نگار

فہرست مضامین ماہ جنوری ۱۹۳۰ء

بسم اللہ ... ھ۱۳۵۵ وحج

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار - ۱	جنوری سنہ ۱۹۳۰ء	جلد - ۱۷

ظفر کی شاعری

کوئی غزل پر اپنی جو نازاں آگے تیری غزل کے ہو
سنا دے اس کو ظفر اک اس میں کا اک اُسمین کا

سرسری تنقید ہے جو ظفر [illegible] اپنی شاعری کے متعلق کی ہے اس میں کلام نہیں کہ ظفر کے جستہ جستہ
م از کم سننے سنانے کے قابل ضرور ہیں اور اگر "کوئی شعر اس میں کا" اور "کوئی
، تو یقیناً اہل ذوق کی میز کا زینت بن سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ظفر کے چار ضخیم
ست لو کون انجام دے؟ میرا ارادہ تھا کہ ظفر کے کلام کا انتخاب میں خود کر دن اور اس ما
یکن اول تو دیگر ضروری مشا[illegible] رصت نہیں دی اور دوسرے یہ بھی خیال ہوا کہ ممکن
ن (مومن کی اور بات تھی) [illegible] لا یترک کلہ" کی حیثیت سے رواروی اور ماہ دسمبر
مجھ سے ممکن ہوا اسے پیش کر[illegible]

۔ اس لئے سب سے [illegible] سی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھتا ہوں کہ

...سے بہت...

اب مین ذرا تفصیل کے ساتھ ان خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہون لیکن اس کو مین تکمیل نہین کہہ سکتا کیونکہ مجھے ظفر کے تمام دیوانون بالاستیعاب مطالعہ کا موقعہ نہین ملا

سب سے اخیر مین مینے واردات محبت کے بیان کا ذکر کیا ہے اور اس مین کلام نہین کہ ظفر کی کوئی غزل ایسی نہین ہے جسمین قسم کے ایک دو شعر نہ نظر آتے ہون، یہانتک کہ نہایت ہی مشکل زمینون اور سنگلاخ ردیف و قوافی کے ساتھ بھی وہ اس مین کامیاب ہاتے ہین

ظفر کی کوئی غزل پوری ایک رنگ کی نہین ہوتی بلکہ اسمین مختلف قسم کے اشعار پائے جاتے ہین۔ مثلاً ایک غزل کے دو شعر یہ ہین

کسی نے اسکو سمجھایا تو ہوتا — کوئی یان تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تونے تقدیر — وہانتک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا

از بیان کی سادگی، اور جذبات کے لحاظ سے صحیح معنی مین غزل کے شعر کہلائے جاسکتے ہین لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہین کہ:۔

نہ بھیجا تونے لکھ کر ایک پرچہ — ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا
نہ بولا ہم نے کھڑکا یا بہت دیر — ذرا دربان کو کھڑکایا تو ہوتا

...سے زیادہ کھلی ہوئی مثال لایعنی رعایت لفظی کی اور کیا ہوسکتی ہے

دوسری غزل کے یہ دو شعر کسقدر پاکیزہ ہین:۔

مین اس کو دیکھ کے یہ محو ہون کہ حیران ہون — جو کچھ وہ پوچھیگا مجھ سے جواب کیا دونگا
نہ پوچھ مجھ سے ظفر میری تو حقیقت حال — اگر کہونگا ابھی تجھ کو مین رُلا دونگا

لیکن اس غزل مین اس رنگ کے شعر بھی موجود ہین:۔

اگر تو آویگا تو جائے فرش پا انداز — مین اپنی آنکھین ترے زیر پا بچھا دونگا
کہے ہے مجھ سے وہ قاتل کہ میرے کوچہ مین — رکھا جو تونے قدم سر ترا اڑا دونگا

ایک مشکل زمین مین کتنا اچھا شعر نکالا ہے:۔

نہ پہونچا تو نہ پہونچا طالب دیدار تک پنے — ترے تکتے ہی تکتے راہ وقت واپسین پہونچا

لیکن اس غزل کے یہ شعر ملاحظہ ہون:۔

زمین لرزی تڑپنے سے ترے بسمل کے یہ قاتل — کہ آخر اس کا اک صدمہ سر گاو زمین پہونچا
مجھے ڈر ہے نہ پہونچے پہونچیون کے بوجھ سے صدمہ — کہ نازک ہے نہایت ہی ترا اے نازنین پہونچا

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہین کہ مشکل زمینون کے پیدا کرنے مین ظفر کو خاص ملکہ حاصل تھا اور اس باب مین انھین اسقدر شغف تھا کہ اگر چارون دیوانون سے اس قسم کی غزلون کو علیحدہ کر دیا جائے تو شاید ہی پورا ایک دیوان معمولی اور آسان ردیف و قافیہ کا باقی رہجائے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ "اس کوہ کنی" کے بعد صرف "کاہ بر آری" نہین ہوتی بلکہ اسقدر خوبی کے ساتھ وہ ردیف قافیہ کو نباہتے ہین کہ حیرت ہوجاتی ہے۔ ہر چند صنعت و آورد کا بیشتر حصہ ظفر کے کلام مین اسی میلان طبع سے پیدا ہوا کیونکہ جب نہایت ہی انمل، بے جوڑ ردیف و قوافی ہونگے تو مضامین مین شگفتگی و بیساختگی کا پیدا ہونا معلوم مثلاً انھون نے ایک غزل مین ردیف گلابی ہو گیا قرار دی ہے اور قافیہ اکثر، بستر وغیرہ، فرض کیجئے کہ ایک شخص محشر گلابی ہو گیا لکھنا چاہتا تو وہ کیا کریگا۔ ظفر کا شعر ملاحظہ فرمایئے کہ یہی ایک صورت محشر کے گلابی ہونے کی ہوسکتی تھی۔ فرماتے ہین:۔

تیرے دامن سے جو ٹپکا خون شہید ناز کا   خوب گہرا دامن محشر گلابی ہو گیا

کہین کہین قافیہ جو آسان مل گیا ہے تو اس زمین مین بھی انھون نے ایک رنگ پیدا کر دیا۔ یہ دو شعر اسی زمین کے ملاحظہ کیجئے:۔

ہو چکی گرمی گلابی بادۂ گلگون سے بھر   ابتو جا ڑا اے پری پیکر گلابی ہو گیا
منہ پہ تانا وقت خواب سنے دوپٹہ تو سفید   عکس روئے لالہ گون سے پر گلابی ہو گیا

ذیل مین بعض اشعار ان کے مشکل زمینون سے درج کرتے ہین جن سے یہ دونون پہلو نمایان ہونگے:۔

خدا نے جبکہ تمہاں بتان بنا یا تھا   مژہ کو تیر بھوؤن کو کمان بنا یا تھا
رہا نہ آسکے وہ ایوان چشم مین میری   مژہ سے مین نے عبث سائبان بنا یا تھا
ص   ہنسے ہے دیکھ کے محفل مین وہ بت بیدرد   الٰہی کیون مجھے گریہ کنان بنا یا تھا

دندان کی تاب دیکھ کے انجم ہوئے خجل   وہ مہ جبین جو شب کو لب بام ہنس پڑا
ص   کیا بات یاد آگئی اس کو کہ اے ظفر   وہ یک بیک جو سُن کے مرا نام ہنس پڑا

وصل ظاہر تو نہ ہوتا تھا ہمین اسکا نصیب   خواب مین وہ چھپ کے آیا یون نہ تھا تو یون ہوا
ص   دیکھے اس بیدرد کو دل ہون ظفر مین دردمند   واہ دُکھ بیٹھے بٹھائے یون نہ تھا تو یون ہوا

تو نے کیون قد سے بیٹھی باندھی شعلہ یاد واہ   باندھتی بلبل کی تھی تار رگ گل سے کمر
کیونکہ اس مین سے روان دریائے اشک شعفہ ہو   جبکہ ہو مشکل محراب در پل سے کمر
ص   روز و شب جو یہ ہو نہ پھرتے ہین بہر قرص نان   اہل دنیا کھول بیٹھے کب تحمل سے کمر

کبھی تو آؤ ہمارے گھر میں سنو ہماری بھی چار باتین — عجب ہے شکوہ رقیب کا یہان ہزار منہ مین ہزار باتین

چڑھا ہے کوٹھے یہ کون اپنے کہ دیکھنے کو آپ جس کے — بگولا بنکر یہان فلک سے کرے ہے اپنا غبار باتین

ص گئے ظفر کل جو اُسکے گھر ہم کھلا یہ شکوہ کا آگے دفتر — گزر گئی شب تمام تسپر نہو چکین زینہار باتین

ایک تو مہندی کی ہے تحریر دونون پانوٴمین — دوسرے ہے کفش بھی تصویر دونون پانوٴمین

ص وحشت گردی خاک کیجے بعد مجنون اے ظفر — مارے ہے خار بیابان تیر دونون پانوٴمین

لب کو مین تیرے مئے ناب کہے تو کہدون — چشم کو ساغر زہر آب کہے تو کہدون

چشم پُر آب مین ہے میرے کہان لخت جگر — یعنی تالاب مین سُرخاب کہے تو کہدون

ص لیکے نام اُس کا بہت آہین بھرا کرتا ہون — کیون ابھی اے دل بیتاب کہے تو کہدون

ص یون تو افسانہ مرا وہ نہین سنتا اے دل — اُس سے یہ قصہ ٴ خواب کہے تو کہدون

خون مرا کیون اُس بت کافر کے گیسو پی گئے — کچھ یہ گنگا جل نہ تھا جو اس کو ہندو پی گئے

ص ایک دو ساغر سے کیا ہوتا ہے ہمتو خم کے خم — بیٹھکر ساقی کے سب زانو بہ زانو پی گئے

کی سحر ہم نے تڑپکر ہجر کی شب مہ جبین — رات بھر سویا کئے تم ماہتابی مین پڑے

گرنہ کھائے ساتھ اپنے وہ نہین کھانے کا لطف — ہے مزا جب ہات دونون کا رکابی مین پڑے

ص اے ظفر جانے وہ کیفیت نگاہ مست کی — آنکھ اُس میکش کی جیسے تہ جابی مین پڑے

یون ہے طبیعت اپنی ہوس پر لگی ہوی — مکڑی کی جیسے تاک مگس پر لگی ہوئی

ص آزاد کب کرے ہمین صیاد دیکھئے — رہتی ہے آنکھ باب قفس پر لگی ہوئی

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مشکل زمینون مین بھی ظفر اپنی کامیابی کو ہات سے جانے نہین دیتے جب تک انھین قافیہ بھی کام کا ملجاتا ہے۔ البتہ ایسے ردیف و قوافی مین جہان کسی اچھے شعر کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہین ہے، وہ ضرور مجبور

ہوجاتے ہین مگر اپنے استاد شاہ نصیر کے تتبع مین اور کچھ قدرت شاعری کے اظہار کے لئے انھون نے ایسی ایسی مہمل ردیفین پیدا کی ہین ا
کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے مکروہ ولغو قافیے استعمال کئے ہین کہ شاید ہی کہین اور نظر آئین۔ مثلاً:۔

غلاف تنگ　،　شگاف تنگ ـــــــ

موڑ کی ایک　،　ہنسوڑ کی ایک ـــــــ

فولاد کی نوک　،　ناشاد کی نوک ـــــــ

سنگ تڑ ق　،　رنگ تڑ ق ـــــــ

قاتل کے چار پانچ　،　ساحل کے چار پانچ ـــــــ

قلقل سے کم　،　بُلبُل سے کم ـــــــ

گھر مین سلاخ　،　کمر مین سلاخ ـــــــ وغیرہ

ظاہر ہے کہ ان زمینون مین کوئی شعر نہین نکل سکتا، لیکن ظفر نے کثرت سے اس طرح کی غزلین کہی ہین اور جہانتک صرف نظم کرد
تعلق ہے، خوب ہین ورنہ غزل سے انھین کوئی واسطہ نہین، اور نہ ہو سکتا ہے

ـــــــ

ظفر کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ واردات قلب کو نظم کرتے ہین تو سہل وآسان الفاظ مین خاص قسم کی تاثیر پ
کر دیتے ہین اور اسی لئے ان کی مسلسل غزلین خوب ہوتی ہین۔ مثلاً ایک جگہ انھون نے کس مغنیہ کی حالت رقص وغنا کو مسلسل غ
کی صورت مین پیش کیا ہے اور اس مین شک نہین کہ خوب ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

تو جو مہتابی پہ کل رات کھڑا گاتا تھا　　دائرہ مہ بھی لئے ساتھ کئے جاتا تھا
بندھ گئی تھی وہ ہوا گانے کی تیری کہ مرا　　ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اُڑا جاتا تھا
کیا کہون رقص کا عالم عجب انداز کے ساتھ　　ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکرین دل کھاتا تھا
ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے　　ہاتھ ہم ملتے تھے دل تھا کہ ملا جاتا تھا

لکھتے لکھتے اخیر مین مقطع لکھتے ہین اور کس قیامت کا کہ:۔

آنکھ چاہت کی ظفر کوئی بھلا چھپتی ہے　　اُس سے شرماتے تھے ہم ہم سے وہ شرماتا تھا

مسلسل غزلون مین اُن کی یہ غزل بہت مشہور ہے:۔

تا درِ جاناں ہمین اول تو جانا منع ہے　　اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے
حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے　　اب بتائین کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے
نام بتلایا جو مین نے تو وہ سنکر چپ رہے　　پھر پکارین کس طرح سے غل مچانا منع ہے

غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجلا کے کہا — جاؤ کیون آئے تمھین گھر مین بلانا منع ہے
اور بلایا بھی تو پھر جائین وہان ہم کس طرح — وہ جہان ہین ہمکو وان تک بار پانا منع ہے
بار پا کر کچھ اگرچہ ہم گئے بھی وان تلک — آنکھ اُٹھا کر کیونکہ دیکھین آنکھ اُٹھانا منع ہے
سامنے بھی وہ کسی صورت سے گر آئے تو پھر — بولنا ہنسنا تو کیا وان مسکرانا منع ہے
مسکرائے بھی تو کچھ چپکے ہی چپکے غنچہ وار — دل مین کیا کیا مدعا اور لب ہلانا منع ہے
لب ہلائے بھی تو کوئی کچھ بات منھ سے اور ہی — پڑھنا ہر مطلب پہ شعر عاشقانہ منع ہے
عاشقانہ شعر بھی کوئی پڑھا تو پڑھ کے پھر — آہ بھرنا منع ہے آنسو بہانا منع ہے
آہ بھر کر کچھ اگر آنسو بہائے بھی تو پھر — وہ جو دل کی بات ہے اُس کا جتانا منع ہے

بات گر دل کی جتائی بھی تو پھر ہوتا ہے کیا
اے ظفر ایسی جگہ دل ہی لگانا منع ہے

کہین کہین دوران غزل مین قطعہ بھی وہ اسی رنگ کا لکھتے ہین مثلاً

خط جسے چاہو لکھو تم لیکن — اتنا بندہ پہ کرم کیجئے گا
وہ جو القاب لکھا ہے مجھے — وہ کسی کو نہ رقم کیجئے گا

اے ظفر دل کو وہ لین گر بقسم — ان کی باور نہ قسم کیجئے گا
یعنی دل لیکے نہ دینگے وہ تمھین — لاکھ گر چشم کو نم کیجئے گا
دل انھین دیکے تم اپنے دل پر — اپنے ہاتھون سے ستم کیجئے گا

مسلسل غزلون کے سلسلہ مین ظفر نے جو سراپا لکھے ہین، وہ کوئی خصوصیت نہین رکھتے کیونکہ ندرت تخئیل کے نہ ہونے کی وجہ سے تمام تشبیہات پامال و فرسودہ استعمال کی گئی ہین

چین جبین کو موج سمندر (عربی لفظ کی اضافت ہندی لفظ کے ساتھ ہے) ابرو کو باب سکندر، مانگ کو خط کہکشان پیشانی کو ماہ انور، بالون کو شب یلدا، رُخ کو خورشید محشر، جوڑے کو مشک نافہ، عارض کو صبح صادق، قد کو قیامت، جس طرح اور شعرا اس سے قبل لکھ گئے تھے، ظفر نے بھی لکھا ہے، لیکن ایک بحر مستلحن مین (مین ہر اُس بحر کو جو موسیقی کی کسی سمپورن راگنی مین پوری طرح آسکے، بحر مستلحن کہتا ہون) ہلکے ہلکے جذبات کے ساتھ ملا ہوا سراپا شاید کسی مغنیہ کا ظفر نے اچھا لکھا ہے

شمشیر برہنہ مانگ غضب بالون کی مہک پھر ویسی ہے — جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالون کی مہک پھر ویسی ہے
ہر بات مین اُس کے گرمی ہے ہر ناز مین اُس کے شوخی ہے — قامت ہے قیامت چال پری چلنے مین پھڑک پھر ویسی ہے

نوخیز کچین دو غنچہ ہین، ہے نرم شکن اک خرمن گل — باریک کمر جون شاخ گل رکھتی ہے لچک پھر ویسی ہے
محرم ہے حباب آب رواں سورج کی کرن ہے اُسپہ لپٹ — جالی کی ہے کرتی اُسکی بلا گوٹے کی دھنک پھر ویسی ہے
وہ گائے تو آفت لائے ہے ہر تال مین لیوے جان نکال — ناچ اُس کا اُٹھائے سو فتنے گھنگرو کی جھنک پھر ویسی ہے

ہر بات پہ ہم سے وہ جو ظفر کرتا ہی رکاوٹ مدت سے
اور اُس کی چاہت رکھتے ہین ہم آج تلک پھر ویسی ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر کو اپنے جذبات واحساسات کے اظہار پر کافی قدرت تھی اور وہ کسی واقعہ یا تاثر کو کافی شرح وبسط اور جزئیات کا پورا احاطہ کرتے ہوے ظاہر کرسکتے تھے۔ اسی لئے طویل بحرون کی غزلین یا مستزاد انھون نے بہتر لکھی ہین اور تنگ بحرون مین وہ کامیاب نہ ہوتے تھے، کیونکہ فارسی تراکیب کا استعمال وہ کرتے نہ تھے اور وسیع مطالب کو مختصر الفاظ مین ظاہر کرنے کے لئے فارسی ترکیبون کا استعمال ناگزیر ہے۔ اگر کہین فارسی ترکیب انھون نے استعمال کی ہے تو ردیف وقافیہ سے مجبور ہو کر مثلاً یہ غزل

مانند شمع عشق مین گردن بریدہ ہون — پر بل ہے سرکشی کہ وہی سرکشیدہ ہون
مطلب نہ آشنا سے نہ دام وقفس سے کام — مین اس چمن مین طائر رنگ پریدہ ہون
ہرئے زلال خضر نہ منہ کا مرے مزا — مین تلخ کام زہر محبت چشیدہ ہون
وحشت کے وہ ہی ڈھنگ ہین ہستی سے تاقدم — مین وحشی رمیدہ کہان آرمیدہ ہون
نے شمع انجمن ہون نہ مین لالۂ چمن — پھر کیون جہان مین داغ بداکا فریدہ ہون

فارسی کا ذوق ظفر کا ناقص تھا جیسا کہ اُن کی بعض فارسی غزلون سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہون:-

اے بت طناز قربانت شوم — اے سراپا ناز قربانت شوم
حلقۂ زلف وکمند جان ودل — اے کمند انداز قربانت شوم
چون مسیحا در لب جان بخش تو — صد ہزار اعجاز قربانت شوم
مرغ جانم در ہوائے کوئے تو — میکند پرواز قربانت شوم
تا بہ قربان گاہ من بکرہ زناز — باز آتا باز قربانت شوم
تو بہر انداز بنما جلوۂ — من بہر انداز قربانت شوم

ہردم آن ابرو کمان را از ظفر
میرسد آواز قربانت شوم

معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کو فارسی زبان سے کوئی مس ہی نہین ہے

ظفر کے یہان اُس رنگ تصوف کے بھی اشعار کہین کہین پائے جاتے ہین جس کا لطف صاحب حال حضرات کے مطالعہ ہی سے

حاصل ہوسکتا ہے اور بعض بعض صوفیہ نے فارسی مین بے اختیارانہ طور پر اسکا اظہار بھی کردیا ہے، ظفر نے بھی انھین کی تتبع مین چند غزلین اس رنگ کی لکھی ہین، لیکن چونکہ صرف قال ہی قال ہے اس لئے بے کیف ہین:-

صوفیون مین ہون نہ رندون مین نہ میخوارون مین ہون　　اے بتو بندہ خدا کا ہون گنہگارون مین ہون

میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے　　خواہ مین ہون کافرون مین خواہ دینداروں مین ہون

اسی طرح وہ کہتے گئے ہین کہ نہ گلون مین ہون نہ خارون مین، نہ مدہوشون مین ہون، نہ ہوشیارون مین نہ آزادون مین ہون نہ گرفتارون مین، صرف ایک شعر انکا اس غزل مین اچھا ہے:-

جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے　　مین عجب اک جنس ناکارہ خریدارون مین ہون

ظفر ایک بزرگ شاہ فخرالدین کے مُرید تھے جن کا ذکر انھون نے متعدد جگہ اپنے کلیات مین کیا ہے- اس غزل کے مقطع مین بھی لکھتے ہین-

اے ظفر مین کیا بتاؤن تجھ سے جو کچھ ہون سو ہون　　لیکن اپنے فخر دین کے کفش بردارون مین ہون

ظفر نے پنجابی زبان مین کہین کہین کاوش کی ہے اور مخمس، تضمین، رباعی، وغیرہ بھی ان کے کلیات مین پائی جاتی ہے، لیکن کوئی خصوصیت ان مین بھی نہین ہے

بہرحال ظفر شاعر تھا اور نہایت پُرگو قسم کا- اور باوجود اُس سخافت و دنائت کے جو رعایات لفظی، ادنی تشبیہات، اور مشکل زمینون مین محض قدرت نظم ظاہر کرنے کے سلسلہ مین اُس سے ظاہر ہوئی ہے، ہمکو ماننا پڑیگا کہ ظفر کو قدرت نے شاعر پیدا کیا [illegible] ہی سیدھا سادھا شاعر جو مادی عشق کے مادی جذبات کے نظم کرنے مین بغیر کسی جوش خروش اور بغیر کسی غیر معمولی بلندی کے پورا [illegible] رکھتا تھا- زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی یہ دو باتین ان کے کلام مین ایسی ہین جنکو تمام تذکرہ نویسون نے بالاتفاق تسلیم کیا [illegible] موجودہ چارون دیوان جنھین نولکشور پریس نے چھاپا ہے وہی ہین جو رنگون جانے سے قبل مرتب ہوچکے تھے- قیام رنگون کے زمانہ کا کلام دستیاب نہین ہوتا ممکن ہے انقلاب حالات کی وجہ سے اس مین کوئی اور کیفیت پیدا ہوگئی ہو

ظفر کی ولادت ۱۷۷۵ء مین ہوئی ۱۸۳۷ء مین تخت نشین ہوئے ۱۸۵۸ء مین معزول کرکے رنگون بھیجدیئے گئے اور ۱۸۶۲ء مین انتقال ہوا، وہ بہت منکسر مزاج، متواضع، رحمدل اور مخیر شخص تھا، اسنے کبھی کسی کو کوئی آزار نہین پہونچایا اور نہ عصبیت اس سے ظاہر ہوئی- عام تصوف کا ذوق رکھنے والون کی طرح اس مین تفضیلی رنگ غالب تھا اور اس لئے مجالس عزاداری وغیرہ کا بھی پابند تھا

ذیل مین اس کے کلام کا ایک سرسری و ناقص انتخاب پیش کیا جاتا ہے:-

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا　　کوئی یان تک اسے لایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا، تونے تقدیر　　وہانتک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا

مین اُس کو دیکھ کے یہ محو ہون کہ حیران ہون جو کچھ وہ پوچھیگا مجھ سے جواب کیا دون گا
نہ پوچھ مجھ سے ظفر میری تو حقیقت حال اگر کہونگا ابھی تجھ کو مین رُلا دون گا

وہ بیحجاب جو کل پی کے یان شراب آیا اگرچہ مست تھا مین پر مجھے حجاب آیا

بیچ مین پردہ دوئی کا تھا جو حایل اُٹھ گیا ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرا دل اُٹھ گیا
اے ظفر کیا پوچھتا ہے بیگناہ و پُرگناہ اُٹھ گیا اب تو جدھر کو دستِ قاتل اُٹھ گیا

یہ کراہا ترا بیمار الم درد کے ساتھ کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر مین نور جمال تھا کھُلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
مرے دل مین تھا کہ کہونگا مین جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

بھید دل کا گریہ سے اے چشم نم کھُل جائے گا وہ جو ہے پوشیدہ اپنا حالِ غم کھُل جائے گا
اُس کے رُکنے پر نہ جا پیتے ہی جام مے ظفر دیکھنا باتون مین وہ کافر صنم کھُل جائے گا

نہ تھی حال کی جب ہمین اپنی خبر رہے دیکھتے اورون کے عیب و ہنر پڑی اپنی بُرائیون پر جو نظر تو نگاہ مین کوئی بُرا نہ رہا
کئی روز مین آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاس حجاب و حیا نہ رہا

وہ بگڑے ایسے کہ پھر کچھ معاملہ نہ بنا رہی نہ جائے سخن موقع گلہ نہ بنا
جو دل لیا ہے تو عہد وفا پہ قائم رہ ظفر سے آپ کو تو بد معاملہ نہ بنا

دیدیا دل اور نہین اب یاد یہ کس کو دیا عشق کو کھووے خدا جس نے جہان سے کھو دیا
خواہ وہ داغ جنون ہو خواہ کو [illegible] خون ہم نے سر آنکھون پہ رکھا عشق تو نے جو دیا
چاہے دلداری کرے چاہے دل آزاری کرے اے ظفر اُس دلربا کو ہم نے دل اب تو دیا

کیا کہون کیونکہ ترے کوچہ مین ہو کر آیا — تجھ کو پایا جو نہین خوب مین رو کر آیا

ہے عشق کی منزل مین یہ حال اپنا کہ جیسے — لٹ جائے کہین راہ مین سامان کسی کا

گلی گلی تری خاطر پھرا بہ چشم پُرآب — لگا کے تجھ سے دل اپنا بہت خراب ہوا

قسم خدا کی تجھے قاصدا کہ یہ پیغام — کہا ہے یار نے یا تو نے اپنے جی سے کہا
ظفر وہ دشمن جان ہے اسے نہ جانیو دوست — ترے جتانے کو ہم نے یہ دوستی سے کہا

کیا بات یاد آگئی اُس کو کہ اے ظفر — وہ یک بیک جو سُنکے مرا نام ہنس پڑا

کوچہ مین ترے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا — دو چار گھڑی اپنا دل کھول کے رو جانا
نیند آئے ظفر کیونکر یاد آئے جو شب مجھ کو — سر رکھ کے سر زانوئے اُس یار کے سو جانا

وہ تو ہے نا آشنا مشہور عالم مین ظفر — پر خدا جانے وہ تم سے آشنا کیونکر ہوا

کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے — دل سے مین مجھ سے مرا دل بیخبر ہونے لگا
ہم نے لکھکر اپنا حالِ دل دیا سب کو رُلا — ہر طرف رومال پر رومال تر ہونے لگا
کوچۂ جانان مین جانا ہی پڑیگا ہو سو ہو — کیا کرون بیتاب دل پھر لے ظفر ہونے لگا

مجھ کو سمجھائین گے یا میرے دلِ دیوانہ کو — حضرت ناصح سے پوچھو کس کو سمجھائین گے آپ
آپ کی خاطر سے ہم کرتے تھے ضبطِ اضطراب — دیکھ کر بیتاب ہمکو اور گھبرائین گے آپ

وقت غفلت اور ہے ہنگام ہشیا[illegible]ر — خواب کی سیر اور ہے اور سیر بیداری ہے اور

درد مندان محبت کا طبیبوں سے علاج کس طرح سے ہو سکے یارو، یہ بیماری ہے اور
میکدہ میں عشق کے جو لوگ ہیں کافر تو ہیں لیکن ان کے کفر میں انداز دینداری ہے اور

کبھی تو آؤ ہمارے گھر میں سنو ہماری بھی چار باتیں عجب ہے شکوہ رقیب کا یاں ہزار منہ ہیں ہزار باتیں
گئے ظفر کل جو اس کے گھر ہم کھلا یہ شکوہ کا آگے دفتر گزر گئی شب تمام تسپر نہو چکیں زینہار باتیں

یار دل مانگے ندوں کیونکر کہو تو کیا کروں اور جب دیدوں تو یوں کیونکر کہو تو کیا کروں
جبکہ پوچھے یار مجھ سے شیفتہ ہے کس پہ تو منہ سے میں اپنے کہوں کیونکر کہو تو کیا کروں
اپنا احوال محبت سامنے اُس کے ظفر آپ میں لکھ کر پڑھوں کیونکر کہو تو کیا کروں

یار ہو پیش نظر یہ کبھی ہونے کا نہیں ہو تو دیکھوں نہ اُدھر یہ کبھی ہونے کا نہیں
صبر مشکل ہے نکر صبر کا دعوی ہرگز عشق میں تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہیں

تم نظر آجاؤ شاید اس ہوس میں آج ہم صبح سے تا شام سوئے رہگزر دیکھا کئے
گر نہیں ہے ربط کچھ باہم تو پھر محفل میں شب تم انھیں اور وہ تمھیں کیوں اے ظفر دیکھا کئے

نہیں ہے طاقت پرواز آہ اے صیاد خدا کرے کہ تو اب وا درِ قفس نہ کرے
جو اُس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے ہے خدا کسی کو جہان میں کسی کے بس نہ کرے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

نیاز

بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے :-

رعیت چو بیخ است و سلطان درخت ۔ ۔ ۔ درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادث زمانہ کے ہاتھوں پائمال ہو چکا تھا اور فلاکت کی تند و تیز باد مخالف کے جھونکوں سے سلطنت مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کرلے۔ مرہٹوں کا زور ہوا، پٹھانوں کا زور ہوا۔ جاٹوں کا زور ہوا۔ انگریزوں کا زور ہوا، مگر دلی کا بادشاہ دلی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جبتک دلی بالکل تباہ نہ ہو لی، اسوقت تک کوئی بھی اس کے تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلی کے ریذیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کردے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر کے قلعہ پر قبضہ کرے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بہت زور مارا کہ دلی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے مگر بورڈ والے اسپر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مباحثے ہوئے۔ نوجوانوں نے بہت کچھ جوش و خروش دکھایا، مگر انگلستان کے جہاندیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی۔ جب بورڈ میں مسٹر ٹکر نے کھڑے ہو کر کہا: "عزیزو! میں ۵۰ سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے۔ اسکی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک۔ ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک۔ ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہلجائے گا۔ یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔" آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور نوجوان ہارے۔ دلی کے بادشاہ کا اقتدار ضرور کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اسمیں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ جیسی تھی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو۔ بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ ہی پر نظر ڈال لو۔ دیکھو کہ ہندو مرد تو مرد عورتوں کو بادشاہ سے کیسی محبت تھی۔ اور خود بادشاہ اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی، جہاں سن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اس کو بلاتے۔ نہ آتا تو خود جاتے۔ اس سے ملتے۔ بہت کچھ دیتے دلاتے۔ اور اس فقیر نوازی کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ غازی الدین خاں اس زمانہ میں دلی کا وزیر تھا، خدا جانے اس کو بادشاہ سے کیوں دلی نفرت تھی۔ قلعہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا۔ قلعہ میں مشہور کر دیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں بڑے صاحب کرامات ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ مگر نہ کہیں خود جاتے ہیں

نہ کسی کو آنے دیتے ہیں۔ ادھر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ ادھر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے اور پل باندھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکلکر کوٹلہ پہونچے۔ اِدھر اُدھر کھنڈروں میں تلاش کی، یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے۔ چار نمک حراموں نے ایک برج میں سے نکلکر بادشاہ کو شہید کر دیا۔ اور لاش جمنا کی ریتی میں پھینکدی۔ خدا کی قدرت دیکھو ادھر سے ایک برہمنی رام کور آرہی تھی۔ اس نے جو لاش پڑی دیکھی تو ذرا ٹھٹکی بھاگنے کا ارادہ کیا۔ پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ ہیں یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے، رات بھر اس بیکس شہید کا سر زانو پر لئے ہوئے بیٹھی روتی رہی۔ صبح جمنا جی کے اشنان کو لوگ آئے۔ انہوں نے بھی لاش کو دیکھکر پہچانا۔ تمام شہر میں کھلبلی پڑگئی۔ اس بیکس شہید کی لاش دفن ہوئی۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے رام کور کو بلایا بہت کچھ انعام و اکرام دیا، اور اس برہمنی کو اپنی منہ بولی بہن بنالیا۔ تھوڑے دنوں میں سلونو کا تہوار آیا۔ بھائی کے لئے بہن موتیوں کی راکھی لے کر پہونچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دئے۔ لیجئے راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہوگئی۔ جب تک قلعہ آباد رہا۔ اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں، بادشاہ اور شاہزادوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دیے جاتے۔ یہ سلسلہ اُسوقت ٹوٹا جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھول والوں کی سیر بھی اسی محبت باہمی کا نتیجہ تھی۔ ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدین ظفر بڑے بیٹے تھے۔ مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے اور کیوں نہ چاہتے۔ مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا، بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے رزیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولیعہد ہو جائیں۔ اس زمانہ میں دلی کے رزیڈنٹ سیٹن صاحب تھے۔ ایسا بادشاہ پرست انگریز شاید ہی ہندوستان میں کوئی اور آیا ہو۔ وہ اکبر شاہ کی ویسی ہی عزت کرتے تھے جیسی خود اپنے بادشاہ کی کرتے تھے۔ ٹوپی اتار کر مجرا گاہ سے آداب بجالاتے۔ کرسی دی جاتی تو بادشاہ کے سامنے جھجھک بیٹھتے گفتگو میں آداب شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ غرض سب کچھ کرتے تھے مگر اس پر راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولیعہد ہوں۔ بظاہر اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سلسلۂ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے، اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے عادات و اطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے۔ اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا، ایک دن سر دربار مرزا جہانگیر نے سیٹن صاحب کو "لو لو ہے بے" کہدیا۔ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دی جاتی۔ قید ہوکر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا۔ منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور سیٹن صاحب کی شرافت دیکھو کہ انہی کی سفارش پر صاحب عالم قید سے رہا ہوئے۔ دلی آئے۔ بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی، شہر بھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اسمیں خوبصورتی کے لئے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا۔ بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا۔ دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے

تکیسا! مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں۔ ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلہ کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دلّی والے راضی ہو گئے، لیجئے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب جاتے۔ وہاں رہتے۔ شہزادے میلہ میں شریک ہوتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں یہ گانا چلا:-

قطب کو چلا میرا اکبر ہٹیلا — رستہ میں جنگل نہ ملتا ہے ٹیلا!

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی، تو ذرا آنکھیں بند کر لیجئے میں دکھائے دیتا ہوں:-

---

سنہ ۱۲۶۴ھ کا ساون بھی غضب کا ساون تھا۔ یا تو برستا ہی نہ تھا یا برسا تو ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ بدھ بدھ پندرہ دن ہو گئے مینھ نہ آج کھلتا ہے نہ کل اور پانی کا یہ حال ہے کہ دھائیں دھائیں یکساں برسے چلا جاتا ہے۔ جمنا بڑھ کر نگمبود گھاٹ تک آ گئی۔ نیلا گھاٹ میں پانی ہو شہر میں گھس آیا۔ چاندنی چوک کی نہر ابل کر کناروں سے نکل گئی۔ بیچارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بڑی بڑی حویلیاں چیں بول گئیں۔ جدھر سنو، اڑڑ اڑڑ دھم کی آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ اس مکان کی چھت بیٹھی اسکا پاکھا گرا۔ شاید ہی کوئی مکان ہو گا جسکی کم سے کم چھل نہ گری ہو۔ غریب غربا گھر بار چھوڑ باہر نکل آئے۔ جامع مسجد کے نیچے سامان کا ڈھیر ہو گیا۔ کسی نے پلنگ بچھا، اوپر سے دری ڈال چھوٹی سی کوٹھری بنا لی۔ کسی نے چھپر کھٹ کے گرد چادر گھیر عورتوں کے لئے جگہ نکال لی۔ غرض ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ دو سال پہلے بھی ڈھائی ڈھوئن کا مینھ برسا تھا مگر یہ تو کچھ اور ہی رنگ تھا۔ بنئے اپنی مصیبت میں مبتلا تھے بھٹیارے اپنے حال میں گرفتار۔ آخر رہیں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلّی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی جو ان غریب شہر لوگوں کی خبر لے۔ شہر والے جانے اور انکا کام جانے۔ خیر بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی۔ بیچارے کے جو کچھ اختیار میں تھا۔ وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھلوا دیئے۔ کوٹ قاسم کی مالگذاری انہی دنوں میں آئی تھی۔ وہ سب کی سب اس مصیبت ماری رعیت پر خرچ کر دی۔ مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہنچایا، ہندوؤں کو غلہ دیا۔ سر چھپانے کو جگہ دی، غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گذر گئے۔ سولھویں دن ذرا پانی نے دم لیا۔ ابر پھٹا۔ سورج کا کونا دکھائی دیا۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ دو چار دن مکانوں کی مرمت اور حالت کی درستی میں لگے۔ اسکے بعد یاروں کو میلہ کی سوجھی

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلی والے چپکے بیٹھے رہیں۔ ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے، صبح ہی سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہوئی کہ شہر خالی ہو۔ بیلہ[1] آباد ہو گیا۔ پنواڑیوں۔ کاچھیوں۔ بساطیوں۔ سوداگروں غرض ہر قسم کے

---

[1] جمنا کی ریتی کے برابر برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اسکو بیلہ کہتے ہیں۔

سودے والوں کی دکانیں لگ گئیں۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔ بادشاہ سلامت بھی نکل ثمن برج[1] میں آبیٹھے شہزادوں کے لئے دیوان خاص کی صحن میں فرش ہوگیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لئے موتی محل۔ خاص محل۔ ہیرا محل اور اسد برج کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے استاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اترے۔ اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کئے۔ کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے۔ کسی نے کھڑی ماری تو ایسی کہ گھٹنے تک پانی سے باہر نکل آیا۔ کوئی ہے کہ کٹھری بنا بہا ؤ پر چلا جا تا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پر سیدھا چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہو رہی تھی۔ اُدھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع ہوئی۔ پکلیں لڑی تو ایسی کہ جھکراتی جھکراتی مقبرہ[2] سے آگے نکل گئیں۔ پتنگ لڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کنکووں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا۔ رات کے نو دس بجے بیلہ پھر وہی جنگل کا جنگل ہوگیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے ڈھیر۔ پیکوں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہوگیا۔

ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھولوالوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفاء دہلی میں سے دو ہندو دو مسلمان لال حویلی[3] پہونچے۔ اطلاع کرائی باریابی ہوئی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے۔ کہا "پیر و مرشد۔ پھولوالوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہوگئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرما دی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔" بادشاہ نے فرمایا "ہاں اماں[4] ٹھیک تو ہے۔ جو تمہاری خوشی۔ وہ ہماری خوشی۔ ۱۵۔ تاریخ مقرر کر دو۔ رہا ہمارا آنا تو جہاں تم وہاں ہم۔ کیوں نہ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔" تاریخ مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لئے حاضر ہوا۔ نفیری پر شادیانہ بجایا۔ لیجئے سیر کی ۱۵۔ تاریخ پکی ہوگئی۔ سارے شہر میں نفیری بجگئی کہ پندرہویں کو پھولوالوں کی سیر ہے۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھ کر تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہوئیں۔ ایک آتیں۔ سلام کرکے بیٹھ جاتیں۔ دوسری آتیں۔ بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر میں سارا قلعہ تسبیح خانہ میں جمع ہوگیا۔ لیکن سب ہیں کہ منہ سے چپ ہیں۔ مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا:۔

---

[1] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اسکا مثمن برج ہے لیکن دلّی والے اس کو ثمن برج کہتے ہیں

[2] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلی سے [illegible] تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[3] دہلی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی [illegible] تھے۔ حافظ عبدالرحمن خان احسان کا شعر ہے:۔

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں دہائی ہو بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

[4] آخر زمانہ میں شاہان دہلی انہی معنوں میں "اماں" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جن میں ہم آج کل "بھئی" کا لفظ بولتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے۔ چنانچہ اب بھی دہلی میں "اے میاں" کو مختصر کرکے "اماں" بولا جاتا ہے۔ ان کے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے دلی کے شہزادوں سے اسکی مکرر تحقیق کی معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ماں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا استعمال حیدرآباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے

"اماں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ آج دس ہے۔ پندرہ کو سیر ہے۔ اچھا ہوگا کہ سب سے پہلے ہی چلے چلیں۔ بعد میں گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ دو تین دن قطب کا لطف اٹھالو۔ اور پھر قطب دلی والوں کے سپرد کردو۔ لو جاؤ۔ چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے سویرے روانہ ہوں گے۔ اور ہاں میاں دارا[1]۔ تم ہماری سواری کا بند و بست کرو۔ کوتوال سے کہدو۔ قلعدار سے کہدو۔ حکیم صاحب[2] سے میں خود کہدونگا کل صبح سویرے نکل گئے۔ تو سلطان جی ہوتے ہوئے شام تک انشاء اللہ قطب پہونچ جائیں گے۔" یہ سب لوگ تو اتنا سننے کے لئے جمع ہی ہوئے تھے۔ ایک ایک اٹھ۔ مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ سامان بندھتا اور داروغہ توشکخانہ کے پاس پہنچ جاتا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ بیسیوں پیٹیاں۔ سیکڑوں بوغبند۔ ہزاروں چاءردانیاں۔ لاکھوں پوٹلیاں۔ غرض الم غلم منوں سامان جمع ہوگیا۔ کچھ چھکڑوں میں لادا گیا۔ کچھ اونٹوں پر چڑھایا گیا۔ کچھ شکرموں[3] میں رکھا گیا۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا کہ سامان چلنا شروع ہوا۔ خدا خدا کر کے کہیں دو بجے اس لدم پھدم کا تانتا ختم ہوا۔ اسوقت کہیں جاکر بیچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی۔ ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کہ اردابیگنی نے حکم پہونچایا کہ حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہوا ہے کہ توشک خانہ شاہی ابھی روانہ ہو۔ جنگلی محل میں قیام ہوگا اسلئے خیموں۔ سراپردوں۔ اور شامیانوں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں شہر والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دیدیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار نہ کیا جائے۔ اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرادی جائے،، حکم پہونچنا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ اپنے پیش دستوں کو لے۔ سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ اور وہاں قلعہ والوں کی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے۔ چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں۔ رنگریزنیں سرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں۔ کہیں مہندی پس رہی ہے کہیں گوٹ لہیاں نکالی جارہی ہیں۔ کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجا دیئے۔ کوئی دو بجے ہونگے کہ سواری کا بگل ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اسمیں سواریاں آن لگیں۔ انائیں۔ دوائیں۔ مغلانیاں۔ خواصیں[4]۔ چھوکریاں۔ لونڈیاں۔ سرتیں[5] سوار ہونا شروع ہوئیں۔ بہارکسوں۔ منجھولیوں۔ اور بہلیوں میں وہ ٹھسا ٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سانگیوں[6] اور اچیوں[7] میں پہلے تو اٹا اٹ سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو۔ تین تین چھوکریاں اور مامائیں دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ

---

[1] مرزا دارا بخت ولیعہد سلطنت تھے

[2] احترام الدولہ۔ عمدۃ الحکماء معتمد الملک، حاذق الزماں۔ حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ انہی کی شہادت نے بیچارے بادشاہ کو رنگون دکھایا

[3] اونٹ گاڑی کو پہلے شکرم کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لئے بھی بولا جانے لگا

[4] اس زمانہ میں بیگمات اور شہزادیوں کی مصاحبوں کو خواص کہتے تھے۔ درجہ میں یہ مغلانیوں سے کچھ بڑی ہوتی تھیں

[5] زرخرید لونڈیاں سرتیں کہلاتی تھیں۔ سریہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں

[6] و [7] بہارکسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر اور سوت کا جال بنا کر جو جگہ نکال لیتے ہیں اسکو سانگی۔ اور اسی طرح پیچھے گھانس وغیرہ بھرنے کو جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اسکو اچی کہتے ہیں

یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لئے ساتھ ہوئے۔ یہ لوگ قلعہ سے باہر ہی ہوئے ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کے لیے رتھیں، ڈولیاں، نیمے، میانے، پالکیاں، چوپہلے، چنڈول اور سکھپال موتی محل کے برابر آلگے۔ شاہزادہ ولیعہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کئے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناتیں کھینچیں، جو بیگم یا شہزادی باہر آتی انکو بلحاظ ان کے درجہ کے سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردابیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین سوا تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں۔ اس کے پیچھے دوسری سواریاں سب سے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہونچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اتر کر سلامی دی۔ دروازہ کے باہر سے دگلہ پلٹن کا ایک پرا آگے ہو گیا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواریوں کے ادھر اُدھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے۔ کھڑکی دار پگڑیاں باندھے۔ ساتوں ہتیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ انکا بھی مردانہ فوجی لباس، گورے گورے چہرے۔ شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ۔ اسمیں سفید پروں کی اونچی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں پشت پر ترکش۔ شانہ پر کمان۔ پہلو میں تلوار۔ ڈاب میں پیش قبض بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینت محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا آگے آگے دو حبشنیں۔ گھونگھر والے بال۔ انپر سرخ پگڑیاں، پگڑیوں میں سفید مقیش کے پھندنے۔ موٹے موٹے ہونٹ لال لال دیدے۔ سرخ گرنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ۔ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں۔ سامنے گھوڑوں کی پشت پر زربفت سے منڈھے ہوئے ڈنکے۔ ایک چوب مارتی۔ دوسری پکارتی "ادب سے۔ نگاہ روبرو حضرت بادشاہ بیگم سلامت"۔ سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسری کے ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر۔ بسم اللہ، بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں۔ سب سے پیچھے اردابیگنیوں کی پلٹنیں۔ مردانہ لباس پہنے۔ ہتھیار لگائے۔ اونچی نچی ساتھ ساتھ تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مشعلچنیں۔ کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کپی۔ کسی کے ہاتھ میں دو شاخہ کسی کے ہاتھ میں پنجشاخہ۔ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس دلی دروازہ تک تو اسی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ

سہ نہ ۲ ۳ اور ۴ آدھی پالکی کو نیمہ کہتے ہیں۔ اسمیں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے بڑی میانہ ہے۔ چوپہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں۔ مگر انکی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے

۵ یہ خاص محلسرا کی حفاظت کی فوج تھی صرف شریف لوگ اسمیں نوکر ہو سکتے تھے۔ اور انپر اسقدر اعتبار تھا کہ ساری ڈیوڑھیوں پر انہی لوگوں کا پہرا تھا۔ بغیر انکی اجازت کے کوئی عورت بھی محل میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی انکے کسی قدر ڈھیلے ڈھالے لباس کی وجہ سے شاید اسکو دگلہ پلٹن کہتے ہوں۔ یا اسوجہ سے ہو کہ لڑائی کے وقت یہ لوگ جلتہ پہنتے تھے

۶ نواب زینت محل خاندان شاہی سے نہ تھیں۔ نواب علی قلی خاں کے خاندان میں نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جواں بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی ولیعہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بلا چون وچرا کرتے۔ آخر انہی جھگڑوں نے رنگوں پہنچا دیا۔ یہ بیگم جب نکلتیں۔ ڈنکہ انکے ساتھ ہوتا، اسی لئے انکو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ پر کم رہتی تھیں لال کنوئیں پر نیا محل بنوایا تھا۔ غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا۔ اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا

کے باہر نکلکر رتھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئیں قطب کی سڑک پڑلیں۔ اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر گڑ[1] کا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔ خانساماں نے یاقوتی کی سرمہر پیالی پیش کی۔ مہر توڑ کر یاقوتی نوشجان کی اور فرمایا "اماں سب لوگ سدھارے" عرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہوگیا۔ میر تزک[2] حاضر ہیں۔ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ فرمایا "اچھا بسم اللہ کرو" یہ حکم ہونا تھا کہ نگل ہوا۔ ولیعہد بہادر کے لئے تامجھام۔ مرزا شاہرخ کے لئے تخت رواں مرزا فخرو کے لئے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کے لئے ہوادار دیوان خاص میں آگیا، باقی سب شاہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہوادار میں قدم رکھا اور ادھر چوبدار نے آواز لگائی "ادب سے تعظیم سے مجرا بجالاؤ۔ حضرت بادشاہ سلامت" شہزادوں نے تلواریں میان سے نکال سلامی دی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجالائے بادشاہ سلامت کے بعد ولیعہد بہادر۔ مرزا شاہرخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے۔ ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا۔ دوسرے نے سورج مکھی لی۔ اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی مثل بندھی ہوئی تھی سب سے آگے نشان کا ہاتھی۔ اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک[3] سواروں کا رسالہ۔ رسالہ کے بعد روشن چوکی کے تخت۔ تختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے۔ مرزا فخرو کا بوچہ۔ مرزا شاہرخ کا تخت رواں۔ مرزا دارا بخت کا تامجھام۔ ان کے پیچھے دور[4] باش اور دور باش کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا۔ آخر میں قلعہ کے نوکر، چاکر، بہیر و بنگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلیوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ[5] کے دلی دروازہ سے جو مثل بندھی تو پرانے کوٹلہ پر جاکر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا "حضرت پیرو مرشد۔ ہمارا حق بھی ملجائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے آمین۔ اور صدہا سال یہ سایہ دلی والوں کے سر پر قایم رکھے آمین۔ خدا شہزادے

---

[1] بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گڑ کا شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا

[2] قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرانیکی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ ایک یہی شخص تھے جنکو دربار میں جریب لیکر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آداب شاہی میں اینچ پینچ کی اور انہوں نے کھٹ سے جریب پاؤں پر ماری۔ یہ خدمت سعادت یار خاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی ہے

[3] دلی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا

[4] دور باش ایک خوبصورت رنگین شہتیر ہوتا تھا جس پر برچھیاں لگی ہوتی تھی۔ یہ سواری کے آگے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کر بیٹھے

[5] قلعہ کے دو دروازے ہیں۔ لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ۔ شہر پناہ کے دو دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باولی کے کنارہ پر تھا۔ وہ تو زمین کے برابر کر دیا گیا۔ ہاں دلی دروازہ موجود ہے۔ فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں سے ہوکر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے

شہزادیوں کو سلامت رکھے آمین۔ سیر آرہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقہ میں سیر کی بہار دیکھ لیں" بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا۔ خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپئے ہوادار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا۔ روپیوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے۔ کسی نے ہاتھ پھیلائے کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا۔ جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے تو شہدے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔ اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہوگئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائے گی رات کے بارہ ہی بجے سے خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے چھتوں اور کمروں پر ہزاروں عورتیں بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لئے بیچین تھا۔ وقت کم تھا، اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوئی تھی، ہاں، بعض بعض مکانوں کے دروازے۔ کمروں کے رو کار اور دوکانیں سجا کر روشنی کر دی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گذرا ایک سناٹے کا عالم تھا۔ مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ایک پھریری سی آئی۔ اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ آئے۔ کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گذریں گے کہ اسی سڑک پر سے گذرنا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہوگی۔ دلی والے تباہ ہوں گے۔ گولوں کی مار سے مکانات مسمار ہوں گے اور بیگناہوں کے خون سے زمین رنگین ہوگی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں داخل ہونا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ خود قید ہوں گے۔ چاروں طرف جنگی پہرہ ہوگا بیٹوں۔ بھانجوں، اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہونگی۔ محل ویران ہوں گے۔ اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہونگی اور کس حالت میں ہوں گی

غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گذر کر دلی دروازہ پہونچی۔ محافظوں نے سلامی دی۔ اور یہ جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پر پڑ لیا جو زنانہ سواریاں پہلے روانہ ہو کر یہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہوگئیں۔ کہاروں نے یہاں سے قدم ذرا تیز کر دیے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہونچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی، اور ابھی دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہونچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہوگیا۔ سواریاں اتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاریوں نے سنبھال لیا۔ اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہوگیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے۔ وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سیکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شاہزادے ساتھ تھے۔ سب کو ایک ایک قبر دکھاتے۔ نام بتاتے انکے کارنامے سناتے اپنی اور انکی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار روتے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا۔ اسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہونچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہوسکتی۔ کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی

---

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں انکا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں مقبرہ کے بالکل سامنے ہے

نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا، ہوادار باولی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اتر کر وضو کیا۔ شہزادوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ شہزادیوں کے لئے باولی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئی تھی۔ کسی نے وضو کیا۔ کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر۔ ہوادار میں آ بیٹھے۔ اردابیگنی نے عرض کی "جہاں پناہ، باولی میں تیرنے کے لئے خداموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے؟" فرمایا "ہاں اماں۔ ہاں۔ بلاؤ۔ وہ حقدار ہیں اپنا حق لینے آئے ہیں کیوں نہ ملے گا حضور ملیگا"۔ حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آئے۔ مجرا بجالائے۔ اجازت چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شہزادیوں نے باولی میں روپے پھینکنے شروع کئے۔ ادھر روپیہ گرا۔ اُدھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی۔ اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے حضرت امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پر آئے۔ بادشاہ سلامت تو اندر چلے گئے۔ عورتوں نے گنبد شریف کے دروازے پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ کسی نے زنجیر پکڑ کر دعا مانگنا شروع کی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لے کر منہ پر ملی۔ کسی نے گود پھیلا کر دل ہی دل میں دعا مانگی۔ کوئی فاتحہ پڑھ پہلو کی مسجد میں جا نفل پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ کسی نے مسجد میں کلام مجید کی تلاوت شروع کی۔ کسی نے مسجد کے کٹورے کا قصہ شروع کیا "دیکھنا بوا۔ یہ کٹورہ سونے کا ہے۔ بڑا بھاری ہے۔ کئی سیر کا ہوگا۔ یہ سامنے جو تسبیح خانہ ہے۔ اسمیں بھی ایک ایسا ہی کٹورہ لٹکا ہوا تھا۔ ———

دادا جان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی یا حضرت سات بیٹیاں ہیں۔ کھانے کو پیسہ پاس نہیں۔ یہ پہاڑ کیونکر اٹھیں گے۔ آپ ہی یہ مشکل آسان کیجئے۔ وہاں سے اٹھ جو تسبیح خانہ میں آئی۔ تو کٹورہ گنبد سے اتر اس کی گود میں آ گیا۔ خوشی خوشی گھر آئی۔ بڑی دھوم دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دلی کے ایک امیر تھے انکو جو یہ خبر ہوئی۔ تو انہوں نے بھی درگاہ شریف میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے بڑی دیر تک کٹورے کو دیکھتے رہے۔ کٹورہ جہاں تھا وہیں رہا۔ جل گئے۔ مزدوروں کو بلوا پاڑ باندھی۔ جتنی پاڑ اونچی ہوتی۔ کٹورہ اونچا ہوتا جاتا۔ پاڑ گنبد کی چھت تک پہونچی تو کٹورہ غائب ہو گیا۔ ادھر پاڑ کھلی کٹورہ اپنی جگہ پر آ موجود ہوا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ کٹورہ تو کیا ملتا۔ پاڑ باندھنے کا خرچ مفت گلے پڑا۔"

بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو۔ درگاہ شریف سے باہر آئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مزار۔ مرزا جہانگیر[1] کے مزار۔ مرزا نیلی[2] اور جہاں آرا[3] بیگم

[1] مرزا جہانگیر وہی شہزادے ہیں جنکی وجہ سے پھول والوں کی سیر قایم ہوئی تھی۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے پھر بے اعتدالیاں کیں پھر الہ آباد بھیجد یے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ نواب ممتاز محل نے انکی لاش الہ آباد سے دلی منگوائی اور سلطان جی میں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا حجرہ بنوا دفن کردی۔

[2] مرزا نیلی شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ انتقال کے بعد انکو بھی مرزا جہانگیر کے حجرہ میں دفن کیا گیا۔

[3] جہاں آرا بیگم شاہجہاں بادشاہ غازی کی بیٹی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی۔ انکا مزار درگاہ کے پائنتی

(باقی آئندہ صفحہ پر)

کی قبر پر گئے۔ فاتحہ پڑھی۔ یہاں سے پھر باولی پر آئے۔ خادموں کو انعام دیے۔ فقیروں کو خیرات تقسیم کی۔ اور وہاں سے نکل منصور کے مقبرہ کی سیدھی سڑک پر ہولئے۔ یہاں دو ڈھائی گھنٹہ آرام کیا۔ خاصہ تناول فرمایا۔ کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہو۔ شام ہوتے ہوتے قطب پہونچ گئے۔ جنگلی محل اور مرزا بابر[1] کی کوٹھی پہلے سے آراستہ تھی جو سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں انہوں نے سب سامان قرینہ سے جما دیا تھا۔ خاصہ تیار تھا۔ دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے۔ کھا۔ پی۔ نماز پڑھ ایسے سوے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی اسوقت کہیں جاکر آنکھ کھلی۔

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے۔ ہاں کسی زمانہ میں بڑا عمدہ محل تھا۔ پہلے ہی کچھ کم پرانا تھا۔ بہادر شاہ نے دیوان خاص دیوان عام۔ خاص محل اور باب ظفر بنوا کر اسکو اور بڑا کر دیا۔ دروازہ کیا ہے خود ایک چھوٹا سا محل ہے۔ سرتاپا سنگ سرخ کا ہے۔ روکار پہ سنگ مرمر کی پٹیاں۔ حاشیہ اور پھول دیکر اسکی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ دروازہ کی بلندی کوئی ۱۶-۱۷ گز ہے۔ پہلو میں سیڑھیوں کا چکردار زینہ ہے۔ محراب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے۔ یہیں سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت اور بیگمات پنکھوں کا تماشہ دیکھتے تھے۔ دروازہ سے ملا درگاہ شریف کا دروازہ ہے جھرنے سے پنکھے اوٹھ کر ادھر آتے۔ پہلے دن جوگ مایا جی کا پنکھا اٹھتا۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا۔ درگاہ شریف کا پنکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف پر چلا جاتا۔ جوگ مایا جی کا پنکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رکتا اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا مندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر کا حصہ دیکھنے کے قابل ہے بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ ہر ڈیوڑھیوں پر پہرہ داروں کے لئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں پھاٹک پر تو دگلہ پلٹن کا پہرہ رہتا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[2]۔ قلماقنیوں[3]۔ اردابیگنیوں[4]۔ شدنوں[5] اور گرجنوں[6] کی نشست ہوتی۔ بھلا کیا

ایک سنگ مرمر کے حجرے میں ہے۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ کا یہ شعر بڑا دردناک ہے :

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا　　که قبرپوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

[1] مرزا بابر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ انکی ایک بڑی کوٹھی انگریزی وضع کی ابتک قطب میں موجود ہے۔ اسکا ایک دروازہ تو درگاہ شریف میں ہے دوسرا جنگلی محل میں۔ اور تیسرا جنگل میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے۔

[2] آخر زمانہ میں ترکستان۔ حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد بند ہو گئی تھی۔ پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انہیں میں سے یہ پلٹنیں بھری جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں انکا کام محلوں میں پہرہ دینا تھا۔

[3] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہونچانے پر مقرر تھیں۔ انکے لباس کا ذکر اوپر آچکا ہے ان عورتوں کو شادی کرنا حکماً ممنوع تھا۔

[4] اردابیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام باہر پہنچاتی تھیں۔ انکا صرف مردانہ لباس ہی نہ ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھری کھری زبان میں کرتی تھیں۔ تھیں تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں۔ دلی میں انکو "ہرد ابیگنیاں" کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑی شریر اور ڈھنگی ہوں اور جن پر سودا کا یہ شعر صادق آتا ہو۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے　　نہ کہ لونڈوں میں جاکے ڈنڑ پیلے

تھا کہ محل میں پرندہ پر تو مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی الٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے مردانہ کو راستہ جاتا تھا غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا۔ اور پھر بھی جگہ رہتی۔ اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوگئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہوگا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی رو کار پر کندہ ہے۔

این در عالی چو شد بکرم بنا حسب المراد

گفت دل۔ سال بنا۔ باب ظفر پائندہ باد

سنہ ۱۱ جلوس ——— ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندر کے محلوں کا۔ وہ تو محکمہ آثار قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لے کر سنبھال لیا

خیر تو صبح کی نوبت بجی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل نماز پڑھ ناشتہ کر سب شہزادے شہزادیاں بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب تھا کہ چلئے۔ یہاں بیٹھے تھوڑی آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہوکر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "کہو اماں۔ کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹ کا" سب نے عرض کی "پیر و مرشد۔ پہلے جھرنے تشریف لے چلئے۔ ابر آیا ہوا ہے۔ اس وقت جھرنے پر بہار ہوگی" فوراً اردابیگنی کو پردہ کرانے کا حکم دیا گیا۔ دو گلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردابیگنیوں اور قلماقنیوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ شدنیں اور گرہنیں بیگمات اور شہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں۔ اصیلوں۔ خواصوں اور سہیلیوں کا غول کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا بابر کی کوٹھی میں سے ہو جنگل میں نکل گئیں۔ پہلے جہاز[1] پر جاکر ذرا دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ برجی[2] بیچ میں آگئی تھی۔ پانی کا یہ عالم دیکھ کر بہتوں کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں ترنا ٹھیک نہیں۔ چپکی ہو رہیں۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھیر کر سب کے سب اولیا[3] مسجد پہونچے۔ مصلوں پر نفل پڑھے، اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ شہزادے ساتھ تھے۔ آگے آگے سواری چلی۔ پیچھے پیچھے عورتوں کا یہ غول روانہ ہوا۔ اولیا مسجد سے جھرنہ دور ہی کتنا ہے۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں ہو نچے۔

---

[1] شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں

[2] اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا برج ہے اور برج کے نیچے ایک سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے۔ اس سم کے نشان کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور ہیں۔ عام طور سے اسکو براق کا سم کہتے ہیں۔ کنارے سے برجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں

[3] یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے۔ صحن میں دو مصلے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان مصلوں پر حضرت معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نماز پڑھا کرتے تھے

جسنے پہلے زمانہ کا جھرنہ نہیں دیکھا۔ اس نے دلی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹکر مہرولی[1] میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لئے تھا اور ہو کیا گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھکر اسکا پانی نوکھی نالہ میں ڈالا تھا۔ اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا۔ تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہوگیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھکر سنہ ۱۷۰۰ء میں نواب[2] غازی الدین فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے۔ نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کردیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں۔ دالان اور مکانات بن گئے چار دیواری کھینچ گئی۔ درخت بڑھکر جھرنے پر چھتر ہوگئے۔ اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ کی کچھ ہوگئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اس لئے اس مقام کا نام جھرنہ ہوگیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ درہ دالان ہے وہ ہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے چھت میں درزیں چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اسطرح گرتا ہے گویا دالان میں مینھ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے۔ اسمیں چراغ رکھنے کے لئے سیکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگادی ہے۔ یا سونا پگھل پگھلکر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر کے نیچے ۱۳ پرنالے ہیں۔ پرنالوں میں سے ہوکر پانی چھجہ پر آتا ہے چھجہ کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی چھجہ پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہورہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی۔ ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی ابل کر اس نہر میں آتا ہے۔ جہاں نہر ختم ہوئی ہے، وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر سی بنادی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی نبت کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چلکر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈوے کے نیچے سے چلی گئی ہے۔ اور چھوٹی دونوں نہریں چلکر کھاکر منڈوے کے دونوں طرف سے چار دیواری کے باہر نکل جاتی ہیں۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگاکر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی دلی کا بادشاہ ہوگا جس نے جھرنہ میں کوئی نہ کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔ خود بہادر شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا[3] بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف پنج درہ دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی نے

---

[1] مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں۔ یہ دلی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہوگئی تھی۔ وہ قطب کے عاشق تھے۔ جہاں ذرا ابر آیا اور انکی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ ابر ہمارے قطب جانیکا نقیب ہے۔

[2] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہان دھلوی کے وزیر اور آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنہوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

[3] اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹیاں لگاکر اوپر پھولونکی بیلیں چڑھادی ہیں پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے

شمال کی جانب دھر دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنہ کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنہ کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلنا پتھر" دوسرے امریاں "پھسلنا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی جدت پسند طبیعت کی یادگار ہے۔ یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ۲ ۱/۲ گز چوڑا ہے۔ اور جھرنہ کی مشرقی دیوار سے ملا کر اسکو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا ہے کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا۔ پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا سیر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہو جاتا ہے۔ اسی پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر کہا ہے۔

میں کہاں سنگ در یار سے ٹل جاؤنگا کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا۔ جھرنہ کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ جھرنہ کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں۔ اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ادھر انکی سبزی۔ ادھر نیچے گھاس کی سبزی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنہ میں چادروں کا گرنا۔ فواروں کا اچھلنا۔ پانی کا بہنا اگر "جنت نگاہ" ہے تو امریوں میں موروں کی جھنکار۔ پپیہے کی پکار۔ اور کوئل کی کوکو "فردوس گوش" ہے۔ غرض جھرنہ ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں نیا لطف دکھاتا تھا۔ اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اب اسکی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ چھنٹ کر حوض بنگیا۔ بند اس سے دور جا پڑا۔ پانی کا رسنا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہوگئیں۔ حوض ملبہ سے اٹ گئے۔ درخت سوکھ ساکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ہوگیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئیں ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ لگے گا۔ اس کے بعد جھرنا اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائیگا۔ سچ ہے :-

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

تو ہاں۔ بادشاہ سلامت کے جھرنے پہونچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی ہنگورا کھڑا کر اسمیں مسند بچھادی۔ ہوادار ہنگورے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اتر اسمیں جا بیٹھے۔ دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دو نے آہستہ آہستہ ہنگورے کو ہلانا شروع کیا تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کھواصاں۔ کیا ارادہ ہے۔ اب تیرنا ہوتا ہے یا جھولا جھولنا۔ اچھا کچھ جھرنہ میں رہو۔ کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اٹھاؤ اور وہاں کا بھی مزا دیکھو۔ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں" یہ کہہ بادشاہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے سب انتظام ہو گیا تھا۔ ایک طرف

لہ قلعہ میں شہزادے اور شہزادیاں دونوں کو مردانہ فن اور کرتب سکھائے جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہوگا جس کو تیر چلانا تلوار مارنا۔ بندوق چلانا۔ سوار ہونا اور تیرنا نہ آتا ہو۔ بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی کو دیکھ لو آدھا قلعہ نہروں اور حوضوں نے گھیر لیا ہے

بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے تھے۔ دوسری طرف شہزادیوں کے لئے دری۔ چاندنی اور قالینوں کے فرش کر کے تکیے لگا دیے گئے تھے۔ درختوں میں بیسیوں جھولے پڑ گئے تھے۔ پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ کب حکم ہو اور کب جھولوں پر جائیں۔ بادشاہ نے فرمایا "واہ۔ جی، واہ خالی جھولا کیسا، کڑھائی چڑھاؤ۔ جھولتے جاؤ۔ کھاتے جاؤ۔" تاج محل[1] نے عرض کی "جہاں پناہ ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں۔ حکم کی دیر ہے ابھی سب کچھ ہوئے جاتا ہے۔" یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر ہی کھڑی تھیں۔ ذرا سی دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آ گئیں۔ درختوں کی جڑوں میں چولھے ناگت گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آ گئی۔ اب ہے کہ کوئی تو بیٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ ملا رہا ہے۔ کوئی سہال اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسے کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے۔ کوئی چھاج پر کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا۔ جب سب سامان سے لیس ہو گئے۔ تو ایک نے بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی "حکم ہو تو کڑھائی میں گلگلہ پڑے۔" فرمایا "نہیں اماں، ابھی نہیں جھولوں پر لوگ بیٹھیں اسوقت پکوان شروع ہوں۔" یہ کہہ نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی ہاں زینت محل کی کچھ نہ پوچھو۔ عجیب قبول صورت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں۔ انکی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے ان سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سرخ و سفید تھی جیسے گلاب کی پتی۔ یا شہاب اور میدہ۔ کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اس کمی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں سر پر تاروں بھرا گلنار دوپٹہ۔ جسم پر سرخ انگیا۔ کرتی۔ بادلے کلی کا سبز زربفت کا پیجامہ۔ موتیوں جڑی گھیتلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ دانتوں میں مسّی۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پرستان کی پری امریوں میں اتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔ تاج محل نے زینت محل کو برے برے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا۔ اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پٹریاں تھیں۔ دونوں اٹھ اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے تاج محل نے جھونکے لینے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ جی۔ واہ۔ ایسا سوتا جھولا ہمکو تو پسند نہیں۔ بی ترمنھی[2] خانم اور دلدارا کو بلاؤ۔

[1] نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا۔ تھی تو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اسکو محل میں داخل کیا تھا اسوقت سے بادشاہ اسکی مٹھی میں آ گئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتا تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اسکا کفر توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی۔ اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

[2] میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کی املا ہے۔ ترمنھی کے معنی ٹیڑھے منہ والی۔ لقوے سے اسکا منہ ذرا پھر گیا تھا جو املا میری سمجھ میں آئی وہ میں نے لکھدی۔ جو آپکی سمجھ میں آئے وہ پڑھ لیجئے۔ ترمنھی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا گنیاتے تھے۔ آخر اس سے لڑ کر نکل گئے۔ بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہی گاتی تھی۔ دلدارا اسکی چھوٹی بہن تھی دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں۔ بڑی بہن کی نواسی دونی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان، ابتک دلّی میں موجود ہیں

بھلا بیگمات جھولیں اور یہ دونوں جھرنے میں گھسی رہیں" یہ سنتے ہی دو وارد ابیگنیاں جا دونوں کو جھرنے میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بیچاریاں جھرنے میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شور بور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں۔ مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا "آؤ۔ اماں۔ آؤ قطب کی بہار یہی ہے" تو اسوقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے نچوڑتی ہوئی دونوں جھولے کے ادھر ادھر کھڑی ہوگئیں۔ اور شہزادیاں بھی آواز ملانے لگیں۔ ادھر انہوں نے ملار شروع کیا اور ادھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ بی ٹر منھی خانم اور دلدارا تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں مگر شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ ان سے کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید ہی کوئی محل والی ہوگی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لئے نوکر تھے۔ تاج محل اسی لئے محل میں آئیں۔ بی ٹر منھی خانم اور دلدارا کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا:—

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

رین اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنکارے۔ بادل کارے۔ بوندیاں پڑیں پھُنیاں۔ ٹھُنیاں۔

جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھلائیں۔ چار مل گیاں۔ بھول بھلیاں۔ جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

وہ نور کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں۔ وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی۔ وہ سہانا وقت۔ بچے بچے اور ٹہنی ٹہنی سے "جھولا کن ڈارو رے۔ امریاں" کی آواز آرہی تھی۔ مور درختوں سے اتر جوش میں آسامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ غرض ایسا سماں بندھا کہ ایکدفعہ ہی فراٹے سے مینھ کا چھینٹا آیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا " واہ۔ اماں۔ واہ۔ قطب میں مینھ سے بھاگتے ہو۔ بھادوں کا چھینٹا ہے۔ ابھی برسا۔ ابھی نکل گیا۔ ہاں بی دلدارا۔ کوئی اور چیز ہو جائے۔ اور ہاں تم سب لوگ ایک ہی جھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو۔ دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ۔ بجاؤ۔ کھاؤ۔ پیو۔ کچھ لطف اٹھاؤ" یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کر لیا جو باقی رہ گئے ان پر شہزادیاں ہو بیٹھیں۔ جب ذرا ہیاں چھیڑ ہوئی تو دلدارا نے دوسری چیز شروع کی۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن تیرے ساتھ

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے بین۔ بانسری۔ جوگیا بجائے بین۔ بانسری۔ جوگن گائے ہے ملار۔ سنو سکھی سیاں ——

جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے بدیس۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے ——

جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے۔ جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔

اب کیا پوچھتے ہو۔ گرم گرم پکوان آرہا ہے۔ کھا رہے ہیں جھولا جھول رہے ہیں۔ کوئی اندرسہ کی گولیاں منہ میں دبائے ہے۔ کسی کے منہ میں سُہال کا ٹکڑا ہے۔ کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رکا جاتا ہے۔ مگر ملار ہے کہ چل رہا ہے۔ مینھ برس کر نکلگیا تھا۔ پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند کڑاہی میں گری تیل اڑا اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے "اوئی" کی آواز نکلی۔ کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا تو کسی کے منہ پر۔ کوئی تو "اوئی توبہ ہے" کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کلہ سہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسروں نے پھر پکڑ یہ کہہ بٹھلا لیا "واہ بوا نوج کوئی ایسا نازک بنجائے۔ چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑھائی چھوڑ کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا"۔

بچوں کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔ پکوان کی سب سے زیادہ کھپت یہیں تھی۔ دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے۔ باقی پر لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پٹریاں ڈالے پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔ وہ بے سرا ملار چل رہا تھا کہ واہ جی واہ۔ کسی کی تان کدھر جاتی تھی کسی کی کدھر۔ لڑائی بھی ہوتی جاتی تھی۔ کہ "لو بوا بس اترو۔ بہت جھول چکیں اب ہماری باری ہے"۔ لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا گیت بھی بڑے مزے کا تھا۔ ذرا سنئے:-

اماں۔ اڑہ جا من گھلے دھرے ——— اماں۔ میں نہیں کھاتی میری ماں

اماں تتّا پانی بھرا دھرا ——— اماں۔ میں نہیں کھاتی میری ماں

اماں۔ دھانی جوڑا اسلا دھرا ——— اماں۔ میں نہیں پہنتی میری ماں

اماں۔ بھائی بھاوج ملن کھڑے ——— اماں۔ میں نہیں ملتی میری ماں

غرض پھوپھا۔ پھوپھی سے لگا ماماؤں اور ناناؤں تک سب ملنے کو کھڑے ہیں۔ مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر تان اس پر ٹوٹتی تھی کہ:-

اماں ساجن ڈولا لئے کھڑا ——— اماں۔ میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا۔ اور وہاں جھرنہ پر کچھ اور ہی بہار تھی۔ بادشاہ سلامت جھرنہ سے نکل ادھر امریوں میں آئے اور ادھر شہزادیوں نے کواڑ بند کر ڈھیلے پائجامے اتار تنگ پائجامے پہن دھم سے جھرنہ میں غوطہ مارا۔ کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ کوئی تیر رہی ہے۔ کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے لڑا رہی ہے۔ نیچے اُتھل نہروں میں کھڑے ادھم مچا رہے ہیں۔ کچھ حوض کے سہ درہ دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں کچھ پہلوی تہہ سے پھسل رہی ہیں۔ نیچے گر کر قلابازیاں کھاتی ہیں۔ کیچڑ میں لت پت ہوتی ہیں۔ حوض میں آکر کود پڑتی ہیں ——— نہانے والیاں غل مچاتی ہیں "نکلو جی۔ نکلو۔ سارا پانی گدلا کر دیا"۔ غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کیا تھا۔ سب پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ ادھر ان کے کپڑے لینے گئیں اور وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔

بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوائے۔ جھرنے کے دروازے کھل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے۔ بھور بہت جھولا جھولا۔ پکوان کھایا، اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنے سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روز افزوں نے بنوایا تھا۔ امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے۔ دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پئے تاریخ سالش گفت ہاتف خدایا ئے بود با اللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چار دیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگ سرخ کی چار بارہ دریاں اور بیچ میں ایک بڑی خوبصورت عالیشان بارہ دری ہے۔ بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں جھرنے کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں تھوڑی دور نہر گئی۔ اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصہ ہو گئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کے لئے پختہ روشیں ہیں اس کے بعد گھانس کے تختے۔ ان درختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا۔ آم کے درختوں پر بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملنی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے آدھے پھینکے گٹھلیاں چلیں چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے۔ کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آکے بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا کرنے کو بیٹھ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں دسترخوان بڑھ گیا۔ اس کے بعد سب ہیں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی جھرنہ امریوں اور باغ کے پھیر میں گذر گیا۔ شام کو جنگلی محل میں آن کر دہ لمبی تانی کہ صبح کی خبر لی۔

دوسرے دن قطب صاحب لاٹھ۔ علائی دروازے[1]۔ امام ضامن کے مقبرے۔ بھیم کی چھٹنکی[2]۔ کڑوے[3] میٹھے نیم۔ اور بارہ بادشاہوں[4] کی

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاء الدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خوبصورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

[2] مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر۔ پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ بچہ بھی ہلائے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑے گا۔

[3] چھٹنکی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہیں۔ کہتے ہیں رائے پتھورا کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی اسکی قبر پر بھی اس نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے درخت کا جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے اس کے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

[4] یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔

قبروں کا چکر رہا تیسرے روز چہل تن چہل من[۵۱] کا دلی کے قلعہ جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا باغ کی سیر کی غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا تھک کر چور ہوگئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑگئے۔ جب کہیں جا کر تھل سے بیٹھے۔ چودھویں تاریخ بھی آگئی تھی معرف جنگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی باقی سارے قطب پر دلی والوں نے قبضہ کرلیا۔

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اسمیں ذرا تیزی آجاتی ہے۔ ادھر تاریخ مقرر ہوئی اور اُدھر کارخنداروں (کارخانہ داروں) کے ہاں پتی پڑی۔ حسب مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہوگیا۔ اب رہے دوسرے خرچ وہ تم جانو اور تمھارا کام جانے۔ جی چاہے اوڑھا دجی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ سے لگا قطب تک دوکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جارہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ مخمل کی بُرجی اس پر زردوزی کے پھول۔ اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے پردے۔ مقیش کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ سفید براق بیسے۔ اُس پر رنگین بیل بوٹے ناگوری بیل۔ اُن پر زردوزی کام کی جھولیں گلے میں چاندی کے گھنگرو سینگوں پر سنگوٹیاں۔ ڈوریوں کی ناتھیں اندر بناؤ سنگار کئے رنڈیاں بیٹھی ہیں۔ ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دوسری آئی نکل گئی۔ دلی کے شرفا۔ گھوڑوں پر سوار۔ مخمل کے کارچوبی زین پوش۔ لیسیں ٹکی ہوئی لگامیں گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے کی رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے ہوئے سائیس۔ ان کے صاف شفاف کپڑے چھوٹی چھوٹی سُرخ پگڑیاں ایک ہاتھ میں باگ ڈور۔ دوسرے میں جوھری سوار ہیں کہ شہسواری کے انداز دکھاتے چلے جارہے ہیں۔ غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے صرف ایک تہمت[۵۲] بندھی ہے۔ نہ جسم پر کرتہ ہے نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا مٹکا سر پر اوندھائے سرپٹ اُڑے جارہے ہیں اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اس مٹکے میں ہے۔ تنخفہ کپڑے ہیں لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے۔ لیو اس سلیم شاہی جوتہ ہے روپے ہیں۔ پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لئے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے ترکیب اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور مٹکہ قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح کو جو ریلیں لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جاکر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہوگئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں کوئی مرد یا

---

۵۱ اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی طرح گنتی میں نہیں آتے بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہوجاتی ہے۔

۵۲ چہل تن چہل من کے پاس ہی ایک ویران عمارت ہے سنتے ہیں کہ رات کے وقت اسمیں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

۵۳ اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ شمسی تالاب کے جنوبی کنارہ پر اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گہرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے گھنا ایسا ہے کہ دن کی دھوپ بھی مشکل سے اسکے پتوں میں سے چھنتی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں خیر جو تھا سو تھا اچھی گزار گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہ رُخ کا مزار باغ کے عین بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ اب باغ کسقدر چھدرا ہوگیا ہے

۵۴ لفظ تو "تہ بند" ہے اس سے تہمد ہوا۔ پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک ابرو کا شعر ہے۔

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئی کس کی کمر　　　　خون کرنے کو چلے عاشق یہ تہمت باندھکر

یا بچہ رد گیا ہو - اب ہی عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی - سبزی منڈی نکل گئیں - باغوں کی سیر کی - جھولے ڈالے - کڑھائیاں چڑھائیں - آم کھائے - حوضوں میں نہائے - غرض دل کے پورے ارمان نکال لئے - شاہی حکم تھا کہ سرکاری باغ میں دلی والیاں جائیں جانے دو پردہ کرادو - سپاہی پہرے لگادو - کہ کوئی مرد اندر نہ جاسکے - آگے یہ جائیں اور باغ جانے - انھوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا - آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے - دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے -

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کونے تلاش کئے - بھلا - قطب میں ٹھہرنے کیلئے جگہ کی کیا کمی تھی - سرکاری ڈیرے تھے - شاہی مکانات تھے - مقبرے تھے - پرانے کھنڈر تھے - امرا تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے - روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے وہ کرایہ پر لے لئے - غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے - کچھ جھرنے میں جا ٹھہرے - کچھ ناظر کے باغ میں اتر گئے - لیکن جنکو قطب کا لطف اٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا - مینہ برستا ہے برسنے دو یہی قطب کی بہار ہے

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو - اس سرے سے اس سرے تک سارے کا سارا آئینہ بند تھا - دنیا بھر کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئی تھیں - میوے مٹھائیوں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا - ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں - کچوریاں - بیوڑیاں - سہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے - تو دوسری طرف کبابوں - پراٹھوں - بریانی - مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا - گاہک ہیں کہ ٹوٹے ہیں - لیا - کھایا - پیتے وہیں پھینک آگے بڑھے - پنواڑن کی دوکان پر پہونچے - بی پنواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے - کنگھی کئے - آنکھوں میں سرمہ لگائے - دانتوں میں مسی ملے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں نسی پان لال لال صافوں میں لپٹے سامنے دھرے ہیں پان بن رہے ہیں مذاق ہو رہا ہے یار لوگوں نے پان لے خود کھائے دوسروں کو کھلائے پیک تھوکی آگے بڑھے پھول والوں کی دوکان سے گجرے لئے گلے میں ڈالے ساقی کے پاس ٹھہر کر دو دم حقے کے مارے ایک پیسہ دے آگے قدم بڑھایا ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے حقہ کیا ہے ایک تماشہ ہے - کوئی گز بھر اونچا نیچہ - اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آئے - نے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے - نے کو سنبھالنے کے لئے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں - نے پر خس چڑھا ہے - اوپر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں - گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں - خود بھی سفید کپڑے پہنے - سبز بنارسی سیلہ باندھے - لال ٹپکا لپیٹے - کھڑے حقہ پلا رہے ہیں سکو ٹھے والوں کو پلانا ہوا تو نے سیدھی کر دی - انھوں نے بھی دو کش کھینچ لئے - ادھر کسی نے مہنال پر ہونٹ رکھے اور انھوں نے شعر پڑھنے شروع کئے -

حقہ جو ہے حضور معلی کے ہاتھ میں — گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا - اتنا بھرا - کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی - تھالی پھینکو تو سروں پر جائے - مغرب کی نماز کے بعد ہی جھرنا سے نفیری کی آواز آئی سمجھئے پنکھا اٹھا - اب ہر شخص ہے کہ جھرنا کی طرف چلا جا رہا ہے - کچھ جا رہے ہیں - کچھ واپس آرہے ہیں - ریلے پر ریلا پڑ رہا ہے - جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہ رہے ہیں - جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہکر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ "ارے بھئی - جانے بھی دو کون اس بلا میں پڑے - آگے چلکر پنکھا دیکھ لینگے -

پنکھا جھرنا سے اٹھا شمسی تالاب سے ہوتا ہوا - مہرولی کی سڑک پر آیا - یہاں پہلے ہی سے مشعلیں - لالٹینیں - گلاس - ہانڈیاں -

فانوس اور دیوارگیریاں جل چکی تھیں - روشنی اتنی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے - اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گزرنا شروع ہوا - آگے آگے ڈھول تاشے والے روپہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں کسی کے گلے میں ڈھول کسی کے گلے میں تاشہ - ہاتھوں میں چوبیں دھوں دھوں کرتا آگے گزرا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے - ان کے پیچھے دو جھنڈے - زربفت کے پھریرے مقیش کے پھندنے - کلابتون کی ڈوریاں جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لالٹینیں - ایک لالٹین کے سرے پر سنہرا ہلال - دوسرے پر روپہلی چکریاں ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا اردلی میں پولیس والوں کا پرا - ان کے پیچھے نوبت خانے کا تخت تخت کیا ہے - خاصی بارہ دری ہے تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر اوپر کھپچیوں کا نصف گنبد بنا - کپڑا منڈھا پنی لگا - کاغذوں کے پھولوں سے سجا - دروں میں گیندئی پردے ڈال - ڈوریوں سے کس دیئے - نوبت والے اندر جا بیٹھے - تخت کو کہاروں نے اٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا - نوبت خانے کے پیچھے دلی کے اکھاڑے - ہر اکھاڑہ کے ساتھ ایک ایک استاد - بیس بیس پچیس پچیس شاگرد - بنے ہوئے تیار جسم - چوڑے چوڑے سینے - بھرے بھرے ڈنڑ - بھری ہوئی مچھلیاں - پتلی پتلی کمریں - جسم پر چست جانگیے - گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ - کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے - کوئی لیزم ہلا رہا ہے - کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے - کہیں پھری گتکہ سے مقابلہ ہو رہا ہے - کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں - غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے - ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلی کے سقے - سفید براق کپڑے پہنے - لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے - سبز سیلے سروں پر باندھے - ہاتھوں میں منجھے منجلے پیتل کے کٹورے لئے - نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آ رہے تھے - نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے پندرہ بیس کا حلقہ - بیچ میں طبلہ سارنگی والے - تال سُر پر ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجیب مزا دے رہی تھی - ان کے پیچھے تخت رواں - تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری بشوازیں پہنے کارچوبی ڈوپٹے اوڑھے - پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں - ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ - سُرخ بانات کی وردیاں - ان میں سفید بانات کے کف اور کالر - شانوں پر فولادی جال - پاؤں میں کالی برجیس - لُک[51] کے چمڑے کے اونچے بوٹ سر پر سُرخ منڈاسے - ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لئے - گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں - سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور سیلانیوں کا اژدہام - سب کے صاف ستھرے کپڑے - کارچوبی ٹوپیاں - مداخل لگی ہوئی نیچی چولی کے انگرکھے - ایک برے پیجامے - سلیم شاہی جوتیاں - ان کے بعد بچھیرا[52] پلٹن کی چار قطاریں - کم عمر گورے گورے لڑکے - سر پر دھانی منڈاسے - منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں - سبز[53] اطلس کے کوٹ سفید اطلس کی کسی ہوئی برجیس سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے - ہاتھوں میں سبز پھریرے دن کے چھوٹے چھوٹے نیزے - بڑی آن بان سے قدم ملاتے چل رہے ہیں - انکے پیچھے دہلی کے

---

[51] PATENT LEATHER کو دلی میں لُک کہتے ہیں -

[52] شرفاء دہلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی - یہ تو لڑکے مگر غدر میں ہاوٹے کے نیچے سب کٹ کے ڈھیر ہو گئے انکے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے - تاریخ میں اس ادھر آ سکے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے خدا معلوم کیا بات ہے - ہاری ہوئی فوج تھی - شائد اس لئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا -

[53] دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا -

شرفاء اور عمایدکا ہجوم - نیچی نیچی قبائین اور جغے - ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں - مسلمانوں کے سروں پر عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں - ہاتھون مین رنگ برنگ کی جریبین - ہشاش بشاش چہرے - گلون مین پھولون کے کنٹھے - ہاتھون مین مولسری کی لڑیاں - موسم کا لطف اُٹھاتے - میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آرہے ہین - انکے بعد شاہی شہنائی نوازون کا گروہ - نفیری کے کمال دکھاتا - موسم کی چیزین بجاتا - خود بھی اپنے کمال کے مزے اُٹھاتا - پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے - سب سے آخر مین پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والون کا غول -

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو - بانس کی کھپچیون کا بڑا سا پنکھا بنا - پنی چڑھا - آئینے لگا - پھولون سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا - یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور یگانگت کا نشان تھا - جس نے چھوٹے بڑون - ہندو مسلمانون - غربا - امراء - غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی مین لے آیا تھا - یہ پنکھا نہ تھا - بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہرون کا مرکز تھا - اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا - جس مین خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا انکے پروانے

غرض خلقت کا یہ ہجوم پھوار مین بھیگتا - خس کے پنکھے جھلتا آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گزرا - باجہ والے اور نفیری والے ہر کمرے کے سامنے ٹھہرتے - ایک آدھ چیز سناتے - انعام لیتے اور آگے بڑھتے - ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازہ کے سامنے پہنچ گیا بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری مین برآمد ہوئے - بیگمات کے لئے چلمنین پڑ گئین - اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئین پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا - یہان باجہ والون نے اپنے کمال دکھائے - اکھاڑے والون نے اپنے کرتب دکھائے سقون نے کٹورے بجائے - ٹنڈرے والون نے اپنے ہاتھ دکھائے - رنڈیون نے اپنا ناچ دکھایا - سب کو حسب مراتب انعام ملا - کسی کو سیلہ ملا - کسی کو دوشالہ ملا - کسی کو مندیل ملی - کسی کو کڑے ملے - اتنے مین پنکھا بھی سامنے آگیا - شہر کے شرفاء و امراء مجرا بجا لائے - اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشون سے گلاب اور کیوڑا چھڑکا گیا - عطر اور پان سے تواضع کی گئی - بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولیعہد بہادر نیچے اتر آئے - لوگون کے گلون مین پھولون کے کنٹھے ڈالکر سب کو رخصت کیا - یہان سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہوگئے - کوئی بارہ بجے ہونگے کہ پنکھا جوگ مایا جی پہنچ گیا

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈہائی سو قدم پر ہے - بڑی لمبی چہار دیواری ہے - کونون پر چار برجیان ہین - احاطہ کے اندر ۲۰-۲۲ عمارتین ہین - بیچ مین دیوی کا استھان ہے - کہتے ہین کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھین - بجلی بنکر الوپ ہوگئین - اور یہان آن پڑین - راجہ یدہشٹر نے مندر بنوادیا - مندر زمین کے برابر ہوگیا تھا - پھول والون کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیڈمل نے نیا مندر بنوایا - رفتہ رفتہ اور عمارتین بھی اندر بن گئین - اب یہ خاصی آباد جگہ ہوگئی ہے - اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے اندر پلنگ یا چارپائی نہین جاسکتی -

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے - دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اُٹھا -

باب ظفر کے سامنے آکر ٹھہرا۔ بعض مصاحبون نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف مین کسی نہ کسی طرح لے چلین مگر بادشاہ کسی طرح اسپر راضی نہین ہوئے۔ کہا "امان۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جب مین جوگ ملیا جن کے پنکھے کے ساتھ نہین گیا۔ تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤن۔ تمھارے ہندو بھائی کیا خیال کرینگے۔ کہین گے۔ مسلمان تھا مسلمانون کے پنکھے مین شریک ہوگیا۔ ہمکو غیر سمجھا اسلئے جھروکون سے نیچے بھی نہین آیا۔ نا۔ امان۔ نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا۔ ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے۔ اب بھی جائینگے۔ آتشبازی[۱] مین ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہین وہان ہم بھی چلین گے۔

خیر۔ درگاہ[۲] شریف تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہوگئے۔ اور یہان سے نکل سیدھے شمشی تالاب پہونچے تھوڑی دیر مین بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی بیگمات کے لئے جہاز پر چلمنین پڑ گئین۔ وہ اندر جا بیٹھین۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ مصاحبون اور دہلی کے اکثر امرا و شرفا کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارہ جم گئے۔ تالاب مین سینکڑون کشتیان۔ بجرے اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھون مین شاہی آتشباز سوار ہو ایک طرف چلے گئے۔ باقی مین دہلی کے آتشباز اور شوقین بیٹھکر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونون پارٹیان مقابلہ کو تیار ہوگئین۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہوگیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے گئے

---

[۱] مین نے بزرگون کی زبانی سنا تھا کہ بہادر شاہ کو آتشبازی کا بڑا شوق تھا۔ آتشباز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جسمین قلعہ سے آتشبازی نہ جاتی ہو۔ دہلی والون سے مقابلہ ہوتے تھے۔ ان مقابلون کے دو بڑے میدان تھے۔ ایک شمشی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا حوض۔ پھول والون کی سیر مین تو اب آتشبازی نہین چھٹتی۔ ہان سید حسن رسول نما مین اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہین ان بزرگون کے بیانکی تائید ایک کتاب سے بھی ہوگئی ابھی حال مین مسٹر اینڈ روز نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خان دہلوی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اور دہلی کے بڈھون بڈھون سے پوچھ پوچھ کر غدر سے پہلے کے حالات جمع کئے ہین۔ اسمین بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور دہلی والون مین کیا تعلقات تھے۔ اور کس طرح یہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہین کہ مین نے جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا۔ خواہ ہندو ہو یا مسلمان اسکے آنسو نکل آئے۔ یہ نہین معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۲۹ء مین ٹیلبو ہیفر اینڈ سنز لمیٹڈ کیمبرج نے چھاپی ہے۔ اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

[۲] یہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔ آپ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپکا وصال قوالی مین اس شعر پر ہوا۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر ست —— دہلی کے بادشاہون نے آپکے مزار کے گرد سنگ مرمر کی جالیان فرش اور دروازے بنوائے دیوار دن پر کاشانی اینٹون کا کام کرایا اور آس پاس مسجدین اور مسجد تعمیر کرائے۔ خود مزار شریف

اور ذرا سی دیر مین آسمان پر ہزارون چاند اور سورج نکل آئے - ان سے فراغت ہوئی تو جنگی[۵۱] آتشبازی کا نمبر آیا - ہوائیان[۵۲] - چھلے[۵۳] - لٹو[۵۴] اور خدنگے[۵۵] چلے ہوائیون کی شائین - شائین - چھلکون کی غائین - غائین - لٹون کی دہائین - دہائین - خدنگون کی زائین - زائین اور قلمون[۵۶] کی سائین - سائین سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے - ادہر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا - اور ادہر پانی پر آتشبازی بجرے چھوٹے - بجرے کیا تھے - چھوٹے چھوٹے جہاز تھے - توپون کی جگہ مہتابیان اور چھچھوندرین - گولون کی جگہ چکر اور خدنگے مستولون کی جگہ انار - آدمیون کی جگہ مٹن کے سپاہی - پیٹ مین بارود - ناف مین چھچھوندر - اس سرے سے اس سرے تک شتابہ کا سلسلہ - ادہر سے - دلی والون کے بجرے چلے - ادہر سے قلعہ والون کے بجرے آئے - بیچ تالاب مین پہنچکر دہوان دہون ہونے لگی - سمند کی لڑائی کا مزا آگیا -

آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے اور پانی مین روشنی کے عکس کشتیون کے سایہ - آتشبازون کے ننگے ننگے جسم - کنارون پر خلقت کے ہجوم - انکے غل - آتشبازی کے عکس سے انکے زرد زرد چہرون - اور اوپر دہوئین کے بادلون نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ - کچی مٹی کا ہے - ہان آس پاس دوسرون کی قبرون کے بڑے عمدہ عمدہ سنگ مرمر کے تعویز ہین - ایک طرف سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے اور اسکے پہلو مین آخری بادشاہان دہلی کے مزار - بیچ مین شاہ عالم ثانی کا مزار ہے - اور اسکے ایک طرف اکبر شاہ ثانی کی قبر - ایک پہلو خالی تھا - اسمین بہادر شاہ نے اپنا سردابہ بنوایا تھا - خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو مین جا پڑینگے - یہ کیا معلوم تھا کہ وہان قبر بنے گی - جہان بزرگون کا پہلو تو کجا کوئی فاتحہ پڑہنے والا بھی نہوگا -

۵۱ دلی والون نے آتشبازی کو دو قسمون مین بانٹا ہے - ایک جنگی - دوسری گلکاری - ان دونون کا مطلب آگے خود آپ سمجھ جائین گے

۵۲ بڑے ازن انارون کو دلی مین ہوائن کہتے ہین -

۵۳ موٹے مضبوط بانسون کی لمبی لمبی پوریون پر آنتین لپیٹ اوپر سے جھلی چڑہا اور اندر خوب ٹھونس ٹھونس کے بارود بھر کر چکہ بنایا جاتا ہے - اسکا جلانا واقعی بڑا کمال ہے - بارود کو آگ دے اسکو ہلانا شروع کیا - جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دیکر اوپر چھوڑ دیا - اب بانس کی یہ آدہ گز لمبی پوری غائین غائین کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ - اگر چھوڑنے مین کہین ہاتھ بیچارہ گیا اور یہ پوری تماشائیون مین گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی - کسی کی ہڈی ٹوٹی - کسی کا منہ جھلس گیا - کسی کے کپڑون مین آگ لگ گئی - غرض آتشبازی کیا ہے ایک بلا ہے ۵۴ مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے گولے بناتے ہین - یہ اندر سے خالی ہوتے ہین - ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی چھید مین چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی - چلاتے وقت چھچھوندر کو آگ لگا - لٹو کو اوپر پھینک کا - اندر کی بارود نے آگ لی - اور لٹو پھٹا - اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی ۵۵ خدنگ کو دلی والے خدنگہ کہتے ہین - یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہین - ۵۶ بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہین - اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہین پانی کی چوٹ کھا کر بھی اٹھتی ہے تو پچیس تیس گز اونچی اڑ جاتی ہے -

ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیون۔ آفتابیون۔ انارون۔ سہرون۔ چائی جوہیون ــــ ہت پھولون اور چرخیون کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونون طرف کی کشتیان سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آگئین۔ یہان استادون نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ لسری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ لوٹ کر سو سو دفعہ اُٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ ہتاشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائین اور پیچ رنگی پھول دین۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتیلی پر چھوڑ لو۔ کیا مجال جو چرکہ لگے۔ بڑے انار جو اُٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختون کو آگ لگا کر کشتیون مین کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہین دم آتا کہ ختم ہونا ہی نہ جانین۔ کمال یہ کہ کپڑے پر دھبہ نہ دین۔ آتشبازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے۔ اور اسکے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب مین آتشین باغ لگا دیا ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے شال۔ دوشالے مندیلین اور نیلے تقسیم ہوئے۔ کہین تین بجے جا کر لوگون کو فرصت ہوئی سب اپنے اپنے ٹھکانون پر جا پڑے بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی اور روشن[۱] چراغ دہلی ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آگئی۔ دوسرے روز لوگون نے صبح ہی صبح اُٹھ۔ میوے۔ مٹھائیان۔ پراٹھے چھلے[۲] اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھرون کا راستہ لیا۔ شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہو گئی۔

دیکھ لیا آپنے پھول والون کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو۔ غدر ہوا۔ دہلی تباہ ہوئی۔ بادشاہ رنگون پہنچے۔ بندھن ٹوٹ گیا۔ تیلیان بکھر گئین۔ بندھن اب بھی ہے۔ مگر وہ محبت کا بندھن تھا۔ یہ قانون کا بندھن ہے۔ ذرا کچھ بات ہوئی اور چل بسیا عدالت مین۔ بات یہ ہے کہ پھول والون کی سیر رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی۔ مگر مرکز اور یکجہتی نہونے سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔ اگر یہی لیل ونہار ہے۔ اور دلون کی کدورت کا یہی حال رہا۔ تو ہمیشہ کے لئے اسکو بند ہی سمجھو۔

اے مصحفی مین روؤن کیا اگلی صحبتون کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھون بگڑ گئے ہین

مضمون ختم ہو گیا پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل مین خیال پیدا ہو گا کہ یہ واقعات ہین یا کوئی من گھڑت قصہ اسکے متعلق مین

---

[۱] حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کا مزار پرانی دہلی مین ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی ۷ میل۔ آپ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کے خلیفہ ہین اور وہین سے آپکو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا۔ جہان آپکا مزار ہے اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے ہین [۲] پھولوالونکی سیر کی بس وہی سوغاتین تھین۔ ایک پراٹھے۔ دوسرے چھلے۔ آتے اور گھر گھر بٹتے۔

بعض باتون کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہون۔ اس مضمون مین جسقدر تاریخی واقعات یا مکانات کے نقشے ہین۔ انکی صحت مین کوکسی کو شک ہو ہی نہین سکتا۔ البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل مین وگدا پیدا ہو سکتا ہے۔ اسکی یہ کیفیت ہے کہ جھرنے اور امرون کے واقعات کا حال مین نے ان بڑھیون سے سنا ہے جو ان جلسون مین شریک تھین۔ اس زمانہ کی سیر دیکھنے والے اب بھی دہلی مین موجود ہین۔ وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کرینگے۔ جلوس کی تصویر خود مین نے اپنے مصوری کے استاد کے ہان دیکھی ہے۔ مین نے صرف یہ کیا ہے کہ ان واقعات کو ملا کر رنگ بھر دیا ہے۔ اب رہی گفتگو تو وہ البتہ میرے خیال کا نتیجہ ہے۔ لیکن جو تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ مین تھی اسکا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز نہین کہا جا سکتا۔ مسٹر سی۔ ایف اینڈروز کی کتاب "ذکاء اللہ دہلوی" اُٹھا کر دیکھ لو۔ معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ مین نے اس بارے مین لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ مسٹر اینڈروز میرے استاد تھے مجھکو معلوم ہے کہ کس طرح بڈھے بڈھون سے ملکر انھون نے غدر سے پہلے کے حالات دریافت کئے ہیں اور خود ان پر اس تحقیقات کا کیا اثر ہوا ہے

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۲۶۴ھ کا انتخاب کیون کیا گیا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے سنہ ۱۲۶۴ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت چین چان اور امن امان سے گزری۔ اسکے سال بھر بعد ہی سے اس بچارے پر پے درپے مصیبتین آنی شروع ہوئین۔

دارا بخت ولیعہد کا انتقال ہوا۔ مرزا شاہرخ مرے۔ مرزا فخرو چل بسے۔ خود بادشاہ کو زہر دیا گیا۔ جوان بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے۔ قصہ مختصر یہ کہ غدر تک ان مصیبتون نے بچارے بڈھے بادشاہ کو بٹھا دیا۔ اسی خیال سے مین نے وہ آخری سال لیا ہے۔ جب بادشاہ ان تمام فکرون اور مصیبتون سے آزاد ہے

بہرحال بڈھون کی یہ ودیعت تھی جو مینے آپکو پہنچا دی۔ اب چاہین آپ اسکو قبول کرین یا نہ کرین۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

دِلّی کا آخری دیدار

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

زمانے کا ہر قدم آگے کو ہے۔ دلّی سے اچھے شہر بنائے جائیں تو آج بنجائیں۔ اینٹ پتھر ہے۔ کاریگر ہیں۔ پہلے سے زیادہ سہولتیں ہیں۔ مگر کچھ ہو دلّی اصل میں اینٹ پتھر کا نام تھی ہی نہیں۔ یہ بات ہوتی تو کہنے کو حویلی[1]، جامع مسجد، اور سینکڑوں چیزیں باقی ہیں۔ آج بھی یہاں پہلی سی گھما گھمی ہوتی لیکن نہیں اگلے وقتوں کوئی اور چیز تھی جو شہروں کی جان بنی رہی۔ اسی سے دلّی دلّی تھی۔ وہ روح رواں پرواز ہوئی تو سمجھو یہ بے جان ہوگئی۔

دلّی کی جان اس کی آن بان تھی۔ یہ ایشیائی تہذیب کے دودھ سے پلی۔ بادشاہت کی گود دوں کھیلی۔ علم و فن نے پروان چڑھایا، راجہ بھرت سے لیکر تیموری خانوادے تک کی رنگینیاں اس سرزمین پر رہتی رہیں۔ جسے دیکھو اعلیٰ زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ، چلتی پھرتی تصویر۔ پشتینی شرافت رگوں میں رگوں کے دوڑتے ہوئے خون میں بسی ہوئی۔ جو بات کلچر کی جان سمجھکر اوروں میں فخریہ بیان کی جاتی، وہ ان کے ناخوں میں پڑی ہوتی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی، جنہیں "میاں جی" کہتے ایک کا منہ خشک ہوتا تو دوسرا "لالہ جی" کہہ کہکر سیجھتا، دونوں متواضع، ملنسار، دکھ درد کے شریک، محبت دار۔ دونوں جسم و روح کے بلونت، علم و فن کے پتلے، حسن و عشق کے رسیا، کیا مجال جو حد سے گذریں۔ ایک دوسرے کا پاس مذہب بھی، ملت بھی، بس یوں کہو سب انسان تھے۔ آج کل کی طرح بھیڑیے نہ تھے کہ ایک ایک کو نگلے جاتا ہے۔ یہ پڑھے لکھے امیر اشرافوں کا طور طریق تھا۔ ان پڑھ اجلاف بھی انجان طور پر تمیز تہذیب کے دلارے بن بن گئے۔ گویا امیر مال میں، غریب حال میں مست تھا۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ گذرا کہ اس شان سے برکتیں بیدار تھیں۔ دن عیدرات شبرات تھی۔ یا ایکا ایکی جو نصیب سویا تو برے دن آگئے، لچھن اچھے نہ رہے، اپنے پرائے بننے لگے۔ عقل پر پٹی پڑی۔ ملت ادندھی ہوگئی۔ ایک ہما ہمی پڑی روز کمزوری بڑھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ دنیا اس سونے کی چڑیا پر تاک لگائے بیٹھی تھی۔ ان باتوں نے رستہ صاف کرکے اور شے دی۔ ۱۸۵۷ء اجل بنکر آن پہونچا۔ بادشاہت نے پاک باطن بہادر شاہ کی گود میں دم توڑا۔ بزم تیموری کا جھلملاتا ہوا چراغ آخری دفعہ بھڑکا اور خاموش ہوگیا۔ اس کے چاہیتے، چاہنے والے کچھ سرِ صحرا نکل کھڑے ہوئے، اور ایسے نکلے کہ پھر دلی دیکھنی نصیب نہوئی، بہت کچھ مارے گئے۔ جو گنتی کے رہ گئے۔ وہ باہر والوں کے طوفان میں ہوئے نہ ہوئے برابر تھے۔ یوں دیکھتے دیکھتے یہ مزے کی بستی اجڑی۔ مغلی تہذیب کی بساط الٹی۔ جب وہ دلی والے ہی نہ رہے تو دلّی کیا رہتی، اللہ کا نام رہ گیا۔

خیر! عروج و زوال پھرتی پھرتی چھاؤں ہے۔ جو بڑھتا ہے، ایک دن گھٹتا بھی ہے، دنیا کا کچھ یہی دستور ہے۔ یہاں ایک رنگ آتا ہے اور ایک جاتا ہے، یہی سدا ہوا، یوں ہی شاید ہوتا رہے۔ اسی طرح دلّی کا پیدایشی روپ سروپ بھی چھن گیا، دولت گئی، حکومت گئی۔

---

[1] دلّی والے قلعہ کو "حویلی" بھی کہتے تھے۔

ولولے مٹے۔ ہمتیں ڈھیئیں، جولانیاں سرد پڑ گئیں۔ سماج کی یوں آب ہوا بدلی تو گویا ملنساری کا قدیم سانچہ ہی ٹوٹ گیا۔ مگر یہاں عروج و زوال کی دھوپ چھاؤں دکھانی نہیں۔ اگلے وقتوں کی صرف وہ آخری جھلک منظور ہے جو دلّی میں دیکھ لینی ہے، جو کسی طرح بھولنے بھلانے کی چیز نہیں۔ یہ اچھے دنوں کی موہنی باتیں کہیں کتابوں میں ملیں۔ کبھی بڑے بوڑھوں کی زبانی سنیں۔ یوں ہوتے ہوتے دماغ ان کا گنجینہ بنا۔ خیال نے افسانہ کر دیا، اب جو "نگار" سننے پر آمادہ ہے تو جی چاہتا ہے، آنے والے، رفتگاں کی یہ سہانی کہانی اسی کی زبانی سنیں۔ کبھی ہنسیں، کبھی روئیں۔ اس طرح جو موتی جستہ جستہ کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں یا ان کا یکجی مالا انہیں تیار ملجائے۔ مانا کہ کتابیں ہیں اور رہیں گی، مگر اس کا کیا علاج کہ ان میں ایک چیز یہاں، ایک وہاں ہے۔ دوسرے سب میں بڑی بات یہ ہے، ان بزرگوں میں بہت سے اٹھ گئے۔ جو ہیں وہ گنتی کے خال خال اور چراغ سحری ہیں۔ آج موئے کل دوسرا دن۔ ایسا نہو کہ ان کے ساتھ بہت سی مزیدار باتیں بھی قبر میں چھپ جائیں۔ اس لئے جو آنکھوں دیکھی یہ سنائیں۔ اسے جُگا جُگا کر رکھ لینا ہے۔ ورنہ یہ معلوم ہے۔ زمانے نے انہیں چھوڑا ہے، نہ ہمیں چھوڑے گا۔ جس طرح اچھے دن نہ رہے، ایک روز یاد ایام بھی مٹ جائے گی۔

ہاں تو ذکر یہ تھا۔ دلّی کی جان اس کی آن تھی جس میں زندہ دلی کی بجلی دوڑتی، چمکتی رہی۔ اس سے بات بات پر حسن رچا۔ حسن نے انداز پیدا کیا۔ پادشاہت نے نوازا۔ آب و ہوا نے بڑھایا۔ لیجئے: ادنیٰ اعلیٰ، امیر غریب، بچہ بوڑھا، پڑھے لکھے، ان پڑھ سب خوش باش خوش خوراک، خوش لباس، خوش مزاج بن گئے، برس کے بارہ مہینے چہل پہل رہنے لگی۔ جب دیکھو میلے ٹھیلے، سیر تماشے، ناچ رنگ ہو رہے ہیں۔ جہاں اپنا پرایا اس طرح ملے گھلے مزے اڑاتا پھرتا کہ زندگی مزے کی موج، شانتی کی سوت دکھائی دیتی۔ قاعدہ ہے: حکومت کی سب ریس کرتے ہیں۔ قلعہ میں گو نام کی پادشاہت رہ گئی تھی۔ مگر بجھتا چراغ تھی۔ اس گئی گذری حالت میں بھی بہار دے گئی۔ اس نحوست میں بھی تختہ زندگی کا نمونہ بنی رہی۔ سارے شہر میں اسی کی مثال لی جاتی۔ اس لئے جسے دلّی دیکھنی ہو وہ پہلے اندنوں کا قلعہ بعد میں اور باتیں دیکھے۔ شہری زندگی کا یہی سچا نمونہ کبھی عطر زندگی رہا۔ اسی سے کبھی ہندوستان پڑا مہکتا تھا

اس سکھ کی سیج میں کبھی نیا سال شروع ہوتا تو صبح عید کا گلابی نور برستا تھا بادشاہ سے لیکر فقیر تک نوروز مناتا۔ دیوان عام، دیوان خاص چھوٹا بڑا رنگ محل۔ خاص محل۔ ہیرا محل۔ موتی محل، باغ حیات بخش۔ مہتاب باغ۔ ساون بھادوں جمع ہر شے سجتی۔ برجوں اور فصیلوں پر نت نیا سماؤ ہوتا۔ محلات کے بیش بہا گل بوٹے، پچی کاری، باغات کی رنگ برنگ پھلکاری پڑی منہ سے بولتی۔ سنگ مرمر کی نہر بہشت میں صاف و شفاف پانی اس طرح دوڑتا پھرتا جیسے حوض نور بہتی ہو۔ جھرنوں کے نیچے انگوری، گلابی باغ تو دلہن بنجاتے۔ خیمے کھڑے ہیں شامیانے تنے ہیں، ان میں جا بجا کرن کے بڑے بڑے طرے، جھالریں جھلجھل جھلجھل کر رہی ہیں۔ چھتوں میں کہیں مقیش کا جال بنا ہوا ہے کہیں گنگا جمنی لیس کا چوخانہ، جس میں سلمے ستارے کے پھول، تاروں بھرے آسمان کی طرح جگمگا رہے ہیں، چوبوں پر زربفت، اطلس لپٹا ہوا ہے، ریشمی طنابیں سونے چاندی کی میخوں میں کھنچی گئی ہیں۔ چپہ چپہ تاش تامی کی جھنڈیوں کی بہار ہے۔ جھرنوں کے باغ سے لگی لگی جمنا بہہ رہی ہے، اس میں کشتیاں پڑی ہیں۔ کشتیوں میں قناتیں لگی ہیں۔ نجومی پنڈت سال بسال جو رنگ خوش آیند بتاتے ہیں وہی نوروزی رنگ کہلاتا ہے، ہر چیز پر رچ جاتا ہے، کسی سال دیکھو تو قلعہ، قلعہ والے سرتاسر گلنار، نافرمانی اگیندئی ہیں، نہیں تو کوئی گلابی

نارنجی، ترکنیں، حبشنیں، جسولنیاں، قلماقنیاں، اردبیگنیاں اندر، قلار، مردھے، پیادے، دربان باہر لپاک جھپاک انتظام کرتے پھرتے ہیں۔ لے لو! وہ دربار آراستہ ہوا، جہاں پناہ ہوادار میں برآمد ہوئے۔ اس کے چاندی کے چار ڈنڈے ہیں، گرد چاندی کا نازک نازک کٹھرا۔ پشت پر سونے کے کام کا زرمل کٹاؤ دار تکیہ۔ بیچوں بیچ زرکوبی مسند تکیہ۔ اہلو بہلو دو اور ملایم تکیے ریشمی ڈوریوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ سامنے سنہری روپہلی دو گنگا جمنی ترکش اور ایک کمان آویزاں ہے۔ دیوان خاص آئے۔ جو بقول فرگسن دنیا کا سب سے شاندار محل تھا۔ بادشاہت کی بیچ تھی، اس سنگ مرمریں در و دیوار۔ ستون۔ مرغول۔ محراب۔ فرش۔ چھت۔ ہر چیز عقیق، مرجان اور بیش بہا پتھروں کی پچکاری، گل بوٹوں سے پڑی جھلملا رہی ہے۔ اجارہ سے اوپر چھت کا حصہ تو گویا سونے سے لیپ دیا گیا ہے۔ سامنے صحن میں بیچوں بیچ چوکھنڈی کا سنگ مرمر کا سندل کٹھرا اور چاندی کی سفید براق چھت ہے۔ بیچ میں چاندنی کی سی نہر بہشت بھی رواں ہے، صدر میں ہشت پہلو مرمریں چبوترا ہے، جس پر تخت طاؤس رکھا ہے، یہ بھی سراسر سونے کا ڈلا ہے۔ چاروں طرف خوشنما محرابیں ہیں۔ گرد سندل کٹھرا۔ پشت پر کٹاؤ دار تکیہ۔ آگے تین تین جڑاؤ سیڑھیاں۔ اوپر محراب۔ گول قبہ نما چھت۔ سنہری کلیاں پاؤں میں رنگ برنگ کے پھول پتے۔ سامنے محراب پر آمنے سامنے دو موتیوں کی تسبیحیں منہ میں لئے کھڑے ہیں۔ نذر نذر سے دربار شروع دعاؤں پر ختم ہوا۔ شعرا قصیدے پڑھتے ہیں خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوتے ہیں، شاہزادوں کے سر پر جیغہ۔ سرپیچ۔ گوشوارہ اور معزز امیروں کے سر پر گوشوارہ حضور بہادر شاہ خود اپنے ہاتھ سے باندھ رہے ہیں۔ بعد میں حضرت علیؓ کی نیاز دی۔ سب نے تبرک چکھا، پنکھا جھلنے کا شگون ہوا۔ چاندی سونا اچھالا گیا۔ بیلہ بٹا۔ تیسرے پہر کشتیوں میں بیٹھے۔ باغوں کی سیر کی مگر اس سے بھی کہیں زیادہ جشن کے ٹھاٹھ رہتے۔ یہ بادشاہ سلامت کی تخت نشینی کی سالگرہ ہوتی، پورا ایک چلہ رنگ رلیوں میں گذرتا۔ دس روز پہلے توڑے بندی شروع ہو جاتی۔ امیر امرا میں جیسی جس کو عزت اتنے خوان کا توڑا سرفراز ہوتا۔ چار دن باقی رہے مہمان داری ہونے لگتی۔ شاہزادیوں، امیرزادیوں سے محلات بھر جاتے۔ نت نئے شگون ہوتے طرح طرح کی تیاریاں کی جاتیں۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ خلعت۔ انعام دیئے جا رہے ہیں۔ نذر نذور، مہمانداری۔ ناچ رنگ کی بہار۔ ایک چھوڑ چالیس دن تک ہے۔۔

یوں ہی برس کے بارہ مہینے جشن رہتے۔ دن عید رات شبرات ہوتی۔ حویلی کی خوش وقتی سماجی زندگی سے گتھ گئی تھی وہاں سے جو مزے کی موج اٹھتی۔ ساری دلی اس شاداب ہوتی۔ ان دنوں حویلی ایک ایسا دریا تھی۔ جو خود بھی شاداب ہوا اور اپنی آبیاری سے اہلو بہلو کو بھی سرسبز کرتا جائے۔ محرم سے بقرعید تک دلی کا بچہ بچہ ایک سے جذبات کا نمونہ ہوتا۔ محرم غم کا مہینہ ہے۔ اس میں بادشاہ سے لگا فقیر، امام حسنؓ حسینؓ کا فقیر بنتا۔ کوئی پیک ہے۔ کوئی نشانچی۔ جابجا پیاؤ سبیلیں لگی ہیں۔ شہیدوں کے نام کا شربت پلایا جا رہا ہے۔ کہیں مجلسیں ہو رہی ہیں، کہیں مرثیے پڑھے جا رہے ہیں۔ علم اور تعزیے اٹھتے ہیں۔ محرم میں دلی گویا سوگوار تو ہے مگر ان انوٹ اداؤں سے جو کسی خوبصورت سوگوار کی گوری گوری برہنہ کلائیوں، بکھرے بالوں میں ہوں! تیرہ تیزی[1] میں آخری چہار شنبہ آیا، قلعہ قلعہ کے

---

[1] بیگمات دلی صفر کو تیرہ تیزی، ربیع الاول کو بارہ وفات، ربیع الثانی کو میراں جی۔ جمادی الاول کو مدار، جمادی الثانی کو خواجہ معین الدین شعبان کو شبرات، شوال کو عید، ذیقعدہ کو خالی، ذی الحجہ کو بکرید (بقر عید) کہتی تھی۔

باہر میلے لگ گئے۔ بڑی رنگ رلیاں رہیں۔ سلونی میٹھی گھنگنیوں[1] پر نیاز ہو رہی ہے۔ سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہوتے ہیں۔ تیسرے ابر سب بن سنور باغوں میں سبزہ روندنے گئے۔ صدقے بستے اتارے۔

بارہ وفات کے آتے ہی جا بجا قوالی کی دھوم مچی۔ مزاروں پر قوال بیٹھے گا رہے ہیں۔ قلعہ میں صبح شام مشائخوں اور ملانوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ چودھویں تاریخ قطب صاحب میں بڑے زور شور سے عرس ہوا۔ بادشاہ ان کے ساتھ سارا شہر خواجہ صاحب جا پہونچا۔ بادشاہ نے مزار شریف پر پھول۔ صندل۔ غلاف چڑھایا۔ دوسرے دن ختم میں شریک ہو سب رخصت ہو گئے۔ میراں جی میں حضرت غوث الاعظم کی بڑی دھوم دھام سے نیاز ہوئی۔ آتش بازی چھوٹی۔ سترھویں تاریخ سلطان جی میں حضرت سلطان نظام الدین اولیا کا عرس ہوا، یہی عرس عام طور سے سترھویں کے نام سے مشہور ہے۔ رات میں ختم ہوا۔ قوالی ہونے لگی۔ صبح کو حضور بادشاہ بڑے تزک و احتشام سے آئے۔ ان کے ساتھ سارا شہر امڈ آیا۔ درگاہ میں نذریں چڑھائیں۔ خادموں نے سر سبز پھینٹے[2] باندھے۔ تبرک دیا۔ کوئی باؤلی میں کود رہا ہے، کوئی سیڑھیوں پر نہا تا ہے۔ شہزادے امیرزادے باؤلی میں روپے پیسے پھینک رہے ہیں۔ لڑکے غوطے مار مار کے نکال لاتے ہیں۔ بازار میں خلقت کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلے۔ قسم قسم کی مٹھائی، کچوریاں، کباب، پراٹھے، لونگ چڑے اور جانے کیا کیا بک رہا ہے۔ چو طرف پتنگ بازی ہو رہی ہے۔ دوپہر دن آئے ہو ہڑ ہو کا غل و شور ہوا۔ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے آئے۔ ساری خلقت ادھر ٹوٹ پڑی۔ شام تک یہاں میلہ لگا۔ ناچ رنگ رہے۔ منگل میں قلعہ کے نیچے چھڑیوں کا میلہ ہوا۔ درگاہ شریف میں بادشاہی لمبا لمبا نشان چڑھا۔ اس میں کر کری تاش کا پھریرا، جھل جھل کر رہا ہے۔ چھیلب دار ڈھول بجاتے ہیں۔ قلعہ سے مالیدہ کے خوان آئے۔ حضور عالم پناہ برآمد ہوئے۔ پھولوں کی بدھی پہنی۔ چھیلب داروں کو معمول دیا۔ رخصت کیا۔ کچھ دیر بعد میلہ ختم ہو گیا۔ خواجہ معین الدین کے مہینے چودھویں تاریخ سے خواجہ صاحب کی چھڑیاں ہونے لگیں۔ سولھویں تاریخ اجمیر شریف میدنی[3] رخصت ہوئی۔ بادشاہ نے چاندی کا نشان تامی کے پھریرے کا چڑھایا۔ کچھ دور میدنی پہونچانے گئے۔ چند روز میں لوگ پھر آئے۔ کنبے والوں نے جاب[4] بھیجی۔ انہوں نے درگاہ شریف کا صندل۔ صندل کی کنگھیاں۔ تسبیحاں۔ تھولی۔ جانمازیاں۔ جے پور کے چادرے۔ انگوچھے۔ رومال۔ چندریاں، کلیاں، چلنیس، عطر کی سوغات روانہ کی۔ رجب میں گھی کھانڈ اور میدے کی میٹھی روٹیاں تندور (تنور) سے پکوائیں۔ سونف خشخاش لگی ہے۔ روٹیوں پر مردوں کی تبارک ہوئی۔ اسی مہینے حضرت جلال بخاریؒ کے کونڈے پلاؤ۔ زردہ۔ کھیر۔ جلیبیوں سے بھرے۔ نیاز دی۔ بانٹ دیئے۔ شبرات میں اور دھوم مچی۔ طرح طرح کے حلوے۔ شیرمالیں۔ میدے کی پوریاں تیار ہوئیں۔ انحضرت صلعم۔

---

[1] چنوں کو ابال کر نون مرچ لگا کر سلونی، گیہوں کو ابال کر خشخاش اور کھانڈ ڈالکر میٹھی گھنگھنیاں بناتے ہیں۔

[2] دس بارہ گز کا سبز کپڑا خادم لوگ سر پر لپیٹ دیتے ہیں۔

[3] خواجہ صاحب اکٹھے ہو کر جو لوگ اجمیر شریف جاتے ہیں۔ انہیں میدنی کہتے ہیں۔

[4] دھوئے تل۔ چانول۔ کھانڈ سینیوں میں لگا کر بھیجی جاتی ہے۔

حضرت امیر حمزہ - حضرت بی بی فاطمہ - بڑے بڑے[1] - بابر بادشاہ، دودھ کے آبخوروں پر معصوم بچوں کی جدا جدا نیاز ہوئی - حضرت بی بی فاطمہ کی نیاز کا بہوی زنوں کو باہر بادشاہ کی نیاز کا خاص ان کی اولاد کو باقی ہم شاکو بٹ گیا - صحنے بحروں کے خوان آنے جانے لگے - پتنگ بازی - آتش بازی - تماشے - مرغے - باجے - نوبت نقارے کا چوطرف شور مچ گیا - شام بادشاہ اما باڑہ آئے - اپنے ہاتھ سے روشنی کی۔ کنگنی کی کھیر چکھی - ایک ایک چمچہ سب کو دی - رمضان شریف آیا - اس کا پوچھنا ہی کیا - یہ تو ایک مہینے کچھ دن کا تہوار تھا - سارا مہینہ ایک ایک گھنٹہ گن گن کر گذرتا - گیارہ مہینے کی کمائی ہر شخص اس مہینے گھر بیٹھکر کھاتا - ہندو بھی اس کا بڑا احترام کرتے - پچھلے پہر توپیں چلیں ڈنکے بجے - سب نے سحری کی - روزے کی نیت کی - کوئی کلام اللہ لے بیٹھا - وظیفہ کوئی پڑھنے لگا - فجر کی نماز کے بعد کسی نے آرام کیا۔ گرمی ہوئی تو کوئی دریا کی سیر کو نکل گیا - کسی نے تیتر بٹیر - اگن کے لال سفید بستنیوں دا پنجرے لئے اور کرم چکاتے جنگل نکل گیا - کوئی پھولوں کا دونا لئے ہوئے مزاروں پر چلا جاتا ہے - سورج نکلا - شہر سنہری دھوپ کے نور میں ڈوب گیا - اب تو دس بجے ادھر دن ڈھلے ادھر - بازاروں میں گھما گھمی ہوتی - قلعہ سے لگا سارے شہر میں نت نئے پکوان ہو رہے ہیں - پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں - من بھاون چیزیں پک ہی ہیں - گھڑی بھر دن رہے، روزہ کشائی لگنی شروع ہوئی - قسم قسم کے شربت - تخم ریحاں - فالودہ - لیموں کا آبشورہ قلمی بڑے - دہی بڑے - لونگ چڑے - مچھلی کے کباب - پھلکیاں - سیو دال - پالک کے پتے - طرح طرح کی ترکاریاں رکابیوں - سینیوں میں لگائی گئی گئیں - لے لو وہ سورج غروب ہوا - مشرق سے سیاہی پھیلی - بادشاہ نے اشارہ فرمایا - ہرکارے نے جھنڈی ہلائی - وہ روزے کی توپ دغی - دعائیں - چوطرف اذانیں ہونے لگیں - سب نے جلدی جلدی آب زمزم - مکے کی کھجور یا چھوارہ سے روزہ کھولا - کٹورے پہ کٹورہ غٹ غٹ شربت پیا - ذرا ذرا سی دال ترکاری میوہ چکھا - نماز کے لئے کھڑے ہوگئے - رات میں تراویوں (تراویح) کی چہل پہل رہی - محلہ کی کوئی مسجد نہیں جہاں سے کلام اللہ کی آواز نہ آتی ہو - اس سے نچنت ہوئے، گیارہ بارہ بجے ذرا اکھر سید ھی کی ایک ڈیڑھ بجے چوکیدار آن پہونچے: کوئی لے داری سے کہتا ہے: روزدارو! اللہ کے پیاروں ابھی دینداروں اٹھو - کوئی کہتا: جاگیو بابا بھلا ہوگا - اور جاگنے میں خدا ملاہے گا - بس یہ سمجھئے سارا مہینہ یونہی چہل پہل سے گزرتا - آخری جمعہ کو الوداع کے ٹھاٹھ رہتے انتیسویں تاریخ ہوئی اور سب کی آنکھیں آسمان پر لگ گئیں - سانڈنی سوار چاند کی خبر کو روانہ ہوئے - کہیں چاند دکھ لیا گیا - تو گواہی آگئی - خوشی خوشی سب نے جوان عید کی تیاریاں کیں نہیں تو پوڑھی عید تو کہیں گئی نہیں - دوسرے دن صبح سویرے دودھ سوئیاں کھائی - بنے سنورے - خوشبوؤں میں بسے بچے، جوان، بوڑھے سب رتھ، پالکی، مانگی اور تام جھام میں عیدگاہ پہونچے - بادشاہ کا جلوس بھی عیدگاہ روانہ ہوا - یہاں پہونچکر دوگانہ ادا کیا - خطبے سے پہلے قورخانہ[2] کے داروغہ نے امام جی کے گلے میں کلابتونی پرتلہ اور تلوار ڈالدی - امام جی نے خطبہ پڑھا ختم پر سب بغلگیر ہوئے - دعائیں دعائیں سلامی کی توپیں سر ہوئیں - بادشاہ نگدمبر[3] میں سوار ہوئے - بیٹھک آئے -

---

[1] بزرگ - [2] سلح خانہ - [3] عماری کی صورت ایک ہودا ہاتھی پر کس دیتے تھے -

یہ مرمریں عمارت بھی اپنی نفاست، نزاکت اور منبت کاری سے کبھی قلعہ کی جان گنی جاتی تھی۔ اس کے شمالی، جنوبی محرابوں پر سعد اللہ خاں کے مشہور کتبے اور اجارہ کے نزدیک آب زر سے لکھے ہوئے اشعار پوری داد حسن و کمال دے رہے ہیں شہ نشین کے آگے زیر سنگ مرمر کا پرچین کار نہایت لطیف پچدرہ دالان ہے، جس کے غربی حجرے میں خاص ڈیوڑھی سے ہوکر دیوان خاص رستہ نکل جاتا ہے۔ دالان کے بیچوں بیچ مرمریں مستطیل حوض ہے۔ اس کی تہ پر طرح طرح کے رنگین اور بیش بہا پتھروں کے گل بوٹے، پھول پتے بنے ہوئے ہیں، ہر پھول کی پنکھڑی میں باریک سوراخ ہے۔ جن سے پانی ابل رہا ہے، دالان کے آگے مرمریں صحن ہے، جس میں موتی سی نہر بہشت بہتی ہوئی محلات چلی جاتی ہے۔ یہاں سے ہوکر بادشاہ دیوان خاص آئے۔ تخت طاؤس پر دربار کیا۔ نذریں۔ پھولوں کے طرے اور ہار مرحمت فرمائے۔ بقرعید میں بھی یونہی عیش رہے۔ ہاں قربانی کا لطف اور بڑھ گیا۔ شہر کا چپہ چپہ خوشی سے معمور ہے۔ شہر والے گرم گرم کچوریاں، مٹھائیاں۔ کباب لئے چلے آتے ہیں۔ کوئی عید ملنے جارہا ہے۔ کوئی بازدید کو چلا آتا ہے، ایک دھوم مچی ہے۔ چیل کوّوں کی طرح تکّیں، تکلیں دوڑتی ہیں۔ سب نے باغات بسائے۔ لطف اڑائے۔ یہ تو مسلمانوں کے تہوار ہوئے۔ اہل ہنود کے بڑے تہوار بھی قابل دید و شنید ہوتے۔ دسہرہ آیا۔ بادشاہ کے سامنے ایک نیل کنٹھ اڑا دیا گیا۔ بازخانہ کا داروغہ باز اور شکرہ لیکر آیا۔ بادشاہ نے ہاتھ پر بٹھایا۔ تیسرے پہر ہندو امرا نے نذریں پیش کیں۔ بادشاہ جھروکوں میں آن بیٹھے۔ عملہ فعلہ یوزک۔ رکاب برخاست ہوا۔ شاہی اصطبل کا داروغہ خاص گھوڑوں کو رنگ رنگا۔ سنہری روپہلی ساز لگاکر جھروکوں کے نیچے لایا۔ ملاحظہ ہوا۔ انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ نو دن رام لیلا کے ٹھاٹھ رہے۔ دسویں دن بھرت ملاپ ہوا، اس میں ہر سال گویا ہندو مسلمان دو بھائی ملتے۔ پیار و محبت استوار کرتے۔ دیوالی آئی۔ جا بجا نوبت۔ نقارے۔ روشن چوکی بج رہی ہے۔ کھیلیں۔ بتاشے۔ کھانڈ۔ مٹی کے کھلونے اور گنے کی اونچی اونچی پھاندیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ دکانوں پر ہیجڑے ”چھلّا دے رے موسے تائیں“ گاتے پھر رہے ہیں۔ حلوائیوں نے بھر بھر تھالی مٹھائیاں۔ رنگ برنگ کی لوزاتیں بنائیں۔ طرح بطرح سجائیں۔ پہلے دئے سے تیسرے دئے تک ایسی روشنی ہوئی کہ سارا شہر دن بن گیا۔ تیسرے دئے کو بادشاہ سونے چاندی میں تلے۔ ایک بھینسا۔ کالا کمبل۔ کڑوا تیل۔ ست نجا۔ سونا۔ چاندی بادشاہ پر سے تصدق ہوا۔ قلعہ میں بھی خوب روشنی ہوئی۔ اہل ہنود نے جا بجا حصے بھیجے۔ احباب نے جاکر مبارکباد دی۔ وہ بازدید کو آئے۔ رتھ بانوں۔ گھوسیوں نے بیلوں۔ گائے۔ بھینسوں کے پاؤں میں مہندی لگائی۔ زنگار رنگ کی اون پر نقاشی کی۔ سینگوں پر قلعی اور تاش کی سنگوٹیاں۔ گلے اور پیروں میں گھنگرو۔ بانات کی زردوزی جھولیں ڈالیں۔ چھم چھم، چھم چھم یہ انہیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر لیکر گئے۔ وہاں سنکھ۔ تاشے۔ باجے بجاکر انہیں نچایا۔ انعام و اکرام لئے۔ رہی ہولی تو یہ بھی بھانت بھانت کے سانگ سے دلّی کی چیز بنجاتی۔ بازاروں۔ گلیوں۔ گھروں میں رنگ کھیلے جارہے ہیں۔ دف۔ چھانجھ۔ نفیری بج رہی ہے۔ جا بجا طائفے ناچ رہے ہیں۔ شہر کے سارے رنگ ایک ایک کر کے قلعہ پہنچے۔ حضور عالم پناہ کے ہندو مسلمان امرا ایک طرف، بادشاہزادیاں، امیرزادیاں دوسری طرف جھروکوں میں بیٹھی ہیں۔ رنگ، سانگ آرہے ہیں۔ انعام لے کر جارہے ہیں۔ کبھی بادشاہی طائفے ہولی کھیلتے۔ بادشاہ تشریف فرما ہیں۔ چار کا فرادائیں بھر بھر پچکاریاں ایک دوسرے پر ڈال رہی ہیں چار ناچ گا رہی ہیں:-

رنگ میں کیسے ہوری کھیلونگی سانوریاں کے سنگ ...... رنگ

۱ ندی کنارے دھوبی دھوئے چولی کے دو بند
کس پاپی کی نجر پڑی تو چولی ہو گئی تنگ ...... رنگ

۲ ندی کنارے بگلہ بیٹھا مچھلی چن چن کھائے !!!
بڑی مچھلی کا کانٹا چبھا تو تڑپ تڑپ مرجائے
رنگ میں کیسے .... رنگ

شہر کے تیج تہوار کے سوا بھی ان منچلوں سے باہر کی رعنائیاں نہ چھوٹتیں۔ کالکا کا میلہ ہو یا میرٹھ کی نوچندی۔ حضرت پیران پیر کلیر۱ صابری یا خواجہ اجمیری کا عرس ہو۔ یہ ہر جگہ وارد ہیں۔ ان باتوں سے طبیعت میں اپنے آپ ایسی ہلکت پڑ گئی کہ عید برات ہو یا نہ ہو ان کے دل کا کنول کھلا رہتا۔ ان کے ہاں زندگی کا دوسرا نام گویا ہنستے کھیلتے آنا اور چلا جانا تھا۔ آج وہ لوگ نہیں۔ ہم دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت کچھ بھلا بیٹھے اور یہ نہ سمجھے: کہ استخواں فروشی کی طرح استخواں فراموشی بھی گناہ ہے۔۔ اگلی باتیں پھر دکھائی دینے لگیں۔ مگر یاد رکھو: کہ زمانہ اچھے یاروں کو نہیں بھولے گا۔ یہ ان آقاؤں کے خادم۔ ان مہاراجاؤں کے پرجا ہیں۔ جو ہندی تمدن کی آن بان تھے۔ جنہوں نے ہندوستان فتح ہی نہیں کیا، بلکہ اسے اپنا مالوف وطن، پیارا گھر بنایا۔ اور جس طرح انسان اپنا گھر لیسا ط بھر سجاتا رہتا ہے انہوں نے بھی اپنی زبان۔ سیاست۔ تعمیر۔ معاشرت۔ ذہنیت۔ موسیقیت۔ شاعری۔ خوش‌ذوقی۔ اور اور علم و فن سے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ یہی وجہ تھی جو رنگین راج کی رنگین پرجا خالی دنوں میں بھی دن عید رات شبرات مناتی تھی۔ گرمی میں گرمی، جاڑے، برسات میں سدا دن کے سے ٹھاٹھ رہتے۔

گرمی آئی۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کوئی جمنا گیا۔ کوئی جنگل نکل گیا۔ کہیں دیکھو تو کسرت ہو رہی ہے۔ اور کہیں لڑنت۔ کچھ بھلے مانس میر محل کے اردگرد مونڈھے بچھائے ادھر ادھر کی باتیں لڑا رہے ہیں۔ کچھ محلسرا میں امیر امراء کی مصاحبت میں جا پہونچے۔ یہاں صحن میں طرح طرح کے پھول بہار دکھا رہے ہیں۔ ایک طرف کورے کورے مٹکے گھڑونچیوں پر سلیقہ سے رکھے ہیں۔ جھجیروں پر صراحیاں ہیں۔ جن پر اجلی اجلی صافیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ چاندی کے نقشین کٹورے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچوں بیچ میں مچھلی بھون ہے۔ جس کے گرد جنگلی تخت بچھے ہیں۔ ان پر سفید سفید نین سکھ کی چاندنیاں سفید بگلا سے کئی کئی گاؤ تکیے۔ چنبیلی کے جال کی براق سی سوزنیاں بچھی ہیں۔ کونوں پر گلناری تراش کے میر فرش رکھے ہیں۔ آنکھ میں میل اس فرش فروش پر میل کا نام نہیں۔ اندر جاؤ تو روشن روشن کھلا کھلا مکان۔ خوبصورت شہ نشین۔ نفیس نفیس صحنچیاں۔ سفید جھک درو دیوار۔ جن سے آنکھوں میں نور آئے۔ جی روشن ہو۔ طاقوں میں نفیس نفیس۔ رنگ رنگ طاق پوش، جن پر چانچی کے گلدان، اور گلدانوں میں پائیں باغچہ کے بنے گلدستے سجے ہیں۔ جا بجا چنبیلی اور مولسری کی لڑیاں لٹک رہی ہیں، بالش میں اگن۔ بلبل۔ ابلقہ۔ دیٹر۔ بیا۔ تیتر۔ بٹیر۔ طوطا۔ مینا۔ چنڈول لال دیدڑیوں کے پنجرے لٹک رہے ہیں۔ سامنے

---

۱ وہ حوض جس میں رنگین مچھلیاں ڈالدیتے ہیں۔

صحن میں ایک طرف کابکیں[1] ہیں۔ یاہو[2]۔ لوٹن۔ چوہے چندن خال۔ زرد بند۔ شیرازی کے جوڑے جھول لینے کے لئے پلے ہوئے
ہیں۔ چھت پر جال میں۔ ٹھیٹر[3]۔ جنگلا۔ لال بند لمبا۔ ویٹر۔ پڈیہ۔ زرد جوگیا۔ لال جوگیا۔ ببرا۔ نیلا۔ ابابیلیا ایک سے ایک اعلیٰ
کبوتر تیواڑ[4] پر بیٹھا ہے۔ پہلے کھولکر انہیں ہڑ گھسکر دی۔ پھر چھپی[5] سے اٹھا دیا[6]۔ دہ تا[7] دا کاٹ کر لوٹواں لوٹواں جا صیڈی[8] کے جھلڑ سے
لڑ گئے۔ یوں دوسرے کا کبوتر چڑھ[9] آیا تو مار لیا[10]۔ ورنہ اپنا کھو بیٹھے۔ اچھا تو اس طرح کہیں کبوتر بازی ہو رہی ہے۔ کہیں باتیں ہو رہی ہیں
سب کے سب ثقہ صورت۔ شگفتہ مزاج۔ مرنجاں مرنج۔ سڈول جسم۔ چوڑا ابھرا ہوا سینہ۔ پتلی کمر۔ بنے ہوئے ڈنڑ۔ ان میں کسی کا سر
منڈا ہوا۔ لبیں کتری ہوئی۔ داڑھی بڑھی ہے۔ کسی کے پٹھے، زلفیں اور خشخشی داڑھی ہے۔ چکن۔ شربتی ململ۔ ڈوریا، یا جامدانی کا نیچی
چولی کا انگرکھا، جو سینہ اور ڈنڑوں میں کھبا جاتا ہے۔ گلبدنی۔ نین سکھ کا ایک بڑا یا تنگ موری کا پاجامہ۔ گھیتلی۔ کفش۔ سلیم شاہی جوتی
چوگوشیہ۔ ہشت پہلو۔ دو پلڑی۔ جالیدار یا ارخ چین کی ٹوپی۔ ہاتھ میں لٹھے کا چوکور رومال۔ ٹھوس بانس کی سیاہی مائل چمکیلی
لکڑی۔ کوئی بانک۔ بنوٹ۔ نیزہ بازی۔ گھوڑے سواری۔ پھینک پٹا۔ پہلوانی۔ تیراکی۔ لیزم۔ اکسنگ۔ غلیل بازی۔ نغل برداری
کا ذکر کر رہا ہے۔ کہیں میر پنجہ کش۔ جید خوشنویس۔ محمد جان۔ آغا صاحب۔ احمد جان۔ امام الدین۔ بدر الدین۔ کے فن و کمال کی داد دی
ہو رہی ہے۔ یہ بدر الدین کون؟ وہی جن کے پاس ولایت سے ملکہ معظمہ کی مہر کھدنے آئی تھی۔ کہیں دیکھو تو شاہ ناصر وزیر، مرزا
کالے، مرزا گوہر یا ان کے شاگرد ہیں اور ستار کے کمال دکھا رہے ہیں۔ دھوپ میں تیزی بڑھی تو تہ خانوں میں آن پڑے فراشی
پنکھا چل رہا ہے۔ خس کی ٹٹیوں پر ہزاروں سے پانی چھڑکا جا رہا ہے، یہ امیر امرا کا حال ہے۔ دوسرے ملازم پیشہ اور دوکاندار اور
متوسط طبقہ بھی چین سے گزارتا۔ بازاروں، گلیوں سے ترکاری والوں کی سہانی آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ وہ اس مزے سے ترکاریاں
بیچتے کہ ان ہوئے کا جی للچائے۔ بن بلائے آن پھنسے: "ریشم کے جال میں ہلایا قدرت کا اودا بنا جلیبیا کھا لو۔" باڑی کے رنگ لال[11] ہیں
پکے جی رنگ لال ہیں۔ شرطی[12] لگائے ہیں میٹھے جلیبیوں سے میٹھے۔ ڈالی[13] کا کھلا پیوندی ہے۔ سانولے سلونے، کیا رنگیلے فالسے لگا دئے ہیں،
شربت کو۔ کھیرے کی نو بہار ہے، کھیرا ککڑی کھیرا۔ انگور کا مزہ ہے رنگترے میں۔ گلابی باغ کا شیریں آلوچہ۔ برف والے قلفیاں
(قفلیاں) جما کے لے آئے۔ تو وہ ٹھنڈی میٹھی برف کھانے لگے۔ نہیں تو کیوڑہ گلاب بسی گنڈیریاں بیٹھے چوس رہے ہیں۔ شام میں نہا دھو
سفید براق سے کپڑے پہن سب عطروں میں بس گئے۔ گلے میں موتیا کے کنٹھے ڈالے۔ کوئی چوک پہ آیا، کوئی چاوڑی نکل گیا۔ کسی نے
چاندنی چوک کی سیر کی، یہاں جا بجا شربت کی دوکانیں لگی ہیں۔ بڑے بڑے اولے۔ فالودہ۔ تخم ریحاں ڈال ڈال کے طرح بطرح کے
شربت دوکاندار دے رہا ہے، کٹورے پہ کٹورے اترے چلے جاتے ہیں۔ سقے کٹورے چھلکا پلا رہے ہیں۔ بھری مشک کاندھے پر،

---

[1] کبوتروں کے لکڑی کے گھر۔ [2] اقسام کبوتر [3] اقسام کبوتر [4] جال کی لکڑیاں جس پر کبوتر بیٹھتے ہیں [5] ایک لکڑی جس میں کپڑا باندھ کر کبوتر اڑاتے ہیں۔ [6] اڑا دیا۔ [7] حلقہ میں اڑ کر۔ [8] مخالف۔ [9] ل آیا۔ [10] پکڑ لیا۔
[11] تربوز۔ [12] خربوزے۔ [13] آڑو۔

جس پر کھاروے کا تر بتر کپڑا پڑا ہوا ہے۔ بڑے تپاک سے کہہ رہے ہیں: "میاں پانی لاؤں! آبِ حیات کے دو گھونٹ پیجیئے گا۔" رات ہوئی کوٹھوں پر پلنگ بچھے۔ سفید سفید دودھ سی چادریں پڑیں ہیں۔ سرہانے مولسری، موتیا، چمپا، زرد چنبیلی کے پھول پڑے ہیں۔ خس کی گیلی پنکھیاں جھل رہے ہیں۔ کوئی کھرّی چارپائی پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہے۔ چاندنی راتیں ہوئیں تو یار دوست فالیز گئے۔ خوب تربوز، خربوزے کھائے، پھاڑوا۔ کبڈی کھیلی۔ ناچ گانا سنا۔ صبح نہا دھو کر آ گئے۔

گرمی گئی برسات آئی۔ آٹھ آٹھ دس دس دن جھڑی لگی ہے۔ کیا مجال جو ذرا کھلے۔ آسمان نظر آئے۔ ابھی پھیاں پھیاں مینہ برس رہا تھا کہ ایکا ایکی بھورے بھورے بادلوں کی ریل پیل ہوئی۔ موسلا دھار برسنے لگا۔ کئی کئی روز سورج دکھائی نہ دیتا۔ کبھی کبھی دن میں آفتاب بجلی کی طرح چمک جاتا۔ یا رات میں تاروں کے جگنو ذرا کی ذرا نظر آ جاتے۔ ورنہ آٹھوں پہر گھٹائیں تلی کھڑی ہیں۔ اس سمے باغ آباد ہو جاتے۔ کوئی خواجہ صاحب گیا۔ کوئی سلطان جی پہونچا۔ ایک سے ایک تحفہ سلونی، میٹھی، مٹھلونی چیزیں تل تل کے آ رہی ہیں۔ کہیں گرم گرم بری پراٹھے اتر رہے ہیں۔ کہیں سروئی۔ گولڑا۔ سیندوریا۔ لنگڑا آدم بھیگا ہوا ہے۔ سب بیٹھے، مزے سے ملکار رہے ہیں۔ کہیں کھم گرڑھے ہیں۔ کہیں درختوں میں جھولے پڑے ہیں، اور شہر کی بہو بیٹیاں پور پور مہندی رچائے، گلنار جوگیا، ملاگیری۔ جوڑے، دھانی چوڑیاں پہنے جھول رہی ہیں۔ لہک لہک ملار گا رہی ہیں۔ لو وہ جمنا چڑھ آئی۔ تیراکی کا میلہ لگا، دوکانیں لگ گئیں۔ خونچے والے بھی پہونچے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ سیلانیوں کے جمگھٹ ہیں۔ تیراک کمال دکھا رہے ہیں۔ دوکانوں میں گرم گرم اندرسے کی گولیاں۔ سہال۔ پھیپیاں اتر رہی ہیں۔ لوگ لے لے کر کھا رہے ہیں۔ کہیں سے یہ آوازیں آ رہی ہیں:—

"کاٹے بھونرا لے نون کے بتاشے ہیں نمکیں لو۔ پال میٹھے ڈالے ہیں جی کرانے کے لڈو والو۔ پیڑ کے پکے امرود میں سیب کا ہی مزہ ہے۔" کہیں کچا لوبک رہے ہیں۔ کوئی کھٹے چنوں کی آواز لگا رہا ہے۔ "رنگیلے چٹپٹے چنے ہیں بارہ مسالے کے۔ کرارے بھر بھرے ہیں جی، نیمو (لیمو) کے رس کے۔ نوبہار کیلے۔ بھٹے بھی لینا ہری ڈال والے! لینا جی پیتی کے کیلے میں کا مزہ۔" غرض جان کی ایک گھما گھمی اور جان میں بھی زندہ دلی کی ایک چہل پہل نظر آتی ہے۔ جس سے اپنے آپ دل کی کلی کھلے۔

جاڑے میں جاڑے کے سے ٹھاٹھ ہیں۔ سب اوڑھے لپیٹے ہیں۔ صبح آٹھ نو بجے تو کہیں جا کر لحافوں سے نکلے۔ گردالانوں کے پردے جوں کے توں ہیں۔ انگیٹھیاں روشن ہیں، پھر بھی تھر تھری چھوٹ رہی ہے۔ لے لو وہ چنے والا، حلوا پوری والا آیا۔ پھولے پھولے خستہ چنے۔ گرم گرم حلوا پوری چٹ کی۔ نہیں تو نہاری۔ خمیری روٹی اڑائی۔ دس گیارہ بجے اللہ اللہ کر کے گھر سے باہر قدم نکالا۔ اب بھی سی سی۔ ہی ہی سے چھٹکارا نہیں۔ جسے دیکھو روئی کا بنولہ بنا ہوا ہے۔ بتیسی بج رہی ہے۔ کہیں مہاوٹ برس گئی تو بس سمجھو "سردی کا باوا" آ گیا! نہ آگ میں گرمی۔ نہ دھوپ میں گرمی۔ عجب سماں ہو گیا۔ رات میں جابجا برف پڑنے لگی۔ پانی جمنے لگا۔ ولایت سے سیب۔ انگور۔ انار۔ پستے۔ بادام۔ اخروٹ۔ چلغوزے۔ کاجو۔ اور اور تر و خشک میوہ بھر بھر بوریاں چلا آتا ہے ختم ہوا جاتا ہے۔ دیسی ترکاریوں کی بہار جدا ہے۔ بازاروں، گلیوں میں غل مچا ہوا ہے۔ شاہ مرداں کی لال ریاں،

---

[1] جامنیں۔ [2] گولڑے آم۔ [3] گاجریں۔

علی گنج کی ہیں جی گرہ سے میٹھیاں۔ کاغذی[1] گری کے بھنا دئیے ہیں بادام، کاٹے پہاڑ کی سوندیاں بیچ بیچ ہی میٹھیاں۔ باغ والوں کی گنڈیریاں ہیں بیر۔ ہرے بھرے بوٹ[2] لڑیوں میں پہلے آ آدمیاں سیر میں سوا سیر ناج۔ گجرات کے چبینے ترمیوے میں کھریان لو۔ پیاری[3] لاڈو نے توڑے ہیں۔ سیر! گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر" کہیں دودھیا۔ جوزی۔ حبشی۔ گوندے کا۔ گری کا۔ پیڑی کا حلوا سوہن تھالوں میں جما اور سجا ہے، کہیں گاجر کی تری تیار ہو رہی ہے۔ کہیں قسم قسم کی گجک۔ تل بھگے کے لڈو۔ گڑا کے داری۔ ریوڑیاں ہیں۔ گھروں میں رساول[4]۔ باجرے کا سوندا سوندا ملیدہ بن رہا ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھائے جاتے ہیں۔ منہ چلے جاتا ہے۔ ادھر کھایا۔ ادھر ہضم۔ جیسے دیکھو لال لال انار کا دانہ بنا ہوا ہے۔ چلو ؤں خون بڑھ رہا ہے۔ عیدگاہ دنگل بندھ رہے ہیں۔ کالے جن والے۔ دری والے، گوندو شاہ والوں کے پٹھے لڑ رہے ہیں۔ تیتر۔ بٹیر۔ گلدم[5] کی پالیاں الگ ہیں۔ اسی زمانے پتنگ بازی کے ہاتھ[6] لگتے۔ سلیم گڈھ پر شاہی پتنگیں، تکلیں لڑنے لگیں۔ عام لوگ جنگلوں میں نکل گئے۔ کانپرا۔ بگلا۔ انگارا۔ مانگ دار۔ زلفوں دار۔ جنیو دار۔ کندے کھلی۔ سر کھلی۔ آدھ رنگی۔ پری۔ رنگ برنگ کی پتنگیں اور تکلیں اڑ رہی ہیں۔ پیچ ہو رہے ہیں۔ نیچے کا پیچ ہوا تو ایک جھول میں گھسا آتا ہے۔ دوسرا اوپر سے قطا کا سا تر رہا ہے۔ لو دونوں نے ڈوریں ملا دیں۔ پیچ چھینے لگے۔ جس کا موقعہ بنا پیچ نکال کے لے گیا۔ واہ وا کا شور مچا۔ رات میں سب رات میں سب دبکے دبکائے مردانوں میں بیٹھے ہیں۔ دیسی کرارے پان پر پان اڑ رہے ہیں۔ جن کی سہانی مہکار چلی آتی ہے۔ کہیں گنجفہ ہو رہا ہے۔ کہیں کعبتیں۔ کہیں شطرنج ہو رہی ہے۔ کہیں چوسر۔ کہیں علم کی پالی جمی ہے۔ حقایق و معارف کے دقیق مسایل طے ہو رہے ہیں۔ صغرا کبریٰ پھڑک رہے ہیں۔ رمل۔ جفر سے لگا فقہ حدیث اور جانے کیا کیا بحثیں ہوتیں۔ شاعری کا عام چرچا تھا۔ استاد ذوق، مرزا غالب کے حامی موالی جابجا تھے۔ مشاعروں میں ان کی لے دے رہتی، ہدہد۔ زاغ، زغن، کی چونچیں جدا ہوتیں۔ ایک کہتا ہے "اردو میں مرزا نوشہ کی طرز جدید تو واقعی اپنا جواب نہیں رکھتی"۔ دوسرا کہتا "غالب شعرا کے شمار میں تو ہیں نہیں۔ ایک تو انہوں نے قصیدے نہیں کہے کہ قصیدہ فن کی کسوٹی ہے۔ دوسرے بے استادے ہیں۔ اپنی خفت کے مٹانے کے لئے تو مولوی عبدالصمد نامی انہوں نے زبردستی استاد گڑھا۔ کوئی خضر راہ ملا نہیں۔ جبھی تو بیچارے تخیل کے اندھیرے میں ٹپے ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

میر صاحب[7]! تمہیں خدا کی قسم ذرا دیکھنا۔ اس میں کہاں کا فلسفہ آن ٹھنسا۔ ان باتوں سے باہر والے بھی تو منہ آنے لگے۔ ایک صاحب کہتے ہیں

---

[1] سنگھاڑے۔ [2] کچریاں۔ [3] جھاڑی بوٹی کے بیر۔ [4] گنے کے رس کی کھیر۔ [5] بلبل۔ [6] جلسے مقرر ہوتے۔

[7] میر علی احمد نام۔ مومن خاں مرحوم کے جلیسوں میں تھے۔ غدر میں سارا خاندان تہ تیغ ہوگیا۔ تنہا رہ گئے تھے۔ دلی کی معاشرت کا جیتا جاگتا نمونہ۔ علم نجوم میں لاجواب۔ مزاج میں سورج کی سی توانائی، زہرا کی سی رعنائی۔ چاند کی سی سج دھج تھی، چتلی قبر سید رفاعی کی مسجد کے سامنے بساطی کی دوکان کھول لی تھی۔ یہاں بھی علم کے رسیا جمع رہتے۔ نت نئی گتھیاں سلجھتی رہتیں نہیں تو شطرنج ہوتی۔ کوئی دس سال ہوئے انتقال ہوا۔ انا للہ...الخ

اگر خواجہ صاحب دیکھے بغیر کوئی یہ کہے کہ میں لاٹھ پر دُھر اوپر گیا تو وہاں سے کھنڈرات کا یہ منظر تھا۔ یہی لاٹھ اگر دو چار کھنڈر اور اونچی ہو جائے تو یہ نہیں یہ بات ہو گی۔ بھلا آپ ہی فرمائیے۔ ایسے بڑ بولے کو آپ کیا کہیں گے۔ نہیں تو خدارا بتائیے۔ عرش پر جانا کیا جیسے وہاں کی ہوا کبھی نہ لگی ہو۔ اس کی یہ لن ترانیاں آخر کیا معنے رکھتی ہیں؟" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا، اور میر صاحب بڑے تپاک سے بولے: "خانصاحب! یوں کہو باہر والوں کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔ مگر مشفق! تمہیں یہ باتیں سزاوار نہیں۔ تم دلی والے ہو۔ دنیا انگلی اٹھائے گی۔ یہ بھی کوئی عقلمندی ہے کہ شاعر عرش پر کب پہونچا۔ پہونچا یا نہ پہونچا؟ عرش کسی کے چچا جان کا گھر تو ہے نہیں! اماں۔ مجھ سے پوچھوں تو عرش اس کے پہلو میں ہے، جہاں اس کا ننا سا پہلو نشین خدائی کرتا ہے! یہ اور بات ہے: رانگڑوں کو اس کا دماغ نہ ہو۔ بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ یاد رکھوگے۔ یاد کروگے۔ شاعر پر الہام ہوتا ہے۔ یہ تلامذۂ رحمٰن ہیں۔ اس کی باتوں پر اسی کو زبان کھولنی چاہیئے، جسے حضرت حق یہ مرتبہ نصیب کرے۔ نہیں تو چپکا بیٹھا آدمی سنتا رہے۔" دوسرے بولے: "میر صاحب! مگر یہ تو فرمائیے استاد ذوق پر بھی الہام ہوتا ہے؟ انہیں تو قصیدے کی صورت میں ہوتا ہوگا؟" یہ سن کر میر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے: "بھئی اسیر نہ جاؤ یہ اس زمانہ کا عام رنگ تھا۔ مگر ان کی جو چیزیں واقعی الہامی ہیں ـــــ کیونکہ رطب و یابس دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے ہاں ہوتا ہے ـــــ تو یقین مانو وہ لاجواب ہیں۔ آپ یہ کہیں۔ میں تو انہیں شاعر سے زیادہ استاد سمجھتا ہوں۔ میر صاحب ہنسنے لگے اور کہا:۔ بھئی تم جو چاہو سمجھو۔ مگر عرش تک ان کی رسائی بھی دیکھ لو:۔

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوہ کی روشنی ہے

یوں نا سمجھ حضور بہادر شاہ کے کلام کو جو استاد کا نتیجۂ فکر کہتے ہیں۔ مگر استاد استاد ہیں، بادشاہ بادشاہ۔ ان میں ایک ذوق کیا، شاہ نصیر، غالب، میر، درد، اکثر کا رنگ ہے۔ زبان گھری ہے۔ سادگی، تازگی، پاکیزگی، جذبات۔ احساسات۔ اثر و گداز ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ مگر اظہار ذات میں وہ اچھوتے رہیں پر رہیں۔ اسو طیکہ صورت کی طرح انسان کے شمائل نفسی بھی ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ خارجی اثرات کے بعد بھی ظفر کا ظرف، رنگ، شوق رہنا اٹل ہے۔ یہ شاعر ہیں، کسی دن دیوان لے آؤ تو دکھاؤ: انہوں نے بھی تخیل کی نگری بسائی ہے! جو اول اول تو حسن و عشق کا آئینہ خانہ تھی! جہاں شوخی مزاج نوبہار ناز چاہتی، اور عشق و محبت مزہ دیتی رہی مگر بعد کے کلام پر آتی رنگ چڑھتا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ خدا کی بستی میں پہونچ گئے ہوں۔ جہاں انوار کی برکت سے وساوس و لوث کا جہنم خلوص کی جنت بن جاتا ہے۔ روح بیدار ہو جاتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، بس یہی مکمل حیات ہے۔ یہی ذہنی جیت کا تاج۔ اسی کی تلقین شاعری کا اصلی پیغام! جسے پہونچانے سے پہلے منشا ایزدی کا رضوان کیف و اثر کے بہشتی پھولوں میں بسا دیتا ہے۔

خیر تو اگلے زمانہ میں دلی کی گھریلو زندگی ہو یا یہاں کا عام طور پر ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا، سب کلچر میں ڈوب گیا تھا۔ یہ ایک ایسا روشن ہیرا تھی! جس کے کئی پہل ہوں اور ہر پہل نئے رنگ، نئی جوت والا ہو، اس نے غالب، داغ، ذوق، شاہ نصیر، مومن سے شاعر۔ شاہ ناصر وزیر سا بین نواز۔ مرزا کالے، مرزا چڑا، مرزا گوہر سا ستار باز، اسمٰعیل شہید سا تیراک۔ میر پنجہ کش سا

خوش نویس۔ محمود خاں سا حکیم۔ حکیم مومن خاں سا وضعدار اور ماہر علم ہیئت۔ مولوی صدر الدین، مولانا نظیر حسین سا عالم۔ خانم کے بازار والوں سے دستکار اور کاریگر بھی تو مرتے مرتے پیدا کئے۔ یہ علم و فن کا گویا یونان تھی، تو نفاست پسندی اور نازک مزاجی کا جاپان مگر افسوس آج یہ ان معنون خانہ بے چراغ، چراغ بے نور ہے، اور ہائے! ان "ہنگاموں" میں سے آج ایک بھی نہیں جو بقولیکہ اس کے عناصر حیات اور اجزائے ہستی تھے۔ نہ قلعہ رہا۔ نہ چاندنی چوک رہی۔ نہ بازار جامع مسجد، ورنہ سیر جمنا جی ہے اور پھولوالوں کی سیر!

یاد ش بخیر! پھولوالوں کی سیر کا نام آیا تو جی نہیں مانتا کہ چپ ہو جاؤں، اسے حویلی کی خاص الخاص مغلانی کی زبانی ذرا تفصیل سے سناؤں گا، یہاں ان کی میٹھی باتوں کا اصلی مزہ تو کیوں آنے لگا، ہاں جو جو سین انہوں نے دکھائے، کوشش کرتا ہوں کہ انہیں آپ بھی دیکھ لیں۔ البتہ اچھے برے کا ذمہ نہیں لیتا۔ ان مغلانی کو آغائی بیگم کہوں تو کون پہچانے گا۔ ہاں نانی جمّن کہوں تو دلّی کے اکثر گھرانے جان جائیں۔ چاندنی محل رہتی ہیں۔ بوڑھی پھونس، پلکیں تک سفید۔ بیچاری چند روز کی مہمان ہیں۔ مگر کھایا ہوا ہاڑ ہے۔ اب بھی حواس بجا ہیں۔ چلتی پھرتی ہیں۔ وہی پہلی سی ہمت۔ وہی حوصلہ۔ وہی تعلقہ۔ وہی وضعداری۔ وہی مہر و محبت۔ وہی غمخواری۔ وہی یگانگت، بات بات سے ٹپکتی ہے۔ باتوں میں منہ سے وہ پُر بہار پھول گرتے ہیں کہ آدمی میٹھا منہ تکا کرے۔ جو بات منہ سے نکلے، دل میں اترے۔ اگلے زمانے کا حسین منظر آنکھوں کے سامنے کھل جائے۔

برکھارت میں دلی کی آب و ہوا خاص طور پر گل و گلزار دکھاتی ہے! گویا پہلی سی بات آج نہیں۔ پھر بھی سیر تماشے، میلے ٹھیلے ہوتے ہیں! جہاں امیر، غریب پر نخوت و حقارت کی نظر ڈال کر خوش ہو لیتا ہے۔ عام طور پر بھی دل صاف نہیں۔ ان میں جانے کہاں کی کپٹ آن ٹھنسی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ہاں، مسلمان ہندوؤں کے ہاں جاتے لرزتے ہیں۔ بات بات پر ٹم کنا۔ ناحق کو لڑ سے مرتے ہیں۔ کہیں میلہ لگا، یا تہوار آیا تو سمجھو غضب الٰہی آگیا۔ جو ہے ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر۔ وہ پتھر چوتھ ہوئی، وہ لکڑی چلی، دم کے دم میں بیسیوں کے سر لال ہو گئے، مشین گنیں آ گئیں۔ پہرہ بندی، ناکہ بندی ہو گئی۔ جیل خانے بھرنے لگے۔ کسی کو جنم قید ہوئی۔ کالے پانی گیا۔ کوئی پھانسی پر ٹنگا۔ بچے یتیم۔ بہو بیٹیاں بیوہ ہوئیں۔ لو صاحب! برس کے برس خوشی، خوشوقتی کی جگہ یوں سوگ چھا گیا۔ ان باتوں کے کارن شرفاء نے تو سیر تماشے چھوڑ ہی دئے۔ مگر وقت و موسم کب گھر بیٹھنے دیتا ہے۔ غریب الگ پھر پھرا لیتے ہیں۔ ایک دن صبح میں نانی جمّن کے ہاں بیٹھا ہوں۔ گھٹا چھائی ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔

سب نے سلطان جی کی ٹھہرائی۔ پکڑ دھکڑ بڑی بی کو بھی ساتھ لیا۔ پہلے درگاہ شریف پہونچے۔ فاتحہ دی۔ پھر ہمایوں کے مقبرے جاکے بیسنی روٹی، بری پراٹھے۔ آم۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں۔ پھینیاں چٹ کیں۔ یہاں سے صفدر گنج کی ٹھانی۔ یہ عمارت کیا ہے؟ سنگ سرخ کا ایک گلاب ہے! جس میں سنگ مرمر کی سفید دھاریاں نازک نازک پنکھڑیوں کی گویا نسیں ہیں۔ گنبد نرا سنگ مرمر کا ہے! اور اپنے حسن و نزاکت سے خدا کی قدرت کے دریا کا فوّارہ ہوا معلوم ہوتا ہے! مدرسے آئے۔ یہاں موتی محل، جنگلی محل، بادشاہ پسند کو اجڑا دیکھا! اور ایسا معلوم ہوا،

---

[1] منصور کے مدرسہ کو صفدر جنگ اور صرف مدرسہ بھی کہتے ہیں۔

جیسے صفدر جنگ، شجاع الدولہ۔ اور رشیدی بلال کی پاک روحیں ہمارے احساسات دیکھ رہی ہوں، حوض اور نہروں میں برسات کا پانی بھر گیا تھا۔ لہلہاتے سبزے پر انگریزی پھولوں کی ہنسی کھیل رہی تھی۔ کیاریوں میں رنگ برنگ تیتریاں، درختوں پر پیاری پیاری چڑیاں اس طرح اڑتی پھرتیں، جیسے چوتھی میں گل اندازی ہو رہی ہو! یہ بھی عجیب سیر تھی! اس سمئے بڑی بی پر بھی کیفیت طاری ہوئی۔ کہنے لگیں بچوں آؤ، "تمہیں آج پاشاہی زمانے کی پھولوالوں کی سیر کا حال سناؤں۔ سیر میں حضور بہادر شاہ جب آتے تو یہاں خاصہ نوش کرتے تھے، کہتے ہیں:- حضرت اکبر شاہ بادشاہ ثانی کو یہاں کی آب و ہوا موافق (موافق) اور سیر پسند تھی۔ سدا برسات میں آ کے رہتے۔ حضور کے بیٹے نواب مرزا جہانگیر نظر بند ہو کے الہ آباد گئے، تو ان کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی " یا حضرت خواجہ صاحب! دعا کیجئے میرا بچہ اصل خیر سے چھٹ کے آ گیا! تو مزار مبارک پر بڑی دھوم سے پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔" خدا کرنا کیا ہوا۔ کچھ دنوں میں مرزا جہانگیر چھٹ آئے۔ پاشاہ بیگم نے منت پوری کی۔ تمامی کا غلاف، پھولوں کا چھپر کھٹ چڑھایا۔ اس میں شہر کے پھولوالوں نے بھی ایک پنکھا لٹکا دیا تھا۔ بس بھئی! یوں خوب میلہ لگا۔ حویلی اور شہر کی ساری خلقت ٹوٹ پڑی۔ حضور کو یہ میلہ بہت بھایا۔ سال بسال پھول والوں کو دو سو روپیہ معمول باندھ دیا۔ وہ ساون میں پنکھا چڑھاتے تھے۔ مگر اللہ بخشے دادی حضرت کہتیں " حضور بہادر شاہ بادشاہ کے پڑدادا یا سکڑ دادا کا وزیر بڑا حاجئیا اور نمک حرام تھا۔ سدا اپنے آقا کی کاٹ میں رہتا۔ ایک دن جانے کیا فریب گانٹھ کے بادشاہ کو شہر سے دور لے گیا۔ اور جان سے گزار دیا۔ میت بے گور و کفن پڑی تھی کہ خدا کی قدرت ادھر ایک ہندنی آن نکلی۔ اس نیک بخت کا بھلا ہی سا نام تھا۔ کہیں اسکی نظر پڑی۔ پاس جا کے دیکھے تو بادشاہ سلامت لہولہان ہوئے مرے پڑے ہیں۔ یہ وہیں ہو بیٹھی۔ ادھر بادشاہ کی ڈھنڈیا پڑی۔ کہیں شام و شام میت ملی۔ میت اور ہندنی کو شہر لائے۔ حضور میں پیش کیا۔ اس دن سے ولی عہد بہادر نے اسے اپنی بہن بنا لیا۔ بادشاہ ہوئے تو برس کے برس مہرولی اس کی سسرال جاتے۔ اس نیک بخت کی وفاداری کی یاد تازہ کرتے۔ لے لو یوں اس میلے کی شروعات ہوئی۔ ہندو مسلمانوں کے پیار و اخلاص کی مثال بنی۔ آگے چل کے پھول والوں کی سیر ہو گئی۔"

خیر بھئی، مہینوں پہلے پنکھے کی تیاریاں ہوتیں۔ قلعہ سے لگا سارے شہر میں رنگ برنگ جوڑے، اُن پر طرح طرح کے مصالحے ٹنک رہے ہیں، فراش، سپاہی، نوکر چاکر، خواجہ صاحب روانہ ہوئے۔ شاہی محل۔ دیوان خاص، جھاڑ بہاڑ کر فرش فروش، جھاڑ فانوس سے دلھن بنایا۔ دنوں پہلے مہمانداری شروع ہوئی۔ محلات میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ بچوں کی ایک چیخ چاخ مچی ہے۔ ایک کہتی ہے، لے بی اماں جان۔ اے بی بھابھی جان! اللہ ان حرامیوں کو رکھوائیے۔ دوئی بیوی کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اماں جان بولیں۔ لے بیٹا۔ بچے ہیں۔ کھیلتے ہیں، کھیلنے دو۔ بچپنے میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بچّا کیسے کیسے ہیں۔ بچے ہیں کہ کہیں اٹکن بٹکن کاٹ کنول بانسلی۔ کوڑی زخن مخن کھیل رہے ہیں۔ ایک اودھم مچی ہے۔ کہیں پانی کھیلا جا رہا ہے۔ لڑکی بالیاں ایڑی سے چوٹی تک شور بور ہیں ایک جو پانی سے بچ کر دوڑی دوڑی کرتی ادبدا کر بھاگیں تو مرمر کا گیلا فرش، پیر پھسل گیا یہ دھڑام سانی آن پڑیں۔ اب کیا تھا۔ تو دوڑ میں دوڑ۔ سب گرتی پڑتی آن جمع ہوئیں۔ سارا محل سر پر اٹھا لیا۔ نانی حضرت۔ دادی حضرت کہتیں " ہئے ہئے خدا نے میری بچی کی جان بچائی دو قدم پہ حوض تھا، دو پار ایسی ویسی ہو جاتی۔ تو وہ بندی کس کی ماں کو ماں کہتی —— دونوں وقت اچھے سے اچھے کھانے۔ پان زردہ۔

بن ڈلیا۔ الائچیاں۔ صبح ناشتے میں حلوا پوری کچوریاں۔ مٹھائیاں خوانوں میں لگائے۔ سبز[1] سبز خوان پوش ڈالے جسولنیا بانٹتی پھرتی ہیں۔ دن رات گانا بجانا۔ آپس میں چہل۔ پچھے ہو رہے ہیں۔ دو دن پہلے مشاطاؤں نے سنگار و ان سنوارے۔ زر و زیور۔ سرمہ مسّی۔ لاکھہ۔ قرینے سے رکھا۔ چاندی کی لگنوں میں مہندی بھیگی۔ انا چھوچھو۔ انا ہیو۔ اکی ڈھکی مبارکبادیاں گاتی جاتی ہیں۔ مہندی لگاتی جاتی ہیں۔ سب نے پور پور مہندی لگائی۔ لال لال مہندی بند باندھا کچھ نانی حضرت، دادی حضرت کو گھیرے بیٹھی ہیں۔ کچھے دار باتیں سن رہی ہیں۔ کچھ الگ بیٹھی باتیں ملکا رہی ہیں۔ نیند اڑا رہی ہیں، ہمسن، ہمجولیوں میں کوئی شامت کی ماری چپکے سے اٹھ کونے کھدرے پڑ جاتی تو سمجھو غضب آجاتا۔ بڑی بری گت بنتی۔ دوسری غیر نفسیاں ٹالم ٹول ٹال مٹول کر جا دھمکتیں۔ وہ غیر، کامنی مورت، پیاری صورت ڈوبٹہ تانے سوتی ہے۔ نیم باز آنکھیں۔ گورے گورے گالوں پر تندرستی کی لالی۔ یہ مہین ڈوپٹہ سے ایسی جھمکتی جیسے آب رواں کی صافی سے گلاب! انہوں نے توے کی کالک، تیل خوب سا بچاری کے منہ پر تھیٹر ہزاروں پھبتیاں اڑائیں۔ وہ کھسیانی ہو کر کہتی "دیکھو بھئی! یہ ہنسی ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بیکے منہ کالا کر دیا۔ اب ہم سے کوئی کلام نہ کرے۔ اس پر سب کھلکھل ہنستیں اور اُڑا دیر چٹکیوں میں اڑاتیں۔ آپا جی! ہم تو جلوں کو جلائیں گے۔ نون مرچیں لگائیں گے۔ صبح میں کوئی کہتی، بولی انا چھوچھو نے تو میرے بائیں ہاتھ میں خاصے چور ڈال دیئے۔ میں آگے ہی کہتی تھی۔ اس ہاتھ کی مہندی ٹھیک نہیں۔ مگر ان اللہ کی بندی نے ایک نہ مانی۔ اپنا ہی کرنا کیا۔ نا بھئی! ایسی بھی ہٹ کس کام کی۔ لو بوا دیکھنا۔ ان کا کیا گیا۔ میرے ہاتھ تو کچے لہو ہو گئے۔ دوسری بولی، مجھے تو یہ موئی مہندی ہی دو کوڑی کی معلوم دیتی ہے۔ نگوڑے میرے ہاتھ جو پھیکے پڑے۔ تیسری بولی؛۔ لو اور سنو۔ اچھی فرید آباد کی رچنی مہندی بھی اب ایسی ہی ہونے لگی۔ چوتھی نے تنگ کر کہا "ان کی تو ناحق کی باتیں ہیں۔ آپا بیگم! قسمیں خدا کی قسم۔ ذرا دیکھنا۔ کیسی شاہانہ تو مہندی رچی ہے بیر بہٹی ہاتھ ہو گئے۔ اس پر بھی چین نہیں۔

ایک دن پہلے محل کا تانتا روانہ ہوا۔ خاصگی رتوں میں تورے[2] داریں۔ حرم۔ سریت۔ ناموس۔ تصرفی میں لونڈیاں، باندیاں کارخانے والیاں چلی جاتی ہیں۔ فوج سپاہی ساتھ ساتھ ہیں۔ خمریاں رتھوں سے لگی لگی دوڑ رہی ہیں۔

اللہ خیریں ہیں خیریں رہیں گی
. . . . رہیں گی
تیرے من کی مرادیں ملیں گی
. . . . ملیں گی
تجھے حق نے دیا ہے
. . . . دیا ہے

---

[1] سبز رنگ بادشاہی رنگ تھا۔ [2] عزت دار۔

تیرے بٹوے میں پیسا دھرا ہے

.... دھرا ہے

تجھے اللہ نوازے دئے جا

.... دئے جا

تجھے مولے نوازے دئے جا

.... دئے جا

دوسرے دن دھن سے فجر کی توپ چلی۔ ساری حویلی میں جاگ ہو گئی۔ خوابگاہ میں حضور بہادر شاہ بھی بیدار ہو کلمہ پڑھتے مسہری پر اٹھ بیٹھے۔ جسولنی نے آواز دی۔ خبردار ہو۔ نقیب چوبداروں نے جواب دیا۔ اللہ رسول خبردار ہے۔ سب نے تپاک سے مجرا کیا۔ دعائیں دیں ترت دھانی مخمل کی زیرپائی رکھ دی۔ بادشاہ سلامت اٹھے۔ چاندی کی طشت چوکی پر گئے۔ ادھر زری کے زیرانداز پر چلمچی آفتابہ لگا دیا رومال خانیوالیاں رومال، پاؤں پاک، بینی پاک لئے حاضر ہیں۔ جسولنی نے صندلی چوکی پر ایرانی مصلےٰ بچھا دیا۔ حضور تشریف لائے۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھتے ہو بیٹھے۔ اتنے میں فجر کی دیوی کا نورانی چہرہ اور روشن ہو گیا۔ جسولنی نے عرض کی۔ حضور حافظ جی حاضر ہیں۔ فرمایا۔ ہوں۔ لو وہ پردہ ہو گیا۔ آگے آگے جسولنی۔ پیچھے پیچھے منھ پر رومال ڈالے حافظ جی چلے آتے ہیں۔ مجرا کیا۔ پاؤ پارہ کلام اللہ کا سنا، بادشاہ سلامت نے اس تعلقہ سے پڑھا کہ جی تڑپ گیا۔ وہ گئے نہ گئے کہ پگڑی والے[1] آئے۔ مجرا کیا۔ نبض دیکھی۔ خیریت کی مبارکباد دی۔ رخصت ہوئے۔ شاہی دواخانہ سے سبز کمخواب کے کشنے میں کسی جھرنگی تبرید بھجوائی۔ دواخانہ والیوں نے سامنے جھر توڑ نوش جان کرائی۔ عرض معروض سنی۔ ٹھنڈائی نوش کیا۔ حمام کا حکم دیا۔ یہاں توشہ خانے والیوں نے مخمل کا دست بقچہ۔ حمام خانے والیوں نے چاندی کی بیسدانی۔ کھلی دانی۔ ابٹنادان۔ لوٹے۔ آبخورے۔ گنگال۔ کنگھی۔ جھانوا۔ رومال خانے والیوں نے چھوٹے بڑے رومال، پاؤں پاک، بینی پاک جواہر خانے والیوں نے جواہرات حاضر کئے۔ روشن چوکی بجنے لگی۔ ایلو! جہاں پناہ حمام تشریف لے آئے۔ اس میں تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ کمرہ نما۔ اجالہ تک سنگ مرمر، اس پر منبت کاری ہوئی ہے۔ مشرق میں جالیاں اور آئینے لگے ہیں۔ اس میں سے دریا، جنگل، اور سبزے کی بڑی بہار دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے درجہ میں شمال کی جانب مرمریں شہ نشیں ہے۔ اس پر بہت تحفہ منبت کاری اور پچیکاری ہے۔ آگے نرا سنگ مرمر کا ایک چوکور درجہ ہے۔ طرح طرح کے بیل بوٹے، پھول پتے بنے ہوئے ہیں۔ بیچوں بیچ پر حسین کام خوشنما مربع حوض ہے۔ اسی کے گرد نہر ہے جس میں جب چاہو گرم اور جب چاہو ٹھنڈا پانی آتا ہے۔ یہ درجہ بھی بڑی بہار کا ہے۔ جہاں پناہ غسل سے فارغ ہوئے بیٹھک آئے۔ محلوں میں بیگماتیں، شاہزادیاں کیا ہیں، گویا نور سرور کی پتریاں پڑی پھرتی ہیں۔ ایک ایک کامنی کو پل۔ کوکتی کوئل۔ سب کی سب ملی جلی۔ گلناری۔ گل شفتالو۔ دھانی۔ سرمئی۔ اودا۔ گیندئی۔ بھاری بھاری سا جوڑا پہن رہی ہیں۔ کسی نے رادھا نگری کی تہ پوشی پسند کی۔ جس پر کھجور چھڑی۔ لہر بیچ بیل کا بدر دم۔ چنبیلی یا ماہی پشت کا سمندر جال بنا ہوا ہے۔ کسی نے کمخواب گلبدن، مشروع، اطلس یا زربفت کا غرارے دار یا تنگ موری کا پاجامہ پہنا۔ جس پر کارچوبی گلدستے۔ گردندے کی بیل اور دیکھت بھولی کا نازک جال

[1] حکیم جی۔ ۱۲ حقہ

پڑا جگر جگر کر رہا ہے۔ بنارسی زری بوٹی مقیشی تاروں کی کریب گلشن۔ آب رواں۔ شبنم کے ڈوپٹے نکلے۔ ان پر مرمرے کی توئی کا چوڑی لیس۔ کیڑے پر کی توئی۔ موتیوں کی توئی۔ نئی جان چھپا۔ پیک یا سلمے ستارے کی توئی ٹکی ہے۔ بھئی یہ کپڑے تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگے تم ٹھہرے چودھویں صدی کے۔ نئی روشنی کے۔ برا نہ ماننا۔ یہ اس لئے کہتی ہوں۔ اب کچھ ہی ہوا چل گئی ہے۔ کوئی برس بھر ہوتا ہے، میں نام تو لیتی نہیں۔ ایک شریف گھرانے کی لڑکی نے جو بھرے جلسے میں اگلے لوگوں کو توم ڈالا۔ بات بات میں باپ دادا کی فی نکالتی! ایک منھ میں ہزار صلواتیں سناتی تھی۔ مگر بیٹا! مجھ سے پوچھو تو گریبان چاک۔ بن آستینوں کے کرتے۔ اونچی ایڑی کی جوتیاں انہیں کو مبارک جو تم چار کو منھ پر ناک رکھیں اور چوٹی کٹا بیٹھیں۔ ہے ہے بھلا یہ بھی موا کوئی پہناوا ہے کہ ہوٹیوں کا سینہ، بغلیں دکھائی دے رہی ہیں۔ آج وہ ہڈ را گیا ہے کہ یہ بڑی عزت کا پہناوا گنا جاتا ہے۔ باپ دادا کے پہناوے میں تو جہان کے کیڑے پڑ گئے۔ اس میں کچھ ایسے لعل لگ گئے ہیں کہ سب مٹے جاتے ہیں۔ ارے میں کہتی ہوں "کیوں تمہاری عقل پہ ٹکلی پڑ گئی۔ کیوں تمہارے دماغ میں خنّاس سمایا ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔ کیوں صدقے کے کپڑوں پر اتراتے ہو۔ یاد رکھو ان باتوں سے تم ان کی نظروں میں بھی گر گئے۔ جن کی ریس پر جان دیتے ہو۔ وہ نئے نہیں اتنا وہ بھی سمجھتے ہیں، جب تم نے باپ دادا کی پت نہ رکھی تو وقت پر ان کیا رکھو گے۔ تم رہے بن پینڈی کے بدھنے، تمہیں قرار مل چکا لو صاحب! یوں یہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ اب جیسا جس کا پہناوا، ویسی اس کی باتیں۔ اور تو اور دیکھا دیکھی میاں بیوی کا رشتہ جو دنیا دکھاوے کا رہ گیا، شام ہوئی میاں نے اپنی راہ لی۔ بیوی نے اپنا رستہ دیکھا۔ اُن کو اِن کی خبر نہیں۔ اِن کو اُن کی خبر نہیں۔ یہ کیا تو خیر سے آجکل کا فیشن ہے (میں نے دیکھا، بڑی بی کا پارہ تدریجاً چڑھا جاتا ہے۔ یہاں رات کم۔ سانگ بہت ہے۔ جھٹ پٹاری اور بن کٹی آگے سرکا دی یہ ٹھہریں پان کی رسیا! ادھر جھک گئیں۔ اور پان بناتے بناتے پوچھنے لگیں۔ ہاں تو بیٹا میں کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا، نانی! آب رواں شبنم کے ڈوپٹوں پر نئی جان نکلی ہے) ہاں! اسیر کی نفیری کئی دن ہوئے بج چکی۔ سارا شہر خواجہ صاحب امڈا جاتا ہے۔ امیر گھیوں، فنٹوں میں، رنڈیاں رتھوں، غریب غربا پیدل، بہلیوں میں تخیں مچاتے چلے جاتے ہیں۔ آج حضور بہادر شاہ بھی سدھار رہے ہیں۔ لال پردے[1] سے حویلی کے صدر دروازے تک کہیں دربان، مردھے، چوبدار کھڑی دار پگڑیاں۔ نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں۔ سرخ شمالی رومالوں سے کمر باندھے دست بستہ کھڑے ہیں۔ کہیں قلار، ڈھلیت، خاص بردار لال بانات کے انگرکھے۔ سبز پگڑیاں۔ کالے پھیٹے سر پہ کسے۔ کندھوں پر بندوقیں۔ پیٹھ پر ڈھال۔ کمر میں تلوار لگائے بت بنے کھڑے ہیں۔ دیوان خاص کے صحن میں اعتبار الملک اور عمدۃ الحکما وزیر شمس الدولہ بخشی۔ معین الدین ناظر۔ سیف الدولہ اور بھی انیس الدولہ وکیل۔ راجہ مرزا بہادر۔ راجہ بہادر۔ میر عدل۔ میر منشی۔ میر توزک اور جانے کون کون امیر امرا اپنے اپنے مرتبے مودب کھڑے ہیں۔ قلعہ کے دروازے سے دلی دروازہ تک دائیں بائیں سوار۔ پیادے جدا بنے سنورے پرا جمائے ہیں۔ بازار میں دوکانداروں نے پیاری پیاری محرابیں بنائی ہیں۔ ان میں کوئی نری پھولوں کی ہے، کوئی زربفت کی ہے۔

---

[1] دیوان خاص کے دروازے پر لال بانات کا بڑا سا پردہ کھنچا ہوتا تھا۔ یہ تیسری آداب گاہ کہلاتی تھی۔ نقار خانہ کا دروازہ پہلی اور دیوان عام میں بڑا دروازہ جس میں موٹی سی لوہے کی زنجیر ہے، دوسری آداب گاہ کہلاتی ہے۔

کوئی مشجّر کی ہے۔ کسی میں یاں سے واں تک سبز گوٹے لگے ہیں۔ کسی میں آئینے ہیں، سڑکوں پر پیاپے چھڑکاؤ ہو رہی ہے، دوکان مکان دلہن بنے ہیں۔ سڑک کے رُخ کی ساری چھتیں شہر کی بہو بیٹیوں سے بھرپور ہیں، کہیں چلمنیں پڑی ہیں۔ کہیں چادرے تنے ہیں، یاں سے سواری دیکھی جا رہی ہے۔ خیر تو ایک کیفیت آ رہی ہے۔ محلات میں الگ دھوم مچی ہے۔ مشاطائیں سنگار دان کھولے بیٹھی ہیں۔ سر سری جھومر ہانے۔ چھپکے۔ بالے۔ بجلی بالے۔ کرن پھول۔ موتی پاک۔ سیس پھول۔ جھمکے۔ کھٹکے۔ چھڑے۔ کڑے۔ حباب۔ مگر چودانیاں۔ مٹھیاں، چوہے دنتیاں۔ پہونچیاں۔ پٹڑیاں۔ نوگریاں۔ جہانگیریاں۔ چوڑیاں۔ ٹیکہ۔ پتے۔ بالیاں۔ چاند۔ جگنی۔ چمپا کلی۔ گجرے کا توڑا۔ موتیا کا توڑا۔ گلوبند۔ بھوج بند۔ کنٹھی۔ ٹیپ۔ دولڑی۔ ست لڑی۔ دہگدھی۔ ہیکل۔ چندن ہار۔ کیری۔ جوشن۔ نورتن۔ نونگے۔ اِکے۔ توڑے۔ پچھے۔ پازیب۔ چوراسی۔ جھانجن۔ نکال رہی ہیں۔ ان میں جسے جو جو چیز بھاتی۔ مشاطائیں پہناتیں۔ بال بال گج موتی پروتیں۔ کوئی زرروز یور پہن رہا ہے۔ کسی کے ابھی جوڑے بھی بھاویں نہیں۔ ایک نکالا جاتا ہے۔ دوسرا نکالا جاتا ہے، ایک بیٹھی کہہ رہی ہے "اری گلشن! اری سوسن! اری مان کنور! اری چنچل کنور! دیکھ تو میری لال مخمل کی بقچی تو دے آ۔ میں تو لاہی پھلکاری کی انگیاں کرتی پہنے لیتی ہوں۔ سوسن جو بھونچال بن کے چلی تو اڑا ادھول دند سے منھ! چھن چھن ساری چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں لو وہ کونے میں کھڑی ہو منھ میں بڑبڑا رہی ہے۔ زبان چلا رہی ہے۔ شہزادی بیگم نے دیکھا فضیحتاں کیں۔ لو اور سنو۔ چڑیل کی عقل ماری گئی ہے۔ اری تجھے کسی نے گرا دیا ہے جو منھ تھتائے بڑبڑا رہی ہے۔ موئی بھونچال کہیں کی۔ سو بار جتایا۔ مگر کیا مجال جو ہٹ دنگی اپنی چال چھوڑ دے اب سر کے لگی بھی یاد ہیں گڑ گئی۔ دیکھ! بوند سا دن ہے۔ یہ جاتا ہے! آتا نہیں۔ مرلی اور چوڑیاں پہن لے۔ وہ ایسی کہاں کی شہانی تھیں کہ میسر نہ آئیں گی۔ دوسری کہتی "اچھی آپا بیگم! ذرا ادھر بھی دیکھ لو۔ دوئی! ایسی بھی کا ہے کی آپا دھاپی پڑ گئی۔ ہائے اللہ! میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ سب آپ آپ کو ہو گئے۔" آپا بیگم بولیں۔ "بیٹی بنو! ناحق الاھنا دیتی ہو۔ تمہیں تو کہتی تھیں الائچی بہن سے صلاح لیکر پہنو نگی۔ لو آؤ شوق سے پوچھو۔ میں نے منع کیا ہے۔ بھلا آنکھوں پر کہیں پلکوں کا بھی بوجھ ہوتا ہے۔" تیسری بولیں "اے بی زناخی! ذرا بوبو۔ دد دکو آواز دینا۔ وہ تو جا کے بیٹھ گئیں۔ میں نے رات ہی کو سمجھا دیا تھا۔ مگر وہ کسی کی مانتی ہیں۔ ایسی تو مغلانی جی اب ان کے لئے بیٹھی ہیں، جو یہ کرتی تکوالائیں گی۔" بی زناخی بولیں "ہاں بی آغا مینا! سچ کہتی ہو۔ نوج ان کا سا بے شعور خدا کسی کو کرے۔ اچھی میں کہتی ہوں۔ رات ہی کو یہ چلی جاتیں تو ان کے پاؤں کی کونسی مہندی گھس جاتی۔ اچھا! کپڑے لئے زرروز یور پہن چکیں تو یہ الٹھرا سہیلیاں۔ ہمسن انلینیاں بسم اللہ کے گنبد سے نکل چھم چھم، چھم چھم پاشا بیگم کے حضور آئیں۔ تپاک سے کورنش بجا لائیں۔ پاشا بیگم کسی کو کہتیں "ہزاری عمر۔ نیک نصیب۔ دلہن بنو" کسی کو کہتیں "عمر دراز۔ بوڑ سہاگن۔ سائیں جئے۔ چاند سا بیٹا ہو" یوں دعائیں لیتی باری باری نذر دے قاعدے قرینے سے ہو بیٹھیں۔ یہاں بھی نت نیا سبھاؤ ہے۔ ملکہ زمانی چندے آفتاب چندے ماہتاب، نک سے سک تک سونے میں پیلی۔ موتیوں میں سفید۔ گوندنی کی طرح لدی، بھندی زردوزی مسند پر گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہیں۔ سامنے گنگا جمنی سنگ لگی ہے، جس میں سے خمیرہ کی سوندی سوندی مہکار چلی آتی ہے۔ بازو میں چاندی کی تپائی پر زردوزی زیرانداز، اس پر سونے کا بڑا عمدہ ہمالیدار خاصدان تپائی کے نیچے چاندی کا اگالدان رکھا ہے۔ ایک طرف بڑے انداز سے سہاگ سیج بچھی ہے [illegible]

تاش تمامی کے پردے پر جوئی جنبیلی۔ مولسری کا جال گجرے۔ لڑیاں۔ پڑی مہک رہی ہیں۔ صحن میں خواجہ سرا۔ نوکر چاکر۔ ماما اصیلیں لونڈیاں باندیاں ادب سے ہاتھ باندھے حکم کی منتظر کھڑی ہیں۔ لے لو! بادشاہ محل میں داخل ہوئے۔ جسولنی نے آواز دی، خبردار ہو۔ ادب سے۔ نگاہ روبرو بیگماتیں سرو قد کھڑی ہوگئیں۔ مجرا کیا۔ حضور نے سب کو ساتھ لے کے ناشتہ فرمایا۔ بھنڈا نوش کیا۔ گھنٹہ بھر بعد آب حیات مانگا۔ پانی پیا تو سب کھڑے ہوگئے۔ پی چکے تو سب نے مزید حیات کہا۔ اشارے کے ساتھ کہاریاں ہوادار لے آئیں۔ حضور نے کھڑے ہوکر تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ خیر سوار ہوگئے۔ چڑھی بڑھی بیگماتیں اور شاہزادے بھی ناکی اور عماریوں میں ساتھ ہوئے۔ جسولنی نے آواز دی: خبردار ہو۔ مہابلی بادشاہ سلامت۔ نقیب چوداروں نے جواب دیا۔ "اللہ رسول خبردار ہے"۔ حضور عالم پناہ برآمد ہوئے۔ سب نے ادب سے مجرا کیا۔ چوبدار للکارے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ رسول کی امان۔ دوست شاد۔ دشمن پامال۔ بلائیں رد۔ مگر اصل میں یہ دربار عدالت کا وقت ہے۔ اور اس وقت دربار ہوتا۔ حضرت پیر و مرشد تخت طاؤسی پر بیٹھے ہیں۔ امیر۔ امرار۔ وزیر۔ وکیل۔ میر عدل۔ میر منشی۔ بخشی۔ ناظر۔ محرر۔ متصدی ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ باری باری کاغذ پیش کرتے حکم احکام حاصل کرتے ہیں۔ عرضی بیگی بھی کھڑا عرضیاں پیش کررہا ہے۔ مگر آج عدالت کے کام کی چھٹی ہے۔ اب جہری دربار بھرے گا۔ جب تک حضور رہیں گے وہاں کام ہوگا، ہاں تو حضور بہادر شاہ بادشاہ برآمد ہوئے۔ دبلے پتلے۔ میانہ قد۔ لمبی گردن، کلبوترا چہرہ۔ سانولی رنگت۔ ستواں ناک۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ سفید بگلا سی ڈاڑھی۔ سر سے اوپر جیسے اللہ میاں کا نور۔ کہاروں نے جھٹ ہوادار لے لیا۔ لال حویلی کے صدر دروازے تک اردا بیگنیاں مردانے کپڑے پہنے۔ سر پر سبز سبز پگڑیاں۔ کمر میں لال لال دوپٹے باندھے۔ ساتھ ہیں۔ ترکنیں۔ قلماقنیاں بلم جریبے ہیں۔ خواجہ سرا گنگا جمنی مورچھل کرتے جاتے ہیں۔ جسولنیاں پکار رہی ہیں۔ خبردار ہو حضرت جہاں پناہ سلامت۔ امیر امرا بھی ہوادار کا پایہ پکڑے اپنے اپنے رتبے سے چلے جاتے ہیں۔ جونہی سواری صدر دروازے کے نئے آئی۔ امیر امرا پایہ چھوڑ الگ ہوگئے۔ توپیں دغیں۔ زنبورکیں[1] چھوٹیں۔ وردیاں بجیں۔ ساری فوج نے سلامی اتاری۔ شہدوں میں سے ایک نے آواز دی۔ الٰہی! ایک سال یہ ہزار اور نصیب ہوں خدا کرے۔ باقیوں نے اس زور سے آمین کہی کہ خاصے گھوڑے بھی چمک اٹھے۔ بادشاہ بھر بھر مٹھیاں روپے۔ دوانیاں۔ چونیاں پھینک رہے ہیں۔ سواری رساں رساں آگے بڑھتی جاتی ہے، بھنڈا بردار بھنڈا لئے، ہوادار سے لگا لگا جاتا ہے۔ بھنڈے کا پیچ بادشاہ نے لے لیا ہے۔ خاص بردار آب حیات کی مراحیاں شورے میں بجھی۔ سفید سفید آبدار اس کی صافیاں پڑی لئے ہیں۔ گھڑیالی ریت کی گھڑیاں۔ کہار پنکھا آفتابی۔ حبشی قلار چاندی کے شیر دہاں سونٹے۔ نقیب چوبدار گنگا جمنی عصا لئے پکارتے جاتے ہیں۔ "بڑھے جاؤ صاحب۔ بڑھاؤ قدم کو جا بجا سے۔ حضور عالم پناہ بادشاہ سلامت"۔ ڈھلیت بندوق ڈھال۔ تلوار لگائے جارہے ہیں۔ ان کے آگے خاصے گھوڑے گنگا جمنی ساز۔ پوزی۔ دمچی ہیکل۔ گنڈے۔ پٹھوں پر پاکھریں، پاؤں میں جھانجن۔ سر پر سنہری کلغیاں۔ مخمل کے کارچوبی غاشیے پڑے چھم چھم، چھم چھم کلائیاں مارتے چلے جاتے ہیں۔ اہلو پہلو دکانوں۔ کوٹھوں سے رعایا برابر سلام کرتی۔ دعائیں دیتی۔ بادشاہ سر کے اشارے سے جواب دیدیتے ہیں۔ یوں سواری بادبہاری شہر کے

---

[1] اونٹوں پر کاٹھیاں کس کر جو بڑی بڑی بندوقیں رکھتے تھے، انہیں زنبوریں کہتے تھے۔

باہر آئی تو بھئی ! جلوس ٹھیر گیا۔ سلامی اتاری اور حویلی چلا گیا۔ مہرولی تک ہرکاروں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ بادشاہ چہڑی سواری ہو چھ گھوڑوں
کی گاڑی میں براجے۔ اس میں نالکی کا سا بنگلہ۔ سنہری کلسیاں۔ گنگا جمنی چھجہ ہے۔ کوچبان ایک سی وردیاں پہنے گھوڑوں پر سوار ہانک رہے
ہیں۔ آگے آگے سانڈنی سوار۔ پیچھے سواروں کا رسالہ۔ آبدار جھنڈا لئے۔ چوبدار عصا لئے گھوڑوں پر بگھی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بگھی پہلے
سلطان جی۔ پھر ہمایوں بادشاہ کے مقبرے ٹھہری۔ سب نے فاتحہ پڑھی۔ پھول چڑھائے۔ یاں سے چلکر سواری بادبہاری سیدھی مدرسہ
آ گئی۔ یہاں راوٹیاں۔ یک چوبے۔ دوچوبے۔ پنچوبے خیمے کھڑے ہیں۔ ایک طرف بڑا سا شامیانہ ہے جس کے بیچوں بیچ ایک چبوترہ
چبوترے پر بادشاہ کی مسند لگی ہے۔ پیچھے دوزنانے سے خیمے کھڑے ہیں۔ ان کے اردگرد بڑے بڑے سبز سرا پنچے[1] کھینچ دئے گئے ہیں۔ مقبرے
کے باہر بھی قناتیں لگی ہیں۔ یہاں بیسوں چولھے گرم ہیں پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ ان میں کہیں گیلانی
ایرانی۔ نورمحلی۔ زمردی۔ نرگسی۔ موتی پلاؤ دم ہو رہا ہے۔ تو کہیں مغلئی دوپیازہ۔ چاشنی دار مچھلی۔ خاصے کے کریلے۔ شاہ پسند دال
قلیہ کندن۔ کوفتے۔ پرسندے۔ کئی طرح کا دلمہ۔ دوغ۔ بورانی۔ رائتا۔ ثمنی۔ لوزانی حسینی۔ شامی کباب۔ شلغم پر۔ مرغ سالم۔
سموسے۔ لقمیاں تیار ہو رہی ہیں۔ ایک طرف دیکھو تو ہوائی چپاتیاں۔ پرت کے پراٹھے۔ اتر رہے ہیں۔ دوسری طرف تندور (تنور) سے ترتر
باقرخانیاں۔ تافتانی۔ نان یزدی۔ نان تنک۔ نان گلزار نکل رہی ہیں۔ مٹھاس میں متنجن۔ یاقوتی۔ من سلوے۔ زمش۔ کھجلے۔ قتلمے۔ حلوا سوہن
امرتی۔ پستہ مغزی۔ اندرسے کی گولیاں۔ سہال دربہشت۔ اور جانے کیا کیا بن رہا ہے۔ ادھر پکوان ہو رہے ہیں۔ ادھر بیگماتیں، شاہزادیاں
شہزادے۔ سواریوں سے اتر مدرسہ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ کوئی ہکا بکا پھر رہا ہے۔ کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی تھک تھکا کر
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لیٹا آرام لے رہا ہے۔ ایک کھڑی ہنسا رہی ہیں "اے بی دشمن! اے بی جانمن! اچھی، آؤ ہم تم سیڑھیوں پر سے
اتریں۔ دیکھیں کون جلدی اترتا ہے۔ وہ کہتی ہیں "بوا ہوش کی لو۔ حواسوں کا صدقہ دو۔ کہیں کسی کا ہاتھ منھ تڑوا دو گی۔ انا دوانے
سنا تو بلبلا کے کہنے لگیں "میں واری۔ میں صدقے۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔" انہوں نے جواب دیا "چلو بی تم چپکی بیٹھی رہو تمہارے
پھسلاسڑوں میں کوئی نہیں آتا۔ تم یونہی پھپھیر مولا لے کیا کرتی ہو۔ اتنے میں دوپہر بج گئی۔ نعمت[2] خانہ تیار ہوا۔ دسترخوان چنا
گیا۔ کھانوں پر سونے چاندی کے ورق جھک رہے ہیں۔ گلاب پاشوں سے۔ مشک۔ زعفران۔ عنبر۔ گلاب۔ کیوڑے کا آمیز چھڑکا جا رہا
ہے۔ خوشبوؤں کی لپٹوں پہ لپٹیں چلی آتی ہیں۔ دسترخوان سے لگی بیچوں بیچ صندل کی چوکی بچھی۔ چوکی سامنے تیک[3] پر آلتی پالتی
مار حضور آن بیٹھے۔ رومال خانے والیوں نے کارچوبی زیرانداز پر پہلے گنگا جمنی چلمچی رکھ ہاتھ دھلائے۔ گھٹنوں پر زانو پوش ڈالے، دست پاک
بینی پاک آگے رکھ دئے۔ شاہی خاصے کے خوان بڑی پڑتال سے آ رہے ہیں۔ داروغہ جی بیٹھی حضور کے سامنے، مہر توڑ توڑ کے دیکھ بھال
کرتی، خاصہ چنتی جاتی ہے۔ اہلو پہلو بیگماتیں شاہزادے۔ شاہزادیاں بیٹھی ہیں۔ حضور پر نور کبھی مرزا شبو۔ کبھی مرزا فخرو۔ کبھی مرزا جواں بخت کو

---

[1] قناتیں۔ [2] شاہی خوان کے چوطرف مہین جالی کا پردہ ڈال دیا جاتا تھا، تاکہ مکھیوں سے امان ملے۔
[3] گول گپہ۔

اسّ دیتے۔ یہ ادب سے سروقد کھڑے ہو کر مجرا کرتے۔ کبھی ملکۂ دوراں اور شاہزادیوں کو دیتے یہ بھی نیچی نیچی لجائی نظروں سے باادب اٹھتیں۔ آداب بجا لاتیں۔ یہ تو خیر شاہی دسترخوان ہوا۔ اور سب بھی اچھا کھاتے۔ اچھا پہنتے۔ بڑی تمیز تہذیب سے رہتے تھے۔ یوں اب جس کا جو جی چاہے کہے۔ کیوں بُئی تم نے بھی سنا۔ ایک بچارے وکیل کی جورو کو تو دلّی برائی کی پوٹ ہی دکھائی دی۔ کھانا پینا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ بات چیت سب کو نوازا ہے۔ اس بڑھ بولی سے کوئی پوچھے۔ بیوی! دلی دلی تو بہت گاتی ہو۔ سمجھتی بھی ہو "دلی تھا کس چڑیا کا نام"۔ دلّی، دلّی والوں سے تھی۔ جو محبت۔ مروت والے۔ دکھ درد کے شریک۔ دشمن کو بھی دکھ میں نہ دیکھ سکتے تھے، جسے دیکھو شاہانہ دماغ۔ خود کو ئے دیئے۔ کسرتی سڈول بدن۔ نڈر۔ دل والے۔ ان کا چلنا پھرنا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ جو چیز تھی اپنے رنگ کی۔ سب سے الگ تھلگ بڑے ملنسار۔ سب سے جھک کر ملتے۔ بگڑتے تو لاٹ کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ جب دیکھو ہونٹوں پہ ہلکی ہلکی ہنسی کھیل رہی ہے۔ باتوں میں منہ سے پھول گر رہا ہے۔ آج یہ لوگ ہیں جو دلی کی تمیز تہذیب کو اگٹ جاتا ہے؟ جس دن یہ تیلیوں کی طرح بکھرے۔ سمجھو "اسی دن" دلی کا سہاگ بھی اجڑ گیا۔ اب شہر دلّی نہیں دہلی ہے۔ باہر والوں کی بستی ہے۔ یاں نہ وہ پہلے سے ہاڑ رہے نہ عمریں رہیں۔ کل کے بچوں کو دیکھتی ہوں بوڑھے ہو گئے۔ تیس چالیس نگوڑوں کی عمر۔ چلتے بنے۔ اگر جئے تو بسور رہے ہیں۔ روئے دیتے ہیں۔ کھانسنے چھینکنے ہی سے فرصت نہیں۔ جسے دیکھو واؤ[1] کی صورت بنا ہے۔ دوائیوں کے بل جیتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی جینا ہے زبردستی کو دن پورے کرتے ہیں۔ برکت ہے کہ ہر چیز سے اڑی جاتی ہے۔ جہاں دیکھتی ہوں ہاؤ ہاؤ ہے۔ سوؤں کی کمائی ہے۔ پھر بھی پیسہ پیسہ کو کاؤ رہے۔ ڈھونڈتے پڑے پھرتے ہیں۔ اگلے وقتوں تھوڑی کمائی۔ زیادہ روٹی تھی۔ صبر سے کمایا۔ صبر سے کھایا۔ نہ ہے ہے تھی نہ پھٹ پھٹ۔ اب کچھ طور ہی دوسرے ہیں۔ چھاجوں پانی برستا ہے۔ منوں اناج ہوتا ہے۔ پھر دیکھو تو کال ہے۔ پیدا نہیں۔ موا اسدا کا کال ہی ہو گیا۔ کال کیوں نہ ہو۔ جو چیز ہے، بھر بھر بوریاں چلی جاتی ہے۔ لڑے کوئی، شامت ہماری آئے۔ کھانے کو ہم دیں۔ مرنے کوئی کرے۔ روپیہ ہم دیں۔ جب ہی تو ننگے بھوکے ہو کر رہ گئے۔ پہلے یاں کی چیز یہیں تھی۔ خیریت خیر صلا تھی، گھر کا پیسہ گھر ہی میں تھا۔ جتنا چاہا اٹھایا۔ اڑایا۔ "گھی کاں گیا؟ کھچڑی میں! کھچڑی کاں (کہاں) گئی؟ پیاروں کے پیٹ میں"! اسی کی برکت اور رونق تھی۔ خود ہی راجہ۔ خود ہی پرجا۔ خود ہی آقا۔ خود ہی غلام۔ برے تھے تو اپنے لئے۔ اچھے تھے تو اپنے لئے۔ یوں لالوں کے لال رہے دن عید رات شبرات رہی، مگر اب کیا ہے، "ڈھاک کے تین پات" "اے بیٹا! سنتی ہوں۔ آج کل علم بہت بڑھ گیا ہے۔ جاں (جہاں) بڑھا ہوگا۔ بڑھا ہوگا۔ یاں تو موا اندھا علم پھیل گیا ہے۔ میاں افضل کو تو جانتے ہو گے؟[2] میری پڑنواسی کا دولہ۔ آٹھ نو سال میں ولایت سے ڈاکٹری پڑھ کے آیا ہے۔ بالکل کرسٹان ہے۔ جب دیکھو گڈّامی پُر بنا پھرتا ہے۔ بہن کا علاج کرنے کھڑا ہوا تو کہتا ہے "ولایت سے عرق نہیں آیا۔ نسخہ کیا لکھوں"۔ میں نے پوچھا "بیٹا! عرق تم خود کیوں نہیں بنا لیتے"۔ کہنے لگا "واہ! نانی حضرت مجھ کو کیا معلوم اس میں کیا کیا دوائیں پڑتی ہیں"۔ یہ سن کے تو بیٹا! تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہیں تڑ سے میں نے کہا "واہ لمے تیری ڈاکٹری

---

[1] یہاں خمیدہ پشت یا کبڑا ہونے سے انہوں نے مراد لی ہے۔ [2] خدا جانے بڑی بی نے کس چیز کا خاکہ اڑایا ہے۔

واہ رے تیرا علم! پھٹے سے منہ ایسی پڑھائی پہ کہ پڑھ تو سب کچھ لیا۔ آتا جاتا خاک نہیں! تجھ سے تو ہمارے ہاں کے عطار ہی اچھے جو ٹکے کے جُشاندے۔ خساندے میں وقت پر کام نکالدیں۔ تو بیٹا برا ماننے کی بات نہیں۔ پڑھ لکھ کے تم یوں ہاتھ سے گئے۔ لڑکی بالیاں تمسے چار ہاتھ آگے ہیں۔ کہتی ہیں "بے پردہ ہوکر ہم مردوں کی بیڑی کمائیں گے" اچھا بھئی! یہ بھی منظور۔ مگر میں ایک بات کہتی ہوں، وہ اپنے سہاگ کی تو پہلے خیر منالیں۔ کل کو چوڑیاں پیچنی بند کردیں۔ تو بیوی سونٹا سے ہاتھ لئے پھریں گی۔ اول یہ تو سمجھ لیں، آج ان کا سہاگ بھی تو دوسروں کے برتے قائم ہے!! سنا ہے، آزادی کا رن ایک سڑن کی تو لوگوں نے خوب کندی کی۔ بھئی! یاد رکھو اس بے پردگی سے کچھ حاصل حصول نہیں۔ کام کی باتیں اور ہیں۔ دل چلے یہ آڑ بھی نکالدینی چاہتے ہیں۔ یہی رنگ رہا تو ہم تو ہوں گے نہیں اور نہ خدا ایسا وقت دکھائے، مگر تم سب کرشان ہوگے اور عورتیں مسیح کی چاریاں۔ بھلا جس جانے عورت کا یوں ہباؤ کھلے۔ یوں دیدہ کا پانی مرجائے بھئی! اس کا تو بس اللہ والی ہے۔ وہاں مائیں تو آگے کو تو سانپ بچھو ہی جنیں گی!!"

(بڑی بی! صلواتوں پہ صلواتیں سناتیں۔ ہم بیٹھے مٹر مٹر دیکھتے۔ سنتے رہتے۔ ایک تو کہتی پتہ کی تھیں۔ دوسرے بول کون سکتا تھا۔ جو بولا اس کے سر بالوں کو آئیں۔ جھلاّئی شیرنی کی طرح بپھر پڑتی تھیں۔ ناچار بیٹھے سنا کئے۔ مجھے ان کے مزاج میں یاد دخل تھا۔ اب کی دفعہ بھی سب نے پاندان۔ پن کٹی کی طرف اشارے کئے۔ مگر میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ جانتا تھا "یہ ریل گاڑی رکنے والی نہیں" اسوقت پن کٹی سرکا دی اور وہ الٹ کے سر پر آئی!! بارے خود ہی کہنے لگیں "دو بی بھئی! باتوں باتوں میں تو کاں (کہاں)، سے کاں نکل گئی۔ جانے میں کیا کہہ رہی تھی" سب نے خوشی خوشی لقمہ دیا "حضور بہادر شاہ اشں دے رہے ہیں، شاہزادیاں بچی بچی لجائی نظروں سے اٹھی! آداب بجالاتی ہیں:-") ہاں تو خاصے سے فارغ ہو کچھ دیر حضور نے سکھ فرمایا ظہر کی نماز پڑھ کے دم میں مہرولی آگئے۔ آہاہاہا! یاں کا کیا پوچھنا۔ جی نکلے جاتا ہے۔ یاں بھی جالی محرابیں بنی ہیں، تاش تمامی کی جھنڈیاں اڑ رہی ہیں۔ اہلو پہلو پلٹنیں کھڑی سلامی اتار رہی ہیں۔ احتشام توپ خانے کی دھنا دھن تو پیں چل رہی ہیں۔ زنبوریں چھوٹ رہی ہیں۔ سڑک پہ سپاہی انتظام کرتے پھرتے ہیں۔ ایک دھوم دھام ہے۔ شہر سے خلقت پہ خلقت امڈی چلی آتی ہے، جن کے مکان ہیں وہ اپنے لپنے سجے سجائے مکانوں میں آدھمکے۔ مقدور والوں نے سوؤں سے کرائے بھرے۔ غریب غربا کو جہاں جائے مل گئی اوہیں اتر جاتے ہیں۔ شاہی محل سے لگا، جھرنہ۔ تالاب۔ ناظر کا باغ۔ امریوں میں بھی زنانہ ہوا۔ جابجا سبز سبز قناتیں لگی ہیں۔ بادشاہ کی سواری پہلے درگاہ شریف آئی۔ سلام ہوا۔ فاتحہ پڑھی۔ پھول چڑھائے۔ چراغی دی۔ وہاں سے محل ہو۔ جنگلی ڈیوڑھی سے باغ آگئے۔ بیگماتیں۔ شہزادیاں۔ حرم۔ سریت۔ ناموس۔ امیرزادیاں سیر کو نکل کھڑی ہوئیں۔ پچھیڑا پلٹنوں کے ننھے ننھے سپاہی تلنگو بجیبوں کی سی وردیاں پہنے ملکی بندوقیں تو سدان لگائے۔ پہرہ دیتے پھر رہے ہیں۔ شاہزادیاں۔ امیرزادیاں۔ رنگ برنگ جوڑے پہنے۔ سونے موتی جواہرات میں ڈوبی چھم چھم کرتی پڑی پھر رہی ہیں۔ انا۔ مغلانیاں۔ ہتّیا۔ دوا۔ مانی۔ جیا۔ لونڈیاں۔ باندیاں ہاتھوں چھاؤں اللہ۔ بسم اللہ کرتی، صدقے قربان ہو رہی ہیں۔ لو وہ سب جھرنے آگئیں چھینیم چھینٹ ہونے لگی۔ کوئی شور بور ہوگئی۔ کسی کا پاؤں کیچڑ میں پھسلا۔ ساری لت پت ہوگئی۔ ایک زنانشی قہقہہ پڑا۔ وہ بچاری خفت کی ماری کنیاتی کتراتی آنکھ چرائے

اپنا سا منہ لئے چلی آتی ہے۔ ہجولیاں نکّو بنا رہی ہیں۔ ایک کہتی "اجی! اجی یہ کڑھاؤ ایسا ہوتا ہی ہے۔" دوسری بولی "بوا تمہاری خفت سر آنکھوں پر۔ اچھی، یہ تو بتاؤ، تم نے اس موئی کھچڑی میں ایسی کون سی انوکھی۔ اچرج۔ جانِ آدم چیز دیکھی جو یوں پچھاڑیں کھانے لگیں وہ کھسیانی رونکھی ہو ہو کر بگڑ رہی ہیں۔ الٰہی کرے! تم بھی نت پت ہو۔ تمہاری شیخی بھی لر ی ہو۔ یاں سے نکل باغ اور امریوں میں جا دھمکیں کڑھائیاں چڑھی۔ پکوان ہو رہے ہیں۔ مالنیں دوکانیں لگائے۔ پھولوں کے گنٹھے گوندھ رہی ہیں۔ تنبولنیں پکے پکے دیسی پان کی گلوریاں بنا رہی ہیں۔ ترکاری میوے والیاں قرینے سے بیٹھی بیچ رہی ہیں۔ کبابنیں کباب۔ دھی بڑے والیاں دھی بڑے۔ سادے کاروں کی لڑکی بالیاں۔ جسر اؤ انگوٹھیاں۔ چھلّے۔ حلوائیوں کی چھوکریاں پوری۔ کچوری۔ مٹھائی لئے بیٹھی ہیں۔ سارا باغ گل نورنگ۔ گل طرہ۔ گلاب۔ گل مہندی۔ گیندا۔ گل شبّو جوئی۔ مولسری۔ مدمالتی سے پڑا مہک رہا ہے۔ آم ہیں محمد شاہی لڈو۔ شہد کوزہ۔ شاہ پسند۔ بتاشہ۔ سفیدا۔ گلابی۔ سیندوریا۔ سردلی کا ٹپکا لگ رہا ہے۔ جامنیں پٹا پٹ گر رہی ہیں۔ لڑکی بالیاں دوڑ دوڑ اٹھا رہی ہیں۔ کھٹّا میٹھا۔ (لیمو) شہتوت۔ نگترہ۔ فالسہ۔ کھرنی۔ گولر۔ کمرک۔ بیری۔ کٹھل۔ بڑھل۔ پاکھل۔ آڑو۔ شفتالو کے درخت پھل پھول رہے ہیں۔ جہاں نما میں سنگ شیر کے سے پاؤں کی کرسی پر جس میں پشت پر سنہری پھول پتے کٹے ہیں۔ کاشانی مخمل کا نرم نرم گدّا بچھا ہے۔ حضور بہادر شاہ بادشاہ بیٹھے ہیں۔ بازو میں چاندی کے چاند سے تاش میں کار چوبی زیر انداز پر جھنڈا رکھا ہے، پیچری کٹوری لگی ہے۔ جھوم جھوم گھٹا آ رہی ہے۔ مینہ کا جھمکا لگ رہا ہے۔ مور جھنگار رہے ہیں بلبلیں چہک رہی ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ جی میں ہوک اٹھتی ہے۔ پپیہوں کی پی کہاں کا جدا شور ہے۔ کیاریوں میں شاہزادیاں بھیگتی پھول پھول توڑتی پھرتی ہیں۔ اس سے ایسا معلوم دیتا، جیسے رنگ برنگ تیتریاں پھول پھول اڑتی پھرتی ہوں۔ کبھی یاں ٹھٹکیں۔ کبھی واں بنکھڑی پہ جھول لٹریں۔ یا ہریاول میں قمریاں جنگل میں ہرنیاں! رنگین جوڑوں سے چوطرف لالہ نافرمان کھل گیا ہے۔ مینہ کی پھوار سے رنگ کٹ کٹ کے رنگیں پانی بہہ رہا ہے۔ کوئی بی دشمن۔ بی جانمن کے گلے بیاں ڈالے چلی آتی ہے۔ کوئی ٹمک ٹمک یہ گئی۔ کوئی سرک سرک وہ جا پڑی۔ کوئی زیر پائی۔ کفِ پائی۔ انی دا دو۔ اتار کھڑاویں پہنے کھڑ کھڑاتی چلی آتی ہے، کوئی آموں کے درختوں پر پتھر مار رہی ہے۔ کوئی کیلے کی گیل پکڑے کہہ رہی ہے، "اچھی میری اچپل۔ دلشاد۔ دردانہ ذرا اسے تڑوا دیجو۔ لونڈیاں باندیاں کد کڑے لگاتی۔ سنگڈے مارتی جھپ جھپ درختوں پر چڑھ گئیں۔ توڑ تاؤ وہیں بکر بکر کھانے لگیں۔ کسی کے کانٹا چبھا۔ کسی کے کھڑ سینچ لگے۔ کوئی لڈسے نیچے آن پڑی۔ بھوں بھوں بیٹھی رو رہی ہے۔ انا۔ دوا۔ پھیپڑا جلاتی۔ بلبلاتی پیچھے پیچھے ہیں۔ دیکھنا بلائیں لوں۔ نیچ میں چلو۔ سفید چادر اوڑھ لو۔ کہیں یاں بنتا ہوا چوٹی والا نہ رہتا ہو۔ کیڑے مکوڑے کا بھی ڈر ہے۔ دو یار کہیں سایہ جھپٹا نہ ہو جائے۔ جو یہ بوڑھا چونڈا گورے استرے سے منڈ جائے۔ کچھ ہمجولیاں ہنڈولے بیٹھی جھول رہی ہیں۔ کچھ ایک پر ایک بولیاں ٹھٹھولیاں مار رہی ہیں۔ آپس میں چہل پہچے ہو رہے ہیں۔ شاباش بوا، یہ لال لال چوچیاتی کرتی یہ موا مونجھ کا بجیہ کیا ہے۔ کیا دشمنوں کے دیدے پٹم ہو گئے تھے۔ بوا پہلے اپنی تو خبر لو۔ کیسا سنہری جوڑا کا لی گوٹ سے کلیجی پھیپڑا کیا ہے۔ اے بی کیا بتاؤں یہ ساری آغا مینا کی کارستانی ہے۔ ذرا نہیں تو دیکھو، تخت کی قسم۔ صدقہ کا ڈوپٹہ اوڑھے پھر رہی ہیں! ایک دوڑی چلی آتی ہے۔ اچھی ذرا یہ کچالو چکھنا۔ کیا مٹھلونے بنے ہیں دوسری

لہ ہمیہ دختر کا د۔

آتی ہے، اچھی میری جانمن! تمہیں ہمارے سر کی قسم۔ اس رنگترے کی راحت جان کو تو دیکھو۔ کیا مزہ دے رہی ہے۔ امریوں میں جھولے پڑے ہیں، ریشمین رسیاں۔ گنگاجمنی پٹریاں۔ دو جھول رہی ہیں۔ چار جھلا رہی ہیں۔ رساں رساں پینگیں بڑھا رہی ہیں۔ جھنبیری آواز میں ملار گا رہی ہیں:۔

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
باگ اندھیرے تال کنارے مورلا جھنکارے بادر کارے
برسن لاگیں بوندیں پھنیاں پھنیاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
سب سکھی مل گئیں بھول بھلیاں بھولی بھولی ڈولیں شوق رنگ سیّاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

لے لو وہ شام ہوگئی۔ دونوں وقت ملے۔ جھٹپٹا ہوا۔ شمسی تالاب کے کنارے کنارے بانسوں کے ٹھاٹھروں میں لال لال کنول انہیں دعدغے روشن ہیں، درختوں میں ننھے ننھے جگنوں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ محلات میں جھاڑ۔ فانوس۔ فتیل سوز۔ ایک شاخی، دو شاخی، سہ شاخی، پنج شاخی۔ دیوارگیریاں، چینی لالٹینوں سے رات دن بن گئی ہے، دردیاں بج رہی ہیں۔ نوبت پر ٹکور پڑ رہی ہے۔ لے لو وہ روشن چوکی کا گشت طبلہ نفیری کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ کہیں تان رس خاں سرانچے کے باہر تانیں لگا رہے ہیں۔ کہیں ناچ ہو رہا ہے، ناچنے والیاں اندر سازندے سرانچے کے باہر طبلہ سارنگی، تال کی جوڑی بجا رہے ہیں۔ یہ تمیز تہذیب کی گڑیاں ہوتیں، ان کا پہناوا، ادب قاعدہ کیا بتاؤں کہ دیکھے سے جی خوش ہو، آنکھیں کھلیں۔ یہ ڈیرے دارنیاں کہلاتی تھیں۔ اگلے وقتوں ایسی ویسی رنڈی ہی نہ تھی۔ ان کی بات چیت۔ گانا۔ چاؤ چونچلا۔ سگھڑاپا، وہ تھا کہ لاکھوں عورتوں میں پہچان لو۔ کنواریں لڑکے لڑکیاں تو ان کے سامنے پڑتے ایسا بھناتیں جیسے کوئی استانی جی سے سہم جاتا ہو۔ بات بات میں نی نکالتیں۔ ٹوکتیں۔ ماں باپ کے سامنے نصیحتیاں کرتی تھیں۔ لوگ بچوں کو ان سے ادب قاعدہ سکھواتے ایک اس زمانے کی رنڈیاں ہیں، ایک دفعہ شادی میں دیکھا تھا۔ بالکل آغا تو بڑا پہلوان جچتی تھی۔ یہ سرانچے کا بانس، ہتھنی کی ہتھنی۔ پنجابی پیجامہ۔ نہ زر زیور۔ رنڈاپا سا چھایا ہوا۔ گنوار و زبان۔ بات کرے تو معلوم ہو جیسے کوئی لڑتا ہو۔ پھر خیر سے یہ وہ بی جان تھیں جو شہر میں ایک کہلاتی ہیں۔ خیر! شہزادیاں نواڑوں[1] میں بیٹھی شمسی تالاب کی سیر کر رہی ہیں۔ سفید سفید پھولوں کے کنٹھے گلے میں۔ کانوں میں پھولوں کی بالیاں۔ نک سے سک بناؤ سنگار کئے ہیں۔ نواڑوں میں روشنی جیسے تالاب میں جھلادے۔ پانی میں یہ روشنی اور بہار دیتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے نور کی مچھلیاں تیرتی ہوں۔ کہیں ڈھولکی بج رہی ہے۔ گانا ہو رہا ہے۔ کہیں دس گھرا۔ چپّیسی۔ قصے۔ کہانیاں۔ پہیلیاں کہ رتیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں۔ زرگری۔ فرفری۔ سرسری۔ معکوب۔ کنشٹولی۔ بکنی زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ کہیں بن بادشاہزادی کا سانگ بن رہا ہے۔ دس بیس مل کے کھڑی ہو گئیں۔ آؤ کھیلیں۔ آنکھ مچولی کھیلیں۔ قطار باندھ اڑنگ بڑنگ۔ طوطی زیر تنگ، مائی جی کا تھان،

---

[1] چھوٹی کشتیاں، ڈونگے۔

کھیلے[1] چوغان۔ ہریا ہر بس۔ یہ نو۔ یہ دس۔ جس جس کے نام پر دس آتا گیا۔ اس کو نکالتی گئیں۔ اخیر میں جس کے نام پر دس آیا وہ چور بنی۔ لو ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی، دہائیں۔ سب نے خاصہ کھایا۔ ڈیوڑھیاں مامور ہوئیں۔ بادشاہ نے سکھ فرمایا۔ چپ چپی۔ بکی۔ داستان ہونے لگی، حبشنیں۔ ترکنیں۔ قلماقنیاں پلنگ کے پہرے پر۔ قلار حبشی۔ دربان۔ مردھے۔ پیادے۔ سپاہی باہر ڈیوڑھیوں میں اپنی اپنی چوکی پہرے پر کھڑے ہوگئے۔ حکیم۔ طبیب۔ خواص اپنی اپنی نشست میں موجود ہیں۔ کئی دن یوں ہی انوکھے کھیل تماشے انرالی باتیں رہیں، تین دن سیر کے باقی رہے، جھرنے، امریوں کا زمانہ موقوف ہوا۔ جھرنے میں کدائی ہونے لگی۔ کوئی پھسلنے پتھر پر پھسل رہا ہے۔ کئی تھئی تھئی ناچ ہو رہا ہے، کہیں چہل پہچھے پہچیدہ۔ پھبتیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں پہلوانوں کے کماٹے[2] ہو رہے ہیں۔ کوئی امریوں میں جھولے پر کھڑا پینگ بڑھا رہا ہے، کوئی پھیک پٹا کی سیر دیکھتا ہے۔ کہیں کنکوئے[3] بازی ہو رہی ہے۔ کوئی کھیم کر رہا ہے۔ کوئی ٹھمکیاں دے رہا ہے کسی کا ہتے پر سے اکھڑ گیا۔ کسی کا کنیانے لگا۔ کسی کا چکرا رہا ہے۔ کسی کی ڈال جیتو[4] ہوگئی۔ کوئی کٹ گیا۔ کوئی دھیری پکار رہا ہے۔ کہیں تکلیں لڑا رہا ہے۔ ان میں کوئی کلیجہ جلی۔ کلچڑی۔ کلسری۔ دو پلکی۔ دو پتی ہے تو کوئی لل ری، دو باز پر لوں دار۔ الفن۔ تیسرے پہر شمسی تالاب پر میلہ لگا۔ شہزادوں کی سواریاں آرہی ہیں۔ ہٹو بڑھو کا شور مچا ہے۔ حضور بھی برآمد ہوئے۔ میاں شہید[4] کے شاگرد تیرنے کے کمال دکھا رہے ہیں۔ کوئی آلتی پالتی مارے تیر رہا ہے۔ کوئی چت ہے۔ کوئی ایسا تیرتا جیسے کرسی پر پاؤں پہ پاؤں ڈالے بیٹھا ہو۔ ایلوا اسی نے بیٹھک کی۔ اور آرام کرسی کی طرح ہو بیٹھا۔ ایک ہے کہ مینڈک کی طرح ملاحی تیرتا چلا آتا ہے۔ آگے بڑھ کے اسی نے کروٹ لگائی اور اس طرح لیٹ گیا، جیسے کوئی چارپائی پر لیٹا ہو۔ ایک پاؤں دراز ایک پاؤں خما کر تکیہ پر رکھ لیا ہے۔ ایک نے جوگیا آسن مارا۔ پھر شیر کی طرح اسدی تیرنے لگا۔ بعد میں استاد شہید پانی میں اترے۔ انہوں نے وہ وہ کرشمے دکھائے کہ کمبا کوئی دکھائے گا۔ سیر کا دن آیا تو راتوں رات دوکانیں، مکان سج گئے۔ سارے بازار باغیچہ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں گملے رکھے ہیں گلاب۔ گیندا۔ گل شبو۔ سورج مکھی۔ گل نرگس کھلا ہے۔ کہیں ہندوؤں نے کیلے کے درخت لا کے شامیانے کی چوبوں میں باندھ دیئے ہیں۔ حلوائیوں نے رنگ برنگ لوزاتیں تھالوں میں سجائی ہیں۔ کہیں گرم کچوریاں۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں اتر رہی ہیں کہیں پستہ۔ بادام کے نقل لگے ہیں۔ کہیں مٹھائی کے رنگترے۔ شریفے۔ امرود۔ جامنیں سجی ہیں۔ کہیں موتی چور، مونگ بادام۔ پستے کے لڈو۔ پستہ مغزی۔ قلاقند۔ بالوشاہی۔ در بہشت۔ پھینیاں۔ برفی پر سونے چاندی کے ورق جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ کوئی مقراضی اُڑدی کا حلوا لئے بیٹھا ہے۔ کوئی نیبو۔ رنگترے۔ ترنج کا مربّا بیچ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے، مکھن ہے ملائی سے میٹھا۔ کوئی خطائی۔ گولے اور گولیوں کے کباب لونگچڑے اتار رہا ہے۔ لوہے کے چرخی نکھوں کی چائیں چائیں کا اک شور مچا ہے۔ کوئی کھجلے، شیرمال، قطب کے پر اٹھے بیچتا پھرتا ہے، کوئی تندور کی میٹھا آس تک رہا ہے۔ کنجڑوں کی سہانی آوازیں الگ ستم ڈھا رہی ہیں، "قطب صاحب کے چھینے ترمیوے ہی کھرنیاں لو۔ کالی کالی بھونرالی جامنیں، نون ولی ہیں نمکین لو۔ جھرنے کا بتاشہ رہی گولر ہے۔ کیوڑے کی بیل کے

---

[1] داؤں کے پیچ۔ [2] پتنگ بازی۔ [3] آپس میں مل گئے۔ [4] میاں محمد اسمٰعیل شہید۔

سنگھاڑے، نرل تلاؤ کے ہی دودھیا لو۔ پال[1] میں ڈالے ہیں جی کرانے کا لڈوا لو۔ سیاہ لچھے ہیں ہاتھوں کے کھلونے ہیں، بالے بھولوں کے"۔ کہیں دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ بریانی تنجن۔ قورمہ پک رہا ہے۔ کہیں قہقہے چھپے اڑ رہے ہیں۔ دودھ پھینیاں، حلوا پوری۔ ملائی کی برف کی چکوتھیاں ہو رہی ہیں۔ کوئی بارہ مصالحہ کی چاٹ اڑا رہا ہے۔ کوئی دہی بڑے کے چٹخارے لے رہا ہے۔ اے لو! وہ شکورلگڑ والا آیا۔ یہ جگت میں جواب نہیں رکھتا۔ کارچوبی ٹوپی۔ کارچوبی جوتی۔ چکن کا اونچی چولی کا انگرکھا بچوں کا غول پیچھے پیچھے۔ دولہا بنے چلے آتے ہیں۔ بڑا سا خوبصورت حقہ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار یا پانچ گز کی نئے کی نیچہ تامی لپٹی ہوئی۔ گنگا جمنی مُہنال۔ پھر سی چلم سے خمیرے کی مہکار چلی آتی ہے۔ سڑک پر سے کوٹھوں پر پلاتے انعام اکرام لیتے چلے جاتے ہیں جہاں ٹھیرے منھ سے پھول گرنے لگے۔ یہ شعر زبان پر بہت چڑھا ہوا ہے، لہک لہک کر پڑھا جا رہا ہے:۔

حقہ نہیں ہے حضرت والا کے ہاتھ میں

گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں!

مداری تماشہ کر رہے ہیں۔ کوئی ریچھ نچا رہا ہے۔ کوئی بندر۔ شہدے۔ امیر امرا کے مکانوں پر کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔ جا بجا دوکانوں پر سونے چاندی کی انگوٹھیاں۔ اکے۔ نونگے۔ پوتھوں کے گچھے۔ موتیوں کے ہار۔ شیشوں کے ہار۔ لال سبز۔ زرد۔ اودے۔ پھرنگے، سوت ریشم کے ڈورے۔ پنکھیاں سجی ہیں۔ گندیوں کے ہاں عطر۔ تیل پھلیل کے کنٹر پر کنٹر خالی ہوتے جاتے ہیں۔ بازار دھک رہے ہیں دوکانوں پر "بھرٹے چھلا دے رے مورے تائیں"۔ گاتے مانگتے پھرتے ہیں۔ بے نوا آزاد[2]۔ خمرے۔ رسول شاہی چار ابرو کا صفایا کئے اپنی اپنی صدا کہہ رہے ہیں "کچھ راہ خدا دیا جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا۔ بھلا کر بھلا ہو گا۔ سودا کر نفع ہو گا۔ کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے۔ اس ہاتھ لے رام رام کرے پچھی۔ یہ کایا نہیں پاوے گا۔ کنکر چن چن محل بنایا۔ مورکھ کہے گھر میرا ہے۔ نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسیرا ہے۔ رام رام کہہ لے اچھے بندے یہ کایا نہیں پاوے۔ ماٹی اوڑھنا ماٹی بچھونا ماٹی کا سرھیانا رے۔ ماٹی کا کلبوت (قالب) بنا اوس میں کلب (قلب) کایا رے۔ رام رام کر لے گا فل وغافل، بندے یہ کایا نہیں پاوے گا"۔ کہیں حسینی برہمن چادر اچھالے کہہ رہے ہیں "عزیز وحق تعالی کبریا ہے شرف جس نے ہمیشہ کو دیا ہے"۔ نوٹنگی والے الگ گا رہے ہیں "ہم پردیسی پاؤنے جور ین کیو بسرام۔ بھور بھئے اٹھ جائیں گے۔ بسے تہارو گام۔ ہم پردیسی رے کہ جائیں ہم پردیسی رے"۔ ظہر کے بعد پہرہ بندی ہوئی۔ سڑک کے دونوں جانب پلٹنیں کھڑی ہو گئیں۔ کمروں میں اجلا اجلا براق سا فرش فروش ہوا ہے۔ چاندی کے پلنگوں پر دلدامیش[3] گیر کھنچے ہیں۔ باناتی پردے پڑے ہیں۔ ہین چقیں، چلمنیں (چلونیں) پھولدار لنگیرے لگے ہیں۔ برآمدے جھاڑ فانوس۔ رنگین گلاسوں۔ قمقموں۔ بڑے بڑے آئینوں۔ ابرک کے لال سبز کنول۔ ہنڈیوں۔ دیوار گیریوں سے۔ دلھن بنے ہوئے ہیں۔ مکانوں۔ دوکانوں کے آگے جنگی تخت ہیں۔ ان پر سجے سجائے شامیانے تنے ہیں۔ کہیں اونی، کاشانی مخمل کے مسند تکیے لگے ہیں کہیں صرف دودھ سی سفید چاندنیاں بچھی ہیں۔ گلناری تراش کے میر فرش رکھے ہیں۔ جابی کلیاں۔ سنک۔ نقشین خاصدان۔ اگالدان رکھے ہیں۔

---

[1] آم۔ [2] عطر فروش۔ [3] فقیروں کے فرقے۔ [4] ایک قسم کا پلنگ پوش۔

اگر سوز روشن ہیں۔ سیلانی بیٹھے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اے لو! وہ احتشام توپ خانے نے سلامی اتاری۔ دھنا دھن توپیں چلنے لگیں۔ حضور بہادر شاہ بادشاہ فاتحہ کو درگاہ شریف آتے ہیں۔ وہ جلوس شروع ہو گیا۔ پہلے نشان کے دو ہاتھی آئے۔ سر سے پاؤں تک نقش و نگار بنے ہیں۔ کرکری تاش کا پھریرا اڑتا چلا آتا ہے۔ تامی جھولیں پڑی ہیں۔ ریشمی ڈوریوں میں کلابتوں کے پھندنے جھول رہے ہیں۔ لو وہ چتر کا گراں[1] بار ہاتھی آیا۔ پہاڑ کا پہاڑ۔ جھومتا۔ پھنکارے مارتا۔ سونڈ سے سلام کرتا چلا آتا ہے۔ چتر میں سونے کے کلس۔ گنگا جمنی سہار[2] ہے۔ نیچے اوپر کارچوبی کام میں لپا ہوا ہے۔ کرن کی جھالر جگر جگر کر رہی ہے۔ وہ ماہی مراتب کے ہاتھی آئے۔ یہ اگلے پادشاہوں کے فتح کے نشان ہیں۔ سونے کے بنے سنہری چوبوں پر لگے۔ کوئی مچھلی کی شکل ہے۔ کوئی گھوڑے کا سر اور شیر کا کلہ ہے۔ تاش تامی ٹکے۔ قیطونی ڈوریاں، پھولوں کے سہرے بندھے ہیں۔ یہ خاص پادشاہی نشان ہے۔ ان کے پیچھے نوبت نقارے کے اونٹ۔ زنبورک کے اونٹ آئے۔ نوبت بج رہی ہے۔ زنبوریں چھوٹ رہی ہیں۔ خاصے گھوڑے سونے چاندی کے ساز میں ڈوبے بدک بدک کر مور بنے جاتے ہیں۔ کالی اگری پچھرا۔ تلنگوں کے تمن[3] کمر میں تلوار۔ کندھوں پر دھماکے۔ بندوق۔ توسدان لگائے۔ دو دو کی قطار میں چلے آتے ہیں۔ امتیازی عہدہ دار کیدان۔ اور جانے کون کون مقیشی توڑے، طرّے پگڑیوں میں لگائے۔ کارچوبی پرتلے حمایل کئے، ایک رنگ سفید گھوڑوں پر سوار ہیں۔ حضور بہادر شاہ بادشاہ کبھی سایہ دار تخت میں زربفت کے مسند تکیے لگائے بیٹھے ہیں۔ کبھی خسخانوں کے تخت میں برآمد ہوتے۔ اندر چھوٹا منکا فراشی پنکھا کھینچ رہا ہے۔ کبھی ہودا رہیں ہیں۔ نہیں تو سدا اینگڈ مبر میں نکلتے۔ مولا بخش[4]۔ خورشید گنج۔ چاند مورت۔ نقش و نگار سے سجے۔ ماتھوں پر فولاد کی ڈھال۔ کانوں میں سونے کے بالے۔ پھول پتے۔ ریشم اور کلابتوں کے گچھے۔ لڑیاں۔ بانات کی کارچوبی جھولیں پڑی ہیں۔ ان میں سے جس پر حضور ہیں۔ اسے فوجدار خاں مہادت گوشوارہ کلغی لگائے۔ ایک ہاتھ میں گجباگ[5]۔ ایک ہاتھ میں شاہی پھنڈا ہولتے چلے آتے ہیں۔ اینگڈ مبر میں حضور عالم پناہ بڑی شان و شوکت سے بیٹھے ہیں۔ نیچے قبا۔ اوپر چارقب۔ دستار۔ گوشوارہ۔ جیغہ۔ سرپیچ۔ تاج شاہی! جس میں بڑے بڑے موتیوں کا طرّہ آویزاں ہے۔ گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ موتی مالا جس میں ایک ایک موتی ایک ایک زمرد، اور دس دس دانوں پر یاقوت کی لڑیں بندھی ہیں۔ بیچوں بیچ یاقوت کی تختی ہے۔ اسپر ہیروں کا ہار۔ یاقوت کا ہار۔ بازوؤں پر ہیرے کے بھج بند۔ نورتن۔ ہاتھوں میں سات جواہرات سمرنیں۔ داہنے میں چار بائیں میں تین، جھل جھل کر رہی ہیں۔ سامنے دو گنگا جمنی ترکش۔ ایک کمان آویزاں ہے۔ سر پہ خوبصورت چتر کا سایہ ہے۔ ہاتھی کے سامنے روشن چوکی بج رہی ہے۔ پہلو بہ پہلو خواص۔ سر سبز پگڑیاں کمر میں لال لال شالی رومال۔ چنی ہوئی چپکنیں پہنے، اپنے اپنے عہدے لئے جاتے ہیں۔ نقیب چوبدار خبردار پکار رہے ہیں۔ خواصی[6] میں مرد شبو بیٹھے ہما کے پر کا رنگین مورچھل کرتے جاتے ہیں۔ ہاتھی کے پیچھے جو ریشمی ڈوری پڑی ہوتی اسے دربان ناپتا اور جب کوس پورا ہو جاتا تو وہ جھنڈی لے کے سامنے آتا۔ مجرا کرتا۔ اس سے یہ مراد کہ سواری کوس بھر آئی۔ گھڑیالی

---

[1] ہاتھی کا نام۔ [2] ڈنڈی۔ [3] سو سو سپاہیوں کا ایک تمن ہوتا تھا۔ [4] ہاتھیوں کے نام ہیں۔
[5] آنکس۔ [6] یہ خدمت نظارت کہلاتی تھی۔

گھڑی پہر جاتا ہے، ایک جریب پیچھے ملکہ زمانی۔ شاہزادیوں کی عماریاں۔ ان کے پیچھے آرایش، اس کے ایک جریب پیچھے امیر امرا، نواب راجاؤں کی سواریاں۔ سوار۔ رسالے۔ طبل کے ہاتھی۔ بیلے کے ہاتھی بیلہ بانٹتے چلے آتے ہیں۔ سواری درگاہ شریف گئی۔ وہاں سے آکر سب شاہی محلوں میں پنکھوں کی سیر دیکھنے آن بیٹھے۔ محلوں کے نیچے پہلے آرایش کے لٹنے کی ایک دھوم اس کی سیر دیکھی۔ مغرب کے بعد شاہی پنکھا آیا۔ یہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ نیچے سانچے موتیوں کی جھالر۔ سچے آویزے۔ اوپر سونے کا مور۔ جس کی گردن اور دُم میں رنگ برنگ جواہرات جڑے ہیں، پیٹ میں گلاب، کیوڑا، مشک، زعفران۔ عنبر کا آمیز بھرا ہوا ہے، جو پنجوں میں سے رس رس کے ٹپکتا جاتا ہے۔ کلاوے اور پھولوں کے سہرے پڑے ہیں۔ آگے پھولوں کی چھڑیاں۔ پھینک پٹا کے اکھاڑے۔ نفیری والے، سپاہیوں کے تمن باجا بجاتے چلے آتے ہیں۔ سقے کٹوروں کا کمال دکھا رہے ہیں۔ چھڑاؤ بھی ہوتا جاتا ہے۔ چھل بھی پلا رہے ہیں "میاں پانی پلاؤں۔ برف کی طرح جن ہے، آب حیات کے دو گھونٹ"۔ یہ اس مزے سے کہتے، بار بد بھی کان پکڑے۔ کوئی کہتا "پیاسوں سبیل ہے مولا کے نام کی" "تیرے پاس ہے تو دے جا، نہیں تو پی جا راہ خدا"۔ پیچھے پیچھے شاہزادے۔ سلاطین۔ امیر و امرا رنگ برنگ کپڑے تھے پہنے۔ نئی دھج۔ نرالی وضع سے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ ہیں۔ ہزارے چھوٹ رہے ہیں۔ خواص گلاب پاشوں سے آمیز[1] چھڑک رہے ہیں۔ کبھی میٹھی میٹھی پھوار پڑنے لگتی کبھی پھیا پھیا برس رہا ہے۔ خلقت کے کوٹھوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ چھجے مکان بوجھ کے مارے ٹوٹے پڑتے ہیں۔ نیچے بھی یہ عالم ہے کہ میں تجھ پہ۔ تو مجھ پہ۔ کھوے سے کھوا چھلے۔ تھالی پھینکو تو سر ہی سر ہے۔ شاہزادے۔ سلاطین کے پیچھے قلعی گر، زردوزوں، آتشبازوں اور پھول والوں کے پنکھے کی دھوم دھام ہوتی۔ مگر یہ میں اپنے بچپنے کا ذکر سنا رہی ہوں۔ بعد میں حضور بہادر شاہ بادشاہ کو کچھ ادھر کی لو زیادہ لگ گئی تھی۔ یہ بات ان کے گیتوں میں بھی آ جاگئی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم دیتا ہے، جیسے دل میں بیٹھے کوئی چٹکیاں لیتا ہو۔ مگر اور پنکھے برس کے برس اسی ٹھاٹھ سے نکلتے تھے۔ بس یوں سمجھو، ایک شاہی پنکھا نہ ہوتا۔ نہیں تو ساری باتیں ہوتیں۔ حضور خود بھی ضرور آتے تھے۔ ہاں تو بڑی دھوم دھام سے پنکھے آ رہے ہیں۔ بازاروں میں جا بجا ٹھاٹھر بندی ہے، جنہیں ابرک کے کنول ان میں شمعائیں روشن ہیں۔ بانس میں کھپچیوں کی ٹٹیاں ان میں بھی کنول دغدغے روشن ہیں۔ کہیں رنگ برنگ گلاس قمقموں۔ چینی قندیلوں کی بہار ہے۔ کہیں جھاڑ فانوس۔ ہانڈیوں دیوارگیریوں سے آنکھوں میں چکا چوند آ رہی ہے۔ دوکانوں مکانوں پر ابرک ملا کر جو سفیدی کی گئی ہے، اس سے سارے بازار جھم جھم کر رہے ہیں۔ رات میں دن نکلا ہوا ہے، اے لو! پنکھے شاہی محلات کے نیچے آ گئے۔ خوجے اوپر سے چھنا چھن روپے پھینک رہے ہیں۔ نفیری والا کس مزے سے بجا رہا ہے:۔

میرا پیا گیا ہے بدیس، موری چونری کون انگا رے۔ بیری ساون آیو ری۔ مور پیا گیا ہے بدیس ــــ

آتشبازوں نے آتشبازی چھوڑنی شروع کی انار۔ پھلجڑی۔ چھچھوندر۔ مہتاب۔ چکر۔ گنج۔ چرخیاں۔ ہت پھول۔ جائی جوئی۔ ہوائیاں پٹاخے۔ آسمانی گولے۔ زمینی گولے۔ خدنگ۔ چدّر۔ کوٹھی۔ پنکھیاں۔ سانپ۔ درخت ہاتھی اور جانے کیا کیا چھوڑا۔ کچھ دیر میں سب

---

[1] یہ پانچ خوشبوؤں گلاب۔ کیوڑا، مشک، زعفران۔ عنبر کا بنایا جاتا تھا۔

انعام اکرام لے یاں سے رخصت ہوئے۔ مسلمانوں نے درگاہ میں اور ہندوؤں نے جوگ مایا میں پنکھے چڑھائے۔ رات بھر ناچ رنگ کی محفل گرم ہوئی۔ شاہ ناصر وزیر کے شاگرد بین بجا رہے ہیں، مرزا گوہر مرزا کالے کے شاگرد ستار کے کمال دکھا رہے ہیں۔ کہیں ڈھولک۔ طنبورہ۔ کھڑک رہا ہے۔ صبح کو سونے چاندی کے چھلے۔ انگوٹھیاں۔ نونگے۔ اِکے۔ پوتھوں کے پنچھے۔ موتیوں کے ہار۔ شیشوں کے ہار۔ رنگ برنگ ڈورے۔ پنیر۔ پراٹھے۔ کھوے کی سوغاتیں لے لوا۔ سب شہر چل کھڑے ہوئے۔ بادشاہ ساری برسات یہیں گذاریں گے۔ سیر و شکار۔ کل سلطنت کا کاروبار یہیں سرانجام دیں گے۔

لو بھئی! یہ ہمارے زمانہ کا شہر اور یہ میلے تھے۔ اس میں ہندو بھی ہوتے مسلمان بھی۔ مگر میاں کیا مقدور جو برائی نکلے۔ بہت کچھ اجڑ گیا تھا۔ پھر بھی مغلئی باقی تھی۔ مسلمان ہندوؤں پر جان چھڑکتے۔ یہ مسلمانوں کی آنکھ دیکھتے گذارتے، ایک تو شاہ تھا تو دوسرا شاہ بالا! اب وہ زمانہ الٹا ہو گیا ہے کہ اینٹیں دب رہی ہیں۔ روڑے اچھل رہے ہیں۔ وہی شہر آج شہر شہلہ ہے۔ وہ بیر اکھیری ہے کہ ایک ایک کو کچا نگلے جاتا ہے، ایک ایک کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ ایساسی کا کانٹا گڑھا ہے کہ مو الڑائی جھگڑا ٹوٹتا ہی نہیں جانے کس نے اتنا بیر بسا دیا۔ کس کا یہ کرشمہ ہے۔ کیوں ہماری عقلوں پر ٹپکی پڑ گئی۔ ان روز روز کے جھگڑوں کو دیکھ کر تو اب اللہ جانے یہ جی چاہنے لگا ہے، زمین پھٹ جائے اور ہم سب سما جائیں تو اچھا ہو۔ ہمیش کو قصہ چکے۔ رسوائی اور جگ ہنسائی سے تو نجات ملے۔ مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ صاف کہتی ہوں۔ ہم میں جو نہیں سنتا نہ سنے۔ ایسی تیسی میں پڑے۔ تم روٹھے، ہم چھوٹے۔ خود سری رنگ لائے پر لائے۔ تیلیوں کی طرح بکھر کر اور مزہ چکھ لیں گے۔ ہم اپنا دل صاف رکھیں۔ کسی کے درپے نہوں نہیں تو ان باتوں سے بہت سے غارتی گو لے لوٹ لوٹ کے اور کھائے جاتے ہیں۔ جو بچارے ہمدرد ہیں وہ تو خیر ہیں ہی۔ مگر ان کے برن میں اور بہت سا لیے لیڈر گیڈر نکل پڑے ہیں۔ موؤں کی حالت یہ ہے۔ جیسے دو کعبہ اور مندر ڈھوا لو۔ مگر میس مار خاں بنے پھرتے ہیں۔ جسے دیکھو سرخرو چونڈا ایمان بھونڈا۔ لے میں تو سمجھتی ہوں، یہ موئے کام کے نہ کاج کے یونہی بیٹھے شیخیاں بگھارتے ہیں، چندے پہ چندہ لئے جاتے ہیں۔ برس بھر ہونے کو آیا۔ دو چار غارتی کے مارے آ مجھ بڑھیا کی چیز بست بھی تو لے گئے۔ کہنے لگے "ہندو مسلمانوں کا ملاپ کرائیں گے روپیہ دو۔ بیٹا میں بھی ان کی باتوں میں آگئی۔ وہ دن اور آج کا دن نہ ملاپ ہی ہوا۔ نہ اون کی میں نے پھر شکل دیکھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کھاپی بیٹھ گئے۔ میں بھی کوس کوس کے کھیر الکھڑی کروں گی: "آئی! اچھریاں کٹا دن۔ زہر مار۔ نتی سلا!"

یہاں یہ پیارے احساس، خوبصورت جذبات کی نظم تمام ہوگئی۔ ہائے وہ سریلے بول جو پیا شاہ رنگیلے کی پرترنم ٹوری اور بہادر شاہ بادشاہ کا ملار ہوں!! اب یہ باتیں اسواسطے سہانی سمجھی جاتی ہیں کہ وہ زمانہ گذر گیا۔ تخیل کی سیر بن گزرے زمانے میں نت نئے کرشمے دکھاتی ہے۔ یا واقعی میں وہ سہانی بھی تھیں تو یہ ہر شخص بساط بھر طے کر سکتا ہے۔ البتہ اس نظم زندگی کی آواز سے جس میں دلی پیامی کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہو میرے انجان (Subconcions mind) میں تو سدا یاد ایام کی ایسی گھڑیاں جاگ جاتی تھیں جو توریت کی اکسیر بنکر رگوں میں، رگوں کے دوڑتے خون میں، گھل ملگئی ہوں۔ میں نے اکثر دیکھا ایک نور کی نگری ہے۔ جہاں اس ظاہر باطن کی سج دھج والی خاتون کے پاک صاف تخیل کی نازک نازک پتریاں دلی کے آڑے پجامے آڑے ڈوپٹہ میں

گلے بیّاں ڈالے پھرتی ہیں۔ محلات میں کہیں تاج محل ہے تو کہیں لال حویلی۔ گویا کہیں بغداد ہے تو کہیں الحمرا! ان میں اکبر اعظم جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب۔ نور جہاں۔ ممتاز محل۔ زیب النسا کی بستی ہے، یا یہ لایق احترام بادشاہ اور بیگمات ہیں یا وہ بزرگ رفتگاں جو پاشاہت کی گودیوں پلے، بڑھے اور پاشاہت ہی کے زانو پر جنہوں نے دم توڑا۔ دلیر۔ وضعدار۔ ہنس مکھ۔ ملنسار۔ علم دفن کے دُلارے۔ تیز تہذیب کے پیارے۔ مرنجاں مرنج، جس میں ایرآن کی خوشباشی، ہند کے بھولے پن نے عرب کی اساسی سادگی، پاکیزگی اور بلندی سے میل کھاکر اک انوکھی روح پھونکدی ہے، اور جو دِلّی میں آکر توبہ شباب نازنین بنی مشرقی یادگاروں کے گیت گاتی پھرتی ہے۔ چہرۂ صبح بہار کی طرح شباب سے روشن۔ پیارے پیارے احساسات اور جذبات کے خوش رنگ پھول نک سے سک تک ہنس رہے ہیں! دولت اور خوشی کے مِینہ برس رہے ہیں! اس سمے میری نظروں میں ماضی۔ حال۔ مستقبل ایک ہوجاتا، اور دل کی آنکھ وہ وہ سندر نظارے دیکھتی کہ جن کے آگے چاند کی کرنوں سے جگمگاتی رات میں تاج محل کا خوبصورت منظر بھی ماند سا پڑ جاتا۔ اب کے بھی یہ آوازر کی تو نور سمٹ گیا۔ اور ایسا معلوم دیا، جیسے چمن کی نازک نازک شاخیں جھک جائیں، پھول کملا جائیں۔ بات کی بات میں افسردگی کا دھندلکا اس نورانی بستی پر بھی چھا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اگلے زمانے کی روح رنگیں قوس وقزح کی طرح گم تھی! اس سے دل تڑپا، آتما کلپ گئی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور سامنے آسمان پر میری ٹکٹکی بندھ گئی! جہاں سورج کا روشن گرد امغلئی شان وشوکت کی طرح ڈوب چکا تھا!!

سیّد وزیر حسنؑ (دہلوی)

تذکرۂ خندۂ گل

یا
ظریف شاعروں کا تذکرہ

جسمیں ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطایف وظرایف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اس کا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی میں اسے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعۂ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصولڈاک للعہ (چار روپیہ)　　منیجر "نگار" لکھنؤ

آہ ظفر!

حصارِ رحمتِ پروردگار تھی دہلی   دیارِ شوکت و عزّ و وقار تھی دہلی
خوشا وہ وقت کہ فردوس زار تھی دہلی   خوشا وہ عہد کہ جانِ بہار تھی دہلی۔

فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا اسکو
اسیرِ نالہ و فریاد کر دیا اسکو

جہاں میں شاہدِ عشرت تھی ہمنشیں اسکی   تہِ فلک تھی فضا فرحت آفریں اس کی
برنگِ گلشنِ فردوس تھی زمیں اس کی   مثالِ مہر ضیا بار تھی جبیں اس کی

پڑے تھے حور و ملائک کے کارواں اسمیں
بچھا تھا تختِ سلاطینِ گورگاں اسمیں

لہو سے دجلہ کا پانی ہوا تھا جب گلگوں   رہی نہ تھی تہِ افلاک شوکتِ ہاروں
کہیں نہ ملتی تھی عبّاسیوں کو جائے سکوں   نشانِ ہیبتِ غرناطہ ہو گیا تھا نگوں

لٹا رہا تھا متاعِ ضیا ہلال یہاں
نظر فروز تھا اسلام کا جمال یہاں

لگا رہی تھی یہ اوجِ سپہر پر زینے   دکھا رہی تھی رسومِ کہن کے آئینے
جلا رہی تھی اشوکا کی یاد سے سینے   مٹا رہی تھی دلوں کی فضاؤں سے کینے

ریاضِ ہند میں حورِ بہشت زاد تھی یہ
جہاں میں شیخ و برہمن کا اتحاد تھی یہ

بھرے ہوئے تھے متاعِ نشاط سے دامن   نوائے مومن و غالب سے مست تھے گلشن
زبانِ ذوق سے جھڑتے تھے پھول وقتِ سخن   چراغِ تفتہ و سالک سے بزم تھی روشن

ظفر کہ باغِ حکومت کا آخری گل تھا
اس انجمن میں نوا سنجِ شکلِ بلبل تھا

ریاضِ دودۂ تیمور کا ہزار تھا یہ　　شکوہِ بابر و اکبر کی یادگار تھا یہ
جہاں میں برقِ جہانگیر کا شرار تھا یہ　　گلِ بہار تھا یہ فخرِ روزگار تھا یہ
بلند و پست کا آئینہ دار تھا گویا
مآلِ ہیبتِ چین و تتار تھا گویا

دکھا رہا تھا تماشائے عالمِ فانی　　چھپا رہا تھا فقیری میں شانِ سلطانی
غزل میں کرتا تھا اظہارِ دردِ پنہانی　　سکندروں کو پلاتا تھا آبِ حیوانی
دمِ سحر جو گلستاں میں نغمہ سازی تھی
بہارِ رفتہ کے غم میں فغاں طرازی تھی

غضب ہے تیغِ فلک بے نیام ہو جائے　　ریاضِ دہر میں جینا حرام ہو جائے
یہ عندلیب گرفتارِ دام ہو جائے　　مہِ فرازِ شہی بے مقام ہو جائے
علاجِ درد جو چاہے کہیں دوا نہ ملے
مرے تو خاکِ وطن میں لحد کو جا نہ ملے

ازل سے گردشِ گردوں کا ہے یہی دستور　　چڑھائے دار پہ اس نے ہزارہا منصور
وہ قافلہ جسے لایا تھا ہند میں تیمور　　ہے اسکی خاک سے رنگون کی فضا معمور
طلسم کاریٔ نیرنگِ آسماں دیکھو
مآلِ دولتِ صاحبقرانیاں دیکھو

خموش قصرِ شکستہ سرائیں روتی ہیں　　کنارِ گنگ و جمن کی فضائیں روتی ہیں
ہمالیہ کی بہشتی ہوائیں روتی ہیں　　سحاب روتے ہیں انکو گھٹائیں روتی ہیں
رہے گی دہر میں تا حشر داستاں انکی
کبھی نہ بھولے گی ہندوستاں کو شاں انکی

اصغر حسین خاں نظیر (لودھیانوی)

عہد ظفر مین دہلی کی شاعری

محمد شاہی دور تک اگرچہ دہلی مین اردو شاعری کا رواج ہو چکا تاہم شاعری نے ابتک کوئی سنجیدہ اور موزون قالب اختیار نہین کیا تھا۔ بلکہ وہ غلط، مکروہ۔ اور مبتذل الفاظ و معانی کا مجموعہ تھی اور اس حیثیت سے اُسکو قدیم دکنی شعراء کے کلام پر چندان تفوق حاصل نہ تھا۔ مثلاً اس دور مین شاہ مبارک آبرو سب سے زیادہ نامور شاعر ہین لیکن انکے کلام کا نمونہ یہ ہے

اُٹھ چیت کھوں جنوں ستی خاطر نچنت ۔۔۔ اے کچھ بہار تجھکو خبر ہے بسنت کی

یارون ڈر دکم سے مڑوڑ دنہ بھر کے انگ ۔۔۔ آجا کہین پتنگ تو لاگ جائے لنگ

اس دور کے اساتذہ مین ایک اور بزرگ شاکر ناجی بھی ہین لیکن اُنکی وقعت جعفر زٹلی سے زیادہ نہ تھی چنانچہ میر صاحب انکی نسبت لکھتے ہین۔

مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود ۔۔۔ معاصر میان آبرو بود

بندہ بہ یک دو بار ملاقات کردہ شعر ہزل خود می داند۔ و مردمان را بہ خندہ می آرد"

اگرچہ شاہ حاتم اس دور کے شعراء مین ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہین اور زبان کی سلاست او صفائی مین بہت کوشان رہے۔ مگر تذکرہ قدرت اللہ مین انکے کلام سے متعلق جو آبرو اور ناجی کے طرز مین لکھا تھا۔ لکھا ہے۔

"بطرز آبرو ناجی حرف می زند۔ اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم"

غرضکہ محمد شاہی دور تک شاعری کا جو رنگ تھا۔ وہ بہت کچھ اصلاح طلب اور ترمیم کا محتاج تھا۔ محمد شاہ کے بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا انکے بارے مین آزاد فرماتے ہین۔

"بہر حال عالمگیر کے عہد مین ولی نے اس نظم (ریختہ) کا چراغ روشن کیا۔ جو محمد شاہ کے عہد مین آسمان پر ستارہ ہو کر چمکا۔ اور شاہ عالم کے عہد مین آفتاب ہو کر اوج پر آیا" شاہ عالم خود ایک پُرگو اور مشاق شاعر تھے۔ آفتاب تخلص کرتے تھے۔ اُنکے چار دیوان اُردو مین موجود ہین۔ اس دور مین درحقیقت خواجہ میر درد۔ فقیر۔ مرزا سودا۔ میر تقی میر۔ میر حسن جیسے اساتذہ اور مصلحین فن نے اردو شاعری کے اکثر عیوب مٹا ڈالے۔ سوقیانہ شاعری۔ مبتذل اشعار۔ ایہام گوئی۔ اور بہاشا۔ سنسکرت اور دکنی الفاظ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ زبان کی صفائی۔ سلاست۔ شستگی۔ مضمون آرائی اور اصلاح الفاظ پر خاص توجہ کی اور ایرانی شعراء کے نقش قدم پر چل کر اردو کو فارسی رنگ مین رنگنے کی کوشش کی۔

سخن کو ریختی کے پوچھے تھا کوئی سودا ۔۔۔ پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے

میر فرماتے ہین:۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختی کے — بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

باوجود اسکے زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی۔ اور بہت سے الفاظ اور روابط جنکو دہلی اور انکے ہمعصر بے تکلف استعمال کرتے تھے نکال ڈالے۔ تاہم کچھ الفاظ ایسے رہگئے جو انکے زمانہ میں فصیح سمجھے جاتے ہوں مگر آج ہمکو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں مثلاً

کیا کیا	بجائے	کس کس
اُن سنے	"	اُوس نے
مجھے آنسو	"	میرے آنسو
ایدہر اودھر	"	ادھر اُدھر
کہنے لاگا	"	کہنے لگا
سجن	"	معشوق
دم کھا رہے	"	سانس نہ لو

اس طرح اور بہت سے اشعار میں جو زیادہ جستجو کرنے سے مل سکتے ہیں۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اگرچہ میر اور سودا نے اردو زبان اور شاعری کو قعر مذلت سے نکال کر بہت کچھ سنوارا اور نہایت آب و تاب دی۔ تاہم اردو ابھی تک ترمیم اور اصلاح کی محتاج تھی۔

شاہ عالم کے بعد محمد اکبر شاہ ثانی تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوئے یہ بھی اکثر شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ اور شعاع تخلص کرتے تھے ۱۸۳۷ء میں انکے وفات پر بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہوئے

ظفر کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ زمانۂ ولیعہدی میں بھی دربار ظفر میں اساتذہ فن کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اور شعر و شاعری کے چرچے رہتے۔ اور مشاعرے بہت دھوم دھام سے منعقد ہوتے تھے۔ مگر جب یہ بادشاہ ہوئے تو ان کا شوق شاعری حد عشق تک پہونچ گیا۔ اور انکی حکومت چونکہ فقط نام کی تھی اور صرف دہلی اور اُسکے گرد نواح تک محدود تھی اور اونکو کار ہائے حکومت سے کچھ سروکار نہ تھا بدیں وجہ یہ ہر لحظہ شعر و سخن میں منہمک رہتے تھے۔

ظفر کی سخن پروری کی بدولت عوام میں شاعری نے اسقدر زور پکڑا کہ دہلی کی گلیوں کا ہر طفل دبستان اپنے آپکو میر، سودا، اور مصحفی کا ہمسر سمجھنے لگا۔ دہلی کا بچہ بچہ شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خاکِ پاک دہلی صہباتی۔ اور آزردہ جیسے فضلاء فارسی و عربی اور شیفتہ جیسے ناقد فن سے مشرف تھی۔ دہلی کی ادبی فضا میں غالب۔ ذوق اور مومن جیسے کاملین فن سانس لیتے تھے۔ دتی کا ہر جوان پیر اس بادہ ادب سے مخمور اور سرشار تھا۔

شعرائے سلف کا عہد ظفر کی شاعری پر اثر

سب سے پہلے یہ بات تحقیق طلب ہے کہ عہد ظفر کے شعراء نے کون سے اساتذہ سلف کے طرز کا تتبع کیا؟

اس ضمن مین ہم صرف اس عہد کے اساتذہ فن کے طرز کو پیش نظر رکھکر ایک صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرینگے۔

اس مین شک نہین ذوق۔ مومن اور غالب ابتدا مین مختلف شعراء قدیم کے کلام سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ کچھ عرصے بعد انھون نے الگ الگ اپنے مخصوص رنگ اختیار کرلئے۔

شاہ نصیر کے کلام مین ناسخ کی تمام خصوصیات کثرت سے پائی جاتی ہین۔ مثلاً انکا یہ شعر خاص ناسخ کے رنگ مین ہے۔

بوسہ نہ کیونکہ شیرے میرے مزار کا　　　مین ہون شہید آہوے چشم نگار کا
عالم تو دیکھ بکھرے ہوے زلف یار کا　　　رکھتا ہے لطف ابر سے پڑنا پھوار کا

علاوہ ازین شاہ نصیر نے ناسخ کی طرح جا بجا اخلاقی مضامین تمثیل کے ساتھ باندھے ہین۔ کہتے ہین

کیا کوئی سر بلند کرے دعوی عروج　　　سایہ ہے باکمال سدا کوہسار کا
شکل حباب حبس نفس گر کیا تو کیا　　　ہر دم مجھے خیال ہے دم کے شمار کا

ذوق کا ابتدائی کلام بھی ناسخ کے رنگ مین ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ درد کا تصوف۔ تیر کی سادگی۔ سودا کی شوکت اور جرات کی شوخی بھی انکے کلام مین پائی جاتی ہے۔

ناسخ کا رنگ حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

تیرے دندان مسی زیب کی دیکھی جو بہار　　　اوس سی پڑ گئی گلشن مین گل سوسن پر
تن رہا یون ہی تپ غم سے اگر گرم میرا　　　شیخ آہن کی طرح ہونگے بدن پر مو گرم

درد کے رنگ مین یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دانہ خرمن ہے ہمین قطرہ ہے دریا ہمکو　　　آئے ہے جزو مین نظر کل کا تماشہ ہمکو

علاوہ ازین انکے کلام مین جذبات اور تاثرات کی آمیزش کافی ہے زمانہ کے ماحول۔ کثرت مشق۔ اور طبیعت کی تیزی اور طراری سے ایک خاص رنگ پیدا کرلیا جس مین زبان کی صفائی اور سلاست محاورون کی برجستگی اور افراط کا عنصر غالب ہے۔ انکی غزلیات نے عوام کے دلون پر سحر سامری کا کام کیا۔

مومن خان نے بھی ابتدا مین ناسخ کا تتبع کیا۔ چنانچہ اونکے دیوان مین اس رنگ کے کثرت سے اشعار ملتے ہین۔ مثلاً کہتے ہین۔

بن تیرے اے شمع رو آتش کدہ تن ہو گیا　　　شمع قد پر تیرے پروانہ برہمن ہو گیا
آخر اشکون کے بھر آنے نے ڈبو یا مجھکو　　　چشم کا سوراخ کشتی کا روزن ہو گیا
نعش کا ہمدم کفن لانا کہ بس مین مر گیا　　　جلونون سے جلوہ خورشید سیما دیکھکر

لیکن یہ رنگ انکی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ انکی وارفتگی اور شوخی نے انکو جرات کی معاملہ بندی کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اس رنگ مین جو انکا کلام موجود ہے وہ متین اور سنجیدہ ہے۔

غالب نے کن اساتذہ فن کا تتبع کیا ؟

اسکا جواب وہ خود دیتے ہین۔

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی۔لیکن آزادروی کے سبب زیادہ ان لوگون کی پیروی کرتا رہا ہون جو راہ صواب سے نابلد تھے۔آخر ان لوگون نے جو اس راہ مین پیشرو تھے دیکھا کہ باوجودیکہ اون کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہون اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہون۔اونکو میرے حال پر رحم آیا اونھون نے مجھپر مربیانہ نگاہ ڈالی۔شیخ علی حزین نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجکو جتائی طالب آملی۔اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ مین تھا اوسکو فنا کردیا۔ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا۔"

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے۔غالب نے بھی تناسخ کے بہت سے دور کے بعد ایک خاص قالب اختیار کیا ابتدا مین بیدل کے رنگ مین اشعار کہے۔اسکا خود اعتراف کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے مجھے رنگ بہار ایجادئی بیدل پسند آیا

بعد ازین مثل دیگر اساتذہ دوران اونھون نے بھی ناسخ کی روش اختیار کی۔جیسا ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

یون بعد ضبط اشک پھرون گرد یار کے پانی پئے کسو پہ کوئی جیسے وار کے

ظاہر ہے ہم سے کلفت بخت سیاہ روز گویا کہ تختہ مشق ہین خط غبار کے

رفتہ رفتہ جب سادگی کی طرف طبیعت کا میلان ہوا۔تو میر کا رنگ اختیار کیا۔اور واقعہ یہ ہے کہ خوب نبھایا۔مثلاً

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہین آتی

میری قسمت مین غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آخر کار غالب نے بھی اپنا ایک خاص رنگ اختیار کرلیا۔انکا کلام بہ ظاہر جدت طرازی۔مضمون آفرینی۔پرواز تخیل۔ندرت ادا۔چستی بندش۔اور فلسفیانہ خیالات بے مثل ہے

ظفر نے ابتدا مین جرات کے رنگ مین شعر کہنا شروع کیا۔مگر بوجہ کہنہ مشقی۔دیگر شعرا کی صحبت۔اور ذاتی مصائب اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرلیا جسمین سوز وگداز اور درد وغم کا عنصر غالب ہے۔

عہد ظفر مین شاعری کے دو جداگانہ اسکول

اس عہد سعید مین دہلی میں اردو شاعری کے دو جداگانہ اسکول قائم ہوگئے۔شعرا کا ایک وہ گروہ تھا جو قدما کی روش کو تو چھوڑنا نہین چاہتا تھا مگر اسلوب بیان اور تازگی مضمون سے کلام مین ایک دلکشی پیدا کرتا تھا یہ گروہ زبان کی سلاست اور شستگی مین کوشان رہتا تھا۔یہ شعرا اردو محاورات کے چٹخارون عام فہم تشبیہات اور استعارات سے اشعار کو پرزور کرکے عوام سے داد سخن لیتے تھے۔مشکل بحرون اور سنگلاخ زمینون مین اشعار کہہ کر سامعین کے دلون پر اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھاتے تھے۔یہ عامیانہ شاعری سے پہلو تہی کرتے اور حقیقی جذبات اور سچے عاشقانہ تاثرات سے

سننے والون کے دل گرماتے تھے۔ یہ وہ گروہ تھا جو شیرین زبانی پر جان دیتا تھا اور پرواز تخئیل کا دامن ہاتھون سے نہ چھوڑتا تھا۔ انھون نے قدما کے محاسن کی سچی قدردانی کی اور اُنکی کمزوریون سے واقف ہوکر اپنے کلام کو اُن سے یکسر معرا رکھنے مین ایک حد تک کامیاب رہے شاہ نصیر۔ ذوق اور ظفر اس گروہ کے سرگروہ تھے۔

دوسرا گروہ غالب کا پیرو ہے۔ غالب اردو شاعری مین ایک طرز خاص کے موجد ہین۔ انھون نے اپنے کلام مین فلسفہ کے نکات کا حل اور تصوف کے رموز کا انکشاف اس خوبی اور آزادی سے کیا ہے کہ قدما، اور متوسطین کا کلام اس سے یکسر خالی معلوم ہوتا ہے۔ انکی دقت پسند اور جدت طراز طبیعت نے اردو شاعری کو نادر تشبیہ اور استعارہ دل آویز فارسی ترکیب اور دلچسپ بندش سے مالامال کردیا۔ مومن اور شیفتہ اس خدمت ادب مین انکے دوش بدوش ہین

عہد ظفر نے اردو شاعری کو خصوصاً اور اردو ادب کو عموماً اسقدر بلند ار فع متین اور سنجیدہ کردیا تھا کہ جسکی مثال کسی اور دور مین ملنا امر محال ہی نہین بلکہ ناممکن ہے۔ اس دور کے شعرا نے میدان شاعری مین وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ جسکا ہر وہ شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہے معترف ہے۔ ظفر کی فیاضانہ سرپرستی عوام کی تعجب خیز دلچسپی۔ اور شعرا روزگار کی باہمی مروت اور دوستی۔ امرا کی سخن فہمی اور سخن سنجی نے اردو شاعری کے لئے وہ قدرتی سامان پیش کردیتے تھے کہ جسکی مثال کوئی دوسرا عہد دینے سے قاصر ہے

علاوہ ازین ان دو اسکولون کی مختلف روش اختیار کرنا اور دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا بھی اردو شاعری کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ہم کو متاخرین مین ایسے اساتذہ فن نظر آتے ہین جنکے کلام مین ان دو مختلف روشون کے اجتماع سے وہ قدرتی اور اصلی رنگ پیدا ہوگیا جسکی زمانہ کو ضرورت تھی۔ مثلاً۔ سالک۔ مجروح۔ حالی۔ انور۔ ظہیر۔ کے کلام مین ذوق اور ظفر کی سلاست اور فصاحت مومن اور غالب کی مضمون آفرینی پرواز تخئیل اور دیگر محاسن کلام کو یکجا پایا جاتا ہے۔

ظفر کا اثر اردو شاعری پر

مل کے نزدیک شاعری عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے جب وہ تنہائی سے نکلکر امرا اور سلاطین کے دربار مین قدم رکھتی ہے اپنے اصلی مرکز سے دور ہوجاتی ہے۔ بالخصوص عاشقانہ شاعری پر جو تمامتر واردات قلبیہ کا مجموعہ ہوتی ہے درباری تعلقات کا سخت مضر اثر پڑتا ہے۔ اور دربارون کے مادی تکلفات اوسکی روحانی لطافت کو بالکل فنا کردیتے ہین

اگرچہ عام خیال یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری کے لئے محاسن اخلاق سے زیادہ رندی اور اوباشی کی ضرورت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری سے زیادہ کوئی چیز اوصاف حمیدہ کی محتاج نہین۔ قناعت۔ خودداری۔ بلند حوصلگی۔ فراخ مشربی۔ آزادی اور پاکیزگی غرض وہ تمام اوصاف جو ایک صوفی منش شخص کے لئے درکار ہین۔ عاشقانہ شاعری کا عنصر ہین اور انہی سے وہ لطیف جذبات اور بلند خیالات پیدا ہوتے ہین جو عاشقانہ شاعری کا آب ورنگ ہین۔ لیکن جو شاعر دربار شاہی مین قدم رکھتا ہے اُوسکو لازمی طور سے اِن اوصاف سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اسکی شاعری درد، جوش اور سوز وگداز سے بالکل تہی دامن ہوجاتی ہے اگرچہ مندرجہ بالا خیالات کا اطلاق لکھنؤ کی شاعری پر پورے طور سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے

کہ جب اوس نے دہلی مین نشو و نما پائی تو آخر کار اُسکو بہادر شاہ جیسا بادشاہ مل گیا جس کے دامن تربیت مین یہ خوب پھولی پھلی۔ بذات خود ظفر ایک درویش صفت بادشاہ ہے۔ انکی فقیری اور فقیر دوستی کی سینکڑون مثالین دہلی اور اکناف دہلی مین مشہور ہین۔ بہادر شاہ کا کلام ابتدا سے تصوف آمیز اور حسرت خیز ہوتا تھا جس مین سوز و گداز درد اور عبرت غالب ہے۔ یہانتک کے اُونکے شگفتہ مضامین مین بھی مایوسی اور ناامیدی کی جھلک نظر آتی ہے

ظفر کو اس بارے مین دیگر سلاطین اور امراء سے تفوق حاصل ہے کہ اوسنے شعراء عصر کو گمراہ نہین کیا۔ اور اونکو عامیانہ اور مبتذل شاعری کے قعر نکبت اور ذلت مین نہ گرنے دیا۔ بلکہ شعراء عصر کو اصناف سخن کے محاسن پر رجوع کیا۔ نہ تو دہلی مین شعراء لکھنؤ کی طرح اساتذہ فن نے اپنے معاصرین کا سوانگ بھروا کر استہزا اور تمسخر کیا اور نہ بہادر شاہ کو آصف الدولہ کی طرح ان ننگ زمانہ اور ننگ ادب مجادلون سے کوئی دلچسپی تھی۔ آزاد ایک مقام پر فرماتے ہین

"ایک شعر پر سید انشا اور شیخ مصحفی مین شکر رنجی ہو گئی۔ اور طبیعت کی شوخی نے زبانون کی بیباکی کے ساتھ ملکر بڑے بڑے معرکے کئے اسوقت آصف الدولہ شکار مین تھے۔ چنانچہ اونھون نے اپنے لکھنؤ نہ ہونے پر ہزار دل افسوس کئے اور بڑے اشتیاق سے ہجوون کو منگاکر سنا اور انعام بھیجے"

اس دور مین شعراء دہلی کے کلام مین جو متانت اور سنجیدگی بلند خیالی اور مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ وہ لکھنؤ کے درباری اور دیگر شعراء مثلاً جرأت۔ انشا۔ آتش۔ ناسخ۔ رنگین اور رند کے کلام مین نہین پائی جاتی۔ یہان ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہین کہ ہمارا یہ مطلب نہین ہے کہ انشا یا دیگر شعراء لکھنؤ کی شاعری یکسر متانت اور سنجیدگی۔ درد و غم کی چاشنی اور سچے جذبات اور تاثرات سے خالی ہے۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان اساتذہ فن کے کلام کا بیشتر حصہ حقیقی شاعری سے بے تعلق ہے۔ دربار لکھنؤ اور نوابان لکھنؤ کی بد مذاقی کا اثر شعراء وقت پر اچھا نہین پڑا۔ جیسا کہ آزاد سید انشاء کے بارے مین لکھتے ہین

"نواب مصطفے خان کا گلشن بیخار دیکھتا ہون تو خار نہین کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے۔ سید موصوف کے حال مین لکھتے ہین "ہیچ سنعت را بطریقہ راسخہ شعر نہ گفتہ، یہ بھی کہہ سکتے ہین کہ انھون نے اس راستہ مین قدم کیون رکھا۔ جو ایسی کیچڑ مین آلودہ دامن ہوئے لیکن شہرستان تجارت کے سیر کرنے والے جانتے ہین کہ جب رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے۔ تو بڑے معقول و ضعدار اشخاص اسکی چھینٹین فخر سمجھکر سر و دستار پر لیتے ہین۔

غرضکہ بہادر شاہ نے سلاطین لکھنؤ کی طرح شعراء وقت کو غلط راستہ پر نہین ڈالا۔ ظفر کی نکتہ شناس اور سخن فہم طبیعت اس آلودگی سے پاک رہی۔ دہلی کی علمی اور ادبی فضا فحش اور گندہ اور شہوتیانہ شاعری سے ایک حد تک پاک تھی اس عہد مین دلی کے مشاعرونکی یہ حالت نہین تھی جسکا ذکر مصحفی اپنے اس شعر مین کرتے ہین۔

ان لوگون کی مجلس مین یہ شور نہین دیکھا
بزم شعراء ہے یہ یا مرغون کی پالی ہے

ظفر — معلوم نہیں ہم سے حجاب ان کو ہے کیسا — اوروں سے تو وہ شرم و حیا کچھ نہیں کرتے

مومن — عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہوں — شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

خمریات

" عربی شعراء میں اخطل اور ابو نواس اور ایرانی شعراء میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ قدماء میں دور تغزل کے بعد جب معاملہ بندی کے ساتھ رندی اور ہوسناکی کا دور شروع ہوا تو آتش اور تلامذۂ آتش نے اس قسم کے خیالات کو زیادہ شوخ کیا۔ غالب عملاً شراب نوشی کا شوق رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بھی اس صنف میں نہایت مستانہ اور پرجوش اشعار کہے۔"

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس صنف میں آتش اور تلامذۂ آتش نے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ لیکن قدماء کے کلام میں بھی اس قسم کے اکثر اشعار ملتے ہیں۔ عہد ظفر میں شعراء دہلی نے اس صنف میں نہایت پرجوش اشعار کہے۔ مگر غالب نے حافظ کی طرح اپنے اشعار میں اپنی مخصوص فلسفہ طرازی بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں غالب نے اس صنف میں رندانہ خیالات کا بہت جوش اور خروش سے اظہار کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے غالب اردو شاعری کے حافظ ہیں۔ غالب کے علاوہ دیگر شعرائے دہلی نے بھی اس صنف سخن میں اشعار کہے ہیں مگر بہت کم اور وہ اس درجہ کو نہیں پہونچتے ہیں۔

غالب — پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

" — رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

" — وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

" — بہت سہی غم گیتی شراب کیا کم ہے — غلام ساقی کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

ذوق — زہر آب با شراب یہاں سب ہے نوش جاں — ساقی پیالہ منھ سے ہم اب تو لگا چکے

" — زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں — کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

" — مجھے آتا ہے رشک اس رند سے آشام پر ساقی — نہ جو دُرد مالکدر سمجھے نہ جو خم صاف سمجھے

" — پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پس جام شراب — لب پہ تو بہ ترے دل میں ہوس جام شراب

" — دست بد مست سے کی ٹوٹ کے فریاد بہت — نہ ہوا کوئی بھی فریاد رس جام شراب

ظفر — میکدہ بھی مدرسہ مجکو ساقی ہے تحصیل سی شوق — جام پیالے میرے حق میں بس شرح جامی ہے

ذوق — کیا ہووے گا دو چار قدح سے مجھے ساقی — میں لوں گا ترے سر کی قسم اور زیادہ

مومن — وہ رند خم کدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں — بہ تنگ آئے حریفان بادہ خوار مجھے

" — حوض میخانہ پئے سے بھی مرا جی نہ بھرا — کیا تنگ ظرف ہیں جو خم سے سبو بھرتے ہیں

فلسفیانہ شاعری

اردو شاعری ابتدا سے شعرائے کرام نے اکثر اپنے خیالات میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس عہد میں دلی

کے شعراء کے کلام میں جا بجا ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو فلسفیانہ خیالات کے حامل ہیں۔ خصوصاً غالب نے اس صنف میں ایک امتیازی حیثیت پیدا کر لی ہے۔

غالب عالم حقیقت کی اس طرح شرح کرتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر — کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

غالب کے نزدیک دنیا کی تمام رونق پست ہمت اشخاص سے ہے چنانچہ کہتے ہیں:۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہونے سے — بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

غالب رسم و رواج کی پابندی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ وہ یہ لکھکر:۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں — پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

طبقۂ خاص کو طعنہ دیتے ہیں۔

غالب عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کو پسند کرتے ہیں۔ اور اس خیال کو کہ "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را" کو یوں بیان فرماتے ہیں:

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

موت اور زیست کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسکو ذوق نے کس خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے:۔

ہے مقام زندگی زیر دم شمشیر مرگ — ہو گیا جس طرح کوئی دم گذارا ہو گیا

ذوق نے انسان کی فطرت کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

موت نے کر دیا ناچار و گرنہ انساں — ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

موت جو عدم و وجود میں حائل ہے اس کا اثر تمام کائنات پر اسقدر گہرا ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا:۔

یہ حیات چندروزہ جو نہ سد راہ ہوتی — تو پھر ایک عرصہ گاہ عدم و وجود ہوتا

اس طور کے فلسفیانہ اشعار اور بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ مثلاً:۔

ذوق — ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں — جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

" — منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے — گر نہیں آ کے خدا ساری خدائی دیتا

" — یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

ثبات کب ہے زمانہ کے عز و شاں کیلئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے

کہاں خلقت عزیز و زیر چرخ پیر پھرتی ہے — یہ فانوس خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے

ظفر — آمد و شد سے نفس کی ہمیں معلوم ہوا — یعنی موجود کو ہستی و عدم ساتھ کے ساتھ

" — آواز طرب گوشِ دلِ محو فنا سے — جز نالہ و فریاد بجز آہ و فغاں ہیچ

" — پایا نہ بجز داغ سیہ کاری اک عمر — نقشِ قدمِ قافلۂ عمرِ رواں ہیچ

" — ہستی یکدم پہ اپنی تو جو ہنستا ہے شرر — تیری اس غفلت پہ ہنستی تیری ہستی اور ہے

زکی — دل سے جو موج اٹھی اس سے کام کچھ ہم نے لیا — چینِ پیشانی بنایا یا خمِ ابرو کیا

" — تفرقہ کے لئے لازم ہوں میں — میں برا ہوں تو ہے اچھا کوئی

" — ہر ذرہ کو ایجاد سے تیری حرکت ہے — موجود ہوئے دہر میں کب ارض و سما آپ

قلق — عالم مگر فریب کے اندر فریب ہے — ہر تشنہ غرقِ آب ہے موجِ شراب میں

صوفیانہ شاعری اردو شاعری میں ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات کی آمیزش تھی رفتہ رفتہ اسکو بہت زیادہ ترقی ہوئی متعدد شعرائے کرام نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ مثلاً خواجہ حسن، کلیم، میر فضل علی شاہ دانا، میر فرحت اللہ فرحت۔ جب اردو شاعری مقبول عوام ہوئی تو خواجہ میر درد نے اردو زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا، خود فخر یہ فرماتے ہیں: ۔

پھوٹے گی اس زبان میں گلزار معرفت — یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

میر سودا، راسخ اور میر حسن کے دیوان بھی صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں۔

عہدِ ظفر میں بھی شعراء صوفیانہ شاعری کیطرف رجوع ہوئے اور قریب قریب تمام شعرائے وقت کے کلام میں تصوف آمیز اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ غالب، ظفر، شیفتہ اس بادۂ حقیقت سے مخمور ہیں۔ غالب کے بارے میں حالی کی رائے ہے کہ متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارہویں صدی کے شعراء میں ممتاز کر دیا۔

شیفتہ — یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا — ہاں عالمِ شہود ہے آئینہ ذات کا

" — سب اسمیں محو اور وہ سب سے علیحدہ — آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

" — فیضِ حق عام ہے افسردہ دل زار نہ ہو — دشت کیا جلوہ گہِ لالہ شاداب نہیں

" — فانوس شیشہ لگن زر سے کیا حصول — وہ ہے وہاں جہاں نہیں روغن چراغ میں

غالب — تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

" — طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

" — شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں — جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

" — لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

ظفر — ظاہر ہیں کیا ظہور کے مظہر نئے نئے — جلوہ ہیں اس کے پردے کے اندر نئے نئے

" — شراب عشق سے کیفیت بقائے ابد — وہ دیکھے آپکو جو یاں فنا سمجھ کے پئے

ظفر — توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جام شراب　　مجکو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے

" — نہیں موقوف شیخ و برہمن پر دیر و کعبہ پر　　ہر ایک سو جلوہ گر ہے حق جدھر چاہو اُدھر دیکھو

حیات و ممات کے کیا لاجواب اور صوفیانہ وجوہات بتاتے ہیں :-

خواب عدم سے چونکے ہیں مشتاق ہم ترے　　دیکھا نہ تجھکو اور اسی حسرت میں سو گئے

دیا اپنی خودی کو جو ہمنے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا　　رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے :- برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار + ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار۔ ظفر نے اسی خیال کو کس اچھی طرح واضح کیا ہے:

ظفر — سب رنگ میں اس گل کی مرے، شان ہے موجود　　غافل تو ذرا دیکھ وہ ہر آن ہے موجود

تم چشم حقیقت سے اگر آپ کو دیکھو　　آئینۂ حق میں دل انسان ہے موجود

ذوق — بشر جو تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے　　وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

" — اوسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا　　اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

" — کشتی سوار عمر ہیں بحر فنا میں ہم　　جس دم بہا کے لیگیا طوفان بہہ گیا

" — جلوہ ہو کیونکہ خاک پہ تاب عتاب کا　　جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا

" — جسے کہتے ہیں بحر عشق اس کے دو کنارے ہیں　　ازل نام اِس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

" — نہیں گوش شنوا باغ جہاں میں غافل　　ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

" — جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہینگے اپنی ہی بات میں　　تو فنا ہو ذوق اسی ذات میں جو ذات جملہ صفات ہو

ذکی — راہ فنا میں آکے پر و بال شوق کھول　　غافل پڑا ہے کشمکش جان و تن میں کیا

مجروح — ہے تو یہ سیدھی منزل مقصود　　سنگ رہ ہیں یہ سبحہ و زنار

" — حصر ہے ظرف کی مقدار پہ بیشی و کمی　　بہر عنایات فغاں سے کوئی ناکام نہیں

قلق — دیار یار کا شاید سراغ لگ جاتا　　جدا جو جادۂ مقصود سے سفر ہوتا

اخلاقی شاعری

اساتذہ سلف نے جا بجا اخلاقی مسائل کو مثلاً ترک دنیا قناعت توکل۔ تواضع۔ خاکساری۔ عفو۔ رحم۔ جود و سخا وغیرہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ادا کئے ہیں۔ ادن کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی شعرا کا تتبع کیا ہے، بہادر شاہ ظفر کے عہد میں شعرا نے اخلاقی مسائل کیطرف کافی توجہ کی۔ شاہ نصیر۔ ذوق اور خود ظفر نے اخلاقی مضامین پر کافی روشنی ڈالی۔ غالب کے بھی وہ اخلاقی اشعار جو دقیق فارسی ترکیبوں اور جدید تشبیہوں کے جکڑ بند سے آزاد ہیں وہ بھی کافی موثر ہیں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر　　پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ظفر آدمی اسکو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا　　جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ظفر — غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب — موج کی مانند کیوں پھرتے ہو بل کھاتے ہوئے
" — راہ بہتر ہے رہ ہموار رہرو کے لئے — نہ بلندی ہے بہت اچھی نہ پستی خوب ہے
" — غنچہ کی مٹھی میں زر ہے پر نہیں بست کرم — تنگئ دل اور ہے اور تنگ دستی اور ہے
ذوق — کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

یہ تمام غزل اخلاقی اشعار سے پر ہے اس کے علاوہ اور بھی اشعار پائے جاتے ہیں مثلاً:-

ذوق — ہے پاک دامنوں کو خلشگر سے کیا خطر — کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار سے
" — اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ — اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا
" — نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم — کہ بدتر ڈوب مرنے سے یاں جینا سہارے کا
" — حق نے تجھکو ایک زباں دی اور کان دو — اس کے یہ معنی کہے ایک اور سنے انسان دو
" — بیٹھے ہیں ثمر شاخ ثمر ور کو جھکا کر!! — جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ!
" — خاکساری ہے عجب وصف کہ جو جس میں ہو سو — ہو صفا اور دل اہل صفا یاد رہے!
" — پھرتا ہے سیل حوادث سے کوئی مردوں کا منھ — شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں
غالب — آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں — ایرا ہی دے کے ہمنے بچایا ہے کشت کو
" — دو نو جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
" — ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو
" — نہ سنو گر برا کہے کوئی !!!! — نہ کہو گر برا کرے کوئی !!!!
" — روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

ندرت اسلوب بیان
ذو معنی اشعار

غالب اور مومن کو ذو معنی اشعار کہنے میں خاص ملکہ تھا۔ ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے یہاں کم دیکھی جاتی ہے۔ اسکا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنے مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنیکے بعد ایک دوسرے ہی لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں، جسکی وجہ سے انکا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔ مثلاً

غالب — کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!! — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!
غالب — کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق — ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
" — الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں دو چار تو کیونکر ہو
" — زندگی میں وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے — دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے
مومن — درد ہی جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونیکے جو درماں ہوگا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

مومن اور غالب کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور ہے اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والا کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں اگر اعتدال ہو جائے تو شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے:۔

مومن　　ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے　　صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
〃　　اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں　　بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث
〃　　ناصح کہاں تلک تیری باتیں اٹھا سکوں　　سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں
غالب　　توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا
〃　　گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
〃　　تجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور　　رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم
〃　　ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
〃　　رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے　　بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
ذوق　　ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں　　ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں
　　ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سن سن اپنے　　کرکے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے
　　تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن　　پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

ندرت اسلوب کے تحت میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ قابل گذارش ہے یعنی مومن کے کلام میں ایک خاص وصف ہے جس میں کوئی استاد اس سے بہتر تو درکنار انکی ہمسری سے بھی عاجز ہے، مومن معاملہ بندی کے تحت میں اپنا مطلب اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اسمیں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔ اگر مومن کا دل یہ چاہتا ہو کہ ان کا معشوق رقیب کی طرف نہ دیکھے اگر سیدھی طور منع کریں تو بیچارہ کی سنے کون لہذا اسطور سے کہتے ہیں کہ معشوق پر انکا جادو چل جاتا ہے۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

اس طرح کے متعدد اشعار ان کے کلام میں ملتے ہیں، مثلاً:۔

سرمگیں آنکھوں میں تم سرمہ لگاتے کیوں ہو　　خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو
وہاں کو آنے دینے میں میرے نہ کیجئے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

"قدما اردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز لطیف اور پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔ اور زبان کی صفائی

اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں، بھائی شاعری مضمون آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔" (منقول از یادگار غالب)

القصہ ایسے اشعار جو مضمون آفرینی میں کمال کو پہونچے ہوئے ہیں۔ مومن۔ غالب۔ ذوق اور ظفر کے کلام میں متعدد پائے جاتے ہیں۔

سہرا | سہرا گوئی عہد ظفر کی ایجاد ہے۔ اس عہد سے قبل کسی شاعر کے دیوان میں سہرا نظر نہیں آتا۔ سہرا اردو شاعری کی خاص چیز ہے۔ ذوق اور اور غالب نے حریفانہ حیثیت سے جو سہرے کہے ہیں انکو ایک سخن گسترانہ بات نے ایک تاریخی اہمیت دیدی۔ مولانا طباطبائی اور امداد امام اثر نے "کاشف الحقایق" میں ان دونوں سہروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ذوق کے سہرے میں معمولی مضامین کو شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ اس طور پر موزوں کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام کو پسند آتا ہے۔ برخلاف اسکے "غالب کا سہرا انکے مذاق غزلگوئی کا رنگ رکھتا ہو۔ الفاظ کی بندش کا انداز بھی وہی ہے، جو انکی غزلگوئی میں اکثر قایم رہتا ہے مثلاً حسن دل افروز۔ طرف کلاہ۔ رگ ابر گہر بار۔ باب گراں باری گوہر۔ اسلئے انکا سہرا سہرے کے تقاضے سے متعلق نہیں۔"

قصیدہ گوئی | قصیدہ گوئی کا آغاز اردو شاعری میں قدماء کے ابتدائی دور میں ہوچکا تھا۔ لیکن قدماء کے دوسرے دور میں سودا نے قصیدہ گوئی میں خاص شہرت حاصل کی۔ سودا نے ایرانی شعراء کے قصیدوں پر قصیدے لکھے۔ اور قصیدہ گوئی کے تمام اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ وہ تمام خوبیاں ان قصیدوں میں پائی جاتی ہیں جن کا التزام قصیدے میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن باوجود اسکے سودا کے قصائد میں اکثر کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً مبالغہ، غلو اور اغراق کے علاوہ ابتذال فحاشی اور بیحیائی بھی پائی جاتی ہے مثلاً :-

گو بر کرے اس آن میں رستم کا گاؤ سر   بیت الخلا کو یاد کرے سام بار بار

علاوہ ازیں اکثر بجائے واقعہ نگاری کے سودا نے تخئیل پر قصیدے کی بنا رکھی ہے۔ مثلاً

قول پر ان کے تری ہمت جود سبیل   پوچھتا میں حکما سے ہے خلا کیونکر محال

ہاتھ تیرے کا اگر عکس پڑے دریا پر   در مکنون سے ہو مشت صدف مالا مال

عہد ظفر میں شعرائے دلی نے قصیدہ گوئی میں ایک امتیازی حیثیت پیدا کی۔ غالب۔ مومن۔ ذوق اور ممنون نے بہت برجستہ اور پرشوکت قصیدے کہے زبان کی صفائی۔ الفاظ کی شوکت اور نیچرل سادگی انمیں بدرجہ کمال ہے۔

ذوق کے قصیدوں میں آمد۔ روانی۔ سلاست، برجستگی اور متانت کے علاوہ سادگی زبان شیرینی اور الفاظ کی شان شوکت ترکیبوں کی دل آویزی اور بندش کی چستی نے ایک خاص دلکشی پیدا کردی ہے۔ مثلاً یہ قصیدہ پڑھیئے

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر   عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

ذوق کے اکثر قصائد مشکل زمینوں میں بھی ہیں مثلاً یہ قصیدہ :-

ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق   پرتو ہے کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق

یا یہ قصیدہ :-

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کا تماشہ گوہر   ایک گھر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

. . . .

موج گوہر میں بھی ہے طرز تبسم پیدا — کوئی دم میں روش غنچہ ہنسے گا گوہر

رخ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ — کیا تراشہ ہے کہ بن جاتے ہیں مونگا گوہر

قطرۂ آب لطافت سے ہے ٹپکا پڑتا — گوش خوبان سمنبر میں مصفا گوہر

مدح حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر — آج ہے خامہ مرا منھ سے اگلتا گوہر

آج وہ دن ہے کہ لے خسرو والا گوہر — کو وہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر

صبح اقبال سعادت کا ستارہ چمکا — جو ترا طرۂ دستار کا چمکا گوہر

عکس سے تیرے اقبال کے دریا سے ترے . ق . اے محیط کرم و جود کے یکتا گوہر

آب گوہر ہو تو آب یہ اعجاز نما تر — کف دریا کو بتائے ید بیضا گوہر

(کچھ اشعار چھوڑ دیئے ہیں)

ذوق کا یہ قصیدہ جو اکبر شاہ کی مدح میں ہے قابل تعریف ہے۔ تشبیب ملاحظہ کیجئے۔

سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیران — تو ایک پری چہرہ حور طلعت بشکل بلقیس و ماہ کنعاں

پری کی صورت چمن کی رنگت گر اسکا شیوہ تو اسکا جلوہ — زبان شیریں بیان رنگیں کلام رندان خرام مستاں

اس تشبیب کے اور گریز کے بعد دوسری بحر میں مدح اس طرح کرتے ہیں :- (اس قصیدہ میں قاآنی کیطرح ترنم پایا جاتا ہے)

شہنشاہ تیرے سر پہ دوراں ہی چتر بن بنکے ہوتا قرباں — کہ ہفت اختر یہ ہفت کشور ہیں آج یکسر مطیع و فرماں

آزاد اپنی رائے کا اظہار ذوق کے قصائد کے بارے میں اس طرح کرتے ہیں "اردو نظم کی نقاشی میں مرزا کے موصوف (سودا) نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کردیا انکے بعد شیخ مرحوم (ذوق) کے سوا کسی نے اسپر قلم نہیں اٹھایا اور اس فقرہ سے اختلاف ہے غالب اور مومن کے دو ایک قصائد بھی اردو قصائد کی جان ہیں اور انہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہونچا۔ انوری ظہیر ظہوری نظیری عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہوکر چمکتے ہیں لیکن اونکے قصیدوں نے ہند کی زمین کو آسمان کردیا" جب بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تو ذوق نے یہ قصیدہ گزرانا :-

روکش ہو ترے رخ سے کیا نور سحر رنگ شفق — ہے ذرہ ترا پرتوئے نور سحر رنگ شفق

اس قصیدے کی فصاحت . بلاغت . پرواز تخیل . شوکت الفاظ . نزاکت خیال قابل داد ہے ۔ مصنف خمخانۂ جاوید کی رائے ہے کہ "ذوق نے قصیدے بھی بڑی شان اور آن بان سے کہے اور مسلم الثبوت استادی کا سکہ تمام معاصرین کے دل پر بٹھادیا سوا اسیر و شنوں کے انکے معاصرین یا متقدمین میں سے کسی نے اس زور شان و شوکت کے قصائد نہیں کہے" ذوق کا یہ دعائیہ مسدس بھی قابل تعریف ہے :-

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان قادر ہو — قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو — زحل میر عمارت ترک گردوں میر لشکر ہو

سر ہفت آسماں جبتک کہ دور ہفت اختر ہو — الٰہی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو　　کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو
ثریا نورتن تا کہکشاں کے ہوئے بازو کو　　کرے وسمہ سے تا قوس قزح سبز اپنے ابرو کو
لب پا نخوردہ دشمن کے ہو سیر تراخنجر ہو　　سر بدخواہ فندق تیری انگشت حنا پر ہو

غرضکہ ذوق نے قدما کے قصائد پر ایک بڑی حد تک ترقی کی اور اپنے فضل و کمال کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ انکے قصائد میں ان کی صفائی اور سلاست مضمون اور الفاظ کی شان و شوکت اور روانی بحد کمال ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ اشعار سے انکے قصائد یکسر پاک ہیں۔ مشکل زمینوں میں جو دو چار قصیدے ہم تک پہونچے ہیں ان میں جو مضمون آفرینی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ اس قصیدہ پر

جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن　　آب وایلولہ ہوئے نشو ونمائے گلشن

خاقانی ہند کا خطاب ملا۔

مومن نے قصیدہ گوئی میں ایک خاص رنگ اختیار کیا، اگرچہ پختگی اور صفائی میں قصائد ذوق کا رتبہ کہیں ارفع ہے مگر جدت اور ندرت میں مومن کے قصائد لاجواب ہیں، انکی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے۔ ایک قصیدۂ منقبت جو سید ناعمر فاروق کی مدح میں ہے، اسکی تشبیب دیکھئے کیا عاشقانہ رنگ سے مملو ہے:۔

جو اسکی زلف کو دوں عقدۂ مشکل　　تو بوالہوس کا بھی ہرگز نہ ہو چھوٹا دل
تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں　　میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل

گریز میں فرماتے ہیں:۔

فغاں کہ دلبر خودکام سے پڑا مجھے کام　　حصول کار ہے بیکار سعی لاحاصل
وہ فتنہ گر بت ناحق شناس نا انصاف　　کہ فرض عین گنے کین داور عادل
امام اہل یقیں شہریار کشور عدل　　امام لشکر دین و مبارز مقتل

قصیدہ میں تعلی اور شکایت زمانہ بھی پائی جاتی ہے نعت شریف اور منقبت خلفا راشدین کے قصیدے والہانہ اور بیخودانہ عقیدتمندی سے لبریز ہیں، مومن کے قصائد میں علمی مضامین بکثرت ملتے ہیں، اور چونکہ خود رمل نجوم اور طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اس لئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اعزاز بڑھا دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر　　کرے معارضہ سر دفتر علوم ونفوس
طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل　　نظارہ رخ گلفام سے مجھے محسوس
جو ہوں معالج مبطوں تو قابض ارواح　　کرے دعا رواج طرق جالینوس

یہ بھی عرفی کیطرح اپنے علم و فضل پر مغرور رہکر اکثر اپنی جدت سرائی کرنے لگتے ہیں جیساکہ اشعار بالا سے ظاہر ہوتا ہے، مومن نے صلہ کی امید پر ارباب دنیا کی مدح میں کبھی قصیدہ نہیں لکھا راجا اجیت سنگہ رئیس پٹیالہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اسکا خاص سبب ہے، یہ اتفاقاً جارہے تھے کہ کسی نے راجہ سے کہا کہ یہی مومن خاں ہیں راجہ نے انکو بلا یا بات چیت ہوئی۔ چلنے لگے تو راجہ نے کہا کہ ہتنی پر سوار ہوکر جایئے، غرضکہ مذکورہ مدحت سرائی برامید صلہ نہیں بلکہ شکریہ دوستانہ ہے

نواب وزیرالدولہ فرمانروائے ٹونک کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے جسکا مطلع یہ ہے:۔

یاد ایام عشرت فانی　　نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

مگر یہ قصیدہ بھی صلہ کی امید پر نہیں لکھا

ماسوا ان قصائد کے ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ہے، ایک نعت میں اور ایک خلفا راشدین اور ایک امام حسین علیہ السلام کی منقبت میں ہے

ذوق اور مومن کے علاوہ غالب نے بھی کچھ قصائد لکھے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اصول قصیدہ گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں۔ مثلاً یہ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے: —

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس قصیدے میں ایک بلند پایہ تشبیب کے بعد نہایت خوبصورتی سے گریز کا راستہ پیدا کیا ہے:-

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ　　اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن　　نام شاہنشہ بلند مقام
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہر ذوالجلال والاکرام

ماہ نو کی طرف خطاب کر کے کہا ہے: —

جب کہ چودہ منازل فلکی　　کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر　　کوئے مشکوے و صحن منظر و بام

اس قصیدے نے بلحاظ اپنی متانت۔ سلاست جزالت اور تشبیب ایک نئی روشنی پیدا کی۔ یہ قصیدہ رسمی محاسن ایشیائی سے یکسر خالی ہے۔

طباطبائی کی رائے ہے کہ اس قصیدہ کی تشبیب یک کارنامہ ہے اور جب سے اردو زبان میں قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے طرح کی تشبیب کم کہی گئی ہے، اس قصیدے کے علاوہ غالب نے اور بھی قصائد کہے ہیں جو دیگر شعرا کے قصائد سے کئی باتوں میں ممتاز ہیں مثلاً انہیں مثل قدما کے بے جا مبالغہ نہیں ہے۔ جیسا کہ سودا کے قصیدے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مطبخ کی تعریف میں سودا یوں فرماتے ہیں

اللہ اللہ تیرے مطبخ کا تجمل جس کا　　طبق روئے زمیں ہے سر خوان خشک

برخلاف اس کے غالب بادشاہ کی مدح اس طرح کرتے ہیں جس طرح کہ ایک بادشاہ کی مدح کرنا چاہیئے: —

بادشاہ کا نام لیتے ہیں خطیب　　اب علوئے پایۂ ممبر کھلا

مثل مومن کے غالب نے بھی عاشقانہ مضامین استعمال کئے ہیں لیکن غالب نے اس کا خیال رکھا ہے کہ وہ غزل نہیں کہہ رہے ہیں لہذا انھوں نے ایسے عاشقانہ اشعار کہے ہیں جن کا تعلق مدح سے مل جاتا ہے۔ غالب نے حسب ذیل قصیدے میں عاشقانہ اشعار کہے ہیں، مگر ان اشعار کا لب و لہجہ قصیدے سے میل کھاتا ہے۔

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلہ عنبر کھلا

بلحاظ اسلوب بیان اور طرز ادا بھی غالب کے قصائد اس صنف سخن کے اصول کے پابند ہیں۔ مثلاً ممدوح کی مدح اس طرح کرنی چاہئے کہ اس کی ذات تمام خصوصیات کے ساتھ مجسم ہو کر سامنے آجائے۔ مثلاً :-

بزم سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

علاوہ ازیں غالب نے اپنے قصائد کے آخیر میں دعائیہ اشعار اس قدر اختصار اور خوبصورتی سے کہے کہ مثال ہو کر رہ گئے :

کاتب حکم نے بموجب حکم — اس رقم کو دیا طراز دوام

ہے ازل سے .... — ہے ابد تک رسائی انجام

دیگر — تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب و مومن و ذوق کے علاوہ دیگر شعرائے وقت نے قصیدہ گوئی پر طبع آزمائی کی مگر سوائے ممنون کے اور کسی کے قصیدے زیادہ مقبول نہ ہوئے۔ ظفر کے دیوان میں بھی نعتیہ قصائد موجود ہیں۔

مثنوی دلی میں مثنوی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی چنانچہ اس دور میں مومن نے چند اچھی مثنویاں لکھی ہیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں ان کی مثنویاں بلحاظ صفائی زبان اور اسلوب ادا اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ چونکہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہیں اس لئے خاص درد اور اثر رکھتی ہیں، لیکن بعض اشعار عریاں ہیں۔ انکی وہ مثنویاں جو مذہبی رنگ میں لکھی گئی ہیں وہ بہت پرجوش ہیں۔ ذوق اور مومن کے یہاں مثنویوں کا وجود بمنزلہ عدم ہے۔ ذوق نے ایک مثنوی نامہ جانسوز لکھی تھی جو پانسو اشعار پر مشتمل تھی مگر غدر میں ضایع ہوگئی۔ اون کے دیوان میں مثنوی کے زیر عنوان کچھ اشعار ملتے ہیں۔

صنائع و بدائع صنائع و بدائع کی پابندی دلی کے شعراء میں بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ کلام کی بنیاد اکثر صنائع و بدائع پر رکھنے سے معنی سخت الجھن میں پڑ جاتے ہیں اور اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ صنعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک معنوی جیسے مراۃ النظیر، مشاکلہ عکس، حسن تعلیل، تجاہل عارفانہ، ایہام وغیرہ۔ دوسری لفظی، جیسے تجنیس اور منقوط وغیرہ۔

اس دور میں شعرائے دلی کے کلام میں خال خال ایسے اشعار ملتے ہیں جنہیں صنایع و بدایع پائے جاتے ہوں، خصوصاً شاہ نصیر اور ذوق کے کلام زیادہ اور مومن اور غالب کے کلام میں کمتر۔

سطور بالا میں ہم عہد ظفر میں اردو شاعری اور شعرائے کرام کے محاسن کلام پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ اردو ادب اور خصوصاً غزلگوئی جس بلند مرتبہ پر پہونچی وہ سب پر ظاہر ہے۔ زبان کی پاکیزگی طرز ادا کی جدت اور اسلوب بیان کی ندرت اس عہد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ پرواز تخیل، شوخی ادا، مضمون آفرینی، فلسفہ طرازی اور تصوف آمیز اشعار کے لحاظ سے یہ عہد بے نظیر ہے، جذبات نگاری میں جس سچائی اور حقیقت کا اظہار شعرائے دلی نے کیا ہے وہ قابل ہزار آفریں ہے۔ باوجود اس حیرت انگیز ترقی کے اس

عہد کے شعرائے کلام میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں، جن کا اظہار ایک ناقد کا فرض ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ کچھ نامناسب الفاظ کا استعمال:-

قریب قریب اس عہد کے تمام شعراء کے کلام میں کبھو۔ کسو۔ کھائے ہے۔ تئیں، اور اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں جنکا شمار اب متروکات میں ہے۔ ممکن ہے جب نہ ہو۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ باوجود اسقدر اصلاح اور ترمیم کے زبان میں اب بھی کچھ سقم باقی تھا۔ اس عہد میں "تس پہ" متروک ہو چکا تھا مگر غالب نے استعمال کیا جو ناجائز ہے۔

گوشش مہجور پیام و چشم محروم جمال　　ایکدل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

۲- رعایت لفظی: شعرائے دلی اگرچہ ایک حد تک اس وبا سے محفوظ رہے تاہم رعایت لفظی کی اکثر مبتذل مثالیں اس عہد کے شعراء کلام پائی جاتی ہیں۔ شاہ نصیر۔ ظفر اور ذوق کے یہاں بہت زیادہ مومن اور غالب کے کلام میں بہت کمی ہے۔

شاہ نصیر — تیرا خط ہر روز پڑھواتے ہیں ہم　　دل اسی پرچے سے پرچاتے ہیں ہم

" — چمکا ترے بلاق کا موتی جو رات کو　　دم ناک میں ہے اختر دنبالہ دار کا

مومن — طلب وصل کس انداز سے ہم لکھتے ہیں　　شوق نامہ اُسے وصلی پہ رقم کرتے ہیں

شیفتہ — کیا کہوں جوہر شناسی آپ کی　　مجکو مارا تیغ جوہر دار نے

غالب — دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں　　ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

" — غالب میرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو　　پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں دہن کے پاؤں

ذوق — چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے!　　ستاروں میں کیا کیا چناں و چنیں ہے

"مشترک خامیاں" اس عہد کے شعراء کے کلام میں بہت کم پائی جاتی ہیں، لہٰذا ہم اس دور کے ممتاز اساتذہ ذوق، غالب اور مومن کے کلام کی کمزوریوں پر اکتفا کرتے ہیں اور جو کمزوریاں ان موالید ثلاثہ کے کلام میں ملتی ہیں، انہیں ایک یا دوسری غلطی کے دوسرے شعراء بھی مرتکب ہوئے ہیں۔

ذوق

بے مطلب قیافہ پیمائی اور محاورہ بندی: اکثر اشعار میں صرف محاورہ بندی کے علاوہ کچھ مطلب یا ندرت نہیں ہے۔ متعدد غزلیں جو سنگلاخ زمینوں میں ہیں انمیں سوائے قیافہ پیمائی کے کچھ نہیں اور حقیقی شاعری سے مفقود۔ شاہ نصیر اور ظفر کے کلام میں بھی یہ عیب ہے۔ ذوق کے یہ اشعار جنمیں محاورہ بندی کے علاوہ کچھ نہیں:-

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا　　یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

سوال بوسہ کو ٹالا جواب چین بر و سے　　برات عاشقاں بر شاخ آہو اسکو کہتے ہیں

ذوق۔ نصیر۔ اور ظفر کے دواوین میں جو غزلیں سنگلاخ زمینوں میں ملتی ہیں ان میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں حسن شعر

کچھ بھی نہیں، مثلاً ذوق اور نصیر کی یہ غزل جو اس زمین ہے "بس کی تیلیاں" "برس کی تیلیاں" دیکھئے یا ذوق کی وہ غزلیں دیکھئے جو اس زمین میں "ہرن کی شاخ" "یاسمن کی شاخ" یا "فن آب میں" "گلگفن آب میں" دیکھئے۔

۴۔ کلام میں تعقید

ذوق کی غزلوں میں بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جنہیں تعقید کا عیب ہے، ظفر کے دیوان میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا دہلی ضرور تاً زبان کو خیالات پر قربان کر دیتے تھے۔ غالب کے کلام میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں مثلاً

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر   ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

بندش میں تعقید ہے۔

غالب

۵۔ خیالات کی پیچیدگی

غالب کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کا اصلی اور صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت ہی نہیں بلکہ ناکامیابی کا سامنا ہوتا ہے، یہ طرز ادا اچھی نہیں اور اسیر غالب کا ناز کرنا کہ

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

نازیبا ہی نہیں ہے بلکہ قابل اعتراض ہے ایسے اشعار دیوان غالب میں بہت ملتے ہیں۔

"فارسیت" کا غلبہ اور بیجا استعمال

غالب کے اکثر اردو اشعار ایسے ہیں کہ جنہیں اگر اردو کا فعل علحدہ کر دیا جائے تو شعر اچھا خاصہ فارسی کا شعر ہو جاتا ہے۔ مثلاً:—

درس عنوانِ تماشہ بتغافل خوشتر   ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگان مجھے
سما رہے مرغوب بہت مشکل پسند آیا   تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
یکقدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

محاورہ بندی میں غلطی

غالب کے کلام میں یہ عیب بھی پایا جاتا ہے، مثلاً اپنے سہرے میں لکھتے ہیں:—

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا   باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا

طباطبائی لکھتے ہیں کہ محاورہ پورا نہ بندھا، محاورہ یہ ہے:۔ ترے سر شاعری کا سہرا۔ ترے سر فضیلت کا سہرا۔ خالی سہرا کوئی نہیں کہتا جس طرح مرزا نے بخت کے سر سہرا کہا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے :۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

شراب کھینچنا۔ یا ساغر کھینچنا دونوں اردو کے محاورے نہیں۔ اگر فارسی کے محاورے "شراب کشیدن" اور ساغر کشیدن" کا ترجمہ کیا ہے تو ناجائز ہے۔

فلسفہ طرازی کی زیادتی غالب کے کلام میں فلسفہ کا عنصر اعتدال سے بڑھ گیا ہے، غزل میں فلسفہ کا غلبہ نامناسب ہے غزل میں صرف حکایات سوز و گداز۔ درد و غم۔ اور احساسات و جذبات کا اظہار ہونا چاہئے اگر تصوف۔ فلسفہ اور اخلاقی مضامین کو شامل کیا جائے تو بہت کمی کے ساتھ مگر غالب کے کلام اس کے برعکس ہے:۔

مومن

خیالات کی پیچیدگی میں مومن بھی غالب سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار معما بن کر رہ جاتے ہیں مثلاً:۔

دیکھو اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

زبان کی ناہمواری مومن نے زبان کی صحت اور بندش کی درستی سے لاپرواہی برتی ہے لہذا ان کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا ہوا ہے جن میں بندش کی تعقید پائی جاتی ہے جو ان کے کلام کے اغلاق کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:۔

بے حجابی کا گلہ کیجئے تو کہتا ہے ترے
پردہ چشم کے تقصیر کے حائل نہوا
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس کے علاوہ مومن کے کلام میں نامانوس تراکیب اور ثقیل الفاظ کی بھرمار ہے۔ مشکل اصطلاحات اور بعید اشارات سے شعر کو گورکھ دھندا کر دیا ہے۔ مثلاً:۔

جیسے بندۂ شور عجز۔ ادراک الخ

مومن نے بعض الفاظ کا غلط استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً شمر بسکون میم کو بہ فتح میم لکھا ہے۔ بعض مقامات پر ردیف بیکار کر دی ہے مثلاً:۔

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

جو خامیاں ہم اوپر لکھ آئے ہیں، وہ دیگر شعرائے دہلی کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔

طاہرہ خاتون

عہد ظفر کے تاریخی وسیاسی حالات

ملتون کے بننے بگڑنے مین، قومون کے عروج وزوال مین، قدما کے شاندار اور پرجلال طرز تمدن مین، انکے دلکش اور دلفریب اصول تہذیب مین، انکے اختلال مملکت، اور اضمحلال قیادت مین ایک محو نظارہ کے لئے جو سامان بصیرت نظر آتا ہے اہل نظر سے مخفی نہین، مطالعہ فطرت کے یہ تاثرات، انسان کے ذوق ادب مین کارفرما نظر آتے ہین، تاریخ آثار، تصوف، شاعری اسی انقلاب ہستی کی مختلف علمی تعبیرات ہین، ایک مورخ اوٹھا، اسنے قوم مین جذبات عمل، اور شورش اقتدار پیدا کردی، انکی تعمیر عادات، انکی تنظیم جماعت انکی سیاست مدن، الغرض انکے تمام شعبات معاشرت کے لئے کاشانۂ ہستی، اور طلسم وجود سے، منتشر واقعات چن کر، اثر آفرینی کا ایک ایسا مادہ جمع کردیا جسے آج ہم "تاریخ" کے نام سے موسوم کرتے ہین، اسیطرح ہیئت اجتماعیہ کے بعض افراد نے اس ہنگامہ عمل کے آخری نتیجہ پر غور کیا، انھون نے مصر کے قدیم آثار، یونان اور روما کے مٹے ہوئے تمدن، فارس اور عرب کی قومی یادگار، ہندوستان اور چین کے دفائن ارضی کا پرحسرت نظارہ کیا، انکے قلوب پر ہنگامۂ ترقی، تمنائے حکومت، اور انکے وجدان مین احساسات مادہ نوازی اور طلب جاہ کی بجائے دوسری کیفیات پیدا ہوئین جنھین مبادی تصوف، اور لوازم شاعری سے تعبیر کرسکتے ہین، آثار قدیمہ کا یہی عبرت آموز نظارہ تھا، جسنے گوتم اور ادہم سے تخت چھڑایا، جسنے رومی اور سنائی پیدا کئے، جسنے گوئٹے اور ورڈسورتھ کی گفتار مین خلش پیدا کی، اسمین شک نہین کہ شعرا کی زندگی کا ابتدائی زینہ اکثر اس مطالعہ کے اولین حصہ سے متعلق رہا ہے، لیکن شاعری جب "فاراہ الآیۃ الکبریٰ" اور "یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ" کے مناظر سے متحسس ہوئی تو احساسات نے کروٹ لی، اذواق کا دوسرا مرکز مقرر ہوا، تاریخ بتاتی ہے، شعر وسخن کا آخری نتیجہ ذوق تصوف ہے، اور یہ کلیہ ہم رومی اور عطار کی حلاوت زندگی، خاقانی اور خسرو کے رشحات درد، نظیری اور ظہوری کے ترک تلذذ مین پاتے ہین، مشاہدات زندگی، اور تجارب انقلاب کی اسی منزل پر پہونچکر رومی نے کہا ہے۔

دیدم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ   بنشستہ ہمی گفت کہ کو، کو، کو

دہر کی اس پُر ملال بوقلمونی، اور دایۂ فطرت کی اس ستم ظریفی سے قلوب پر جو اثر پڑتا تھا، وہ صوفی ادبیات، یا زوال دولت کی تاریخی موشگافیون، اور کھنڈر اور آثار کی دلکش نقش آرائیون مین ملیگا، جنکا کافی ذخیرہ گبن کی دردانگیز سحر کلامی، اور خاقانی کے نگارخانۂ بیان مین پایا جاتا ہے، خاقانی مداین کے سربفلک عمارات کے کھنڈرون مین پہونچتا ہے، عہد اکاسرہ کی مٹی ہوئی عظمت انکا جاہ وجلال، انکی شان وشکوہ، انکا رعب ودبدبہ اسکی آنکھون کے سامنے آجاتا ہے، وہ عہد ماضی کے اس دور سطوت وحکمرانی کا ایک نہایت دلفریب نقشہ پیش کرتا ہے، اور اسکے بعد اس وحشت آباد مقام، اور درد پیدا کرنے والے ویرانہ کے نقوش دکھاتا ہے دفعۃً قلب مین ہیجان پیدا ہونے لگتا ہے، دل مین ٹیس اوٹھتی ہے، اور بے اختیار تیرہ سو سال پیشتر کے ایک انسان کے الہامی

جذبات کی تصویر نظر کے سامنے کھینچ جاتی ہے، وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم احسن اثاثا ورئیاہ قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمن مدا۔ حتی اذا رأوا مایوعدون اما العذاب واما الساعۃ فسیعلمون ھو شر مکانا واضعف جندا[۱] (اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے لوگ ہلاک کئے جو سامان اور نمود مین ان سے بھی اچھے تھے، آپ فرما دیجئے جو لوگ گمراہی مین ہین اللہ تعالی انکو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے، یہانتک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، اسکو دیکھ لینگے خواہ عذاب کو خواہ قیامت کو، سو انکو معلوم ہو جاویگا کہ برا مکان کسکا ہے، اور کمزور مددگار کس کے ہین)

خاقانی نے مدائن کے کھنڈر کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ گویا قرآن مجید کے اسی آیت کی شرح ہے، فرماتے ہین[۲]

ہان اے دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان
یکرہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن ران
خود دجلہ چنان گرید صد دجلہ خون گوئی کز گرمی خونا بش آتش چکد از مژگان
بینی کہ لب دجلہ کف چون بدہان آرد گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چندان

شاعر دریائے دجلہ کے کنارہ کھڑا ہے، اسکے ایک طرف عہد اکاسرہ کی یادگارون کا سلسلہ ہے، اسے دیکھکر شاعر کے دل مین ایک التہاب درد پیدا ہوتا ہے، ایک شعلۂ الم بھڑک اٹھتا ہے، اسے اپنے تمام جذبات لطیف خود دریائے دجلہ مین نظر آنے لگتے ہین، وہ دجلہ کے تموج اور تھپیڑون مین حباب کی سرافرازیون کو دیکھکر کہتا ہے کہ موج دریا آہ ہے جسکی گرمی سے جسم دریا پر پھپھولے رونما ہین، اور یہ حباب کی شکل مین سطح دریا پر نظر آرہے ہین

گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایوان را تا بو کہ بہ گوش دل پاسخ شنوی ز ایوان
دندانہ ہر قصرے پندے دہدت نو نو پند سر دندانہ بشنو ز بن دندان
گوید کہ تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنون گامے دو سہ بر ما نہ اشکے دو سہ ہم بفشان
از نوحہ جغد الحق مائیم بہ درد سر از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشان
آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی جغد است پے بلبل نوحہ است پے الحان

اسکے بعد شاعر کی آنکھون مین آنسو بھر آتے ہین وہ ایک والہانہ انداز مین، ٹوٹے ہوئے محلون سے اس تباہی و بربادی کا راز دریافت کرتا ہے، اور عالم بیخودی مین اسے دندانہ قصر سے جواب بھی مل رہا ہے، کہ آؤ تم بھی ایک پتلہ خاک ہو، مین بھی تمھاری ہستی کا ڈھیر ہون، ہماری تمہاری خلقت ایک ہے، مجھ پر دو ایک قدم چلو، چند قطرے آنسو بہا لو، دوسری طرف سے شاعر کے

---

[۱] قرآن مجید مین اکثر اس مضمون کی آیتین پائی جاتی ہین، زخرف، قصص، احقاف، قاف وغیرہ مین یہ اشارے موجود ہین۔
[۲] خاقانی کا یہ قصیدہ اس قدر مشہور ہے کہ ایک انگریز مستشرق نے اسکا ترجمہ مع شرح شایع کیا،

کان مین الو کی وحشتناک آوازین آرہی ہین، سرمین درد ہوگیا ہے، اور اب وہ طالب ہے کہ گلاب نہین بلکہ آنسوؤن سے میرے اس درد کا علاج کرو یعنی وہ دوسرے افراد کو بھی اپنا شریک ماتم بنانا چاہتا ہے، اسکے بعد نیرنگئی دہر کا ایک کلیہ پیش کرتا ہے، کہ دنیا مین ہر بلبل کی آواز کے بعد الو کی منحوس صدائین سنی جاتی ہین اور ہر نغمۂ نشاط کے بعد نوحہ مستلزم ہے۔

این ہست ہمان ایوان کز نقش رخ مردم   خاک در او بودے دیوار نگارستان
این ہست ہمان درگہ کورا ز شہان بودے   دیلم ملک بابل، ہند و شہ ترکستان
پند ار ہمان عہد است از دیدۂ فکرت بین   در سلسلہ درگہ در کوکبۂ میدان

یہ وہی محل ہے جہان خدم وحشم تھا، جہان کی خاک نگارخانہ چین کی دیوار تھی، یہ وہی دربار ہے، جہان دیلم، بابل ہند اور ترکستان کے حکمران جذبۂ نیایش لیکر آتے، اگر غور سے دیکھا جائے تو عہد ماضی کا وہ جبروت آج بھی در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے، آثار قدیمہ کے اس مطالعہ سے خاقانی اس نتیجہ پر پہونچے ہین

امروز کہ از سلطان رندے طلبد توشہ   فردا ز در رندے توشہ طلبد سلطان
ہر کس برد از طیبہ سبحہ "ز گل حمزہ"   پس تو ز مداین بر تسبیح "گل سلمان"

دنیا مین یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ آج اگر کوئی شخص بھکاری بنکر بادشاہ کے دروازہ پر صدا لگا رہا ہے، تو کل بادشاہ اس مفلس و قلاش کے دروازہ پر دریوزہ گری کیلئے آتا ہے، اسکے بعد فرماتے ہین کہ مکہ سے تو سب لوگ "سبحہ گل حمزہ" لیجاتے ہین مجھے مداین سے "گل سلمان" کی تسبیح لانی چاہیئے،

دنیا کی ہر قومی ترقی کا ایک دور ہوتا ہے، اور اگر مین تاریخ و آثار کے بے شمار واقعات کی بنا پر دعوی کرون تو بیجا نہین کہ امتون کی ترقی کے لئے فطرت خود اسباب مہیا کرتی ہے، اور جب انکی بربادی کا زمانہ آتا ہے، تو کوئی تدبیر کوئی حکمت عملی کارگر نہین ہوتی، جنھون نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، انھین اس سے انکار نہین ہوسکتا، کہ خاندانونکے اسباب عروج و زوال مین باوجود کاوش بھی اسکا پتہ لگانا مشکل ہے کہ کسی خاندان کی سیاسیات ایک وقت حوادث زمانہ کے سیلاب سے کیون محفوظ رہجاتی ہے، اور دوسرے وقت وہی اسباب سیاسی خطرات کیون پیدا کردیتے ہین؟ ایک غلام اور ایک آشفتہ حال فرد بادشاہ ہوتا ہے، اور شاہی خاندان کا ایک معزز انسان دربدر کی ٹھوکرین کھاتا پھرتا ہے، یا اپنا گلوئے نازپرورده کو تشنگی شمشیر کے لئے وقف کر دیتا ہے، عہد اموی و عباسی کی مطول داستان جلالت و نکبت کو جانے دیجئے، صفویہ اور قاچاریہ، فاطمیہ اور مملوکیون کے سیاسی انقلاب کو چھوڑیے، برامکہ کی ترقی، اور ہندوستان کے غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی، سور خاندانون کو درگزر کیجئے، صرف دکن کی محدود سرزمین کے مختلف شاہی خاندانون کے اسباب ترقی و تنزل پر غور کیجئے، خاندان بہمنیہ اور عادلشاہیہ، کے آشفتہ حال بانیون کے حالات زندگی پڑھیئے، نظام الملک بحری اور فاروق شاہیہ کے بانی راجہ بیگ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے[1]، آپکو معلوم ہوجاویگا کہ طلسم کائنات کی ان بوالعجبیون کو سمجھنا مشکل ہے، اور

[1] فرشتہ، البساتین السلاطین، منتخب التواریخ، اور تاریخ قطب شاہیہ وغیرہ مین بہ تفصیل یہ حالات موجود ہین ان خاندانون کے بانی اور انکے نسب و حسب کے متعلق ایک کتاب میرے زیر تصنیف ہے، جسکی اشاعت پہلے نگار مین بھی ہوگی،

عجز کیساتھ صرف یہی اقرار کرنا پڑیگا کہ حقیقتاً فطرت کا بانی کسی شے کو ہمیشہ ایک حالت پر رکھنا نہین چاہتا، ہر شاہی خاندان کا وجود ایک بچہ کی ولادت ہے، اور اسکے لئے جتنے مراحل ارتقاء طے کرنا ہین ان سے گزرنے کے بعد یقیناً ایک وقت معین پر باوجود سامان ارتقار، باوجود اسباب علو، نکبت کا ہجوم اور بدبختی کا سیلاب ضروری ہے، جس طرح ضعف پیری مین عمدہ سے عمدہ تدابیر بھی ایام جوانی کی معمولی تدبیر کے برابر بھی اپنا اثر ظاہر نہین کرتین، اسی طرح قومون اور ملتون، خاندانون اور افراد کے ارتقار کی ایک محدود منزل ہے، جہان اسے اپنی ترقی کا آخری سفر ختم کرکے فنا ہونا پڑتا ہے، اکاسرہ کی تباہی کا جب زمانہ آیا تو یزدجرد جیسے بیدار مغز بادشاہ کی ایک نہ چلی، اموریہ کی پستی کا دور آیا تو مروان الحمار جیسے زبردست سلطان سے بھی کچھ بنائے نہ بن پڑا، لودیون کے خراب دن آئے تو ابراہیم میدان جنگ مین مارا گیا

مغل خاندان حوادث روزگار کی اس زد سے کیونکہ محفوظ رہسکتا تھا، جلوس بابری ۹۳۲ھ سے ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کے وقت جلوس ۱۲۵۳ھ تک تین صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا تھا، خاندان مغلیہ وہ تمام خدم وحشم تزک وتجمل، جبروقہر قبضہ واختیار انعام ولذائذ حاصل کرچکا تھا، جو دنیا کے ایک بڑے سے بڑے خاندان کیلئے ضروری ہین آخر کار انکے عادات واطوار، انکے اخلاق اور ذہنیت مین انقلاب ہونا تھا، ہوا، اور جسطرح انھون نے لودیون کو بے خانمان کیا تھا، اسی طرح خود بھی بے خانمان ہوئے، وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (اور بہت سی بستیان ایسی تھین جو قوت مین آپکی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھین جسکے رہنے والون نے آپکو گھر سے بے گھر کردیا کہ ہمنے انکو ہلاک کردیا، سو انکا کوئی مددگار نہوا)

ایک با اقتدار خاندان کے ظل عاطفت مین، قدرت دوسرے خاندان کی ترقی کے جو اسباب مہیا کرتی ہے انہین تاریخ نے نظرانداز نہین کیا، البتہ صورتین مختلف ہوئی ہین، اور اس سایہ مین پرورش پاکر خاندانون نے اپنے ولی نعمت سے جو سیاسی حقوق حاصل کئے، انھین جسطرح مٹایا، اور آخر کار انہین مٹا کر تاج وتخت حاصل کیا وہ تاریخ کا کوئی نادرالوقوع مسئلہ نہین، لہذا مغل خاندان کے ساتھ انگریزی حکومت نے جن سیاسی تدابیر اور ظاہر دارانہ مراعات سے کام لیا انکا مطالعہ کرنیکے بعد نہ تو انگریزی حکومت کو مطعون بنایا جاسکتا ہے، نہ انگریزون سے کوئی گلہ ہے

خاندان مغلیہ کا دور انحطاط تو عالمگیر کی وفات سے ہی شروع ہوتا ہے، لیکن اکبر اور عالمگیر کی قایم کی ہوئی عظمت نے شاہ عالم کی زندگی (۱۱۱۸ھ سے ۱۱۲۴ھ) تک کوئی نمایان تغیر نہونے دیا اسکے بعد پیاپے مختلف بادشاہونکی تخت نشینی اور چند ماہ اور چند یوم تک زمام حکومت لیکر برطرف ہونے کے واقعات نے مغل سیاسیات کو بہت نقصان پہونچایا، چنانچہ شاہ عالم کی وفات ۱۱۲۴ھ سے سلطان محمد ابراہیم کے وقت جلوس ۱۱۳۲ھ تک تخت دہلی پر پیاپے مغل خاندان کے نو بادشاہ بیٹھے، ان مین صرف سلطان فرخ سیر نے چھ سال تین ماہ اور چند یوم تک حکومت کی بقیہ تمام سلاطین چند ماہ اور چند یوم تک سریر آرائے حکومت رہے ابوالفتح محمد شاہ بادشاہ کی حکومت ہرچند سطوت مغلیہ کے استقرار کے اعتبار سے اچھی تھی لیکن نادری حملہ اور دہلی کی بربادی نے

مغلوں کو دنیا کی نظر میں بہت خفیف کر دیا، اور غالباً اسی وقت سے ہندوستان کی دوسری سیاسی تحریکات کو مغلوں پر تسلط حاصل کرنے کی جرأت ہوئی، محمد شاہ کے بعد بہادر شاہ سے لیکر اکبر شاہ (۱۱۶۱ھ ۱۲۵۳ھ) تک ہر چند مستقل طور پر بادشاہوں نے حکومت کی، لیکن شاہ عالم ثانی ہی کے دور میں انگریزی سیاسیات نے ہندوستان پر ایک گہرا اثر پیدا کر دیا تھا اور شاہ عالم سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (۱۱۷۳ھ ۱۲۵۳ھ) تک تیموری خاندان کے بجائے انگریزوں کو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تصور کرنی چاہیئے

لارڈ ولسلی اور اسکے رفقائے دار الشوریٰ کا خیال تھا کہ شاہ عالم کو اپنی حمایت میں لیکر بتدریج حصول شہنشاہیت کی سیاسی تدابیر اختیار کرنی چاہیئے[۱]، شاہ عالم کے مسئلہ حفاظت سے لارڈ ولسلی نے سیاسی فضا میں جو نمایاں انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر خاندان مغلیہ کا یہ فرمانروا، انگریزوں کی بجائے فرانسیسیوں یا مرہٹوں کی حمایت میں آجاتا تو انگریزوں کو برطانوی حکومت کے قایم کرنے میں دقتیں پیدا ہوتیں، چنانچہ یہ نظریہ اس خط سے بھی واضح ہوجاتا ہے، جو لارڈ ولسلی نے ۱۳ر جولائی ۱۸۰۴ء کو انگلستان کی "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" میں بھیجا تھا، جسکا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ عالم کو برطانوی حفاظت میں لینے سے فرانسیسی قوم جو ہندوستان کے ایک حصہ میں صاحب اقتدار ہے، اپنے معاندانہ ارادوں میں کامیاب نہیں ہوسکتی، کیونکہ شاہ عالم انکے معاندانہ کارروائیوں میں ایک آلہ تھا، جس سے وہ اب محروم ہو گئے، ولسلی نے اس سیاسی حکمت علمی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بادشاہ کے مسئلہ حفاظت سے اطراف و جوانب کی دیسی ریاستوں پر ایک اچھا اثر پڑیگا اور وہ یہ دیکھکر کہ انگریزوں نے بادشاہ کے لئے اس گری ہوئی حالت میں ایک نشیمن راحت کا سامان کر دیا، اور اسکے آفت زدہ کثیر التعداد افراد خاندان کے لئے ایک معقول ذریعہ معاش مقرر کر دیا، انگریزی سیاسیات کو بہ نظر استحسان دیکھینگے، شاہ عالم کا انگریزی حمایت میں آجانا خاندان تیموریہ کے مٹنے اور حکومت برطانیہ کے استقلال کا سبب ہوا، اور "ولیم کے" "فتح و نصرت کے نہایت ستمگارانہ جذبات میں جبکہ

---

[۱] عہد ظفر کے یہ سیاسی و تاریخی حالات میں نے "جان ولیم کے" کی کتاب "تاریخ جنگ سپاہیان" سے لئے ہیں جو تین جلدوں میں ہے تاریخی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے بعض جگہ جیسی زہر افشانیاں کی ہیں، طنز آمیز لہجہ اور حقارت انگیز طرز خطابت اختیار کیا ہے، وہ یہی نہیں کہ ہندوستانی دماغوں کے اندر ہیجان پیدا کرنے والے ہیں بلکہ انگریزی سیاست کے بھی منافی ہیں اور میں یہ آہنگ بلند کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے یہ کتاب لکھکر انگریزی سیاسیات کو فایدہ پہونچانیکی بجائے نقصان پہونچانیکی کوشش کی ہے، میں نے چاہا تھا کہ ظفر کے متعلق ہر پہلو سے بحث کروں لیکن افسوس یہ ہے کہ میں پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں باوجود کاوش عہد ظفر کی تاریخی کتابیں نہ پاسکا وہاں اردو کی کتابیں ایک تو یوں بھی کم ہیں، اور جو ہیں انہیں اس مقصد کی کتابیں نہ مل سکیں تاریخ اور ادب کی کتابونکی تدوین کے متعلق خاندان مغلیہ کو جو شرف ہے، وہ علمی دنیا سے مخفی نہیں، لیکن عہد ظفر خاندان مغلیہ کا دور نزع تھا، وہاں تاریخ اور شاعری کے متعلق کتابیں کون لکھتا، بہت تلاش کے بعد "جام جم" مصنفہ سید احمد خان (قلمی نسخہ) انکشاف المخلوق مصنفہ منشی خادم علی سندیلوی اور اس انگریزی کتاب سے سیاسی اور تاریخی حالات مرتب کئے،

انسان بنجود ہو جاتا ہے، لکھتا ہے، کہ "ولسلی نے اپنے رفقا سر جارج بارلی اور مسٹر ایڈمن اسٹون کے مشورہ سے ایک فہرست تجاویز مرتب کی جسکے ذریعہ بادشاہ کی وقعت ایک گڑیا سے زیادہ نہیں رہی وہ بیک وقت ایک بادشاہ بھی تھا، اور انگریزون کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ایک آلہ بھی، وہ کچھ تھا بھی اور کچھ نہیں، اب وہ انگریزون کا ایک وظیفہ یاب تھا، وہ ہملوگون کے لئے "بازی عظیم" (Great game) کا ایک نمود اطمینان تھا، ہملوگون کو یہ دیکھکر تشفی تھی کہ بادشاہ ہمارے تصرف مین ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ہملوگون کیلئے ایک کشمکش اور حیرت کی چیز بھی تھا، کہ کس طرح اس آلہ کو استعمال کرین لارڈ ولسلی کی حکومت کی سیاسی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہ لارڈ ولسلی کی زبردست حکمت عملی تھی کہ اسنے صرف خاندان تیموریہ ہی نہین بلکہ اُنلوگون سے بھی مصالحت رکھی جو اس مسلمان شاہی خاندان سے ایک جذبہ احترام اور تعلق معززانہ رکھتے تھے لارڈ ولسلی کی تجاویز مین ایک تجویز یہ تھی کہ ریاستون پر جو اقتدار قایم کیا گیا ہے، اسکا ایک حصہ ہنوز بادشاہ سے متعلق رہے اور ان اضلاع کی آمدنی کے علاوہ جو اس تخت شاہی سے مخصوص تھی، بادشاہ اور اسکے خاندان کے لئے سالانہ ایک لاکھ پونڈ سے زیادہ وظیفہ مقرر کردیا، اس طور سے کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ، ہندوستان کا حکمران بایںہمہ کہ اسے حکومت بھی تھی اسکے مقبوضات بھی تھے حقیقتہً "جماعت تجار" کا ایک وظیفہ خوار ہو گیا، حالات نے ایسی صورتین اختیار کرلی تھین جو حکومت برطانیہ ہند کے فوایدکی موید ہون، لیکن خطرات سے خالی نہ تھین، ان مصائب اور انحطاط کے باوجود بادشاہ کا نام قوت کا ایک ستون تھا اور لوگ پرچم شاہی کو ہنوز بہ نظر اعزاز واحترام دیکھتے تھے، لارڈ ولسلی نے اچھی طرح معلوم کرلیا کہ اگر حکومت مغلیہ کے یہ بقیہ آثار قایم رہے اگر شاہ عالم کو شاہجہان کے محل مین اس تمام اگلی شان شکوہ کے ساتھ ایک مسلمان آبادی کے درمیان مین جو ہنوز خاندان تیموریہ سے وفاداری کا جذبہ رکھتی تھی، چھوڑ دیا گیا تو ایک نہ ایک دن شاہ عالم کے کسی جانشین کی بدولت تباہ شدہ شہنشاہیت کی تعمیر جدید کی جد وجہد ہوگی جس سے ہملوگون کو نہایت پریشان کن تکالیف کا سامنا ہوگا، اسلئے تجویز کیا گیا کہ مونگیر شاہی خاندان کا مسکن قرار دیا جائے لیکن تبدیلی مقام کے خیال سے ضعیف العمر بادشاہ کانپ گیا اور یہ لرزش خوف اسکے تمام خاندان، چھوٹے بڑے، مرد عورت، متعلقین اور محکومین مین سرایت کرگئی لارڈ ولسلی نے اب مزید ایذا رسانی سے باز رہکر انھین مورد عجز بنانا نہ چاہا، اور راضی ہو گیا کہ وہ دہلی محل مین سابق دستور رہین

دسمبر ۱۸۰۶ء مین شاہ عالم کا انتقال ہو گیا، اور اکبر شاہ اسکا جانشین مقرر ہوا، اسوقت انگریز افسر جو دہلی مین برطانوی حکومت کی نیابت کرتا تھا، قدیم طرز کا ایک درباری تھا، اور اسے اپنی نرمی کلام اور اوضاع سے کافی موقعہ تھا کہ دربار شہنشاہی پر خارجی اثر ڈال سکے، مسٹر سیٹن کو مرجانا قبول تھا لیکن وہ محل کے چھوٹے چھوٹے افراد کے احساسات کو مجروح کرنا نہین چاہتا تھا، چارلس مٹکاف نے لکھا کہ مین سٹین کے اس طرز عمل کو پسند نہین کرتا، جو انھون نے شاہی خاندان کے انتظام مین اختیار کیا ہے، مینے مانا کہ ایک برسر اقتدار شاہی خاندان کے زوال کے بعد عدل وانصاف، شفقت و مرحمت کا اقتضا ہے کہ ایک مستحسن طرز عمل اختیار کیا جائے، لیکن سیٹن کا خلق و رافت، انکا عجز محبت انکا اعتراف لطف اس تمام

شان وشکوہ کا خاتمہ کر رہا ہے جبکہ برطانوی حکومت کے ایک نائب کو دہلی مین جو صحیح معنی مین دہلی کا حکمران ہے، حاصل ہونا چاہیئے اس طور سے حمیت انسانی کے اظہار مین وہ ان شاہی جذبات کو بیدار کر رہے ہین جنھین ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہیے یہ تو ظاہر ہے کہ ہملوگ بادشاہ کو شہنشاہی اقتدار تفویض کرنا نہیں چاہتے، لیکن ساتھ ہی ہملوگون کو ایسی روش نہین اختیار کرنی چاہیے، کہ اسکے دل مین اسکے حصول کا حوصلہ پیدا ہو جائے، ہملوگ اسکے حالات کے مطابق اسکا احترام کرین ہملوگ ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکی اسکی آسایش کا خیال رکھین، اور جہانتک ممکن ہو وہ تمام ذرایع بہم پہونچائین جس سے وہ خوش خوش رہے، ساتھ ہی جب ہملوگونکی غرض غائی یہ نہین کہ پھر اسے وہی اگلی شہنشاہیت عطا کرین تو یہ ضروری ہے کہ ہملوگ یہ بھی مدنظر رکھین کہ اسے شہنشاہیت کا خواب دیکھنے کی بھی ترغیب نہو، ایک سفید مو ماہر سیاسیات بھی اس سے زیادہ معقول بات نہین لکھ سکتا، اور جب چند سال گزرنے کے بعد وہ دہلی مین ریذیڈنٹ مقرر ہوا، اور اسے مسائل کے حل وعقد کے اعلی اختیارات حاصل ہوئے تو اسکے لڑکپن کے خیالات اور بھی قوی ہوگئے، اسے ایسے ایسے امور سے سامنا ہوا جو عقل اور انسانیت دونو اعتبار سے مجرمانہ تھے، لیکن نہ تو وہ خود اور نہ اسکے جانشین اس سے زیادہ کر سکتے تھے، کہ یکے بعد دیگرے ایسی تدبیر اختیار کرین کہ بتدریج ان خرابیون کا ازالہ ہوجائے جو انکے سامنے رونما تھین، وقت گزر گیا انگریزون کے بڑے بڑے مقبوضات محفوظ تھے، انھین کسی خارجی دشمن سے خوف نہ تھا اور وہ اپنے اندر ایک زبردست قوت کا احساس پانے لگے، کہ وہ ہر اس خطرہ سے سامنا کر سکتے ہین جس سے انھین سرزمین ہندوستان مین دوچار ہونا پڑے، انھون نے مضبوط اور جوانمردانہ قدم اوٹھایا، اب انھین ایک حکومت قایم کرنیکے خیال الگ رہنے کی ضرورت نہ تھی، ابتدائے صدی مین جو ایک خطرناک خیال معلوم ہوتا تھا اب ہملوگونکی پوزیشن کا ایک قطعی سانحہ کہا جا سکتا تھا لارڈ ولسلی کے زمانہ مین "بازی عظیم" نامکمل طور پر انجام پائی تھی اور دس سال کے بعد لارڈ ہیسٹنگس نے دیکھا کہ سمجھوتہ سے کوئی مفید نتائج مرتب نہوئے اور انھون نے ارادہ کر لیا کہ ہندوستان کی تمام سیاسی قوتون پر حکومت برطانیہ کا اقتدار قایم کر دین، وطن اور غیر ممالک دونو جگہ زمانہ بدل چکا تھا اور اسکے ساتھ ہمارے احساسات مین تغیر ہو چکا تھا، یورپ مین ہماری کامیابیون نے ہملوگون کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ ہملوگ ایک بڑی طاقتور قوم ہین، اور باوجودیکہ "لیڈن ہال" اسٹریٹ کے رہنما، مشرق مین ہماری تمام فوجی اور سیاسی توسیع کے خلاف صف بستہ تھے، لیکن یہ خیال تھا کہ اگر ہمین کامیابی ہوئی تو انگریزی قوم ہماری جوانمردانہ حکمت عملیہ کی داد دیگی، اس زمانہ سے انگلستان کے ہاتھ مین ہند کے شاہزادونکی قسمت کے فیصلہ کرنیکی باگ ڈور آگئی اب ہملوگون کو کوئی دریغ نہ تھا کہ ایک سب سے زبردست طاقت کی طرح اپنا طرز عمل اختیار کرین، ہماری تجاویز کا ایک اہم جزئیہ تھا کہ ہم سلطنت دہلی کے فسانہ کو مٹائین، اب مشرق مین لفظ "حکومت" کا الحاق صرف برطانیہ کے ساتھ ہو سکتا تھا اور "تسخیر شہنشاہیت" کے قایم رہنیکی ضرورت نہ تھی جسے ہملوگون نے اپنی سیاسی حکمت عملیون کے لئے پہلے ضروری خیال کیا تھا، یہ قابل بیان ہے کہ کس طرح تین سال کے درمیان مین آفتاب شہنشاہیت کی چمک مین ماند پڑتی گئی، کسطرح ایک گورنر جنرل اور اسکے بعد دوسرا مغلون کے متکبرانہ دعاوی کو مسترد کرتا گیا، اور خاندان

تیموریہ کے اُن اعزازات کو جنھوں نے عرصہ بعید تک اسکی شان و شکوہ قایم رکھا تھا، مٹاتا گیا، سنہ ۱۸۳۵ء مین ہندوستان کے سکہ مروجہ مین یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ اسپر مغل بادشاہ کا نام و علامت کندہ نہین ہوتی تھی بلکہ اسکی جگہ "سکہ کمپنی" نے لی، یہ تمام صورتین ارباب محل کے پیش نظر تھین لیکن وہ لوگ انگریزون کے روزافزون اقتدار کے حاجتمند تھے، عظیم الشان محل جو بذات خود ایک بڑا شہر تھا، بہتیری قسم کی مکروہات کا مخزن تھا، اور ایک مسیحی حکومت کو نسلاً بعد نسلٍ آزاد مرد اور بدسیرت عورتون سے تکلیف پہونچ رہی تھی، جو خود اپنے لئے بھی لعنت بنے ہوتے تھے اور دوسرون کیلئے بھی محکومانہ سرکاری الفاظ مین کہا جاتا تھا کہ شاہی خاندان کے افراد قانون کے قیود سے آزاد ہین، وہ کاہلی اور بد اطواری مین غرق رہتے، اور انھین عام راستے سے کوئی التفات نہ تھا، حقانیت کو بغیر چھپائے ہوئے کہا جاسکتا ہے، کہ محل کے مقامات مین اُن تمام جرایم کا ارتکاب ہوتا تھا جنکا رواج مشرق مین تھا، اور صرف خدا تعالی ہی اس ہولناک فہرست آزادی کا محاسبہ کرسکتا تھا، ۲۸ر ستمبر سنہ ۱۸۳۷ء کی شام کو ۸۲ سال کی عمر مین اکبر شاہ نے وفات پائی، چند سال قبل اسنے اپنے ایک عزیز لڑکے کے لئے جائز شاہزادہ کی جانشینی کے خلاف خفیہ کارروائی کی تھی، اور اب شاہزادہ ابوظفر اس دور کی سرکاری اصطلاح مین "ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی[1]" کے لقب سے سریرآرائے حکومت ہوا، وہ اسوقت عمر کا زیادہ حصہ گزار چکا تھا لیکن چونکہ ایک عرصہ سے صاحب حکومت خاندان کا رکن تھا، اسکی زندگی کی ساٹھ سال کی گزری ہوئی مدت نے اسپر برا اثر نہین ڈالا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک خموش، کاہل انسان ہے، جسے صرف شاعری کا شغف ہے، اور اسے فطری طور پر سیاسی خفیہ کارروائیوں سے کوئی علاقہ نہین، تاہم شہنشاہ کا خطاب ملتے ہی، اس نے شاہی وظیفہ میں جو اکبر شاہ کو دیا جاتا تھا اضافہ کے لئے اصرار کرنا شروع کیا، سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل پبلک کے روپیہ کی اتنی بربادی کرنی نہین چاہتے تھے، لیکن باوجودیکہ گورنر جنرل کو پورا یقین تھا کہ یہ روپیہ کی تضیع ہے، لیکن اس نے وعدہ کرلیا مگر اسکے لئے شرط پیش کی کہ بادشاہ کو ایک عہدنامہ کے ذریعہ یہ اقرار کرنا پڑیگا کہ وہ آیندہ برطانوی حکومت پر کسی قسم کے دعاوی نہین کرینگے، لیکن بہادر شاہ نے وہی کیا جو انکے والد نے قبل کیا تھا، انھون نے مجوزہ شرط کو ماننے سے انکار کردیا، اور ہنوز یہ خیال کرتے رہے کہ وہ انگلستان مین ایک نائب بھیجکر جو کچھ چاہتے ہین بلکہ کسی قید و شرط کے حاصل کرلینگے اکبر شاہ نے مشہور برہمن رام موہن رائے کو اپنا نائب مقرر کیا اور اپنے اسی قدیمی نشہ حکومت مین انہین "راجہ" کا خطاب دیدیا لیکن انگریزی ارباب حل و عقد نے سرکاری طور پر "راجہ" کے خطاب کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، ہرچند وہ اس شخص کی سیرت کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ وہ شخص جہلا کو ایک معاشرتی اور مذہبی مصلح کی طرح، روشن خیال بنانیکی کوشش

---

[1] ۲۶ر شعبان سنہ ۱۱۸۳ھ مین قریب غروب آفتاب بہادر شاہ کی ولادت ہوئی تھی، دار السلطنت دہلی مین بہ عمر تریسٹھ سال دس ماہ شب جمعہ الجمادی الثانی کو سریرآرائے حکومت ہوئے، مولوی امام بخش صہبائی نے تاریخ کہی۔

ازنشہ دولت بہادر شاہی ۔ بنشست بہ تخت دولت افزون
شد بر زمی طرف باغ دہلی ۔ نزہت بفزود ارتفاع دہلی
تاریخ جلوس آن شہ والا قدر ۔ آمد بہ لب خرد چراغ دہلی
(جام جم)

کر رہا تھا، مغل بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے راجہ رام موہن رائے نے کوئی مفید کام انجام نہیں دیا اور بہادر شاہ نے دیکھا کہ معاملات اسی حالت میں تھے جبکہ متوفی بادشاہ کی طرف سے راموہن رائے نے انگلستان کا سفر اختیار کیا تھا، لیکن ابھی تک اسے یقین تھا کہ اگر کسی انگریز نائب کے ذریعہ انگلستان میں پیام رسانی کیجائے تو مفید ہو سکتی ہے، اسلئے جب انھوں نے سنا کہ ایک فصیح و بلیغ خطیب جسنے رنگین اقوام کے حقوق کی نیابت کرکے مغربی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کرلی تھی، ہندوستان میں آیا ہے، تو انھوں نے اسے دہلی میں مدعو کیا، انکی خواہش ہوئی کہ اسے اس خدمت پر مامور کریں انھیں اپنے بہت سے خیالی مصائب کی فریاد کرنی تھی لارڈ اڈنبرو نے نذرانہ پیش کرنیکا رواج ختم کر دیا تھا، یہانتک کہ ریذیڈنٹ کیلئے بھی اس قسم کا کوئی ہدیہ پیش کرنا ممنوع تھا، نذرانہ پہلے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف پیش کرتا تھا، ۱۸۳۷ء بہادر شاہ کی تخت نشینی تک موخر الذکر عہدہ دار یہ عمل کرتا رہا ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کے موسم سرما میں لارڈ اڈنبرو کے ناظموں نے بادشاہ کو نذرانہ پیش کیا گورنر جنرل کو اسکی خبر نہ تھی، جب اسے خبر ہوئی تو وہ نہایت متعجب ہوا، اور پھر اپنے ناظموں پر خفگی کی، اور ہمیشہ کیلئے نذرانہ پیش کرنیکی رسم کو اوٹھا دیا، اس طور سے خاندان تیموریہ کی آخری شاہانہ شان بھی انگلستانی حکومت کے زیر اثر جاتی رہی ہرچند اسکے معاوضہ میں روپیہ دیا جاتا تھا، لیکن بادشاہ کے دماغ کو یہ تغیر بھی تکلیف دے رہا تھا، کمپنی نے کسی مزید وظیفہ کے تقرر سے اسوقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شاہی خاندان اُن مفصلہ شرائط کو منظور نہ کرے، حقیقتاً کوئی سبب بھی نہ تھا کہ وظیفہ بڑھایا جائے، ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کافی تھا، اس ماہانہ لاکھ روپیہ کے وظیفہ کے علاوہ بہادر شاہ کو بعض شاہی اراضی کی آمدنی بھی تھی، اور انہیں شہر سے بعض جایداد کا کرایہ بھی آتا تھا[۵]

بہادر شاہ کو برطانوی حکومت سے کوئی گلہ نہ تھا، اور غالباً بادشاہ کامل قناعت نہیں تو ایک مطیعانہ امن کے ساتھ اس حالت میں بسر کرتے، لیکن حرم کی خفیہ ریشہ دوانیوں نے جنکا ہر مشرقی بادشاہ شکار رہوا کرتا ہے، بہادر شاہ کو بھی زیر اثر کر لیا تھا انہوں نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کرلی تھی، اور پیری میں انھیں اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا، وہ عورت خیر و شر کے متعلق بادشاہ پر اثر رکھتی تھی، جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے، نواب زینت محل کے زیر اثر بادشاہ نے کوشش شروع کی، کہ حقیقی جانشین کا حق مسترد کرکے اس بچے شہزادہ کو اپنا جانشین مقرر کر دے، جیسا کہ اکبر شاہ نے خود بہادر شاہ کے خلاف کیا تھا اسی طرح انہنے بھی یہ نامنصفانہ طرز عمل اختیار کیا تاکہ اسکی محبوبہ کو تسلی ہو، لیکن اسمیں بادشاہ کو جلدی کرنے میں ناکامی کا خطرہ تھا اسنے بہتر یہی سمجھا کہ جب تک بچہ جوان بخت، جوان نہ ہولے موقعہ کا انتظار کیا جائے۔

جانشینی کا قصہ ۱۸۴۹ء میں شہزادہ دارا بخت وارث تخت نے وفات پائی، اسوقت بہادر شاہ کے ستر سے زیادہ بیٹے تھے

---

[۵] "دلیم کے" نے اس منظر کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا ہے، جبکہ دو انگریز افسر بہادر شاہ کو نذرانہ دینے گئے ہیں، ان میں ایک انگریز کا بیان ہے، کہ اسنے بادشاہ کا ردعمل خاندان تیموریہ کے اس آخری نشیمن جلال میں جسوقت قدم رکھا، تو اس پر ایک خاص قسم کا رعب در ہیبت طاری تھا، یہ آخری نذرانہ تھا جو مغل خاندان کے اس آخری فرمانروا کو برطانیہ کی طرف سے دیا گیا، (تاریخ جنگ سپاہیان جلد ۲) ۵۲ مسٹر سنڈر کی شہادت بابت مقدمہ بہادر شاہ

جانشینی کے سوال نے گورنر جنرل کو بہت تکلیف پہونچائی، لارڈ ڈلہا وزی ایسا نہ تھا کہ مغل بادشاہ کی اس تمسخرانہ بادشاہت کو تسلیم کرتا، اسکے سامنے دوسرے لوگ تھے جو قدیم شاہی خاندان کی روایات پر زیادہ متاثر تھے اور وہ غم و ملال کیسا تھ اس حالت کی برقراری چاہتے تھے، جسکے خلاف عقل و حقانیت بغاوت کر رہی تھی، " بہادر شاہ کی وفات کے بعد" شاہ دہلی کے خطابی شکوہ کے متعلق "ایسٹ انڈیا کمپنی" مین مباحث ہوئے، اگست ۱۸۴۷ء مین "مجلس رہنمایان" نے یہ خیال ظاہر کیا، گورنر جنرل نے ایجنٹ کو ہدایات بھیجے ہین کہ شاہ دہلی کی وفات کے بعد اسکے جانشین کے اس خطاب کے اختیار کرنے پر کوئی ایسا قدم نہ بڑھایا جائے، جو اس خطاب کے تسلیم کرنے پر مشتمل ہو، اگر ان ہدایات مین خطاب کے مسترد کرنے کا خیال ظاہر کیا جا ویگا تو ہملوگ اسے منظور نہین کرینگے، جب تک ہملوگون کو تمھاری طرف سے بیشتر معلومات نہ موصول ہون اور جب تک۔ ہملوگونکو اس خلاصہ سفارشات پر جو پیش کیا جا دیگا غور و فکر کرنے کا وقت نہ ملے، اس تجویز سے لیڈن ہال چیمبر مین مختلف جماعتین ہو گئین اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عملی قدم بڑھانے مین دیر ہوئی، ڈلہا وزی نے دیکھا کہ مسئلہ اسوقت تک کیلیے لانحل رہا جب تک ہندوستان سے آئندہ مشورے نہ ارسال کئے جائین، دارابخت کی وفات نے مسئلہ کے طے پانے کا موقعہ دیا جس سے ڈلہا وزی جیسے مزاج کا آدمی چوک نہین سکتا تھا، دوسرا جانشین اسلامی قانون کے مطابق شاہزادہ فخر الدین ہوتا تھا جسکی عمر اسوقت تیس سال کی تھی، اور وہ یورو پین سوسائٹی کا شایق اور برطانوی حکومت کا روادار تھا، اسکے ذریعہ لارڈ ڈلہا وزی تغیرات پیدا کرنا چاہتا تھا

ڈلہاوزی کی تدابیر

برطانوی حکومت سہولت کے ساتھ وقت کا انتظار کرتی تھی دارابخت وہ اخیر شہزادہ تھا جو مغلیہ خاندان کی حکمرانی کے زمانہ مین پیدا ہوا تھا اسے خیال تھا کہ دہلی کی بادشاہت کا مالک ہونگا، اسوقت ان امیدون اور آرزؤن کے مٹانے مین بڑی دقت ہوتی، فخر الدین ایک وظیفہ خوار پیدا ہوا تھا اسے اسوقت کی یاد نہ تھی جبکہ دہلی کا بادشاہ تخت پر بیٹھتا، اور وہ اسوقت تک ہندوستان مین سب سے زبردست اقتدار رکھتا تھا برطانوی حکومت کے اغراض اور مصالح ملکی کے خلاف یون تو بہت سی باتین قابل اصلاح تھین، لیکن دو مسائل بہت اہمیت رکھتے تھے، خاندان مغلیہ مین لقب "شاہ" کا استقلال، اور شاہی محل پر انکا قبضہ۔ لارڈ ڈلہاوزی ان مسائل کی اہمیت سے ناواقف نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد "شاہ" کا خطاب اس خاندان مین باقی نہ رہے، اور شاہی محل پر انگریزون کا تصرف ہو جائے۔

لارڈ ڈلہاوزی نے اپنے دور حکومت ہی مین "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" کو لکھا کہ اب ضرورت ہے کہ حکومت کی طرف سے ایسے احکام جاری ہون، جنکے ماتحت موجودہ بادشاہ کے بعد اسکے جانشین کو شاہ کا لقب اختیار کرنیکا حق نہ رہے دوسرا حکم انکے نقل مکان کے متعلق ہونا چاہئے، ڈلہاوزی کی تجویز تھی کہ شاہی خاندان اب "قطب" مین جا رہے، اور شاہی محل پر انگریزون کا قبضہ ہو، اگر بادشاہ ان تجاویز کو نہ مانین تو وظیفہ بند کر دیا جائے، ان تجاویز پر دلچسپ مباحث ہوئے بورڈ نے ڈلہاوزی کے نظریات کی تائید کی، لیکن "مجلس رہنمایان" نے اختلاف کیا اور بتایا کہ یہ تجاویز صرف گورنر جنرل نے ارسال کی ہین، مجلس شوری کی رائین اس پر ثبت نہین، بورڈ نے جواب دیا کہ اسکی ضرورت نہین تھی، بورڈ نے دکھلایا کہ گورنر جنرل

لکھتا ہے کہ ہر چند خاندان تیموریہ سے کوئی خدشہ نہین لیکن جب مسلمان باشندے جوش مین آکر برطانوی اقتدار کو صدمہ پہونچانا چاہین تو انکے لئے اسباب موجود ہین، ایک بادشاہ ہے ایک مستحکم قلعہ ہے، اس ردوکد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بورڈ نے آخری فیصلہ یہ کیا کہ قلعہ سے شاہی خاندان کا اخراج مستحسن نہین، لارڈ ڈلہاؤزی کو یہ خط ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۰ء مین موصول ہوا، خط پانے کے بعد اسنے لکھا کہ ہر چند میرا سیاسی عقیدہ ان مرسلہ نظریات کے متعلق پہلے بھی وہی تھا اور اب بھی ہے، لیکن جب انگلستان کے ارباب حل وعقد نے، جن کے خیالات کو ہندوستانی سیاسیات کے متعلق بہت اہمیت ہے، اپنی تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے، تو یہ تجویز ابھی عمل مین نہین لائی جاویگی

محل کی ریشہ دوانیان

بادشاہ نے شاہزادہ فخر الدین کی جانشینی کے متعلق احتجاج کیا، اپنی بیوی زینت محل کے زیر اثر انھون نے اسکے لڑکے کے لئے جو اسوقت گیارہ سال کا ایک بچہ تھا جانشینی کی رائے ظاہر کی، بادشاہ نے جو اسباب عذر پیش کئے تھے، انمین ایک نہایت دلچسپ عذر یہ تھا کہ شاہزادہ فخر الدین مختون تھا، اسلئے خاندان تیموریہ کی روایت کے مطابق کہ کوئی شخص جسکا کوئی عضو کٹا ہو تخت نشین نہین ہوسکتا، فخر الدین سلطنت کا حقدار نہین، ہمایون کے وقت تک سلاطین مغلیہ مختون تھے، لیکن یہ رسم بعد مین منقطع ہوگئی، بعض جسمانی علت کے اعتبار سے فخر الدین کیساتھ یہ استثنا تھا، اور زینت محل کو ایک بہانہ ملگیا، جانشینی کے سوال کے متعلق انگریزی ماہرین سیاست کا یہ متفقہ فیصلہ ہوگیا کہ بادشاہ کی حیات تک تمام امور غیر متغیر رہین، شاہزادہ فخر الدین نائب بادشاہ متصور ہو، لیکن اسکے حریف مقابل سے اگر یہ فایدہ حاصل ہو کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ کر قطب مین جا رہے، تو موقعہ ہاتھ سے نہ دیا جائے اگرچہ وظیفہ مین اضافہ ہی کیون نہ کرنا پڑے۔

برطانوی حکومت اور فخر الدین سے وہ معاہدہ

سرکاری ہدایات کے مطابق دہلی کے ایجنٹ سر ٹامس مٹکاف نے شہزادہ فخر الدین سے خفیہ ملاقات کی، اور انکے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی کہ اگر وہ ایک عہد نامہ کے ذریعہ اس امر پر راضی ہوجائے کہ بادشاہ کا جانشین ہونیکے بعد شاہی محل سے دست بردار ہوکر "قطب" مین اپنا مقام سکونت منتقل کردیگا تو انگریز جانشینی کے مسئلہ مین اسکی طرفداری کرینگے، شہزادہ نے یہ تجویز منظور کرلی، ایک عہد نامہ مرتب ہوا، شہزادہ نے اسپر دستخط کیا لوگونکی شہادتین ثبت ہوئین، جب یہ خبر قلعہ مین پہونچی تو لوگ بہت متاثر ہوئے، اور خصوصیت کے ساتھ ملکہ زینت محل کو زیادہ رنج ہوا

فخر الدین کی ناگہانی وفات

۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء مین فخر الدین نے مرض استفراغ سے اچانک انتقال کیا، قرائن بتلاتے مین انہین زہر دیا گیا، شاہی حکیم احسان اللہ کو بلایا گیا لیکن وہ نہ آسکے یا۔ انہون نے آنے مین حیلہ حوالہ کیا، نتائج سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ رات ملکہ زینت محل کے کمرون مین کس طرح بسر ہوئی ہوگی، یقیناً یہ رات ریشہ دوانی اور عمل سازی کی رات ہوگی، دوسرے دن سر ٹامس مٹکاف ملنے آیا تو بادشاہ نے ایک رقعہ دیا، جسمین شہزادہ جوان بخت کی جانشینی کے متعلق حکومت برطانیہ سے استرضا کیا گیا تھا، اسمین بادشاہ کے دوسرے لڑکونکے دستخط بھی مندرج تھے اسکا خلاصہ یہ تھا کہ زینت محل

کا لڑکا جوان بخت، عقل، خوبی علم اور عادات وخصایل کے اعتبار سے بادشاہ کا جانشین بننے کا مستحق ہے" اسمین شاہی خاندان کے آٹھ شاہزادونکی مہر تھی، لیکن دوسرے دن مرزا قریش بڑے لڑکے نے حکومت برطانیہ مین ایک یادداشت (موریل) بھیجی کہ بادشاہ نے شاہزادونکو لالچ دلائی تھی کہ اگر وہ دستخط کرینگے تو انکا وظیفہ بڑھا دیا جاویگا، ورنہ بند کر دیا جاویگا، بادشاہ نے مرزا قریش کو بھی کچھ دیکر راضی کرلینا چاہا، مرزا نے ایک مطیع اولاد کی حیثیت سے بادشاہ کے ان تمام خواہشات کو قبول کرنا چاہا اگر وہ اسے جانشین مقرر کرین لیکن جب اس نے دیکھا کہ زینت محل کے اغوا سے بادشاہ تلے ہوئے ہین کہ اسے جانشینی سے محروم کر دین تو اسنے حکومت برطانیہ مین ایک یادداشت بھیجی، اور دکھلایا کہ مین سب سے بڑا ہون، مینے حج کیا ہے، حافظ قرآن ہون، اور ملاقات کے وقت میری بقیہ استعداد معلوم ہو سکتی ہے

لارڈ کیننگ کے نظریات سیاسی لارڈ ڈلہاوزی نے جو سیاسی طرز عمل اختیار کیا تھا، نہایت مدبرانہ تھا ہر چند انکا یہ عقیدہ غلط تھا کہ دہلی کے مسلمان خاندان تیموریہ سے کوئی قلبی علاقہ نہین رکھتے اور انکا یہ بھی خیال غلط تھا کہ اگر شاہی خاندان کو شاہی محل سے قطب مین منتقل کر دیا جائے تو مسلمان غیر متاثر رہینگے لیکن اثر آفرین ہے کہ انھون نے باوجود اقتدار، اپنے نظریات سیاسی کو، جب ان سے بالادست ارباب حل وعقد نے اختلاف کیا تو جامۂ عمل نہین پہنایا، لارڈ کیننگ نے خیال کیا کہ قلعہ کا خاندان تیموریہ کے قبضہ مین رہنا نہایت خطرناک ہے، اسے برطانیہ کے قبضہ مین رہنا چاہیے جسمین سپاہ اور آلات حرب کا ذخیرہ جمع رہے، چونکہ لارڈ کیننگ کو ہندوستان مین آئے ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے اور وہ بھی کلکتہ مین، لہذا وہ مسلمانان دہلی کے احساسات سے ناواقف تھے، بنا برین انھون نے خیال ظاہر کیا کہ بتدریج دہلی کے "تمسخر بادشاہت" سے تمام اختیارات سلب کرلئے گئے، تو "شاہ" کا لقب بھی چھین کر کیون نہ خاندان تیموریہ کی شاہی عظمت کا خاتمہ کر دیا جائے، انہے مرزا قریش کی جانشینی کے لئے مجلس ارباب حل وعقد سے سفارش کی، کاونسل نے گورنر جنرل کے مراسلہ پر غور وفکر کرنیکے بعد مفصلہ ذیل ہدایات ارسال کین،

(۱) دہلی ایجنٹ کے ذریعہ بادشاہ کو یہ جواب دیا جائے کہ گورنر جنرل مرزا جوان بخت کی جانشینی قبول نہین کر سکتا

(۲) مرزا قریش کو بھی یہ امید نہین رکھنی چاہیے کہ انکی جانشینی ان شرائط پر منظور کیجاویگی جن پر مرزا فخرالدین سے معاہدہ ہوا تھا اور یہ کہ مسئلہ جانشینی کے متعلق بادشاہ کی زندگی تک حکومت کے ساتھ کوئی نامہ وپیام نہ ہوگا

(۳) بادشاہ کی وفات کے بعد مرزا قریش جانشین ہونگے، اور انکے ساتھ وہی شرائط ملحوظ رہینگی، جو فخرالدین کے ساتھ تھین لیکن انہین بادشاہ کے لقب کے بجائے "شاہزادہ" کا لقب اختیار کرنا ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی تحریری اقرار یا معاہدہ کی صورت مین نہین پیش کیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ حکومت کا یہ ارادہ راسخ ہے، کہ ایسا ہی ہو

(۴) محل کے ان افراد کی ایک فہرست مانگی جائے، جنھین وظیفہ دیا جاتا ہے، اور یہ کہ وظیفہ کہانتک محدود رہیگا، بیٹے اور پوتے تک؟ لیکن کسی بادشاہ کے دور کے رشتہ دار اسکے مستحق نہ ہونگے،

(۵) مقررہ وظیفہ مین سے پندرہ ہزار سالانہ شاہی خاندان کے وارث کو ملیگا

زینت محل کی خفیہ کارروائیان

بادشاہ اپنی زندگی کی بقیہ گھڑیان اطمینان اور امن سے گزار دیتا، لیکن ملکہ زینت محل کی ریشہ دوانی نے اسے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اسنے کبھی یہ امید منقطع نہین کی کہ میرا لڑکا دہلی کا بادشاہ ہوگا ایک پردہ حایل تھا وہ موت سے دور ہوگیا دوسرا بھی اسی طرح دور ہوجاویگا اگر حکومت برطانیہ نے جوان بخت کی جانشینی کو تسلیم نہین کیا تو دوسری زبردست قوتون سے استمداد کیا جائے، بادشاہ کو اسمین اغماض نہ تھا کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ دے اور نہ اسے اپنے جانشین کے فواید سے چندان دلچسپی تھی، جیسا کہ بادشاہ کے مقدمہ مین حکیم احسان اللہ کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زینت محل کی ریشہ دوانیون نے اسے روکا، جب فخر الدین نے شاہی محل کو چھوڑ دینے کی شرط پر دستخط کر دی تو باوجود اسکے کہ وہ اس '' نائب بادشاہ '' سے نفرت رکھتی تھی لیکن اسنے شور و شغب برپا کیا، وہ جانتی تھی کہ فخر الدین کوئی غیر فانی ہستی تو ہے نہین ؟ اس عرصہ مین وہ شاہزادہ جسکے ساتھ انگریزون کے خلاف نفرت کا جذبہ پرورش کر رہا تھا، وہ انگریز رعایا کے سامنے بھی یہ کہنے سے باز نہین آتا تھا کہ مین تھوڑے عرصہ مین انگریز قوم کو اپنے قدمون کے سامنے جھکا ہوا دیکھونگا، مسز فلیمنگ ایک انگریز سرجنٹ کی بیوی قلعہ مین گئی تھی، اسکی لڑکی مسز ایسکلی بھی اسکے ساتھ تھی جوان بخت نے اس لڑکی کے سامنے بھی انگریزون کے مقابلہ مین اپنی فتح و نصرت کا نغمہ گایا لڑکی نے مان سے شکایت کی، کہ یہ نوعمر بدمعاش اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے اسپر انگریز خاتون نے کہا کہ اگر تمھارے خیالات ایسے ہین تو سب سے پہلے تمھاری گردن ماری جاویگی، شاہزادہ جوان بخت اس قسم کے خیالات اکثر عورتوں کی محفلون مین ظاہر کیا کرتا تھا، اور جب سرجنٹ کی بیوی نے خشمگین لہجہ مین اسے یہ جواب دیا تو وہ کہنے لگا کہ اہل ایران آرہے ہین مان بیٹی کو ہم لوگ قلعہ مین پناہ دینگے، اور اسی طرح اکثر باتین بنا دیا کرتا محلسرا مین اسے اپنی مان سے یہی تعلیم مل رہی تھی، اور وہ انھین احساسات کے ساتھ نشو و نما پا رہا تھا

ہرچند دہلی یا اسکے باہر مسلمانون کو اس سے دلچسپی نہین تھی کہ کون شاہزادہ جانشین ہوگا لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اہل محل کی پیہم کوششین جاری تھین کہ مسلمانون مین یہ خیال پیدا کرین کہ عالم غیب سے کوئی ایسا آدمی پیدا ہونے والا ہے، جو خاندان دہلی کی زوال پذیر حکومت کو پھر برسر عروج لاویگا، اور ہندوستان کے مسلمانون کو پھر وہ دولت اور عزت حاصل ہوگی جس سے انگریزون کے غصب کے باعث وہ محروم ہوگئے ہین

احساسات دہلی

دہلی مین اخبارات نے پیشین گوئی کرنی شروع کی کہ ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہونے والا ہے جس سے انگریزی سیاسیات کو نقصان پہونچیگا، اہل فارس ہندوستان پر حملہ آور ہونگے، ایک مرتبہ شور ہوا کہ ایرانی اٹک تک آچلے ہین دوسری خبر یہ پھیلی کہ ایرانی فوج درہ بولن کو طے کرتی ہوتی آرہی ہے، اور اس حملہ کی توجیہ یہ کی گئی کہ شاہ فارس پانچ پشت سے فوج اور سامان حرب جمع کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کو فتح کرے، زار روس شاہ کا ساتھ دیگا، اور تقریباً پچاس ہزار روسی فوج مع سامان حرب اہل فارس کی مدد کے لئے پہونچ گئی ہے، اور اگر یہ فوج کافی نہین ثابت ہوئی تو روس سے مزید کمک

آویگی، اس صورت حال مین، ترکی، اور فرانس کا طرز عمل ظاہر ہے، وہ بھی شاہ کا ساتھ دینگے، بعض اخبارات کا یہ نظریہ تھا کہ دوست محمد خان امیر کابل ہرچند انگریزون کا وظیفہ خوار اور ظاہری دوست ہے، لیکن وہ بھی دو نو طریق عمل اختیار کریگا کفار سے معرکہ آرائی اور فارس کے ساتھ قسمت آزمائی، بازار، گلی کوچہ دوکان اور شاہی محل تمام مقامات مین ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی، شہر، ہیبت و تعجب کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا اور شاہ نعمت اللہؒ کی اس پیشینگوئی نے اور بھی اس سنسنی خیز خبر کو مستحکم کر دیا تھا کہ ایک سو برس کے بعد انگریزونکو زوال ہوگا اور ایک مقامی شاہی خاندان برسر اقتدار ہوجائیگا۔

بادشاہ اور شاہ فارس کے سیاسی تعلقات کے متعلق ایک مقامی نامہ نگار نے مارچ ۱۸۵۷ء مین شمالی مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر کو اطلاع دی کہ شاہی محل اور خصوصیت کے ساتھ بادشاہ کے خاص کمرون مین، شبانہ روز اہل فارس کی آمد کا چرچہ رہتا ہے حسن عسکری نامی ایک شخص تھا، اسکے خاندان مین پیری مریدی کا سلسلہ تھا، شاہی محل کے دہلی دروازہ کے نزدیک اسکا مکان تھا ایرانی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلق کرنے کے لئے یہ شخص ہمیشہ مستعد رہا کرتا تھا اسنے بادشاہ کو متاثر کر لیا کہ اسے کشف کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ایرانی حکومت، دہلی بلکہ تمام ہندوستان مین وسیع ہوجائیگی اور دہلی کی بادشاہت کو ازسر نو عروج ہوگا کیونکہ شاہ فارس پھر دہلی حکومت کو تاج و تخت عطا کر دیگا، تمام اہل محل خصوصیت کے ساتھ بادشاہ بہت مسرور ہین یہانتک کہ اسکے لئے نماز پڑھی جاتی ہے، حسن عسکری غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل روزانہ "عمل" (ریاضت) کیا کرتا ہے، تاکہ اہل فارس جلد آوین اور انگریزونکو نکالین" لفٹنٹ گورنر جنرل کالون نے جب یہ خط پایا تو مضحکہ اور حقارت سے دیکھکر بے توجہی کیساتھ اسے ڈالدیا اسنے واقعہ کی اہمیت پر نظر نہین ڈالی، ہرچند شاہ فارس کیساتھ شاہ دہلی کا سیاسی تعلق ہو یا نہو (شمالی ہند کے مسلمانون کا خیال تھا کہ یہ خبر صحیح ہے) لیکن اس خبر سے عام باشندون مین جو سنسنی اور احساس پیدا ہو رہا تھا، وہ نہایت اہم تھا انگریز مدبرین کا یہ نقص تھا کہ وہ اپنے اندر ان لوگون کے وجدان کا صحیح اندازہ لگانیکی اہلیت نہین رکھتے تھے، جو انکے ارد گرد رہتے تھے بادشاہ اور شاہ فارس کے نامہ و پیام کا قصہ محض کہانی نہین تھا، ہرچند اسکے متعلق صحیح واقعات نہین ملتے کہ کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکے لیکن بہادر شاہ کے مقدمہ مین جو گواہ گزرے انمین سب سے معتبر گواہ احسان اللہ شاہی حکیم کی روایت یہ ہے کہ بادشاہ نے خواہ اپنے ذاتی خیال کی بنا پر یا اپنے بعض رشتہ دار ونکی تحریک سے جو اودھ مین سکونت رکھتے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنا چاہا، مرزا حیدر جو بادشاہ کا بھتیجہ، اور اودھ مین سکونت رکھتا تھا دہلی مین آیا اور جب واپس گیا تو یہ خبر شایع کی کہ بہت تغیر ہو گیا ہے، مغل بھی شیعہ مذہب اختیار کرنے چاہتے ہین ممکن ہے، بادشاہ کو ترغیب دیگئی ہو کہ انکے تبدیل مذہب کی خبر سے بادشاہ اودھ اور شاہ فارس اور بھی برضا و رغبت مدد کرینگے چونکہ بادشاہ جانشینی کے متعلق اپنی بیوی کی خواہش پوری نہین کر سکتا تھا لہذا ممکن ہے اسنے یہ پہلو اختیار کیا ہو کہا جاتا ہے کہ اسنے شاہ فارس کو اپنے معتبر کار پردازون کے ذریعہ خطوط لکھے، شبہ ہے کہ اسنے زار روس، کو بھی خطوط لکھے لیکن یہ پہونچے نہین،

اسی طرح ایک دن دہلی جامع مسجد کے دروازہ پر ایک اشتہار چسپان تھا جسکا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ فارس نے مسلمانان ہندکو

خطاب کیا ہے کہ ایک ایرانی فوج آرہی ہے، اور ہندوستان کے مسلمانون کا فرض ہے کہ اس فوج سے بازو ملاکر کفار کے مقابلہ مین جنگ کرین، معلن کا نام محمد صادق تھا لیکن پتہ نہین لگا کہ یہ محمد صادق ہے کون شخص عوام پر اسکا کوئی اثر نہوا، کیونکہ چسپان ہونیکے چند ساعت کے بعد پھاڑ دیا گیا، لیکن مقامی اخبارون نے اس اشتہار کا خلاصہ شایع کردیا، بہادر شاہ نے ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۷ء مین کوئی عملی قدم نہین اوٹھایا، بلکہ انکے نام سے لوگون نے شور و فتنہ بپا کیا جسکا خمیازہ انھین اوٹھانا پڑا، مئی ۱۸۵۷ء مین میرٹھ کے اندر سپاہیون مین بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور دہلی کے ملکی افسرون کو دعوت دیگئی کہ وہ آنیوالی کشمکش مین حصہ لین،

اسکے بعد سیاسیات ہند مین وہ نازک حالتین پیدا ہوگئین جنھون نے مغل خاندان کو "قطب" کی بجائے ہندوستان کے مختلف مقامات مین کالجسد المنتشی بنادیا، اور اب نہ تو شاہی محل کے خالی کرنیکا کوئی سوال باقی رہا اور نہ کسی شاہزادہ سے "شاہ" کے ترک لقب کیلئے عہد نامہ کی ضرورت، خاندان مغل کا یہ بدقسمت فرمانروا ایک ملزم کی حیثیت سے برطانوی عدالت مین پیش ہوا، اور اسے رنگون مین زندگی کی بقیہ تکلیف دہ ساعتین تمام کرنی پڑین، غالب مرحوم اسوقت زندہ تھے، غالباً طلسم ہستی کے اسی دردانگیز منظر کو دیکھکر انھون نے کہا تھا،

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد شمع بجھتی ہے تو اس مین سے دھواں اٹھتا ہے

عبد المالک آروی

ایک غلطی کا ازالہ

دسمبر میں جو نظم "ترانۂ کابل" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے اسکے مصنف ہمارے عزیز دوست اختر شیرانی ہیں، غلطی سے محمود شیرانی لکھا گیا۔

پنجاب میں اردو

جسپر نگار میں ریویو شایع ہوچکا، اس کے ملنے کا پتہ یہ ہے:-

قیمت ۶ جناب اختر شیرانی - ۱۸ فلیمنگ روڈ - لاہور

دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء

شاہانِ مغلیہ صرف اپنی فتوحات نظم ونسق حکومت اور تسخیر ممالک ہی کے لئے مشہور نہین ہین۔ بلکہ دنیائے علم وادب کی جو خدمتین ان شہنشاہانِ ہند نے کین ہین۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہین۔ بابر کا آفتاب شہرت آجتک بام علم وادب پر درخشان ہے۔ اُسکی "توزک" اس کی شاعری اور خوش نویسی شہرۂ آفاق ہے۔ ہمایون بھی ایک بڑا ادیب تھا۔ اور اُسکی ہمشیرہ گلبدن بیگم نے اپنی مشہور عالم کتاب "ہمایون نامہ" لکھ کر صرف اپنی تاریخ دانی ہی کا نہین بلکہ اپنے ذوق ادب کا بھی کافی ثبوت دیا ہے

اکبر جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ مین فارسی شاعری نے جو عروج پایا وہ کسی سے مخفی نہین۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فیضی نظیری۔ عرفی۔ طالب آملی اور کلیم جیسے اساتذۂ فن دربار مغلیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ اور سخن شناس اور علم دوست بادشاہ اور امراء ان شعراء کے حوصلے گران قدر انعامات اور بیش بہا خلعت سے بڑھاتے تھے۔ مگر افسوس کہ یہ درباری سلسلۂ شعر وشاعری اورنگ زیب کے وقت مین منقطع ہوگیا۔ اور چونکہ اورنگ زیب کے جانشینون کو حادثاتِ زمانہ کی بادِ مخالف نے چین نہ لینے دیا لہذا یہ برہم شدہ مجلس پھر سے ترتیب نہ پا سکی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک مین ہرطرف شورش برپا تھی۔ طوائف الملوکی کا زور تھا۔ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ اجزائے پریشان کی طرح منتشر ہوچکا تھا۔ دکن مین مرہٹہ زور پکڑ چکے تھے۔ اور تمام ملک ہند کو اپنی لوٹ مار سے تاخت وتاراج کر رہے تھے۔ بنگال اور مدراس مین انگریز اور فرانسیسی اپنے قدم جما رہے تھے۔ اس پرآشوب زمانہ مین عروسِ ادب عالم جان کنی مین اپنی لازوال ہستی کی آخری سانسین لے رہی تھی۔ اب پھر اُس کو خاندانِ مغلیہ کے آخری بادشاہون نے خضر صفت ہوکر اپنے ہاتھ سے آبِ حیات پلا کر صحت بخشی۔ مگر اب اس نے اپنا فارسی لباس اُتار کر اُردو کا وہ جامۂ بوقلمون زیب تن کیا، جو اپنے محاسن گوناگون کے لئے محمد شاہ۔ شاہ عالم۔ مرزا سلیمان شکوہ۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا رہین منت ہے۔

آخر الذکر بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر اپنی اُردو نوازی مین سب سے بازی لے گئے۔ تخت مغلیہ کا آخری تاجدار آسمانِ شاعری پر ایسا نیر اعظم ہوکر چمکا کہ جس کی ضوفشانی سے تمام ستارے ماند پڑ گئے۔ اس نے شعر وشاعری مین ایک زبردست روح پھونکدی۔ اور ادب اُردو مین ایک اہم انقلاب پیدا کردیا۔ ان کی سخن پروری کی بدولت عوام مین شاعری نے اسقدر زور پکڑا کہ دلی کی گلیون کا ہر طفل دبستان اپنے آپ کو میر سودا مصحفی اور انشا کا ہمسر سمجھنے لگا ظفر کے ذوق شوق کا وہ عالم تھا کہ قلعہ معلی اردو شاعری کا سرچشمہ بن گیا۔ یہان کی ادبی مجلسون اور مشاعرون کی گرماگرمی نے اردو شاعری کو درجہ کمال پر پہونچا دیا۔ ظفر کو اوائل عمر ہی سے شاعری سے ایک خاص لگاؤ تھا

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھین تو شعر سے کچھ زیادہ رغبت نہ تھی مگر بہادر شاہ شعر کے عاشق و شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا دربار شاہی خاصہ مشاعرہ بنا ہوا تھا۔ جہان اسوقت کہنہ مشق شاعر مثلاً حکیم ثناء اللہ خان فراق۔ میر غالب علی خان سید۔ عبدالرحمن خان احسان۔ برہان الدین خان زار۔ حکیم قدرت اللہ قاسم اور ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خان عشق۔ میان شکیبا۔ شاگرد میر تقی میر۔ مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا۔ میر قمرالدین منت اور ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب مشاعرے مین آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع پر مطلع اور مصرعہ پر مصرعہ لگا کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ میر کاظم حسین بیقرار جو دہلی عہد کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتون مین شامل ہوتے تھے

بہادر شاہ ظفر کے تخت پر بیٹھتے ہی اردو ادب نے عموماً اور اردو شاعری نے خصوصاً ایک کروٹ بدلی۔ دلی ایک مرتبہ پھر اردو ادب کا مرکز اور گہوارہ بن گئی۔ اگرچہ اساتذہ متقدمین اور متوسطین مثلاً میر۔ مصحفی۔ انشا۔ نصیر۔ بوجہ غربت اور فلاکت دلی چھوڑ کر تلاش معاش مین لکھنؤ چلے گئے تھے اور ایک حد تک اردو کا مرکز لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا۔ تاہم وہ شاخ جو حاتم۔ آرزو۔ درد۔ میر نے لگائی تھی، بارآور ہوئی۔ اور باوجود حادثات زمانہ اردو شاعری دہلی مین ترقی کرتی رہی۔ مگر عہد بہادر شاہ مین جو حیرت انگیز ترقی اردو نے کی وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ شاہ نصیر۔ ذوق۔ مومن اور غالب اس دور کے عناصر اربعہ شمار کئے جاتے ہین، ان اساتذہ کے متعدد ارشد تلامذہ نے بھی اردو شاعری کو معراج کمال پر پہونچانے مین بہت حصہ لیا۔ یہان عہد ظفر کے مشاہیر شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا مقصود ہے۔

ظفر — قبل اس کے کہ عہد ظفر کے دیگر کاملین فن کا تذکرہ کیا جائے، ہم اس تاجدار اقلیم سخن کے ذکر سے ابتدا کرتے ہیں .... اور چونکہ مضمون ہی ان سے وابستہ ہے اور یہی اپنے دور کی شاعری کی ترقی کا سرچشمہ ہین۔ لہذا ہم مجملاً کچھ ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہین۔

ظفر کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اور کیون نہ ہوتا۔ ہوش سنبھالا تو فضا شاعری سے معمور تھی۔ اور دربار بھی نامی گرامی شعرا سے آراستہ تھا۔ اس پر اُن کی خداداد ذہانت اور طبع رسا اس کا جیسا نتیجہ ہونا چاہئے تھا ہوا۔ گو ظفر خود بھی تمام عمر شاعری مین مستغرق رہے۔ شاعری سے، عہد مہد سے لیکر آغوش لحد تک جدا نہوئے اور ظفر کے مذاق صحیحہ نے شاعری کو بام ترقی کے وہ اعلیٰ مدارج بخشے کہ باید و شاید ظفر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے شاعری کو جادۂ تہذیب سے حتی الامکان تجاوز نہ کرنے دیا۔ ظفر کا خود شاعر ہونا شاعری کے لئے خضر راہ ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے وہ رہ مستقیم سے نہ بھٹکے۔ اور نہ اپنے مقام ارفع سے ردیہ انحطاط ہوئے

۲ — اس کا مفصل تذکرہ تو دوسری جگہ کیا جائیگا۔ یہان صرف ظفر کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔ ان کے کلام مین سب سے زیادہ نمایان خصوصیت ان کا سوز و گداز ہے ذاتی مصائب اور زمانہ کے پر آشوب حالات نے اُن کی شاعری مین درد و غم حسرت و اندوہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جو کسی دوسرے اُردو کے شاعر کے کلام مین بہ استثنائے میر نہین ملیگا۔

علاوہ اس کے ظفر کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ اُن کی ٹھمریان اور گیت شمالی ہند مین مقبولیت عامہ اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہین۔

ظفر ایک بلند پایہ خوشنویس بھی تھے دہلی کی اکثر مشہور مساجد کے لئے قران شریف کی آیات لکھ کر نذر کی تھین

باوجود اس ہمہ گیری کے ظفر کی شہرت کا انحصار ان کی غزلیات پر ہے۔ ظفر کا کلام ان کے حینِ حیات ہی مین مقبول ہو چکا تھا حتی کہ دہلی کے گلی کوچون مین ان کی غزلین گائی جاتی تھیں

چنانچہ حسن نظامی صاحب نے لکھا ہے کہ ولی عہدی کے جھگڑے مین جب بہادر شاہ نے یہ شعر کہا۔

> اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نامِ سلطنت

تو دہلی کے ہر گھر مین اس کا ذکر تھا اور عورتین اس شعر کو پڑھ کر روتی تھین اور بچے گلیون مین مرثیہ کے انداز مین گاتے پھرتے تھے

خصوصیاتِ کلام ظفر سچ پوچھو تو ظفر حقیقی اور فطری شاعر ہین۔ یہ عبرت کا درس دیتے ہین۔ رنج واندوہ غم والم حسرت و یاس کی کیفیات بکثرت موثر طریقہ سے فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہین۔

ظفر کے کلام مین سلاست روانی اور آمد ہے۔ فصاحت۔ معاملہ بندی محاورہ بندی۔ شیرین زبانی ان کے کلام سے نمایان ہے جرأت کا رنگ بہت مرغوب تھا۔ اور یہ ظفر کے کلام سے بخوبی ظاہر ہے۔

ظفر کا یہ مخصوص رنگ نمایان طور سے ان کے کلام مین عیان ہے ان کی غزلین کیفیات الم کی دنیا ہین۔ اخلاقی مضامین کثرت سے ملتے ہین۔ اور صوفیانہ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ ظفر کے خیالات بلند ہین تخیل شاعرانہ ہے تشبیہین اور استعارے عام فہم اور جذبات سچے اور شریفانہ ہین۔ ذوق کی طرح زبان کے چٹخارے اور محاورے بھی ہین۔ لیکن غالب اور مومن کی طرح ان کی غزلون مین فارسی ترکیب اور جدت مضمون کم ہے۔ بڑی تلاش سے شاید چند مثالین مل سکین۔ تاہم اکثر فرسودہ مضمون کو لیکر درد کی چاشنی سے اسقدر انوکھا پن پیدا کر دیا ہے کہ گویا قالب مردہ مین روح حیات پھونکدی ہے

ظفر نے مشکل بحرون۔ سنگلاخ زمینون اور بڑی ردیفون مین بھی طبع آزمائی کی ہے اور نہایت کامیابی سے غزلین کہی ہین۔

بہرحال ظفر کی شاعری جذبات۔ واقعات اور حادثات دنیا کی سچی تصویر ہے۔ اور ظفر اپنی طرز شاعری کا واحد تاجدار اور اپنی دلکش غزلون اور شیرین نغمون کی وجہ سے نہایت بلند مرتبہ پر ہے

کلیات ظفر مین کچھ فارسی غزلین اور فارسی غزلیات پر چند تضمین بھی شامل ہین ظفر کو تاریخ گوئی مین بھی بڑا ملکہ تھا درگاہ قطب الاقطاب کا ایک نیا دروازہ تیار ہوا۔ تو انھون نے یہ تاریخ کہی۔

> این درِ عالی چو شد محکم بنا حسب المراد گفت دل سالِ بنا بابِ ظفر پائندہ باد

طبع حاضر فی البدیہہ اشعار کہنے سے بھی دریغ نہ کرتی تھی کہتے ہین کہ کسی امیر نے ایک شخص پر اسقدر ظلم کیا کہ مظلوم جان بحق تسلیم ہو گیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھون نے فی البدیہہ فرمایا۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش مین یادِ خدا نہ رہی جسے طیش مین خوفِ خدا نہ رہا

تصویر کا تاریک پہلو اسقدر محاسن کے ہوتے ہوئے ظفر کے کلام مین اکثر بندشین سُست ہین۔ تازگیٔ مضمون کی کمی ہے۔ پامال مضامین کی بھرمار ہے۔ جستجو سے اخلاق سے گرے ہوئے اشعار بھی مل سکتے ہین۔ اکثر اشعار مین آورد کا شائبہ ہے۔ ایک ہی مضمون کو بار بار کئی کئی اشعار مین باندھا ہے

ظفر کے اُستاد ابتدا مین شاہ نصیر کو غزلین دکھائین۔ ان کے بعد میر کاظم حسین بیقرار اس خدمت پر مامور ہوئے۔ ان کے بعد ذوق کا سلسلۂ استادی ایک مدت دراز تک قائم رہا۔ ان کے انتقال کے بعد غالب سے مشورۂ سخن کیا۔ تنویر نے انکی استادی کا دعویٰ کیا ہے۔ مگر لالہ سری رام نے تذکرۂ "گلستانِ سخن" کے حوالے سے غلط ثابت کیا ہے۔

تصنیفات شرح گلستانِ شعدی لکھی ہے۔ لیکن دراصل ان کی مہتم بالشان ان کے چار مکمل دیوان ہین۔ جن مین غزلون کے سوائے۔ حمد و نعت۔ سلام و مرثیہ۔ قطعات۔ رباعیات۔ تضمین مخمس۔ مسدس۔ مثلث۔ ٹھمریان۔ گیت سب کچھ ہین۔

غرض ظفر کے چارون دیوان گلہائے رنگا رنگ سے غیرتِ باغِ ارم ہین

ظفر کے کلیات پر اعتراض ظفر کے کلیات کے متعلق حضرت آزاد کی رائے ہے کہ "آدھا دیوان شاہ نصیر کا اور باقی ساڑھے تین دیوان استاد ذوق کے عطا کردہ ہین" سخت تعجب ہے۔ نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر آزاد نے یہ کہا ہے۔ آخر اُنھون نے اس حق سے غالب بیقرار اور خود ساختہ اُستاد تنویر کو کیون محروم کر دیا۔ خیر آزاد کچھ ہی کہین۔ لیکن واقعات اسکے خلاف معلوم ہوتے ہین آزاد نے منجملہ دیگر اسباب کے جو استاد ذوق کے مکمل دیوان مرتب نہونے کے بیان کئے ہین ان مین سے ایک وجہ اُستاد شاہ ہونا بھی ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اُستاد شاہ ہونے کی وجہ سے ذوق کا دیوان جیسا ہونا چاہئے تھا۔ نہوا۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوق ظفر کو اپنا کلام بخش دیتے تھے۔ اس دعوے کے ثبوت کے لئے کہ ظفر کے کل دیوان بلا شرکت غیرے ظفر ہی کے ہین۔ قبل اس کے کہ ہم کوئی دلیل پیش کرین۔ دونون شعراء کے دیوان پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ امر از خود روشن ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ آزاد جوشِ عقیدت مندی مین کہہ گئے ہین۔ ورنہ کہان ذوق کا پرواز تخیل۔ تازگیٔ مضمون طرزِ بیان ترکیب اور محاورون کی بندش۔ اور کہان ظفر کہ جن کے کلیات مین ایک بحرِ غم و الم اور سوز و گداز موج زن ہے۔ جس جس طریقہ سے ظفر نے غم و اندوہ کی تصویرین کھینچی ہین۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ظفر ہی کا حصہ ہے۔ ظفر کی زبان پر تو کوئی حرف لا ہی نہین سکتا۔ لیکن سلاست و صفائی مین بھی وہ یکتا ہے۔ محاورے بھی ظفر نے کثرت سے استعمال کئے ہین اور نہایت کامیابی سے انکو اپنے کلام مین شامل کیا ہے۔ ذوق کے کلام مین بھی کیفیات درد و الم پائی جاتی ہین۔ لیکن ظفر کی طرح یہ ان کی امتیازی شان نہین ہے۔ یہی ایک خصوصیت ظفر کو اپنے طرز کا استاد منوانے کے لئے کافی ہے۔ اب رہا ذوق کا خود کوئی دیوان مرتب ہونا

تو اس کی وجہ ظفر کی استادی نہین ہوسکتی۔ ذوق آخر استاد شاہ تھے اور یہ خدمت ان کے سپرد تھی کہ بادشاہ کی غزلین درست کرین۔ بہت ممکن ہے کہ بوجہ اس خدمت کے وہ عدیم الفرصت رہتے ہون۔ جیسا کہ خود اُنھون نے اپنے ایک شعر مین ظاہر کیا ہے۔

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیوان شکوۂ فرصت کس سے کرین ، باندھے گلے مین ہمنے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہین

اس سے صاف یہی مطلب اخذ ہوتا ہے کہ مجھکو ظفر کے کلام کی اصلاح سے فرصت نہین ہوتی۔ یہ تو کہین نہین کہا کہ مجھ کو بادشاہ کی غزلین لکھ کر دینی پڑتی ہین

یہ ممکن ہے کہ کچھ مصرعے اور چند شعر بھی جیسا کہ استادون کا قاعدہ ہے۔ ذوق کے ہون۔ اکثر اصلاح کے وقت جو مصرعے موزون ہوجاتے ہین شاگردون کو بخش دیا کرتے ہین۔ اسی طرح ذوق نے بھی بروقت اصلاح کبھی کوئی مصرعہ یا کوئی شعر جو وقت پر ہو گیا۔ غزل مین شامل کردیا ہو۔ تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ اس سے یہ کیون کر مان لیا جائے کہ سالم غزل ذوق ہی کی ہے۔ اس سبب سے اگر کلیات ظفر مین کچھ مصرعے چند شعر یا کچھ غزلون مین ذوق کا رنگ پایا جائے تو تعجب نہین

ایک بات اور بھی خیال کرنے کی ہے کہ نئے اور پرانے کسی تذکرہ نویس نے یہ بات نہین کہی کہ ذوق ظفر کو غزل لکھ کر دیدیا کرتے تھے برخلاف اس کے صاحب بزم سخن ان کی شاعری کے معترف ہین اور کہتے ہین

" درسخن پایۂ ارجمند گفتارش اگرچہ سادہ پرکار ہست اما ہمااش۔ خاطر شکار ہست۔ محاورہ گوئی ازان اوست و معاملہ نویسی زیر فرمان او "

اقلیم سخن کی فرمان روائی دادا سے ترکہ مین ملی تھی۔ اور اُردوئے معلی زیر نگین تھا۔ افسوس کہ اسکو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخشد ینا چاہا۔ آب حیات مین اُستاد ذوق کے حالات پڑھو۔ ظفر کے ہاتھ کیا رہتا ہے۔ کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرعہ۔ کوئی ایک۔ کوئی آدھا مصرعہ۔ فقط بحر اور قافیہ باقی بخیر۔ "گل رعنا صفحہ ۲۹۳"

مقدمۂ دیوان حالی مین حالی نے بھی ان کو اپنی طرز کا استاد تسلیم کیا ہے۔ " ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی مین اوّل سے آخر تک یکسان ہے۔ لیکن اس مین تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے "۔ نمونتہً ظفر کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے جو کہ قریب قریب اُنکے تمام خصوصیات کلام کی حامل ہے

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ سا بیچ مین تھا نہ رہا
رہے پردہ مین اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمین اپنے خبر رہے دیکھتے اورون کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیون پر جو نظر تو نگاہ مین کوئی بُرا نہ رہا

ترے رخ کے خیال مین کون سے دن اُٹھے مجھپہ نہ فتنۂ روز جزا
تری زلف کے دھیان مین کون سی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہین ساغر بادہ کے دیتے ین اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہیگا جہان مین سدا نہ رہا

کئی روز مین آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاس حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیل ستم زدگان
گئے کتنے ہی قافلے خشک زبان کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھون مین رو رو کے خونِ جگر
ملے پانوٴن سے کس کے ہین دیدۂ ترکفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا مین نے کہ روک رکھون مری جان بھی جائے تو جانے نہ دون
کئے لاکھ فریب کڑوڑ فسون نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا

لگے یون تو ہزارون ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
وے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اُس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش مین یاد خدا نہ رہی جسے طیش مین خوفِ خدا نہ رہا

احسان حافظ عبدالرحمن خان احسان خلفِ حافظ غلام رسول خان شاہزادہ مرزا فرخندہ بخت عرف مرزا ۔ کے خلف حضرت شاہ عالم ثانی کے سرکار مین مختار کل تھے اور استاد سلاطین زمن کے لقب سے مشہور تھے۔ شعراء پایۂ تخت مین ممتاز اور سر بلند تھے ۔ فارسی مین طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اُردو سے خاص لگاؤ تھا ۔ فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے

اساتذہ فارسی کے ہزارون اشعار بر زبان تھے ۔ جب کوئی ان کے شعر مین کسی لفظ یا ترکیب پر اعتراض کرتا تو فوراً سند مین کسی استاد کا کلام پیش کر دیتے ۔ آپنے دیوان اُردو مین بھی کئی جگہ کسی غیر معمولی حرکت یا ترکیب الفاظ کی سند مین کئی کئی شعر لکھے ہین ۔ شاہ عالم کے ایک مصرعہ پر اُنھون نے فی البدیہہ کہا کہ

نا مناسب ہے میان وقت سحرگاہ نہین

کسی نے وقت سحرگاہ پر اعتراض کیا تو انھون نے سند مین صائب کا شعر پڑھا

آدمی پیر شود حرص جوان می گردد خواب در وقت سحرگاہ گران می گردد

قلعہ معلی کے تمام شاہزادے اور دلی کے اکثر امیرزادے آپ کی شاگردی کے حلقہ بگوش تھے ۔ شاہ عالم ثانی آپکے اشعار

نہایت شوق سے سُنا کرتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے حضور میں بارہا شاہ نصیر سے نوک جھوک ہوئی۔ لیکن دربار شاہی میں عزت ہمیشہ برقرار رہی۔ ایک بار شاہ نصیر نے کہا تھا

اے خالِ رخ یار تجھے ٹھیک بناتا ۔۔۔ پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

علوم متداولہ اور فنون نفسیہ میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ کے زبردست اُستادوں میں شمار ہوتے تھے۔ مثل شاہ نصیر کے یہ بھی شعراء متوسطین کی باقیات صالحات تھے۔ جہاں جرأت۔ انشا مصحفی۔ اور نصیر کے ہم آہنگ تھے وہاں ذوق۔ مومن۔ غالب اور ممنون کے بھی ہمعصر رہے۔ چنانچہ ان کے دیوان میں ان اساتذۂ فن کی ہم طرح غزلیں موجود ہیں۔ زبان کی صفائی۔ الفاظ کی شستگی ترکیب کی برجستگی میں نہایت کدوکاوش کی اور حتی الوسع مغلق الفاظ پیچیدہ تراکیب سے پرہیز کیا۔ رعایت لفظی و معنوی ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔ تاہم طرز بیان نہایت صاف۔ سہل۔ مؤثر اور بے تکلف ہے۔ بہادر شاہ ظفر تخت نشینی کے بعد آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور تادم زیست وظیفہ شاہی کے احسان سے سبکدوش نہ ہوئے۔

احسان کا دیوان عنقا ہے۔ بڑی تلاش اور جستجو سے ایک قلمی کلیات جو ضخامت میں تین جزو سے زیادہ نہیں ہے دستیاب ہوا ہے اور ایک مثنوی یوسف زلیخا بھی نہایت عمدہ لکھی ہے۔ ان کے شاگرد سیکڑوں ہوئے لیکن مرزا ثابت اور صابر کو اُستادی کا درجہ حاصل ہوا شاہ ظفر کی اُستادی کا دعویٰ بھی کیا ہے لیکن شاید ایام شاہ زادگی کے تعلق سے۔ کیونکہ ذوق ان کی شاہزادگی کے عہدی اُستاد ہیں۔ شاید یہ اس سے بھی پہلے کبھی بچپن کے اُستاد ہوں ۱۲۶۷ھ میں رحلت کی ان کے قطعات بھی نہایت پرلطف ہوتے ہیں۔ قطعات لکھنے میں ان کو خاص مہارت ہے

بیقرار میر کاظم حسین بیقرار تخلص کرتے تھے۔ ہمشیر زادہ نواب رضا خان مختار شاہ عالم ثانی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اور ذوق کے ہم سبق تھے۔ شاہ نصیر کے بعد کچھ عرصہ تک ظفر نے ان کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ یہ نہایت موزوں طبع اور ذہین تھے۔ مگر افسوس کہ ہمارے سامنے اسوقت ان کے دو شعر ہیں۔ وہ ہدیہ ناظرین ہیں

جس طرف پھرتا رہا یار وہ رشکِ آفتاب ۔۔۔ جوں دل خورشید دل اپنا مقابل رہ گیا
رخ سے گر زلفیں اُٹھیں تو چھوڑ دی اپنے نقاب ۔۔۔ اک نہ اک پردہ ہمارے ان کے حائل رہ گیا

زار منشی برہان الدین خان زار شاہجہان آبادی شاعر دربار اکبر ثانی۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ خط شکستہ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ پہلے اکبر شاہ کے خواصوں میں تھے پھر شعراء میں داخل ہوگئے اور یہ انکے اشعار ہیں

کیونکر اس بات کو میں حالِ دل بد نام لکھوں ۔۔۔ کب وہ دیکھے ہے خدا کا بھی اگر نام لکھوں
چشم طوفان خیز گریہ پر مری تیار ہے ۔۔۔ جس کے آگے اے سیہ رو ابر تو بیکار ہے

ممنون میر نظام الدین نام ممنون تخلص۔ میر قمر الدین منت کے بیٹے تھے اصلی وطن تو سونی پت تھا۔ مگر مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ سے قرابت رکھنے کی وجہ سے ان کے والد دہلی آگئے تھے۔ ممنون دہلی میں پیدا ہوئے۔

درسی کتابین والدین سے پڑھین اور اصلاح سخن بھی انھین سے کی۔ چند روز کی فکر و کاوش سے دہلی شہر مین ان کی شاعری کا سکہ رائج ہوگیا۔ اکبر شاہ نے ان کو فخر شعرا کے خطاب سے متفخر کیا۔ کثرت سے لوگ ان کے تلمذ مین داخل ہوگئے۔ کہتے ہین کہ مفتی صدر الدین خان آزردہ نے بھی ان سے اصلاح لی ہے بہرحال ان کی شاعری نے خوب ترقی کی۔ اسی زمانے مین لکھنؤ تشریف لائے تھے اور سرکار اودھ کی طرف سے خاطر خواہ قدر دانی ہوئی۔ مگر گورنمنٹ انگریزی نے بڑی قدر دانی کی۔ اور ان کو اجمیر کا صدر الصدور کر دیا۔ مدت تک اس جلیل القدر عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب کبر سنی نے مجبور کیا تو دلی جاکر خانہ نشین ہو گئے اور ۱۲۶۱ھ مین ایک ضخیم دیوان چھوڑ کر دنیا سے رحلت کی۔

ان کی زبان صاف و شیرین ہے اور جا بجا محاورون کی چاشنی دیتے ہین۔ تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے۔ پھر ترکیب بندش کی چستی سے پامال اور فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہین کہ کلام مین خاص لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے

شاہ نصیر نصیر الدین المتخلص بہ نصیر بلحاظ زبان اور زمانہ شعرائے متوسطین مین شمار کئے جاتے ہین۔ ان مین خاص بات یہ ہے کہ شعرائے متوسطین اور متاخرین مین بطور کڑی کے ہین۔ آپ سیاہ فام بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کو میان کلو بھی کہتے تھے۔ شاہ غریب باشندہ دلی کے فرزند تھے۔ ان کے والد عزلت نشین درویش مشرب تھے۔ شاہان مغلیہ کی عطا کردہ جاگیر پر بسر اوقات تھی شاہ نصیر کی علمی استعداد معمولی سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اوائل عمر مین ہی مشق سخن کرنے لگے۔ مائل کے شاگرد ہوئے۔ شاہ عالم کے دربار مین بھی رسائی پیدا کی۔ خلعت اور انعامات سے مالامال ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ سیاحت مین گذرا لکھنؤ اور حیدر آباد کے کئی چکر لگائے۔ لکھنؤ مین مصحفی۔ انشا۔ جرأت سے معرکہ آرائیان ہوئین۔ اور کامیابی کا سہرا ان کے سر رہا۔ دیوان چند و لال شاداں کی دعوت پر حیدر آباد تشریف لیگئے۔ اور وہان انکی آمد نے اُردو شاعری کے قالب مین نئی روح پھونکدی

کلام یہ کہنہ مشق اور پرگو شاعر تھے اور مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ چونکہ طبیعت مین لاپرواہی تھی۔ اسوجہ سے ان کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ ان کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے تقریباً ایک لاکھ اشعار کو ترتیب دیکر دیوان کی شکل مین شائع کرایا ہے۔ اور ایسا بھی کہتے ہین کہ ان کا دیوان بہ شکل مسودہ میر عبد الرحمٰن پسر میر تسکین شاگرد مومن نے ترتیب دیا۔ اور نواب رامپور کو فروخت کر دیا۔ جو اُن کی لائبریری مین موجود ہے

نصیر بہت با اخلاق۔ ظریف اور خوش مزاج تھے۔ حیدر آباد۔ دہلی۔ لکھنؤ مین بہت سے اُن کے شاگرد تھے۔ نصیر سنگلاخ زمینون اور مشکل بحرون مین نہایت روانی کے ساتھ اشعار کہتے تھے۔ اور اس طرز مین انھین ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کو شاعری مین کمال حاصل تھا۔ پرشکوہ الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے بٹھاتے تھے۔ انھون نے عام تشبیہ و استعارات کو نہایت کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ مثل ناسخ اور صائب کے بھی پہلے مصرعہ مین اخلاقی مضمون اور دوسرے مین برجستہ تشبیہ دیتے ہین۔ اگرچہ نہایت جوش وخروش سے اشعار لکھتے ہین مگر رفعت خیال اور ندرت مضمون کمیاب ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد نہایت مشہور ہوئے

ذوق خاقانی ہند ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق استاد بہادر شاہ ایک غریب باپ کے بیٹے تھے۔ اگرچہ خاندانی شخص نہ تھے تاہم

اپنی ذاتی قابلیت اور خداداد لیاقت کے سبب معراج ترقی پر پہونچ گئے۔ جب ذوق نے ہوش سنبھالا۔ دلی کی گلی گلی مین شعر و شاعری کا چرچہ تھا۔ ان کے معلم حافظ غلام رسول شوق اکثر مجلس مشاعرہ مین شریک ہوا کرتے تھے۔ ذوق کو بھی شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ ابتدا مین کچھ عرصہ تک شوق کو اپنا کلام دکھایا۔ مگر طبیعت کی تیزی کسی باکمال کی تلاش مین تھی۔ میر کاظم حسین بیقرار شاگرد شاہ نصیر کے توسط سے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ نصیر کا طوطی دہلی مین بولتا تھا۔ ذوق کی شاعرانہ قابلیت نے شاہ نصیر کے سینہ مین آتش حسد بھڑکا دی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ اُستاد اور شاگرد مین ناچاقی ہوگئی۔ شاہ نصیر سے رشتہ شاگردی منقطع ہونے کے بعد ذوق نے کسی کی شاگردی قبول نہ کی۔ رفتہ رفتہ ذوق کی شاعری مقبول ہونے لگی۔ اور دہلی کی گلی گلی مین بچے بچے کی زبان پر ان کی غزلین تھین۔ اس وقت شاعری کا مرکز مرزا ابو ظفر ولی عہد کا محل تھا۔ جو قلعہ محل مین بڑی دھوم دھام سے مجلس مشاعرہ منعقد کیا کرتے۔ جہان اکثر بڑے جوش و خروش سے فی البدیہہ مشاعرے بھی ہو جایا کرتے تھے جسکی وجہ سے شاعری بام عروج پر پہونچ گئی۔

ان مجلسون مین اساتذہ فن کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ذوق نے اپنے رفیق میر کاظم حسین بیقرار کے توسل سے دربار مین رسائی حاصل کی شہزادے کی غزل کی اصلاح کی خدمت بیقرار کے سپرد تھی۔ کیونکہ شاہ نصیر دلی سے چلے جا چکے تھے تھوڑے عرصہ بعد میر کاظم حسین بھی جان الفسٹن کے ہمراہ میر منشی ہو کر دہلی سے سندھ چلے گئے۔ اب ذوق کا ستارہ چمکا اور یہ اُستاد ولی عہد مقرر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ بعد بقول آزاد نواب الٰہی بخش خان معروف جو کہ دربار مغلیہ کے مشہور رکن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ذوق کے شاگرد ہوئے۔

مگر لالہ سری رام خمخانہ مین معروف کی شاگردی کے بارے مین لکھتے ہین " مولانا آزاد نے جوش عقیدت مندی مین یہ ذکر بھی کر دیا ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروف جو شاہ نصیر کے پُرانے شاگرد تھے۔ اور عمر ان کی چھپاسٹھ سال کی تھی۔ انھون نے ذوق کو جو بمشکل اٹھارہ سال کے تھے۔ اپنا اُستاد بنایا اور اپنے دو نون دیوان درستگی کے لئے دئے۔ اس واقعہ کی تکذیب نواب ضیاء الدین احمد خان نیر درخشان اور نواب احمد سعید خان صاحب طالب نے خود مولانا آزاد سے مباحثہ کرکے بہ براہین قاطع کر دی ہے "

ذوق کے کلام مین اس وقت تک پختگی آ چکی تھی۔ اور اُن کی شاعری مین ایک خاص رنگ پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد نصیر نے مراجعت وطن کی۔ اور ذوق سے میدان شاعری مین معرکہ آرائیان ہونے لگین۔ ذوق نے مشکل اور سنگلاخ زمینون مین شاہ نصیر کی غزلون پر غزلین کہین

عرصہ تک شاہ نصیر اور ذوق مین شاعرانہ مجادلہ ہوتا رہا اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخرالامر میابی کا سہرا ذوق کے سر رہا۔ ان معرکہ آرائیون کا یہ اثر ہوا کہ عوام مین شاعری سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی میدان شاعری مین ذوق اور شاہ نصیر کے نقش قدم پر چلنے مین کوشان رہنے لگا۔ دہلی مین ذوق کی شاعری کا ڈنکا بج گیا۔ ذوق نے قصیدہ گوئی مین بھی کمال حاصل کیا۔ اور نہایت جوش و خروش سے قصیدہ لکھے۔ اور اکبر شاہ ثانی نے خاقانی ہند کے خطاب سے اعزاز بخشا۔ جب بہادر شاہ ظفر جلوہ آرائے تخت دہلی ہوئے۔ تو انھون نے ذوق کا مشاعرہ پانچ روپیہ سے بڑھا کر تیس روپیہ کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد سو روپیہ کر دیا۔ اور وقتاً فوقتاً خلعت۔ جاگیر۔ انعامات اور تحفہ تحائف سے مالامال کرتے رہے

ذوق کی سیرت ذوق فطرتاً طباع تھے۔ بلحاظ ذہانت اور حافظہ ہزارون مین فرد تھے۔ رحمدل۔ خداترس اور نہایت متقی تھے۔ موسیقی سے بھی شوق تھا۔ طبابت اور قیافہ شناسی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ لیکن شاعری کی شوق کو سب پر تفوق حاصل تھا۔ اور اس مین اس قدر غرق تھے کہ ان کو فنا فی الشعر کہنا ناموزون نہ ہوگا۔ خاک دہلی کی الفت اسقدر دامنگیر تھی کہ اُس نے ان کو کہین بھی نہ جانے دیا۔ دیوان چندو لال شاداںؔ نے ان کو بصد منت حیدرآباد بلایا۔ اور مصرعہ طرح بھیجا۔۔۔ انھون نے جواب مین غزل لکھکر بھیجی۔ جس کا مقطع تھا۔

گرچہ ہے ملکِ دکن مین اِن دنون قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دہلی کی گلیان چھوڑ کر

ترتیب دیوان آخر عمر مین صوم وصلوٰۃ کی نہایت سختی سے پابند ہوگئے۔ ذوق تمام عمر شعر گوئی مین منہمک رہے۔ جب ہم ان کا ایک مختصر سا دیوان دیکھتے ہین۔ تو تعجب ہوتا ہے ذوق کے حالات پر کافی غور وخوض کرنے اور آزاد کی اس تحریر کے پڑھنے کے بعد جو اُنھون نے ذوق کے دیوان مین مختلف مقامات پر لکھی ہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ ان کے مزاج مین استغنا اور لاپروائی بہت تھی

ترتیب دیوان کے ضمن مین آزاد کہتے ہین

"فصاحت کا خون ہوتا ہے۔ جب ان کے دیوان پر نگاہ پڑتی ہے۔ اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے اور مرثیہ خوانی میرا فرض ہے فرماتے تھے کہ بچپن مین جب کہ ۱۵-۱۶ سال کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانہ نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوئی جدا کاغذ پر لکھی گئی۔ اس طرح طاق پر رکھدئے تھے کہ فرصت سے نظر ثانی کرینگے۔ جب طاق بھر گیا۔ تکیہ کے غلاف مین بھرے اور گھر مین دیدیتے اور کہدیتے کہ احتیاط سے رکھنا۔ اور کبھی مٹکے اور ٹھلیا مین بھرے۔ اور گھر مین بھجوادئے کہ ضائع نہ ہون۔ اور اسی طرح تھیلے اور مٹکے ٹھلیان بھر گئے"

آگے چلکر لکھتے ہین کہ۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق الٹ جائیگا عالم تہ وبالا ہوجائیگا حسرتون کے خون بہ جائینگے۔ دل کے ارمان دل ہی مین رہ جائینگے"

دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوگیا کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ان کے فرزند روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے" اس کے علاوہ آزاد نے متعدد غزلون پر نوٹ بھی لکھے ہین کہ ان کے سامنے کوئی مطلع یا کوئی غزل کوئی شعر پڑھا گیا تو انھون نے کہا " ہان بھائی لڑکپن یا جوانی کی غزل ہے "

اور بقول آزاد :- "نظر ثانی سے نور نہین پایا" فرصت مین دیکھین گے"

بے پروائی کی حد ہوگئی۔ جب غزلون کے مسودے گھڑے مٹکون، تھیلون اور طاقون مین بھرے جانے لگے۔ تو ان کے ساتھ

وہی ہونا تھا جو ہوا۔ کیون کوئی زمانے کو کوسے۔ اور کیون خیال کرے کہ انھون نے اپنا کلام دوسرون کو بخش دیا۔ ایسا کبھی سننے مین نہین آیا۔ کہ غزلین گھڑون اور طاقون مین رکھی جائین۔ بے پروائی سے ماری ماری پھرین۔ اور پھر دیوان کی شکل مین بھی مرتب ہو جائین۔ لہذا ذوق کے کلام کے ساتھ جو کچھ ہوا غیر متوقع نہین ہوا۔ اس پر طرہ آشوب غدر۔ بہرحال ہم یہ ماننے کو تیار نہین کہ بادشاہ کی استادی نے ذوق کے دیوان کو جیسا کہ ہونا تھا نہ ہونے دیا۔ یہ تھوڑا بہت مشتے نمونہ از خروارے جو ہم تک پہونچا ہے۔ اس کو پہلے حافظ ویران نے اپنے دوستون کی مدد سے مرتب کیا۔

بہت دنون کے بعد آزاد نے کوشش کرکے ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا۔ جس سے کچھ ناتمام غزلین مکمل ہوگئین۔ اور کچھ قصیدون اور غزلون کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے فنا فی الشعر آدمی کا یہ مختصر سا دیوان ہی تمام سرمایہ نہین ہو سکتا۔ اگر کلام انکی لاپروائی اور غدر کے نذر نہ ہو جاتا تو یقینی تین چار ضخیم جلدین بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتین۔

تصانیف

ذوق غزل اور قصیدہ کے مسلم الثبوت استاد ہین۔ ان کی مشہور عالم مثنوی "نامہ جان سوز" جو ۵۰۰ اشعار پر مشتمل تھی وہ غدر مین ضائع ہو گئی۔ علاوہ ازین ذوق بے شمار رباعیات مخمس اور تاریخون کے مصنف ہین۔ جواب بہت کم یاب ہین۔ سلام اور مراثی پر طبع آزمائی نہین کی نہ کسی کی ہجو سے اپنی زبان کو آلودہ کیا

ذوق کا مرتبہ اُردو ادب مین

ذوق نے اُردو کی نہایت اہم خدمت کی ہے۔ ذوق نے زبان کو نہایت شستہ اور سلیس کیا۔ موزون اور برجستہ الفاظ کے استعمال مین ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ذوق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھون نے ہندی اور اُردو کے لاتعداد محاورات بہت حسن خوبی سے استعمال کئے اور اشعار مین ان کو نگینے کیطرح جڑ دیا۔ زبان پر ان کو بہت زیادہ عبور حاصل تھا۔ غزل قصیدہ مین حیرت انگیز کمال دکھایا۔ ذوق نے اکثر غزلون مین ترنم کا خاص طور سے لحاظ رکھا ہے۔ ذوق نے اشعار کے قالب مین جو نغمات بھر دئے ہین وہ دنیائے ادب کو آج تک مست و بیخود کئے ہوئے ہین

طرز کلام

صنائع اور بدائع، تشبیہ اور استعارات بطریق احسن استعمال کئے ہین۔ اور اس خوبی سے بٹھائے ہین کہ کانون پر ذرا بھی گران نہین گذرتے۔ ذوق کے اشعار مین جوش۔ آمد اور مناسب زیر و بم ہے۔ زبان کی شیرینی، اور صفائی کا بمقابلہ رفعت خیال اور پرواز تخیل زیادہ خیال رکھا ہے۔ ہمہ گیری مین ان کا مقابلہ سودا سے کیا جا سکتا ہے۔ اکثر ذوق نے سودا کے طرز کلام کا تتبع کیا ہے مگر قصیدہ گوئی مین تمام شعرائے اُردو مین ممتاز ہین۔

ذوق نے غزلون مین شاہ نصیر۔ انشا۔ مصحفی۔ جرأت اور اکثر ناسخ کا تتبع کیا ہے اور آخر کار اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرلیا۔ جو غزلیات انھون نے جرأت کے رنگ مین لکھی ہین۔ ان مین جرأت کی تمام خوبیان پائی جاتی ہین۔ مگر وہ جرأت کی کمزوریون سے یکسر پاک ہین۔ ان کی علمی استعداد پر نکتہ چینی کیجاتی ہے۔ لیکن خمخانۂ جاوید مین لکھا ہے

" ابتدائے عمر مین شیخ مرحوم نے معمولی درسی تعلیم کے بجائے شعر گوئی کی طرف توجہ کردی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ مشاعرون کی معرکہ آرائیون اور حریفون کے اعتراضون نے انھین تکمیل علوم اور سیر کتب کی طرف متوجہ کیا۔ فطری شوق کی مدد سے قلیل عرصہ مین

وہ ایک فاضل ہوگئے۔ اور معلومات کا دائرہ وسیع کرلیا۔ مولوی محمد حسین آزاد فرماتے ہین۔ کہ شیخ مرحوم نے فرمایا کہ مین نے ۵۰، ۷ دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے ہین۔ اور اُن کا خلاصہ کیا۔ اساتذہ کی تصنیفات ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی صدہا کتابین گویا ان کی زبان پر ہین۔ مگر مجھ کو اس کا تعجب نہیں اگر شعراء عجم کے ہزارون شعر انھین ازبر تھے۔ تو مجھے حیرت نہین۔ اور گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر بندش دیتے تھے۔ اس کا بھی خیال نہین۔ کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہین۔ ہان تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہین۔ خصوصًا تصوف مین ایک عالم خاص تھا۔ رمل ونجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر مین انھین خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقعہ ہوتے تھے۔ علم طب کو خوب تحصیل کیا مگر کام نہ کیا"

اگرچہ ذوق قابلیت اور لیاقت۔ رفعت تخیل اور تازگی مضمون مین غالب سے کمتر ہین۔ لیکن غالب زبان کی سلاست۔ محاورہ بندی مین ان کے مقابلہ سے قاصر ہین۔ ذوق آسمان شاعری کے نیر تابان اور گلشن اُردو کے عندلیب شیرین مقال ہین

لالہ سری رام نے ان کے کلام پر حسب ذیل ریویو کیا

"استاد ذوق کی محاورہ بندی مضمون آفرینی۔ کلام کی پختگی۔ صحت زبان سلاست بیان کی شہرت محتاج بیان نہین۔ ذوق اگرچہ نازک خیالی اور مضمون بندی مین غالب اور حکیم مومن خان کے رتبہ کو نہین پہونچے۔ مگر ان کی خداداد ذہانت اور ہمہ دانی نے اس کمی کو جیساکہ چاہئے۔ پورا کر دکھایا۔ ایک خاص وصف جس سے ان کی شاعری مسلم مانی جاتی ہے۔ یہ تھا کہ اکثر پامال مضامین اس خوبی اور ایسے الفاظ مین باندھتے ہین کہ اپنی جدت طرازی سے نئے خیال کا لطف اس مین پیدا کرتے ہین"

"نساخ۔ گارسن دتاسی۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ آزردہ جیسے منصف مزاج باکمالون نے انھین فن شعر کا بادشاہ اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کیا ہے"

شیفتہ فرماتے ہین

قوت مشقی کہ اورا است دیگرے را دیدہ نہ شد
لہذا از طبع یا بس کہ شیوہ بسیار گویان است
در کلامش کمتر و بر جمیع اصناف سخن قدرت تمام دارد

ارشد تلامذہ یون تو تمام دلی ذوق کے شاگردون سے پُر تھی مگر ظفر۔ آزاد۔ ظہیر۔ انور۔ تخیر اور داغ نے اُستاد کے نام کو چار چاند لگا دئے۔ نمونہ کلام ذیل میں درج ہے

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہین کرتا — پر میرا جگر دیکھ کہ مین اُف نہین کرتا
گل اس نگہ کے زخم رسیدون مین مل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدون مین مل گیا
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا — خوب طوطی بولتا ہے ان دنون صیاد کا

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

الفت کا نشہ جب کوئی مرجائے تو جائے — یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

بل بے استغنا کہ وہ یان آتے آتے رہگئے — اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منھ بناتے ہو — وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

کیا ہے چلے گلی سے تیری ہم کہ جون ستم — آئے تھے سر پہ خاک اُڑ اتے اُڑ ا چلے

تیغ تو ادھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے — دلکو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ لے

آنا تو خفا آنا جانا تو رُلا جانا — آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ — پر حیف کہ مجنون کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

یان لب لاکھ لاکھ سخن اضطراب مین — وہان ایک خاموشی تیری سبکے جواب مین

احسان ناخدا کا اُٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دون لنگر کو توڑ دون

وقت پیری شباب کی باتین — ایسی ہین جیسے خواب کی باتین

موت ہی سے کچھ علاج دردِ فرقت ہو تو ہو — غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہین کہ مرجائین گے — مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائین گے

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی — کالا کریگا منھ بھی جو داڑھی سیاہ کی

جس جگہ بیٹھے ہین بادیدۂ نم اُٹھے ہین — آج کس شخص کا منھ دیکھکے ہم اُٹھے ہین

سینہ و دل یہ مرے زخم جگر ہنستے ہین — ہنسنے دو چارہ گرون ہنستے ہی گھر بستے ہین

یہ اقامت ہمین پیغام سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

بدنہ بولے زیر گردون گر کوئی میری سُنے — ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

جائے اک بار نہ پھرنا تھا جہان سے ہم کو — بیقراری ہے کہ سَو بار لئے پھرتی ہے

رفعتِ خیال پروازِ تخیل مضمون آفرینی کے نمونے :—

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ — اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا
موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انسان — ہے وہ خود بین کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
اتنا تو شور فنا ہو کہ چمن میں بلبل! — خرمن گل کی جگہ ڈھیر ہوا نگاروں کا
چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ — ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
کب لباس دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر — جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا
دم کو ہمارے سینے میں اک دم نہ ہو قرار — یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے
مشکل ہے مرے عہد محبت کا توڑنا — اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں
وہ مست ہوں کہ رکھے قدح کش تہ بغل — بنیاد میکدہ مری خشت لحد سے ہے
دیکھنا آپی دوپٹہ منھ پہ اُنکے خواب میں — برج آبی میں ہے منہ یا مہر روشن آب میں
رکا خوب نہیں طبع کی روانی میں — کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں
جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ — سرد ہونے پہ بھی گرمیٔ وفا ہے اس میں
دانہ خرمن ہے ہمیں دریا ہے قطرہ ہم کو — آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو
ہم تبرک ہوئے اب کرے زیارت مجنوں — سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو
افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف — لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ
کعبہ کی دیوار و در سے نور کے جلوے اٹھیں — گر پڑے سایہ مرے میخانہ کی دیوار کا
ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب — اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح
لبریز صد نشاط بہ رنگ ہلال عید — سینہ میں میرے ناخن غم کی خراش ہے

زمین پہ نور رقم کے گرنے سے صاف اظہار روشنی ہے — کہ جو ہیں روشن ضمیر اُن کو فروغ اُنکی فروتنی ہے

ہے نماز کشتۂ قامت ۔ بجائے جا نماز — اے قیامت لا بچھا دامان محشر زیر پا

ارشد تلامذہ

ظہیر — سید ظہیر الدین جلیل سید جلال الدین حیدر خوشنویس کے لڑکے تھے جلال الدین حیدر شاہ ظفر کے خوشنویسی میں اُستاد تھے۔ ظہیر نے بھی ملازمت اختیار کی اور راقم الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۔ چودہ سال کی عمر میں

ذوق کے شاگرد ہوئے۔ زمانۂ غدر مین دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ اور زمانہ کے ہاتھون بہت پریشان رہے۔ آخر حیدرآباد پہونچے۔ اور نہایت عُسرت کی حالت مین انتقال کیا

ظہیر بہت پرگو شاعر تھے۔ ان کا پہلا دیوان "گلستانِ سخن" آگرہ سے شایع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا دیوان مطبع کریمی کلکتہ سے شائع ہوا چوتھا غیر مطبوعہ ہے۔

ظہیر اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے۔ مگر غزلین اکثر مومن کے رنگ مین کہتے تھے۔ اور اس کا اعتراف اپنے اشعار مین کیا ہے

سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جبتک کہ ظہیر

عہدِ ظفر کی شاعری کے آخری چراغ تھے جسکو صرصرِ حوادث نے سرزمینِ دکن مین گل کر دیا۔ ان کو اُردو شاعری کا مسلم الثبوت اُستاد تصور کیا جاتا ہے۔ نجم الدین احمد ثاقب بدایونی انکے شاگردِ رشید تھے۔ جن کو ظہیر نے "پہلوانِ سخن" کا خطاب دیا تھا۔ ان کے کلام مین بجائے ذوق کے مومن خان کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیات کلام کی پختگی اور محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی ظہیر کے ہان پائی جاتی ہین مومن خان کے یہان شاعری کا مدار خیال کی نزاکت ترکیب۔ فارسی بندش اور اسلوب بیانکی جدت پر ہے۔ جو ظہیر کی شاعری کا سرمایۂ ناز خصوصیت ہے

غرضکہ مجموعی حیثیت سے ظہیر کی شاعری دلی کی اصلی اور قدیم مشاعری کا ایسا نمونہ ہے کہ جسکی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام مین نہین مل سکتی

نگاہِ شرمگیں سے ہے نہان کیا کیا عیان کیا کیا فقط اک سادگی پر شوخیون کے ہین گمان کیا کیا

بڑھا جاتا ہے یان شوقِ سجودِ آستان کیا کیا قدم رکھتے نہین ہین وہ زمین پر بے نیازی سے

الجھتے ہین دمِ رفتار سَو سَو بار دامن سے یہ شوخی ہے کہ تمکین ہے الٰہی کیا قیامت ہے

مین کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا پھر سیرِ عشق سے مجھے وحشت فزون ہوئی
ہر ہر ادا یہ مجھ کو گمانِ نظر رہا اعجاز دلفریبئی انداز دیکھنا

انور سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا المتخلص بہ انور برادرِ خردِ ظہیر شاگردِ ذوق۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب کی طرف رجوع ہوئے۔ یہ نہایت ہونہار شاعر تھے۔ مگر صد حیف کہ عمر نے دفا نہ کی۔ اور ۳۵ برس کی عمر مین جیپور مین انتقال کیا۔ ان کے ہمعصر ان کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غدر کے دس ماہ کے بعد جو مشاعرہ دہلی مین منعقد ہوا جس مین داغ۔ ارشد۔ ظہیر۔ مجروح۔ سالک۔ عزیز۔ مشتاق اور حالی رونق آرائے بزمِ سخن تھے۔ یہ بھی موجود تھے۔ ان کے

دو دیوان ضائع ہوگئے۔ لیکن لالہ سری رام نے ان کی غزلیات کو جمع کرکے ایک دیوان کی شکل مین شائع کیا ہے۔ انور کے کلام مین ذوق کی سلاست۔ مومن کی نزاکت۔ اور غالب کی بلاغت پائی جاتی ہے۔

"طبیعت نہایت دقت پسند اور مضمون خیز واقع ہوئی تھی۔ کلام کی شوخی خیال کی چیلاہٹ اور فکر کی رسائی روزمرہ کے انوٹ فریفتگان سخن کے دماغ مین عجیب سرور اور عاشق مزاجون کے دلون مین غضب کا درد پیدا کرتے تھے۔ جو شعر دیکھو پھڑکتا ہوا حسن خیال و بلندی مضمون پر نظر ڈالو تو ایک خوش آئند حیرت پیدا ہوتی ہے"

کیا غماز اپنا ہمنے پیدا ہاتھ سے اپنے — زبان بنکر کہے دیتا ہے چاک آستین کیا کیا

تقلید خاکساری ہوتی ہے خاک ہوکر — مٹ مٹ کے ہمنے سیکھا انداز نقش پا کا

تم آج ہی چل پھر کے مٹا دو نہ یہ جھگڑا — کیون کل پہ رکھو شورش غوغائے قیامت

تجھ سے دل کا غبار مٹ نہ سکا — اپنے کو ہم مٹائے بیٹھے ہین

کچھ کچھ وہ چھیڑ لطف کی کم کم عتاب مین — جی ہے اُمید و یاس کے کس کس عذاب مین

نہین انجم یہ رُو رُو کر کسی کے یاد دندان مین — بھرے ہین ہمنے موتی دامن شب ہائے ہجران مین

اللہ فرط شوق اسیری کے شوق مین — پہرون اُٹھا اُٹھا کے سلاسل کو دیکھنا

تم کسی وعدے سے پھر جاؤ کہ ہو جاؤن تمام — ہوا گر بھرنے مین میرے حلق پر خنجر خراب

شب غم مین کس کس کی ہو روک تھام — جو دل من گیا دم خفا ہوگیا

کیا غم دراز دستی نارسیر کا — دامن کو لے چلا ہون بھگو کر شراب مین

ضعف مین مرنا بھی مشکل ہوگیا — جان ابھی ہے نفس کے تار سے"

داغ۔ نواب مرزا خان داغ نواب شمس الدین خان کے لڑکے تھے ۱۲ ذی الحجہ کو دہلی مین پیدا ہوئے۔ چھ یا سات برس کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ انکی والدہ نے مرزا فخرو خلف ظفر شاہ ولی عہد سے نکاح کرلیا۔ اور قلعہ مین رہنے لگین۔ یہ بھی ساتھ تھے غرض ۷ سال کی سے ان کی تعلیم کا سلسلہ ہوا۔ دربار ظفر مین کمالان فن کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی تعلیم باقاعدہ ہونے لگی ولی عہد بہادر خود ان کی تعلیم مین بہت دلچسپی لیتے تھے اور بعض فنون کی تعلیم خود دیتے تھے۔ قلعہ مین جہان اور علوم مین کمال حاصل ہوسکتا تھا ان شعر و شاعری کا بھی بازار گرم تھا۔ یہ دیکھ کر ان کو بھی شاعری کا شوق ہوا۔ خدا نے ذہانت اور ذکاوت ان کی فطرت مین نہایت فیاضی سے ودیعت کی تھی۔ اور اس پر خدا نے سامان بھی ایسے ہی پیدا کردئے۔ ذوق کا زمانہ تھا۔ اور حضرت ذوق، بہادر شاہ ظفر اور ولی عہد دونون کے اُستاد تھے۔ مرزا فخرو نے جب ان کا رجحان شاعری کی طرف دیکھا۔ تو ان کو ذوق کا شاگرد کردیا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی مشاعرون کا بھی اسوقت بہت چرچا تھا۔ علاوہ قلعہ معلی کے شہر مین اکثر لوگون کے مکانون پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ انھون نے پہلے پہل نواب شیفتہ کے مشاعرے مین

غزل پڑھی۔ پھر اکثر مشاعروں مین غزلین پڑھنے لگے۔ اور تعریف بھی ہونے لگی۔ غدر سے دس ماہ بیشتر مرزا فخرو ولی عہد کا بعارضۂ ہیضہ انتقال ہوگیا۔ مرزا کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ پھر دس ماہ کے بعد ہنگامہ غدر برپا ہوا۔ اور اس طوفان نے سب کے ساتھ شیرازۂ ادب کو بھی منتشر کرکے رکھدیا۔ اور .... داغ کو بھی دلّی چھوڑنی پڑی۔ اور یہ معہ اپنے خاندان کے رامپور چلے آئے۔ یہان نواب یوسف علی خان اور ان کے بعد نواب کلب علی خان نے انکی بہت قدر کی۔ نواب کلب علی خان نے ان کو اپنا مصاحب خاص بنالیا۔ ۲۴ سال تک مرزا ان کے ہمراہ رہے۔ اور ان کے ساتھ ہی سعادت حج سے بہرہ ور ہوئے۔ نواب کلب علی خان کے انتقال کے بعد بوجوہ چند رامپور سے دلّی چلے آئے۔ یہان کچھ روز قیام کرکے اِدھر اُدھر کی سیر کی۔ پھر حیدر آباد چلے گئے وہان کچھ روز قیام کیا۔ حیدر آباد مین آپ کی بہت شہرت ہوئی۔ آپنے راجہ گردھاری پرشاد باقی کی مدح مین ایک قصیدہ بھی کہا۔

مین ہوا باد یہ پیما طرفِ ملک دکن سرمۂ چشم غزالان ہوئی گرد دامن

کچھ عرصہ بعد حیدر آباد سے چلے آئے۔ دوبارہ نظام حیدر آباد نے نوشتہ بھیجکر طلب کیا۔ مرزا پھر حیدر آباد پہونچے۔ مدت کے بعد دربار مین طلبی ہوئی ساڑھے چار سو روپیہ وظیفہ مقرر ہوا۔ اور یہ اُستادِ نظام مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ایک ہزار روپیہ ملنے لگا۔ طبیعت کے نہایت غیور اور خود دار تھے۔ اُنھون نے کسی امیر ورئیس کی مدح نہ کی۔ سوائے چند کے۔ اگر کہین جاتے تو نظام سے پوچھ کر حتیٰ کہ اپنے ولی نعمت کے یہان بھی بلا بُلائے نہ جاتے تھے۔ عام لوگون سے نہایت خلوص اخلاق اور خوش طبعی سے ملتے تھے نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ انکی گفتگو دلچسپ ہوتی تھی۔ طبیعت نہایت مرنجاں مرنج واقع ہوئی تھی۔ دوسرے اُستادون کے مانند ان سے اور کسی ہمعصر سے سخن گسترانہ معرکہ آرائی تک نہین ہوئی۔ حرف گیری اور اعتراض ان کے ذوق سے باہر تھے۔ خلق کی عمدہ مثال امیر مینائی کی مہانداری اور تیمارداری ہے۔ جلال۔ مجروح۔ ظہیر۔ تسلیم۔ راسخ۔ نساخ سے ان کے تعلقات نہایت شگفتہ رہے۔ ۱۸ برس تک دکن مین قیام رہا۔ ۹ ذی الحجہ کو آٹھ روز مرض فالج مین مبتلا رہکر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور یہ آفتاب شاعری خاک دکن مین ہمیشہ کے لئے چھپ گیا مرزا خان داغ سے بھی انکی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مرزا کی یادگار چار دیوان اور ایک مثنوی ہے

خصوصیات کلام اور طرز کلام

طرز کلام ان کا جداگانہ ہے۔ ان کو اُردو زبان کا مصلح مانا گیا ہے۔ نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ غزل کے جس قدر موضوع ہین سب پر بخوبی حاوی تھے۔ بلا شبہ غزل کے بے نظیر شاعر تھے۔ انھین نے نظم کو ثقیل الفاظ سے پاک کیا ہے ان کے اشعار مین صفائی بیان۔ شستگی زبان۔ برجستگی محاورات اور مضمون آفرینی بہت ہے چھوٹی چھوٹی بحرون اور سنگلاخ زمینون مین نہایت کامیابی سے غزل کہتے ہین۔ الفاظ کے تھوڑے سے الٹ پھیر سے نیا مضمون پیدا کردینا ان کا کمال ہے۔ مدحیہ قصیدے بھی نہایت کامیابی سے لکھے ہین اور نہایت جوش وخروش سے لکھے ہین۔ ہجو سے انھون نے کبھی زبان کو آلودہ نہین کیا۔ اسیر۔ منیر۔ ظہیر۔ زکی۔ حالی۔ مجروح۔ سالک۔ جلال۔ امیر سب ان کی ہمہ گیری اور قادر الکلامی کے مداح و معترف ہین

اس آفتاب شعریت کے تلامذہ ستارہ ہائے منتشر کی طرح ہین لیکن اس مین اکثر اپنے وقت کے بدر کامل ہو کر منو فشان ہوئے ہین جضور نظام - بیخود بدایونی - بیخود دہلوی - مرزا اسمٰعیل دہلوی - آغا شاعر دہلوی - ڈاکٹر اقبال بیباک - حیرت - آزاد - رسا - فیروز - اشک - نوح ناروی -

غالب اسد اللہ خان غالب ۱۷۹۶ء - ۱۸۶۹ء - غالب کی ہستی نے دنیائے ادب اُردو مین ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا - اگرچہ ان کے ہمعصر شعراء کو ان سے ہمیشہ شکایت رہی کہ ان کے کلام کا سمجھنا صرف مشکل ہی نہین بلکہ ناممکن ہے اور ان کے مخصوص انداز کلام نے اپنے عہد مین فروغ نہ پایا - مگر زمانۂ حاضرہ نے انکی شاعری کا صرف لوہا ہی نہین مانا - بلکہ بڑے بڑے محققین اسپر متفق ہین کہ غالب دنیا کے زبردست شعراء کی صف اوّل مین پیش پیش ہے ان کی شاعری کے نکات و رموز کی شرح بڑے بڑے نقادان نے کی ہے - حالی کی یادگار غالب - دیباچہ دیوان غالب - از ڈاکٹر بجنوری - ——— شرح طباطبائی شرح حسرت موہانی .... یہ معرکتہ الآرا کتابین ہین خصوصًا یادگار غالب - اور مقدمہ بجنوری نے غالب کے فلسفیانہ رموز و نکات - مطالب بیان کرنے مین جو سعی عظیم کی ہے - وہ قابل صد ہزار تحسین ہے

ان کتابون کے بعد اگرچہ ضرورت تو نہین ہے - کہ غالب پر بحث و تحیص کا آغاز کیا جائے - تاہم ابھی تک بہت سے اشخاص مطمئن نہین ہوئے ہین - نگار مین آرگس نے جو غالب بے نقاب کے عنوان سے سرقہ و توارد کے تحت مین بحث چھیڑی تھی وہ عرصہ تک نیرنگ خیال مین اختتام کو نہین پہونچی -

---

نسب و ابتدائی تعلیم مرزا اسد اللہ خان غالب ۱۷۹۶ء مین آگرہ مین پیدا ہوئے یہ ایک شریف اور بارسوخ خاندان کے چشم و چراغ ہین - انکا نسب فریدون سے ملتا ہے - ان کے دادا وطن سے ہجرت کرکے دربار شاہ عالم ثانی مین آئے - ان کے والد مرزا عبد اللہ خان نے نواب اودھ - نظام حیدر آباد اور مہاراجہ الور کی ملازمتین اختیار کین - اور ایک قلعہ کے محاصرے مین جام شہادت نوش کیا - غالب نے اپنے چچا مرزا نصر اللہ خان کے سایۂ عاطفت مین پرورش پائی مگر شومئی بخت کہ غالب نو سال کے تھے کہ انھون نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا - بعد ازان اُن کی پرورش ان کے ننہال مین ہوئی - ابتدائی تعلیم شیخ معظم الدین اور میان نذیر اکبر آبادی سے حاصل کی - چودہ برس کے ہوئے تو ایک نو وارد صاحب کمال سے فارسی مین استفادہ کیا - یہ نو مسلم تھا - دو سال تک آگرہ اور دتی مین غالب ان کی صحبت سے مستفید ہوئے - اور فارسی مین نہایت حیرت انگیز ترقی کی - ۱۸۱۵ء مین نواب الٰہی بخش خان معروف کی دختر سے شادی ہوئی اور اس وقت دتی کی ادبی فضا شعر و شاعری سے معمور تھی - اور دتی مین شرفا کے مکانون پر کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے - بہت ممکن ہے کہ دہلی کی آمد و رفت اور تیزی طبیعت نے اُردو شاعری کی طرف رجحان پیدا کر دیا ہو ابتدا میں فارسی میں ذوق سخن فرماتے تھے لیکن بعد کو اُردو میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے -

غالب نے کلکتہ۔ بنارس اور لکھنؤ کے سفر کئے اور ایک قصیدہ نواب اودھ کے وزیر کی شان مین اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر کی مدح مین لکھا۔ واجد علی شاہ نے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جو ۱۸۵۶ء مین دو سال کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۸۳۷ء مین قماربازی کی تہمت مین ۶ ماہ کی قید بھی ہوئی مگر جیل مین بھی انکا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۸۴۲ء مین دہلی کالج کی پروفیسری ملتی تھی مگر نہین کی کیونکہ ...... مسٹر ٹامسن نے ان کی کافی تعظیم نہین کی۔ ۱۸۴۹ء مین بہادر شاہ ظفر نے ان کو نجم الدولہ دبیر الملک کے خطاب سے معزز فرمایا۔ اور بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار ان کو اپنے خاندان کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا۔

اُستاد ذوق کے انتقال کے بعد غالب اُستاد شاہ ہوئے۔ ہنگامہ غدر کے بعد اس بنا پر کہ ان کے تعلقات قلعہ معلّٰی سے تھے بہت مصائب و آلام مین مبتلا ہوئے۔ لیکن پھر ان کی پنشن مقرر ہو گئی۔ اور ان کا لکھنؤ مین وقار از سر نو قائم ہو گیا۔ اور بعد کو نواب یوسف علی خان والئ رامپور کے اُستاد مقرر ہوئے ان کے دربار سے سنو روپیہ ماہوار وظیفہ ہو گیا۔ جو ان کو تاحین حیات برابر ملتا رہا۔ ۱۸۶۹ء مین ... برس کی عمر مین دہلی مین انتقال کیا۔ اور درگاہ حضرت نظام الدین مین دفن ہوئے

غالب کی سیرت

غالب بہت زیادہ بامروت متواضع۔ ہمدرد۔ رحمدل اور خلیق تھے۔ مذہبی تعصب ان کو چھو بھی نہ گیا تھا۔ بہت سے ہندو شرفا ان کے دوست تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ سے ان کے بہت زیادہ مراسم تھے۔ یہ بہت آزاد خیال اور صاف دل تھے۔

آمدنی کے ذرائع متعدد تھے مگر نہایت مُسرف تھے۔ اس لئے ہمیشہ تنگدستی مین بسر کی۔ خودداری کے ساتھ ہی طبیعت مین شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی

غالب کی علمیت

غالب کو فارسی مین کافی عبور تھا۔ ابتدا مین فارسی شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ مگر زمانہ کی رفتار دیکھ کر اُردو شاعری شروع کی۔ غالب بہت تیز طبیعت اور حاضر دماغ تھے اور اکثر فی البدیہہ اشعار فرمایا کرتے تھے۔ غالب ایک بہت بڑے فلسفی و صوفی ایک جید عالم اور ایک جدت طراز شاعر تھے۔ غالب کو تصوف سے خاص دلچسپی تھی اور علم تصوف پر ان کو عبور کامل تھا۔ غالب چونکہ فطرتاً ایک فلسفی دل و دماغ لیکر آئے تھے لہذا ان کی شاعری مین یہ عنصر غالب ہے

تصانیف

عود ہندی۔ اُردوئے معلّٰی۔ کلیات فارسی۔ دیوان اُردو۔ لطائف غیبی۔ تیغ تیز۔ قاطع برہان۔ پنج آہنگ نامۂ غالب۔ مہر نیم روز دستنبو۔ سبد چین ان کی مشہور تصانیف ہین۔ برہان قاطع غالب کی علمیت قابلیت اور تحقیق پر برہان قاطع ہے۔

خصوصیات کلام

سب سے بڑی خصوصیت جو غالب کو دوسرے اساتذہ سے ممیز کرتی ہے وہ ان کی جدت طرازی ہے۔ یہ جدت ان کے خیالات۔ تشبیہات و استعارات اور تخیل پر حاوی ہے۔ معمولی اور پامال مضمون مین بھی دلکشی اور ندرت کا رنگ کامیابی سے بھرا ہے۔ غالب نے اپنے کلام مین بہ نسبت الفاظ کے رفعت خیال کا زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ اور خیالات کو الفاظ کے لباس سے اسطرح مزین کیا ہے جو صرف غالب ہی جیسے اُستادِ فن کا حق ہے

طرز کلام
غالب اپنی شاعری مین زندگی کے ہر شعبہ پر تبصرہ کرتے ہین مصائب کی دکھ بھری کہانیان اور تلخ تجربات سے ناظرین کو عبرت دلاتے ہین نا امیدی و حسرت و یاس کی تصاویر خوب کھینچتے ہین

فلسفہ
جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ غالب ایک زبردست فلسفی تھے۔ ان کا تمام کلام صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات سے مملو ہے غالب مذہب، مشرب، ملت کے تعصبات سے بالکل مبرا تھے

ہم موحد ہین ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتین جب مٹ گئین اجزائے ایمان ہو گئین

ان کا مطمح نظر عبادت کے بارے مین نہایت بلند ہے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہین

جنت کی حقیقت ان کی نظرون مین اسقدر ہے

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

عبادت ان کی نظر مین صرف عبادت کے لئے کرنا چاہئے نہ حصول صلہ کے لئے

طاعت مین تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ دوزخ مین ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

غالب کے نزدیک انسان کا وجود ایک دائمی مصیبت ہے اور اس کا عدم اس کے وجود سے بہتر ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا مین تو کیا ہوتا

غالب .... دنیا کے مصائب آلام کو بالکل ہیچ اور فانی خیال کرتے ہین۔ اور حقیقت یہ ہے کہ غالب نہایت حقیقت شناس نگاہ رکھتے ہین یہ فلسفیانہ مسائل اور دقیق نکات کو نہایت آسانی سے حل کرتے ہین

غالب پہلے شاعر ہین جنھون نے اردو مین فلسفیانہ شاعری کی مستقل بنیاد ڈالی اور وہ عمارت کھڑی کی کہ جس کو دیکھ کر دنیا کے بڑے بڑے عالم بحر حیرت مین غرق ہو جاتے ہین۔ غالب اپنی طرز کے موجد اور واحد مالک ہین مبتذل اور صوفیانہ خیالات کی بیخ کنی کرنے مین اپنے دور کے مشہور شعراء کے دوش بدوش ہین۔ ان کے اشعار روحانی لذت اور تازگی بخشتے ہین۔ غالب اپنی اس اہمیت پر بجا طور پر نازان ہین چنانچہ کہتے ہین

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

قدما مین صرف درد کے کلام مین جا بجا اکثر اسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری علاوہ فلسفیانہ خیالات کے حقیقی جذبات سے بھری ہے۔ غالب نے زندگی کے تاریک پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے حسرت و یاس۔ اندوہ و غم۔ مصائب و آلام بدبختی تنگدستی کی خوب خوب تصویرین کھینچی ہین

غالب وحدت الوجود کے قائل ہین۔ اور وہ خدا کو ماسوا سے علیحدہ نہین خیال کرتے بلکہ ان کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ مین کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہین کہ دنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی

غالب اس کا جواب دیتے ہین اور کہتے ہین

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہین | ہم کہان ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین
قید حیات و بند غم اصل مین دونون ایک ہین | موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیون

غالب اپنے مغربی ہمعصر شیلی (انگریز شاعر) سے خود داری اور معصومانہ جذبات کے بے باکانہ اظہار مین بہت ملتے جلتے ہین۔ غالب اس کی کوئی وجہ نہین خیال کرتے کہ ان کو دنیا مین کیون نہ اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ دنیاوی تکالیف پر نہایت آزادی سے دل کھولکر ماتم کرین

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیون | روئین گے ہم ہزار بار کوئی ہمین ستائے کیون

غالب کا یہ شعر جذبات نا امیدی کا حیرت انگیز آئینہ ہے۔ غالب کے اکثر سلیس اشعار مین بڑے بڑے معنی پنہان ہوتے ہین انھون نے وسیع سے وسیع مضمون کو جو کئی کئی اشعار مین ادا ہو سکتا ہے۔ ایک شعر مین نہایت آسانی سے ادا کر دیا مثلاً

ناکردہ گناہون کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہون کی سزا ہے

غالب ترا احوال سنا دین گے ہم انکو | وہ سن کے بلا لین یہ اجارہ نہین لیتے

غالب کے اکثر اشعار ذو معنی ہین اس لئے ان کے مضمون مین بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق | ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب کا معاصرین سے موازنہ

غالب اپنے معاصرین مین ذوق اور مومن سے بہت بڑھے ہوئے ہین۔ لیکن سلاست و آمد مین ذوق کا پلہ بھاری ہے۔ اور مومن کی زبان ان سی بہتر ہے۔ ان کی فلسفیانہ شاعری کا مقابلہ براؤنگ سے ہو سکتا ہے، وہ بھی روح کا تجزیہ کیا کرتا ہے۔ مگر غالب روح مین اتنی دلچسپی نہین لیتے جتنا کہ وہ زندگی کے رموز اور اسرار کے انکشاف مین سرگرم ہین۔ اور اپنی یاس انگیز اور حسرت خیز شاعری مین (Heine) ہین کا مدمقابل ہے لیکن بہت موزون ہوگا اگر غالب کو اردو ادب کا گرٹھے (Goethe) کہا جائے۔

تلامذہ

غالب کے تلامذہ مین حسب ذیل بہت مشہور ہوئے۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشان۔ مجروح۔ سالک۔ حالی۔ زکی۔ علوی۔ تفتہ۔ عزیز۔ مشاق۔ جوہر۔

مجروح

میر مہدی مجروح میر حسین نگار کے لڑکے تھے۔ غدر مین دلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے۔ بعد غدر پھر دلی آئے اور نواب حامد علی خان والی رامپور کے دربار مین وظیفہ خوار ہوئے۔ مجروح کے کلام مین آمد۔ صفائی۔ سلاست۔ بدرجہ اتم ہے چھوٹی چھوٹی بحرون مین خوب طبع آزمائی کرتے ہین ان کے کلام مین ندرت نہین ہے تاہم کمزوریون سے پاک ہے اور استادانہ رنگ جھلکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء مین انتقال کیا

سالک - مرزا قربان علی سالک نواب مرزا عالم بیگ کے لڑکے تھے۔ حیدرآباد مین پیدا ہوئے۔ ابتدا مین قربان تخلص کرتے تھے۔

ن خان کے انتقال کے بعد غالب کو غزل دکھانے لگے اور سالک تخلص اختیار کیا۔ ایّام غدر مین دلی چھوڑ کر الور چلے گئے اور عرصہ تک
ان وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد حیدرآباد مین محکمہ تعلیم مین سررشتہ دار ہوگئے۔ اور رسالۂ مخزن الفوائد کی اڈیٹری بھی کی۔ ان کا
وان موسوم بہ نیجار سالک ہے ۱۹۰۳ء مین حیدرآباد مین انتقال کیا۔ مثل مجروح کے انکے یہان بھی تازگیٔ مضمون کی کمی ہے۔ رفعتِ
ل۔ اور آمد ان کے کلام مین بہت ہے۔ دلی کی بربادی پر سالک شہرآشوب اور غالب کا مرثیہ بہت مشہور ہے

زکی — نواب سید محمد زکریا خان رضوی المتخلص بہ زکی۔ ان کے والد نواب سید محمد خان اور نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خان معظم جنگ
سرور یہ دونون صاحب دیوان اور مصنف تھے۔ ان کے نانا نے ایک تذکرہ اُردو شعرا کا لکھا ہے۔ زکی اُردو فارسی۔ عربی کے
لم تھے۔ طبابت اور قانونِ تصوف مین بھی دستگاہ تام رکھتے تھے۔ نجوم۔ موسیقی اور خوشنویسی مین ماہر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت
[illegible] ان کے معلم رہے۔ شاعری مین غالب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ غالب سے ان کے خاندانی تعلقات بھی تھے۔ غالب
[illegible] ایک سند بھی دی جو ان کے دیوان مین موجود ہے۔ بہت پرگو شاعر تھے۔ مشاعرون مین نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔
[illegible] کے کلام کی بہت سی خصوصیات ان کے ہان پائی جاتی ہین غرض ان کو اُستاد تسلیم کیا گیا ہے۔ رفعت خیال۔ پروازِ تخیل ان
[illegible] مین خاص طور سے نمایان ہے۔ ایّام غدر مین ان کو بھی مثل دیگر شعراء کے دلی کو خیرباد کہنا پڑا اور گورنمنٹ کی ملازمت اختیار
[illegible] مین ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء مین پنشن لی ۱۹۰۳ء مین انتقال کیا
زکی کے دیوان ان کے حین حیات ہی مین طبع ہوگئے تھے اور یہ زکی کی شاعری کی زندہ یادگار ہے۔ سید احمد صاحب مؤلف
[illegible] آصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول ان کے مشہور شاگرد ہین

درخشان — نواب ضیاء الدین خان نیّر درخشان۔ درخشان اُردو مین اور نیّر فارسی مین تخلص رکھتے تھے۔ یہ غالب کے جانشین
خیال کئے جاتے ہین۔ نیّر بہت زبردست نقاد تھے۔ بڑے عالم اور منطقی تھے۔ لوگ ان کی نہایت وقعت و احترام
[illegible] مشہور مورخ الیٹ (   ) کو انھون نے تاریخ لکھنے مین بہت مدد دی۔ ان کے لڑکے نواب شہاب الدین خان
ثاقب۔ غالب کے بھانجے تھے۔ نیّر بہت ہی ہوشیار شاعر تھے۔ مگر عین عالم شباب مین قضا کر گئے۔ نواب مرزا سعید الدین خان
طالب ان کے دوسرے لڑکے تھے۔

تابان — مسٹر شجاع الدین خان تابان ثاقب کے بڑے لڑکے اور نیّر کے پوتے تھے شادان اور داغ کے شاگرد تھے۔ مرزا باقر علی خان
کامل یہ غالب کے متبنّی مین۔ انکی لڑکی سے تابان کی شادی ہوئی تھی۔ نواب مرزا سراج الدین احمد خان سائل ثاقب
کے دوسرے لڑکے اور نیّر کے پوتے ہین۔ داغ کے بہت مشہور شاگرد اور اپنے وقت کے مسلم الثبوت اُستاد ہین

آزردہ — مولوی مفتی صدر الدین خان آزردہ صدر الصدور تھے اور اپنے زمانہ کے زبردست عالم تھے۔ مولانا شاہ
عبدالعزیز اور مولوی فضل امام سے تعلیم حاصل کی۔ عربی فارسی کے جیّد عالم تھے۔ اُردو پر کامل عبور تھا۔ نواب
لطف علی خان والی رامپور اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی کے اتالیق رہے اور سرسید احمد خان نے بھی انکے سامنے زانوئے ادب

تہ کیا تھا۔ علم سے ان کو خاص شغف تھا اور اس درجہ انہماک کہ عدالت کے کام کے بعد اکثر تشنہ کامان علم کو سیراب کیا کرتے تھے۔ مومن
غالب۔ صہبائی۔ ذوق۔ شیفتہ۔ درخشان سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ عربی۔ فارسی اور اردو مین شعر کہتے تھے۔ اردو
مین پہلے شاہ نصیر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ پھر مرحوم اکبرآبادی اور ان کے بعد میر ممنون کے شاگرد ہوئے۔ ان کے اشعار سلیس صاف
اور موثر ہین۔ اردو شعرا کا ایک تذکرہ موسوم بہ "تذکرۂ آزردہ" بھی یادگار ہے۔ لیکن یہ شاعری اردو کی وجہ سے اس قدر مشہور
نہین ہے جتنے کہ اپنے اثر اور رسوخ کی وجہ سے۔ ۱۸۶۸ء مین دلّی مین انتقال کیا۔

مومن

حکیم مومن خان مومن۔ حکیم غلام نبی خان کے بیٹے تھے۔ ۱۲۱۵ھ مین پیدا ہوئے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر
علیہ الرحمۃ سے عربی کی کتابین پڑھین جب استعداد درست ہو گئی۔ تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خان اور حکیم غلام حسن
خان سے طب کی کتابین پڑھین۔ اور انھین کی زیر نگرانی۔ نسخہ نویسی کی

مومن خان کو بچپن ہی سے شاعری کا چسکا پڑ گیا تھا۔ انکی ذہانت اور حیرت انگیز حافظے نے ان کو شاعری مین بہت
مدد دی۔ یہ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ نجوم اور رمل مین بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مزاج مین وارفتگی اور شوریدگی
درجہ تھی شہر مین بانکون مین آپ کا شمار تھا۔ رنگینی طبع و رنگین مزاجی کے ساتھ خوش وضع اور خوش لباس آدمی تھے۔ غزل دل
آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ مگر یہ رشتہ شاگردی بہت جلد منقطع ہو گیا۔ مومن بہت خود
مغرور تھے۔ اساتذہ سابقہ کا نام اکثر تحقیر سے لیتے تھے۔ میدان شاعری مین اپنے سے زیادہ کسی کو شہسوار نہ سمجھتے تھے اور اپنے
معاصرین مثلاً ذوق اور غالب کو خاطر مین نہ لاتے تھے۔ انھین وجوہ سے قلعہ معلی مین کچھ زیادہ اعزاز نہ پایا اور نہ کبھی اُسکی پروا کی۔

تصنیف

آپکا ایک دیوان اردو ان کے شاگرد رشید شیفتہ نے ترتیب دیا اور ۱۸۴۶ء مین کریم الدین مصنف تذکرہ
شعراء ہند نے شائع کیا۔ علاوہ دیوان کے ان کی چھ مثنویان بھی انکی یادگار ہین۔ ایک مثنوی جہادیہ ہے جو مومن
لکھی تھی جب ان کے پیر و مرشد سید احمد شہید سکھون سے جہاد کر رہے تھے۔

خصوصیات کلام مومن

مومن اپنی رفعت خیالی۔ پرواز تخیل کے لئے مشہور ہین۔ ان کی تشبیہ اور استعارے نگاہ
عوام سے بالا ہین۔ ان کے اشعار مین بلندئ خیال اور حقیقی شاعری کا خلاملا بہت ہے۔

ان کے کلام مین عشق کی اصلی چاشنی اور شاعری کی حقیقی حلاوت کا اجتماع بطریق احسن ہے۔ مومن کے یہان غیر مانوس استعارے
اور تشبیہ کی کمی ہے۔ غالب کی طرح مومن نے بھی فارسی ترکیبین۔ محاورے اور الفاظ بے تکان استعمال کئے ہین۔ مگر ہمارے نزدیک
اکثر انکی "فارسیت" نے ان کے اشعار کو پھیکا کر دیا ہے۔ اور اس میدان مین یہ غالب سے سبقت نہ لیجا سکے

ان کی مثنویان ادب اردو کی سرمایۂ ناز ہین جو بہت درد انگیز اور حقیقی جذبات سے پُر ہین۔ اور عاشقانہ تاثرات اور
محاکات سے لبریز ہین۔ ان کی مثنویان اردو کی مشہور مثنویون سے ہم پایہ ہین۔ ان کی کلیات مین قصائد بھی ہین۔ جو اپنے رنگ مین
بلند رتبہ رکھتے ہین۔ مگر انھون نے صلہ کی امید پر ارباب دنیا کی مدح مین کبھی قصیدہ نہین کہا۔ مومن کو تاریخ گوئی مین بھی کافی مشق تھی

آزاد نے مومن کے کلام پر حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔

"ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین بہت عالی ہین" آگے چلکر لکھتے ہین "معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہین۔ اس واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اسکا انداز جرأت سے ملتا ہے۔ اکثر اشعار مین ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہین۔ اور اس ہیر پھیر سے شعر مین عجیب۔ لطیف معانی پیدا کرتے ہین۔ اکثر عمدہ ترکیبین اور نادر تراشیدہ فارسی کے استعارے اور اضافتین اردو مین استعمال کرکے کلام کو نمکین کرتے ہین" مومن خان کے ہمعصرون مین مبلغ فکر کے موافق لطافتین اور نزاکتین پیدا کرنے مین مرزا غالب نے نمایان حصہ لیا ہے۔ مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگار غالب مین ایک موقع پر تسلیم کیا ہے۔ مومن خان مرحوم اس خصوصیت مین مرزا سے بھی سبقت لے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن خان نے جس قدر اسالیب بیان مین نزاکت اور لطافت پیدا کر دی ہے۔ وہ اُنکی ذہانت اور جولانیٔ طبیعت کی تماشا گاہ ہے ان کی طرز ادا مین ایک بات اور بھی ہے جسکو مولانا شبلی نے شعر العجم مین خصوصیات غالب مین بیان کیا ہے۔ کچھ شک نہین کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ہین مگر مومن کے کلام مین بھی یہ بات بہت نمایان ہے کہ اکثر موقعون پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہین، جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقع ہوتا ہے جہان سننے والے کا ذہن خود بخود اُن اجزا کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے۔ مومن کو اس طرز کا اُستاد مانا گیا ہے۔ حیرت۔ نسیم اور تسلیم اس طرز کے علمبردار ہین

ارشد تلامذہ ان کے مشہور شاگرد تسکین۔ وحشت۔ نواب قیصر۔ نسیم اور شیفتہ خصوصاً قابل ذکر ہین نمونہ کلام یہ ہے:-

شب وصل آپ کا عذر نزاکت — بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جان سے

نہ جانے کیون دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی — بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

یارب وصال یار مین کیونکر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

جانا حرام ہجر بتان مین تو کیا گناہ — پیر مغان شراب ہے شیشہ مین سم نہین

خار بستر پہ شب ہجر بچھاؤن کیونکر — دل مین تو ہے وہ گل اندام اگر بر مین نہین

تو کہان جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے — ہم تو کل خواب عدم مین شب ہجران ہونگے

شب ہجر مین کیسا ہجوم بلا ہے — زبان تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اشک فغان کی ہائے رقیب آفرینیان — محشر نے خفتگان زمین کو جگا دیا

وہ علی الرغم عدو مجھ پر کرم کرتے ہین — ہے ستم لطف کے پردے مین ستم کرتے ہین

چارہ گر اس کی خطا کیا مرے تن مین نہ رہا — خون اتنا کہ سر نشتر فصاد بھرے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہین صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھے اپنی نظر نہ ہو جائے

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

بجھ گئی اک آہ مین شمع حیات — مجھ کو دم سرد نے ٹھنڈا کیا

ڈوبی ہجوم اشک سے کشتی زمین کی — ماہی کو اضطراب ہوا جوش آب مین
پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے — آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا
یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا — مین الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
جیب درست لائق لطف و کرم نہین — ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہین
دشنام یار طبع حزین پر گران نہین — اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
درد ہے جان کے عوض ہو رگ و پے مین ساری — چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا
اُلجھا ہے پاؤن یار کا زلف دراز مین — لو آپ اپنے دام مین صیاد آگیا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہین ہوتا
جذب دل اُسے کھینچ کے لائے تو کہان لائے — جو غیر کا گھر ہے وہی مسکن ہے ہمارا

قطعہ

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و ممنون　　ہوئی احسان سے پر اصلاح پہ طبیعت میری
پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض　　طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب　　استادون ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
فضل و ہنر ذات پہ ہے جنکی تمام　　مانتے ہین وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر مین بزم انشا　　کرتے ہین اہل سخن وقعت و عزت میری

فراق: ثنا اللہ خان فراق تخلص، حکیم ہدایت اللہ خان ہدایت کے بھتیجے تھے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد رشید، علم طب مین بھی دستگاہ تام رکھتے تھے۔ اور مشہور اطبا، مین شمار تھا فراق بھی دربار ظفر کے شعرا مین سے تھے۔ اسی سے زیادہ حال نہین ملا اور نہ سال وفات کا پتہ چلا نہ انکے تلامذہ معلوم ہوسکے۔ مصحفی اپنے تذکرہ مین لکھتے ہین "جوان حلیم و سلیم، خوش فکر و شیرین گفتار، شعراز خواجہ میر درد بلکہ ذات شریف را ہمیشہ می کرد۔ آخراً خرہ پیش حکیم حقیر تحصیل علم طب کردہ نام بطبابت آوردہ" چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہین۔

جون ریگ رواں خانہ نشین ہون مین اُنسے　　نے قصد وطن کا نہ ارادہ ہے سفر کا
دل تھا منا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ　　ساغر کو دیکھتا کہ مین شیشہ سنبھالتا
صاف دلکو کیا اور داغ جگر کو دھویا　　کام کیا کیا نہ میرے دیدۂ تر سے نکلا
ہر غنچہ مین بو ہے تری ہر گل مین ترا رنگ　　جس پر بھی تری شکل و شمائل نہین معلوم
مجنون کے سواد یکھیے اب دشت جنون مین　　ہو کون فراق اپنے مقابل نہین معلوم

عیش: حکیم آغا جان عیش تخلص کرتے تھے۔ کہن سال، مشاق، اور زندہ دل شاعر تھے۔ محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہین۔
"بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ، صاحب خلاق، شیرین کلام، شگفتہ صورت شعر کا عشق تھا۔ طبیعت ایسی ظریف اور بذلہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہین۔ غزل بصفائی کلام، شوخیِ مضامین اور حسن زبان سے پھولونکی جھڑی ہوتی تھی"

عیش۔ غالب کی دقت پسندی کے نہایت شاکی تھے۔ ایک دفعہ اجمیری دروازہ مین مشاعرہ ہوا۔ انھون نے غزل طرحی میں قطعہ پڑھا اور مرزا پر چوٹ کر بیٹھے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھین یا خدا سمجھے

اس بیجا حملہ نے اساتذہ کے دلون مین رنجش پیدا کردی مگر رفتہ رفتہ صفائی ہوگئی۔ ایک بار قلعہ مین مشاعرہ منعقد غزل تھی۔ یار دے بہار دے، روزگار دے۔ عیش اور ذوق دونون اُستادون کی غزلین ہوئین جن مین شمع کا غزل میں باندھا اور خوب باندھا۔

بسم اللہ

نگار

ایڈیٹر

فہرست مضامین ماہ فروری سنہ ۱۹۳۰ء

ایک تصویر صفحہ ۰

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد۔ ۱۷ | فروری سنہ ۱۹۳۰ء | شمار۔ ۲

ملاحظات

کمبلپور سے واپس ہوتے ہوئے، جب مین ۲۰ر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو لاہور آیا، تو یہ خیال بھی دل مین جاگزین تھا کہ اگر لی فضا نے کسی حیثیت سے بھی مساعدت کی تو مین کانگرس کی شرکت کا بہانہ کرکے رختِ سفر کھول دونگا اور کم از کم ایک ہفتہ تک زمین کا پوری آزادی نشاط کے ساتھ مطالعہ کرونگا جس کی زیارت کا اب سے تقریباً ۲ سال قبل موقعہ تو ملا تھا لیکن حالت وافسردگی مین ۔۔۔ مگر جس وقت مین وہان پہونچا، کثیف ابر محیط تھا، اور بارش نے راستون کی تمام عفونتون اور گندگیون صورت مین پیش کر رکھا تھا۔ چونکہ کثافت سے مجھے غیر معمولی تنفر ہے اور میرے لئے ایسے راستون پر ایک قدم چلنا بھی دشوار ہوتا ہے، اس لئے یہان پہونچتے ہی تنغص و استکراہ کی کیفیت پیدا ہوگئی اور جس وقت فلیمنگ روڈ کی غلاظتون سے میرا زرنے لگا تو حالت بالکل ناقابل برداشت ہوگئی۔ مین اسٹیشن واپس ہی جا رہا تھا کہ دفعتہً مسٹر لطیفی بی۔ اے ملگئے اور لودھیانہ کی ایک شام اور اُسکی صحبت ملیح کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، مینے واپسی کا ارادہ ملتوی کردیا اور رفیعی اجمیری کی فرودگاہ تک جناب اختر شیرانی کے ایک مہمان کی حیثیت سے آخرکار پہونچ ہی گیا

مسٹر لطیفی سے جو کانگرس مین ڈلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہونے والے تھے، تمام اُن طیاریون کا حال معلوم ہوا جو کانگرس کو کامیاب بنانے کے لئے اہل لاہور کی طرف سے عمل مین آرہی تھین، لیکن اس وقت میرے سامنے صرف ایک ہی حقیقت تھی

اور وہ یہ کہ موسم کی ناگواری اور سردی کی شدت حقیقتاً بلائے بد ہے اس لئے مستقبل کی دلچسپیوں پر حال کی اذیتیں غالب آئیں اور دوسرے ہی دن مین نے کھلا ہوا بستر پھر لپیٹ لیا۔ علاوہ اس کے یوں بھی مین اپنی شرکت کانگرس کو کوئی اہمیت نہ دے سکتا تھا کیونکہ مجھے نہ اس کے ممبر ہونے کا فخر حاصل ہے، نہ ڈلی گیٹ بننے کا امتیاز۔ رہا معمولی تماشائی کی حیثیت سے جانا، سو اس کو بھی طبیعت نے گوارا نہ کیا اور اپنے ذرائع معلومات کو صرف اخباروں کے بھروسہ پر چھوڑ کر واپس آگیا

اس تمہید سے غالباً یہ رائے قائم کیجائے گی کہ مجھے کانگرس سے دلچسپی نہیں ہے، جہانتک شرکت کا سوال ہے یہ رائے یقیناً صحیح ہے لیکن جس حد تک معاملات کا تعلق ہے، یہ رائے بالکل غلط ہے۔ گو مین کانگرس مین شریک نہین ہوا لیکن مین نے اس کی ہر کارروائی کو پڑھا، اس کے تمام مدوجزر پر نگاہ رکھی اور خود بھی ایک رائے قائم کی کہ جو کچھ وہان ہوا وہ کس حد تک جائز و درست ہے اور کس حد تک ناروا و غیر قابل عمل

مین اس ماہ کے ملاحظات مین اسی پر اظہار خیال کرونگا اور ناظرین نگار کے سامنے ملخصاً وہان کی کارروائی کو پیش کر کے اپنی ذاتی رائے بھی دونگا

قبل اس کے کہ آپ لاہور کانگرس کی کارروائی پر کوئی نتیجہ طلب نگاہ ڈالین ضروری ہے کہ گزشتہ سال کے سیاسیات پر غور کرلین۔ نہرو رپورٹ کی تکمیل کے بعد دو پہلو قابل غور پیدا ہو گئے تھے ایک قلیل جماعتوں کا اختلاف اور دوسرے کلکتہ کانگرس مین گاندھی جی کے اُس مصاف طلب رزولیوشن کا پاس ہو جانا کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک حکومت نے نہرو رپورٹ کے اصول پر ڈومی نین ہوم رول ہندوستان کے لئے منظور نہ کیا تو پھر کانگرس کا مطالبہ "کامل آزادی" ہوگا

نہرو رپورٹ کے واضعین کا جو مقصود بھی رہا ہو، لیکن اس سے انکار نہین ہوسکتا کہ سائمن کمیشن کے مضرت رسان نتائج کو اسنے ضرور بڑی حد تک دور کر دیا اور حکومت نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ باوجود قلیل جماعتوں کے اختلاف کے بھی، نہرو رپورٹ پر سائمن کمیشن کے نتیجہ سے علیحدہ ہو کر غور کرنا ضروری ہے، چنانچہ لارڈ ارون کا سفر انگلستان، وہان سے واپس آکر انکا ہمدردانہ، امید افزا پیام، گول میز کانفرنس کے انعقاد کی طیاریان، یہ سب نہرو رپورٹ ہی کے نتائج تھے۔ اب اسکے ساتھ اختلافی پہلو پر بھی نگاہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی بے نتیجہ نہین رہا اور حکومت نے اس سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی یعنی حکومت نے اپنی جگہ یہ سوچ لیا کہ جس وقت گول میز کانفرنس مین ہندوستان کی تمام جماعتوں کے نمایندے موجود ہون گے تو یقیناً وہ اختلاف بھی رونما ہوگا جو اس وقت تک دور نہین ہو سکا اور حکومت کے لئے بہت آسان ہوگا کہ وہ نہرو رپورٹ کو یہ کہکر رد کردے کہ سارا ہندوستان چونکہ اسپر متفق نہین ہے اس لئے یہ تجویز ناقابل عمل ہے

نہرو رپورٹ کے مرتب کرنے والے اس رمز سے واقف تھے اور اسی لئے انھون نے ولیسرائے سے گول میز کانفرنس کی شرکت کی اولین شرط یہ قرار دی کہ حکومت اس امر کا وعدہ کرے کہ وہان صرف ڈومی نین اسٹیٹس پر بحث ہوگی نہ اس امر پر کہ اُسکا دیا جانا مناسب ہے یا نہین۔ یعنی حکومت پہلے اصولاً ڈومی نین ہوم رول کا دیا جانا منظور کرلے۔ چونکہ ولیسرائے یہ وعدہ نہ کر سکتے تھے

اس لئے لاہور کانگرس کی فضا ایک تو اس لحاظ سے کہ وائسرائے اور لیڈرون کی یہ کانفرنس ناکام رہی، دوسرے اس حیثیت سے کہ کانگریس کے لئے جس صدر کا انتخاب ہوا وہ خود اشتراکیت پسند تھا اور تیسرے اس سبب سے کہ خود سرزمین پنجاب کا جوش و خروش حکومت کے خلاف کافی طور پر بڑھا ہوا تھا۔ کہے دے رہی تھی کہ اگر آزادی کامل کے مطالبہ کے علاوہ کوئی اور رزولیوشن پیش کیا گیا تو کبھی کامیاب نہ ہوگا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہستی کی طرف سے پیش کیا جائے۔ پھر اسی کے ساتھ اُس چیلنج کو بھی سامنے رکھئے جو کلکتہ کانگریس مین حکومت کو دیا گیا تھا تو معلوم ہوگا کہ گاندھی جی نے مطالبۂ آزادی کا جو رزولیوشن لاہور کانگریس مین پیش کیا تھا وہ ایک نوع کی سیاسی اخلاقی اور مقامی مجبوری تھی، ورنہ یہ حقیقت گاندھی جی سے بھی پوشیدہ نہین کہ ملک سول نافرمانی کے لئے طیار ہے اور نہ کسی اور ایسے مظاہرہ کے لئے جو آزادی کامل سے ملک کو قریب تر کردے

گاندھی جی کی اس تجویز کے خلاف ۲۶ ترمیمین پیش ہوئین لیکن جن پر اجلاس پر بحث و مباحثہ ہوا وہ صرف چند تھین۔

(۱) ایک ترمیم پنڈت مالوی جی کی تھی کہ فروری کے آخری ہفتہ تک آزادی کامل کے مطالبہ کو ملتوی کرکے آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعہ سے گول میز کانفرنس کی شرکت و عدم شرکت پر غور کیا جائے اور پھر جو فیصلہ ہو اس پر عمل ہو۔ مالوی جی کا مقصود یہ تھا کہ ایک موقعہ حکومت کو اور دیا جائے

(۲) دوسری تجویز چودھری فضل الحق کی تھی کہ اپریل تک مکمل آزادی کے اعلان کو ملتوی کرکے گول میز کانفرنس مین مطالبات کو کامیاب بنانے کی کوشش کیجائے

(۳) تیسری ترمیم مسٹر سوبھاش چندر کی تھی کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے فوراً مقابلہ کی ایک گورنمنٹ مقابلہ کی قایم کردیجائے

(۴) چوتھی ترمیم ڈاکٹر محمد عالم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اصل رزولیوشن سے اُس حصہ کو نکال دیا جائے جس مین وائسرائے کی کوششون کو بہ نظر استحسان دیکھنے کا ذکر تھا

(۵) پانچوین ترمیم یہ تھی کہ کونسلون کے بائیکاٹ سے میونسپل بورڈ کو علٰحدہ کردیا جائے

ان تمام ترمیمون سے صرف موخرالذکر ترمیم پاس ہوئی، باقی رد ہوگئین۔ اور اصل رزولیوشن گویا اس مفہوم کا پاس ہوا کہ "کانگرس کا نصب العین مکمل آزادی ہے اور اس کے حصول کے لئے کانگرس سول نافرمانی کے لئے ملک کو طیار کریگی، اسی کے ساتھ کونسلون، اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ سے کانگرس کے نمایندون کو نکل آنے کا حکم دیا گیا"

اب غور طلب امر یہ ہے کہ آیا کانگرس کا یہ رزولیوشن قابل عمل ہے یا نہین اور نیز یہ کہ کیا ایسی تجویز صورتِ حالات کے لحاظ سے مناسب قرار دیجاسکتی ہے یا نہین؟

میرے نزدیک مناسب یہ تھا کہ فی الحال مکمل آزادی کی تجویز گول میز کانفرنس کے انعقاد تک ملتوی کردیا جاتا اور وہین

یہ مطالبہ پیش کیا جاتا کہ اس کانفرنس مین صرف ڈومی نین اسٹیٹس پر بحث کیجائے اور برطانوی حکومت اس کانفرنس کی تجویز کو تسلیم کرے۔ اگر یہ دونون شرطین منظور ہو جاتین تو خیر، ورنہ کانفرنس کو چھوڑ کر چلے آتے اور بہ محل ایسا ہوتا کہ شاید اس کے بعد ہندوستان کے کسی فریق کو اختلاف نہ ہوتا اور موجودہ صورتِ افتراق پیدا نہ ہوتی۔ ایک تو یہ پہلو تجویز کا ہے جس کے لحاظ سے اسکو قبل از وقت کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا حصہ تجویز کا جو کونسلون وغیرہ کے بائیکاٹ کے متعلق ہے۔ وہ بھی میری رائے مین نامناسب ہے، کیونکہ اگر اس باب مین سارا ملک ہم آہنگ ہوتا تو کوئی نتیجہ پیدا ہو سکتا تھا، لیکن بحالت موجودہ اس سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہین ہو سکتا۔ کیونکہ کونسلون کی خالی جگہ کے لئے بیس امیدوار گورنمنٹ کو مل جائین گے اور اس طرح حکومت کو اور زیادہ تشدد کا موقعہ مل جائیگا

مقابلہ کی تدابیر مین اولین اصول یہ ہے کہ فریق مخالف کے ذرایع مخالفت کو امکان بھر ضعیف و محدود کر دیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ کونسلون مین سے کانگرس کے آدمیون کا چلا جانا، حکومت کے ہاتھون کو اور قوی بنا دینا ہے اور یہ مصالح جنگ کے بالکل خلاف ہے۔ گاندھی جی کا یہ فرمانا یقیناً اخلاق و صداقت کی دنیا مین عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا کہ جب مکمل آزادی کا عقیدہ اختیار کیا جاتا ہے تو کونسلون مین جانے کے بعد حلف وفاداری لینے کے کوئی معنی نہین رہتے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مصلحت اندیشی و ڈپلومیسی بالکل دوسری چیز ہے اور اس کا اقتضا یہی ہے کہ کونسلون پر پورا قبضہ قایم کیا جائے علی الخصوص اس وقت جب کہ خود ہم نے ابھی تک کسی آزاد گورنمنٹ کی تشکیل نہین کی ہے اور یہ بھی منجملہ اُن ذرائع کے ہے جو حصول مقصود تک پہونچنے کے لئے اختیار کئے جا رہے ہین۔ الغرض رزولیوشن کا یہ حصہ بہت مضرت رسان ہے اور اس سے ملک کو سخت نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے

بہر حال اس وقت ملک کی سیاسی حالت عملاً پہلے سے بہتر حالت مین نہین ہے گو اصولاً کیسی ہی اچھی ہو، کیونکہ باوجود کامل آزادی کے مطالبہ کے جو تمام جماعتون کا حقیقی مقصود ہے، اختلاف ہنوز باقی ہے اور سمجھ مین نہین آتا کہ ایسا کیون ہے، سوائے اس کے کہ اس کو ذاتی کدورتون اور انتقامی جذبات پر محمول کیا جائے۔ اعتدال پسند حضرات کے نزدیک کانگرس کا فیصلہ قبل از وقت ہے تو اس کو اتنا ہی کہنا اور سمجھنا چاہئے، نہ یہ کہ اُسے گمراہ کن ثابت کیا جائے۔ کیونکہ اس کے گمراہ کُن ہونے کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مطالبات مین کمزوری کا اظہار کرتی، لیکن جب اس نے اپنا مطالبہ وہ رکھا ہے جس سے ہندوستان کے کسی باشندہ کو اصولاً اختلاف نہین ہو سکتا تو پھر اسپر گمراہ کُن ہونے کا الزام کیونکر عاید ہو سکتا ہے

خلافت کانفرنس کی کارروائیان جسے بالفاظ دیگر علی برادران کانفرنس کہنا چاہئے، نہایت ہی مضحک مگر دلچسپ تھین اول تو اس مین شریک ہونے والے حضرات ہی بہت کم تھے اور جو ہوئے بھی اُن مین سے چند رجعت پسند لوگ تھے اور باقی علی برادران کی پارٹی کے۔ دو چار نمایندے جو موجودہ خلافت پالیسی کے مخالف تھے ان غریبون کو وہان سے نکال کر میدان اپنے لئے بالکل صاف کر لیا گیا تھا، لیکن پُر لطف بات یہ ہے کہ باوجود ان تمام کوششون کے بھی نتیجہ اُن کے خاطر خواہ نہ نکلا۔ سر شفیع، سر اقبال

وغیرہ نے اس شرط کے ساتھ خلافت کانفرنس مین شرکت کی تھی کہ وہان مکمل آزادی کا رزدلیوشن پاس نہ کیا جائیگا اور ارباب خلافت نے اس کا وعدہ بھی کر لیا لیکن جس وقت گول میز کانفرنس کے خیر مقدم کی قرارداد پیش کی گئی تو اس کی سخت مخالفت ہوئی اور آخر کار مجبور ہو کر مکمل آزادی کی شرط بڑھانا پڑی، دوسری تجویز یہ منظور ہوئی کہ تمام صوبون مین نیابت تناسب آبادی کے لحاظ سے ہو۔ اس تجویز کے بہتر ہونے مین کس کو گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ تجویز بھی بعد از وقت منظور کی گئی۔ اگر مسلمان اب سے ایک سال قبل ہی اس پر راضی ہو جاتے تو یہ اختلاف کیون رونما ہوتے اور اقلیت و اکثریت کا تصادم کیون ہوتا بہر حال ایک عمومی تبصرہ کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس وقت اصولاً تمام جماعتین تو متحد ہین لیکن عملاً ان مین اختلاف ہے، اور یہ اختلاف ایسا شدید نہین ہے کہ دُور نہ ہو سکے

مفاہمت و مصالحت کا صرف ایک ہی طریقہ ہوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ نرم گرم دونون فریق اپنی اپنی ضد سے باز آجاتے ہین اور ایک درمیانی صورت ایسی پیدا کر لیتے ہین جسے غرض مشترک قرار دیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک ضرورت اس امر کی ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کو پھر طلب کیا جائے اور وہان صرف عملی پہلوؤن پر غور کر کے کوئی پُرامن و صحیح راستہ حصول مقصود کا تلاش کیا جائے۔ گاندھی جی اور اُن کے رفقاء اچھی طرح سمجھتے ہین کہ اب ملک سِول نافرمانی کے لئے آسانی سے آمادہ نہین ہو سکتا اور وہ اپنی جگہ غور کر رہے ہین کہ کیا صورت اختیار کرنا چاہئے۔ اسی طرح مخالفین بھی متردد ہین کہ وہ کانگریس سے علیحدہ ہو کر کامیاب نہین ہو سکتے اور کوشان ہین کہ ملک کی صحیح رہبری کرین۔ اس لئے امید ہے کہ ان دونون فریقون کا یہ تردد کسی ایسے نقطہ پر لے آئیگا جہان دونون متفق ہو جائین گے۔ لیکن یہ صرف اسی حالت مین ممکن ہے کہ دونون جماعتون مین سے پہلے اُن ہستیون کو بالکل علیحدہ کر دیا جائے جن کا مقصود صرف تخریب و فساد ہے اور ملک کی اصلاح ان کا مقصود نہین۔ انھین ہستیون مین میرے نزدیک وہ انتہا پسند اور ناآزمودہ کار نوجوان بھی ہین جو انقلاب پسندی کا مفہوم صرف بدامنی پیدا کرنا سمجھ رہے ہین۔ ہندوستان کی حالت ہرگز اس کی مقتضی نہین ہے کہ سختی و تشدد سے کام لیا جائے اور بم پھینکنے کو صحیح تدبیر خیال کیا جائے۔ چنانچہ حال ہی مین ولیسرائے کے اسپیشل ٹرین کو بم سے صدمہ پہونچانے کی جو کوشش کی گئی وہ بجائے مفید ہونے کے مُضر ہے اور ایسے ناعاقبت اندیش لوگون سے تمام بہی خواہان ملک کو اظہار بیزاری کرنا چاہئے

اس ماہ کے نگار مین باب الاستفسار اور معلومات کے لئے جگہ نہ نکل سکی۔ ماہ آیندہ مین اس کی تلافی کی کوشش کی جائیگی پہلا مضمون حزین کے متعلق مولوی عبد المالک آروی کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس حصہ مین فاضل مقالہ نگار نے صرف حزین کی زندگی اور اس سے متعلق بعض تمدنی و سیاسی اشارات سے بحث کی ہے جو بجائے خود بہت مفید و کارآمد چیز ہے۔ آیندہ اشاعت مین اس کی شاعری پر ایک دلچسپ تبصرہ ہوگا۔ ہم جناب عبد المالک صاحب کے شکر گزار ہین کہ انھون نے اس مبحث پر کافی دلچسپ مواد فراہم کیا اور نگار کو اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا

چند راتین ایک فسانہ ہے جسے ہمارے قدیم کرمفرما جناب سید علی اکبر کاظمی بی اے (کیمبرج) نے تحریر فرمایا ہے۔ صاحب موصوف صوبۂ بہار کے ایک معزز خاندان کے فرد ہین اور وہان کے محکمۂ تعلیم مین اعلیٰ عہدہ پر سرفراز ہین۔ آپ کو اُردو زبان سے (باوجود اس بیگانگی کے جو ولایت کے طویل قیام کے دوران مین پیدا ہوجانا لازم ہے) بہت دلچسپی ہے، اس سے قبل بھی نگار مین آپ کے کئی فسانے شائع ہوکر پسند کئے جاچکے ہین

حقیقت منصور مولانا کیفی چریاکوٹی کا مضمون ہے، جو پوری کیفیت تصوف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے میرے نزدیک اس مین گفتگو کی کافی گنجایش ہے۔ عرصہ ہوا مین نے منصور کے متعلق بہ سلسلۂ استفسار اپنے خیالات ظاہر کئے تھے لیکن انکا تعلق صرف سیاست وشریعت سے تھا۔ روحانی کیفیات کے لحاظ سے مین نے کوئی گفتگو نہین کی تھی جسے آج مولانا کیفی پورا کر رہے ہین اور پورے مبالغہ کے ساتھ۔ یہ مضمون صاحبان ذوق وشوق کے لئے گویا "محفل قوالی" کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے، امید ہے کہ پسند کیا جائیگا

باہیہ خانم فسانہ نہین ہے بلکہ جناب ابن السبیل کا ایک تجربہ ہے منجملہ ان بہت سے دلچسپ تجربات کے جو ممالک غیر کی سیاحت کے دوران مین انھین حاصل ہوئے۔ ہمین امید ہے کہ ابن السبیل صاحب آیندہ بھی اس قسم کے واقعات سپرد قلم کرتے رہین گے جو حقیقتاً فسانون سے زیادہ دلچسپ ہین

جناب افسر امروہوی اس سے قبل مصحفی ومیر کا تقابل کرچکے ہین۔ اس مرتبہ انھون نے مصحفی کو سودا کے مقابل پیش کیا ہے۔ جناب افسر وہین کے رہنے والے ہین جہان مصحفی کا مسکن تھا اور شاعری مین بھی اس کے متبع ہین۔ اس مین شک نہین کہ مصحفی جس مرتبہ کا شاعر تھا اس کو ابتک بہت سے لوگون نے نہین سمجھا اور ضرورت ہے کہ ملک کے ارباب قلم کو اس موضوع پر لکھنے کی دعوت دیجائے۔ چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ع کا رسالہ اسی مبحث کے لئے مخصوص کردیا جائے اور کافی ضخیم نکالا جائے ماہ آیندہ مین ایک مفصل اعلان اس باب مین کیا جائے گا

"چند دن لکھنؤ سے باہر" میرا مضمون ہے جسے اپنے بعض مخلص احباب کے الطاف وعنایات کے ایک ناقص اعتراف کی حیثیت پیش کرنے کی جرأت کرتا ہون

"سیاح کی ڈائری کا تتمہ" وہی مضمون ہے جس کا وعدہ دسمبر سنہ ۲۹ع کے نگار مین کیا گیا تھا، معلوم نہین اس کا شکریہ سیاح کی خدمت مین بھیجا جانا چاہئے یا اُن کے نمایندہ کے پاس ——— مگر کیون نہ دونون کو شامل کرلیا جائے

نظمون مین جناب اختر شیرانی کی نظم اے عشق کہین لیچل، ایک ایسی والہانہ چیز ہے جس کو سننے کے بعد بجائے داد دینے کے ان پر رحم کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے آپ کے دل دکھانے سے کیا ہوتا ہے، جب تک وہی متوجہ نہ ہو جس کے عدم التفات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے جناب اختر اپنے عشق کو "وقف برندش" کا معمول بنانا چاہتے ہین۔ اس نظم کے اکثر بند اسقدر لطیف ہین کہ ان کو پڑھنے کے بعد بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے کہ کاشکے مین بھی

ان کو خیالی دنیا مین ان کی سلمائی فضامین ایک تلخ حقیقت کی حیثیت اختیار کر سکتا

دوسری نظم جناب رفیعی اجمیری کی ہے جس مین صنعت آہنگ سے کام لیا گیا ہے۔ صنعت آہنگ سے مراد یہ ہے کہ موضوع کے لحاظ سے ایسے الفاظ استعمال کئے جائین جو اس کی تصویر کھینچنے مین پوری مدد دے سکین۔ مثلاً میر انیس کا مشہور مصرعہ:

نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

اس مین ڈکارنا، ضیغم اور کچھار یہ تینون لفظ ایسے ہین جو مہیب صحرا سے ایک خوفناک شیر کے نکلنے کی تصویر کو پوری طرح ظاہر کر رہے ہین اگر ان ثقیل الفاظ کے بجائے ہلکے الفاظ یہان رکھدئے جائین تو کبھی مقصود حاصل نہین ہوسکتا۔ جناب رفیعی نے بھی جنگ کے لحاظ سے وہی الفاظ اس نظم مین استعمال کئے ہین جو جنگ کے وحشت و ہراس، خوف و دہشت وغیرہ کو بخوبی ظاہر کرتے ہین۔ اُردو اس رنگ کی نظمین بہت کم لکھی جاتی ہین

نظم "مشاہدات و واردات" ہمارے عزیز دوست مولوی سید علی اختر اختر کا عطیہ ہے۔ ناظرین نگار اس سے قبل بھی آپ کی نظمین بہت پسند کر چکے ہین اور اس مین کلام نہین کہ آپ کا حکیمانہ طرز ادا جو فطرت انسانی کے غایر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ یقیناً داد و ستایش کا مستحق ہے

غزلوں میں اس مرتبہ ایک غزل آپ کو ایک قدیم لیکن نگار کے لحاظ سے بالکل جدید ہستی ریاض خیرابادی کی نظر آئے گی۔ جناب ریاض کی ہستی تعارف و تقریب سے مستغنی ہے اور ہم سید امتیاز علی بی اے اسسٹنٹ اڈیٹر ہمدم کے ممنون ہین کہ انھون نے اپنی جیب سے ریاض کی یہ غزل نکال لینے مین مطلق کوئی مزاحمت نہین کی۔ مین جناب ریاض سے یہ استدعا نہین کرونگا کہ آیندہ کے لئے براہ راست کرم فرمائی کا شیوہ اختیار کرین، کیونکہ سوال کی خو مجھ مین کبھی پیدا نہین ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔ اس غزل مین ریاض کے بعض بعض شعر ایسے ہین جس سے ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ وہ زندگی اور تاثرات کے کس دور سے گزر رہے ہین — جناب سحر عظیم آبادی نے بھی بعض شعر خوب فرمائے ہین اور جناب فرخ بنارسی کے رنگ تغزل کے متعلق لکھنا اس لئے غیر ضروری ہے کہ ناظرین نگار اس سے آشنا ہو چکے ہین اور پسند کر چکے ہین

۱۹۳۶ء کا جو پروگرام نگار کی ترتیب و تہذیب کے متعلق طیار کیا گیا ہے اس کے متعلق مین کوئی تفصیل فی الحال دینا مناسب نہین سمجھتا لیکن وہ حضرات جنھون نے یقیناً غلط فہمی کی بنا پر میری تنقیدات کو عصبی رنگ کی چیز سمجھا، اتنی جگہ مطمئن ہو جائین کہ یہ سال مین نے اپنے ضغطۂ دماغی کے دور کرنے کے لئے "سن راحت" قرار دیا ہے بالکل اسی طرح جیسے یہودی روایات کے مطابق الوہم نے چھ دن تک کام کرنے کے بعد ساتوین دن کو "یوم السبت" قرار دیا تھا

میں ۷ر فروری ۱۹۳۶ء کو براہ قاضی پیٹ روانہ ہوکر ۸ر کو حیدرآباد پھونچونگا اور جناب ہوش بلگرامی کے دولت کدہ پر رسالہ عبدللہ قدیم میں قیام کرونگا۔

نیاز

شیخ محمد بن ابو طالب علی حزین لاہجی

مقدمہ

شیخ کے کلام پر جب ایک مبصر کی نگاہ پڑتی ہے، تو وہ کسی قدر غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ انہوں نے اپنا تمام سرمایۂ خیال غزلگوئی میں صرف کیا ہے، یوں تو آپ کے کلام میں غزلیات و قصائد بھی ہیں رباعیات و مثنوی بھی، لیکن جو برجستگی و حلاوت و لطافت آپ کی عشقیہ شاعری میں پائی جاتی ہے، وہ دیگر اصناف سخن میں نہیں لہذا آج کی صحبت میں، شیخ کے محاسن کلام میں زیادہ تر غزلیات کو لوں گا، اور بتاؤں گا کہ شیخ نے غزل گوئی میں کیا خصوصیت پیدا کی اور یہ کہ فارسی کے اکابر شعراء میں آپ کا کیا درجہ ہے ؟

قبل اس کے کہ اصل موضوع سے تفصیلی بحث کروں، زیادہ مناسب ہے کہ فارسی کی عشقیہ شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لوں، میرے نزدیک "غزل گوئی" ہی کا دوسرا نام "عشقیہ شاعری" ہے کیونکہ غزل میں وہی جذبات ادا کئے جاتے ہیں، جو ناہر عشق ہیں اس لئے لذت وصل، درد فراق، اضطراب محبت، پرستش حسن، مستی شباب، راز و نیاز، اور رموز خلوت و جلوت کو علوئے تخیل اور عذوبت بیان کے ساتھ پیش کرنا ایک اچھے غزلگو کا فرض اولین ہے۔ اور بنا براں عشقیہ شاعری پر بحث کرنے سے پہلے اگر خود "عشق" پر بھی لغوی، مذہبی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک نگاہ ڈال لی جائے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔

عشق کی لغوی اور مذہبی وضاحت

عشق ایک عربی لفظ ہے، جس سے معاشقہ، تعشق، عاشق وغیرہ مشتق ہیں، بعضوں نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ یہ عشقہ سے ہے، جس کے معنی لبلاب ہیں، لبلاب اس بیل کو کہتے ہیں جو اکثر درختوں کے اوپر پھیل جاتی ہے، اور جس درخت پر پھیلتی ہے اسے خشک کر دیتی ہے عشق کی بھی یہی حالت ہے، ہر چند یہ خالص عربی لفظ ہے، اور قدیم عربوں کی شاعری میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، چنانچہ ایک شعر ہے جسے مجنوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے +

تعشقت لیلی وھی غر صغیرۃ　　　وان کنت ابن سبع ما بلغت ثمانیا

ابو تمام کے حماسہ اور دوسرے قدیم عربوں کے کلام میں یہ لفظ پایا جاتا ہے، لیکن باینہمہ قرآن مجید نے اسے کہیں استعمال نہیں کیا، باوجودیکہ بعض قدیم شعرائے عرب کے کلام میں جو الفاظ و فقرے آئے ہیں وہ بجنسہ قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے، کہ قدیم عربوں کی معاشرتی زندگی میں عشق کا اخلاقی معیار ایسا پست ہو گیا تھا، جسے سنجیدہ زندگی، حسن اخلاق کی لطافت سنجیوں، اور محبت عفیف کی حقیقی شورشوں سے تعبیر کرنے کے لئے تیار نہیں تھی، لہذا قرآن مجید نے خالق و مخلوق کے عشقیہ رموز، عورت و مرد کے والہانہ جذبات محبت، باپ اور بیٹے کے عاشقانہ واقعات فدائیت بیان تو کئے لیکن کہیں

"عشق کا لفظ استعمال ہوا، خالق و مخلوق کے عشقیہ رموز کی جو پردہ دری کی جاتی ہے وہ ان الفاظ میں

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونہم کحب اللہ والذین اٰمنوا اشد حباً للہ (بقرہ)

اسی طرح جب بیٹے کے ساتھ باپ کے عشقیہ رمز کا انکشاف کیا جاتا ہے تو اس اسلوب سے اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الی ابینا منا

عام اصطلاح میں عشق کا جو مفہوم لیا جاتا ہے، قرآن مجید نے اسے بھی بیان کرتے ہوئے "حب" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے،

واذ قال نسوۃ فی المدینۃ امراۃ العزیز تراود فتٰہا عن نفسہ قد شغفہا حبا۔

الغرض قرآن مجید نے رموز عشقیہ کی توضیح میں عشق کے بجائے حب کا لفظ استعمال کیا، لیکن احادیث میں یہ لفظ پایا جاتا ہے، چنانچہ مشہور حدیث ہے، جسے مولانا جامیؒ نے بہارستان میں بھی نقل کیا ہے، من عشق و کتم و عف ثم مات مات شہیداً

عشق کی نفسیاتی تشریح

بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ عشق، شباب یا بہ الفاظ دیگر جذبۂ جنسی کی پیداوار ہے، اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو شعور جنسی کی مفصلہ ذیل بحث سے یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ ہر انسان میں علی قدر مراتب، معاشقہ کی صلاحیت موجود ہے، شعور جنسی جہاں تک طوفان خیز ہوگا ولولۂ عشق بھی اس حد تک بلا انگیز ہوگا، چونکہ جذبۂ جنسیت کا غلبہ عہد شباب میں ہوا کرتا ہے، لہذا عشق کا تسلط عہد شباب ہی میں ہوتا ہے۔

عمومیت عشق کے متعلق پروفیسر ولیم جیمس "مبادی نفسیات" جلد دوم میں عنوان "ارادہ" کے اندر ایک نہایت دلچسپ واقعہ لکھا ہے،

شورش عشق کو ایک خاص قسم کے جنون سے تعبیر کر سکتے ہیں جو بعض افراد پر طاری ہوتا ہے: ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ہر چند ہم لوگ صاحب ہوش و حواس ہی کیوں نہ ہوں، یہ شوریدگی عشق محبوب کے ساتھ حقارت و نفرت کے باوجود قائم رہتی ہے، الفیری خود اپنی پرزور متضادانہ قوت اور ایک خاتون کے ساتھ غیر معمولی تہیج عشقیہ کے واقعات لکھتا ہے۔

"میں ایک بار ایسی کربت زا کیفیت میں مبتلا ہوا جو میری نظر میں نفرت انگیز معلوم ہونے کے باوجود مجھ پر طاری رہی، اور اگر یہ کچھ عرصہ تک یونہی قائم رہتی تو یا تو میں بتلائے جنون ہو جاتا، یا میری زندگی کے دن ہی ختم ہو جاتے، میں اس ذلت انگیز سلسلہ میں جنوری ۱۷۷۵ء کے اخیر تک مبتلا رہا، اس وقت تک یہ شعلہ میرے دل و جگر میں پنہاں تھا، اب یہ نہایت شدت کے ساتھ شورش افزا معلوم ہونے لگا، ایک دن شام کو جب میں تفریح گاہ سے واپس آیا، جہاں میں کئی گھنٹے تک اس محبوبہ خاتون کے ساتھ جو میرا مطمح نظر بھی تھی اور مرکز نفرت بھی، بیٹھا رہا، تو مکان آکر میں نے عزم صمیم کر لیا کہ اب ہمیشہ کے لئے اسکی محبت سے آزاد ہو جاؤں گا، میں اپنی خصوصیت عادات اور سخت گیری سے واقف تھا، میں نے سوچا کہ اگر فلاں حکمت عملی کی جائے تو میں اس آزار روحانی سے نجات پالوں گا، میں نے تہیہ کر لیا کہ اب گھر سے باہر ہی نہ جاؤں گا، میرا گھر اس خاتون کے مقابل تھا، میں نے یہ بھی ارادہ کر لیا کہ اپنی کھڑکی بھی نہ کھولوں گا، اور نہ اس خاتون کو آمد و رفت کے وقت دیکھوں گا، نہ اس کی آواز سنوں گا یہانتک کہ خاتون کی نسبت آمیز یاد دہانی اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اقدام محبت میرے قلب میں عشق و محبت کی بقا نہیں رکھ سکتا، میرا ارادہ راسخ ہو گیا تھا کہ میں یا تو خود کو اس آزار محبت سے آزاد کر لوں گا، یا جان دیدوں گا، میں نے اپنا یہ ارادہ اپنے ایک گہرے دوست پر ظاہر کیا،

جو مجھ سے گہری محبت رکھتا تھا، اور میں اسکی تعظیم و تکریم کرتا تھا، اسے میری اس دماغی حالت پر بہت افسوس آیا، لیکن اس نے میری پر درد حالت کا نظارہ ملال آگیں نہ کرنے کی غرض سے، اور مجھے اس عمل سے باز رکھنے کی ترغیب ناممکن دیکھکر، میرے یہاں آمد و رفت ہی ترک کردی، چند سطور میں میں نے اسے اپنی اس تدبیر کا حال لکھا، جو میں نے خود جنون عشق سے شفا پانے کے لئے اختیار کی تھی، اور اپنی پختگی ارادہ کے ثبوت میں پیشانی کے بال کاٹ ڈالے، میں نے عمداً اسے کاٹ دیا تھا تاکہ باہر نہ جا سکوں، چونکہ اس وقت گداگروں اور ملاحوں کے سوا، دوسرا آدمی چھوٹے چھوٹے بال رکھکر پبلک میں نہیں آتا تھا، میں نے اپنے ایک شاگرد کو متعین کیا اور اسے قسم دیدی کہ وہ میرے ارادہ اور تدبیر میں میری مدد کرے، اس صورت سے میں اپنے گھر میں محبوس رہا، اور ہر قسم کے تعلقات ترک کردئے، اس طور سے پندرہ دن اتم اور نالہ و بکا میں بسر ہوئے، میرے بعض دوست میری ملاقات کیلئے آئے اور نہیں میری حالت پر رحم آیا، ہر چند میں نے اسکا شکوہ نہیں کیا لیکن انھوں نے میری شکل و صورت سے میرے آزار کا پتہ لگا لیا، کچھ پڑھنے کے ارادہ سے میں نے اخبار کا مطالعہ شروع کیا جس کے ورق میں نے پڑھ ڈالے، لیکن ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا، میں اسی حالت میں دو ماہ یعنی مارچ ۱۸۲۸ء تک مبتلا رہا، اس دور میں میری کیفیات ایسی تھیں جس کے ڈانڈے جنون سے ملے ہوئے تھے، لیکن اس کے بعد ہی میرے دماغ میں ایک جدید خیال پیدا ہوا، جس نے میرے تہیجات غم و کربت میں سکون پیدا کرنا شروع کیا "

جیمس لکھتا ہے کہ یہ شاعری کا خیال تھا جو اس حیات فرسا مرض کے زمانہ میں پیدا ہوا، الفیری کہتا ہے کہ اس خیال میں جو میری فلاح مضمر تھی وہ یہ تھی کہ میں بتدریج آزار محبت سے رہا ہونے لگا، اور میری قوت مدرکہ میں جو ایک عرصہ سے خفتہ اور معطل تھی بیداری کے آثار ظاہر ہونے لگے میں نے اب اسکی ضرورت نہ سمجھی کہ میں خود کو کرسی سے بندھا ہوا رکھوں، تاکہ اپنا گھر چھوڑ کر اپنے محبوبہ خاتون کے مکان میں نہ جا سکوں، تمام خیالی طریقوں میں میں نے جو اختیار کیا زیادہ دلچسپ یہ تھا کہ عید کے اخیر میں، بھیس بدل کر میں تھیٹر میں چلا آیا، اپالو کی طرح بیٹھ کر ایک ستار پر میں اپنے ہی بنائے ہوئے اشعار گانے لگا، اس قسم کی بے حیائی میرے چال چلن کے بالکل مخالف تھی، لیکن میری طرف سے اسکا عذر ہو سکتا ہے، کہ یہ تمام مناظر میری اس ظالمانہ شوریدگی عشق کی مزاحمت کے لئے تھے، میں نے محسوس کیا کہ غرض عشق اور میرے درمیان ایک ناقابل طے حد بندی قایم ہو جائے اور میں نے دیکھا کہ وہ قوی ترین "شرم" تھا جس کے روبرو مجھے بے نقاب ہونا چاہیے۔

باڈوین فرانس کا مشہور نفسیات داں گزرا ہے، ایڈن اور سیڈر پال نے اس کی عالمانہ کتاب "تصریح نفسیات" کا فرنچ سے انگریزی میں ترجمہ کیا، مصنف "تخیل ارتقائے شعور" کے زیر عنوان مفصلہ ذیل نفسیاتی تحقیق پیش کرتا ہے:۔

ایک عرصہ بعد تک یہ مسئلہ متداول تھا کہ شعور (Instinct) ناقابل تغیر ہے، اس کے بعد منطقی ترقی نے ثابت کیا کہ جب ایک ہی جنس سے دوسری جنسیں وجود میں آتی ہیں اور جب ہر جنس اپنی مخصوص حیات شاعرہ بھی رکھتی ہے، تو یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے، کہ "شعور" مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے، اسپالڈنگ نے اس مسئلہ کو اس زینہ تک پہونچایا کہ چند شعور یں زندگی کے ایک خاص مرحلہ پر رونما ہوتے ہیں، اگر اس دور میں اس شعور کو روک کر ظاہر نہ ہونے دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر وہ ظاہر نہ ہوگا، ایک حد تک اسپالڈنگ کا یہ خیال ولیم جیمس کے "اصول شعور" کی بنیاد تھا، جیمس اپنے قانون عارضیہ Law of Transitoriness کے

ماتحت لکھتا ہے، کہ بہتیری شعوری کیفیات حیات کے ایک خاص دور میں پختگی حاصل کرتی ہیں اور پھر فنا ہو جاتی ہیں، تھارنڈک اس خیال میں تعمیم پیدا کر کے کہتا ہے، کہ ہر ایک شعور اگر ماحول کی مزاحمت سے، وقت پر ظاہر نہ ہو سکے تو فنا ہو جائے گا۔ ولیم جیمس اپنی کتاب "مبادی نفسیات" میں انسانی شعور کی ایک فہرست دیتا ہے، اور انہیں "قانون عارضیہ" کے ماتحت رکھتا ہے، اگر ایک بچہ گھوڑے کی سواری، مچھلی کا شکار، اور بندوق کا استعمال اس وقت نہ سیکھے جب عموماً یہ شعور یں پیدا ہوتی ہیں تو پھر آئندہ زندگی میں ان فنون کا حصول، باوجود دستیابی موقعہ بھی دقت طلب ہوگا، اسی طرح زندگی کے ایک خاص دور میں مصوری و صنعت کا ذوق پیدا ہوتا ہے، بڑی حد تک موجودہ اصول تعلیم کی کامیابی جنہیں بچوں کے فطری اذواق کا لحاظ رکھا گیا ہے، نفسیات کے اسی اصول کی مرہون منت ہے، جہاں ہم لوگ واقعات کی بنا پر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ شعور کو دبا دیا جاتا ہے، وہاں نفسیاتی تحقیق اس عقیدہ کی بھی موئد ہے، کہ شعور دوسری شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

شعور جنسی (Sexual Instinct) کے متعلق فرائڈ اور جیمس کے خیالات یکساں ہیں، فرائڈ نے شعور جنسی کی بہتیری متغیر صورتیں پیش کی ہیں اس کا خیال ہے کہ جذبۂ جنسیت چند "رجحانات ثانیہ" (Secondary Tendencies) کا ایک مجموعہ ہے، اور پھر ان رجحانات ثانیہ کو مفصلہ ذیل عنوان کے ماتحت رکھتا ہے:۔

غلط کاری (Homo - Sexuality) تھاپی (Auto - Erotism) انکشاف ستر عورت یا عریانی (Exhibitionism) وغیرہ جب اصل رجحان دبا دیا جاتا ہے، تو وہ مشتق ہو کر کسی نہ کسی رجحان ثانیہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے، تغیر شعور کے مسئلہ میں نفسیات کے دو اصول ہیں، جنہیں "قانون تبعی" (Derivation) اور قانون تجید (Sublimations) کہتے ہیں۔ سابق الذکر اصلاح کا یہ مفہوم ہے کہ حیات شاعرہ کی مخصوص نوعیت جب اپنے نمود کا موقعہ نہیں پاتی، تو کسی نہ کسی صورت میں مشتق ہو کر ضرر رساں ہوتی ہے۔ شورش جنسیت کے مظاہر کا جب موقعہ نہیں ملا کرتا تو بورڈنگ ہاؤس اور زندان خانہ کے افعال قبیحہ کے دردناک شواہد ہمارے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ قانون تجید، قانون تبعی کی ایک مزکی اور منظم صورت ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ بعض اوقات حیات شاعرہ کی مزاحمت ایک کامیاب اور فائدہ بخش صورت بھی پیدا کر دیتی ہے جس کے محاسن کبھی اخلاقی، داغی اور مذہبی رنگ میں ہمارے سامنے آتے ہیں، اسی کو یورپ ایک بہت بڑا ماہر نفسیات فرائڈ (Successful and beneficient derivation) "ایک کامیاب اور مفید قانون تبعی" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔

اگر باڈوین کے نفسیاتی اصطلاحات قانون تبعی، و قانون تجید حقائق سے متعلق ہیں، جس کے صحیح تسلیم کر لینے میں کوئی استبعاد عقلی نہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ فارسی کے تمام اکابر غزل گو سعدی، حافظ، خسرو، جامی، عرفی کی عشقیہ شاعری گویا شعور جنسیت، محبت عفیفہ، اور سیہ شوری شباب کا نتیجہ ہے کہ جو قانون تجید کے ماتحت شعر و سخن کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔ شیخ حزیں میرے نزدیک مشاہیر غزل گو میں کسی سے کم درجہ نہیں رکھتے، بلکہ بعض اعتبار سے اکثر ارباب کمال پر آپ کو تفوق ہے، جس کی تفصیل آپ کے خصوصیات کلام کے سلسلہ میں پیش کی جائے گی۔

شعرائے متقدمین کا ذوق عشقیہ | جب عشق شعور جنسیت اور جوش شباب کا نتیجہ ہے، جس کی پیداوار عشقیہ شاعری ہے، تو یہ

بات ثابت ہوگئی کہ ایک اچھے اور کامیاب غزل گو کا عاشق ہونا بھی ناگزیر ہے، اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ اکابر غزل گو اور مشاہیر عشقیہ شاعری اپنے دور کے درد دل رکھنے والے عاشق تھے۔ جس کے تاریخی شواہد یا تو خود ان کی تصنیفات میں پائے جاتے ہیں، یا اوراق تاریخ میں تلاش کرنے سے نظر آتے ہیں۔

سعدی، حافظ، خسرو، جامی، عرفی فارسی شاعری کے ابوالآباء تھے، جنہوں نے سعدی کی گلستان باب پنجم کا مطالعہ کیا ہے، انکی نظر سے شیخ سعدی کے واقعات عشقیہ بھی گذرے ہوں گے، فرماتے ہیں:-

"در عنفوان جوانی چنانکہ افتد و دانی، با شاہدے سرے و سرّے داشتم بحکم آنکہ حلقے داشت طیب الادا، ذخلقے کالبدر اذا بدا"

دوسری حکایت میں پھر اپنے ایک دوسرے عشقیہ راز کی یوں پردہ دری فرماتے ہیں:-

"یاد دارم کہ در ایام جوانی گزر داشتم در کوئے و نظر بر روئے"

اس کے بعد کڑکڑاتی دھوپ میں کوئے جاناں میں پہونچنے کا تذکرہ فرماتے ہیں اور پھر یہیں تک نہیں بلکہ اپنی محبوبہ کے حسن بدیع اور جمال غریب کا یوں اظہار کرتے ہیں

"ناگاہ از ظلمت دہلیز خانہ روشنائی بتافت یعنی جمالیکہ زبان فصاحت از بیان صباحت او عاجز آید چنانکہ در شب تارے صبح برآید آب حیات از ظلمات بدرآید"

آپکو محبوبہ کے ہاتھ سے پانی ملتا ہے، اس وقت آپ ایک سرشارانہ طریقہ سے قدح آب اور معشوق کے پسینہ کی تعریف کرتے ہیں:-

"قدحے برف آب در دست گرفتہ و شکر دراں ریختہ و بعرق آمیختہ ندانم کہ بہ گلابش مطیب کردہ بود یا قطرہ چندازگل رویش دراں چکیدہ فی الجملہ شراب از دست نگارینش برگرفتم و بخوردم و عمر از سر گرفتم"

اس کے بعد فرماتے ہیں ہماری تشنگی، جس سے محبوبہ نے ایک پیالہ شربت دیکر مجھے آسودہ کرنا چاہا، دریاؤں کے پی جانے پر بھی بجھنے والی نہیں، یعنی یہ تشنگی، ہجر کی تشنگی ہے، جس سے آسودگی اسوقت میسر ہوگی جب لذت وصل میسر آجائے

ظماءٌ بقلبی لایکاد یسیغہٗ — رشف الزلال ولو شربت بحوراً

خواجہ حافظ کی پرجوش عشقیہ ترانہ سنجی آپ کے دیوان کا مطالعہ کرنے والے کسی طرح فراموش نہیں کرسکتے، فرماتے ہیں:-

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا — بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

"ترک شیرازی" کہا صرف ترک کا تعمیمی لفظ نہیں لائے، لہذا شیرازی کی قید لگا کر اس شعر کو اپنے واقعہ زندگی کے ساتھ مخصوص کرلیا ہے، جو ایک تاریخی حقیقت رکھتا ہے۔

جناب خسرو دہلوی کا واقعہ عشق عہد غلامان کی عشقیہ داستانوں میں ایک ایسی شہرت رکھتا ہے، جسے تاریخ نے بھی نظرانداز نہیں کیا، تاریخ فرشتہ کے بارھویں مقالہ میں یہ واقعہ موجود ہے، جس کے سلسلہ میں الفری کی طرح جناب خسرو نے اپنی مغلوبیت عشقیہ اور مطعون خلایق

ہونے کا حسرت اندوز گلہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

زین دل خود کام کار من برسوائی کشید　　خسروا فرمان دل بردن ہمیں بار آورد

مولانا جامی نے سعدی، حافظ، خسرو وغیرہ کی طرح خود تو اپنے واقعات عشقیہ بیان نہیں کئے، اونھوں نے گلستاں کے جواب میں بوستاں تو لکھی اور گلستاں کی طرح اپنی کتاب کے پانچویں باب میں افسانہائے عشق بھی لکھے ہیں لیکن اپنی ذاتی زندگی کو پیش نہیں کیا اور نہ آپ کے واقعات عشقیہ تاریخ میں کہیں پائے جاتے ہیں، لیکن جب آپ کے دیوان کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو عقل سلیم یہ نتیجہ نکال لیتی ہے کہ آپ بھی آزار دل سے خالی نہ تھے، مولویت کی سنجیدہ زندگی نے سعدی، حافظ، اور خسرو کی طرح کلام میں شوخی نہیں پیدا ہونے دی، مگر آپ کا کلام راز محبت کو پردۂ کتمان میں نہ رکھ سکا، فرماتے ہیں:-

مشغولی عشق داد جامی　　از شغل جہان فراغ مارا

ز عشق تو بہ نہ مقدور من بود جامی　　خدا چو بہر ہمیں کار آفرید مرا

عرفی کا واقعہ محبت، نگار بابت ماہ دسمبر ۲۵ء میں لکھا جا چکا ہے۔

ان واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فارسی شاعری کا کمال غزل گوئی خود شعراء کے بتلائے محبت ہونے کا نتیجہ تھا جو فرانس کے مشہور ماہر نفسیات باڈوئن کے قانون تجدید کے ماتحت ہے۔

متقدمین کی عشقیہ شاعری

شعرائے متقدمین میں بڑے بڑے باکمال گذرے، لیکن سب غزل گوئی میں وہ نزاکت تخئیل، کرشمۂ لطف، بیساختگی کلام اور حلاوت معنی نہ پیدا کرسکے، جو ان کے ذوقیہ صنف سخن میں پائی جاتی ہے۔

فردوسی اور نظامی، مثنوی میں تو بے مثل رہے، لیکن غزل گوئی میں وہ کچھ نظر نہیں آتے، اسی طرح خاقانی اور انوری قصاید میں تو تمام شعرائے فارس سے بڑھ گئے، لیکن عشقیہ شاعری کی خصوصیات سے انکا کلام معرّا رہا، وہی قصیدہ کی سی دقیقہ سنجیاں ہیں اور شان وشکوہ والے الفاظ جن سے جذبات کی لطافت اور احساسات کی نزاکت قایم نہ رہ سکی، مولانا روم کی فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری نے مشرق سے گذر کر مغرب سے بھی خراج تحسین وصول کیا، آپکے دیوان میں عمدہ غزلیں بھی ہیں، لیکن صوفیانہ رنگ کا غلبہ ہے، اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کا تسلّط، اگر غزلیات کے اندر فلسفیانہ تخیلات، صوفیانہ نکتے، تاریخی روایات، اور مذہبی ارادتمندیاں ہوں تو انہیں دائرہ معارف کہہ لیجئے، نطق الہام سے تعبیر کر لیجئے، لیکن غزلیات کے نام سے نامزد کرنا "اتہام تعبیری" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، یاروں نے خواجہ حافظ کے کلام کو بھی مولانا رومی ہی کی طرح ایک نطق صوفیانہ سمجھ لیا، اسمیں شک نہیں کہ بعض مقامات میں خواجہ صاحب کے کلام کے اندر صوفیانہ ذوق بھی پایا جاتا ہے، لیکن آپ کے شارحین نے آپ کے ہر شعر کی تشریح میں ایسے دور از کار صوفیانہ تاویلات سے کام لیا ہے کہ غزل فلسفہ مابعد الطبیعہ کی طرح خشک رہ گیا ہے۔ حالانکہ خواجہ صاحب کے کلام کا اکثر حصہ، سادہ اور تاویلات سے مستغنی ہے، بشرطیکہ کمال غزلگوئی کی رعایت سے دیکھا جائے، جامی کے کلام کا ایک حصہ تو رومی کے طرز میں ہے جسکی وضاحت موازنہ میں کیگئی ہے، اور دوسرا حصہ سعدی، خسرو، حافظ اور عرفی کیطرح کمال غزلگوئی کی شان پیدا کر رہا ہے:-

رومی

چمنے کہ تا قیامت گل او بہار بادا
صنمے کہ بر جمالش دو جہاں نثار بادا
ز نگاہ میر خوباں بہ شکار می خرامد
کہ بہ تیر غمزۂ او دل ما شکار بادا
بدو چشم من ز بینش کہ بپاست ہر دم
کہ دو چشم از پیامش خوش و پرخمار بادا
در ناہدے شکستم بدعا نمود نفریں
کہ برو کہ روزگارت ہمہ بیقرار بادا
نہ قرار ماند نہ دل بدعائے او ز یارے
کہ بخون ماست تشنہ کہ خدش یار بادا
تن من بماہ ماند کہ ز عشق می گدازد
دل من چوں چنگ زہرہ کہ گسستہ تار بادا
بگداز ماہ منگر بہ گسستگی زہرہ
تو حلاوت غمش بیں کہ یکے ہزار بادا
چہ عروسیست در جان کہ جہان ز عکس رویش
چو دو دست نو عروساں تر و پرنگار بادا
بعذار جسم منگر کہ بوسد و بریزد
بعذار جان نگر کو خوش و خوشگوار بادا
تن تیرہ ہمچو زاغے دجہاں تن زمستاں
کہ برغم ایں دو ناخوش ابداً بہار بادا
کہ قوام ایں دو ناخوش بچہار عنصر آمد
کہ قوام بندگانت بجز ایں چہار بادا

جامی

ترا اے نازنین ہر سو ز دلہا صد سپہ بادا
ہر جا بگذری صد جان پاکت خاک رہ بادا
ہمی ترسم شود آزردہ آں تن ورنہ می گفتم
ترا ہر شب درون دیدۂ من جایگہ بادا
ز علم عقل می بخشد فراغت عشق تو مارا
ہمیشہ عشق تو در کشور دل بادشہ بادا
سیہ رو خواندیم واں موجب سرخروئی شد
سر موئے اگر گویم خطا رویم سیہ بادا
طفیل دیگراں باشد کہ یابم لذت تیغت
ہمیشہ خوئی تو خونریزی بیگنہ ادا
کلہ کج کردہ می تازی سمند خلق می گویند
خدا ہموارہ یارا ایں سوار کج کلہ بادا
دل جامی کہ شد بتخانہ از مہر بتے چوں تو
نہ در روئے فکر مسجد نہ ہوائے خانقہ بادا

جامی کے تمام اشعار کمال غزلگوئی کی ایک عمدہ مثال پیش کر رہے ہیں صرف آخر شعر جسمیں ذوق صوفیانہ ادہ

عاشقانہ دونوں پایا جاتا ہے، حذف کر دیا جائے، تو غزل خسرو، عرفی، حافظ وغیرہ کی بہترین غزلوں سے ملجاتی ہے، مولانا رومی "بگداز ماہ منگر بہ گسستگی زہرہ" تک تو غزلگوئی کے اعلیٰ رنگ میں کہتے چلے آئے ہیں اس کے بعد فوراً ہی مثنوی کی سی خصوصیت آگئی ہے، کہ بطور نتیجہ، مواعظ و حکم کی طرف دماغ لوٹ گیا ہے، "چہ عروسیست در جان کہ جہاں ز عکس رویش" نے ہرچند سادگی بیان کو کھو دیا، دماغ ایک گہرے مسئلہ بدء خلق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، پھر بھی کلام اور حسن ادا قابل داد ہے، "چو دو دست نوعروساں تر و پر نگار باد" کی تمثیل نے پہلے مصرع کی وقت معنوی کا بدل کر کے بیان میں حلاوت پیدا کر دی ہے، اس کے بعد اخلاق و مواعظ کا گہرا اثر ہے جسے صنف غزلگوئی میں شامل کرنا ہی میرے نزدیک اصول کے خلاف ہے۔

رومی

داؤد گفت اے بادشا چوں بے نیازی تو زما
حکمت چہ بود آخر بگو در خلقت ہر دو سرا
حق گفتش اے مرد زماں گنجے بدم من در نہاں
جستم کہ تا پیدا شود آں گنج احسان و عطا
آئینہ کردم عیاں رویش دل و پشتش جہاں
پشتش بود بہتر ز رو گر تو ندانی روئے را
چوں کاہ جفت گل بود آئینہ کے مقبل بود،
چوں کہ جدا کردی زگل آئینہ گردد با صفا
شیرہ نگردد می اگر در خُم نہ جوشد مدتی
خواہی کہ دل روشن شود اندک عمل باید ترا
بہر تواضع بر خرے بنشست عیسیٰ اے پسر
ورنہ سواری کے کند بر پشت خر باد صبا
اے روح اندر جستجو سر ساز ہمچوں آب جو،
وے عقل ہر آں بقا دایم بر در راہ فنا
چنداں ہمی کن یاد حق کز خود فراموشت شود
تا محو در مدعو شوی بے ریب داعی و دعا

جامی

یا من بدا جمالک فی کل ما بدا
بادا ہزار جان مقدس ترا فدا
می نالم از جدائی تو دم بدم چو نے
ویں طرفہ ترکہ از تو نیم یک نفس جدا
عشقت و بس کہ در دو جہاں جلوہ می کند
گاہ از لباس شاہ گہ از کسوت گدا
یک صوت بر دو گونہ ہمی آیدت بگوش
گاہے ندا ہمیش نام و گہ صدا
برخیز ساقیا بہ کرم جرعہ بریز،
بر عاشقان غمزدہ زاں جام غمزدہ،
زاں جام خاص کز خودیم چوں دہد خلاص
در رہ پدید شہود و نماند بجز خدا
جامی رہ ہدی بخدا غیر عشق نیست
گفتیم والسلام علی تابع الہدی

جامی کے یہاں خالص مولویانہ رنگ ہے، رومی کے یہاں صوفیانہ، حقیقۃً دونو کلام معیار غزلگوئی سے جدا واقع ہوئے ہیں، ہاں یہ بات البتہ ہے کہ غزل ہی کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جامی کے یہاں ایک نظمیہ حمد ہے رومی کے یہاں تصوف کے ایک خاص مسئلہ "تصفیۂ قلب"

کے متعلق تسلسل مضامین ہے، ہمارے ملک کے فخر زماں ادیب علامہ شبلی نے تسلسل مضامین کو مستحسن قرار دیا ہے، میرے ناقص خیال میں تسلسل کے لئے مثنویاں اور قصاید زیادہ موزوں ہیں، غزلیات میں ہر شعر کو مستقل بالذات، اور انفرادی طور پر معنی خیز ہونا چاہیئے، رومی کی غزل سے میں نے "چوں گہ جدا کردی ز زنگ آئینہ گردد با صفا"، کے بعد سے چند اشعار حذف کر دیئے ہیں تاہم اس پوری غزل میں مسلسل پند و موعظت، اور صوفیانہ تخیل پایا جاتا ہے، پہلے خلقت کائنات کا سبب بتا گیا ہے، اس کے بعد "حقیقت دل" اور عالم مادی پر روشنی ڈالی گئی ہے، سابق الذکر کو آئینہ کا رخ اور ثانی الذکر کو پشت آئینہ کہا گیا، اس کے بعد "تصفیہ قلب" کے اسرار بتائے گئے ہیں اور مثال دی گئی ہے کہ جس طرح ایک آئینہ کی پشت پر صورتوں کے انعکاس کے لئے مٹی لگا دی جائے، اور مٹی میں خس و خاشاک بھی شامل ہو تو آئینہ صاف و شفاف نہو گا، بلکہ اس کے رخ پر برا اثر پڑیگا، اسی طرح جسم جبتک مادیت اور نفسانیت کی آلودگیوں سے ملوث رہیگا، صرف یہی نہیں کہ آئینہ دل پر انعکاس حقایق بلکہ دل خود اپنے اصل کمال پر قایم نہ رہیگا۔ اس کے بعد مجاہدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کے لئے "شیرہ نہ گردد می اگر در خم نہ جوشد مدتی" کی ایک نفیس تمثیل دی گئی ہے، پند موعظت کرتے کرتے مولانا خود جذبہ میں آگئے، اور اب بے اختیارانہ "چنداں ہمی کن یاد حق کز خود فراموشت شود" اور پھر اپنے رنگ فنا فی اللہ اور محویت الٰہی میں "تا محو در مدعو شوی" کہہ بیٹھے اور یہیں تک بس نہیں کیا "بے ریب داعی و دعا" کا بھی فقرہ بڑھا دیا جو محویت الٰہیہ کی آخری منزل ہے، یعنی جہاں طالب کو نہ اپنی فکر رہتی ہے، نہ دعا کا احساس جسے اصطلاح تصوف میں فناء الفنا کہتے ہیں۔

حافظ اور خسرو غزلیات کے میدان میں اپنی آپ نظیر ہیں، اس میں شک نہیں کہ انکی غزلیں عشقیہ شاعری کے حدود سے متجاوز بھی ہیں چنانچہ خواجہ حافظ کی تمام غزلیات پر ایک سرسری نظر ڈال کر انہیں تین عنوان کے ماتحت رکھ سکتے ہیں، رندانہ خمریات، عشقیہ، صوفیانہ اسی طرح جناب خسرو کے کلام میں مواعظ و حکم اور تصوف کا رنگ بھی ہے لیکن کم، آپکی غزلیں گویا عشقیات کی شرح ہیں، حافظ کی غزلیات کا اکثر حصہ عشقیہ شاعری کی بہترین مثالیں پیش کرتا ہے۔ بیتابی خیال، جوش کلام اور روانی بیان میں غزلیات کے اندر حافظ کا کوئی ہمسر نہیں، اردو میں مرزا غالب اور مومن خاں کے کلام میں البتہ یہ پرتو موجود ہے۔

جناب خسرو کی اکثر غزلیں نہایت سلیس، سادہ اور پاکیزہ ہیں، ہر چند آپ کے کلام میں حافظ کی سی ولولہ انگیزی نہیں پائی جاتی لیکن جہاں آپ رموز عشقیہ بیان کرتے ہیں، وہاں روزمرہ کے واقعات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، کوئی معنوی دقیقہ سنجی، لفظی نزاکت یا نظری و فکری باریکی نہیں پائی جاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپکی غزلیں ادھر زبان سے ادا ہوئیں ادھر قلب کیفیات سے لذت آشنا ہوا۔

خواجہ حافظ کا صوفیانہ طرز

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست　　سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست
سرم بہ دنیا و عقبیٰ فرو نمی آید　　تبارک اللہ ازیں فتنہا کہ در سر ماست
در اندرون من خستہ دل ندانم کیست　　کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست
دلم ز پردہ برون شد کجائی اے مطرب　　بنال ہاں کہ ازیں پردہ کار ما بنواست

مرا بہ کار جہاں ہرگز التفات نبود — رخ تو در نظر من چنیں خوشش آراست
نخفتہ ام بہ خیالے کہ می پزم شبہا — خمار صد شبہ دارم شراب خانہ کجاست
چنیں کہ صومعہ آلودہ شد بہ خون دلم، — گرم بہ بادہ بشوئید حق بدست شماست
ازاں بدیر مغانم عزیز می دارند — کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست
چہ ساز بود کہ بنواخت مطرب عشاق — کہ رفت عمر و ہنوزم دماغ پر ز صداست
خمار عشق تو دیشب در اندرونم بود، — کجاست وقت عبادت چہ وقت جائے دعاست
ندائے عشق تو دوشم در اندرون دل دادند — فضائے سینہ حافظ ہنوز پر ز صداست

یہ اسلوب بیان حافظ کی غزلیات میں بیشتر مقامات کے اندر موجود ہے، "رخ تو در نظر من چنیں خوشش آراست"، کے تخیل سے جو وحدۃ الوجود کی ایک عمدہ مثال ہے، اور پھر "کار جہاں" سے بے التفاتی کے اظہار پر کلام میں رومی کے خیالات کی روح آگئی ہے، "آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست"، امثل حبًا للّٰہ کی ترجمانی ہے۔

رندانہ شاعری کے متعلق بھی آپ کا کلام کثیر تعداد میں پایا جاتا ہے، فرماتے ہیں:۔

روزگاریست کہ سودائے بتاں دین من است — غم ایں کار نشاط دل غمگین من است

اور پھر جہاں مے اور میکشی کا تذکرہ ہے، وہاں نہ پوچھئے کس قدر صاف گوئی اور بیباکی سے آپ اپنے جذبات کا اظہار کر گئے ہیں:۔

اساس توبہ کہ در محکمی چوں سنگ نمود — ببیں کہ جام زجاجی چگونہ اش بشکست

عشقیہ شاعری کے تو گویا آپ بادشاہ تھے، خسرو دہلوی کا کلام بھی سراپا افسانۂ عشق ہے، حافظ اور خسرو میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ حافظ کے یہاں ولولۂ شوق اور وفور تمنا پایا جاتا ہے، خسرو کا کلام ایک عاشق ناکام کا افسانۂ محبت معلوم ہوتا ہے، خسرو اور حافظ کا یہ ایک ایسا ناقابل رد امتیاز ہے جسے ہر سخن فہم ان کے دواوین کا مطالعہ کرنے کے بعد سمجھ لیگا۔

خمریات یا رندانہ کلام کے متعلق آپ کی ایک بہترین غزل یہ ہے:۔

رندانہ کلام

زلف آشفتہ و خوی کردہ و خنداں لب و مست — پیرہن چاک و غزل خواں و صراحی در دست
نرگسش عربدہ جوی و لبش افسوس کناں — نیم شب مست بہ بالین من آمد بہ نشست
سر فرا گوش من آورد بہ آواز حزیں — گفت کاے عاشق شوریدۂ من خوابت ہست
عاشقے را کہ چنیں بادۂ شبگیر دہند — کافر عشق بود گر نبود بادہ پرست
برو اے زاہد و بر دردکشاں خردہ مگیر — کہ ندادند جز ایں تحفہ بما روز الست
آنچہ او ریخت بہ پیمانۂ ما نوشیدیم — اگر از خمر بہشت است و گر از بادہ مست

خندہ جام می وزلف گرہ گیر نگار　　　اے بسا توبہ کہ چوں توبہ حافظ بشکست

ارادتمند حضرات نے اس کی بھی صوفیانہ تاویلیں کرنی چاہیں نہیں معلوم نگار کی سیہ مستیاں جو دکھائی گئی ہیں وہ تصوف کے حسن لی یا بہ الفاظ دیگر کردگار عالم پر کیونکر منطبق ہو سکتی ہیں، مست حافظ تو جنون شباب اور روح نشاط کا ایک ابدی پیام دے گئے، لیکن ارباب ارادت کی چابکدستیوں نے اس کی تاویل کر کے حافظ کو بھی ارباب ظواہر سے ایک نہایت شوخ اور بے باک صوفی کا لقب دلا دیا حالانکہ اسے نہ ذوق تصوف سے تعبیر کر سکتے ہیں، نہ اس میں حافظ کی شوخی کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ سیدھی بات ہے، جو معنی ظاہر الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں وہی خواجہ صاحب کا مقصود تھا۔ اور اسی نشہ میں انہوں نے لکھا بھی ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ حقیقیات کی لذت آگینیوں کے بجائے تصورات کی نشاط انگیزیوں سے سرشار ہوں۔

عشقیہ طرز عشقیہ شاعری کے متعلق آپ کی وہ غزل نہایت اثر آفریں ہے جس کے دو اشعار یہ ہیں:-

رسم عاشق کشی و شیوہ شہر آشوبی　　　جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

کفر زلفش رہ دیں می زد و آں سنگین دل　　　در رہش مشعلہ از چہرہ برافروختہ بود

عرفی کی غزلیات میں دیر و حرم کے افسانوں کی تکرار اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح شراب و صراحی، خرقہ و مصلا فروشی کے مضامین خواجہ حافظ کے کلام میں عمیمی حیثیت رکھتے ہیں، خواجہ سلمان ساوجی جس طرح قصیدہ میں ایک نازک خیال، لطیف البیان اور سلیس گو شاعر گذرے ہیں غزلیات میں بھی آپ کا کمال کم نہیں نظر آتا ہے آپکی غزلوں میں روانی اور عذوبت بکثرت پائی جاتی ہے، فرماتے ہیں:-

شبہائے فرقت را آخر سحرے باشد　　　ویں نالہ شبہا را روزے اثرے باشد

اندیدہ اگر آبے خواہیم بصد گریہ　　　آبے نہ دہد ما را کان بے جگرے باشد

درد فراق کی اچھی تصریح کی ہے، اور پھر تسکین قلب کے لئے مناظر فطرت سے استدلال بھی نہایت عمدہ ہے، ہر شب کے بعد سحر کا تلازم ناگزیر ہے، دوسرے شعر میں گویا عضویات اور نفسیات کا عام مسئلہ پیش کر دیا ہے کہ جگر کی درستگی پر جذبات کے تہیج کا مدار ہے، جب جگر ہی ندارد ہے، تو دیدۂ پر حسرت سے ہنگامۂ اشک ریزی کے پورے ہونے کی گنجائش ہی کہاں، اس کے بعد ایک نہایت ہی اثر آفریں خیال پیش کرتے ہیں:-

تنہا نہ منم خاک کز خاک سر کویت　　　ہر گرد کہ برخیزد صاحب نظرے باشد

یہ تخیل خیام کے کلام کی خصوصیت ہے، وہ اپنی رباعیوں میں بار بار یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ صراحی کا جو دست ہے، وہ شاید کسی شاعر کی خاک کا بنا ہوا ہے، جو اپنا ہاتھ محبوب کے گردن نازک میں آدینہ ال رکھا کرتا تھا، جام کو جگر عاشق کہا ہے، حزیں کا ایک شعر بھی اس تخیل کی انتہائی پرواز کا نتیجہ ہے۔ فرماتے ہیں:-

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب　　　شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے دارد

کلام حزیں کے وہ ہیجان پیدا کرنے والے تخیلات جنہوں نے مجھے ان سطور کے لکھنے پر آمادہ کیا ہے، ان میں ممدوح کا یہ ایک شعر بھی ہے۔

ایک ناکام محبت جس طرح مرنے کے بعد "پیمانۂ میکدہ" بننے کی دعائیں کر رہا ہے، کیفیت سے خالی نہیں، اور وہ صرف اتنی سی امید پر کہ زندگی میں محبوب کے لب سے لب نہ مل سکا، میری خاک کا جب کاسہ بنایا جائیگا تو اس میں میرے لب کے اجزا بھی ضرور شامل ہوں گے، شاید اس طور سے "دل حسرت کش" کو پیالۂ شراب بنکر معشوق کے لب سے مس ہو جانے کا شرف حاصل ہو جائے، جذبات کا طوفان اور شوق کی جو وسعت اس ایک شعر میں پائی جاتی ہے، متعدد سطور میں نہیں پیدا ہو سکتی، اور لطف یہ کہ بیان میں سلاست، اور خیال میں روانی بھی ہے۔

ماخذ شیخ علی حزیں کی شاعری اور کمالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے حالات زندگی بھی بیان کر دیئے جائیں، خوش قسمتی سے شیخ نے خود ہی اپنے حالات زندگی جمع کر دیئے ہیں جو انکی کلیات کے ابتدائی حصہ میں بصورت "تذکرہ" پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ جو واقعات خود شیخ نے لکھے ہیں ان کے لئے کسی دوسرے تذکرہ سے مدد لینا کوئی کار آمد شے نہیں، آپ نے یہ تذکرہ ۱۱۵۴ھ میں لکھا بقیہ حالات کی فراہمی اور مضمون کی ترتیب میں مینے جن کتابوں سے مدد لی ہے، اسکی تفصیل تتمہ میں کر دی گئی ہے۔

نام و نسب اور بعض خاندانی حالات شیخ کا اصل نام محمد تھا "علی" کہکر لوگ پکارا کرتے تھے، لہذا ہندوستان میں محمد علی کے نام سے مشہور ہو گئے، اگر شیخ کا یہ تذکرہ نہ ہوتا، تو متاخرین میں آپ کے اصل نام کے متعلق بھی اختلاف ہوتا، شیخ نے خود ہی اس کا فیصلہ کر دیا ہے، وانا المستمد بواهب المواهب محمد المدعو بعلی بن ابی طالب

شیخ نے پندرہ پشت اپنے اجداد کے اسماء درج کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

ابی طالب بن عبد اللہ، بن اسمٰعیل، بن اسحٰق، بن نور الدین محمد بن شہاب الدین علی، بن علی بن یعقوب بن عبد الواحد بن شمس الدین محمد بن احمد بن محمد بن جمال الدین علی بن شیخ الاجل قدوۃ العارفین تاج الدین ابراہیم المعروف بہ زاہد الجیلانی قدس سرہٗ۔

اپنے اجداد میں سے بزرگوں کا مختصر تذکرہ بھی لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ شیخ علی بن عطاء اللہ اپنے زمانہ کے ایک بہت بڑے عالم گذرے ہیں۔ یہاں تک کہ گیلان کا بادشاہ خان احمد خاں آپ کی نہایت عزت کرتا اور بعض اوقات علمی استفادہ بھی کرتا، دار السلطنت قزوین میں، شیخ جلیل بہاؤ الدین محمد عاملی (جن کی کشکول کا ایک نہایت عمدہ فارسی قلمی نسخہ جو عربی کا ترجمہ ہے، خاکسار کے پاس بھی ہے) کے ساتھ آپ کی گہری محبت تھی، چنانچہ شیخ علی بن عطاء اللہ نے حدیث معراج کی شرح میں جو کتاب لکھی ہے، اس کے مقالہ افتتاحیہ میں شیخ بہاؤ الدین محمد عاملی کا بھی تذکرہ کیا ہے، اس کے علاوہ آپ کی چند تصنیفات ہیں، جن میں کلیات قانون بو علی سینا کی فارسی شرح ہے، جو آپ نے خان احمد خاں کی فرمایش سے لکھی، اثبات واجب الوجود کے متعلق ایک رسالہ لکھا جس سے آپ کا معیار دانش متعین کیا جا سکتا ہے، آپ کا ایک رسالہ حل شبہ جذر اصم" کے متعلق بھی ہے، اور مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان دونوں رسائل کا قلمی نسخہ شیخ علی حزیں نے اپنے والد کے کتبخانہ میں دیکھا تھا، ان کے علاوہ فلسفہ کے متعلق بھی آپ کی تصنیفات پائی جاتی تھیں جن میں فصوص فارابی پر ایک مبسوط حاشیہ ہے، آپ نے امیر فخر الدین اسماکی استرآبادی کے حلقۂ درس میں تکمیل علوم کی، شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے، "وحدت" تخلص تھا، آپکے کمال کے متعلق خود شیخ حزیں کی رائے ہے:-

سخنان عاشقانہ اش در کیفیت و حسن بلاغت بے نظیر افتادہ

دو ہزار بیت کا ایک دیوان مرتب کیا تھا، جس میں یہ غزلیں بھی ہیں :-

خوب است محبت اثرے داشتہ باشد   معشوق ز عاشق خبرے داشتہ باشد

دل رخصت بہ آتشکدۂ عشق دنیامد   می آمد اگر بال و پرے داشتہ باشد

مردیم ز بس ثابت و سیارہ شمردیم   آیا شب ہجران سحرے داشتہ باشد

آپ کے صرف ایک صاحبزادے ہوئے جنکا نام عبد اللہ تھا، یہ ایک متقی اور گوشہ گیر شخص تھے، جو موروثی جائداد تھی اس میں سے قلیل حصہ پر قناعت کرتے، اور بقیہ محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے، شیخ عبد اللہ کے تین بیٹے ہوئے، عطاء اللہ، ابو طالب و ابراہیم، عطاء اللہ فقہ اور حدیث میں اپنے ملک کے علامہ تھے، زہد و ریاضت بھی اعلیٰ درجہ پر تھی آپ نے وسط عمر میں انتقال کیا، سب سے چھوٹے صاحبزادہ شیخ ابراہیم ایک ذہین اور بلند حوصلہ شخص تھے، انہوں نے علوم متداولہ حاصل کئے، اور اپنے زمانہ کے ایک بڑے شخص ہوئے، آپ کو خوشنویسی میں بھی کمال تھا، چنانچہ سات خط لکھنا جانتے تھے، شیخ حزیں فرماتے ہیں، ایک قرآن مجید مترجم لکھ کر میرے والد کی خدمت میں بمقام اصفہان بھیجا تھا، اصفہان کے خوشنویس پاکیزگی خط پہ تعجب کرتے تھے، آپ کو انشا پردازی میں بھی مہارت تھی، ذوق شعر گوئی بھی رکھتے تھے، آپ کی رباعی ہے :-

بادہ خون جگر ماست زمینا مطلب   گوہر از چشم تر ماست ز دریا مطلب

پئے لیلیٰ نتواں گشت چو مجنوں در دشت   آنچہ در سینہ تواں یافت بصحرا مطلب

شیخ نے جس والہانہ ارادت، اور پرستارانہ جوش میں اپنے قابل فخر والد کے کمالات کا تذکرہ کیا ہے، انہیں دیکھنے کے بعد کم از کم اتنا سبق ضرور ملتا ہے، کہ ایک صالح اور مطیع اولاد کو اپنے بزرگوں کے ساتھ کیسے تعلقات ہوتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ جذبۂ محبت میں شیخ کے کلام سے ایک حد تک مبالغہ کی بو آتی ہے، لیکن یہ صرف شیخ کے جذبات کے متعلق کہہ سکتے ہیں، اپنے والد کے حالات زندگی جو انہوں نے بیان کئے ہیں ان کا تاریخی پہلو نہایت مستند ہے، جس سے ہر ذی شعور انسان کو واقعۃً شیخ ابو طالب کے کمالات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے -

شیخ ابو طالب بیس برس کی عمر میں جب ایک حد تک تحصیل علوم کر چکے تو عراق کے فاضلوں کی علمی مجالس میں شرکت کرنے کے لئے فاضل ملا حسن شیخ الاسلام گیلانی کی خدمت میں بمقام اصفہان تشریف لائے، استاد العلماء آقا حسن خوانساری کے حلقہ درس میں استفادہ شروع کیا اور مولانا محمد رفیع کی خدمت میں جو رفیعائے یزدی کے نام سے مشہور ہیں، فنون ریاضیہ کی تکمیل کی، مطالعہ و مباحثہ میں ایسا شغف تھا کہ بہت سے طلبہ آپکی تربیت سے اعلیٰ درجہ کے عالم ہو گئے، آپ کے کتب خانہ میں پانچ ہزار جلدوں سے زیادہ کتابیں تھیں، جن میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو شروع سے آخر تک آپ کے زیر تصحیح نہ آئی ہو اور اکثر کتابوں پر خود آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا حاشیہ تھا، انمیں ستر جلدیں ایسی تھیں جن کی نقل کتابت خود ابو طالب نے کی تھی، ان میں تفسیر بیضاوی، قاموس اللغۃ، شرح لمعہ اور حدیث کی کتابیں تھیں بہت اچھے خوشنویس تھے، شیخ کہتے ہیں کہ والد فرماتے تھے کہ جب میں اصفہان میں آیا، تو میرے والد اس خیال سے کہ کہیں میں اصفہان ہی میں بود و باش نہ اختیار کر لوں، خاص خاص ضروریات سے زیادہ مصارف روانہ نہیں کرتے تھے، وہ بھی سال میں کئی مرتبہ کر کے بھیجتے تھے، لہٰذا کتابوں کے خریدنے کی استطاعت نہ تھی، اس لئے

یں کتابوں کی نقل کر لیا کرتا تھا، جب شیخ کے دادا نے انتقال کیا، تو ان کے والد نے اصفہان ہی میں مکان بنا لیا، شام کی راہ سے حجاز کا سفر کیا، اور طواف بیت اللہ سے فارغ ہو کر بغداد ہوتے ہوئے اصفہان میں چلے آئے، حاجی عنایت اللہ اصفہانی انہیں بہت دوست رکھتے تھے انہوں نے اپنی لڑکی بیاہ دی، ابوطالب کے چار بیٹے ہوئے جنہیں سب سے بڑے شیخ علی حزیں ہیں، ایک نے بچپن میں انتقال کیا، دو عالم جوانی میں گذر گئے، موت سے سات سال قبل خلوت گزینی کی طرف طبیعت مائل ہوئی، علمی مناظرہ اور درس و تدریس ترک کر دیا، حتی کہ گھر کے اسباب معاش کی فکر سے بھی سبکدوش ہو گئے، بعض اوقات کتابوں کا مطالعہ کرتے، اور اکثر رات کو عبادت کرتے اور بیشتر روتے رہتے، یہاں تک کہ ۱۱۲۷ھ میں وفات پائی، مرتے وقت شیخ نے وصیت کی جسے انہیں کے الفاظ میں لکھدینا مناسب ہے، فرماتے ہیں :-

چنانکہ مرا خوشنود داشتی، خدائے از تو خوشنود باد، وصیت من بتو انیست کہ ہر چند او ضاع دنیا را بروفق مرام نہ بینی در زمانہ ناسازگار افتد باید کہ بمنزلت رضا نہ ہی، و تبعیت دو نبالہ روی اختیار نہ کنی، چہ عمر قلیل قابل آن نیست،

شیخ اس وقت تقریباً چوبیس سال کے تھے، بزرگ باپ کی وفات کا مرثیہ کہا:-

سپہر از مرگت اے صاف حقیقت بے صفا گشتہ	نمی ماند بسر کیفیتے مینائے خالی را
کشیدی تا ز من دست نوازش اے چمن پیرا	شل چوں بید مجنوں گشتہ ام آشفتہ حالی را
تو در پیرانہ سر رفتی و من ہم در غمت پیرم	بحسرت می کنم ہر لحظہ یاد خرد سالی را
نہاں بالائے عرش از رفعت تا ندیدم در دل خاکت	ندانستم کہ پوشد خاک سافل کوہ عالی را

باپ بیٹے کی گہری محبت اور باہمی خوشنودی کی حقیقت اس واقعہ سے اور بھی واضح ہوتی ہے، کہ ایک مرتبہ شیخ علی حزیں شیراز میں تھے، باپ نے عرصہ سے دیکھا نہ تھا، ایک محبت آمیز خط لکھکر بلایا، جس کے عنوان میں یہ رباعی بھی لکھی تھی :-

در دل ز فراق خستگیہا دارم	در کار ز چرخ بستگیہا دارم
با اینہمہ غم تو نیز پیمان وفا	مشکن کہ جز این شکستگیہا دارم

یہ ایک رباعی ہے، یا جادو کوئی اس دل سے پوچھے جسے قدرت نے گیارہ ہی سال کی عمر میں ایک بزرگ سیرت باپ سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا ہو[1]، شیخ کے واقعہ زندگی سے یہاں ایک ایسی مماثلت پائی جاتی ہے، کہ بے اختیارانہ دل بھر آتا ہے، رباعی نے حزیں پر بیحد اثر کیا اور وہ باپ کی ملاقات کو فی الفور روانہ ہوئے

ولادت و وطن

شیخ علی حزیں کی ولادت دوشنبہ کے دن بتاریخ ۲۷ ربیع الاول ۱۱۰۳ھ بمقام اصفہان واقع ہوئی، اسی مناسبت سے آپ "اصفہانی" مشہور ہو گئے، ورنہ شہاب الدین علی کے قبل آپ کے اجداد کا مولد و مسکن شہر استا تھا، شیخ شہاب الدین نے اسے چھوڑ کر لاہجان میں اقامت اختیار کی، لاہجان، گیلان (فارس) کے شہروں میں سے ایک بہت ہی عمدہ شہر ہے،

---

[1] معین الدین بن عبد العلی حکاری (ضلع پٹنہ) اعلی اللہ درجاتہ فی الآخرۃ

اس کے بعد سے لاہجان آپ کے اجداد کا مولد و مسکن ہوگیا، تذکرہ کے آخر میں شیخ نے خود کو لاہجان ہی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن والد نے اصفہان میں بود و باش اختیار کر لی تھی، اور خود شیخ موصوف وہیں پیدا ہوئے تھے، اس لئے اہل زمانہ نے آپ کو "اصفہانی" کہا اور "لاہجی" بھول گئے۔

تعلیم و تربیت

شیخ کا خاندان ایک علمی خاندان تھا، گھر میں فقہ و حدیث، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب کا چرچا تھا، کتابیں تھیں، شیخ کی طبیعت عہد طفولیت ہی سے کسب علوم کی طرف راغب ہوئی، اور اس میں انہیں ایسی لذت ملی، کہ در بدر مارے مارے پھرے، عزیز و اقارب کو چھوڑا، ترک وطن کیا، انتہا یہ کہ تعلق ازدواجی کا خیال بھی ترک کر دیا، جبتک سر پر والد کا سایہ رہا، انہوں نے شادی کے لئے استمزاج کیا، پھر مجبور کیا، لیکن طلب علم کی لذت نے کچھ ایسا محو بنا دیا تھا کہ تاہل کی زندگی کو خیرباد کہا، خود فرماتے ہیں:—

والدین خواستند کہ تاہل اختیار کنم در اں مبالغہ داشتند، و جمعے از اکفا و اعیان خواہش بہ نسبت نمودند و مرا بہ سبب اشتغال و شوق مفرط بہ علم رضا بہ آں نبود و آں را عایق فرصت و مانع می پنداشتم، و تجرد را بہ فراغ و آزادگی انسب یافتہ، چنداں کہ جہد نمودند راضی نہ شدم،

چار سال کی عمر میں والد نے ملا شاہ محمد شیرازی سے الف با کی ابتدا کرائی، مولانا موصوف نے بسم اللہ کے بعد تین مرتبہ رب اشرح لی صدری الی آخر یفقھوا قولی کی تلقین کی، حزیں کو دو سال میں لکھنا پڑھنا آگیا، اسی وقت سے شیخ کی طبیعت نوشت و خواند میں ایسی مشغول ہوئی کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کام انہیں مرغوب ہی نہیں معلوم ہوتا تھا، اس زمانہ میں انہوں نے فارسی زبان میں نظم و نثر کی بہتیری کتابیں پڑھ ڈالیں، صرف نحو، اور فقہ کی کتابیں شروع کیں اور جلد ہی ختم کیں، منطق میں چند رسالے پڑھ ڈالے، منطق سے طبیعت کو کچھ ایسی مناسبت تھی کہ اس کا خاص شغف رکھنے لگے، آپ کے استاد کو آپ کے شوق اور تیزی ذہن پر تعجب آتا، وہ ہمیشہ دل بڑھاتے رہے، اسی زمانہ میں انہیں شعر و سخن کا بھی ذوق پیدا ہوا، کچھ کہنے لگے، استاد کو خبر ہوئی تو انہوں نے منع کیا، شیخ ابوطالب نے ترک شاعری میں مبالغہ کیا، لیکن شیخ فرماتے ہیں:—

مرا صرف طبیعت یکبارہ ازاں ممکن نبود، چیزیکہ وارد خاطر می شد می نوشتم و پنہاں می داشتم۔

آٹھ برس کی عمر میں باپ نے علم تجوید (قرأۃ) کی تعلیم دلانا شروع کی، شیخ نے دو برس تک مولانا ملک حسین قاری سے اسکی تعلیم پائی، اور اس فن میں کئی رسالے پڑھے، شیخ کو حسن قرأۃ میں ایسا کمال ہوا، کہ لوگ اسے بہت پسند کرتے، اس کے بعد فاضل باپ نے لایق بیٹے کی تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ کی، اور شرح جامی، شرح نظام (شافیہ) تہذیب، شرح ایساغوجی، و شرح شمسیہ، و شرح مطالع (منطق)، شرح ہدایہ، حکمۃ العین با حواشی، مختصر تلخیص، تمام مطول، مغنی اللبیب، جعفریہ، مختصر نافع، ارشاد، شرایع الاحکام (فقہ) و من لا یحضرہ الفقیہ (حدیث) و معالم اصول اور چند دوسری کتابیں خود پڑھائیں۔

تخلص حزیں کا انتخاب

شیخ ابھی کم سن ہی تھے کہ ابوطالب اپنے بیٹے کو تربیت و ارشاد کی غرض سے مشہور بزرگ جناب شیخ خلیل اللہ طالقانی کی خدمت میں لے گئے، یہ سلسلہ تربیت تین سال تک جاری رہا، اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کے متعلق شیخ موصوف نے خاص توجہ سے ان کی تربیت شروع کی، شیخ خلیل اللہ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے، انہوں نے حزیں کو شعر گوئی سے منع نہیں کیا،

بلکہ بعض اوقات انکی کلام سنا کرتے، آپ ہی نے تخلص حزیں کا انتخاب کیا۔

عشق و محبت

شعرائے فارس کے واقعات زندگی میں ان کا افسانہ عشق ایک عام واقعہ ہے، جیسے مقدمہ میں لکھا جا چکا ہے، اہل عقل سلیم یہ نتیجہ نکالتی ہے، کہ ہر انسانی زندگی میں حسن و عشق کے کرامات کا ظہور بھی ایک ناگزیر مسئلہ ہے، شعرا رو اد بار نے سخن سنجوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی، عام قلوب اکثر شاہدان لب بام کی عشوہ طراز نگاہوں کے گھائل ہوکر لطافت عشقیہ کھو بیٹھے، اور بعض سنجیدہ دماغ سیلاب کے عارضی جوش سے ڈگمگاتے تو ضرور ہیں، لیکن مذہب و معاشرت کے قیود نے شمع کی طرح سوزاں رکھا، نتیجہ یہ نکلا کہ انکی شورش بھی کچھ زیادہ پائدار رہی اور انہیں لذت درد کا فیضان بھی عرصہ تک پہونچتا رہا، شیخؒ کو بھی عہد شباب سے دوچار ہونا تھا، چونکہ خاندانی تربیت، بزرگوں کی صحبت علوم کی برکتیں تھیں، عشق لطیف صورتوں میں جلوہ گر ہوا، فرماتے ہیں:۔

عندلیب دل شوریدہ حال بگلبانگ بلند این پردہ سرائیدن گرفت،

فاش می گویم و از گفتہ خود دل شادم — بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

نیست بر لوح دلم جز الف قامت یار — چکنم حرف دگر یاد نداد استادم

ایک رات دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک باغ میں گئے، مولانا علی کو ساری اصفہانی ایک مشہور خطاط (خوشنویس) تھے، انہیں موسیقی کا بھی خاص ذوق تھا، آپ کی آواز حضرت داؤدؑ کی طرح ایک معجزانہ پہلو رکھتی تھی، وہ بھی شریک جلسہ تھے، انہوں نے "نیم شبی" راگ چھیڑ کر یہ بیت پڑھنا شروع کیا:۔

امشب بیا تا در چمن سازیم پر پیمانہ را — تو شمع و گل او داغ کن من بلبل پروانہ را

حزیں کا دل ایک جذبہ لطیف سے مانوس ہو چکا تھا، حسن محبوب کے تمام نقوش نظر کے سامنے آگئے، دل میں ٹیس شروع ہوئی، لذت درد نے قلب کو بیچین کرنا شروع کیا، شیخ کو ایسا حال آیا کہ خود فرماتے ہیں:۔

(ہزار بار کالبد عنصری را سلطان روح تہی ساختہ باشد۔

شیخ نے فتنۂ محبت کا ایک اور نہایت ہی عجیب واقعہ لکھا ہے، جسے خود انہوں نے دیکھا تھا، فرماتے ہیں ایک دن شیراز میں ایک مقام پر بیٹھا ہوا تھا، دیکھا کہ ایک آدمی سراپا برہنہ جا رہا ہے، اس کے دونوں ہاتھوں میں چھری تھی، پوری قوت سے یہ چھری وہ اپنے جسم پر مارتا، بدن سے خون جاری تھا، اس کے سر، جسم، اور منھ پر بیتیرے گہرے زخم تھے، جب وہ چھری مار کر اپنے بدن کو زخمی کرتا، تو اس کے اوضاع سے معلوم ہوتا، کہ اسے خاص راحت و لذت ملتی ہے، منھ سے وہ کچھ نہیں کہتا تھا، اسکی حالت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کا نام اسمٰعیل ہے کسی پر عاشق تھا اس نے انتقال کیا، اسے جب خبر ہوئی تو بیہوش ہو گیا، ہوش آیا تو مجنوں کیطرح کپڑے پھاڑ کر اپنی یہ حالت بنالی، کئی روز ہوئے کہ اسی حالت میں ہے، میں نے کہا اس کے ہاتھ سے لوگ چھری کیوں نہیں لے لیتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ جب کئی آدمیوں نے ملکر اسے پکڑا، اور چھری چھین لینے کا ارادہ کیا تو پہلے اس نے عجز کیا، پھر اس کی ہیئت سے ایسا معلوم ہوا کہ اگر چھری اس سے چھین لی گئی، تو فوراً اس کا دم نکل جائے گا، میں اسکے حالات کے تفحص میں رہنے لگا، تین دن کے بعد شہر کے باہر ایک چھری اس کے پہلو پر لگی کہ آنتیں کٹ گئیں اور وہ مرگیا، شیخ فرماتے ہیں:۔

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ　　　در کوچۂ عشق آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح عشق است　　　با آنکہ سپاہ او شہید اند ہمہ

عرفی ایک ایسا مجسمہ محبت تھا کہ حسن عشقیہ جادو بیانی سے حزیں جیسے نازک خیال اور کامل فن شاعری کو بھی استفادہ کرنا پڑا، یہ رباعی اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے، ہر چند شیخ صاحب نے سہواً عرفی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

بدیہہ گوئی

بدیہہ گوئی، کمال سخن سنجی، اور انتہائے جودت ذہن کی دلیل ہے، اکابر شعرائے فارس میں بدیہہ گوئی کی چند مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں سعدی اور خسرو کے بھی کلام ہیں، سعدی نے گلستان میں اس کا تذکرہ بھی کر دیا ہے، چنانچہ ایک مہ جبین کو جہاں ضرب زیدٌ عمر کان متعدی عمر پڑھتے دیکھا، وہاں عربی و فارسی میں فی البدیہہ اشعار کہہ ڈالے، پیکر حسن نے پوچھا کہ آپ کا دولت خانہ، بولے شیراز، سعدی کی کافی شہرت ہو چکی تھی، "از سخناں سعدی چہ داری" کا سوال ہوا، بھلا شیخ جیسے شخص وقت پر کیوں چوکتے، فوراً عربی میں یہ کہا:-

بلیت بنحوی یصول مغاضبا　　　علی کزید فی مقابلۃ العمر
علی جر ذیل لیس یرفع رأسہ　　　وھل یستقیم الرفع من عامل الجر

حسن تو بارگاہ قدرت کا عطیہ تھا، کچھ کمسنی، کچھ علم کا ابتدائی زینہ، عربی کا مجازی رنگ سمجھ میں نہ آیا، فرمایش ہوئی فارسی کلام سنائیے، سعدی پر نگاہ ناز تو کام کر ہی چکی تھی، فوراً کہا:-

طبع ترا تا ہوس نحو کرد　　　صورت عقل از دل ما محو کرد
اے دل عشاق بدام تو صید　　　ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

خسرو دہلوی سے جب سلطان محمد خاں شہید نے پوچھا کہ حسن کے ساتھ تمہاری محبت حقیقی ہے، یا ہوا پرستی کا نتیجہ ہے؟ امیر نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:-

عشق آمد و شد چوں خونم اندر رگ و پوست　　　تا کرد مرا تہی و پر کرد ز دوست
اجزائے وجودم ہمگی دوست گرفت　　　نامیست مرا بر من و باقی ہمہ اوست　　　(تاریخ فرشتہ)

ابو القاسم مرزا، مرزا کامران کے اکلوتے بیٹے تھے، جلال الدین اکبر نے انہیں قلعہ گوالیار میں قید کر دیا تھا، جب خان زماں خاں کی مہم پر جانے لگا، تو غریب ابو القاسم کا وجود مصالح ملکی کے منافی جانکر قتل کا حکم دیا، جلاد گردن مارنے چلا، تو مرزا نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا،

فلک بہ کشتن من اینقدر شتاب مکن　　　چو خواہم از ستمت مرد اضطراب مکن

جس قدر درد انگیز احساس پیدا کرتا ہے، اور واقعات ماضیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، ایک شعور لطیف اچھی طرح محسوس کر لیتا ہے، کامران کی ناکامی، دنیا سے سفر، خاندان کا انتشار، اپنی قید کی بلا انگیزیاں، اکلوتے بیٹے نے سب کچھ دیکھیں، یہی کیا کم تھیں کہ غریب ابو القاسم کو زندگی سے سبکدوش کر دیں "چو خواہم از ستمت مرد" میں یہی خیالات ادا کئے گئے ہیں (فرشتہ)

لیکن شیخ حزیں کی بدیہہ گوئی اسقدر زبردست قوت تخییل اور حاضر دماغی کا پتہ بتاتی ہے کہ تعجب آتا ہے، ایک دن شیخ ابو طالب کی

مجلس میں ایک شخص نے ملا محتشم کاشی کا یہ شعر پڑھا،

اے قامت بلند قداں در کمند تو　　رعنائی آفریدہ قد بلند تو

لوگوں نے بڑی تعریف کی، ابوطالب نے کہا، ملا محتشم کا دیوان میرے زیر مطالعہ رہا ہے، استاد سخن تھے، لیکن ان کا کلام بے نمک ہے۔ اور اسمیں اتنی حلاوت نہیں پائی جاتی کہ بے نمکی کی تلافی ہو جائے چنانچہ اسی شعر سے ظاہر ہے، شعر کا دوسرا مصرعہ درست ہے لیکن پہلا مصرعہ طبیعت سے مانوس نہیں ہوتا ہے، کیونکہ قامت کو کمند میں پھنسا ہوا نہیں کہتے، اگر لفظ قامت نہ ہوتا، اور صرف "اے کہ بلند قداں در کمند تو" ہوتا تو کلام پسندیدہ ہوتا، حاضرین مجلس نے تصدیق کی، اس کے بعد شیخ حزیں کیطرف متوجہ ہوئے، اور کہا میں جانتا ہوں کہ ابھی تک تم شعر گوئی سے باز نہیں آئے ہو اگر اس شعر پر شعر کہہ سکتے ہو تو کہو، شیخ نے فوراً ایک مطلع موزوں کر لیا، جب دوبارہ باپ کی نظر پڑی، تو انہیں پتہ چلا کہ شیخ نے کچھ کہا، بولے اگر موزوں کر چکے ہو تو کہو، شرم نہ کرو، شیخ حزیں نے پڑھا:-

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو　　فریاد از تطاول مشکین کمند تو

حاضرین مجلس لوٹ گئے، اور بیحد تعریف کی، وہ اسی حال میں تھے کہ شیخ نے دوسرا شعر پڑھا:-

شد خشک طرز زاہد نت کوئے عاشقاں　　بنشیں کہ باد خوردہ جانہا سپند تو

اسوقت شیخ ابوطالب بھی پھڑک اٹھے، اور تحسین کی، حزیں نے تیسرا شعر پڑھا:-

مشکل شدست کار دل از عشق خوش دلم　　شاید رسد بہ خاطر مشکل پسند تو

اسی طرح تھوڑے تامل میں دو سرا بیت کہا، اور پوری غزل کہہ گئے، حاضرین مجلس نے کہا کہ اس طرز کی بدیہہ گوئی پر اب کوئی قدرت نہیں رکھتا، شیخ ابوطالب نے حزیں کو شعر گوئی کی اجازت دی، لیکن اسقدر کہ وقت ضایع نہو، اور اس غزل کہنے کے صلہ میں اپنا قلمدان عطا کیا۔

سفر ہندوستان

شیخ نے عمر کا بیشتر حصہ سفر ہی میں گزار دیا، فارس کے تمام مشہور بلاد کا سفر کیا، شیراز، لار، شوستر، اصفہان، لاہجان طہران، ماژندران، میں عرصہ تک سفر کرتے رہے، پھر ملتان کا سفر کیا، آخر میں ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے، آپ نے اپنے سفر ہند کے سلسلہ میں، عہد محمد شاہی اور واقعہ نادر شاہ پر کافی طور سے روشنی ڈالی ہے، گویا اس عہد کی تاریخی حالات کے لئے تذکرہ حزیں ایک نہایت مستند اور معتبر کتاب ہے، لیکن اس سلسلہ میں آپ نے ہندوستان اور ارباب ہند پر سخت نکتہ چینیاں بھی کی ہیں، ہندوستان کی خاصیت آب و ہوا کو برا بھلا کہا ہے، اور شاہنامہ فردوسی کے چند اشعار بھی دلیل میں لائے ہیں۔ کہ گشتاسپ نے جب ہندوستان پر فوج روانہ کی تو امیر لشکر سے تاکید کر دی، کہ فتح کرنے کے بعد جلد لوٹ آنا، ورنہ وہاں کی خاصیت آب و ہوا فوجیوں کو نکما بنا دے گی، لہذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ شیخ نے ہندوستان کی شکوہ پردازی میں جو لب ولہجہ اختیار کیا ہے، اسے پیش کر دوں، اس کے بعد آپ کے الزامات کی حقیقت پر غیر جانبدارانہ تنقید کر دوں، تاکہ ہندوستان کے مسلمان کم از کم اتنا تو سمجھ لیں کہ غیر ملکی مسلمان اپنے ملک کے کس قدر مداح ہوتے ہیں، اور یہ کہ اپنے ملکی اور قومی اعتبار سے کیسی معاندانہ تنقیدیں کیا کرتے ہیں، اور اسوقت انہیں اسلامی اور مذہبی رواداری کا مطلق احساس نہیں ہوتا، کیا ہندوستان کے مسلمان ہنوز غیر ممالک (اسلامیہ) سے خیالی اتحاد، اور لفظی رشتہ جوڑتے رہیں گے، اور ہندوستان کو بائیکاٹ کر کے اسے

ایک محض "مرا بہ منزل جاناں چہ امن وچہ عیش" سمجھکر ایسے برداشتہ خاطر ہا کرینگے کہ صرف "بر بند ید محملہا" کی آوازیں نہیں سنائی دیں، اور فرقہ وارانہ امتیازات اور مذہبی غلو ترک کرکے، ایک ملکی اور قومی (ہندوستانی) سوسائٹی کا تخیل قایم نہ کریں؟

ہندوستان اور اس کے باشندوں پر شیخ نے جس عصبیت کے رنگ الزامات عائد کئے ہیں، انکا مقتضا تو یہی تھا کہ ہر ہندوستانی مسلمان ہندوستان کو اپنا حقیقی نشیمن سمجھے، کیونکہ جنہیں وہ اپنا سمجھتا ہے، وہ انہیں غیر سمجھکر بری طرح ان پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں، اور جنہیں وہ غیر سمجھتے ہیں، وہ تاریخ، معاشرت، اور سب سے بڑھ کر ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ان کے نہایت عزیز ہیں۔

دسویں رمضان المبارک ۱۱۴۶ھ کو سفر ہند کی غرض سے شیخ کشتی میں سوار ہوئے جو سندھ کی طرف جا رہا تھا، جہاز ہی میں انگریزی جماعت کا کپتان جب شیخ کے ارادہ سے واقف ہوا تو اس نے آپ کو بہت منع کیا کہ ہندوستان نہ جائیں بلکہ اس نے سفر یورپ کی ترغیب دی، شیخ راضی نہوئے، پہلے آپ شہر ٹھٹہ میں اترے، ۱۱۴۶ھ سے ۱۱۵۴ھ تک (جب شیخ یہ تذکرہ لکھ رہے تھے) ہندوستان میں اقامت گزیں رہے، لیکن دلکو سکون نہ تھا فرماتے ہیں:۔

من این مدت اقامت را دریں مملکت از زندگانی محسوب نداشتہ، ہمانا آغاز رسیدن بہ سواحل ایں ملک انجام عمر و حیات بود، و دریں مدت ہشت سال از نجا ر ٹتہ تا بلدہ دہلی کہ معروف بہ شاہجہان آباد است دیدہ ام و آنچہ از اوصاف، احوال و اوضاع ایں مملکت و ساکنانش شنیدہ و یافتہ بودم ہمہ معائن نشنیدہ و بہ خاطر خطور مکرر بود مشاہدہ و معلوم شد۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

بالجملہ دراں بلدہ از بے آبی و بد ہوائی و اوضاع زشت کہ ایں مملکت را عرض عام است بے آرام شدم۔

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:۔

و اصلا طبع را ملایمت و طاقت بہ تحمل اوضاع و اطوار اشخاص ایں دیار نبود

ایک مقام پر اور غیظ و غضب میں لکھتے ہیں:۔

ناچار برخے از قبائح و فضائح احوال و اوصاف ایں دیار کہ کدورت آثار شنعت اطوار نمایش خواہد گرفت

یہ خیالات ہیں جو اس سخت لب ولہجہ میں شیخ نے اپنے تذکرہ میں ہندوستان اور اہل ہندوستان کے متعلق ظاہر کئے ہیں آگے ذرا اس کی حقیقت پر غور کریں، ۱۱۰۳ھ میں شیخ کی ولادت ہوئی ۱۱۴۶ھ تک فارس، ماژندران عراق وغیرہ کا سفر کرتے رہے، الغرض ۴۳ برس کی عمر تک دنیا کی لذت سفر سے بہرہ اندوز ہوئے ۱۱۴۶ھ میں ہندوستان آئے ۱۱۸۰ھ بمقام بنارس انتقال کیا، ظاہر ہے کہ ۳۴ سال تک ہندوستان نے مہمان رکھا، تقریباً عمر کا نصف حصہ یہیں گذرا، بہت ممکن ہے شیخ کے یہ خیالات تصنیف تذکرہ ہی کے وقت (۱۱۵۴ھ) تک ہوں بعد میں ان کے خیالات بدلے ہوں، یہ بھی دو حال سے خالی نہیں اگر آپ کے خیالات شروع سے آخر تک ہندوستان اور اس کے باشندوں کے متعلق ویسے قایم رہے، تو پھر زندگی کا نصف حصہ ہند ہی میں گزار دینا چہ معنی دارد، جس ملک سے ایسی نفرت ہو، جس کے رہنے والوں کے اوضاع و اطوار آپکے نزدیک

اسقدر ناپسندیدہ ہوں، پھر انہیں کے ساتھ اتنی مدت تک بسر کر دینا حیرت انگیز امر ہے، (شیخ نے ہند سے سفر نہ کرنے کا سبب قلب بضاعت، بتایا ہے، لیکن یہ عذر قابل قبول نہیں) یقیناً بعض ایسی ہستیاں بھی ضرور ہوں گی، جو "دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست" کا مصداق ہوں، اگر یہ واقعہ ہے کہ ۱۱۵۴ھ کے بعد سے ہندوستان، اور اہل ہندوستان نے آپ کے دل و دماغ پر محبت و الفت کا اثر پیدا کرنا شروع کر دیا تھا جس کے باعث ۱۱۸۰ھ تک یہیں رہ گئے تو شیخ پر ایک بڑا الزام یہ رہجاتا ہے، کہ پھر انہوں نے تبدیل خیال کا اظہار کیوں نہ کیا، اگر واقعۃً شیخ کی نفرت، اور کشیدگی شروع سے آخر تک یکساں قایم رہی تو ان کا ۴۳ سالہ استقرار ایک سخت بوالعجبی ہے، بہرحال ہم شیخ کے خیالات کو جو انہوں نے ۱۱۵۴ھ میں ظاہر کئے تھے ۱۱۸۰ھ تک یکساں تصور کرتے ہیں، اور اب غور کرتے ہیں کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر شیخ نے ہند اور اہل ہند کو دنیا کے سامنے اس صورت میں پیش کیا ہے، میرے خیال میں اس کے مفصلہ ذیل اسباب تھے، لسانی انقلاب، سیاسی پیچیدگیاں، مذہبی اختلاف۔

لسانی انقلاب

تاریخ شاہد ہے کہ اکابر شعرائے فارس ہندوستان میں آئے جو خود نہ آئے انہیں دعوتیں دی گئیں، چنانچہ سعدی، حافظ انوری، جامی، عرفی، صائب سبھوں نے ہندوستان کی تعریفیں کیں، اور اس دریا کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے، جسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی آخر شیخ حزیں کے ساتھ کیا خصوصیت تھی، اس کی بڑی وجہ ہندوستان کا وہ انقلاب تھا، جو زبان اور ذوق شعر پر پڑا تھا، ظاہر ہے کہ شیخ کے قیام ہند کے زمانہ میں فارسی شاعری کا وہ چرچہ نہ تھا، جو جلال الدین محمد اکبر یا عہد ہمینہ کے ابتدائی فرمانرواؤں کے دور میں تھا، عرفی کامیاب ہوئے، صائب بامراد گئے، حافظ کو تحایف پہونچے، مولانا جامی کو خواجہ محمود گادان ہدیہ و تحفے بھیجتے رہے، سعدی کو محمد سلطان نے دعوتیں دیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان میں شعر و ادب کے اندر فارسی ہی کا رواج تھا، ہر چند شیخ کے زمانہ میں بھی فارسی تصانیف پائی جاتی ہیں لیکن شعر و سخن کے لئے اردو مخصوص ہو گئی تھی، چنانچہ اس وقت اردو شاعری کے بڑے بڑے اساتذہ میر تقی، خواجہ میر درد، مرزا سودا وغیرہ کا زمانہ تھا، عام لوگوں کا رجحان اردو شاعری کی طرف تھا، الغرض اردو ملک کا ذوق عام بن چکی تھی، شیخ کے کمالات سے کسے انکار ہے، لیکن جب ملکی ذوق ہی میں انقلاب ہو چکا تھا تو پھر کمال کی قدر کون کرتا، شاعر تو یوں بھی نازک مزاج ہوتے ہیں ممکن ہے "دعوت شیراز" کا لطف نہ آیا ہو، اور یہی شیخ کے جھلانے کی وجہ ہو گئی ہو، اس شعر سے یہ خیال اور بھی راسخ ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں:-

سواد ہند خاطر خواہ باشد بے کمالاں را — نماید خانہ تاریک روشن چشم عریاں را

جناب آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں کہ شیخ جب دہلی میں آئے تو پوچھا ہندوستان میں کوئی بڑا شاعر بھی ہے، لوگوں نے سودا کا نام لیا، مرزا نے خود ملاقات کی، شیخ نے کلام سننے کی خواہش ظاہر کی، مرزا سودا نے کہا:-

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

آزاد مرحوم نے دو روایتیں بیان کی ہیں، ایک سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ نے کہا "در پوچ گویاں ہند نیز ہستی" دوسری روایت بتاتی ہے کہ شیخ نے پوچھا کہ "تڑپے" چہ معنی دارد لوگوں نے کہا کہ طپیدن کو "تڑپنا" کہتے ہیں، شیخ نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا مرزا غضب کیا ایک مرغ قبلہ نما تھا اسے بھی نہ چھوڑا، ہندوستان کے متعلق شیخ کی تلخی طبیعت کا مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں روایتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں، ممکن ہے شیخ نے پہلے ہجو یہ خیال ہی ظاہر کیا ہو، پھر مہمان کی خاطر داری، اور مرزا جیسے معزز شخص کے خاطر سے تعریف بھی کر دی ہو،

سیاسی پیچیدگیاں

حزیں جب ہندوستان میں آئے محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ تھا، یہ حکومت مغلیہ کا دورِ انحطاط تھا، بادشاہ سلامت ہی رنگ رلیاں مناتے تھے تو ملک کا انتظام کون کرتا، طرفہ یہ کہ نادر شاہ نے حملہ کر دیا، ایک غیر ملکی شخص کی آمد، اور فوراً ہی بیرونی حملہ، نادر شاہ حزیں کا ہموطن تھا، ارباب سیاست نے انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا ہوگا جسکی ایک جھلک تذکرہ میں بھی پائی جاتی ہے، ایک جگہ اپنے سفر خراسان کا خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

وچوں بہ یقین می دانستم کہ اوضاع مقتضی ورود نادر شاہ بہ ہندوستان است و بصوبہ کابل درآمدہ بود، اگر حرکت من میسر آمدے ناچار بہمان راہ بودے و طبیعت و بینش اہل ایں دیار مقتضی آنکہ لامحالہ ازرفتن مرا محرک آمدن او دانند۔

شیخ کو تو صرف ہندوستان کے الزام جاسوسی کا کھٹکا تھا، لیکن یہ ہندوستان کی سیاسی زندگی کے لئے جو نازک ساعت تھی اسے حزیں جیسے "فارسی پرست" کیا جانیں، جس کی محبوب چیز معرض خطر و اختلال میں پڑتی ہے تو خیالات کی پرواز اسے کہاں نہیں بہا لیجاتی - الغرض شیخ حزیں کی ناز برداری نہ ہونے کی دوسری وجہ ملک کی سیاسی پیچیدگی تھی۔

مذہبی اختلاف

شیخ نے اپنے عقاید کے متعلق کہیں نہیں لکھا، لیکن تذکرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ مذہب شیعی کے اثنا عشریہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، ہر چند آپ کے خیالات میں فرقہ وارانہ عصبیت اور مذہبی تنگ نظری نہیں پائی جاتی، کیونکہ آپ ایک زبردست عالم اور اعلیٰ درجہ کے محقق تھے، محض تقلیدی عقاید کے آپ پابند نہ تھے، جس کا تذکرہ انھوں نے خود فرمایا ہے، ہندوستان ہمیشہ کمالات کا قدرداں رہا ہے، اور اسے علم و فضل کی قدردانی میں فرقہ وارانہ اختلافات کا خیال نہیں ہوا، چنانچہ اردو کے اکثر سربرآوردہ شعرا مذہب شیعی ہی کے متبع تھے، ہندوستان کا کون سنجیدہ دماغ کہہ سکتا ہے کہ اس کے قلب میں میر، غالب، آتش، انیس وغیرہ کے لئے جذبہ احترام نہیں پایا جاتا، ؟ لیکن شیخ عقاید شیعی کے گہوارہ سے نکلکر ہندوستان میں آئے تو انہیں مذہبی فکر و عقاید کا ایک جدید سماں نظر آیا۔ حکومت کا عقیدہ بھی شیخ سے مختلف تھا، ملک کی بڑی جماعت آپ کے خیالات مذہبی سے اختلاف رکھتی تھی، ممکن ہے، لسانی انقلاب، اور سیاسی شورش کے ساتھ، مذہبی اختلاف نے بھی ملکر کچھ بد دلی پیدا کر دی ہو،

کمالات علمیہ اور ذوق مطالعہ

اگلی سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ شیخ کا خاندان ایک علمی خاندان تھا، اس لئے بچپن ہی سے انہیں علم و فن سے دلچسپی تھی، پھر جیوں جیوں علمی استعداد بڑھتی گئی، کتب بینی کا شوق بھی بڑھتا گیا، اور یہ شوق اسقدر پائدار اور یہ جذبہ اسقدر مستقل تھا، کہ جبتک زندہ رہے تحصیل علوم کا نشہ نہ اترا، فارغ التحصیل ہو چکے ہیں والد کے ساتھ اپنے آبائی وطن لاہجان سے اصفہان کیطرف آ رہے ہیں، رستہ میں رسالہ تشریح افلاک پڑھ ڈالا۔ ہیئیات کے متعلق معلومات حاصل کئے، اصفہان میں پہونچے، تو فرماتے ہیں :۔

دراں بلدہ باز بشوقے تمام و جدے موفور بمذاکرہ و مباحثہ مشغول شدم و روزگارے بجمعیت و آرام داشتم و در مدرس فاضل تحریر مرزا کمال الدین حسن فسوی باستفادہ تفسیر بیضاوی، و جامع الجوامع طبری، و امور عامہ شرح تجرید پرداختم و نزد مولانائے فاضل حاجی محمد طاہر اصفہانی کہ محدث و فقیہ زماں بود کتاب استبصار شیخ طوسی و شرح لمعہ دمشقیہ قراءۃ کردم۔

اس کے بعد شیخ عنایت اللہ گیلانی سے منطق تجریدیہ (جو منطق میں ایک بہترین کتاب ہے) اور کتاب نجات شیخ الرئیس شروع سے آخر تک

پر نظر ڈالی پھر امیر سید حسن طالقانی کے حلقہ درس میں فصوص الحکم شیخ عربی اور شرح ہیاکل النور پڑھی، طب کا شوق ہوا، ایک رات مطالعہ میں مشغول تھے اور فن طب کی کتابیں گرد و پیش جمع تھیں، قریب صبح شیخ کے والد آئے اور کہا جس شخص کو فرصت کا اعتماد ہو تو جو چاہے حاصل کرے، اسے جائز ہے، لیکن تمہیں طول عمر پر ایسا اعتماد کیونکر حاصل ہوا، میں دیکھتا ہوں تمہارا نفس تمہارا جسم گھلا رہا ہے، پھر اس کے بعد چند باتیں تلقین کیں اور پردے اور دعا کرتے ہوئے اٹھ گئے پھر فرماتے ہیں:۔

پس از چندے بخدمت فاضل محقق میرزا محمد طاہر خلف مرزا ابوالحسن قاینی کہ در ریاضیات واسطہ حکمت نادرۂ زمن بود رفتہ مدتے تحصیل و تنقیح رسائل ہیئات و شرح تذکرہ و تحریر اقلیدس و تحریر مجسطی و قوانین حساب پرداختم۔

مختلف مذاہب کی تعلیم کے متعلق انہوں نے ان مذاہب کے مشہور علما سے مذہبی کتابیں پڑھیں، اصفہان میں ایک نصرانی خلیفہ آوانوس تھا اس سے انجیل پڑھی، پھر شعیب ایک یہودی عالم تھا اس سے توریت کا درس لیا، آپ تقلید محض کے پابند نہ تھے، فرماتے ہیں:۔

مرا در مسائل فروعیہ علمیہ کہ مواضع خلاف فقہا بود، اضطرابے و حیرتے روی داد و خاطر مطمئن بہ فتاوائے فقہاء معمول بین الناس نمی شد۔

فکر میں حریت تھی، خیالات مجتہدانہ تھے، فوراً احادیث کا مطالعہ شروع کیا، اسماء الرجال کی کتابیں دیکھیں، اور خود متنازع فیہ مسائل پر اجتہادی نظر ڈالی، فرماتے ہیں:۔

احادیث را اصل و ماخذ دانستہ، بسیارے از کتاب تہذیب الاحکام شیخ طوسی را در مدرس مجتہد زماں آقا ہادی خلف مولانای محمد صالح مازندرانی استفادہ نمودم، و نظر در رجال حدیث و اسناد آں کردم و رجوع بکتب استدلالیہ فقہا و تشخیص طرق استنباط ایشان نمودم و بر کتب فروعیہ حدیث گذشتم و دراں باب جہد موفور کردم تا آنکہ در مسائل کہ مرا احتیاج الیہ و معمول بہ بود بقدر وسع اطمینان حاصل آمد، و از تقلید محض، خاصہ با تخالف آراء و عدم عصمت احدے از مفتیاں کہ مرتکب اقدام است و موقف حیرت فی الجملہ رہائی حاصل آمد

دنیا کے سنجیدہ دماغ تقلید محض کے سخت مخالف رہے ہیں، اور انہوں نے فرقہ وارانہ عصبیت کا جال توڑ ڈالا ہے، شیخ حزیں نے دنیا میں ایک نکتہ سنج اور نازک خیال شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی، وہ بھی تقلید محض کو ایک حیرت کی چیز بتاتے ہیں، ہندوستان میں غیر مقلدین (اہلحدیث) کا وجود مستقبل ہند کی حریت فکری اور کاوش ذہنی و عقلی کا سنگ بنیاد ہے، جس کے شواہد آج بھی نظر آ رہے ہیں، "دی اسپرٹ آف اسلام" کے مصنف نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

عبادت و ریاضت

شیخ نے ابتدائی زندگی کے ریاضت پسندانہ رجحان کا تذکرہ کیا ہے، اور وہ اپنی موجودہ زندگی پر متاسف ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آں قدر از کتب مختلفہ و فنون نشستہ کہ در اندک مدت بہ مطالعہ من در آمد مگر قلیلے از علمائے متبحر را میسر آمدہ باشد و باایں حال رغبتی موفورہ بہ طاعات و عبادات بود، و لذتے عجیب ازاں می یافتم۔

لیلۃ القدر جمعہ اور دوسری متبرک راتوں کو ذکر و شغل میں مصروف رہتے، آپ کا معمول تھا کہ بہتیری سنن اور نوافل کو پابندی سے گذارتے، عبادت اور پاک زندگی کے اثرات کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

دول را طراوت و صفائی و سینہ را انشراحے بود، و ذکر آں احوال چنانکہ بود نتوانم کرد،

پھر فرماتے ہیں:۔ افسوس افسوس چہ دانستم کہ کار بایں درماندگی و دل مردگی و افسردگی کہ اکنوں کشیدہ، خواہد کشید۔

تصنیفات شعریہ شیخ نے اپنی غزلیات، مثنوی، قصائد، رباعیات کے پانچ دیوان مرتب کئے تھے، پہلے دیوان میں تقریباً سات آٹھ ہزار بیت تھے، دیوان ثانی میں دس ہزار بیت تھے، اس میں تذکرۃ العاشقین نامی ایک مثنوی بھی تھی جسمیں عرب کی ایک روایت حسن و عشق سے پلاٹ لیا گیا ہے، جو اصمعی سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں "در طریق طایف سنگے دیدم کہ بریں بیت نوشتہ بود"

الا یا معشر العشاق با اللہ خبروا   اذا اشتد عشق بالفتی کیف یصنع

یہ مثنوی ایک ہزار بیت پر مشتمل تھی۔

۱۱۲۷ھ میں شیخ کے والد نے انتقال کیا، دو برس کے بعد والدہ بھی سیار جہاں ہوئیں اصفہان میں طبیعت نہیں لگی، شیراز میں آئے یہاں اگلے دوست مر چکے تھے، اس زمانہ میں شیخ نے بہت سے اشعار کہے، اور اپنا تیسرا دیوان مرتب کیا، جسمیں تین چار ہزار ابیات تھے، اپنے چوتھے دیوان کے متعلق صرف اسی قدر لکھتے ہیں:۔

"اشعاریکہ دراں مدت گفتہ شدہ بود جمع آوردم و ایں چہارم دیوان خاکسار است"

بوستان سعدی کے طرز میں ایک مثنوی لکھی جس کا نام خرابات رکھا، ہر چند یہ تمام نہو سکی، اسمیں ایک ہزار دو سو بیت تھے، معمہ گوئی کی طرف بھی رغبت ہوئی۔

ایک مرتبہ دوستوں کے ساتھ صحرا نوردی کر رہے تھے، گھوڑا گرا، شیخ بھی گرے، داہنے ہاتھ میں چوٹ آئی اور ایک سال تک اذیت میں مبتلا رہے، اس زمانہ میں بہت سے اشعار کہے، بائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کیا، مثنوی ساقی نامہ جو ایک ہزار بیت پر مشتمل تھی اسی زمانہ کا کلام ہے۔

علمی تصنیفات رسالہ کنہ المرام جو قضا و قدر کے بیان میں ہے، ہندوستان میں لکھا، یہ وہ وقت تھا جب شیخ کی اقامت ہند کا ابتدائی زمانہ تھا، یہ کتاب یقیناً شیخ کی بہترین تصنیفات میں ہوگی، چونکہ ہندوستان کے متعلق جو تاثرات آپ کے قلب میں پیدا ہوئے تھے، انہیں قانون تجدید، یا ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ کہوں تو بیجا نہیں، کہ جذبۂ انتقام کی ایک مہذب اور آراستہ صورت میں ادا کیا ہوگا، مکہ معظمہ میں ایک رسالہ "امامت" تصنیف کیا، اس کے متعلق خود فرماتے ہیں:۔ "بہ سبب اشاعتے کہ در رویا روی داد" مشہد مقدس میں تھے تو چند رسائل لکھے، جن کے متعلق لکھتے ہیں "بسیارے از کتاب رموز کشفیہ" با چند رسالہ دیگر در آنجا تحریر نمودہ ام" کرمانشاہان میں تھے، تو مجربات طب کے متعلق "مفرح القلوب" نامی ایک رسالہ لکھا، اور دوسرا رسالہ "تجرد نفس" بھی اسی مقام پر تصنیف کیا، شیخ ابن العربی کی کتاب فصوص الحکم کے فص ادریسی کے متعلق ایک شرح لکھی، اپنی چند دیگر تصنیفات کے متعلق لکھتے ہیں:۔

رسالہ موسومہ بہ توفیق کہ در توافق حکمت و شریعت است در رسالہ توجیہہ کلام قدمائے حکمائے مجوس در مبدا و عالم و

حواشی بر شرح حکمت اشراق، درر ایح الجنان در رسالہ ابطال تناسخ برائے طبیعین، و شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق، و حاشیہ بر آلہیات شفا و فرائد الفوائد و حاشیہ بر شرح ہیاکل النور۔ و رسالہ در مدائح حروف و فرسنامہ تحریر نمودہ ام۔"

اس سے ظاہر ہے کہ شیخ حدیث، فقہ، فلسفہ، حکمت، کلام، تصوف، شاعری، آلہیات وغیرہ تمام علوم کے ماہر تھے۔

یورپ کی قدردانی ایک انگریز مستشرق ایف سی بلفور نے، شیخ کے "تذکرہ" کا ایک نسخہ دو قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مرتب کیا، اس کا ایک انگریزی ترجمہ ۱۸۳۰ء میں لندن شایع کیا اور اس میں جو تاریخی، اور جغرافی روایا ہیں ان کی تشریح کی۔

وفات صاحب "خزانۂ عامرہ" نے لکھا ہے، ۱۱۸۰ھ میں گیارھویں جمادی الاول کی شب کو انتقال کیا، بنارس میں پہلے سے ایک مقبرہ تیار کرا لیا تھا، یہیں مدفون ہوئے، شیخ کی قبر پر ایک کتبہ ہے، جسمیں خود شیخ کا یہ شعر پایا جاتا ہے:-

حزیں از پائے رہ پیما بسے افسردگی دیدم　　سر شوریدہ بر بالین آسایش رسیدہ اینجا

(باقی ——— باقی)

(حزیں کے کلام پر تفصیلی و جزئی تنقید آیندہ ماہ میں شایع ہوگی)

عبد المالک آروی

چندراوتی

(فسانہ)

رات کو دو بجے مجھے فرصت ہوئی اور اخیر پروف شیٹ پاس کر کے مین نے اُورکوٹ پہنا۔ ٹوپی چھڑی ہاتھ مین لی اور سگریٹ جلاتا ہوا مورننگ اسٹار کے دفتر سے چورنگی پر نکل آیا۔

یون تو ۲۶ دسمبر کو کلکتہ مین ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے لیکن میرے لئے یہ دن بہت انہماک کا تھا اور متحدہ مسلم کانفرنس کے جلسے مین رجو ایک تباہ ہونے والی قوم کے بداخلاقیون کا بہترین نمونہ تھا) صبح کو تین گھنٹے کامل ضایع کرنے کے بعد واپس آیا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور چیف اڈیٹر کی آواز سنائی دی

"احسن مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آجکی گھوڑ دوڑ مین وایسرائے کپ کے لئے شہریار کی کامیابی کے آثار اچھے ہین لیکن چونکہ گھوڑا نیا ہے اور نہایت مخفی طور پر طیار کیا گیا ہے اس لئے نہ لوگون کو حقیقت کا علم ہے اور نہ سر احسان الزمان کچھ بتاتے ہین۔ تم تو انکے پاس آتے جاتے ہو۔ اگر کچھ دریافت کرسکو تو کل گھوڑ دوڑ کی خبر ونکے ساتھ اس کا اضافہ بہت دلچسپ ہوگا" یئن "دیکھئے کوشش کرتا ہون" کہکر ٹیلیفون رکھدیا۔ کانفرنس کی رپورٹ ختم کر کے نیوز اڈیٹر کو دے آیا۔ اور ٹیکسی لیکر سیدہا زمان پیلیس پہونچا لیکن سر احسان بھی باہر جا چکے تھے اسلئے مجھے ناکامیاب واپس ہونا پڑا۔

میرے نوکر نے دروازہ کھولا۔ اور اُوورکوٹ۔ ٹوپی اور چھڑی لیکر آنکھین ملتے ہوے کہنے لگا "حضور۔ دو گھنٹے ہوے سر احسان الزمان نے ٹیلیفون کیا تھا۔ فرمایا تھا کہ جب آپ واپس آئین تو اونھین خبر کر دیجئے گا۔ وہ منتظر رہین گے" مین نے "اچھا" کہکر نشست کے کمرہ مین جاکر ٹیلیفون پر ۷۵۶۵ پارک۔ زمان پیلیس کا نمبر مانگا اور ایک لمحہ مین سر احسان دوسری طرف بولتے ہوے سنائی دئے۔ "جی ہان، ابھی ابھی واپس، ...... ہان صبح حاضر ہوا...... شہریار کی کامیابی ...... حضور دعوت ...... ضرور ...... کیا فرمایا ...... کل گیارہ بجے ...... بہتر ضرور حاضر ہون گا ...... کیا فرمایا ...... رانی چندراوتی ...... نہین ابھی تک تو ...... آج صرف پیڈاک کے قریب دیکھا تھا ...... ضرور ضرور ...... آبیرا ہادس ...... ہان ہان ...... ضرور حاضر ہونگا ...... شکریہ ...... تسلیم" ٹیلیفون رکھ کر مین دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ کل گیارہ بجے شب کو سر احسان الزمان نے مجھے شب کے کھانے پر بلایا تھا اور مہارانی چندراوتی انکی خاص مہمان ہونیکو تھین۔ مہارانی صاحبہ کل آبیرا ہادس مین نو بجے سے گانیوالی تھین اور اوسکے بعد زمان پیلیس مین دعوت تھی۔ لیکن میری سمجھ مین نہ آتا تھا کہ آخر سر احسان اور رانی چندراوتی کا

گیا جو۔ کہ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور مورننگ اسٹار کے چیف اڈیٹر کی آواز آئی۔ "احسن" دیر سے تمھارا نمبر مانگ رہا ہون۔ لیکن جب جواب ملا "مشغول" اسن سول کے آگے پنجاب میل اک مال گاڑی سے ٹکرا گئی ہے چار بجے ریلیف ٹرین جائیگی۔ تم مہربانی کرکے تھوڑی دیر دم لیکر ہوڑہ چلے جاؤ۔ ابھی کسی اور اخبار کو خبر نہین ہے" بہت بہتر کہکر مین نے ٹیلیفون پٹک دیا۔ کمبخت۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ ابھی تو تھکا ماندا گھر آیا تھا اور ابھی یہ حکم کہ پردوان جاؤ۔ اخبار کے نامہ نگارونکی زندگی بھی اک عذاب ہوتی ہے۔

مین نے دوسرے دن دس بجے واپس آکر غسل کیا۔ خدمت گار نے "ڈنر سوٹ" پلنگ پر پھیلا دیا تھا۔ کپڑے بدل کر مین ٹہلتا ہوا آ پیرا ہاؤس کو روانہ ہوگیا۔ راہ مین سوچنے لگا کہ آخر سر احسان الزمان جیسے معزز بیرسٹر نے جن کی عورتون سے نفرت ہر ایک کو معلوم تھی مہارانی چندراوتی اور اونکے ساتھ اور بھی کئی عورتون کو کیون اپنے گھر بلایا تھا۔ جہانتک مجھے علم تھا۔ سر احسان کی بیوی زندہ نہ تھین اور آجتک انھون نے عورت کی اپنے گھر دعوت نہ کی تھی۔ اور عموماً ایسے جلسون اور ایسی جگہون مین کم جایا کرتے تھے جہان عورتین ہوتی تھین پھر ابتدا بھی ہوئی تو مہارانی چندراوتی سے۔ میری کچھ سمجھ مین نہ آتا تھا۔ مہارانی صاحبہ وسط ہند کے ایک اوسط درجہ کی ریاست فتح پور کے راجہ کی بیوی تھین۔ مجھے اسکا پتہ نہ چلسکا کہ یہ مہاراجہ فتح پور کی چوتھی بیوی تھین یا گیارھوین۔ مدت تک یہ حرم سرا مین ایک گمنام زندگی بسر کرتی رہین۔ غالباً انکے وجود کا مہاراجہ کے چند خاص ملازمین کے علاوہ کسی اور کو علم بھی نہ تھا۔ مہاراجہ فتح پور جب ایک وفد کے ساتھ انگلینڈ جانے لگے تو معیت کے لئے انھین کا انتخاب ہوا۔ اور بمبئی پہونچکر مہارانی کا بے نقاب ہونا تھا کہ انکے حسن وجمال کا شہرہ دور دور پہونچ گیا۔ اب تو جس اخبار اور جس میگزین کو اوٹھا کر دیکھو ان کے حالات اور انکی تصویرون سے بھرے نظر آتے تھے۔ کہین مہارانی پوجا کر رہی ہین تو کہین ستار بجا رہی ہین کہین پر شیر کا شکار ہو رہا ہے تو کہین نیزہ بازی کی مشق ہو رہی ہے

یورپ پہونچکر انکا اور بھی شہرہ ہوگیا یہانتک کہ جب وہ مونٹے کارلو پہونچی ہین تو انکی شہرت سے سارا یوروپ گونج رہا تھا۔

نیس اور مونٹے کارلو بحر روم کے کنارے دو ایسی جگھین ہین جہان ساری دنیا کے دولتمند سیر و تفریح کے لئے جمع ہوتے ہین جہان دنیا کی حسین ترین عورتون کا اجتماع ہوتا ہے اور جن مین سے ہر ایک لاکھوں کے زیور سے لدی ہوتی ہے لیکن اس حسین مجمع مین بھی مہاراتی چندراوتی گل سرسبد کی طرح سب سے الگ نظر آتی تھی۔ اوسی زمانہ مین روسی شاہی خاندانکے جواہرات بک رہے تھے۔ اور یورپ اور امریکہ کے کروڑ پتی بڑھ بڑھ کر قیمت لگا رہے تھے مگر مہاراجہ فتحپور نے اتنے دام لگا دئے کہ امریکہ کے کروڑ پتی تاجرون کے چھکے چھوٹ گئے اگر ان تاجرون نے مٹی کے تیل۔ سور کے گوشت، اور دیا سلائیان بنا کر اور بیچکر دولت کمائی تھی تو فتح پور کے مہاراجہ نے سیکڑون برس کے جمع کئے ہوئے خزانے ترکہ مین پائے تھے۔ ہان اتنا ضرور ہے کہ اس ایک خریداری کے بعد فتح پور مین ملازمین کو کئی مہینے تنخواہ نہ ملی۔ بہت سی کمپنیون کے بل ادا نہ ہوسکے رعایا پر ٹکیس دوچند ہوگیا اور پھر بھی مہاراجہ کو نج کی جائیداد کا نصف حصہ رہن کردینا پڑا

جب مہارانی صاحبہ لندن پہونچین تو رٹز ہوٹل کے ان کمرون مین اترین جن مین یا تو چارلی چپلین، ڈگلس فیربینک میری پکفورڈ جیسی ہستیان قیام کرتی ہین یا سابق شاہ اسپین اور سابق شاہ ایران جیسے بیفکر اور آزاد بادشاہ ٹھیرا کرتے تھے خاصہ کے کمرون کے علاوہ۔ احباب۔ مصاحبین اور ملازمین کے لئے مہاراجہ نے کارلٹن ہوٹل کی پوری ایک منزل کرایہ پر رکھی تھی لندن کے انتہائی رونق اور چہل پہل کا زمانہ تھا شہزادی وکٹر شادی کے بعد پہلے پہل مارل برا ہاؤس مین مقیم ہو کر سوسائٹی کے فرائض انجام دیرہی تھین۔ دنکوئنصر لبنگھم یا رانائے مین پولو کے شاندار میچ ہوا کرتے تھے۔ ایسکٹ کی گھوڑ دوڑ اور ہنلے کی کشتی رانی مین جانا ضرور تھا۔ شب کو دعوتین تھین اور پھر رقص کے جلسے۔ تھیٹر تھے اور انکے بعد نائیٹ کلب مین صبح کے چار پانچ بجے تک جام شراب کے دور اور مستانہ وار ناچ۔ سارا لندن کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور ہر جلسہ اور ہر تقریب مین مہارانی موجود رہتی تھین

ایک شب جرمن سفارت مین کھانا تھا۔ کسی بات پر مہاراجہ فتح پور اور کونٹ موسکو وچ۔ روس کے قدیمی شاہی خاندان کے ایک رکن سے کچھ بحث ہوگئی۔ مہاراجہ نے کچھ سخت کہا اور کونٹ نے شراب کا گلاس انکے منہ پر کھینچ مارا دوسری شب کو رچمنڈ پارک مین پوشیدگی سے کونٹ اور مہاراجہ مین (ڈویل) جنگ ہوئی۔ اور دونون ایک دوسرے کی گولی کھا کر گرے اور مر گئے۔

فتح پور مین مہاراجہ کمار کی نابالغی کی وجہ سے ریجنسی قایم ہوگئی، ریاست کا انتظام مجلس انتظامیہ کے سپرد ہو گیا جس کے صدر ایک انگریز مقرر ہوے۔ اخراجات مین کمی ہونے لگی۔ دوڑ کے گھوڑے۔ کتے اور موٹرین نیلام ہونے لگین زاید ملازم برخاست کردئے گئے۔ مہارانیون کے گزارے کے لئے مختصر سی تنخواہین مقرر ہوگئین۔ اور ایسی عورتین جنھین مہاراجہ نے شادی بغیر محل مین ڈال رکھا تھا کچھ دے دلا کر ریاست سے نکال دیگئین۔ چندرا دلی کا بھی یہی حشر ہوا۔ ریاست کے جواہرات فوراً وزیر ہند کے حکم سے چھین لئے گئے اور چند ہی دنون مین یہ غریب عسرت کی زندگی بسر کرنے لگی، مگر مہاراجہ اور کونٹ کی موت نے انکی کافی شہرت کردی تھی۔ ہر اخبار اور ہر میگزین مین انکے حالات اور انکی تصویرین چھپتی تھین۔ اخبار والون نے ہزارون روپے دیکر من گھڑنت افسانے اور خیالی قصے ان کے نامون سے چھاپے۔ صابن منجن۔ اور "سرمہ مسی" والون نے بھی بڑی رقمین خرچ کرکے سندین حاصل کین۔ ناگن کے سے لہراتے ہوے بالون اور موتی کے سے صاف دانتون کی تصویرین لی گئین لیکن وہ عورت جس نے ہزارون۔ لاکھون اپنی ادنی ادنی خواہش پر لٹائے ہون جس نے اپنی آرائش اور آرام پر دولت پانی کی طرح بہائی ہو وہ کیتک اس طرح کی بے مزہ زندگی بسر کرسکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ مین رُونینڈ لاسکی جو امریکہ اور یورپ کے کئی بڑے بڑے تھیٹر و نکا مالک تھا اپنے خاص ہوائی جہاز پر لندن آیا۔ اور ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کرکے دو سال کے لئے ان سے معاہدہ کرلیا کہ ہفتہ مین دو روز مہارانی اسٹیج پر جاکر ناچین اور گائین گی

اخباری تشہیر بھی وہ جادو ہے کہ معاذ اللہ اب تو جس شہر مین مہارانی گانے والی ہوتین وہان ہفتون بلکہ مہینون پہلے سے شہر کے ہر مشہور اور ممتاز مقام پر انکی قد آدم تصویرونکے اشتہار ہوتے۔ کہین پر انکی ہندوستانی زندگی کا منظر ہوتا کہین یورپ کے سفر کے مرقع۔ اور کہین مہاراجہ اور کونٹ سے گولی چلتی دکھائی جاتی۔ غرض اشتہار کے ذریعہ سے لوگون مین ایک

خاص شوق اور ایک خاص ہیجان اور بیچینی پیدا کیجاتی - ہفتوں پہلے سے شہر کے لوگ سوائے اس کے کسی اور مضمون پر گفتگو ہی نہ کرتے تھے - مہارانی کے آنے سے بہت پہلے تھیٹر کے کل ٹکٹ بک چکے ہوتے - قبل سے کسی ایک جگہہ دو ایک دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ظاہر نہ کیا جاتا - لیکن اگر پبلک مین مزید شوق دیکھا جاتا تو دو ایک دن اور بھی ٹھہر جاتین - ایک کے بدلے دو تین تماشے ہوتے - ٹکٹ کے دام دو گنے تگنے کردئے جاتے الغرض لاسکی نے مہارانی کے ذریعہ سے اور مہارانی نے لاسکی کے ذریعہ سے کافی دولت حاصل کی

دو برس کے بعد جب لاسکی کے معاہدہ کی مدت ختم ہوئی تو امریکہ اور یورپ کے تھیٹر والون مین لاگ ہوگئی - لیکن چندراوتی نے چونکہ اتنے دنون مین اچھی طرح دنیا دیکھ لی تھی اور وہ اپنے حسن کی جادو گری اور اپنی جوانی کی مقناطیسی قوت سے آگاہ تھین اسلئے خود انھون نے براہ راست اپنا کاروبار شروع کیا - اور خود اپنے انتظام سے رقص وجمال کے تماشے دکھانے لگین - مغربی رئیسون کو بھی آنے جانے کا موقع دیا گیا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہُن برسنے لگا اور دولت کی انتہا نہ رہی - پانچ سال تک مہارانی یورپ - امریکہ - جاپان - اور چین کے دورے کرتی ہوئی ہندوستان آئین - اور بمبئی مین صرف ایک شب گا نیکے بعد آج کلکتہ کے "پیراڈاوس مین والسرائے اور امراء ہند کے سامنے نغمہ زن ہونے والی تھین

مین انھین خیالات مین ڈوبا ہوا "پیراڈاوس" پہونچ گیا - سامنے فوج کا پہرہ تھا - مورننگ اسٹار کے نامہ نگار ہونیکے وجہ سے مجھے ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہ تھی - ہال مین رستم جی منیجر ملے اور اونھین کے ساتھ مین بھی ایک کونہ مین کھڑا ہو گیا - سارا تھیٹر جواہرات سے جگمگا رہا تھا - والسرائے اور گورنر کے علاوہ بہت سے امراء جمع تھے "اسٹیج پر مہارانی" گا رہی تھین ہندوستان کا ہر راجہ اکٹھا کیا گیا تھا - انکی وردیان زرق برق تھین انکے آگے بیس پچیس حسین کمسن عورتون کا مجمع تھا اور انکے جھرمٹ مین مہارانی ناچ ناچ کر اور بھاؤ بتا بتا کر گا رہی تھین انکے لباس اور انکے زیورات کا حال بیان کرنیکی مجھمین طاقت نہین ہان اتنا ضرور کہونگا کہ گویا ریاست فتح پور کے دئے ہوئے جواہرات چھن گئے تھے لیکن فتح پور جیسے بیسون والیان ریاست اور مغربی لارڈ اور کروڑپتی تاجرونکے دئے ہوئے جواہرات مہارانی کے جسم پر چمک رہے تھے - انکا حسن اب بھی باقی تھا - جسم مین ابھی تک چھریرا پن موجود اور انداز رعنائی مین ابھی تک جادو بھرا تھا - مالکوس گا رہی تھین اور اس پایہ سے گا رہی تھین کہ انگریز بھی سر دھن رہے تھے اور لیڈیان بھی موسیقی سے متاثر ہو کر پانون پٹک رہی تھین - مالکوس کے بعد ایک انگریزی گانا شروع ہوا جو وادرا کے طرز پر بندھا ہوا تھا اسکے ساتھ کہروا ناچ نے مجمع کے ہر فرد کو آپے سے باہر کر دیا تھا - سب سازندے تھے صرف میان مراد علی پٹنہ والے کی سارنگی بج رہی تھی - انکا جبہ پوری صافہ - گلابی کمخواب کی شیروانی گلے مین اور موٹی طلائی زنجیر سازندو نمین انھین ممتاز بنائے ہوئے تھی انکے سیاہ گلمچھے اور گھنی مونچھ اور پھر تان کی ہر لپیٹ اور تارون پر انگلیون کی ہر سوت کے ساتھ انکے سر کا ہلنا اور ہر کن اور مُرکی پر انکے منہ کا بننا بگڑنا بہت پر لطف منظر تھا - میان ریاضی بھی آہستہ آہستہ ٹھیکا دئے جا رہے تھے - اور جب بایان دبنے لگتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑا کبوتر بول رہا ہے اور دل مین ایک خاص گدگدی سی

معلوم ہوتی تھی غضب کا سمان تھا۔ رقص کے اختتام پر تحسین کا ہنگامہ تالیوں کا شور ہوا۔ مہارانی ایک عجیب انداز دلربائی سے سر جھکائے کھڑی رہنے کے بعد اسٹیج سے اوتر کر وائسرائے کے سامنے گئین جنھون نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ مبارکباد دی اور پھر رخصت ہوئے۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ مین بھی باہر نکل آیا اور ٹیکسی لیکر زمان پیلس پہونچا

زمان پیلس دلھن کی طرح سجا ہوا تھا۔ باغ کے ہر ہر درخت کی ڈالیون اور روش کے کنارے کنارے جھاڑ یونمین قمقمے روشن تھے سر احسان مہمانون کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ میرے پہونچتے ہی مہارانی چندر راوتی اپنی بہت بڑی۔ ہسپانو سوئزا۔ سوہارس پاور کی موٹر پر تشریف لائین۔ یہ گاڑی اونھون نے خاص اپنی فرمائش سے بنوائی تھی اور خالص چاندی کی تھی دروازونکے دستے سونیکے تھے۔ اس گاڑی کی تصویرین مین کئی بار دیکھ چکا تھا مگر اسوقت جو اسے دیکھنے کا موقع ملا تو مین حیران رہگیا

جب مین ڈرائینگ روم مین داخل ہوا تو تمام مہمان جمع تھے جن مین سر جیمس فریزر چیف جسٹس سر چارلس فرگوسن پولیس کمشنر۔ جنرل سر ہنری اسٹوارٹ بنگال کی فوجونکے افسر اعلیٰ جسٹس کمارناتھ بینرجی وائس چانسلر نواب محسن علی آف براج پور کرنل بچانسلر پرنسپل میڈیکل کالج۔ راجہ سرندر ناتھ سین صدر مجلس سونہ رای خاص طور پر قابل ذکر ہین

میرے والد سر احسان الزمانکے منشی تھے اور انکے انتقال کے بعد سر احسان ہی نے مجھے تعلیم دلوائی تھی۔ کیمبرج بھیجا تھا۔ صحافت کی تعلیم دلوائی تھی اور اونھین کی سفارش سے مورننگ اسٹار جیسے معزز انگریزی اخبار کا نامہ نگار ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے اور مجھے پیلس کی ہر دعوت اور ہر تقریب مین بلایا کرتے تھے

زمان پیلس کا ڈرائنگ روم کلکتہ کا سب سے عمدہ اور آراستہ کمرہ تھا یورپ کے متعدد رسالونمین اسکے فوٹو نکل چکے تھے اس کمرہ قلمی تصویرین۔ اسکے ایرانی قالین۔ سیکڑون برس کے قدیم چینی کے گلدان اور کھلونے۔ ہاتھی دانت کے مجسمے اور سامان آرائش ایسی چیزین تھین جو دنیا مین نایاب تھین اور جنھین دیکھے بغیر کوئی امریکن سیاح کلکتہ سے چلا نہین جاتا تھا

مہارانی کے کمرہ مین داخل ہوتے ہی دوسرے مہمانون نے انکے گرد جھرمٹ کر لیا۔ سر احسان نے ایک ایک سے تعارف کرایا اور سبھون نے اپنی خوش قسمتی کا اظہار کیا۔ مہارانی کی اعلیٰ موسیقی اور بہترین رقص کا ہر شخص معترف تھا اور ہر شخص کی زبان سے واہ واہ اور سبحان اللہ نکل رہا تھا۔ خادم نے مودب لفظون مین خاصہ چنے جانیکی اطلاع کی۔ سر احسان نے مہارانی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور وہ مسکراتی ہوئی انکے بازو پر سہارا دیکر کھانے کے کمرہ کی طرف بڑھین۔ چھپی ہوئی فہرست ہم سبھونکو پہلے ہی مل چکی تھی جسمین میز کے گرد ہر ایک کی مخصوص جگہہ بنی ہوئی تھی اور ایک ساتھ جانیوالے مرد عورت کے نام لکھے تھے۔ ہر ایک اپنی لیڈی کا ہاتھ اپنے ہاتھ مین لیکر پیچھے ہولیا۔ مین راجہ کمارناتھ کے ساتھ سبھونکے عقب مین تھا

زمان پیلس کے کھانیکے کمرہ کے بلورین میز اور بلورین کرسیان بوہیمیا کے شاہی محل کی تھین۔ جنگ عظیم کے بعد جب اس خاندان سے تخت چھن گیا اور شاہزادے آوارہ وطن ہوگئے تو سر احسان نے ایک ایجنٹ کے ذریعہ سے اسے ایک کثیر رقم دیکر حاصل کیا تھا۔ دور سے انگریزی باجونکی دلکش آواز آنے لگی اور کھانا شروع ہوا۔ ہر شخص ہنس ہنس کر باتین کر رہا تھا

لیکن سبھون کی نظر مہارانی کی طرف تھی اور سب انھین کی باتین سننے کے مشتاق تھے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد سر احسان کھڑے ہو گئے گفتگو بند ہو گئی اور ہر شخص انکی طرف مخاطب ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ سر احسان نے آہستہ آہستہ رک رک کر اپنی تقریر شروع کی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کسی جذبے کو روکنے کی کوشش کر رہے ہین۔ انکی انگلیان کانپ رہی تھین اور وہ رہ رہ کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے جا رہے تھے

''میرے معزز دوستو۔ یہ کوئی سیاسی مجمع تو ہے نہین۔ صرف میرے چند خاص احباب کی محبت ہے۔ جنھون نے میری ناچیز دعوت قبول کرکے مجھے ممنون ہونے کا موقع دیا ہے۔ آج مین اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرون مجھے زیبا ہے۔ کیونکہ فخر جہان۔ بلبل ہندوستان مہارانی چندراوتی صاحبہ نے میرے گھر آکر مجھے دنیا کا سب سے خوش قسمت شخص بنا دیا ہے۔

حضرات۔ آپ مین سے کون ایسا ہے جو برسون سے مہارانی کے دیکھنے کا متمنی نہ تھا۔ اور مین دعوی کے ساتھ کہسکتا ہون کہ اخبارون اور رسالون کے ذریعہ سے مہارانی کی جو تصویر ہمنے اپنے دلون مین کھینچی تھی۔ اوس سے انھین کہین بڑھ کر پایا دوستو۔ آخر جادو ہے کیا؟ جادو نام ہے حسن کا۔ آواز کا اور دولت کا اور اگر دنیا۔ اور آجکل کی روشن خیال اور ترقی یافتہ دنیا مین کوئی سچا جادوگر ہے۔ یا یہ کیون نہ کہون کہ جو خود مجسم جادو ہے وہ ہماری مہارانی صاحبہ مین انکا دسرپا حسن وجمال۔ انکا دلکش ترنم۔ انکی بے پایان دولت اگر جادو نہین تو کیا ہے۔ (تحسین کے پر زور نعرون اور گونجتی ہوئی تالیون نے اس مدح سرائی کی تائید کی مہارانی شرم سے سر جھکائے اپنی انگوٹھیون سے کھیل رہی تھین۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا)۔

''حضرات۔ مین ڈرتا ہون کہ آپ نے ان جملون کو شاعرانہ تخیل سمجھا ہو۔ مگر مجھے بتائیے کہ ہندوستان مین زہرہ بائی اور بی حیدر سے لیکر بی گوہر اور بی نور جہان تک اور کالکا بندا دین سے بی چودھرائن تک کون ایسا تھا اور ہے جسکے رقص و سرود مین وہ اثر ہو جو مہارانی کے ناچ گانے مین ہے۔ اور یورپ مین مدام پاؤالدوا اور مدام لاپاکو دا۔ ٹٹرازینی اور گھیلی کرسی یا ڈیم کلارا بٹ انمین سے کون ہے جو ہماری مہارانی کا مقابلہ کر سکے۔ نہین۔ دوستو مین سچ کہتا ہون کہ مہارانی کے کمال پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے بجا ہے اور مغربی مہذب تو مین انکی جتنی عزت کرین کم ہے'' (تحسین کا شور)۔

سر احسان اتنا کہکر خموش ہو گئے۔ پانی کا ایک گھونٹ پیکر چہرہ کا پسینہ پونچھا اور اب جو اپنی تقریر کا سلسلہ شروع کیا تو بہت دھیمی آواز مین اور اس طرح جیسے اپنی کسی بات پر نادم ہون۔

''لیکن میرے دوستو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دلمین کہہ رہے ہونگے کہ مجھ جیسے زاہد خشک کو رقص و سرود سے کیا تعلق۔ تو سنئے آج مین اپنے اُس راز کو ظاہر کرتا ہون جو آج پندرہ سال سے میرے دلمین پنہان ہے اور اسوقت مین اوس مُہر کو توڑنے کھڑا ہوا ہون جو میرے لبون پر ایک مدت سے لگی ہوئی ہے''

اتنا کہکر سر احسان بیٹھ گئے اور سارے مہمان کسی غیر معمولی اثر سے متاثر ہو کر انکی طرف جھک گئے۔ مین نے دیکھا کہ مہارانی گھبرا گھبرا کر متاثر ہو کر انکی طرف دیکھتی اور کچھ کہنا چاہتی تھین۔ لیکن چپ رہجاتی تھین انکا گلاب سا چہرہ افسردہ ہو گیا تھا۔ اور

پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ سر احسان نے پانی کا پھر ایک گھونٹ پیا اور بیٹھے ہی بیٹھے کہنا شروع کیا۔ کمرہ میں سناٹا تھا ہماری سانسین تیزی سے چل رہی تھین۔ خادم کمرہ سے باہر چلے گئے تھے

"دوستو۔ آج سے پندرہ سال قبل مین شہر گیا مین ضلع کا ایک معمولی بیرسٹر تھا۔ چھوٹی جگہ تھی۔ دکیلون کا زور تھا۔ میرا اپنا آبائی مکان تھا مختصر سی جائیداد بھی تھی۔ سادہ زندگی تھی۔ خوشی کے ساتھ سفید پوشی سے کٹ جاتی تھی۔ میری شادی خاندان ہی مین ہوئی تھی۔ لیکن میری بیوی کا شادی کے دوسال بعد انتقال ہوگیا تھا۔ صرف ایک لڑکا تھا" سر احسان کچھ دیر کے لئے پھر چپ ہو گئے۔ مین نے دیکھا کہ ہماری کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ سانس چڑھ رہی تھی اور آنکھون سے خوف کی جھلک نمودار تھی، سر احسان کی آواز اور بھی دہیمی تھی۔ اور گویا وہ ہمارے سواکسی دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے یا اپنے دل سے بول رہے تھے

"میرے بچے نے میری مان باپ کے ساتھ پٹنہ مین پرورش پائی تھی۔ وہین پڑھتا بھی رہا تھا۔ صرف چھٹیون مین میرے ہان چلا آیا کرتا تھا۔ اب جوانی کا آغاز تھا۔ مسین بھیگ رہی تھین۔ بی۔ اے کا امتحان دیکر میرے پاس آیا تھا۔ مین نے اوسکی دلبستگی کے لئے گراموفون منگا دیا تھا۔ ناول خرید دیئے تھے۔ گھوڑا لے دیا تھا۔ غرض اسکی دلجوئی مین ہر طرح کوشان تھا۔ اور اس پر اپنی جان فدا کرنیکو ہر طرح موجود تھا۔ اسوقت یہ اپنی مان سے بہت مشابہ تھا۔ اور جب مین اسے دیکھتا تھا تو اسکی مان کی تصویر میری آنکھون کے سامنے آجاتی تھی" (باوجود ضبط سر احسان کے آنکھون سے آنسو ٹپکنے لگے اور ہر شخص انکی یہ حالت دیکھکر بہت متاسف تھا)

"ایک روز مین ایک سنگین مقدمہ مین مشورہ کے لئے کہین گیا ہوا تھا۔ دیر ہوگئی۔ رات کے بارہ بجے واپس آیا۔ اور سو رہا۔ دو بجے ہونگے کہ ایک جگر خراش چیخ کی آواز آئی اور مین چونک کر اوٹھ بیٹھا۔ دوسری بار پھر چیخ کی آواز آئی اور بیقراری کے ساتھ تڑپ کر مین مکان کے اوس طرف دوڑا جہان میرا بچہ سویا کرتا تھا۔ لالٹین دہیمی جل رہی تھی۔ مین نے قریب پہونچکر دیکھا کہ میرا بچہ پلنگ کے کنارے بیٹھا دونون ہاتھون سے کلیجہ کو سنبھالے جھکا ہوا خون تھوک رہا ہے۔ یہ دیکھکر بیقراری اور بیتابی سے ایک دل ہلادینے والے کرب کے ساتھ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ مین نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اُسے سینے سے لگا لیا۔ اوسکی حالت پوچھی اور اوسنے رک رک کر ہچکیان لیکر اپنا دکھڑا سنایا۔ مین نے خادم کو جگایا۔ ڈاکٹر کے گھر بھیجا۔ مگر بھلا دو بجے رات کو ڈاکٹر جلدی کیا آسکتے تھے دیر ہوئی۔ مین سر پیٹتا رہ گیا۔ اور میرے بچے نے میری گود مین تڑپ کر جان دیدی" (سر احسان کے ہچکیان بندھی تھین۔ آنکھون سے آنسو جاری تھے)۔

"دوستو۔ اب میرے لئے کیا باقی رہگیا تھا۔ دنیا آنکھون مین اندھیر تھی اور زندگی برباد۔ ایک مدت تک میری حالت دیوانون کی سی رہی۔ سخت علیل ہوگیا۔ تبدیل آب وہوا کے لئے یورپ چلا گیا۔ ڈیڑھ سال کے بعد جب گیا واپس آیا تو ہر کونہ مین خون کے دھبے نظر آنے لگے۔ رہ رہکر جگر خراش چیخ کی آواز سنائی دینے لگی۔ گھر کاٹے کھاتا تھا۔ مین نے اسے بیچ کر اسکی قیمت یتیم خانہ کو بھیجدی اور کلکتہ آکر پریکٹس شروع کی۔ خدا نے میری زبان مین اثر دیا۔ کام اچھا چلنے لگا۔ مقدمات نکلنے لگے اور دو تین سال مین ایک مشہور اور نامی بیرسٹر ہوگیا"

سبھون نے سمجھا کہ یہ دکھ بھری داستان ختم ہوگئی۔ مگر گو مین سر احسان کی تقریر کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا میری نظر مہارانی کے چہرہ پر تھی۔ ایک عجیب انتشار اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ سر احسان نے پھر شروع کیا "حضرات آپ یہ سننے کے منتظر ہونگے کہ آخر میرے بچے کو ہو کیا گیا تھا

"میرے دوستو۔ گیا مین میرا مکان اوس سڑک پر تھا جو چوک کے پشت پر واقع ہے۔ میرے مکان کے سامنے متنانامی ایک طوائف رہتی تھی اور اوسکی ایک لڑکی تھی تارہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" سر احسان کی زبان سے یہ نام نکلا ہی تھا کہ مہارانی کے منہ سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی "نواب صاحب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھین لیکن سر احسان نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ مہارانی چپ "دوستو۔ جس زمانہ کا مین ذکر کر رہا تھا۔ تارہ اون دنون جوان ہو رہی تھی اسکے حسن کے چرچے ہونے لگے تھے۔ ذہین اور طرحدار تھی۔ اچھا گانے لگی تھی۔ مجرے شروع ہو گئے تھے۔ اور دو ایک ریاستون مین بھی ہو آئی تھی میرا بچہ اپنے شباب کے آغاز مین اوس پر عاشق ہو گیا۔ وہ مجھسے چھپ چھپ کر اسکے گھر جانے لگا۔ مگر اسکے گھر بھی کسی راجہ کا ملازم آیا ہوا تھا۔ تارہ کی مان نے اسے آنے جانے سے منع کیا۔ مجھے مطلع کر دینے کی دھمکی دی۔ مگر کمسن بچہ اور وہ بھی پہلا عشق تارہ ابھی اسکی طرف ملتفت تھی۔ آخر ایک دن مان بیٹی مین بحث ہو گئی۔ مان نے عشق کی آزمائش کے لئے تارہ سے فرمایش کی کہ وہ میرے بچے کو شراب پلائے۔ دوسری رات جب میرا بچہ گیا تو تارہ نے شراب پلائی اس نے انکار کیا۔ لیکن جب تارہ نے یہ کہا کہ مان نے عشق کی یہی آزمایش رکھی ہے تو اسنے پیلی۔ دوستو۔ ممکن ہے کہ تارہ کو نہ معلوم ہو کہ اس شراب مین کیا ملا تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس شراب نے چند گھنٹون مین مجھسے میرے جگر کے ٹکڑے کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کر دیا"

"دوستو۔ دم توڑتے ہوئے بچے نے مجھسے دو وعدے لئے تھے۔ ایک تو یہ کہ اسکی اس طرح کی موت کی کسی کو خبر نہ دونگا۔ میرا بچہ بڑا غیور تھا اسے عزت کا بڑا خیال تھا۔ اور مرتے وقت بھی یہی خیال تھا کہ خاندان کے نام پر دھبہ نہ لگے۔ اور دوسری یہ فرمایش تھی کہ مین اپنی بیوی کے زیورات تارہ کو دیدون کیونکہ وہ تارہ سے انکا وعدہ کر چکا تھا"

"میرے عزیز دوستو۔ پہلی فرمایش مین نے آج تک پوری کی۔ لیکن دوسری فرمایش کے لئے جب مین نے پوری سے واپس آکر سنا اور تارہ کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دونون اس کے مرتے ہی شہر سے کہین اور مقام پر چلی گئی تھین۔ مین نے بڑی کوشش کی مگر پتہ نہ چلا"

(سر احسان پھر چپ ہو گئے۔ اور مین نے دیکھا کہ چیف جسٹس اور پولیس کمشنر متوحش نظر آرہے تھے)

"دوستو۔ میری داستان ختم ہو گئی۔ صرف چند کلمے اور ہین۔ ابھی چند دن ہوئے مین ایک مقدمہ مین بمبئی گیا ہوا تھا وہان ایک رات جی گھبرایا تو تھیٹر چلا گیا۔ مگر آپ میری حیرت کا اندازہ نہین کر سکتے جب مین نے دیکھا کہ وہی تارہ اسٹیج پر کھڑی گا رہی تھی۔ مزید احتیاط کے لئے مین نے اپنا کارڈ بھیجا اور انکے ڈریسنگ روم مین انسے ملاقات کی۔ یہ مجھے بالکل پہچان نہ سکی کیونکہ میرا نام بدلا ہوا تھا پہلے داڑھی نہ تھی اور اب سفید داڑھی ہے۔ بہرحال مجھے یقین ہو گیا کہ تارہ یہی ہے۔ حضرات مین اتنی مدت کے بعد آج اپنے بیٹے کی قاتلہ سے بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ دلمین ہزارون طرح کے جذبے پیدا ہو رہے تھے۔ بچے کی صورت

قصداً اسلئے اٹھایا تھا کہ میرے ملازم حسن کو جنھیں کرد لوگ عام طور سے حسن عتیکہ (یعنی عجائب خانے مین رکھے جانے کے قابل حسن) کہتے تھے کچھ دنون سے خانہ آبادی کا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور مجھے برابر ترک ملازمت کا نوٹس دیتے رہتے تھے مین نے خیال کیا کہ شاید لڑکی میری اس مشکل کا حل ہو جائے اور مین حسن بغدادی کا گھر بسا سکون۔ لڑکی نے نوکری کرنا قبول کر لی۔ اور تھوڑے دنون کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ باہیہ خانم حسن آفندی کو میری نظر سے نہین دیکھتین تو مین نے اپنے دوست قاضی حسام الدین علی کو بلا کر حسن و باہیہ خانم کو میاں بیوی بنا دیا۔

(۳)

اس خانہ آبادی کو مشکل سے دو مہینہ ہوئے ہونگے کہ بغاوت کردستان کی چنگاریان دشت شیرزور مین مشتعل ہو گئین مین گرفتار رہا۔ لوٹا گیا۔ اور تقریباً پانچ ماہ تک حیات و موت کے درمیان امید و بیم کی زندگی گزاری۔ جب بغاوت فرو ہوئی اور امن و امان قائم ہوا تو مجھے اپنے ملازم و ملازمہ کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ دونون میری گرفتاری کے بعد ہی کسی نہ کسی طرح روپوش ہو گئے اور پھر یہودیون کے ایک قافلہ کے ساتھ شیروان کے گھاٹیون کی راہ سے مخالفین بھاگ گئے۔ عرصہ کے بعد جب مین کردستان کے سیاسی مہم کے بعد بغداد کو واپس ہوا تو ایک شام میری طبیعت بہت گھبرائی جی مین آیا کہ کسی رقص خانہ مین جا کر دل بہلاؤن۔ خلیل پاشا جادہ سی کے سرے پر یہودیون کا ایک رقص خانہ حال ہی مین قایم ہوا تھا اور اس مین ایک گانے والی لڑکی کی خاص شہرت تھی۔ میرے آنے سے تھوڑی دیر پہلے لڑکی کا ناچ شروع ہو چکا تھا۔ لڑکی طاہر ہمدانی کی غزل کو کردی لب لہجہ سے گا رہی تھی۔ مین بالکل اسٹیج کے نیچے اول صف مین بیٹھا ہوا تھا کہ غزل کے آخر پر لڑکی نے ایک کردی رقص کیا۔ حاضرین سے پرجوش داد کا ہنگامہ بلند ہوا اور لڑکی کو پھر اسٹیج پر واپس آنا پڑا۔ اور عرب کے دستور کے مطابق چھوٹے مگر قیمتی سکے بعض شایقین نے اسپر نچھاور کئے۔ لڑکی گھوم کر میری طرف آئی۔ میری جیب مین اسوقت چند پیسے اور اکنیان تھین۔ میری دریادلی بھی جوش مین آئی اور چونکہ ہم ہندوستانی اور خصوصاً وہ جنکا تعلق فوج سے ہوتا تھا۔ اپنی سخاوت کے لئے بغداد مین کافی شہرت رکھتے تھے۔ لڑکی نے میرے عطیہ پر حسن ظن سے کام لیا اور پاس آکر ان سکون کو چننے لگی۔ اتفاق سے سب سے پہلے اسکے ہاتھ دو پیسے لگے۔ پہلے سمجھی کہ اکنیان ہین۔ روشنی مین اسکو غور سے دیکھا اور پھر مجھے سر سے پیر تک۔ مین نے بھی روشنی کی مدد سے اسکو قریب سے دیکھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہم دونون ایک دوسرے کو پہچانتے ہین۔ وہ مسکرا کر پیچھے ہٹی اور پھر اپنے کردی لہجے مین ہندوستانیون کی برائی کے وہ عربی مصرعے جو بغداد کے ہر بازاری لڑکے کی زبان پر رہتے ہیں گانا شروع کیا۔

ہندی بابا بطال۔ اکال البندی و الدال (ہندی بابا کاہل، دال اور بھنڈی کا کھانے والا) وغیرہ

اسی کے ساتھ وہ میرے دونون پیسون کو دونون ہاتھ مین لیکر میری طرف شوخی و شرارت سے اشارہ کرتی۔ اور پھر قہقہہ لگاتی اور رقص کرتی۔ اور مجلس مین ہنگامہ برپا ہوتا۔ مین سمجھ گیا کہ یہ کون لڑکی ہے مین سر جھکائے خاموش آخری ڈراپ سین تک بیٹھا رہا شے کے ختم کے بعد مین نے اسٹیج منیجر کو بلا کر کان مین کہا کہ مین اس رقاصہ سے ملنا چاہتا ہون۔ جس نے مجھے ایسا شرمندہ کیا ہے

تاکہ مین اسکی تلافی کرسکون۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے آکر کہا کہ اٹھئے۔ رقاصہ کو خود آپکی ملاقات کا اشتیاق ہے۔ اور وہ آپکو پہلے سے جانتی ہے۔ غالبًا اس کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ مین اپنی پرانی خادمہ باہیہ خانم کے سامنے کھڑا تھا۔ اور اس کایا پلٹ پر حیرت زدہ تھا

"باہیہ خانم" ! مین نے مستعجبانہ لہجے مین کہا "مین خواب تو نہین دیکھ رہا ہون۔ اس پر مجھے تعجب نہین کہ تم ایسی حسین وجمیل کیون ہوگئی۔ جس حالت نے تمھاری فطری قومی خوبیون کو مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اسکے بالکل متضاد حالت نے اسکے بڑھانے مین البتہ مدد کی۔ مگر مین یہ نہ جانتا تھا کہ تمھارا میلان اس فن کی طرف تھا۔ اور اس مشکل فن کو تم اتنی جلد حاصل کرلوگی۔ خیر مین تمکو مبارکباد دیتا ہون۔ خوش رہو۔ اور تمھارا شوہر حسن کہان ہے"

"حسن۔ حسن۔ کیا کہا میرا شوہر۔ لڑکی نے نہایت ترش لہجے سے کہا۔ آہ آفندی۔ اسکا نام نہ حسن ہے نہ وہ مسلمان ہے۔ اور میری بڑی توہین ہے کہ میرے معمولی بدصورت سارنگی نواز یہودی حزقیل کو میرے شوہر سے خطاب کیا جائے اسکے بعد لڑکی نے کہا یہان آپ اپنے حسن عتیکہ سے ضرور ملاقات کرینگے۔ حزقیل۔ حزقیل۔ کم بخت کہان گم ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے آپکو اسنے اسٹیج پر سے دیکھ لیا اور غائب ہوگیا۔ کیا افندی۔ آپ نے کبھی کسی مسلمان کی بھی ایسی ناک دیکھی ہے۔ ہان بھول گئی آپ ہندی ہین۔ عرب کا معمولی بچہ بھی اس ناک سے دھوکا نہ کھاتا۔

مگر خیر۔ اب اسکی مجال نہین کہ میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھے۔ اور مین اپنی اس حالت سے خوش ہون۔ گو روسیاہ ہون مگر مین جانتی ہون کہ اسکی ذمہ داری مجھ پر نہین بلکہ آپ پر ہے یا آپکے قاضی صاحب پر۔ مین نے کہا خانم۔ یہ تم نے عجیب بات کہی کہ یہودی قوم ایک مخصوص وضع کی ناک رکھتے ہین۔ کیا سعید آفندی کی ناک اس سے بڑی اور لال نہ تھی مگر وہ کروی تھا اصیل اور اگر مین بالفرض نادانستہ گناہ کا ملزم ٹھہر سکتا ہون تو ہمارے قاضی علی حسام الدین کا کیا قصور جنکی بزرگی و پارسائی مین شک کرنے والا کافر ہے۔ لڑکی قاضی کا نام سنتے ہی تلملا اُٹھی نہایت سخت و مکروہ الفاظ سے ان کو یاد کیا اور بولی اب آپ مجھ سے سارا قصہ سن لیجئے۔ اگر سننا چاہتے ہین

(۵)

"آفندم۔ میرا باپ کوئی سنجاق کی طابور (رجمنٹ) کا امام تھا۔ اور اُسی کوئی سنجاق کے ضلع مین حسام الدین قاضی تھا مین خود اس سے پہلے سے واقف نہ تھی۔ اور مین نے اسکو پہلی بار اس روز دیکھا۔ جب وہ میرا نکاح پڑھانے آیا تھا اُسکے بعد جب وہ کبھی آپ سے ملنے آتا تو مجھے اسکے سامنے جاتے ہی بہت تردد ہوتا کیونکہ باوجودیکہ وہ سن مین میرے باپ سے بھی بڑا تھا۔ مگر اسکی نگاہیں بہت ہی مشتبہ تھین۔ ایکبار اسنے مجھے علیحدہ پایا۔ اور میرے باپ کا حال دریافت کرکے بولا کہ ارے تو تو میرے گود کی کھلائی ہوئی بچی ہے۔ تیرا باپ میرا بڑا دوست تھا۔ بلکہ اُنکے مرنے کے بعد رجمنٹ کی کمپنی نے اسکے سارے ورثہ کی تقسیم میرے سپرد کردی تھی۔ وہ سارا مال میرے پاس امانت ہے۔ اب تم آفندی کے یہان کی نوکری چھوڑکر میرے پاس آجاؤ تاکہ مین تیرے باپ کی

تمکو بسر دکر دون - جب مین قاضی کے پاس گئی تو مجھ سے کہنے لگا کہ ہاں اس شرط پر دیا جائیگا کہ تو اپنے خاوند سے طلاق لے لے - مین تیری شادی بہتر جگہ کرادونگا - مین نے کہا قاضی - اگر تم حسن سے میری گلو خلاصی کرانے کا کوئی طریقہ بتادو تو مین تمھاری بہت احسانمند ہونگی - مجھے اس سے خود نفرت ہے - مگر مین کیا کرون - افندی نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا - اور اب ہمارے لئے اس سے خلاص پانے کی صورت شرعی حیثیت سے تو ممکن نہین - قاضی نے غور کیا اور کہا ایک صورت سمجھ مین آتی ہے - فتاوی برہانی مین تین سو ساٹھ کلمات کفر دیئے ہوئے ہین جن مین سے ایک بھی اگر کوئی مسلمان کہدائے تو وہ اسی وقت مرتد ہوجاتا ہے - اور اسکی عورت اسکے نکاح سے باہر ہو جاتی ہے - ہم لوگ ایسی مشکلات کو اسی طرح حل کیا کرتے ہین - اچھا تو کسی روز مین آؤنگا اور آفندی کے سامنے حسن سے ایک جملہ انھین کلمات مین سے کہلادونگا وہ فوراً اسلام سے خارج ہو جائیگا - افسوس تو یہ ہے کہ اسلامی سلطنت نہین رہی - ورنہ اسکے بعد اسکا زندہ رہنا بھی ناجائز سمجھا جاتا - خیر - اس طلسمی کلمے کے منہ سے فوراً نکلتے ہی تم اسکے نکاح سے باہر ہوجاؤگی اور پھر تم میرے پاس آجانا - مین بڑی خوش ہوئی اور اس موقع کی انتظار مین رہی - مگر افسوس - اسکے بعد بغاوت برپا ہوگئی اور آپ اسیر ہوگئے - بغاوت کے دوسرے دن قاضی کا ایک آدمی آیا اور ہم دونون کو اپنے ساتھ بلالے گیا - قاضی کے سامنے جیسے ہی ہم دونون پہونچے - قاضی نے اعلان کیا کہ حسن کافر ہے - اسواسطے کہ یہ شخص کفار کا ساتھ دیتا ہے -

حسن یہ سنتے ہی ایسا فرار ہوا کہ پھر اسکو شہر مین کسی نے نہ دیکھا - اور اب مین قاضی صاحب کی حفاظت مین آگئی - جب شب ہوئی تو میرے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ قاضی صاحب بار ریش و بردت و جبہ و دستار میرے پاس آکر مجھ سے لپٹ گئے - مین چلائی بولے - بے وقوف چھوکری - تو تو میری لونڈی ہوچکی - کفار کے ہاتھ سے آئی ہے - اور ہم تجھ سے بغیر نکاح متمتع ہوسکتے ہین - ہماری شریعت مین نکاح کی ضرورت ہی نہین - تو میری لونڈی ہے - مین حسن سے زیادہ قاضی سے متنفر تھی - اور دو گھنٹے تک اس بدمعاش قاضی سے اپنی عصمت بچاتی رہی - آخر مین نے ایک لات اسکے منہ پر زور سے رسید کی - وہ الگ دور جا گرا اور مین کوٹھری کھولکر بھاگی - صبح کا وقت قریب تھا - راستے مین یہودی سوداگرون کا ایک قافلہ خانقین[1] جانے والا مل گیا - مین نے دیکھا کہ اس مین میرا خاوند حسن بھی موجود ہے - مین بڑی خوش ہوئی - اور اسکے ہمراہ بغداد آئی - یہان آکر ایک نیا عقدہ کھلا -

قصہ مختصر یہ کہ اب مین اس حالت مین ہون جس مین آپ دیکھ رہے ہین - اب میرے سونے کا وقت آگیا ہے اگر ناوقت نہ ہوتا تو مین اپنی بغداد کی ساری سرگزشت سناتی - خیر پھر ملون گی - اسکے بعد مین رخصت ہوکر اپنے کلبہ حزن مین آگیا باہیہ خانم سے مین پھر نہ مل سکا کیونکہ دوسرے روز خود مجھے بغداد چھوڑ دینا پڑا -

"ابن السبیل"

---

[1] سرحد ایران و عراق پر ایک شہر ہے ۱۲

مصحفی وسودا کا تقابل

اور

مصنف آبحیات کی کج نگاہیان

اس سے قبل دسمبر ۱۹۲۹ء کے نگار مین مصحفی اور میر کا موازنہ ہو چکا ہے۔ آج کی صحبت مین یہ دیکھنا ہے کہ سودا کا اثر ان پر کسقدر رہا۔ لیکن اس سے قبل یہ بات خود فیصلہ طلب ہے کہ مرزا سودا اردو شعرا مین کیا درجہ رکھتے ہین۔ اور ان کی شاعری کو کس قسم کی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ شعر الہند کی پہلی جلد مین میر و مرزا کے عنوان سے ایک پورا باب تحریر کیا گیا ہے جس مین مختلف حوالون سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ میر تقی و مرزا سودا کے کارنامے کہان تک ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہین۔ اسکا ضروری اقتباس ہم ذیل مین درج کرتے ہین:-

"عام طور پر مشہور ہے اور اکثر تذکرہ نویس بھی اسکے ساتھ ہم آہنگ ہین کہ مرزا کو قصیدہ نگاری مین کمال ہے اور میر غزل گوئی مین اپنا جواب نہین رکھتے۔ اسکے ساتھ میر صاحب کو یہ منزلت بھی حاصل ہے کہ وہ مثنوی بھی بہت اچھی لکھتے ہین۔ اسلئے دونون کے راستے الگ الگ ہین۔

ان تصریحات سے قطع نظر کرکے دونون کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو دونون مین کوئی نمایان فرق نظر نہ آئیگا قدما کے دور کے جو محاسن ہین وہ دونون مین مشترک طور پر پائے جاتے ہین۔ اسی طرح اس دور کے معائب بھی دونون کے یہان کم و بیش موجود ہین۔ جا بجا زبان فحش اور مبتذل ہے۔ کہین کہین سبک مضامین دونون باندھ جاتے ہین۔ شتر گربگی یعنی کلام کی ناہمواری دونون کے یہان پائی جاتی ہے۔ لیکن باوجود ان معائب کے غزل گوئی مین سودا کو میر سے اسلئے پست درجہ خیال کیا جاتا ہے کہ سودا کی غزلون مین تغزل کی اصلی روح یعنی سوز و گداز نہین اور ہمارے نزدیک اسکے مختلف اسباب ہین۔

(۱) - ایک تو اُن کی قومی خصوصیت جو اُن کی ہجو گوئی کا سبب ہوئی اُسنے وہ عجز و تذلل نہین پیدا ہونے دیا جو مسکین میر کا شیوہ اور غزل کا اصلی عنصر ہے

(۲) - دوسرے یہ کہ وہ تغزل کے علاوہ اخلاقی مسائل کو لیتے ہین اور اُن کو تمثیل کے ذریعے سے ثابت کرتے ہین۔ بعض جگہ عاشقانہ مضامین مین بھی تمثیل رنگ سے کام لیتے ہین قدرت نے ان کی غزل گوئی کی تعریف مین سلیم و کلیم کا جو نام

لیا ہے۔ اسکی یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں تمثیلی رنگ مین اُستاد خیال کئے جاتے تھے۔ اور تمثیلی رنگ مین اگرچہ دعویٰ و دلیل کے تطابق سے دماغ بے شبہ متاثر ہو جاتا ہے لیکن جذبات و احساسات پر اسکا کوئی اثر نہین پڑتا

(۳) تیسرے یہ کہ اس زمانہ کی روش کے خلاف وہ جا بجا مضمون آفرینی اور خیال بندی بھی کر جاتے ہین۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس زمانے مین مغلق گو مشہور تھے

(۴) چوتھے یہ کہ داخلی پہلو کے ساتھ خارجی رنگ کو بھی لیتے ہین اور اکثر معشوق کے خط و خال کی بے اثر تعریف و توصیف کرتے ہین یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس رنگ مین کہنے والے ہین وہ شعرائے قدیم مین سودا ہی کا تتبع کرتے ہین

(۵) پانچوین یہ کہ اُن کا زور طبع اُن کو کسی ایک رنگ پر ٹھہرنے نہین دیتا۔ یہان تک کہ کبھی کبھی شاہ مبارک آبرو کے رنگ مین بھی کہہ جاتے ہین بعض غزلون مین جرأت و انشا کی روش اختیار کر لیتے ہین

(۶) چھٹے یہ کہ وہ نسبتاً میر سے مشکل زمینون مین غزلین کہتے ہین۔ اسلئے لازمی طور پر ان زمینون مین موثر اور دلآویز اشعار کم نکلتے ہین

(۷) ساتوین یہ کہ وہ میر کی طرح گوشہ نشین اور قناعت پسند نہ تھے۔ بلکہ انھون نے ہمیشہ درباری زندگی بسر کی اور غزل گوئی خستہ جگر گداختہ دل، آزاد مزاج، عزلت نشین، قناعت پیشہ اور الم کش اشخاص کا شیوہ ہے۔ ہوس ناکی، جاہ طلبی، اور زراندوزی وغیرہ سے اسے کوئی تعلق نہین ہے۔ ایشیائی شعرا مین صرف چند بزرگ مثلاً شیخ سعدیؒ۔ خواجہ حافظؒ۔ خواجہ میر درد و حمید الہ آبادی۔ راسخ عظیم آبادی۔ میر تقی میر اور خواجہ آتش وغیرہ ایسے گذرے ہین جن مین کم و بیش یہ اوصاف پائے جاتے ہین۔ اور ان لوگون نے حتی الامکان سلاطین و امراء کے دربار سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکی غزلون مین جو کیف جو اثر اور جو سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ وہ درباری شعرا مثلاً سودا و انشا و ذوق کے کلام مین مفقود ہے

(۸) آٹھوین یہ کہ وہ تیغِ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے۔ لیکن میر کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا اور عمر بھر اُن کے دل مین یہ نشتر کھٹکتا رہا

ان تمام اسباب کی بنا پر سودا کے کلام مین وہ سوز و گداز پیدا نہ ہو سکا۔ جو میر صاحب کی غزلون مین عموماً موجود ہے۔

چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات مین دونون کے چند قریب المعنی اشعار کا موازنہ کر کے دونون کے انداز طبیعت کو نہایت خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے

شعر الہند جلد اوّل صفحہ ۴۷ تا ۵۶

اس اقتباس کے بعد یہ تسلیم کرنے مین کوئی اعتراض نہین رہتا کہ مرزا سودا کو نفس شاعری سے درحقیقت کوئی تعلق نہ تھا یا اگر تھا تو بہت کم غزلین اُنھون نے لکھین ضرور لیکن اثر پیدا نہین ہوا اور نہ ہو سکتا تھا وہ قصیدہ گو تھے اور قصیدہ گوئی کے تمام اوصاف اُن کے کلام مین پائے جاتے ہین اور انھین اوصاف نے اُن کو غزل گو شعرا کے گروہ سے نکال دیا ہے۔

لیکن آزاد اس رائے سے مختلف ہین اور چونکہ انھین آگے چلکر انھین اوصاف غیر شاعرانہ سے کام لینا ہے اسلئے کلام مرزا کی

بے تاثیری مٹانے کیلئے اس طرح زور قلم دکھاتے ہین

(۱) "اُن کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا (یہ لوازم غزل گوئی کے فقدان کی توجیہ کیجا رہی ہے)

(۲) "اس پر سب رنگون مین ہمرنگ اور ہر رنگ مین اپنی ترنگ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز، نظم کی ہر فرع مین طبع آزمائی کی ہے اور کہین رُکے نہین"

(۳) چند صفتین خاص ہین جن سے اُن کا کلام جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے

(۴) زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہین۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلہ مین گرمی اور روشنی بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظون کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جوڑتے ہین گویا ولائتی تمنچے کی چابنین چڑھی ہوئی ہین

(۵) اور یہ خاص اُن کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر مین سے کچھ بھول جائین تو جب تک وہی لفظ نہ رکھے جائین شعر مزا ہی نہین دیتا

(۶) خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہین مگر اس باریک نقاشی پر اُن کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارہ ان کے ہان ہین مگر اُسی قدر کہ جتنا کھانے مین نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ

یہان تو مرزا سودا کی مدح نگاری کا حق ادا کرتے ہوئے بیان کے زور اور عقیدت کے جوش مین کہہ دیا کہ تشبیہ و استعارہ ان کے یہان کھانے مین نمک سے زیادہ نہین۔ لیکن آخر حق حق ہوتا ہے یہ الفاظ حافظہ مین نہ رہ سکے اور صفحہ ۱۹۱ مین سچی بات قلم سے نکل گئی۔ یعنی مرزا سودا بہت دور ہین۔ کیونکہ تشبیہ و استعارہ کے رنگ مین غوطہ دیکر محاورہ مین ترکیب دیتے تھے اور رنگینی کے پردے مین مطلب اصلی کو گم نہ ہونے دیتے تھے۔

(۷) اُنھون نے فارسی محاورون کو بھاشا مین کھپا کر ایسا ایک کیا ہے۔ جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادّہ کو دوسرے مادّہ مین جذب کر دیتا ہے۔ اور تیسرا مادّہ پیدا کر دیتا ہے کہ کسی تیزاب سے اسکا جوڑ نہین کھل سکتا اور اُنھون نے ہندی زبان کو فارسی محاورون اور استعارون سے نہایت زور بخشا۔ اکثر ان مین سے رواج پا گئے اکثر آگے نہ چلے

(۸) مرزا طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر ذہن برّاق اور زبان مشّاق رکھتے تھے توسن فکر اِن کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رُک نہ سکتا تھا کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے۔ تغزل کی خصوصیت نہین رہتی تھی جس برجستہ مضمون مین بندھ جائے باندھ دیتے تھے

(۹) بیشک ان کی غزلون کے بھی اکثر اشعار چستی و درستی مین قصیدہ کا رنگ دکھاتے ہین۔ بہت سی غزلین دل پسند اور دلچسپ بحرون مین ہین کہ اسوقت تک اردو مین نہین آئی تھین زمینین سنگلاخ ہین اور ردیف قافئے بہت مشکل مگر جس پہلو سے اُنھین جما دیا ہے ایسے جمے ہین کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو معلوم ہو۔ (آب حیات)

باتین تمام وہی ہین جنھین شعر الہند مین بیان کیا گیا ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ حسن لیلیٰ از چشم مجنون باید دید کے مطابق مرزا سودا کی تمام برائیان آزاد کو خوبیان ہو کر نظر آتی ہین اور مولوی عبدالسلام دوستی و دشمنی دونون جذبون کے اثر سے محفوظ رہنے کے باعث برائیون کو برائیون کی صورت مین دیکھتے ہین۔ مولوی عبدالحیٔ صاحب لکھتے ہین:۔

"چاہئے تو یہ تھا کہ دنیائے شاعری مین کوئی متنفس بھی اس طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن خود مرزا کے زمانے مین چند حضرات نے تقلیداً ومقابلتاً ان اوصاف غیر شاعرانہ کو اپنے کلام کا زیور بنا لیا۔ جب متوسطین کا زمانہ آیا تو اپنے تمام معاصرین کے خلاف سید انشاؔ نے مرزا سوداؔ کے جنون کا ساتھ دیا۔ اور قصائد نویسی کے ساتھ ساتھ غزل گوئی کو بھی صرف تفریح دماغ کا ذریعہ بنانے مین اپنی پوری طاقت صرف کردی۔ کلیات ان کا چھپ گیا ہے اسمین ایک دیوان فارسی کا ہے۔ ایک اردو کا جس مین قصیدے غزلین قطعے خطوط منظوم، رباعیان، پہلیان، چیستانین ہجوین اور چھوٹی چھوٹی مثنویان ہین۔ فارسی اردو کے سوا ہندوستان کی مختلف زبانون مین کچھ کچھ کہا ہے بقول آزاد ابھی پنجاب مین کھڑے ہین ابھی پورب مین بیٹھے باتین کر رہے ہین ابھی برج بھاشی ہین ابھی مرہٹی۔ ابھی افغان ہین ابھی کشمیری ہین اور چند ساعت بھی اپنے رفیق تمسخر سے جدا نہین ہوتے۔ سید انشاؔ جیسا ذکی و ذہین آدمی اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا۔ تو سعادت علی خان کے مزاج مین درخور ہو جانے پر وہ کوئی چیز بن جاتا اور اسکا دیوان لطائف سے مالا مال ہونیکی جگہ ملک کے سامنے آج ایک نمونہ پیش کرتا۔

(گل رعنا ۲۶۰-۲۶۱)

واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزلون مین سخت ناہمواریان اور بے اعتدالیان پائی جاتی ہین اور کسی نظم مین سید انشاؔ سے بالکل متانت کی توقع ایک بے سود چیز ہے۔ شیخ مصحفیؔ نے انھین بھانڈ اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ نے بے اصول شاعر کہدیا تو کوئی مبالغہ نہین کیا۔

لیکن آزاد نے اپنی عمارت بے اصل کے سنبھالنے مین جس حسن استدلال سے کام لیا ہے۔ اور واقعات پر پردہ ڈالکر کچھ کا کچھ دکھانے مین جو منہ زوری کی ہے اسکا خلاصہ یہ ہے

غزلون کا دیوان عجیب طلسم کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل بیان کا لطف محاورون کی نمکینی ترکیبون کی خوشنما تراشین دیکھنے کے قابل ہین۔

غزلون مین غزلیت کے اصول کی پابندی نہین۔ سبب یہ ہے کہ وہ سخن آفرین ایک ذخیرۂ وافر مضامین والفاظ کا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا کر لیتا تھا۔ (آب حیات صفحہ ۲۷۱)

اس مین کچھ کلام نہین کہ جو جو تصرفات یا ایجادات کئے انمین بعض جگہ سینہ زوری بھی ہے۔ مگر خوش نمائی وخوش ادائی مین شبہ نہین۔ درحقیقت ان کی تیزی طبع نے عالم وجود مین آنیکے لئے تیزی دکھائی۔ اگر وہ سو برس بعد پیدا ہوتے تو ہماری زبان کا فیشن نہایت خوبصورتی سے بدلتے (صفحہ ۲۰۶ آب حیات)

اوّل تو اکثر غزلین اور قصائد ان کے سنگلاخ زمینون مین ہوتے تھے۔ پھر اسمین قافئے ایسے کڈھب لیتے تھے۔

کہ عاشقانہ مضمون کم آسکتے تھے۔ اسیواسطے قانون کلام یہ رکھا تھا۔ کہ کیسا ہی قافیہ ہو اور کیسا ہی مضمون جس برجستہ پہلو سے بندھ جائے چھوڑنا نہین چاہئے۔ ساتھ اسکے یہ ہے کہ شاعر کو زیادہ تر کام عوام سے ہوتا ہے جنھیں مضامین عشقیہ کے بعد کچھ لطف ہے تو ظرافت مین ہے۔ اسلئے انکی طبیعت جو اسی آسمان کا ریزہ تھی ہر آن نیا جلوہ دیتی تھی۔

(آبحیات صفحہ ۲۸۳)

لوگ کہتے ہین کہ سید انشا کا کلام ہر مقام پر قابل سند نہین۔ یہ بات درست ہے مگر اُن کی بے اعتدالیان کچھ جہالت کے سبب نہ تھین۔ بلکہ عمداً تھین یا بے پروائی کے سبب تھین۔ کہ اپنی طبع وقاد اور وسعتِ استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو پانی کر دیا۔ الفاظ و محاورات مین بہت سے تصرف کئے یہ تصرف صرف اگر محدود مقامون مین ہوتے تو شکائتین نہ ہوتین۔ کیونکہ اس زبان آور سے زیادہ قادر زبان اور زباندان کون ہے۔ خصوصاً جبکہ استعداد علمی سے مسلح ہو لیکن افراط نے ہمین بھی خاموش کر دیا ہے۔

بہر حال اُن کے کلام سے واقف حال اور طالب کمال بہت کچھ فائدے اُٹھا سکتا ہے اکثر اچھوتے ایجاد ہین کہ گل نوبہار کی طرح سر پر رکھنے کے قابل ہین۔ بہت سے تھوڑی تبدیلی یا تراش سے انوکھے بن سکتے ہین۔ بہت سے وہ ہین جن پر سوا اسکے کچھ نہین کہہ سکتے۔ خطائے بزرگان گرفتن خطاست (آب حیات صفحہ ۲۸۴)

نگاہ کا فرق دیکھئے شیخ مصحفی صرف تین شعر کہتے ہین:-

تیغ نے اُسکی کلیجہ کھا لیا　　اُس نے آتے ہی مجھے سنگوا لیا

چمن مین چل کے کرائے مصحفی تو نالہ وآہ　　جو جی چلا ہو ترا امتحانِ بلبل کو

نہ مین صحرا مین نہ گلشن مین نکل جاؤنگا　　خوگر شہر ہون یان خاک مین رل جاؤنگا

تو وطن کا محاورہ یاد آجانا کہکر دادِ سخنوری دی جاتی ہے۔ اور جب انشا بے راہ روی اور ناقابل تقلید شاعری کی دُھن مین غیر مستند اور غلط محاورے و الفاظ کا ایک ڈھیر لگا دیتے ہین تو کہا جاتا ہے کہ یہ بے اعتدالیان کچھ جہالت کے سبب سے نہ تھین بلکہ عمداً تھین یا بے پروائی کے سبب سے تھین۔ حالانکہ دانستگی و واقفیت کی غلطی گناہِ کبیرہ خیال کیجاتی ہے۔ یا

شیخ مصحفی۔　　اُس گُل کی باغ مین جو صبا نے چلائی بات　　غنچے نے مسکرا کے کہا ہنتے پائی بات

فرماتے ہین تو ام وہم والی بات کہکر انسانیت سوز طریقۂ تحسین استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جب انشا کی کثیر التعداد ایسی زیادتیون کا ذکر آتا ہے جو نہ گل نوبہار کی طرح سر پر رکھنے کے قابل ہین نہ تھوڑی بہت تبدیلی سے انوکھی بن سکتی ہین تو صرف خطائے بزرگان گرفتن خطاست کہہ کر سعادتمندی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ شیخ مصحفی (بقول ناسخ) انشا کے اُستاد ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ بزرگی کے مستحق تھے

یہان پھر مجھے وہی کہنا پڑیگا کہ آزاد نے آبحیات کی تصنیف سے کوئی ادبی خدمت نہین کی۔ بلکہ دو تین شاعرون کی

یعنی اور غلط تعریف و توصیف کے جوش میں جو کچھ زبانِ قلم پر آیا بغیر سوچے سمجھے لکھتے چلے گئے ہیں ۔ جب شاعری نے اور ذرا ترقی کی تو نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا رنگ پہلے سے زیادہ اُچھلا جس کے اثر سے اردو شاعری مہمل الفاظ کا ایک مجموعہ ہو کر رہ گئی ۔ لکھنؤ میں شیخ ناسخ نے طبعی مناسبت کی بنا پر میر و مصحفی کے سادہ و سلیس اندازِ بیان کو چھوڑ کر مضامین تازہ اور غزلہائے قصیدہ نما کو اپنا سرمایۂ ناز قرار دیا ۔ اور نہایت پرزور الفاظ میں اپنے مسلک کا اعلان کر دیا ۔

ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا　　　　کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب

اس اعلان سے شیخ ناسخ کے اصلی ماخذ شاعری کا پتہ چلتا ہے ۔ اور ساتھ میں یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہتی کہ میر صاحب نے انہیں اصلاح دینے سے صاف انکار کیون کر دیا ۔ اور شیخ مصحفی مرحوم نے دس پانچ غزلین دیکھنے کے بعد اپنے یہان سے کیون نکال دیا ۔ شیخ ناسخ کے کلام کو دیکھئے وہی ثقیل الفاظ وہی ابتذال وہی فضول اور بے نتیجہ خیال بندی تمام باتین جو مرزا سودا کی شاعری کی جان ہین یہان بھی حد سے زیادہ پائی جاتی ہین ۔ مولانا سید امداد صاحب اثر کا فرمانا بالکل درست ہے کہ ۔

> شیخ ناسخ کی بدولت وہ خیالات بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی مین داخل ہوگئے ۔ جو درحقیقت اس سے باہر ہین ۔ اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلین معرّا ہوگئین ۔ اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہوگئی جس پر قصیدہ گوئی اور غزل سرائی دونون مین سے ایک کی تعریف بھی صادق نہین آتی ۔　　　(کاشف الحقائق صفحہ ۱۳۹) جلد دوم

اس روش سے نہ صرف شیخ ناسخ کو نقصان پہونچا بلکہ منشی مظفر علی اسیر کی ہمنوائی نے ایک عرصے تک کیلئے تمام لکھنؤ کی شاعری کو خاک مین ملا دیا ۔ اور آتش و چند تلامذۂ آتش کو چھوڑ کر سب اسی میدان کے ہو کر رہ گئے

دلّی مین شاہ نصیر نے مشکل پسندی کو آسان گوئی پر ترجیح دیکر شعرائے دلّی کے دربار سے اپنی نامقبولیت کی سند حاصل کی نہین دلّی کا شیخ ناسخ کہین تو غلط نہین کیونکہ ان کے کلام مین شیخ ناسخ کی تمام خصوصیات جلوہ گر نظر آتی ہین شیخ ناسخ کے کلام کی ایک بڑی خوبی تمثیل ہے جو سینہ بہ سینہ مرزا سودا سے چلی آتی ہے یعنی وہ اخلاقی مضامین کو اکثر اس طریقہ سے باندھتے ہین ۔ کہ ایک مصرعہ مین دعویٰ ہوتا ہے اور دوسرے مین مثال جا بجا اخلاقی دعوی کرتے ہین اور اُسکو تمثیل کے ذریعہ سے ثابت کرتے ہین اس رنگ کے بے اثر اور اس شاعری کے بے مصرف ہونے مین کسی صاحبِ عقل کو شبہ نہین ۔ لیکن آزاد کی تاویل دیکھئے ۔

> کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا زبان شکوہ الفاظ اور چستیٔ ترکیب مین سودا کی زبان تھی ۔ اور گرمی و لذّت اسمین خداداد تھی انھین اپنی نئی تشبیہون اور استعارون کا دعویٰ تھا ۔ اور یہ دعویٰ بیجا نہ تھا ۔ نئی نئی زمینین نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے ۔ مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھین جسمین بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے تشبیہ اور استعارہ کو لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے ۔ جیسے اکثر زبردست انشاپرداز ناپسند کرکے کم استواری کا نتیجہ نکالتے ہین اور کہتے ہین کہ یہ تشبیہ یا استعارہ شاعرانہ نہین پھبتی ہے ۔ لیکن یہ اُن کی غلطی ہے ۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو کلام سریع الفہم کیونکر ہوتا ۔

اور ہم ایسی سنگلاخ زمینون مین گرم گرم شعر کیونکر سنتے۔ پھر وہ ہزارون شاعرون مین خاص وعام کے منہ سے واہ وا کیونکر
سنتے علم کے دعویدار شاعران کے کلام کی دھوم دھام کو ہمیشہ کنکھیون سے دیکھتے تھے۔ اور آپس مین کانا پھوسیان کرتے
کرتے تھے۔ پھر بھی اُن کے زور کلام کو دبا نہ سکتے تھے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ زور طبع اُنکا کسی کے بس کا نہ تھا جس سنگلاخ
زمینون مین گرمی کلام سے وہ مشاعرہ کو تڑپا دیتے تھے۔ اور ون کو غزل پوری کرنی مشکل ہوتی تھی۔ (آبحیات)

انصاف دیکھئے شاہ نصیر کے بے اثر حصۂ کلام کا ذکر تک نہین کرتے۔ اخلاقی مضامین کا مطلق حوالہ نہین دیتے۔ اور اپنی طرف سے کچھ گھٹا کچھ بڑھا کر یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہین کہ شاہ نصیر نے بڑے بڑے شہسواران سخن کو پست کرکے چھوڑ دیا۔ لیکن دست قضا و قدر سے انسان مجبور ہے۔ اسی جوش مین وہ الفاظ بھی نکل گئے ہین جنھون نے شاہ نصیر و مرزا سودا کی خصوصیات شاعرانہ کو یکجا کر دیا ہے۔ آزاد کا یہ فقرہ غور طلب ہے۔ کہ علم کے دعویدار شاعرون کے کلام کی دھوم دھام کو ہمیشہ کنکھیون سے دیکھتے تھے اور آپس مین کانا پھوسی کرتے تھے پھر بھی اُن کے زور کلام کو دبا نہ سکتے تھے۔ اور جب اسکے ساتھ سید انشا والے اس فقرہ کو بھی پڑھا جائے۔ کہ انکی غلطیان کچھ نادانستگی کے سبب سے نہ ہوتی تھین بلکہ عمداً ہوتی تھین۔ یا بے پروائی کی وجہ سے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ زبان کی طراری ایک جوہر ہے۔ اور یہ جسے نصیب ہو جائے وہ کسی مقام مین بھی مرزا سودا کے اسپ بد لگام کی طرح سوار کو باگ پر ہاتھ رکھنے کی اجازت نہین دیتا۔ اور بے لگام جدھر چاہتا ہے۔ سرپٹ دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہان بھی تعریف و توصیف کا وہی زور شور قائم ہے جسکی بین مثالین مرزا سودا و انشا کے یہان پیش کی جا چکی ہین۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر آزاد کی اس بے اصل و بے بنیاد عمارت کے ایک ستون ہین۔ جو سالہا سال کی کوششون کے بعد تعمیر کرکے آب حیات کے نام سے یادگار عالم چھوڑ گئی ہے۔

شاہ نصیر کا شاہراہ اصلی سے ہٹ جانا دتی اور شعرائے دتی کے لئے سمند ناز پر تازیانہ تھا۔ ناسخ کے کلام کا غلغلہ بلند ہوتے ہی مومن و غالب نے بھی وہی فضول روش اختیار کرلی۔ لیکن ان دونون بزرگون سے فطری نامناسبت کے سبب یہ روش نہ نبھ سکی خدا کا شکر ہے کہ دونون جلد سے جلد راہ راست پر آگئے۔ مومن خان نے معاملہ بندی کی طرف توجہ کرکے جرأت کے رنگ کو جلا دی اور غالب نے میر و مصحفی کے سادہ انداز کو اختیار کرکے مستحسن طریق سخن پیدا کیا۔ البتہ ذوق پر اپنے استاد کا اثر زیادہ پڑا چنانچہ ان کے کلام مین ناسخ کی تمام خصوصیات موجود ہین۔ یہانتک کہ رعایت لفظی کی بدترین مثالین بھی پائی جاتی ہین اور مبتذل و سوقیانہ مضامین بھی تمثیلی مضامین کا تو ٹھکانا ہی نہین غزلین کی غزلین ناسخ کا راگ الاپ رہی ہین۔ البتہ بقول مولوی عبد السلام وہ اپنے استاد شاہ نصیر سے دو باتون مین ممتاز ہین ایک تو یہ کہ دتی کی آب و ہوا کے اثر سے اُن کے کلام مین جا بجا جذبات اور روحانیت کی آمیزش بھی موجود ہے۔ اسلئے اُن کا کلام صحرائے بے آب و گیاہ کی طرح بالکل خشک اور بے مزہ نہین معلوم ہوتا۔ بلکہ خس و خاشاک کے ڈھیر مین کہین کہین دو چار پھول بھی نظر آجاتے ہین۔ دوسرے یہ کہ اکثر محاورات کو اس برجستگی کے ساتھ باندھ جاتے ہین کہ طبیعت کو نہایت انبساط حاصل ہوتا ہے لیکن یہ تمام جواہر ابتدائی حالت کے معلوم ہوتے ہین۔ کیونکہ سید صفیر بلگرامی کی تحقیق کے مطابق وہ آخر زمانے مین بالکل سودا بن گئے تھے۔ آزاد کا مسلک جمہور کے خلاف ہے

اور چونکہ وہ شیخ ذوق کے شاگرد رشید نہیں بلکہ مُرید ارادتمند ہین - اسلئے اُنھون نے اپنے پیرو مرشد کی عزت وحرمت برقرار رکھنے کیلئے تعریف وتوصیف کی سیاہی سے آبِ حیات کے صفحات کے صفحات سیاہ کرکے دنیا پر ثابت کردیا ہے کہ آب چشمۂ حیوان درون تاریکی ست" اور ملاحظہ ہو فرماتے ہین :-

عام جوہر اُن کے کلام کا تازگیٔ مضمون، صفائی، چستیٔ ترکیب، خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی ہے مگر حقیقت مین رنگ مختلف وقتون مین مختلف رہا - ابتدا مین مرزا رفیع کا انداز تھا شاہ نصیر سے ان دنون معرکے ہو رہے تھے - انکا ڈھنگ وہی تھا اسلئے انھون نے بھی وہی اختیار کیا - اسکے علاوہ مرزا کی طرز کے گرمانے مین اور لوگون کے لب ودہن سے واہ وا نکال لینے مین ایک عجیب جادو کا اثر ہے چنانچہ وہی مشکل طرحین چُست بندشین برجستہ ترکیبین معانی کی بلندی الفاظ کی شکوہ مین اُن کے ہان بھی پائی جاتی ہین - اُن کی غزل ایک گلدستہ گلہائے رنگارنگ کا ہوتی تھی ہر قافیہ ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اس مین بندھے تو لطف ہے نہین تو پھیکا رہے - پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا - اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا - اسی مین باندھ دیتا تھا - اور طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا - ساتھ ہی اسکے صفائی اور محاورہ کو ہرگز نہ جانے دیتا تھا -

جاننے والے جانتے ہین کہ اصلی میدان اُنکی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا - نظم اُردو کی نقاشی مین مرزا موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کردیا ہے - ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اسپر قلم نہین اُٹھایا - اور انھون نے اس مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہان کسی کا ہاتھ نہین پہنچا - انوری - ظہیری - نظیری - عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہوکے چمکتے ہین لیکن ان کے قصیدون نے اپنی کڑک دمک سے زمین کو آسمان کر دکھایا -

نواب حامد علی خان مرحوم نے نہایت شوق سے ایک عاشقانہ خط لکھنے کی اُنھین فرمائش کی تھی - اُنھون نے وہ نامہ لکھنا شروع کیا - اسنے ایسا طول کھینچا کہ تخمیناً تین سو شعر اسکے ہوگئے - اگرچہ نامہ ناتمام تھا مگر ایک ایک مصرعہ سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھا - اسکا نام نامۂ جان سوز تھا - اول حمد و نعت تھی پھر ساقی نامہ پھر القاب معشوق اسمین اُسکا سراپا اسکے بعد یاد ایام اسمین چارون موسمون کی بہار مگر اسکے معنون کی نزاکت لفظون کی لطافت ترکیبون کی خوبیان اندازون کی شوخیان کیا کہون سامری کے جادو اور جادو کے طلسم اسکے آگے دھوان ہوکر اُڑے جاتے تھے -

عبارت کا زور عقیدت کا جوش دیکھئے کہتے ہین -

کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہین مگر اپنے لفظون کی ترکیب سے اُنھین ایسی شان وشکوہ کی کُرسیون پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہین - انھین قادر الکلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہین کہہ جاتے ہین کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجاکر استعارہ کی

بُو سے بساتے ہین کبھی بالکل سادے لباس مین جلوہ دکھاتے ہین مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہین کہ دل ہی نشتر سا کھٹک جاتا ہے۔ اور مُنہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے ہونٹون مین شُستہ اور برجستہ لفظون کے خزانے بھرے ہین۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزارون رنگ ہین۔ مگر جسے جہان سجتا دیکھتے ہین وہ گویا وہین کے لئے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے۔ کہ سادگی مین رنگ دے جائیگا اور کونسا رنگینی مین جس طرح کامل مصوّر کی تیزی قلم کو اُسکے رنگون کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح اُن کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انہین اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانون کے رستے سے پلا دیا اسی وصف نے نادانون کو غلطی مین ڈالا ہے۔ جو کہتے ہین اُن کے ہان عالی مضامین نہین بلکہ سیدھی سیدھی باتین اور صاف صاف خیالات ہوتے ہین۔ وہ نہین جانتے کہ ان ہونٹون مین خدا نے عجب تاثیر دی تھی۔ کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلے ہین خود بخود زبانون پر ڈھلکتے آتے ہین جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کیسی آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے۔ یا انھون نے الفاظ کے نگینون پر کیونکہ جلا کی ہے جس سے کلام مین یہ بات پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت مین اسکا سبب یہ ہے کہ قدرتِ کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل مین اس طرح ترکیب دیتی ہے۔ جیسے آئینہ گر شیشے کو قلعی سے ترکیب دیکر آئینہ بناتا ہے اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ مین آتا ہے۔ اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔ ان کا مضمون جس طرح دلکو بھلا معلوم ہوتا ہے اسی طرح پڑھنے مین زبان کو مزا آتا ہے ان کے لفظون کی ترکیب مین ایک خداداد چستی ہے۔ جو کلام مین زور پیدا کرتی ہے وہ زور فقط ان کے دل کا جوش ہی نہین ظاہر کرتا بلکہ سُننے والونکے دل مین ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی قدرتی رنگ ہے جو ان کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے ان کے دیوان کو جب نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلمون آوازین آتی ہین۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہین یہی سبب ہے کہ اُن کے دیکھنے سے دل اکتا نہین جاتا وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے۔ اور مضامین کے طبیب تھے جس طرح برجستہ بیٹھتا دیکھتے تھے باندھ دیتے تھے۔ خیال بندی ہو یا عاشقانہ یا تصوّف اُن کے سینے مین جو دل تھا گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا ہزارون آدمیونکے دل تھے اسواسطے کلام اُن کا مقناطیس کی طرح قبول عام کو کھینچتا ہے۔ دل دل کے حالات باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گذری ہے۔ (آبِ حیات صفحا ۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵)

اس مبالغہ آمیز قصیدہ گوئی کی شانِ نزول یہ ہے کہ آزاد نے وہ تمام الفاظ و فقرات جو شعرائے اردو پر زبان زنی کرتے ہوئے دولت بخیل کی طرح بچا بچا کر رکھے تھے اور وہ تمام وقت جو مستحقین مدح وستائش کی مدح وستائش سے گریز کر کے آب حیات کے لئے نکالا تھا۔ دونون چیزین فراخ دلی کے ساتھ یہان خرچ کر دین اور اپنی لفاظی کے زور سے شیخ ذوق مرحوم کو

اُٹھا کر آسمان شاعری کے اُس اونچے مقام پر بیجا کر بٹھا دیا جہان سے اُن کے رنگ کلام مین سفیدی وسیاہی کا امتیاز دشوار ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اگر اپنے اُستاد کو سریر عزت پر متمکن کرنے مین شاگردی کا حق ادا کیا تھا تو آزاد کم رہنے والے نہ تھے۔ انھون نے ارباب نظر کی آنکھون مین خاک جھونک کر وہ کام کر دکھایا کہ جب تک اُردو دان طبقہ مین تنقید کا بازار گرم رہے گا۔ مشتاقان ادب آب حیات اور سرچشمہ آب حیات کو اپنے دل سے محو نہ کر سکین گے۔

آب حیات کی تصنیف اور مصنف آب حیات کی زندگی ذوق کے واسطے تھی اور ذوق کے کام آئی۔ اگر اس سلسلے مین مرزا سودا سید انشا، شاہ نصیر بلکہ شیخ ناسخ کا ذکر بھی اچھے الفاظ مین آگیا ہے تو یہ سب طفیل ذوق کا ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے ان حضرات مین کوئی صفت ہو یا نہ ہو لیکن یہ فخر کیا کم ہے کہ آزاد کے گیتون مین شامل ہونا نصیب ہو گیا۔ نہ آزاد ذوق کے شاگرد ہوتے نہ ان کی حیات لکھی جاتی نہ اس حیات کے ایک ایک پہلو کو روشن اور ایک ایک بات کو اُجاگر کرکے دکھانیکے لئے متقابلین کی تعریف وتوصیف لازمی قرار پاتی اور یہی سبب ہے کہ مرزا سودا کے مقابلے مین میر تقی کی شاعرانہ و اخلاقی تصویر بگاڑنے، انشا کا لحاظ کرکے شیخ مصحفی کے کمالات حسنہ کو بدنما کرنے، ناسخ کی رعایت مد نظر رکھ کر خواجہ آتش کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک روا رکھنے، اور ذوق کی عقیدت وارادت کے جوش مین غالب مرحوم کو بادل ناخواستہ جگہ دینے مین آزاد کی طرف سے کسی خوش مذاقی کا اظہار نہین ہوا

المختصر متقدمین مین میر تقی۔ میر سوز اور میر درد کے متبعین ومقلدین تو سیکڑون ہوئے مگر مرزا سودا کے نامقبول رنگ پر شاذ و نادر ہی کسی کو چلنے کی جرأت ورغبت ہوئی اور جو لوگ قضا کے مارے ادھر آ پڑے اُنکی شاعری کا حشر ارباب فہم مین اسکے سوا کچھ نہ ہوا کہ غزل گویونکے گروہ سے خارج سمجھے گئے۔

شیخ مصحفی کے متعلق یہ ہے کہ اُنھون نے مرزا سودا کا آخری زمانہ پایا تھا اور دہلی کے تکلف پرست طبقے مین بیٹھ کر اپنی شاعری کے جوہر دکھائے تھے۔ اسلئے اُن کے کلام مین ہر جگہ تو نہین البتہ کہین کہین سودا کا رنگ نظر آجاتا ہے۔ جیسے زیادہ تر اوائل شاعری کا حاصل کہنا چاہئے مگر باینہمہ اُنھون نے تلاش مضمون وجستجوئے خیال تازہ مین کوہ کندن وکاہ برآوردن پر کبھی عمل نہین کیا اعتدال ومیانہ روی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہ اتنا نیچے جاتے تھے کہ ہرکس وناکس کی رسائی ہو جائے نہ اتنا اونچا اُڑتے تھے کہ بالکل اوجھل ہو جائین یہ حالت بھی کچھ زیادہ عرصے تک قایم نہ رہ سکی اور یہ دیکھکر کہ مرزا سودا کا غیر فطری رنگ اپنی بے اثری وبے کیفی کیوجہ سے عامتہ الناس مین عزت کی نظر سے نہین دیکھا جاتا۔ انھون نے بہت جلد رُخ بدلا اور اپنے اصلی رنگ پر آگئے۔

شیخ مصحفی کا اصلی رنگ وہی ہے جو میر تقی ومیر سوز کی محاورہ بندی کا رنگ ہے۔ جس طرح یہ دونون اُستاد تھوڑے بہت فرق کے ساتھ واردات وکیفیات قلب کو معمولی معمولی لفظون مین ظاہر کرنیکے عادی تھے۔ اسی طرح شیخ مصحفی مرحوم نے بھی مضامین عشقیہ کے ساتھ سادگی بیان کو اختیار کرکے اپنی غزل کو صحیح معنون مین غزل بنا دیا جیسا کہ ہم نگار دسمبر مین ثابت کر چکے ہین۔ اسی کیفیت وحالت کا اندازہ کرکے مولوی عبد السلام نے فرمایا ہے کہ متوسطین مین مصحفی نے اردو غزل گوئی کا بہترین نمونہ

قائم کر دیا تھا۔

ان کے اور ان کے شاگرد خواجہ آتش کے کلام کو دیکھئے جذبات لطیف میں جوش اور اُن کے اظہار میں دلکشی و دل آویزی شاعری کے دونوں عناصر پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں مگر بقول حضرت عزیز لکھنوی اسوقت کے محشرستان میں ان کے لطیف نغمے اس طرح دبے کہ سبق آموز نہ ہو سکے یا یوں کہو کہ طبیعتوں میں اُسکے قبول کرنیکی صلاحیت ہی نہ تھی۔

جب سید انشا اور مرزا سودا کی تقلید میں شیخ ناسخ اُردو شاعری کے پھلے پھولے چمن کو برباد کرنے میں مصروف سعی تھے اور لکھنؤ کی غیر صلاحیت پذیر ہستیاں جوش و خروش کے ساتھ اُن کے توسن باد پا کی باگ پکڑنے دوڑ رہی تھیں تو رنگ قدیم ضلع جگت اور رنفاظی کے گرد و غبار میں اس طرح اٹا ہوا تھا جس طرح چودھویں رات کے چاند پر ابر کی سیاہی اپنا قبضہ کرنی چاہتی ہے شیخ مرحوم نے اسی حالت کی طرف اشارہ فرمایا ہے

تھا جو شعر راست سرو بوستان ریختہ ۔۔۔ اب وہی ہے لالۂ زرد خزان ریختہ
پیچ دے دے لفظ و معنی کو بناتے ہیں کلفت ۔۔۔ اور پھر وہ اُسپہ رکھتے ہیں گمان ریختہ
فہم میں اتنا نہیں آتا بحکم رائے پست ۔۔۔ اس بلندی سے گھٹی جاتی ہے شان ریختہ
خوان نعما بن کے پہنچا ہر کس و ناکس کے ہاتھ ۔۔۔ قطع سلطان کا جو تھا مخصوص خوان ریختہ
جب سے معنی بند کا چرچا ہوا اے مصحفی ۔۔۔ خلط میں جاتا رہا حسن بیان ریختہ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نئی تراش خراش نے ان کے دل پر کسقدر اثر کیا ہوگا۔ اور میر تقی کی سیدھی سادی وضع یعنی اپنی محاورہ بندی کی شاعری اپنی آنکھوں کے سامنے بے اثر ہوتے دیکھ کر کسقدر رنجیدہ ہوئے ہونگے لیکن زمانہ کی روش کسے چھوڑتی ہے رفتہ رفتہ وہ بھی ایک دن اسی بلا میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے دیوان ششم میں کہیں کہیں رنگ جدید کی جھلک اسی طرح نظر آجاتی ہے جس طرح بالفاظ آزاد میر سوز کے کلام میں دو چار شعروں کے بعد ایک آدھ بُرا نا لفظ کھٹک جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مرزا کا طرز کلام نہ کبھی شیخ مصحفی کو پسند آیا اور نہ اُسے قابل تقلید سمجھا تاہم وقتاً فوقتاً غزلیں اس انداز میں لکھ گئے ہیں وہ مرزا سودا کی تمام خصوصیات کمال پر حاوی ہیں ان میں الفاظ کی شان و شکوہ معانی کی تازگی و بلندی اور ترکیبوں کی چستی و درستی زمین شعر کو آسمان سے ٹکرائے دیتی ہے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سودا شیخ مصحفی کے روپ میں مجمع اہل کمال کے سامنے اپنی شہزوری کا اعلان کر رہے ہیں یہی موقع ہے جہاں پہونچکر شیخ مصحفی کے کلام بلاغت نظام اور سید انشا کے اجتہادی کارناموں کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملجاتی ہیں

مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں اپنی کاوش فکر سے وہ کمالات دکھائے ہیں کہ مرزا سودا کی کارگزاریاں مات نظر آتی ہیں ان غزلوں میں بہت سی غزلیں بقا، اللہ خان بقا شیخ ولی اللہ محب اور شیخ قیام الدین قائم بلکہ خود مرزا سودا کی غزلوں پر کہہ کر داد سخن دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مشاعرہ میں پڑھی گئی ہیں۔ بہت سی ایسی ہیں۔ جو مرزا سودا کے ردیف و قافیے میں

تھوڑا سا تغیر کر کے اپنے استعمال کے لائق بنائی گئی ہین اور اپنی اُستادی کے جھنڈے گاڑنے مین ان سے کام لیا ہے۔ بیشتر مشکل مشکل ردیفین خود اختیار کی ہین اور اس قسم کی تمام غزلون مین اسقدر صفائی و سلاست سے کام لیا ہے کہ ردیف کی مشکلات سے محاورات کے تیور پر بل نہین آنے دیا یعنی ایسے موقع پر شاہ نصیر اور شیخ مصحفی مین کوئی فرق نظر نہین آتا۔

جہان حریفانہ طور پر مرزا سودا کا مقابلہ کیا ہے۔ دیگر خصوصیات کی طرح استعارہ و تشبیہ اور دعویٰ و دلیل مین تطابق پیدا کرنیکے لئے تمثیل بیان کرنے مین بھی کوئی کمی نہین کی متعدد غزلین ہین کہ جن مین مطلع سے مقطع تک اخلاقی مضامین بیان کرتے چلے گئے ہین یہانتک کہ عاشقانہ مضامین بھی تمثیل و تشبیہ سے کام لے لیا ہے۔ اگرچہ نوعیت مضمون کے لحاظ سے اس قسم کا تمام کلام مرزا سودا کے کلام کے مقابلے مین رکھا جا سکتا ہے لیکن بلحاظ صفائی زبان اور روانی بیان ان سے کہین بڑھ چڑھ کر ہے۔

تھا سُرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر — شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر
جو ہاتھ دلبرون کے دامن کو کھینچتے تھے — اب کھنچ کے رہ گئے ہین کیسے کفن کے اندر
گورے بدن کا عالم اُسکا مین رات دیکھا — اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر
شکوہ کا نامہ اُس نے وہ خونچکان لکھا تھا — چھریان رکھین تھین جسکی ہر اک شکن کے اندر
وعدہ نہ مصحفی سے جھوٹا کرو گے صاحب — ہے اک زبان حلال اس سارے بدن کے اندر

کلام کا زور اور مضمون کی نزاکت اس طرح دونون دست و گریبان ہین کہ بیک وقت سامع کے دماغ کو مسحور کر لیتے ہین۔ مطلع کی رنگینی کا کیا ٹھکانا ہے۔ یہی شعلہ تو ہے جسکی گرمی اور روشنی آزاد نے مرزا سودا کے کلام مین دیکھی دوسرے شعر مین کھنچنا اور کھینچنے سے دو مختلف حالتون کی نقاشی کر کے موت و حیات یا بالفاظ دیگر دنیا و آخرت کو ایک جگہ کھینچکر رکھدیا ہے تیسرا شعر محاسن شاعری کی دنیا مین ہمیشہ روشن و منور نظر آنے کے قابل ہے۔ لفظرات کا انتخاب کسقدر جدت کے ساتھ کیا ہے۔ چوتھے شعر مین خط کی شکن کو چھریان دھرنیکی جگہ بنا کر خونچکانی کا سامان فراہم کرنا تلاش مضمون کی بہترین مثال ہے۔ مقطع کا تو کہنا ہی کیا۔ شعر کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ زبان حلال ہے اور جھوٹ بولنا حرام اور چونکہ جھوٹ زبان سے بولا جاتا ہے۔ اس لئے حلال سے حرام کا ظاہر ہونا چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی کا مصداق ہے۔ شاعر صرف یہ کہکر کہ مجھسے جھوٹا وعدہ نہ کرو کیونکہ سارے بدن مین زبان ہی اک حلال چیز ہے باقی حصہ حذف کر دیتا ہے جو بجائے خود نہایت لطیف پیرایۂ بیان ہے۔ احترام معشوق دیکھیئے یہ نہین کہا کہ جھوٹ بولنے کی بات تمھاری زبان حرام سے آشنا ہو جائیگی۔ بلکہ ایک کلیۃً بیان کر دیا جس میں یہ ضروری کیفیت خود بخود آ گئی۔ ایثار محبت دیکھئے جھوٹے وعدے سے روکنے کے لئے اپنے نقصان کا حوالہ نہین دیا بلکہ معشوق کی زبان کو حرام سے پاک صاف رکھنے کی طرف اشارہ کیا جس مین پہلی بات بھی شامل ہے

تم گرم ملے ہم سے نہ سرما کے دنون مین — پیش آئے بگرمی بھی تو گرما کے دنون مین
نے غرفے سے جھانکے نہ کبھی بام پر آئے — پنہان ہی رہے حسن کی آرا کے دنون مین

جی ہی مین رکھی اپنے میاں ہنے جو اُپچی — کچھ ہم نے کہا تم سے تمنا کے دنون مین
دل اپنا الجھتا تھا کبھی جن دنون پیارے — تھی زلف تری طرۂ لیلیٰ کے دنون مین
مفلس ہوئے اے مصحفیؔ افسوس کہ ہم نے — پیدا نہ کیا یار کو پیدا کے دنون مین

مرزا سودا کا یہی رنگ ہے جو غزل کے ایک ایک مصرعہ سے نمایان ہو رہا ہے۔

غنچے نے ترے لب سے لیا دام تبسم — اور آنکھون سے سیکھا گل بادام تبسم
زلفون مین اچنبھا نہین کچھ اسکی بناگوش — یان کرتی ہے نت صبح تہ شام تبسم
جس گھر مین ہو خورشید رخ یار کا جلوہ — موجود ہو وان تا بلب بام تبسم
اس زیر لبی خندہ کے کشتون مین ہون جسکا — نزدیک ادا فہمون کے ہے نام تبسم
اے مصحفیؔ میرے دل ناشاد کی خاطر — ایجاد کیا اُس نے بد شنام تبسم

ایک ایک مصرعہ پکار رہا ہے کہ مین شیخ مصحفیؔ کی ملکیت نہین مرزا سودا کی تراوش ہون مطلع مین دونون قافیون کو اس طرح درست بٹھا دینا چودھوین صدی کے شعرا کا کام نہین ہے زلف اور بناگوش کی تشبیہ صبح تہ شام کے ساتھ شاعرانہ کارنامہ ہے تا بلب زیر لبی خندہ اور بد شنام وہ ترکیبین ہین جن سے ان کے کمال کا ثبوت ملتا ہے۔

شبنم کا قطرہ ہی نہ فقط آبدیدہ تھا — تربت پہ میری گل بھی گریبان دریدہ تھا
دن رات طفل اشک کبھی نور دیدہ تھا — رونے سے آشنا دل حسرت کشیدہ تھا
آتی تھی رنگ گل سے مجھے رات بوئے خون — عاشق کا کیا ترے وہ گلوئے بریدہ تھا
اب لامکان سے بھی ہے ادھر اُس کی بود و باش — عرش آشیان جو طائر رنگ پریدہ تھا
شب اشتیاق بوسۂ رخ مین ترے صنم — ہر ایک برگ گل لب حسرت گزیدہ تھا

شبنم و گل یہی دو چیزین ہین جن سے دونون قافیے دو صفتون سے متصف ہو گئے اور عاشق ناشاد کی تربت پر حسرت و یاس کی بارش کر رہے ہین چوتھے شعر کی معنویت تک پہونچنے کے لئے ذرا بلند دماغ کی ضرورت ہے۔ پانچوین برگ گل کو لب حسرت گزیدہ سے تشبیہ دینا مرزا سودا سے قریب تر کر دیتا ہے۔

کیا عہد کوئی اُس بت سفاک سے باندھے — سر کاٹ کے عاشق کا جو فتراک سے باندھے
جاؤن جو حرم مین تو میری آہ کا شعلہ — قندیل ستون حرم پاک سے باندھے
پلکین نہ کبھی سد رہ اشک روان ہون — دریا کو نہ کوئی خس و خاشاک سے باندھے
گر دیدۂ بینا ہو تو صناع ازل نے — کیا کیا نہ طلسم ایک کف خاک سے باندھے
چسپیدہ گئی دل سے عجب کیا ہے جو عاشق — تیر ادم خنجر جگر چاک سے باندھے

کل مین شب ہجران مین ترے غصے کے مارے — الماس کے ٹکڑے جگر چاک سے باندھے
ہم سجدہ ادا کر چکے اب سر کو ہمارے — نیزے پہ رکھے خواہ وہ فتراک سے باندھے
دریائے سرشک اپنا جو طغیانی پر آوے — دامن کو وہین دامن افلاک سے باندھے
کیا کیا نہ غزال ختنی مصحفی مین نے — اس دشت مین تارِ نظر پاک سے باندھے

تیسرے شعر کی تشبیہی کیفیت غور طلب ہے۔ اشک روان کو دریا اور پلکون کو خس وخاشاک سے تشبیہ دینا نادر نہین تو اور کیا ہے۔ پانچوین شعر کی جان چسپیدگی دل ہے چاک جگر کی تسکین کیلئے قاتل کے دم خنجر کو پھاہا بنانا نہایت مزے کی بات ہے ساتوان شعر نیاز عشق اور صبر وتسلیم کا اعلیٰ مظہر ہے مقطع فخریہ نہین واقعہ ہے کلام کا زور اور مضمون کی نزاکت دونون کا لحاظ کیجئے زبان پر حاکمانہ قدرت رکھنا اسی کا نام ہے

سیراب آب جو سے قدح اور قدح سے ہم — سرخوش گلون کی بو سے قدح اور قدح سے ہم
چہرے پہ ہے گلال جو اُس مست ناز کے — رنگین ہے عکس رو سے قدح اور قدح سے ہم
پیر مغان کرم ہے جو سیراب ہو سکے — تیرے نم وضو سے قدح اور قدح سے ہم
حلقہ نہین یہ کاکل ساقی مین بلکہ ہے — وابستہ مو بمو سے قدح اور قدح سے ہم
شیشہ جو پھوٹ جائے تو پھوٹے مگر نہ ہو — یارب جدا سبو سے قدح اور قدح سے ہم

اسکے مقابلہ مین بقا کی غزلین بھی دیکھو اور پھر فیصلہ کرو کہ مصحفی کا کیا مرتبہ تھا

مصحفی کی ایک اور غزل ملاحظہ ہو:۔

ہے کاروان رفتہ فراموش نقش پا — بانگ جرس کو سُن نہ سکے گوش نقش پا
تلوے ہون ایسے کیون کہ فراموش نقش پا — دیکھے سے جن کے صاف گیا ہوش نقش پا
اُفتادگان وادی غربت کی سرگذشت — کرتا ہے خود بیاں لب خاموش نقش پا
رنگ کفک سے تا نہ ہوا اُسکے ہم کنار — نکلی نہ دل سے حسرت آغوش نقش پا
اک ناز سے جب اُسنے زمین پر رکھا قدم — سو منتین رکھین بسر دوش نقش پا
تربت پہ میری بھول کر اُسنے رکھا تھا پاؤن — اتبک دعا مین ہین لب خاموش نقش پا
کس کی حنائے تازہ کے ہین فرش پر نشان — فراش اتبلک ہین جو مدہوش نقش پا
مین ناتوان زمین پہ قدم کیا رکھون کہ ہے — ہستی مری گران بہ سر دوش نقش پا

روندے حسن مین ہم تو ہوگئے پامال مصحفی
از بس کہ اس گلی مین ہوا جوش نقش پا

اسکے ساتھ ہی مرزا سودا کی غزل پر بھی نگاہ ڈالو۔ اور پھر انصاف کرو کہ مصحفی کیا چیز تھا۔

ایک اور سنگلاخ زمین مین مصحفی فرماتے ہین:-

روبرو اُسکی جو تھی شب فندق گلرنگ و شمع ۔ تا سحر کرتا تھا مین سیر گل اور نگ و شمع

وہ تو ہوا سپر تصدق یہ کرے اس سے گریز ۔ دیدنی ہے صحبت پروانۂ بے ننگ و شمع

جانتا گر مین کہ مانی تری کھینچے گا شبیہ ۔ متصل ہونے نہ دیتا کاغذ بیرنگ و شمع

داغ سینہ کا وہی ہے سختیٔ ہجران وہی ۔ قبر عاشق کو نہین کچھ احتیاج سنگ و شمع

ہم تصور مین تری انگشت فندق بند کے ۔ رکھ کے سورہتے ہین بالین پر گل اورنگ و شمع

مجلس احباب مین شب ہم گئے تو لطف کیا ۔ صبحدم تھا ایک چہرے کا ہمارے رنگ و شمع

عاشق دیوانہ کو کیا مجلس افروزی سے کام ۔ عشق مین کیونکر ہو یکجا ترک نام ننگ و شمع

مین قسم کھاتا ہون جھپکی ہو ذرا اگر میری آنکھ ۔ رات تھا پیش نظر اُس حسن کا نیرنگ و شمع

دل جلون کے تن پہ ہے ہر پیرہن فانوس وار ۔ مصحفی یکجا نہ ہو ہرگز لباس تنگ و شمع

شمع کی ردیف اور اُسکے ساتھ دوسری بالکل غیر متعلق چیز کا جمع کر لینا آسان نہین ہے۔ ایک ایک شعر کاوش فکر کا بے مثل نمونہ ہے۔ چوتھے شعر کی برجستگی داد کی مستحق ہے پانچوان شعر تشبیہ کے حسن انتظام کا لحاظ کرتے ہوئے اعجاز سے کم نہین گل اورنگ و شمع کے اجتماع کو انگشت فندق بند کے تصور کے ساتھ اس ترکیب سے وابستہ کیا گیا ہے کہ ہر پہلو سے روشن معلوم ہوتا ہے۔ آٹھوان شعر حسرت و یاس کی ایک دنیا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ترک نام و ننگ اور شمع ایک جگہ نہین ہو سکتے عاشق دیوانہ کی ترکیب کسقدر درست ہے مجلس افروزی کا موقع اس سے بہتر کہان دستیاب ہو سکتا ہے۔ مقطع بھی اپنے رنگ مین لاجواب ہے۔ بقول مولوی عبدالسلام مرحوم ایسی سنگلاخ زمینون مین سررشتۂ مضمون کو ہاتھ سے نہ دینا ان ہی بزرگون کا کام تھا۔ متاخرین سے یہ کمان زہ نہ ہو سکی۔ اسیر آزاد کہتے ہین کہ سودا کا کچھ کچھ سایہ پڑ جاتا ہے۔ خود دو چار شعر لکھنے بیٹھتے تو حقیقت کھلجاتی

ایک غزل اور ملاحظہ ہو:-

میری نشستگاہ تو اکثر زمین ہے ۔ مانند نقش پا مرا بستر زمین ہے

آتا ہے جی مین روکے ڈبو دون اسے بھی مین ۔ تھوڑی سی یہ جو پانی کے باہر زمین ہے

دیکھو نہ خاکساروں کا بستر بہ چشم کم ۔ رہتے مین آسمان کی برابر زمین ہے

ہم جانتے ہین کوچۂ جانان کا مرتبہ ۔ مسجود خلق ہے یہ عجب سرزمین ہے

اک دن ہوا تھا وہ گل عارض عرق فشان ۔ ابتک ہمارے گھر کی معطر زمین ہے

کس بات پر ترا ہے دماغ آسمان پر ۔ منزل گہ فقیر و تونگر زمین ہے

ہون خاک پائے خلق مین دنیا مین مصحفی — یعنے بسانِ مور مرا گھر زمین ہے

دوسرے شعر کی بلند حوصلگی نواب مصطفےٰ خان شیفتہ سے دریافت کیجئے، چوتھا شعر ندرت تخیل کا بہترین مرقع کہا جا سکتا ہے کوچۂ جانان کا مرتبہ بڑھانیکے لئے مسجودِ خلق کہنا اور اس نسبت سے عجیب سرزمین کا خطاب دینا اُستادی سے بھی زیادہ ہے سرزمین کے اصلی معنی جیسے یہان بیان ہوگئے۔ دوسری جگہ شاید ہی ہو سکین۔

صاف چولی سے عیان ہے بدن سرخ ترا — نہین چھپتا تہِ شبنم چمن سُرخ ترا
یہی عالم ہے اگر اسکا تو دکھلائے گا — بارش خون کا سمان پیرہن سُرخ ترا
وائے ناکامی کہ عاشق کو ترے موت آئی — قابل بوسہ ہوا جب دہن سُرخ ترا
خون سے آلودہ ہوتا ہے تو اے اشکِ سفید — نام ہم کیون نہ رکھین یاسمن سُرخ ترا
آتش تیز یہ ٹھہرا ہے کہین یون بھی سپند — کہہ رہا ہے یہی خالِ ذقن سُرخ ترا
یہی پوشاک کا ہے رنگ تو اے گل ہوگا — تشنۂ خون چمن پیرہن سُرخ ترا
کاش اے کشتے تو محشر مین اُٹھے ہوکے فقیر — گیروا مٹی مین ہووے کفن سُرخ ترا
مصحفی چاہئے کیا اس کو دلیلِ قاطع — سبز ہے خود یہ تخلص سخن سُرخ ترا

اک تو تھا آتش سوزان بدن سُرخ ترا — شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہن سُرخ ترا
شمع گلگون غم پروانہ مین خون آشنا نہ رو — طشت آتش تو بنا ہے لگن سُرخ ترا
سُرخ عیار سے تو کم نہین اے دزدِ حنا — کف رنگین بتان ہے دہن سُرخ ترا
یون ہی اے کشتہ جو آیا تو صفِ محشر مین — آگ دیویگا لگا وان کفن سُرخ ترا
تو اگر نافۂ آہو ہے تو اے عقدۂ زلف — وہ ہے رخسارۂ رنگین ختن سُرخ ترا
ہر پری چہرہ ہے پوشیدہ لباس گلگون — مین تو دیوانہ ہون اے انجمن سُرخ ترا
مصحفی زخم ہے تیشے کا ترے ہر مو پر — نام ہم کیون نہ رکھین کوہکن سُرخ ترا

یہ غزلین اُس زمانہ کی ہین جبکہ بقول آزاد شیخ مصحفی کی پیری نے پرواز کے باز ضعیف کر دیئے تھے اور بقول کسے پہلوان سخن شاہ نصیر لکھنؤ مین موجود تھے۔ واقعہ بندی کا حق اور کتابون مین ادا کیا گیا ہے ہمین صرف یہ دکھانا ہے کہ جوان طبیعت شاہ نصیر صبر نے جنکی تعریف و توصیف ان کے ارادتمند شاید پانچون وقت کرتے ہونگے۔ اس قافیہ اور ردیف مین صرف ایک ہی غزل لکھی اور وہ بھی جو آبحیات مین درج ہے۔ مگر اسی کہن سال مصحفی نے نہ صرف تین غزلین لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ایک غزل کا دربھی اضافہ کر دیا جسمین سرخ ترا کے بدلے دہن سرخ ترا کو ردیف قرار دیکر گل و بلبل کو قافئے کے لئے انتخاب کیا گیا تھا۔ اگر کسی کی

چشم انصاف بند نہ ہو تو بھی مصحفی کی تصویر کمال کے لئے آئینہ کا کام دے سکتی ہے۔ لیکن جب ہم آزاد کے قلم کو شاہ نصیر کی تعریف و توصیف مین شورش انگیز دیکھتے ہین اور شیخ مرحوم کی اوصاف نگاری کے وقت گُند و شکستہ تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہین رہتی

منعم عبث عبث ہے گرفتار سنگ و خشت
دب جائیگا کبھی تہِ دیوار سنگ و خشت

لعل و گہر کا مرتبہ کیا جانتے ہین وہ
جو عمر بھر رہے ہین خریدار سنگ و خشت

میرے جنون کے عہد مین لڑکون کے ہاتھ سے
ثابت نہین زمین پر آثار سنگ و خشت

لڑکون کی خالی اب نظر آتی ہین جھولیان
بس ہم تلک تھی گرمیِ بازار سنگ و خشت

شور جنون نہ اس سے گیا ہائے مصحفی
یہ سر رہا ہمیشہ طلبگار سنگ و خشت

آغاز صبح ہجر کا انجام دور ہے
اے دیدہ اور روکہ ابھی شام دور ہے

انصاف تو کرو دل بیتاب کو مرے
آرام کس طرح ہو دل آرام دور ہے

مے پی چکون تو دیکھنا بدمستیان مری
یارو ابھی تو لب سے مرے جام دور ہے

بیٹھا ہے نقش سب کا لب یار پر درست
الّا کہ اس نگین سے میرا نام دور ہے

نازان ہو اسقدر نہ کمند شعاع پر
اے آفتاب اسکا لب بام دور ہے

جب سے نظر پڑی ہے اُس ابرو کی تیغ پر
سر سے ہمارے بالش آرام دور ہے

کیون مصحفی کو دیکھ کے کہتا ہے دور دور
قدرت ہوئی کہ آپ یہ بدنام دور ہے

ہو کیونکر مصحف دل کی مرے تفسیر بے معنی
کہ دانشمند کی ہوتی نہین تقریر بے معنی

جو آیا دان سے مجھسے اُسنے کی تقریر بے معنی
مرے خط کی تو کچھ ایسی نہ تھی تحریر بے معنی

خط اُس نے پڑھ کے میرا پھاڑ ڈالا اس بہانے سے
یہ خط لکھا ہے کس نے اسکی ہے تحریر بے معنی

نکالا قتل کرنے کو جو اُس نے مجھکو زندان سے
تو مقتل تک صدا دیتی گئی زنجیر بے معنی

لکھا ہے صاف اُس مین حالِ قتلِ عاشقِ محزون
نہین خطِ غبارِ جوہر شمشیر بے معنی

بے معنی ردیف اور اُس مین اسقدر صفائی کے ساتھ معنی دار شعر نکالنا اعجاز شاعری ہے۔ تیسرے شعر کے تیور دیکھئے خالص عاشقانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جرأت کا اصلی رنگ یہی ہے جسے مومن خان کے خاندان نے متین اور ذوق کے خاندان مین خصوصیت کے ساتھ داغ نے بازاری بنا دیا۔ چوتھا شعر بھی عجیب ہے ظاہراً صدائے زنجیر کو معنویت سے کوئی تعلق نہین لیکن جب اس طرف نگاہ کی جائے کہ معشوق اپنے عاشق کو قتل کرنیکے لئے زندان سے نکال کر قتل کی طرف لیجاتا ہے۔ اور اسیر

محبت کی پابجولانی کی طرف خیال بھی نہین کرتا تو صدائے زنجیر مین خود بخود معنی پڑجاتے ہین۔ اُستادی اسی کا نام ہے۔ پانچوین شعر کی ترکیب کسقدر برجستہ اور حیثیت واقع ہوئی ہے خط غبار جوہر شمشیر کا پیچ در پیچ استعارہ مرزا غالب کی شاعری کی یاد دلادیتا ہے

ہے گمان اس مصرع قد پر نہال طور کا ہون مین شاعر سوجھتا ہے مجھکو مضمون ور کا
عمر آخر مٹ گیا داغ اس دل رنجور کا صبح پیری مین اثر تھا مرہم کا فور کا
کب کوئی مجھ سا ہے عاشق اُس رخ پُر نور کا چاہئے موسیٰ سا پروانہ چراغ طور کا
معنی الحق لیکلو سب جہان پر کھل گئے دار پر جسوقت سر اونچا ہوا منصور کا
اہل دنیا ثقل سے دنیا کے ہون سرگرم سعی بوجھ سر پر ہو تو جلد اُٹھے قدم مزدور کا
مان کہنے کو مرے ترک رعونت کر کہ یہان گوئے بازی بیشتر دیکھا ہے سر مغرور کا
زلف مین افشان ہے گرمی سے عرق افشان وہ رخ ۔ کیا برستا ہے شب مہ مین یہ باران نور کا
خوشون کے مانند سر سے پاؤن تک ہین آبلے آدمی ہے تیرا دیوانہ کہ نخل انگور کا
گلشن امکان ہے جائے انفعال اے باغبان سرنگون رہنا بجا ہے نرگس مخمور کا
چشم کم سے دیکھتا ہے میرے آنسو کو بھی وہ شبہ ہے دُر نجف پر یار کو بلّور کا
مصحفی چرخ ملکوکب سے نہ اتنا بھی اُلجھ چھیڑنا اچھا نہین ہے خانۂ زنبور کا

دل کرون کیون کر مین اپنا نذر چشم یار کو رسم ہے آئینہ دکھلاتے نہین بیمار کو
کیا سمجھکر دل دیا تھا مین نے چشم یار کو اب جدا کیونکر کرون اس سیب سے بیمار کو
نوجوانی کھوکے یون پیری مین غفلت بڑھ گئی صبح کو آتی ہے جیسے نیند شب بیدار کو
کہکشان نے اور بھی بیقدر گردون کو کیا مول کب لیتے ہین مردم جبینئ مودار کو
زہر ہے یہ ترک کردنیا کی لذت اے حریص چوستا ہے منہ مین رکھ کر کیا زبان مار کو
دل جو محکم ہے نہین پروائے دور آسمان بیل کی ٹکر سے کیا ڈر آہنی دیوار کو
ہو حسینون کو مبارک غازۂ رخسار صاف دوست رکھتے ہین یہ مرے دیدۂ خونبار کو
عارضی عزت کا خواہان ہی نہین مرد فقیر کیا علاقہ ہے سر آزاد سے دستار کو
مصحفی چھوڑا در اُس کا تونے نادان کیا کیا ہاتھ سے دیتا ہے کوئی ایسی بھی سرکار کو

دونون غزلین یہ ثابت کرنیکے لئے کافی ہین کہ تمثیل کا وہی حق شیخ مصحفی نے تمام وکمال ادا کر دیا ہے۔ جو مرزا سودا، شاہ نصیر، ناسخ اور ذوق کے کلام کا جوہر تسلیم کرتے ہین کہ دیوان اُنکی اُستادی کو مسلم الثبوت

کرتے ہین انواع و اقسام کی صدہا غزلین ہین جو غزلین سنگلاخ زمینون مین لکھی ہین ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت مشق سے کلام پر قدرت کامل پائی تھی۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کرکے اس دروبست کے ساتھ کھپایا ہے کہ جو حق اُستادی کا ہے ادا ہو گیا ہے۔ ساتھ اسکے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیتے" لیکن اپنی عادت مستمرہ کے مطابق یہ کہنے سے بھی نہین چوکے کہ ایسے موقع پر کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑ جاتا ہے۔

مزے کی بات دیکھئے ایک طرف تو کہتے ہین کہ جو اُستادی کا حق ہے ادا ہو گیا ہے اور محاورہ بھی ہاتھ سے نہین گیا اور دوسری طرف کہتے ہین کہ کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑ جاتا ہے۔ آخر اسکا کیا مطلب ہے اگر لفظون کے دروبست مین شیخ مصحفی نے اُستادی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور یہ صفت درحقیقت مرزا سودا کی ہے تو پھر مرزا سودا کا پورا سایہ کیون نہ تسلیم کیا جائے۔ اور اگر کچھ کچھ سایہ پڑا ہے تو اسکی دو صورتین ہو سکتی ہین یا تو آزاد نے سمجھنے مین غلطی کی یعنی شیخ مصحفی مرحوم نے مرزا سودا کی طرح استادی کا اصلی حق ادا نہین کیا اور یہ بالکل غلط ہے یا مرزا سودا خود اس درجہ تک نہ پہونچے تھے جہان اُستادی کا حق ادا ہوتا ہے اس صورت مین اس فقرہ کا یہ مطلب ہوگا کہ سودا نے اُستادی کا حق تو ادا نہین کیا البتہ الفاظ کے دروبست مین انہون نے پوری کوشش سے کام لیا اور شیخ مصحفی نے مرزا سودا کی تقلید بھی کی اور اُستادی کا حق بھی پورا پورا ادا ہو گیا۔

جن ردیف و قوافی مین دونون باکمال اُستادون کو طبع آزمائی کا موقع ملا ہے بہت خفیف تامل کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ مرزا سودا کو شیخ مصحفی کے مقابلے مین کوئی خاص برتری حاصل نہین بلکہ اکثر مقامات پر شیخ مصحفی مرحوم کی فصاحت زبان مرزا سودا کی قدیم اُردو سے اس طرح ممیز نظر آتی ہے جس طرح متفرق رنگ کے پھولون سے سجائے ہوئے گلدستے مین گلاب کا پھول مثلاً:-

کبھی مین بات بن روئے نہین کی اُس سے پر اُن نے　　نہ پوچھا یون سبب کیا ہے ترے ہر بار رونے کا　　سودا

ہنسی آتی ہے تیری بات پر اے مصحفی مجھکو　　نہ کر تو ذکر میرے سامنے ہر بار رونے کا　　مصحفی

مرزا سودا کے شعر مین رو کر بات کرنا طفلانہ حرکت سے کم نہین دوسرے مصرعہ مین یون زائد ہے۔ شیخ مصحفی کا شعر بالکل سانچے مین ڈھلکر نکلا ہے ہر بار رونے کا ذکر سنکر ہنسی آنا فطرت سے کسقدر قریب ہے۔

جو مذکور اُس سے کرتا ہے کوئی غمخوار رونے کا　　تو کہتا ہے کہ چپ رہ ہے اُسے آزار رونے کا　　سودا

معالج ہو سکے اب کیا کوئی غمخوار رونے کا　　کہ ان آنکھون کو اک مدت سے ہے آزار رونیکا　　مصحفی

مرزا سودا کے شعر مین رونے والے کی تخصیص نہین ہے مگر شیخ مصحفی نے آنکھون کو رونے کا آزار دیکر اعتراض کی گنجائش نہین چھوڑی۔

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا　　پہونچے کب اُسکو ہاتھ ہمارے غبار کا　　سودا

کرے صبا طواف ہمارے مزار کا　　پائیگی پھر نشان بھی نہ مشت غبار کا　　مصحفی

مرزا سودا نے نہایت اچھی بات کہی ہے جب صبا ہی دامن نہ چھو سکے تو غبار کا ہاتھ کیسے پہونچ سکتا ہے کیونکہ غبار کی رسائی تو

ذریعہ تو صرف صبا ہی ہے لیکن شیخ مصحفی نے بھی غضب کر دیا۔ پہلے مصرعہ کی ترکیب کسقدر ریزہ زور ہے۔ اپنے بے نشان ہونے کی اطلاع ایسے پیرایہ مین دینا کہ جیسے صبا کا اس مین مطلق ہاتھ نہ ہوگا ایک کمال شاعرانہ ہے مشت غبار کی ترکیب بھی لطافت سے خالی نہین

خونِ جگر شراب، ترشح یہ چشم تر — ساغر مرا گرد نہین ابر بہار کا — سودا

کچھ دیر ہے رہائی مُرغ اسیر مین — جائے ابھی چمن سے نہ موسم بہار کا — مصحفی

مرزا سودا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی شراب خواری کیلئے ابر بہار کے محتاج نہین ہین ہمارے لئے خون جگر شراب ہے اور چشم تر بارش اسمین شک نہین کہ بات پیدا کی ہے لیکن تغزل سے بالکل علیحدہ تھی۔ شیخ مصحفی کا شعر بہترین نمونہ تغزل کا ہے۔

چھوٹا جو زلف سے تو پھنسا دام خط کے بیچ — یہ مرغ دل ہمیشہ گرفتار ہی رہا — سودا

مانند مرغ قبلہ نما مرغ دل مرا — نکلا نہ آشیان سے گرفتار ہی رہا — مصحفی

مرزا سودا کا شعر معمولی مضمون خال و خط مین اُلجھا ہوا ہے لیکن شیخ مصحفی نے مرغ دل کی گرفتاری کا نیا پہلو پیدا کیا اور اُسے مرغ قبلہ نما کہہ کر میعاد قید کی اسقدر توسیع کر دی کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھی

کیا فائدہ کہ درپے تحقیق ہم رہین — ملنے سے جبکہ ہم رہے پھر تو کہین رہا — سودا

یاران تیز رو تو سب آگے نکل گئے — اللہ رے ضعف اُن سے مین پیچھے کہین رہا — مصحفی

دونون شعر جداگانہ حیثیت رکھتے ہین تاہم مرزا سودا کا مضمون مبتذل ہے اور شیخ نے اپنی متانت و ثقاہت کو برقرار رکھا ہے

نکلا کسی ہی طرح نہ دل سے ترے غبار — سودا سے تو تو یار رہا اشر نگین رہا — سودا

ہرگز ہوا نہ کام مرا ایک دن تمام — مین نیم کشتہ نگہ شرمگین رہا — مصحفی

مرزا سودا کا پہلا مصرعہ فصاحت سے بالکل لبید ہے "کسی ہی طرح سے" ان پارہائے فصاحت مین سے ہے جن کی بناپر آزاد نے انکو "افصح البیان" کا تمغا عنایت کیا ہے۔ شیخ مصحفی کے شعر کو دیکھئے ستارہ کے مقابلے مین آفتاب معلوم ہوتا ہے "نیم کشتہ نگہ شرمگین" کی ترکیب کسقدر پاکیزہ واقع ہوئی ہے

اب کے بھی دن بہار کے یون ہی چلے گئے — پھر پھر گل آچکے پہ صنم تم بھلے گئے — سودا

تم رات وعدہ کر کے جو ہمسے چلے گئے — پھر جب سے خواب مین بھی نہ آئے بھلے گئے — مصحفی

اے شمع دل گداز کسی کا نہ ہو کہ شب — پروانہ داغ تجھسے ہوا ہم جلے گئے — سودا

آتش مین عشق و شوق کی مانند چوب خشک — جب تک کسی نے ہم کو جلایا جلے گئے — مصحفی

منہ مین خدا نے دی ہے زبان بات کیلئے　　محرم ہون مین تو کہہ دو مکافات کے لئے　　**سودا**

ہم یان تڑپ کے رہ گئے اک بات کیلئے　　تم وان گئے کسی کی ملاقات کے لئے　　**مصحفی**

غالبًا یہ چند مثالین اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہین کہ شکوہ الفاظ، بلندی خیال، چستیٔ ترکیب وغیرہ جملہ اوصاف عالیہ مین شیخ مصحفی مرزا سودا سے کسی طرح کم نہین ہین۔ اور میر و مرزا دونون باکمال استادون کے اوصاف کمال کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اُنھون نے

حسد کی جا نہین اے مصحفی کلام اُن کا　　کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہین

کہدیا تو کوئی مبالغہ نہین کیا بلکہ امر واقعہ کا اظہار تھا۔

افسر امروہوی

چند دن لکھنؤ سے باہر

میرا لکھنؤ سے باہر جانا گویا "ہفتخوان" طے کرنا ہے۔ وہی عزم و اہتمام، وہی نشر و اعلان اور وہی "رستمانہ" جرأت و بسالت کا اظہار ——— لیکن فرق یہ ہے کہ اُس کو "فردوسی" ایسا شاعر مل گیا تھا اور مجھے یہ خدمت خود انجام دینا پڑتی ہے ——— اور وہ بھی بلا لغہ! کتنا تفاوت ہے!! سفر "وسیلۂ ظفر" ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا "مشق نظر" ہونا یقینی ہے اور میرا دل اسدرجہ "لبریز بصیرت" ہے کہ "بصارت" سے بھی کوئی خلاف معمول کام لینا مجھے مشوش کر دیتا ہے ——— پھر اسی کے ساتھ ایک اہم سوال "سیاسیات خانگی" کا ہمیشہ یہ بھی پیش آجاتا ہے کہ اِدھر مین نے کہین جانے کا ارادہ کیا اور اُدھر ایک فیصلہ کن انداز سے بیگم بولین کہ "مین بھی چلونگی۔ کوئی وجہ نہین کہ مرد جہان چاہے آزادی سے سیر کرتے پھرین اور عورتین ایک ہی قسم کی صبح و شام بسر کرنے پر مجبور رہون" ——— ممکن ہے وہ یہ صرف تفریحاً و مزاحاً کہتی ہون، لیکن انکا لب و لہجہ اسقدر سنجیدہ ہوتا ہے کہ مجھے بالکل "باب الاستفسار" کی طرح اسپر غور کرنا پڑتا ہے۔ اِس مرتبہ بھی یہی ہوا اور مین نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ "بیشک عورت آزاد ہے اور آپ آزادی کے ساتھ جہان جی مین آئے جا سکتی ہین، لیکن میرے ساتھ چلنے مین آپ کو پھر وہی پابندی رہیگی اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ نہ چلئے بلکہ اگر مین مغرب کی طرف پشاور جاتا ہون تو آپ مشرق کی جانب کلکتہ جائے، اگر قسمت مین پھر ملاقات لکھی ہے تو ہو ہی جائے گی ورنہ خیر، اللہ مالک ہے۔ مگر ہان دیکھئے اپنا پتہ ضرور لکھئے گا تاکہ کبھی کبھی خط و کتابت تو ہو سکے" یہ سنکر وہ چین پیشانی سے برہمی کا اظہار کرتی ہوئی چلدین لیکن دوبارہ کچھ سوچکر اس طرح بپھری ہوئی آئین گویا کوئی قصاص کا میاب صورت انتقام کی ذہن مین آئی ہے بولین "یہ آپ پانچ دن کے لئے گھر کا سارا سامان تو ساتھ لئے جاتے ہین، لیکن یہ یاد رہے کہ ایک ایک چیز میری نگاہ مین ہے۔ اُس مرتبہ رُدولی گئے تو اُونی ٹوپی جس کو مینے تین دن کی محنت سے ڈھائی روپیہ کا اُون صرف کرکے بُنا تھا، خدا معلوم قوال کو دے آئے یا کیا کی، اس مرتبہ یہ سب گرم کپڑے کھو کر آنا۔ مین کہتی ہون کہ یہ گھر سے باہر نکلنے کے بعد مرد اپنے آپ مین کیون نہین رہتا ——— بیوی گویا عذاب ہے جس سے چھٹنے کی خوشی مین سر و پا کا ہوش نہین رہتا ——— کچھ سُنا آپ نے" ——— مین نے عرض کیا کہ "اسی لئے تو مین کبھی آپ کو اپنے ساتھ نہین لیجاتا کہ نسیان غالب ہے، چیزین ہمیشہ بھول جاتا ہون، اگر خدانخواستہ آپ کو کھو بیٹھا تو پھر کیا ہوگا ———" الغرض سفر سے ایک ہفتہ قبل "ذکر سفر" کے سلسلہ مین اس نوع کا مکالمہ بھی کبھی کبھی ضرور ہو جاتا تھا

۶ ار دسمبر سے غالباً دس دن قبل اس "سفر" کے آثار اول اول مولوی غلام ربانی عزیز بی اے کیمبلپوری کی ایک تحریر سے پیدا ہوئے جس مین انھون نے اپنے ایک خواب کا ذکر کیا تھا اور جس کی تعبیر ناممکن تھی جب تک مین وہان نہ پہونچ جاتا اس سلسلہ مین یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ مولوی عزیز میرے اور نگار کے اُن چند مخلصین مین سے ہین کہ اگر ان حضرات کا

وجود نہ ہوتا تو میرے دل کی "سرشاریاں" اور نگار کی "پرکاریاں" شاید اس حد تک نہ پہونچ سکتیں ـــ ۱۹۲۹ء کے آخری دن، کام کا ہجوم، نئے سال کی طیاریاں، جنوری کے "عظیم انجم" رسالہ کی ترتیب وطباعت، پریس، دار الاشاعت اور نگار کے سالانہ حساب کی تنقیح، آیندہ لائحہ عمل کی تعیین وتشکیل، رسالۂ جن کی ترتیب وتوسیع اشاعت کی فکر اور پھر ان سب پر طرہ زمہریری سردی ـــــ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اس زمانہ میں، پشاور کی طرف کا عزم کہیں ایسا تو نہیں کہ میری مٹی کھینچے لئے جا رہی ہو
بہرحال منیجر نگار کو تمام کاروبار تفویض کرکے اور ایام غیر حاضری کا پورا پروگرام اس طرح طیار کرکے گویا کہ وہ کوئی "وصیت نامہ" تھا، میں ۱۶ دسمبر کی رات میں ٹھیک ۹ بجے گھر سے روانہ ہوگیا۔

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرساہا

سفر کی کئی قسمیں ہیں، ایک سفر تو وہ "بیک بینی و دو گوش" والا سفر ہے جو آدم کو جنت سے کرنا پڑا تھا اور جسے "ولے براندش" بھی کہتے ہیں، دوسری قسم سفر کی وہ ہے جو نپولین، ہنی بال، سکندر، چنگیز اور ہلاکو کیا کرتے تھے اور جسے "زلزلۃ فی الارض" کہنا زیادہ موزوں ہے، تیسری صورت سفر کی وہ ہے جو ابراہیم ادہم اور بودھ نے اختیار کیا تھا کہ اس سے مقصود "نفس کشی" یا "اصلاح نوع انسانی" تھا، چوتھی صورت سفر کی وہ ہے جو کاروباری ایجنٹ یا تاجر کرتے ہیں، پانچویں صورت اُس جہان گردی کی ہے جو فسیروا فی الارض کے ماتحت آجکل امریکہ کے دولتمند لوگ کیا کرتے ہیں چھٹی قسم وہ ہے جسے "یارے برخورد از وصل یارے" کہتے ہیں، ساتویں وہ "مفقود" قسم سفر کی ہے جو فرہاد و مجنوں کو کرنا پڑتا تھا۔ "مفقود" اس لئے کہ اب " نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں سردیاں" ـــ ایک، آخری قسم سفر کی اور ہے جسے "سفر آخرت" کہتے ہیں اور جسکی تفسیر وتشریح رسالۂ جن" میں ہوا کرتی ہے ـــــ لیکن یہ سفر ان تمام قسموں سے الگ قسم کا تھا یعنی اگر وہ "دنیادارانہ" "واخلاقانہ" نہیں تھا تو اس میں شک نہیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا جارہا تھا شدت برودت سے اُس میں "جانبازانہ" کیفیت ضرور پیدا ہوتی جارہی تھی

۱۷ کی صبح کو جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ٹرین سہارنپور اسٹیشن پر کھڑی ہے جو یوپی کے حصۂ "مستدراباد" کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے عازمان پنجاب کو وہاں کے لب ولہجہ سے آشنا کرنے میں کافی مدد پہونچاتا ہے۔ ٹرین میں بیٹھے رہنے کا جہانتک تعلق ہے یہ سفر نہایت ہی خشک (Barren) ثابت ہوا اس لئے میں جزئیات سفر سے بحث نہ کرونگا، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دن بھر لحاف کے اندر نہایت آرام سے لیٹا رہا اور کھڑکیاں بند کئے ہوئے پان کھاتا رہا یا کتاب پڑھتا رہا۔ چونکہ آجکل "جن" کا بھوت سر پر سوار ہے اس لئے کتاب بھی ڈنس براڈلے کی (Towards The Stars) تھی۔ شام کو جب لاہور اسٹیشن پر اختر شیرانی، رفیعی اجمیری اور غلام رسول مہر سے ملاقات ہوئی تو "دیارائے گفتگو" بھی عود کر آیا ورنہ گزشتہ ۲۲ گھنٹے کے دوران میں ایک بار بھی لبوں کو جنبش دینے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔

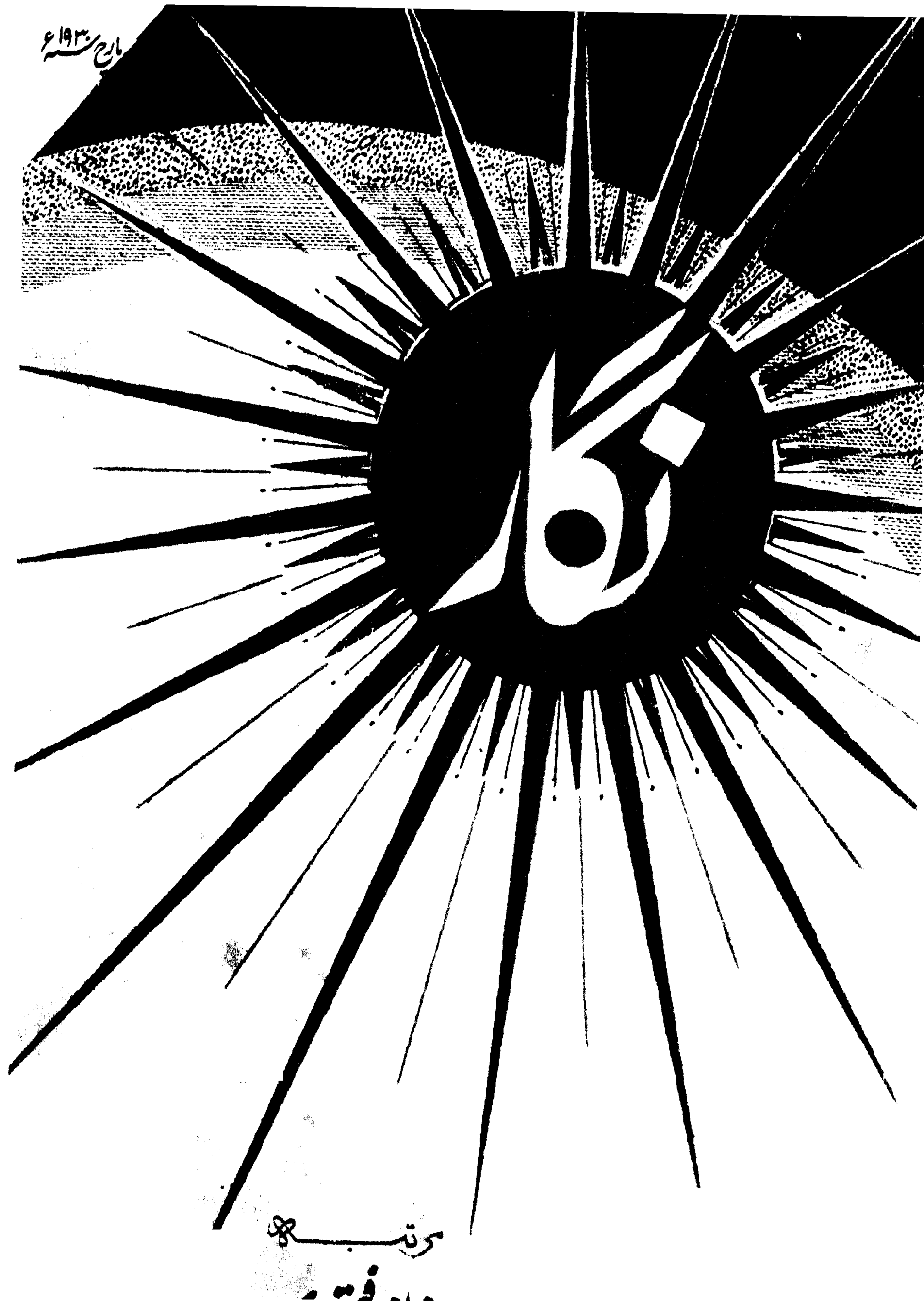
اختر راجپوتانہ کے ایک قصبۂ شیراں کے رہنے والے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں راجپوتانہ ہی وہ حصہ ہے جو

عرب کی عشق خیز سرزمین۔ نجد و تہامہ۔ کے جواب مین پیش کیا جا سکتا ہے اس لئے ناظرین نگار کو حیرت نہ کرنا چاہئے اگر قیس عامری کی لیلیٰ کی طرح انھون نے بھی ایک سلمیٰ پیدا کرلی ہے اور اگر حقیقت کو مستور رکھا جائے تو بھی یہ حقیقت اُن کی شاعری سے ظاہر ہے کہ جس طرح سرزمین نجد نے ایک بڑا عظیم الشان عاشق مہجور (قیس) پیدا کیا، اسی طرح راجپوتانہ کی بے آب گیاہ فضا نے بھی ایک زبردست محروم وصال غرامی (اختر) کو پیش کیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ لیلیٰ مجنون کی حکایت سے ساری دنیا واقف ہو گئی اور اختر و سلمیٰ کی دردمند یان فسانہ نہ بن سکین۔

نہ دنیا مین ہوا مشہور، ورنہ اک فسانہ تھا
مرے دل کا ہلاک جلوۂ مستور ہو جاتا

اس مین شک نہین کہ اختر اُن نوجوانون مین سے ہین جنھین طفل برباد (spoiled child) کہتے ہین لیکن یہ کم لوگون کو معلوم ہے کہ بعض ہستیان سنورتی ہی ہین برباد ہونے کے بعد اور زمانہ انھین بگاڑ رہا ہے بنانے کے لئے۔ اختر کی شاعرانہ افتاد مزاج، انکا والہانہ رنگ طبیعت، انکی وارستہ مزاجی، وارفتہ طبعی، اور ہر وہ ادا جو ایک ذہانت نبوغ، فطانت ادب، احساس شعر، اور اعتراف جمال کے ذوق کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاکر صحیح معنی مین جوانی کے مفہوم کو متعین کرتی ہے، ایک شخص کو بہ اول نظر پوری طرح فریب مین مبتلا کر دینے والی ہے، لیکن جیسا کہ میرا تجربہ ہے، ایسی ہستیون کا غایر مطالعہ ہمیشہ ایک سخت ٹریجڈی ثابت ہوتا ہے اور بہت سے وہ چہرے جو بظاہر متبسم معلوم ہوتے ہین، حقیقتاً اشک سے داغدار ہوتے ہین، اختر بظاہر نوجوان ہین، نشاط کا موسم رکھتے ہین مرادون کے دن کے مالک ہین، لیکن مین دیکھتا ہون کہ یہ غریب اپنے آلام روحانی کی چھپانے کے لئے "یک گونہ بیخودی" قایم رکھنے پر بھی پوری طرح قادر نہین ہے۔ ممکن ہے اختر کی شاعری مین لوگون کو کیف نشاط نظر آتا ہو، لیکن میرے نزدیک وہ سخت المناک ہے۔ افسوس ہے کہ وہ لوگ جنکی زندگی "شاہد و شعر و شراب و شکر" کے ماحول مین بسر ہونی چاہئے ان پر "فریاد زبیچارگی و خستہ درونی" کا ماتم کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اختر شیرانی کی نظم و نثر نے اُن کی تشویش ذہنی کی وجہ سے ابھی تک اُس رنگ کو اختیار نہین کیا جو سکون دماغ کا نتیجہ ہوا کرتا ہے میرے سامنے انکا ادبی مستقبل بہت گرانمایہ ہے، جس کو "شانِ ماضی" سے کوئی واسطہ نہ ہوگا

رفیعی اجمیری (جن کے نام کو مین آجتک صحیح طور پر انگریزی مین نہین لکھ سکا) سرزمین راجپوتانہ کی زیارتگاہ عام (عوام؟) کی پیداوار ہین جسے لوگ (اجمیر شریف کہتے ہین۔ اس سے قبل مین نے ان کو بھوپال مین اس وقت دیکھا تھا جب یہ باندازۂ شش سال زیادہ بچے تھے۔ مین نے بچہ اس لئے کہا کہ اب بھی باوجود "مرد بست و چہار سال" ہونے کے "دران دیار کہ زادی ہنوز آنجائی" کا رنگ ان پر غالب ہے۔ ان کے افسانہائے شباب سے مجھے آگاہی نہین ہے، لیکن ان کی فطری شرافت نفس اور اُس حریری جانماز اور ریشمی قسم کی تسبیح کو دیکھتے ہوئے (جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے اور جنکی بربنائے "اجمیریت"، کبھی کبھی نمائش بھی ہو جاتی ہے) کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک انکی کارگاہ نشاط "چند تصویر بتان چند حسینون کے خطوط"


مارچ سنہ ۱۹۳۰ء
نگار
مرتبہ

چندہ دل اللہ

قواعدِ رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔

۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا

۳- خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دئے جاتے ہیں

۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں

۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو دس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اختتام سے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد

بنات النعش ۸
مرآۃ العروس ۱۰ر
توبۃ النصوح ۱۰ر
موعظۂ حسنہ ۱۴ر
رویائے صادقہ ۱۴ر
ایامی ۱۴ر
فسانۂ مبتلا ۱۴ر
ابن الوقت ۱۴ر
مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول [illegible]
〃 دوم [illegible]
〃 سوم [illegible]
الفاروق [illegible]
سیرۃ النعمان [illegible]
الغزالی [illegible]
المامون [illegible]
سوانح مولانا روم [illegible]
سفرنامہ مصر و شام [illegible]

علم الکلام [illegible]
الکلام [illegible]
رسائل شبلی [illegible]
مقالات شبلی [illegible]
شعر العجم جلد اول [illegible]
〃 دوم [illegible]
〃 سوم [illegible]
〃 چہارم [illegible]
〃 پنجم [illegible]
موازنۂ انیس و دبیر [illegible]

مضامین عالمگیر [illegible]
آغاز اسلام [illegible]
کلیات فارسی شبلی [illegible]
کلام شبلی اردو [illegible]

امیر مینائی

صنم خانۂ عشق [illegible]
مرآۃ الغیب [illegible]
محامد خاتم النبیین ۸ر
مینائے سخن [illegible]
مکاتیب امیر مینائی [illegible]

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار [illegible]
خدائی فوجدار [illegible]
جام سرشار [illegible]
الف لیلہ بطرز ناول [illegible]
کامنی [illegible]
سوانح عمر و عیار [illegible]

منشی سجاد حسین

احمق الذی [illegible]
حاجی بغلول ۸ر

پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی [illegible]
طلسمی فانوس [illegible]

مولوی ارشاد حسین

مرزا لنی ۱۰ر
مار آستین ۱۰
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوق فرنگ ۸ر

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار (۳)	مارچ سنہ ۱۹۳۰ء	جلد (۱۷)

ملاحظات

خدا ہے یا نہین؟ اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے مانگو، چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشارون کی روانی دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑون کے سکوت اور دریاؤن کے شور سے طلب کرو۔ موسمون کا باقاعدہ تغیر و تبدل بہار و خزان کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی نیرنگی، نوع انسانی کے قوائے کامنہ، فضائے بسیط کے ستارے کائنات کی لانہایت وسعت، خور و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فرد تر انسانی مساعی کی مختلف صورتین، (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجو علم الافلاک، علم الکیمیا، علم وظایف الاعضا، علم الحیات، نفسیات و غیرہ رکھا ہے) بتائین گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بےبس پاتے ہین اور اسی لئے یہ مسئلہ اسقدر بدیہی اسدرجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہون تو اُسے مشاہدہ سے تعبیر کر سکتا ہون جس کے لئے نہ دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و توجیہ کی۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے، صبح کو پھول کھلتے ہین اور سارا گنج نکہت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مُصدِق ہے۔ اگر ہم اس سے ناواقف ہین تو کس کا قصور؟

تجربات جن کا مشاہدہ روز ہوتا رہتا ہے، اس حقیقت کو محو کر دینگے کہ جو جماعت ہم سے فراخدلی اور رواداری چاہتی ہے وہ خود ہمارے لئے کس درجہ مُکلّف، تنگ نظر اور متعصب ثابت ہو رہی ہے ـ مین یہ نہین کہتا کہ اس جماعت کے قاید و رہنما بھی اس مرض مین مبتلا ہین، لیکن یہ الزام ان سے کبھی رفع نہین ہو سکتا کہ باوجود اس علم کے انھون نے کبھی اپنے ملک کو صحیح معنی مین اس نقص کے رفع کرنے پر آمادہ نہین کیا

ملک کی آزادی نہ گول میز کانفرنس سے ملسکتی ہے، نہ سول نافرمانی سے، بلکہ وہ میسر آسکتی ہے صرف اتحاد و اتفاق سے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب چھوٹی جماعتون کے دلون سے تمام اندیشے نکال دیئے جائین ـ نہرو رپورٹ خواہ کتنی ہی مناسب کیون نہ رہی ہو اور اب آزادی کا اعلان خواہ کتنا ہی دلخوش کن کیون نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانون کے دل خطرات سے لبریز ہیں اور عملی زندگی کے تجربات نے ان کو ہندوؤن کی طرف سے سخت بدظن و بددل کر رکھا ہے

اگر آج گاندھی اور نہرو نہایت فراخدلی سے اس امر کا اعلان کر دین کہ وہ مسلمانون کی تمام شکایات سننے اور اُن کے مداوا کے لئے طیار ہین تو ابھی یہ دور تذبذب دور ہوا جاتا ہے اور منزل مقصود قریب ـ لیکن ہمکو معلوم ہے کہ یہ نہین ہوگا اور حصول آزادی کے بعد ایک نہایت ہی المناک قسم کی اندرونی جنگ شروع ہوگی اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اس اختلال کا نتیجہ کیا ہو

یقیناً ہندوؤن کی جماعت کثیر ہے، صاحب دولت ہے ـ صاحب علم ہے، اور ان کے مقابلہ مین مسلمان کم ہین ضعیف و غریب ہین، جاہل و بدنصیب ہین، لیکن یہ حقیقت بھی غالباً ہندوؤن سے مخفی نہ ہوگی کہ ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے اور مجبوری کے عالم میں انسان سبھی کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے

گاندھی نے حکومت کو اعلان جنگ دیدیا ہے اور ملک کو آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے سینون کو حکومت کی تیغ و تفنگ سے زخمی ہونے کے لئے کھولدے اور اس مین شک نہیں کہ یہ وہ طریق کار ہے کہ اگر سارا ملک اسپر آمادہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہین کر سکتی، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمان بہت کم اس مین حصہ لین گے اور ہندو کبھی کوئی ایسا محاذ قایم نہ کر سکین گے جس کی کمزوری سے مخالف فایدہ نہ اُٹھا سکے

ماہ گزشتہ کے نگار مین اپنے سفر حیدرآباد کا اعلان کرنے کے بعد حضرت ہوش بلگرامی کا تار موصول ہوا کہ رمضان کے بعد آنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ زمانہ وہان عام تعطیل کا ہوتا ہے اس لئے میرے سفر کی خبر تو مشتہر ہو گئی اور مین نہین رہ گیا مجھے اپنے اُن احباب سے سخت ندامت ہے جنھون نے مجھے ناگپور، بلہارشاہ اور دوسرے مقامات پر ریل مین ڈھونڈھنے کی زحمت گوارا فرمائی ـ یقیناً یہ میری غلطی تھی، لیکن شاید ایسی ہولناک قسم کی نہین کہ اس کو نظرانداز نہ کیا جا سکے ـ بہرحال اب مارچ کے دوسرے ہفتہ مین روانہ ہونے کا قصد ہے، لیکن تعیین تاریخ نہ کرونگا، کیونکہ بالکل ممکن ہے اب ہوش صاحب مجھے "تقلعلی" کہکر روک دین، فردوس مین جگہ پانے کے لئے رضوان کے ناز اُٹھانا ہی پڑتے ہین اور اُٹھاؤنگا جب تک "ہوس نشاط" کی

سوداسر مین موجود ہے۔

اس ماہ کے مضامین مین پہلا مضمون مولوی عبدالمالک آروی کا حزین پر ہے جو ختم ہوگیا۔ اس مضمون کے دو حصے تھے ایک تاریخی دوسرا تنقیدی۔ تاریخی حصہ کے متعلق فاضل مقالہ نگار نے جو کاوش کی ہے وہ کسی طرح نظرانداز نہین ہوسکتی تنقیدی حصہ البتہ تشنہ رہا اور اس سے کہین زیادہ استقصا کا مستحق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب عبدالمالک صاحب باوجود اپنے مشاغل معاش کی کثرت کے جتنا وقت مطالعہ و تحریر پر صرف کردیتے ہین وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہین۔ کاش زمانہ انھین فرصت دیتا اور وہ اپنے ذوق و ولولہ کے لحاظ سے زبان کی خدمت انجام دیسکتے۔

ظفر قریشی کے فسانہ مین کوئی خاص بات سوائے اس کے نہین کہ "تعبیر نقش" کو اچھے پیرایہ مین ظاہر کیا ہے۔

جناب رفیعی کا انسانہ جو مراق کے عنوان سے لکھا گیا ہے، یہ عجیب خصوصیت رکھتا ہے کہ اس کے لکھنے والے پر واقعی مراق کا دھوکا ہوتا ہے اور پڑھنے والا بھی اپنی جگہ سوچنے لگتا ہے کہ کہین وہ تو اس مرض مین بتلا نہین ہوگیا فسانہ نگاری کا ایک خاص اسکول ہے جو فسانہ کی تمام کیفیات کو اپنے اوپر طاری کرکے ناظرین کو بھی اس سے متاثر کرنا چاہتا ہے اور جناب رفیعی نے اسی اسکول کے تتبع مین یہ فسانہ لکھا ہے۔ لیکن اگر اس کے علاوہ فسانہ نگار کا مقصود اس سے محبت کے فلسفہ پر بحث کرنا ہے تو مجھے اس کی صداقت سے انکار ہے۔ اور اس باب مین مجھے اُن کے اس دوست سے اتفاق ہے جو محبت کے مفہوم کو اسی عالم گوشت و پوست سے متعلق کرتا ہے۔ یہ عشق اور وحدت الوجود کا اجتماع کبھی میری سمجھ مین نہین آیا۔ اجمیر کی فضامین پرورش پانے والے دماغ ممکن ہے اس مغالطہ سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرسکین

مومن و کلام مومن کا سلسلہ پھر شروع کیا گیا ہے جس کے دلچسپی سے کسی کو انکار نہین ہوسکتا۔

جناب محشر عابدی کا فسانہ "انتظار" خوب ہے۔ مین ہارڈی کی تعریف کیون کرون، اسی کو کیون نہ داد دون جسنے اس خوبی سے اُسے اُردو مین منتقل کیا اور نگار کو بغرض اشاعت روانہ کیا۔ اور اگر اس نوع کے المناک فسانہ لکھنا کوئی عیب ہے تو اس کے ذمہ دار مجنون گورکھپوری ہین جنھون نے سب سے پہلے اپنے افسانون کے لئے ہارڈی کا انتخاب کرکے اس بدعت کو عام کیا۔

سلطنت برطانیہ کے متعلق جو مضمون درج ہے وہ بالکل وقت و موسم کی چیز ہے اور موجودہ حالات کے ماتحت اُسے حد درجہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جانا چاہئے

ہمارے دوست سید مقبول احمد صاحب بی اے کا مضمون مسلمانون کے عقاید کے متعلق حقیقتاً تمہید ہے ایک اور مضمون کی جو اس کے بعد شایع ہونے والا ہے نظمون مین حافظ غازیپوری کی نظم اچھی تخییل کا نمونہ ہے۔ اور اختر شیرانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ حد درجہ ہیجان انگیز محاکات پر مبنی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا جوان کرے لیکن جوانی کا احساس نہ پیدا ہونے دے۔

نیاز

شیخ محمد بن ابوطالب علی حزین لاہجی

(بہ سلسلۂ سابق)

حزین کی شاعری پر متقدمین کا اثر

شیخ کے محاسن کلام، اور ندرت فکر کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان عناصر کی تحقیق کر لیجائے، جو شیخ کی ارتقائے تخئیل میں موید ہوئے، طریق جستجو کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، تاریخی روایات یا خود شیخ کے کلام کا گہرا مطالعہ، پہلی صورت آسان ہے لیکن اس میں شدید لائے تحقیق کے لذت خود اعتمادی میسر نہیں آتی، دوسری صورت مشکل ہے، لیکن کسی مسئلہ پر اجتہادی اور تحقیقی نظر ڈالنے والے افراد کے لئے نشاط باطن کا سبب ضرور ہے اور ارباب نظر کے نزدیک بھی یہ آخری طریقۂ استنباط یقیناً قابل ستائش ہوتا ہے، اگرچہ یارے حق سے اجتہاد اور قیاس میں لغزشیں ہی کیوں نہ ہوئی ہوں، لہذا میں بجائے تاریخ کی ورق گردانی کرنے کے خود شیخ کے کلام پر ایک گہری نظر ڈالکر یہ جستجو کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ نے فارسی شاعری کے کن مبادی سے استفادہ کیا، ہر مسلک کے رہرو کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ بدرقہ راہ یا نقش قدم کا جویاں ہو، رینالڈ اے نکلسن نے مقدمہ دیوان شمس تبریز میں مولانا روم جیسے با کمال اور بلند پایہ شاعر کے محاسن افکار کی تفصیل کرتے ہوئے ان مبادی کا تذکرہ کیا ہے، جن سے مولانا مستفید ہوئے[1]، اسی طرح عرفی جسکی آتش بیانی، سحر طرازی، اور ندرت بیان کے متعلق تفصیل سے لکھ چکا ہوں، تعلی اور اظہار کمال میں غلو کرنے کے باوجود متقدمین کے فیضان سے بہرہ اندوز ہوئے[2]، لہذا شیخ حزین بھی اس فطری تقلید سے اعراض نہیں کر سکتے تھے،

شیخ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ رومی، حافظ، سعدی، خاقانی، نظیری اور سنائی سے بہت عقیدت رکھتے تھے، چنانچہ بعض غزلیں ایسی ہیں جنکے مقطع میں آپ نے اپنی عقیدتمندی کا اظہار بھی کر دیا ہے، جس غزل میں جس قدیم شاعر سے اپنے اظہار عقیدت کیا ہے، وہ ادائے بیان، لطافت فکر، اور مماثلت ذوق کے اعتبار سے اس شاعر کے کلام سے ملجاتی ہے۔

مولانا رومی و حزین

شیخ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

حزین از عارف رومی صلائی عشرتے زدہ　　کہ ساقی ہرچہ دریابد تمام آور دمستا نرا

اس غزل میں تمام و کمال رومی کا طرز بیان ہے، وہی جلوہ آگہی ہے، وہی بے خودی اور ولولۂ صوفیانہ فرماتے ہیں:۔

درید نہائے جیب غنچہ از باد سحر گاہے　　برون از خرقۂ ناموس و تام آور دمستا نرا

---

[1] نگار بابت اکتوبر ۱۹۶۰ء "غالب بے نقاب کے حجابات" [2] نگار بابت دسمبر ۱۹۶۰ء خواجہ سید محمد شیرازی

اسی طرح فروغ خلوت، عالم شہود اور رموز وصل کی یون پردہ دری کرتے ہین

دو عالم خلوت یار است مطرب پردۂ سرکن سروش خاص او در بزم عام آورد مستانرا

ایک دوسری غزل کے مقطع مین فرماتے ہین:

(۲) برکش از دل نفس مولوی روم حزین تا ز گلزار و سمن رنج خزان برخیزد

یہان بھی مولانا رومی ہی کی طرح علم حقیقت، اور تصوف کے مباحث پیش کئے ہین فرماتے ہین

یا تو در خلوت دل وصل مدامی خواہم کز میان کلفت روزان و شبان برخیزد

اسی خیال اور اسی رنگ مین مولانا رومی کی غزل کا ایک شعر یہ ہے

عمر ابد پیش من ہست زمان وصال زانکہ نگنجد درو ہیچ زمانی مرا

شیخ اپنی ایک اور غزل مین مولانا رومی کے متعلق فرماتے ہین

(۳) این جواب غزل مرشد روم است کہ گفت من بوے تو خوشم نافۂ تاتار مگیر

اس غزل کے تمام اشعار کو رومی کے خیالات سے چندان نسبت نہین البتہ طعن رندانہ، لہجۂ شکوہ، بے باکی ادا اور راز و نیاز مین حافظ کے کلام سے مماثلت ہے، ملاحظہ ہو

من خرابا تیم اے شوق مرا یار مگیر نیکنامی تو رہ خانۂ خمار مگیر
عنبرین طرہ چہ انداختۂ بر سر دوش کافر عشق تو مائیم تو زنار مگیر
گر بہ گستاخیم از سینہ صفیرے زدہ سر رحم فرما و باین مرغ گرفتار مگیر

ایک مقام پر اور لکھتے ہین

(۴) اشعار عشق و مستی ست اشعار عارف روم گفتار نیست لیکن گفتار می نماید

خواجہ حافظ شیرازی اور حزین

خواجہ حافظ کی شاعری نے متاخرین کے خیالات پر جس قدر اثر کیا، کسی دوسرے شاعر کے افکار نے وہ اثر آفرینی نہین کی، چنانچہ آپکے بعد جتنے اکابر شعرا جامی، عرفی، صائب حزین وغیرہ گزرے سبھون کے کلام مین حافظ کی رنگینی ادا، اور بیتابی خیال پائی جاتی ہے، مرزا غالب نے تو شاعری کے وہ تمام نقوش و رموز پیش کردئے جو خواجہ حافظ کا طغرائے امتیاز ہین، اور جس سے غالب کے قبل اردو کا دامن معرّا تھا، شیخ حزین کو خواجہ موصوف سے بھی ایک خاص عقیدت تھی، فرماتے ہین

دلم از نغمۂ حافظ بہ سماع است حزین در نہانخانۂ عشرت صنمے خوش دارم

می برد نغمۂ حافظ دلم از ہوش حزین این نشانہ بخشد می شیراز مرا

دم حافظ برد از دل غم دیرینہ حزین　　اے صبا نکہتے از خاک رہ یار بیار

می برد مصرعہ حافظ دلم از دست حزین　　تکیہ بر عہد گل و باد صبا نتوان کرد

تازہ کردی روش حافظ شیراز حزین　　کز انفاس خوشش بوئے کسے می آید

حافظ اپنے ادائے بیان مین آپ ہی اپنی نظیر ہین لیکن حزین نے جو ہم آہنگی اور تمثل کی کوشش کی ہے، وہ بھی ناکام نہین رہی بلکہ مختلف اثرات کے اختلاط، اور افکار کی آمیزش نے حزین کو لطافت خیال اور غرابت ادا کا ایک ایسا دلکش مجموعہ بنا دیا جسکی پذیرائی سے کوئی صاحب نظر اعراض نہین کرسکتا، موازنہ سے یہ نظریہ ایک حد تک واضح ہوگا۔

حافظ	حزین
نکتۂ روح فزا از دہن یار بگو	اے صبا نکتۂ از لعل لب یار بیار
نامۂ خوش خبر از عالم اسرار بیار	گہرے تحفہ ز گنجینۂ اسرار بیار

حافظ اور حزین دونو کے یہان صبا سے خطاب ہے، الفاظ ملتے جلتے ہین معنی بالکل ایک ہین، حزین کے یہان "لعل لب یار" اور "گنجینۂ اسرار" ہے، جیسے حافظ نے "دہن یار" اور "عالم اسرار" کے الفاظ مین پیش کیا ہے، اگر حزین کے تبحر علمیہ کے تاریخی واقعات ہمارے پاس موجود نہوتے، توہم اسے یقیناً سرقہ کہدیتے، لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ حافظ کی اس غزل کا مطالعہ کرنیکے بعد شیخ صاحب کو اس رنگ اور معنی مین کچھ کہنے کا خیال ہوا، لہذا حزین کی پوری غزل حافظ کی غزل سے غیر شعوری طور پر مستفاد ہوگئی

حافظ		حزین
تا معطر کنم از لطف نسیم تو مشام	دامن آلودہ بہ بوئے گل فردوس مکن
شمۂ از نفحات نفس یار بیار	ہرچہ می آوری از خاک رہ یار بیار

الفاظ متغایر ہین لیکن معنی کے لحاظ سے دونو ایک نتیجہ پر پہونچے ہین یعنی "بوئے دوست" کی طلب، حصول مراد کے لئے دونو کے یہان وساطت پائی جاتی ہے، حزین خاک رہ یار ہی سے اپنے بڑھے ہوئے جذبہ کا سامان سکون پیدا کرنا چاہتے ہین خواجہ صاحب کو نفس یار سے آسودگی ہوتی ہے بیتابی دل کے اعتبار سے حزین کا شعر بڑھا ہوا ہے،

حافظ	حزین
شکر آنرا کہ تو در عشرتی اے مرغ چمن	اے کہ از سیر چمن بال فشان می گزری
با اسیران قفس مژدۂ گلزار بیار	برگ سبزے سوئے مرغان گرفتار بیار

دونو کے یہان ایک خیال ہے، دونو گرفتار قفس ہین، دونو رقیب کی نظر رحمت کے طالب ہین اور چمن مین لوٹ کر جانے کے متمنی ہین۔

حافظ	حزین
دل دیوانہ ز زنجیر نمی آید باز	لب مخمور مرا جرعہ نہ بند د ساقی
حلقۂ از خم آن طرۂ طرار بیار	چون رسد دور بمن میکدہ بردار بیار

الفاظ متغائر ہیں اور بظاہر دو خیالات معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل دو نوں کے یہان ایک ہی خیال ہے، ایک ہی جذبۂ "قلزم آشامی" ہے، اور ایک ہی وسعت شوق ہے، حزین کہتے ہیں ایک گھونٹ سے کہین لب مخمور کی تسکین ہوتی ہے - پورا میکدہ اوٹھا لاؤ - سے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی میری (غالب) خواجہ حافظ کے یہان بھی شوق کا وہی وفور ہے، اور حساس کی وہی ناپید اکناری، فرماتے ہین کہمین دیوانہ کا دل زنجیر سے رکتا ہے، جیسا ؤ محبوب کے کاکل پیچان سے ایک تار لے آؤ، عرفی نے کیا خوب کہا ہے، ؎

همه جا وحشی از انست که رام است اینجا

حزین	بهوا داری ازان سیب زنخدان بوئے	کام جان تلخ شد از صبر که کردم بے دوست	حافظ
	گر توانی به مشام من بیمار رسیار	عشوۂ زان لب شیرین شکر بار بیار	

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دونوں کے یہان ایک خیال ہے، حزین کا مقتضا "سیب زنخدان" کی بو ہے، حافظ کی طلب "لب شیرین" کا عشوہ، البتہ دونوں کی صورت تعلیل مین اختلاف ہے، لیکن غور کرنے سے دونوں کے یہان طلب کی علت غائی بھی ایک ہی معلوم ہوتی ہے، حزین نے "بیماری" ظاہر کر دی ہے، حافظ نے اسی کو "کام جان تلخ شد" مین پیش کیا ہے

حزین	چند بر دوش توان خرقۂ ناموس کشید	دلق حافظ بچه ارزد به میش رنگین کن	حافظ
	مست از صومعه ام تا سر بازار بیار	وانگهش مست وخراب از سر بازار بیار	

ایک ہی "جذبۂ بے اختیار شوق" ہے، اور ایک ہی مستانہ انداز ذوق، حافظ صاحب اپنی عادت قدیم کے مطابق دلق درویشی کو شراب سے ملوث کرنا چاہتے ہین، حزین اپنے خرقہ (تصوف) کو شراب مین ڈبونا تو نہین چاہتے لیکن نام و ننگ سے سبکدوش ہو کر حافظ کی طرح مست وخراب، بر سر بازار گزرنا چاہتے ہین

حزین	گرچه در سینه صد آتشکده آتش دارم	حافظا چون غم و شادی جهان در گزر است	حافظ
	للله الحمد که با سوزش دل خوش دارم	بهتر آنست که من خاطر خود خوش دارم	

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دونوں اشعار مین ایک ہی خیال پایا جاتا ہے، حزین نے اپنے آتشکدۂ دل کے سوز و تپش کو ظاہر کر دیا ہے، حافظ صاحب نے "سوزش دل" کی تصریح کر دی ہے، اور غم و شادی کی لذت والم سے جدا ہو کر وجود کی "بے بقائی" سے متاثر ہین، اور حزین کی طرح با وجود محرکات احساس، ایک نشاط باطن اور کیف نفس محسوس کر رہے ہین،

حزین	بار عشقے که ازان چرخ به زنهار آمد	ناوک غمزه بیاو زره زلف که من
	کوه دردیست که بر جان بلاکش دارم	جنگها با دل مجروح بلاکش دارم

دونو مین مختلف خیالات ہین، حزین کہتے ہین "جان بلاکش" پر ایک ایسا بار عشق ہے جس سے آسمان بھی پناہ مانگتا ہے، اور دل مین پہاڑ کی طرح ایک درد گران محسوس کرتا ہون، حافظ صاحب کے یہان ایک میدان مقاتلہ ہے، ایک طرف "دل مجروح بلاکش" ہے اور دوسری طرف خود، لہذا محبوب سے سامان حرب طلب کر رہے ہین اور وہ "ناوک غمزہ" اور "زرہ زلف" ہے

حافظ — گریہ کاشانۂ رندان قدمے خواہی زد ـ نقل شیرو شکرین و می بغیش دارم

حزین — نکند تیرہ غبار غم ایام مرا ـ مشربے صاف تراز بادۂ بغیش دارم

کسی قدر اختلاف ہے، لیکن اصولی حیثیت سے دونو کے یہان ایک ہی خیال ہے، اور ایک ہی پر امن زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، حزین "غم ایام" کی تیرگی سے آزاد ہین حافظ صاحب کے "کاشانۂ رندانہ" کی کیا بات ہے وہان شیر و شکر کا چرچہ ہے، اور شراب و کباب کا سامان، اسلئے دونو کی زندگی نتیجہ کے اعتبار سے ملتی ہوئی ہے۔

حافظ — باسر زلف تو گو یا شدہ گستاخ صبا ـ ورتو زین دست مرا بے سرو سامان داری

حزین — بے سبب خاطر مجموع مشوش دارم ـ من بہ آہ سحرت زلف مشوش دارم

تذکرۂ زلف دونو مین مشترک ہے البتہ دونو نے اظہار خیال کے دو طریقے اختیار کئے ہین

حافظ — یک سر موئے بدست من و یکسر بادوست ـ سالہا بر سر این موئے کشاکش دارم

حزین — نرود از سر سودا زدہ تا حشر بردن ـ پیچ و تابے کہ ازان طرۂ دلکش دارم

حزین اور حافظ دونو کے یہان معشوق کے کاکل پیچان کا تذکرہ ہے، حزین کے یہان پیچ و تاب ہے، حافظ نے اپنے "کشاکش" مین ظاہر کیا ہے، زلف کی اثر آفرینی دونو پر یکسان ہے

سنائی و حزین حکیم سنائی عہد غزنویہ کے "رومی" تھے، آپ مولانا سے پہلے گزرے ہین آپکی کتاب حدیقہ کا ایک انگریزی ترجمہ بھی شایع ہوا ہے، حزین نے آپکی طرف بھی اشارہ کیا ہے، فرماتے ہین

از یاد حزین نہ ہی مصرع سنائی را ـ از یار بہر زخمے افگار نبایدشد

فغانی و حزین حزین نے اپنی بعض غزلیات کے مقطع مین فغانی کے ساتھ بھی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا ہے فغانی اپنے عہد کے بڑے استاد سخن گزرے ہین اور متاخرین کی آتش بیانی اور جوش خیال بڑی حد تک فغانی ہی کے نالہ و فغان سے مستفاد ہے، چنانچہ مجمع النفایس مین تقی اوحدی کا یہ قول مسطور ہے، کہ جب وہ عرفی شیرازی کے رفیق و جلیس تھے، اسوقت مشاعرہ مین فغانی ہی کا کلام مصرعہ طرح مقرر ہوتا تھا، (نگار بابت دسمبر ۱۹۳۶ء عرفی شیرازی)

شیخ فرماتے ہین

داریم حزین این غزل از فیض فغانی ـ ہرجا کہ رود ہمرۂ یار است دل ما

ایک دوسری غزل کے مقطع مین کہتے ہین

حزین ازین غزلت تازہ گشت طرز فغانی — سزد ز سدرہ فرود آید و زمین تو بوسد

سعدی و حزین رینالڈ اے نکلسن نے مقدمہ دیوان شمس تبریز (مطبوعہ کیمبرج) مین سعدی کو "نیم دل صوفی" لکھا ہے سعدی کو تصوف کا مذاق تھا تو ضرور، لیکن آپکے کلام مین اخلاق و موعظت کا گہرا اثر پایا جاتا ہے، مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران مین فاضل مقالہ نگار نے مجازیات و عشقیات سے تعبیر کیا ہے، اور حق یہ ہے کہ شیخ سعدی، ایک ہمہ دان استاد گزرے ہین اور آپ فارس کی عشقیہ شاعری کے سلسلہ ارتقاء کی ایک زبردست کڑی ہین، حزین نے سعدی کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے، فرماتے ہین۔

این جواب غزل دلکش سعدی است کہ گفت — کہ نئ خامہ آتش نفسم رادم ازدست

نظیری و حزین — حزین کے مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے، کہ نظیری کا کلام بھی آپکے زیر مطالعہ رہا ہے، فرماتے ہین۔

غوغائے حزین است ز فریاد نظیری — بانگے کہ نباشد نکند کوہ صدا ہیچ

آخری مصرعہ پر غور کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے، کہ نظیری کو حزین نے اپنا استاد اور رہنما تسلیم کیا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھکر جب شیخ کے نظریہ استدلال پر غور کیا جاتا ہے، تو پتہ چلتا ہے، کہ اگر نظیری کا کلام انکے زیر مطالعہ نہوتا تو وہ شاعری کی لذت سے بھی ناآشنا رہجاتے، "بانگے کہ نباشد نہ کند کوہ صدا ہیچ" کا یہی مطلب ہے،

عرفی و حزین شیخ نے اپنے کلام مین کہین عرفی شیرازی سے ارادت کا اظہار نہین کیا ہے، لیکن گزشتہ اوراق مین لکھا جاچکا ہے، کہ شیخ نے عرفی کی ایک رباعی نقل کی ہے، مگر حوالہ نہین دیا، اس سے مین یہ نتیجہ نکالنا نہین چاہتا، کہ شیخ نے عمداً عرفی کا حوالہ نہین دیا تاکہ ناواقف حضرات اسے آپ ہی کی طرف منسوب کردین، بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ عرفی کا کلام بھی آپکے زیر مطالعہ رہا ہے، اور اسکا طرز بیان اور اشعار آپکے دماغ مین محفوظ بھی رہے ہین، چنانچہ مفصلہ ذیل موازنہ سے ایک حد تک یہ نظریہ واضح ہوتا ہے۔

حزین: سینہ آسا درآ تشکدہ نہ میرقص — بہ بال شعلہ چون پروانہ میرقص

عرفی: چو خون در زخم صیدے کشتہ می جوشد — چو دل در سینۂ پروانہ میرقص ...

مضمون مین کسی قدر اختلاف ہے، لیکن خیال ایک ہے، "جذبۂ پروانہ" اور "رقص پروانہ" دونو مین مشترک ہے

حزین: برافگن خرقہ ہنگام سماعست — زمستوری براستانہ میرقص

عرفی: برافشان دست بر ناموس دانگہ — میان محرم و بیگانہ می رقص

حزین کا "برافگن خرقہ" اور عرفی کا "برافشان دست بر ناموس" معنی کے لحاظ سے ایک ہی خیال پر مبنی ہے، دوسرا شعر بھی ملتا ہوا ہے، یعنی رقص مستانہ کیلئے دونو کے یہان خلوت و جلوت، یا مجلس خاص و عام کی قید نہین،

حزین
سرودے نیست بہ از غلغل مے
بپائے شیشہ چون پیمانہ میرقص

عرفی
عجب ذوقے بود در رقص و مستی
تو نیز اے بادہ در پیمانہ میرقص

حزین کے مجازی رنگ نے زیادہ لطف پیدا کر دیا ہے، عرفی نے پیمانہ مین شراب کی جھلک دیکھکر "رقص مستانہ" کا حکم لگایا ہے، حزین نے غلغل مے کو وہ صوفیانہ سماع اور ذوقیہ لہجہ ترنم سمجھا، جسکے لئے نہ وضعی پردۂ سرود اور قانون لحن کی ضرورت ہے، نہ اسرار موسیقی کے درک کی بلکہ رینالڈ اے نکلسن کے الفاظ مین سقہ کی آواز، موذن کی پکار ہوا کی سائین سائین، بھیڑ کی صدا مین ایک صوفی کے قلب کو متاثر کر دیتی ہے، یہان حزین بھی تصوف کے اسی خاص رنگ مین "غلغل مے" کو تحریک سماع کا ایک کامیاب ذریعہ بتاتے ہین

حزین
نہ کمتر حزین از ذرۂ عشق
مدام از جلوۂ جانانہ میرقص

عرفی
مشوع فی رہین باغ و بلبل
بیا تک چند در پروانہ میرقص

دونوں کے یہان ایک ہی ذوق سماع ہے، اور ایک ہی لہجہ ادا، البتہ صورت استدلال مین فرق ہے، حزین کہتے ہین سرگردان عشق "ذرہ" سے تو کمتر درجہ نہین ہونا چاہئے، جو جلوہ یار (آفتاب) سے ہمیشہ مصروف رقص ہے، عرفی کہتے ہین باغ و بلبل کی قید کیا، دلکو تو ایک ویران کن اور وحشت انگیز الوکی آواز پر بھی محو رقص ہو جانا چاہتے، عرفی کا شعر حزین کے شعر "سرودے نیست بہ از غلغل مے" سے ملجاتا ہے

سطور بالا سے یہ نظریہ واضح ہو گیا ہے کہ حزین کے ذوق شاعری پر رومی، سنائی، حافظ، سعدی، فغانی، نظیری اور ایک حد تک عرفی کے تخیلات کا اثر پڑا ہے، جسکا شیخ نے دبہ استثنائے عرفی) اعتراف بھی کیا ہے،

شیخ کی غزلیات پر جب ایک مبصر کی نگاہ پڑتی ہے، تو وہ اسے دو حصون مین تقسیم کر دیتا ہے، ایک عشقیہ دوسرا صوفیانہ حزین نے رموز عشق اور ذوق صوفیانہ کی ایسی تصریح کی ہے، کہ زبان سے بے اختیارانہ صدائے تحسین نکلتی ہے، مضمون آفرینی، عذوبت بیان، سلاست اور نفاست ادا، مین حزین اپنے دور مین فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہین،

حزین کی عشقیہ شاعری

عشق کی لذت آگینیان کو ذرا اس دل سے پوچھیے، جو کسی نگاہ ناز اور عشوۂ لب لعل سے زندگی مین آشنا ہوا ہو، زندگی بھی نشۂ شباب کی فریب خوردہ نہین، بلکہ ایک پاک اور محتاط زندگی، جسے ہجر مین پردلیالی" نے "گرم فریاد" اور دیدۂ پرتمنا کو مصروف اشک ریزی رکھکر محبت کے سخت اور خطرناک منزلون سے اس سطح پر پہونچا دیا ہو جہان مجاز حقیقت مین ملکر ایک ایسا ارفع احساس پیدا کر دیتا ہے، جسے کچھ وہ انسان سمجھ سکتا ہے، جسکے سامنے "بند نقاب حسن" برطرف ہو کر "غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہین رہا" کا منظر موجود ہو، فارس کی عشقیہ شاعری سے کامل طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے ضرور ہے، کہ انسان اپنی زندگی کے اس دور کی یاد

تازہ کرے، جیسے شکسپیر کے الفاظ مین "حیات کے سات مراحل" مین سے "مرحلہ عشق" کہتے ہین، وہ عشق نہین جس کے باطنی فیوض و برکات کو طوفان شباب بہائے گیا ہو، بلکہ وہ پر کیف محبت اور نشاط انگیز لذت در دجسکے امیال دعواطف نے انسانی زندگی کو "رنج نومیدی جاوید" کے باوجود کسی عذرہ یا سلمی سے وابستہ رکھا ہو، سامان وصل مفقود ہو، تکلم و ترسل استحالہ کی حد تک پہونچ گیا ہو، اگر انفرادی زندگی کا وہی دور ہو یا کم ازکم اس دور کا نقشہ پیش نظر ہو، تو حزین کی عشقیہ شاعری البتہ ایک سمند ناز کو لطف تازیانہ سے آشنا کرسکتی ہے، ملاحظہ ہو۔

دل در شکن زلفت صبح طربے دارد — مہتاب بناگوشت فرخندہ شبے دارد
در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب — شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے دارد
افسانہ کند خوابش آشوب قیامت را — دل بیہدہ در کویش شور و شغبے دارد
بے رنج نہ شد حاصل نے کفر نہ ایمانم — از بتکدہ تا کعبہ رنج و تعبے دارد
بکشائے حزین چشمے کان مہر جہان آرا — در محمل ہر ذرہ لیلی نسبے دارد

"شکن زلف" کے ساتھ "صبح طرب" اور "مہتاب بناگوش" کے ساتھ فرخندہ شب کا تلازم ایک نہایت دلکش طرز بیان ہے، استعارہ جمیل قابل داد ہے، دوسرے شعر کے متعلق مقدمہ مین لکھا جا چکا ہے، "آشوب قیامت" کا ایک فسانہ ہو جانا، کچھ وہی سمجھ سکتا ہے، جسے قیامت کے ہولناک واقعات کا احساس ہو، اور پھر خواب نازمین محو ہو جانے والے کو بھی دیکھا ہو، جسکی ادائے بیداد اور رعنائی نے قیامت کو محض ایک افسانہ بنا دیا ہے، غالب کہتے ہین "کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور"، کفر و ایمان کا ایک سطح پر آجانا بہت پر لطف ہے، اس طرز مین عرفی کے بہتیرے اشعار پائے جاتے ہین آخری شعر وحدت فی الکثرت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ (Pantheism) فارسی شاعری کا ایک نہایت اہم موضوع تخئیل ہے مولانا روم کے اکثر اشعار اسی خیال سے متعلق ہین،

ازین دہشت کہ ہجرانے مبادا در کمین باشد — ز حسرت ہر نگاہ من نگاہ واپسین باشد

شیخ نے جس سرشارانہ طریقہ سے "حسرت نگاہ" اور "نگاہ واپسین" کا نقشہ کھینچا ہے، اسے وہ ناکام محبت سمجھ سکتا ہے جسے شوق و انتظار کے بے شمار مراحل کے طے کر لینے کے بعد محبوب کی اتفاقی ملاقات نصیب ہو جائے، اور یہ مواصلت اندیشہ ناکی سے خالی بھی نہو، اسوقت نگاہ پرحسرت کی یاس افزا تکتکی وہی منظر پیش کرتی ہوگی، جو ایک دردمند محبت محبوب سے جدا ہوتے وقت "نگاہ واپسین" (آخری نظر) کی صورت مین پیش کرتا ہے، الفاظ تشریح کے لئے ناکافی ہین ہان تصور کے بعد ہر شخص لذت احساس سے متکیف ہو سکتا ہے۔

ہر محفل کہ حرفے زان عذار آتشین باشد — گرہ ساز د زبان شعلہ شمع انجمن پیرا

اس غزل کا ہر شعر حزین کے وفور تمنا کا مظہر ہے، یہاں تشبیہ، تجنیس، مدح، تمام صنائع و صنعیات نے مل کر شعر کو نہایت بلند سطح پر پہونچا دیا ہے، جس محفل میں سلمیٰ کے عذار آتشین کا تذکرہ آئے وہاں شمع کی لو کا تموّ واضطراب شاعر کے جذبہ کی ناپیداکناری کا ایک اعلیٰ ثبوت ہے، "زبان شعلۂ شمع" سے محبوب کے رخسار کی تشبیہ، اور پھر مشبہ بہ پر مشبہ کا تفوق جداگانہ لذت انگیز ہے، مگر حصول لذت کے لئے تصور شرط ہے

شود در موج آب زندگانی سبزہ اش غلطان　　دران گلشن کہ ابروئے تر از ناز چین باشد

"چین جبین" یار سے گلشن میں نباتات پر ترو تازگی آجانا وہی سمجھ سکتا ہے، جو عرصہ کی فسردگی حیات کے بعد محبوب کی غلط انداز نگاہ ناز سے لذت آشنا ہوا ہو

فریب حرف و صورت خضر مرا زجا برنمی آرد　　کہ آب زندگی لعل ترا زیر نگین باشد

آب حیات لانے میں خضر کی ناکامی کا راز یہ ہے کہ اب آب حیات کا مقام ظلمات نہیں رہا بلکہ وہ اب شیخ کے محبوب کے لب لعل کے زیر نگین ہے، کیا لطیف اسلوب بیان ہے، کس خوبی سے "لب لعل" تک دسترس ہونے کو آبحیات تک رسائی سے تعبیر کیا ہے، پردہ ظلمات کو طے کر لینے کے لئے جن منازل سے گزرنا ناگزیر ہے، وہ الگ، سکندر کی سرگشتگی اور نامرادی کا فسانہ بھی پیش نظر ہے، محبوب کے لب لعل سے سیرابی کی تمنا میں بھی یہی دقتیں ہیں، اور نامرادی و یاس کا منظر،

نگاہ گرم چون رخسار آتشین تو بوسد　　عرق چو شبنم گستاخ یاسمین تو بوسد

جذبات، تشبیہات اور استعارہ کے مخلوط اثر نے شعر میں بڑی حلاوت پیدا کر دی ہے۔ منظر پر خیال کیجئے اور جذبات کی داد دیجئے، ایک عاشق بیباک، شاہد ناز کے رخ زیبا پر نظر جمار رہا ہے، یہ گویا رخسار کا بوسہ ہے جو نگاہ دے رہی ہے، یہیں تک بس نہیں آگے دیکھئے اس منظر سے محبوب پر کیا اثر ہوتا ہے، جذبۂ حیا میں محبوب کے چہرہ سے پسینہ نکل آیا ہے، محبوب کو بھی بازاری نہیں ہونے دیا، ایک نہایت پاک سیرت اور عصمت دار تصور کیا، یہیں تک ختم نہیں ہے، بلکہ اس منظر کی بھی ایک اور تشبیہ دی ہے، جو اسقدر لطف انگیز ہے کہ دل پھڑک اٹھتا ہے، اس عاشق بیباک کی نظربازی سے محبوب پر جذبۂ حیا طاری ہوا، حیا کا مقتضا تھا کہ پسینہ نکلے، اب پسینہ کو "شبنم گستاخ" سے تشبیہ دیتے ہیں جو یاسمین کی نکھر بو کا بوسہ لیا کرتی ہے، گویا رخسار محبوب یاسمین ہے اور پسینہ "شبنم گستاخ"

خدا کے را بخرامی بہ گشت باغ مبادا　　دہان غنچہ کف پائے نازنین تو بوسد

صرف جذبات کی داد دیجئے، محبوب کی سیر باغ سے غنچہ "کا کف پائے نازنین" کو چوم لینا، شاعر کی عجیب وارفتگی محبت کو ظاہر کرتا ہے،

بیا بتاب بیا زوئے حسن دست تجلی　　کہ معجز ید بیضا سر آستین تو بوسد

"دست و بازوئے" شاہد کو معجزہ ید بیضا کا بوسہ دینا لطف سے خالی نہین،

کند بہ ساغر ہوش فرشتہ داروئے مستی تبسمے کہ لب سحر آفرین تو بوسد

کوئی جدت نہین، معنی صاف ہے، الفاظ سادہ ہین البتہ "نقشہ تبسم" قابل غور ہے، تاکہ "سحر آفرینی" کا صحیح ادراک ہو، ورنہ فرشتہ کے لئے تبسم کے "شراب مستی" ہونے پر شاعر ذمہ دار نہین،

بقدر قابلیت میوہ افشانست ہر نخلے ازان سرو سہی زیبائی اندام می بارد

انگور کی لت سے انگور پھلتا ہے، سیب کے درخت سے سیب قامت محبوب بھی ایک درخت ہے اسکا پھل زیبائی اندام (تناسب (عضا وغیرہ) ہے، جو سرو سہی کی خصوصیت ہے،

نفس پروردہ خون ساز تا رنگین سخن گردی ثمر از نخلہائے تشنہ اکثر خام می بارد

فرماتے ہین اپنی ہستی کو خون سے سینچ سینچ کر نشو و نما دو، تب رنگین سخن ہوسکتے ہو، ورنہ پیاسے درختون سے اکثر کچا ہی پھل گرجایا کرتا ہے، "رنگین سخن" کے لئے "خون" کی رعایت اور نباتاتی نظریہ سے استدلال بہت عمدہ ہے، دو نو صورتیں ہوسکتی ہیں عاشق بنکر خون بہاؤ، یا طالب علم بنکر جگر ریزی کرو، مگر کلام کی پختگی کے لئے نفس کو خون سے پرورش کرنا ضروری ہے

زجیبم صد بیابان خار خار بیخودی جوشد بہ خوابم گر شبے آن شاخ گل مست و خراب آید

مجازی رنگ کیساتھ جذبات کی فراوانی قابل داد ہے، خواب مین محبوب کا مست و خراب آنا اور پھر گریبان عاشق سے خار بیخودی کا جوش تجربہ سے متعلق ہے، جسنے "شبہائے فراق" مین، محبوب کو خواب مین دیکھکر آنکھون کو وقف اشک ریزی کررکھا ہو وہ اس بلند تخئیل سے پرکیف ہوسکتا ہے

حجاب عشق می بندد نظر مجنون مسکین را اگر لیلی برون از پردۂ شرم و حجاب آید

اگر لیلی پردہ شرم و حجاب ترک کرکے مجنون کے سامنے آجائے جب بھی غریب مجنون کی آنکھون کا بند ہوجانا وہی سمجھ سکتا ہے، جس نے حجاب عشق کا ذاتی تجربہ کیا ہو، ایک بوالہوس کی نگاہ معصیت آلود اسے سمجھ نہین سکتی، اسی معنی مین رعب حسن بولتے ہین

ز شوخی لیلی ناز آفرین رامی کند مجنون اگر طرز نگاہت چشم آہو را بہ خواب آید

تمام شعرانے معشوق کی آنکھون کو نرگس شہلا سے تشبیہ دی ہے، لیکن حزین نے جس عجیب انداز سے محبوب کے طرز نگاہ کی تفسیر کی ہے، وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے، شیخ نے اپنی عادت کے مطابق ایک ہی تشبیہ پر کلام ختم نہین کیا بلکہ اب مشبہ بہ کے طرز آموختنی کا اثر دکھارہے ہین، وہ یہ ہے کہ آہو کو اگر محبوب کا طرز نگاہ خواب مین دیکھنا نصیب ہوجائے تو مجنون تو درکنار

خود لیلی بھی ایسے غزال حرم کو دیکھکر دیوانی ہو جائے

درونِ لبریز داغِ عشق آتشپارہ دارم حزین از دل اگر آہے کشم بوئے کباب آید

فرماتے ہین دل مین عشق کی آگ لگی ہوئی ہے، اس لئے جو آہ بھی کھینچتا ہون اس سے بوے کباب آتی ہے یعنی دل جل بھنکر کباب ہو گیا ہے

بہ گلشن غنچہ یاد از نوشخندان می دہد ما را نشانے سرو از بالا بلندان می دہد ما را

مناظر فطرت کا مطالعہ کرنیکے بعد اپنی استعداد دماغی اور پرواز نفس و روح کے مطابق شعرا نتائج پیدا کرتے ہین شیخ علی حزین نے اس غزل مین نہایت پر لطف نتائج نکالے ہین گلشن مین غنچہ کو دیکھکر "نوشخندان کی یاد" اور سرو کو دیکھکر "بالا بلندان" کا نقشہ کھنچ جانا، دماغ کی فلسفیانہ دقیقہ سنجیون کی طرف رہنمائی کر رہا ہے، آگے چلکر فرماتے ہین

کنم تا لب تہی چون نقش پا منیم براہ او خبر از حال زار مستمندان می دہد ما را

سید انشاء نے اپنی اس زندگی مین جب دربار سے تعلق ترک ہو گیا تھا، افلاس اور غربت مستولی تھی، پریشان حالی سے زندگی گزارتے تھے ایک مشاعرہ مین اپنی غزل پڑھی سامعین پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، چارون طرف ایک سکوت کا عالم تھا، اس غزل کے دو اشعار یہ ہین

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہین ہم بیزار بیٹھے ہین

دوسرا شعر حزین سے ملجاتا ہے۔

بسان نقش پائے رہروان کوئے تمنا مین نہین چلنے کی طاقت کیا کرین ناچار بیٹھے ہین

اسی کے مقابلہ مین حزین کا ایک اور شعر ہے۔

یاران سبک سیر رسیدند بہ منزل چون نقش قدم ماندہ بجا قافلۂ ما

اسیر پیچ و تاب موج اشک آلودہ مژگانم فریب سنبل گیسو کمندان می دہد ما را

تشبیہ قابل داد ہے، مژگاں اشک آلود ہے، اور موج اشک کے پیچ و تاب مین اسیر، اسے دیکھکر "شاہدان گیسو کمندان" کے سنبل نماطرۂ پیچاں کی طرف شیخ کا دماغ منتقل ہو گیا ہے۔

بدشت از جلوہ ہائے لالہ داغم تازہ می گردد کہ یاد از سینہ ہائے دردمندان می دہد ما را

اس مضمون کو اکثر شعرائے فارس نے مختلف پیرایہ مین بیان کیا ہے، چنانچہ حافظ، جامی، صائب کے یہان بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔

حافظ:-	ز حسرت لب شیرین ہنوز می بینم	کہ لالہ می دمد از خاک تربت فرہاد
جامی:-	بسکہ رفتند شہیدان غمت زیر زمین	لالہ ہا غرقہ بہ خون می دمد آن صحرا را
صائب:-	یادگار جگر سوختۂ مجنون است	لالۂ چند کہ از دامن صحرا برخواست

رم وحشی نگاہ او بوحشت دادہ آرامم	دماغم را بشور آوردہ آہوئے کہ او دارد
جبین کعبہ و دیر است بر خاک نیاز او	چہ محراب است یارب طاق ابروئے کہ او دارد
ندارد گر نظر با ما تغافل نیست کم از [illegible]	نگہ را می فریبد چشم جادوئے کہ او دارد
حزین آشفتہ حالم آہ از دامن فشانیہا	بطوفان می دہد خاک مرا کوئے کہ او دارد

"رم وحشی نگاہ"، "محراب طاق ابرو"، "دامن فشانیہا" اور خاک عاشق کا سپرد طوفان ہونا، غضب کے فقرے ہیں، نزاکت تخئیل اور لطافت احساس قابل داد ہے

دل عاجز حریف ترک چشمت کے تواند شد	بخون غلطاندہ مژگانت صف خنجر گزاران را

حزین کی صوفیانہ شاعری

شعرائے فارس میں مشکل سے کوئی ایسا شاعر ہوگا جسکی غزلیات میں تصوف کی چاشنی نہو، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ فارس کے اکابر شعراء اساتذہ سخن رہبر و طریقت تھے، دنیا کو نقش قدم کی تلاش رہتی ہے متاخرین میں جو صوفیانہ مذاق نہ بھی رکھتے تھے، انھوں نے بھی صوفیانہ طرز میں کہنا شروع کیا، تعلیم کے اعتبار سے حزین ایک مشہور صوفی شیخ خلیل اللہ طالقانی کے تربیت یافتہ تھے، دوسری بات یہ ہے کہ اکثر صوفی ہی شعراء کا کلام آپکے زیر مطالعہ رہا ہے جسکی تفصیل اوپر گزر چکی لہذا آپکے کلام میں بکثرت صوفیانہ جذبات پائے جاتے ہیں

نہ در کنعان نہ در بازار مصرت می توان دیدن	بیابان گرد حیرت کردہ شوقت کاروانہا را

گریبان چاک باشد دلق ما تر دامنان تا کے	بہ آلودہ گرداں خرقۂ پرہیزگاران را
سلوکم در طریق عشق با یاراں چناں ماند	کہ مور لنگ ہمراہی کند چابک سواراں را

چو لالہ با چمن حسن و عشق خوست مرا	مئے مجاز و حقیقت بیک سبوست مرا
بہ گرد بام و درم دیر و کعبہ می گردد	ازاں زماں کہ بدرگاہ عشق روست مرا

ز خود تہی شدہ ام چون نی و ز نالہ پرم — خروش درد تو پیچیدہ در گلوست مرا

ہمین تنہا نہ من در خاک و خون غلطیدہ اوم — نہاد آن زلف مشکین بر زمین ناف غزالان را

شایستۂ برق است بہ صحرای ملامت — خارے کہ بہ خون تر نہ شد از آبلۂ ما
پیرانہ سر آزادگی از عشق نداریم — رگہا شدہ در گردن ما سلسلۂ ما
اے بیخبران پائے طلب رنجہ مسازید — نزدیک تر از ماست بما مرحلۂ ما
گر موج زند بر لب ما تلخی عالم — ہرگز نہ زند چین بہ جبین حوصلۂ ما
یاران سبکسیر رسیدند بمنزل — چون نقش قدم ماندہ بجا قافلۂ ما
دستان زن بستیم حزین تا نفسے ہست — از عشق نکو نام بود سلسلۂ ما

تشبیہ تمثیل اور استعارہ نے شیخ کی لطافت معانی کو دوبالا کر دیا ہے، آبلہ پا ہو کر حوصلۂ بادیہ پیمائی اور پیرانہ سالی مین بھی وابستگی قابل داد ہے۔ سلسلہ وفا مین مقید رہتے رہتے زنجیر کا رگ کی شکل مین منتقل ہو جانا، نہایت لطیف الخیالی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ضعیفی مین رگین ابھر آتی ہین تو گویا رگہائے گردن وہ "سلسلہ محبت" ہین جس مین مدتون گرفتار رہی لہذا جسب قید و بند کا تعلق فطرت جسمانی سے ہو گیا تو گویا اسکے یہ معنی ہین کہ اسوقت بھی آزار محبت سے آزاد ہونا، ناممکن ہے، پانچواں شعر بہت یاس افزا ہے۔

حزین نے خود اعتراف کیا ہے کہ انکی شاعری مین صوفیانہ فکر و عقاید کی روح مولانا روم کے فیوض و برکات کی منت کش ہے، اس سلسلہ مین شیخ اور مولانا کی مفصلہ ذیل غزلیات کا موازنہ حقیقت کو اور واضح کر دیتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے مولانا کی غزل پڑھنے کے بعد یہ اشعار کہے ہین

حزین — رومی

بقید آب و گل اے جان ناتوان چونی — دلا چہ بستۂ این خاکدان برگذران
درین کہن قفس اے سدرہ آشیان چونی — ازین حظیرہ بر دان پر کہ مرغ عالم جانی

حزین — رومی

زلال خضر ترا سینہ چاک می طلبد — ہمی رسد ز سموات ہر صباح ندایت
نفس گداختہ دنبال کاروان چونی — کہ رہ بری بہ نشانہ چو گرد رہ بنشانی

تو رشک یوسف مصری فتادہ در چہ تن — تو یار خلوت نازی مقیم پردہ رازی
تو بار کنگر عرشی بہ خاکدان چونی — قرارگاہ چہ سازی درین نشیمن فانی

حزین
تو شمع محفل انسی بہ تیرہ وحشت گاہ — تو مرغ عالم قدسی ندیم مجلس انسی

رومی
توزیب مسند قدسی برآستان چونی — دریغ باشد اگر تو درین مقام بمانی

خیالات مین جو توافق اور بیان مین ہم آہنگی ہے، محتاج بیان نہین، بعض جگہ ایسا توارد ہے کہ حزیں کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو مدح کی بجائے قدح ہوتی مگر اس سے تو انکار ہو ہی نہین سکتا کہ مولانا کی غزل کے زیر مطالعہ آنیکے بعد حزیں نے اپنی غزل کہی،

محاسن کلام حزیں

کلام حزیں کی خصوصیات میں آپکی مضمون آفرینی، نازک خیالی، استعارہ آمیز و مجازی تعبیرات ہین آپنے اخلاقی درس بھی دیاہے، لیکن کم، شیخ کی جس غزل کو لیجئے، اسکا ہر شعر ولولہ انگیز ہے، ابھی سامع ایک ہی شعر کی نازک خیالیوں سے کافی طور پر لذت اندوز نہین ہو لیتا، کہ دوسرا شعر نظر کے سامنے آتا ہے، جس مین حلاوت بیان، ندرت فکر جدت خیال اور سلاست عبارت پائی جاتی ہے، دل لوٹ جاتا ہے، پھر مسلسل ایسے ہی اشعار آتے ہین اور سامع پر ایک عجیب وجد انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے، میرے اس دعوی مین حزین کی بدیہہ گوئی کی مثال پڑھئے جو اگلی سطور مین لکھی جاچکی یا پھر "ازین حسرت کہ ہجرانے مبادا در کمین باشد" والی غزل پڑھئے، شیخ کے محاسن افکار کو عنوان ذیل کے ماتحت رکھ سکتے ہین

نازک خیالی

ز تاراج بہاراں مست ورنگیں جلوہ می آئی — حنا بود کہ جوشان خون گلزار است از دستت

پہلے محبوب کے دست حنا شدہ کا تصور شرط ہے، اب غور کیجئے کس لطیف طریقہ سے اس مہندی کے رنگ کو خون گلزار کی ریزش بتائی، رعایت لفظی بذات خود ہے، "تاراج بہاران" کو "بربادی عزیزان" سمجھ لیجئے اب معنی صاف ہے، کہ دست محبوب مین جو حنائی رنگ دیکھتے ہو وہ غالب مرحوم کے مرثیہ "انکے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد" کا نتیجہ نہین بلکہ یہ تو ان محویان الفت کا خون ہے جنھین تپش عشق نے درجۂ شہادت عطا کیا،

خرام ناز تو اے شوخ گل قیامت را — بخاک عاشق خونیں کفن فرو ریزد

"عاشق خونین کفن" اور "گل" مین جو رعایت معنوی پائی جاتی ہے، وہ ظاہر ہے، قیامت تک خونین کفن عاشق کی قبر مین "خرام ناز" کا اثر قابل داد ہے، میرے خیال مین شیخ صاحب "عاشق خونین کفن" کے قبر کو "خرام ناز گل" کے بدل "رنگ گل" کامنت کش بتاتے تو زیادہ اثر آفرین ہوتا، قبر عاشق مین خرام ناز کا اثر صرف عشقیہ عقیدتمندی ہے غالب بھی فرماتے ہین "خون ہے دل خاک مین احوال بتان پر یعنی"

مگر افگندہ لعل آبدار ش از نظر می را — کہ اشک حسرتے از دیدۂ پیمانہ می آید

معشوق کا لب لعلین سے پیالۂ شراب جدا کر دینا اور اس لئے دیدۂ پیمانہ سے اشک ریزی منظریہ شاعری ہے، اور مجھ جیسے "زاہد خشک" یا "پختہ وضع زاہد خام" سے اسکی تشریح ہو نہین سکتی، اور اگر صرف ایک فلسفی کی طرح صرف تصور اور

تخیّل سے کام لے کر نقشہ لفظی پیش کیا جائے، تو کہین حریفان دردآشام کی بارگاہ سے "باحبیب نشینی و بادہ پیمائی" کا فتوی نہ صادر ہونے لگے، جو کچھ بھی ہو، شیخ صاحب نے یہان بڑی لطافت تخیّل سے کام لیا ہے، قاعدہ ہے کہ جب پیمانہ شراب منہ سے جدا کرتے ہین، تو کچھ لب و دہن اور کچھ پیمانہ سے چھلک کر شیشہ کے بالائی سطح پر آجاتا ہے، اور وہ کنارہ پیمانہ سے قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتا ہے اب شعر کے الفاظ پر غور کیجئے، حزین نے پیمانہ کی یہ حالت دیکھکر نتیجہ نکالا ہے کہ کہ پیمانہ کی یہ تراوش اسکی اشک ریزی ہے جسکی علت یہ ہے کہ محبوب نے اسے اپنے لب لعل سے جدا کر دیا ہے

تجلی زار می بینم سر خاک شہیدان را　　مگر شمعے بہ طوف مشہد پروانہ می آید

خاک شہدا کا تجلی زار ہو جانا اس بنا پر ہے کہ زندگی مین تو پروانے طواف شمع کیا کرتے تھے، اب انکے جلنے بھننے کے بعد شمع ہی طوف پروانہ کرنے آرہی ہے

وحدت فی الکثرت

عکس یار است کہ دارد ہمہ جا جلوہ حزین　　چہرہ پرداز در آئینۂ ایجاد یکے ست

یہ رنگ سخن رومی کی خصوصیات کلام مین ہے، ذات باری کے متعلق سورہ نور کی آیت حزین کے تخیّل کو واضح کر دیتی ہے، المصباح فی الزجاجۃ آلخ

عالم عرفان

نقاب زلف زعارض اگر بر اندازی　　صنم زطاق دل برہمن فرو ریزد

یہی تو موسی سے بنی اسرائیل نے بھی کہا تھا، لن نومن لک حتی نری اللہ جہرۃً فرق صرف یہ ہے کہ حزین کے یہان مسئلہ کا اثباتی رخ ہے، اور بنی اسرائیل کے یہان منفیانہ

مرقع حسرت

گل می شنو دخندان نالیدن بلبل را　　از زاری ما جانان بیزار نباید شد

اخلاقی سبق

حزین کہ بیخبر از خود ز خود خبر دار ست　　ترا کہ با خودی از خود خبر نمی آید

فرامش می کند ما را بوصلت چون رسد قاصد　　شود بیگانہ از یاران دنی چون دولتے یابد

تتمہ حالات وکلام شیخ محمد علی حزین

ابھی تک شیخ کے حالات زندگی اور تنقید کلام کے متعلق مینے کلیات حزین مطبوعہ نولکشور کا ایک پرانا نسخہ سامنے رکھکر اور صرف اپنی کاوش و جستجو اور ذوق تنقید پر اعتماد کرکے لکھا ہے، لیکن شیخ کی شخصیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے صرف انفرادی رائے پر منحصر نہ رکھا جائے، لہذا ضرورت ہوئی کہ تاریخ اور سیرت کے متعلق ان کتابونکی ورق گردانی کی جائے جو شیخ کے عہد مین لکھی گئین یا بعد مین لکھی گئین لیکن مصنف نے واقعات کی ترتیب اور کلام پر رائے زنی کرنے مین اپنی صحت ذوق اور نکتہ شناسی کا ثبوت دیا ہے، اس سلسلہ مین مفصلہ ذیل کتابین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہین جن کے مطالعہ کرنیکے بعد شیخ کے اس عہد کی زندگی

سامنے آجاتی ہے، جب وہ ہندوستان کی مذمت مین سرگرم اور اسکے بعض ارباب سخن سے برسر مجادلہ تھے، اور آخیر عمر تک یہی حالت قایم رہی۔

ماخذ اور بعض تذکرون پر تنقید تذکرہ شعرائے فارس کے سلسلہ مین تقریباً چالیس کتابین پائی جاتی ہین جن کے قلمی نسخے اورینٹل لائبریری پٹنہ مین موجود ہین، ان مین چند تذکرون کے سوا جن مین تذکرہ شعرا دولت شاہ، عرفات العاشقین مصنفہ تقی اوحدی البلیانی اور نفحاۃ الانس جامی بھی شامل ہین، قریب قریب تمام تذکرون مین شیخ حزین کے متعلق کم وبیش تاریخی اور تنقیدی واقعات ملتے ہین، لیکن تاریخی واقعات کی جستجو مین معاصرین کے بیانات ترجیحی پہلو رکھتے ہین، لہذا ریاض الشعرا مصنفہ علی قلی خان واغستانی متخلص بہ والہ، مجمع النفایس مصنفہ سراج الدین علی خان آرزو، ید بیضا مصنفہ غلام علی آزاد بلگرامی کی اہمیت نظرانداز نہین کیجا سکتی، یہ تینون ارباب فضل وکمال شیخ کے معاصر تھے، صرف یہی نہین بلکہ شیخ کیساتھ والہ واغستانی اور آزاد بلگرامی گہرے تعلقات تھے، شیخ جب ہندوستان مین تشریف لارہے تھے، تو اتفاقاً والہ واغستانی بھی ساتھ ہوگئے، اور بندر عباس تک دونو کا ساتھ رہا، دہلی مین آئے تو کچھ دنون والہ کے یہان شیخ ٹھہرے بھی اور جب لاہور مین زکریا خان بہادر دلیر جنگ صوبہ دار نے شیخ کی ایذارسانی کا ارادہ کیا، تو والہ نے اپنے بھائی حسن قلی خان کاشی کو جو محمد شاہ کی طرف سے نادر شاہ کے دربار مین سفیر بن کر گئے تھے، اور اس زمانہ مین لاہور کے اطراف مین پہونچ چکے تھے، لکھا کہ شیخ کو ساتھ لیتے آئین چنانچہ خان موصوف شیخ کو صحیح سالم ساتھ لائے[1]، غلام علی آزاد بلگرامی جب سیوستان سے واپس آرہے تھے، تو شہر بھکر مین شیخ سے ملاقات ہوئی، اور پر لطف صحبتین رہین، اسی عارضی ملاقات مین شیخ جیسے نازک مزاج فارسی الاصل مزاج ہندی نژاد ادیب سے کچھ ایسے مالوف ہوگئے کہ اپنے قلم سے اپنے چند اشعار لکھکر آزاد بلگرامی کو روانہ کئے، وہ اشعار یہ تھے

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم ۔۔۔ آتش بسنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

نگردد غرق طوفان کشتی بے لنگر عاشق ۔۔۔ بود دریا نمک پروردۂ چشم تر عاشق

بہ جلوہ ہائے رسا سرفرازمی آئی ۔۔۔ مگر زغارت عمر درازمی آئی

گہر بہ خلوت خاص صدف نمی آید ۔۔۔ چنین کہ در دل اہل نیاز می آئی

جب آزاد مرحوم ید بیضا لکھ رہے تھے تو شیخ دہلی مین تھے

سراج الدین علی خان آرزو ہندوستان مین شیخ کے ادبی معرکہ آرائی کے حریف مقابل تھے، دہلی مین دونو کا ساتھ رہا ممکن ہے شیخ کی نازک مزاجیون اور جذبات انانیت نے خان آرزو کو صحبت شیخ سے روکا ہو لیکن دونو ہم مذاق معاصرین کا ایک ہی شہر

[1] ریاض الشعرا جلد اول ۵۳ ید بیضا۔

رہنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دونون نے ایک دوسرے سے ملاقات کی ہو، خان آرزو، ایک ہندوستانی تھے اور شیخ کے حریف مقابل لہذا شیخ کی اس ہجویہ شاعری کی داد نہین ضرور دینا تھی جس نے خان آرزو اور شیخ کی زندگی کو لازم و ملزوم کر دیا اور ایک تذکرہ نویس کے لئے نا ممکن ہے کہ شیخ کے حالات زندگی بیان کرنے مین، وہ خان آرزو کا تذکرہ نظر انداز کردے، اس سے میری مراد خان آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین ہے، جسے خان موصوف نے شیخ حزین کی ہجویہ شاعری (متعلقہ ہند) کے جواب مین لکھا ہے آیندہ سطور مین، مین یہ بتاؤنگا، کہ خان آرزو نے تنبیہ الغافلین لکھتے وقت جب شیخ دہلی مین تھے، تو کونسا لب و لہجہ اختیار کیا تھا[2]، اور جب وہ مجمع النفایس لکھ رہے تھے اور شیخ بنارس مین جاکر عزلت گزین ہوگئے تھے تو خان آرزو کے خیال مین کیسی بے باکی، اور اظہار مین کیسی حریت آگئی تھی[3] مجمع النفایس، ریاض الشعرا کے بعد کی تصنیف ہے بعض ایسی باتین جو متذکرہ بالا تذکرون مین نہین پائی جاتین مینے غلام ہمدانی متخلص بہ مصحفی کی کتاب عقد ثریا اور مخزن الغرائب مصنفہ احمد علی ہاشمی سندیلہ سے لی ہین، لیکن باوجود کاوش تاریخ کی کتابون سے مصحفی کی روایت کی تصدیق نہو سکی، عہد محمد شاہی کی تاریخ مین شیخ حزین کا تذکرہ نہین پایا جاتا، عہد محمد شاہی کے ایک اہل قلم نے "تاریخ محمد شاہ" کے نام سے، محمد شاہ کی حکومت کے ابتدائی عہد کی تاریخ لکھی ہے، جو پٹنہ اورنٹیل لائبریری کی فہرست کتب فارسی مین نمبر ۱۳۴ کے مقابل مندرج ہے، یہ قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا، مصنف نے دیباچہ مین لکھا ہے کہ مینے یہ کتاب اپنے ایک پیارے دوست (جنکا نام بھی مندرج ہے) کی فرمایش سے لکھی ہے، اس مین حزین کا تذکرہ نہین ہے، ہاشم مخاطب بہ خافی خان نے منتخب اللباب نامی ایک کتاب لکھی اور بابر سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ تک تمام تاریخی واقعات قلمبند کئے، یہ عہد مغلیہ کی ایک نہایت مستند اور معتبر تاریخ ہے، لیکن باوجود ورق گردانی اس مین حزین کے متعلق ایک لفظ بھی نہ مل سکا، اسی طرح محمد علی خان انصاری (مصنف بحر المواج) نے تاریخ مظفری کے نام سے عہد مغلیہ کی ایک قابل قدر تاریخ لکھی اور اس مین تذکرہ شعرا کے متعلق ایک عنوان قایم کرکے شعرائے متقدمین اور متاخرین پر ایک سرسری نظر ڈالی چنانچہ اس ضمن مین ابوالعلا گنجوی اور خاقانی کے تعلقات، شاہ اسمعیل کے ساتھ امیر معزی (شاعر) کا عشق، اور تیر کھا کر جان دینا عہد اکبری مین محمد حسین نظیری کا ورود ہند، ابراہیم عادلشاہ کی سلطنت اور فارس سے نورالدین ظہوری کی آمد فیضی اور عرفی کے مطائبات، تمام واقعات پر روشنی ڈالی لیکن حزین کا تذکرہ نہین طرفہ یہ کہ شیخ حزین کے حریف مقابل سراج الدین علی خان آرزو کے حالات زندگی اور تصنیفات کے متعلق کسی قدر تفصیلی واقعات لکھے، لیکن وہان بھی حزین کے متعلق ایک لفظ نہ لکھا، الغرض عہد محمد شاہی کی ان تمام تاریخی کتابون مین حزین سے بے التفاتی کی گئی، براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ۳ مین ایک جگہ مسلسل، اور دو تین جگہ سرسری طور پر حزین کے کلام اور زندگی پر تبصرہ کیا ہے، براؤن کے نزدیک سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک فارس کی تمام تاریخ مین نہایت خشک ادبی دور رہے، اس زمانہ مین اگر کوئی مشہور کلام منصۂ شہود پر

[1] ریاض الشعرا [2] دیباچہ تنبیہ الغافلین [3] مجمع النفایس

آیا تو وہ ہاتف اصفہانی کا ترجیع بند ہے، جسکے متعلق پروفیسر موصوف نے ایک عالمانہ بحث کی ہے، اور نمونۂ کلام پیش کیا ہے، اسکے بعد براؤن لکھتے ہین کہ اس دور کے تاریخی حالات ہملوگ دو نہایت مستند اور کامل اہل قلم کے زبانون مین پاتے ہین، یہ شیخ محمد علی حزین اور لطف علی بیگ متخلص بہ آذر ہین، دونو شاعر تھے اور سابق الذکر بڑے پایہ کے شاعر تھے چونکہ انھون نے اپنے کلام کے تین یا چار دیوان مرتب کئے تھے، اسکے بعد پروفیسر صاحب اپنا ذاتی خیال لکھتے ہین کہ ہملوگون کے نقطۂ نظر سے انکی نثر نگاری نظم سے زیادہ قابل وقعت ہے، ۱۱۳۵ھ مین شیخ حزین نے مدت العمر نام سے شیخ بہاؤ الدین عاملی کے کشکول کی طرح ایک مجموعہ تیار کرنا شروع کیا، لیکن افغانون کے ہاتھ سے اصفہان کی غارتگری مین شیخ کے کتبخانہ کے دوسری کتابون کی طرح یہ نسخہ بھی ضایع ہوگیا، اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم مین ہے، پروفیسر موصوف نے دوسری جگہ خاندان صفویہ کے عروج و زوال کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے علی حزین کے بعض خیالات کا (جو انھون نے تذکرۃ الاحوال مین ظاہر کئے ہین) جونس ہینوے کی کتاب "بحر اخضر مین برطانوی تجارت کی تاریخی سرگزشت" اور کروسنسکی کی کتاب "تاریخ انقلاب فارس" کے نظریات سے موازنہ کیا ہے۔

اس ابتدائی عرصہ کے طے ہو جانے کے بعد اب مین بہ عنوان ذیل اُن واقعات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہون جن کے متعلق حزین نے اپنے تذکرہ مین یا تو ذکر ہی نہین کیا یا تفصیل سے نہین لکھا، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ حزین نے اپنا تذکرہ ۱۱۵۴ھ مین ختم کیا اور مندرجہ ذیل واقعات مابعد کی تصنیف مین ملتے ہین

شیخ زاہد الجیلانی کی شخصیت

اگلے اوراق مین لکھا جا چکا ہے، کہ شیخ نے اپنے اجداد کے سلسلہ مین زاہد الجیلانی کا تذکرہ کیا ہے اور اسکے متعلق مزید واقعات نہین لکھے، تذکرہ نویسون نے بھی عموماً اس طرف توجہ نہین کی، صرف براؤن کی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ۳ اور مجمع النفایس جلد اول مین اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، شیخ صفی الدین اسحق بن شیخ امین الدین جبرئیل الموسوی، سلسلہ صفویہ (حکمران فارس) کے مورث اعلی تھے، آپکا نسب حضرت موسی کاظمؑ سے ملجاتا ہے[۵۱]، آپکا وطن اردبیل تھا[۵۲]، حزین کے جد امجد حضرت شیخ زاہد الجیلانی حضرت صفی الدین کے پیر و مرشد تھے،

۵۱ عرفات العاشقین مصنفہ تقی اوحدی البلبانی (قلمی نسخہ اورینٹل لائبریری پٹنہ) ہفت اقلیم امین احمد رازی (قلمی)

۵۲ اردبیل کا بانی کیانی خاندان کا مشہور بادشاہ کیخسرو بن کیکاؤس ہے یہ شہر کوہ سیلان کے دامن مین واقع ہے، اسکی آب و ہوا بہت سرد ہے، یہان کوہ سیلان سے پانی آتا ہے، جو بہت ہاضم ہوا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہانکے آدمی بڑے کھانیوالے ہوتے ہین، یہانکے اکثر باشندے مذہب شافعی کے پیرو اور شیخ صفی الدین کے مرید ہین کوہ سیلان کے اوپر ایک مضبوط قلعہ ہے، جسے "دربہمن دژ رو ہین" کہتے ہین، فردوسی شاہنامہ مین لکھتا ہے کہ جب کیخسرو اور فریبرز مین بادشاہی کیلئے نزاع ہوا تو اسی قلعہ کی فتح پر فیصلہ قرار پایا فرابرز اسے فتح نہ کرسکا کیخسرو نے فتح کرلیا اور بادشاہی اسی کو ملی

(نزہت القلوب حمد اللہ المستوفی قلمی نسخہ)

چنانچہ خان آرزو و یا تقی اوحدی نے جہاں اپنے تذکرہ مین شیخ صفی الدین کا ذکر کیا ہے، وہان یہ لکھا ہے، کہ گو تاریخ سے ثابت نہین کہ آپنے شعر گوئی کی ہو لیکن (یہ) اشعار آپکی طرف منسوب ہین[۱] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حزین کے جدامجد حضرت زاہد الجیلانی کی کیا شخصیت تھی ؟

حزین کا موطن آبائی اور اسکی جغرافی حالت

شیخ "اصفہانی" مشہور ہین لیکن آپکا آبائی موطن لاہیجان تھا، اسکی تصریح گزشتہ اوراق مین ہو چکی ہے، شیخ نے تذکرۃ الاحوال" مین صرف یہ لکھا ہے کہ یہ گیلان کے شہرون مین سے ایک شہر ہے، لیکن عوام کو خود گیلان کے متعلق بھی کم واقفیت ہے، لہذا ضروری ہے کہ گیلان کے جغرافی حالت کے متعلق چند سطور لکھدیئے جائین

صاحب عجائب البلدان لکھتے ہین:-

"گیلان ولایتیست نزدیک بہ قزوین و بحر خرر در جانب شمال آنست رودہا و اشجار ہا بسیار دارد و باران بسیار شود، و گویند تا چہل شبانہ روز آنجا باران منقطع نہ شود و چون باران بسیار شود در شب بانگ شغال بشنوند و بعد ازان بانگ سگ، مردم یک دیگر را بشارت دہند بہ انقطاع باران و این بسیار بہ تجربہ معلوم شدہ است"

عجائب البلدان مین لاہیجان کا تذکرہ نہین پایا جاتا، لیکن امین رازی نے ہفت اقلیم مین گیلان کے ماتحت لاہیجان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

"گیلان ایک ولایت ہے، جسکے اطراف مین پہاڑیون کا ایک سلسلہ ہے، وہان تقریباً تین ماہ تک پانی برستا ہے، یہانکے لوگ اپنی اصطلاح مین دریا کو "سپید رود" کہتے ہین اور چونکہ سپید رود گیلان کے درمیان مین جاری ہے، اسلئے اسے دو حصون مین تقسیم کر دیتا ہے، ایک حصہ کو "بیشہ پیش" اور دوسرے کو "بیشہ پس"، کہتے ہین، سابق الذکر حصہ کا دار الملک لاہیجان ہے، جو ایک آباد اور گنجان شہر ہے، دوسرے حصہ مین شہر رشت آباد ہے، جسے زشت بھی کہتے ہین"[۲]

اسکے بعد امین رازی نے وہان کے طرز معاشرت کے متعلق ایک مختصر تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہین کہ وہانکی لڑکیان بڑی شوخ اور طناز ہوا کرتی ہین، اور بازارون مین ایک ادائے بے باکانہ کیساتھ محو خرام ناز رہتی ہین، جب کوئی شخص کسی لڑکی کا خواستگار ہوتا ہے، تو وہ پھر بازار مین نہین آتی، مولانا گیلانی فرماتے ہین۔

دخترانے کہ ساکن رشت اند ہمچو ن طاؤس مست می گردند
طلب مشتری بہ ہر بازار بند تنبان بدست می گیرند[۳]

---

[۱] مجمع النفائس جلد دوم عرفات العاشقین جلد دوم [۲] ہفت اقلیم علا[illegible] ابن احمد رازی (قلمی نسخہ)

شاہی وظیفہ اور ملاقات حزین کیلئے محمد شاہ کی تشریف آوری

حزین نے اپنے تذکرہ مین کہین یہ واقعہ نہین لکھا اسکے راوی صرف ایک تذکرہ نویس، غلام ہمدانی متخلص بہ مصحفی ہین، انکے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نویس نے اس واقعہ پر روشنی نہین ڈالی، حزین دہلی مین عمدۃ الملک امیر خان کے دولتکدہ پر ٹھیرے ہوئے تھے اسوقت خود محمد شاہ حزین سے ملنے آئے لیکن حزین نے ملنا پسند نہ کیا۔

بارہا فردوس آرامگاہ خواستند کہ آن بزرگ، را پیش خود طلبیدہ خطے از کلام وے بردارند زنہار قبول نہ کرد، چون استغنائے مزاج وے بر بادشاہ عالم پناہ باحسن وجہ ہویدا شد خود یک دو بار سوار شدہ قصد منزلگاہش کرد شیخ از آمد آمد اطلاع یافتہ بہ بہانہ بہ زیارت خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکی پیش از آمدن بادشاہ سوار شدہ در رفت چون کہ چنین اتفاق افتاد ملاقی الطرفین فیمابین صورت نہ گرفت بالآخر بہ سبب منادی کشتن از زبان سخن چینیان و غوغائے حریفان از دہلی بر آمدہ در بنارس رفتہ کنج عزلت اختیار نمود[۱]"

ایک دوسری روایت احمد علی ہاشمی سندیلہ بیان کرتے ہین،

عمدۃ الملک نواب امیر خان خبر مقدم شیخ یافتہ برائے ملاقاتش رفت و شیخ را بہ نیاز تمام مہمان خود ساخت، خدمت نیکو بہ تقدیم رسانیدہ ملازمت بادشاہ کنانیدہ جاگیر مبلغ چہل ہزار روپیہ نزدیکی اکبر آباد برائش گرفت از مردم ثقہ شنید کہ بادشاہ مزبور مبلغ پنج لک روپیہ بہ معرفت نواب مزبور بہ شیخ عطا فرمودہ[۲]

لیکن ساتھ ہی مجمع النفائس مین سراج الدین علی خان آرزو لکھتے ہین،

دروقتیکہ عمدۃ الملک امیر خان بہادر مرحوم از الہ آباد بہ حضور آمد شیخ بہ توقع قدر شناسی ربع القہقری نمودہ بہ شاہجہان آباد باز آمد و چندگاہ دیگر مثل کیمیا و عنقا متواری درین شہر بود و غرض گمنامی اشتیاق افزائی مردم است و سبق چون بختش مدد و اقبال یاوری کرد عمدۃ الملک قریب بست لک دام جید از بادشاہ برائے او گرفت پس بہ جمعیت می گزرانند[۳]

ان تینون مختلف روایات کی تطبیق بہ ظاہر بہت مشکل ہے، نہ معلوم مصحفی نے یہ واقعہ کہان سے لیا، حزین نازک مزاج سہی لیکن ایسے بے نیاز نہ تھے، کہ بادشاہ تشریف لائین اور وہ ملاقات سے اعراض کرین یہ تو ایک تارک الدنیا درویش کر سکتا ہے، نہ کہ ایک شاعر، ہان خسرو دہلوی نے درباری تعلق سے علیحدگی کر لی[۴]، خاقانی نے منوچہر شروان شاہ کی ملازمت ترک کر دی[۵]، لیکن یہ سوقت جب محبت الٰہی کا جوش پیدا ہوا اور عزلت نشینی کی طرف طبیعت مائل ہوئی، حزین کی زندگی نے ہنوز یہ پہلو اختیار نہین کیا تھا، لہذا

---

[۱] عقد ثریا [۲] مخزن الغرائب جلد اول (قلمی)، [۳] مجمع النفائس جلد اول [۴] تاریخ فرشتہ [۵] صحف ابراہیم مصنفہ عزیز الملک متخلص بہ خلیل (قلمی)۔

معلوم ہوتا ہے، حزین نے ثقہ شخص سے روایت نہین لی، اسکے علاوہ صاحب مخزن الغرائب سے اسکی تردید بھی ہوجاتی ہے، چونکہ حزین عمدۃ الملک سے ملے انکے یہان ٹھیرے، انھون نے بادشاہ سے ملایا، دربار سے وظیفہ دلایا، خان آرزو کی روایت سے طنز کی بو آتی ہے، جو رشک سے خالی نہین، خان آرزو کے نزدیک شاہجہان آباد مین حزین اسلئے آئے کہ امیر خان قدر کرینگے حالانکہ صاحب مخزن الغرائب کی روایت بھی یہی ہے، لیکن انھون نے اسی واقعہ کو دوسرے پہلو سے بیان کیا ہے، اور خان آرزو نے اپنے جذبہ عنادمین واقعہ پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈالی ہے، جس سے حزین کی خفت اور سبکی مقصود ہے، حزین دوبارہ شاہجہان آباد مین آئے ضرور لیکن یہ کیا ضرور ہے، کہ امیر خان کی قدر شناسی ہی کی امید مین آئے معلوم ہوتا ہے، میر خان نے جو قدر شناسی کی وہ خان صاحب موصوف کو گران گزری اور آپکا یہ جذبہ ایک رشک آمیز حسرت کیساتھ اس ادائے بیان سے ظاہر بھی ہوتا ہے،

" چون بخشش واقبال یاوری کرد عمدۃ الملک قریب بست لک دام جید از بادشاہ برائے او گرفت پس بجمعیت می گزرانید "

آخری جملہ مین جو جذبہ کار فرما ہے، ارباب بصیرت سے مخفی نہین، اگر امیر خان حزین سے ملے انہین اپنا مہمان کیا بادشاہ سے انکی ملازمت کرائی، وظیفہ مقرر کرادیا تو اس سے یہ نتیجہ کہان نکلتا ہے، کہ حزین ایک گداگر کی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے دہلی دوڑے آئے، خان آرزو ایک بڑے پایہ کے ادیب اور مستند راوی ہین، اور یہی وجہ ہے کہ واقعہ انھون نے یون بیان کردیا کہ دوسرے تاریخی روایات سے تضاد نہو لیکن نتیجہ ایسا نکالا، کہ عوام مین غلط فہمی پیدا ہوجائے، احمد ہاشمی کی روایت کا بھی ملخص وہی ہے، جو خان آرزو نے لکھا ہے لیکن استنتاج مین دونون نے دو راہین اختیار کی ہین

ہندوستان کی ہجو اور ارباب کمال سے معرکہ آرائی

گزشتہ اوراق مین، مین شیخ کے ان ہجویہ خیالات پر روشنی ڈال چکا ہون جو انھون نے تذکرہ مین ہندوستان اور اہل ہندوستان کے متعلق ظاہر کئے تھے، قیاس اور رائے کی بنا پر انکے اسباب پر بھی ایک حد تک روشنی ڈال چکا ہون، والہ داغستانی اور خان آرزو نے اسکے متعلق شرح وبسط سے بحث کی ہے، مین نے صرف قیاس پر اعتماد کرکے نتیجہ نکالا تھا، عجیب اتفاق ہے کہ بعض واقعات کی تائید جنکے ماتحت مینے بحث کی تھی، تذکرون سے بھی ہوجاتی ہے مینے تین عنوان کے ماتحت بحث کی تھی، لسانی انقلاب، سیاسی پیچیدگی اور مذہبی اختلاف،

صاحب مجمع النفائس لکھتے ہین:۔

" کسے چنانکہ قدر او بود دران وقت نہ شناخت۔ نادر شاہ در دہلی مسلط شدہ بود وشہر دہلی بہ تصرف قشون او درآمدہ، (حزین) درگوشہ خزیدہ بود بعد رفتن افواج شاہی باز ظاہر شد،

پھر فرماتے ہین:۔

" از بسکہ طبع ناسازی دارد وطن وغربت بروی یکسان است "

میرے ایک عنوان سیاسی بیچیدگی کی تو خان آرزو کے خیال سے تائید ہو گئی خان موصوف نے دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ شیخ خشک طبع، اور ناملنسار تھے ہی اسو جہسے لوگ انکی طرف زیادہ متوجہ نہین،

خان آرزو نے یہ خیال کسی معاندانہ جذبہ مین نہین ظاہر کیا ہے بلکہ والہ داغستانی بھی جو شیخ کے دوست اور ندیم تھے، فرماتے ہین:-

بادشاہ وامراو سائر ناس کمال محبت و مراعات نسبت بہ دے مرعی می دارند لیکن از انجاکہ مروت جبلی وانصاف ذاتی شیخ است عموم اہل این دیار از بادشاہ وامراوغیرہ ہجو ہائے رکیک کہ لایق شان شیخ نبودہ ، نمودہ ہر چند اورا ازین ادائے زشت منع کردم فایدہ نہ بخشید وتاحال درکار است لابدپاس نمک بادشاہ وحق صحبت امرا وآشنایان بے گناہ گریبان گیر شدہ ترک آشنائی وملاقات آن بزرگوار نمودہ[1]

روایت بالا سے ظاہر ہے کہ والہ داغستانی کے نزدیک بھی شیخ ایک بے مروت انسان ہین اور انھون نے نہایت بے انصافی کے ساتھ ہندوستانیون کی مراعات کا یہ جواب دیا، کہ ہجو کہنے لگے، والہ داغستانی نے انھین اس سے منع کیا لیکن شیخ اس پر بھی باز نہین آئے، آخر کار والہ کو بھی اسکا رنج ہوا، اور انھون نے شیخ سے ترک تعلق کر لیا، چنانچہ اسپر خان آرزو نے چٹکی لی۔ فرماتے ہین:-

.... عالی جاہ خان شفقت نشان علی قلی خان داغستانی کہ معتقد ومخلص حزین است وحالا سورۂ برأۃ دوستی شیخ حفظ کردہ[2] ....

والہ اور خان آرزو کے خیالات کی تائید، خود شیخ کے ملفوظات اور کلام سے بھی ہو جاتی ہے، چنانچہ جہان اپنے والد کی وفات کا تذکرہ فرماتے ہین وہان انکی اس وصیت کو بھی نہایت اہمیت سے لکھا ہے، کہ "ہر چند اوضاع دنیا را بر وفق مرام نہ بینی تبعیت ودنبالہ روی اختیار نہ کنی" عالم سے بے نیازی، خلق ظاہری کی افسردگی زود رنجی، بے محابا اظہار خیال یہ تمام باتین شیخ کی سیرت مین داخل تھین، جسکا ایک پہلو مفصلہ ذیل اشعار سے بھی نمایان ہو جاتا ہے،

حریف عیش جہان بے دماغ می ماند پیالہ می رود از دست و داغ می ماند

بہ سفلہ عالم افسردہ باد ارزانی خزان چون گشت گلستان بہ زاغ می ماند

ز جوئے آتش عشق غیور بوالعجبی است کہ آشیانۂ بلبل بہ باغ می ماند

ہندوستان اور اہل ہندوستان پر عمومی حیثیت سے شیخ نے جو اپنے ہجویہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ایک حد تک مفصلۂ ذیل اشعار مین بھی موجود ہے

بہ ہند گشتہ زمین گیر ناتوانی ما رسیدہ است بہ شب روز زندگانی ما

---

[1] ریاض الشعراء قلمی نسخہ (اورنٹیل لائبریری پٹنہ) [2] مجمع النفائس جلد اول (قلمی نسخہ)

سواد ہند خاطر خواہ باشد بے کمالاں را نماید خانۂ تاریک روشن چشم عریان را

زہند تیرہ دل چون شمع روشن گر برون رفتم بپائے خود باین بزم آمدم از سر برون رفتم
نہ گشت آلودۂ پستی ہمت دامن پاکم ازین عالم چون خورشید بلند اختر برون رفتم
بہ من نگذاشت دوران سبک سر قوت پائے چون موج از سینہ زین دریائے بے لنگر برون رفتم
چون شمع بزم کوران تا یکے بیہودہ بگذارم حزین از کشور گردون دون پرواز برون رفتم

صرف یہی نہین بلکہ عمومیت سے گزر کر شیخ نے ذاتی حملے بھی کئے، جسکا نتیجہ یہ ہوا، کہ خان آرزو نے ایک سالہ مسمی بہ تنبیہ الغافلین لکھا اور شیخ کے کثیر التعداد اشعار کے نقایص لفظی و معنوی پر عالمانہ بحث کی چنانچہ والہ داغستانی لکھتے ہین۔

بعض از غیوران این مملکت کمر انتقام لبستہ، تیغ ہجا بروئے کشیدہ در نظر ارباب خرد خفیفش کردند، از جملہ سراج الدین علی خان آرزو کہ از شعرائے این شہر است و در فضیلت و سخنوری گوئے از میدان ہمکنان می رباید اشعار غلط بسیار از دیوان شیخ برآوردہ رسالہ مسمی بہ تنبیہ الغافلین نوشت و ابیات مزبور را یک یک ذکر کردہ تعریضات نمودہ[۵۳]

اسی طرح میر محمد عظیم ثبات ابن میر افضل ثابت نے شیخ کے دیوان سے بروایت والہ داغستانی پانچسو اور بروایت خان آرزو دو سو ابیات نقل کئے اور انکے مقابلہ مین متقدمین کے اشعار پیش کرکے بتایا کہ شیخ نے سرقہ کیا ہے[۵۴] ان مین زیادہ تر صائب کے اشعار پائے جاتے ہین جنھین میر عظیم ثبات نے حزین کا ماخذ قرار دیا ہے، اسکی رویداد دو طریقہ سے بیان کیجاتی ہے، والہ داغستانی کا بیان ہے کہ کسی شخص نے ایک موقعہ پر میر افضل ثابت کا کوئی شعر لکھکر شیخ سے پوچھا، شیخ نے جواب دیا کہ مضمون جو گرا ہوا ہے وہ تو درکنار ہے، یہ فلان شاعر کا خیال ہے، جب سے میر افضل نے سرقہ کیا ہے، میر عظیم نے یہ رقعہ دیکھ لیا انکی رگ حمیت جوش مین آئی اور انھون نے بھی شیخ کے کلام کی نظیرین پیش کین، اور بتایا کہ ان مین فلان فلان متقدمین سے سرقہ کیا گیا ہے[۵۵]، لیکن خان آرزو فرماتے ہین کہ جب نواب شیر افگن خان پسر غیرت خان، میر محمد افضل کی شاگردی مین داخل ہوئے تو انھون نے نگینہ مین یہ

۵۱ ۱۱۴۶ھ مین شیخ نے سفر ہندوستان کیا، اور ۱۱۸۰ھ مین وفات پائی، یہ درمیانی زندگی ہندوستان مین گزری تاریخ سے پتہ نہین چلتا کہ انھون نے ہند سے فارس کا سفر کیا ہو، لیکن براؤن نے بلفور کے ترجمہ "تذکرۃ الاحوال" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حزین نے تہیہ کر لیا تھا کہ فارس کے سیاسی انقلاب اور اختلال کے باوجود، ہند سے لوٹ جائین (لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد تین ورق ۲۸۳) چونکہ چینے تذکرہ الاحوال ۱۱۵۴ھ مین تمام کیا لہذا نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ اشعار اسی زمانہ مین کہے کیونکہ اسکے بعد وہ فارس جانیکے بجائے بنارس مین چلے گئے ۵۲ ریاض الشعرا ۵۳ خان آرزو نے صرف تذکرہ کر دیا ہے، لیکن ریاض الشعرا مین یہ اشعار بھی مندرج ہین ۵۴ ریاض الشعرا ۔

مصرعہ کندہ کرایا تھا ؎

شیر افگن خان مرید ثابت اوست

جب میر افضل کا انتقال ہوگیا تو خان موصوف نے شیخ علی حزین کی شاگردی اختیار کرلی اور ایسے معتقد ہوئے کہ خان آرزو لکھتے ہین "اعتقادے کہ ما فوقش متصور نبودہ بہم رسانید" یہی وجہ ہوئی کہ میر محمد عظیم نے تعصب مین آکر شیخ کے کلام پر ردوقدح کی اور دو سو ابیات کو متقدمین کے کلام کا مسروقہ بتایا[۱] شیخ نے اہل کشمیر پر بھی تعریضین کین، چنانچہ وہ بھی شیخ سے اُلجھے اور انھون نے مقابلہ کے لئے ملا ساطع وغیرہ کو مستعد کیا[۲]۔

خان آرزو کی تنبیہ الغافلین پر ایک سرسری تبصرہ

خان آرزو نے جب تنبیہ الغافلین لکھی شیخ دہلی مین تھے، اور یہی وجہ ہے کہ خان آرزو کا لب ولہجہ بھی ایسا نرم تھا، گویا وہ شیخ کے سامنے مودبانہ بیٹھے ہین، اور اپنے شکوک رفع فرمارہے ہین کہا جاسکتا ہے کہ خان صاحب موصوف کا بہ حسن اخلاق تھا کہ انھون نے یہ ادائے بیان اختیار کیا لیکن مین کہونگا کہ نہین یہ شیخ کے کمالات کا رعب اور اسکی شخصیت کا اثر تھا اور یہ خیال اس واقعہ سے اور بھی پایہ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے، کہ خان آرزو مجمع النفائس لکھ رہے تھے اسوقت شیخ بنارس مین اقامت گزین ہوگئے تھے جب بارعب حریف سامنے سے ہٹ گیا اور اسکی ہیبت کا اثر دل سے کم ہوگیا تو خان صاحب موصوف کے خیالات مین ایسی جرأت آگئی کہ گویا وہ حزین کو ایک ناقابل التفات چیز تصور کرتے ہین اگر حسن اخلاق کے اثر سے خان صاحب نے تنبیہ الغافلین مین اس ظاہر دارانہ استرشاد، اور ملمع آمیز انکسار کا اظہار کیا تھا تو اسکا موقعہ ہر وقت تھا، خان صاحب نے مجمع النفائس مین حزین کے متعلق جو ادائے بیان، اظہار خیال، لہجہ طنز اختیار کیا ہے اسے دیکھنے کے بعد خان صاحب کے ساتھ تنبیہ الغافلین کے دیباچہ کی نسبت اتہام سے زیادہ حیثیت نہین رکھتی یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حزین ایسی بارعب شخصیت رکھتے تھے، کہ انکی موجودگی مین خان آرزو جیسے بلند پایہ شاعر اور نکتہ رس عالم بھی "حریف جوشش دریا نہین خودداری ساحل" کا مصداق تھے۔

خان آرزو تنبیہ الغافلین کے دیباچہ مین لکھتے ہین:۔

"درین ایام مطالعہ دیوان بلاغت بنیان جناب فصاحت مآب شعرائے اوج نکتہ پردازی دبیر فلک سخن سازی بقیۃ السلف حجۃ الخلف، نتیجہ متقدمین وخاتم متاخرین شیخ محمد علی متخلص بہ حزین کہ تخمینا از مدت دہ سال بہ سبب ہنگامہ ایران وارد ہندوستان جنت نشان کہ داخلش مَن دَخلہ کانَ اٰمِنا گویان است گردیدہ از طنطنہ شاعرانہ اش گوش اکابر و اصاغر پرگشتہ اتفاق افتاد، داستفادہ تمام دست بہم داد لیکن در بعض اشعار کہ بہ سبب قصور ذہن بہ معانی آن نرسیدہ، دخاطر بہ مقصد آن نہ گردیدہ، ترددے روداد ناچار در تحریر آن رابرد ئے قلم مشوش رقم خود

---

[۱] مجمع النفائس [۲] مخزن الغرائب ۱۲

کشادہ و نیز بارہ از مصارع شعر را کہ از نارسائی فہم خویش نارسا فہمیدہ گاہے باندک تغیر و تبدیل گردانیدہ و گاہے خود گفتہ، پس این از عالم خطائے بزرگان گرفتن کہ در واقع خطائے بزرگیست تصور نباید فرمود، ۔۔۔۔۔۔
امید کہ اگر بہ نظر شریف او درآید از خلل و زلل برآید"[۱]

اسکے مقابلہ مین مجمع النفائس کے ان طنزیہ اور تند فقرون کو ملاحظہ فرمائین جو جستہ جستہ خان آرزو نے لکھے ہین،

چندگاہ دیگر مثل کیمیا و عنقا متوازی این شہر بود و غرض از گمنامی اشتیاق افزائی مردم است و بس ۔۔۔۔۔
رسالہ مشتمل بر حسب و نسب و سیر و شعر خود نوشتہ دعویہائے بلند در ان نمودہ کہ صاحب داعیہ از ان معلوم می شود ۔۔۔۔۔۔ در ہنولا بعزم حج و زیارت عتبات کہ روانہ بنگالہ شدہ بود، از عظیم آباد برگشتہ بہ بنارس کہ معبد عظیم ہندوان است فرو کش گشتہ ؎

ترسیم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

۔۔۔۔۔۔ شیخ گوید کہ این دیوان کہ شہرت دارد دیوان چہارم است و سہ دیوان در فترت افاغنہ تلف شد
بہر حال دیوان مذکور ہم کہ مکرر بہ مطالعہ درآمد بہ آن وجہ کہ مظنون معتقدین شیخ و جماعت نصیریان اوست
نیست اگر این ہم بہ آن سہ ملحق می گردید، مورد این ہمہ اعتراضات نمی گردید ۔۔۔۔ می گویند کہ شیخ مذکور
فاضل است و صاحب تصانیف لیکن ہیچ از و در علم حکمت و کلام بہ نظر در نیامدہ[۲]

نتیجہ ظاہر ہے، ساتھ ہی خان آرزو نے شیخ کے حکمیہ اور کلامیہ تصنیفات کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے، ممکن ہے حکمت اور کلام کے متعلق شیخ کی کوئی تصنیف انکی نظر سے نہ گزری ہو، لیکن ان فنون کے اوپر یقیناً انھون نے تصنیفات چھوڑی ہین جنکا مختصر حال اپنے "تذکرۃ الاحوال" مین بھی درج کر دیا ہے، شیخ کے بارہ رسائل کا ایک مجموعہ پٹنہ کی اورنٹیل لائبریری مین موجود ہے، جس مین رسالہ "حدوث و قدم" رسالہ صیدیہ، رسالہ فرسنامہ، شرح قصیدہ لامیہ، رسالہ معاد وغیرہ ہین، متذکرہ بالا رسائل پر مینے ایک سرسری نظر ڈالی ہے، اور مجھے شیخ کے کمالات علمیہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے[۳]

خان آرزو نے حزین کے کلام پر جو جرح کی ہے، وہ بعض جگہ صحیح بھی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہین نکالا جا سکتا کہ شیخ ایک قابل اور نکتہ رس شاعر نہ تھے، شیخ کی شاعری ملہمانہ تو تھی نہین، کہ انکا کلام لفظی اور معنوی ربط، اصولی اور فروعی قیود تخییلی اور منطقی دقیقہ سنجیون کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی گرا ہوا نہ ہوتا سرخوش اپنے تذکرہ مین لکھتے ہین کہ صائب تبریزی نے بابا فغانی کے مندرجہ ذیل شعر کے مصرعہ اول پر تصرف کیا،

چو شبنم صبحدم نالان زگلگشت چمن رفتم نہادم روئے بر روئے گل و از خویشتن رفتم (فغانی)

صائب نے کہا " بجائے " نالان " بہ مناسبت شبنم " لفظ گریان " باید اگر مصرعہ اول را بہ این طور خوانند خوب است

---

[۱] ریاض الشعرا [۲] مجمع النفائس [۳] فہرست کتب قلمی فارسی اورنٹیل لائبریری پٹنہ (ع ۶۶۹)

چو شبنم صبحدم گریان بگلگشت چمن رفتم[1]

اسی طرح حزین نے اپنے تذکرہ مین ملا محتشم کاشی کے جس شعر کے اوپر اپنے والد کی جرح کا حال لکھا ہے وہ اگلے اوراق مین لکھا جا چکا ہے، ملا محتشم کاشی عہد صفویہ (فارس) کے ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر گزرے ہین اور انکا وہ شعر جس پر حزین کے والد شیخ ابوطالب نے جرح کی ہے، اس قدر مشہور ہے کہ مورخین نے محتشم کے کلام کا نمونہ پیش کرنے مین اسے درج بھی کیا ہے، ہر چند شیخ ابوطالب کی جرح اس اعتبار سے صحیح ہے، کہ انکے نزدیک شعر صحیح طور پر نہ پڑھا گیا "اے قامت بلند قدان در کمند تو" لوگون نے پڑھا تھا، حالانکہ محتشم کاشی کے اصل شعر مین "قامت بلند" کی جگہ "گردن بلند" ہے اور صرف اس ایک لفظ "قامت" اور "گردن" کے رد و بدل سے لطافت معنوی مین آسمان زمین کا فرق ہوگیا ہے، "گردن بلند" کو ملحوظ رکھنے کے بعد ابوطالب کی جرح کوئی چیز نظر نہین آتی[2]

الغرض جرح سب پر ہوسکتی ہے، تنقید آسان ہے، لیکن سخن آفرینی مشکل چیز ہے،

حزین:- ظلمتکدہ عاشق را از چہرہ منور کن　　تا چند بروز آرم تاریکی شبہا را

آرزو:- شب بروز آوردن صحیح است نہ تاریکی شب بروز آوردن یا شبہائے تاریک می بایست گفت

یہان مجھے آرزو سے اتفاق ہے، اصل محاورہ وہی ہے جو خان آرزو نے لکھا ہے، رات سے دن ہونا محاورہ صحیح ہے تاریکی شب سے دن ہونا محاورہ نہین،

حزین:- ہر چہ خواہی مکن از دوری دیدار مگو　　وحشت آباد مکن خاطر ویرانی ما

آرزو:- وحشت آباد کردن خاطر ویران چہ لطف دارد اگر خاطر جمع یا خاطر آبادمی بود گنجایش داشت واگر گوئید کہ عاشق را با جمعیت خاطر چہ کار گوئیم درینجا معشوق مخاطب است وخطاب جز در حالت وصل صورت نمی بندد و جمعیت خاطر در وصل متصور است۔

اس شعر مین خان آرزو نے جرح تو صحیح کی لیکن تمثیل مین نفسیاتی اعتبار سے خود غلطی کر رہے ہین خان صاحب نے یہانتک صحیح فرمایا، کہ خاطر ویران کو وحشت آباد کرنیکی تمثیل ایک فضول چیز ہے ویرانہ تو خود ہی وحشت آباد ہوتا ہے اسکے بعد یہ فرماتے ہین کہ "میرے قول پر یہ جرح ہوسکتی ہے کہ عاشقون کا دل تو خاطر جمع ہوتا نہین تو مین یہ کہونگا کہ اس شعر مین معشوق مخاطب ہے، اور خطاب صرف حالت وصل ہی مین کیا جاتا ہے، لہذا دلکو خاطر جمع کہنا مناسب تھا" خان صاحب نے "خاطر جمع" کی صلاح دیکر، اور اس جرح کو اپنے سر فرض کرکے البتہ خود کو مجروح کرلیا ہے، ورنہ انکی جرح اپنی جگہ پر صحیح تھی، خان موصوف صرف یہ کہہ سکتے تھے کہ ویرانہ کو وحشت آباد کہنا صحیح ہے، اور بس بات ختم تھی اب انھون نے جرح کو طول دیا، اور فرماتے ہین "خطاب وصل مین ہوا کرتا ہے، اور اسوقت "خاطر ویران" کی جگہ حزین "خاطر آباد" کہہ سکتے تھے" لیکن ظاہر ہے کہ

[1] مجمع النفایس [2] مخزن الغرائب

خیالات اور نفسیات کی دنیا مین خان آرزو کے نظریہ کے خلاف بھی ہوا کرتا ہے، اگر وہ تصور کی نیرنگیون خیال کے التباسات، مراقبہ کے مظاہر، جذبہ رسا اور شوق ناپیدا کنار کے رموز پر غور کرتے تو انہین معلوم ہوتا کہ ہجر مین بھی وصل کا لطف آتا ہے، اور چونکہ نفس ایک طرف ملال ہجر سے متکیف اور دوسری طرف وصل خیالی کی لذت آفرینیون سے لذت اندوز ہوتا رہتا ہے، اسلئے معشوق کو مخاطب کر کے بھی "خاطر ویران" کا شکوہ ادا کیا جا سکتا ہے

حزین:- از ہمت سرمستان بردار حزین خضرے تنہا نتوان رفتن صحرائے محبت را

آرزو:- "خضر برداشتن" عبارت تازہ است خضر از عالم زاو نیست کہ بردارند و گر گویند کہ "رفیق برداشتن" در محاورہ آمدہ گوئیم ہمراہ "برداشتن" است نہ تنہا "برداشتن" در محاورہ آمدہ گوئیم ہمراہ "برداشتن" است نہ تنہا "برداشتن" و بر تقدیر تسلیم خضر در حکم رفیق نیست یعنی استعمال این لفظ در حق متبوع جائز نیست"

یہان خان آرزو کے دو اعتراض ہین، ایک لفظی دوسرا معنوی جب وہ یہ تسلیم کرتے ہین کہ "خضر برداشتن" بہ منزلہ "رفیق برداشتن" ہے، اور زبان کے اعتبار سے اسمین کوئی نقص نہین تو اب انکا یہ اعتراض ہوتا ہے کہ لفظ خضر کے ساتھ ہی "بردار" بھی ہونا چاہئے، تھا خضر اور "بردار" کے درمیان مین دو ایک لفظ کا حائل ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ محاورہ زبان کے خلاف ہے، اسکا جواب یہ ہے کہ اگر یہ نقص ہے جیسا کہ علمائے بلاغت و معانی نے لکھا ہے، تو صرف حزین ہی اسکے مجرم نہین بلکہ شیخ سعدی بھی اسکے مجرم ہین، بوستان کا پہلا شعر ہے،

بنام جہان دار جان آفرین حکیم سخن بر زبان آفرین

یقیناً "سخن آفرین" ساتھ ہونا چاہئے، ورنہ ضعف التالیف کا الزام عاید ہوتا ہے، مگر جب سعدی جیسے باکمال نے اسے منظور کر لیا تو حزین کے سر یہ عیب نہین معلوم ہوتا،

خان صاحب موصوف کی دوسری جگہ معنی سے متعلق ہے، افسوس انہوننے بے محابا یہ تو لکھ دیا کہ "خضر بحکم رفیق نیست" رفیق خود خضر کا متبوع ہے لہذا "خضر بردار" کا فقرہ متبوع کو بولنا جائز نہین، اگر خان موصوف کا یہ منطقی استنتاج کسی مغالطہ کا منت کش نہین تو نعوذ باللہ یہی اعتراض قرآن مجید کے سر وارد ہوتا ہے

الم تر الی الملا من بنی اسرائیل من بعد موسی اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکا الخ

یقیناً بنی اسرائیل متبوع تھے، اور انکا بادشاہ انکا محکوم نہین ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی بنی اسرائیل "ملک بردارد" کا فقرہ بول رہے ہین، کہا جا سکتا ہے کہ نبی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ اٹھا اور حزین کے شعر سے خود ہی "خضر برداشتن" کا معنی پیدا ہوتا ہے، لیکن کہونگا کہ ایسا نہین یہان "ہمت سرمستان" کی قید لگی ہوئی ہے خان آرزو نے غالباً "ہمت سرمستان" کا پایہ نہین سمجھا "خضر برداشتن" کے لئے ایک درمیانی کڑی موجود ہے جس طرح بنی اسرائیل کے "العبث لنا ملکا" کے لئے "لنبی" کی درمیانی کڑی ہے، لہذا اس آیت سے خان آرزو کے اس خیال کا رد ہو جاتا ہے کہ

"خضر در حکم رفیق نیست یعنی استعمال این لفظ (خضر بردار) درحق متبوع جائز نیست"

ایک اور شک یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کے انتخاب کیلئے کسی ذاتی شخصیت کی تعیین نہین ہوتی اور خضر ایک متعین ہستی ہے لیکن مین کہونگا کہ یہان خضر مجازی کی تلاش ہے، کہ صحرائے محبت مین رفاقت کا کام انجام دے ظاہر ہے کہ خضر حقیقی کو گستاخانہ وادی محبت مین رہنمائی کی تکلیف نہین دی جاسکتی،

حزین:- مانع نمی شود کف بے مایہ سیل را دامن حریف گریۂ بے اختیار نیست

آرزو:- دامن را با کف بے مایہ نسبتے نیست معہذا نفی در کلام بلغا تابع اثبات است اگر دامن را مداخلت در منع گریہ می بود نفی آن صحت می داشت چہ دامن پاک کنندۂ اشک است نہ مانع گریہ،

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ کف بے مایہ سے تو سیلاب اشک ریزی رکتا نہین، لیکن دامن بھی اس سیلاب کو جذب نہین کر سکتا ظاہر ہے کہ جب انسان روتا ہے، تو پہلے کف دست اور انگلیان بار بار آنکھون پر پھیری جاتی ہین جذبہ وافر ہے تو قطرات اشک ہاتھ سے گزر کر دامن پر چھلکنے لگتے ہین، اور دامن تر ہو جاتا ہے، لیکن حزین کہتے ہین کہ میرا گریہ صرف یہی نہین کہ کف بے مایہ سے نہین رکتا بلکہ دامن بھی قطرات اشک کو جذب کرنیکی صلاحیت رکھنے کے باوجود میرے "گریہ بے اختیار" کا حریف نہین، یعنی دامن سے بھی سیلاب اشک گزرنے لگتا ہے خان آرزو کا اعتراض یہ ہے کہ دامن اشک کو پاک کرتا ہے، گریہ کو روکنا اسکا کام نہین، مگر اسکا جواب یہ ہے کہ "گریہ بے اختیار" مین ہوتا کیا ہے، کیا گریہ کرتے کرتے انسان کی ہچکیان بندھ جائین اور ایک قطرہ بھی آنسو نہ نکلے، اگر ایسا ہوتا ہے تو کہہ سکتے تھے، کہ دامن کو حریف گریہ کہنا غلط ہے، لیکن جب یہ ہے کہ گریہ نام ہے سیلاب اشک ریزی کا تو پھر اعتراض ہی کیا ہے، غالب مرحوم نے بھی اس معنی مین ایک شعر کہا ہے:

مصرعہ- حریف جوشش دریا نہین خود داری ساحل

خان آرزو کے اصول کے مطابق تو اسپر بھی جرح ہو سکتی ہے، چونکہ ساحل کو تو موج سے دوچار ہونا پڑتا ہے، "جوشش دریا" کا مقابلہ کیسا لیکن جب جوشش دریا اور موج خیزی لازم و ملزوم شے ہین تو پھر کوئی جرح نہین،

ہرچند خان آرزو کی بعض جرحین اپنی جگہ پر صحیح ہین لیکن اکثر ایسی ہی ہین کہ خود ان پر اعتراض عاید ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وارستہ مل سیالکوٹی نے ----- رجم الشیاطین کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور خان آرزو کے اعتراضات کی بے سروپائی دکھائی، میر محمد عظیم ثبات کے جو اعتراضات والہ داغستانی نے ریاض الشعراء مین لکھے ہین، وہ ٹھیک وہی پہلو رکھتے ہین جسکا نقشہ آج بیسوین صدی مین "غالب بے نقاب" کی رزم آرائیون مین جھلک رہا ہے، اور مین اس مسئلہ پر اصولی حیثیت سے "غالب بے نقاب کے حجابات" (مطبوعہ نگار بابت اکتوبر ۱۹۲۸ء) کے زیر عنوان بحث کر چکا ہون،

شیخ کے تلامذہ اور قدرشناس | پچھلے اوراق مین قیاسی طور پر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شیخ کے قیام (دائمی)

ہند کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ارباب جدل اور مخالفین کی تعداد کے باوجود ان کے قدر شناسون کی ایک جماعت ہوگی جسکے اثر محبت نے آپکو محبوس کنشت رکھا، اور تذکرون سے یہ بات ثابت ہوگئی، عمدۃ الملک امیر خان کے الطاف، بادشاہ کے وظایف، شیر افگن خان کی عقیدت[1]، آزاد بلگرامی کے جذبات[2] شیخ آیت اللہ ثنا جیسے بلند پایہ شاعر کا تلمذ[3] یہ باتین ایسی نہ تھین جو شیخ کو گرویدہ نہ بنالیتین

عبد المالک آروی

---

[1] مجمع النفایس - [2] ید بیضا [3] عقد ثریا ۱۲

مصوّر کا ناتمام شاہکار

(ایک افسانہ)

(۱)

نواب جمشید یار کی کوٹھی عین دریائے جمن کے کنارے تھی۔ ایک طرف تاج اور دوسری طرف جمنا کی چادر سیمین آنکھ کی فرحت اور دل کی سرور کے لئے کافی سامان بہم پہنچاتے تھے نواب صاحب نے اس قطعہ کو صرف اسی نظارہ سے لطف اندوز ہونے کیلئے خریدا تھا۔ مین جس کمرہ مین ٹھہرایا گیا تھا وہ وسعت کے لحاظ سے گو مختصر تھا مگر میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھا۔

نواب صاحب کے ملازم نے بتایا تھا کہ یہ کمرہ خود نواب صاحب کی پرائیوٹ نشستگاہ کا کام دیتا تھا اسوجہ سے اسے نسبت دیگر کمرون کے زیادہ سجایا گیا تھا۔ عمدہ فرنیچر قیمتی ساز و سامان اور دلکش آرائشی تصاویر سے کمرہ کی تزئین کی گئی تھی۔

کمرہ کے ارد گرد کھلی الماریان رکھی ہوئی تھین جن مین بیش قیمت کتابین، قلمی دستاویزات و مکاتیب، رسالون اور اخبارون کے فایل قرینے سے سلسلہ وار رکھے ہوے تھے۔ ہر الماری کے تختہ پر اسکی فہرست چسپان تھی چنانچہ مجھے یہ معلوم کرنے مین مطلق وقت نہ ہوئی کہ نواب صاحب کی تاریخی کتابین کس الماری مین رہتی تھین اور اسکی فہرست کن کن کتابون پر مشتمل تھی۔

نواب صاحب اپنے داماد شہریار بہادر کے ہمراہ شکار پر گئے ہوئے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ مین ان کے دولت کدہ پر انکی عدم موجودگی مین حاضر ہوا تھا لیکن ان کے خوش خلق ملازم جانتے تھے کہ مین ان کا عزیز ترین دوست ہون اس لئے کوٹھی مین میری آمد کی خبر فوراً پھیل گئی اور ہر ایک نے مجھے گرمجوشی سے بیبیک کہا پھر نہایت پر تکلف کھانے کے بعد مجھے باعزاز اس کمرہ مین پہنچا دیا گیا جہان کا مین نے ابھی ذکر کیا ہے۔

رات ہو چلی تھی مگر نہ معلوم دس بجے جانے کے بعد بھی مجھے کیون نیند نہ آئی اس وجہ سے ارادہ کیا کہ بجائے پلنگ پر لیٹے لیٹے وقت ضائع کرنے کے کچھ دیر مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ غنودگی پیدا ہو جائے اس خیال سے پلنگ پر سے اٹھا اور تاریخ کی الماری کے قریب پہنچکر ایک کتاب منتخب کی اور واپس آکر پڑھنا شروع کر دیا

ہندوستان مین سلطنت مغلیہ کا زوال میرے لئے ایک دلچسپ موضوع کا باعث ہوئی اور مین اس کے متعدد صفحات پڑھکر بیحد مسرور ہوا۔ میری عادت ہے کہ دوران مطالعہ مین ہر پیرگراف کے بعد نظر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہون تاکہ نگاہ کو آرام ملے حسب عادت مین اس عمل کو کئی بار کر چکا تھا کہ ایکدفعہ میری نظر کتاب پر سے ہٹکر ایک بیضوی تصویر پر پڑی جو میرے پلنگ کے عین مقابل دیوار کے وسط مین لٹک رہی تھی اور جسے اس وقت تک مین نے

نہ دیکھا تھا

---

(۲)

سبز جھالر کے برقی فانوس سے ہلکی ہلکی روشنی صرف میری کتاب پر پڑ رہی تھی اور کمرہ کا وہ حصّہ جس میں تصویر (۹) رکھی تھی گو کامل تاریکی میں تو نہ تھا مگر پھر بھی جھالر میں سے چھن چھن کر کچھ روشنی اس پر پڑ رہی تھی جونہی میری نظر تصویر پر جا کر ٹھیری میں نے ہاتھ سے کتاب رکھدی اور غور سے تصویر دیکھنے لگا تصویر ایک نوجوان حسین لڑکی کی تھی۔

تصویر کینوس (Canvas) پر بنی ہوئی تھی۔ صاحب تصویر کا چہرۂ گردن، شانہ اور نصف سینہ دکھایا گیا تھا۔ بازو اور لمبے لمبے بال تاریک "فضائے بعید" (Background) میں غیر محسوس طریقہ سے جذب کر دئے گئے تھے اور یہی وہ صنعت تھی جو تصویر کو جالب توجہ بنا دیتی تھی۔ تصویر کا فریم بیضوی تھا اور نہایت قیمتی مطلا نقش و نگار سے مزین۔

مصوّری میں معمولی شُد بُد کے سوا مجھے اور کچھ لگاؤ نہ تھا مگر اس تصویر کی ظاہری کشش اور رنگوں کی آمیزش آنکھوں میں کچھ اس طرح کھبی جا رہی تھی کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے قریب سے جا کر دیکھوں۔

چنانچہ میں پلنگ پر سے اُٹھا اور تصویر کے پاس گیا۔ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنا شروع کیا آنکھوں میں خمار بادہ کی سی مستی، رخساروں پر شہاب کی سی سرخی ایسی خصوصیات تھیں کہ جنھوں نے مجھے تھوڑی دیر کیلئے مبہوت بنا دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس تصویر میں کیا دلکشی تھی جو اسقدر جالب توجہ واقع ہوئی تھی۔ میں نے بہت سے باکمال مصوّروں کے نقوش دیکھے تھے مُغل، بنگال اور پہاڑی اسکول کے بہت سے بے نظیر نمونے میرے البموں میں موجود تھے اور گو خود کبھی تصویر کشی نہ کی تھی مگر اوّل عمر سے تصویر اور نقاشی کا مداح تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ فن سے ناواقف ہونے کے باوجود بھی ہر اس تصویر کو اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا جو مجھے اچھی معلوم ہوتی تھی میں کسی خاص اصول یا قاعدہ کا پابند نہ تھا بلکہ صرف جاذب نظر تصویر میرا عام معیار تھا یہی وجہ تھی کہ میرے پاس کئی تصویریں ایسی تھیں جنھیں ماہرین قطعی معمولی بتاتے تھے مگر میں نے صرف اس وجہ سے رکھ چھوڑا تھا کہ وہ مجھے "اچھی معلوم ہوتی تھیں"

لیکن ایسی تصویر کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس تصویر میں کیا خوبی تھی ——————

—————— کہ اسقدر مسحور کر رہی تھی۔ بہت دیر غور و تعمق کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تصویر کی حقیقی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ بالکل جاندار معلوم ہو رہی تھی تصویر نے مجھے پہلے بہت مسرور کیا پھر حیرت ہوئی اور تھوڑی دیر تک یہ حالت قایم رہنے کے بعد میرے مُنہ سے "واہ" نکلا اور سٹول پر سے اتر پڑا۔

---

(۳)

میں نے الماری کے قریب جا کر اس جلد کو تلاش کرنا شروع کیا جس میں تصاویر اور نقوش کے متعلق تفصیلی حالات درج تھے

بہت جستجو کے بعد مجھے ایک رجسٹر مل گیا جس مین نواب صاحب کی تمام تصاویر کے متعلق حالات لکھے ہوئے تھے

اس رجسٹر کی ورق گردانی کرنے کے بعد مجھے وہ جگہ مل گئی جسے مین تلاش کر رہا تھا۔ یعنی بنگال سکول کے مصورون کے نقوش کے حالات ایک علیحدہ ضمیمہ کی صورت مین مل گئے مین نے تصویر دیکھتے ہی یہ رائے قایم کر لی تھی کہ یہ کسی بنگالی مصوّر کے موقلم کا نتیجہ تھی۔

ردیف وار فہرست پڑھنے سے معلوم ہوا کہ، انبر کی تصویر کسی قدیم بنگالی مصوّر آتوش چندر اسرکار کی بنائی ہوئی تھی اور فہرست مین اسے "مصوّر کا ناتمام شاہکار" کا عنوان دیا گیا تھا۔

عنوان کے نیچے تصویر کے جو حالات لکھے ہوئے تھے انھیں یہان درج کیا جاتا ہے:۔

---

(۴)

صاحب تصویر بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤن کی لڑکی تھی اسکا گاؤن گنگا کے کنارے واقع تھا اور ارد گرد کے دیہات مین اس لڑکی کے حسن کا چرچہ ہونے لگا کیونکہ وہ بہت ہی حسین تھی۔ لڑکی یتیم تھی اور ایک اندھی مان کے سوا اسکا کوئی سرپرست نہ تھا"

"نوجوان مصوّر اس گاؤن مین آیا اور لڑکی کو دیکھکر فریفتہ ہوگیا۔ ایکدن وہ گنگا کے کنارے بیٹھا ہوا کشتیون کا نقش بنا رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے پاس سے گزری اور اس خوبصورت جوان کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔"

غرض کیا ہی منحوس ساعت تھی کہ مصوّر اور لڑکی کی شادی ہوگئی۔ لڑکی جو حسین ترین مخلوق تھی مصوّر کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگی وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی جس سے نوجوان مصوّر کے دل پر بجلیان گرتی تھین۔ لڑکی مصوّر کو دل و جان سے چاہتی تھی مگر اس کا پیشہ، موقلم، رنگون کی پیالیان اور ٹکیان اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھین۔ اسے آرٹ سے نفرت تھی کیونکہ وہ خود ایک تصویر تھی۔۔۔۔۔۔"

"مصوّر سارا وقت تصویر کشی اور رنگ گھولنے مین گزار دیتا تھا مگر لڑکی کو اس مین دلچسپی نہ ہونے کے باعث سخت اذیت ہوتی تھی"

"مصوّر کو لڑکی کی مسکراہٹ دل و جان سے بھاتی تھی وہ طرح طرح کی مضحکہ خیز تصویرین بنا کر لڑکی کو دکھاتا تھا جنھین دیکھکر وہ مسکرا دیتی تھی۔۔۔۔۔ اور مصوّر باغ باغ ہوجاتا تھا یون ان کی محبت روز بروز مضبوط ہو رہی تھی"

"ایک دن مصوّر کو خیال آیا کہ لڑکی کی تصویر بنائے اور اسے اس طرح بنائے کہ اسکا شاہکار سمجھا جائے، اپنی پوری صنعت صرف کردے اور کسی طریق سے اس تصویر مین بھی اصل کی بات پیدا کردے۔۔۔۔۔ مگر سب سے بڑھکر لڑکی کی مسکراہٹ!"

"لڑکی نے جب یہ سُنا کہ مصوّر اپنی دلھن کا بھی نقش اتارنے پر آمادہ ہوگیا ہے تو اسے سخت روحانی تکلیف ہوئی

اور اس کا دل بیٹھنے لگا کیونکہ اسے آرٹ سے نفرت تھی مگر چونکہ فطرتاً نرم مزاج اور مطیع تھی اسوجہ سے اپنے خاوند کے حکم کی تعمیل کے لئے آمادہ ہوگئی"

"لڑکی مصوّر کے سامنے ہفتوں بیٹھکر تصویر کھنچواتی رہی۔ مصوّر کو اس تصویر کے بنانے مین وہ لطف محسوس ہوا جو بیان سے باہر ہے اس نے اپنے موقلم کی تمام شوخیان دہیا کیان اپنی دلھن کو مصوّر کرنے مین صرف کردین اسکا شوق وولولہ دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا تھا جس وقت وہ لڑکی کو سامنے ٹھاکر اور اپنے کینوس پر گردن جھکا کر موقلم کو جنبش دیتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک غیرفانی دنیا" مین پہنچ گیا ہے"

"لڑکی جسے آرٹ سے نفرت تھی اس جبریہ حاضری اور مسلسل نشست کو برداشت نہ کرسکی اور کنول کی طرح مرجھانے لگی۔ اسکی صحت مین فرق آگیا چہرہ کی روشنی معدوم ہوگئی۔ رخساروں کی سرخی زردی مایل ہونی شروع ہوگئی۔ مگر وہ نہ صرف اپنے خاوند کا حکم ماننا چاہتی تھی بلکہ ——— اسے مسلسل ٹکٹی باندھے دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی"

"وہ مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرکے خوش نظر آنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ ہوسکتا تھا اسکا دل بیٹھا جارہا تھا مگر اپنے مصوّر کے شاہکار کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجسمہ بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تصویر اب ختم ہونے کو تھی اور مصوّر خوش ہوتا تھا کہ اگر کبھی (خدانخواستہ) لڑکی مرگئی تو وہ تصویر اسکے لئے ایک اچھی یادگار ثابت ہوگی۔ اب تصویر کا چہرہ، سینہ اور کندھے بن چکے تھے اور بال بنانے کے لئے صرف ایک ہفتہ کی ضرورت تھی مگر لڑکی کی صحت اب اور بھی خراب ہوگئی تھی"

"مصوّر اپنے ذوق مین اسقدر منہمک تھا کہ بہت کم نظر اٹھا کر دیکھتا تھا۔ جب تصویر ختم ہونے کو آئی یعنی آنکھ اور لبون پر صرف دو تین برشون کی اور کسر رہگئی تو لڑکی کی صحت اس طرح مضمحل ہوگئی جس طرح شمع ٹمٹماتی ہے اور بجھتے بجھتے رہجاتی ہے"

دن ہفتے، اور مہینے گزر گئے، لڑکی کے رخساروں کا رنگ تصویر مین بالکل اتر آیا تھا، آنکھوں کی چمک بھی پیدا ہوگئی تھی مگر مصوّر جس ذہن مین تھا وہ یہ ظاہری اوصاف نہ تھے بلکہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنی تصویر مین لڑکی کی مسکراہٹ کو ابدی طور پر منتقل کرے تاکہ وہ جس وقت تصویر کو دیکھے لڑکی کو اپنی طرف مسکراتا ہوا پائے ——— اور یہی وہ مسکراہٹ تھی جس نے اسکے دل کو موہ لیا تھا!"

تصویر ختم ہوگئی تھی مگر صرف لبوں پر ایک برش کے ذریعہ مسکراہٹ پیدا کرنی اور باقی تھی اسوجہ سے اس نے برش بورڈ پر رکھا، پیالیان ایک طرف علٰحدہ کین اور کرسی پر سے کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی اور دزدیدہ نگاہوں سے تصویر کی جانب دیکھا ——— آہ! کسقدر خوبصورت رنگ تھے، کیسی عمدہ شبیہ اتری تھی، معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی اب منہ سے بول اٹھیگی لیکن صرف ایک کسر باقی رہگئی تھی یعنی تصویر مین اسکی طبعی مسکراہٹ نہ دکھائی گئی تھی اور یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہ تھا صرف ایک، برش کی حاجت تھی"

"مصوّر نے تصویر کی خوبیون کو سراہا اور بے اختیار ہو کر بولا!! خوب! تصویر نہین بذات خود زندگی ہے!"

"مصوّر نے اپنی محبوبہ کی طرف نظر اُٹھائی ——————" "لڑکی کے لبوں پر گو اب بھی مسکراہٹ تھی مگر وہ بالکل بےحس و حرکت بیٹھی تھی۔ مصوّر چاہتا تھا کہ اس مسکراہٹ کو تصویر مین پیدا کردے مگر خیال آنے کی دیر تھی کہ یکایک لڑکی کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکلی اور وہ ہمیشہ کے لئے اس مسکراہٹ کو لیکر رخصت ہو گئی!"

---

(۵)

"لوگ کہتے ہین کہ مصوّر نے اپنی محبوبہ کی طرف پلٹ کر دیکھا مگر اس وقت اپنی دلھن کو آرٹ پر قربان ہوتے ہوئے دیکھکر اسے اتنا دکھ نہ ہوا جتنا اس خیال سے کہ اسکا شاہکار ابھی ناتمام تھا ——————— اور وہ مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی تھی"

"مصوّر اپنی تصویر مین مسکراہٹ پیدا نہ کرسکا تھا اس لئے اسنے اپنی ساری عمر کی کمائی کو اس طرح ضایع ہوتے ہوئے دیکھکر اپنا موقلم پھینک دیا، پیالیان الٹ دین اور آرٹ سے ہمیشہ کے لئے دست کشی کرکے ایک چیخ ماری اور اپنی محبوبہ کی روح سے جاملا"

"انمبر کی یہ تصویر اسی مصوّر کا "ناتمام شاہکار" تھا جسے نواب جمشید یار نے اپنے عمدہ مجموعہ مین سب سے زیادہ نمایان جگہ دی تھی اور جسکے حالات پڑھکر مین بیحد متاثر ہوا تھا۔

ظفر قریشی دہلوی

کیا مسلمانون کے تمام عقاید واقعی اسلامی ہین؟

اس سے قبل ہم ایک مضمون مین بتا چکے ہین کہ اسلام کو قومی مذہب بنانے مین کتنے نقصان ہین۔ اور یہ بھی دکھلا چکے ہین کہ مسلمانان ہند کی جماعت کسی معنی مین "قوم" نہین ہے بلکہ ایک مذہبی جماعت ہے۔ ہم نے یہ بھی دکھلایا ہے کہ اس غلط خیال کی وجہ سے مسلمانون کی تنظیم جماعت مین سخت ابتری پھیل رہی ہے۔

اس مضمون مین ہم صرف مذہبی نقطۂ خیال سے اس مسئلے پر بحث کرینگے کہ مسلمانون کے عام عقاید و اعمال مین کسقدر در اصل اسلام ہے اور کسقدر سیاست و معاشرت ملکی۔

ایک مسلمان کا بچہ جب پانچ یا چھ برس کی عمر کو پہونچتا ہے تو والدین کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے دینی تعلیم حاصل کرے محلہ کے میانجی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ جو اسکو بغدادی قاعدہ شروع کراتے ہین۔ اور اسکے بعد قرآن کا سارا متن دو تین سال کے اندر پڑھاتے ہین۔ یہ گویا اولین مذہبی تعلیم ہے جو مسلمان کے بچون کو دیجاتی ہے۔ ہندو کا بچہ اتنے ہی زمانہ مین مدرسہ مین داخل ہو کر واقعی علم حاصل کرتا ہے۔ لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھتا ہے۔ اور مدارس ثانوی کے قابل ہو جاتا ہے۔ بدقسمت مسلمان کا بچہ قرآن کے ختم کرنے پر بھی چھوڑا نہین جاتا۔ اگر گلستان بوستان کی نوبت نہ آئے تو بھی دو تین سال تک اور اسکو غیر مانوس علم و زبان مین درس حاصل کرنے پڑتے ہین۔ اگر وہ اسکول مین بھی داخل ہوا تو اسکولون اور کالجون کے نتیجے برملا کہہ رہے ہین کہ تعلیمی تگ و پو مین مسلمان کا بچہ ہمیشہ پیچھے رہا کرتا ہے۔ یہ بہت ہی شاذ بات ہے کہ مسلمان کسی امتحان مقابلہ مین کامیاب ہو جائے یا مدارس کی معلمین کی کرسیون کا زینت ہو لیکن اگر آج کوئی مسلمان اپنی زبان سے یہ نکال دے کہ اس طریق تعلیم سے کیا حاصل ہوا اور کیون وقت ضائع کیا گیا تو مولوی ہاتھ مل کر کے رہجائینگے کہ افسوس آج اس مرتد کو سنگسار کرنے کا موقع حاصل نہین ہے۔ لیکن آؤ ذرا ہم اسلام کے متعلق جانچ کرین کہ کیا واقعی یہ اسلام حقیقت مین وہی اسلام ہے جسکا حکم قرآن مین ہے۔

مین پوچھتا ہون کہ دنیا مین اسلام کی کیا ضرورت تھی جبکہ پہلے یہود مذہب مین ہماری شریعت کی وہ ساری باتین (کیا اعمال کیا اعتقاد) موجود تھین یہود کا مذہب کیون منسوخ اور نامقبول قرار پایا اور اسکی جگہ کیون اسلام قائم ہوا۔ کون یہودی ایسا ہے جو خدائے وحدہ لاشریک کا قائل نہین یا انبیائے مرسلین کا۔ اگر کوئی مولوی موجودہ اسلامیت اور یہودیت مین فرق دکھلا دے تو مین بیشک قایل ہو سکتا ہون۔ ملاحظہ فرمائے

یہودیون کے ہان	اسلام مین
۱- قربانی ایک فعل محمود اور پسندیدہ خدا ہے	ایضاً
۲- خدا کے ہاتھ پیر ہین اور بالکلیہ مجسم انسان ہے	ایضاً (عقائد حنابلہ و اہل حدیث دیکھو)

یہود	اسلام
۳۔ آدمی ایک خاص قسم کے جانور کا گوشت کھانے سے ناپاک اور بدمذہب ہوجاتا ہے۔	ایضاً [۵]
۴۔ عبادت مین کوئی خاص حرکت نہ کرنے سے عبادت باطل و نامقبول ہے	ایضاً
۵۔ غیر یہود سے سود لینا جائز اونکے مال کو خورد برد کرنا اور انکی عورتون سے مباشرت کرنا جائز ہے۔	ایضاً [۶] (دیکھو فتاوی مولوی احمد رضا خان بریلوی)
۶۔ صحف آسمانی کا بغیر طہارت چھونا اور اسکا ترجمہ پڑھنا حرام	ایضاً
۷۔ ساحرہ زانیہ اور مرتد کو سنگسار کرنا۔	ایضاً
۸۔ غلامی کا جواز و استحسان	ایضاً [۷] (دیکھو کتاب تقویۃ الایمان)
۹۔ مذہبی اعتقاد کا یہود قوم سے مخصوص ہونا	ایضاً
۱۰۔ طہارت۔ زکوٰۃ۔ روزے کی باریک عملی تدابیر و ذبیحہ مین مخصوص قواعد کی پیروی	ایضاً
۱۱۔ ختنہ۔	ایضاً مع عقیقہ
۱۲۔ طلاق کی آسانی	ایضاً
۱۳۔ توریت کے احکام منسوخ ہوئے ہین	ایضاً [۸] قرآن کے احکام منسوخ (دیکھو اتقان سیوطی)
۱۴۔ احکام توریت کے علاوہ انھون نے بہت سے امور کو ناجائز قرار دیا ہے۔	قرآن کے علاوہ علماء نے بہت سے امور کو ناجائز قرار دیا مثلاً موسیقی، فنون لطیفہ، سونا چاندی کا استعمال کرنا
۱۵۔ مشنا کی اشاعت بجائے توریت	اشاعت سنن بجائے قرآن
۱۶۔ مذہب کو اسپرٹ سے کوئی واسطہ نہین لفظی پیروی ضروری ہے اسلئے ہوسکتا ہے کہ بعض شرعی اوامر مین لفظی تاویل کرلیجائے اور جواز کی صورت نکال دیجائے۔	[۹] ایضاً
۱۷۔ یہود کی قوم کے علاوہ اشاعت مذہب ممنوع۔	دارالحرب مین سلام کا بجانا حرام

پچھلے دنون مجھے ایک جید عالم سے خط وکتابت کا شرف ملا۔ بعض مسائل کے اختلاف پر مین نے اُنکی رائے پوچھی اور اس سلسلے مین مین نے انھین یاد دلایا کہ ہم مسلمانون نے درحقیقت اسوقت اپنے کو تخذوا من دون الله اربابا کا پورا پورا مصداق کرلیا ہے اور ہماری ساری خرابیون کا راز اس ہی مین ہے۔ اُنکا جواب سننے کے قابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

[۵] حنابلہ درحقیقت اہل حدیث ہین اور مسند امام حنبل کی تدوین کرنے سے انکی کوئی مقصد نہ تھا کہ تمام احادیث کو یکجا کرکے ہر مسلمانون کو عمل کی دعوت دیجائے

"عنایت نامہ ملا۔ میری عادت بحث و مناظرہ کی نہین ہے البتہ آپ نے ازراہ کرم ایک آیت کے متعلق استفسار فرمایا اور مین نے اسکا جواب نہ دینا بد اخلاقی خیال کیا۔ لیکن اس موقع پر یہ بحث نہ تھی کہ اہل قرآن اور اہل حدیث مین کس کا راستہ صحیح اور کس کا غلط ہے۔ اس لئے آپکے یہ الفاظ کہ "ہم اور آپ دو راستے پر ہین ہمارا قول یہ ہے کہ قرآن غیر ذی عوج لعلکم تعقلون" ہمارے لئے کافی ہے۔ اور آپ کہتے ہین تتخذوا من اربابا من دون الله (سیوطی و بیضاوی و ابوحنیفہ و طاوس و ضحاک وغیرہ) کے بغیر چارہ نہین اور زمانہ بتائیگا کہ کون صحیح راستے پر ہے یا عقل و تمدن کسکا ساتھ دے رہے ہین" جو کسی قدر مناظرانہ شان لئے ہوئے ہین بے محل ہین۔ میرے خط سے تقریباً و اشارۃً یہ بھی نہین ظاہر ہو سکتا کہ مین آپکو ناواقف خیال کرتا ہون اسلئے آپ کے یہ الفاظ کہ مین اس مسئلے مین اسقدر ناواقف نہین ہون جیسا آپ خیال کر رہے ہین بالکل بے موقع ہے۔

"آپکے استفسار کے ساتھ ہی میرے دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ آیت ہمین مدنی تو نہین اور چونکہ اصولاً یہ معلوم تھا کہ آیتون مین بعض مدنی آیتین شامل ہین۔ اسلئے اس خیال کو اور تقویت ہوئی۔ تاہم مین مسائل مین اپنی ذاتی رائے کو کافی نہین سمجھتا بلکہ اور لوگون کے اقوال سے اسکی تائید کرتا ہون۔ اسلئے مین نے تفسیرین دیکھین تو بیضاوی جلد دوم مطبوعہ مطبع احمدی صفحہ ۱۰ تفسیر سورہ روم مین جہان آیت زیر بحث کی تفسیر کی ہے یہ عبارت نظر آئی۔

عن ابن عباس ان الاية جامعة للصلوات الخمس و لذالك زعم الحسن انها مدينة لانه كان يقول كان الواجب بمكة ركعتين فى اى وقت انقضت و انما فرضت الخمس بالمدينة

اس آیت کی تفسیر مین کشاف نے بھی یہی لکھا ہے (بیضاوی تو خود کشاف کا خلاصہ ہے) اور آپ اپنے بیضاوی کے نسخے مین بھی اس آیت کی تفسیر مین اس قول کو ملاحظہ فرما سکتے ہین (افسوس کہ میرے پاس جو قرآن شریف مطبوعہ ہے اور اسکے حاشیہ پر تفسیر بیضاوی ہے۔ اس مین یہ موجود نہین۔ ممکن ہے حذف کر دیا گیا ہو) اگرچہ انہون نے مدنی ہونے کی جو وجہ لکھی ہے وہ صحیح نہین ہے (یا للعجب، ابن عباس کا قول اور صحیح نہین، نعوذ باللہ، نعوذ باللہ۔ اس سے زیادہ مستند تفسیر اور کہان ملیگی۔ س۔م۔ا) - - - - - - -

آیت زیر بحث نازل تو ہوئی معراج سے پہلے لیکن اسپر عمل بعد کو ہوا - - - - - - - - - -"

"آپکی توجہ دلانے پر مین نے فرقہ اہل قرآن کی تاریخ پر غور کرنا شروع کیا (فرقہ اہل قرآن کے معنی میری سمجھ مین نہین آئے) تو حسب ذیل سوالات پیدا ہوئے۔

(۱) یہ فرقہ کس زمانے مین پیدا ہوا اور کب تک قائم رہا۔

(۲) اس نے احادیث کا انکار کن وجوہ سے کیا

(۳) اس فرقہ کا مجموعۂ احکام یا مجموعۂ فقہ کیا ہے۔

ان سوالات کو پیش نظر رکھ کر مین نے کتابین دیکھنا شروع کین تو امام شافعی کی کتاب الام سے معلوم ہوا کہ انکے زمانے مین اس قسم کا ایک فرقہ تھا۔ لیکن بعد کو اسکا پتہ نہین چلتا۔ ابن قتیبہ کی کتاب مختلف الحدیث سے انکار حدیث کے چند اسباب بھی

معلوم ہوئے۔ لیکن اسکے مجموعہ احکام ومجموعہ فقہ کا پتہ نہین چلتا (غالباً مہدی آخر الزمان قرآن کو سمیٹ کر غار سامرا مین بیٹھ چکے تھے) امام شافعی نے کتاب الام مین اس فرقے کے ایک شخص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس بارے مین کچھ لوگون نے دو مذہب اختیار کئے۔ ایک فریق حدیث کو نہین مانتا اور خود قرآن اس کے نزدیک کافی ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص نماز وزکوٰۃ اس حد تک ادا کردے جس پر نماز وزکوٰۃ کا لفظ بولا جا سکتا ہے تو اسنے اپنا فرض ادا کردیا۔ اسکے لئے کوئی وقت نہین ہے اگرچہ وہ روزانہ صرف دو ہی رکعتین پڑھا کرے اور جس معاملے مین قرآن کی کوئی ہدایت نہین ہے وہ فرض نہین ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ جس معاملے مین قرآن کا حکم موجود ہے اوس مین حدیث قبول کرلی جائیگی، اسلئے جس معاملے مین قرآن کا حکم نہین ہے اسکا قول بھی پہلے فرقے کے موافق ہے، اور نتیجہ بھی تقریباً دونون کا ایک ہی ہے"۔ اس بنا پر اس فرقے کا بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے احکام کا مجموعہ مرتب کرے تاکہ اس پر بحث کیجائے۔ لیکن جہان تک مین سمجھتا ہون اب تک صرف رد وقدح ہوتا رہا ہے۔ خود اس فرقہ نے اپنی ہستی کو بحیثیت ایک بانی فقہ جدید کے نمایان نہین کیا" وغیرہ

یہ عالم دیوبندی نہین بریلوی نہین فرنگی محلی نہین کہ انکی بات کو گوزشتر سمجھا جائے یا اسپر مضحکہ کیا جائے بلکہ علامہ شبلی کے شاگرد رشید اور ندوۃ العلماء کے "سراجاً منیرا"۔ مگر ذرا دیکھو تو کیسی خدا لگتی بات کہی ہے کہ فرقہ اہل قرآن کا مجموعہ احکام و فقہ کہان ہے۔ سبحان اللہ اسپر بھی اگر کوئی یہ کہدے کہ مولانا آخر قرآن کیا چیز ہے۔ تو بتائیے کہ وہ مردود ہوا یا نہین۔

توخیر مجھے آپ فرقہ اہل قرآن ہی سمجھ کر اصول اہل قرآن سن لیجئے۔

سب سے بڑا اصول اہل قرآن کا یہ ہے کہ قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے۔ نہ یہ مابعد الطبیعۃ کا فلسفہ ہے۔ نہ ریاضی کی کتاب کہ اسکے لئے تحقیق کیجائے۔ انسان جسکو خدانے دو آنکھین اور دو کان اور ایک صحیح دماغ دیا ہے۔ وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا ایک علامۃ اللوزعی۔ قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہئے۔ نہ اس مین کسی تاویل کی ضرورت ہے اور نہ کسی تفسیر کی اور قرآن کا سب سے عظیم الشان ریفارم یہ تھا کہ خدائی مذہب کسی خاص فرقہ یا قوم کی جائداد نہین ہے۔ عملی مذہب مین کسی خاص نسک (RITUALISM) کی خدا کو پروا نہین اور نہ کسی پر بہت کی۔ اگر ہو سکے اور تم کو یقین ہو کہ تمھاری نماز وہی ہے جو رسول اللہ نے ادا کی تو پڑھو اور ضرور پڑھو۔ لیکن اگر خدا کی عبادت کسی اور طریقہ سے کرسکتے ہو تو وہی قرآن کا منشاء ہے عبادت کے لئے اوقات کی تعیین وہی کی گئی ہے جسوقت فطرتاً انسان کو اپنے معبود کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یعنی قبل طلوع قبل غروب اور عشا۔ زکوٰۃ برابر اور متواتر دیتے رہو اور جتنی ہوسکے۔ رمضان کے روزے جس مین بہت سی مصلحتین ہین ایام معدودات یعنی ہاسے ۳۰ تک مین رکھو۔ اور نہ رکھو تو اسکی جگہ فدیہ دیدو۔ اپنے دنیاوی فوائد مین قرآن سے مشورہ لے سکتے ہو لیکن مجبور نہین ہو۔ زمانہ اور ملک کا خیال رکھو۔ اصولاً اس چیز کو گناہ جانو جس سے تم کو یا کسی تمھارے ہم جنس کو جسمانی یا روحانی تکلیف پہونچے۔ اگر تم کو عربی نہین آتی ہے تو قرآن کو اپنی زبان مین پڑھو۔ اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ترک یا تقلید خواہ خفی ہو یا جلی وہ گناہ عظیم ہے، ناقابل معافی ہے کیونکہ یہ چیز تمکو انسانیت کے درجے سے گرا دیتی ہے اور تم ہر ایک کے

غلام بنجاتے ہو۔ حالانکہ تمھاری ماؤن نے تمکو آزاد جنا ہے۔ اور زیادہ صراحت چاہو تو ہمارے فلسفہ مذہب کو دیکھو
یہ فرقہ کب پیدا ہوا اور کب تک دنیا مین رہا۔ تو اسکی تاریخ عجیب ہے۔
رمضان کی ۱۷ یا ۱۲ یا ۲۹ تاریخ ۶۱۲ء کو پیدا ہوا۔ اور دو سو صدی تک جب تک عجم سے ایک بانا اٹھی قایم رہا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ وبا اس طرح آئی کہ ایک بزرگ محمد مہدی نام اس فرقہ کی اصل کتاب بغل مین دبا کر سامرہ کے ایک غار مین بیٹھ گئے۔
بعض کہتے ہین کہ اس کتاب کی اکثر آیتین گاؤ خورد ہو گئی اور بعض منسوخ التلاوۃ ہین اور جو باقی بچی ہین وہ ایسی چیستانی ہین کہ ان کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہین رہا اس فرقے کے ماننے والے چند بزرگ ہوئے ہین جن مین سے زیادہ مشہور ابو القاسم محمد بن عبد اللہ (روحی فداہ) اور انکے اصحاب ہین۔ مثل ابو بکر صدیق۔ عمر فاروق۔ عثمان ذو النورین علی بن ابی طالب۔ لیکن خیال غالب یہ ہے کہ اس فرقہ کے لوگ اپنے کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتے ہوئے پائے گئے۔ اور کبھی اپنے فرقہ کا اظہار نہین کیا۔ اسواسطے کہ فریق ثانی ہمیشہ سیاسی قوت کے ساتھ غالب رہے۔ اگر ہمارے فرقہ کا کوئی آدمی ہمارے اصول کو ابھی بھی ذہن نشین کرے تو سب سے پہلے وہ یہ کرے گا کہ خواہ مخواہ اپنی قوم سے لام بندی یا مورچہ بندی نہ کریگا۔ اپنی قوم کی پسندیدہ باتون کو اپنی کتاب کے معیار سے ملا کر قبول کریگا۔ اور مکروہ باتون کو چھوڑ دیگا۔ مگر اس فرقہ کا بچہ اسکول مین اسیوقت جائیگا جبکہ اس قوم کا دوسرا بچہ جاتا ہے گھر آکر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے فرقہ کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے باپ سے مذہبی عبادت کے طریقے یاد کرتا ہے۔ اس کے پاس اسکی یہ کتاب اس کی زبان مین رہتی ہے جس کا وہ خود بھی مطالعہ کرتا رہتا ہے یہانتک کہ اسکو خود اپنی زبان پر عبور ہو جائے
لیکن ہمارے فرقہ سے باہر کا آدمی تو خدا ہی اسکا حافظ ہے۔ اسکے نزدیک صغیر سنی کی شادی ایسی بری چیز بھی اسکے مذہب مین جایز ہے اگر اس کی قوم مین ممانعت کیجاتی ہے تو وہ سب سے پہلے اس حکم کو توڑنے پر تیار ہوتا ہے اور پھر ساری وہ خرافات باتین کرے گا جو انسانیت کے لئے باعث ننگ ہین لیکن اس کے ساتھ اسکو مذہب کا ایسا غلو ہوگا کہ بقر عید مین ایک بکرے کی جگہ دو بکرے کی قربانی کریگا۔ شام کے وقت اپنی جا نماز سڑک پر بچھا کر نماز پڑھیگا بڑی عمدہ داڑھی رکھیگا۔ اونچا پائجامہ پہنے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کریگا کہ اپنے سوا سب کو کافر اور بددین جانیگا جس نے اس سے آمین بالجہر اور رفع یدین مین بھی اختلاف کیا۔
مولانا کے اس سوال کا جواب کہ فرقہ اہل قرآن نے احادیث کا انکار کن وجوہ سے کیا۔ اس کی سرگذشت نگار کی آیندہ اشاعت مین درج کرونگا۔

سید مقبول احمد بی اے

مراق

(فسانہ)

"اف اف! آہ آہ!!"

میرا معمول ہے کہ مین مغرب سے کچھ پہلے چہل قدمی کے لئے نکل جاتا ہون۔ اور مغرب سے کچھ بعد واپس آجاتا ہون۔ کمپنی باغ کے گرد ایک چکر یا چاندنی چوک کا ایک گشت یا پارسی تھیٹریکل کمپنی تک چہل قدمی، میری صحت جسمانی میرے دل و دماغ کے لئے جسقدر منفعت بخش ہے اسکا ادنی ثبوت یہ ہے کہ مجھے آج تک نہ امرت دھارا کی ضرورت پڑی نہ آتنک نگرہ گولیون کی! ہان تو جیسا کہ مین نے کہا، مغرب سے کچھ دیر بعد واپس آجاتا ہون۔ اسکے بعد دوستون کی آمد یکے بعد دیگرے شروع ہو جاتی ہے اور بارہ بجے تک مجلس احباب بڑے زور شور سے گرم رہتی ہے۔ غالباً مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ صدر مجلس یہ خاکسار ہی رہتا ہے!

"اف اف! آہ آہ!!"

اپنے کمرے مین قدم رکھتے ہی یہ آواز میرے کان مین آئی۔ ہمدردی کے تمام جذبات، تیمارداری کے تمام احساسات مجھ مین دفعتہً بیدار ہو گئے۔ میرا دماغ جلد جلد ان وسائل پر غور کرنے لگا۔ جو کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہو سکتے ہین میری طبیعت مین فطرتاً یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ تکلیف کی ایک کراہ، کرب و اذیت کی ایک چیخ، درد کی ایک سسکی مجھے بیتاب و بیچین کر دیتی ہے اور مین بغیر ایک لمحہ توقف کئے اپنا دست امداد دراز کر دیتا ہون۔ انسان تو انسان جانورون تک کے لئے میری ہمدردیان وقف ہین حتی کہ شب ماہ مین جسوقت کتے چاند پر بانگ زنی کرتے ہین تو مین اس قدرت کے لئے دست بدعا ہو جاتا ہون کہ چاند کو اسی وقت غروب کر دون۔ ہرچند اس خیال کے ساتھ ہی چاند کے لئے بھی جی کڑھتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض حق پسند لوگ مجھے (Philanthropist) "ہمدردی کا مجسمہ" کے معزز نام سے پکارتے ہین۔ اگرچہ میرا نا سمجھ حلقۂ احباب کوتاہ نظری سے مجھے اس "دبلی ہونے والی" ہستی سے مشابہت دینے کی ناکام کوشش کرتا ہے جسکا "شہر کا اندیشہ" زبان زد خاص و عام ہے۔ بیوقوف کہین کے

"اف اف، آہ آہ!!"

مین چھلانگ مار کر اندر پہنچا۔ میرے پلنگ پر میرا عزیز ترین دوست حامد پڑا ہوا، ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ مین جلدی سے اسپر جھک گیا اور اسکے سر پر ہاتھ رکھکر پوچھا "حامد کیا بات ہے" اور اسی کے ساتھ انداز فخر و غرور کے ساتھ میری نظران بے شمار ادویات پر گئی جن کو مین نے نہایت سلیقہ سے ایک الماری مین چن رکھا تھا۔ یہ وہ مجرب ادویات

تھین۔ جنکے اشتہارات روزانہ ہندوستان کے معزز اخبارات مین نکلتے رہتے ہین اور جنکا تیر کبھی خطا نہین کرتا۔ اور اگر بفرض محال کبھی ناکامی بھی ہو تو پھر پیر جی عامل کریم الدین کے تعویذ تو اس قسم کے مواقع کے لئے اکسیر کا حکم رکھتے ہین !!

"اف اف، ہائے مرگیا، مار ڈالا" حامد ابکی اور ذرا زور سے چلایا اور پہلے سے زیادہ جلد جلد کروٹین بدلنے لگا" آخر بات کیا ہے" مین نے پوچھا مگر معاً ایک خیال میرے ذہن مین آیا" ذرا ٹھہرو" مین نے کہا "مین خود معلوم کرونگا کہ کیا ہے مین آج تمھین اپنی تشخیص کا قائل کرکے چھوڑونگا۔ فرسٹ ایڈ کا مطالعہ مین نے بیکار نہین کیا ہے" "ہائے ہائے۔ مٹا گیا تباہ ہوگیا"

مین نے ہمدردانہ نظرون سے اسکی طرف دیکھا۔ ایک منٹ تامل کیا۔ مین آثار و علائم سے مرض کا دماغی تفحص کر رہا تھا۔ دفعتہً میری نظر الحکیم کے تازہ پرچے پر پڑی جو میز پر پڑا ہوا تھا۔ آج ہی مین نے اسکا مطالعہ کیا تھا۔ مین نے اطمینان وخود اعتمادی کا سانس لیتے ہوئے کہا "تمھین درد گردہ کی شکایت ہے"

"ہائے نہین" اور پھر اس نے کروٹ بدلی

"نہین" مین نے حیرت سے کہا" مگر مین نے آج ہی اسکی بحث پڑھی ہے اچھا ذرا ٹھیرو۔ تمھارا مثانہ پھٹ گیا ہے" اور مین نے ذرا تشکر داد طلب نظرون سے اسکی طرف دیکھا۔

"نہین نہین بخدا نہین آہ!" اس نے بری طرح سے آنکھین بھیچ کر اور منہ بگاڑ کر جواب دیا" اچھا تو عارضۂ فتق کا دورہ پڑا ہوگا" مین نے یقین کلی کے ساتھ کہا" اس صورت مین آلہ ایریکٹرس ایکلینا۔۔۔" "نہین" اس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا" تو تمھین قبض ہوگیا ہے"

نہین یہ بھی نہین ہائے" مجھے اسکے انکار اور اپنی تشخیص پر غصہ آنے لگا تھا

"اخوہ مین چوک گیا تھا مین نے تمھاری آنکھون کو اب تک نہین دیکھا۔ تمھین یقیناً یرقان کا مرض لاحق ہے" اور مین نے دل ہی دل مین اپنی تشخیص کی داد لی

"اوہ، اوہ نہین نہین" کم بخت نے پھر انکار کردیا

میرا جی چاہ رہا تھا اپنے کو اور اسے دونون کو کچا چبا جاؤن۔ خبیث کو دیکھو انکار کئے جا رہا ہے اور مجھے آج کیا ہوگیا ہے کہ کوئی تشخیص ٹھیک نہین بیٹھتی

ہا! کیسی اچھی اچھی زود اثر مجرب دوائین رکھی ہین مگر یہ بدنصیب کسی سے کبھی فائدہ اٹھانا نہین چاہتا۔ معاً مجھے ایک ترکیب سوجھی مین حریفانہ انداز مین اکڑ کر بیٹھ گیا اور پوچھنا شروع کیا "دمہ ہے"

"نہین"

"چالا" "نہین، آہ" "خارش" "نہین"

"بچھونے کاٹا ہے" اور میں اپنی ادبی برتفریں کرنے لگا کہ اتنی ذراسی بات ابتک نہ سمجھ سکا تھا
"نہیں" اس نے پھر انکار کر دیا

"داد" "نہیں"
"خنازیر" "نہیں"
"اور رنگ زیبی" "نہیں"
"کالا بخار" "نہیں"

"بال توڑ" میں نے ڈپٹ کر اس طرح کہا جیسے یہ نام مجھے یاد نہ آتا تھا ورنہ میں شروع ہی سے سمجھ گیا تھا کہ مرض کیا ہے۔ لیکن جب پھر بھی اس نے نفی میں جواب دیا تو میں سرد ہو گیا۔ اللہ اکبر انسان ضعیف انسان کا علم کسقدر محدود ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے میں نے جھلا کر کہا "آخر منہ سے تو پھوٹے کیا بات ہے؟"

وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور آہ سرد بھر کر کہا "مجھے محبت ہو گئی ہے، راشد مجھے محبت ہو گئی ہے"

"آہا تو یہ بات تھی۔ یہ بات تھی" جو ایسا تڑپا رہی تھی۔ میرا افسردہ جوش پھر ابھر کر اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ گیا۔ محبت کے نام نے میرے اعصاب کے ساتھ وہ کیا جو مفرح مرداریدی یا رفیق بدن (رجسٹرڈ) کی دس خوراکیں بھی نہ کرتیں۔ دنیا میں یہ دوسرا موضوع ہے جس کے لئے میرا ذہن بیحد طرار ہے۔ محبت آہ محبت۔ دنیا والوں نے اس پاکیزہ لفظ کے سمجھنے میں کسقدر غلطی کی ہے۔ یہ لوگ پسند یدگی کا نام محبت بوالہوسی کا نام محبت، خمار گندم کا نام محبت رکھتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ فلسفہ محبت کے بلند معیار تک ان احمقوں کی کمزور نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ عشق صادق جس چیز کو کہتے ہیں انکو اسکی ہوا بھی نہیں لگی۔ دوستی اور محبت کا فرق ان کے نزدیک بے معنی ہے۔ کوئی ان حماقت کے پتلوں کو کس طرح سمجھائے کہ نادانو، پہلے محبت کے فلسفہ کو سمجھو تو پھر محبت کرو۔ میرا بدن افراط معلومات سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ ایک ہی سانس میں اپنی معلومات کا تمام سیلاب بہا دوں۔ ہاں آج میں اسے بتاؤنگا کہ میں فلسفۂ محبت اور اسکے ہر ہر جزو کا کسقدر ماہر خصوصی ہوں نفسیات کو کس طرح پانی کی طرح سہل کر کے رکھ دے سکتا ہوں۔ عشق کے رموز و نکات کا کیسا بحر ذخار میرے سینہ میں موجزن ہے ہے۔ تحلیل نفسی میں کسقدر درخور حاصل ہے۔ جی! کوئی مذاق ہے۔ شہاب کی سرگزشت کو پندرہ مرتبہ پڑھ چکا ہوں"

"آہ! تیر نظر جگر کے پار ہو گیا" حامد نے تڑپ کر کہا

"تیر نظر اگرچہ شاعرانہ مبالغہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے حامد نے مجھے متامل دیکھ کر آنکھیں پھاڑ کر میری جانب دیکھا اور کہا "تم تلقین و وعظ تو نہیں شروع کر دو گے۔ مجھے یقین ہے!"

میں چونک پڑا اوہ! یہ بات تو میرے ذہن سے بالکل نکل ہی گئی تھی۔ میں اسکا دوست تھا اور میرا پہلا فرض تھا

کہ مین اپنے پند و نصائح سے اس ہولناک منزلون سے اسے دور رکھنے کی کوشش کرون۔ استغفر اللہ۔ کیا بھولا تھا۔ مین نے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنایا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھا اور تین منٹ تک غور کرتا رہا کہ شروع کس طرح کرون۔ یکایک مین اچھل پڑا۔ پرانا مطالعہ میرے کام آیا اور مین نے حامد کا ہاتھ اپنے ہاتھ مین لیکر۔ انتہائی ہمدردی کا جذبہ اپنی آنکھون مین پیدا کرکے بڑی محبت سے کہا۔

لگا یہ روگ جوانی مین کیون میان جرات ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن

اور پھر گویا مزید زور پیدا کرنے کیلئے آہ سرد بھر کر پُر تنبیہ لہجہ مین کہا

"جسکو خدا خراب کرے وہ لگائے دل!"

حامد نے بھی فوراً .... موقعہ شناسی کے ساتھ بے پروائی سے جواب دیا

یا تنگ نہ کر ناصح نادان مجھے اتنا یا لاکے دکھادے دہن ایسا کمر ایسی

جی چاہا کہ اسکا منہ چوم لون۔ کسقدر موقعہ شناس تھا۔ صرف ایک شعر سے میری ناصحانہ پوزیشن کو ختم کرکے اس دوسری منزل پر لے آیا۔ جہان نصیحت امداد و اعانت مین تبدیل ہوجاتی ہے "مین اب وعظ و نصیحت کو بالائے طاق رکھکر اپنی فلسفہ دانی کی شمع فروزان سے اسکو عشق صادق کے صحیح ڈگر پر ڈالونگا" مین نے سوچا "آہ۔ جب سے دیکھا ہے تڑپ رہا ہون خواب و خور حرام ہے۔ دوست وصال یار کی کوئی تدبیر"؟

وصال یار! میرے بدن مین سناٹا آگیا۔ ہمدردی کے تمام جذبات یک لخت کافور ہوگئے۔ دل سے بجائے محبت کے حقارت کا ایک سیلاب یہ نکلا "وصال یار اور یہ مردود ہمیشہ مجھسے کہتا تھا کہ اسے محبت ہوگئی ہے۔ یہ ہے ان لوگون کی کائنات محبت۔ محبت کا ادعا اور تمنائے وصال۔ ناممکن، ناممکن یہ دونون باتین دوش بدوش نہین چل سکتین محبت کا لطف تو فراق و ہجر ہی مین ہے۔ ایکدفعہ محبت کرنے بعد دیکھنے کی آرزو ہی دل مین پیدا نہونی چاہیے یہ محبت کی توہین ہے کہ محبوب کو قطعاً فراموش کرنیکی کوشش کیجائے تا اینکہ ترک ترک کا درجہ حاصل کرلے!!

"اگر دیدار بازی کا موقعہ نصیب نہوا تو زندگی مشکل ہے" اس نے پھر کہا

میرے سینہ مین شعلے بھڑکنے لگے۔ میرا وہ پاکبازانہ لکچر جو مین سوچے بیٹھا تھا۔ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔

"اور اگر بوس و کنار کا موقعہ بھی ملے تو نوراً علیٰ نور" وہ پھر بولا۔

مین نے اپنی شعلہ فشان آنکھون سے اسکی طرف گھور کر دیکھا۔ مین اپنی جگہ کسمسا کر رہجاتا تھا۔ فرط غضب سے قوت گویائی سلب ہوگئی تھی۔ کسقدر بیہودہ بکواس تھی۔ محبت سے کوسون دور پاکیزگی کا میلون پتہ نہین اف رے اعوذ باللہ!!

"دیکھین ان کے پھول کے رخسارون کو چومنا کب نصیب ہوتا ہے"

استغفر اللہ! میرا بدن تھرتھر کانپنے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مین ڈنڈے کے زور سے [illegible] محبت بتانے کی خواہش

اپنے دل میں پار رہا تھا۔

"آہ یہ روزِ ہجر ختم ہوا اور شب وصال اپنا روئے زیبا دکھائے"

معاذ اللہ! میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کھول لیا۔ میرے سر پر خون سوار ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چمکتی ہوئی چیز جیب سے باہر بھی آجاتی۔ مگر یکایک باہر آہٹ ہوئی اور سعید، منیر، واحد اور ضیا، داخل ہوئے۔

ہماری پارٹی مکمل تھی۔ مجھے قدرے سکون و مسرت حاصل ہوئی کہ اب مجھے داد ملیگی اور حامد کو خوب آڑے ہاتھوں لونگا میں نے فوراً اپنے برانگیختہ حسیات کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، قبل اسکے وہ لوگ کرسیوں پر اچھی طرح بیٹھ چکیں کہنا شروع کیا "یہ نا پاک ہستی جو اسوقت پلنگ پر دراز ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا بات ہے" واحد نے اپنی عینک میں سے جھانکتے ہوئے میرا قطع کلام کیا

"منیر بولا" آپ کی گفتگو کی تمہید چونکہ نہایت نامعقول طریق پر شروع ہوئی اس لئے۔ ۔"

"واہی ہو" میں نے کہا "بات یہ ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔"

سعید نے شرارت سے کہا "پہلے اپنے الفاظ کو واپس لیجئے اور تحریری معافی مانگئے"

ضیا، سب سے چھوٹا مگر سب سے کھوٹا تھا، بندر کی طرح آنکھیں ملا کر بولا "اور پھر ایسا یاد رکھئے تاکہ آج کا یاد کیا برسوں نہ بھولے!" اس نے آنکھ سے دواؤں کی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسپر سب مسکرا دیئے۔

میں نے پیشانی کس لین اور اپنے قد کے پانچ فٹ چھ انچ کی پوری لمبائی لئے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا "مذاق دلگی برطرف میں آپ لوگوں تک خبر پہنچانا چاہتا ہوں کہ جناب کو خود ان کے قول کے مطابق مرض محبت لاحق ہو گیا ہے"

حیرت کی ایک بے معنی آواز سب کے منہ سے نکلی اور سب کی آنکھیں حامد کے چہرہ پر گڑ گئیں۔

"مرحبا!" سعید نے اپنی عینک ریشمیں رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "آفرین"

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد   من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

منصور، دار و رسن کا نام سنکر میری باچھیں کھل گئیں۔ الحمد للہ کہ سعید محبت کی منزل اعلیٰ میں یقیناً میرا ہمزبان ہوگا۔ ورنہ اگر اسکی بھی ذہنیت اسقدر پست ہوتی تو اتنا اعلیٰ شعر نہ پڑھتا۔

منیر نے ہنسکر کہا "دورِ مجنون گذشت و نوبت ماست"

میرے سینے میں وفورِ مسرت سے آماس پیدا ہونے لگا۔

واحد نے کہا "عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد"

"بلاکش! عمرت دراز باد تم سب میرے ہم خیال ہو" میں نے سوچا اور خوشی سے میری سانس پھولنے لگی۔

ضیا، نے کرسی کی پشت کو اپنی دونوں بغلوں مین لیتے ہوئے اپنی باریک آواز مین کہا۔ "عاشقی کھیل نہین ہے جیسے لڑکے کھیلین"
"اس کمبخت کے مزاج مین سے کبھی بچپن نہین جائیگا" مین نے سوچا۔ مین نے ایک عمر رسیدہ ماسٹر کی طرح تبسم کیا۔ وہ تبسم جو صرف اسوقت نمودار ہوتا ہے جب لڑکے سبق اچھی طرح یاد کر لیتے ہین۔ پھر ایک کمانڈر انچیف کی طرح ان سب کا نظرن جائزہ لیتے ہوئے کہا "اور آپ کو یہ اپنی ادعائے محبت تمنائے وصال بھی ہے!!"

سب حیرت زدہ ہو کر میری جانب ان نظرون سے دیکھنے لگے جیسے کوئی پاگل کو دیکھتا ہے۔ مین بھوچکا سا ہو کر رہگیا مجھے کامل توقع تھی کہ میری زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی سب اُگ حامد پر ایک قہقہہ لگائینگے۔ اور ابھی دم کے دم مین لعنت کے ووٹ پاس ہو جائینگے۔ آخر چند لمحے کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد واحد نے چھڑی سے زمین کریدتے ہوئے کہا "افسوس ہے ہم آپ کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہے"

مین نے کھسیانے پن سے کہا "یہ۔ یہ۔ من خوب می شناسم۔ جی ہان مدعا سمجھنے سے قاصر رہے"

"نہیں واقعی" منیر نے تائید کی۔

"تم لوگ فضول باتین مت کرو" مین نے کہا اور خفت چھپانے کے لئے پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

سعید نے کہا "جناب محتشم نے جو اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ فقرہ اس تیور کے ساتھ ادا فرمایا جیسے کوئی استحالہ عقلی یا عادی کا تذکرہ۔۔۔"

مین نے جھنجھلا کر کہا "خاموش رہو۔ مین ان بڑے بڑے لفظون سے مرعوب ہونے والا نہین ہون ابھی کلام مجید سامنے رکھکر گفتگو شروع کر دی تو ساری لغت دانی دھری رہجائیگی"

سعید نے پھر کہا "آخر جناب کس استدلال کی بنا پر محبت سے تمنائے وصال کو منفک کر سکتے ہین"

مین نے کہا واللہ تم سب لوگ کورے ہو۔ محبت کی تعریف سے اصلا واقف نہین"

سعید نے اپنے چہرہ پر شاگردانہ جھلک پیدا کر کے کہا "تو ہمین کامل امید ہے کہ جناب ہمارے تاریک دماغون کو اس خاص روشنی سے منور فرمائینگے" اسکی اس سنجیدگی پر مجھے غصہ آنے لگا۔ کم بخت ہزار مرتبہ اس موضوع پر میرے خیالات سن چکے تھے مگر کیسے انجان بن رہے تھے

ضیا، "مگر پہلے تمنائے وصال کی تشریح تو ہو جانا چاہئے وصال کی کون سی صورت؟"

سعید "ہر ممکن صورت۔ ذرائع کو اتنی اہمیت نہ دینی چاہئے۔"

میرا خون کھولنے لگا۔ مین اپنی پہلی غیر متوقع شکست کی وجہ سے دفعتاً کچھ تھک گیا تھا لیکن یہ الفاظ سنکر میری طاقت عود کر آئی افوہ! یہ مردود اپنی بوالہوسی اور بدمعاشی مین یہان تک ترقی کر گئے ہین۔ بڑے فلسفی بنتے ہین اور محبت کے متعلق اسقدر رکیک خیالات رکھتے ہین مین نے بپھر کر کہا "نالائقو۔ تم مین حیوانی روح حلول کر گئی ہے۔ تم لوگ شیطان کی

ذریات مین سے ہو۔ انسانی خصائص جو ملکوتی خصائل پر حشیات نی کرتے ہین تم مین سے اسی طرح مفقود ہو گئے ہین جس طرح
ال عمر بھر نہ اگنے کے جوہر سے بال! بدمعاش لوگو! تم محبت جیسی پاکیزہ چیز کو بھی اپنی بدباطنی اور سیاہ قلبی کی وجہ سے پان بہار
سمجھتے ہو جو تھوڑی دیر کی لذتِ دہن کے لئے پان کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ محبت محبوب کو اسقدر پر عظمت اسقدر پر احترام
نیز بنا دیتی ہے کہ حصول تو حصول، اسکا خیال بھی بدن مین کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ نادانو! تمھارے دل زنگ آلود ہو گئے ہین
را سو کی وہ شیشی بھی اس زنگ کو نہین چھڑا سکتی" مین نے الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی تقریر کو ختم کیا

سعید نے نہایت سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "خواجہ حسن نظامی کا قرآنی آسان قاعدہ کتنے مین آتا ہے؟"
یہ تھا وہ جواب جو اس نے میری طرف آتی پرجوش تقریر کا دیا۔ سب نے ملکر ایک بلند قہقہہ لگایا۔ حامد بھی
ب تڑپنا چھوڑ چکا تھا اور شریک تماشا تھا۔ میرے دل مین ایک بے نام سی بےچینی کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ چھیڑ چھاڑ
روزانہ ہوتی ہے۔ لیکن آج تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب میرے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہین۔ کہین انھون نے سازش تو
مین کر رکھی ہے "اوہو" مین نے سوچا "اگر ایسا ہے بھی تو مجھے کیا پرواہ ہے۔ تین اکیلا ان سب پر بھاری ہون" مین نے
غضبناک ہو کر کہا "جناب، اب ٹالنے سے کام نہین چلے گا۔ سیدھے سیدھے جواب دیجئے!"

"تم تو مجھے کچھ بیوقوف سے نظر آتے ہو" واحد بولا "ارے بھئی عورت مرد کی محبت کا منشائے حقیقی دونون
یکجائی اور اتصال باہمی ہونا چاہئے۔ محبت کو آخر تم نے اسقدر مہیب اور ڈراؤنی چیز کیون بنا دیا کہ جسکا قدم درمیان
ن آتے ہی محبوب ایک خوشرنگ مگر زہریلا سانپ ہو جائے۔ اگر محبت ایسی ہی چیز ہے تو پھر پتھر سے کیون نہ کیجائے۔
کہ پھر یہ ہجر و فراق، دوری وصل، انکار و پذیرائی کا کھڑاگ ہی ختم ہو۔ تم تو بالکل منشی سجاد حسین کی ایک تصنیف ہو"
مطلب یہ تھا کہ احمق الذین ہو! رہ تو سہی مین تیری کیسی خبر لیتا ہون مین کوئی غضبناک جواب دینے ہی والا تھا
بیچ مین ضیا بول اٹھا "اچھا یہ تو بتائیے آپ شادی بربنائے محبت کے قائل ہین یا اندھا دھند شادی کے" مین نے
ا شادی بربنائے محبت؟ اس سے زیادہ ناکام شادی کوئی نہین ہو سکتی! شادی محبت کی موت ہے۔ جو شخص محبت
وجہ سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ گویا ایک تشنہ کام ہے جو گلاس کی اس لئے تلاش کرتا ہے کہ پانی پی سکے۔ اسکے برخلاف
یسی شادی گویا گلاس کا خریدنا ہے گلاس کی خاطر" اور مین نے اکثر فخر کے تیورون سے چارون طرف نظر ڈالی۔

سعید (مسکرا کر) جی، جس کتاب سے آپ یہ فقرے نقل کر رہے ہین کبھی اسکو سمجھ کر بھی آپ نے پڑھا ہے؟

ضیاء "تم واللہ نرے کھٹ ابابیل ہو"

اسپر سب نے فرمائشی قہقہہ لگایا اور مین مارے غصہ کے گونگا ہو کر رہ گیا۔ مگر میری آنکھین شعلہ فشانی کر رہی تھین
واحد نے مسکرا کر کہا "خیر یہ باتین تو سب ہوتی ہی رہینگی۔ یہ تو بتائیے کہ آپنے حامد کے مرض کا کیا علاج تجویز کیا"
ضیاء "واہ یہ کون مشکل بات ہے۔ دعائے عقد المحبت ——— سیدھا سادا علاج ہے"

"چپ رہو" مین نے غصہ سے کہا"

ضیا: "اچھا تو مطلوب طالب کے قدمون پر سہی، یہ نہین تو محبت کے مایوس مریضو! پھر شہاب کی سرگذشت سہی!"

"بالکل خاموش ہو جاؤ" مین نے دانت کٹکٹا کر کہا

"آپکو خدا کی قسم مجھے شروع سے آخر تک پڑھو" کے متعلق کیا خیال ہے

واحد نے بطور تجویز کے کہا۔

عنان ضبط میرے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔

مین: "نہین بھئی اللہ شوق دے تو کتابین پڑھا کرو" قہقہہ پڑا۔

سعید نے سنجیدگی سے کہا یہ سب کچھ نہین اسکا صرف ایک علاج ہے" سب ہمہ تن اشتیاق ہو کر اسکی طرف دیکھنے لگے کم بخت نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا کہ خود میرے دل مین بھی شوق پیدا ہوا کہ دیکھین کیا کہتا ہے

"اسکا علاج" اسنے کہا "بہترین علاج صرف ایک ہے اور وہ (اسنے گلا صاف کیا) یہ کہ پندرہ سن مین بال جڑ سے کاٹ ڈالا!"

اسپر ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا۔ مین اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصہ سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔ "بکومت" مین نے چیخ کر کہا "بکومت" مین گرج اٹھا "بکومت" مین نے دیو کی طرح چنگھاڑ کر کہا دفعتہً باہر زینہ پر کسی کے جلد جلد اترنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحہ والد بزرگوار حیران و ششدر کمرہ مین داخل ہوئے سب کھڑے ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور ادہر ادہر دیکھ کر پوچھا "یہ کون جنگلیون کی طرح چیخ رہا تھا؟" سب کی نظرین بیساختہ میری طرف اٹھ گئین۔

"یہ راشد ہوگا۔ مین پہلے ہی سمجھا تھا اور اس خبطی کے سوائے کون ہو سکتا ہے" ان کے چہرہ پر تبسم کے آثار نمایان ہوئے اور میرے دوستون کی طرف مخاطب ہو کر انھون نے پوچھا کیا بات تھی۔ محبت کے متعلق گفتگو تھی یا اشتہاری دواؤن کے"

سب کے سب نظرین جھکا کر مسکرانے لگے۔ میرے بدن مین سنسنی پھیل گئی۔ مین نے اپنے دوستون کی نظرون مین جو وقعت پیدا کر رکھی تھی وہ آج والد بزرگوار فنا کئے دے رہے تھے۔

"خدا جانے اسے کیا خبط ہو گیا ہے" وہ پھر بولے "گھر مین بھی ہر وقت اسی قسم کی باتون پر مباحثہ کرتا رہتا ہے۔ اسکے چھیڑنے پر اور سب اسے چھیڑتے ہین" پھر میری طرف دیکھ کر کہا "شرم نہین آتی۔ بی۔ اے تک کی پڑھائی۔ کاندو کے ! ے مین بھائی تمھین اشتہاری دواؤن سے فرصت ملے تو کوئی اور کام کرو۔

سعید: جناب قبلہ ہمارا بھی انھون نے ناک مین دم کر رکھا ہے۔ اسی لئے ہم آج ارادہ کرکے آئے تھے کہ آج انھین خوب بنائین گے اور انکی یہ عادت ہمیشہ کے لئے چھڑا کر رہینگے۔ ہم نے حامد کو پہلے ہی پٹی پڑھا کر بھیجدیا تھا۔ وہ تو آپ تشریف

لے آئے ورنہ ہم آج ان سے عہد لیکر چھوڑتے"

"چھوٹا نامراد - ارادہ کرکے آئے تھے - سب جھوٹ حامد یقیناً عاشق ہوکر آیا تھا، سعید نے اس ڈر سے کہ کہین والد نے سب کچھ نہ سنا ہو اور حامد کے باپ سے کہد ین یہ اور مجھے بنا! والد نہوتے تو بتاتا کہ تم مجھے کس طرح بناتے ہو۔

"ہا! ناشدنی - سب ہی تو تجھ سے تنگ ہین - پھر کہنے لگے "عزیزم سلمہٗ، ہم تو تمھارے بھلے کے لئے کہتے ہین - آگے تم جانو خود ہی خوار ہوگے"

سلمہٗ - ہونہہ - مار تو ڈالا اور سلمہٗ - تمام دوستون کے سامنے ذلیل کیا - سخت تحقیر ہوئی - منہ دکھاتے شرم آئیگی۔

سلمہٗ - ہونہہ - غرض قصہ مختصر یہ کہ اس دن والد نے بڑی تحقیر کی - مین بیوقوف تھا - جو ان عاقلانہ مسائل کا تذکرہ ان نادانون سے کیا کرتا تھا - اس دن کے بعد سے مین نے مطلقاً ان لوگون کے سامنے ان عمیق مسائل کا ذکر چھوڑ دیا ہے - نادان ہین - کم فہم ہین - نہ یہ محبت کو جانین نہ جینتان کو"

یہ ہے وہ قصہ جو موسم گرما کی ایک گرم دوپہر مین راشد نے مجھے سنایا - اپنے حلقۂ تعارف مین وہ مخبوط الحواس مشہور ہے بعض جنون اور مالیخولیا کا مرض بتاتے ہین - مین نے ذاتی طور پر اسکے متعلق کبھی کچھ نہین سوچا - لیکن اگر چاہون تو کہہ سکتا ہون کہ اسکی دماغی حالت اس نقطہ پر ہے جہان دیوانگی اور فرزانگی کے ڈانڈے ملتے ہین پھر کیا اسکی دیوانگی کوئی عجیب یا کمیاب دیوانگی ہے۔ ہم مین کتنے ہین جو اصلیت کے ادراک مین کچھ نہ کچھ اس طرح نہین بھٹک جاتے؟ کتنے ہین جو حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہین؟ ہم سب کم و بیش راشد ہی کی طرح چند در چند ہیون مین پھنسے ہوئے ہین - یہ اور بات ہے کہ ہم مین راز داری اور ضبط کی قوت اس سے زیادہ ہے - فرسٹ ایڈ گو اس کے لئے میٹریا میڈیکا کی قائم مقام ہو - لیکن غالباً وہ محبت اور جینتان کو ہم مین سے اکثر سے بہتر جانتا ہے!

رفیعی اجمیری

عاشق کو جیسا ہونا چاہیئے، مومن اپنے اشعار غزل مین نمایان ہے۔

نا قدان فن اور صاحبانِ مذاق نے غزل یا عشق کے جذبات کو ذیل کی صورتون مین نمایان کیا ہے۔

جذبات تغزل

(معشوق کا انداز کج ادائی)

فارسی شاعر کہتا ہے:

با غیر نشینی و فرستی ز پئے ما — آن را کہ نداند رہِ کاشانۂ ما را

"مومن" کی شان دیکھئے:

مجلس مین تا نہ دیکھ سکون یار کی طرف — دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

فارسی شعر مین معشوق اپنے محفل مین بلانے اور غیر کے ساتھ ملاطفت دکھانے اور عاشق کے جلانے کے لئے اس کو ایسے شخص کی معرفت بلواتا ہے جو عاشق کا گھر تک نہین جانتا۔

"مومن" کا رنگ دیکھئے کہ وہ مجلس مین موجود ہے، رقیب کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے، اس پر اکتفا نہین بلکہ عاشق کے جلانے کو معشوق عجیب لطیف انداز کج ادائی دکھاتا ہے۔

ارباب فن دونون کا فرق محسوس کرین اور "مومن" کے جذبات کی داد دین،

(معشوق کا ذکر کسی عنوان سے ہو بہتر ہے)

فارسی شاعر کا خیال دیکھئے:

بہر مجلس کہ جا سازم حدیث نیکوان پرسم — کہ حرفِ آن مہ نامہربان را در میان پرسم

"مومن" کا انداز دیکھئے:

نہ مانون گا نصیحت پر نہ سنتا مین تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

پہلے شعر مین ذکر معشوق معمولی رنگ مین ہے، خود عاشق ذکر کرتا ہے اگرچہ اس کے لئے پیرایہ تلاش کرتا ہے۔ "مومن" نے دشمن عقل "ناصح" کی نصیحت مین عشق کے مزے لئے ہین، اس مضمون کو مومن نے کہان سے کہان پہونچا

عربی کا ایک شعر بالکل اسی مضمون کا ہے:

احب العذول لتکرارہ — حدیث الحبیب علی مسمعی

نصیحت کرنے والے کی نصیحت اس لئے پسند کرتا ہون کہ بار بار دوست کا نام سننے مین آتا ہے

"مومن" کی بلندیٔ خیالی نے اور لطیف انداز بیان نے دونون شاعرون کو پست کر دیا

(ستم محبوب)

فارسی شعر: این جورِ دیگر ست کہ آزارِ عاشقان — چندان نمی کند کہ بہ بیداد خو کنند

مومن :ـ

جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو   بیوفا پھر حاصل بیداد کیا

مضمون قریب قریب دونون ایک ہین مگر "مومن" نے اپنے شعر مین اثر کی بجلی بھر دی ہے، الفاظ اور بندش سے آسمان شاعری مین ستارے جڑ دئے ہین

(محبوب کی نسبت بد گمانی)

فارسی شاعر کہتا ہے :ـ

کاش اے محرم نمی پرسیدیم کان مہ کجاست   یک سخن گفتی و بازا زصد گمانم سوختی

مومن :ـ

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دیگا   ان کو شوقِ آرائش دل ہے بدگمان اپنا

(معشوق کو خط لکھنا)

فارسی شاعر کہتا ہے :ـ

بجانان نامہ ہرگز عاشق بیمار ننویسد   کہ از بے طاقتی یک حرف راصد بار بنویسد

مومن :ـ

حالِ دل یار کو لکھون کیونکر   ہاتھ دل سے جدا نہین ہوتا

(ستم کی ادا)

فارسی شاعر کہتا ہے :ـ

تا مرا در نظر مدعیان خوار کند   ہرچہ گویم بخلافِ سخنم کار کند

مومن :ـ

لاش کس کی ہے ؟ یہ عدو سے نہ پوچھ   مین ہون کشتہ ترے تغافل کا

فارسی شعر مین ابتدائے ادا ہے اور مومن کے شعر مین انتہا ہے، لطف بیان نے شعر کو اپنا کر لیا ہے۔

تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو ضخیم دفتر ہو جائے، یہان یہ دکھانا منظور ہے کہ "مومن" نے تغزل کا جو مفہوم سمجھا ہے اور دوسرون کو سمجھانا چاہا ہے وہ اپنی جگہ بے مثل ہے، مومن سے پہلے فارسی شاعری اُردو کے سامنے جو کچھ ناز کرتی بجا تھا لیکن "مومن" نے اپنے کمال شاعری سے اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا ہے کہ اس کا جواب مشکل سے کسی زبان مین مل سکتا ہے

"مومن" کا یہ کمال دیکھئے کہ غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ واسوخت کی زبان۔ ترتیب والفاظ۔ معانی ۔

انداز بیان - لہجہ وغیرہ مین نمایان فرق رکھتا ہے۔

الفاظ غزل غزلون مین مومن نے جس طرح الفاظ کا اہتمام کیا ہے اس کی چند مثالین دیکھ لیجئے:۔

یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل سے قبت دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا "سا"

اس شعر مین لفظ "سا" جس اہتمام سے رکھا گیا ہے اس نے لطفِ معانی کو دوبالا کر دیا ہے۔

یہی "سا" تمام غزل مین علیحدہ علیحدہ رنگ دکھاتا ہے۔ دوسری غزل مین دیکھئے:۔

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

ایسی لذت خلش دل مین کہان ہوتی ہے رہ گیا سینہ مین اس کا کوئی پیکان ہوگا

اس شعر مین لفظ "کوئی" کی تنکیر نے ایسی خوبی اور دلکشی پیدا کر دی ہے جس نے تمام شعر بالخصوص پہلے مصرعہ کو سانچے مین ڈھال دیا ہے۔

درد ہے جان کے عوض ہر رگ پے مین ساری چارہ گر! ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

اس شعر مین "نہین ہونے کے" الفاظ نے محاورہ کی بیساختگی کے ساتھ اظہار جذبات مین جادو کیا ہے۔

سینے سے گھبرا کے آخر جان لب تک آ گئی حال پہونچا یان تلک اور تم نہ آئے یان تلک

اس شعر کے دوسرے مصرعہ مین یان تلک دو جگہ کس طرح آیا ہے اور دونون جگہ کیا کام کر رہا ہے ارباب فن سے پوشیدہ نہین

کیا دل کوئے گیا کوئی بیگانہ آشنا کیون اپنے جی کو لگتے ہین کچھ اجنبی سے ہم

اس شعر کے دوسرے مصرعہ مین "سے" کتنا فصیح ہے؟

اے خوش گئی ہے بےطرح زانوئے جاناں کی یہ سر تکیہ سے ہمدم جس طرح رکھون نہ ٹھیریگا

اس شعر کے دونون لفظ "بےطرح" اور "نہ ٹھیرے گا" کا انداز دیکھئے

معانی غزل جس طرح غزل مین "الفاظ" درد و بیتابی، بیکسی، جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص ہوتے ہین اسی طرح "معانی" کا حال ہے، "مومن" نے اپنی غزلون مین اس کا بھی اسی عتبار سے اہتمام و لحاظ کیا ہے، مثالون سے ظاہر ہے

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر مین جینا مشکل تم سے بیرحم پہ مرنے سے تو آسان ہوگا

معنوی اعتبار سے یہ شعر کتنا بلند ہو گیا ہے؟

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤن کیونکر آپ وہ میرے گلے دوڑ کے آ بار لگا

کیون لگے دینے خطِ آزادی کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

پہلے شعر مین چھاتی سے لگانے کے محاورہ مین معنوی خوبیون کو دیکھئے دوسرے مین پہلے مصرعہ کی رعایت سے غلام

درصاحب کے الفاظ نے معنوی حیثیت سے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے
اس قسم کے اشعار سے تمام دیوان بھرا پڑا ہے۔

لہجہ غزل مین "لہجہ" کو بھی خاص وقعت اور خاص قوت ہے، مومن کو اس کے ادا کرنے پر بھی غیر معمولی قدرت ہے مثال ملاحظہ فرمائیے۔

دم آخر بھی تم نہین آتے ——— بند گی اب کہ مین چلا صاحب
جذب دل نے غیر کے بھی کیا کہین تاثیر کی ——— آج کیون آتے ہوئے ہر گام پر رکتے ہین آپ
مومن خدا کے واسطے ایسا مکان نہ چھوڑ ——— دوزخ مین ڈال خلد کو کوئے بتان نہ چھوڑ

لہجے کی خوبی کے یہی معنی ہین کہ مطلب کو اس طرح ادا کرے کہ اس مین تاثیر پیدا ہو جائے، ان اشعار مین [illegible] لہجے کے اعتبار سے "الفاظ" اور معانی مین جو اہتمام ہوتا ہے وہ "مومن" کی غزلون مین بدرجہ اتم موجود ہے

ترکیب و ترتیب کمال غزل یا کمال شاعری کا انداز ترکیب اور ترتیب سے بھی ہوتا ہے مثلاً:-

اے جذب دل وہ شوخ ستمگر تو اک طرف ——— پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہین ہنوز
ہم تا سحر آپ مین نہین تھے ——— کیا جانے رہے وہ کس کے گھر رات
جو نقاب اٹھی میری آنکھون پہ پردا پڑ گیا ——— کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر
اثر غم ذرا بتا دینا ——— وہ بہت پوچھتے ہین کیا ہے عشق

ہم نے تفصیل کے لئے عنوان قائم کر کے علیحدہ علیحدہ طور پر مثالین پیش کی ہین ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "مومن" کے ہر شعر مین یہ تمام خوبیان یکجا طور پر موجود ہین۔

سلاست زبان

ہم ہین اور نزع شب ہجر مین جان ہونے تک
صبر آتا ہے کوئی تاب و توان ہونے تک

مجھ پہ عاشق نہین ہے کچھ ظالم ——— صبر آخر کرے وفا کب تک
لے شب وصل غیر بھی کاٹی ——— تو مجھے آزمائے گا کب تک
یا الٰہی مجھ کو کس پردہ نشین کا غم لگا ——— سینے مین اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا ہے دل
سرمہ ہین اس چشم جادو فن مین ہم ——— خاک ڈالین دیدۂ دشمن مین ہم

اعجاز سلاست کے اظہار کے لئے مومن کی حسب ذیل غزلین قابل ملاحظہ ہین:-

اثر اس کو ذرا نہین ہوتا ——— رنج راحت فزا نہین ہوتا
مجھے جنت مین وہ صنم نہ ملا ——— حشر اور ایک بار ہونا تھا

زبان کی پابندی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو ادا کر سکتا تھا، وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا اور جب زبان کی تمام معمولی و متداول ترکیبین ناکافی ثابت ہوتی تھین تو بالکل الہامی و وجدانی طور پر از خود نئی نئی ترکیبین اس کے ذہن سے پیدا ہوتی تھین اور اس طرح گویا وہ اپنی ندرت تخیل کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان بھی پیدا کر رہا تھا، بیدل کو محض شاعر کہنا اور شاعر سمجھ کر اس کے کلام پر تنقید کرنا درست نہین، وہ شاعر سے زیادہ بلند چیز خنزید تھا بلکہ اس سے بھی ارفع ایک خلاق سخن تھا، ایک پیام رسان قدرت تھا حسن و عشق کی معمولی شاعری اس کے ذوق سے بہت فروتر چیز تھی اور اس کا ہر ہر لفظ ایک ایسا نغمہ لاہوتی تھا جس کی مثال سوائے الہامی کتابون کے کسی اور جگہ نہین ملسکتی۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو صرف سعدی، نظامی، حافظ، فردوسی، عرفی، نظیری، کی سطح سے بیدل کا مطالعہ کرین گے وہ یقیناً کوئی لطف اس کے کلام مین نہ پائین گے اور جنھون نے وہ مخصوص ذہنیت فطرت کی طرف سے نہین پائی ہے، جو بیدل کے حقایق و معارف کو سمجھ سکے، وہ اگر اس کے کلام کو مغلق مہمل اور لغو نہ قرار دین تو تعجب ہے

بیدل اپنے بعد لاکھون شعر اور سیکڑون صفحات نثر کے چھوڑ گیا، لیکن آپ باوجود سعی و کاوش اس کا ایک مصرعہ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہین دکھا سکتے جو اس کے حقیقی رنگ، اس کے ضمیمی پیام سے علیحدہ ہو، اس کی شاعری، اس کی انشا، یکسر وقف تھی صرف اس ایک جذبہ کے اظہار کے لئے کہ خالق و مخلوق کا تعلق نہایت و لانہایت کا سا تعلق ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ جو حقیقتاً صرف ایک پرتو ہے اُسی ایک آفتاب کبریائی کا، اپنے حیز اصلی، اپنے منبع فطری تک پہونچنے کے لئے بیتاب ہے اور یہ تمام جستجو صرف ایک حیرت ہے غیر متناہی، ایک حیرانی ہے ابدی، اور ایک بیکسی و بیچارگی ہے ناقابل علاج

کلیات بیدل کے تمام مجموعہ مین صرف رقعات ہی کا ایک حصہ ایسا ہو سکتا تھا جس مین اس امر کا امکان تھا کہ وہ اپنی نگاہ کو بلندی سے ہٹا کر پستی کی طرف مایل کرتا، لیکن اسپر اتنا زبردست رنگ چڑھا ہوا تھا کہ دنیاوی معاملات و تعلقات کے اظہار مین بھی وہ اپنے حقیقی رنگ طبیعت کو نہین چھوڑتا اور مادی تعلقات کی دنیا کو بھی وہ بالکل آسمانی و اثیری (Ethereal) صورت سے پیش کرتا ہے

وہ ایک شخص کو خط لکھتا ہے اور اس کی تعبیر ان الفاظ مین کرتا ہے:۔

شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وامی شود قطرۂ ما می رسد جائے کہ دریا می شود

کسی دوست کی پرسش پر وہ اس رنگ مین اظہار خیال کرتا ہے:۔

مشت خاکم عشق نادانستہ صیدم کردہ است اے حیا آہم مکن از ننگ صیادم مپرس

ایک جگہ نہ پہونچ سکنے کا عذر یون ہوتا ہے:۔

نگہ گر نشد قابل روئے دوست فغان می رسانم بجائے کہ اوست

ایک صاحب نے ایک دلق تحفۃً پیش کی تھی، اس کا شکریہ ان الفاظ میں ہوتا ہے:-

سزد کہ چشم ہوس از گل و سمن پوشیم سرے کشیم درین گودری (گدڑی) چمن پوشیم
ہوس دمے کہ تمنائے این لباس کند ہزار جان بہم آریم تا بدن پوشیم
اگر باین ہنرست آب و رنگ عریانی چہ لازم ست کہ ناعیب پیرہن پوشیم
دران بساط کہ وارستگی ست خلعت ناز مرقع سحر از بوئے یاسمن پوشیم

کسی صحبت گزشتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

ما ہم از گلشن دیدار گلے می چیدیم ہر کجا آئینہ بینید مرا یاد کنید

یہ ہے رنگ بیدل کا رقعات و مکاتیب مین۔ اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نکات، چہار عناصر اور مثنویون مین اُس نے کیا کچھ نہ لکھا ہوگا اور بلندی خیال، رفعتِ تصور، جدت بیان، اور ندرت ادا کے کیسے کیسے نادر نقوش اُن مین پائے جاتے ہونگے۔ چونکہ اس مضمون مین بیدل پر تنقید کرنا مقصود نہین ہے اس لئے مین زیادہ مثالین دینے سے معذور ہون، لیکن مذکورۂ بالا چند اشعار سے بھی کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیدل پر کسقدر گہرا اثر پیغام حقیقت کا تھا اور اس کی زبان کا ہر ہر لفظ اسی کے لئے وقف تھا

غالب کو اپنی ذہانت، فارسیت اور شاعری پر جتنا ناز تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہین، مشکل ہی سے وہ کسی کا قایل ہوتا تھا، لیکن بیدل کی جدت طرازیون اور معنی آفرینیون سے وہ بھی مرعوب ہو گیا اور اس حد تک کہ آخرکار اسنے اس کے تتبع کی کوشش شروع کر دی اور پھر خود ہی اس کے ذوق سلیم نے بتا دیا کہ کامیابی ممکن نہین۔ غالب کی ناکامی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اسنے زمین وہ نہین پیدا کی جو بیدل کی تخییل کو بارآور کر سکتی۔ بیدل نے صرف فلسفۂ تکوین کو سامنے رکھا اور اس مین بھی خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایان وسعت، اس کے مظاہر و آثار، اپنی محدود و ناکام جستجو اور آخر مین وحدت وجود جو نتیجہ ہے اس نوع کی سعی و جستجو کا۔ غالب نے غلطی سے بیدل کے اس رنگ کو منطبق کرنا چاہا مادی شاعری پر، مادی تغزل پر اور اُن واقعات حسن و عشق پر جو اس دنیا مین، انسانی گوشت پوست سے متعلق رونما ہوتے ہین، اس لئے جو کچھ اسنے لکھا وہ اُس کیف سے خالی رہا جو بیدل کے یہان پایا جاتا ہے اور چونکہ غالب کا ذوق شعری نہایت بلند تھا اُس لئے وہ اس کمی کو آخرکار خود بھی سمجھ گیا۔ بیدل و غالب کے کلام کے اس فرق کو آپ ذیل کی مثال سے سمجھ سکین گے

غالب کا مشہور شعر ہے:-

بساطِ عجز مین تھا ایک دل یکقطرہ خون وہ بھی سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگون وہ بھی

غزل اصغر لودہیانوی

خود اپنے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی — محمل غبارِ راہ سے پیدا کرے کوئی

دار و رسن ہے آگ ہے زندان ہے تیغ ہے — اب وقت ہے کہ تیری تمنا کرے کوئی

مجبور ہو کے اُن کی غلامی قبول کی — جب دل ہی دے نہ ساتھ تو پھر کیا کرے کوئی

مدہوش ہین کلیم بھی تابِ جمال سے — کیا اعتبارِ دیدۂ بینا کرے کوئی

موقوف ہے جو اُن کی ملاقات حشر پر — مقصد یہ ہے نہ روز تقاضا کرے کوئی

مایوس دل مین تابِ شکیب اسقدر کہان — ایسا نہ ہو کہ آپ کو رسوا کرے کوئی

زیرِ فلک نہین کسی شے کو بھی جب قرار — کیا آرزوئے دولتِ دنیا کرے کوئی

آ میفروش سے غمِ الفت خرید لین — کب تک شکایتِ غمِ دنیا کرے کوئی

آ اک نئے حرم کی بنا ڈالئے یہان — کب تک تمیزِ دیر و کلیسا کرے کوئی

آ ربطِ حسن و عشق سے دنیا کو گھیر لین — آخر کہان تلک انھین رسوا کرے کوئی

ہمراہ پھر چمن مین وہ جنت فریب ہے — پھر اہتمامِ ساغر و مینا کرے کوئی

یہ دیکھنا نہین جو سراپا نظر نہین — آئینہ بن کے آپ کو دیکھا کرے کوئی

افسانۂ جمیل ابھی یاد ہے نظیر — کس آسرے پہ عشق کا دعویٰ کرے کوئی

غزل ثاقب جالندہری

یہ چاہتی ہین انکی بیگانہ وار ادائین — دل ہمکو بھول جائے ہم دل کو بھول جائین

توبہ ضرور کی ہے۔ لیکن یہ سوچتا ہون — کیا چاہتی ہین مجھ سے چھائی ہوئی گھٹائین

امیدِ زندگی کا تھین آخری سہارا — ٹھکرائی جا چکی ہین جو میری التجائین

وحشی کو چھیڑتے ہین۔ وحشی کو چھیڑتی ہین — اٹھتے ہوئے بگولے چلتی ہوئی ہوائین

مایوسیون مین ڈوبین۔ ناکامیون سے الجھین — اک کشمکش کی دنیا رکھتی ہین التجائین

دل تنگ آگیا ہے اب نامرادیون سے — آ اے خیالِ دلبر تجکو گلے لگائین

گم کردہ راہ ثاقب ہم عمر بھر رہینگے
ہان بیخودی مین شاید منزل کو دیکھ پائین

رباعیّات

اللہ نے اعجاز یہ تمکو ہی دیا
ناکام محبت کا بھرم کھو ہی دیا
کیا جانئے کیون مجھکو سر محفل ناز
تم ہنس ہی دیئے دیکھکے مین رو ہی دیا

اے دکھتے ہوئے دل کے دکھانے والے
روتے ہوئے کو ہان رُلانے والے
اتنا نہین کرتے ہین کسی کو بیتاب
ھنستے ہوے مُنہ پھیر کے جانے والے

اُٹھ اُٹھ کے جھکی نگاہ جانان کیسی
ہوتی تھی ابھر ابھر کے پنہان کیسی
فوارۂ خون کا حال سینے مین نہ پوچھ
دل پر چلتی رہی ہین چھریان کیسی

اے دوست بتا ترا تکلم کیا ہے
چشمک کیا ہے ترا تبسم کیا ہے
اسوقت فضا ہے ایک سحر لرزان
آگے ترے مجھکو یہ توہم کیا ہے

ہان درد جگر کو کچھ تو اچھا کرلین
ہان سوز درون کو کچھ تو ٹھنڈا کرلین
رو لین ترا نام لیکے شام ہجران
دکھتے ہوئے دل کا کچھ مداوا کرلین

فراق گورکھپوری

.....داری ۱۰ر

[مو]لانا شرر مرحوم

- [عبد]الحمید بغدادی عہ
- ملکہ زنوبیہ ۳ر
- قرۃ العین ۳ر
- مخدرات ۸ر
- جویائے حق للعہ
- لعبت چین عہ
- فاتح مفتوح ۸ر
- بابک خرمی ۸ر
- الفانسو ۱۲ر
- ایام عرب ۸ر
- قیس ولبنیٰ ۸ر
- یوسف و نجمہ ۸ر
- زوال بغداد ۸ر
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین ۸ر
- رومتہ الکبریٰ ۸ر
- فلپانا ۸ر
- شوقین ملکہ ۸ر
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو ۸ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلہن عہ
- بدر النساء کی مصیبت ۸ر

میلی کا پھل عہ

شوق قدوائی

- ترانۂ شوق ۸ر
- قاسم و زہرہ ۱۲ر
- نیرنگ جمال ۸ر

میر ولی اللہ بی۔اے

- بندگی ۸ر
- ناس الکرام ۸ر
- لسان الغیب جلد اول ۸ر
- ″ ″ دوم ۸ر
- ″ ″ سوم ۸ر
- ″ ″ چہارم ۸ر
- نگہدانِ فصاحت ۸ر
- نادرۂ نایاب عہ

ظفر عمر بی۔اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری ۸ر
- بہرام کی گرفتاری عہ

مولانا نیاز فتحپوری

- گیتانجلی ۸ر
- گہوارۂ تمدن ۸ر
- نگارستان ۸ر
- صحابیات ۸ر
- تاریخ الدولتین ۸ر

سید سجاد حیدر بی۔اے

- زہرا ۱۴
- جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
- خیالستان ۸ر
- ثالث بخیر ۸ر

دلچسپ تاریخی جاسوسی ناول

- سراب نفتین ۸ر
- بالشوک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۱۲ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس عہ
- شیخ چلی عہ
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی ۸ر
- انقلاب فرانس ۸ر
- حسن بنارس ۸ر
- فطرتی جاسوس ۸ر
- ٹرکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور ۸ر
- زر پرست ۸ر
- کنجی کا راز ۸ر
- عبد الرحمٰن ناصر ۸ر
- عروس مصر ۸ر
- سیلاب خون ۸ر
- کرشمہ ۸ر
- وفادار دلہن ۸ر
- طواف زمین عہ

- سیاحت ہوا عہ
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر ۸ر
- اسرار بالشویزم ۸ر
- روح لیلیٰ ۸ر
- امین بک عہ
- حجاج بن یوسف ۸ر
- یوسف باغی ۸ر
- انقلاب عثمانی ۸ر
- بہرام کی رہائی ۸ر
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگزشت ۸ر
- لال کنور ۸ر
- پراسرار قتل ۸ر

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب ۸ر
- بزم خیال ۸ر
- مشاطۂ سخن عہ
- انشائے نسواں ۶ر
- مکاتیب محسن الملک ۸ر
- لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

- مراثی دبیر ۸ر
- مراثی انیس للعہ
- مراثی ضمیر عہ

- مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

- تذکرۂ حسینی ۱۱ر
- گلشن ۱۰ر
- سراپائے سخن عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی ۸ر

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز ۱۲ر
- کلیات عراقی ۱۲ر
- دیوان حافظ ۸ر
- دیوان نعمت خان عالی عہ
- کلیات انوری ۸ر
- دیوان بیدل ۱۰ر
- کلیات سعدی ۸ر
- دیوان عرفی ۱ر
- کلیات جامی ۸ر
- کلیات غالب ۸ر
- کلیات صائب ۱۲ر
- کلیات حزیں ۱۲ر
- دیوان عنصری ۱۲ر
- دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
- دیوان غنی کشمیری ۶ر
- دیوان ناصر علی ۶ر
- دیوان ہلالی ۶ر
- کلیات جلال اسیر ۸ر

دواوین اردو

- دیوان حسن دہلوی ۸ر
- کلیات ظفر ۱۲ر

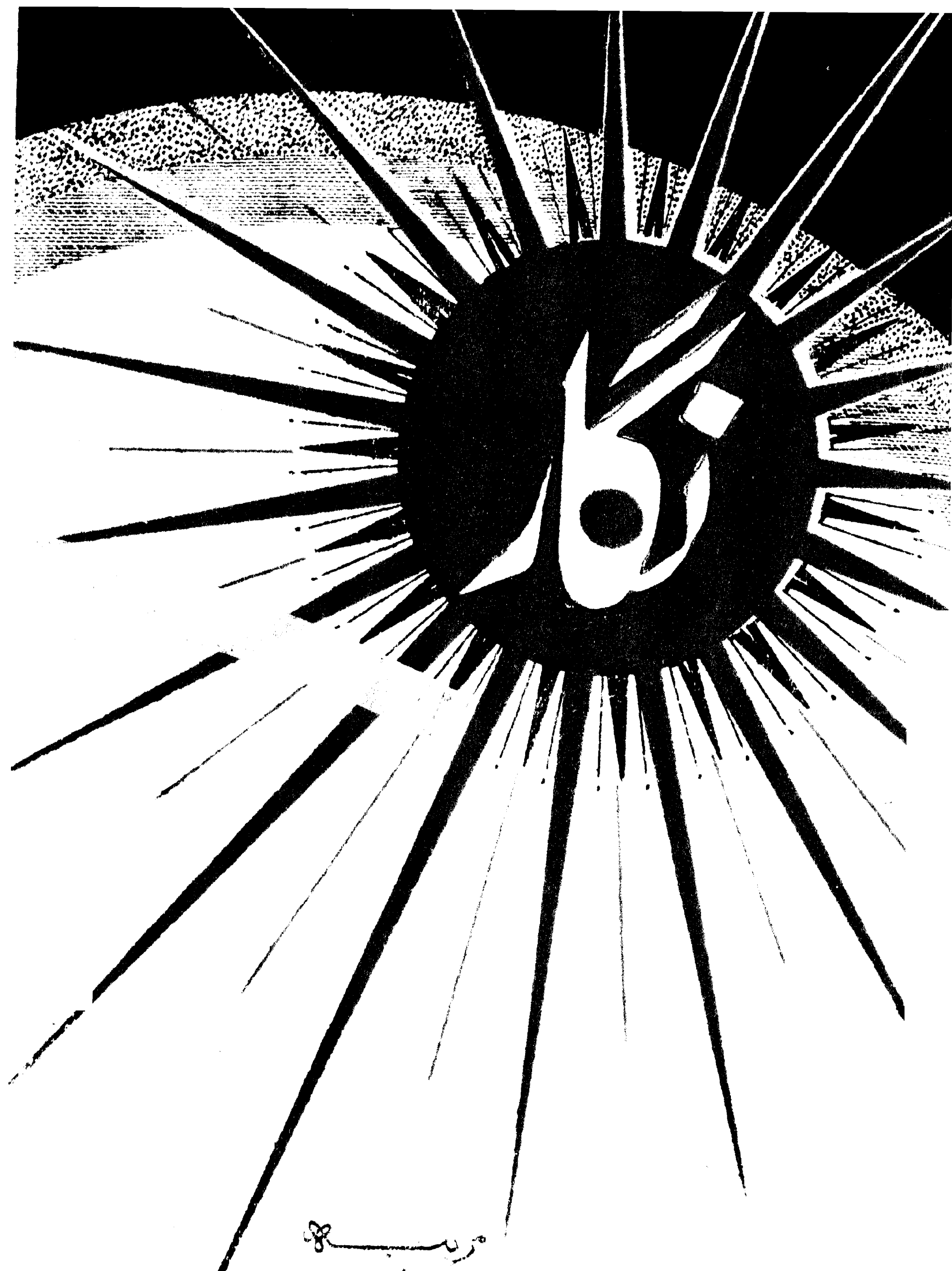
- دیوان ناسخ عہ
- کلیات میر ۸ر
- کلیات سودا ۸ر
- کلیات انشا ۸ر
- کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
- گلزار داغ ۸ر
- دیوان رند ۹ر
- دیوان ذوق ۱۲ر
- کلیات اسمٰعیل ۸ر
- مرآۃ الغیب عہ
- صحیفۂ عشق ۸ر
- فریاد داغ ۸ر
- دیوان قاتل ۸ر
- دیوان شہیدی ۸ر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات مع تصاویر رنگین ۸ر
- ″ باتصویر سادہ للعہ
- مجمع الفنون ۸ر
- طلسم فرنگ ۸ر
- کارخانۂ عالم عہ

زمانۂ رنگین دلوں کے ترجمے

- الہ دین و لیلیٰ ۸ر
- فریب حسن ۸ر
- سوزش عشق ۸ر
- روز ابیرٹ للعہ
- ناول اسرار ۸ر
- شام جوانی ۸ر
- طلسمی فانوس ۱۲ر



مدیر

نیاز فتحپوری

قواعد رسالۂ نگار

۱۔ رسالہ مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔

۲۔ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت روانہ نہ کیا جائے گا

۳۔ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵۔ مضامین صاف اور خوشخط لکھے ہونے چاہئیں

۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہندوستان ... روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت بہرحال پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار ختم ہونے سے ایک مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

تعداد مرتبہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	چوتھائی صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	چوتھائی صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۶ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد

- بنات النعش ۸
- مرآۃ العروس ۱۰/
- توبۃ النصوح ۱۰/
- موعظۂ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲/

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- ״ دوم صہ
- ״ سوم صہ
- الفاروق ہے و عہ
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم عہ
- سفرنامہ مصر و شام ہ و عہ

- علم الکلام ہہ و عہ
- الکلام عہ و عہ
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ۱۲
- ״ دوم عہ
- ״ سوم عہ
- ״ چہارم عہ
- ״ پنجم ۱۲/
- موازنۂ انیس و دبیر ہے

- مضامین عالمگیر عہ
- آغاز اسلام ۱۲
- کلیات فارسی شبلی عہ
- کلام شبلی اردو عہ و ہ

امیر مینائی

- صنم خانۂ عشق عہ
- مرآۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۸
- مینائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی عہ

رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار عہ
- خدائی فوجدار عہ
- جام سرشار عہ
- الف لیلہ چار جلد عہ
- کامنی عہ
- سوانح عمر دریا عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی عہ
- حاجی بغلول ہ

- پیاری دنیا ۸
- کایا پلٹ ۸
- میٹھی چھری ۶
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲

جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۱۰
- مار آستین ۱۰
- بنگالی دولہن ۱۲/
- مسعودہ فرنگی ۸

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

منظومات:-

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۱۷	اپریل سنہ ۱۹۴۰ء	شمار - ۴

ملاحظات

ایک قوم کے انحطاط کا بدترین دور وہ ہوتا ہے، جب وہ اس فریب مین مبتلا ہوتی ہے کہ صرف اسی کا مذہب خدا کا پسندیدہ مذہب ہے اور نجات محدود و مخصوص ہے محض اسی کیلئے - پھر جب وہ اپنے ادبار و ذلت، اپنے انحطاط و زوال کو دیکھتی ہے تو اسکی کوئی تاویل نہین کر سکتی کیونکہ اسکی سمجھ مین نہین آتا کہ خدا کیونکر تنہا سچے مذہب والی قوم کو تباہ کر سکتا ہے اور آخر کار وہ "چنان نماند و چنین نیز ہم نخواہد ماند" کہکر اپنی تسکین کر لیتی ہے اور پھر اُس سے زیادہ شدید فریب مین اپنے آپکو مبتلا کر کے غافل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ یہ غلط اعتماد، یہ خلاف حقیقت عقیدہ اسکے تمام قوائے عمل کو بیکار بنا دیتا ہے اور محض "سات آسمان کی گردش" پر "کچھ نہ کچھ ہو رہنے" کا خیال اُسے آخر کار پامال و معدوم کر دیتا ہے -

ہندوستان کے مسلمان بھی آجکل اسی دور سے گزر رہے ہین - ایک شاعر اُٹھتا ہے اور اسی اعتقاد کی بنا پر اپنے آپکو بغیر استعداد کے علو کا مستحق جانکر خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ "ہم نے یون تیرے نام کا اعلان کیا، اس اس طرح دنیا کے ہر گوشہ مین تیری پرستش کرائی اور تو ہی آج ہمین برباد کر رہا ہے یہ تو سمجھ کہ ہم نہ رہین گے تو پھر کون تیری کبریائی کا علم بلند کریگا" - نظام عالم بدستور اپنے اصول پر جاری رہتا ہے، آفتاب و ماہتاب مقررہ اوقات پر طلوع و غروب ہوتے رہتے ہین اور قدرت کو خبر بھی نہین ہوتی کہ کون کیا کہہ رہا ہے - کیونکہ وہان صرف فرد اعمال، پیش ہوتی ہے نہ کہ "دفتر اقوال" ـــــ ایک واعظ اُٹھتا ہے اور افراد ملت کو سمجھاتا ہے کہ عسرت و افلاس سے

ہندوستان کا مولوی ہر چند ترکی کو بیدین کہتا ہے اور اس کی ترقی کو نصرانیت و بیدینی کی ترقی قرار دیتا ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ آج اگر اسلام کا صحیح وجود کہیں پایا جاتا ہے تو صرف ترکی میں۔ جہان تجارت و اقتصاد کی ترقی ہے، فنون و علوم کی ترقی ہے معیشت و معاشرت کی بلندی ہے اور جہان کی قومیت ایک بنیان مرصوص کی طرح تمام بلاد یوروپ کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار ہے۔ ہندوستان کے گمراہ کن رہبر و علماء اب بھی غور کرین کہ مذہب و قومیت دو بالکل علحدہ چیزین ہین اور ایک ملک کی ترقی کا انحصار ہمیشہ جذبۂ قومیت پر ہوا کرتا ہے جو مذہبیت سے بہت زیادہ وسیع چیز ہے۔

مصر مین بھی اب حالات بدل گئے ہین اور یقین ہے کہ وہان بھی خود مختاری و آزادی کامل کا "یوسف کنعان" پھر جلد وطن واپس آنے والا ہے، لیکن آپ وہان جاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہان بھی جو چیز کام کر رہی ہے وہ صرف وطنیت و قومیت ہے جس نے عیسائیون، یہودیون اور مسلمانون کو ایک رشتہ و شیرازہ سے وابستہ کر دیا ہے اور کسی جگہ آپ کو مذہبیت کے سلسلہ مین اختلاف و افتراق کی جھلک نظر نہ آئے گی۔ اسی طرح ایران کی بیداری کا سب سے پہلا مظاہرہ وطنیت سے شروع ہوتا ہے اور تفریق مذہب کا سوال وہان کوئی اہمیت نہین رکھتا۔ الغرض ممالک اسلامی مین صرف وہین ترقی کے آثار نظر آتے ہین، جہان سے مولویون کی لعنت دور ہو چکی ہے یا ہو گئی ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان، جو ابھی تک اپنے صحیح دشمنون کو نہین سمجھ سکے بدستور ان رہبران قوم کو اپنا دوست سمجھے ہوئے ہین، اور ابھی تک وہ اس رمز کو نہین سمجھ سکے کہ مذہبیت بالکل انفرادی چیز ہے جسے نظام تمدن و عالم سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے۔ وہ چیز جو ہیئت اجتماعی کی تشکیل کرتی ہے، جو ملک کے افراد کو ایک مرکز پر لاتی ہے صرف وطنیت و قومیت ہے اور اگر آج یہ جذبہ ہندوستان کی آبادی مین قوی ہو جائے تو تمام اختلافات از خود مٹ جائین اور مادرِ وطن کی وہ آرزو جس کی تکمیل کے لئے وہ بیچین ہے ابھی پوری ہوئی جاتی ہے۔

یہ خبر غالباً تمام ناظرین نگار کے لئے باعث حیرت ہوگی کہ ملاحظات کے ابتدائی صفحات ریل مین اور آخری صفحات مین حضرت ہوش بلگرامی کے پاس بیٹھا ہوا لکھ رہا ہون۔ یعنی پہلی مرتبہ حیدرآباد آنے کی تاریخ مقرر کرکے ٹال گیا اور اب پہونچنے کے بعد بھی یہ نہین بتانا چاہتا کہ کب یہان پہونچا۔ مین یہان کیون آیا ہون۔ اور کب تک رہونگا۔ اس کی تفصیل کے لئے آپ ماہ آیندہ کے ملاحظات کا انتظار کیجئے تاہم یہ اظہار ضروری ہے کہ جو حضرات براہ راست مجھے کسی امر مین مخاطب کرنا چاہین وہ ۱۵ اپریل تک اس پتہ سے مراسلت فرمائین:۔

ذریعہ مولوی سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی۔ نائب معتمد افواج سرکار عالی

رسالۂ عبداللہ قدیم — حیدرآباد (دکن)

چونکہ مین لکھنؤ سے باہر ہون اس لئے مجھے پوری طرح یاد نہین کہ اس مہینے مین کس کس کا مضمون درج ہے اور ان مین سے کسی کے متعلق مجھے لکھنا ہے یا نہین۔ تاہم قوت حافظہ پر زور دینے کے بعد مجھے یاد آتا ہے کہ ایک تو صحرائی صاحب کا فسانہ شاید پریم کی پیاسی کے نام سے شایع ہو رہا ہے اور مجھے یہ بھی خیال ہے کہ جس وقت اس کی کاپی میرے سامنے طیار ہوکر آئی تھی تو مینے اس کے مطالعہ کے بعد یہ رائے قایم کی تھی کہ صحرائی صاحب کا ذوق فسانہ نگاری ہنوز بہت نارسا ہے اور ضرورت ہے کہ وہ پہلے انسانی زندگی کا مطالعہ بالکل صحیح اصول فطرت کے لحاظ سے کرین اور پھر جب وہ اس مین کامیاب ہوجائین تو فسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہون۔

مومن و کلام مومن کا باقی حصہ ماہ آیندہ مین ختم ہو جائیگا۔

اس مہینے سے علامۂ آصفی نظامی پر جناب عرشی رامپوری کا نہایت بسیط مقالہ شایع ہونا شروع ہوا ہے اور جیسا کہ آیندہ اجزا سے معلوم ہوگا، فاضل مقالہ نگار نے پوری تحقیق و کاوش سے کام لیکر داد سخن دی ہے۔ علاوہ ملاحظات و استفسارات کے میرا ایک مضمون تو آپ پڑھ چکے ہونگے جو واقعی مزاحیہ ہے اگر آپ اُسے سنجیدگی سے نہ دیکھین — اور دوسرا وہ ہے جو آدم و حوا کی تخلیق سے بہت قبل ایک واقعۂ آفرینش سے متعلق ہے اس مضمون کی تحریر سے اصل مدعا وہ ہے جو اس کی آخری دو سطرون مین ظاہر کیا گیا ہے۔ اب اس پر عمل کرنا نہ کرنا ہمارے واعظین کا کام ہے۔

دونون استفسار مذہبی ہین اس لئے اگر جواب کے سلسلہ مین کسی کو بوئے دہریت و لامذہبیت آئے تو اس کا ذمہ دار مین نہین ہون۔ بلکہ پبلک ہے جو اب کسی طرح مولویون کے بتائے ہوئے اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ نہین ہوتی۔ نظمون کے متعلق مجھے بالکل یاد نہین آتا کہ کس کس عنوان پر کن کن حضرات نے لکھی ہین تاہم یہ ضرور یاد ہے کہ ہین سب معقول اور اچھی

گزشتہ ماہ کے نگار کا سرورق رنگین شایع ہونا صرف منیجر صاحب کی اُپج ہے، جس کو مین نے پسند نہین کیا۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ وہ نگار کی سادگی کی روایت کو بدستور قایم رہنے دینگے ممکن ہے کہ بعض ناظرین نگار نے اس کو پسند کیا ہو، لیکن مین یقیناً اس سے خوش نہین ہون۔ اگر اپریل کا سرورق رنگین چھپ گیا ہو تو براہ کرم آیندہ سے وہ اسکا لحاظ رکھین۔

اس ماہ کا رسالہ بالکل میری غیبت مین چھپ رہا ہے، نہ مین کاپیان دیکھ سکا اور نہ مضامین پر اصلاحی نگاہ ڈال سکا اس لئے جو سقم اس مین نظر آئے اس کے ذمہ دار ہمارے منیجر صاحب کو قرار دین اور جو خوبی معلوم ہو تو مجھ سے منسوب کر دین (اگر جی چاہے)

ظفر نمبر کے انعامی مضمون کے متعلق ماہ آیندہ مین عرض کرونگا جو عرض کرنا ہے۔

نیاز

خاقانی ہند، قاآنی عصر، علامہ آصفی نظامی رح

آصفی گرچہ نمائیم بہ گیتی بسیار
لیکن از عشق بماند سخن ما باقی

سنہ ۱۴ھ مین عربون نے ایرآن پر حملہ کیا۔ اور سنہ ۲۳ھ مین کشا دولبست کے مالک ہوگئے۔ جب تک ایرآن عرب کا حریف رہا، اس کے پاس سب کچھ موجود تھا، لیکن جس روز میدان کارزار مین ہتھیار رکھے نہ صرف ملک و دولت ہی ضائع کی بلکہ علوم و فنون مین بھی پسپا ہوگئے۔ اور فارس کے کیانی تخت اور کاویانی صنائع کو چند بادیہ نشینون کی نگاہ رحم پہ چھوڑ دینا پڑا۔

دنیا واقف ہے کہ مغلوب کو غالب کی پزیرائی کرنی پڑتی ہے۔ مگر درحقیقت یہ خیر مقدم بادلِ ناخواستہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ غیر معمولی مدت کی تاثیر اور تاثر کے باوجود بھی حاکم اور محکوم قومین، علم و عمل کے ہر ہر گوشہ مین متحد الخیال نہین ہوجاتین۔ لیکن دنیا کے علی الرغم، عرب کو خزینۂ فطرت سے کچھ ایسی جاذبیت عطا ہوئی تھی۔ کہ جہان گیا۔ آنکھون پر چلا۔ اور دلون مین جگہ کی

ایرآن نیم وحشی قبائل سے ابتداً نفرت کرتا رہا کیونکہ ابھی تک زخم تازہ تھا، اور عربی تلوارین، زرتشتی مذہب کے خون سے رنگین نظر آرہی تھین مگر جسقدر ان کے حقیقی اوصاف و خصائص سے آگاہ ہوتا گیا، اُن کی جنسیت قبول کرتا گیا تا آنکہ بہت ہی تھوڑے عرصہ مین اپنی جداگانہ ہستی گم کرکے ازسرتاپا عرب ہوگیا

یہ ایران کی وہ خصوصیت تھی، جس کی نظیر پیش کرنے سے واقعات و حوادث کا ذخیرہ ابھی تک قاصر ہے تکبیر کی صدائین بلند ہوتے ہی دنیا بدل گئی۔ آتش پرست پیشانیان، نمرودی سجدہ گاہون سے منحرف ہوکر، ابراہیمی گھر کی طرف جھک گئین، اور مادہ کو روحانیت نے شکست دیدی۔

ادہر اسلام کی یہ خصوصیت، کہ جہان پہنچا۔ ذہن و فکر مین انقلاب پیدا کردیا۔ ایرآن اس اثر سے کس طرح متاثر نہوتا۔ عرب فاتحانہ دراتے گھس پڑے۔ اور ایرآن نے ملک و دولت کے ساتھ ساتھ، مذہب و ملت، اور علم و فن سے بھی کنارہ کرلیا، حکومت و مذہب دونون کی زبان عربی تھی۔ چند روز مین "بندہ ایرانی ہستم" کے بجائے "انا مسلمٌ" کی صدائین آنے لگین

مذہب نے لایعنی شعر و شاعری کو گمراہی قرار دیا تھا۔ ایران مذہبی جوش سے دیوانہ تھا۔ اس لئے اور علوم کے ساتھ اپنا لٹریچر بھی نذر آتش کر بیٹھا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ابھی نصف صدی بھی اسلام پر نگذرنے پائی تھی کہ اندرونی

مناقشات شروع ہوگئے۔ خدا کی قدرت، کہ یہی ایران، عرب کا حریف بن کر میدان جنگ مین اترا۔ ان مناقشات سے مذہب و سیاست کو جو کچھ نقصان پہنچا۔ اس کا تذکرہ تو یہان بے محل ہے۔ مگر مطلع ادب بھی ایسا غبار آلود ہوا، کہ تیسری صدی ہجری تک صاف نہو سکا۔

چونکہ قانونِ فطرت نے صنعت کو حکومت کا تابع بنایا ہے۔ اس لئے جب کسی قوم مین ملک گیری کا جذبہ نشو و نما پاتا ہے۔ تو علوم و فنون کی بھی جستجو شروع ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر دولت و حکومت سے تمدن، اور تمدن و تہذیب سے صنائع پیدا ہوتے ہین،، اور جون جون تمدن و تہذیب کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ علوم و فنون کی کثرت ہوتی جاتی ہے۔

عرب مین بھی یہی ہوا۔ ملک گیری سے فراغت پاتے ہی صنعت و حرفت کا چرچہ شروع ہوگیا۔ آغاز طلب مین ذوق کی وسعت، مذہب اور اس کے متعلقات تک محدود رہی، لیکن رفتہ رفتہ صحرا نوردی نے تشنگی بڑھا دی۔ جو آگے چل کر اسقدر بڑھی کہ فضل و کمال کے سمندر بھی سیراب نکر سکے

ایران عرب کا مقلد تھا۔ جب تک یہان خموشی طاری رہی۔ دنیائے ایران بھی خواب غفلت مین پڑی رہی مگر عرب کا کروٹ بدلنا تھا۔ کہ عجم بیدار ہوگیا۔ اٹھا۔ قدم بڑھایا۔ اور چشم زدن مین عرب حریف سے آگے نکل گیا۔ دنیائے دیکھا، اور دیکھکر انگشت بدندان رہ گئی۔ فقہ و اجتہاد مین، ابو حنیفہ کوفیؒ، حدیث و رجال مین بخاریؒ و مسلمؒ، فلسفہ مین فارابی و سینا، کلام مین رازی و جاحظ ادب و متعلقات ادب مین سیبویہ اور ابو علی فارسی وغیرہ وہ لافانی ہستیان سامنے متمکن نظر آئین۔ کہ نگاہین خیرہ ہو کر رہ گئین

خیر۔ عجم نے عرب اور عربی علم و ادب کی تو خوب نقالی کی۔ مگر خود اپنے ادب و شعر کو بھولا دیا۔ جب ذوق کو نئے میدان کی تلاش ہوئی تو یہ از یاد رفتہ گوشہ یاد آیا۔ مشغلہ دلچسپ تھا۔ ہاتھون ہاتھ لیا گیا ذوق نے پذیرائی کی اور دل مین جگہ دی۔ مگر اس عرصہ مین ایران اپنی شاعری کے پارینہ اجزاء ترکیبی سب فراموش کر چکا تھا۔ نیا نقشہ تیار کرتے وقت، عربی بنیادون پر داغ بیل ڈالی گئی۔ چنانچہ وہی بحور، وہی زحافات، وہی صنائع بدائع، وہی تخیل، حتی کہ وہی خط بھی استعمال کیا گیا

چند سال مین فارسی شاعری نے مرتب و مہذب شکل اختیار کر لی۔ گذشتہ دو ڈھائی صدی کے مسلسل جمودِ خیال نے تخیل سے بیگانہ کر دیا تھا۔ ادھر استادِ عرب بھی سادگی پسند تھا۔ تو زائیدہ بچہ نے، سادے، سچے، اور پاکیزہ جذبات ہی سے دامن بھرے۔ لیکن ہوش سنبھال کر، حکومت کے دوش بدوش چلنا پڑا۔ جو معنوی حیثیت سے عجم مین منتقل ہوگئی تھی،، اس لئے جھوٹی تعریف، بیجا مدح سرائی۔ اور جوش مسابقت نے اصلی روح فنا کر دی۔ البتہ تخیل مین وسعت ہوئی۔ اور چھ سو سال کے اندر گوشہ گوشہ مکمل ہوگیا

کسی حکیم کا قول ہے ؎ اگر پدر نتواند، پسر تمام کند۔ فارسی شاعری اس کا آئینہ ہے۔ اس نے آنکھین کھولکر عربی شعر کو دیکھا تھا۔ جو قدیم خصوصیات کو خیرباد کہکر خلفاء، وزراء، سلطنت، اور اراکین حکومت کا کاسہ لیس بن چکا تھا

دماغ پر اگلے خصائص کے کچھ دھندلے سے نقوش ابھی تک باقی تھے - اس لئے اتنی آن ضرور تھی - کہ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا اور ہجو کے پل باندھ دیتا - مگر یہ جو پروان چڑھی، تو نئی نئی امنگیں ساتھ تھیں - آن کی آن میں کچھ سے کچھ ہو گئی - پہلے جو کچھ نشاء نخوت و غرور تھا تو ایک مرتبہ بگڑ کر بول اٹھی تھی

دو شعر رسم بود شاعران طامع را یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور نداد، ہجا من این دو گفتہ ام اکنون چہ حکم فرمائی

انوری

لیکن آخر کار یہ سبق فراموش کر دیا - عرب نے زیادہ سے زیادہ کچھ کہا - تو دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ بنا دیا - مرجع مخلوقات اور ملجاء انام کہدیا - مگر اس نے بسم اللہ کی تو اس شعر پر - کہ

نہ کرسئ فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

انوری

جس کا آغاز یہ ہے - اس کا انجام اور کیا ہو سکتا ہے شریف جذبات کو یکقلم خیرباد کہدیا - اور مدح سرائی شروع کر دی - مدح کے لئے قصیدہ سے بہتر جامہ ممکن نہ تھا - اس لئے فارسی دماغ نے اسی میدان کو اپنا جولانگاہ بنایا - اور انوری، ظہیر فاریابی حسان العجم خاقانی وغیرہ شعرا پیدا ہوئے - چونکہ یہ عہد اپنے مبدا سے قریب تھا، ادھر قومی زندگی بھی سیاہ ہیولیٰ نہ تھی اور تمدن و تہذیب کے تکلفات نے تخیل میں گمراہی نہ پیدا کی تھی - اس لئے اس عہد کی زبان صاف، خیالات بڑی حد تک سادے، تصنع سے پاک، اور فطرت سے قریب رہے - تشبیہات قریب الفہم اور محسوس استعمال کی گئیں - اور استعاروں میں بھی بال کی کھال نہ نکالی - البتہ لفظی صنائع کا زیادہ لحاظ تھا - وہی نظم بہتر شمار ہوتی جو الفاظ کی صنعت سے زیادہ مالامال نظر آتی

اس کے بعد زمانہ نے تاریخ کا دوسرا ورق الٹا - خلفا کے بچے گداگر، اور سلاطین کے محل خاک کا ڈھیر ہو گئے دنیا کی بے ثباتی کا اس سے زائد صاف اور موثر منظر کیا ہو سکتا تھا - شعرا کی تخیلی دنیا میں بھی زبردست انقلاب ہوا - دنیا اور اس کے حکمرانوں کے بجائے آخرت اور اس کے مالک کا خیال دماغ نشین ہوا - اور مدحیہ خیالات کی جگہ، صوفیانہ واردات و جذبات نے لی ان اسرار و رموز کی تشریح کے لئے ایسے وسیع صنف کلام کی ضرورت پیش آئی جو دریائے مواج کی طرح ہر غیر ضروری پابندی سے آزاد ہو جستجو شروع ہوئی - اور دقیقی و فردوسی کا ساز ہاتھ آ گیا - لکھنے والوں نے لکھنا شروع کیا - اور دنیا خدائے سخن نظامی جامی، خسرو، عطار، اور مولانائے روم جیسی باجبروت ہستیاں دیکھ کر دنگ ہو گئی - اس زمانہ میں، الفاظ میں جوش، بندش میں چستی، اور معانی میں بلندی پیدا ہوئی - مدح میں اغراق فخر میں تعلی عشق و محبت میں جذبات لطیفہ، اور وارداتِ قلبی کی جھلک نظر آنے لگی - گو یہ دور مثنوی کہلاتا ہے - لیکن قصائد و غزل کی ترقی بھی اسی کی پروردۂ احسان ہے - قصائد میں تخیل آفرینی، غزلیات میں جذبات نگاری، اور

تشبیہ و استعارہ مین لطافت داخل ہوئی ۔ اس عہد کے ممتاز شعرا خاجو، حافظ شیرازی وغیرہ ہین ۔ جو اپنے خصوصیاتِ غزل کے باعث قبولیتِ عام کے مالک بنے

لیکن ارتقائے شعر کی آخری کڑی باقی تھی ۔ زمانہ نے ایک اور کروٹ بدلی ۔ نوین صدی ہجری مین ایران مین طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوکر مرکزی حکومت قائم ہوئی ۔ اور ہندوستان مین مغلیہ ستارہ اوجِ اقبال پر چمکا ۔ تمدن و تہذیب نے مختلف زاویون مین ترقی کی ۔ اور اکبر و عباس صفوی کے عہدِ حکومت نے عالم سرسبز ہوگیا فطرت ابھی تک محو خواب تھی ۔ نئے انداز سے انگڑائی لیکر اٹھی عشق ہمیشہ دماغ پہلے ہی مخمور تھا ۔ فطرت کے بے نقاب نظارون نے اور آگ لگادی اور جب کہ وہ نغمۂ عشق تھے بیتاب نکلنے کے لئے ۔ ایک ایسا ساز درکار ہوا جو محبت کی دبی ہوئی آگ کو سلگائے ۔ جلائے ۔ بھڑکائے، اور بھڑکا کر عالم کو تودۂ خاک بنادے ۔ متقدمین نے عرب محسن سے ایک ساز پایا تھا ۔ جسے غزل یا تشبیب کہتے تھے متوسطین تک تو اس مین سامانِ ذوق ہی نہ تھا لیکن حافظ و خواجو، اور حسن و خسرو نے جو سرگردۂ عہد متوسط ہین اسے استعمال کیا تھا ۔ اور اپنی خوشنوائی سے عالم کو مسحور کر دیا تھا ۔ امتداد زمانہ نے جب اسکی صدائین بے کیف کردین ۔ تو ان حسن پرست حریفون کی باری آئی ۔ یہ اٹھے ۔ بجایا ۔ اور گوناگون نغمات سے عالم کو مدہوش کر دیا اس عہد کے باوا آدم فغانیؔ ہین ۔ گو فغانی سے بہت پہلے، حافظ وغیرہ کی بدولت غزل کی زبان شیرین ہوچکی تھی ۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہین امتداد زمانہ کے ہاتھون شیرینی غائب ہوکر ۔ خالص الفاظ کے داو پیچ پر مدار رکھا گیا تھا ۔ تناسب لفظی اور ایہام کی حکومت تھی ۔ فغانی نے تجدید کرنی چاہی تو چارون طرف سے نفرین کی صدائین بلند ہوئین ۔ اور مہملیت کا خطاب ملا ۔ جو یہان تک زبان زد ہوا ۔ کہ مہمل کلام کا نام ہی فغانیہ رکھدیا گیا ۔ مگر فطرت کی مقاومت مجہول دیکھئے ۔ کچھ ہی دنون مین فغانیت غالب آگئی ۔ اور غزالی ۔ عراقی، وحشی، عرفی، نظیری وغیرہ پیدا ہوئے ۔ انھون نے کرخت اور عشقیہ جذبات کیلئے ناموزون الفاظ بالکلیہ خارج کر دیئے ۔ نازک ترین تخیلات ادا کرنے کے لئے ویسے ہی نازک اور لطیف ترکیبین وضع کین ۔ دقتِ معنی اور رقتِ جذبات نے استعارات اور تشبیہون مین ندرت پیدا کی ۔ اور تصوف ۔ فلسفہ اور اخلاق کے موتیون سے غزل کا دامن بھر دیا

مدت تک یہ دل سوز نوائین، سامان گرمی محفل رہین ۔ لیکن رفتار کی بے اعتدالی نے ایک ور راستہ پیدا کر دیا اس کے سالک کچھ ایسے بیخود اور ناآشنائے منزل تھے ۔ کہ راستہ ہی مین گم ہوکر رہگئے ۔ ان مین شوکت بخاری، علی سرہندی اور میرزا عبدالقادر بیدل ممتاز ہستیان ہین

دراصل یہ لوگ متاخرین کا تتمہ ہین ۔ بعض بعض شاعر اس زمانہ مین بدمذاقی کی طرف قدم اٹھا چلے تھے ۔ مذاق عام سلیم تھا اصلاح ہوگئی ۔ لیکن آنے والا گروہ تباہ ہوگیا ۔ ان نوواردون نے اپنے سامنے کچھ نشانہائے قدم دیکھے ! ور آب و سراب مین امتیاز کئے بغیر چل کھڑے ہوئے ۔ سامنے بدمذاقی کے عمیق غار تھے ۔ اوندھے منہ جارہے ۔ غزل پڑھتے چلے جاؤ ۔

مبالغہ، غلو، استعارے گورکھ دھندے، اور تشبیہات کی بھول بھلیان نظر آئین گی جس مین جنون جولانی کے سوا بس خدا کا نام ہے۔

مگر رفعت و عروج کی انتہا نئے انقلاب کا مادہ تیار کرتی ہے۔ گذشتہ چھ، سات سو سال مین، فارسی تخیل بلند ہو کر فلک پیما ہو چکا تھا۔ انقلاب ہوا۔ اور زبردست ہوا۔ میرزا غالبؒ اپنے شکستہ ساز کے بے کیف نغمون مین گم تھے۔ کہ ایران مین ایک دماغ نے نظم کی کایا پلٹ دی۔ یہ شخص زبردست فاضل، اور متعدد مغربی زبانون سے بھی واقف تھا۔ حضرت نے مذاق سلیم سے بہرہ مند کیا تھا۔ اسلئے مئے اور پہیلیان ابتدا سے گران گذرتی تھین آخر طبیعت نے اُبھار کر قدما کی روش پر ڈالدیا۔ اس نے ہمت کی اور قصائد مین سلاست و روانی کے دریا بہا دیئے۔ فلک پیما دماغ خستہ ہو چلے تھے۔ سب نے یہی سادہ روش اختیار کر لی ایران کی ہوا بدلنے کی خبر ہندوستان پہنچی تو غالب زندہ تھے۔ سنا اور عش عش کرنے لگے۔ مگر وقت نکل چکا تھا۔ اور تیر کمان سے باہر تھا۔

برسر مطلب

گو میرزا حبیب قاآنی اور اسد اللہ خان غالب ہمعصر تھے۔ مگر دونون کے مسلک مین نمایان فرق تھا ایرانی متقدمین کے راستہ پر گامزن تھا۔ اور ہندی، نظیری و عرفی کی مسخ شدہ صورت کا والہ و شیدا تھا منزل قابل جادہ پیمائی تھی اگر جا پہنچتا۔ مگر افسوس صرف نشان ہائے راہ کو منزل سمجھ کر رہگیا عبد القادر بیدل، علی سرہندی۔ بدر چاچ۔ شوکت بخاری وغیرہ داخل درس تھے۔ بیچارہ برسون اسی آئینہ خانہ مین محو حیرت رہا۔

لیکن یہ انقلاب ایران ہی مین نہوا۔ ہندوستان مین بھی ہوا۔ مذاق کی پستی کے عالم گیر اثر کو صرف قاآنی کیون محسوس کرتا۔ ہندوستان کی ہوا زبان سے زیادہ مسموم تھی۔ غالب کو بھی انقلاب شعری کی ضرورت نے اُبھارا۔ مگر کیا کرتا۔ یہ فخر اس ہستی کے لئے ودیعت ہو چکا تھا۔ جو یو۔پی کے مردم خیز خطہ رامپور مین پیدا ہونیوالی تھی یہ شخص جو آگے چل کر "علامۂ آصفی نظامی"، کہلایا۔ اس وقت پیدا ہوا۔ جب قاآنی و غالب دنیا کے شعر کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اور ایران و ہند مین فارسی شاعری کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ قاآنی نے تو اپنے بعد کوئی ممتاز ہستی چھوڑی ہی نہین۔ البتہ ہندوستان مین دو چار شخصیتین ایسی موجود تھین جنکی طرف نگاہین اُٹھتی تھین مگر اچانک مغربیت کا طوفان آیا۔ اور ایشیائیت بہتی چلی گئی قدامت پسندون نے بند باندھے۔ مگر بے سود۔ دریا راستہ بنا چکا تھا۔ رہی سہی امیدین بھی نذر آب ہو گئین

فطرت انقلاب ذوق و اختلاف طبائع کا سرچشمہ ہے اُٹھی۔ اور اس رامپوری بچہ کو گود لے لیا۔ یہ جب مکتب مین گیا۔ تو درسیات فارسی، دیوان شوکت بخاری، غزلیات ناصر علی سرہندی، نکات میرزا بیدل، اور قصائد بدر چاچ سے عبارت تھے مروج مذاق نے حافظ و نظیری وغیرہ کو شرف قبولیت نہ بخشا تھا جذبات قلبی، اور واردات روحانی کے بجائے، چیستانون پر سر دھنا جاتا تھا۔ اس بچہ نے یہی کتابین پڑھین، انھین کے مطالب کو دماغ مین جگہ دی۔ اور حیدرآباد گیا۔ تو انہی کو ہمراہ لے کر گیا۔ مگر اہل زبان کی صحبتون نے رہنمائی کی۔ اور حقیقت کا دامن ہاتھ آگیا نابردہ

راہ دماغون کی جگہ، نظیری، عرفی، اور قاآنی نے لی۔ اور قصائد و غزلیات دونون مین اساتذہ کی تصویرین جھلکتی نظر آنے لگین۔

(۲)

نسبتے با دودمانِ عالی عشقم بس است
آصفی از نسبتِ آبا و اجدادم مپرس

تام، نسب، مولد محمد عبد الجبار خان نام، آصفی تخلص، اور نظامی لقب تھا۔ والد کا نام حافظ عبد الرزاق خان، اور دادا کا حافظ محمد عبد اللہ خان عرف حافظ کلان تھا۔

جناب حافظ احمد علی خان صاحب شوقی نے، جو رامپور اسٹیٹ لائبریری کے مہتمم اور سردار ڈیوڑھی ہین، رامپور کے علما، صلحا، اور فقرا کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ جو تذکرۂ کاملین رامپور کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ مرحوم کو بھی خط لکھا تھا۔ جواب مین انھون نے اپنے مختصر حالات، اور کتابون کی فہرست لکھ بھیجی تھی۔ میرا ماخذ وہی خط ہے۔ فرماتے ہین۔

"کرم نامہ بر طلب احوالِ خاکسار و تصانیف و تالیفات صادر ہوا، ممنونِ کرم کیا۔ بہ تعمیل حکم شریف حالات لکھدیئے گئے۔ کمی و زیادتی کا اختیار ہے۔ اہل رامپور کے تذکرہ مین شریک ہونے کا شرف بطفیلِ ذاتِ ہمایون ہوگا۔ ورنہ مین کہان، اور رامپور کا تعلق کہان۔ چالیس سال سے سرکارِ نظام کے سایۂ عاطفت مین بسر ہو رہی ہے۔ جو کچھ اکتسابِ علوم ہوا وہ اسی سرزمین مین ہوا، بہر کیف تھوڑا تعلق بھی دنیوی اعتبارات سے کافی ہے۔"

حضرت آصفی نسلاً افغانی تھے۔ غالباً ان کے دادا حافظ کلان افغانستان سے ترک سکونت کرکے رامپور مین اقامت گزین ہوئے تھے۔ آصفی یہین پیدا ہوئے۔ اور یہین عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

حافظ محمد عبد اللہ خان کو علوم دینیہ مین بڑی دستگاہ تھی۔ جید قاری اور ریاضت و مجاہدہ مین اکابر زمانہ مین شمار ہوتے تھے۔ حضرت آصفی نے اپنے تذکرہ مین انکے متعلق لکھا ہے

"فقیر کے دادا عالم متبحر، حافظ اور قاری جید تھے ریاضت و مجاہدہ مین اکابر زمانہ سے تھے۔ بڑے بڑے علما و صلحا ان سے استفادۂ معنوی کیا کرتے تھے۔ سید حسن شاہ صاحب محدث جو رامپور کے اعلیٰ درجہ کے علمائے اسلامی سے تھے۔ خاکسار سے فرماتے تھے۔ کہ تمھارے دادا عزیز الوجود تھے۔ مین ان کی خدمت مین حاضر ہوا کرتا تھا۔ مولوی مختصر صاحب ان کے فیض یافتون سے تھے۔ علی ہذا الاکثر نامور علما اور اصحاب طریقت ان سے مستفید ہوتے تھے۔ اس زمانہ مین کہ راستے پر خطر اور اسباب سفر دشواری سے

بہم ہوتے تھے۔ سات بار زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ روضۂ منورہ سے بہت کچھ انوار و برکات حاصل کئے۔ تقویٰ اس درجہ تھا، کہ بے نماز آدمی کے ہاتھ کی چیز کا کبھی استعمال نہین کیا۔ ریاست ٹونک اور جاورہ سے سالانہ معقول طور پر امداد ہوتی تھی۔ کسی رئیس کے مکان پر نہین جاتے تھے، نواب احمد علیخان، فرمان روائے رامپور کے عہد مین رحلت کی"

علم میراث اب وجد نہین۔ ایک وہی فضیلت ہے۔ حافظ عبد الرزاق خان وہ دل و دماغ لیکر نہین آئے تھے جس کی علم کو ضرورت تھی۔ ایسے متبحر اور شیخ العصر باپ کی فیضِ صحبت سے حفظ کلام اللہ اور قرأت کے سوا کچھ نہ پایا۔ آصفی نے جہان ان کی علمیت کا تذکرہ کیا ہے، صرف "حافظ اور جید قاری تھے" لکھا ہے۔ غدر ۵۷ء سے پہلے حافظ عبد الرزاق خان تجارت کے ذریعہ بسر اوقات کرتے تھے۔ غدر کی آگ فرو ہوجانے کے بعد طلبِ معاش کے لئے ہرات و قندھار کا طویل سفر کیا۔ مقصد تو یہ تھا کہ اس سفر سے ہند و افغانستان کے درمیان ایک مستحکم سلسلۂ تجارت قائم کرین۔ مگر اثنائے راہ مین امیر خداداد خان والی قلات نے روک لیا۔ اور آپنے ہان فوج مین جمعدار رسالہ مقرر کردیا۔ مثل مشہور ہے "عشق اور مشک کبھی نہین چھپتے" اس مین "علم و فضل" کے اضافہ کی اور ضرورت ہے۔ استعداد اور علمیت بھی اپنی غماز ہین چند روز مین والی قلات کو علم ہوگیا کہ یہ نیم ہندی جید حافظ اور زبردست قاری ہے۔ چنانچہ اپنے لڑکون کی تعلیم اُن کے سپرد کرکے عہدۂ رسالداری اور تین سو سوار عنایت کئے تقریباً بیس سال امیر موصوف کے موردِ عنایات رہے۔ اس کے بعد ترک روزگار کرکے رامپور چلے آئے اور شاہجہانپور کے علاقہ مین ایک موضع خرید کر ازسرِ نو تجارت پیشہ کیا۔ کچھ دنون کے بعد معہ اہل و عیال چندوسی چلے گئے۔ اور کھنڈسار سے وجہ معیشت پیدا کرتے رہے۔ آخرِ عمر مین اس سے بھی دست کش ہوگئے اور ۱۳۱۳ھ مین وہین انتقال کیا

آصفی ۱۲۶۱ھ مین پیدا ہوئے۔ سہ نثر کے خاتمہ مین لکھا ہے "درین نزدیکی کہ سرد آزادِ عمرم از جوئی چمنِ عشرۂ سوم آب دریافتہ" (سہ نثر آصفی ص۱۶۷) سہ نثر ۱۲۹۱ھ کی تصنیف ہے، نثر سوم کے ص۱۸ پر مادۂ تاریخ تحریر کیا ہے فرماتے ہین۔

آمدہ سالش ز نظام سخن　　نامۂ اقبال نظام دکن

دوسرا مصرع مادہ ہے۔ جس سے ۱۲۹۱ھ سالِ تصنیف نکلتا ہے، اس وقت آصفی کی عمر ۳۰ سال تھی تیس کو ۱۲۹۱ع مین سے گھٹانے پر ۱۲۶۱ھ باقی رہجاتے ہین۔ صاحب تذکرۂ کاملین رامپور نے تقریباً ۱۲۶۵ھ سال پیدائش بتایا ہے لیکن وہ کس طرح درست نہین۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب عبد الرزاق خان قلات مین ملازم تھے۔ آصفی کی پرورش ان کی غیبت مین ہوئی۔ جب یہ سن شعور کو پہنچے تو گھر مین عورتون اور بچون کے سوا کوئی سرپرست نہ تھا

آصفی عام طفلانہ دماغ لیکر آتے، تو حشرات الارض کی طرح خاک ہوکر صفحۂ ہستی سے مٹجاتے۔ مگر انھین فطرت نے

وہ دماغ عطا کیا تھا جس مین علم کی طلب کا جنون اور فضل و کمال کی تحصیل کا سودا تھا۔ اسلئے فطری ذوق و شوق طفلانہ لہو ولعب پر غالب آیا۔ اور ثابت ہو گیا کہ "السعید من سعد فی بطن امہ" (نیک مان کے پیٹ سے نیک ہوتا ہے)

آصفی اٹھارہ سال کی عمر تک رامپور مین مقیم رہے۔ مختلف مکتبی ملاؤن سے فارسی کی ابتدائی کتابین پڑھین۔ اور جب چل نکلے تو مولوی ولی محمد خان صاحب سہل رامپوری کے حلقۂ درس مین شامل ہو گئے۔ یہ صاحب فارسی کے زبردست فاضل تھے۔ مولانا ان کے متعلق تحریر فرماتے ہین۔

" صاحب ممدوح اعلیٰ درجہ کے فارسی دان تھے دیگر علوم پر بھی حاوی تھے۔ انکی عمر طلب علم ہی مین بسر ہوئی۔ انشا اور شعر انکا طبیعی مشغلہ تھا۔ اساتذہ کا تتبع کم کرتے تھے۔ اور نازک خیال تھے۔ مجکو ان سے اصلاح سخن کا موقع نہوا۔ صرف درس کا استفادہ ہوا "

یہ خلد آشیان نواب کلب علی خان بہادر کا عہد تھا۔ رامپور فضلاء و شعرا کا مجمع تھا۔ اسی زمانہ مین آصفی کو عربی پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا مولانا عبدالقادر خان صاحب مفتی عدالت دیوانی ریاست رامپور سے کنز الدقائق پڑھی مفتی صاحب افغانستان کے باشندے ہین۔ ترک وطن کرکے رامپور مین اقامت گزین ہو گئے ہین۔ اور آج ہندوستان مین صرف ایک فقیہ ہین۔ آصفی کا مفتی صاحب سے فقہی استفادہ اس امر کی کافی ضمانت ہے۔ کہ وہ فقہ مین معقول دسترس رکھتے تھے

والدین کی ناعاقبت اندیشی سے فارسی درسیات ختم ہوتے ہی ازدواجی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔ آصفی نے ترک وطن کی ٹھان لی۔ اس زمانہ مین بھوپال علم کا دوسرا مرکز تھا" اشرف نوع انسانی، علامۂ روزگار، صدر کبار نواب سید محمد صدیق حسن خان صاحب بہادر مرحوم صدر آرائے علوم و فنون تھے" اور ایک عالم اس طرف کھنچا جا رہا تھا وطن کی ناقدردانی نے مجبور کیا۔ اور آصفی بھوپال چلے گئے نواب صاحب بہادر ان سے بہت شفقت و محبت سے پیش آئے۔ اور ہمیشہ کے لئے مورد عنایات بنا دیا۔ آصفی کچھ مدت تک بھوپال مین مقیم رہکر وہان کے علماکی درسگاہون مین حاضر ہوتے رہے۔ لیکن جہان تک پتہ چلتا ہے۔ ملازمت نہ کی

دہلی و لکھنؤ کے تباہ ہو جانے کے بعد، ارباب فضل و کمال کے لئے ماوی و ملجا رامپور تھا۔ یا حیدر آباد۔ مرحوم نظام کے عہد نے سرزمین دکن کو، اہل علم سے مالا مال کر دیا تھا۔ فنون لطیفہ سے مغفور کو خاص دلچسپی تھی۔ اور کرسی وزارت پر سر سالار جنگ جیسی علم دوست ہستی متمکن تھی۔ اس لئے علی الخصوص عربی و فارسی علم ادب اوج شباب پر تھا

آصفی کو ذوق شعر و ادب فطرت سے ودیعت ہوا تھا۔ اتفاق سے کسی عزیز نے حیدر آباد کے حالات لکھے، اور ادب کی ترقی کا خاص طور پر تذکرہ کیا۔ مولانا کے ذوق ادب کیلئے خط نے تازیانہ کا کام دیا۔ یہ بھوپال کو خیرباد کہکر حیدر آباد جا پہنچے۔ عربی کی ابتدائی درسیات رامپور اور بھوپال ہی مین ختم کر چکے تھے۔ وہان پہنچکر دواوین عرب اور کتب اہل ادب کے مطالعہ مین مصروف ہو گئے

اُس وقت حیدر آباد مین ایک زبردست فاضل مقیم تھے۔ آقا سید علی طوبی شوشتری نام تھا اور (جیسا کہ آصفی نے اپنے خط مین لکھا ہے) ادبائے عراق مین ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ یہ علامہ سید نعمت اللہ جزائری کے خاندان اور سادات نوریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مذہب امامیہ تھا۔ بدرجۂ کمال مہذب تھے۔ ان کے فضل و کمال کو آصفی نے ان الفاظ مین سراہا ہے

"یہ سید عالی نسب، والاحسب، اہل عراق کے مشہور ادبا مین اعلی پایہ رکھتے تھے۔ واللہ باللہ ان کی معلومات لغوی اور شواہد کلام عرب، قیاس سے باہر تھے۔ قریحہ ایسا تھا۔ کہ قلم برداشتہ سینکڑون اشعار عربیہ لکھدیتے تھے۔ اور یہی حال نثر عربی اور فارسی کا تھا"

حیدر آباد مین آصفی نے اس علامہ کا حلقۂ درس انتخاب کیا۔ اور بہ صد خلوص و شوق ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ علامہ کی مجلس اہل عجم و عرب کا مرکز تھی۔ اس اہلِ عجم کے اختلاط اور میل جول نے، ان کی استعداد فارسی مین بھی غیر معمولی اضافہ کرایا۔

شعر گوئی کی مشق آصفی نے رامپور ہی مین شروع کردی تھی۔ حامی تخلص کرتے تھے۔ نواب خلد آشیان کی ایما سے امیر مینائی مرحوم نے رامپور کے شعرا کا تذکرہ مرتب کیا تھا۔ جو انتخاب یادگار کہلاتا ہے۔ اس مین آصفی کا تذکرہ اسی تخلص کے تحت مین ہے۔ صاحب تذکرہ لکھتے ہین۔ اسوقت اٹھارہ سال کی عمر ہے۔ نمونہ کے طور پر دو شعر بھی لکھے ہین

سرو شکلِ شیشۂ و گل صورت ساغر گرفت   میکشی اے ہمنشینان درچمن خواہیم کرد
کے کشاید خاطرِ من از تماشائے بہشت   بہر آسائش بکوئی او وطن خواہیم کرد

لیکن اسوقت تک کسی کو اصلاحِ سخن کے لئے پسند نکیا تھا۔ یہان علامہ کے فضل و کمال نے ایسا مبہوت کیا کہ انھون نے استفادۂ عربیت کے ساتھ ساتھ اپنا کلام بھی سنانا شروع کر دیا۔ ایک تو اس علامہ کی نکتہ چینی، دوسرے اہل عجم کے مجالس و محافل، ان باتون نے ملکِ آصفی کو طہرانی، یا شیرازی بنا دیا۔ دنیا نے دیکھ لیا۔ کہ تربیت کے بعد ہندی دماغ بھی نظیری، عرفی، طالب، حزین، اور قاآنی کی صف مین جگہ پاسکتا ہے۔

بعض احباب کے مشورہ سے آصفی نے حضور نظام دکن مرحوم کی مدح مین سہ نثر لکھکر بارگاہ ہمایون مین پیش کیا۔ اس زمانہ مین پیشی کا موجودہ منظم طریقہ نہ تھا۔ مہینون اور برسون تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ تب کہین کوئی عرضی حضور کی نظر سے گذرتی۔ آصفی جن صاحب کے ہان مقیم تھے۔ وہ رامپور کے باشندہ تھے وہان وکالت کرتے تھے۔ نہایت شریف النفس اور دوست پرور تھے۔ وہان ایک بدمعاش شیخ چاند نامی رہتا تھا۔ شریف آزاری رویہ تھا۔ کسی بات پر وکیل صاحب سے بگڑ بیٹھا بیچارے یہ شریف آدمی کیا کرتے۔ اس نے بیجا پریشان کرنا شروع کردیا۔ جب معاملہ حد برداشت سے آگے نکل گیا۔ تو مجبوراً آصفی سے تذکرہ کیا۔ اور ساتھ ہی زندگی سے بیزاری ظاہر کی۔ آصفی غیور طبیعت تھے۔ پھر معاملہ تھا۔ ایک محسن دوست کا انہین تسلی دے کر شیخ چاند کو باز رکھنے کا وعدہ کیا۔ شیخ صاحب بادۂ سرکشی مین چور تھے۔ اور جہاندیدہ بھی تھے۔ ایک نوجوان

کوکب خیال مین لانیوالے تھے۔ حسب عادت پھر وکیل صاحب کو تنگ کیا۔ ایک بار آصفی نے پھر فہمائش کی۔ مگر بے سود۔ آخر سہ بارہ آپ سے باہر ہوگئے۔ شیخ صاحب بازار مین کسی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ آصفی تلوار لیکر اُن کے اڈے ہی پر جا پہنچے۔ شیخ صاحب نے معمولی باتون کا جواب تندی اور غصہ سے دیا۔ اور آخر کار تلوار چلنے لگی۔ آصفی نہایت قوی الجثہ جری، اور شمشیر باز تھے۔ دو چار ہاتھون کے ردوبدل کے بعد شیخ چاند زمین پر آرہے۔ اور جان بحق تسلیم ہوگئے یہ گرفتار کر لیے گئے اور مقدمہ مین وکیل صاحب کی جان توڑ کوشش کے باعث، پھانسی تو نہوئی مگر حبس دوام ہو گیا اس واقعہ پر تقریبًا دو سال گزرے ہون گے۔ کہ ناگاہ بخت نے یاوری کی۔ اور سہ نثر حضور نظام کے سامنے پیش ہوئی۔ نظام مرحوم بڑے نقاد سخن تھے۔ اس جوان سال شاعر کی نظم ونثر سے استعداد ذاتی کے جوہر تاڑ گئے۔ حکم دیا۔ بلاؤ۔ اراکین دولت نے عرض کیا۔ شاعر قید خانہ مین اپنے بقیہ سالہائے حیات گذار رہا ہے۔ استفسار ہوا۔ کیون۔ بیان کرنیوالون نے حقیقت حال کا اظہار کیا۔ ترحم خسروی نے برداشت نکیا۔ کہ ایک شریف آزار اوباش کے عوض، ایک جوان سال وپیرانہ فہم، شاعر ایسی ذلیل زندگی بسر کرے۔ رہائی کا حکم دیا۔ اور نواب افسر الملک کمانڈر انچیف افواج قاہرہ نظام کے برگیڈ آفس مین میر منشی مقرر فرمایا حسن خدمت، اور لیاقت کے باعث آصفی برابر ترقی کرتے رہے تا آنکہ مددگار معتمد صرف خاص شاہی ہوگئے۔ موجودہ فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ سریر آرائے ملکِ دکن ہوئے، تو آصفی کو خاص طور پر مورد عنایات خسروانہ بنایا۔ چنانچہ ایک تصنیف کے صلہ مین ماہانہ ۵۰ روپیہ کا منصب دار مقرر کیا

آصفی کی عربی قابلیت بھی ہندوستانیون کے لئے قابل رشک تھی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بعد صرف دو ہستیان نظر آتی ہین جو عربی زبان مین مشغلۂ شعر وسخن رکھتی تھین۔ ایک مولنا فیض الحسن سہارنپوری اور دوسرے علامۂ آصفی خط مین لکھا ہے۔ کہ عربیت مین سید علی خان موسوی صاحب "سلافۃ العصر" "وانوار الربیع" کے تتبع ہین بعض قصائد آزاد بلگرامی کے تتبع مین لکھے ہین ایک قصیدہ بوفراس کے قصیدہ پر ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ عربی سے اسقدر شغف حیرت انگیز ہے۔ آخر عمر تک طلبہ کو عربی ادب کی انتہائی کتابون کا درس دیتے رہے۔ مگر آخر مین شعر وسخن سے نفرت ہوگئی تھی۔ اور کتب سیر وغیرہ کے ترجمہ وتالیف مین مشغول ہوگئے۔ اپنے خط مین اس پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ کہ امرا کی مداحی مین عمر عزیز کا گرانمایہ حصہ، شباب، رائگان گیا۔ کاش یہ آخرت کے کام آتا چنانچہ آخری بیس پچیس سال مذہب ومتعلقاتِ مذہب پر صرف ہوئے

تاریخ پیدائش ووفات سال پیدائش ۱۲۶۱ھ ہے۔ سہ نثر کے خاتمہ مین لکھا ہے۔ کہ ۳۰ سال کی عمر مین تصنیف کی ہے۔ یہ ۱۲۹۱ ہجری مین تمام ہوئی تھی۔ اس لئے اس سے مذکورۂ بالا سند کی تائید ہوتی ہے۔ ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۶ جون ۱۹۲۶ء کو تقریبًا ۸۳ سال کی عمر مین حیدرآباد مین انتقال کیا

مولانا بڑے تنومند اور قوی الجثہ تھے۔ لیکن حیدرآباد کی آب وہوا ناموافق تھی۔ آخر عمر مین مختلف امراض

ستاتے رہے۔ درد گردہ بالخصوص حملے کرتا رہتا تھا۔ ایک بار کسی تیز دوا کا استعمال کیا۔ گردون مین پیپ پڑ گئی۔ ہر چند علاج کیا۔ لیکن جان بر نہو سکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اخلاقِ مخصوصہ و احوالِ عامہ

آصفی، متقی اور پرہیزگار تھے۔ رسم مذہب کی سختی سے پابندی کرتے۔ موجودہ مذہبی سہولت پسندی اور ناروا سی آزادی ناپسند تھی۔ فرماتے ہین

چنان کردند برہم آصفی این نیچران دین را
کہ شد ہند و دکن شورشکدہ از نامسلمانی

روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا۔ قصائد کا بڑا حصہ نعتیہ ہے۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے۔ محبت و خلوص مین ڈوبا معلوم ہوتا ہے۔ اسلیئے نعتیہ قصائد مین خاص طور پر زور ہے۔ فرماتے ہین

اے مہر تو شیرازۂ جمعیتِ امکان — وز قہر تو مجموعۂ کونین مجزّا
یک برگ بود نخل ترا، زندگئ خضر — یک ریشۂ گلزار تر اعمرِ مسیحا
مشتاقِ ترا، بزم ازل، میکدۂ ذوق — مجنونِ ترا عہدِ ابد، عرصۂ صحرا
مخمورِ ترا، خونِ جگر، چشمۂ حیوان — رنجورِ ترا، مرگِ ابد، فیضِ مسیحا
یک نالۂ شوریدۂ تو، شورشِ محشر — یک داغ جگر سوختہ از دوزخِ فردا

اے ذاتِ ترا، عزتِ کونین، زمینگیرا — بر عرشِ برین، شانِ تو افراخت علم را
تا نامِ ترا، نقشِ سرِ لوح نہ بستند — از چشمِ قلم جلوہ نشد حرف و رقم را
تا ذاتِ ترا مقصدِ ہستی نہ شمردند — مفہوم نشد فائدہ امکان و عدم را
تا عدلِ تو شد علتِ امنیتِ دوران — در عہد تو امکان نہ پسندید ستم را
از مہر تو تبدیل شدہ کینہ بالفت — پروردہ در آغوشِ نظر، گرگ غنم را
آن روز کہ فیضت در انوار کشادہ — از تربیتِ باطنی، اصنافِ امم را
قدسی نفسان با دلِ روشن نہ گرفتند — آئینۂ اسکندر و جامِ شہِ جم را

ز نقشِ بستنِ ہستئ او، قلم بخشید — طراز، صورتِ ایجاد لوحِ امکان را
دمے کہ نامۂ اقبالِ او رقم گردید — بچشمِ خویش، قضا مہر کرد عنوان را
دمے کہ سایۂ کہسارِ حلمِ او افتد — دہد سکون چو زمین، آسمانِ گردان را

بخویش برد سکندر ز عالمِ فانی — بسینہ داغ تمنائے آبِ حیوان را
اگر ز چشمۂ مہرش کشیدے آبِ بقا — نمی گرفت بیک جرعہ، عالمِ جان را
بدورِ امنیت او اگر خضر میزاد — چو گرد باد، نہ پیمودے این بیابان را

حوادثاتِ زمانہ برداشت کرنیکی بھی حد ہوتی ہے۔ ہجوم غم طاقتِ ضبط کو نذرِ آتش کر دیتا ہے۔ تو سردارِ دو عالم سے دادخواہ ہوتے ہین

دادرا! در جگرِ آصفئ خستہ درون — تا یکے حادثۂ غم، سرِ خنجر شکند؟
در محیطے کہ ز خونابِ جگر موج زند — ز درم رفتہ بگرداب دو لنگر شکند
چارۂ رنجِ دلِ خستہ، ز چرخ است محال — کہ بمہر اسِ ستم، صورتِ گوہر شکند
در دلِ خون شدۂ من نبود تا تیرے — کہ بہ پردے فغان گنبدِ بے در شکند
شحنۂ عدلِ تو، خواہم، کہ کند دادگری — دلِ پر کینۂ این چرخ ستمگر شکند
این سرِ پیتیم، از مہر بادجے پردار! — کہ کلہ، گوشہ بادجِ شہِ خاور شکند
پنجۂ بختِ مرا نیروئے اقبال افزا! — کہ ہمہ سلسلۂ خوارئ اختر شکند
تا غزالانِ حرم را نبرد دام کین — تا ز حسرت دلِ صیادِ ستمگر شکند
چرخ ہر دام جفائے کہ نہد در راہم — نیروئے عدلِ تو ہر حلقۂ چنبر شکند

یہ خرمن مین سے چند دانے ہین۔ انصاف کرو۔ کیا صرف یہی چند اشعار حسان الہند ہونے کی سند نہین؟ ان سے جیسی والہانہ محبت وشوق کا اظہار ہوتا ہے وہ ابدی زندگی کا لازوال پروانہ ہے

آصفی اہل اللہ سے بہت محبت کرتے تھے اگر کسی کو اہلِ دل سے پر سختی پیش آتے دیکھتے۔ تو ناراض ہوتے فرماتے ہین۔

کسے با اہلِ دل گر آصفی الفت نمیدارد
یقین میدان کہ حیوانے بود در شکلِ انسانی

دنیائے اسلام عموماً، اور ہندوستان کے مسلمان خصوصاً، جس ذلت وخواری مین مبتلا ہین، خدا کی پناہ۔ رہنمایانِ ملت کا خیال ہے۔ کہ اس انحطاط کا سبب ترکِ اسلام ہے۔ بجائے خود یہ خیال درست ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ رواسم مذہب کی قید سے ہمیشہ دنیانے آزادی حاصل کرنا چاہی ہے۔ اور ہمیشہ مذہبی جماعت نے سہل پسند گروہ کی شکایت کی ہے پھر مسلمان کیون ترقی کرتے رہے۔ کیا صرف دو صدی پیشتر بھی مسلمان ایسے ہی خوار تھے۔ پھر کیون۔ آصفی اس کی وجہ

بتاتے ہین

ننگ اسلام کہ از خواریِ دنیا شدہ ایم   آصفی عزتِ دینی ز خدا می خواہیم

اور پھر خواری سے نجات پانے کا راستہ بھی بتاتے ہین۔

باز است بر رخِ تو درِ میکدہ ہنوز   ساقی صلا دہد بتو، جام شراب گیر
ساقیت گر ز ساغرِ صہبا کند دریغ   در جام ذوق، خونِ جگر را شراب گیر

آصفی گر ہمہ شب خواب گران میداری   چشم بیدار بہ ہنگام سحر می باید

بگذر از اوہام غفلت، صید مطلب را بگیر   خوابِ صیادے، بود دریدہ ہاے دام تلخ

قدرتے ہست اگر، دست بگردان کوتاہ   دامنِ مقصدِ کونین، بچنگ است این جا

مزاج بہت نازک تھا معمولی سی بات بھی خلاف طبیعت پاتے تو برہم ہو جاتے۔ ایک بار دفتر مین افسر متعلق نے کچھ خفگی کا اظہار کیا۔ مولانا ایسا موقع کہان آنے دیتے تھے۔ ہمیشہ اپنے فرائض خدمت تن دہی سے انجام دیتے۔ اس لئے ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھے۔ کہ جا و بیجا ناز رضا مندی اُٹھائین۔ چنانچہ انھون نے اس موقع پر بھی یہی کیا۔ حاکم کا دماغ بادۂ حکومت سے سرشار تھا مولانا کے جواب پر برہم ہو گیا۔ اب آگے معاملہ ضبط کی حد سے گذر چکا تھا آصفی نے فوراً پستول نکال لیا۔ بیچارہ نے بصد مشکل چھپ چھپا کر جان بچائی۔ اور معاملہ رفت گذشت ہوا۔ مولانا کو حیدر آباد مین خدمت کا پورا صلہ نملا۔ اس کی وجہ تقریباً یہی خود داری تھی۔ چاپلوسی اور خوشامد امرا کو پسند آتی ہے۔ یہ اس سے کوسون دور تھے۔ چونکہ طبیعت غیور پائی تھی۔ اس لئے منت پذیری کو نا قابلِ عفو جرم خیال کرتے تھے فرماتے ہین۔

دانہ دانہ میکند خرمن بہ سعیِ خویشتن   بارِ احسانِ سلیمان بر نتابد مورِ ما
چون مسیحا از سبکروحی بگردون رہ بریم   اوج دارے، ننگ داند ہمتِ منصورِ ما

دماغ اہلِ جوہر منتِ منعم نہ برتابد   نمی گیرد تری از آب دریا مغزِ گوہر ہا

نرفتہ ایم بدریوزہ بر درِ دیگر   ہر آنچہ داشتہ ایم، آصفی، خدادادست

بہ پیشِ اربابِ جاہ و دولت خجل نیم آصفی زحاجت   زشانِ ہمت، غناز دنیا، بہ طبع کردہ کریم پیدا

آصفی از منعمانِ دہر می باشم سبک   بردلِ بے مدعا ازمنتِ شان بار نیست

زچرخ سفلہ مکش ننگِ احتیاجِ سوال   کہ دستِ ہمت او کوتہ است و حوصلہ تنگ

تواضع اور ہمدردی کا مجسمہ تھے۔ کوئی ہم وطن جا پہنچتا۔ تو بڑی مدارات سے پیش آتے۔ حتی الامکان ہر قسم کی سہولتین بہم پہنچاتے۔ اور حاجت روائی مین کبھی دریغ نہ ہوتا۔ دسترخوان ہمیشہ وسیع رہا۔ علامہ محمد طیب مکی مرحوم بھی اتفاق سے حیدرآباد پہنچ گئے تھے۔ عربون کی مہمان نوازی مشہور ہے مگر وہ بھی مولانا کے مہمان داری کے بدرجۂ غایت شکر گذار تھے۔

علو ہمت، صفائی باطن، اور تسلیم و رضا وغیرہ اوصاف کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خوشامد اور چاپلوسی سے گریز کرتے۔ سگ دنیا بنکر زندگی گزارنے پر موت کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہین۔

علو ہمت   رسد بر پایگاہے آصفی از ہمتِ عالی   عروجِ پایۂ از پستی فطرت نمی باشد

آصفی از ہمتِ مردانہ با ما یار باش   ما بجان و دل، فدائے ہمتِ مردانہ ایم

صفائی قلب   بسکہ پرداز گرفتہ ز صفا سینۂ ما   پاک از کلفتِ اغیار شد آئینۂ ما

آصفی صاف دلان رفع کدورت خواہند   در دلِ خویش چو آئینہ صفا می جویند

توکل   اے آصفی مخور غمِ روزی بعمر خویش   تا زندگی ست رزقِ خدا کم نمی شود

شاد مانم کز کشا کشہائی خواہش فارغم   یک دلِ بے مدعا در روزگارم دادہ اند

تسلیم و رضا   در رہِ تسلیم، ہمچو آبلہ داریم سر   نیست غیر عجز دل، در سعی ل، مقدور ما

اے آصفی از جورِ فلک رنجہ نباشی   زین شیوۂ تسلیم و رضائے، کہ تو داری

نیک نہادی کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچایا۔ ہمیشہ نفع رسانی کے لئے کوشان رہتے خیر مجسم تھے۔ فرماتے ہین۔

بدنہ کردم بہ کسے، آصفی از حیلۂ نفس   کار افتادم اگرچہ بہر نیک و بدسے

لـ۵ تذکرۂ کاملین رامپور صفحہ ۹ مؤلفہ حافظ احمد علی خان شوق

"خود داری، فضل وکمال کا زیور ہے"۔ لیکن خود دار ارباب دولت سے کنارہ کش رہتا ہے۔ اس لئے فضل وکمال کے باوجود دنیوی جاہ ومرتبت سے بہرہ یاب نہین ہوتا۔ اس کے مقابلہ مین کم مایہ اپنی دونیٔ طبع سے کامیاب ہوجاتے ہین بجائے خود یہی کچھ کم غم انگیز نہین۔ پھر اس پرطرہ یہ۔ کہ تنک ظرفی سے یہ لوگ مقابلہ پر آمادہ ہوجاتے ہین۔ یہ اہل فضل کے جراحتِ دل پر نمک پاشی کا کام کرتا ہے۔ ابتدأً صبر کرتے ہین۔ لیکن تابکے۔ آخرکار ناقدرشناسی سفلہ پروری، اور جوہر کشی کی شکایت کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے پہل استعارات اور کنایات استعمال کئے جاتے ہین۔ لیکن جب کوئی کان ہی نہین دھرتا تو کھلم کھلا مدعی کی قلعی کھولکر مقابلتہً اپنے ہنر نمایان کئے جاتے ہین۔ ظاہر بین اسے غرور وحسد خیال کرکے نکتہ چینی کرتے ہین لیکن علم النفس کے ماہر جانتے ہین۔ یہ غرور نہین، خود داری ہے۔ حسد نہین، رشک ہے۔ وشتّان مابینہما۔

چونکہ اکثر اہل علم کے سوانح حیات کا اہم ترین واقعہ ناقدرشناسی رہا ہے۔ اس لئے فخریہ عام ہے۔ جس مین فیضی عرفی، اور غالب پیش پیش ہین۔ کہ وہ خود داری کی سلطنت کے خود مختار بادشاہ تھے

آصفی بھی صاحب فضل وکمال ہونے کے باعث انتہائی قدر ومنزلت کے مستحق تھے۔ لیکن زمانہ کی نامساعدت سے ابتدأً انھین بھی بہت کچھ دکھ اُٹھانا پڑے۔ پھر خدا خدا کرکے کچھ قدر ومنزلت ہوئی بھی تو ظرفِ بادہ خوار کا لحاظ نہ کیا گیا۔ نتیجۃً جاہل حریف کی حقیقت اور اپنے دریائے کمال کی وسعت دکھانا لابد تھا۔ فرماتے ہین

چہ پرسی آصفی از بے مذاقی اندرین گلشن بشاخے، زاغ نالد، عندلیبان توازن ہم

از شرم جاہلانِ سخن، آصفی، مپرس چون رشحہ ہائے کلکِ سخندان فرد حکیم

حیدرآباد کے کم مایہ شعرا کے متعلق، جو وہان کی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ فرماتے ہین۔

در دکن انجمنِ تازہ خیالان دیدم شعر شان، مضحکۂ بزم، زندیان گردد
نے بود پایۂ علمی ونہ تعلیم سخن نے بود طبع رسائے کہ سخن آن گردد
مبتذل شیوہ درین عہد بود، ذوقِ سخن ننگِ عالم شود آن کس کہ سخندان گردد

قدرناشناس کے متعلق فرمایا ہے

کارم بناکسانِ زمانہ فتادہ است ہریک زجہل، دشمن عمرِ ہنر درست
قدرِ سخن نماندہ، نماندہ سخن شناس خرمہرہ ایست، گو ہمہ ارزند گوہر است
باسنگریزہ کس نہ پذیرد درین دیار گوگوہرم بہ گوہر عمان برابر ست

رفت عہد شاعری ور وزگارِ قدر شعر جو نمی ارزد، کسے گر عرضِ حسّانی کند

واے برشعرے کہ باشد در صفاتِ ابلہان   واے برنثرے کہ مدحِ اہلِ نادانی کند

اپنی تعریف نہایت پر معنی الفاظ مین کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ذرہ بھر مبالغہ نہین

زاعجازِ سخن، اے آصفی، دارم مسیحائی   خموشی را زبان بخشم، بہ ہنگامِ شنیدن ہا

آصفی گوہر شہوارِ معانی ایزد   قلمِ ما دم ریزش رگِ نیسانے ہست

بدریاے معانی، آصفی، آن ابرِ نیسانم   فشانم رشحۂ از خامہ و شکلِ گہر بندد

آصفی در شوکت آبادِ سخن   تکیہ بر تختِ سلیمان کردہ

بعہدِ میر عثمان علی خان از سخن سنجی   چہ ایران گرمیٔ گفتار در ملکِ دکن دارم

آصفی ملکِ سخن زیرِ نگین طبع است   دل ندارد ہوسِ ملکِ سلیمان از من

زنیرنگِ خیالم، آصفی، طاوسِ من کلکست   دو صد آئینہ می آراید از نقشِ پر و بلے

مرحوم نظام کی مدح مین ایک قصیدہ لکھا ہے۔ تعریف کرتے کرتے، قلم رکتا ہے، اور لکھ دیتا ہے۔

امروز منم عرفیٔ عہدِ تو، غلط نیست   از ملکِ دکن فخر بود ملکِ عجم را
زان دولت و اجلال نماندہ ست خلائے   آوازہ بلند است مگر جاہ و حشم را
دارم طمع از نسبتِ ذاتِ تو بماند   ہر صفحۂ جاوید، نشانِ حرف و رقم را

دوسرے قصیدہ مین علی الاعلان پکار اٹھے ہین۔ کہ

بہ بزمِ چون تو سلطانے نیامد یک سخندانے   چو بندہ معجز الخلقے، چہ در نظم و چہ در انشا

چو عزمِ مدحِ تو سازم، شود برادجِ پردازم   عطارد وار اندازم بچرخ آوازہ از معنی

صدف آسا وہان دارم، زبحر تو گہر بارم   زمعنی ہائے بسیارم ، با برِ آذر ی مانا

بکشور ہر زمان آدر، بود گوا خترِ انور   نماید از سہا کم تر، منم چون نیرِ بیضا

سخن جامے ست در دستم، ز اوصافِ تو سرمستم   ہمانا آصفیؔ ہستم، بعہدِ آصفِ یکتا

حبِ وطن ایمان کی نشانی ہے۔ آصفیؔ کو بھی وطن محبوب تھا۔ گو ناقدردانی نے حیدرآباد جا بسایا۔ مگر وہان کی قدر و منزلت اس صحبت کو نفرت سے نہ بدل سکی۔ آخرکار کہنا پڑا کہ

دل در برِ غربت زدہ آسودہ نماند   یا رب چہ بود جذبہ نہان خاکِ وطن را

اور کہ

شوقِ سفر آوارہ کند لیک چو سوزن   بہ پیچد و بیا، رشتۂ حبِ وطنِ ما

آصفیؔ کو رامپور کی ہر شئے اچھی معلوم ہوتی تھی۔ بستی یہان کی اچھی تھی۔ دوست احباب یہان کے اچھے تھے۔ اور حق بھی یہی ہے۔ کہ بھلے کیون نہ معلوم ہوتے۔ وطن تھا۔ یہان کی دوستی بے غرض دشمنی بے ضرر، شناسائی مفید، اور اجنبیت منفعت رسان تھی، امیر مینائی رح گو وطناً لکھنوی تھے۔ لیکن ملازمت کے سلسلہ مین ایک عرصہ تک رامپور رہ چکے تھے۔ علاوہ ازین خلد آشیان کے استاد تھے اسلئے سارا شہر (اور کسی لئے نہین، تو) سرکار کا استاد بھائی بننے کے لئے شاگرد ہو گیا۔ جس نے رامپور سے موصوف کا زیادہ گہرا اور پائدار تعلق قائم کر دیا تھا۔ رامپور کی بزم منتشر ہو جانے کے بعد، حضور نظام غفر اللہ لہ کے بلاوے پر جب امیر مرحوم حیدرآباد تشریف لیگئے، تو آصفیؔ وہان موجود تھے۔ امیر کی تشریف آوری کی خبر نے یونتو تمام حیدرآباد کو چشم براہ کر رکھا تھا[1] لیکن اتفاق سے منتظرین میں سے وطنی تعلق والا کوئی بھی نہ تھا۔ ہزار ہا آدمیون کے مجمع مین سے صرف دو آدمی سب سے پہلے آگے بڑھے، اور عقیدت کے ہونٹ علم و شعر کے ہاتھون سے مس کئے۔ وہ دونون کون تھے۔ ایک مینائی مرحوم کے شاگرد پنڈت رتن ناتھ سرشار صاحب فسانۂ آزاد اور دوسرے عبد الجبار خان آصفی نظامی رامپوری چنانچہ خاندان و متعلقات جناب امیر مینائی پر جو کچھ احسانات ہین۔ بقولِ طاہر صاحب مجددی آصفیؔ کے جذبۂ حبِ وطن ہی کا نتیجہ ہین اگر جناب جلیل کو بھی رامپور سے تعلق ہوتا تو آج آفتاب کی سی ضیا گستری، اور ماہتاب کی سی قبولیت نہ پاتے۔

آصفیؔ اکثر رامپور آتے۔ اور کئی کئی ماہ یہان قیام کرتے۔ ایک مرتبہ جرنل عظیم الدین خان مرحوم مدار المہام ریاست نے مستقل اقامت اختیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا حیدرآباد کی قدر و منزلت کے خوگر ہو چکے تھے۔ جواباً ایک قصیدہ

---

[1] سوانح امیر مینائی صفحہ ۔ مولفہ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل جانشین جناب امیر مینائی مرحوم

لکھکر یہ لطائف الحیل معاملہ کو رفت و گذشت کیا۔ قصیدہ مین رامپور کی مختصر تاریخ، اور جوانانِ رامپور کی تعریف و توصیف ہے۔ ہر ہر شعر سے محبت ٹپکتی ہے۔ فرماتے ہین

گرچہ وضع رامپور از دل نشین ہئیت نہ بود ۔۔۔ لیک دل کش بود وضع و سیرتِ جملہ رجال
از جلادت وز تہور وز شجاعت در جہان ۔۔۔ بود ہر یک نامور بر خوئی و طبع پورِ زال
جملہ در پیکار و کین جستن بسانِ نرہ شیر ۔۔۔ می شمر دندے عدوئے پیلتن را چون شغال
از حیا و مردمی و شیوۂ خلقِ حسن ۔۔۔ بود خالی جائے شان در محفلِ عز و جلال
آن قدر میداشتندے از محارم اجتناب ۔۔۔ می نمودندے یارباب مناہی صد نکال
اتباع سنتِ پیغمبر و اصحاب دین ۔۔۔ فطرۃً بودہ بفرمانِ خدائے ذوالجلال
شہرتِ ایشان بہر کشور زنامِ نیک رفت ۔۔۔ خوبیٔ شان نقش بستہ در دل وطبعِ رجال

جنرل صاحب سے خطاب کرتے ہین

اے جہانِ مردمی و عالمِ ہوش و خرد ۔۔۔ انچہ فرمودی رقم با بندہ از فیض و نوال
شکر این اسکاف بیرون ست ز امکانِ خرد ۔۔۔ شکر این احسان زبانِ عقل من داند محال
در دکن عیش مہنا آن چنان دارم کہ نیست ۔۔۔ در وطن امکانِ آن در عالمِ وہم و خیال
سر بگردون میرسد از عزتِ قدرِ ہنر ۔۔۔ از نشانِ مسندی استغنا، نہ از وضعِ سوال
گرچہ دورم لیک نزدیکی بہ اخلاصم بود ۔۔۔ از دکن تا رامپورم خطوہ باشد در خیال
مصلحت نبود کہ خواہم خدمتے من در وطن ۔۔۔ در دکن بر خدمتم چون رفت چندین ماہ و سال

بقولِ علامۂ شبلی رح حسد اور تنگ نظری شعرا کا خاصہ ہے پوری تاریخ شعر و شاعری مین گنتی کے آدمی مستثنیٰ نکلتے ہین مگر سوادِ اعظم کے برخلاف، آصفی اپنے معاصرین سے محبت، خلوص، اور ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے۔ بہ خندہ پیشانی ملتے۔ بہ نرمی والفت گفتگو کرتے، ان کے مصرعون پر غزلین لکھتے۔ اور مقطعون مین سراہتے۔ کئی جگہ اپنے ہم وطن اور مخلص دوست بیخود رامپوری کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہین

کلامِ بیخود ما، آصفی چندان بود دلکش ۔۔۔ کہ تحسین بیخود از طبعِ سخن سنجان برآید
بہ صہبائے مذاقِ شعرِ بیخود آصفی مستم ۔۔۔ ز ہر لفظش بکامِ دل، شرابِ ناب می آید

علامۂ شبلی دکن تشریف لے گئے ہین۔ مولانا سے بھی راہ و رسم ہے۔ علامۂ موصوف کی مدح مین قصیدہ لکھا ہے۔ اور دوستی و محبت کا حق ادا کیا ہے۔ فرماتے ہین

مژدہ یاران بدکن تازہ بہاران آمد — بخت گلریز د طرب خیز و گل افشان آمد
آمدہ شبلیٔ علامہ سوئے ملکِ دکن — یا کہ از علم و حکم خطۂ یونان آمد
ذرہ ذرہ شود از نورِ کمالش روشن — آفتابے بسوئے خاک نشینان آمد
غافلان گر ہوسِ فطرتِ روشن دارید — اینک آن روشنیٔ فطرتِ انسان آمد
گوہرِ حکمتِ یونان بفشاند بہ دکن — آن فلاطونِ گران کیسہ زِ یونان آمد
فیلسوفے ست کہ از فرّۂ رائے عالی — افتخارِ ابد از وے بہ حکیمان آمد
بہرِ سنجیدنِ آرائے حکیمانِ سلف — پلۂ دانش او پلۂ میزان آمد
جائے زاغ و زغن امروز نیا شد بدکن — عندلیبِ چمنِ ذوق، غزلخوان آمد
منطق و فلسفہ را پایۂ دیگر بنہاد — شیخ و فارابی ازان درصفِ ماجان آمد
از فصاحت چو فصیحانِ عرب حرف زند — وز بلاغت سخن، ثانیٔ سحبان آمد

ایک بار آصفی رامپور آئے، تو ان کے مخلص دوست جناب احمد علی خان صاحب بیخود نے، اس تقریب مین، ایک فارسی بزم مشاعرہ کے انعقاد کا اعلان کیا۔ اس زمانہ مین یہان ایک ایرانی آغا سنجر نامی مقیم تھا۔ یہ شخص اہل زبان ہی تھا جید شاعر بھی تھا۔ صاحب مشاعرہ نے اسے بھی مدعو کیا۔ وہ مولانا کی شہرت سُن چکا تھا۔ غلط فہمی سے اسکو مقابلہ کا اعلان سمجھکر شرکت سے انکار کردیا۔ مولانا کو خبر ہوئی، تو بہت تاسف کیا اور بیخود کو ہمراہ لیکر خود قیام گاہ پر پہنچے۔ رسمی گفتگو کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے، اور کنایتہً یہ امر واضح کردیا کہ اس بزم کا مقصد صرف یہ ہے، کہ چند لمحے یارانِ نجد کی خوش آیند صحبت مین گذر جائین، اور بس۔ مقابلہ مقصود نہین۔ آغا سنجر نے شرکت کا وعدہ تو کرلیا۔ مگر پھر بھی غزل نہین پڑھی مولانا کی حساس طبیعت نے اس سے بہت اثر لیا

آصفی جسیم، توانا اور قوی الجثہ تھے خدا نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت سے بھی مالامال کیا تھا آب وہوا ناموافق تھی۔ عمر کا آخری حصہ شکایات ہی مین گذرا قلب کمزور ہو گیا تھا۔ اختلاج کا بہت زور رہتا۔ کئی بار دہلی تشریف لائے اور مسیح دوران حکیم دراصل خان اور مسیح الملک حکیم اجمل خان رحمہا اللہ سے رجوع کیا۔ مگر بے سود۔ حکیم واصل خان کی تعریف مین قصیدہ لکھا ہے۔ خاتمہ مین فرماتے ہین

اے حکیم علتِ جانہائے ارباب حکم — برکمالت نسخۂ شافیٔ تو بربان بود
بازوئے شیرانۂ من از عوارض کردیست — آسمان را گر بہ صد رنج در ابنان بود
پیش ازین گنج حقائق بود، اکنون ز ہجوم — سینۂ من جائگاہ یک دلِ ویران بود
از عوارض جسم تعلیمی درین ملکِ دکن — تختہ مشقِ طبیبانِ جہان چندان بود

از سراپایش اگر بینند ارباب نظر — نیست ممکن نقطۂ صحت در دگنجان بود

دوسرے قصیدہ مین مسیح الملک سے خطاب کرتے ہین

دیا اے عیسی دوران، کہ لطف تو بود دران — چہ درمانے کہ بخشد جان، چو جان خضر پیغمبر
دے دارم چو گوہر موج خیز شان استغنا — نہ پیچیدہ ہوایم از گدائی آرزو برسر
و لے از ضعف قلب وہم زبیماری گوناگون — تنم فرسودہ، جان کاہیدہ مغزم خشک شد یکسر

ضرورت زمانہ نے آصفی سے امرا کی مدح کرائی، لیکن خودداری و استغنانے کہین دامن چھوڑا، اپنی آن ہر جگہ قائم رکھی اور عام شعرا کی طرح دریوزہ گری سے پرہیز کیا۔ فرماتے ہین

این زبان از رگ اندیشہ جو ابر نیسان — می فشانم بمدیح تو گزیدہ گوہر
صلۂ شعر نخواہم، کہ گدائی باشد — متبذل شیوہ شناسم کہ بود ننگ ہنر
صلۂ خاص مناصب کہ ز شاہان باشد — بہر اصحاب علوم ست، ہما نا درخور
می شناسی کہ بود پایگۂ علم رفیع — منصب علم شد از جملہ مناصب برتر
لیک از خواہش این بندہ نباشد زر و سیم — کردہ است از صلۂ عام عطا قطع نظر

چونکہ آصفی کبھی کسی کے دست نگر نہین ہوئے۔ اس لئے عرفی کی طرح مدحیہ قصائد مین خود ستائی سے باز نہین رہتے نواب سرور الملک بہادر معتمد پیشی کی مدح کرتے کرتے، فرماتے ہین

داورا از گہر افشانی معنی چو سحاب — بمدیحت قلم من گہر آما بیند
نیستم شاعر دریوزہ گر قلزم و کان — از معانی بدلم معدن و دریا بیند
می توانم کہ بہر شیوہ زبان بکشایم — تا مرا اہل سخن شیوہ شناسا بیند
نامۂ را کہ طراز د قلم از ایجاز — از مطالب ہمہ مجموعۂ انشا بیند
طفل نطقم کہ ز روح القدس آمد بوجود — نفس معجز او چون دم عیسی بیند
قلم دعوی کن، در کف اعجاز، عصا ست — کہ بمیدان فسون در کف موسی بیند

نالائقون کو کرسیٔ امارت پر متمکن دیکھکر ضبط نہین کر سکتے آج سے چند سو سال پیشتر حافظ نے کہا تھا

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان — طوق زرین ہمہ در گردن خر می بینم
ابلہان را ہمہ شربت ز گلاب و قند است — قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم

آصفی بھی حیران ہین۔ کہ گدھے کس طرح عالی مرتبہ ہو گئے۔ نواب وقار الملک مرحوم کی مدح مین ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔ خاتمہ مین زمانہ کی سفلہ پروری اور کمینہ نوازی کی شکایت مین فرماتے ہین

میکنم اندیشہ در احوالِ عمالِ دکن	ہیچ سرآن نمی گردد بدانش آشکار
این قدر دانم کہ بہر عبرتِ اہلِ خرد	ناکسان را پایگاہے مید ہد پروردگار
شکل انسانند لیکن زادۂ مست خار جند	سیرتِ نسناس میدارند دیو زبنہ شعار
از ستیزہ طبع برخیزند با چنگال و ناب	سخت آویزند با ہم چون سگانِ جیفہ خوار

رامپور مین محلہ لال قبر پر بزرگون کے مکانات تھے۔ حیدرآباد مین ۴۵ سال تک محلہ مغلپورہ مین سکونت رہی۔ تمام مکانات ذاتی تھے

ملازمت

غالباً سب سے پہلے آصفی کا تقرر کرنل نواب افسر الملک کمانڈر انچیف افواج باقاعدہ سرکار عالی کے برگیڈ آفس مین میر منشی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس کے بعد کرنل مارشل صاحب سیکریٹری سرکار نظام کے دفتر مین دو سال سررشتہ دار رہے۔ یہان سے دفتر معتمدی صرف خاص مین تبادلہ ہو گیا۔ اور نواب آصف نواز الملک کے ماتحتی مین پانچ سال تک کام کیا دو سال تک نواب سرور جنگ معتمد پیشی سرکار نظام کے دفتر مین سررشتہ دار رہے۔ سرور جنگ بہادر کے بعد، مولوی احمد حسین صاحب بی۔اے، ایل۔ایل، بی کی خدمت مین آٹھ دس سال تک رہے۔ یہ غفران مکان نواب میر محبوب علیخان فرمانروائے دکن کے پیشکار تھے۔ ان کے عہدے بدلتے رہے۔ کبھی پرسنل سیکریٹری رہے۔ کبھی انڈر سیکریٹری ہوئے، اور اخیر مین صدر المہام پیشی نواب میر عثمان علیخان بہادر فرمان روائے حیدرآباد ہو گئے تھے

یہان دس سال خدمت کرنیکے بعد غفران مکان کے عہد مین، صدر محاسبی صرفِ خاص مین منتظمی کا کام انجام دینے لگے۔ ڈیڑھ سال کے بعد، محکمۂ معتمدی صرفِ خاص مین لے لئے گئے۔ اسوقت رائے مرلی دھر بہادر صدر المہام تھے یہ محکمۂ معتمدی و صدر المہامی مین منتظم بنادیئے گئے۔ حافظ احمد علی خان صاحب کو لکھا ہے

"نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہا ہون والحمد للہ علی کل حال"

یہ خط ۱۳۳۴ھ ہجری مین لکھا ہے۔ اس کے بعد تقریباً دس سال مولانا نے اور خدمت کی۔ درمیان مین جن جن حکام سے تعلق رہا۔ انکا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن مولانا کے نواسے مجی نواب شیر خان صاحب فرماتے تھے کہ آخر مین مددگار معتمد صرف خاص شاہی ہو گئے تھے

مولانا کو ۱۵۰ روپیہ منصب کے، اور للعماص۵ روپیہ دفتر سے ملتے تھے

(باقی)

خان امتیاز علی عرشی (رام پور)

پریم کی پیاسی

"عورت کا ضمیر "شرم" اور "محبت" ہے، مگر جب "محبت" "شرم" پر غالب آجاتی ہے تو عورت صرف "محبت" ہو کر رہ جاتی ہے"

(نٹشے)

مین نے نٹشے کا یہ قول پڑھا، تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میرے سامنے مشرقی حسن و عشق کے افسانے اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہونے لگے، جن کا عنوان "محبت" مگر انجام یا مصیبت یا ہلاکت ہے، ایک مشرق ہی کیا، مصر و نجد، یونان اور ایران کے اسٹیج پر جو ڈرامے "عورت" نے کھیلے ان سب مین اُسکی ہلاکت آفرین استغنائی جھلک رہی تھی، مین حیران تھا کہ جب عورت صرف "شرم" اور "پریم" سے بنی ہے تو اُسکی فطرت اُسکا ثبوت کیون نہین دیتی؟ —— کیا اسلئے کہ "عشق" اپنی نیاز مندیون سے اُسے مغرور بنا دیتا ہے؟ یا اس لئے کہ "شرم" "محبت" پر غالب نہین آتی؟ —!

بہرحال مینے سوچ لیا کہ مین عورت کی اس "فطرت" کا امتحان لونگا، مین اپنی بے اعتنائی اور بے التفاتی سے اُسکے سازِ محبت کو چھیڑونگا، اسکی شرم کو اپنی نگاہون کے تکلف سے تکلیف دون گا، اور اُسکی لطافتون کو اپنی مردانہ قوتون سے اسقدر پریشان کردونگا۔ کہ وہ گھبرا کر اپنی فطرت کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جائے!

مین بظاہر ایک منحنی جسم کا دبلا پتلا انسان تھا، نہ میری آنکھون مین جاذبیت تھی نہ میرے ہونٹون مین کوئی کشش تھی، نہ مجھے باتین بنانی آتی تھین، نہ مین فیشن اور آراستگی کا متوالا تھا — میرا لباس صرف موسمی ضرورتون کے ماتحت سرد اور گرم ہوتا تھا، مین لباس کی ریاکارانہ نمائش کو ایک بدترین گناہ سمجھتا تھا — مگر مجھے یقین تھا کہ میری شادی وہین ہوگی، جہان مین چاہتا ہون، مین رادھا کی فطرت سے واقف ہون وہ ایک ایماندار ضمیر والی لڑکی ہے، مگر اُسکی "شرم" کی داستانین تمام شہر مین مشہور ہین، اگر واقعی اُس مین شرم کا عنصر زیادہ ہے، تو یقیناً اُسکی محبت دبی ہوئی ہوگی وہ مجھے محبت کا کوئی ثبوت نہین دے سکتی، مگر مین اسکی شرم کو جھنجھوڑون گا، اور اتنا جھنجھوڑون گا کہ آخر اُسکی محبت اُبھر آئیگی! لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سمجھ لون گا کہ مغربی شعرا کے اقوال یا تو صرف مہمل ہوتے ہین یا اُنکا محل وقوع صرف مغرب تک محدود ہے۔

میری شادی کے دن قریب آنے لگے، مجھے رادھا سے محبت تھی، وہ بڑی پیاری لڑکی تھی گرمی کے دنون مین جب وہ مدرسہ جایا کرتی تھی تو مین اُس کو دیر تک دیکھا کرتا تھا اُسکی آنکھین کبھی اوپر نہ اُٹھتی تھین، اور اُسکی دراز پلکین ہمیشہ اُسکے روشن رخسارون کیطرف مائل رہتی تھین، وہ اُسکی لمبی اور گھنی چوٹی، ...... سرخ ہونٹھ، جن پر

ہر دیکھنے والے کو مسکرانے کا گمان ہوتا تھا! مین خوش نصیب تھا! کیونکہ میری شادی میری مرضی کے مطابق ہو گئی تھی! ـــ !

مگر رادھا کی عارضی بدنصیبی اکثر میرا دل دُکھا دیتی تھی، اسلیئے کہ مین اُسکی محبت کا امتحان لینے والا تھا! مین اُسے آزمانا چاہتا تھا، اور مین اُسکے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہتا تھا جو ایک حسن پسند کو کبھی نہ کرنا چاہیئے۔ مگر مین اپنے ارادہ سے مجبور سا ہو گیا تھا، اور میرے دل مین یہ شبہ ذرا سی دیر کے لئے بھی پیدا نہ ہوتا تھا کہ مین اپنے ارادۂ امتحان سے باز آجاؤن گا!

(۳)

آخر میری شادی ہوئی، اور رادھا ہی سے ہوئی! رادھا کو معلوم نہ تھا کہ مین اُسے آزماؤنگا، اسلیئے وہ اپنی محبت کو چھپانے کی کوشش کرتی رہی، اور مین اُسکی محبت کو اُبھارنے کی دھن مین لگا رہا!

مین بہت سویرے گھر سے نکل جاتا، میرے والدین جانتے تھے کہ میرے ذمہ بہت سے کام ہین، اور مین انہین انجام دینے کے لئے مجبور ہون، اسلیئے وہ میری نقل و حرکت مین کبھی مزاحم نہ ہوتے تھے، مین اکثر کھانا بھی باہر ہی کھا لیتا تھا گو مجھے اس مین ایک طرح کی تکلیف ہوتی تھی، شام کو جب سب سو جاتے، رادھا بھی سو جاتی تو مین گھر آتا، خاموشی سے اپنے کپڑے اُتار کر مطالعہ کے بعد سو جاتا، رادھا میرے انتظار مین سو جاتی تھی، اور مین اُسکے سو جانے کے انتظار مین بہت رات تک جاگتا رہتا تھا!

کبھی کبھی وہ مجھے جاگتی ہوئی بھی ملی، ایسے موقع پر مین کسی ایسے ضروری کام مین مصروف ہو جاتا کہ وہ سو جاتی اُسے ہمیشہ میرے طرزِ عمل سے شکایت رہتی ہوگی مگر مین مجبور تھا! اُسکی محبت کو جگانا چاہتا تھا، اور مجھے اُسکا امتحان لینا مقصود تھا! جب کبھی وہ میرے گھر آنے سے پہلے سو جاتی تو اُسکی آنکھ صبح سے پہلے کھلتی، اور مین اُٹھتا تو دیکھتا کہ وہ میرے ناشگفتہ چہرے، اور خواب آلود آنکھون پر اپنی نظرین جمائے ہوئے میرے پلنگ کے پاس کھڑی ہے، اُسکی چتون مین اسوقت ایک قسم کی ندامت ہوتی تھی، اور اُسے یہ خیال بہت تکلیف دیتا تھا کہ "رات کو مین اُن کے آنے سے پہلے سو گئی، شاید وہ مجھ سے کچھ کہتے، اور شاید میری اُنکی بے تکلفی کی پہلی رات ہوتی" ـــــ اُسکا ضمیر اُسے دھوکا دیتا تھا کہ غالبًا جلدی سو جانے کے سبب یہ ساری خفگی ہے، مگر اُسے یہ راز ابتک معلوم نہ تھا کہ مین اُسکی محبت کو آزمانا چاہتا ہون!

(۴)

"دو مہینے گذر گئے" اس عرصہ مین، مین اُس سے بہت کم مخاطب ہوا، اور میرے اُسی طرزِ عمل سے وہ یقین نہ کر سکی کہ مین اُس سے محبت کرتا ہون، اب اُسکے دل مین ایک خلش پیدا ہو گئی، اُسکی طبیعت مین بدگمانیان پیدا ہونے لگین، بِملا جو میرے گھر کے پاس رہتی تھی اکثر اُسکے پاس آیا جایا کرتی تھی، اور دونون گھنٹون بیٹھی ہوئی گفتگو کیا کرتی تھین

آج بملا آئی تو رادھا غمگین تھی، بملا نے مسکرا کر پوچھا — "کیون رادھا! آج اُداس کیون ہو، بھانو پرکاش نے کوئی تکلیف تو نہین دی!"

رادھا "وہ بہت شریف نوجوان ہین، گو اُنکی غیر معمولی خاموشی مجھے انکی طرف سے بدگمان رکھتی ہے، مگر مین سمجھتی ہون کہ یہ اُنکی "فطرت" ہے اور میری بدگمانی بے کار ہے"

بملا "ہان مجھے اچھی طرح معلوم ہے، وہ ہمیشہ خاموش رہتے ہین، اور بہت کم گفتگو کرتے ہین، تمھین اُنکی خاموشی سے بدگمان نہ ہونا چاہئیے!"

رادھا "لیکن بہن بملا! ——— اُن کی محبت بھی اُنھین کی طرح خاموش ہے، اگر وہ کسی سے زیادہ بول نہین سکتے تو کیا محبت بھی نہین کر سکتے؟"

بملا "جہان تک مجھے معلوم ہے، بھانو پرکاش مین "محبت کا" جذبہ سب سے زیادہ ہے وہ ایک علمی و ادبی ذوق کے نوجوان ہین، کیا تم نے اُنکی نظمین اور مضامین نہین پڑھے؟ جن مین داستانِ محبت کے سوا اور کچھ نہین ہوتا"

رادھا "لیکن مین ابتک اُنکی محبت سے ناآشنا ہون"

بملا "اسکا کوئی سبب ہوگا ——— مینے اُنکا ایک افسانہ پڑھا تھا، اُنکے خیالات اُس افسانے سے معلوم ہوجاتے ہین، اگر تم پڑھو تو بھیج دون"

رادھا "مین اُنکا افسانہ کیا پڑھونگی، خود اُنھین کو پڑھ رہی ہون، مگر میرا سبق بہت مشکل ہے، دو مہینے ہو گئے اور ہنوز عنوان تک سمجھ مین نہین آتا"

بملا "اُنکے خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت مین شعریت تلاش کرتے ہین"

رادھا "مگر مین شاعر تو نہین ہون"

بملا "نہ سہی — شعریت کے لئے شاعر ہونا ضروری نہین، خیال کی رنگینی شرط ہے"

رادھا "آخر مین کیا کرون؟"

بملا "تم اُنکے مضامین دیکھ ڈالو، آجتک اُنھون نے جو کچھ لکھا ہے، سب پڑھ لو، بس تمھین اندازہ ہوجائیگا کہ وہ کیا چاہتے ہین، اور اُن پر کس بات کا اثر ہو سکتا ہے"

رادھا "اچھا مین ایسا کرونگی، اگر یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہوتی تو شاید مجھے اُنکی محبت اور التفات کے لئے اسقدر انتظار نہ کرنا پڑتا!

(۴)

رادھا نے دس دن نہایت خاموشی سے گذار دیئے، اس عرصہ مین اُس نے بیر اوہ تمام لٹریچر پڑھ ڈالا، جو میرے

قلم سے نکلا تھا، وہ میرے تمام مضامین پر عبور کر گئی، اور اُس نے میری فطرت کو میری تحریر اور میرے خیالات سے اچھی طرح معلوم کیا، ایک دن جب وہ میکہ سے آئی، اور مین باہر سے گھر لوٹا تو مجھے اپنے کمرہ کے باہر ایک زندگی سی نظر آنیلگی کمرہ بے حد روشن اور معطر تھا مین ابھی باہر تھا ——— مگر میری روح مجبور کر رہی تھی، کہ مین کس طرح کمرہ کے اندر پہونچ جاؤن، تاہم مین نے ضبط سے کام لیا، ۱۲ بج چکے تھے مین نے باہر سے دیکھا کہ کمرہ بہت آراستہ ہے اور رادھا فرش پر بیٹھی ہے دروازے بند ہین، رادھا کی نازک انگلیان ہارمونیم کے پردون کو مس کر رہی ہین رات کے سناٹے مین ہارمونیم کی رسیلی آواز عطر سہاگ مین بھیگی ہوئی پوری آزادی سے گونج رہی ہے اور رادھا گا رہی ہے:-

منا لا رے بھونرا سیان کو مورے!
جاگ جاگ کے رتیان کاٹین — نیر جا کر ندیان پاٹین
پیان پردن مین تورے — منا لا رے بھونرے!

رادھا کی ہر رسیلی تان پر جی چاہتا تھا کہ پروانہ کی طرح اُڑ کر اُس مین جذب ہو جاؤن مگر مین ضبط سے کام لے رہا تھا، میرے دل مین مسرت اور خوشی کے سمندر موجین لے رہے تھے، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ رادھا میری ہم مذاق ہے رادھا کو مجھ سے محبت ہے، اور اب مین کسی حیلے سے بھی اُسے بے نیازی اور لاپروائی کا ثبوت نہین دے سکتا!

رادھا کی آواز پھر گونجی ——— اُس نے پھر اپنی بجلی چمکانے والی آنکھون سے دروازہ کی طرف دیکھا، اور اور اپنی ٹھنڈی سانس کو اپنی گرم آواز مین سمو کر نہایت درد بھرے ہوئے لہجہ مین گایا:-

منا لا رے بھونرے سیان کو مورے

اُسکی ہر ادا پر میرا ضبط کمزور ہوتا چلا جاتا تھا، مین اپنی گذشتہ لاپروایون کو یاد کر کرکے پشیمان تھا، اور سوچتا تھا کہ ساز و آواز کے اس محشر مین جو رادھا کی رعنائیون نے آج برپا کیا ہے، کس طرح باریاب ہو جاؤن، کمرہ میرا تھا، گھر میرا تھا، مگر مجھ پر پشیمانی کی ایک ایسی حالت طاری تھی کہ مین جب دروازہ مین داخل ہونے کے لئے قدم بڑھاتا تھا تو مجھ پر ایک خوف طاری ہو جاتا تھا ——— مین لرز جاتا تھا۔ اور مجھے ٹھٹکنا پڑتا تھا، آج گھر مین اتفاق سے کوئی نہ تھا، خیر والدین ایک شادی مین لاہور گئے ہوئے تھے، اور گھر مین سوائے رادھا دیوی کے کوئی نہ تھا!

مین نے پھر ہمت کر کے قدم بڑھایا، اور ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنا چاہا تو یکایک رادھا کی درد بھری تان پھر گونجی، پھر ایک شاعرانہ نغمہ کمرہ کی معطر فضا میں رچنے لگا:-

سیان کے کارن بن جاؤن جوگن — سیان کے اپنے کر لون مین درشن
گھڑی رہون کر جور رے ——— منا لا رے بھونرے!!

مین پھر ٹھٹک گیا، سوز و ساز کی پوری قوتون سے رادھا کے نغمون نے براہ راست میرے دردمند دل پر

اثر کیا، مین اسکی ہر آواز پر کانپ، کانپ جاتا تھا، مجھے اپنے ضبط کی قوتین بیکار اور کمزور نظر آنے لگین، مجھ سے صبر نہ ہو سکا، اور مین دروازہ کھولکر اندر پہونچ گیا!

رادھا کی مسکراتی ہوئی آنکھون نے میرا خیر مقدم کیا، اسکی جوانی کی خوشبو نے مجھ پر ایسا حملہ کیا کہ میرے ہوش و حواس گم ہوگئے، وہ ہارمونیم چھوڑ کر ایکدم کھڑی ہوگئی، اسکی آنکھون سے مستی اور جوانی کی شعاعین نکل رہی تھین، اسکے لمبے اور کالے بالون سے خوشبو برس رہی تھی! مین حسب معمول اپنے پلنگ کی طرف نہ جا سکا، اور خاموشی کے ساتھ ہارمونیم کے پاس بیٹھ گیا، رادھا نے بڑھ کر دروازہ بند کردیا، اور غالبًا اس انتظار مین کھڑی ہوگئی کہ مین اس سے بیٹھنے یا ہارمونیم چھیڑنے کے لئے کہون گا، رادھا اسوقت خوبصورتی کے اس عالم مین تھی جب دیکھنے والے کو حسن کی ہزارون دیویان، اور جنت کی لاکھون حورین رقص کرتی نظر آتی ہیں - میرے لئے بہت مشکل تھا کہ مین خاموش بیٹھا رہون، مگر مجھے اپنا عہد یاد آگیا، ساتھ ہی ساتھ میرے دل نے مجھ سے کہا کہ "اب عہد کیسا، رادھا کی محبت اپنے پورے جوش کے ساتھ متحرک ہو چکی ہے اب کسی قسم کے عہد کو قائم رکھنا اپنی بیوقوفی کا ثبوت دینا ہے" ــــ "ہولی مین" صرف چھ دن باقی تھے، مینے کہا یہ چھ دن اور گزر جانے دو، اسکے بعد دیکھا جائیگا مین رادھا کی محبت سے کھیلنا چاہتا ہون، رادھا اپنے امتحان مین پوری اُتر رہی ہے، لیکن مین ابھی اُسے اور ستانا چاہتا ہون!

جب اُسکی آواز نہ آنے سے کمرہ مین خاموشی طاری ہوگئی، تو مجھپر جو جادو ہو چکا تھا، اسکا اثر ختم ہونے لگا مین سنبھلا، مینے کمرہ کی فضا پر چارون طرف گہری نظر ڈالی، کمرہ کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو مجھے خاموش ہو کر سوجانے کی دعوت دیتا آج مجھے اپنے پلنگ پر، اپنی کرسی پر، اور اپنی ہر چیز پر رادھا بیٹھی ہوئی نظر آرہی تھی، میرے لئے کمرہ مین کوئی جگہ خالی نہ تھی، مجھے پھر وحشت ہوئی، میرا دل گھبرایا، میرے ضبط نے پھر جواب دینا چاہا، مین نے پھر کمرہ کو دیکھا، اور دیکھا کہ رادھا کھڑی ہوئی میری طرف تبسم کے تیر پھینک رہی ہے اور کیوپڈ ہر تیر پر بیٹھا ہوا مسکرا رہا ہے!

"اب رات بہت آگئی ہے، میرے سر مین درد ہے تھکا ہوا ہون - روشنی کم کر دیجئے" مین نے اپنی نیچی نظرون سے کہنا شروع کیا، مین سمجھتا تھا کہ یہ رادھا کی نہین، بلکہ "حسن" کی توہین ہو رہی ہے، مگر طبیعت کی ضد سے مجبور تھا، میرا یہ پروگرام بالکل برباد ہو رہا تھا - اس حیلہ سے اُسے محفوظ کرنا چاہتا تھا، رادھا، روشنی کم کرنے سے پہلے میرے پاس بیٹھ گئی اُس نے اپنے کنول سے زیادہ روشن چہرہ کو اوپر اُٹھایا، اُس کے سہاگ کی خوشبو میرے تنفس کو مست کرنے لگی، اور مینے دیکھا کہ اُسکے چمکدار چہرہ پر اُسکی لمبی لمبی پلکون سے موتی جیسے دو آنسو ڈھلک کر اُسکے دل کی کیفیت کا اعلان کر رہے ہین!

مین نے کہا "روتی کیون ہو؟ ــــ مین دو مہینہ سے سخت بیمار ہون ــــ سمجھتا ہون کہ تمھارا دل

محبت کا بھوکا، اور تم پریم کی پیاسی ہو مگر....." رادھا "(میری بات کاٹ کر) پران ناتھ! ـــــ اپنی کنیز کا قصور معاف کردو"۔

مین "کیسا قصور؟ ـــــ بے وقوف ہوئی ہو! ـ سو رہو ـ مین بہت جلد اچھا ہو جاؤنگا ـ "ہولی" رہی ہے .... روشنی کم کردو"

رادہا "کیا میری صورت سے بھی نفرت ہے؟"

مین "مجھے کسی چیز سے نفرت نہین! تفصیل کا موقع آرہا ہے، تمھین خود معلوم ہو جائیگا، گھبرانے کی کوئی بات نہین!"

رادھا "میرے ہاتھ پر قول دو"

مین "آج سے دو مہینے پہلے مین جو قول دے چکا ہون وہ کافی ہے"

رادھا "اُسکا تو کوئی نتیجہ نہین نکلا؟"

مین "اب نکلے گا"

رادھا "آپ میری زندگی برباد کررہے ہین"

مین "ہرگز نہین!"

رادہا "ممکن ہے ـــــ "

مین "بس! روشنی کم کردو، اور سو رہو"

کمرہ مین تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا، ہر چیز اُداس نظر آنے لگی میرا دل دھڑک رہا تھا، مین مشرقی عورت کی روایات سے ناواقف نہ تھا مین ترپاہٹ کے نتائج سے بے خبر نہ تھا، مگر چاہتا تھا کہ یہ چند روز اور گزر جائین، تاکہ مجھے رادہا کی محبت کی گہرائیون کا پتہ چل جائے! مین نے انتہائے ضبط سے کام لیا، اور خاموشی سے رادہا کے خیالات کا اندازہ لگانے لگا، آخر رادہا اُٹھی! اُس نے موم بتیون کو بجھا دیا، لیمپ کو ٹھنڈا کردیا اور خود خدا جانے کس گوشۂ تاریک مین جا بیٹھی، مین اندھیری رات کے پروانے کی طرح ٹٹولتا ہوا، بیٹھا بیٹھا اپنے پلنگ تک پہونچ گیا، پلنگ پر ہاتھ رکھکر جائزہ لیا تو وہ خالی تھا، اُٹھا اور لیٹ گیا، ساری رات نیند نہ آئی، رادھا کی محبت نے ہزارون طعنے دئے، دل مین سو طرح کے وسواس آئے مگر جذبۂ امتحان نے سبکو مغلوب کردیا! جب صبح کی روشنی کمرہ مین داخل ہوئی تو مین نے دیکھا کہ رادہا میرے پلنگ کی پائنتی پر سر رکھے بیٹھی ہوئی ہے، اُسکی ساری آنسوؤن سے تر ہے، اسکے رخسار بھیگے ہوئے ہین، اُسکے گیسو برہم ہین، ـــــ اور اُسکی آنکھون سے ناکامی کے شعلے نکل رہے ہین! مجھے اپنی بےرحمی پر بہت افسوس ہوا، مین نے رادہا کی طرف ہاتھ بڑہایا، وہ میری محبت کی طرح سرد پڑی ہوئی تھی! اس مین کوئی حس باقی نہ تھی وہ رنج و فکر کے سمندر مین ڈوب گئی تھی، مینے بمشکل اپنے دلکو قابو مین کرکے رادہا سے کہا۔

"کیا تم ساری رات یہین بیٹھی رہین! آخر اس سوگواری کا سبب، مین نے کہہ تو دیا کہ مجھے ہولی تک اور معاف کر دو"

رادھا نے ایک بامعنی انگڑائی لی، اپنے بکھرے ہوئے بالون کو سنبھالا خاموشی سے اُٹھی اور اُداس رفتار کے ساتھ کمرہ سے باہر چلی گئی!

(۵)

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ رادھا اب سراپا محبت ہے، مین اُسے ہر طرح آزما چکا تھا، اسلئے اب میرا آزمانا بیکار تھا لیکن "حسن" جب "عشق" کے قابو مین آجاتا ہے تو حسن سے زیادہ ستم آرائی سوجھتی ہے ——————— مین جانتا تھا کہ رادھا میرے بس مین ہے، اور مین نے جو ترکیب اُسکی محبت کو بیدار کرنے کے لئے سوچی تھی، وہ کامیاب ہو چکی ہے، میرا دل خوش تھا، کہ مین نوعروسی کی حیا و شرم کی منزلون سے اس دیوی کو بہت دور کھینچ لے گیا ہون، اور اب میرے تعلقات مین محبت کے سوا کوئی دوسری چیز نمودار نہین ہے!

لاہور سے خط آچکا تھا کہ والدین ہولی کے بعد آسکین گے، یہ تنہائی کا موقع بھی حسن اتفاق سے میرے لئے بہت غنیمت تھا، مگر مین دیکھتا تھا کہ رادھا روز بروز مرجھائی جاتی ہے، وہ دن اور رات کے کسی حصہ مین جب میری طرف دیکھتی تو اُسکی معصومیت مجھے پریشان کر دیتی تھی، اور مین اُسے مطمئن کرنے کے لئے مسکرا دیتا تھا!

آخر ہولی آگئی، رنگ و بُو کا موسم اپنی نیرنگیان دکھانے لگا، رادھا دیوی نے ہولی کھیلنے کا پورا سامان کیا، اُسے یقین تھا کہ آج مین اپنا وعدہ پورا کر دونگا اور میری محبت رادھا کے ساتھ رنگ اُڑائیگی!

آج امتحان محبت کا آخری دن تھا، جب مین دن کے وقت گھر آیا تو رادھا نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا، اور انتظار کرنے لگی کہ مین اپنا وعدہ پورا کرون!

مگر میری طبیعت مین ستم ظریفی کے طوفان ابھی موجزن تھے، مین نے کھانا کھایا، رادھا کی آنکھون نے مجھے دعوت رنگ باری دی، اور مین تیز نگاہون سے اُسے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا

میری یہ ادائے بے التفاتی رادھا رانی کو وحشی ہرنی کی طرح بے چین بنانے کے لئے کافی تھی، جونہی مین باہر پونچا اندر سے نغمون کی آوازین آنے لگین، رادھا گا رہی تھی ——— نہین وہ رو رہی تھی، اسکی آواز مین سوز ہی سوز تھا، مین نے دروازہ سے کان لگا لئے! مین نے سنا رادھا بھرائی ہوئی آواز مین کہہ رہی ہے:-

دیکھو دیکھو آج بھا ن ——— مار گیو نین با ن
گیسو کے تیر کھینچ تا ن ——— مار گیو، مین ہا ن

اُسکے بعد آواز پست ہوتے ہوتے بالکل کمزور ہو گئی ——— مگر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد رادھا دیوی کی آواز پھر آئی، اُسکی آواز مین سوز و گداز اپنی انتہائی درد آفرینی کے ساتھ موجین لے رہا تھا، اور وہ میری طلب مین اپنا

وہی پرانا منتر دھرا رہی تھی ————— وہ اپنی لرزتی ہوئی آواز سے کہہ رہی تھی:۔

منا لارے بھونرا سیّاں کو مورے

ہولی کھیلن کو جیا للچائے آج بھی سیّاں بیگی نہ آئے

کھائے رہی ہچکولے ——— منا لارے بھونرے سیّاں کو مورے

مین رادھا کی یہ نوحہ گری سنتا ہوا چلا گیا، مین نے دیکھا کہ سارا شہر عبیر و گلال مین ڈوبا ہوا ہے، ہر مکان سے عشرت و مسرت کی خوشبو چلی آرہی ہے، موسمی کیفیات ذرہ ذرہ سے آشکار ہین، مین نے بمشکل دن گذارا، گھر کے کئی چکر لگائے، اور ہر مرتبہ رادھا دیوی کو ایک نئے اہتمام مین دیکھا ——— وہ امید و بیم کی بے انتہا گہرائیوں مین ڈوبی ہوئی تھی، مگر مایوس نہ تھی، اُسکے انداز اہتمام سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج مجھے زندہ نہ رہنے دیگی، آخر رات ہوگئی، مجھے ایک دوست کے یہان جلسۂ رقص مین شرکت کرنی تھی، مین وہان گیا، مگر مجھے ہر ساز اور ہر سرود سے صرف رادھا کی آواز آرہی تھی

منا لارے بھونرا سیّاں کو مورے!

جب مغنی کوئی چیز گاتا تو مین یقین کرتا تھا کہ اُسکا صحیح مخاطب مین ہون، اور متکلم میری رادھا ہے، جب مطرب کوئی چیز چھیڑتا تھا تو مجھے رادھا کی سوگوار مگر امید سے بھری ہوئی تان سنائی دیتی تھی، میرا دل اُچاٹ تھا، مجھے محفل کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی، کوئی مجھے اپنے گھر کی طرف کھینچ رہا تھا

مین بمشکل کچھ دیر وہان بیٹھا، اور اُسکے بعد سیدھا گھر آیا، دروازہ پر دستک دی کسی ہاتھ سنے دروازہ کھولدیا، مگر مجھے علم نہ ہوسکا، مین چند منٹ منتظر کھڑا رہا، میرے دل مین جذبات کے طوفان اُمڈ رہے تھے اور مین اُن مین بالکل کھویا ہوا تھا، آخر دروازہ کو پھر ہاتھ لگایا تو وہ کھلا ہوا تھا، گھر مین قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ عطر و گلال کے فوارے کھولدیئے گئے ہین، گوشہ گوشہ سجا ہوا تھا، چپہ چپہ مہکا ہوا تھا، روشنی خوب ہو رہی تھی، ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی، دو برتنون مین گلابی رنگ بھرا ہوا تھا، دو پچکاریان جگمگا رہی تھین۔ مگر رادھا دیوی کا کہین پتہ نہ تھا! خیال ہوا کہ شاید کسی کام سے گئی ہوگی، مین فرش پر بیٹھ گیا، اور ہارمونیم چھیڑنے لگا مگر رادھا کا اب تک پتہ نہ تھا!

مین نے ہارمونیم بند کردیا، اور گھر مین چارون طرف رادھا کو ڈھونڈنے لگا، مگر مین اُسکے حاصل کرنے مین کامیاب نہ ہوسکا!

واقعات و حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد دفعتہً مجھے اپنے افسانہ کا ایک پلاٹ یاد آیا جو اس نظریہ پر قائم کیا گیا تھا:۔

"حسن ستائے جانے کے بعد جب ستاتا ہے تو پھر اُسکا حربہ بے پناہ ہوتا ہے"

مین ڈر گیا، لرز گیا، مجھے اس تحریر کا لفظ لفظ ہیبت ناک نظر آرہا تھا، اور مین پریشان تھا کہ آخر رادھا کہان ہے!

مین نے مجبور ہوکر آواز دی، مگر کوئی جواب نہ ملا، میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی مین عنقریب پاگل ہونیوالا تھا کہ یکایک اُس پھولون کے پردہ سے، جو سامنے آویزان تھا، اور جس کے پیچھے مجھے صرف دیوار کا دھوکا تھا، رادھا دیوی چودھوین رات کے چاند کی طرح مسکراتی ہوئی نکلی! اُس نے بغیر کچھ کہے سنے، پچکاری اپنے رنگین ہاتھون مین اُٹھا لی، رنگ بھرا، اور مجھپر برسانے لگی، مجھے سنبھلنا دشوار ہوگیا، کمرہ مین ہر طرف رنگ ہی رنگ نظر آنے لگا، آخر مجھے بھی موقع مل گیا مین نے بھی اپنی پچکاری اُٹھالی، رنگ بھرا ——— اور رادھا کی رنگ باری کا جواب دینے لگا، یہ پہلی رات تھی، حسن و عشق کھیل رہے تھے، حسن کی پچکاریون سے عشق بھیگا ہوا تھا، اور عشق کی رنگ باریون میں حسن ڈوبا ہوا تھا، تھوڑی دیر تک اس طرح ہولی "منانے کے بعد ہم دونون تھک گئے

"محبت" آزمائش و امتحان کے بعد اب ایک ایسی نعمت تھی جسکی نظیر نہین مل سکتی، مین کامیاب محبت ہونے کے بعد اسقدر مسرور تھا کہ بیان نہین کرسکتا!

"لارڈ ٹینیسن" کا مقولہ حرف بحرف پورا ہورہا تھا، اور رادھا سراپا محبت اور "پریم" بنکر میرے سامنے موجود تھی!

صبح اُٹھکر رادھا دیوی نے کہا "پران پیتم! آپ نے میری محبت کو خوب آزمایا، اور مجھے بہت ستایا، مین اسکا شکریہ ادا کرتی ہون، میری روح "پریم کی پیاسی" تھی، اب وہ سیراب ہے، مگر مین ہنوز آپکی محبت کی تشنہ ہون اور رہون گی ——— آپ اپنا کام ختم کرچکے، اب مجھے اجازت دیجئے کہ مین آپکی محبت کا امتحان شروع کردون!

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی، مین نے رادھا دیوی کو گلے سے لگا لیا، اور کہا:-

"دیوی! مجھے معاف کردو، تم یکسر "پریم" اور مطلق "محبت" ہو" اگر تم نے امتحان شروع کردیا تو مین یقیناً پورا نہ اُتر سکون گا مجھے علم ہے کہ "حسن" جب انتقام لیتا ہے تو "عشق" کو دنیا مین کہین پناہ نہین ملتی مین تمھین یقین دلاتا ہون کہ اب کوئی چیز میرے دل سے تمھین علٰحدہ نہین کرسکتی"

رادھا کی مست آنکھون مین خوشی کے آنسو آگئے، اُسکے رخسار سرخ ہوگئے، اُسکے ہونٹون پر تبسم کی موجین اُٹھنے لگین، اور پھر خود ہی شرماکر وہاں سے اُٹھ گئی

صحرائی سروری

قوّالی

اسوقت یہ تحقیق مقصود نہین کہ یہ پیشہ کب سے رائج ہے، اس اختراع و ابداع کا سہرا ابراہیم لنکن کے سر ہے یا نپولین بوناپارٹ کے، کیونکہ اگر اس باب مین یہ قول صحیح سمجھ لیا جائے کہ "بگڑا گویّا قوال اور بگڑا شاعر مرثیہ گو" تو پھر قوال اور مرثیہ گوئی کو اتنا ہی قدیم ماننا پڑیگا جتنا موسیقی و شاعری کو، یہ بات اور ہے کہ ان کے یہ اصطلاحی نام بعد کو وضع ہوئے ہون اسوقت اسکی لسانی تحقیق بھی مراد نہین کہ یہ باب "قال یقول" کا صیغۂ مبالغہ ہے اور ایک گانیوالے کیلئے اسکا استعمال بالکل اسیطرح غلط ہوتا ہے جیسے بقال کا، کہ بقال اصل مین ترکاری بیچنے والے کو کہتے ہین لیکن اب وہ عام طور پر بنئے کے معنی مین بولا جاتا ہے، بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس جماعت یا زیادہ صحیح لفظ مین اس طائفہ کے غنائی و ذکاہی پہلو کا انکشاف کیا جائے۔

لفظ قوالی ایک ایسا لفظ ہے جو ایک ہی وقت مین دو مفہوم کو مشتمل ہے۔ ایک وہ جسکا تعلق محض موسیقی سے ہے یعنی قوالی بول کر ایک مخصوص لحن ایک مخصوص برگ و ساز کے ساتھ گانا بجانا مراد ہوتا ہے، اور دوسرے وہ نشفلا سماع، یا "احتفال درویشانہ" جہان اس قسم کی صحبت برپا ہوتی ہے۔

جب گانے کے جواز یا عدم جواز پر بحث ہوتی ہے تو مولوی اکثر و بیشتر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ نفس غنا تو جائز ہے لیکن مزامیر کے ساتھ ناجائز ہے اور مزامیر کے معنی وہ بتاتا ہے "تار والے ساز" جیسے، سارنگی، ستار، قانون، بربط، وغیرہ۔ حالانکہ زبور مین جہان غنائے داؤد کا ذکر آیا ہے وہان مزامیر داؤد لکھا ہے اور یہ امر ثابت ہے کہ جناب داؤد صرف بانسری بجاتے تھے اور مزامیر داؤد سے مراد اُن کے وہ تمام ترنمات ہین جو بانسری سے پیدا ہوتے تھے اسی لئے عربی زبان مین زمیر صرف اچھی آواز کو کہتے ہین اور زمیر خوبصورت لڑکے کو، زمّارہ بانسری کے معنی مین آتا ہے اور مزمار ہر اُس آلہ کو کہتے ہین جس سے اچھی آواز پیدا ہو۔

پھر جب ہر وہ آواز جو کانون کو بھلی معلوم ہو جو دل کو خوش کرے لغتاً "مزامیری وعید" کے تحت مین آتی ہے تو بے مزامیری گانیکے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہین یعنی وہ گانا جس سے دل کو وحشت ہو، جس کے سننے سے سامعہ کے پردون مین تشویش پیدا ہو اور جو تھوڑی دیر کے بعد ایک انسان کو کانون مین اُنگلی دیکر بھاگ جانے پر مجبور کرے، اگر کوئی مثال دون تو کہہ سکتا ہون کہ جیسے ہمارے آسی صاحب، افسر صاحب، اور امین صاحب، کا مشاعرہ مین غزل پڑھنا، کہ اس لحاظ سے اُن کو بہترین قوال ماننا پڑیگا اگر قوالی نام واقعی اس غنا کا ہے جو مطلقاً کوئی مزامیری کیفیت نہین رکھتا اور جسے دلکشی سے کوئی لگاؤ نہین ہے۔ نوحہ گو، نعت گو، مشہور مقولہ ہے اسکے ساتھ یہ اضافہ بھی ہونا چاہئے کہ "بیہودہ سرا، قوالی سرا" کیونکہ اسطرح ہم اصولاً قوالی کے مفہوم کی کوئی تعیین تو کر سکین گے اور اگر کوئی قوالی کی تعریف پوچھے گا تو ہم کہہ سکین گے کہ قوالی نام ہے موسیقی کی نعت گوئی کا" اور یون بھی چونکہ ایسی محافل مین اکثر نعتیہ غزلین پڑھی جاتی ہین اس لئے یہ توجیہہ و تصریح زیادہ برمحل و قریب حقیقت ہو گی۔

موسیقی کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اس سلسلہ مین ہندوؤن کے ناہد و اناہد کے جھگڑے، یا کسی مسلمان بزرگ کا یہ کہنا کہ اُنھون نے روز الست جو آواز سنی تھی وہ لحن پوربی مین تھی، یا کسی فلسفی کا یہ دعوی کہ گردش سیارگان کی آواز سے اُس نے اصول غنا مرتب کئے یہ سب ہماری سمجھ سے باہر ہین لیکن یہ یقینی ہے کہ ارتقاء تمدن کے سلسلہ مین جس طرح اور باتون مین مرد و عورت دونون برابر کے شریک ہین اسیطرح موسیقی کی ایجاد و اختراع مین بھی دونون کی کاوشین شامل ہین فرق یہ ہے کہ مرد جب باہر جنگل مین حصول غذا کے لئے جاتا تھا تو اُسے درندون کی ہیبت ناک صداؤن، اپنے آلات اور چٹانون کے آہنی و حجری تصادم کی خشن آوازون سے واسطہ پڑتا تھا جنھون نے اسکو اصول موسیقی کی ترتیب مین مدد دی، اور عورت غار کے اندر جھونپڑون کے نیچے یا چمڑے کے خیمون مین اُن چڑیون کی آوازین سنا کرتی تھی جو پاس کے چشمون پر آ آ کر پانی پیتی تھین۔ اور وہین قریب کے درختون پر بیٹھ کر عورت کی تنہائی اور صحرائی سکوت کو شیرین نغمون سے معمور کرتی رہتی تھین جن سے عورت نے اپنے گیت بنائے، بیخواب مچلنے والے بچون کو سنا سنا کر اُن کی روح مین سکون و راحت کی کیفیت پیدا کی اور رات کے وقت، دن بھر کی محنت سے خستہ ہو کر پڑ جانیوالے مرد کے دل کو صبح کیلئے نئے ولولۂ عمل سے لبریز کیا، پھر چونکہ عورت کی تخلیق، اسکے گلے کی ساخت صرف لچیلی، نرم اور شیرین ہی آواز پیدا کر سکتی ہے اس لئے اسکی یہ کوشش زمیر ہو گئی اور مرد اپنے گلے سے بھاری موٹی آواز نکالتا ہے اسلئے اسکی یہ سعی نفیر[1] ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مولویون اور صوفیون کی مجالس مین کبھی عورت کا گانا نہین ہوتا کیونکہ اسکا گانا مزامیری ہے اور غنا بالمزامیر حرام ہو ہی چکا ہے۔ بلکہ صرف مرد کا چیخنا پسند کیا جاتا ہے کیونکہ اس مین زمیر کا کہین پتہ نہین اور ممکن ہے یہ سب کچھ اس لئے بھی ہو کہ آدم کا انتقام حوا کی بیٹیون سے لیا جائے لیکن بظاہر اسکا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صوفیہ کے یہان دل خوش کرنیکے بجائے دل دکھانا زیادہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اسلئے انھون نے اپنی محفل مین یہ مشغلہ مرد کے سپرد کیا اور شاعری کا جو حصہ اس مین شامل کیا وہ بھی اُسی "پوچ گو" قسم کا۔

اسلئے اب اس تمام بحث کے بعد قوال کی جو تعریف بھی کیجائے لیکن یہ یقینی ہے کہ اُسکا گانا کسی طرح ناجائز نہین ہو سکتا۔ اور جب انسان فرط مسرت کی یکسانی سے گھبرا کر کبیدگی خاطر پیدا کرنا چاہے تو منجملہ دیگر تدابیر کے قوالی بھی اسکی ایک کامیاب تدبیر ہے

قوال کی محفلین خواہ کسی خانقاہ مین ہون یا کسی "مرشد خانہ" مین اُسکے اصول تہذیب و ترتیب ایک ہی ہوتے ہین۔ یعنی زمین پر جہان رنگ برنگ کی بوسیدہ دریان اور ایک آدھ کیف سی چاندنی بچھی رہتی ہے ایک جانب گاؤ تکیہ رکھدیا جاتا ہے جس کے سہارے سے خانقاہ کے متولی یا صاحب سجادہ ایک خاص ادائے مغانہ سے دو زانو یا چار زانو ہو کر بیٹھ جاتا ہے دونون جانب ارادتمندون یا سامعین کی جماعت مین کچھ "می پرانند" قسم کے افراد شامل ہوتے ہین اور کچھ حال لانے کے لحاظ سے "می پرند" قسم کے۔ وضع قطع کے تنوع کے لحاظ سے بھی یہ ہجوم اچھا خاصہ "حدیقۃ الحیوانات" ہوتا ہے جہان معدوم (Extinct) حیوانات (مثلاً میمتھ سیمرغ وغیرہ) سے لیکر سارس، ہُد ہُد تک کے نمونے نظر آتے ہین۔ بعض کی داڑھیان "خاکروب" قسم کی ہوتی ہین بعض کی "زمین دوز" اور بعض کی بالکل ایسی کہ وقت ضرورت ان سے مزار پر سپیدی پھیرنے (white wash.) کا کام نہایت خوبی سے لیا جا سکتا ہے۔

لباس مین نیم ساقی کمانی دار یا جامہ، رنگین محرابی تہمد اور شملہ بمقدار جہل والا عمامہ یہان کے علم مناظر ہین لیکن قابل ذکر وضع ایک تو اُس

---

[1] یہ اور نفرت ایک ہی مادہ کے لفظ ہین

جماعت کی ہے جو "احرام بند" کہلاتی ہے اور ایک ہی چادر مین (جو حسب توفیق دو دو تولہ ریشمی بھی ہوتی ہے) جسم کے بالائی و زیرین حصہ دونون کو ملفوف کر لیتی ہے اس جماعت کے نوجوان باعتبار زیبائش و آرائش اس انداز کے بھی دیکھے جاتے ہین جو وجد کیوقت بقول عرفی

چون عروسانِ ہند در دمِ رقص   از خمِ گیسوش چکد روغن

کا سمان پیش کرتے ہین اور شہر کے اُس حصہ مین جو چوک کے نام سے موسوم ہے اپنی کارگاہ ولایت کو زیادہ کامیابی کیساتھ قائم کر سکتے ہین۔ دوسری قابل ذکر جماعت وہ ہے جسے "سدا سہاگ" کہتے ہین، ان کے ہاتھون مین چوڑیان کان مین بالیان، پاؤن مین گھونگھرو، سر پر دوپٹہ، آنکھ مین کاجل، ہونٹون پر مسّی سینہ پر چولی، چوٹی مین موباف، سبھی کچھ نظر آتا ہے گویا درویشی و تصرف کا یہ مزامیری عنصر ہے جو جنت سے نکلنے کے غصہ مین حوا کی بیٹیون نے انتقام لینے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ خدا کی یہ مخلوق (جسکو نہ مرد کہہ سکتے ہین نہ عورت جو نہ خنثا مفرد ہے نہ خنثا مشکل) جسوقت مرغ زرین بنی ہوئی محفل سرود مین تال سم کیساتھ گھونگھرو کی جھنکار پیدا کرتے ہوئے انتہائی جوش کے عالم مین رقص کرتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرد کی ساری جنس اسوقت بحر اوقیانوس مین ڈوب مرنے کیلئے بیتاب ہے

قوالون کی جماعت جو اکثر و بیشتر معمولی طبقہ کی پیداوار ہوتی ہے نہ بلحاظ صورت قابل لحاظ ہوتی ہے نہ باعتبار سیرت۔ جاہل ہونا اسکی اولین خصوصیت ہے اور انسان ہونا بالکل آخری، اس طائفہ کی ترتیب کم از کم تین افراد پر مشتمل ہے ایک ہارمونیم نواز یا ستار نواز جو سرخیل کی حیثیت رکھتا ہے دوسرا اسکا معاون جو اکثر کوئی نوجوان یا کمسن لڑکا ہوا کرتا ہے اور تیسرے وہ حضرت جو ڈھولک کے مالک ہوتے ہین اور جنکی گردن کی جنبش، چہرے کے اعصاب کا تناؤ، چشم و ابرو کی متنوع الزوایا کشش ایک محقق کیلئے پوری ابو بیٹری (vocabulary) کی حیثیت رکھتی ہے "سرخیل طائفہ" اصولاً کسی رباعی سے ابتدا کرتا ہے جو جماعت صوفیہ مین بالکل "حقانی" ہوتی ہے اور اسکے بعد وہ خسرو، حافظ یا جامی کی کوئی غزل شروع کرتا ہے جس کے سمجھنے والے محفل مین زیادہ تر اس حیثیت کے ہوتے ہین کہ جسوقت ع

مائی خواہم سیم تنگ و نامرا

قوال کے منھ سے نکلتا ہے تو وہ تہمد اتار کر "ننگے" ہو جاتے ہین اور دوئی و فردا کا فرق مٹا کر رقص مین مصروف، اس سے اندازہ اس وجدانی کیفیت کا ہو سکتا ہے جو اشعار کے مفہوم سے متعلق ہوتی ہے ورنہ یون ڈھولک، ستار اور تالیون کی آواز سے جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اسکو دیکھتے ہوئے۔

بہ آواز دولاب مستی کنند

پر کب اعتراض کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

صاحب سجادہ یا خانقاہ کا متولی جو اسوقت ساری محفل کا "مالکُ الملک" ہوتا ہے بہت کم وجد مین آتا ہے کیونکہ اہل کمال صوفیہ کے نزدیک بیتابی و بے اختیاری کا اظہار سلوک کی خامی کی دلیل ہے اور ایسے "پختہ کارون" کے یہان خامی کا کیا ذکر، اسمین شک نہین کہ صاحب خانقاہ کی ذمہ داریان بہت ہین، مہمانون کی ضیافت ہم مشرب لوگون کی مدارات، قوالون کی رخصتی، گاگر، چادر وغیرہ کی رسمین یہ سب زر طلب باتین ہین اور نذر و نیاز وغیرہ سے جو کچھ ملتا ہے وہ سب اسمین صرف ہو جاتا ہے، لیکن سب سے زیادہ قابل تعریف ایثار وہ ہے جو محفل سماع مین اسکی طرف سے ظاہر ہوتا ہے کہ چارون طرف سے لوگ اُٹھ اُٹھ کر اسکے سامنے نذر پیش کرتے ہین اور وہ چوتھا حصہ یعنی "حق سجادگی" کا نہین کاٹتا اور سبکا سب قوالون کو دیدیتا ہے۔ یہ جوش ولایت! یہ زور تہمتنی! معلوم نہین ان حضرات کے دست و بازو زخم چشم سے کیونکر محفوظ رہتے ہین

یہ تھا ایک مجموعی و اجمالی بیان اس نوع کے محافل کا، اب جو مختلف خانقاہون مین مختلف خصوصیات پائی جاتی ہین وہ مستقل مقالات کی مقتضی ہین اس دوران مین اودھ کی ایک نہایت مشہور خانقاہ مین مجھے جانیکا اتفاق ہوا تھا اور ممکن ہے کہ کسی آیندہ اشاعت مین وہان کے جزئی حالات سے بحث کرون۔

مومن و کلام مومن

(بہ سلسلہ سابق)

علوم اور مومن پہلے لکھا جاچکا ہے کہ شاعر کا شعر اس کے علوم و فنون، طبیعت اور رنگ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے "مومن" کے علوم کو ان کی غزل مین دیکھئے اور قدرت بیان کی داد دیجئے۔

قرآن و حدیث

کیون سنے عرضِ مومنِ مضطر — صنم آخر خدا نہین ہوتا

اس شعر مین قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے یجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔

اور اس آیت کی طرف لفظاً جس کا مقصود یہ ہے کہ خدا مضطر کی سنتا ہے

خدایا ہاتھ اٹھاؤن عرض مطلب سے بھلا کیونکر — کہ ہے دست دعا مین گوشہ دامانِ اجابت کا

اس شعر مین آیت لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور اس کے ہم معنی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ

آخر امید ہی سے چارہ حرمان ہوگا — مرگ کی آس پہ جینا شب ہجران ہوگا

یہ ایک مسئلہ ہے کہ انتہا کے بعد پھر ابتدا ہوتی ہے، انتہاے نا امیدی کے بعد امید پیدا ہوتی ہے، غالب نے اس کو ان الفاظ مین بیان کیا ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید — نا امیدی اسکی دیکھا چاہیئے

غالب کو بیان فلسفہ کے لئے مناسب الفاظ نہین ملے، جہان کہین ملے ہین مسئلہ کو چیستان کے اشعار بنا دیئے ہین "مومن" نے دونون سے اپنے بیان کو محفوظ رکھا ہے نہ تو ابتذال آنے دیا ہے اور نہ اطلاق۔

تونے جو قہرِ خدا یاد دلا یا مومن — شکوۂ جور بتان دل سے فراموش ہوا

ایک مسئلہ ہے کہ ایک وقت مین صرف ایک ہی خیال ہو سکتا ہے، اس کا بیان ہے

نجوم

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع نا ساز دیکھنا

حکمت و طب

جنون کے جوش سے بیگانہ وار ہین احباب — ہمارا حال وطن مین ہوا سفر کا سا

سودا اور جنون سے کچھ تمیز نہین رہ جاتی

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے مین ساری — چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درماں ہو گا

اسی طرح ضمنی طور پر اور بھی علوم و فنون آگئے ہین جن کا ذکر طوالت پیدا کر دیگا

موازنہ دعویٰ کی دلیل مستحکم کرنے کے لئے موازنہ ضروری چیز ہے سب سے پہلے "مومن" کا موازنہ "میر" سے کرکے دیکھنا

چاہئے کہ "مومن" اپنے انداز مین رب النوع استاد شاعران "میر" کے مقابلہ مین کہانتک کامیاب اور سرسبز ہوئے ہین۔

اس حقیقت سے انکار نہین کیا جاسکتا، کہ "میر" نے "غزل" مین خاص رنگ پیدا کرکے اس کو متعلق فن بنایا ہے اس کے تسلیم مین بھی پس وپیش نہین ہوسکتا کہ "مومن" نے اس فن کو آسمان عروج کا آفتاب بناکر اردو کے ذرّون پر کسب ضیا کے لئے احسان عظیم کیا ہے۔

میر و مومن

میر

گرمی سے مین تو آتش غم کے پگھل گیا — راتون کو روتے روتے ہی جون شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہین تجھسے بھی نازک مزاج تھے — تیوری چڑھائی تو نے کہ یان جی نکل گیا

گرمی عشق مانع نشو و نما ہوئی — مین وہ نہال تھا کہ اوگا اور جل گیا

مستی مین چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا مین — لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

عریان تنی کی شوخی سے دیوانگی مین میر
مجنون کے دشت خار کا دامن بھی جل گیا

مومن

پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا — جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جون خفتگان خاک ہے اپنی فتادگی — آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل — مین کوچۂ رقیب مین بھی سر کے بل گیا

بتخانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس معاف کہ یان جی بہل گیا

پہلے شعر مین "میر صاحب" نے آمد کے رنگ مین رات ہی بھر مین آتش غم سے گھل گھل کر شمع کی طرح تمام ہو جانیکو کہا ہے "مومن" نے اپنا "سخت دل" پیش کیا ہے لیکن اہتمام اور ہمت دیکھئے بہترین سلیقے اور اسلوب سے موتیون کی طرح مالے مین پروکر، اب دونون کا فرق ظاہر ہے یہی مناسبت تمام غزل مین قائم ہے۔

(۲)

میر

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے — کار شکایت اپنا گفتار تک نہ پہونچا

بے چشم نم رسیدہ پانی چوانے کوئی — وقت اخیر اس کے بیمار تک نہ پہونچا

یہ بخت تیرہ دیکھو باغ زمانہ مین ہے — پژمردہ گل بھی اپنے دستار تک نہ پہونچا

مومن

اللہ رے ناتوانی جب شدت قلق مین — بالین سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

مفت اوّل سخن مین عاشق نے جان دیدی — قاصد بیان تیرا اقرار تک نہ پہونچا

(۳)

تیسری غزل مین مشترک قوافی کو سامنے رکھ کر فرق دیکھنا چاہیے۔

میر

سمجھی نہ بادِ صبح کہ آکر اُٹھا دیا — اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کے وہ پردہ اُٹھا دیا

تکلیف دادِ دل کی عبث ہمنشین نے کی — دردِ سخن نے میر سبھون کو رولا دیا

مومن

چارون کے بدلے مجھ کو زمین پر گرا دیا — اس شوخ بےحجاب نے پردہ اُٹھا دیا

فرماتے ہین وصال ہے انجام کارِ عشق — کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا

اشک فغان کی ہائے رقیب آفرینیان — محشر نے خفتگان زمین کو جگا دیا

ہمدم دکھا اب اس کو کسی ہب کہ رحم آئے — ناصح کو میرے حالِ زبون نے ڈبا دیا

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

ان دونون غزلون کے فیصلہ کی ضرورت نہین صاحبِ نظر اس مین خود فرق نکال سکتے ہین۔

مومن کا ایک لفظ

"مومن" نے اپنی ایک مرصع غزل مین لفظ "گویا" اس طرح استعمال کیا ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

ترازو کے ایک پلے مین اس لفظ کو رکھیے اور دوسرے مین "میر" کی یہ غزل جس مین "گویا" ردیف ہے

غنچہ ہے وہ دہان ہے گویا — ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا

میرے مردے سے بھی وہ چونکتے ہین — ابتلک مجھ مین جان ہے گویا

حیرتِ روئے گل سے مرغ چمن — جب ہی یون بےزبان ہے گویا

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے — میکدہ اک جہان ہے گویا

بسکہ ہین اس غزل مین شعر بلند — یہ زمین آسمان ہے گویا

وہی سوز مزاج شب مین ہے — میر ابتک جوان ہے گویا

انصاف سے بتایئے کہ وزن کس کا زیادہ ہے، حالانکہ "مومن" کا "گویا" میر کے بعد ہے لیکن "مومن" نے اپنی کرشمہ کار دل سے ایک لفظ کو ایسا "موتی" بنایا ہے جس کے وزن کا موتی بڑے بڑے جوہریون کے جواہر خانہ مین نہین۔

مومن و غالب

مسلم الثبوت، حکمت استاد سے موازنے کے بعد معاصرین سے مقابلہ کی بھی ضرورت ہے، یہ ظاہر ہے کہ میر کا زمانہ اور تھا اور مومن کا اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ کے اعتبار سے دونون کی شاعریان متاثر

ہوئین معاصرین کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ مین "مومن" کا جوہر ہر اعتبار سے کھل جائیگا۔

ہمارے خیال مین جوزمانہ "مومن" کو ملا تھا وہ شاعری کے کمال کا زمانہ تھا، بڑے بڑے محقق اور فاضل ہستیان اسوقت موجود تھین ذوق اور غالب کے ایسے استادون کے سامنے فروغ پانا مشکل اور دشوار بات تھی۔

ان شاعرون کے علاوہ علوم معانی و بیان ۔عروض و قوافی، ادب و انشا کے بڑے بڑے ماہرین موجود تھے مفتی صدر الدین آزردہؔ جس پائے کے شاعر تھے اس سے زیادہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے فاضل تھے ان کے سامنے شعرائے عصر زانوے ادب تہ کرتے تھے، لیکن "مومن" نے ان فضلائے زمانہ سے داد تحسین و خراج آفرین وصول کیا تھا ان مین غالب اور ذوق کا مرتبہ یکے بعد دیگرے بہت بلند تھا۔

غالب کی ان دو معرکتہ الآرا غزلون سے مومن کی غزلون کا حسب ذیل موازنہ ہے، جو غالب کے زمانے ہی مین بہت مشہور ہو چکی تھین۔

ان غزلون کے مشترک قوافی خاصکر قابل غور ہین۔

غالب

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب مین	کافر ہون ۔گر نہ ملتی ہو راحت عذاب مین
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون	مین جانتا ہون جو وہ لکھین گے جواب مین
مین اور خطِ وصل خدا ساز بات ہے	جان نذر دینی بھول گیا اضطراب مین
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی	پیتا ہون روزِ ابر وشب ماہتاب مین

مومن

تاثیر صبر مین نہ اثر اضطراب مین	بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب مین
کہتے ہین تمکو ہوش نہین اضطراب مین	سارے گلے تمام ہوے اک جواب مین
بے نالہ منہ سے جھڑتے ہین بے گریہ آنکھ سے	اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب مین
ناکامیون سے کام رہا عمر بھر ہمین	پیری مین یاس ہے جو ہوس تھی شباب مین
کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہین	بے بادہ مست ہون مین شب ماہتاب مین

غالب کی غزل کا پہلا شعر دیکھئے، مصرعہ اول مین الفاظ کی مشکل بعدی نار۔ التہاب نے شعر کو "تغزل" کی آہ سے گرادیا ہے "ملتی ہے خوئے یار سے" ترکیب نار اور التہاب کی مناسبت ہے پہلے لکھا جاچکا ہے کہ "غزل کے لئے الفاظ اور معانی مین عذوبت ترکیب مین سلاست ہونا چاہئے وہ غالب کے اس شعر مین مفقود ہے

مومن کا پہلا شعر اس کے مقابلہ مین دیکھئے۔

جذبات عشق کے اعتبار سے کسقدر مناسب اور موزون الفاظ لائے ہین۔

معنوی اعتبار سے "مومن" کے شعر سے غالب کو کوئی مناسبت نہین غالب کہتا ہے کہ عذاب مین اس لئے راحت ہے کہ اس مین دوست کی خو ہے، اس اتنے مضمون کے لئے الفاظ کا پہاڑ اٹھایا ہے

"مومن" کہتا ہے کہ صبر اور اضطراب دونون بیکار ہین گویا کہ ارتفاع نقیضین کو مومن نے ثابت کرنا چاہا ہے، جب یہ صورت ہو کہ نہ تو صبر کرنے سے اور نہ اضطراب سے کچھ حاصل ہو تو اسوقت جان پر کیسا عذاب ہوتا ہے

لفظ بیچارگی نے اس شعر مین وہ کام کیا ہے جو جسم مین روح کرتی ہے، اس کی بلاغت پر جتنا غور کیجئے گا شعر مین لطف پیدا ہوتا جائیگا جواب کے قافیے مین غالب صاحب قاصد کے آنے سے پہلے ایک خط اور لکھ لینا چاہتے ہین، "مین جانتا ہون جو وہ لکھینگے جواب مین مفہوم اور مضمون بطن شاعر مین ہے

"مومن" نے کسقدر بلیغ مضمون ادا کیا ہے کہ "کہتے ہین تمکو ہوش نہین اضطراب مین، اس نتیجہ کو اس طرح رکھا ہے کہ مقدمات خود سمجھ مین آتے ہین - یہ "جواب" ایسا لاجواب ہے کہ پھر کچھ کہنے کی گنجایش نہین

تیسرا شعر اضطراب کے قافیہ کا ہے -

غالب کا منشا یہ ہے کہ قاصد نے آکر یا خود معشوق نے وصل کا مژدہ سنایا یا وصل حاصل ہوا (کچھ صاف نہین) یہ صورت خدا ساز ہوی ہے - اس خوشی مین جان نذر کرنا تھا لیکن اس کو مین بھول گیا، پورے شعر مین اگر اپنی طرف سے الفاظ اور عبارات کا اضافہ نہ کیجئے تو شعر چیستان بنا رہتا ہے -

"مومن" کہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے نالہ بنکر منہ سے اور آنکھ سے نکل رہے ہین اس کو دیکھنا چاہیے پوچھنے کی ضرورت نہین ہے گریہ آنکھ سے؟ اس لئے کہا کہ بجائے اشک دل کے ٹکڑے نکلتے ہین جھڑنے کی لفظ سے پھول جھڑنے کی طرف بھی لطیف اشارہ ہوتا ہے، اب دونون کا فرق ظاہر ہے

غالب کے بیان محذوفات نے شعر کو "راز" بنایا ہے "مومن" مختصر الفاظ مین صفحہ کے صفحہ کی داستان رنگین بیان کر دی ہے

ماہتاب کے قافیے مین "مومن" کا شعر غالب کے شعر سے اتنا بلند ہے کہ دونون مین کوئی مناسبت نہین

غالب نے واقعہ بیان کیا ہے "مومن" نے دل پر تصویر کھینچی ہے شباب کے قافیہ مین "مومن" نے ناکامیون کا عجیب و غریب فلسفہ بیان کیا ہے، اب دوسری غزل بھی قابل غور ہے -

غالب

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گمان نہین — اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحان نہین

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز — نامہربان نہین ہے اگر مہربان نہین

ہر چند جانگدازی قہر و عتاب ہے — ہر چند پشت گرمی تاب و توان نہین

پاتا ہون اس سے داد کچھ اپنے سخن کی مین — روح القدس اگرچہ مرا ہمزبان نہین

مومن

اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال | دشمن سے سن چکا ہون کہ تو مہربان نہین
بیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا | قابو مین دل نہین مرے بس مین زبان نہین
کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر | پھر کیا کرین کہ اس کو سر امتحان نہین
ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا | بس اے خرام ناز کہ تاب و توان نہین

ان دونون غزلون مین صرف مشترک قوافی لکھے گئے ہین، تنقید کی ضرورت نہین، معیار بتا یا جا چکا ہے، اب فیصلہ ان کے ہاتھ مین ہے جو انصاف کے ساتھ فیصلہ و تحیص کر سکتے ہین۔

غالب پرست، غالب کے دوسرے شعر کی بہت تعریف کرتے ہین ان کو چاہئے کہ "مومن" کے اس قافیہ پر غور کرین، غالب کے شعر مین اشکال پسندی اور دقت نظری کے بعد بھی معمولی مضمون کے سوا کچھ نہین

"مومن" کس وقت اور کس کی زبان سے معشوق کی، مہربانی کا حال سنا ہے اور اس کو کس انداز مین بیان کیا ہے۔ بلاغت کی مثال کے لئے یہ شعر سند ہے

ذوق و مومن | غالب کے اغلاق اور مشکل پسندی سے موازنہ کرنے کے بعد ذوق کی سلاست اور روانی سے بھی مقابلہ کرنا چاہئے۔

ذوق

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب مین | کیا جانین لکھدیا اسے کیا اضطراب مین
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب مین | واں ایک خامشی تری سب کے جواب مین
بے بادہ عورگی ہیں ہوا ذوق چون مویز | کی توبہ بیوقوف نے ناحق شباب مین

"مومن نے اس ردیف اور قافیہ مین جو کچھ لکھا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہین ذوق کے اشعار پر اظہار خیال کافی ہے۔

ذوق نے صرف تین ہی شعر لکھے ہین، ان مین دو اپنے رنگ مین بہتر ہین، تیسرے شعر مین الفاظ "عورگی" "چون مویز" کے ندرت اور نقص ترکیب کے علاوہ معنوی کوئی خوبی پیدا نہین ہوئی۔

"مومن" نے اپنے ہر شعر مین "تلاش" "مضمون آفرینی" "طرز ادا" "اسلوب بیان" سے تغزل کا گلستان طیار کر دیا ہے۔

ذوق

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زبان کے لئے | سو ہے دل مین مزے سوزش نہان کیلئے
نہین ثبات بلندی عزو شان کے لئے | کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسمان کیلئے
ہزار لطف ہین جو ہر ستم مین جان کے لئے | ستم شریک ہے ہوا کون آسمان کیلئے

نہ چھوڑ تو کسی عالم مین دوستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جوان کیلئے
بنایا آدمی کو ذوق ایک مرد ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہان کیلئے

مومن

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہان کے لئے
ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا — وگرنہ خواب کہاں چشم پاسبان کے لئے
بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوے — ہمین بھی دینی تھی جان اسکے امتحان کیلئے

ذوق نے اس بحر مین ۲۶ شعر اس انداز کے کہے ہین، ذوق نے اپنی غزلون مین بیشتر اخلاقی شعر کہے ہین! اکثر اشعار ایسے بھی ہین کہ ان کا ہونا جذبات تغزل کے سلسلہ مین بہتر معلوم نہین ہوتا، مثلاً چوتھا شعر اس کو تغزل کے ساتھ کوئی مناسبت نہین
''مومن'' نے اپنے تمام دیوان مین سلسلہ لفظ و تغزل کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان مین اخلاقی اشعار کم ہین، یہی حال اور علوم و فنون کا ہے، جہان کہین اخلاقی اشعار ضمناً آگئے ہین ان مین وہ لفظ موجود ہے
''مومن'' نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ معاملات حسن وعشق مین دوسرے مسائل اور معاملے آنے نہ پائین، حقیقت بھی اسکی مقتضی ہے۔

غور سے دیکھئے تو ''مومن'' کے سوا اس اہتمام کا شاعر کوئی دوسرا نہین

مومن اور ذوق مین وہی فرق ہے جو غزل اور قصیدے مین ہوتا ہے، مومن پر تغزل کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ قصیدے مین بھی اس کی جھلک ہے، ذوق قصیدے مین ڈوبے ہوے ہین اس لئے ان کی غزلون مین بھی اس کا رنگ موجود ہے اس لئے حقیقتاً مومن اور ذوق کا موازنہ غزل مین نہین ہو سکتا

قصیدے کی ''واہ'' کو غزل کی موازنہ ''آہ'' سے واسطہ نہین، تاہم ذوق کی استادی اور قدرتِ کلام سے انکار نہین ہو سکتا، قصیدے مین انکی جسقدر تعریف ہو مناسب ہے۔ اُردو فارسی سے موازنہ کرنے کے بعد ''مومن'' تنہا وہ شاعر ہین کہ انکی غزلون کا موازنہ ''برج بھاشا'' کی تغزل سے کیا جا سکتا ہے تاکہ ''مومن'' کے کمال کی قدر ایسے زبان کے مقابلہ مین کیجا سکے جس کا مقابلہ مغرب کی کوئی زبان نہین کر سکتی

بھاشا کا تغزل اور مومن کی غزل | بہاری کہتا ہے:-

پوس ماس سنی سکھن پے سائین چلت سواد — گہی کر مین پردیں تجیا رو پیو ر اگ ملاد

ترجمہ:- پوس کے مہینہ مین سکھیون سے یہ بات سن کر کہ پیارے علی الصباح پردیس کو جائین گے اس چالاک عورت نے بین لیکر ملاد کی راگ الاپی (ملاد کی راگ سے پانی برستا ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق سفر کو نہ جا سکے۔

بہاری کا دوسرا شعر ہے

مانجو یدہی تنوا چیہ سوچھ راکھتے کاج درگ پگ پوچھن کو کئے بھوشن پا انداج

ترجمہ:- جسم کی خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے خدانے پائے نگاہ کے صاف کرنے کو زیور پا انداز بنایا۔

چھوی نہ شستوتا کی جھلک جھلکیو یو بن رنگ دیپتی دیھ دو ہون ملی دیپتی تا پتھا رنگ

ترجمہ:- لڑکپن کی جھلک نہین گئی تھی کہ جسم پر جوانی کا رنگ چڑھ گیا دونون کے ملنے سے جسم تانبہ کی طرح چمکنے لگا۔

میرن کہتا ہے:-

تم بن اے نی کون کرے کر یا موپر ناتھ سو ہین اکیلی جان کے دُکھ کر دینو ساتھ

خسرو کہتا ہے:-

خسرو اپنا سوہاگ کی جاگی پی کے بھنگ من مورے من پیو کو دو وُ بھئے اک رنگ

ترجمہ:- اے خسرو مین نے سب وصال معشوق کے ساتھ جاگ کر بسر کی میرا جسم اور اسکی روح دونون ملکر ایک چیز بنگئی تھی

سنی رام:-

چنت لال کے مین کیو کیجی ہیو پشان کاہ کہون درکت نہین آتے ویوگ کرشان

ترجمہ:- معشوق کی جدائی کے وقت مین نے اپنا کلیجہ پتھر کا بنا لیا کیا کہون کہ وہ آتش فراق سے پھٹ کیون نہین جاتا

ایک اور شاعر کہتا ہے:-

تارے گنت گنت ہون ہارتی ٹپکن لاگے نین +

ترجمہ:- تارے گنتے گنتے مین ہار گئی آنکھین ٹپکنے لگین۔

مومن

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیون کیا یون ہی تو ہجر مین مجھے رنج و عذاب تھا

کاٹ لینے دو گلا تم شوق سے گھر جائیو ایک رقص نیم لبسمل کا تماشا دیکھ کر

وقتِ وداع آہ گلا کاٹ رہے تھے کیا کھینچتے دامن کو ترے کام مین تھا ہاتھ

ہندی کے شعر مین پانی برسانے کی فکر کیجا رہی ہے تاکہ معشوق سفر سے باز آجائے۔

آپ کو قابو مین لانے کی کوشش ہے لیکن معشوق پر کچھ زور نہین چلتا۔

اُردو کے تینون شعر دیکھئے کہ "سفر" کا اثر ہے اور معشوق کو سفر سے باز رکھنے کے لئے کیسی کیسی جانبازی دکھائی جا رہی ہے۔

اک نگاہ سر بسر دیوانہ ہمکو کر گئی گردشِ چشم پریرو ساحر بنگالہ تھا

ہندی شعر مین معشوق کے تن کی [illegible] بیان کرنے کے بعد خاموشی ہے، اُردو مین صرف آنکھون کی حقیقت بیان کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اس کا اثر دل پر کیا ہوتا ہے۔ دونون کا فرق ظاہر ہے

خواب مین کیا خوش ہو یوسف کو زلیخا دیکھ کر ‏ کھل گئین آنکھین تجھے "اے جلوہ آرا" دیکھ کر

جو نقاب اُٹھی مری آنکھون پہ پردا پڑ گیا ‏ کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر

ہندی اور اُردو مذاق کا فرق ظاہر ہے "مومن" نے اپنے دونون شعر کہان سے کہان پہونچا دیئے ہین۔

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے مین ساری ‏ چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

ہندی شعر کا مطلب یہ ہے کہ مین تنہا نہین ہون بلکہ دُکھ بھی ساتھ ہے، اُردو شعر کا مضمون کیا دلنشین اور کس قدر بلند ہے

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا ‏ جینا وصال مین بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دونون کا رنگ جدا ہے، حضرت امیر خسرو نے وصال کی جو کیفیت بیان کی ہے، مومن، نے اس مین ایسی بات پیدا کی ہے جس کا جواب دنیائے شاعری مین نہین۔

وہ چلا، جان چلی دونون یہان سے کھس کے ‏ اس کو تھامون کہ اسے پانون پڑون کس کس کے

ان نصیبون پر کیا اختر شناس ‏ آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

دوسرا شعر دیکھئے

تارے کے بدلے گن کے شب تار کاٹ دی ‏ ایام ہجر مین مرے کیا کام آئے داغ

شکسپیر اور مومن | ہندی سے موازنہ کے بعد فخر یورپ شکسپیر سے موازنہ کرکے دیکھنا چاہئے کہ "مومن" نے ان مضامین کو کیونکر بیان کیا ہے جن مضامین کو شکسپیر نے ادا کیا ہے اور یورپ اسکو معجزہ سمجھتا ہے۔

شکسپیر But, soft! what light through yonder window breaks
It is the East, and Juliet is the Sun
Arise, fair Sun & kill the envious moon
Who is already sick and pale with grief

(۲) With love's light wings did I o'erperch these walls
For stony limits can not hold love out

(۳) O! swear not by the moon, the inconstant moon
That monthly changes in her circled orb.

یہ اشعار رومیو جولیٹ کے بہت مشہور ڈرامے کے ہین پہلے اشعار مین یہ دیکھنا چاہئے کہ رومیو جولیٹ سے ملنے گیا ہے جولیٹ دو بجے سے نظارہ فروشی کر رہی ہے رومیو اس منظر کو اپنے الفاظ مین بیان کرتا ہے کہ:۔

" یہ دور کی مشرق ہے اور جولیٹ آفتاب، آفتاب مشرق سے نکلا ہے، اس اجالی رات مین ماہتاب کی روشنی جو زرد معلوم ہوتی ہے وہ حسد سے کیونکہ آفتاب (یعنی جولیٹ) سے حسد کر رہا ہے۔

اے خوبصورت آفتاب، حاسد ماہتاب کو (اپنے غمزے سے) قتل کر ڈال"

اس کے مقابلے مین دیکھئے "مومن" کیا کہتا ہے:-

مومن دیدۂ حیران نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

" مومن" کہتا ہے کہ مین جو معشوق کا نظارہ کرکے حیران رہ گیا تو گویا میری آنکھون نے مجھ کو تماشا بنا دیا، اس تماشے کو معشوق دیر تک دیکھتا رہا، عاشق کا تماشا بننا اور معشوق کا دیکھنا حسن وعشق کا کیسا انوکھا اور دلچسپ بیان ہے:-

شکسپیر رومیو دیوار پھاند کر جولیٹ تک پہونچا ہے وہ تعجب سے پوچھتی ہے تم کیسے آئے، درمیان مین پتھر کی دیوارین حائل تھین، وہ کہتا ہے کہ محبت کے ہلکے پھلکے بازو پتھر کی دیوارون کی پروا نہین کرتے (انھون نے اڑا کر پہونچا دیا ہے)۔

مومن تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری — شاید کہ وہ گھبرا کے سر بام نکلتا

مومن معشوق کو خود بام تک بلاتا ہے لیکن کس طرح کہ باوجود ناز معشوقانہ آنا ضروری ہو

شکسپیر جولیٹ رومیو سے پیمان محبت لینے پر قسم کھلاتی ہے وہ چاند کی قسم کھاتا ہے، جولیٹ کہتی ہے " چاند تو ہر مہینے مین بدل جاتا ہے کہین تم بھی نہ بدل جاؤ

مومن سچ ہے سچا آپ کا پیمان ہے — مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

" مومن"، کا معشوق عہد کرتا ہے کہ وہ کل پھر آئیگا، عاشق کہتا ہے آپ کا وعدہ سچا سہی لیکن اس درمیان مین اگر موت آگئی تو وہ وعدہ فردا کرنے سے رہی

دوسرے یہ کہ معشوق کا جانا ہی موت ہے، موت کل کا وعدہ نہین کرتی۔

ان دونون شعرون کا لطف اور ان مین فرق ارباب ذوق سمجھ سکتے ہین " مومن" نے اپنے الفاظ کی جادو نگاری سے مضمون کو جادو بنا دیا ہے۔

باقی —— باقی

کیفی چریاکوٹی

نوائے رضا پر تنقیدی نظر

یہ مجموعہ ہے سید آل رضا صاحب رضا کی اُن غزلون کا جن کو انھون نے عالم وارفتگی مین لکھا اور اسی انداز سے پھیلا بھی دیا۔ ملک کو ممنون ہونا چاہئے جناب رضا کے بھائی کاظم صاحب کا جن کے جمع و اصرار سے یہ مختصر مگر نہایت جمیل مجموعہ شایع ہو سکا۔ جناب رضا لکھنؤ کے مشہور و مصروف وکلاء مین سے ہین اور ایک وکیل کے مصروف ہونے کے صرف یہ معنی ہین کہ ہر وقت وہ مقدمات کی گتھیان سلجھانے مین مصروف رہے یا اُن ہستیون سے گھرا رہے جنھون نے کوئی جرم کیا ہے یا جن پر کوئی جرم کیا گیا ہے۔ ظاہر کہ ایسی زندگی مین جبکہ فطرت انسانی کا ہمیشہ تاریک پہلو سامنے رہتا ہے ایک شخص اپنے جمالیاتی ذوق کو قایم بھی نہین رکھ سکتا چہ جائیکہ اُس مین ترقی کرنا۔ لیکن مین اس کو جناب رضا کی سلامت ذوق کا معجزہ سمجھتا ہون کہ وہ ایک ہی وقت مین خوش دماغ وکیل بھی ہین اور خوش فکر شاعر بھی!

ابتدا مین جناب رضا نے چند صفحات " عرض حال " کے بھی لکھے ہین اور انھون نے "تغزل" کا جو مفہوم قرار دیا ہے یہ ہے:- " غزل نظم کی ایک نہایت لطیف و نازک صنف ہے۔ میرے خیال مین اس کی منزل سوقیانہ پستی اور خشک فلسفیانہ بلندی کے درمیان ہے ——— غزل کہتے وقت مجھ پر جو ایک خاص کیفیت وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت طاری ہوتی رہی ہے، اُس سے یہ اندازہ کر سکتا ہون کہ اچھا شعر کہنا اسی کیفیت خاص کا کرشمہ ہے "

جناب رضا کے اس بیان کی ہر صاحب ذوق تصدیق کریگا اور جس وقت نوائے رضا کا مطالعہ کریگا تو معلوم ہوگا کہ واقعی ان کی شاعری جذبات کی شاعری ہے اور ایک خاص کیفیت سے لبریز ——— جسوقت یہ مجموعہ میرے پاس آیا تو مین نے چند لمحہ تک اس کی خوشنما طباعت و ترتیب پر غور کرکے اس کو بند کرکے رکھ دینا چاہا اس خیال سے کہ ایک وکیل اور وہ بھی لکھنؤ کا، تغزل سے کیا واسطہ رکھ سکتا ہے، لیکن بند کرتے کرتے اتفاقاً میری نگاہ اس شعر پر پڑ گئی

اک خواب سا مین نے دیکھا تھا، ان سے پہ تھین کیون یاد آئے　　باتون کا وہ بڑھنا راتون مین، راتون کا وہ گھٹنا باتون مین

مین چونک پڑا، مین نے پھر اس شعر کو پڑھا، دیر تک کچھ سوچتا رہا اور اس کے بعد دوسرا شعر پڑھا:-

چھیڑو نہ مجھے لے ہمنفسو جس سنج مین ہون رہنے دو　　انجام مین چُپ ہو جانا ہے، کیا وقت گنواؤن باتون مین

پھر شروع سے یہ غزل دیکھی اور ہر شعر اس کا دل مین گھر کرتا گیا ——— مین نے اور کام ملتوی کئے اور پورے دو گھنٹے اس مجموعہ کے مطالعہ مین صرف کرنے پڑے، حالانکہ اور مشاغل کی وجہ سے دواوین پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی فرصت مجھے نہین ملتی۔

اس کے چند دن بعد اتفاق سے جناب رضا ایک دن میرے مکان پر تشریف لائے اور اس طرح مجھے اس ہستی کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو گیا جس کے خیالات سے مین لطف اندوز ہو چکا تھا۔

اس مجموعہ کے دیکھنے کے بعد اس سے انکار تو کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ جناب رضا شاعر ہیں اور وہ غزل اس وقت کہتے ہیں جب ان پر غزل کہنے کی کیفیت طاری ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا ممکن ہے کہ وہ اس کیفیت کے بالقصد طاری کرنے پر بھی قادر ہوں لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ جو کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے وہ عام شعراء کی کیفیت سے کچھ علیحدہ ہے۔ یہ علیحدگی کس قسم کی ہے اس تفریق کو کیا کہہ سکتے ہیں، اس امتیاز کا کیا نام رکھا جا سکتا ہے۔ یہ آسان کام نہیں، لیکن اگر میں اس کا نام رکھنے پر مجبور ہونگا، تو صرف "محبوبیت یا معشوقیت" سے تعبیر کرونگا لیکن "معشوقیت" بھی اس دامن قسم کی جو خود مجروح محبت ہے، آپ بیتاب لذت ہے، جس کا ہر شکوہ ایک مرثیہ ہے، جس کا ہر گلہ ایک "بین" ہے اور جس کے جذبات الفت میں اک نوع کا انفعال ہے۔ کیفیات استسلام میں اک قسم کی شرح و حیا ہے اور جس کے عشق کو ہم "چنا" کی شعلہ پروری کے بجائے "لجالو" کی حجاب آمیز فنادگی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی لئے جناب رضا کی شاعری میں بہت کچھ ہندی شاعری کا سا لوچ پایا جاتا ہے جس میں جذبات محبت ایک عورت کی طرف سے ظاہر کئے جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ محبت خواہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی جانب سے ایک ہی چیز ہے، لیکن چونکہ نوعیت میں تھوڑا سا فرق ہے اس لئے اس کے اظہار میں بھی فرق ہونا چاہئے۔ مرد کے بیان میں اک خاص قسم کا التہاب اک مخصوص انداز کا جوش اور جانبازانہ اظہار محبت ہوتا ہے لیکن عورت کے یہاں اک پامال فنادگی، اک سلگتے دل کی کیفیت اور اک تپ دق کی سی دبی ہوئی چنگاری پائی جاتی ہے۔ جناب رضا کی شاعری میں میرے نزدیک یہی کیفیت زیادہ ہے اور شاید میرا یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ اردو میں ہندی شاعری کے رنگ کا سب سے پہلا دیوان یہی ہے، جسپر جناب رضا ہر تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ہندی زبان میں تو اس رنگ کی شاعری کرنے والے مسلمان متعدد ہوئے ہیں جن میں عبدالرحیم خانخانان کا خاص مرتبہ ہے، لیکن اردو زبان میں یہ بالکل پہلی مثال ہے، جس سے شاید خود جناب رضا بھی واقف نہ ہونگے۔

اب میں چند مثالوں سے اس کی وضاحت کرونگا:۔

میر کا مشہور شعر ہے:۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ کمبخت پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

چونکہ محبوب کا یاد آتے رہنا، عاشق کے لئے سخت تکلیف دہ ہے اس لئے میر اپنے آپ کو ہر وقت اس کی یاد کرتے رہنے سے باز رکھتے ہیں۔ جناب رضا اس مفہوم کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:۔

ہاں اور جس طرح بھی ہو تڑپائیے مجھے کچھ ایسا کیجئے کہ نہ یاد آئیے مجھے

اس شعر کے پڑھنے کے بعد ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں جو التجا کی گئی ہے وہ بہت کچھ نسائی رنگ لئے ہوئے ہے جیسے "تڑپائیے"، "کچھ ایسا کیجئے" اور "یاد آئیے" نے پوری طرح چمکا دیا ہے۔

جناب رضا اپنے دل آنے کے اولین واقعہ کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

حسن کی گرمی، نئی جوانی، پہلی محبت نازک دل جلتی تپتی ریت پہ گر کر جیسے تازہ کلی کمھلائے

اس شعر میں جناب رضا نے دو تقسیمیں علیحدہ علیحدہ کی ہیں۔ "حسن کی گرمی، نئی جوانی"۔ محبوب کے لئے حسن کی تشبیہ "جلتی تپتی ریت" سے دیگئی ہے۔ "پہلی محبت نازک دل" اپنے لئے جسے تازہ کلی کے کھلانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس تقسیم میں اس سے زیادہ نسائی لطافت جذبات اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

شرم کہاں کی، شرم گنوا کر یہ بھی مار ہے قسمت کی — بھیک جو منہ مانگی لینے میں ہاتھ بڑھائے اور رہجائے

یعنی مجھے منہ مانگی بھیک مل رہی ہے اور میں ہاتھ بڑھا بڑھا کر رہجاتا ہوں۔ یہ شرم شرم نہیں ہے بلکہ قسمت کی مار ہے۔ اس شعر کی ساری ترتیب، جذبات کا انفعالی رنگ، الفاظ کا انتخاب شروع سے اخیر تک ایسے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جو ایک عورت ہی کی محبت میں پایا جا سکتا ہے

تیسرا شعر:۔

عشق میں تم آزاد ہو جتنے، اتنے کیوں مجبور ہیں ہم — دل میں بسو آنکھوں میں سماؤ پھر بھی لب تک نام نہ آئے

اس شعر کا بھی انفعالی پہلو ظاہر ہے۔ عشق میں آزاد ہونا محبوب کے لئے لکھا گیا ہے اور اپنے کو اس درجہ مجبور ظاہر کیا ہے لب پر نام تک نہیں آسکتا۔ جذبات کا تقابل قابل غور ہے

اس انداز کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں:۔

وہ کرے کیا کچھ نہ آئے جس کو منت کے سوا — پھر یونہی منت کرینگے ہم خفا ہو جائے

قسم لیلو جو شکوہ ہو، تمھاری بیوفائی کا — کئے کو اپنے روتا ہوں مجھے جی بھر کے رونے دو

سوچ لیں یہ ہمیں ہنس ہنس کے مٹانے والے — کون روئے گا، ہمارا جو کہیں نام آیا

ہم گئے جان سے اور عہد جوانی کی گئی — کھا لیا تیر کلیجہ پہ تو آرام آیا

دم ہے کہ اکھڑا اکھڑا سا اور وہ بھی نہیں آچکتے ہیں — قسمت میں ہو مرنا یا جینا، اب ہوئی چکے جو ہونا ہے

دل ہی تو ہے آخر بھر آیا، تم چیں بجبیں کیوں ہوتے ہو — ہم تمکو بھلا کچھ کہتے ہیں، تقدیر کا اپنی رونا ہے

بیٹھے بیٹھے اک دن دل نے کہا کہہ تو دیا دہ آئیں گے — اب تک لیکن یہ نہیں کھولا کب تک راہ دکھائیں گے

جناب رضا کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک شعر کو چند ٹکڑوں کے ارتباط سے، پیدا کرتے ہیں یعنی بعض مرتبہ

چند چھوٹے چھوٹے فقروں کو جوڑ کر شعر بناتے ہیں اور کبھی الفاظ کو ادھر اُدھر اس طرح منتشر کر دیتے ہیں کہ جب تک اُن کو اپنی اپنی جگہ نہ لایا جائے شعر کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا مثلاً:۔

تھمے طوفان۔ ہٹے موجوں کی چادر تو کھلیں آنکھیں ۔۔۔ بنگاہوں میں ابھی دھندلے سے کچھ نقشے ہیں ساحل کے

زبان حرفِ دعا۔ سجدہ میں سر۔ اور خاک پر سجدہ ۔۔۔ ہوئے ہونگے کم انکے خیر مقدم تیغ قاتل کے

جنھیں آنا تھا آ پہونچے، جنھیں جانا ہے، جاتے ہیں ۔۔۔ رضا اُٹھو، سحر ہوتی ہے، تارے جھلملاتے ہیں

تم، وہ تم ہی نہ رہو، بھول سکوں گر تم کو ۔۔۔ میں وہ میں ہی نہ رہوں تم جو کر دیا دو مجھے

عشق کی شان جنوں حسن کی خو ناز و غرور ۔۔۔ آپ مجبور ہیں، بندہ بھی خطا وار نہیں

کیا یہ کہوں کہ دوست دلِ بے وفا نہیں ۔۔۔ ہا ہا، نہیں نہیں، گلۂ آشنا نہیں

ہیں منفعل نہ بجھی اُن کے سیل اشک سے بھی ۔۔۔ لگائی آگ مری دُکھ بھری کہانی کی

رُت اور فضا بدلی، زندان کی ہوا بدلی ۔۔۔ بیڑی کی صدا بدلی، دیوانہ پریشان ہے

ٹھہر کر تو سہی خود سوگ سے بیٹھیں نہ موجیں ۔۔۔ ابھی طوفان بپا ہے مری کشتی ڈبونے دو

ہاں ذبح تو مجھ کو کر ہی چکے، اک کام ضروری اور بھی ہے ۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو، گھر جاؤ، یہ دامن پُر خون دھونا ہے

ساتویں شعر کی اگر نثر کیجائے تو یوں ہوگی:۔ "منفعل ہیں کہ مری دُکھ بھری کہانی کی لگائی آگ اُن کے سیل اشک سے بھی نہ بجھی"۔ غور کیجیے کہ اس نثر کے ٹکڑے کتنے منتشر طور پر شعر میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نویں شعر کے اول مصرعہ کی نثر یہ ہوگی "تو سہی جو یہی موجیں ٹھہر کر خود سوگ سے بیٹھیں" لیکن مصرعہ مرتب کیا گیا ہے، ان ٹکڑوں کو بے ترتیب پھیلا دینے سے۔ لیکن یہ رضا صاحب کی شاعری کی خصوصیت ہے کہ وہ باوجود اس انتشار و بے ترتیبی کے بھی تعقید کا عیب نہیں پیدا

ہونے دیتے اس قسم کے شعر مشاعرہ مین بہت لطف پیدا کرتے ہین اور سننے والون پر اس کا بڑا اثر ہوتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا غلو کبھی کبھی اشعار کو بے معنی بھی کر دیتا ہے - جناب رضا کے یہان بہت کم شعر ایسے ہین جو اس طرح داغدار ہوگئے ہین، تاہم دو چار نظر آتے ہین مثلاً:-

نہ جانے موت سے کیسی بنے، خدا کی پناہ   یہ کوفت آٹھ پہر بلکہ زندگی بھر کی

جب تک خود شاعر کوئی نکتہ نہ سمجھائے، صرف شعر پڑھکر ذہن کسی تغزل کی طرف منتقل نہین ہوتا - کوفت کیا ہے کیون ہے، جذبات محبت سے اس کا کس قسم کا تعلق ہے جو خیال موت کی طرف گیا اور اگر ایسا درست ہے تو پھر یہ درست - یہ تمام باتین شعر سے سمجھ مین نہین آتین - ایک اور شعر اسی زمین کا ہے:-

یہی ہے داور محشر یہی ہے عدل کی شان   شہید ظلم کا قصہ، زبان خنجر کی

اگر اس شعر کے معنی یہ نہین ہین کہ "اے داور محشر تو نے شہید ظلم کا قصہ زبان خنجر سے کھلوا دیا تو درحقیقت یہ ہے کہ عدل کی شان یہی چاہتی تھی" ـــــــ تو شعر مہمل ہے اور اگر مفہوم یہی پیدا کرنا چاہا ہے تو خوبی سے ادا نہ ہوسکا،

اسی غزل کا ایک شعر اور یہ ہے:-

جگہ امید کی آخر کو یاس نے لیلی   فضا بدل گئی دنیائے یاد پرور کی

اس مین یاد پرور بہ معنے پروردۂ یاد استعمال کیا گیا ہے جس نے لطف مین بہت کمی کردی

دیکھنا ہین وہ کروٹین پہلے جھین وہ چونک اٹھے   صبح شعور ہے قریب حسن ہے خواب ناز مین

اگر پہلے مصرعہ مین دیکھنا ہین بہ معنی قابل دید آیا ہے تو مصرعہ درست ہے کیونکہ چونک اٹھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کروٹین ختم ہوچکی ہین جن کے بعد وہ چونکے ہین اس لئے دیکھنا ہین مستقبل سے متعلق نہین ہوسکتا - لیکن اسی کے ساتھ دوسرا مصرعہ بیکار ہوا جاتا ہے، کیونکہ حسن کا خواب ناز مین ہونا اور صبح شعور کا قریب ہونا دونون باہمد گر اور علیحدہ علیحدہ پہلے مصرعہ کے مفہوم کے منافی ہین -

یون بھی جل جائے گا پردہ مری رسوائی کا   دیکھ او ضبط فغان آگ لگی جاتی ہے

مدعا یہ کہنا تھا کہ "میرا پردۂ رسوائی یون بھی جلجائے گا، اے ضبط فغان تو کیون آگ لگاتی ہے" لیکن اس انداز بیان نے کہ دیکھ آگ لگی جاتی ہے" مفہوم کی تعبیر کو ناقص کردیا - اگر آگ لگجانا اور جلجانا دو علیحدہ باتین ہوتین تو بیشک "ضبط فغان" کو مخاطب کیا جاسکتا تھا -

اللہ رے بند و بست خود آرائی شباب   غنچے چٹک کے پھول بنے اور سنور گئے

اس شعر کا مطلب غالباً یہ ہے کہ غنچے پھول ہو ہو کر سنور گئے لیکن ان کی خود آرائی شباب کے بند و بست کو دیکھئے کہ ابتک وہ نہین سنور سکے - گویا ایک پورا جملہ ترک کردیا گیا ہے - اس مین شک نہین کہ بعض مقامات پر اس قسم کا خلا بہت لطف دیتا ہے جسکے

بہتر نمونے مومن کے یہان اکثر اور غالب کے یہان کمتر پائے جاتے ہین، لیکن اس شعر کا خلا ضرورت سے زیادہ ذہانت آرا ہے

لکھنؤ کے شاعر بدنام ہین کہ وہ سوز و گداز پیدا کرتے ہین موت، جنازہ، قبرستان، اور نزع وغیرہ کے ذکر سے اور اس طرح اُن کے شاعری بجائے سوز تغزل کے سوز مرثیہ کا رنگ پیدا کر لیتی ہے۔ لیکن جناب رضا کے کلام مین دو چار ہی شعر ایسے نظر آتے ہین جن مین یہ کیفیت پائی جاتی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ اس مجموعہ کی ابتدا کیون اس شعر سے ہوئی:۔

اتر گیا صدقہ حسن کا مبارک ہو　　مبارک آپ کو مرگِ رضا مبارک ہو

مین نے ہمیشہ تعجب کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ ایک شاعر کے اخلاق و عادات اس کی کیفیات شعری سے کیون جدا ہوتے ہین لیکن جناب رضا کے باب مین مجھے اس استعجاب سے واسطہ نہین پڑا، کیونکہ جو پاکیزگی و لطافت، نظافت و نعومت، لینت و مروت اُن کے کلام مین ہے، وہی ان کی طرز معیشت و معاشرت مین بھی پائی جاتی ہے اور اس لئے مجھے یہ کہنے میں متلق تامل نہین ہو سکتا کہ جس طرح ان کی شاعری لچیلی ہے، اسی طرح وہ خود بھی اور، ان کی فطرت بھی لچک رکھنے والی ہے۔ البتہ تقدیم وہ میرے لحاظ سے مین کوئی حکم نہین لگا سکتا، ممکن ہے اسباب و ماحول نے ان کی شاعری مین یہ رنگ پیدا کیا ہو، یا اس نوع کی شاعری نے ان کے اخلاق و عادات اور ان کی معاشرت و معیشت کو اس سانچہ مین ڈھال دیا ہو۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بعض وہ اشعار جنھون نے مجھے بہت مسرور کیا ان کو بھی سنا دون کیونکہ مجھے اعتراف لطف و امتنان کا صرف یہی ایک طریقہ معلوم ہے:۔

اور آتا تھا مرا وعدہ شکن یاد مجھے　　بڑھتا جاتا تھا، رضا، حسنِ مہ شب جتنا

اب اسکے بعد گریہ بے اختیار رہے　　طے ہو چکین شکست تمنا کی منزلین

اتنی گنجایش بھی کیا رسم مروت مین نہین　　مسکرا ہی دو اگر پرسانِ حالِ دل نہ ہو

وہ جو اک لطف ہے بجلی سی چمک جانے مین　　پردہ اُٹھ جانے پہ مٹ جائیگا لذت دید

یون آج مل رہے ہین کہ جیسے خفا نہین　　ڈرتا ہون یہ بھی نہ ہو کوئی پردۂ ستم

اکثر اسی نے ہنستے ہوؤن کو رُلا دیا　　یہ میرا حال جسپہ ہنسی آ گئی تمھین

کسی کو فارغ اندوہ پاؤں تو پوچھوں　　　کہ اور بھی کوئی صورت ہے زندگانی کی

جو دل میں تھا وہ ملتا ہے ساتھ اپنے خاک میں　　　تم دور، اور کہہ نہ سکے کچھ کسی سے ہم

تمھیں نہ کہدو کہ ہم تم کو کیا سمجھتے ہیں　　　ہماری بات کا تو کوئی اعتبار نہیں
جو سُن سکو تو مری داستان ختم نہ ہو　　　نہ سُن سکو تو کوئی حد اختصار نہیں
جو مجھ پہ ہنستے ہیں ہنس لیں جو روتے ہیں رو لیں　　　کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں

ہائے کیا وقت تھا کیا کیف تھا کیا عالم تھا　　　جب ترے لب پہ مرا پہلے پہل نام آیا

زندگی ختم جہاں کی وہ جگہ پھر نہ ملی　　　تیرے کوچہ سے اُٹھائے لئے جاتے ہیں مجھے

مسافران عدم، جاؤ ہم بھی آتے ہیں　　　وہیں سے مل کے چلیں گے جو پہلی منزل ہے

ہنستے ہو بہت جب کہتا ہوں، حال اپنے دل وارفتہ کا　　　روؤ گے بہت جب بعد مرے یہ تم کو سنایا جائے گا
در سے تو اُٹھا ہی تم نے دیا، تڑپوں بھی نہ میں یہ ظلم ہے کیا　　　ٹوٹا ہے سہارا مدت کا صبر آتے آتے آئے گا

ہے سب سے نرالی شان اسکی کیا شے ہے جوانی کا موسم　　　یہ جیٹھ کا ایسا تپتا ہے برسات کی بھیگی راتوں میں

حسن کو محدود کب کرتا ہوں لیکن ہر حسین　　　اتنا ہی دلکش ہے جتنا تجھ سے ہے ملتا ہوا

ہم اک اشارے پہ کتنے سوال کر بیٹھے　　　کسی سوال کا لیکن کوئی جواب نہ تھا

ہے چھیڑ امید کی پُرلطف آنکھوں کی روانی میں　　　شعاعیں چاند کی جس طرح کھیلیں بہتے پانی میں

مطبوعات موصولہ

اُردو شہ پارے جلد اول | مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام اے - پی اچ ڈی مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن -

ہر زبان کی ترقی کے تین دور ہوا کرتے ہیں، پہلا دور تراجم کا، دوسرا تالیفات کا اور تیسرا تصانیف کا۔ اس مین کلام نہین کہ اُردو زبان پہلے دور سے گزر کر دوسرے دور مین آ گئی ہے اور اگر ہم سرزمین دکن کی علم پرور فضا کے کارنامون پر نگاہ ڈالین تو کہا جا سکتا ہے کہ شاید اسنے تیسرے دور مین بھی قدم رکھ دیا ہے -

اس دوران مین اُردو کی جو خدمت اپنی بیش بہا تصانیف و تالیفات سے فرزندان دکن نے کی ہے، وہ ایسی معمولی نہین ہے کہ کوئی شخص اُسے نظر انداز کر دے - یقیناً حیدرآباد اس وقت حالت نہضت (Renaissance) مین ہے اور اس کے یہ مختلف دلچسپ مناظر ہین کہ ایک طرف عثمانیہ یونیورسٹی نشر علم مین نمایان حصہ لے رہی ہے اور دوسری طرف وہان کے طلبہ عملاً ملک و زبان کی خدمت مین مصروف نظر آتے ہین - ڈاکٹر سید محی الدین قادری جو حال ہی مین لسانیات کی تحقیقات سے فارغ ہوکر ولایت سے واپس آئے ہین معروف و مقتدر نوجوانان دکن مین سے ہین اور اُردو شہ پارون کی پہلی جلد انھیں کی تحقیق مستقل کا نتیجہ ہے - اس مین اُردو ادب کے آغاز سے دلی کے زبان تک جتنے مشہور شاعر و نثر نگار ہوئے ہین انکے حالات اور ان کے کلام نظم و نثر کے بہترین نمونے دیئے ہین - اس کتاب کو چار حصون مین تقسیم کیا گیا ہے - پہلے باب مین اُردو ادب کی ابتدائی حالت پر نظر ڈالی گئی ہے، دوسرے باب مین بیجاپور، تیسرے مین گولکنڈہ اور چوتھے مین عہد مغلیہ کے اُردو ادب سے بحث کی ہے - اس کے بعد شہ پارون کا انتخاب ہے - اس کتاب کے ضمیمے بعض نہایت بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہین اس مین علی عادل شاہ، سید شاہ راجو، ابوالحسن تانا شاہ، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی کی تصویرین بھی شامل ہین کتاب ولایتی کھردرے کاغذ پر مجلد شائع کی گئی ہے اور صوری و معنوی دونون حیثیت سے عہد حاضر کی بہترین تالیفات مین جگہ پانے کے قابل ہے - قیمت درج نہین ہے

اس سلسلہ کی دو جلدین زیر ترتیب ہین جن مین زمانۂ حال تک کے مصنفین سے بحث کیجائے گی -

مختصر تاریخ اسلامی حصہ اول | جناب مولوی محمد خلیل الرحمان صاحب مترجم اخبار الاندلس سے اب ہر شخص واقف ہے - انھون نے اپنی عمر کا کافی حصہ تاریخ اندلس کے مطالعہ مین صرف کیا ہے اور اس طرح عمومی طور پر تمام تاریخ اسلام پر انکھین عبور حاصل ہو گیا ہے - اس مختصر کتاب مین انھون نے رسول اللہ کے حالات سے نہایت صاف و سلیس زبان مین بحث کی ہے اور ہر حیثیت سے اس کو طلبہ کے استعمال کے لئے موزون بنایا ہے - ضرورت ہے کہ ایسی کتابین نصاب مین داخل کیجائین - قیمت ۸ ملنے کا پتہ: مقتدر کلیم الرحمان بی اے - ۱۷ - بیلی روڈ الہ آباد -

اردو زبان اور ادب

ہندوستانی اکاڈیمی کے پہلے اجلاس مین ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ اُردو ہندی کے موجودہ تحریر پر ریویو کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اب کس قسم کی تصانیف کی ضرورت ہے۔ اُردو کے متعلق جو کمیٹی مرتب ہوئی تھی اس کے صدر سید ضامن علی صاحب ام اے (صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی) تھے۔ انھون نے یہ رپورٹ مرتب کر کے اکاڈیمی کے کونسل مین پیش کی تھی۔ اس مین زبان اُردو کی ابتدا اور اس کی تدریجی ترقی سے بحث کرتے ہوئے ہندوستانی اکاڈیمی کو چند مفید مشورے دیئے ہین جو ترقی زبان کے لئے ضروری ہین، اس رپورٹ مین ایک فہرست بھی بعض ان مشہور کتابون کی ہے جو شروع سے اس وقت تک تالیف کی گئی ہین۔ یہ کتاب دفتر ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد سے ملسکتی ہے

کردار اور افسانہ

جناب عبدالقادر سروری ام۔اے اس سے قبل "دنیائے افسانہ" لکھ کر کافی شہرت حاصل کر چکے ہین۔ اب انھون نے یہ دوسری کتاب پیش کی ہے جسے "دنیائے افسانہ" کا تتمہ سمجھنا چاہئے۔ اس مین سیرت نگاری سے بحث کر کے مثالاً مثنوی سحرالبیان کے نجم النسا، مراثی انیس کے عون و محمد، نذیر احمد کے نصوح و نعیمہ اور داستان امیر حمزہ کے عمر و عیار کے کردار سے بحث کی ہے، کتاب بہت دلچسپ، مفید، اور پر از معلومات ہے کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور عہر مین مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد سے ملسکتی ہے

تابش خیال

جناب افسر امروہوی کی غزلون کا مجموعہ ہے۔ پہلے ایک مختصر دیباچہ ہے اس کے بعد اسرار احمد صاحب گورکھپوری کا مقدمہ ہے جس مین انھون نے جناب افسر کے خصوصیات شاعری سے بحث کی ہے اور پھر اصل حصہ غزلیات کا ہے۔

جناب افسر کی بعض غزلین نگار مین شایع ہوئی ہین اور اس مین شک نہین کہ ان مین ایک اچھے شاعر بننے کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہین۔ جناب افسر مصحفی و خاندان مصحفی کے بہت معتقد ہین جس سے اُن کے حُسنِ ذوق کا پتہ چلتا ہے اور وہی رنگ اپنے کلام مین پیدا کرنا چاہتے ہین۔ بعض شعر ملاحظہ ہون:-

منزلِ عشق و محبت کسقدر سنسان ہے آشنا تو آشنا نا آشنا ملتا نہین

اب مرے دل کو نہین تشویش راہ و راہبر بیخودی نے بے نیاز فکر منزل کر دیا

ہجوم حشر پہ موقوف رکھنا اپنے ملنے کو ستمگر چلتے چلتے چل گیا فقرہ قیامت کا

ہم تو جنون مین کہہ گئے جو مُنہ مین آگیا اب ایک ایک لفظ کو سمجھا کرے کوئی

یہ مجموعہ عہ مین شاہد علی امجد علی رام سوامی نسروان کمپونڈ کراچی سے ملسکتا ہے

«شاعر»

اے مجسم زندگی اے بے نیاز زندگی | تیرے دم سے ہے ترنم خیز ساز زندگی
آنکھ سے پنہاں ہیں سب پست و فراز زندگی | منکشف تو نے کئے عالم پہ راز زندگی

روح لذات دو عالم کا خلاصہ بن گئی
حاصل کونین تیری ہر تمنا بن گئی

تو بساط دہر پہ زندہ کن تقویم ہے | تیری ہستی لذت کونین کی تعلیم ہے
خدمت انساں سے بالاتر تری تعظیم ہے | محفل عقبیٰ میں بھی تو واجب التکریم ہے

عشق کی دشوار رہ کا راہبر تو ہی تو ہے
ظلمت شب کیلئے روشن قمر تو ہی تو ہے

کون ہے تیرے سوا حسن ازل کا راز داں | ہے گذرگاہ تخیل جلوہ گاہ لامکاں
جس حقیقت کو نہیں پہنچے کبھی وہم و گماں | آئینہ بردار ہے اسکا ترا حسن بیاں

بے نشاں جو شے ہو اس کو بانشاں کرتا ہے تو
قلب بیگانہ کو اپنا راز داں کرتا ہے تو

تیری بزم آرائیوں میں کیا خدا کی شان ہے | تیری تاثیر سخن کا معترف یونان ہے
مردہ دل اقوام کو تو زندگی ہے جان ہے | بات کیا یاں کی تو حامل ایمان ہے

دین و دنیا دونوں مٹتے ہیں ترے انداز پر
شمعیں جاں دیتی ہیں اک پروانہ جانباز پر

جن ممالک کو ترقی پر ہے اپنی ناز آج | تیرے احسانات کا مظہر ہے انکا تخت و تاج
ناممکمل سی نظر آتے شہنشاہوں کے راج | تیرے ہونے سے ہوئی تکمیل ترکیب مزاج

آدمیت ہو گئی پیدا سلیقہ آ گیا
تیرے حسن گفتگو سے ہمکو کیا کیا آ گیا

تیرے مرنے جا پہ بھی موجود تیرا نام ہے | تیری عالی حوصلہ فطرت کا یہ انجام ہے
تو مٹا ہے اور نہ مٹنا تیرا آساں کام ہے | تیرا ہر شعر اک دوامی زیست کا پیغام ہے

زندہ ہیں جب تک ترے اشعار تو مرتا نہیں
رنگ تازہ روز جو بدلے یہ وہ دنیا نہیں

ملک وہ اچھا جہاں پیدا ہوں یہ لعل و گہر | قوم وہ بہتر ہوں جس میں ایسے ارباب ہنر
وہ مکاں کس کام کا کس کام کے وہ بام و در | گو شوالوں نے نہ جس کے دیکھے ہوں ایسے بشر

ایسی تعمیروں کا ہونا اور نہ ہونا ایک ہے
تو نہ ہو شاعر تو مٹی اور سونا ایک ہے

ثاقب جالندہری

ظفر نمبر کو دیکھکر

آہ! اے دہلی! بہشتِ عشرتِ عہدِ کہن
مہر و مہ سے تھی کبھی آباد تیری انجمن

اے دیارِ نامرادی، اے مزارِ رنگ و بو
تیری رگ رگ مین روان ہے تاجدارون کا لہو

پھول تیرے باغِ عشرت کی ہوا کھائے ہوئے
اس فضا مین آج بھی ملتے ہین، مرجھائے ہوئے

کتنے غنچے، کھل چکے ہین اس خس و خاشاک سے
کتنی تہذیبین، بنی، بگڑی، ہین تیری خاک سے

مدتون، کی پاسبانی، گردشِ ایام کی
مدتون تو نے سنواری، قسمتین اقوام کی

مٹ نہین سکتے جہان سے تیری عظمت کے نشان
کون کہہ سکتا ہے ٹھنڈے دل سے تیری داستان

تو کہان، اے یادگارِ کاروانِ محتشم
رہ گیا ہے جانے والون کا فقط نقشِ قدم

خلجی و سوری سے لیکر، تا بہ ایامِ مغل
اک صدا تھی گونجتے تھے جس سے میدان و جبل

کیا ہوئے، اے دہلی برباد! آخر کیا ہوئے
عظمت ہندوستان کے، وہ مناظر، کیا ہوئے

شب کی نکہت بیز، وہ رنگینیان کیا ہو گئین
صبح ہونے بھی نہ پائی تھی، کہ کلیان سو گئین!

قوتین اس منقلب دُنیا مین آتی جائینگی
یہ ہوائین، تو بہ تو غنچے کھلاتی جائینگی

ذرہ ذرہ ہے جہان کا، مرکزِ رازِ فنا
زندگی ہے کاروانِ موت کو بانگِ درا

رہنِ اجزائے تلون ہے، مزاجِ کائنات
"وہ تغیر ہے، جسے حاصل ہے دُنیا مین ثبات"

پھر بھی تیری عظمتِ دیرینہ کے دُرِ ثمین
جن سے رخشندہ تھی، اے دہلی، کبھی تیری جبین

اپنی، عبرت خیز، آب و تاب کھو سکتے نہین
زلزلون مین، دہر کے پامال ہو سکتے نہین

علی اختر اختر

طاہرہ خانم

اب چشمِ خونفشان کی گہرریزیان کہان　　طفلی کی یاد مین بھی دل آویزیان کہان
چمکی مری نگاہِ محبت کے نور سے　　تکمیل ہو گئی مری تیرے ظہور سے
یکسر بدل گیا مری تخلیق کا نظام　　معدوم ہو گئی ہین مری خامیان تمام

سیرِ بہشت رازِ تمنا ہے اور مین
معصوم شوخیون کا تماشا ہے اور مین

نیرنگِ روزگار سے گھبرا گئے ہین جو　　افلاک کے طلسم سے جکرا گئے ہین جو
ہوتے ہین وہ ولادتِ دختر پہ اشکبار　　فرزند کی طلب نہین رکھتی ہے بیقرار

میرے لئے ہے دختر و فرزند ایک چیز
دونون اگر ہین عاقل و حق گوش و باتمیز

اصغر حسین خان نظیر لودھیانوی

شروع سنہ ہجری کی خاص رعایت یہ زرین موقعہ ہاتھ سے نہ دیں

ایک عدد نیو سائیکل مفت ہمراہ تمام ساز و سامان کے

اگر حاصل کرنا ہو تو ہمیں مندرجہ ذیل اشیاء کے آٹھ روپئے کا آرڈر دیں تو ہم آپکو ایک انعامی ٹکٹ روانہ کر دینگے بموقعہ شروع سنہ ہجری تک جو مئی ۱۹۳۰ء بروز جمعہ چند معزز اشخاص کے سامنے جس شخص کا نمبر نکلیگا اسے نیو سائیکل تمام ساز و سامان کے ہمراہ مفت روانہ کیا جاویگا یہ انعام ہماری کمپنی نے محض شہرت کی [illegible] رکھا ہے، چنانچہ یہ زرین موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیں ایمانداری کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اگر مال پسند نہ ہو تو فوراً واپس کر دو۔

ململ [illegible] درجہ اول [illegible] دوم [illegible] سوم [illegible]
" " [illegible] گز " " [illegible] " [illegible] " [illegible]
امیرانہ ریشمی [illegible] صافہ [illegible] گز " " [illegible] " [illegible] " [illegible]
" " [illegible] گز " " [illegible] " [illegible] " [illegible]
سہین موتی لنگی [illegible] گز " " [illegible] " [illegible] " [illegible]
" " [illegible] گز " " [illegible] " [illegible] " [illegible]
پشاوری سادہ کلاہ مخملی [illegible] درجہ اول [illegible] " [illegible] " [illegible]
" زیدار پشاوری " " [illegible] " [illegible] " [illegible]
" سلمہ ستارہ پشاوری مخملی " [illegible] " [illegible] " [illegible]
اصلی فرانسیسی ریشمی رومال فیدرجن " [illegible] " [illegible] " [illegible]
" سلکی " " " [illegible]
" خالص ریشمی ازاربند " [illegible] " [illegible] " [illegible]

اصلی خالص ریشمی ازاربند فیدرجن اول [illegible] دوم [illegible] سوم [illegible]
" " سلکی " " " [illegible]
" " ریشمی " ٹائی " [illegible] " [illegible] " [illegible]
" مفلر نیلیٹ مشن فیدرجن درجہ اول [illegible] دوم [illegible] سوم [illegible]
" " " دھاریدار درجہ اول [illegible] دوم [illegible] سوم [illegible]
سلکی ریشمی لٹ لنک نیلیٹ مشن فیجورہ " [illegible] " [illegible]
" " " سادہ فیجورہ " [illegible] " [illegible]
" " " جراب " [illegible]
" " " [illegible]
سلکی چادر کا ماپ ۳ × ۲½ گز " [illegible]
امیرانہ بستر نما تولیہ ۲½ × ۱½ پھولدار [illegible]

نوٹ اخبار کا حوالہ ضرور دیں [illegible] روپیہ کے خریدار کو [illegible] کے ٹکٹ دیئے جائینگے۔

ٹی براداران اینڈ کمپنی کلاتھ اینڈ ہوزری مینوفیکچررس - لودھیانہ (پنجاب)

برتاب ۱۲ر
مجی ۱۰ر

ناول علامہ(؟)

بتیمہ بغداد ۸ر
ملکہ زنوبیہ ۱۲ر
قرۃ العین ۱۲ر
محذرات ۱۲ر
جویائے حق للعہ
لعبت چین ۸ر
فاتح مفتوح ۱۲ر
بابک خرمی ۱۲ر
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۶ر
فلپس ولعینی ۱۲ر
یوسف و نجمہ ۸ر
زوال بغداد ۱۲ر
مینا بازار ۸ر
مقدس نازنین ۱۲ر
ردیۃ الکبریٰ ۱۲ر
فلپانا ۱۲ر
شوقین ملکہ ۱۲ر
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ماہ ملک العزیز و ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو ۱۲ر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دلہن ۸ر
بدر النساء کی مصیبت ۱۲ر

میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل ۸ر

شوق قدوائی

ترانۂ شوق ۱۲ر
قاسم و زہرہ ۱۲ر
نیرنگ جمال ۱۲ر

ناول ... [illegible]

بندگی ۶ر
لباس الکرام ۵ر
لسان العصر ... [illegible]
دوم ۶ر
سوم ۶ر
چہارم ۶ر
گلدان فصاحت ۱۲ر
بادۂ ناب [illegible]

شعر و ...

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری ۸ر

مولانا نیاز فتحپوری

شہاب کی سرگزشت ۶ر
گہوارۂ تمدن ۶ر
نگارستان ۶ر
جمالیات ۶ر
تاریخ الدولتین ۱۲ر

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۲ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
خیالستان ۱۲ر
ثالث بالخیر ۸ر

حکایات عصا ساسم ۱۲ر

... [illegible]

سراج قیصر ۸ر
بانکا شاہزادی ۸ر
شہید وفا ۸ر
مقامات بیگم ۱۲ر
غدر دلہن ۸ر
مجاہرۂ دہلی ۸ر
شیخ چلی ۸ر
بہادر ترک ۸ر
بہرام کی واپسی ۱۲ر
انقلاب فرانس ۱۲ر
حسن بن صباح ۸ر
فطرتی جاسوس ۱۲ر
خونی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام جور ۱۲ر
زر پرست ۱۲ر
گنجی کا راز ۱۲ر
عبید اللہ شاہ مصر ۶ر
عروس مصر ۶ر
سیلاب خون ۱۲ر
کرشمہ ۸ر
وفادار دلہن ۱۲ر
طواف زمین ۸ر

سیاحت زمین ۱۲ر
سیاحت ہوا ۸ر
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر ۶ر
اسرار بادشاہ زمیم ۱۲ر
روح لیلیٰ ۵ر
امین کہف ۸ر
سراج بن یوسف ۱۲ر
یوسف پاشا ۱۲ر
انقلاب عثمانی ۱۲ر
بہرام کی رہائی ۱۲ر
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی سرگزشت ۱۲ر
لالہ کمشو ۱۲ر
بہادر ... قلی ۶ر

... [illegible]

مکمل شرح دیوان غالب ۵ر
بزم خیال ۸ر
مشاطۂ سخن ۸ر
انشائے رسوا ۶ر
مکاتیب محسن الملک ۱۲ر
لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر ۶ر
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر ۸ر

مراثی ... [illegible] ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
مرآۃ الشعر ۸ر
سوانح نظیر اکبرآبادی ۶ر

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۱۲ر
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ ۱۲ر
دیوان نعمت خان عالی ۸ر
کلیات انوری ۶ر
دیوان بیدل ۱۰ر
کلیات سعدی ۱۲ر
دیوان عرفی ۱۰ر
کلیات جامی ۱۲ر
کلیات غالب ۱۲ر
کلیات صائب ۱۲ر
کلیات قدسی ۶ر
دیوان فیضی ۱۲ر
دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ناصر علی ۶ر
دیوان ہلالی ۶ر
کلیات جلال اسیر ۱۲ر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۸ر
کلیات ظفر ۶ر

دیوان ناسخ ۸ر
کلیات میر ۱۲ر
کلیات سودا ۱۲ر
کلیات انشا ۱۲ر
کلیات نظیر اکبرآبادی ۸ر
گلزار داغ ۱۲ر
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمٰعیل ۶ر
مرآۃ الغیب ۸ر
مثنوی عشق ۶ر
فریاد داغ ۱۲ر
دیوان قاتل ۸ر
دیوان شہیدی ۸ر

عجائب غرائب

عجائب المخلوقات مع تصویر ۵ر
... تصویر سادہ للعہ
مجمع العجائب ۵ر
طلسم فرنگ ۵ر
کارخانۂ عالم ۸ر

زبان سنسکرت کتابوں کے ترجمے

المیرا دیبلی ۱۲ر
فریب حسن ۵ر
سوزش عشق ۱۲ر
... [illegible] للعہ
نادر اسرار ۶ر
شام جوانی ۱۲ر
طلسمی قانوس ۱۲ر

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ تخیل نفسیاتی کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچ گئی ہے

قیمت علاوہ محصول ڈاک

ایک روپیہ (عہ)

صحابیات

جس میں عہد رسالت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ جو نیاز نے خاص اپنی انشا میں اسقدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے رسالہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہو جاتے ہیں

قیمت علاوہ محصول

عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال اور جدت اظہار کے ایسے نادر نمونے موجود ہیں کہ کسی دوسری تصنیف میں نہیں مل سکتے۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔

قیمت علاوہ محصول دس آنے ۱۰

فراست الید

مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نکینامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور سے پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت علاوہ محصول عہ

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصر کے مشہور مورخ کی تاریخ جس میں تاریخ اسلامی کے ایک عہد کا ترجمہ جس میں عہد امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ مولانا نیاز کیا ہے اور اسقدر سادگی و تسلسل کے ساتھ کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔

قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی حلاوت و شیرینی تمام دنیا کی شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تفسیر و تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے

قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲)

تذکرہ تندرہ گل

مولفہ مولوی عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف گو شعراء کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں۔ اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔

حجم ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصول چار روپیہ (للعہ)

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا سے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عمار

نگارستان

(دوسرا اڈیشن) زیر طبع ہے جس میں حضرت نیاز کے اور متعدد ادبی مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت بعد طباعت متعین کی جائیگی۔

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ماہ مئی ۱۹۳۰ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد- ۱۷	مئی سنہ ۱۹۳۹ع	شمار- ۵

ملاحظات

آج ۲۸ کی صبح کو آخر کار مین لکھنؤ واپس آہی گیا، لیکن اس حال مین کہ ایک طرف کام کا انبار ہات پانون سرد کئے دے رہا ہے اور دوسری طرف سامنے سے گرم ہوا کے جھونکے رُوح کو خشک ـــــ کامل ایک گھنٹہ سے بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا ہون کہ کام کی ابتدا کیونکر ہو اور کس کو مقدم سمجھکر پہلے اس طرف توجہ کرون- صرف میرے دیکھنے کی ڈاک اس طرح سامنے پھیلی ہوی ہے، جیسے ڈاک خانہ کی میز پر سارٹر کے روبرو کبھی آپ کو نظر آئی ہوگی- اور کامون کا کیا ذکر ہے- منیجر صاحب کو اپنے مشاغل سے فرصت نہین، بہرحال جو کچھ مجھے کرنا ہے، مجھی کو کرنا پڑیگا اور ایک ہفتہ کے اندر زندگی کے اُس اسلوب کو پھر قایم کرنے کی کوشش کرونگا جو ایک ماہ پانچ دن قبل عزم حیدر آباد سے پہلے قایم تھا ـــ یہ ذکر مین نے اس لئے کر دیا کہ اگر بعض احباب کے آئے ہوئے خطوط کا جواب تعویق سے جائے تو وہ مجھے مورد ملامت نہ بنائین ـــ

سیاحت عموماً دو قسم کی ہوا کرتی ہے، ایک صرف تفریح کے لئے جو آجکل اہل امریکہ کا شعار ہے اور دوسری کسی ضرورت وغرض کی بنا پر جو ہم ایسے " بندگان بیچارہ " پر مصیبت کی طرح نازل ہوتی ہے- مگر ایک تیسری قسم سیاحت کی اور بھی ہے جو شروع تو ہوتی ہے بالکل مہمل طور پر لیکن ختم ہوتی ہے ایک مفہوم پر، کسی مدعا کی تشلیل پر اور ایسی صورت پر جسے شعراء کی زبان مین بالکل " خدا ساز " بات کہتے ہین-

میرا اولین اصول عمل معاملات کے باب مین یہ ہے کہ کبھی کوئی توقع ہی قایم نہین کرتا اور اس لئے مجھے یاس و نا امیدی سے بہت کم

دوچار ہونا پڑتا ہے — مین جب حیدر آباد گیا تو میرا دماغ تدابیر سے یکسر معرّا، توقعات سے بالکل خالی اور اس اُلجھن سے بالکل آزاد تھا

"کہ گرنہ ہو تو کہان جائین اور ہو تو کیونکر ہو"

لیکن جب واپس آیا تو اس حال مین کہ دل توقعات سے لبریز ہے اور رُوح "تشکرات" سے۔ سامان بصیرت و عتبار بھی ساتھ ہے اور اسباب بہجت و افتخار بھی — یعنی "یار ما آن دارد و این نیز ہم"

حیدر آباد پہونچنے سے قبل جو اخبار و روایات وہان کے مجھ تک پہونچے تھے ان کی بنا پر مین نے وہان کے تمدن و معاشرت، وہان کے نہضت و ارتقا، اور وہان کی ارستقراطی (Aristocratic) جماعت کے متعلق ایک خاص خیال قائم رکھا تھا اور کتمان حقیقت ہوگا اگر مین یہ کہون کہ مجھے اس باب مین مایوسی سے مطلقاً واسطہ نہین پڑا۔ انسانی ظن و تخمین کی سب سے بڑی اصولی غلطی یہ ہوتی ہے کہ اس باب مین وہ زمانہ کا لحاظ بالکل نہین کرتا اور ہمیشہ ماضی کے واقعات و روایات کو سامنے رکھ کر "حال" کو سمجھنا چاہتا ہے اور پھر جب حقیقت اس کے خلاف نظر آتی ہے تو بجائے اپنی غلطی کے اعتراف کے وہ زمانۂ موجودہ کی شکایت کرنے لگتا ہے — میرے والد کے ایک دوست جنھون نے مجھے کبھی نہین دیکھا تھا، والد کے انتقال کے بعد مجھ سے ملنے آئے اور حد درجہ مایوس واپس گئے۔ انھون نے چلتے وقت نہایت حسرت کے لہجہ مین فرمایا کہ "میان تم مین تو ایک بات بھی خانصاحب مرحوم کی سی نہین ہے" مین نے ادب سے عرض کیا کہ "اگر آپ میرے والد کے وجود سے قبل مجھے دیکھتے تو آج جو کچھ میری نسبت فرمارہے ہین وہ اُن کے متعلق کہتے، لیکن افسوس ہے کہ آپ کو خوش کرنے کے لئے فطرت اپنے اس اصول کو نہین بدل سکتی کہ بیٹا ہمیشہ باپ کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے" ——— مین جانتا ہون کہ جو کچھ انھون نے فرمایا وہ بالکل صحیح تھا، لیکن اگر زمانہ کے اقتضاء نے میرے اندر وہ صفات پیدا نہین کئے تھے تو میرا اس مین کیا قصور تھا حقیقتاً غلطی ان کی تھی کہ انھون نے نصف صدی کے زمانہ کو کوئی اہمیت ہی نہین دی اور نہ باپ بیٹے مین فرق کرنا ضروری خیال کیا ——— اسی نوع کی غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ حیدر آباد کی اُن روایات قدیم کو (جو اپنی افادیت کے لحاظ سے حکومت استبدادی کا روشن ترین پہلو پیش کرتی ہین) سامنے رکھ کر مین نے موجودہ حیدر آباد کی تصویر قایم کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہان پہونچنے کے بعد اس تصویر کے بہت سے نقوش مین ترمیم و تصحیح کرنا پڑی لیکن غالباً خلاف حقیقت ہوگا اگر مین اس کا اعتراف نہ کرون کہ ہر چند یہ ترمیم شدہ صورت اپنے بعض خط و خال کے لحاظ سے زیادہ حسین نہ تھی لیکن بعض حیثیات کے لحاظ سے مکمل و حقیقی ضرور تھی ——— مین اس وقت نہ سرزمین دکن کی تاریخ سے بحث کرنا چاہتا ہون کہ اس کے لئے ملاحظات کے محدود صفحات مین گنجایش کہان، اور نہ دولت آصفیہ کے مد و جزر سے گفتگو کرنا مقصود ہے کہ یہ ایک مستقل کتاب چاہتا ہے، بلکہ مدعا صرف یہ بتانا ہے کہ مین نے وہان جا کر کن تاثرات کو قبول کیا اور یہ کہ موجودہ حیدر آباد کے حال سے اُس کے مستقبل پر کیا حکم لگایا جا سکتا ہے۔

حیدر آباد کیا بہ لحاظ آب و ہوا، کیا بہ لحاظ آبادی و پیداوار، ہندوستان سے بالکل مختلف چیز ہے اور اس طرف کا ایک شخص وہان جا کر یقیناً یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی دوسرے حصۂ زمین مین آگیا ہے، لیکن چونکہ حیدر آباد کی آبادی بالکل

Heterogeneous (مختلف الجنس) قسم کی ہے، اس لئے مغایرت واجنبیت، کا احساس نہین ہوتا - اور زبان ومعاشرت کے لحاظ سے ہندوستان کے ہر حصہ کا انسان وہان اپنی سوسائٹی پیدا کر سکتا ہے۔ شمالی ہند کا ذکر بیکار ہے کہ یہان کے لوگ تو دولت آصفیہ کے ہمیشہ سے ممنون کرم رہے ہین اور حیدرآباد کی تاریخ کا کوئی پہلو ایسا نہین ہے جس مین شمالی ہند کے رہنے والون نے نمایان حصہ نہ لیا ہو — چنانچہ آج بھی حکومت آصفیہ کے نظم ونسق مین حصہ لینے والے زیادہ تر شمال ہی کے لوگ ہین اور اس لحاظ سے کہ دولت آصفیہ خود عبارت ہے انھین امراء کبار کے فتوحانہ اقدام سے جو شمال ہی سے تعلق رکھتے تھے اس لئے جائے حیرت نہین اگر ابھی تک شمالی ہند کے رہنے والون کا وہان اثر قایم ہے۔

حیدرآباد کی ملکی آبادی مین ایک حصہ تو اُن وحشیون اور شُدر قومون کا ہے جو خدا معلوم تاریخ کے کس عہد سے یہان پہاڑیون اور وادیون مین زندگی بسر کر رہے ہین اور یہ اپنی شکل وصورت، تمدن ومعاشرت کے لحاظ سے ہنوز وہی غلامانہ جسم ورُوح رکھتے ہین جو ہندوستان کی دوسری وحشی قومون مین پائی جاتی ہے۔ دوسری جماعت اُن لوگون کی ہے جو ہین تو خالص دکن کے باشندے لیکن شرافت خاندانی، اور تہذیب وشایستگی کے لحاظ سے نمایان حیثیت سوسائٹی مین رکھتے ہین، ایک تیسری جماعت اور ہے جو خالص دکنی تو نہین ہے لیکن کئی پُشت گزر جانے کی وجہ سے اُن مین بھی وہی دکنی رنگ پیدا ہو گیا ہے — یہان ایک مخصوص طبقہ امراء کا ہے جن مین سے بعض شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہین اور بعض وزراء کے خاندان سے۔ دکن کی یہ خصوصیت کہ وہان کا طبقۂ امراء بھی ایک فرمانروایانہ حیثیت رکھتا ہے، بڑی حد تک اب بھی قائم ہے اور یہان کے خود مختار جاگیردارون اور صاحبان ریاست کی مجموعی تعداد اسقدر ہے کہ اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو ہندوستان کی کوئی اور بڑی سی بڑی ریاست بھی مقابلہ نہین کر سکتی۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ جو تغیر خود دولت آصفیہ مین ہوا ہے، اسی لحاظ سے تمام امراء ونوابان بھی متاثر ہوئے ہین اور وہ خود مختارانہ وآزادانہ شوکت وجبروت جو اس سے قبل کسی وقت سرزمین دکن مین پائی جاتی تھی بہت مضمحل نظر آتی ہے۔

غفران مآب نواب محبوب علی خان اُس زمانہ کے فرمانروایون مین سے آخری فرد تھے جب سطوت مغلیہ کے آثار وعلایم ہندوستان کے مختلف گوشون مین پائے جاتے تھے اور ان کے ساتھ ہی وہ دور ختم ہو گیا۔ دور عثمانی بالکل جدید دور ہے جس کے اصول جہانبانی اور جہانداری بالکل مختلف ہین اور جس مین وہی ضبط واہتمام وہی نسق وانصرام پایا جاتا ہے جو مغربی حکومتون کے اثر سے نہ صرف یہان بلکہ اب ہندوستان کی تمام ریاستون مین نظر آتا ہے اس مین کلام نہین کہ شخصی حکومت یعنی صرف ایک ہستی کا نائب خدا کی حیثیت سے کسی حصۂ ملک کے سیاہ سفید کا مالک ہونا وہ دلکش پہلو بھی رکھتا ہے، جو دنیا کے جبابرہ نے اپنی بے دریغ زرپاشیون سے ہمیشہ نمایان کیا اور ہمیشہ صاحبان احتیاج وغرض سے اس کی داد حاصل کی، لیکن جہانتک آئین واصول کا تعلق ہے، جس حد تک اقتصاد وسیاسیات کا واسطہ ہے وہ دور عہد پارینہ کی یادگار سمجھا جاتا ہے اور نظام ارتقاء کے لحاظ سے قابل ہجر وترک یقیناً موجودہ دور مین وہ مثالین بخشش وکرم کی نظر نہین آسکتین جب فرمانروائے وقت کی ادنیٰ سی نگاہ بخشش وکرم فقیر کو غنی اور گدا کو امیر بنا دیتی تھی لیکن اس کے ساتھ جو صورتین نہضت وارتقاء کی اب پائی جاتی ہین وہ اس سے پہلے مفقود تھین۔

اعلیحضرت حضور نظام (موجودہ فرمانروائے دکن) اپنی سادگی معاشرت کے لحاظ سے بالکل قرون اُولیٰ کے انسان معلوم ہوتے ہین اور جس طرح فتح بیت المقدس کے وقت وہان کے راہبون نے خلیفۂ ثانی کے بوسیدہ ملبوس کو دیکھ کر ان کے خلیفۂ وقت ہونے پر حیرت کی تھی، اسی طرح اب بھی ہر شخص اعلیحضرت حضور نظام کو دیکھ کر حیران رہجاتا ہے کہ کیا یہ ہستی اس ریاست کی فرمانروا ہو سکتی ہے جو حقیقتاً ایک ملک کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جہانتک خود اُن کی ذات اُن کی خانگی زندگی کا تعلق ہے وہ اسی سطح پر نظر آتے ہین جہان اسلام نے شاہ وگدا دونون کو دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا تھا، لیکن جس حد تک سلطنت کے نظم ونسق کا تعلق ہے ان کی وسعت نظر کا یہ عالم ہے کہ کرورون روپیہ شہر کے حفظان صحت وآرایش بلدہ کے لئے اُٹھا کر دیدیتے ہین اور علوم وفنون کی پرورش کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے کہ مسلم یونیورسٹی سے لیکر جو مسلمانون کی سب سے بڑی درسگاہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ مدرسہ تک سب اس کے دست کرم کے ممنون ہین اور انکا سر رشتۂ حیات اسی ایک ہاتھ سے وابستہ ہے جو نہ صرف نام کے لحاظ سے عثمان ہے بلکہ صفت کے لحاظ سے بھی اتنا ہی غنی ہے۔ خود اندرون ملک مین ترقی علوم وتہذیب زندگی کے لئے جو کچھ ہورہا ہے اس کے ثبوت مین صرف جامعۂ عثمانیہ کا نام لے دینا کافی ہے جو اصول کار کے لحاظ سے اس وقت ہندوستان کی بہترین یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے۔ الغرض یہ اور اسی طرح کے اور تمام برکات جن کو دیکھ کر ایک ملک کے ارتقاء پر آسانی سے حکم لگایا جاسکتا ہے یہان کے ہر ہر ذرہ سے ہویدا ہین اور غالباً اس خصوص مین تاریخ دکن کا کوئی فرمانروا، ہز اگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علی خان کا ہمدوش نہین سمجھا جاسکتا۔

یہان کا نظم حکومت ایک کونسل کے سپرد ہے جو چھ ممبرون اور ایک پریسیڈنٹ پر مشتمل ہے ممبرون کو یہان صدر المہام اور پریسیڈنٹ کو صدر اعظم کہتے ہین۔

صدر اعظم (مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالقابہ) طبقۂ امراء سے متعلق ہین اور ان کا خاندان اپنی خدمات کے لحاظ سے اسقدر دیرینہ تعلق دولت آصفیہ کے ساتھ رکھتا ہے کہ ایک شخص کے لئے خواہ وہ کسی حیثیت سے دکن کا مطالعہ کرے اس خاندان کے افراد کو نظر انداز کرنا محال ہے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ دربار اکبری کے مشہور نورتن مین سے ایک درخشندہ ترین رتن راجہ ٹوڈرمل تھا جس سے عہد مغلیہ کا ہر مورخ واقف ہے اور دکن کی تاریخ قدیم مین مہاراجہ چندو لال جو ہمارے موجودہ صدر اعظم کے نانا تھے اور جن کے کارنامے دولت آصفیہ کی تاریخ مین اسی طرح منتشر نظر آتے ہین جیسے ہار کے بکھرے ہوئے موتی۔ اب یہان صرف مہاراجہ بہادر ہی کی ایک ذات ایسی رہگئی ہے جن مین قدیم امراء کی خصوصیات پائی جاتی ہین۔ اور جن کا دربار اب بھی امیدگاہ انام ہے۔ آپ باوجود کبر سنی وپیرانہ سالی کے جوانانہ عزم وارادہ رکھتے ہین اور مشکل ہی سے کوئی وقت آپ کا ایسا گزرتا ہے جسے فارغ از انہماک کہہ سکین آپ کے اخلاق کی وسعت آپ کی سیرت کی نمایان خصوصیت ہے اور انسانیت پرستی آپ کا مسلک مذہب آپ کی حیات کا مدعا صرف خدمت ابنائے جنس ہے اور آپ کی زندگی کا مقصود دوسرون کے لئے ایثار وقربانی ضبط وتحمل آپ کا اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ باتین جو معمولی انسان کو بھی برہم کرسکتی ہین آپ پر کوئی اثر نہین کرتین اور ہلکی سی چین پیشانی بھی کسی شخص کا یہ

نہین دیتی۔ مجھے ایٹ ہوم ڈنر وغیرہ کے علاوہ یون بھی متعدد بار حاضری وحضوری کا شرف حاصل ہوا اور مین نے ہر مرتبہ یہ محسوس کیا کہ ابھی تک مین کافی مطالعہ اس عجیب وغریب ہستی کا نہین کر سکا۔ آپ کی ذات یکسر خیر وبرکت ہے اور آپ کی وہ مخفی داد ودہش جس کا علم کسی کو نہین ہوتا اسدرجہ وسیع ہے کہ اس عہد مین مشکل سے کوئی دوسری نظیر اُس کی پیش کی جاسکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ کا دربار صحیح نمونہ ہے اُس دور امارت کا جو اس سے قبل کسی وقت یہان پایا جاتا تھا اور آپ کی ذات تنہا یادگار ہے اس زمانہ کی جسے لوگ اب یاد کرتے ہین اور واپس نہین لاسکتے میرے اوپر خصوصیت کے ساتھ جو الطاف آپ نے صرف کئے، ان کی تفصیل وتشریح بیکار ہے کیونکہ نہ مین اپنے تاثرات کے لحاظ سے ان کے بیان پر قادر ہون نہ نوازش وکرم کی وسعت وفراوانی کی حیثیت سے۔ آپ کا علمی ذوق جسقدر بلند وپاکیزہ ہے وہ آپ کے فارسی اُردو کلام اور دیگر متعدد تصانیف سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ آیندہ کسی صحبت مین اس پر مفصل تبصرہ کرکے بتاؤنگا کہ دولت آصفیہ کا صدر اعظم ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے کس بلند مرتبہ کا حامل ہے۔

کونسل کے ممبران مین سے مجھے نواب مہدی یار جنگ بہادر اور نواب عقیل یار جنگ بہادر سے ملنے کا فخر حاصل ہوا۔ یہ دونون نواب عماد الملک بہادر مرحوم کے صاحبزادے ہین اور تمام خصوصیات کے لحاظ سے اُس فخر ملک وقوم ہستی کے سچے جانشین۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات ہین اور اپنی گرانقدر خدمات کی وجہ سے حکومت آصفیہ وحکومت برطانیہ دونون کا پورا اعتماد حاصل کئے ہوئے ہین۔ آپ نہایت نیک نفس، صلح کل، مرنجان مرنج اور وسیع الاخلاق انسان ہین اور ذاتی قابلیت وفہم وتدبر کی حیثیت سے کونسل مین خاص اقتدار رکھتے ہین۔ ان کے برادر گرامی نواب عقیل یار جنگ بہادر وزیر تعمیرات ہین اور آپ کے عہد مین حیدرآباد کو جسقدر عمارتی ترقی حاصل ہوئی یا ہو رہی ہے، وہ تاریخ حیدرآباد مین یادگار رہجانے والی چیز ہے۔ آپ نہایت خوش فکر انسان ہین اور خلوص وصداقت کا مجسمہ۔ وزیر فنانس سر اکبر حیدری یہان کے نہایت مشہور شخص ہین اور کونسل مین آپ کا وجود وہی اہمیت رکھتا ہے جو نظام عصبی مین نخاع کو حاصل ہے۔ افسوس ہے کہ مجھے آپ سے ملنے کا موقعہ حاصل نہین ہوا۔ باقی تین ممبرون مین نواب ولی الدولہ بہادر اور نواب لطف الدولہ بہادر طبقۂ امراء سے متعلق ہین اور اپنے اخلاق کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہین۔ کرنل ٹرینچ صیغۂ مال وپولیس کے وزیر ہین اور مغربی خصوصیات کے لحاظ سے بہت کامیاب وزیر سمجھے جاتے ہین۔

کونسل کے احکام کا نفاد معتمدون کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر محکمہ ایک معتمد یا سکریٹری سے متعلق ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام کاغذات کونسل مین پیش ہوتے ہین۔ معتمدون مین سے مجھے صرف نواب فخر یار جنگ بہادر اور نواب صمد یار جنگ بہادر سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ نواب فخر یار جنگ معتمد محکمۂ فنانس ہین اور اپنی محنت ودیانت اہلیت وقابلیت، اور اخلاق وانسانیت کے لحاظ سے ایک ایسے شخص ہین جن کے متعلق حیدرآباد کے کسی حلقہ مین دو رائین نہین سُنی جاسکتین۔ ہر شخص آپ کا معترف ومداح ہے اور حکومت وپبلک دونون کا اعتماد آپ کو حاصل ہے۔ نواب صدر یار جنگ محکمہ افواج کے معتمد ہین اور اپنی ذاتی قابلیت

وصلح کل فطرت کے لحاظ سے بہت مقبول سکرٹری ہین

ان کے علاوہ اور بہت سے اعلی عہدہ داران ریاست سے ملنے کا موقعہ مجھے ملا جس کا تفصیلی ذکر اس وقت ممکن نہین، لیکن مختصرًا اس قدر ضرور کہونگا کہ مین نے ان جملہ حضرات کو بہت متواضع پایا اور اپنے موجودہ خدمات کے لحاظ سے حد درجہ مطمئن۔

غیر سرکاری حلقون کے علاوہ بڑی تعداد ملنے والون کی طلبہ کی جماعت پر مشتمل تھی۔ ان مین سے اکثر وہ تھے جو میری مذہبی تبلیغ کے ہمنوا ہین اور کثر وہ جو مخالف ہین ہر صحبت گویا ایک صحبت مناظرہ ہوا کرتی تھی جس مین یہ لوگ مجھ سے مختلف سوالات کرتے تھے اور مین ان کو جواب دیتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ دکنی طلبہ مین ذوق علم وتفتیش بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اور وہ کوشش کرتے ہین کہ مکالمہ ومطالعہ دونون ذریعہ سے اپنے معلومات کو وسیع کرین۔

جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کی وجہ سے یہان ذوق تصنیف وتالیف بھی نوجوان جماعت مین پیدا ہو گیا ہے اور اس وقت تک متعدد کتابین شایع ہو کر ملک مین مقبول ہو چکی ہین اسی طرح ان لوگون مین وہ خود داری وخود اعتمادی بھی نمودار ہے جو صحیح تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے اور جذبۂ وطنیت جو بیداری کی غایت اصلی ہے یہان کی آبادی مین بہت ترقی پذیر ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہان کے علمی خدمات یا تصانیف مین ابھی تک ایک چیز کی ضرور کمی ہے جسے ہم اگر فقدان روح نہین کہہ سکتے تو فقدان خوشدلی (Liveliness) ضرور کہین گے۔ مین نے جہانتک غور کیا اس کا سبب بالکل مقامی وماحولی ہے۔ سرزمین دکن خواہ کتنی ہی بلند خصوصیات کیون نہ رکھتی ہو، لیکن جمالیاتی ذوق (Aesthetic taste) کی تربیت کا سامان وہان ابھی تک پیدا نہین نہین ہوا اور اسی حس کے کند ہونے کی وجہ سے یہان کے علمی کارنامے کچھ اُداس سے معلوم ہوتے ہین۔ لیکن امید کیجاتی ہے کہ یہ عالم زیادہ عرصہ تک قایم نہین رہیگا اور مستقبل قریب یا بعید مین کوئی اسکول مخصوص رنگ کے مصنفین کا ایسا ضرور پیدا ہوگا جو اس کمی کو محسوس کر کے دور کریگا اور پھر رفتہ رفتہ یہ احساس مصنفین کے تمام طبقون مین پیدا ہو جائیگا۔

مین جسوقت واپس آیا تو رسالہ تقریبًا مرتب ہو کر لکھا جا چکا تھا اور چونکہ مین یہان موجود نہ تھا اس لئے اس مرتبہ رسالہ کی ترتیب یقینًا نہ صرف ثقیل ہو کر رہگئی، بلکہ ایک حد تک بدنما بھی ہو گئی۔ صفحہ ۹ سے صفحہ ۸۸ تک مسلسل علمی وتنقیدی مضامین درج ہو گئے اور اگر مین حیدرآباد سے سرزمین دکن والا مضمون نہ بھیجدیتا تو شایقان ادب لطیف کے لئے یہ رسالہ بالکل رمضان ہو کر رہجاتا۔ میرا قاعدہ ہے کہ ہمیشہ کسی ایسے مقالہ کے بعد جس کے مطالعہ سے دماغ کو کچھ تھکن محسوس ہو، کوئی ایسا مضمون یا فسانہ ضرور رکھدیتا ہون جو اُس خستگی کو دور کر کے آیندہ مضمون پر غور کرنے کے لئے انسان کو طیار کردے، لیکن اس مرتبہ ترتیب کی یہ صورت قایم نہ رہسکی اور جناب بدر اصلاحی کے دو علمی مضمون مسلسل درج ہو گئے، ہر چند یہ دونون بہت مختصر ہین اور بڑی حد تک دلچسپ بھی لیکن اگر ان کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جاتا تو زیادہ لطف پیدا ہو جاتا۔ علامۂ آصفی کے متعلق پہلے مضمون نے بہت کافی جگہ لیلی، لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ مضمون بہت طویل ہے اور جلد سے جلد اسے ختم کر دینا ہے۔ مومن وکلام مومن کے لئے زیادہ جگہ

نکال کر اس مہینے میں ختم کر دیا گیا کہ اس کا سلسلہ بھی عرصہ سے چلا آرہا تھا۔ جناب فسر امروہوی نے مرزا غالب اور مصحفی کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی کافی طویل ہے، لیکن اس نوع کے تنقیدی مضامین کی طوالت طبیعت پر بار نہیں ہوتی ــ جناب رسا کا مضمون اُسی سلسلہ کی کڑی ہے جو اس سے قبل "حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز" کے عنوان سے شایع ہو رہا تھا۔ موجودہ سیاسیات کے لحاظ سے یہ مضمون بہت مفید و کارآمد ہے۔ افسوس ہے کہ انھیں اسباب کے ماتحت نہ باب الاستفسار کے لئے جگہ نکل سکی جسکا لوگون کو بہت انتظار رہتا ہے اور نہ معلومات کے لئے اسی طرح حصۂ نظم مین بھی صرف دو نظمین درج ہو سکین۔ جون کے رسالہ مین انشاء اللہ پوری تلافی اس بدمزگی کی کردیجائے گی اگر واقعی یہ کوئی بدمزگی ہے

ذکر رنگین، جناب جگر مرادابادی کا عطیہ ہے اور شفق حضرت فرخ بنارسی کا مین چاہتا ہون کہ ناظرین نگار خود انکا مطالعہ کرکے داد دین۔

اسوقت ہندوستان کے سیاسیات کا جو رنگ ہے، وہ کسی سے مخفی نہین۔ تمام کام کرنیوالے ایک ایک کرکے گرفتار ہوچکے ہین، یہانتک کہ آج، ہر کی صبح کو سارے شہر مین ہرتال ہے اور مہاتما گاندھی کو گرفتار کرکے گویا حکومت نے اس سرچشمہ کو ہی بند کر دینا چاہا ہے، جس سے ملک مین بدامنی پھیلنے کا اندیشہ کیا جاتا تھا۔

حکومت کا موجودہ طرز عمل کس حد تک دانشمندانہ کہلایا جاسکتاہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہین۔ کیونکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب نمک کے متعلق قانون شکنی پر حکومت کی خاموشی نے مہاتما گاندھی کے تیوار کو بھی مضمحل کر دیا تھا اور وہ حیران تھے کہ حکومت کی اس ستیاگرہ کا کیا جواب دے سکتے ہین اور آج حکومت کے تشدد نے، تمام اُن آرزوؤن کو تکمیل کی حد تک پہونچا دیا ہے جن کو لیکر مہاتما گاندھی نکلے تھے۔ دنیا مین جب کوئی شخص قوت کا جواب انتہائی عجز و قربانی سے دینے لگے تو پھر اس کا توڑ صرف خاموشی ہوسکتاہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حکومت زیادہ ضبط سے کام نہ لے سکی اور اس نے ہنگامہ دار وگیر کو اسکا علاج سمجھا، حالانکہ اصل چارۂ کار وہی تھا جو ابتدا مین ظاہر کیا گیا۔ بعض لوگون کا خیال ہے کہ اب جب کہ ملک کے تمام قایدین و رہنما گرفتار ہوچکے ہین، یہ تحریک مضمحل ہوکر فنا ہو جائیگی۔ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن اس کے ساتھ دوسری صورت بھی سامنے رکھکر غور کرنا چاہئے کہ اگر اس کے بعد بھی یہ تحریک قائم رہی تو کروڑون آدمیون کے لئے کتنے زندان طیار کئے جائین گے اور کہان کہان؟

غیر ملکی کپڑے کی تجارت کو روکنے کیلئے اکثر مقامات مین پکٹنگ سے کام لیا جارہا ہے۔ جسوقت مین لکھنؤ واپس آیا تو یہان بھی اسکا زور تھا اور ابتک قائم ہے، بہت سی دوکانین بند ہوگئی ہین اور خرید و فروخت صرف دیسی کپڑے کی ہورہی ہے۔ مسلمانون مین سے بعض حضرات نے الستہ حد درجہ جوانمردی سے کام لیا کہ باوجود الحاح وزاری کے انھون نے ولایتی کپڑا خریدا اور بعد کو پکٹنگ کرنیوالے لڑکے اور لڑکیون کو جو اُن کے راستے مین پڑگئے تھے، روندتے ہوئے نکل گئے ـــــ مین سوچتا ہون کہ اگر واقعی ولایتی کپڑا آنا بند ہوگیا تو پھر وہ مسلمان جو صرف ولایتی لٹھے اور تنزیب ہی کے استعمال کو توشۂ آخرت اور وجہ شفاعت سمجھے ہوئے ہین کیا کرینگے؟

خاقانی ہند، قاآنی عصر، علامہ آصفی نظامیؒ

اولاد

رامپور مین، فیاض خان جمعدار برادر سالار خان کی نواسی سے شادی ہوتی تھی۔ یہ بی بی مجبر دولہ خاں، اور عباس خان مشہور چوگان باز کی ہمشیرہ زادی۔ اور رامپور کے ایک نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھین۔ ان کے بطن سے چار لڑکیان، اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا عین نشوونما کی حالت مین راہی ملک عدم ہوگیا۔ ایک لڑکی شادی کے قبل فوت ہوگئی تھی۔ دو لڑکیون کی شادی بنی شیر خان ساکن شاہ آباد کے دو فرزندون کے ساتھ ہوئی۔ اب صرف بڑی لڑکی زندہ ہین۔ ان کے شوہر بعارضہ طاعون انتقال کر گئے۔ دو لڑکے چھوڑے ہین۔ جو رامپور مین تجارت کرتے ہین۔ چونکہ یہ جوانی مین بیوہ ہوگئی تھین۔ اسلئے مولانا امداد کرتے رہے۔ اکثر رامپور رہا کرتی تھین۔ ماہوار خرچ حیدرآباد سے آجاتا تھا کبھی کبھی حیدرآباد بھی چلی جاتی تھین

پہلی بی بی کے انتقال کے بعد مولانا نے عقد ثانی کیا۔ یہ بی بی نواب بہرام الدولہ بشر برجنگ کی نواسی تھین۔ نواب صاحب فرخ آباد مؤ کے رئیس تھے۔ اور حیدرآباد مین بہت معزز شمار ہوتے تھے۔ ان کے بطن سے دو لڑکیان اور تین لڑکے پیدا ہوئے۔ لڑکون کے نام علی الترتیب عبدالوہاب خان، عبدالسلام خان، اور عبداللہ خان، ہین۔ یہ تینون بقید حیات ہین۔ اور حیدرآباد ہی مین قیام ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے مولانا کے انتقال کے بعد ساری اولادون کے وظیفے مقرر کئے تھے۔ رامپور والی لڑکی کو تو کسی وجہ سے نہ ملا۔ لیکن ان لڑکون کو برابر مل رہا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے۔ کہ ایک لڑکا بھی اس علامہ باپ کا خلف الصدق نہین سب کے سب معمولی خواندہ ہین، مولانا کو اس کا بہت رنج تھا، ہر چند کوشش کی۔ مگر کچھ فائدہ نہوا۔

تلامذہ

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد وزیر سلطنت آصفیہ، مولانا سے فارسی مین مشورۂ سخن کیا کرتے تھے چونکہ مہاراجہ بہادر کو مولانا سے دلی عقیدت تھی۔ مولانا بھی بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ بعض مواقع پر مولانا نے تہنیت نامے لکھے ہین۔ یہ نہین معلوم ہوتا کہ کوئی ماتحت کسی افسر کو مبارکباد دے رہا ہے۔ یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ ایک بزرگ اپنے اطاعت شعار چھوٹے کو پیار کر رہا ہے اور دعا دیتا ہے۔ مہاراجہ بہادر نے، مولانا کے انتقال کے بعد، مولانا کی اولاد کے ساتھ مربیانہ سلوک کیا۔ البتہ انکی بڑی صاحبزادی اس منبع فیض وکرم کے جود وسخا سے محروم رہین۔ کاش اس ذات ہمایون تک کوئی آواز پہنچ جاتی اور مولانا کی اس نور چشم کے مصائب کچھ کم ہوتے

مولانا حیدرآباد مین فارسی کی سند تھے۔ اکثر لوگ فارسی مین اصلاح لیتے تھے۔ یہان رامپور مین ذرائع معلومات اسقدر محدود ہین۔ کہ مہاراجہ بہادر کے علاوہ کسی ایک شخص کا نام بھی معلوم نہو سکا۔

لیاقتِ علمی مولانا عربی اور فارسی لٹریچر (ادب) میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ ترجمہ خصائص کبریٰ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

"میں ایک معمولی مترجم ہوں۔ عربی الفاظ کے معانی ہندی زبان میں عوام الناس کے سمجھانے کے واسطے بیان کر دیتا ہوں جلوہ آرائش کلام، تکلف بیان اور دنیوی شہرت منظور نہیں، ورنہ بہت سے خیالی قصہ جات، قالبِ تکلف میں گڑھ سکتا، اور زبان آوروں کی روش پر خیال بندی کے مراتب میں اغراق کر سکتا ہوں۔ چنانچہ

"میری دستگاہ سخن فارسی زبان میں مسلمۂ اہل ہند و عجم ہے"

اس کے سوا عربی ادب میں عمر کا بیشتر بڑا عزیز حصہ صرف ہوا۔ وہ عظیم نعمائے الٰہی سے ہے"

مولانا کو فارسی شاعری سے طبعی شوق تھا عمر کا بڑا حصہ اس کی تکمیل میں صرف کیا۔ ابتداءً قدیم طرز انشا سے زائد شغف رہا جسکا نتیجہ سہ نثر آصفی کی صورت میں نکلا۔ یہ ظہوری کی سہ نثر کا جواب ہے۔ اور حق یہ ہے کہ نقش ثانی نقش اول سے کم نہیں

مولانا کو امید تھی کہ اسکی قدر ہوگی۔ مگر زمانہ کی ہوا بدل چکی تھی۔ مولانا انصاف طلب رہے۔ لیکن انصاف کون کرتا وہ سمجھنے والے اور داد دینے والے ہی نہ رہے تھے حافظ صاحب کو لکھتے ہیں

"سہ نثر میں جو کچھ جدتِ مطالب و مضامین ہوئی ہے۔ وہ زیادہ انصاف کی محتاج ہے"

عربیت کا اندازہ مولانا کے عربی قصائد سے ہو سکتا ہے۔ دو چار فارسی کلیات میں طبع ہو گئے ہیں۔ رقعات غیر مطبوع رہے۔ ورنہ خدا جانے حریری و بدیعی پر کیا گزرتی۔

معقول و منقول میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔ نور الانوار اصول فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے۔ شاہنشاہ عالمگیر کے استاد ملا جیون کی تصنیف ہے۔ مولانا نے نہایت حسن و خوبی سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، علامۂ زمان قدوۃ العلماء الراسخین مولانا مولوی انوار اللہ خان بہادر معین المہام امور مذہبی ممالک محروسہ سرکار عالی نے حقیقۃ الفقہ نامی کتاب تصنیف کی تھی اس میں امام ہمام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور فقہ کی اصل اور تدریجی ترقی سے بحث کی گئی تھی۔ مولانا نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جو غالباً طبع ہو چکا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آصفی علوم معقولہ و منقولہ کے بھی زبردست فاضل تھے۔

ذہانت و طباعی کا یہ عالم تھا۔ کہ خاقانی و عرفی کی بحروں میں تین تین اور چار چار سو اشعار کے قصیدے لکھے ہیں۔ طبیعت دریائے مواج معلوم ہوتی ہے۔ جس کے سامنے اشکال و صعوبت کی پہاڑیاں، پر کاہ سے زائد باوقعت نہیں ایک بار، صرف دو گھنٹے میں سو شعروں کا قصیدہ لکھ ڈالا۔ خاتمہ میں فرماتے ہیں۔

میداشت بندہ طبع روانے بسانِ بحر	چون آب جا گرفتہ ز عمرے مکدرست
دیروز این چگامہ بدو پاس نقش بست	مانیِ کلکِ من، کہ طراز ندہ دفترست
بنگر کہ از فروغ معانی بہ مدحِ تو	این سلکِ نظمِ من بہ ثریا برابرست

تصنیفات

تصنیفات کی صحیح تعداد معلوم نہو سکی ۔ اپنے خط میں جن کتابون کا مولانا نے تذکرہ کیا ہے ۔ وہ یہ ہین ۔

(۱) وسائل الوصول الی شمائل الرسول ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال، اقوال وغیرہ کا مجموعہ اور مرد، عورت، بوڑھے، بچہ، ہر ایک کے لئے سنتِ نبوی کا آئینہ ہے ۔ کتبِ سیر و احادیث سے رسول اللہ کی عام طرزِ معاشرت کو واضح کیا ہے ۔ اور آپ کے صفات ہا یون کو ایک ایک کرکے بتایا ہے ۔ یہ ۱۳۱۹ھ سے قبل کی تصنیف ہے ۔

(۲) جلاء الابصار ۔ اصولِ فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب "نور الانوار" کا اردو ترجمہ ہے ۔ دو جلدون مین طبع ہو کر شائع ہوا تھا ۔ جا بجا حواشی کا اضافہ ہے ۔ جو حلِ کتاب، اور مطالب شرح و متن کو سمجھنے مین امداد کرتے ہین ۔ ابتدا مین ۴۲ صفحون کا دیباچہ ہے ۔ مسلمانون کی پستی کے اسباب، اور مختلف علوم و فنون کی کتابون کے ترجمہ کی ضرورت سے بحث ہے ۔ اردو کی عبارت مولویانہ ہے ۔

ترجمہ کے کام ۱۳۱۷ھ کو ختم ہو کر ۱۳۱۹ھ مین زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ۔ کل مدت ترجمہ ایک سال ہے ۔ یہ ترجمہ میر مجلس عدالت عالیہ کے ایما سے وکلا و ریاست حیدر آباد کے مطالعہ کے لئے کیا گیا تھا ۔ مجلس مذکور کے صیغہ انتظامی نے طباعت کے انتظام کا فرمان لکھکر مولانا آصفی کو امید دلائی تھی ۔ کہ ان کی جان کاہ کوششین رائگان نہین جائینگی ۔ مگر اثنا، ترجمہ ہی مین کسی فتنہ پرداز کی انسانیت سوز سعی نے تمام امیدون پر پانی پھیر دیا ۔ بعد اختتام، کتاب اپنے صرف سے طبع کرانا پڑی ۔ مولانا کا خیال تھا ۔ کہ طباعت کے بعد عدالتِ عالیہ سے کافی معاوضہ ملے گا ۔ مگر یہ خیال بھی خام نکلا

فخر الملک بہادر وزیر تعلیم کی مدح مین ایک قصیدہ لکھا ہے اس مین یہ واقعہ بالتفصیل مذکور ہے ۔ فرماتے ہین ۔

لیک یک نابلدِ کو بہ فرہنگ و تمیز — از خدا غافل و از دین پیمبر بیزار
کرد آہنگ بہ پرخاشِ من و یا دمِ من — فرسِ فتنہ جہا نید بشو رشِ مضمار

خاتمہ مین ممدوح سے سارا واقعہ بیان کرتے ہین ۔

اے سپہر شرف و عز و معالی و جلال — گوش کن قصۂ من، نغز بود این گفتار
از اصولِ فقہ آن کحل جواہر سر دم — کہ بہر چشم خرد ا، جلائے ابصار
تا بیک سال بدل دشنۂ محنت خوردم — دادم از خونِ جگر ترجمہ را نقش و نگار
تا بدو سال و گر رنج کشیدم از طبع — طاقتم طاق شد و گشت و ماغم بیکار
حسبِ فرمانِ گرامی گرامی حکام — از پئے ترجمہ بستم کمر خو دیکبار
واپس زانوئے حیرت بہ نشستند ہمہ — آن کسانے کہ پئے ترجمہ کردند اقرار
وعدۂ مجلس عالیہ عدالت، نلشود — بر رخِ محنتِ من ایا ب مراعاتِ کبار
پئے تبییض و بہ تصحیح و بہ طبعش شد صرف — نقدِ سرمایۂ ذاتم کہ شمردم دو ہزار

کس زیاے نکشیدہ چو من از خدمتِ علم برنگر دید تہی دست چو من از سرِ کار
اعتمادے نہ کنم بعد ازین بر حکام خوانم از وعدۂ مستقبلِ شان استغفار

اس کے بعد فتنہ پرواز کی ہجو ہے۔ خوب خوب دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

(۳) **معجزات نبی خیر الوریٰ۔**

علامہ سیوطی رح کی مشہور و معروف کتاب "خصائص کبریٰ" کا اردو ترجمہ ہے۔ ابتدا مین ۵۰ صفحات کا پرمعنی دیباچہ ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ دو جلدون مین طبع ہوا ہے۔ تقریباً ۱۵۰۰ صفحات پرمشتمل ہے۔ تین سال کی شبانہ روز محنت سے ۱۳۲۸ھ کو تمام ہوا۔

کتاب ضخیم تھی۔ مولانا اس کی طباعت کا صرف برداشت نہین کر سکتے تھے۔ ایک مدحیہ قصیدے کے ذریعہ حیدرآباد کے امیر کبیر نواب لطف الدین خان بہادر سے طباعت کے اخراجات برداشت کرلینے کی درخواست کی ہے۔ فرماتے ہین۔

اندرین عہد کہ این بندہ رسیدہ بحضور ہست یک مقصدِ دینی کہ نمودش مضطر
میکنم خدمتِ قومی ز علوم و زفنون بنود خدمتے از خدمتِ دینی بہتر
آن کسانے کہ ندارند سوادِ عِلمی جانبِ دقتِ علمی نکشایند نظر
بنود تاکہ تراجم بزبانِ ملکی از علومِ عربیہ بنود ہیچ خبر
بہ خصائص بود این نسخۂ کبریٰ مشحون ہمچو یک قلزمِ بے ساحلِ مشحون بدُر
آن چنان رانے زدند اہلِ صفا دخلت کہ دہد ترجمہ اش نفع با ہل کشور
بہوا خواہیٔ قومی و رضائے باری بندہ سہ سال پئے ترجمہ اش بست کمر
بارِ طبعش نتوانم کہ بخود برد ارم اندرین کار نشد طالع و بختم یاور
گر کنی ہمتِ مردانہ بہ طبعش زکرم از تو خوشنود شود خالق و ہم پیغمبر
نامِ نامی تو تا روزِ جزا خواہد ماند ثبت در دفترِ اخلاص بدیوان قدر

غالباً امیر ممدوح نے صرف برداشت کرلیا تھا۔ اور مولانا کو دماغی محنت کے ساتھ روپیہ صرف کرنیکی زحمت گوارا کرنا نہ پڑی۔ ادھر نواب ہمایون۔ دریادل، میر عثمان علیخان بہادر فرمانروائے دکن نے ماہ ۵۰ روپیہ کا منصب صلہ مین جاری کرکے مولانا کی اشک شوئی کردی۔

(۴) ۔ **ترجمۂ مواہب لدنیہ** - ترجمہ کا کام ختم ہوچکا تھا طباعت جاری تھی۔ کچھ حصہ چھپ گیا تھا۔ کچھ باقی تھا۔ کہ راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔

(۵) حقیقۃ الفقہ - علامہ زمان مولانا مولوی انوار اللہ خانصاحب بہادر معین المہام امور مذہبی ممالک

نظام نے عربی مین ایک کتاب لکھی تھی جس مین امامِ اعظمؒ کے حالات اور فقہ کی تاریخ سے بحث کی تھی۔ مولانا نے فارسی مین اسکا ترجمہ کیا۔ ۲۰۲ جز مین تمام ہوئی تھی۔ صفر ۱۳۳۴ھ مین مولانا نے لکھا ہے۔ کہ عنقریب طبع ہونیوالی ہے۔ غالبًا شایع ہوگئی ہوگی۔

(۶) **رسالۃ فی الاختلاف بین الاشاعرۃ والماتریدیۃ**۔ اسلام کے دو نامور فرقون کے اختلافی مسائل سے بحث کی ہے۔

یہ مولانا کا مذہبی کام ہے۔ اس پر انھین فخر تھا۔ آخر مین شعر و شاعری کو بیہودہ خیالی تصور کرکے، بقیہ عمر کو مذہبی تصنیف و تالیف مین صرف کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ خط مین اسکا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مذکورہ کتب و تالیف کے ماسوا اور علوم و فنون مین بھی چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے تھے۔ جن مین بعض نامکمل رہے۔ بعض پایۂ تکمیل کو پہنچے مگر طبع نہو سکے۔

(۷) **مرات العروس**۔ حسن و عشق نعمت خانِ عالی کے طرز مین لکھی ہے۔ پندرہ جز مین تمام ہوئی تھی۔ طبع کی نوبت نہ آئی۔

(۸) **سہ نثر آصفی**۔ ملا نورالدین ظہوری کے سہ نثر کا جواب ہے۔ خوب خوب استعارات، تشبیہات اور صنائع و بدایع استعمال کئے ہین۔ غفران مکان حضور نظام مرحوم و مغفور اور اعیانِ ریاست کا مدحت نامہ ہے۔ جوانی کی تصنیف ہر سر بادۂ فخر و غرور سے مست تھا۔ ہر ہر جملہ سے جوشِ مسابقت ہویدا ہے حافظ صاحب کو تحریر فرماتے ہین۔

"سہ نثر آصفی بمدحِ غفران مکان طبع ہو کر ۲۵۔ ۳۰ سال سے انصاف طلب ہے۔ اس مین جو کچھ جدتِ مطالب و مضامین ہوئی ہے۔ زیادہ انصاف کی محتاج ہے"

ایک قصیدہ مین سہ نثر کو ان الفاظ مین پیش کیا ہے۔

آن کتابے کہ شدہ پیش کشِ حضرتِ تو ... از ثنا ہائے نظام ست گرندہ دفتر
محسن الملک بہادر کہ بود معدنِ عقل ... پیش تو دوش بنفتاند بایما گوہر
طرز سہ نثر ظہوری ست باندازِ شگرف ... کہ مضامینش کشد دل ز برِ اہلِ ہنر
وصف اعیانِ گرامی دکن بست طراز ... قلم سحر نگارم چو بتانِ آذر

(۹) **آثار الاقبال**۔ دکن کی عمارات کے حالات لکھے ہین۔ سات آٹھ جز کا رسالہ ہے۔

(۱۰) **تاریخ دکن**۔ نامکمل رہی

(۱۱) **مسلکِ گوہر تاریخ خاندانِ مرلی دھر**۔ اس کتاب مین آفرینش آسمان و زمین اور ضرورت تمدن سے بحث کرکے معتمدین صرف خاص سرکار نظام کے نادر واقعات درج کئے ہین۔ راے مرلی دھر معتمد صرف خاص قوم کائستہ اور اکبرآباد کے رہنے والے تھے۔ صرف خاص کے صدر المہام تھے۔ مولانا کا ان سے تعلق خدمت تھا۔ چنانچہ یہ کتاب ان کے خاندان کی تاریخ ہے۔

(۱۲) **نظامِ سروری** - صرف خاص اور عدالتِ دیوانی کے حکام کی مختصر منظوم تاریخ ہے۔ طبع نہین ہوئی۔

(۱۳) **شواہد النحو** - علم نحو کا ایک مختصر رسالہ ہے۔

(۱۴) **قول فیصل** - یمین السلطنتہ وزیر دکن نے حضورِ نظام کا سجع کہا تھا۔

سکہ زد از فضل یزدانِ زمن   میر محبوب علی شاہ دکن

سید مرتضیٰ فلسفی بلگرامی نے "یزدان زمن" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ اور آپ زر نام رسالہ مین اس پر استدلال کیا۔ یمین السلطنتہ کی ایما سے مولانا نے اس کے جواب مین یہ رسالہ فارسی زبان مین لکھا تھا۔ مگر باہم صلح ہو جانے کے باعث طبع نہ کرایا۔

(۱۵) **کلیات نظم آصفی** - قصائد، قطعات، ترکیب بند مثنوی، مخمسات وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ مولانا نے اسے طبع کرانا شروع کر دیا تھا لیکن ناتمام رہا۔ ردیف نون تک طبع ہونے پایا تھا۔ کہ بعض وجوہ مانع آ گئے۔ اس مین ۹۴ قصائد مکمل اور ایک ناتمام ہے۔ یہ ۹۴ قصائد ۳۶۸ صفحات مین ہین۔

بیشتر وہی طرحین اختیار کی ہین جن پر خاقانی، انوری، عرفی، طالب، حزین، اور قاآنی قلم اٹھا چکے ہین۔ حق یہ ہے کہ ان نامور شعرا کے دوش بدوش نظر آتے ہین۔ سر مو فرق نہین معلوم ہوتا۔ ابھی تک مولانا کا کلام اہل نظر سے پوشیدہ ہے۔ جب یہ جواہر ریزے اہل ادب کے سامنے آئین گے تو انہین فیصلہ کرنا پڑے گا کہ۔

"قاآنی اور غالب کے بعد ایران و ہند مین ان جیسا قادر الکلام شاعر پیدا نہوا"

کلیات ۱۳۲۶ھ مین طبع ہونا شروع ہوا تھا۔ لیکن مکمل طبع نہو سکا۔ ردیف نون کی ابتدا تھی۔ کہ کام رک گیا۔

(۱۶) **دیوان آصفی** - فارسی غزلیات اور مخمسات کا مجموعہ ہے۔ ۵۶۸ صفحات مین غزلین ہین۔ اس کے بعد مخمس ہین، لیکن یہ بھی ناتمام ہے۔

(۱۷) **رباعیات و قطعات** - مولانا نے اپنی تمام رباعیان اور قطع یکجا جمع کئے تھے۔ لیکن طبع کی نوبت نہین آئی۔ ارادہ یہ تھا۔ کہ تمام مجموعۂ اشعار کی تعداد تیس ہزار سے متجاوز نہو۔ حافظ صاحب کو لکھتے ہین۔

"ارادہ ہے۔ کہ ۳۰ ہزار اشعار سے زیادہ کلیات نظم نہ رکھا جائے بلکہ اور بھی مختصر رہے۔ کون دیکھتا ہے"

(۱۸) **قصائد عربی** - بعض قصائد فارسی کلیات مین طبع ہو گئے ہین۔ باقی آغوش بیاض مین رہے۔ عربی قصائد سید علیخان مولوی، میر غلام علی آزاد اور بو فراس کے تتبع مین لکھے ہین۔ چونکہ متنبی و حماسہ زیر تدریس رہتے تھے اس لئے عربی قصائد مین قدیم سادگی پر ایرانی تخیل غالب ہے

(۱۹) **مکاتیب عربی** - مکاتیب غیر مرتب رہے۔ چند اجزا کا مبیضہ موجود تھا۔ طبع ہونے کا موقع نہین آیا۔ یہ ہین مولانا کی وہ مصنفات، جن کو مولانا "محض دردِ سر اور دنیا کی نمود کا سرمایہ" تصور کرتے رہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک "اس وقت مین ایسے خیالات لاطائل تصور کئے جاتے ہین"

مولانا کو اپنے ادبی سرمایہ پر نہ ناز تھا۔ اور نہ وہ اسے کچھ اہم خدمت شمار کرتے تھے۔ دینی خدمت اسیر و احادیث کے تراجم سے شغف ہو گیا تھا۔ خود ان کے الفاظ ہیں۔

"فارسی سرمایہ پر فخر کا موقع نہیں۔ البتہ دینی خدمات جو عام مسلمانوں کے لئے ہیں۔ قابل دقعت ہیں"

مولانا کا ایک مجموعۂ قصائد اور ایک دیوان تلف ہو گیا تھا۔ مولانا نے خود افسوس ظاہر کیا ہے۔ یہ قصائد اور غزلیں اسکے بعد جمع کیں۔ چونکہ کلام جمع کرنے کی طرف نہ رغبت تھی، اور نہ کوئی امر محرک، اسلئے بہت کلام ضائع ہو گیا۔

آصفی در شوکت آبادِ سخن
تکیہ بر تختِ سلیمان کردہ

کلام پر رائے

شاعری کی ابتدا قصائد ہیں۔ پھر شاعر کے زورِ کلام اور قدرتِ تخئیل، جدتِ طرزِ ادا، اور چستی بندش کا اندازہ بھی قصائد سے واضح تر، کسی اور صنفِ کلام میں نہیں ہو سکتا۔ اسلئے ہم سب سے پہلے مولانا کے قصائد کے خصائص سے بحث کریں گے۔

انوری۔ عرفی، فیضی، اور قاآنی وہ خداوندانِ قصائد ہیں جن کے طرحوں پر آصفی نے طبع آزمائی کی ہے۔ چونکہ یہ ہستیاں اپنی مخصوص روشوں کے مالک ہیں۔ اسلئے دیکھنا یہ ہے کہ آصفی نے ان مختلف روشوں کی کس حد تک پابندی کی، تیز طبیعت پر کس رنگ کا غلبہ رہا۔ اس امر کے طے کرنیکے لئے، پہلے بالاختصار ان اساتذہ کی خصوصیات کا تذکرہ ضروری ہے۔

انوری کے کلام میں، سادگی۔ سلاست کے ساتھ قدرے مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ عرفی کے ہاں رفعتِ تخئیل، جدتِ تراکیب، اور ندرتِ استعارات نمایاں ہیں، فیضی میں، زورِ کلام، چستی، اور شوکتِ الفاظ، اور قاآنی میں سلاست و روانی، بحور کی نغمہ آفرینی، الفاظ کی ہم آہنگی، اور تراکیب کا زیر و بم مخصوص اوصاف ہیں۔

خصوصیاتِ مذکورہ میں سے ہر ایک بجائے خود مستقل اور مکمل ہے۔ جس تک پہنچنے کے لئے نہایت پیچیدار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ کوئی قصیدہ گو ان سب خصوصیات کا جامع نہیں ہوا۔ جو کسی روش پر چلا۔ عمر بھر چلتا رہا مگر تمام نکر سکا۔ چہ جائیکہ کسی دوسری روش پر گامزن ہوتا۔

مگر اس کلیہ میں صرف ایک استثنا ہے۔ آصفی نے گامزنی شروع کی۔ تو ان چاروں راستوں کو پامال کر دیا جس کے طرز میں قصیدہ لکھا۔ اس کا چربہ اتار لیا۔ دیکھنے اور سننے والا بلا پس و پیش خلط ملط کر لیتا ہے۔ اور کبھی شک نہیں گزرتا۔ کہ یہ صاحبِ طرز کا کلام نہیں ہے جو لوگ ان روشوں سے ناواقف ہیں۔ انکو صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے۔ پھر ان کے نزدیک یہ امر لائق تحسین بھی نہیں۔ مگر واقف کار جانتے ہیں کہ بیک وقت و بیک دماغ ہر روش میں درجہ اجتہاد حاصل کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اور اشکال بھی ایسا جو امتناع کے قریب ہے۔

مگر ہمارے نزدیک یہ آصفی کے لئے حقیقی عزت نہین یہ امر بجائے خود کتنا ہی قابل تحسین و ستائش ہو حیرت انگیز نہین دوسرے کا تتبع خصوصیت نہین قرار دیا جا سکتا۔ تقلید ہے۔ ہمین ان کے کلام مین یہ غور کرنا چاہئے۔ کہ خود ان کی اپنی روش کیا ہے؟

جب چشم انصاف سے ان کے قصائد کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کی اپنی روش مذکورہ خصوصیات کی معتدل ترکیب ہے طبی اصطلاح مین، اخلاط اربعہ کی اعتدالی آمیزش کا نام مزاج ہے جب بہت یہ چارون ارکان اپنے مقررہ اعمال و فرائض بصلح و آشتی انجام دیتے رہتے ہین، انسان تندرست رہتا ہے۔ لیکن جہان کوئی ایک اپنے حدود سے متجاوز ہوا۔ کسی مرض کا حملہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی مثال شاعری کی ہے۔ قصائدہ کے اوصاف وہ ہین۔ جو اوپر بیان ہوئے۔ لیکن صرف دو چار باتون کا پایا جانا، قصیدہ کو "تندرست" نہین بنا سکتا۔ اسی طرح یہ حالت، ان اوصاف مین سے کسی ایک کے غلبہ سے بھی پیدا نہین ہو سکتی۔ قصیدہ صرف وہ بہتر یا "تندرست" کہلایا جا سکتا ہے۔ جس مین یہ اوصاف بالاعتدال پائے جائین۔

چونکہ آصفی نے ان تمام اساتذہ کا اتباع کیا ہے۔ جن کے خصوصیات اوپر مذکور ہوئے ہین اسلئے قصائد مین یہ سب اوصاف موجود ہین۔ البتہ سلامتِ طبع کے باعث ان کی ترکیب غیر معتدل نہین ہوئی۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہین۔ کہ آصفی کی روش مزاج ہے۔ قاآنی کی سلاست دروانی، عرفی کی نازک خیالی، اور فیضی کے زورِ کلام اور شکوہ الفاظ کو انہون نے اپنے ہان سمو دیا ہے۔

علامہ نے شعر العجم مین لکھا ہے "عموماً قصیدہ گو شعرا کی غزلین اور غزل نگار شعرا کے قصائد بے مزہ ہوتے ہین" اس کی وجہ ان دونون اصناف کلام کے خصوصیات کا تضاد ہے، مگر آصفی اس کلیہ سے بڑی حد تک مستثنیٰ ہین، تفصیل کا محل نہین مجملاً یہ کہ آصفی کو، میدانِ تغزل مین بھی صحتِ ذوق اور سلاست طبع نے بے راہ روی سے باز رکھا ہے۔ ابتداً بیدل و شوکت ہمدم و انیس رہے۔ اسلئے کلام "آئینہ ہی آئینہ" ہے۔ لیکن آخر مین حافظ، طالب، حزین، اور نظیری سے شغف ہو گیا تھا، اسلئے پچھلا کلام سادہ، پرمعنی، اور چاشنئ زبان سے لبریز ہے۔ طبیعت کی جدت پسندی نے یہان بھی نئی روش پیدا کی ہے۔

"نظیری کا تغزل، حافظ کا جوشِ بیان اور سادگی، طالب کی تخییل اور صائب کا مثالیہ گھل مل کر ایک ہو گئے ہین۔ جس مین حافظ، طالب، اور نظیری کا رنگ غالب ہے"

قصائد مین آصفی کا دعویٰ ہے۔

همنوا گشته ام بخاقانی　　　ذوق آهنگ بر ترا نداز د
پیش از عرفی و حزین رفتم　　　انوری در رهم سر اندازد

همرهِ عرفی و فیضی و حزین و شوکت　　　اندرین مرحله چون برق شتابان رفتم
سعی اندیشه درین عرصه قدم پیش گزاشت　　　گرچه در وادئ هستی پس ایشان رفتم

عادتِ خلق بود مردہ ستائی زقدیم کس نگوید بہ بلاغت رہِ سعبانِ رفتم

غزل مین فرماتے ہین۔

چہ نظیری وچہ غالب، گل ولالہ چیدہ فتند چوتو آصفی ندیدم چمنے طراز کردن

باسنائی وحزین طرحِ سخن افگندیم آصفی خواستہ دل دعوتِ یاران کردن

قصائد

ہم بیان کرچکے ہین کہ فارسی شعر کی ابتدا قصائد سے ہوئی۔ اس لئے سب سے پہلے یہی صنعت پایۂ تکمیل کو پہنچی ابوالشعر رودکی سے پیغمبرِ سخن انوری تک قصائد نے اپنے ابتدائی مدارج ارتقا طے کئے۔ انوری پہلا شاعر ہے، جس نے عمارتِ نظم کی آخری اینٹ رکھ کر، تعمیری کام ختم کیا۔

عربی قصائد کے اجزاء ترکیبی تین تھے۔ تشبیب۔ مخلص اور خاتمہ۔ اسلئے فارسی قصائد کے اجزا بھی یہی قرار پائے۔ جو شاعران تینون کے لوازمات ومحاسن سے خوبی سے عہدہ برآ ہوا وہ کامیاب قصیدہ گومانا گیا۔

لیکن عمارت کی تکمیل، اجزا کے ہیئتِ تالیفی اختیار کرلینے کا نام نہین۔ اس کے لئے ضروری نقوش، اور خط وخال کی آراستگی بھی درکار ہوتی ہے۔ خط وخال کا تعلق، ہر ملک کی آب وہوا، اور ذوقِ حسن کی پسندیدگی کے اختلاف کی بناپر مختلف ہوتا ہے۔ ایران کا مذاقِ حسن، عرب سے بالاتر تھا۔ اسلئے عربی کے برخلاف، فارسی قصائد کے نقش ونگار، رفعتِ تخیل، شکوہِ الفاظ، جدتِ ادا، جوشِ تالیف، اور ندرتِ تشبیہ واستعارہ قرار پائے۔

آصفی نے قصائد مین اجزائے ترکیبی صورت اور خط وخال سب کا لحاظ رکھا ہے، اب ہم قصیدہ کے اجزا کی علیحدہ علیحدہ تحلیل کرکے، آصفی کا پایۂ سخن بتاتے ہین، چونکہ آصفی سے بیشتر، مضامین کی ہر نوعیت ضبطِ تحریر مین آچکی ہے۔ اس لئے سلسلۂ کلام مین اساتذہ سے تقابل لابد ہے۔ ممکن ہے بعض قدامت پرست چین بجبین ہون۔ مگر میرے پاس صرف جواب ہے۔ یعنی۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی! مباش منکرِ غالب، کہ در زمانۂ تست

تشبیب

تشبیب کا عربی مفہوم، معشوقہ سے مخاطبہ، اور جذباتِ عشقیہ کا تذکرہ تھا۔ ابتدا اً فارسی مین بھی معشوق کے حسن وجمال، اور وصل وہجر کی داستان کا نام تشبیب رہا۔ مگر رفتہ رفتہ، بہار وخزان، اخلاق وتصوف شکایتِ دہر، اور مناظرۂ اشیاء وغیرہ بھی تشبیب مین جگہ پانے لگے آصفی نے ان تمام مضامین پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن شاعر کا زورِ طبیعت کا صحیح اندازہ عشقیہ جذبات وواردات کے بیان سے ہوتا ہے۔ اسلئے ہم پہلے اسی کو معرضِ بحث مین لاتے ہین۔

عشقیہ

عشقیہ تشبیب کے مخصوص مضامین یہ ہین۔ عشق کی آمد جذباتِ محبت کی تحریک، معشوقہ کے حسن وجمال کا

تذکرہ، اس کے ایک ایک عضو، اور ایک ایک ناز کی تعریف، بیوفائی کا گلہ، رشک ورقابت وغیرہ

اس صنف میں عرفی سباق الغایات ہے - وہ اس جوش و خروش سے سلطان عشق کی آمد کا تذکرہ کرتا ہے کہ دنیائے قلب میں تہلکہ پڑ جاتا ہے - علامہ شبلی لکھتے ہیں - کہ عرفی حسین بھی تھا - اور حسن پرست بھی - اس لئے اسرارِ عشق کے بیان، اور کنایاتِ الفت کی ادا میں کوئی شاعر اس کا ہمسر نہیں - جن رموز کو اس کا قلم ادا کر جاتا ہے - دوسرون کا خیال بھی وہان تک نہیں پہنچتا -

عرفی کے بعد غالب نے بھی انہیں نقوش پر چلنے کی کوشش کی - مگر آصفی نے جس بلند آہنگی سے یہ نغمہ الاپا ہے، بایدو شاید ---- خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے

صبح چون زلفِ شب برانداز د مرغِ صبح از طرب سرانداز د

تشبیب مین شب کا کوچ، صبح کی آمد، طلوعِ آفتاب، ساقی کی جستجو، اور طلبِ صبوحی کا بیان ہے - آمدِ صبح اور طلوعِ آفتاب کے متعلق فرماتے ہین -

صبح چون زلفِ شب براندازد مرغِ صبح ازطرب سراندازد
گر گسِ شب، غراب وار از حلق بیضۂ آتشین، براندازد
برشگاند صبا مشیمۂ شب طفلِ خونین نجا در اندازد
زخمۂ مطربان، صدائے صبوح درزبان ہائے مزمراند ازد
برقدحہائے آسمان زنار مشتری طیلسان در اندازد

عرفی نے بھی اسی زمین مین قصیدہ لکھا ہے - مگر تشبیب مین تلاشِ عشق، جستجوئے شاہد، آرزوے شراب ور خواہشِ مئی کا بیان ہے - ابتدا عشق اور شراب سے کی ہے لکھتا ہے

عشق کو؟ تا خرد برانداز د غوغہِ شوقے بہ مجمراندازد
درد را در دم بیا لاید عافیت را بہ بستراندازد
مرغِ جان را بردبہ باغِ گلے کہ اگر پر زند، پر اندازد
صیدِ دل را کشد بہ بندِ کسے کہ اگر سر کشد، سر اندازد

آصفی نے عرفی کا تتبع کیا ہے اور انکی تشبیب بھی از سرتا پا عشقیہ ہے، عرفی کو جس عشق کی تلاش تھی - اسمین صرف یہ صفات درکار تھے

(۱) عقل و خرد سے بیگانہ کردے -

(۲) آتشِ شوق سے سینہ مین آگ لگا دے

(۳) دل کو درد سے بھردے
(۴) عافیت و سلامتی کو بیمار ڈالدے
(۵) ایسی بزم میں لیجائے۔ جہان زبان قلم ہوتی ہو۔
(۶) اور ایسے ظالم کے دام مین پھنسا دے۔ جہان سر اُٹھاتے ہی سر قلم ہو جائے۔

مگر آصفی کے خیال مین یہ عشق کی معمولی سطح تھی۔ انھین جس شراب الفت کی تلاش تھی۔ اسے ایسا تیز و تند اور برہم زن عقل و ہوش ہونا چاہئے۔ کہ ساغر مین آتے ہی فتنہ ہائے حشر برپا کردے۔ فرماتے ہین۔

عشق چون مے بساغر اندازد   فتنۂ حشر در سر اندازد

"شراب عشق ساغر دل مین پہنچتے ہی، دماغ کو قیامت خیز فتنون سے درہم، برہم کر دیتی ہے"

جوشِ سودا جحیم افروزد   مغز سر را بآذر اندازد

"جنون کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ ہر ہر گوشۂ دل جہنمی آگ سے بھرجاتا ہے۔ اور بھیجے سے دہکتے ہوئے کوئلہ کی طرح شرارے لگتے ہین"

آتشین نالۂ قیامت کار   شعلہ در چرخ اخضر اندازد

"نالون کی سوزش اور گرمی سے، آسمان جل بھن کر تودۂ خاک ہو جاتا ہے۔ اور دنیا آنیوالے دن کا دھوکہ کھاتی ہے"

بہوائے سوادِ چشم غزال   طرح صحرا ز کشور اندازد

"دل مین آہو نگاہ حسین کی کالی کالی آنکھون کی محبت کروٹ لیکر اٹھتی ہے۔ اور دنیا ویران نظر آتی ہے"

اضطراب رگِ دل بیتاب   رعشہ در برقِ مضطر اندازد

"دل مچلتا ہے۔ اضطراب اور بے چینی چٹکیان لیتے ہین مگر آہ وہ اضطراب جس کو دیکھکر بجلیان کانپ اٹھتی ہین"

دیدہ از خونِ دل زند طوفان   دل ز آہ، طرحِ محشر اندازد

"آنکھون سے خون کا طوفان اُمنڈ پڑتا ہے آہین دلون کو بے چین کئے دیتی ہین۔ اور آہون سے سننے والون کے دل لرز جاتے ہین"

ہوش بہر وداع برخیزد   بیخودی، طرحِ بستر اندازد

"ہوش و حواس رخصت ہو جاتے ہین۔ اور ایک خوش آیند بیخودی آپے سے باہر کر دیتی ہے"

ہر سر شکے کہ از مژہ غلطد   جوش در بحرِ خون در اندازد

"آنسوؤن کی جھڑ یان لگ جاتی ہین۔ اور ہر قطرۂ اشک پر خون جوش مارنے لگتا ہے۔ کاش! ایک ہی آنسو مین سب کا سب نکلجاتا!"

دم طوفانِ چشم وجلہ کشا کشتیٔ چرخ، لنگر اندازد

"اگر مین یہ کہون کہ "میرے نالون کے درد سے آسمانی مخلوق بلبلا اٹھتی ہے" تو کچھ مبالغہ نہین"
معانی پرغور کرو۔ دل خون ہوتا ہے۔ تراکیب دیکھو۔ نالۂ قیامت کار، چشم دجلہ کشا۔ پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے پھر کلام کا زور، معانی کی رقت، اور الفاظ کی برجستگی، عرفی کو شرماتی ہے۔
شاہد وشراب کی تعریف مین عرفی نے زیادہ سے زیادہ جو کہا ہے۔ یہ ہے۔

شاہدے کو کہ یک نفس گوشے بدل درد پرور انداز د
آن کہ از ناز وغمزہ برجانم گہ ستان، گاہ خنجر اندازد
وز متاعِ دفا، بجیبِ دلم نہ اقل ونہ اکثر اندازد
ہر شکستے کہ از دلم خیزد بدو زلفِ معنبر اندازد
آسمان رنگ شیشۂ طلبد کافتابے بساغر اندازد
در شراب افگند دلِ گرمم دوزخے را بکوثر اندازد

مگر آصفی نے جس بلند آہنگی سے ماجرائے عشق اور اندازِ حسن بیان کیا ہے۔ محال نہین۔ تو ممکن بھی نہین کہا جا سکتا فرماتے ہین۔

تا بکے چشم خونفشان ساقی آبِ احمر، بساغر اندازد
چشمِ مخمور را اشارت کن تازے، طرح دیگر اندازد

"ساقی، کب تک خونِ جگر پیتا رہون۔ برائے خدا، اپنی مخمور آنکھ کی مستانہ نگاہ سے میرے ویانے قلب مین انقلاب برپا کردے"

مغزِ افسردہ را دہد گرمی چون سمندر بآذر اندازد

"متواتر ناکامیون نے یا ربالفاظِ دیگر) تیرے بیجا تغافل نے دل کے سارے ولولے مٹا دیئے۔ آج تو اپنے شرابِ عشوہ سے، اس کو از سرِ نو بیقرار کردے"

آبلہ پائیم بہ منزلِ عشق خار در راہِ رہبر اندازد

"میری بیقراری ناکام سعی مین، روح پھونکدے۔ اور مین ایسے مست ذوق قدمون سے تیری مہربانی کی تلاش کردن۔ کہ راہ بر بھی تھک کر بیٹھ جائے"

دلِ دوزخ شرارۂ دارم کہ بکونین آور اندازد

"دل مین محبت کی آگ بھڑک اٹھے اور ساری تمناؤن اور آرزوؤن کو جلا کر خاک کردے۔ صرف تیری یاد ہو۔

اور دل ہو"

گرمیٔ نالۂ شب آہنگم شور در مغزِ محشر اندازد

"رات کی تاریکیون مین، میرے پرسوز نالے، اُسننے والون کے دلون کو پانی پانی کردین۔ اور وہ اپنے دماغون مین محشر نما انقلاب محسوس کرنے لگین،"

ہر نفس صبر رخت بر بندد در جگر نالہ بستر اندازد

"منٹ منٹ بھر مین صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اور لمحے لمحے مین جگر سے نالے نکلین"

آہِ گرمم، چنان بسر گرمیست کہ شرر پا بہ کوثر اندازد

میری گرم آہین، اس قدر سامانِ سوزش رکھتی ہین کہ اگر کوثر کو ایک بپٹ بھی لگ جائے۔ تو ساری ٹھر شعلہ بنکر اُڑ جائے۔ بالفاظِ دیگر میری دل کی لگی کو کوئی لذت، کوئی ذوق، اور کوئی سعی نہین بجھا سکتی۔ گو وہ آسمانی اثرات ہی کیون نرکھتی ہو"

در جہان خوار گشتہ ام از عشق وائے گر چشمِ دلبر اندازد!

"ظالم یہ تو سوچ۔ کہ صرف تیری محبت کے باعث، اسقدر رسوا ہوا ہون۔ اور پھر اپنی بے مروتی سے آنکھ پھیرے لیتا ہے۔ افسوس میرے حال پر، اگر مین ترے دل مین جگہ نپا سکون،"

عرفی کا دلبر، ناز و غمزہ سے خنجر و سنان کا کام لیتا تھا۔ اور متاعِ دفا کا سخت دشمن تھا۔ مگر آسعی کا دلبر، وہ تھا کہ

کافرین غمزہ اش بکشور دین انقلابے چو کافر اندازد

"جسکا غمزہ دشمنِ ایمان ہے۔ اور جس کی مست نگاہون کے سامنے سارا زہد و تقویٰ کافور ہو جاتا ہے۔ ادھر اس نے ترچھی نظر سے دیکھا۔ اور ادھر خشک فلسفہ پر بجلی گری"

نازِ او، چون شکستِ دل خواہد چین بزلفِ معنبر اندازد

"اُس کی عنبر جیسی کالی، اور خوشبودار زلف کی شکن پر دل لوٹ ہو جاتا ہے۔ جہان اسے چھیڑنا مقصود ہوا۔ زلفون کو شکن در شکن بنا کر عاشق کے دل کو بیقرار کر دیا"

فتنہ ہائے نگاہِ بیمارش ناتوانم بہ بستر اندازد

"جس کی بیمار نگاہین اسقدر فتنہ گر ہین۔ کہ اپنی خوش ادائی سے، عاشق کو امید و یاس کے پنجہ سے چھڑاتی بھی ہین۔ اور پھر پھانسی بھی دیتی ہین

بادِ سودائے زلفِ او بسرم طرحِ آشوبِ محشر اندازد

"جسکی زلفون کی محبت نے میرے سر کو میدانِ محشر بنا دیا ہے۔ دن رات یاد کرتا ہون۔ اور پریشان ہوتا ہون"

بہ تبسم ز تابش پروین   شعلہ در ہفت اختر اندازد

"جب وہ مسکراتا ہے، تو اس کے دانتوں کی چمک پر آسمان کے ستاروں کو رشک آتا ہے"

قامتش سرو را ز رعنائی   در گلستان ز پا در اندازد

"جو اس قدر موزوں قامت ہے۔ کہ سرو باوجود ہمہ موزوں قامتی، اسکے سامنے باغ مین کھڑا نہین ہوسکتا"

یہ بھی پروردۂ عشق، عرفی کی کائناتِ تخیل جس پر آج تک لوگ سر دھنتے ہین، ایک شخص دوسرے کو زبان سے اجنبی ہونے کا طعنہ دیسکتا ہے۔ پست تخیل نہین کہہ سکتا۔ عرفی اہل زبان تھا مسلم لیکن تخیل فارسی کا پابند نہین۔ وہ عشق پیشہ تھا۔ درست۔ مگر عشق پر کسی کا زور نہین۔ اوسکا معشوق قیامت تھا صحیح لیکن حسن کی کائنات ختم نہین ہوئی ہے۔ آصفی اہلِ زبان نہ تھے۔ مگر زباندان تھے پھر مبتلائے عشق دل اور ایسا معشوق پایا تھا جس کا مثل وہ عین ما رأت و لا اذن سمعت و ما خطر علی قلب بشر۔ تخیل بلند تھا جو کچھ کہا ہے۔ اس حسن و خوبی سے کہا ہے۔ کہ عش عش کرنا پڑتا ہے۔ تراکیب کا زور، الفاظ کی برجستگی، معانی کی بلندی، اور جذبات کی رقت کیا ہے۔ جو انکے ہان نہین

(۲) انوری کا مدحیہ قصیدہ ہے "خنجر آفتاب" اور "اخگر آفتاب کی" زمین مین ہے۔ تشبیب عشقیہ ہے لیکن متعلقاتِ عشق مین سے صرف معشوق کی مدح سرائی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس قافیہ اور ردیف کے لئے تشبیہ واستعارہ لازم ہے۔ استعارہ کی خوبی یہ ہے۔ کہ نازک اور قریب الفہم ہو۔ اسلئے وہی شعر کامیاب کہلاتا ہے۔ جس مین استعارہ نازک، سہل، اور تشبیہ لطیف ہو۔

انوری متقدمین مین سے ہے۔ اسلئے اس کے ہان استعارات کی نزاکت اور تخیل کے نقش و نگار مفقود ہین مگر آصفی نے اس زمین مین، استعارات کے رنگا رنگ گل کھلائے ہین۔ انوری کا پورا قصیدہ ۴۹ شعر کا ہے۔ آصفی کی تشبیب مین ۳۴ شعر ہین۔ ہم پہلے انوری کی تشبیب کے اشعار لکھتے ہین۔ پڑھو۔ اور غور سے پڑھو۔ انوری کو صرف تقدم کا شرف ہے۔ ورنہ آصفی، آصفی ہے۔

انوری

اے از کمالِ حسنِ تو، چیزوے در آفتاب   خطت کشیدہ دائرۂ شب بر آفتاب

زلفِ چو مشکنابِ ترا بندہ مشکِ ناب   روئے چو آفتابِ ترا چاکر آفتاب

آنجا کہ زلفِ تست ہمہ یکسرہ شب است   وانجا کہ روئے تست ہمہ یکسر آفتاب

باغیست عارضِ تو کہ دارد ستارہ برگ   سرویست قامتِ تو، کہ دارد بر آفتاب

بر ماہ مشک داری و بر سرو گلستان   در لالہ نوش داری و در عنبر آفتاب

گر حور آفتاب نہم نامِ تو رواست   کاندر کنار حوری واندر بر آفتاب

از چہرہ آفتابی و از بوسہ شکری   پس لایق است یا شکرت ہمسر آفتاب

انگیختہ است حسنِ تو گل با مہِ تمام وامیختہ است لعل تو باشکرِ آفتاب

انوری خدائے قصائد ہے۔ اپنی سادہ روش مین، کس خوبی سے حسن کی صفت و ثنا کرتا ہے۔ اشعار نمبر ۲-۳-۴- سادگیٔ ادا کا بہترین نمونہ ہین۔ مگر آصفی فغانیہ اسکول سے تعلق رکھتے ہین۔ انوری کی ہمنوائی اختیار کی۔ لیکن فکر پست نہین ہوسکتی۔ سادہ تخیل مین بلندیٔ فکر کی رنگ آمیزی ہے اور بے حد لطیف ہے۔ دنیائے شعر "آفتابی" نظر آتی ہے فرماتے ہین۔

اے یک رخ تو ماہ و رخِ دیگر آفتاب ہم چہرۂ تو مہ نشود، ہمسر آفتاب

"چاند، سورج، تیرے پیارے پیارے رخساروں کی ہمسری نہین کرسکتے۔ تیرا ایک رخسارہ چاند، اور دوسرا سورج ہے۔ پھر وہ دونوں فرداً، فرداً۔ سورج ایک مجمع حسن وجمال کے مقابل ہو سکتے ہین"

از زلفِ مشک سائی تو یک نفحہ مشکِ ناب و ز سنبلِ سیاہ تو، یک اخگر آفتاب

"خالص مشک، تیری کالی کالی خوشبودار زلف کی ایک لپٹ ہے اور سورج تیرے سیاہ کاکل کا ایک شرارہ"

در طرہ حلقہ داری، در حلقہ مہر و ماہ در مہ ہلال داری، در پردین در آفتاب

"تیرے طرہ مین حلقے، اور حلقوں مین چاند سورج نظر آتے ہین۔ تیرے چاند سے مکھڑے مین، خمدار ابروؤں کے ہلال، اور آفتابی چہرہ مین ستارے جگمگا رہے ہین"

از خطِ تیرہ نوش، لب تو بہ مشکِ ناب و ز سنبلِ سیاہ تو، در عنبر آفتاب

بر روئے آتشینِ تو خالِ سیاہ نیست دودِ دلِ شب ست کہ پیچید بر آفتاب

یہ اشعار سادہ قدیم تخیل کا نمونہ ہین۔ انوری کے اشعار سے مقابلہ کرو۔ کسقدر مشابہت ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی متقدم شاعر انوری کا ہمنوا ہے۔ لیکن یہان سے فغانیہ رنگینی شروع ہوتی ہے۔

گر سایہ افگند، مہِ زلفِ تو، بر سپہر گردد کبود چہرہ، چو نیلوفر، آفتاب

"اگر کہین تیرے سیاہ کاکلوں کا سایہ آسمان پر پڑجائے، تو، سورج کا چہرہ نیلوفر کے پھولوں کی طرح نیلا ہو جائے"

چون میکشانِ مستِ شبینہ، دمِ سحر بر طاقِ ابروے تو کشد ساغر آفتاب

سبحان اللہ:- حسنِ تعلیل کا خاتمہ کر دیا۔ صبح کو سورج نکلتا ہے تو مست شرابی کی طرح آہستہ آہستہ ابھرتا ہے۔ چہرہ سرخ، شعاعوں کے سہارے آسمانی میدان مین گامزن۔ شاعر دیکھتا ہے۔ اور مستِ مئے حسن خیال کرتا ہے "جب آفتاب افق سے سر نکالتا ہے۔ تو خمار شکنی کے لئے، رات بھر کے مدہوش مئے نوش کی طرح دو چار جام تیری شرابی آنکھوں کی یاد مین ضرور پی لیتا ہے ورنہ یہ چمک دمک، اور یہ حسن کی گرمی نہین آسکتی"

گردد لبسانِ دیدۂ شبنم، نگاہِ او بیند بآفتاب رخ تو، اگر آفتاب

”تیرا حسن نظر سوز ہے۔ چنانچہ تیرے آفتابی چہرہ پر سورج کی نگاہ بھی نہین ٹھہر سکتی۔ پہلی نظر اوس کے قطرہ کی مانند تھر تھرا اٹھتی ہے“

گر افگنی نقاب جمال جہان فروز گردد نہان بہ پیشِ تو چون شبپر آفتاب

”یہ شعر تقریباً گذشتہ شعر کا ہم معنی ہے۔ یہان آفتاب کو چمگادر، اور معشوقہ کے حسن کو آفتاب قرار دیا ہے“

دارد سحر، زقطرۂ شبنم بباغ دہر از اشتیاقِ روے تو چشم تر آفتاب

”یہ شعر بھی حسنِ تعلیل پر مبنی ہے۔ شاعر، باغ مین پھولون پر اوس کے قطرے دیکھتا ہے۔ علی الصباح، پانی کے قطرے، پتون پر کہان سے آسکتے ہین۔ یہ تو بالکل آنسو سے نظر آتے ہین! شاعر فوراً تاڑ جاتا ہے۔ کہ ہو، نہو سورج اسکے حسن و جمال پر فریفتہ ہوگیا ہے۔ اسلئے اشتیاق مین گریہ وزاری کیا کرتا ہے یہ اس کی آنسوون سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھین ہین۔ اوس کے قطرون کو سورج کی آنکھ قرار دینے مین، اشتیاقِ دید کا ایک عالم نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اللہ۔ اللہ۔ لاکھون آنکھین ہین۔ اور پھر بھی دیدار سے محروم ہے“

از اضطراب جلوہ، ہند دست پیش چشم بر حسنِ تو نگاہ کشاید گر آفتاب

حیرت نظر شود، چو حبابِ شراب ناب بیند دمے کہ عکسِ تو در ساغر آفتاب

دونون شعر ہم معنی ہین مطلب یہ ہے۔ کہ سورج بھی تیری تجلیٔ حسن کی تاب نہین لاسکتا۔ گر دوسرا قیامت ہے۔ ساغر شراب مین معشوق کا حسن عکس فگن ہے۔ عکس وہ چمک دمک کھو بیٹھتا ہے۔ جو اصل مین ہوتی ہے۔ لیکن یہان یہ عالم ہے۔ کہ عکس پر نظر پڑتے ہی، حیرت طاری ہوجاتی ہے“ آفتاب کی تمثیل، حبابِ شراب ناب سے بیحد خوب ہے“

گاہے بود، ز برگِ بنفشہ، کلت بشک گاہے بود ز قیرِ تو، در عنبر آفتاب

شاید خیالِ روئے تو آید بخواب او پہلو نہد بہ شب، بہ سر بستر آفتاب

”حسنِ تعلیل کی یہ تیسری نادر مثال ہے۔ غروبِ آفتاب کی علت کیا ہے۔ علمائے ہیئت کا خیال ہے۔ کہ زمین کی گردش، سورج کو ہماری آنکھون کے سامنے سے ہٹا دیتی ہے۔ یہ خشک دماغ فلسفہ ہے۔ شاعر کی لطافتِ خیال یہ بار نہین اٹھا سکتی۔ اوس کے نزدیک علت کچھ اور ہی ہے۔ یعنی

روزانہ رات کو، سورج صرف اسلئے بستر پر جالیٹتا ہے۔ کہ شاید خواب ہی مین تیرے خیال کا دیدار ہوجائے“ نزاکت حسن کی حد ہوگئی۔ ”خیال رو“۔ ”بخواب“ اور پھر ”شاید“ کی لطافتِ مفہوم کو دیکھو بے نظیر جدتِ ادا ہے۔

از حیرتِ خیالِ تو، ہم رنگِ آئینہ در شش جہت مدام بود ششدر آفتاب

”تیرا خیال اس درجہ حیرت فزا ہے۔ کہ آئینہ کی طرح سورج بھی چارون طرف ٹکڑے مارتا پھرتا ہے“

(۳) - انوری نے ایک قصیدہ مین ”مرجان آمدہ ست“ اور ”نمکدان آمدہ است“ زمین اختیار کی ہے۔

تشبیب عشقیہ سے لکھتا ہے

سید نان را روئے تو آئینہ جان آمدہ ست
وز لب و دندانِ تو لولو و مرجان آمدہ ست

چون نسیم زلفِ تو بو بید [illegible] از فرح
مژدہ اے کیبان [illegible] مژدۂ جان آمدہ ست

گرچہ خوانِ حسن روئے تست بھر [illegible]
زان لب شکر فشان برقی نمکدان آمدہ ست

از گلِ رخسار تو اے خارِ عشقت سینہ را
خار خارے در دل گلہائے بستان آمدہ ست

روئے تو ماہ ست و دل از مہر تاکِ کوئے تو
ہمچو عکس مہر و مہ در آب لرزان آمدہ ست

خونِ دل بر خاک مے افشانم از دو دیدہ چشم
تا [illegible] آن چاہ زنخدان آمدہ ست

کلبۂ دل بیتِ معمور فلک را طعنہ زد
تا خیالت اندر ان ویرانہ مہمان آمدہ ست

آصفی نے بھی اس زمین میں نعتیہ قصیدہ لکھا ہے چونکہ نعت میں [illegible] ہوتی ہے۔ جو مسلمانوں کے عقیدہ کے موافق "بعد از خدا بزرگ" ہے۔ اسلئے کلام مین خود بخود زور پیدا ہو جاتا ہے اس قصیدہ کی تشبیب بھی عشقیہ ہے۔ چند شعر لکھے جاتے ہیں۔ شوکتِ الفاظ، رفعتِ تخیل، حسنِ بندش اور جدت ادا کا کمال نمونہ ہیں، فرماتے ہیں۔

نوشِ لعل جان فزایش آبِ حیوان آمدہ ست
در کنارِ دل [illegible] بند و نقشِ عالمِ جان آمدہ ست

کہنا یہ تھا کہ معشوق کے منہ سے جو بات نکلتی ہے۔ دل مین گھر کر لیتی ہے۔ طرزِ ادا کی جدت دیکھئے کہ اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ یعنی "[illegible]" ہو نہو۔ اُس کے جان فزا لب چشمۂ حیوان اور اس کی باتین آبِ حیات ہین۔ جس کا قطرہ قطرہ، دنیائے عشق کے لئے زندگی، اور روحوں کے لئے تازگی ہے۔ ورنہ "عالمِ جان" اور دنیائے کیفیات اس کے ذوق مین [illegible] دل مین سمٹ کر نہ آجاتی۔

نرگسِ مستش مگر مے زد ز خونِ آفتاب
مو بمو مژگان نش رنگِ لعلِ بدخشان آمدہ ست

آنکھ کی خوبصورتی صرف یہی نہین ہے کہ بڑی اور ابھری ہو، اس کے ساتھ چمک دمک بھی ہونا چاہئے۔ ورنہ "بیاہ کے دیدوں" کی پھبتی راست آتی ہے۔ دنیا مین جسقدر چمکدار چیزیں موجود ہین۔ ان مین روشن تر آفتاب ہے۔ شاعر کو معشوق کی آنکھ کی چمک کی تمثیل اس سے زیادہ مکمل اور موزون کہان مل سکتی ہے۔ اسلئے وہ فوراً کہہ اُٹھتا ہے۔ کہ اسکی آنکھ سورج کی طرح چمکدار ہے۔ لیکن یہ ایک سیدھی سادی بات ہے۔ اور پھر بلا دلیل یقین کون کرے گا۔ اسلئے اسکو مدلل بیان مین ادا کرتا ہے۔ یعنی "اس کے پلک لعلِ بدخشان کی طرح دمک رہے ہین۔ غالباً مست و سرشار نرگسی آنکھوں نے سورج کے خون کی شراب پی ہے۔ ورنہ اسقدر چمک دمک، اور آب و تاب، خاکی مخلوق مین پیدا نہین ہو سکتی"۔

یہ شعر جدت، اور حسن تعلیل مین بے نظیر ہے "نرگس مست" ہی کیا کم صفت تھی۔ کہ اسپر "خونِ آفتاب" کی مے سے مستی اور سرشاری کا طوفان برپا کر دیا۔ پھر بظاہر اسے مست کہا لیکن بباطن "آبدار" بھی کہدیا۔ سبحان اللہ!

اس کے علاوہ ایک لطیف پہلو بھی ہے۔ کہ "مے خونِ آفتاب" چشمِ فتنہ خیز کی ہمہ گیری پر مہر ہے جب اسکی نگاہِ ناز کی عالمگیری کا یہ عالم ہے۔ کہ آفتاب بھی، بااین ہمہ آب وتاب، اور شکوہ حسن وجمال اس کی دستبرد سے محفوظ نہین رہا۔ توپھر اور کون تاب لاسکتا ہے

از ہوائے زلفِ مشکینش نفس خواید مشک   وز خیالِ روئے او، در دل گلستان آمدہ ست

" اسکی مشکین زلفون کی چاہت، انسان کی سانس کو مشک کے خوشبو دار بہ دون مین سلاتی ہے۔ اور چہرہ کا تصور دل کو چمن بنا دیتا ہے"

رنگ رخسارش چمن را غوطہ در خون میدہد   تیغ حسنِ او، بخون ریزِ بہاران آمدہ ست

کہنا یہ تھا۔ کہ اسکا چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہے۔ یا گلاب کے پھول کی طرح روشن ہے۔ اس کو اس طور سے ادا کرتے ہین

" چمن مین سرخ سرخ پھولون کی چادر بچھی ہے دراصل یہ خون کی چادر ہے .... اسلئے کہ اسکے رخسارون کے رنگ نے، حسن کی تلوار سے، طفلانِ بہار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے یہ اُن کا خون ہے۔ جس مین چمن ڈوبا نظر آتا ہے"

تا چہ بیداد تطاول کاکلِ او، در چمن   سنبل از آشوبِ او برخویش لرزان آمدہ ست

شور لذت بوشد از ہر پارۂ زخمِ جگر   از شکر خندش در آغوشش نمکدان آمدہ ست

کہنا یہ ہے۔ کہ اس کی ہنسی سے ہماری مردہ تمناؤن مین جان آجاتی ہے۔ مگر اس کو ادا کرنے کے لئے کیسا موثر طرز ادا اختیار کرتے ہین۔ فرماتے ہین:- " اس کے خندہ سے ہمارے زخمی جگر کو نمک پاشی کا لطف آتا ہے۔ جب وہ ہنستا ہے۔ جگر کا ہر ہر زخم چلا اُٹھتا ہے۔ کہ ہان تھوڑا سا اور سے عمرت دراز باد کہ من تشنہ ام ہنوز"

نالۂ حسرت در آغوشِ دلم گردید خون   تاکہ درد جان گسل از عشق درمان آمدہ ست

" عشق کا علاج یہ ہے۔ کہ درد حد سے گزر کر جان فرسا ہو جائے۔ اسلئے مین نے اپنے پُرحسرت نالون کو گھوٹ گھوٹ کر دل میں فنا کر دیا" یعنی عشق ومحبت کی بے چینیون مین تسکین صرف اس سے ہوتی ہے کہ انسان آہ وزاری کرلے اور دلکا بوجھ ہلکا ہو جائے لیکن میرا دردِ الفت عام حالت سے برتر ہے۔ اسکا علاج یہ ہے۔ کہ اپنی تمناؤں پر مہربانی پھیر کر، عالم سے بیخبر ہو جاؤن اور بوالہوسوں کے خلاف حسرت ویاس کی بندشوں سے آزاد رہون۔

ایک دلم در حلقۂ زلفش نشد وحشت فروش   از فشارش یک جہان دل پریشان آمدہ ست

" زلف شعرا کے خیال مین "پریشانی اثر" ہے۔ مضمون عام ہے اور تقریباً ہر شاعر نے مختلف صورتون سے باندھا ہے۔ آصفی نے بھی لکھا۔ مگر "وحشت فروش" اور "یک جہانِ دل" کی پاکیزہ ترکیبون سے نزاکت کو دوبالا کردیا۔ "صرف شاعر ہی کا دل وحشئ زلف نہین ہے۔ اسکی زلف کی وحشت اسقدر بڑھی ہے کہ سارا جہانِ دل اسکے

اثر سے پریشان ہے"

صد جنون شوخی، از نقش پا سیاہی می کند   گردِ راہش، سرمۂ چشمِ غزالان آمدہ است

"سیاہی کردن" کے معنی نمودار ہونا۔ یا ظاہر ہونا۔ ہین۔ شعرا نقش پا کو شرخ لکھتے ہین۔ آصفی نے "صد جنون شوخی" کہکر مضمون کو فلک پر کر دیا۔ معشوق کی شوخی شنگی کا یہ عالم ہے۔ کہ صرف اس کے قدمون کے سرخ نشان دیکھکر دنیا دیوانی ہو رہی ہے۔ اور ہرن کی آنکھین اسکی راستہ کی خاک بجائے سرمہ کے استعمال کرتی ہین۔ اسی لئے اسقدر جہ سرخ اور سیاہ ہین۔

دوسرا مصرع "سیاہی" سے پیدا کیا ہے۔ بعض مرتبہ اشارات دماغ کو کہین سے کہین پہنچا دیتے ہین۔ شاعر کہہ رہا تھا۔ صد جنون شوخی و نقش پا سیاہی میکند۔ کہ یکایک شوخی نقش پا اور سیاہی نے، ہرن کی سرمہ آلود آنکھ کی طرف خیال منتقل کر دیا۔ عاشق کے نزدیک تمام دنیا معشوق کی ممنون ہے۔ یہان فوراً اسکی تاویل کر لی۔ اور دلکی تسکین ہو گئی۔

(۴) غالباً سب سے پہلے منوچہرے نے عشقیہ تشبیب مین چاند کا ذکر کیا تھا۔ مگر منظر عام اور دلفریب تھا۔ اور منچلونکو کیسے قرار آتا متعدد شعرا نے یہ مضمون لکھا اور خوب لکھا۔ آصفی کی باری آئی تو انھون نے بھی ایک تشبیب مین ماہتاب اور اسکی تشبیہات بیان کین۔ تشبیہ کی خوبی، ندرت اور قریب الفہم ہونا ہے، آصفی نے جسقدر تشبیہات اختراع کی ہین۔ نزاکت ندرت اور قرب فہم سے ہم آغوش ہین۔ رہی روشِ بیان کر دلکشی تو وہ مستزاد ہے۔

"چاند افقِ مغرب پر نمودار ہوتا ہے۔ لوگون کی نگاہین دیکھکر متحیر ہو جاتی ہین۔ کسقدر حسین، کیسا دلکش، اور کتنا جاذب نظر ہے۔ روشن، خم، شان، اور ادا کی یکتائی بغیر مشابہات اور نظائر کے سمجھ مین نہین آسکتی۔ دیکھنے والے امثلہ تلاش کرتے ہین۔ "دستبنۂ لیلی شام"، "طوقِ زرین" وغیرہ مثالین چاند کے اوصاف کو نمایان کرتی ہین یہ جنکو آصفی یون ادا کرتے ہین

ماہِ نو بنمود در رخ چون از زمرد گون نقاب   چشمِ مردم او فتاد از پرتوش در ارتیاب

ہر کہ دیدش گفت "باشد غبغب سیمینِ ماہ   یوسفِ زرین رسن را افگند در چاہِ آب

پہلی تاریخ کا چاند دیکھکر شبہ مین پڑ گئے۔ کہ یہ کیا ہے؟ جس نے دیکھا۔ وہ یہ سمجھا۔ کہ (۱) یہ چاند کی ٹھوری کا ٹکڑا ہے (۲) یا حسین یوسف نے کنوین سے پانی بھرنے کے لئے چمکدار رسی کنوین مین ڈالی ہے

یا کہ باشد، نیمۂ دستینۂ لیلیٔ شام   یا کہ زرین طوق افتاد از گلوئی ماہتاب

(۳) یا ملکۂ شام کے دستانہ کا آدھا ٹکڑا ہے (۴) یا چاند کے گلے سے سونے کا طوق گر پڑا ہے۔

یا ز بحرِ اخضرِ گردون، بہنگام شنا   ماہی زرین بر آوردہ سرے از زیر آب

(۵) یا یہ سونے کی مچھلی ہے جو آسمان کے نیلے سمندر مین تیر رہی تھی۔ یکایک پانی کی چادر سے باہر نکل آئی ہے۔

(۶) مشہور ہے۔ کہ سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ مین ایک انگوٹھی پڑی رہتی تھی تمام جن و انس اس کے باعث

سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان تھے ایکبار کسی دیو نے حیلہ سے انگوٹھی اڑالی اس کے اثر سے بھیس بدلکر خود سلیمانؑ کی جگہ تخت پر متمکن ہو گیا اور حضرت آوارہ و سرگردان پھرنے لگے مگر آپ کی بیبی نے مخصوص خصائل نپا کر اس دیو کی شخصیت مین شبہ کیا۔ اور معاملہ کی تہ تک پہنچ کر کسی صورت سے اسے دفع کیا۔ انگوٹھی سلیمان علیہ السلام کو مل گئی، اور آپ پھر بادشاہ ہو گئے۔ آصفی نے چاند دیکھا۔ کالے کالے دیو جیسے آسمان مین نمودار ہوا ہے۔ لہذا فوراً اس قصہ کا خیال آ گیا۔ فرماتے ہین۔

یا کہ عفریتِ فلک دارد بکف انگشتری		کز طرازِ آن سلیمانؑ داشتے صد فر و تاب

یا بہ چرخِ لاجوردی، شام گاہان اوفتاد		نیمہ از عکسِ مرآتِ سکندر بے حجاب

(۷) یا شام کے وقت، سکندر نے غلاف سے اپنا آئینہ نکالا تھا اسکے عکس کا کچھ حصہ آسمان پر پڑ گیا۔ اور دنیا سمجھی کہ چاند ہے۔

یا بزر بگرفتہ بالِ خویش را ورقائے شام		یا پرِ عنقائے مغرب، بردمیدہ از غراب

(۸) شام کے وقت نہ دن کا سا اجالا ہوتا ہے۔ اور نہ رات کی سی تاریکی۔ یہ وقت روشنی اور ظلمت کا سنگھم ہے۔ اس لئے آصفی اسے جنگلی کبوتر سے تشبیہ دیتے ہین۔ جو ہلکا سبز سا ہوتا ہے۔ فرماتے ہین۔ یہ چاند نہین ہے۔ شام نامی کبوتر کا پر ہے جسپر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا ہے۔

(۹) یا عنقائے مغرب کا پر کوے (شب یا شام) کے نکل آیا ہے

یا فتاد از بازوئے سیمرغِ سبزِ آسمان		شہپرِ یاقوت رنگے در فضائے مشک ناب

(۱۰) جھٹپٹے کے وقت فضا تاریک ہو جاتی ہے شاعر اسکو مشک کی فضا کہتا ہے۔ اسلئے کہ مشک کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اسوقت آسمان کا رنگ بھی نیلا سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مشک کی خوشبو دل کو بھاتی ہے شام کا سماں بھی خوش آیند ہوتا ہے نور و ظلمت دن بھر کی جدائی کے بعد ہم آغوش ہوتے ہین۔ اس سے روح کو ایک قابل تحلیل کیف حاصل ہوتا ہے، پرندون کا رنگ عموماً گہرا سبز ہوتا ہے۔ اس لئے نگاہ کو آسمان پر عظیم الشان پرند سیمرغ کا دھوکا ہوتا ہے چنانچہ لوگ چاند کو دیکھکر یہ خیال کرتے ہین کہ سیمرغ آسمان کے بازو سے ایک یاقوت جیسا سرخ پر ٹوٹ کر اس مشک جیسی فضا مین گر پڑا ہے

یا کمانِ زالِ زر را، کرد پر کش روزگار		بہرِ صید نسرِ عشرت، شد خدنگ آن شہاب

(۱۱) یا یہ زال زر کی کمان ہے جسے زمانہ نے اسلئے چڑھا یا ہے کہ شہاب کے تیر سے عیش و عشرت کو شکار کرے۔ رات کا وقت عیش کا اصلی وقت ہے۔ شاعر کے خیال مین زمانہ نے چاند کی خمیدہ کمان سے مار کر دنیا والونکے لئے ہیا کیا ہے چاند کو کمان، شہاب کو اسکا تیر، اور عیش و عشرت کو شکار، اور زمانہ کو شکاری یا کماندار کہکر آصفی نے ایک تصویر کھینچ دی ہے جس کا ایک ایک خط واقعیت سے دست و گریبان ہے۔

یا فتادہ از رکاب توسنِ ادہمیہ		شاہِ خاور را نہ چون در عرصۂ گردون شتاب

(۱۲) - یا آفتاب آسمان کے وسیع میدان مین گھوڑا دوڑاتا جا رہا تھا - یہ اسکی رکاب کا ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا -

یا کہ نعلے بست اشہب مرزبان باختر　　در سم خنگ شموس آسمان از زر ناب

(۱۳) مرزبان بفتح میم - زمیندار - مالک - بادشاہ - باختر مشرق یا مغرب، شموس بفتح شین - سرکش، بدخو، منہ زور -
یا یہ سونے کا نعل ہے - جو شاہ مشرق نے آسمان نامی سرکش گھوڑے کے پیر مین لگایا ہے -

یا بود یک تیغ سیمین در کف زنگی شام　　سرخ چہرہ گشت از خونخواری رنج وعذاب

(۱۴) یا یہ چاندی کی تلوار ہے - جو زنگی کے ہاتھ مین علم ہے شام کے وقت شفق پھولتی ہے - اور دنیا خون کا دریا نظر آتی ہے - اس کو آصفی نے اس زنگی شام کے چہرہ کی سرخی قرار دیا ہے - جو مصائب و تکالیف کی خون خواری پر غصہ مین لال ہے - سچ ہے دن بھر درد دکھ جھیل کر شام کے وقت انسان ذرا دم لیتا ہے - تو مصیبت پر غور کر کے غصہ مین پیچ تاب کھاتا ہے -

یا کہ باشد "خنجر الماس گون روز نگار"　　کز دل گردون کشاید خون چندین انقلاب

(۱۵) "یا یہ ہیرے جیسا روشن خنجر ہے - جو آسمان کے دل سے انقلابون کا خون نکالتا ہے" - "الماس گون" صفت خنجر کے کام مین خوفناک اضافہ کرتی ہے اس لئے کہ ہیرہ کی کنی زہر قاتل ہے - پھر انقلاب کا باعث اچاند کو قرار دیا ہے یہ بھی کس قدر لطیف تعلیل ہے - قمری سال و ماہ کا حساب اور تغیر و تبدل چاند سے ہوتا ہے چونکہ شب و روز کی آمد و رفت کا نام انقلاب ہے - اور دنیا کے تمام حوادثات اسی کا نتیجہ ہے - اس لئے چاند کو خنجر کہنا بجا تشبیہ ہے

یا کہ باشد "رشتہ شمع شب عشرت نوید"　　کز فروغش، نور دریا بد دل ہر شیخ و شاب

(۱۶) یا یہ اس شمع کا ڈورا ہے - جو خوشی کا پیام لاتی ہے - نوجوان ہو یا بوڑھا - خوشی مین پھولا نہین سماتا -

یا کہ زرین جام جمشید، از خم چرخ کبود　　ساقئ دوران برون می آرد از ذوق شراب

(۱۷) یا یہ جمشید کا زرین پیالہ ہے - جسے ساقئ دوران نے اس نیلے شراب کے مٹکے سے بھر کر پینے کے لئے نکالا ہے

یا بود شاخ غزال مرتع خضرائے چرخ　　شعلہ ور از آتش رنگ شفق شد چون شہاب

(۱۸) یا آسمان کے سبزہ زار مین کوئی ہرن چر رہا ہے یہ اس کا سینگ ہے - جس مین شفق سے آگ لگ گئی ہے - اور شہاب کی طرح بھڑک اٹھا ہے - ہرن کے سینگ کو فارسی مین شاخ کہتے ہین - شاخ درخت کی بھی ہوتی ہے - لکڑی مین یہ مادہ ذاتی ہے - کہ آگ مین ڈالدی جائے تو جل اٹھے - آسمان پر شفق پھولی ہے - تو آگ سی لگی معلوم ہوتی ہے - تخیل کی نزاکت نے رنگ شفق سے شاخ غزال کو شعلہ ور بنا دیا سبحان اللہ!

یا بود چوگان سیمین شہ بہرام چرخ　　گوئے زرین را زدہ از عرصۂ گردون آب

(۱۹) جسوقت چاند نکلتا ہے، سورج چھپ جاتا ہے - سورج کی شکل گیند کی سی - اور چاند بلے کی طرح خمدار ہوتا ہے - فرماتے ہین -

یا یہ بہرام شاہ چرخ کا چاندی کا بلا ہے۔ جس سے اس نے سونے کے گنبد (سورج) کو آسمان کے میدان سے پانی میں پھینک دیا ہے۔

یا کلیدِ قفلِ بابِ آرزوئے صائم ست   ابروش دارد اشارت بر فلک از فتحِ باب

(۲۰) یا یہ روزہ دار کی آرزو کے دروازہ کے قفل کی کنجی ہے جو آسمان سے اشارون مین کہتی ہے۔ کہ ہان اب دروازہ کھولدے۔"!

قصیدہ عید کی تہنیت مین لکھا گیا تھا جس پر ہزارہا قصائد اور قطع لکھے گئے ہین۔ فارسی تو فارسی، اردو مین بھی ہر شاعر نے خامہ فرسائی کی ہے۔ سال مین ایک مرتبہ عید الفطر ضرور آتی ہے۔ مداح کے لئے اس سے موزون تر موقع کہان سے میسر آسکتا ہے۔ غالب نے بھی بہادر شاہ کی تعریف مین تہنیت عید پر ایک مختصر سا قصیدہ لکھا ہے۔ قصیدہ اردو مین بے نظیر ہے۔ نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ تشبیہات کی رنگارنگی کہان۔ آصفی نے تشبیہون مین اعجاز دکھایا ہے۔ غرابت کا نام نہین۔ ندرت کے ساتھ ساتھ قریب الفہم بھی ہین۔ پھر ایک کو پڑھکر یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ بس اب اور تشبیہ ممکن نہین۔ لیکن جونہی دوسرے پر نظر جاتی ہے۔ انگلیان دانتون مین دبانا پڑتی ہین۔ جس نے پہلی تاریخ کا چاند دیکھا ہے۔ اسے چاند کو (۱) غبغبِ سیمین۔ (۲) نیمۂ دستینہ (۳) طوقِ زرین (۴) ماہیٔ زرین (۵) انگشتریٔ سلیمان (۶) نیمۂ عکسِ مراتِ سکندر (۷) پرِ عنقائی مغرب (۸) شہپرِ یاقوت رنگ (۹) کمانِ زالِ زر (۱۰) نیمۂ رکاب (۱۱) نعلِ زرین (۱۲) خنجرِ الماس گون (۱۳) تیغِ سیمین (۱۴) رشتۂ شمعِ شبِ عشرت نوید (۱۵) زرین جام (۱۶) چوگانِ سیمین (۱۷) شاخِ غزال (۱۸) بالِ ورقائی شام (۱۹) اور کلید قفلِ بابِ صائم وغیرہ سے تعبیر کرنے مین کبھی غرابت نظر نہ آئیگی۔ یہ ہے انشا کا وہ مرتبہ جس پر صرف وہ دماغ فائز ہوتا ہے۔ جو آسمانی ملکہ لیکر آیا ہو۔ تخیل کی باریکی پر اہل فارس کا اجارہ نہین۔ اہل ذوق دیکھین۔ کیا ان مقامات تک عرفی و نظیری کی رسائی ہے۔

اس کے بعد معشوق کی ستائش ہے۔ فرماتے ہین۔

آمد آن کبکِ خرامان سورتِ طاؤس مست   ہم بطے درکف دہم در بغل چنگ و رباب

در ہلالِ نوش خند شر داشت پروین برقِ طور   شعلہ میزد لمعۂ نورش بلولوئے خوشاب

ہم عقیقش خفتہ از سبزہ، سیاق عنبرے   ہم گلش بنہفتہ از سنبل بزیرِ مشکناب

مشکِ گل پوششِ سیہ ہمچون پرِ بالِ غراب   مطلع آفتابِ لالہ رنگش تازہ ہمچون گل در آب

بود رنگین پنجہ اش چون پنجۂ مرجان، وے   رنگِ این از خونِ دلہا، رنگِ اوار آفتاب

زیرِ پائش سر سکشتہ زنگی دامن کشان   کز نہیبش شاہ خاور داشت تیغ اندر قراب

سرمہ را کردہ سپیدہ شام گاہان از سحر   مشک را کافور بنمود از فروغ ماہتاب

خیرہ شد چشم زما ہش ، چیرہ شد حسرت ال   چون ہلالم رنگ بشکست از فروغ آفتاب

ذیل میں عشقیہ تشابیب سے دو دو چار چار اشعار لکھے جاتے ہیں جو مولانا کے پایۂ سخن کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں لیکن سمجھ لو کہ گو نزاکتِ تخیل صفت ہے۔ لیکن شیرینی اسی وقت تک ذائقہ کو بھاتی ہے۔ جب تک تلخی نہ پیدا ہو۔ جہاں تلخی یا ہیک پیدا ہوئی۔ خوبی غائب ہوگئی۔ یہی حال تخیل کا ہے جہاں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" مثل صادق آئی۔ عاقبت منغز ہوگئی۔ متاخرین کے ہاں یہ عیب موجود ہے لیکن مرحوم کے ہاں یہ خاص بات ہے۔ کہ گو متاخرین اسکول کے ہیں تاہم تخیل بامزہ ہوتا ہے۔ جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ایسے موزون الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ کہ آنکھوں کے سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں

بہ سخن ، گر لبِ نوشینِ تو ، شکر شکنَد   ذوق ، در دستِ ہوس ساغرِ کوثر شکند

کہنا یہ تھا۔ کہ تیری باتیں شہد سے زائد شیرین ہوتی ہیں۔ اس کو ادا اس طرح کیا۔ کہ "اگر تیرے شیرین ہونٹ باتوں سے شکر برسائیں تو ذوق اسقدر مست و سرشار ہوجائے۔ کہ ہوس و ہوا کے ہاتھ سے، آب کوثر کا پیالہ لیکر زمین پر دے مارے" اس سے پہلے "مرجان آمدہ ست" قصیدہ کا مطلع گذر چکا ہے اس میں بھی یہی مضمون بیان کیا ہے۔ لیکن دونوں کی روش ادا جدا ہے۔ "شکر شکستن" محاورہ سے زبان کی چاشنی بھی پیدا ہوگئی ہے

لبِ میگونِ تو ، رنگِ رخِ یاقوت برد   زلفِ مشکینِ تو ، صد طبلۂ عنبر شکند

تیرے شراب جیسے ہونٹ دیکھکر یاقوت کا منہ فق ہوجاتا ہے۔ اور تیری مشکین زلف کے سامنے عنبر کے سیکڑوں ڈبے بھی ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔

لالہ را رنگِ رخِ تو بنشاند در خون   قامتِ تو ہوسِ سرو و صنوبر شکند

تیرے چہرہ کا سرخ و سپید رنگ دیکھکر گلِ لالہ حسد سے مرا جاتا ہے۔ اور تیرے خوبصورت قد نے سرو اور صنوبر کی ہوس موزون قامتی خاک میں ملادی"

شوخیٔ نرگسِ مستِ تو ، دمِ نظارہ   در چمن ، ساغرِ مخموریٔ عنبر شکند

"تو چمن میں اپنی مستِ شراب نگاہیں شوخی سے ادھر ادھر ڈالتا ہے۔ تو نرگس کا سارا نشہ ہرن ہوجاتا ہے اسکی خمار آلود آنکھیں اپنا سارا حسن کھو بیٹھتی ہیں۔ اور وہ قائل ہوکر رہجاتی ہے"

سادہ سی بات تھی۔ معشوق کی آنکھیں شعرا کی اصطلاح میں نرگس کہلاتی ہیں۔ دنیا بھی کہتی چلی آئی ہے۔ بعض شعرا نے نرگس سے فوقیت بھی دی ہے۔ لیکن آصفی نے جدتِ ادا سے نئی راہ پیدا کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ "نظارہ کے وقت، چمن میں، تیری مست نرگسین آنکھ کی شوخی نرگس کا ساغرِ خمار چور چور کردے گی"

ناوکِ اندازِ نگاہِ تو ، قدر اندازیست   کہ ہدف سیکند ، از نالہ بدل پر شکند

"ظالم مارے اور رونے نہ دے" سادی نثر ہے۔ جسکی شاعرانہ صورت یہ ہے "تیری تیر انداز نگاہ، ایسی نشانہ باز ہے۔ کہ ادھر دل میں نالہ نے پر تولے، اور ادھر تیر آکر زمین پر آرہا"

سروِ قدِ تو، کہ اندازِ قیامت دارد — آہ حسرت، بدلِ فتنۂ محشر شکند

تیرے سرو جیسے قد میں، قیامت کے انداز ہیں۔ حشر کا فتنہ افسوس کرتا ہے۔ کہ تیرے قد کے سامنے ہیچ ہے

چہ بلا غمزہ و ناز، اے بتِ کافر داری! — وضعِ سنگین دلیِ تو، دلِ آذر شکند
مژۂ شوخِ تو، در محفلِ خونین جگران — بہ نگاہِ ہوسِ دل، سرِ نشتر شکند

کہنا یہ تھا۔ کہ تیرے سامنے بات نہیں ہو سکتی۔ کہوں، تو کیا کہوں اس کو شاعرانہ انشا میں فرماتے ہیں "تیرے شوخ اور شریر پلک، عشاق کے محفل میں، ہوس کی آنکھ میں نشتر بھونک دیتے ہیں" یا مفہوم یہ ہے۔ کہ "تیرے سامنے بوالہوس کی دال نہیں گلتی جہاں تو نے دیکھا۔ اور ہوس کی آنکھ میں یہ معلوم ہوا۔ کہ پلک تیر بنکر گھس گئے۔ اور اندھا کر دیا"۔

حیرتِ آئینہ، گر شوخیِ چشمت نگرد — سنگِ آشوبِ جنون، شیشۂ جوہر شکند

"تیری آنکھ اسقدر شوخ ہے۔ کہ آئینہ، با این ہمہ حیرت و خاموشی، اگر وہ شوخی دیکھ پائے۔ تو پاگل ہو جائے۔ یا مولانا کے الفاظ میں "اسیر دیوانگی کے اسقدر پتھر پڑیں، کہ سارا شیشۂ جوہر چکنا چور ہو جائے"

حسنِ تو، آئینہ را داد فروغے چندان — کہ عرض بعد ازین رونقِ جوہر شکند

تیرا حسن آئینہ کی شفافی کو دو بالا کر دیتا ہے۔ تو نے منہ دیکھا۔ اور آئینہ کچھ سے کچھ ہوا۔ جوہر آئینہ کی آب و تاب کو کہتے ہیں فلسفہ کی اصطلاح میں، جو چیز آپ سے (بذاتہ) موجود ہو۔ دوسرے کی محتاج نہو۔ جوہر کہلاتی ہے۔ اس کا مقابل عرض ہے۔ جو اپنے ہونے میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے حسن رنگ، چمک، دمک، سب اعراض ہیں۔ جو کسی دوسرے میں پائے جاتے ہیں۔ آج تک حسن، رنگ، یا چمک دمک، علیحدہ نہیں دیکھے گئے مولانا نے معشوق کے حسن سے آئینہ کو روشن تر کہا۔ فروغ یا روشنی عرض ہے۔ عرض جوہر کو فنا نہیں کر سکتا۔ لیکن یہاں آئینہ کے جوہر کو اس عرض نے مٹا دیا۔ گو یہ اصطلاحی جوہر نہ تھا۔ لیکن شاعر ایسا کہتا ہے۔ کہ اب عرض اصطلاحی جوہر پر بھی غالب آ جائے گا۔ کیونکہ اس نے معشوق سے فروغ پایا ہے

ترسم زخم و سلسلۂ نازِ رسائش — بیچائے کمندش، کشد آہوئے حرم را
ہم مستیِ او، چاک زنِ دامنِ تقویٰ — ہم زورِ شرابش، شکند ساغرِ جم را

دوش آمد زورم شاعر حور را منظر — برخِ خلد نظیر [illegible] ہمسر
بود از زیرِ لبش چشمۂ آبِ حیوان — خضر [illegible]

صورتِ عقد ثریا کہ بود در شفقے ‏ ‏ ‏ بود در حقّہ یا قوتِ لبش سلک گہر

دانتوں کی تمثیل و تشبیہ میں شعرا نے بہت زد بطبع سے کام لیا ہے۔ لیکن مولانا نے کمال کر دیا۔ مرکب تشبیہ کی بہترین مثال ہے۔ فرماتے ہیں۔ " اس کے یاقوتی ہونٹوں کے اندر موتی جیسے دانت ایسے نظر آتے ہیں۔ گویا شفق میں ثریا کا گچھا نمودار ہے " اس ایک شعر میں دانت اور ہونٹوں کو سب کچھ کہہ دیا ہے۔ خاکی اشیا میں یاقوت اور موتی سے زیادہ سرخ اور آبدار کوئی شے نہیں ہے۔ آسمانی مخلوق میں شفق اور ثریا سے موزوں تر تشبیہ نہیں ملسکتی۔ اب دانت اور ہونٹ کی تشبیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ زمین سے لیکر آسمان تک راہیں بند ہو چکیں ہیں وذالک فضل اللہ۔

کاکلش بود بر خسار، برنگ شب گل ‏ ‏ ‏ عارضش بود ز انوار صباحِ گستر
بود از پرتو رخسارۂ او شب کا فور ‏ ‏ ‏ بود کافور ہم از سایۂ شب چون عنبر
ذوق از لعل لبش، در شکرستان آمد ‏ ‏ ‏ لذتش برد ز دل، لذتِ قند و شکر
سنبلِ غالیہ گو نش بدماغم افگند ‏ ‏ ‏ شور سودائے جنونے بہ ہوائے دیگر
شوق، آغوشِ دلِ من یکشادہ چندان ‏ ‏ ‏ کہ براو تنگ شود عرصۂ اہل محشر
غمزۂ و عشوۂ و نازش زدلم تاب بود ‏ ‏ ‏ گاہ جا کرد در آغوش و گہے جست زبر
شوخ آہوئی حرم بود، کہ از حرمتِ شان ‏ ‏ ‏ نشدہ صیدِ کمند ہوسِ اہل نظر

ماہِ دو ہفتۂ من، کوفت در بستۂ من ‏ ‏ ‏ داد آواز زمستی، بنوائی دف و چنگ
نرگس اوز مۓ فتنۂ محشر مخمور ‏ ‏ ‏ نگہش از مۓ خود کامۓ ترکانہ ملنگ
غازۂ عشرہ زدہ بر رخ او پرکاری ‏ ‏ ‏ سرمۂ غمزہ کشیدہ بنگاہش نیرنگ
چشمش از نشۂ صہبائے جنون عربدہ ساز ‏ ‏ ‏ نگہش از مۓ مستی فسون بر سر جنگ
سامرۓ نگہش، فتنہ گر از جادوۓ ‏ ‏ ‏ مژۂ او، قلم نسخ طرازِ ارژنگ
چہرہ اش بود، دیا بود مہ دو ہفتہ ‏ ‏ ‏ ابرو ش بود و یا بود ہلالِ شبہ رنگ

ابرو کو سارا جہان کمان کہتا ہے۔ آصفی اسے ہلال یا پہلی تاریخ کا چاند کہتے ہیں۔ نئی اور مکمل تشبیہ ہے۔

شاہدے، عشوہ گرے، ناز فسون پردازے ‏ ‏ ‏ شوخئے و فتنہ طرازے با دائے نیرنگ

(باقی)

خان امتیاز علی عرشی (رام پور)

مرزا غالب اور مصحفی

(تیسری قسط)

مرزا غالب اول اول مرزا بیدل کے رنگ مین کہتے تھے چنانچہ خود کہتے ہین۔

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے — مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

اسکے بعد جب شیخ ناسخ کے کلام کا غلغلہ بلند ہوا۔ تو مومن کے ساتھ یہ بھی اس طرف جھک پڑے چنانچہ اُن کی بعض غزلون سے یہ رنگ نمایان ہے لیکن ان دونون بزرگون سے یہ روش نہ نبھ سکی یا یون کہئے کہ ان کا فطری ذوق ناسخ کے رنگ سے زاید بلند تھا اس لئے دونون نے الگ الگ رنگ اختیار کیا۔ مومن نے معاملہ بندی شروع کی اور غالب نے میر کے طرز مین کہنا شروع کیا چند باتون مین اُن کا راستہ میر سے بالکل الگ ہے مثلاً اُن کے کلام مین استعارات و کنایات کی نہایت کثرت پائی جاتی ہے اضافتون کی بھرمار ہے فارسی الفاظ اس کثرت سے موجود ہین کہ بعض اشعار اُردو کے معلوم ہی نہین ہوتے۔ مضامین مین بھی بکثرت اغلاق و اشکال پایا جاتا ہے لیکن بایںہمہ جسقدر سادہ اور صاف شعر اُن کے دیوان مین موجود ہین وہ تمام تر میر کے رنگ مین ہین۔ چنانچہ اُن کی نسبت سید امداد امام صاحب اثر کاشف الحقائق مین لکھتے ہین۔

"واقعی جو سوز و گداز، خستگی، درد، برشتگی، نشتریت، بلند پروازی، نازک خیالی، تمکنت جلالت، تہذیب، شوخی غالب کے کلام مین ہے باستثنائے درد و میر کسی اُستاد کے کلام مین نہین پائی جاتی ہے نشتریت تو ایسی غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام مین بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی، پُر تاثیری کا کیا کہنا"۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ بیدل اور ناسخ کے گورکھ دھندے سے نکلنے کے بعد انھون نے تیموری دور کے متاخرین شعرائے فارسی کی روش اختیار کر لی تھی جس مین اگرچہ طالب آملی کی استعارہ طرازی عرفی کی جدت آفرینی اور مضمون بندی سب کچھ موجود ہے لیکن تصوف اور تغزل کی آمیزش نے اسکو نظیری سے زیادہ مشابہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب بہار بےخزان غالب کے تذکرے مین ان کی طرز خاص کو نظیری کی طرز خاص سے قریب تر بتاتے ہین۔

مولانا حالی مرزا غالب کے فارسی کلام کی بابت کہتے ہین۔

"ان کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزل مین نہ صرف نظیری بلکہ عرفی ظہوری طالب آملی، جلالی، اسیر اور اُن کے دیگر متبعین کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر ان کے کلام مین نظیری سے کچھ کم نہین ہے۔ ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہین"۔ (یادگار غالب)

معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کلام کے ساتھ ساتھ مرزا کے اُردو کلام مین بھی یہ انقلاب ہوا اور جو روش انھون نے فارسی مین اختیار کی تھی ۔ اسی طرز مین اُردو مین بھی کہنا شروع کیا ہے چنانچہ اُن کے اردو اور فارسی دیوانون مین متعدد اشعار بالکل ہم مضمون اور ہم معنی پائے جاتے ہین بلکہ بعض اشعار ایسے بھی ہین جن مین انھون نے نظیری و حزین وغیرہ کے اشعار کا بعینہ ترجمہ کیا ہے۔ بہرحال متاخرین شعرائے فارسی کے کلام کی تمام خصوصیات فارسی کی طرح اُن کے اردو کلام مین بھی نمایان طور پر پائی جاتی ہین۔

غالب سے حسنِ ظن رکھنے والے حضرات کا خیال ہے کہ اُنھون نے اسلوب بیان کی ندرت کو حدِ کمال پر پہنچا دیا۔ معمولی سے معمولی باتین بھی اس پہلو سے بیان کر دین کہ کان سنتے ہین۔ اور دل لطف اُٹھاتا ہے وہ شعرائے اردو مین سے بلند درجے پر پہنچ گئے ہین کہ کسی کا طائر خیال بھی اُڑ کر نہین جا سکتا ممکن ہے کہ یہ سب باتین صحیح ہون اور مرزا غالب کو اسلوب بیان کی جدت و ندرت مین ایسا اجتہادی مرتبہ حاصل ہو ۔ کہ اُسے کشف و الہام کہہ سکین لیکن ہمارے خیال مین وہ اس طرز کے موجد و مخترع نہین غور سے دیکھا جائے تو غالب نے جدت اسلوب مین جو کمالات دکھائے ہین مصحفی مرحوم کی تجدید پسند طبیعت بھی اس صفت سے خالی نہ تھی ۔

مرزا غالب کے کلام کی نمایان اور مابہ الامتیاز صفت فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال ہے وہ بعض اوقات اس صفت مین اسقدر غلو کرتے ہین کہ اُردو شعر پر فارسی کا دھوکا ہونے لگتا ہے ۔ نیز اُن کے یہان تیموری عہد کے شعرائے فارسی کی دلاویز ترکیبین بھی کثرت سے پائی جاتی ہین ۔ یک بیابان ماندگی، یک قدم وحشت، اعضا گدازیان، دل سوزدہ، شورش کدۂ راز، تمکین آزما طاقت رُبا، رو کش پردہ، شعلہ خیز، تمکین نظر اور اسی قبیل کی بہت سی ترکیبین ہین جن سے مرزا غالب اور اُن کے مخصوص شاگردونکا کلام آراستہ و پیراستہ ہے ۔

شیخ مصحفی کو بھی شعرائے فارسی سے عموماً اور نظیری نیشاپوری سے خصوصاً تعلق باطن تھا اسلئے بسا اوقات فارسی زبان کی سبک اور لطیف ترکیبین نہایت حسن و خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کر گئے ہین ۔ اور ہمارے خیال مین ایک ایسے شاعر کے یہان جسکا مقولہ یہ ہو ۔

یون تو کہنے کو سبھی شعر و سخن کہتے ہین ۔۔۔ مصحفی ریختہ آئی کی زبان اور ہی ہے

یا

جب سے معنی بند کا چرچا ہوا اے مصحفی ۔۔۔ خلط مین جاتا رہا حُسنِ بیان ریختہ

فارسی زبان کی کم سے کم ترکیبین بھی دستیاب ہو جائین تو چندان قابل اعتراض نہین ۔ بلکہ سزاوار مدح ستائش ہے ۔

ملاحظہ ہو:۔ ہستی سے اپنی مجھکو نہین مطلق آگہی ۔۔۔ عمر گذشتہ ہون کہ مین ہوش رمیدہ ہون

پیدا ہے میری وضع سے اک شورشِ جنون ۔۔۔ دریا نہین مین سیل گریبان دریدہ ہون

مرغِ غانِ باغ مین مرے نالے کا شور ہے ۔۔۔ ہر چند مین ابھی نفس ناکشیدہ ہون

جاتا ہے جلد قافلۂ عمر کس قدر — مہلت نہیں مجھے کہ ذرا آرمیدہ ہوں

جوں شمع داغِ غم نے جلایا بدن تمام — نکلی نہ دل سے پر ہوسِ سوختن تمام

کس دن سرِ شوریدہ نہیں چاک قفس میں — بیتاب ہوں نظارۂ گلشن کی ہوس میں

گر ناخنِ فریاد کرے عقدہ کشائی — سو زمزمے پنہاں ہیں مرے تارِ نفس میں

اے جنوں قیس کا اس دشت میں ہمدوش نہیں — خانہ بردوش ہے وہ خانہ فراموش ہوں میں

نشۂ میرا وہ نہیں ہے کہ سر اسکا ہٹے — مصحفی میکدۂ عشق کا مدہوش ہوں میں

جس جگہ چشم تری حوصلہ پرواز ہوئی — خوبیٔ دیدۂ نرگس تسلیم انداز ہوئی

شب تری مجلس میں واں دورِ قدح چلتا رہا — تا سحر یاں آنسوؤں سے سبحہ گردانی ہوئی

گوشۂ خلوت میں بیٹھا اُن سے آخر چھپ کے میں — خوش نہ آیا اختلاطِ مردم دنیا مجھے

اے فلک اُٹھتی عمارت کا گرانا لطف کیا — دے نہ تو داغِ شکستِ لالۂ حمرا مجھے

بس لگائے ہوئے تاک ہر کسی پر ہے — ہوش باش کہ عالم روا روی پر ہے

وہ نہ تھے ہم کہ کبھی شکوۂ خوباں کرتے — گریہ رگ رگ میں فرو نشترِ مژگاں کرتے

نہیں اتنی بھی فرصت ہمکو ملتی وقتِ محرومی — کہ کھولیں اُسکے رُخ پر خواب میں چشمِ تماشا کو

پھر اشک سرخ آنے لگے اب تو مصحفی — پھر چشم وا ہوئی رہِ خونِ جگر کھلی

نشتر فرو کردن، چشم تماشہ کشادن، چشم وا شدن، اور رہِ خونِ جگر کشادن کا استعمال کسقدر دلکش طریقہ پر ہوا ہے

ہم نامہ دیکھتے ہیں قاصد کو اپنے تو کہہ — جانِ بلب رسیدہ تیرا پیام کیا ہے

اک فریبندہ ہے تیری روشِ طرزِ خرام — اس کے عہدہ سے کوئی کبکِ دری نکلے ہے

اے فرطِ شوق تو مجھے رسوا نہ کیجیو — لایا ہوں اپنے گھر اُسے قول و قسم کے ساتھ

وقتے کہ دسترس ہی نہ ہو زلفِ یار پر — پھر کس طرح نگاہ بہ حسرت نہ کیجئے

تھی گرفتاری میں اک لذتِ آسودگی — کیا کہیں ہم کتنا پچھتائے نکل کر دام سے

واں باریاب جلوہ اُسی کی نگاہ ہو — آنکھوں سے اپنی جو کوئی پردہ اٹھا سکے

ہے تماشا کدۂ خلق مری غالب مزا — جی میں آئے تو ذرا تو بھی یہاں ہو جانا

ہے قصورِ جنوں باعثِ آمرزشِ مجنوں — کیا ساتھ گریباں کے پھٹا نامۂ اعمال

بے تلخیٔ خمار کہاں ہے شرابِ وصل — چاہت کے ساتھ کشمکشِ امتحاں بھی ہے

اے دل قدم آہستہ رکھ اس فرشِ زمیں پر — محنت زدہ چندے نے آرام کیا ہے

وہ جی میں یہ نازاں کہ مرا رعب تو دیکھو — میں خوش کہ خیال نگہ دور کسے ہے
موسیٰ سے ہزاروں ہیں یہاں مصحفی لیکن — سودائے تجلی کدۂ طور کسے ہے
یہ چمن افسوس کی جاگہ نہیں تو کس لئے — برگہائے لالۂ گل دست برہم سودہ ہیں
کباب لخت دل میرے نمک سود محبت ہیں — تمھارے واسطے لایا ہوں یہ تحفہ ذرا چکھو
گلیوں میں یکسر وہ ہجوم ہے میرے جنونکی ہر طرف — اس عشق شہر آشوب کو اب کیجیے پنہاں کہاں
کہتے ہیں داغ عشق کسے ہم کو کیا خبر — یک قطرہ خون گرم تو ہے ہمکنار دل
اُٹھا کے آنکھ نہ دیکھا کبھی اُس نے — میں ساری عمر تمنائے یک نظر میں رہا

خطازدہ ترکیبوں پر نگاہ ڈالئے تو مرزا غالب کی شاعری کا انداز آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔
ایرانی شعراکے آخری دور میں تشبیہات کی نزاکت اور استعارات کی لطافت حد کمال کو پہونچ گئی تھی۔ چنانچہ عرفی نظیری۔ اور طالب آملی کے کلام میں ان کا چمن زار نظر آتا ہے۔ غالب اور مصحفی دونوں شعرائے مذکور الصدر کے مقلد تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں بھی اسی قسم کی لطیف تشبیہیں برابر درجے پر پائی جاتی ہیں

نیرنگ حسن سے جو ترے متصل ہوا — آئینہ ہزار نما میرا دل ہوا
مصحفی عالی وقاروں پر نہیں آئی شکست — سنگسار فتنہ کس دن گنبد مینا ہوا
میرے سینے میں داغ غم نہ سمجھ — ہے یہی عشق کے چمن کا گل
پیدا ہے میری وضع سے اک شورش جنوں — دریا نہیں میں سیل گریباں دریدہ ہوں
باقی وہی ہے باد یہ گردوں میں آبرو — غلطاں برنگ دانہ گوہر پھرا ہوں میں
میں وہ بے کس ہوں کہ مانند چراغ سرراہ — مر بھی جاؤں تو کوئی آکے نہ روئے مجھکو
آسماں اک خانۂ پُر دود ہے — اس میں تو میرا گھٹا جاتا ہے جی
وہ نخل ہوں میں سوختۂ صرصر حرماں — جس میں نہ لگے پھول نہ کوئی ثمر آئے
آیا تھا میں سجدے کو ترے ملک عدم سے — سرسائے کی مانند اُٹھایا نہ قدم سے
مثل نگہ شوق وہیں لائے گا پھر شوق — مجلس سے تری اُٹھ کے کدہر جائیگا کوئی
بزم تصویر ہے طلسم جہاں — کب کوئی یاں کسی کی سُنتا ہے
ہم کیا کریں چمن میں کدھر ہوا چلی ہے — اپنا دل فسردہ تصویر کی کلی ہے
سُراغ قافلۂ اشک کیجیے کیونکر — نکل گیا ہے یہ کوسوں دیار حرماں سے

دلفریبیِ چمنِ حسن کی کچھ مجھ سے نہ پوچھ　　گل جو [illegible] جسم مین تو ہجا دو کانٹے
اشکِ رنگین کے سوا اور نہ کچھ ہاتھ آیا　　پھول ہم [illegible] یہ لائے چمنِ حرمان سے
بعد مرنے کے ہوئی تن کی حقیقت معلوم　　عبث [illegible] ویران کی مین تعمیر مین تھا

علامہ نظم طباطبائی کے خیال کے مطابق متحرک تشبیہات پیدا کرنے مین مرزا غالب کو یدطولیٰ حاصل تھا مثلاً:- "ہین ورق گردانیٔ نیرنگ یک بتخانہ ہم" یا "نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے" یا "مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی"۔ یہ چند مثالین اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہین کہ مرزا غالب کے دیوان مین متحرک تشبیہات کا سرمایہ کافی ہوگا لیکن جب ہم دیکھتے ہین تو شیخ مصحفی مرحوم کا کلام بھی اس سے خالی نہین اور انکی تشبیہات مین بھی ترکیب وحرکت دونون صفتین اکثر پائی جاتی ہین ؎

مجھے اشکون مین یون لختِ جگر بہتے نظر آئے　　کہ جیسے وقت شب دریا مین عالم ہو چراغان کا
لختِ جگر کا اشکِ روان مین یہ حال ہے　　دریا مین جیسے جاتا ہے لاشہ بہا ہوا
مے پی کے اس چمن سے کون اُٹھ گیا ہے جو ہے　　انگڑائیون کا عالم پھولون کی ڈالیون پر
گرمِ سفر ہے ہم منزل کو پر نہ ہو پہنچے　　آوارگی نے ہمکو ریگِ روان بنایا
بھلا مین ہاتھ دھو بیٹھون نہ کیونکر جان سے اپنی　　کہ چلنے مین تمھارے موجِ دریا کی روانی ہے
جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی طرح دشت بدشت　　ساتھ پھرتا ہے لئے یہ دلِ نالان ہم کو
دلِ بیتاب مرا کوئی گھڑی ہے شاید　　خود بخود چوٹ لگی خود بخود آوازہ ہوئی
پلکین نہ کبھی سدِ رہِ اشک روان ہون　　دریا کو نہ کوئی خس وخاشاک سے باندھے
شب تری مجلس مین وان دورِ قدح چلتا رہا　　تا سحر یان آنسوؤن سے سبح گردانی ہوئی
پیدا ہے میری وضع سے اک شورشِ جنون　　دریا نہین مین سیلِ گریبان دریدہ ہون
سُراغِ قافلۂ اشک کیجئے کیونکر　　نکل گیا ہے یہ کوسون دیارِ حرمان سے
باقی رہی ہے بادیہ گردی مین آبرو　　غلطان برنگِ دانۂ گوہر پھرا ہون مین
نوکِ مژگان پر کرے ہے یون دلِ صد پارہ رقص　　پھول گیندے کا کرے جون بر سرِ فوارہ رقص

غالب کے کلام کی خصوصیت جسے مولانا شبلی نے شعر العجم مین اچھی طرح واضح کیا ہے یہ ہے کہ کسی وسیع خیال کو جو ایک زائد سے اشعار کا محتاج ہو۔ ایک ہی شعر مین ادا کر دیتے ہین۔ اس قسم کے اشعار مرزا کے کلام مین ایک دو نہین بلکہ متعدد نکلین گے۔ لیکن جب ذرا گہری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تو شیخ مصحفی مرحوم کا کلام بھی اس ندرت سے خالی نہین۔ مثلاً:-

گلی کو دوست کی سمجھا ہے اپنا کعبہ وہ
یہ مصحفی سے نہ پوچھو کہ ہر ہے سجدہ درست

حالت یہ ہے کہ:-

ایک مسلمان عشق و محبت کی زنجیرون مین گرفتار اپنے معشوق کی گلی مین پہونچتا ہے اور بے اختیاری کے ساتھ سجدے ادا کرنے مین مصروف ہو جاتا ہے۔ اُسکے غمگسار دوست یا اُس کوچہ کے دوسرے لوگ خیال کرتے ہین کہ شاید یہ نماز ادا کر رہا ہے لیکن ابھی اس بات سے باخبر نہین کہ سجدہ کس طرف کو کیا جاتا ہے یا سمت مغرب کی شناخت مین غلطی ہو گئی ہے)۔ یہ لوگ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے دریافت کرتے ہین کہ اے دیوانے تجھے معلوم ہے کہ سجدہ کرنا کس جانب کو درست ہے اور کس جانب کو نادرست عاشق جواب دیتا ہے کہ مجھے اس الجھن مین پڑنے کی کیا ضرورت۔ دنیا کا عقیدہ کچھ سہی مجھے اپنے عقیدے سے کام ہے۔ مین اس گلی کو اپنا کعبہ خیال کرتا ہون۔ اور چونکہ کعبہ مین ہر جانب کو سجدہ کرنا روا ہے۔ اسلئے میرے مذہب کی رو سے یہان ہر جانب کو سجدہ کرنا بالکل درست اور حق بجانب ہے ''سمجھا ہے'' سے یہ مُراد ہے کہ درحقیقت نہین ہے ''اپنا کعبہ'' کہنے سے یہ غرض ہے کہ دنیا کے عقیدے سے بحث نہین '' نہ پوچھو '' کا مدعا یہ ہے کہ جذبۂ عشق مذہب و ملّت کی پابندی سے آزاد ہے اس لئے جواب باصواب نہ مل سکے گا۔

خفا نہ ہو ترے کہنے سے مین تو جاتا ہون
سلام تو اُسے کہدے بجُو پاسبان میرا

عاشق جذبۂ محبت سے مجبور ہوکر معشوق کی خدمت مین سلام عرض کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اُسکے دروازہ پر پہونچ جاتا ہے۔ معشوق نے پاسبان کو حکم دے رکھا ہے کہ فلان شخص کو دروازے کے پاس نہ آنے دیا جائے۔ اسلئے جب وہ اُسنے آتا ہوا دیکھتا ہے تو بگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہان سے فوراً چلے جاؤ تمھارے کھڑے ہونیکی اجازت نہین ہے۔ عاشق اس غرض سے کہ کہین اُسکی آواز صاحب خانہ کے نازک کانون تک پہونچکر مزید خفگی کا سبب نہ ہو بجاجت و خوشامد کے ساتھ کہتا ہے، کہ اے پاسبان بگڑنے کی کیا ضرورت ہے مین تیرے کہنے سے جانیکے واسطے تیار ہون۔ مین یہان کچھ لینے کے واسطے نہین آیا تھا بلکہ سلام کرنے حاضر ہوا تھا۔ سو یہ کام تو بھی کر سکتا ہے جسوقت موقع ہو اور تو اُن کے سامنے پہونچے تو میرا سلام کہدینا۔

دعا لکھی ہے اُسے خط مین مینے کوئی بغور
اگر پڑھے تو دعا بھی ہے مدّعا بھی ہے

حالت یہ ہے کہ۔ عاشق اپنے معشوق کے نام برابر خط لکھتا رہتا ہے۔ معشوق اُن خطون کی طرف کبھی نگاہ نہین کرتا کیونکہ جانتا ہے کہ ان مین مدّعا و مطالب کے سوا کچھ درج نہ ہوگا۔ عاشق جب دیکھتا ہے کہ اُسکے خطوط مطالعہ مین نہین آتے تو ایکمرتبہ مدعا کو اُڑا جاتا ہے اور صرف دعا لکھدیتا ہے تاکہ پڑھنے والا پڑھ سکے۔ احباب پوچھتے ہین کہ اب کی مرتبہ تمنے خط مین کیا تحریر کیا ہے تو جواب دیتا ہے کہ مین نے حسب معمول مدعا نہین لکھا بلکہ صرف دعا لکھدی ہے لیکن یہ دعا لکھی اس طریقے پر ہے کہ اگر کوئی غور کے ساتھ پڑھے تو مدعا بھی ظاہر ہو جائے۔

شعر کا ایک ایک لفظ کتنے وسیع معنی دے رہا ہے '' اگر پڑھے '' کس قدر معنی خیز ٹکڑا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ وہ خطاب بے پروائی کے ساتھ پڑھتا بھی نہیں "بغور" کا لفظ قابل غور ہے جس نے دعا کو اور بڑا اسرا بنا دیا ہے "اُسے" کہکر "کوئی" کئے میں تیسیم بعد التخصیص ہے اسکا لطف بیان سے باہر ہے صرف ایک شعر اور سن لیجئے ؎

وہ دل میں یہ نازان کہ میرا رُعب تو دیکھو میں خوش کہ خیال نگہ دور کسے ہے

حالت یہ ہے کہ ایک عاشق تقدیر سے محفل معشوق میں پہونچ گیا ہے۔ اور ایسی جگہ بیٹھ گیا ہے کہ اگرچہ دور ہے لیکن صاف محفل کو اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے۔ معشوق غافل نہیں ہے اور اُس نے اس "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" کو پہلی نظر میں بھانپ لیا ہے۔ لیکن غصہ کرنے کی بجائے اس بات پر ناز کر رہا ہے کہ ہمارے رعب اور دبدبے نے اُسے قریب آنیکی اجازت نہیں دی اور اس بنا پر کوئی خاص توجہ نہیں کرتا۔ لیکن عاشق اس عدم توجہی سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ میں خود اتنی دور بیٹھ گیا ہوں کہ کوئی میری طرف نگاہ نہیں کر سکتا۔ اور خوش ہوتا ہے کہ آج جی بھر کے دیدار یار سے مستفید ہوگا۔ اب اس حالت کو پیش نظر رکھ کر شعر پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ایک ایک لفظ کس حسن ترتیب کے ساتھ ایک وسیع مضمون کو ادا کر رہا ہے۔

غالب کے کلام کی دوسری ندرت یہ ہے کہ وہ بعض جملے محذوف کر جاتے ہیں لیکن دیگر واقعات اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ کہ متروک جملے خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس قسم کے بکثرت اشعار اُن کے یہاں موجود ہیں مصحفی مرحوم نے بھی اکثر مواقع پر اس انداز سے کام لیا ہے۔ اور اشعار کے بعض اجزا کو ایسے طریقہ سے محذوف کر دیا ہے کہ سننے والے کا ذہن خود بخود اس حصہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

افسوس آشیان پہ مرے برق گر پڑی جب فصل گل میں میں نے کئے بال و پر درست

مطلب یہ ہے کہ جب آشیانہ موجود تھا تو میں اُڑنے کے لئے بال و پر نہ رکھتا تھا۔ اور جب بہار کا موسم آیا اور میں نے اُڑنے کے لئے بال و پر درست کئے تو میرے آشیانے کو بجلی نے خاک سیاہ کر ڈالا۔ یعنی میں ہمیشہ ایک نہ ایک مصیبت میں گرفتار رہا۔

مومن خان مرحوم اس مضمون کو یون ادا کرتے ہیں

ڈرتا ہون آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آسمان نہیں

مطلب یہ ہے کہ صیاد چونکہ میرے آشیانے کو نہیں دیکھ رہا مجھے خوف ہے کہ آسمان سے بجلی نہ گر پڑے کیونکہ اہل زمانہ کا کسی نہ کسی بلا میں گرفتار رہنا لازمی ہے لیکن مومن خان نے شاعری کے اس نازک پہلو پر غور نہیں کیا اور ذرا سی بے اعتدالی سے شعر اسقدر پیچیدہ ہو گیا۔ کہ جب تک یہ جملہ "اہل دنیا کا کسی نہ کسی بلا میں گرفتار رہنا ضروری ہے" اضافہ نہ کیا جائے عام ذہن معنی مقصود کی طرف نہیں جا سکتا بر خلاف اسکے شیخ مصحفی مرحوم کا بیان بالکل صاف و سادہ ہے اور اسکے محذوف و متروک حصے پر نگاہ فوراً پہنچ جاتی ہے

جو خیال میں کسی کے شب ہجر سو گیا ہو نہ ہو صبح کو آنکھ کبھی اُسکا خواب اُلٹا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کے خیال میں سو گیا ہو اور اُس خیال کے اثر سے معشوق کو خواب میں اپنے پاس دیکھے تو

صبح کو اسکا خواب اُلٹا نہ ہو یعنی درحقیقت وصال نصیب ہو جائے۔ یہ دو جملے "معشوق کو خواب مین اپنے پاس دیکھے" اور "درحقیقت وصال نصیب ہو جائے" شعر مین مذکور نہین ہین تاہم شعر کا وہی لطف قائم ہے۔

"جو" کی تخصیص اسلئے کی گئی ہے کہ فراق مین ہر ایک کو نیند نہین آ سکتی "خیال مین سو جائیگی" تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ خواب کا تعلق خیال ہی سے ہے۔ لہٰذا جو چیز خیال پر مسلط ہو جائیگی وہی خواب مین بھی مشکل ہو کر نظر آئیگی۔

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل ایک شب اور بھی جئے ہی بنے

کہنا یہ ہے کہ یار نے وصل کے وعدہ کو صبح پر ٹال دیا ہے۔ اور چونکہ اُمید وصل قیام زندگی کا موجب ہے اسلئے ہمین ایک رات مجبوراً اور زندہ رہنا پڑ گیا حسن و عشق کا پورا فوٹو ایک شعر مین کھینچ دیا ہے

ایسا بھی اتفاق زمانے مین کم ہوا قاصد کو موت آ گئی جو نامہ رقم ہوا

دنیا مین بہت کم لوگون کو ایسے اتفاقات کا سامنا ہوتا ہے جیسے ہمین پیش آ رہے ہین یعنی آج تک اپنے معشوق کے پاس خط بھیجنے مین کامیاب نہ ہو سکے۔ جب قاصد دستیاب ہو سکتا تھا تو نامہ نہین رقم ہو سکتا تھا اور جب نامہ رقم ہوا تو قاصد کو موت نے آ گھیرا لیا۔

"جو نامہ رقم ہوا" اسے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پہلے نامہ رقم نہ ہو سکتا تھا "اور قاصد کو موت آ گئی" سے ثابت ہے کہ اس سے قبل قاصد موجود تھا

غالب کے کلام کی تیسری ندرت یہ ہے کہ ان کے بعض اشعار ذو معنین ہوتے ہین اسلئے قدرتی طور پر ان کے مفہوم مین وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

شیخ مصحفی مرحوم کا کلام بھی بعض اوقات یہی رنگ رکھتا ہے کہ بادی النظر مین اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہین مگر غور کرنے کے بعد دوسرے نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہین جسکی وجہ سے ان کا ہر ایسا شعر ہمیشہ ایک نہایت لطف دیتا ہے۔ اور بار بار پڑھنے سے طبیعت نہین اُکتاتی۔

وہ مجھے بدنصیب کہتے ہین یہ بھی خوبی مرے نصیبون کی

ظاہری معنی یہ ہین کہ میرے نصیب ایسے خراب ہین کہ معشوق مجھے بدنصیب کہتا ہے اور اس مین شک نہین کہ یہ معنی بالکل صحیح ہین کیونکہ عاشق کی بدنصیبی اور خوش نصیبی معشوق کے ہاتھ مین ہے اور جب وہ ہی بدنصیب کہہ دے تو خوش نصیب کہنے والا کون رہا۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو دو اور لطیف معنی بھی پیدا ہوتے ہین اول یہ کہ اگر معشوق مجھے بدنصیب کہہ کر پکارتا ہے تو مین اسے اپنے نصیبے کی خوبی خیال کرتا ہون کیونکہ اسی بدنصیبی نے اُسکی زبان سے یہ الفاظ سننے کا موقع دیا۔ ورنہ مین کہان اور گفتگوئے یار کہان دوسرے یہ کہ وہ بدنصیب کہہ کر اس الزام کو جو نصیبے کے سر جانا چاہئے تھا میرے سر ڈال رہا ہے اس سے زیادہ نصیبے کی خوبی کیا ہو سکتی ہے ان تینون صورتون کے لئے علیحدہ علیحدہ قرینہ موجود ہے پہلے دو معنی خوبی کے اصلی اور طنزیہ معنی کے ساتھ پیدا ہوتے ہین اور

تیسرے معنی کے لئے مجھے پر زور دینا پڑتا ہے۔

خالی ہی چلے آتے ہین ہم صحن چمن سے — داماں مین کچھ ہے نہ گریبان مین کچھ ہے

چمن سے خالی واپس آنے کے تین پہلو ہین۔ یا اسوجہ سے کہ دونون مین پھول نہین یا اسوجہ سے کہ دونون مین ایک تار باقی نہ رہا یا اسوجہ کہ داماں مین پھول نہین اور گریبان مین تار نہین یعنی گریبان بھی چاک ہو گیا اور پھول بھی نصیب نہ ہوئے اور ظاہر ہے کہ یہ معنی بہت زیادہ لطیف ہین۔

رکھ کے سوزن کو ذرا دیکھ تو اے جرّاح — قابل بخیہ مرا زخم جگر ہے کہ نہین

اس شعر کے دو پہلو ہین۔

ایک اس حالت کے ساتھ کہ جرّاح آتے ہی زخم جگر کی بخیہ گیری مین مصروف ہو گیا۔ بیمار محبت نے اسکی نادانی پر نگاہ کی اور کہا کہ اے جرّاح "سوزن کو ہاتھ سے رکھ اور پہلے یہ دیکھ کہ میرا زخم جگر بخیہ کرنیکے قابل ہے کہ نہین کہین ایسا نہ ہو کہ تیری محنت بیکار جائے"!

دوسرا اس حالت کے ساتھ کہ جرّاح زخم جگر کو قابل بخیہ گری نہین سمجھتا اور اس بنا پر ٹانکا لگانے سے پرہیز کرتا ہے مریض کو تشفّی نہین اسلئے کہتا ہے کہ اے جرّاح تونے دیکھا نہ بھالا یون ہی فیصلہ کر دیا کہ یہ زخم جگر قابل بخیہ گری نہین ہے۔ سوئی کو رکھ کر دو چار ٹانکے لگا اور دیکھ کہ کام دیتے ہین یا نہین۔ "رکھ کے سوزن کو" یہ ٹکڑا قیامت کا ہے جس نے استفہام کے دونون پہلوؤن کو سنبھال لیا ہے۔

ہے شکر کی جگہ کہ دم امتحان اُسے — جو غیر پر گمان ہے وہ مجھ پر گمان نہین

اس شعر کے بھی تین مختلف پہلو ہین

ایک یہ کہ غیر معرض امتحان مین ہے۔ اور عاشق خیال کرتا ہے کہ معشوق اُسے دروغگو سمجھ کر امتحان لے رہا ہے خدا کا شکر ہے کہ میری محبت پر اُسے ایسا گمان نہین۔ اور مین امتحان سے محفوظ ہون دوسرے یہ کہ رقیب محفوظ ہے اور عاشق صادق امتحان کی زد مین ہوتے ہوئے اس بات کا خیال کر رہا ہے کہ میرا امتحان میری محبت آزمانیکے لئے کیا جا رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ معشوق میری طرف وہ گمان نہین رکھتا جو غیر کی طرف ہے کیونکہ اُسکا امتحان ہی نہین لیا گیا۔ جس کے صاف معنی یہ ہین کہ اُسکی محبت غیر معتبر اور دعوائے عشق ناقابل التفات ہے۔

تیسرا لطیف پہلو یہ ہے کہ عاشق صادق اور دشمن کاذب دونون ایک وقت مین مبتلائے امتحان ہین اور چونکہ امتحان سچا جانکر بھی لیا جا سکتا ہے اور جھوٹا سمجھ کر بھی اسلئے عاشق خیال کرتا ہے کہ غیر کی جانچ اسلئے کیجا رہی ہے کہ وہ جھوٹا ہے اور میری آزمائش اسلئے کیجاتی ہے کہ مجھے سچا سمجھا گیا ہے اور اسی عندیہ کی بنا پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ معشوق اُسکی طرف وہ گمان نہین رکھتا جو غیر پر رکھتا ہے ؎

مجھکو سحر خجل نہ کرے روئے یار سے | بس اتنی التجا ہے شب انتظار سے

صبح کو خجل نہ ہونیکی دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو انتظار کی رات میں محبت کا کامیاب جذبہ معشوق کو کھینچ لائے یا شب انتظار کی سختی صبح ہونے سے پہلے پہلے منتظر یار کو آغوش لحد میں سُلا دے اور یہان دونوں معنی لئے جاسکتے ہیں

حسن معنی کے ساتھ غالب کا کلام حسن بندش اور حسن ترکیب کا بھی بہترین نمونہ ہے ان کی بعض غزلیں فصیح، سلیس، روان اور شُستہ الفاظ کا بہترین مجموعہ ہوتی ہیں جستی بندش اور حسن ترتیب کی جسقدر بہترین مثالیں غالب کے مختصر سے دیوان میں ملتی ہیں ان کی نظیر سے اُردو شعرا کے بڑے بڑے دیوان خالی ہیں۔

مصحفی مرحوم کے متعلق ہم پچھلے صفحات میں اچھی طرح ثابت کرچکے ہیں اور بعض محققین نے اسے تسلیم بھی کیا ہے کہ روانی و برجستگی کے لحاظ سے انہیں نہ صرف اپنے متقدمین بلکہ معاصرین پر بھی یک گونہ سبقت حاصل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو سیر کرنی ہے کرے کہ جب خزان آئی | نہ گل رہیگا چمن میں نہ خار ٹھہرے گا
کرے گی تن کو بھی بیتاب بیقراری روح | ہوا میں خاک یہ مشت غبار ٹھہرے گا

اب نہ فرہاد ہے نہ مجنون ہے | رہ گیا عاشقوں کا افسانہ
جو ملا اُس نے بے وفائی کی | کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا
تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے | غنچہ انداز مسکرانے کا
دیکھو شبیہ عاشق و معشوق کا ورق | گویا مقابلہ ہے خزان و بہار کا

یون میں نے بت ماہ لقا کو نہیں دیکھا | جس طرح کہ بندے نے خدا کو نہیں دیکھا
ہم نام ہی سنتے ہیں فقط مہر و وفا کا | آنکھوں سے کہیں مہر و وفا کو نہیں دیکھا

تلوار کو کھینچ ہنس پڑا وہ | ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا
یادِ ایام بے قراری دل | وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا
اب کہان ہم کہان وہ کنج قفس | کوئی دن وان بھی آب و دانہ تھا

سینے سے تیرے جلوہ نما ہے ضیائے صبح | گل کھاتی ہے بیاض گلو پر صفائے صبح
کھل جائے آنکھ گر تری شب سے تو بیخبر | قابل ہے سیر کے چمن دلکشائے صبح
ہستی سے درگزر جو تو چاہے ہے وصل دوست | جلوہ ہے آفتاب کا بعد از فنائے صبح

دیدار ہی ہے حسرت دیدار کا علاج | محشر پہ اُٹھ رہا ترے بیمار کا علاج
مزا جب ہے کہ ہوچکے ہی چکے مدعا حاصل | کسی نے کرلیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل
پلکیں تری جبتک کہ صف آرا نہ ہوئی تھیں | گلیاں ترے کشتوں سے تماشا نہ ہوئی تھیں

یون مل گئے خوبانِ جہان خاک مین ہائے وہ صورتین گویا کبھی پیدا نہ ہوئی تھین
اے مصحفی دزدیدہ نگہ کی تھی نہ جب تک کمبخت نگاہین مری رسوا نہ ہوئی تھین
عاشق سے بھی ہوتا ہے کہین صبر و تحمل وہ کام بتاتے ہو جو آتا ہے نہین مجھ کو
صحبت ہے ترے خیال کے ساتھ ہے ہجر مگر وصال کے ساتھ
یار آکے رہے قریب میرے ایسے ہین کہان نصیب میرے

جسقدر انتخابات کلامِ مصحفی کے چھپے ہین ان مین بعض بعض غزلین ایسی بھی ہین جو مطلع سے مقطع تک نہایت سلیس نہایت روان اور نہایت برجستہ معلوم ہوتی ہین۔ مثلاً

رہا گل سے زیادہ بیم تاراج خزان مجھکو بنانا ہی نہ تھا ایسے چمن مین آشیان مجھکو
نگاہون مین بہار گل کو مین توٗ لوٹ لیتا ہون بھلا کب ارخصت سیرِ چمن دے باغبان مجھکو
پڑا ہون شاخ سے گر کر مین برگ زرد کی صورت خدا جانے کہان لیجائے اب بادِ خزان مجھکو
نہین موسم سفر کا تازہ آیا ہون مین صحرا سے بھلا دو دن تو رہنے دے چمن مین باغبان مجھکو
رہا کچھ آسرا رستے مین منزل پر پہونچنے کا نظر آتی رہی جب تک کہ گردِ کاروان مجھکو
گلستانِ جہان مین نغمہ پرداز کہن ہون مین نواسنجون مین بہتر جانتا ہے باغبان مجھکو
سبک اے مصحفی یان تک ہوا مین ضعفِ پیری سے کہ آخر زیست اپنی ہوگئی بارِ گران مجھکو

اشک نے راہِ چشم تر لی ہے مصلحت کچھ تو دل سے کر لی ہے
دیدِ رخ سے ہے باغ باغ نگاہ کیسی پھولون سے گود بھر لی ہے
آؤ میدان مین تم بھی سر بازو اس نے پھر تیغ اور سپر لی ہے
مین نے بازارِ حسن خوبان سے مول اک حسرتِ نظر لی ہے
یہ غزل کہہ کے قدر دانون سے مصحفی قیمت گہر لی ہے

بندش کی چستی اور روانی نے غالب کے کلام مین ایک خاص صفت پیدا کر دی ہے جسکو تماثل تراکیب کہتے ہین یعنی اس صفت مین تمام فقرے ایک ہی وزن کے ہوتے ہین جیسے۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغان کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو
اُدھر یہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے

لیکن جب ہم دیکھتے ہین تو شیخ مصحفی مرحوم کا کلام بھی اس صفت سے خالی نہین اور متعدد اشعار ایسے نظر آتے ہین جن مین تماثل تراکیب نے روانی و برجستگی کے جوہر دکھائے ہین۔

پوچھے نہ کبھی تو نے مرے دیدۂ گریان　　رکھا نہ کبھی تو نے مرے زخم پہ پھاہا

روش یہ ہے تو ٹھوکر کھائینگے سرہائے مشتاقان　　ادا یہ ہے تو تلوارین چلین گی تیری چتون پر

یا وہ عالم تھا کہ عالم اس سے واقف ہی نہ تھا　　یا یہ عالم ہے کہ عالم اُسپہ مرجانے لگا

حسن کہتا ہے کہ عارض سے اُلٹ دے پردہ　　شرم کہتی ہے ذرا منہ کو چھپا دکھلا کر

کھیل جاتے ہین جان پر عاشق　　جان دیتے ہین آن پر عاشق

کیجئے ظلم سزا دارِ خطا ہم بھی ہین　　کھینچئے تیغ کہ مدت سے فدا ہم بھی ہین

غالب کے کلام مین اگرچہ صنائع و بدائع بہت کم پائے جاتے ہین تاہم رعایت لفظی سے جسکو اس دور مین شعرائے لکھنؤ نے بہت زیادہ نمایان کردیا تھا - وہ بھی بالکل محفوظ نہ رہ سکے تھے باین ہمہ انھون نے دوچار اشعار کو چھوڑ کر اکثر اس صفت مین جدتین اور لطافتین پیدا کی ہین۔

شیخ مصحفی کا شمار قریب قریب شعرائے متقدمین مین ہے اور متقدمین اساتذہ کو رعایت لفظی اور ایہام سے بہت زیادہ رغبت تھی شیخ مرحوم کے کلام مین بھی اس صفت کی سیکڑون نہین بلکہ ہزارون مثالین ملتی ہین تاہم موصوف کی صفائی طبع اور روانئی بیان نے اس صنعت کو کہین بدنما نہین ہونے دیا۔ رعایت ہے مگر اس لطف کے ساتھ کہ یک لخت اس طرف کسی کی نگاہ نہیں جا سکتی مثلاً:-

اللہ رے تیرے سلسلۂ زلف کی کشش　　جاتا ہے دل اُدھر کو کھنچا کائنات کا

ہنستا ہے پریشانئی عاشق پہ جو ہردم　　اُس گل نے زمانے کی ہوا کو نہین دیکھا

رد بات کا ہرگز نہین اس بزم مین مجھکو　　جون آئینہ اک مین بھی ہون منہ دیکھنے والا

خدا کے واسطے چوب قفس کو سُرخ نہ کر　　ہمارے خون پہ باندھی ہے کیون کمر صیاد

کیا قیامت ہے کہ وہ شوخ چھپائے منہ کو　　اپنا دیدار ہمین روز جزا دکھلا کر

آیا نہ وہ تو صورت پروانہ جل گیا　　مین دیکھ کر چراغ سر شام کی طرف

خدا کے واسطے چاک قفس مین پھول نہ رکھ　　کہ برگ گل مری چھاتی پہ سنگ ہے صیاد

مصحفی جاکے مین گلزار سے ناشاد آیا　　نہوئی نکہتِ گل سے بھی ہوادار کی دل

ہے تیرگی مین کس کو سفید و سیہ کا فرق　　زندانیون کو شام و سحر دونون ایک ہین

وہی دشت اور وہی گریبان چاک　　جب تلک ہاتھ پاؤن چلتے ہین

نرگس کی ہے وہ آنکھ نہ گل کا وہ رنگ ہے　　کیا اندنون ہوائے گلستان پلٹ گئی

بعض مقامات پر رعایت لفظی سے ایک عجب لطافت پیدا کی ہے ؎

کی ذرا آب دمِ شمشیرِ قاتل نے کمی　　ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

آبِ دمِ شمشیرِ قاتل نے کمی کرنے کے لحاظ سے پیمانہ لبریز نہ ہونا ایک لطیف رعایت ہے ؎

سر سے اک شعلہ لگا ایسا کہ ساری جل گئی　　کچھ نہ پوچھو ہم سے شمعِ انجمن کی سرگذشت

سر سے شعلہ لگ جانیکے بعد سرگزشت کا استعمال کسقدر مزے دار ہے ؎

ہم جانتے ہیں کوچۂ جانان کا مرتبہ　　مسجودِ خلق ہے یہ عجب سرزمین ہے

مسجودِ خلق ہونیکے لحاظ سے سرزمین کہنا بے مثل رعایت ہے

کہا تو نے نہ دیکھا کر مجھے، کیا عذر ہے مجھکو　　بجا لاؤنگا تیرا حکم تا مقدور آنکھوں سے

نہ دیکھنے کی تاکید کے بعد آنکھوں سے اُسکی تعمیل کرنا لفظی رعایت کی دنیا مین لاجواب مثال ہے

دردو غم، حسرت و تمنّا، اور یاس و ناکامی کے مضامین مین مرزا غالب نے میر تقی مرحوم کو اپنا پیشرو بنایا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بقول سید امداد اثر جذب و تاثیر کے لحاظ سے ان کے اشعار مین ایسی نشتریت ہے کہ دوسرے اُردو شعرا کے یہان ذرا کم دیکھنے مین آئیگی۔

یہی مضامین یاس و ناکامی شیخ مصحفی مرحوم کا حصہ ہین جیسا کہ ہم نے مماثلت میر و مصحفی کے سلسلے مین ثابت کیا ہے۔ اگرچہ شیخ مرحوم کے اشعار درد انگیز و حسرت خیز کی معقول تعداد درج کی جا چکی ہے۔ تاہم مرزا غالب کے مضامین زار نالی کے سلسلے مین گزیدہ اشعار کا ایک اور انتخاب پیش کیا جاتا ہے ؎

دردو غم کو بھی ہے مقدر شرط　　یہ بھی قسمت سوا نہین ملتا

گھیرے رہی اُسی کو گلستان مین رات برق　　جس شاخ پر چمن مین مرا آشیانہ تھا

اس طرف ہم ہونگے رخصت اُس طرف تو جا بہو　　کاٹ لے اے شمع اک شب گریۂ و زاری مین اور

کیا تھا جمع مال اپنا مصیبت یہ نہ سمجھا تھا　　ستارے برق ہو ہو کر گرینگے میرے خرمن پر

ہم اسیرانِ قفس لطفِ چمن کیا جانین　　کون بیٹھا تاہے نکہتِ گل و گلزار کے پاس

ہو چکے وہ دن کہ رشکِ قمر تھا رو برو　　مصحفی اب مین ہون تنہا اور شبِ تارِ خیال

اتنا نہین کوئی کہ خبر اُس کی آکے لے　　کب سے بجھا پڑا ہے چراغِ مزارِ دل

آیا نہ وہ تو صورتِ پروانہ جل گیا　　مین دیکھ کر چراغ سرِ شام کی طرف

نے محرمِ چمن نہ شناسائے باغ ہین　　ہم اپنے اس نصیب کے ہاتھون سے داغ ہین

زبان بریدہ سے اے ہم صفیر ہم بھی ہین　　جہان ہین اور قفس مین اسیر ہم بھی ہین

فلک کی خو نہین ایسون کی پرورش ورنہ　　شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہین

نہ تنہا ہم ہی مثل گل گریباں چاک رہتے ہیں
جو تیرے ملنے والے ہیں وہ سب غمناک رہتے ہیں

یار ہیں چیں بر جبیں سب مہرباں کوئی نہیں
ہمسے ہنسکر بولنے والا یہاں کوئی نہیں

وائے ناکامی کہ فریادی ہین ہم اس شہر مین
جُز خموشی داد رس اپنا جہان کوئی نہین

ہم جو تنہائی مین فریاد کیا کرتے ہین
وصل کی شب کے مزے یاد کیا کرتے ہین

کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آئے
اور جھپکے تو وہی خواب پریشان دیکھون

وصل کا روز جسے کہتے ہین سب اہل جہان
مین بھی وہ دن کبھی اے گردشِ دوران دیکھون

ہائے جن آنکھون سے دیکھا ہو رخ روزِ وصال
پھر انہین آنکھون سے روئے شبِ ہجران دیکھون

نہ یہ طاقت کہ اُسکی بزم سے اُٹھکر مین گھر جاؤن
نہ مقدور اسقدر مجھکو کہ قربان ہو کے مرجاؤن

ساتھ لیجائے کہان عشق کی رسوائی کو
گور بھی تنگ ملی ہے ترے سودائی کو

مین وہ بیکس ہون کہ مانند چراغ سرِ راہ
مر بھی جاؤن تو کوئی آ کے نہ روئے مجھکو

اس قدر چشمِ خلائق مین سبک ہون کہ اگر
ڈوبنے جاؤن تو دریا نہ ڈبوئے مجھکو

نہ یار ہے نہ کوئی آشنا ہے میرے ساتھ
خدا کے ساتھ ہون مین اور خدا ہے میرے ساتھ

ہم نے چاہا تھا کرینگے رخ جانان پہ نگاہ
رہ گئی ضعف سے آکر سرِ مژگان پہ نگاہ

عزم ہو تجھکو اگر برق ادھر آنے کا
پہلے کر لیجیو میرے سر و سامان پہ نگاہ

قصۂ کوتہی عمر جو چھیڑا اُس نے
شمع بھی روئی سحر تک ترے بیمار کے ساتھ

شاد رہیو تو اے شبِ ہجر
جھپکی نہین آنکھ مصحفی کی

جورِ فراق بھی ستم آسمان بھی ہے
دل کی طرف سے یاس بھی ہے خوفِ جان بھی ہے

دیکھون قفس مین گر کسی مرغِ اسیر کو
اتنا کہون کہ کچھ خبر آشیان بھی ہے

حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

ہزارون حوادث ہین تا زندگی ہے
یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

رشک ہے حالِ زلیخا پہ کہ ہمسے بدبخت
خواب مین بھی نہ کبھی وصل سے مسرور ہوئے

کاروان دور گیا پاؤن تھکے جی ہارا
کون اب منزلِ مقصود کو پہنچائے مجھے

ہم کیا کرین چمن مین گر پھر ہوا چلی ہے
اپنا دلِ فسردہ تصویر کی کلی ہے

سراغِ قافلۂ اشک کیجئے کیونکر
نکل گیا ہے یہ کوسون دیارِ حرمان سے

بیابان در بیابان ہر طرف آوارہ پھرتے ہین
نہین بھولے ہین ہم ایسے کہ ہمکو راہ یاد آئے

نہ غنچہ لائی نہ گل ارمغان ہزار افسوس ہمیں قفس میں نسیم بہار بھول گئی
جو کچھ شکستہ قفس کی بھی تیلیاں ملتیں تو ہم انھیں کو خس و خار آشیاں کرتے

مرزا غالب کی مضامین نگاری مسلّم ہے اُن کے خیالات کی پرواز بعض اوقات اس قدر بلند ہوتی ہے کہ سامعین اور ناظرین کا طائر فہم رسائی حاصل کرنے میں ناکامیاب رہ جاتا ہے۔ ایسی بلند پروازی اور علوِ تخیل کا طفیل ہے کہ آج جانشینان حضرت داغ کی طرح شارحین دیوان غالب کی بھی ایک معقول تعداد ہندوستان میں نظر آتی ہے

مصحفی مرحوم میر کی طرح بعید الفہم اور پیچ در پیچ مفاہم کو شانِ غزل گوئی کے منافی خیال کرتے تھے۔ وہ ایسی شاعری کے قائل نہ تھے۔ جسے سنکر سامع کا ذہن مصیبت اور دماغ کشاکش میں پڑ جائے۔ بلکہ ایسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ جو دماغ کے بجائے دلکو سرمایۂ لطف سے مالامال کردے۔ اسقدر تخالف طبائع کے بعد دونوں کے دیوان سے یکساں نسبت مضمون کی مثالیں بہم پہونچانا آسان کام نہیں۔ بایں ہمہ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جو بلحاظ الفاظ کتنے ہی متغائر کیوں نہ ہوں مگر بلحاظ معنی ایک دوسرے کے بالکل موافق ہیں۔ اور یہ شاید اثر اس بات کا ہے۔ کہ شیخ مصحفی کی طرح مرزا غالب بھی غزل گوئی میں نظیری نیشاپوری کے مقلد و متبع تھے

تمام موجودات عالم کو جن دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ان میں نیچا درجہ مادیات کا ہے اور اونچا مرتبہ مجردات کا۔ مجردات اپنی لطافت کے نامحسوس اور غیر مرئی ہیں۔ اور جب ظہور کرتی ہیں تو محسوس اور مرئی اشیا کے پردے میں ظہور کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام موجودات عالم کو انوار الٰہیہ کا مظہر اتم مانتے ہیں اور ہر صاحب دل کو مشورہ دیتے ہیں کہ معمورۂ عالم کی حدود سے گذر کر لق و دق میدان میں جلوۂ ذات کی تلاش کرنا فضول اور لایعنی ہے۔ شیخ مصحفی مرحوم کا شعر ہے۔

سُنسان دشت میں مجھے لے چل نہ اے جنون ظل درخت سایۂ دیوار کچھ تو ہو

کیونکہ بقول مرزا غالب ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ فصلِ بہاری کا

اشک ایک شریف جذبہ ہے کیونکہ حقیقی محبت محبوب کی کسی چیز کو بھی دوسروں کے حصے میں آتا گوارا نہیں کرسکتی شاعرانہ طور پر اسکی انتہا یہ ہوسکتی ہے کہ محبت کرنے والا خود اپنی ذات پر بھی رشک کرنے لگے شیخ مصحفی فرماتے ہیں۔

رشک اوروں سے جو ہے ہمکو ترے کوچے میں اپنے پیروں کے نشاں آپ مٹا جاتے ہیں

یعنی یہ کہ جب ہم ہی اس کوچہ سے جارہے ہیں تو ہمارے پاؤں کے نشان بھی یہاں کیوں رہ جائیں مرزا غالب کہتے ہیں۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

عاشقانہ شاعری مین خلوت اور وصل کے مرقع تمام شعرائے اُردو نے کھینچے ہین لیکن ایسے لوگ کم ہین جنہون نے لطیف طرز ادا کو ہاتھ سے نہ دیا ہو اور عشق و محبت کے دامن کو ابتذال کی آمیزش سے بچانے کی سعی کی ہو شیخ مصحفی مرحوم کہتے ہین

بیدار ہین طالع اُنھین لوگون کے جو ہر گز ۔۔۔ پاؤن پہ ترے رکھ کے سر اپنا نہ اُٹھائین

اور مرزا غالب کا شعر ہے۔

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتین اُسکی ہین ۔۔۔ جس کے شانے پر تری زلفین پریشان ہوگئین

وصل اور خوش نصیبی کی نقشہ کشی اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔

معشوق کی جفا جفا سہی لیکن اس سے کم سے کم اتنا پتہ ضرور چل جاتا ہے کہ اُس نے اپنے عاشق کو فراموش نہین کیا۔ یہ فراموش نکرنا عاشق کے لئے سرمایۂ تسکین و موجب سکون ہے کیونکہ اس سے باہمی تعلق باطن کا ثبوت ملتا ہے۔ اور عاشق دنیائے محبت مین بالکل ہی دامن نہین رہتا۔ اسلئے شیخ مصحفی فرماتے ہین ؎

دیتے نہین جو داد تو بیداد کیجئے ۔۔۔ یعنی کسی طرح تو ہمین یاد کیجئے

اور مرزا غالب کہتے ہین

اب جفا سے بھی ہین محروم ہم اللہ اللہ ۔۔۔ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

اس یقین کے ساتھ کہ دن، رات کا اور بادشاہ کسی گدا کا مہمان نہین ہو سکتا کوئی دردمند اپنے مسیحائے درد دل کو یکلخت اپنے سامنے دیکھے تو اسکے سوا کیا حالت ہو سکتی ہے کہ کبھی مکان کو دیکھے کہ بدل تو نہین گیا کبھی آنے والے کو دیکھے کہ دھوکا تو نہین ہوا یا آخر درجے پر سوچنے لگے کہ مین خواب تو نہین دیکھ رہا شیخ مصحفی کہتے ہین

مین ہون اور خلوت ہے اور پیش نظر معشوق ہے ۔۔۔ ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہون خواب سا

اور مرزا غالب برجستگی کے اضافہ کے ساتھ بیان کرتے ہین۔

وہ آئین گھر مین ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔۔۔ کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہین

ایک مذہبی مسئلہ ہے کہ طالبانِ دیدارِ خداوندی قیامت کے دن دیدار خداوندی سے شرف اندوز ہونگے۔ فلسفیانہ طور پر اسکے دلائل کچھ ہی کیون نہ ہون لیکن شیخ مصحفی مرحوم کے خیال مین شاعرانہ حیثیت سے اسکی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ۔

شاید اُسکے حسن مین باقی ہے آرائش ہنوز ۔۔۔ روزِ محشر پر جو رکھا وعدۂ دیدار کو

مرزا غالب کا خیال بھی یہی ہے لیکن وہ دلیل سے کام لینا ضروری نہین سمجھتے بلکہ محوِ آرائش ہستی کے انہماک خود آرائی پر

ایک نفیس نقاب اور ڈال دیتے ہین

آرائشِ جمال سے فارغ نہین ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب مین

اہلِ درد کے خیال مین دردِ عشق راحتِ باطن کا موجب اور لطفِ زندگی کا سرمایہ ہونے کے باعث ایسی قابلِ قدر چیز ہے کہ جیتے جی ہاتھون سے نہین کھونا چاہئے۔ اسلئے وہ ہمیشہ ایسے زخم کی تمنا کرتے ہین جو مندمل ہوکر خندہ زنی کا سبب نہ بنے۔ اور قیامت تک اپنی تری و تازگی کو بحال رکھے کیونکہ علاج پذیر زخم کی تمنا کرنا بوالہوسی مین داخل ہے شیخ مصحفی فرماتے ہین

وہ زخم چاہتا ہون تری تیغ تیز کا جو روزِ حشر منہ پہ میرے خندہ زن نہ ہو

اور مرزا غالب کہتے ہین۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھدیجو یارب اُسے قسمت مین عدو کی

منزلِ تسلیم و رضا مین پہونچ جانیکے بعد عاشق کو رغبت و نفرت کا احساس نہین رہتا اب وہ اس حالت مین ہوتا ہے کہ معشوق کے ہر حکم پر گردن جھکانے اور ہر کام کو بہ نظرِ استحسان دیکھنے کے علاوہ کچھ نہین جانتا۔ حتیٰ کہ معشوق کو غیر کے ساتھ گرم اختلاط دیکھ کر بھی خاموشی سے کام لیتا یا عاجزانہ الفاظ مین اس تفریق سلوک کی طرف اشارہ کردیتا ہے۔ شیخ مصحفی کہتے ہین۔

غیر سے گرم ملو ہم پہ یہ بیداد رہے اور تو کیا کہین ہم تمسے مگر یاد رہے

مرزا غالب کہتے ہین۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اہلِ باطن کے لئے دنیا ایک قید خانہ ہے عیش و عشرت کا زمانہ ہو یا رنج و غم کے ایام۔ ان کی حالت مین کسی قسم کی تبدیلی نہین ہوتی۔ ہر موسم بہار کی آمد کے وقت دلمین اُمنگ اور طبیعت مین ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کنج قفس سے نکل کر جسے دنیا والے جسم کہتے ہین اپنے گلشن مقصود کی سیر کرین لیکن بدقسمتی سے کوئی موقع نصیب نہین ہوتا۔ اور یہی سوچتے سوچتے ایک عرصہ دراز منقضی ہو جاتا ہے۔ شیخ مصحفی فرماتے ہین

فصلِ گل سو بار آئی ہم نہ چھوٹے قید سے بند ہین کنج قفس مین ایک مدت ہو گئی

مرزا غالب کہتے ہین۔

خزان کیا فصلِ گل کہتے ہین کس کو کوئی موسم ہو وہی ہم ہین قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

عشق کا لازمہ ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے جفائین سہے تکلیفین اُٹھائے بعض اوقات صبر و سکون سے کام لے

اور بعض اوقات آہ و زاری کا شغل کرے موقع حاصل ہو تو درد دل کہے اور جہانتک ممکن ہو دعوئ عشق مین ثابت قدم اور راہ وفا مین مستقل رہے لیکن جب تمام ترکیبین بے سود ثابت ہوتی ہین۔ اور ناآشنا معشوق کے آشنا ہونیکی کوئی صورت باقی نہین رہتی تو زندگی وبال ہوجاتی ہے اور پھر ایک منٹ بھی زندہ رہنے کو جی نہین چاہتا ایسی حالت مین معشوق کی غیر متغیر سرد مہری عاشق کو عشق و وفا کے دائرہ سے خارج کردیتی ہے اور جب یہ مایوس محبت مرنیکے لئے تیار ہوجاتا ہے تو اُسکے خیال مین بندشِ حیات سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے کسی مخصوص جگہ کی قید نہین رہتی ایسے شیخ مصحفی فرماتے ہین

کوچہ ہو ترا یا کسی مقتل کی زمین ہو   مرنا ہی ہمین مد نظر ہے تو کہین ہو

اور مرزا غالب کا شعر ہے۔

وفا کیسی کہان کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستان کیون ہو

بے پروائی حسن کا شیوہ ہے اور عیش و عشرت مین استغراق بے پروائی کا نتیجہ اسلئے معشوق بزم نشاط کو آراستہ اور دور صہبا کو قائم رکھے اور دردمند محبت کی طرف خیال بھی نہ کرے تو چندان حیرت انگیز نہین البتہ عاشق کو اپنی کم نصیبی و نارسائی پر گریہ و زاری کرنیکی وجہ ہے کہ معشوق کی محفل عشرت مین باریاب نہین۔ شیخ مصحفی مرحوم کہتے ہین

شب تری مجلس مین وان دور قدح چلتا رہا   تا سحر یان آنسوؤن سے سبحہ گردانی ہوئی

دورِ قدح کے ساتھ سبحہ گردانی تازگی مضمون کی بہترین مثال ہے اسی حالت کا نقشہ مرزا غالب اس طرح کھینچتے ہین

وان خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال   یان ہجوم اشک مین تارِ نگہ نایاب تھا

اہل عشق جانتے ہین کہ عشاق کے رنج و راحت اور تکلیف و آرام کا سرچشمہ معشوق ہے ایک ہی ہستی کسی وقت روح کو توانائی اور دماغ کو سکون پہنچاتی ہے اور دوسرے وقت طبیعت مین ہیجان اور دل مین اضطراب پیدا ہونے کا سبب ہوتی ہے گویا دنیائے محبت مین موت و حیات ایک معنی رکھتی ہے شیخ مصحفی مرحوم کہتے ہین۔

مُردونکو جلاتی ہے ترے پاؤن کی ٹھوکر   اس چال پہ مرنا ہے بجا ایک دری کا

مطلب یہ ہے کہ ایسے معشوق کی رفتار پر جان دینا بالکل درست ہے جس کے پاؤن کی ٹھوکر مردون کو زندہ کرتی ہے کیونکہ ادہر جان دینے والا جان دیگا اور اُوہر زندہ ہوجائیگا مرزا غالب اسی مفہوم کو یون ادا کرتے ہین

محبت مین نہین ہے فرق مرنے اور جینے کا   اُسی کو دیکھکر جیتے ہین جس کافر پہ دم نکلے

دونون شعرون مین محاورات نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال ہوئے ہین البتہ مفہوم اصلی مرزا غالب کے یہان ذرا نمایان ہے اور شیخ مصحفی کے یہان دربردہ۔

اسبابِ طرب جتنے تھے موجود تھے لیکن　　ہمت مری طالب نہ ہوئی چرخِ دنی سے　　مصحفی
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم　　لے لیا مجھسے مری ہمتِ عالی نے مجھے　　غالب

حیراں ہے کس کا جو سمندر　　مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے　　مصحفی
کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا　　آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے　　غالب

نہ گیا اُس پری کو خط لکھنا　　ہاتھ جب تک میرے قلم نہ ہوئے　　مصحفی
لکھتے رہے جنون کی حکایات خونچکان　　ہر چند اس مین ہاتھ ہمارے قلم ہوے　　غالب

رکھ کے ہم زانو پہ جس وقت کہ سر بیٹھ گئے　　یہ سمجھ لیجئو کہ ہمسایون کے گھر بیٹھ گئے　　مصحفی
یون ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہان　　دیکھنا ان بستیون کو تم کہ ویران ہو گئین　　غالب

عکس آئینہ مین دیکھا تو گیا ہاتھ سے دل　　آپ ناظر ہوئے وہ آپ ہی منظور ہوئے　　مصحفی
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا　　غالب

بے کسی پر رحم آتا ہے اگر مین مر گیا　　پھر کہان اسکا ٹھکانا دربدر ہو جائیگی　　مصحفی
آتا ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب　　کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد　　غالب

مرزا صاحب مرحوم کی یکتائے روزگار اور یگانہ روش عام طبیعت کا اقتضا تھا کہ اپنے لئے زمینین جداگانہ اختیار کرے پھر بھی پانچ سات غزلین ایسی ہاتھ آگئی ہین جن مین دونون باکمالون نے طبع آزمائی کی ہے۔ انہین کے چند ہمقافیہ اشعار ذیل مین درج کئے جاتے ہین۔ ہم قافیہ اشعار کا تقابل کرتے ہوئے شیخ مصحفی و مرزا غالب کے زمانۂ شاعری کے فصل و بعد اور رنگ شاعری کے اختلاف کو نظر انداز نکرنا چاہئے۔ کیونکہ دو شاعر ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے مماثل نہین ہو سکتے۔

مجھے اشکون مین یون لختِ جگر بہتے نظر آئے　　کہ جیسے وقتِ شب دریا مین عالم ہو چراغان کا　　مصحفی
دکھاؤن گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے　　مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغان کا　　غالب

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پر　　نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوال زنداں کا　　مصحفی
ہنوز اک پرتو نقشِ خیالِ یار باقی ہے　　دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا　　غالب

شبِ مہتاب میں کیا کیا سماں ہمکو دکھاتا ہے　　بکھرنا چاند سے چہرے پر اس کی زلفِ پریشاں کا　　مصحفی
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب　　کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا　　غالب

نہ مجھ سا قدردانِ ظلم ہوگا میں وہ رہرو ہوں　　دئیے ہیں تازیانے کھا کے بوسے دستِ رہزن پر　　مصحفی
فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر　　غالب

جو چاہا دل نے وہ ہم نے نہ چاہا واہ ری ہمت　　رہیگا حشر تک خونِ تمنا اپنی گردن پر　　مصحفی
جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی　　گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر　　غالب

اسیری گر مقدر ہے تو ہرگز غم نہ کھا اُس کا　　گراں قمری کو کب ہے طوق اپنا اپنی گردن پر　　مصحفی
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے　　کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر　　غالب

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز　　اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز　　مصحفی
اسد اللہ خاں تمام ہوا　　اے دریغا وہ رندِ شاہد باز　　غالب

زلف جھک کر سلام کرتی ہے　　رُخ کو اور رُخ کے ہے عمر دراز　　مصحفی
تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　میں اور اندیشہائے دور دراز　　غالب

اس کا آہستہ بولنا ہے غضب　　رتبہ ہے قہر نرمیٔ آواز　　مصحفی
نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز　　غالب

اے صبا اُس گلی میں گر جائے　　کہیو میرا بھی تو سلامِ نیاز　　مصحفی
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو　　ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز　　غالب

آنے دیتا ہے مجھے بزم مین اپنی وہ کب | جس نے دم بھر نہ دیا بیٹھنے دیوار کے پاس | مصحفی
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے | بیٹھنا اُسکا وہ آ کر تری دیوار کے پاس | غالب

کون آتا ہے عیادت کو دلِ زار کے پاس | لوگ سب جمع ہین اُس نرگس بیمار کے پاس | مصحفی
مُند گئین کھولتے ہی کھولتے آنکھین ہے ہے | خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس | غالب

آیا تھا کون بند کھلے رات باغ مین | جو آج چاک چاک ہے جیب قبائے گل | مصحفی
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو | جس کا خیال ہے گلِ جیب قبائے گل | غالب

اسکا ہی سبب ہے جو گرمِ فغاں نہین | میرا تو اِس چمن مین کوئی ہمزباں نہین | مصحفی
پاتا ہون داد اُس سے کچھ اپنے کلام کی | روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہین | غالب

یہ جسمِ زار روح کو کیونکر وبال ہو | دوشِ ہوا پہ نکہتِ گل کچھ گراں نہین | مصحفی
نقصاں نہین جنون مین بلا سے ہو گھر خراب | سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہین | غالب

حیراں سا کچھ ہے اسے ہو گیا ہے کیا | آئینہ کس کے حسن کا آئینہ دار ہے | مصحفی
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی | اے بیدماغ آئینہ تمثال دار ہے | غالب

حیراں ہون اسقدر کہ شبِ وصل بھی مجھے | تو سامنے ہے اور ترا انتظار ہے | مصحفی
کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا | آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے | غالب

کیا جانئے اکسیر ہے عنقا ہے یہ کیا ہے | ملتی نہین جو چیز زمانے مین وفا ہے | مصحفی
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت | دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے | غالب

افسر امروہوی

افسنٹ کی بیع ممنوع قرار دیدی تھی۔ تو وہاں بھی یہی ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ مگر آج دن وہاں ہر قسم کی شرابون کا استعمال جائز سمجھا جاتا ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ نفس کو اباحت مین اگرچہ بعض نقصان ہون راحت ملتی ہے اور ممنوعات سے اگرچہ اس مین بعض فوائد ہون تکلیف ہوتی ہے اشیاء ممنوعہ کی طرف خواہ مخواہ کے لیئے ہر شخص کی طبیعت راغب ہوتی ہے چنانچہ امریکہ کے تازہ شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت کی زمانہ مین مینوشون کی تعداد اباحت کے زمانہ سے کہین زیادہ ہوگئی ہے

ایسے معاملات کے اندر درحقیقت کسی قانونی تشدد کے بجائے صرف ممانعت زیادہ سودمند ثابت ہوتی ہے کسی جماعت کو کسی زبون عادت کی ممارست یا کسی برُے طریقہ کو اختیار کرنے سے منع کردینا بلحاظ نتیجہ اس سے زیادہ اچھا ہے کہ ان پر کسی قسم کی جبر و سختی کیجائے مہدی جب سوڈان کا بادشاہ ہوا تو اُم درمان (پایۂ تخت سلطنت) مین یہ حکم نافذ کیا کہ تمام لوگ نماز پڑھنے کے لیئے جامع مسجد مین حاضر ہون۔ جو شخص مسجد مین نہ آئیگا اور گھر پر نماز پڑھے گا اسکو سزا دیجائیگی، اسی طرح انگلینڈ مین ملکہ الزابتھ نے بھی اتوار کے دن گرجا مین تمام لوگون کے جمع ہونیکی ایک تہدیدانہ نوٹس جاری کی لیکن ان سختیون کا کیا نتیجہ نکلا؟ تاریخ شاہد ہے کہ تھوڑے ہی دنون مین ان تمام زبردستیون کے دروازے خود بخود بند ہوگئے۔

بعض تصنیفات و تالیفات بھی ممنوعات مین داخل ہین، مصر مین ڈاکٹر طہٰ حسین کی مشہور تصنیف "الشعر الجاہلی" جب ممنوع قرار دیدیگئی تو پبلک نے بڑی توجہ کے ساتھ اسکی خریداری شروع کی حتیٰ کہ اُس کا ایک ایک نسخہ گنیون میں بکا اسی طرح یورپ مین بہت سی ایسی کتابین ہین جن کا پڑہنا کیتھولک فرقہ والون کو ممنوع ہے

کبھی ان اشیاء کی ممانعت مین جن سے مباح ہونے مین کوئی نقصان نہین ہے حکمرانون کی ہوا و ہوس بھی شامل ہوتی ہے۔ امریکہ کی کسی ولایۃ مین یہ قانون نافذ ہوا کہ اتوار کے دن زوجین ایکدوسرے کا بوسہ نہ لین، اس لئے کہ یہ دن نماز و دعا کا دن ہے، اس دن اس قسم کی ملاعبت جائز نہین ہے، حاکم بامر اللہ فاطمی نے مصر مین یہ حکم جاری کیا تھا کہ لوگ ملوخیہ کو نہ استعمال کرین، لیکن یہ دونون قانون کتنے دن قائم رہے؟ فلاحین مصر برابر ملوخیہ کو کھاتے رہے اور امریکہ مین زوجین ہمیشہ ایکدوسرے کا بوسہ لیتے رہے قانونی ممانعت کی کبھی کچھ پروا نہ کی گئی۔

قوانین و شرائع کے محرمات خواہ مخواہ کے لیئے لوگون کو ممنوعات کی طرف مائل کردیتے ہین۔ اور جب وہ چیز انکو دستیاب نہین ہوتی تو وہ اس سے بھی زیادہ مضر چیزون کو استعمال کرنا شروع کردیتے ہین مثلاً اگر کسی شخص کو مینوشی سے روکدو تو وہ افیون یا بھنگ کا ضرور عادی ہوجائیگا۔ یا اگر کسی نوجوان کی شادی نہ کرو تو یقیناً وہ بری عادتون مین مبتلا ہوجائیگا۔ پس ضروری ہے کہ دنیا کی تمام چیزون مین اباحت مد نظر رکھی جائے اور حرمت کا دائرہ صرف انہی چیزون تک محدود ہونا چاہیئے۔ جن کا نقصان واضح اور عامۃ الناس کو شامل ہو۔

دنیا مین آج تک جماعت ایسی نہین پیدا ہوئی، جسکی تاریخ مین اوامر و نواہی کی ایک بڑی تعداد نہو۔ مصر مین

لوگون کو قہوہ نوشی پر درے لگائے گئے کرومویل کے زمانہ حکومت مین انگلینڈ کے اندر بھٹیون کو مقفل کیا گیا۔ جینوا اور زیورخ مین سولھوین صدی مین ناچ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن باینہمہ سب جانتے ہین کہ قاہرہ مین اب تک قہوہ پیا جاتا ہے زیورخ وجینوا مین ناچ مباح ہے۔ اور لندن مین درتشیل تعلیم و تربیت کا گھر سمجھی جاتی ہے

بدر اصلاحی

جماعت و فرد کا موازنہ

موجودہ زمانہ مین جماعت کے فیصلے غیر معمولی اہمیت اختیار کرتے جاتے ہین کارگاہ عالم کے تقریبًا تمام شعبون مین جماعت ہی کے "اشارۂ ابرو" اور "جنبشِ لب" پر سارا کام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ملک مین ایک پارلیمنٹ ہوتی ہے، جس کے متفقہ احکام نافذ ہوا کرتے ہین۔ اور ملک کے گوشہ گوشہ مین نیکی و احسان، تعلیم و تعلم، تہذیب و اخلاق وغیرہ کی بہت سی کمیٹیان قایم ہین جو اکابر ملک کے متفقہ فیصلون کی تبلیغ کرتی ہین غرض یہ کہ عصر حاضر مین حکمت اجماع پر لوگون کا ایمان غیر معمولی طور پر راسخ ہو چکا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جماعت مین خود کوئی قابل احترام عظمت نہین ہے بلکہ ہماری نشو و نما چونکہ ایسے ماحول مین ہوئی ہے جہان سیاست یا ملک، مذہب یا ملت ہر ایک شعبہ مین "خارج از جماعت" کی تحقیر کیجاتی ہے۔ اس لئے ہم سب لوگ جماعت کا احترام کرتے ہین اور یہ سمجھتے ہین کہ جماعت کی رائے ہمیشہ فرد کی رائے سے اچھی ہوتی ہے یا کم از کم اگر اس سے بلند نہین ہوتی تو پست بھی نہین ہوتی خصوصًا جبکہ وہ فرد بھی ایسی جماعت کا ایک عضو ہو ورنہ حقیقت مین جماعت کی رائے ہمیشہ فرد کی رائے سے گری ہوئی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ عام ناظرین کو میری اس ناچیز رائے سے اتفاق نہو، لیکن جن دلائل کی بنا پر مین اس خیال تک پہونچا ہون انکو ذیل مین عرض کرتا ہون آئندہ ناظرین کو اختلاف رائے کا حق حاصل ہے۔

جماعت کی رائے فرد کی رائے سے فروتر ہوتی ہے

انسان مین چونکہ ایک استمراری ترقی پائی جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس میدان مین نہ تو کبھی کسی حد پر ٹھہرا ہے اور نہ آئندہ کبھی ٹھہریگا۔ آدم کے تمام بیٹے "غرائز قدیمہ" کے اعتبار سے تو باہم مساوی ہوتے ہین۔ مگر "غرائز جدیدہ" کے اعتبار سے انمین فرق ہوتا ہے۔ مثلًا کھانے اور پینے، دوستی اور محبت، قتل اور قتال، خوف اور دہشت مین ہم سب برابر ہین، اس لئے کہ یہ "غرائز قدیمہ" ہین، جو انسانی طبیعتون مین ازمنہ قدیمہ سے راسخ ہو چکی ہین، اور فہم و ذکا مین (جو غرائز جدیدہ ہین) ہم سب متفاوت ہین، اسبارہ مین لوگونکی مثال بعینہ ویسی ہے جیسے جماعت مین طبقۂ متعلمہ کی! غور کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ اس جماعت کے تمام افراد کا اشتراک صرف اس قرأۃ و کتابۃ کی معرفت مین ہوگا جسکو ان لوگون نے عہد طفولیت مین سب سے پہلے سیکھا ہے اس کے علاوہ تاریخ یا جغرافیہ ریاضی یا ہندسہ، منطق یا فلسفہ، ادب یا ہیئت وغیرہ علوم و فنون مین وہ بالکل ایک دوسرے سے الگ ہونگے۔ دوسرے لفظون مین یون سمجھو کہ اگر کسی طبقۂ متعلمہ کے افراد کو جمع کیا جائے اور تعلیم کے متعلق ان سے ایک ایسی اجماعی رائے لی جائے جسپر ساری جماعت کا اتفاق ہو تو یہ رائے کبھی بھی قرأۃ و کتابۃ کی حد سے آگے نہ بڑھے گی۔ اسلئے کہ یہی دونون چیزین ایسی ہین، جن مین اس جماعت کے تمام افراد بلا استثنا مشترک ہین باقی تاریخ یا جغرافیہ، ریاضی یا ہندسہ ادب یا منطق کسی فن مین بھی وہ سب ایک ہی رائے پر اتفاق نہ کرین گے اس لئے کہ سب نے اسکو سیکھا نہین ہے۔ اور ہر شخص کا ذوق مختلف

ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی حال ہر اجتماع مین جماعت کا بھی ہوتا ہے۔ "افراد جماعت" چونکہ "غرائز قدیمہ" مین متساوی ہوتے ہین اور "غرائز جدیدہ" مین متفاوت! اس لئے کسی ایک ہی چیز پر تمام افراد کا اجتماع قطعاً ناممکن ہے۔ اور "جدید" چونکہ "قدیم" سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے (اسکی واضح مثال "ذکاء" ہے کہ یہ تمام غرائز قدیمہ سے ترقی یافتہ ہے) اس لئے افراد کی منفرد عقل بھی جماعت کی مجمع عقول سے کہین زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ جماعت والے اسی چیز پر اجتماع کرینگے جس مین وہ سب باہم مشترک ہونگے۔ اور یہ معلوم ہوچکا ہے کہ ان کا اشتراک "غرائز جدیدہ" مین نہین ہوسکتا۔ بلکہ وہ صرف "غرائز قدیمہ" مین مشترک ہوتے ہین اس لئے "غرائز جدیدہ" مین ان کا اجتماع ناممکن ہی نہین بلکہ قطعاً محال ہے۔

اگر یہ صحیح ہے جسکو ہمنے ابھی بیان کیا ہے۔ تو ضرورت ہے ان لیڈرون کی جو سواد امت کے دلون کے مالک ہین، ایک ایسے شخص کی جو انسانون مین "ذکاء" کو نہین بلکہ "غرائز" کو مخاطب بناتا ہو۔ اسلئے کہ ذکاء ایک جدید چیز ہے، اسپر تمام افراد کا اجتماع ناممکن ہے۔ پس ایک زعیم کے زعامت کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ جازم ہونے کے علاوہ "ایحاء" کو بالقصد جماعت کے ساتھ استعمال کرے۔

"ایحاء" اس تاثیر کو کہتے ہین جسکو انسان ایسے ہی مواقع پر محسوس کیا کرتا ہے اس تاثیر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ زعیم جو چاہتا ہے اسکو لوگ ہنسی خوشی کے ساتھ انجام دیتے ہین۔ یہ تاثیر خطیب کی جانب سے وجاہت ظاہری، حسن صورت و سیرت یا شیخوخت کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن منطق سے کبھی بھی یہ بات حاصل نہین ہوسکتی۔

"ایحاء" یعنی اس تاثیر سے ہم ہمیشہ بلا اختیار متاثر ہوتے ہین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطیب جو ہمارے سامنے اپنے اغراض پیش کرتا ہے اس کا مخاطب دراصل ہماری "عقل باطن" ہوتی ہے۔ اور "عقل باطن" چونکہ "عقل داعی" سے فروتر ہوتی ہے اس لئے جب ہم کسی اجتماع مین سیاسی یا دینی خطیب کے سامنے جمع ہوتے ہین تو اپنی اہم ترین صفت "ذکاء داعی" سے مجرد ہوکر "ایحاء" سے متاثر ہوجاتے ہین

اجتماع کی حالت مین "ایحاء" اس ذکاء کے قایم مقام ہوتا ہے جو انفراد کے وقت ہماری سب سے غالب صفت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظون مین یون سمجھو کہ اجتماع کی حالت مین فرد گر جاتا ہے اور انفراد کی حالت مین بلند ہوجاتا ہے

غرض یہ کہ ہم اجتماع کی حالت مین ترقی کے زینون پر ہرگز نہین چڑھ سکتے اس لئے کہ اسوقت ہم "عقل داعی" سے بالکل مجرد ہوجاتے ہین اور صرف "عقل باطن" ہماری رہبر و پیشوا ہوتی ہے۔ جو اس کام کے قابل نہین۔

امراض جماعت

بہر حال یہ ثابت ہوچکا کہ افراد جماعت چونکہ "ذکاء جدیدہ" مین مشترک نہین ہوتے بلکہ ان کا اشتراک محض "غرائز قدیمہ" مین پایا جاتا ہے، اس لئے انسان اجتماع کے وقت اپنی انفرادی حالت سے بہت زیادہ نیچے آجاتا ہے۔ اور جدید نفسلوجی بحثون سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوچکی ہے کہ کا بوس صرف ان جذبات مکتسبہ کی بدولت

پیدا ہوتا ہے جنکو ہم عالم بیداری میں اپنے اندر محسوس کرلیتے ہیں۔ چنانچہ "عقل داعی" جب غافل ہوجاتی ہے تو نیند میں لوگ بولنے لگتے ہیں، کابوس میں ہمارا رد عمل اور مسالک بعین اسلاف قدماء کا مسالک ہوتا ہے۔ وہ خوف کا جواب "جمود" سے دیا کرتے تھے اور اسی "جمود" کے باعث وہ درندوں کے بے پناہ حملوں سے محفوظ رہتے تھے حتی کہ اسوقت بھی بعض حیوانات ناگہانی حادثات کے موقعہ پر بالکل ساکن اور خاموش ہوجاتے ہیں لومڑی اس فن کی بڑی ماہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بھی جب کابوس میں ڈراونی چیزوں کو دیکھتے ہیں تو مطلق حرکت نہیں کرتے۔

اس کا واضح منشا یہ ہے کہ ہم کابوس میں قدیم حیوانی عقل سے غور و فکر کا کام لیتے ہیں اس لئے کابوس کی اصل ہی "طبع قدیمہ" کا احتباس ہے، ٹھیک یہی حال ثورہ میں جماعت کا بھی ہوتا ہے، جماعت کے اندر ثورہ علت اولی کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسا فرد میں کابوس! "احتباس عواطف" اور "قدیم حیوانی مسالک" کا نام کابوس ہے اور "ثورہ" اس ہنگامہ کو کہتے ہیں جسکی آگ عرصہ سے اندر ہی اندر سلگ رہی ہو اور ایکدن دفعۃً مشتعل ہوجائے ایسے ہنگامہ میں انسان وہ سب کچھ کرتا ہے جس کا علاقہ دہشت اور بربریت سے ہوتا ہے۔ خزانوں کو برباد کرنا، اغنیاء کو لوٹنا، دور حکومت کو زیروزبر کرنا، لیڈروں اور زعیموں کو قتل کرنا، مستورات کی بے عزتی کرنا، معصوم بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا۔ اپاہج اور مجبور بوڑھوں کی جان مارنا اس ہنگامہ کی ایک ادنی کرشمہ سازی ہوتی ہے۔ فرانس کے ثورۃ الکبریٰ میں یہ تمام انسانیت سوز اور خونی معرکے ہوچکے ہیں

عبرت بہر حال اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ کسی ایسی رائے یا عقیدہ پر یقین نہ لایا جائے جو بہت سے لوگوں کا متفق علیہ خیال ہو۔ دوسرے اس ضغط و فشار کی حمایت کیجائے جو کابوس کا باعث ہے۔ دنیا میں وہ سی جماعت نے دیکھا جو قیصر روس کو تنہا شیوعیتہ میں نظر آیا؟ بلکہ قیصر نے خود روس کے ساتھ جو کچھ کیا وہ دنیا کی کس جماعت نے کس کے ساتھ کیا؟

بدر اصلاحی

مومن وکلام مومن

(بسلسلۂ سابق)

۱۔ "الفاظ" کے اہتمام مین اور ان کی ترکیب و ترتیب مین ایسا کمال دکھایا ہے کہ جو لفظ جس جگہ، جس طرح جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے رکھ دیا ہے۔ اس کے سوا دوسرا لفظ لانا استاذۂ فن کے لئے بھی دشوار ہے۔

۲۔ "مومن" کا یہ کمال دیکھئے کہ ان کی جدت پسندی نے غزل، قصیدہ، مثنوی۔ واسوخت کے لئے حتی الوسع الفاظ بھی علحدہ کر دیئے ہین

۳۔ جس طرح شکسپیر نے اپنے لئے ڈرامے کا میدان علحدہ کیا ہے، "مومن" نے غزل کا اقلیم اپنے لئے درست کر لیا ہے، جس مین وہ مالک تخت و تاج ہین، اس مین اس کا اضافہ کر لیجئے کہ انہون نے قواعد مقررہ کو پامال نہین کیا ہے

۴۔ تمام دیوان عشق حلال کا مرقع ہے یعنی وہ تمام شاعرون کی طرح امرد پرستی نہین کرتے بلکہ ان کا عشق خود پاک اور تصوف کے پاک دامن سے چھنا ہوا ہے۔

امرد پرستی کے جذبات نے بڑے بڑے متقی اور متورع شعرا کا دامن بھی داغدار بنا دیا ہے۔ مثلاً میر صاحب کہتے ہین:۔

ستم ہین قہر ہین لونڈے شراب خانے کے اتار لیتے ہین عمامہ پیر منا زی کا

اس شعر میں لونڈے کے لفظ نے سخت تنغص پیدا کر دیا ہے۔ دوسرا شعر اس سے مہذب دیکھئے:۔

خط منہ پہ آئے جانان خوبی پہ جان دے گا ناچار عاشقون کو رخصت کے پان دیگا

دوسرے دور مین مصحفی کو دیکھئے:۔

مان کہنے کو مرے امرد پرستون سے نہ مل صاف چہرے پر ترے خط کا ابھی آغاز ہے

تیسرے دور مین آتش بھی اس مین مبتلا ہین:۔

سبزے سے خط یار کے ہوتا ہے غم غلط کیونکر کہین نوشتہ قسمت کو ہم غلط

مومن کے معاصر ذوق بھی اسی رنگ مین کہتے ہین:۔

ذوق ہے ایک رند شاہد باز دخل کیا اس کو پارسائی مین

اگرچہ اُردو شعرا نے اس مضمون مین فارسی کی تقلید کی ہے لیکن "مومن" نے اس کو محسوس کر کے اپنی راہ الگ بنائی جو محفوظ بھی ہے اور خوشنما بھی مومن نے نہ تو امرد پرستی کی ہے اور نہ کُھلّم کھلاّ "لیلےٰ" عذرا، سلمیٰ کو معشوق بنایا ہے بلکہ اپنے راز عشق کو معشوق پردہ نشین کے حوالہ کر دیا ہے، وہ اپنی غزلون مین لفظاً جا بجا اس کا ذکر کرتے ہین اور معناً اس کی مناسبت سے

لطیف مضامین پیدا کرتے ہین۔ مثلاً کہتے ہین:۔

ہجر پردہ نشین مین مرتے ہین　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے

اہل ذوق سمجھ سکتے ہین کہ "مومن" نے اس بدعت سے کتنی دلنشین ایجاد کی ہے دیوان کے اکثر غزلون مین اس رعایت سے لطیف اور بلیغ اشعار موجود ہین۔

۵۔ "مومن" نے غزل مین خمریات کے مضامین کم رکھے ہیں جسقدر ہیں ان میں بھی مومن بہکے نہین ہین یہی وجہ ہے کہ اکثر نقادون کو دھوکھا ہوا ہے کہ "مومن" کے یہان تصوف نہین اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

اس کی وجہ "مومن" کی غیر معمولی متانت اور غیرت ہے۔

۶۔ رندانہ مضامین مین وہ کبھی جادۂ شریعت سے بے لگام آگے نہین بڑھے مصحفی کا ایک شعر ہے:۔

یارب کبھی وہ دن ہو کہ خلوت مین وہ صنم　　کھلوائے اپنے بند قبا میرے ہاتھ سے

خدا سے اس قسم کی دعا اور تمنا کرنا بالکل اس کے مشابہ ہے کہ کوئی کہے" خدایا آج میری چوری کامیاب کرنا" یا جوئے مین پانسہ میرے ہی موافق پڑے۔

اس قسم کی دعائین اور تمنائین ترک ادب مین داخل ہین۔

۷۔ "مومن" کے خمیر مین عشق کا سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس پر تصوف کے حلقہ بگوش نے آگ بنا دیا ہے لیکن اس آگ مین خود ہمیشہ جلے مگر دوسرون کو اس کی گرمی سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ وہ شراب عشق کے متوالے ہین پیتے ہین مگر بہکتے نہین

۸۔ ان کی غزلون مین ضمنی طور پر علوم طبعیات و فلسفہ، حکمت، طب، نجوم، جفر و رمل موجود ہین لیکن اس طرح کہ وہ بھی جذبات غزل میں گم ہین علیحدہ معلوم نہین ہوتے جیسا کہ مثال مین دیکھا یا گیا ہے، آیندہ ایک موقع اس کے اظہار کا اور آتا ہے۔

اکثر ارباب نظر کو دھوکھا ہوا ہے وہ سمجھتے ہین کہ "مومن" کے کلام مین یہ علوم نہین۔

۹۔ "مومن" نے اپنی غزلون کے مناسب بحرین اور موزون ردیف اور قافیے تجویز کئے ہین اس مناسبت اور موزونی مین ترنم، نغمات، موسیقی کو بہت کچھ دخل ہے۔

۱۰۔ بعض فارسی مضامین رکھ لئے ہین تو اس طرح کہ اردو مین وہ آکر گم ہو گئے ہین اگر مالک زبان (فارسی کا شاعر) تلاش کرنا چاہے تو اس کو بھی دستیاب نہین ہو سکتے۔

۱۱۔ لہجہ اور طرز ادا مین بیساختگی عاشقانہ عجز، اس طرح پیدا کرتے ہین کہ سنگدل معشوق موم ہو جائے۔

۱۲۔ نامرادی۔ یاس۔ حسرت۔ بیکسی سے دنیا کی زندگی سے اس طرح بیزاری دکھاتے ہین کہ دنیا سے نفرت ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ اخلاقی مضامین کے بیان مین تغزل سے مناسبت کو پوری طرح سے سمجھ لیتے ہین تاکہ ان کے گلدستہ مین کوئی نامناسب اور

اجنبی کا نشانہ شریک ہوجائے

۱۴۔ غزلون مین اشعار کی تعداد ناگوار زیادہ نہین ہوتی حتی الوسع منتخب کہتے ہین۔

۱۵۔ مضامین کو اس طرح ادا کرتے ہین کہ "مسلمات" کو سمجھنے والے کی سمجھ پر چھوڑ دیتے ہین ضروری ٹکڑون کا اظہار اس طرح کرتے ہین کہ شعر نہایت بلیغ ہوجاتا ہے مثلاً:۔

تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری — شاید کہ وہ گھبرا کے سر بام نکلتا

اس شعر مین دل کا جنازہ کہا جنازہ کہنے سے مرنا خود بخود سمجھ مین آگیا۔ تلمیحات بعیدہ بھی ان کا شیوہ ہے لیکن اس طرح نہین کہ نامناسب ہو یا سمجھ مین نہ آئے

۱۶۔ معانی اور بیان، فصاحت اور بلاغت کی اکثر مثالین ان کے اشعار مین اس طرح موجود ہین کہ ان سے ایک رسالہ ان علوم پر طیار ہوسکتا ہے۔

۱۷۔ کوئی مسئلہ اخلاقی یا علمی تغزل سے علحدہ ہوکر بیان نہین کرتے

۱۸۔ کسی شعر مین کوئی لفظ بھی اس خیال سے غافل اور بے پروا ہوکر نہین لاتے کہ اس کا تعلق تمام شعر سے نہ ہو۔ ان کے اشعار مین الفاظ کی حالت زنجیر کی کڑیون کی ہے کہ ایک کڑی کی جنبش سے تمام زنجیر جنبش مین آجاتی ہے۔

۱۹۔ "مومن" نے ضرورتِ شعری کو اپنے دیوان مین آنے نہین دیا ہے معمولی بات بھی ایسے انداز سے بیان کرتے ہین کہ غیر معمولی ہوجاتی ہے۔

۲۰۔ مضمون کی تلاش مین ایسا ڈوبتے ہین کہ دیکھنے والون کی نظرین حیران ہوجاتی ہین۔

۲۱۔ ایسی ہجو ان کے شعر مین ایک گناہ کبیرہ ہے جس سے انتقام یا حصول زر مقصود ہو اس کے قریب نہین جاتے۔

۲۲۔ اپنے خصوصیات مین وہ کسی کے مقلد نہین بلکہ "امام" اور مجتہد ہین۔

اعتراضات اور اس کا جواب

باوجود اس کے "مومن" انسان ہین جس طرح خطا اور نسیان انسان کا شعار ہے "مومن" نے بھی غلطیان کین ہونگی۔ لیکن جو غلطیان ان کی طرف منسوب کیجاتی ہین دراصل غلطیان نہین بلکہ اعتراض کرنے والون کی بھول یا زبردستی ہے۔

ذیل کے اعتراضات اور جواب سے حقیقت معلوم ہوجائیگی۔

(۱۔ خیالات کی پیچیدگی۔ (۲) اس کی مثال مین ذیل کے اشعار پیش کئے جاتے ہین۔

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

ان سے پریوش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

تاثیر بیقراری ناکام آفرین — ہے کام ان سے شوخ شمائل کو تھامنا

یہان تک تو چندان مضائقہ نہ تھا حالانکہ اس کا تمنا ح جواب دیا جاچکا ہے۔ لیکن حسب ذیل اشعار بھی اس مدین شمار کیے گئے ہین:۔

ذکر اغیار سے ہوا معلوم ۔۔۔ حرف ناصح برا نہین ہوتا
دفن جب خاک مین ہم سوختہ سامان ہونگے ۔۔۔ فلس ماہی کے گل شمع شبستان ہونگے
لیا ہے دل کے عوض جان دے رقیب تو دون ۔۔۔ مین اور آپ کی سوداگری زبان کے لئے

یہ سمجھ مین نہین آتا کہ ان اشعار کے کون اجزا سمجھ مین نہین آتے اور ان کے سمجھنے مین کیا اشکال ہے۔ پھر اشکال اور غلاق کا معیار کیا رہا ہے اگر اس کا نام اشکال اور اغلاق ہے تو غالب کے ان اشعار کے متعلق کیا کہا جائیگا؟

ودیعت خانۂ بیداد کاوش ہائے مژگان ہون ۔۔۔ نگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خون تن مین
گلشن آباد دل مجروح مین ہوجائے ہے ۔۔۔ غنچۂ پیکان شاخ ناوک صیاد گل
حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز ۔۔۔ دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز
مجنون فسون شعلہ خرامی فسانہ ہے ۔۔۔ ہے شمع جادہ داغ نفس رفتن ہنوز

یہ اشعار دیوان غالب نسخہ حمیدیہ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ سے لئے گئے ذوق کے ایسے سلاست پسند کے کلام مین اس قسم کی مثالین موجود ہین۔

طاس قلیان مین رکھا ہے اس نے ابر بردہ کو ۔۔۔ ڈوب مرر رد کے توا ے ابر کیس آپ ہین
بے بادہ غورگی مین ہون ذوق جون مویز ۔۔۔ کی توبہ بے وقوف نے ناحق شباب مین
مین ہون وہ نخچیر جسکو دیکھتا ہے وقت ذبح ۔۔۔ دیدۂ حسرت سے حلقہ جوہر ساطور کا

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت فارسی دانی کے غلبہ اور رواج کی وجہ سے مجبوری۔ انوری۔ خاقانی کے رنگ میں کہنا کمال سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ غالب نے اس کا تتبع یہان تک کیا کہ بعض اشعار ایسے زبان اور ایسی ترکیب مین ادا ہوے ہین کہ ابتک یہ طے نہ ہوسکا کہ ان کی زبان اردو ہے یا فارسی؟ اور شاعر کا مقصد کیا ہے؟ الفاظ سے یہ مقصد حاصل بھی ہوتا ہے یا نہین جو منشائے بیان ہے۔

(۲) زبان کی ناہمواری کا الزام لگاکر یہ اشعار پیش کئے جاتے ہین:۔

بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے ۔۔۔ پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا
ہان جوش طپش جھپٹ چلی جائے کہ پھر تو ۔۔۔ جھڑ جائین گے فرمودہ اگر دام نہ ہوگا

مومن کا یہ انداز بیان اگر قابل اعتراض ہے تو میر ذوق اور غالب پر کیون مہربانی کی گئی ہے حالانکہ وہ لوگ اس رفتار مین کئی قدم آگے ہین۔

میر — ہوتا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تجھے تو — مانند شمع مجھ کو کاہے کے تئیں جلایا
غالب — مین نے مجنون پہ لڑکپن مین اسد — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
" — مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ مین — شایان دست و بازوئے قاتل نہین رہا
ذوق — سر د مہری سے فلک ڈال نہ پالا کہ ابھی — نخل سر سبز دل کا ابھی جل جائیگا
" — کیا پہلے بھی شہ تری ہم کہ جون نسیم — آئے تھے سر پہ خاک اڑا اے چلے گئے

اس قسم کے اشعار ان شعرائے کلام مین بکثرت موجود ہین، ان کے علاوہ سودا، آتش اور مصحفی کے کلام بین بھی یہ مثالین بکثرت ملین گی، داغ نے بھی اس سے احتراز نہین کیا ہے مثلاً

تیرے بیمار محبت اب تو — قابل غور ہوئے جاتے ہین

حقیقت یہ ہے کہ اس دور تک یہ انداز محبوب نہ تھا ورنہ "مومن" یا ان کے معاصرین کبھی گوارا نہ کرتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اصولی طور پر یہ نہ تو مذموم ہے اور نہ غلط ہے، البتہ اس کا ترک بہتر ہے۔

(۳) "مومن" نے مضاف الیہ کے نون آخر کا اعلان کیا مثلاً

یہ دیکھ تو مجھے کہ طاقت بیان نہین

اس کا اظہار بھی ابتدائے دور سے اسوقت تک معیوب نہ تھا، اس دور کے بعد بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے۔
میر کے ایسے محقق اور اہل زبان، مسلم الثبوت استاد نے اس طرح کہا ہے۔

خوبرو سب کی جان ہوتے ہین — آرزوے جہان ہوتے ہین
غمزۂ چشم خوش تدان زمین — فتنۂ آسمان ہوتے ہین

مصحفی نے لکھا ہے۔

دشوار ہے اپنے کو پیمبر کے پہونچنا — ہے موسئے عمران بھی باروان پہ آگے

میر دوسری جگہ لکھتے ہین:۔

غنچہ ہے وہ دہان ہے گویا — ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا

میر حسن لکھتے ہین:۔

درد فراق، زخم جگر داغ دل حسن — کیا کیا نہ وہ ہمین گل خندان دیکھا

غالب نے لکھا ہے۔

مشکین لباس کعبہ علی کے قدم سے جان — ناف زمین ہے، نہ کہ ناف غزال ہے

مصحفی کے شاگرد مسرور نے لکھا ہے:۔

بد نام تو ہوا مین وہ کہتے ہین دیکھئے کیا کچھ کریگا دیدۂ گریان آپ کا

(۴) "شمر" کو حرکت میم کے ساتھ "شَمَر" کہا،

یہ اعتراض بھی غلط ہے اصل لفظ شمر میم کے کسرہ کے ساتھ ہے (دیکھئے اقرب الموارد قاموس وغیرہ) شمر خود غلط ہے۔
شمر کہ اسم ہے ابن افریقش بادشاہ یمن کا، اس نے شہر نیقد فتح کرکے اس مین قلعہ وغیرہ بنایا، اس لئے شمر کند یعنی
اس کو بنایا کہا گیا۔ آخر مین وہ سمرقند ہوگیا

"مومن" نے اس لفظ کو عوام کے خلاف صحیح استعمال کیا

(۵) "مومن" نے حسب ذیل ردیفین بیکار رکھی ہین:-

مجھ پہ طوفان اُٹھائے لوگون نے مفت بیٹھے بٹھائے لوگون نے

اس مین "لوگون نے" بیکار ہے

یہ اعتراض بھی بالکل ہیچ ہے کیونکہ "لوگون نے" فاعل ہی فعل معروف مین جملہ بغیر فاعل کے پورا نہین ہوتا اس لئے
اس کا ذکر ضروری تھا۔

اس کے علاوہ اور جو اعتراضات ہین وہ قابل التفات نہین البتہ ان مین ایک اعتراض قابل لحاظ اور لائق جواب ہے

(۶) "مومن" نے تلمیح بعید سے کام لیا ہے مثلاً:-

جلتا ہون اہلِ نار کی تبدیل جلد سے "مومن" غضب ہے آتشِ لذت فزائے داغ

تیشہ کچھ دشنۂ شیر دیہ نہین اے غیرت اپنے ہی خون سے مگر دامن فریاد بھرے

جس زمانے مین "مومن" نے یہ شعر کہے ہین "مسلمان" اپنے مذہب اور اس کی روایات سے بالعموم واقف ہوتے تھے،
اس لئے "اہل نار" اور "تبدیل جلد کے الفاظ کے ذکر سے بدلناھم جلوداً غیرھا" کی طرف ذہن کا فوراً منتقل ہونا یقینی
تھا، اب اگر کسی کا ذہن منتقل نہ ہو تو "مومن" پر کچھ اعتراض نہین ہوسکتا۔ کبھی آگے چلکر معتقدات مذہب لوگ بھول جائین
تو اسوقت کے اشعار جن مین اشارے موجود ہین قابل اعتراض نہین ہوسکتے۔

دوسرے شعر کا واقعہ بھی عام طور پر مشہور تھا اور مشہور ہے اس لئے اس کو بھی تلمیح بعید نہین کہہ سکتے۔

تعجب ہے کہ اس شعر مین تو تلمیح بعید ہے اور غالب کے اِس شعر مین نہین

کاوِ کاوِ سخت جانیہاے تنہائی نہ پوچھ شام کرنا صبح کو لانا ہے جوئے شیر کا

یا اس شعر مین:-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(۷) قصیدون مین "مومن" نے الفاظ و محاورات علمیہ استعمال کئے ہین تو ان کے کمال کی دلیل ہے، اعتراض کی صورت نہین

انوری، خاقانی کے قصائد دیکھئے ان مین علوم عقلیہ نقلیہ کے پیچیدہ مسائل موجود ہین، اور یہ چیزون کی قابلیت اور سعادت کی دلیل سمجھی جاتی تھی یہ بھی معلوم ہے کہ مسائل علمیہ، محاورات و الفاظ علمیہ کے ذریعہ سے بیان کئے جاتے ہین، اس کا ذکر آ چکا ہے۔

(۴)۔ غالب نے کہا ہے۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب مین	یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب مین

اس شعر سے یہ حدیث کون شخص سمجھ سکتا ہے "من شرب الخمر فی الدنیا لم یطعمها فی الآخرة" جو دنیا مین شراب پیئے گا وہ عاقبت مین شراب طہور سے محروم رہے گا۔

شارحین غالب مین سے کس کس نے اس حدیث کو اس شعر سے سمجھا ہے؟ دوسرے یہ کہ اس شعر کا مخاطب غائب اور مجہول ہے لہذا شعر کامل نہین کہا جاتا ہے کہ "مومن" کا دیوان بیان تصوف۔ فلسفہ۔ اخلاق سے خالی ہے سب سے پہلے مومن کے اشعار کو تصوف کے نقطۂ خیال سے جانچنا چاہئے۔

تصوف اور مومن

تصوف کے معنی اگر صرف خمریات کے ہین (جیسا کہ آجکل عام طور پر سمجھا جاتا ہے) تو معترضین کا خیال بالکل صحیح ہے، لیکن تصوف کے معنی ان اصطلاحات علمیہ اور جذبات سوز گداز کا نام ہے جن سے تصوف مرکب ہے تو "مومن" کے کلام مین ان کا وجود شروع سے آخر تک ہے۔

تصوف "عشق حقیقی" کے اظہار کا فن ہے عشق حقیقی عشق مجازی کا پرتو ہے۔

عشق مجازی بیشتر اعمال ردیہ کی طرف لیجاتا ہے تصوف نے اس پر حقیقت کا رنگ چڑھا کر اخلاق کو سنوارا ہے۔

شاعری کے اعتبار سے "جذبات حسن و عشق" مجازی اور حقیقی دونون مین مشترک ہین مثلاً

۱۔ عشق مجازی مین "ایک ہی معشوق کے حسن و جمال پر جان و مال قربان کرنا چاہئے یا ایک ہی محبوب اور معشوق کی صورت عاشق صادق کو ہر جگہ نظر آتی ہے، سوا معشوق کے عاشق کی طرف متوجہ نہین ہوتا۔

عشق حقیقی، مین اس کو وحدت وجود "ہمہ اوست" سے ظاہر کرتے ہین

مومن نے اس مسئلہ کو ان الفاظ مین بیان کیا ہے

چارۂ دل سوائے صبر نہین	سو تمھارے سوا نہین ہوتا

دوسرا شعر اسی مضمون کا ہے:۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتان مین مومن	آخری وقت مین کیا خاک مسلمان ہونگے

تصوف مین ایک درجہ فنا کا ہوتا ہے جس مین آکر صوفی ہر چیز کو بھول جاتا ہے "مومن" اس مسئلہ کو ان الفاظ مین ادا کرتے ہین

نشۂ الفت سے بھولے یار کو	سچ ہے ایسی بیخودی مین یاد کیا

تصوف مین "عشق و محبت" دوران خون کے ساتھ عاشق کی رگ رگ مین ساری ہوتے ہین۔ "مومن" نے اس کو اس طرح

بیان کیا ہے:۔

دردہے جان کے عوض ہر رگ وپے مین ساری　　چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

صوفی جب فانی فی الشیخ ہوجاتا ہے تو گویا اس کو وصل یا وصال نصیب ہوتا ہے یہ درجہ ریاضت کے بعد ملتا ہے "مومن" نے اس مسئلہ کو یون حل کیا ہے:۔

فرماتے ہین وصال ہے انجام کار عشق　　کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا

تصوف مین معشوق حقیقی کے جلوے کے سوا دنیا مین اور کسی چیز کا وجود نہین۔ "مومن" نے اس کو اس طرح ادا کیا ہے:۔

جو نقاب اُٹھی مری آنکھون پہ پردہ پڑ گیا　　کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھ کر

تصوف مین شیخ ساقی، شراب کیف محبت ہے، میخانہ خانقاہ ہے کیف محبت کا لطف شیخ کے بغیر حاصل نہین ہوتا، مومن نے اسکو اس طرح بیان کیا ہے:۔

مئے نہ اُتری گلے سے جو اس بن　　مجھ کو یارون نے پارسا جانا

حاصل یہ ہے کہ وہ تمام جذبات جو عشق مجازی مین ہوتے ہین عشق حقیقی مین موجود ہین، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کا ہر شاعر جو فارسی کا متبع ہے اور جذبات عشق اور سوز وگداز رکھتا ہے، اس کے اشعار غزل مین جذبات تصوف کا ہونا ضروری ہے۔ "مومن" کا دیوان ان جذبات سے بھرا ہے تو تصوف اسے خالی کیونکر رہ سکتا ہے؟ صبر ورضا وتسلیم بھی تصوف کی ایک منزل ہے "مومن" نے اس کو اس طرح دکھایا ہے

شب ہجر مین کیا ہجوم بلا ہے　　زبان تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

سب کے آخر مین یہ کہ حضرت امیر خسرو کا یہ شعر بھی اپنے اندر تصوف کا رنگ رکھتا ہے:۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس　　چلے خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو ندیس

یہ شعر حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر حضرت سلطان نظام الدین اولیا کی وفات پر ان کے مزار کے سامنے کہا تھا

غرضکہ وصل وفراق، حسن وعشق کے جذبات اور ان جذبات سے جو سوز وگداز پیدا ہوتا ہے وہ تصوف کا عکس ہے۔

فلسفہ "تصوف" کے متعلق جو حال عام غلط فہمی کا ہے وہی "فلسفہ" کا بھی ہے "فلسفہ" کے معنی آجکل اس مہمل شعر کے ہین، جس کی ترتیب نہایت پیچیدہ ہو یا تو بالکل سمجھ مین نہ آئے اگر آئے تو سمجھنے والا اس کے مفہوم سے مطمئن نہ ہوسکے مومن کی غزلون مین اس قسم کا فلسفہ نہین ہے، البتہ علوم حکمیہ طبعیہ جو اصلی فلسفہ مین موجود ہین ان کا ذکر آچکا ہے چند اشعار کا ذکر اس جگہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مار ڈالا ہمکو جور گردش ایام نے　　بڑھ گئی رات اپنی روز حشر کی تقصیر سے

اس شعر مین علم ہیئت بیان کیا ہے

شوق کم ہے نئے اندوہ فزا ہوتا ہے ہائے ہر چیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے

طبعیات کا ایک مسئلہ ہے۔

کر علاج جوش وحشت چارہ گر لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

حکمت کا مسئلہ ہے:-

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

موسیقی ہے، یہ علم بھی علوم فلسفہ مین داخل ہے۔

اخلاق دیوان "مومن" مین اس کا ذکر اور بیان بھی موجود ہے۔ مثلاً خودداری کی شکست پر اس طرح افسوس کرتے ہین:-

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل مین کوچۂ رقیب مین بھی سر کے بل گیا

نازک مزاجی:-

بات کرنے مین رقیبون سے ابھی ٹوٹ گیا دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیمان ہوگا

غیرت:-

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا غیر لیجائے ہے پیام مرا

اعتراف گناہ:-

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہون کو مرے تر ہوا دامن تو بارے پاکدامن ہو گیا

اس قسم کے اشعار کثرت سے موجود ہین، البتہ ان کا تغزل سے علیحدہ کرنا اور راز کو سمجھنا صحیح تنقید ہے۔

اصناف سخن:-

"مومن" نے اپنے غزل کی طرح اور "اصناف سخن" کی بھی الگ راہ نکالی ہے۔

قصیدہ علم الادب اور معجم مین قصیدے کی حدود مین ہے کہ "مدح" کو شاندار الفاظ سے مرتب ہونا چاہئے، بازاری اور مبتذل الفاظ سے قصیدہ کا بچنا اولین فرض ہے۔

ممدوح کی مدح مین ایسا مبالغہ نہ ہو کہ وہ "ذم" کی صورت اختیار کرے، ممدوح کی شان اور اپنی حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی قصیدہ گو کا فرض ہے ممدوح اگر "بادشاہ" ہے تو اس کا درجہ کم نہ کرے اور اسقدر بڑھا دے کہ "پیغمبری" یا "خدائی" دیدے۔ قاضی یا امیر کی مدح کرے تو ان کو بادشاہ، کے برابر یا اس سے زیادہ نہ کہے۔

حدود شرعیہ وعقلیہ کا خیال رکھنا بھی قصیدہ گو کے ذمہ ہے۔

جن قصائد مین اس قسم کی پابندی نہین ہوتی اس کے اشعار مقدوح اور مذموم ہوتے ہین، قرآن حکیم اور احادیث

کثیرہ مین اس قسم کے اشعار کی مذمت ہے" مومن "نے ان "خصوصیات" اور "حدود" کو بدرجہ اتم پیش نظر رکھا ہے۔ راجہ چندولال کی تعریف مین "مومن" نے جو قصیدہ لکھا ہے اس کو اس نظر سے دیکھ لیجئے کہ الفاظ کا نقل اور "ندرت" قدرت اور علم و فضل کی دلیل ہے کیونکہ "مومن" نے ان سے مسائل علمیہ کو بیان کیا ہے۔

مثنوی چونکہ مسلسل واقعات رطب و یابس کا بیان ہوتی ہے اس لئے واقعات کی تابع ہے" مومن" پر جو لوگ یہ الزام رکھتے ہین کہ" ان کی مثنویان متانت سے گری ہوی ہین" ان لوگون نے شاید حضرت جامی کی "مثنوی یوسف زلیخا" امیر خسرو کی" مجنون لیلےٰ" اور نظامی کی" لیلیٰ مجنون" "شیرین خسرو" مین، شب زفاف اور شب وصال کے بیان نہین دیکھے ہین حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایسے مواقع کے جذبات بیان کرنا اپنا کمال سمجھتا ہے معانی و بیان کے ماہرین کا قول ہے کہ جو بیان حسن قدرت واقعہ اور فطری جذبات کے مناسب ہوتا ہے اسی قدر اثر انداز فطرت ہوتا ہے۔

"مقامات بدیع الزمان ہمدانی" مین خصوصیت کے ساتھ ایک" مقامہ" اسی بیان مین ہے،

بڑے بڑے محتاط" شاعر" اس صنف مین آکر مجبور ہو جاتے ہین" مومن" کی سادگی دیکھئے کہ وہ اپنے واقعات اور واردات اپنی زبان سے بے کم و کاست بیان کر دیتے ہین، کوئی واقعہ کہین اگر متانت سے گر جاتا ہے تو واقعہ کی نوعیت ہے شاعری کا کیا قصور ہے۔

واسوخت "مومن" نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے، ان کا اصلی سوز و گداز، امنگ، جذبات عشق کیفیات حسن کا خاکہ اس کے اندر ہے، جس شاعر مین یہ جذبات جسقدر زیادہ ہونگے اسی مناسبت سے واسوخت" سوز و گداز" کا مرقع ہوگا۔

رباعیان "مومن" نے رباعیان کم کہی ہین، چونکہ رباعیان واردات عشق و حسن کے بیان کی چیز نہین اس لئے ان کے رنگ مین "مومن" کی جھلک نمایان نہین۔

معمے اور تاریخین دونون چیزین" مومن" کی ذہانت اور طباعی کا خط و خال ہین۔ "علوم ادبیہ" مین ان کا بھی خاص وزن ہے، "مومن" کے معمون مین حضرت امیر خسرو کی" ذہانت" اور ہمہ گیری کا رنگ نظر آتا ہے۔

مرثیہ محرک" جذبات شاعری" "مومن" کی" محبوبہ دلنواز" کا انتقال ہوتا ہے اس کا مرثیہ" مومن" ایسا شاعر جیسا لکھ سکتا ہے" مومن" نے لکھ کر شاعری مین اضافۂ عظیم کیا ہے، اس کے چند شعر دیکھئے:۔

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جان کو کیا ہوا — دم مین نہین ہے دم مرے جانان کو کیا ہوا

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونون ہاتھ سے — کیا جانئے اس کی زلف پریشان کو کیا ہوا

پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا — اس دست رشک پنجۂ مرجان کو کیا ہوا

دل مین شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی برہم ہے حال کاکل پیچان کو کیا ہوا
گردش پر اپنے ناز ہے پھر روزگار کو اس چشم رشکِ فتنۂ دوران کو کیا ہوا

خیال کیجئے کہ ''محبوب'' کا ماتم ان سے زیادہ موزون اور دلدوز الفاظ مین کیونکر ہو سکتا ہے۔

''مومن'' نے ''مرثیہ'' کے لئے بھی نئی راہ نکالی ہے، اسکی مثال دنیائے شاعری مین مشکل سے ملے گی۔

معاصرین

''مومن'' اس معاملے مین بھی متفرد ہین کہ ان کے معاصرین ایسی ہستیان تھین جن پر شاعری کو ناز ہے۔ ہمارے خیال مین ''مومن'' کے اس اہتمام کا سبب معاصرین تھے وہ سمجھتے تھے کہ جب تک شاعری مین کوئی خاص رنگ نہ ہوگا ان کے سامنے فروغ پانا مشکل ہے - تذکرہ نویسون نے ان کے نام حسب ذیل دئے ہین:۔

غالب۔ ذوق۔ آزردہ۔ شیفتہ۔ صہبائی، عیش۔ عارف۔ درخشان، علائی۔ سالک۔ بیتاب۔ حضور۔ برق میرصاحب۔ شور۔ آزاد۔ تائب۔ تسکین۔ تشنہ۔ حزین۔ شہرت۔ عزیز۔ رقم۔ تعشق۔ تابش۔ تمکین۔ عاشق۔ اوج نازنین۔ تصویر۔ قلق۔ کامل۔ تجلی۔ جوش۔ یکتا۔ تنویر۔ جعفری۔ بسمل۔ بیدل۔ شوق۔ تسلی۔ نالان۔ ماہر۔ جنون۔ اتسلی۔ حشمت۔ ایجاد۔ رسا۔ رفعت۔ قناعت۔ حیا۔ ظہیر۔ صابر۔ داغ۔ احسان۔ یہ وہ معاصرین ہین جو ''مومن'' کے ساتھ ایک مشاعرے مین شریک ہوئے تھے جس کا ذکر فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مضمون مین کیا ہے۔

تلامذہ

حسب ذیل تلامذہ کا ذکر امتیاز احمد صاحب نے اپنے مضمون ''مومن کی اُردو شاعری''، مندرجہ ''نگار'' جنوری سنہ ۲۸ء مین کیا ہے:۔

وحشت۔ مضطر۔ کرم۔ تسکین۔ یاس۔ اکبر۔ عظمت۔ شیفتہ۔ آشفتہ۔ آہی۔ قلق۔ بیتاب۔ بیمار۔ تسکین۔ تہور برق۔ راحت، راسخ۔ سالک۔ صاحب۔ ظہور۔ شورش۔ صفیر۔ قیصر۔ کاظم۔ نسیم۔ وحشت۔

ان تلامذہ مین سلیم۔ شیفتہ۔ تسکین۔ استادانِ فن مین ان پر ''مومن'' کو ناز تھا

وفات

ہندوستان کے اس مایۂ ناز شاعر نے جو شاعری اور تغزل کا امام تھا ۵۱۔ برس کی عمر مین کوٹھے سے گر کر سنہ ۱۲۶۸ھ مین وفات پائی۔

۵ مہینے پہلے خود ہی تاریخ کہی تھی ''دست و باز وبشکست'' اس مین پورے سنہ ۱۲۶۸ھ نکلتے ہیں۔

دلی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

جوہر کلام

یون تو ''مومن''، علیہ الرحمۃ کا پورا دیوان ایسے نشترون کا مجموعہ ہے جو رگہائے دل کو چھیڑ کر سراپا درد بنا دیتے ہین، لیکن ذیل کے اشعار وہ ہین جو دنیا کی تمام زبانون کے مقابلے مین ایشیائی شاعری کے لئے فخر ومباہات کی دلیل بن سکتے ہین۔ اور لعل وجواہر مین ہمیں بلکہ ان سے زیادہ قیمتی چیز یعنی دل کے ٹکڑون مین تولے جا سکتے ہین:۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
مین کوچۂ رقیب مین بھی سر کے بل گیا

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے مین ساری
چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

سچ ہی سہی آپ کا پیمان دے
مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

نہ مانون گا نصیحت پر نہ سنتا مین تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

چارہ گر جنت مین اس کے آستان سے لیگئے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارمان اک مدت سے جی مین تھا نکل آیا

گور مین بھی جوشِ غم دل سے نہ نکلا ہائے ہائے
آپ ہی مین ہم نہین جب کنج تنہائی ملا

ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر مین چلا گیا
اے رشک میری جان گئی تیرا کیا گیا

دمِ آخر بھی تم نہین آتے
بندگی اب کہ مین چلا صاحب

اتنی فرصت دے ستمگر کہ پہونچ جائے اجل
دم کے دم اور بھی سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

تارے گنے بدلے گن کے شبِ تار کاٹ دی
ایام ہجر مین مرے کیا کام آئے داغ

سینے سے گھبرا کے آخر جان لب تک آ گئی
حال پہونچا یان تلک اور تم نہ آئے یان تلک

دھوان اٹھتا ہے دل سے وقتِ گریہ
بجھا دی تو نے کیا اے چشمِ تر آگ

عشق نے یہ کیا خراب ہمین
کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمین

چھٹتا ہے جیتے جی کوئی زنجیر زلف سے
دیوانہ ہون کہ چارۂ سودائے دل کرون

کیا شکوہ جفائے آسمان کا
مین آپ کو دور کھینچتا ہون

توبہ گنہ عشق سے فرماتے ہے واعظ
یہ بھی کہین دل دیکے گنہگار ہوا ہے

مین اگر آپ سے جاؤن تو قرار آجائے
پھر یہ ڈرتا ہون کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

داغ خون سے میرے وہ حیران ہوئے
دامن الجھا ہے گلِ بیجا رسے

چھٹ کر کہان اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہین قیدِ حیات ہے

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

رقیب کھائے قسم تو وفا کا آئے یقین
تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار صحیح

وہ آئے ہین پشیمان لاش پر اب
تجھے اب زندگی لاؤن کہان سے

یارو کسی صورت سے تو احوال بتادو
دروازے پر اس کے میری تصویر لگادو

علم عروض اور مومن

عام طور پر جہلا مین مشہور ہے کہ " طبع موزون را عروض و قافیہ در کار نیست " یہ مصرعہ ان لوگون کیلئے باعثِ تسکین ہے جو فن شعر یا علم عروض سے واقف نہین لیکن شاعری مین استادی کا دعویٰ کرتے ہین ان کو شاید یہ معلوم نہین کہ کسی چیز کا جہل اس کے عدم کو لازم نہین کرتا، وہ یہ بھی نہین جانتے کہ آجکل بیشتر خرابیان فن شعر و علم عروض مین نظر آتی ہین، نئی نئی بحرین نئے نئے اسلوب تراشے جاتے ہین، مسلمات سے اعراض اور روگردانی کیجاتی ہے وہ "کفر مذہب شعر" اور "شرک فی ملت العروض" ہے، ایسے لوگ ٹھوکرین کھاتے ہین ان کو پتا نہین چلتا، اپنی بدمذاقی کو مذاق اور جہل و نادانی کو مہارت سمجھتے ہین وہ یہ نتیجہ سمجھنے سے قاصر ہین کہ اپنی بدعتون سے، ملتِ شاعری، کو برباد کر رہے ہین، اس طرح رفتہ رفتہ، زبان اور ادب تباہی اور بربادی کی طرف جا رہی ہے۔

"عوام" کا ذکر تو ایک طرف اس مرض مین اکثر خواص بھی مبتلا ہین، بڑے بڑے مشہور اساتذہ ایک غزل کے متعدد اشعار مختلف بحرون مین کہہ جاتے ہین اور ان کو اپنی اس غلطی کا احساس تک نہین ہوتا۔

بعض سابق اساتذہ نے بھی جو علم اور فن سے بے بہرہ تھے فاش غلطیان کی ہین ان کے تفصیلی ذکر سے فتنے کا جگانا مقصود نہین

حکیم "مومن" کی ہمہ گیری فن شعر اور علم عروض سے بھی تشنہ کام نہین رہی ہے، اس لئے حکیم صاحب نے اس مین بھی استادانہ احتیاط برتی ہے۔ ان کے مذاق کی صحت اور خداداد مناسبت و موزونیٔ طبع نے وہ بحرین غزلون کے لئے استعمال کی ہین جو نہایت شگفتہ، رواں اور لبریز ترنم ہین۔ ان مین اکثر بحرین وہ بھی ہین جو ہندی۔ اردو۔ فارسی مین یکسان دلپذیر معلوم ہوتی ہین

تفصیلی بحور مفردہ

دو قسم کی بحرین عام طور پر مستعمل ہین۔ مفرد و مرکب بحور مفردہ علوئے مومن نے حسب ذیل بحرون مین دادِ مذاق دی ہے۔

بحر ہزج۔ اس کے ارکان "مفاعیلن مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، چار بار ایک مصرعہ میں اور بارہ مرتبہ پورے شعر میں آتے ہیں۔

یہ بحر عربی اغانی مین بکثرت رائج ہے۔

اسے خو پڑ گئی ہے بیطرح زانوئے جانان کی   یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھون نہ ٹھہریگا

اس غزل کے مصرعۂ اول مین "زانوئے جان کی" میں ترتیب ترنم ہے

دوسرے مصرعہ مین الفاظ "رکھون نہ ٹھہریگا" مین ترنم اور اتار چڑھاؤ موجود ہے۔ یہ غزل ہندی راگ بھیروین مین اصلی حالت کے ساتھ گائی جا سکتی ہے

اس بحر مین عروض و ضرب دونون مبتغ بھی استعمال کئے جاتے ہین۔ مثلاً

فلک ظالم بُری قسمت جہان دشمن وہ بُت نامرد   بتاؤ تو بھلا پھر کس سے جا کر مین کرون فریاد

گلیم فقر کو کیوں دوش پر ہم ڈالتے اے رند   اگر کملی سے بہتر جانتے کمخوابِ پشمینہ کو

رند کے شعر کے پہلے مصرعہ میں تسبغ ہے اور دوسرا سالم ہے۔

فن کے اعتبار سے یہ نقص نہیں لیکن احتیاط کی رو سے قادر الکلام شعرا اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "مومن" نے بھی اس سے گریز کی ہے۔ اس بحر میں اور بھی اضافات ہیں جو طبیعت کو پسندیدہ معلوم نہیں ہوتے "مومن" نے اس سے کنارہ کشی کی ہے۔

یہ بحر اس طرح بھی مستعمل ہے۔ غالب نے کہا ہے:۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

مومن نے اس میں بھی طبع آزمائی کی ہے:۔

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دیگا   ان کو شوق آرائش دل ہے بدگمان اپنا

اس کو سمن اشتر کہتے ہیں۔

"مومن" نے یہ "زحاف" ترنم کی وجہ سے اختیار کیا ہے، اس کے ہر ٹکڑے میں زیر و بم موجود ہے، ہزج کی شگفتہ صورت مثمن اخرب مکفوف محذوف بھی ہے۔ مومن نے کہا ہے

تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری   شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

ہزج مسدس مقصور الاخر میں سیر ممنون کہتے ہیں۔

نہیں دیتی دکھائی صورت زیست   غضب صورت ہوں آیا دیکھ کر آج

لفظ "زیست" اگرچہ مفاعیل کی تقطیع کی رو سے باعتبار فن درست ہے لیکن بادی النظر میں "ت اور س" زائد معلوم ہوتے ہیں اور نظر کو دھوکا ہوتا ہے کہ دونوں حرف ساقط ہیں۔ "مومن" اس سے بچتے ہیں

ہزج مسدس اخرب مقبوض:۔

مومن:۔ کیا شکوۂ جفائے آسمان کا   میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

بحر رمل:۔ ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ایک مصرعہ میں پورے شعر میں دو بار۔

یہ بحر اردو میں سالم مستعمل نہیں، اس لئے یا تو محذوف آتی ہے یا مقصور مقطوع یا مشعث یا مسبغ:۔

مومن:۔ اک نگاہِ سرسری دیوانہ ہمکو کر گئی   گردشِ چشم پری ساحر ہنگامہ تھا

کہ رہا ہے کون ہمسے بے شکیبائی ملا   مجھ کو قسمت نے نصیحت گر بھی سودائی ملا

رمل کی ایک صورت غالب نے یہ بھی جائز کی ہے:۔

غمِ شبیر میں ہوں سینہ یہاں تک لبریز   کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگین

پہلے مصرعہ مین تبریز کی "ز" کی وہی شکل ہے جس کا ذکر ہزج مین آچکا ہے۔

رمل مثمن مخبون محذوف مسکن:۔

مومن:۔ اہلِ بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے عشرتِ عمر ابد قیمت غم دیتے ہین

رمل مسدس مقصور۔

مومن نشہ، الفت مین بھولے یار کو سچ ہے ایسی بیخودی مین یاد کیا

بحر رجز۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

مومن دہرات فکرِ جور مین یون رنج اُٹھانا کب تلک مین بھی ذرا آرام لون تم بھی ذرا آرام لو

مومن نے بالکل سالم استعمال کیا ہے۔

بحر وافر۔ اُردو مین مستعمل نہین

بحر متقارب۔ فعولن فعولن فعولن فعولن

اس بحر مین "مومن" نے مثنویان زیادہ کہی ہین، کیونکہ یہ بحر مثنویون کے لئے زیادہ موزون ہے، اور شعرائے غزلین بھی لکھی ہین، یہ مومن کی حکمت اور دانائی ہے کہ اس نے "بحر" کو اصلی جگہ استعمال کیا ہے۔

اس بحر مین فعولن ۸ بار ایک مصرعہ مین آتا ہے، میر نے استعمال کیا ہے، مومن نے غزل کے لئے اس کو مناسب نہین سمجھا

متقارب مثمن مقبوض اثلم۔ اس مین ترنم بھی ہے اور سلاست بھی مومن نے اس کو لیا ہے

عدم مین رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو دم نہ ہوتا

اس وزن کو مولانا جامی نے سولہ[16] ارکان سے مرکب کرکے جاری کیا ہے جو صرف غزل کے لئے مخصوص تھا، مومن نے اس کو اردو مین لاکر ترنم کے ساتھ شگفتہ کر دیا۔ ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ترنم ن۔ اور رم بھی ہے ان کی ترتیب زیر و بم کے ساتھ مومن نے اکثر استعمال کی ہے۔ یہ علیحدہ مسئلہ ہے اس لئے، صرف اجمالی بیان کافی ہے۔

بحر مضارع۔ مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن

مضارع مثمن اخرب:۔

مومن۔ اللہ رے ناتوانی جب شدتِ قلق مین بالین سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

اس مین عروض و حذب مسبغ بھی آتا ہے یعنی فاعلاتن کی جگہ فاعلان میر کہتے ہین

رہئے بغیر تیرے اے رشکِ ماہ تا چند آنکھون مین یون ہمارے عالم سیاہ تا چند

ن۔ د۔ اس مین زائد معلوم ہوتے ہین۔ مومن نے اس سے احتراز کیا ہے

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف:۔

ن سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی لو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا

بتت - مس تفع لن فاعلاتن مس تفع لن فاعلاتن

ت مثمن مجنون محذوف:-

من لگے خدنگ جب اس نالۂ سحر کا سا فلک کا حال نہ ہو گیا میرے جگر کا سا

سریع - مومن نے اس بحر کو بھی مثنوی کے لئے مخصوص کیا ہے۔

فیف - خفیف مسدس محذوف مسکن:-

ن:- غیر چھیڑ کے ہے زخم دل پہ نمک اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

ب عروض | عروض میں حسب ذیل عیوب ایسے ہیں جو شعر کو شعر رہنے نہیں دیتے بشرطیکہ فہم اور ادراک میں

ی نہ ہو۔ مومن نے سختی سے احتراز کیا ہے۔

تخلیع - نقلی ارکان اور ناپسندیدہ وزن سے مرکب شعر اس تحت میں آتا ہے۔

تحدید - ایک بحر کے اشعار میں جب اختلاف ہو تو سخت عیب ہے اس کے لئے صحیح مذاق اور مہارت کی ضرورت ہے اکثر اساتذہ نے دھوکا کھایا ہے۔

مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری اپنی کتاب بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں کہ "عظیم شاگرد شاہ حاتم نے بحر ہزج کے بحر رمل کو ملا دیا تھا، اس پر انشا اللہ خان نے برسر مشاعرہ اعتراض کیا تھا

مشہور استاد وحشت نے ایک شعر لکھا ہے۔

سنبھالے ہیں مرے نالوں نے بھالے فلک نے پشت خمیدہ کو تھامے

اس شعر کے دونوں مصرعہ مختلف ہیں، پہلا ہزج مسدس دوسرا متقارب مثمن ہے غالب نے ان چار مصرعوں میں غلطی کی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

دیا دوسرا ہے کب دہر میں بتا تو پھر کیا یہ تو تو میں میں ہے کیا قیل و قال ہے

تیسرے مصرعہ کا وزن تینوں سے مختلف ہے۔

اختلاف غیر معتاد - یعنی عروض محذوف کا استعمال بحر طویل میں اور مقطوع کا کامل میں نادرست ہے۔

اس تفصیلی بیان کا مقصد یہ ہے کہ کسی شاعر کی تنقید کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کے خصوصیات سمجھ لئے جائیں اور اس کے ہر پہلو اور ہر مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی جائے۔

"مومن" جن علوم و فنون" کے سرچشمہ اور مخزن تھے ان کے اشعار میں ان علوم پر بحث کرنا تنقید نگاری کا فرض ادا کرنا ہے۔

مجھ کو افسوس ہے کہ مین نے یہ فرض اجمالاً ادا کیا ہے، فرصت ہوتی تو مسائل مذکورہ کے ہر جزو پر کافی بحث کرتا تاہم جو کچھ میری فرصت نے مجھے کام لیا ہے اس پر خدا کا شکر ہے کہ اُردو مین تنقید نگاری کے لئے راہ نکالنے کی کوشش کی ہے بیان موضوع جو مجھ کو سیری نہین ہوی وہ صرف اس لئے کہ طالب علم ہون مشہور ہے کہ دو شخص سیر نہین ہوتے "طالب علم اور طالب مال"

اثنان لا یشبعان طالب علم وطالب مال

مومن کے موئدین

"مومن" پر جن لوگون نے اعتراضات عائد کئے ہین، یا جن ارباب قلم نے کسی وجہ سے اس کے اوصاف پر پردہ ڈالا ہے ان کی نیتون پر کوئی تعجب نہین، ایک شخص کسی "بھلائی" کو کسی سے پسند نہین کرتا اور اس کے خلاف اظہار خیال کرتا ہے، دلیلین پیش کرنے کی سعی کرتا ہے تعجب ان صاحبان ذوق کے اعمال پر ہے جو باوجود تائید و تعریف اپنے مدعا کے ظاہر کرنے مین قاصر رہے ہین۔

جناب نیاز صاحب کا خدا بھلا کرے کہ اپنے موقر رسالہ "نگار" کا مومن نمبر نکال کر مومن کے ساتھ انصاف کرنے صحت مذاق کی راہ نکال دی، اب یہ ملک کے ذمہ ہے کہ اس پر اکتفا کرے یا وسعت اور اضافے سے کام لے۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ انتخاب کلام مومن کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے اور ایشیا بالخصوص ہندوستان کا یہ گوہر گرانمایہ یوروپ کے سامنے لایا جائے

ہم نے مومن کا موازنہ شیکسپیر سے کرکے اس خیال کی ابتدا کر دی ہے، فرصت ملی تو انشاءاللہ تعالیٰ اس تجویز کی تکمیل کی جائیگی ابتدا مین ہم نے "صنائع و بدائع" کے سلسلے مین جو مضمون لکھا ہے وہ تمام تر منقول ہے۔ اور بحر الفصاحت سے ماخوذ ہے اگرچہ ہم کو اس سے کامل اتفاق نہین ہے بعض "حگہ" مولف "سے تسامح ہوا ہے تاہم صنائع و بدائع" کا مرتب بیان ہے اس مین ایک نقص یہ بھی ہے کہ "مومن" کے جو اشعار مثال مین پیش کئے گئے ہین وہ اس حیثیت سے موزون تر نہین مومن مین ایسے اشعار بھی ہین جو ان صنائع کے ساتھ جذبات تغزل کا نمونہ ہین وہ پیش نہین کئے گئے، شاید اس کی وجہ مولف کا منشا صنائع و بدائع کا بیان تھا "مومن" کے کلام پر تنقید مدنظر نہ تھی۔ قصائد مومن" پر بھی جو کچھ لکھا گیا وہ بھی تشنہ ہے۔ مثنوی، رباعی، تاریخ کا یہی حال ہے، انشاءاللہ ہم تحقیق کے ساتھ تمام اصناف پر کسی وقت روشنی ڈالیں گے۔

کیفی چریاکوٹی

رسالہ "جن"

بہ اعتبار ذوق ومزاج ایک طرح کی یکسانیت رکھتے ہین اور انکا باہم ملکر زندگی بسر کرنا بغیر جذبات کو صدمہ پہونچائے ممکن ہے۔
پھر چونکہ انسانی طبائع صرف ملک کی آب وہوا، ملک کی پیداوار اور ملک کی اقتصادی کیفیت کے ماتحت بنتے ہین،
اس لئے ہندوستان کے کسی باشندہ کا یہ کہنا کہ اس کی قومیت دوسرے باشندہ سے علیحدہ ہے، بالکل خلاف حقیقت ہے۔ وہ لوگ
جو ہندوستان مین پیدا ہوئے، یہان کی آب وہوا مین جنھون نے پرورش پائی، یہان کے اقتصادی حالات کے ماتحت جنکی
تربیت ہوئی، وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے کس اصول کی بنا پر جدا کہہ سکتے ہین اور اگر کہین تو کون صحیح الدماغ اسے
باور کر سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کے مختلف حصون کے لوگ ذوق وطبائع مین تھوڑا سا اختلاف رکھین، لیکن
یہ اختلاف اسقدر اہم نہین ہو سکتا کہ قومیت کو بدلدے۔ یو۔پی کا باشندہ، پنجاب کے رہنے والے سے، بنگال کا انسان
مدراس کے باشندہ سے یقیناً کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور رکھتا ہے، لیکن مین یہ ماننے کے لئے طیار نہین کہ ان سب کا اجتماع
متضاد عناصر کا اجتماع ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ شخص جو ہندوستان کا باشندہ ہے ایک ہی قوم سے وابستہ ہے جس کا
نام صرف ہندی یا ہندوستانی ہونا چاہئے، اور مختلف صوبون کے لوگون کا اپنے آپ کو مختلف قومیت سے نامزد کرنا، نہ
صرف تمدن واقتصاد، بلکہ خود قدرت وفطرت کے مقصود کے خلاف ہے اگر نظر انصاف سے کام لیا جائے

اب سوال یہ ہے کہ اگر حقیقتاً ہندوستان کی آبادی ایک ہی سرزمین پر سانس لینے کی وجہ سے اور ایک ہی
ملک کی آب وہوا مین پیدا ہونے، بڑھنے جینے اور مرنے کے سبب سے، ایک ہی قوم کہلائے جانے کی مستحق ہے، تو پھر
لوگون مین یہ اختلاف کیون ہے اور وہ کیون اپنے آپ کو مختلف اقوام سے تعبیر کرتے ہین؟ ۔ اس کا جواب اتنا ہی
آسان ہے، جتنا اس پر عمل کرانا دشوار ۔۔۔ مین نے اس سے قبل عرض کیا تھا کہ ترقی ملک کی مانع دو چیزین ہین ایک
اقوام کا تنوع جس کی حقیقت بیان ہو چکی اور دوسرے مذاہب کا اختلاف اور حقیقتاً یہی دوسری چیز ہے جسنے ہماری
قومیت ووطنیت کو تباہ کیا اور جسنے ہم قوم ہونے کے مفہوم کو بالکل بدلدیا ہے

لوگ ہمیشہ سے اس غلطی مین مبتلا ہین کہ نوع انسان کی ترقی کا انحصار مذہب پر ہے اور مذہب ہی اصل چیز
ہے جس کے مقابلہ مین ملک ووطن کا رشتہ کوئی حقیقت نہین رکھتا، حالانکہ انھون نے کبھی اس امر پر غور نہین کیا کہ
مذہب کا رشتہ تو اسقدر نازک ہے کہ اعتقاد کی ذرا تبدیلی سے وہ ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے، برخلاف رشتۂ وطنیت
کے کہ وہ ہر حال مین اور ہر جگہ قایم رہنے والی چیز ہے ایک مسلمان عیسائی ہونے کے بعد جماعت اسلام سے علیحدہ ہو سکتا
ہے لیکن اُسکے ہندوستانی ہونے سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔۔۔ اس لئے میرے نزدیک اصل خرابی یہ ہے کہ لوگ
خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان عیسائی ہون یا موسائی، ہمدردی وتعاوُن کی بنیاد مذہب کے رشتہ پر قایم کرتے ہین
اور ملک ووطن اُن کے سامنے کوئی چیز نہین ہے۔ ممکن ہے ایک شخص یہ کہے کہ مذہب کا رشتہ وطنیت کے تعلق سے
بہت زیادہ وسیع ہے کیونکہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک بلکہ سارے کرۂ ارض تک وسیع ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ کہنا

اول تو محض امکانی صورت رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ نظم سیاسیات کے لحاظ سے ناقابل لحاظ ہے۔ ہیئت اجتماعی کی تشکیل اور کسی غرض مشترک کے ساتھ تمرکز خیال کے لئے ہمیشہ اول کسی محدود رقبۂ زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر بعد کو اس مین وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم مذہب کو اس کی بنیاد قرار دینگے تو ایک ملک کے اندر بھی ہم مرکزیت عامہ پیدا نہین کرسکتے، چہ جائیکہ دوسرے ممالک کو اس مین شریک کیا جائے۔ البتہ اگر قومیت و وطنیت کا جذبہ قوی ہوگیا تو اسکا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم مین ایک اعتبار سے اخوت عامہ قایم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی جس کو ہم بہت زیادہ وسیع بنا سکتے ہین۔ حتی کہ اپنا وطن بجائے کسی مخصوص سرزمین کے سارے کرۂ ارض کو قرار دے سکتے ہین اور ہر ملک وقوم کے انسان کو اس تعلق سے اپنا بھائی سمجھ سکتے ہین۔

بہرحال مین یہ نہین کہتا کہ مذہب غیر ضروری چیز ہے یا یہ کہ مذہب کا خیال ہی اصولاً ناواجب ہے۔ لیکن اس سے انکار نہین ہوسکتا کہ آج نہ مذہب کے مفہوم سے کوئی واقف ہے اور نہ اس کی صحیح تعلیم دنیا مین باقی ہے۔ اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو بنی نوع انسان کے ساتھ محبت وہمدردی کا درس نہین دیتا جو ابنا، جنس مین باہم خلوص و رافت کا جذبہ پیدا نہین کرتا، تو میرے نزدیک وہ مذہب بالکل لغو ہے اور اس کی تعلیم دینے والے یکسر گمراہ۔ لیکن جس طرح مین یہ جانتا ہون کہ مذہب ہونے کی حیثیت سے دنیا کے تمام مذاہب ایک ہین اور انکا مقصود سوائے اس کے کچھ نہین کہ نوع انسانی ترقی کرے اور دنیا امن وسکون سے آشنا ہو، اسی طرح مین اس سے بھی واقف ہون کہ علمبرداران مذہب، اور رہنمایان مذہب جن کی گمراہ کن تعلیم کو ہم لوگون نے عین مذہب سمجھ لیا ہے، وہ یہی پسند کرتے ہین کہ انسان ہمیشہ دور جہل و انحطاط مین زندگی بسر کرے اور کرۂ ارض کبھی فتنہ و فساد سے خالی نظر نہ آئے۔

اس لئے ہماری موجودہ مشکلات کا سبب نہ حقیقتاً یہ ہے کہ ملک مین مختلف اقوام کی کثرت ہے اور نہ یہ کہ تعداد مذاہب یہان پائے جاتے ہین، بلکہ اس کا سررشتہ اُن جاہل مولویون، اُن ہٹ دھرم پنڈتون کے ہاتھ مین ہے، جنھون نے اپنی بلید ذہنیت، اپنی تنگ نظری اور ابلیسانہ فطرت سے مجبور ہوکر قومیت و مذہبیت دونون کا مفہوم نفسانیت وعصبیت قرار دیدیا ہے اور جن کے ہان انسان کا اولین و آخرین فرض صرف یہ ہے کہ وہ مخصوص مراسم عبودیت ادا کرلیا کرے، خواہ اخلاق و اطوار کے لحاظ سے وہ کتنا ہی درندہ کیون نہ ہو۔

مجھے ہندؤن کے علما، مذہب کا حال نہین معلوم کہ انکا کتنا اور کس قسم کا اثر لوگون پر قایم ہے، لیکن مسلمان جماعت کا حال مجھے ضرور معلوم ہے اور مین وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ ہمارے ہان تمام خرابیون کا سبب صرف علما، کی ذات گرامی ہے اور انھون نے ہمارے ذہن و دماغ ہمارے اخلاق وعادات کے بگاڑنے مین کوئی دقیقہ کوشش کا نہین اُٹھا رکھا۔ انھون نے بجائے مذہب کے ہم کو صرف رسم و رواج کا پابند بنایا، انھون نے مذہب کی حقیقی روح سے بیگانہ کرکے ہمکو عصبیت و تنگ نظری کی تعلیم دی اور انھون نے ہمیشہ وہی درس ہمکو دیا جو وطنیت کے جذبہ کو خاک مین ملا دینے والا تھا

انھون نے ہمکو تمام عمر کفر و اسلام کی نزاع ، مسجد و مندر کی تفریق ، ریش و بروت کے جھگڑون مین پھنسائے رکھا اور کبھی اسلام کے اُس مفہوم سے آشنا نہین کیا جو ساری دنیا کے افراد کو ایک رشتہ سے وابستہ کردینے والا ہے ۔ یہانتک کہ اگر آج کوئی شخص مجھ سے دریافت کرے کہ اصلاح ملک و قوم کی بہترین تدبیر کیا ہے تو مین صرف یہی کہونگا کہ بلا امتیاز و تفریق اس جماعت کے ایک ایک فرد کو منہدم کردینا چاہئے اور ان کے ہاتھون سے وہ اقتدار چھین لینا چاہئے جس کے بدولت یہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ کہنے والے اس وقت تک "خدائی" کرتے چلے آئے ہین ۔ ان مین سے "سوء" و "خیر" کا انتخاب ، نسیہ و نقد کے امتیاز مین نہ صرف وقت ضائع کرنا ہے بلکہ بڑی حد تک خطرناک بھی ہے کیونکہ اگر ہمکو کوئی ایسا ظرف دیدیا جائے جس مین ۹۹ سانپ ہون اور ایک مچھلی اور اس کے اندر ہاتھ ڈالکر مچھلی نکال لینے کا اختیار دیا جائے تو ہمارے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اس ظرف ہی کو زمین مین دفن کردین اور ایک مچھلی کی جستجو مین ۹۹ سانپون سے ڈسے جانے کے خطرہ کو منظور نہ کرین ۔

ایک مولوی تبلیغ اسلام کے نام سے جمیعۃ قایم کرکے مسلمانون کی موجودہ بے معنی جماعت مین اُسی بے معنی ذہنیت رکھنے والے افراد کا اضافہ کرسکتا ہے ، خلافت کی لغو و بے بنیاد تحریک کو قائم رکھنے مین وہ قرآن و حدیث کے سارے دفتر کو ہر مہمل تاویل کے ساتھ پیش کرسکتا ہے ، وہ دیوبند مین بیٹھکر خدا اور رسول کے بہانے سے ہر طاغوتی قوت کو بروئے کار لاسکتا ہے ، وہ فرنگی محل مین بیٹھکر اپنے آپ کو دین کا "والی و قطب" ظاہر کرتے ہوئے صرف عرب و فلسطین کی سیاسیات مین دلچسپی لینے کی تعلیم مسلمانون کو دے سکتا ہے ۔ لیکن اس کو یہ سلیقہ کبھی حاصل نہین ہوسکتا کہ وہ ملک کے فلاح پر غور کرے ، وطن کی سیاسی اقتضاء کو سمجھے اور اس ایثار و قربانی کا درس دے جس کو سب سے زیادہ اسلام ہی نے سمجھا اور سمجھایا ۔

لفظ "مسلمان" دنیا مین صرف ایک ہی مفہوم کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور وہ مفہوم "بہترین انسان اور بہترین متمدن" ہونے کا تھا ، لیکن آج یہ علمبرداران اسلام ، یہ حاملان مذہب اپنے اقوال و افعال سے ، اپنی گفتار و کردار سے اسکا مفہوم یہ بتا رہے ہین کہ نہین "مسلمان" وہ ہے ، جو انتہا درجہ کا تنگ نظر ہو حد درجہ کا خودغرض ہو اور بے انتہا کمزور و بزدل بھی ہو یعنی اس کا ذریعۂ فخر بلندی اخلاق و پاکیزگی سیرت نہین رہا ، بلکہ اس کی پہچان اب صرف یہ رہگئی ہے کہ خدا کی عبادت کی جگہ وہ صرف محراب و منبر کی پوجا کرتا ہو ، قرآن کے الہامی ہونے کے ثبوت مین وہ اس کی بلند تعلیم پیش کرنے کے بجائے معجزۂ شق القمر اور فصاحت و بلاغت کا ذکر کرتا ہو اور اپنے سوا سب کو کافر ملحد مشرک اور ناری بتاتا ہو ۔ حالانکہ اس غریب کو یہ خبر نہین کہ ذہنیت کا یہی وہ دور ہے جو "فی الدرک الاسفل من النار" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وہ منزل انحطاط ہے جہان پہونچنے کے بعد "علیٰ شفا حفرۃ من النار" کی تصویر سامنے آجاتی ہے ۔

اس کے یہان "دعوۃ الی الخیر" کے معنی صرف یہ ہین کہ جہانتک ممکن ہو "مولوی" کی دعوت کرو اور عمدہ غذاؤن سے قربانی کے بکرے کی طرح اسکو موٹا کرو ، حالانکہ حقیقی قربانی کے لئے کبھی اس کی گردن جھکنے والی نہین اس کے وعظ مین "امر بالمعروف"

کا مفہوم یہ ہے کہ جو مشہور مولوی کہے بلا سوچے سمجھے، بلا غور و فکر صحیح مان لو، گو وہ تمام عمر تمھیں غلطیون مین مبتلا رکھے۔ اور اسکے نہی عن المنکر کی تبلیغ اس سے زیادہ نہین کہ نماز کے وقت ناقوس کی آواز نہ بلند ہونے دو، مسجد کے سامنے سے باجہ نہ گزرنے دو اور اگر وہ بہت ہی ردی قسم کا مولوی ہے تو یہ بھی کہہ گزرتا ہے کہ داڑھی نہ منڈاؤ، کوٹ پتلون نہ پہنو۔ الغرض نہ اس کی سیرت ایسی ہے کہ ہم اس کو دیکھ کر اپنی زندگی کی کوئی شاہراہ قائم کر سکین اور نہ اس کے اقوال مین کوئی ایسی حکمت مضمر ہے جو ہماری تمدنی زندگی اور ہماری انسانی خصوصیات کے لئے مفید و کارآمد ثابت ہو۔

آج ہندوستان جس دور اضطراب سے گزر رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہین اور مسلمانون کی جماعت اپنے قائدین و علماء سے مستفسر ہے کہ وہ کیا کرے، لیکن مولوی کو کہان فرصت کہ وہ تبلیغ، خلافت اور فلسطین کے لایعنی قصون کو ترک کر کے اس جانب متوجہ ہو۔

جمعیۃ العلماء کے جس گروہ نے آزادی ملک کے نصب العین کو سامنے رکھ کر تحریک کانگرس مین شرکت کا رزولیوشن پاس کیا ہے، اس کی حقیقت بھی سب کو معلوم ہے اور جس جماعت نے اس کی مخالفت مین آستانۂ حکومت پر جبہ سائی کو ترجیح دی ہے، اس کا حال بھی کسی سے مخفی نہین۔ کیونکہ نہ اُس جماعت مین یہ ہمت و جرات ہے کہ عملاً وہ اس تحریک کو بارآور بنائے اور نہ اس مین یہ سلیقہ کہ حکومت ہی سے کوئی جایز یا ناجایز فائدہ اُٹھا سکے۔ بہرحال مسلمانون کو جان لینا چاہئے کہ اسوقت ان کی جماعت مین کوئی قاید و رہنما کوئی مولوی اور مولانا اس قابل نہین ہے کہ اس کے اقوال و افعال پر اعتماد کیا جائے اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ خود غور کرے کہ اُسے کیا کرنا چاہئے اور یہ کہ ہندوستان کے ساتھ رشتۂ طینت قائم رکھنے کے بعد عقل و فراست کا کیا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ اس باب مین ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ ساحل تک پہونچنے والے وہی لوگ ثابت ہوئے ہین، جنھون نے مضطربانہ ہات پانون مارے اور جنھون نے اپنے آپکو طوفان کے رحم پر چھوڑ دیا وہ ایسے غرق ہوئے کہ پھر انھین ابھرنا نصیب نہ ہوا۔

ہملوگون کی ادنی ذہنیت اور سطحی مذہبیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب حافظ عزیز احمد (اہلمد جوڈیشل حیدر گڈھ ضلع بارہ بنکی) ۲۳ مئی کے ہمت مین "مادر زاد حافظ" کے عنوان سے ایک مراسلہ شایع کراتے ہین کہ موضع رونی تحصیل حیدر گڈھ مین کسی نداف کا لڑکا ہے جسکی عمر ۹ سال کی ہے اور جو حافظ پیدا ہوا ہے، یعنی اس نے کہین کوئی تعلیم حاصل نہین کی لیکن قرآن اس کو حفظ ہے اور متعدد اصحاب کے سامنے امتحان لینے سے اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔ مراسلہ نگار نے لڑکے کی اس صفت و کیفیت کا نام "کرامت" رکھا ہے اور اس لڑکے کا "مادر زاد ولی"۔ صاحب موصوف فرماتے ہین کہ "قدرت نے بسا اوقات طرح طرح کی کرامتین اپنے بندون کے ذریعہ سے ظاہر کی ہین اور منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے"

اس مراسلے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانون مین کرامت و ولایت کا کیا مفہوم ہے اور وہ کسقدر اوہام

پرستی مین مبتلا ہین۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ واقعہ جس سے حافظ عزیز احمد استحکام ایمان کا کام لے رہے ہین، کہین "تناسخ" کے ثبوت مین نہ پیش کر دیا جائے جس کا خیال کرنا بھی ایک مسلمان کو جہنمی بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اس سے قبل متعدد بار اسی طرح کے صاحب کرامات لڑکے ہندؤن کے یہان بھی پیدا ہو چکے ہین جو بجائے حافظ قرآن ہونے کے بڑے ویدانت تھے اور ان واقعات کو اُن کی طرف سے تناسخ کے ثبوت مین پیش کیا جا چکا ہے۔

گزشتہ ماہ کے اندر علیاحضرت سلطان جہان بیگم، فرمانروائے بھوپال کی والدۂ محترمہ کا انتقال، ایک ایسا سانحہ ہو گیا ہے کہ بقول سعدی

آسمان را حق بود گر خون بہ گرید بر زمین

ہرچند علیاحضرت اپنی عمر طبیعی کو پہونچ چکی تھین، لیکن ان کی موت یقیناً غیر طبیعی طور پر ہوئی یعنی یہ کہ زیر ناف آپریشن کیا گیا اور قلب نے اس کا متحمل نہ ہو کر حرکت بند کر دی۔ علیاحضرت جن خصوصیات کی مالک تھین وہ ملک کے کسی فرد سے پوشیدہ نہین۔ آپ کی علم پروری، آپ کا پاکیزہ اخلاق آپ کی خالص مذہبی زندگی اور پھر ان سب سے زیادہ ملک و قوم اور خصوصیت کے ساتھ طبقۂ نسوان کی فلاح و بہبود کے لئے ہر وقت آپ کا منہمک رہنا، یہ وہ باتین تھین، جنھون نے آپ کو حقیقتاً مردون کی صف مین بھی نمایان جگہ دی تھی۔ سرزمین بھوپال کا موجودہ علمی دور آپ ہی کی ذات سے قایم تھا اور تصنیف و تالیف خود آپ کا بہترین مشغلۂ حیات تھا۔ اہل علم و کمال کی قدردانی جس طرح آپ کے زمانۂ حکومت مین ہوئی، وہ بھی ملک سے مخفی نہین ۔ چونکہ مجھے خود بارہا علیاحضرت کی بارگاہ مین شرف حضوری حاصل ہوا ہے، اس لئے مین کہہ سکتا ہون کہ جس جامعیت و خوش اسلوبی سے آپ علمی و معاشرتی مسایل پر گفتگو فرماتی تھین وہ علماء عصر مین بھی نظر نہین آتی۔

بہرحال علیاحضرت کا اُٹھ جانا، نہ صرف بھوپال، بلکہ تمامی ہند کے لئے ایک ایسا فقدان عظیم ہے، جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہین اور سب لوگ جتنا ماتم بھی کرین کم ہے۔ ہمین امید ہے کہ بھوپال کا محکمۂ تاریخ جلد از جلد آپ کی سیرۃ مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کریگا اور موجودہ حکومت اُن روایات علم پروری کو بدستور قایم رہنے دیگی جو علیاحضرت کی ذات سے قایم تھین۔

دوسرا ادبی سانحہ لالہ سری رام ایم۔ اے مولف خمخانۂ جاوید کی وفات کا ہے۔ مرحوم دہلی کے رؤساء مین سے تھے اور بہت پاکیزہ اخلاق رکھتے تھے۔ آپ کا کتب خانہ ایک آئینہ تھا جس سے آپ کے ذوق علم و ادب کا حال معلوم ہوتا تھا اور آپ کا ہر وقت کسی نہ کسی علمی مشغلہ مین مصروف رہنا آپ کی فطری صلاحیت کا ثبوت تھا۔

تذکرۂ خمخانۂ جاوید کی ترتیب و اشاعت مین آپ نے جسقدر مادی و ذہنی ایثار سے کام لیا وہ تاریخ ادب کا ہمیشہ یاد رہنے والا واقعہ ہے۔ افسوس ہے کہ مرحوم اس سلسلہ کو مکمل کرنے سے قبل اُٹھ گئے اور نہین کہا جاسکتا کہ اب اس کا حشر کیا ہوگا لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ اب اس کام کو پنڈت دتاتریہ کیفی انجام تک پہونچائین گے تو ہمکو مایوس نہ ہونا چاہئے ممکن ہے کہ رلف خمخانہ کی تمنا پوری ہو کر رہے اور اس کی اشاعت کا سلسلہ بدستور قایم

اس ماہ کی اشاعت مین آصفی نظامی، سلسلہ کا مضمون ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خان امتیاز علی عرشی نے پورا حق وطنیت اس مین ادا کیا ہے۔ اس مین کلام نہین کہ آصفی نظامی دور آخر کے نہایت پرگو اور کامیاب فارسی زبان کے شاعر تھے، لیکن اگر فاضل مضمون نگار ان کے کلام کی خصوصیات کو اس طرح نمایان نہ کرتے تو غالبًا اس جوہر قابل کا علم بھی کسی کو نہ ہوتا۔

"قرآن کے لطایف ادبی" نگار کے مقالہ نگار خصوصی مولوی عبد المالک آروی کی تحقیق کا نتیجہ ہے اور نہین کہا جا سکتا کہ اسکی تکمیل کتنی اشاعتون مین ہو اس مقالہ کو صرف تمہید سمجھنا چاہئے مجھے نہین معلوم کہ اس بحث مین انھون نے "قرآن کی فصاحت و بلاغت" سے بہ حیثیت معجزہ اعتنا کیا ہے یا نہین۔ اگر نہین، تو مین انھین مشورہ دونگا کہ اسی سلسلہ مین وہ اس موضوع پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرین، تاکہ ان لوگون کو بھی کچھ کہنے کا موقعہ ملے جو اس کے قایل نہین ہین۔

راحت القلوب پر جناب نقاد نے جس اہتمام سے تنقید کی ہے وہ اگر خصم کو ساکت نہین کر سکتی، تو زیادہ سے زیادہ اسیقدر ریارائے تکلم دے سکتی ہے کہ وہ شاہ نظام الدین اولیاء سے اس کتاب کی نسبت کا انکار کرین۔

باب المراسلہ مین ایک تحریر جناب فضل حمید دہلوی کی ہے، جس مین میری مذہبیت سے بحث کی گئی ہے اور دوسری جناب ریاض خیرابادی کی جسے انشاء کا ایک پاکیزہ نمونہ ہونے کے لحاظ سے درج کیا گیا ہے۔ حسب عادت مین نے دونون کا جواب دیا ہے لیکن اتنا عرض کئے دیتا ہون کہ میرا جواب "جواب طلب" نہین ہے۔

باب الاستفسار مین اس مرتبہ ایک خاص بحث ایسی چھڑ گئی ہے جس کا سلسلہ زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے، اگر مولویون نے اپنی عادت کے موافق اپنی "خرافیات" کو "حقیقیات" ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جناب سید علی اکبر کاظمی بی اے کا افسانہ پلاٹ کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ محلہ کی رونق" مین، مینے قصدًا افسانہ کا رنگ پیدا ہونے نہین دیا۔ نظمون اور غزلون پر ہر شخص اپنے ذوق کے لحاظ سے اچھے برے ہونے کا حکم لگائے مجھے کوئی اعتراض نہین۔

آیندہ ماہ سے نگار کی اٹھارہوین جلد شروع ہوگی اور ایسے معرکۃ الآرا مضامین کے ساتھ جو ذہن انسانی مین خاص انقلاب پیدا کرنے والے ہونگے۔ ان مین سے اکثر مقالات، اڈیٹوریل ہین۔ جن حضرات کا چندہ جون کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، وہ اگر منی آرڈر بھیجکر وی پی کی زحمت سے بچالین تو بہتر ہے ورنہ جولائی کے ابتدائی ہفتہ سے وی پی کی روانگی شروع ہو جائیگی

خاقانی ہند، قاآنی عصر، علامہ آصفی نظامی

بہاریہ بہاریہ تشبیب مین، ابر کا امنڈ امنڈ کر آنا، گھٹاؤن کا عالم پر چھا جانا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤن کا چلنا، بہار کی آمد، خزان کا نزدل، قوتِ نامیہ کی بیداری، موالید ثلاثہ کی بالیدگی، مزاج عالم کی اعتدال آشنائی، بہار کی وسعتِ دستگاہ، سلطانِ گل کی قوت و حکومت، چمن کی مشاطگی، دشت و صحرا کی گلبن و بوستان سے حریف پیشگی، مے مرد افگن کا دور، اور کسی گوشۂ باغ مین معشوقِ سیمین تن کی صحبت وغیرہ کا تذکرہ ہوا کرتا ہے۔

انسان فطرتاً، مناظر قدرت کا گرویدہ ہے۔ یہ مناظر اسقدر دلچسپ اور باعث مسرت ہوتے ہین کہ شاید ہی کوئی طبیعت لطف نہ اٹھاتی ہو۔ چمن کا پھول بوڑھے سے لیکر بچہ تک، اور مینہ کی پھوار مرد سے لیکر عورت تک، ہر طبقہ ہر ملک اور ہر ذوق کے انسان کیلئے رحمتِ خداوندی ہے۔ چونکہ مضمون ہر دل عزیز ہے، اور وسیع بھی۔ اسلئے متعدد اسلوب سے ادا ہو سکتا ہے۔ قدما رنے اپنی تشابیب مین بہاریہ خوب دل کھولکر لکھا ہے۔ صرف یہی ایک وہ عنوان ہے، جو سب سے کم تخیل، اور سب سے زائد محاکات کا محتاج ہے۔ محاکات کیلئے، قدما کا زورِ قلم ممتاز خصوصیت رکھتا ہے۔ اسلئے انوری وغیرہ کے قصائد "بہار" سے پر ہین۔ تفصیل کا محل نہین۔ صرف انوری کے دو چار شعرون سے اندازہ کرلو۔

نو بہار آمد و ہنگامِ طرب در گلزار — چہ بہارے کہ زد لہا ببرد صبر و قرار
ساقیا، خیز کہ گل رشکِ رخِ حورا شد — بوستان جنت دمی کوثر و، طوبی ست چنار
مردہ خواہد کہ بجنبد بچنین فصل از جا — کشتہ خواہد کہ رخان لالہ کند یا گلبار
بادِ نوروز، سحرگہ چو بہ بستان بگذشت — گلِ صدبرگ بردن رست ز پیراہن خار
چرخ بدستیٔ فلک بین تو کہ بے خامہ و رنگ — کردہ اطرافِ چمن را ہمہ پر نقش و نگار
نقشبندیٔ ہوا باز نگہ کن بر گل — کہ دو صد دائرہ بر دائرہ زد بے پرکار

باد شبگیری، نسیم آورد باز از جوئبار — ابر نوروزی علم بفراخت باز از کوہسار
این چو پیکانِ بشارت بر شتابان در ہوا — وان چو پیلانِ جواہر کش خرامان در قطار

"پیکانِ بشارت بر" اور "پیلان جواہر کش" کی ترکیبین بہت پاکیزہ استعمال کی ہین۔

گہ معطر خاکِ دست از بادکا فوری نسیم — گہ مرصع سنگِ کوہ از ابرِ مروارید باز
بوئے خاکرا ز نرگس و سوسن چو مشکِ ببتی — روئے باغ از لالۂ و نسرین چو نقشِ قندہار

یہی حال، ظہیر فاریابی، اور کمال اصفہانی وغیرہ کا ہے۔ حسان العجم خاقانی بھی بہار کی ہمہ گیری سے محفوظ نہ رہ سکے، مگر تھے مغلق گو، بہاریہ بھی مغلق ہی رہی۔ اگر شوق ہو، تو یہ قصائد پڑھو۔

جامِ طرب کش کہ صبح کام بر آمد
دوش برون شد ز دلو، یوسفِ زرین نقاب
تا نفحاتِ ربیع صور دمید از جہان
دستِ صبا بر فروخت مشعلۂ نو بہار

عرفی کی عاشقانہ طبیعت فطرت کے مظہر اتم (انسان) ہی کا نظارہ کرتی رہی۔ بیچارہ گل و بلبل کے فسانہ کے لئے کہان سے وقت نکالتا۔ اسکے ہان صرف دو بہاریہ تشبیبین ہین حسن یار گل، اور حل و الحل۔

خیر اس مین بھی کچھ ہرج نہ تھا اسکی افتادِ طبع ہی عاشقانہ تھی مگر ستم یہ ہوا۔ کہ دماغ بادۂ تخیل سے سرشار تھا، اسنے بہاریہ کو کوہ قاف کی خیالی دنیا بنانے کی سعی کی۔ اس کش مکش مین حقیقت دامن چھڑا کر غائب ہوگئی

ابتداءً آصفی بھی اس روش کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ عرفی کی دونون طرحون پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہم چاہتے ہین۔ کہ سردست عرفی سے توازن کرتے چلیں ورنہ قاآنی کی زمین مین داخل ہوکر یہ دنیا ہیچ نظر آئیگی

عرفی کی طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی تھی۔ وہ محاکات کی جگہ تخیل کا بادشاہ تھا۔ اسلئے ہمیشہ سخت اور دشوار گذار زمین انتخاب کیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس مین تخیل کی زیادہ سے زیادہ گنجایش ممکن ہوتی ہے۔ گو بہاریہ مین یہ امر دشوار ہے۔ مگر دماغ کی ساخت نے یہان بھی راہ نکال لی۔

سب سے پہلے کاتبی نے "حسنِ یار گل" ردیف و قافیہ مین قصیدہ لکھا تھا۔ امیری اور ہلالی کو یہ زمین بھائی اور وہ بھی ہمنوا ہوگئے مولانا عرفی نے یہی طرح اختیار کی۔

جب آصفی نے اس طرح پر قلم اُٹھایا۔ تو اپنے سامنے پانچ قصائد پائے۔ جو بترتیب زمانہ، کاتبی، امیدی، ہلالی، عراقی، اور بیدل نے لکھے تھے۔ میرے سامنے صرف عرفی ہے چونکہ مولانا آصفی نے اس کے نام توافی لکھے ہین۔ اسلئے صرف ہمقافیہ اشعار کا توازن کافی ہے

عرفی کا مطلع ہے۔

نو بہار آمد، کہ افشانہ چو حسنِ یار گل چون وصالِ یار ریزد ہر خس و ہر خار گل

مقصد تو یہ ہے۔ کہ "جسطرف نظر ڈالئے۔ بہار ہی بہار ہے" مگر عرفی کا مذاق عاشقانہ تھا۔ اس لئے اسنے اسلوبِ ادا عشقیہ اختیار کیا۔ اور ستائش بہار بھی، حسنِ یار، اور وصالِ یار کی زنجیر سے نہ چھوٹ سکی۔

یہ طرزِ بیان بجائے خود، کیسا ہی دلکش کیون نہو۔ مگر حسنِ فطرت کے جویا کے لئے دلچسپ نہین۔ آصفی نے عرفی کی

اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ اور کوشش کی کہ جدت ادا سے گل کی ہمہ گیری پر مہر لگا دین۔ فرماتے ہین

بازفیضِ نوبہاران، میکند ایثارِ گل گلستانِ گل، دار و دشت و دامنِ کہسارِ گل

عرفی
گل فروشی بود مخصوصِ لبِ انگار را کرد بے عزت بہار آخر بہر بازار گل

آصفی
از زلیخائی دلہا قدرِ او افزون شود سرنہد، گو، مثلِ یوسف، بر سرِ بازار گل

عرفی کو آمدِ بہار اور فیضِ نامیہ مین گل کی بے عزتی، اور گلشن کی گل فروشی مین۔ دلِ افکار کی حریف پیشگی نظر آتی ہے۔ اسے حیرت ہے کہ "بہار کو یہ دستگاہ کہان سے ہوئی۔ جو آج یون پھول برسا رہی ہے۔ یہ جو صرف میرے دل کا شیوہ تھا" یہ مضمون بہاریہ بہاریہ تشبیب کو محاسن سے محروم کرتا ہے۔ ستائش و مدح، مین منقصت کا پہلو نکلنا عیب ہے۔ شعر پڑھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شاعر کو بہار اور سرمایۂ بہار سے لطف نہین آتا۔ بلکہ اسکی طبیعت اور منقبض ہوتی ہے

آصفی فطرت کا دلدادہ اور جلوۂ گل کا جویا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر شے کی قدر و منزلت اس کے اوصاف کے مشاہدہ پر موقوف ہے۔ جبتک یوسف بازار مین نہ پہنچے تھے۔ چند کھوٹے درہم قیمت اٹھی تھی۔ مگر بازار مین آنا تھا۔ کہ زلیخا نے دل نذر کر دیا۔ پھر سر بازار جلوۂ گل کیون تلاش نہ کرے۔ اس سے گل کی منزلت پہچانی جا سکے گی۔

عرفی پر حیرت ہے۔ بہاریہ لکھنے بیٹھا ہے۔ مگر موسمِ گل کی منقصت کرتا ہے۔ علاوہ ازین اس کے پہلے مصرع کی بندش بھی سست ہے۔ آصفی کا شعر اس عیب سے پاک ہے۔ رہی زلیخا اور یوسف کی تلمیح جس نے شعر کو ایک اہم صنعت سے مالا مال کر دیا ہے وہ سراسر مزید ہے۔

عرفی
بعد ازین از فیضِ رنگ آمیزیٔ فصلِ بہار خامۂ بے رنگ ریزد بر در و دیوار گل

آصفی
جوش دارد رنگ و بو، از جنبشِ بادِ نسیم گر مصور نقش بندد، بر در و دیوار گل

مبالغہ کلام کی جان ہے۔ مگر اس کی خوبی یہ ہے۔ کہ حقیقت پر محمول کیا جا سکے۔ بالفاظِ دیگر وہی مبالغہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ جو سامع کو حقیقت سے زیادہ قریب نظر آئے۔ عرفی کا شعر مبالغہ کی خوبی سے محروم ہے۔ ایسا کبھی نہین ہوتا کہ سادہ قلم سے کچھ پھول پتیان بنا دی جائین۔ اور رنگدار معلوم ہون۔ لیکن یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ کہ نقاش در و دیوار پر پھول پنکھڑیان بنا دیتا ہے۔ اور کچھ اس کاریگری سے رنگ بھرتا ہے۔ کہ نظر فریب کھا جاتی ہے۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ سچ مچ کے پھول ہین۔ آصفی اس پر اضافہ کرتی ہے اور یہ خیال گزرتا ہے۔ کہ ہوا کے ساتھ خوشبو کی لپٹین دماغ کو معطر کر رہی ہین۔ اپنی قوتِ متخیلہ پر زور دیکر دیکھو۔ سادہ اور بیرنگ قلم سے رنگ آمیزی واقعیت سے کوسون دور نظر آئے گی لیکن رنگین پھولون سے، رنگ و بو کی موجین امنڈتی نظر آنا، واقعہ معلوم ہوگا

عرفی
بسکہ طبعِ کائنات از خرمی آبستن است بر دماند بادِ آہِ مجرمان بردار گل

آصفی
از دمِ تیغِ ستم، برجائے زخمِ خونچکان گلبنِ آسا میدمد از چوبِ خشکِ دار گل

عرفی کا شعر لطیف ہے۔ سانس مین تری ہوتی ہے۔ ادہر کائنات کی طبیعت خوش و خرم ہے۔ اس لئے مجرم کی سانس سے دار کی

لکڑی میں پھول نکل آنا کچھ بعید نہیں۔ لیکن آصفی کا شعر لطیف تر ہے۔ بظاہر بات ایک ہے۔ لیکن جدت کی کارفرمائی نے زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ زخموں سے خون بہکر سولی کی خشک لکڑی پر جم جاتا ہے۔ تو یہ نظر آتا ہے۔ کہ نقش و نگار ہیں۔ تلوار کا دم، نہ صرف شاعر کے ذہن میں بلکہ یوں بھی حقیقتاً، اس نقاشی کا باعث ہے۔ اس لئے آہِ مجرم کے مقابلہ میں، دمِ تیغ، ہر حیثیت سے مکمل وجہ روئیدگی کہا جا سکتا ہے۔

عرفی　　از نہالِ قامتِ خوبان، درین موسم رواست　　گر بجائے عشوہ ریزد، در دمِ رفتار گل

آصفی　　نقشِ پائے شاہدِ شنگولِ عہدِ نوبہار　　از نسیمِ ناز افشاند دمِ رفتار گل

عرفی کے مضمون کی بنیاد صرف الفاظ پر ہے۔ چونکہ معشوق کے قد کو نہال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور نہال میں پھول آتے ہیں۔ اسلئے شاعر کا ذہن مجاز کو حقیقت سے بدلنا چاہتا ہے۔ ادہر موسم ہے بہار کا۔ اسلئے متخیلہ کے نزدیک اور زیادہ ممکن نظر آتا ہے۔ کہ عشوہ و ادا کی جگہ اس فصل میں معشوق کے جسم سے پھول جھڑنے لگیں

آصفی نے بھی یہی مضمون باندھا ہے۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ قیامت برپا کی ہے۔ عدیم النظیر جدت سے مضمون ناقابلِ انکار حد تک معجزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ غور فرمائیے!۔

"بہار کا موسم ہو۔ کوئی مست ناز خرامان خرامان جا رہا ہو۔ شباب اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہو۔ شرابِ حسن چھلکی پڑتی ہو۔ دمِ رفتار کچھ نقش زمین پر بنتے چلے جاتے ہوں۔ شاعر یہ منظر دیکھے، تو کیوں نہ تڑپ اٹھے؟۔ موسم بہار میں شاہد شنگول کا جھوم جھوم کر چلنا اور قدموں کے نشان زمین پر بنجانا اسے یقیناً یہی نظر آئے گا۔ کہ ناز و انداز کی ہوا، قدموں سے پھول برسا رہی ہے"

کیا تخیل نے بیجا فریب کھایا۔ جو دماغ شرابِ حسن سے مدہوش ہو حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ اس کو نقوشِ قدم پھول ہی نظر آئیں گے۔ لیکن عشوہ باری کے بدلے پھول برسنا صرف تخیل ہے۔ علاوہ ازیں عرفی کا مضمون کمزور بھی ہے وہ صرف امکان و جواز کا دعوی کرتا ہے۔ یعنی اگر ایسا ہو جائے تو امتناعِ عقلی نہیں لیکن آصفی اس کو واقعہ بیان کرتے ہیں۔ یہ انکا زور کا مشاہدہ ہے۔

عرفی　　مشہدِ بختِ مرا پژمردہ گل برگے رسید　　بسکہ از بذلِ چمن گردیدہ بیمقدار گل

آصفی　　صورتِ گلشن، ز عکسِ او شود مرآتِ چرخ　　جلوہ ہا کردہ ست، یارب، تا چہا مقدار گل!

مفہوم متحد ہے۔ عرفی بھی پھولوں کی کثرت دکھا رہا ہے۔ آصفی بھی یہی چاہتے ہیں لیکن طرزِ بیان، اور روشِ ادا بدلجانے سے بظاہر صورت بدل گئی ہے۔ عرفی کا شعر کمزور ہے۔ اس کے شعر سے پھولوں کی منقصت ٹپکتی ہے۔ پھولوں کی اسقدر کثرت اور بہتات کہ چمن کی نظر میں اسکی وقعت ہی نرہے۔ زیبا بات نہیں۔ لیکن آسمان پر چمن کا عکس پڑنا، اور پھر ساری فضا کا پھول ہی پھول نظر آنا، لاجواب بات ہے۔ شیشہ میں جو چیز منعکس ہوتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل شیشہ کے اندر موجود ہے۔ آسمان کے شفاف آئینہ میں چمن کا عکس نظر آتا ہے۔ تو شاعر حیرت سے سوال کر بیٹھتا ہے خداوندا پھول کا جلوہ کسقدر ہمہ گیر

اور لامتناہی ہے۔ کہ سارا عالم بھرا ہوا ہے۔

مضمون بجائے خود ہی ستائش خواہ تھا۔ مگر اس استعجاب نے چار چاند لگا دیئے۔ بے اختیار زبان سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے

عرفی: در چنین فصلے، کہ از فیض ہوائے نو بہار / در زمین شور میروید ز نوک خسار گل

آصفی: از گلستان تا نجارستان، نباشد امتیاز / مید ہد چون شاخ گل، از ہر خس ہر خار گل

یہ قافیہ عرفی نے قطعہ مین لکھا ہے، لیکن ہمین عرض یہ دکھاتا ہے۔ کہ عرفی کا یہ شعر جو اپنے مدعا کی ادائیگی مین؛ دوسرے کا محتاج نہین ہے۔ آصفی کے ہمقافیہ شعر سے پست نہین ہے۔ تو بلند بھی نہین۔ لیکن یہی قافیہ آصفی نے دوسری جگہ اس خوبی سے لکھا ہے۔ کہ باید وشاید۔ فرماتے ہین

بسکہ بالد دستگاہ نامیہ از نو بہار / مید ہد از شاخ گل، از برگ گل از خار گل

یہی حال آیندہ قوافی کا ہے۔ دونون کے اشعار پڑھو اور بتاؤ کہ کیا اب بھی دنیا یہی بے بنیاد عقیدہ رکھے گی۔ کہ اہل فارس کی حریف ہمشیگی ہندی سے ممکن نہین۔ یادگارِ غالب مین مولانا حالی نے یہ خیالی عمارت ڈہادی ہے۔ اُن کے نزدیک تخیل کی وسعت غیر محدود ہے۔ فیضانِ خداوندی کا دروازہ کسی ایک قوم یا ایک ملک ہی پر نہین کھولا گیا ہے علاوہ ازین زبان کی قدرت بھی اہل زبان ہی کا خاصہ نہین۔ روزمرہ مین دوسری زبان والا اہل زبان کا مقابلہ نہین کرسکتا۔ مگر شاعرانہ زبان، یا لٹریچر ایسی چیز ہے۔ کہ ایک زباندان اہل زبان سے فوقیت حاصل کرسکتا ہے۔ مولانا آصفی جنکی پرورش ایرانی گود مین ہوئی، زباندانی اور تخیل دونون مین فارسی کے حریف ہین۔

عرفی:
شاید از گلبن صفت بر گلشن از فیض ہوا
پردہ ہائے عنکبوت انگیزد از ہر تار گل
گر ہمی داند کہ تاراجِ خزانی در پے است
از چہ می نازد بہ مشتِ درہم و دینار گل

آصفی:
بے نسیم زخمۂ مطرب ز سازِ بزم عیش
جائے نغمہ، ہمچو شاخ گل، چکد از تار گل
گر چنین باشد زدراجِ سکۂ فصلِ بہار
زرگران ریزند، جائے درہم و دینار گل

یہان بھی عرفی، بہار یہ تشبیب کا حسن کھو بیٹھا۔ وہ بھول کر فہمائش کرتا ہے۔ کہ جب خزان کا کھٹکا ہر وقت لگا ہوا ہے۔ تو مٹھی بھر چاندی سونے پر گھمنڈ کرنا عبث ہی ناصح کیسا ہی مشفق کیون نہو قبولیت سے کوسون دور رہتا ہے۔ آصفی فرماتے ہین

"اگر شاہنشاہ بہار کا یہی دور دورہ رہا۔ اور قلمرو فطرت مین اسی شان وشکوہ سے اسکا سکہ چلتا رہا تو اب کوئی دم جاتا ہے جو تم سن لوگے کہ سنار روپے اور اشرفیاں ڈھال رہا تھا یکایک سانچون مین سے سرخ وسپید پھول جھڑنے لگے" اشرفی اور روپیہ پر پھول خود ہی بنے ہوتے ہین۔ ان کو سانچون مین سے نکلتے دیکھکر پھول جان لینا بالکل قرین قیاس ہے۔

عرفی:
مغز عالم را معطر کرد، گو [illegible]
از شمیم خلقِ داور شمۂ اظہار گل

آصفی:
سایۂ ہر گل کہ می خندد، بود یاقوت خیز
رنگ ہر برگے کہ می بالد، کند اظہار گل

عرفی نے یہان سے ممدوح کی طرف گریز کی ہے۔ اس لئے تقابل ناانصافی ہے۔ صرف یہ دیکھو۔ کہ آصفی نے کس خوبی سے یہ قافیہ نظم کیا ہے۔ سرخ پھول کے سایہ سے یاقوت پیدا ہونا کیسا خوبصورت مبالغہ۔ اور ہر پتے کے رنگ سے پھول ظاہر ہونا۔ کسقدر نادر تخیل ہے۔ گویا پھول اور پتون کا رنگ مافوق العادت ہے۔

فسانہ طویل ہو گیا۔ آصفی کی تشبیب کے دو چار شعر اور سن لو

شہر بند گلشن دہر ست رنگین عالمی نغمۂ بلبل شود دیدہ کو چۂ منقار گل

"دنیا کی رنگینی حد سے گذر گئی۔ اب یہ عالم ہے۔ کہ بلبل کی چونچ سے نغمون کے بجائے پھول جھڑتے ہین" پیاری باتون کو لوگ عام طور پر پھول کہتے ہین۔ موسم بہار مین رنگینی عالم پر چھائی ہوتی ہے اس سے مجاز نے حقیقت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سنگ از فیض نمو باشد برنگ گل زمین لالہ آسا، سر زند از صخرۂ کہسار گل

گر بیفشاند بہاران دامن خود بر ہوا در نظر آید، سراپا گنبد دوار گل

نکہت گل، کار انفاس مسیحا می کند گر بیفشاند کسے بر بستر بیمار گل

"عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کر دیتے تھے"۔ "قم باذن اللہ" کہا اور مردہ کلمہ پڑھکر اُٹھ بیٹھا یہان پھولون کی خوشبو کا یہ حال ہے کہ اگر بیمار کے بستر پر دو چار پھول ڈالدو۔ تو چنگا ہو جائے" خوشبو روح کو فرحت دیتی ہے۔ بیمار کی روح متالم ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے لئے وہ چیز دوا ہے۔ جو اسے قوی کر دے۔ پھول خوشبودار ہوتا ہے اور دماغ کو تازگی بخشتا ہے۔ اسلئے آصفی کا ادعا عین حقیقت ہے۔ پھر مسیحا کا ادب بھی ملحوظ ہے۔ وہ مردہ زندہ کرتے تھے۔ یہ بیمار کو تندرست بناتا ہے

بنگرد اشکال نیرنگ بہاران در زمین گر نہد اعمیٰ بچشم خویش، عینک وار گل

فلسفہ کا دعوی ہے۔ کہ ذرات خاک خوردبین سے معائنہ کئے جائین تو بیل بوٹے نظر آئین گے۔ گویا زمین بہار کی نیرنگیون سے پُر ہے۔ شاعر اس فلسفہ کی حمایت کرتا ہے۔ لیکن شاعرانہ زبان مین۔ کہتا ہے۔

"اگر بہار کی بوقلمونی دیکھنا چاہتے ہو تو خوردبین کی کیا ضرورت ہے۔ پھول کو آنکھ پر لگا کر وہ کچھ معائنہ کر لو۔ جو مصنوعی آلات نہین دکھا سکتے"

خیام کا فلسفہ ہے۔ کہ ہر پھول "لالہ روئے بودہ ست" اور "زخاک لالہ روے رستہ است" بالفاظ دیگر پھول مردہ حسینون کی یاد دلاتا ہے۔ آصفی کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن فرق یہ ہے۔ کہ وہ بوالہوسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ فطرت کے سربستہ اسرار بتاتے ہین۔

گر گلستان در بہاران عرصۂ محشر شود فتنۂ محشر فشاند بر سراشرار گل

در نسیم این جہان، در عالم عقبی رود دوزخی چیند بدست آرزو از نار گل

قطرۂ شبنم زجوش رنگ گل طوفانیست چون محیط از فیض خود، گردید طوفان کار گل

غنچہ اگوئی گریبان بتان، از نو بہار — آنقدر بر خویشتن بالد شود یکبار گل

۲- عرفی کا دوسرا بہاریہ قصیدہ حمل۔ حلل وغیرہ قوافی مین ہے۔ آصفی نے مختلف اوقات مین تین قصیدے اس زمین مین لکھے ہین۔ ایک نعتیہ ہے۔ دوسرا حضور نظام دکن کی مدح مین ہے۔ اور تیسرا حضور والی رامپور کی ستائش مین ہے۔ حضور نظام سے خطاب کرتے ہین۔

خسروا عرش جنابا، بہ سخن دادرسا! — یافت معراج ز مدحت، چہ قصاید چہ غزل

اندرین عہد نشان یافتہ در ملک سخن — ہمچو اعیان ز تو ہر معنیٔ از شانِ اجل

بلّہ الحمد، کہ ہر گوہرِ معنے خوش آب — ریخت نیسان رگِ خامہ بساقل و دل

نرسد عرفی و طالب بقفائے گردش — از ہم خامۂ من گرم عنان شد ز ازل

بظاہر یہ خیال ہوگا۔ کہ ان کا یہ دعوی کہ عرفی و طالب میرے قلم کی گرد کو بھی نہین پہنچ سکتے محض ادعا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ مولانا نے اپنے خط مین ان قصائد کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے لکھتے ہین۔

" ان قصائد مین ۳ قصیدے ایک ہی زمین مین، ایک نعت رسالتماب علیہ السلام مین، دوسرا بمدح نواب حامد علیخان صاحب بہادر رئیس رامپور، تیسرا بمدح نواب میر عثمان علیخان بہادر فرمانروا دکن ہے۔ تذکرہ نویسی مین ایسے مقامات پر شاعر کی تلاش اور زورِ طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خاکسار نے جن نامور شعرا کی تتبع کی تصریح کی ہے۔ اکثر قصائد انہی کی روش پر لکھے ہین۔ ملاحظہ کے وقت یہ امر منکشف ہو سکے گا۔ کہ کلام کے مراتب کیا ہین۔"

غالبًا اس زمین مین پہلا قصیدہ انوری کا ہے۔ لیکن ہم اسکو چھوڑ دین گے۔ صرف عرفی سے مقابلہ کرنا ہے۔ کیونکہ آصفی نے گذشتہ قصیدہ اور یہ اسی کی روش پر لکھے ہین۔ مراتب کلام پر غور کرنا سلیم طبیعتوں پر موقوف ہے۔ سخن شناس کبھی دھوکہ نہین کھا سکتا غالب کہہ چکا ہے۔ کہ

غالب بخور و چرخ فریب، اے ہزار بار — گفتم بروزگار، سخنور چو من بسے ست

ایران مین بہار تقریبًا بیساکھ کے مہینہ مین شروع ہوتی ہے اس ماہ کا نام فروردین ہے علم ہیئت کی رو سے اس ماہ مین آفتاب برج حمل مین اقامت گزین ہوتا ہے۔ نوروز اس داخلہ کا پہلا دن ہے ایران مین یہ دن تیوہار ہے گھر گھر جشن منائے جاتے ہین ساغر عیش چھلکتے ہین۔ اور پیر و جوان مست و سرشار نظر آتے ہین۔

ہندوستان مین، فارسی سلطنت اور سلطنت کے ساتھ رسوم و رواج داخل ہوئے تو نوروز بھی ساتھ آیا شعرا نے بہاریہ مین، آفتاب کا برج حمل مین داخلہ، صلائے عیش و نشاط، لشکر فروردین کا عمل، اور ماہ دِی کے اثر کے زوال وغیرہ کو لکھنا شروع کر دیا۔ غالبًا سب سے پہلے انوری نے لامیہ مین یہ مضمون لکھا۔ اسکے بعد عرفی کی نوبت آئی۔ اور اس نے اپنی اعجاز نگاری سے

مہر ثبت کردی۔ کہتا ہے۔

چہرہ پردازِ جہان، رخت کشد چون بحمل　　شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

موسم بہار شروع ہوتے ہی، رات گھٹنے لگتی ہے۔ اور دن بڑھنا شروع ہو جاتا ہے عرفیؔ اسی نقطہ سے قصیدہ کی ابتدا کرتا ہے۔ فن مصوری کی اصطلاح مین، نیم رخ وہ تصویر ہے جس مین صاحب تصویر کو ایک پہلو سے دکھایا جائے یعنی اسکی نگاہ دیکھنے والے کی طرف ہونیکے بجائے داہنے یا بائین جانب ہو۔ اس حالت مین تصویر کی ایک آنکھ اور ایک رخسار دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ مستقبل (بہ فتح با) وہ تصویر ہے جس مین صاحب تصویر کو اس طرح دکھایا گیا ہے۔ گویا وہ سامنے کو دیکھ رہا ہے۔ اس حالت مین دونون آنکھین اور دونون گال نمایان ہوتے ہین۔ اور تصویر مکمل چہرہ دکھاتی ہے۔ عرفیؔ نے ان دونون اصطلاحون کو استعمال کیا ہے۔ اسکے ان شعر دن سے رات کا گھٹنا، اور دن کا بڑھنا ظاہر ہوتا ہے،

چہرہ پردازِ جہان، رخت کشد چون بحمل　　شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

چشمِ شب، تنگ شود دائرۂ مردمکش　　دیدۂ روز بتدریج برآید احول

مردمِ دیدۂ آن زالہ دگر بالصفت　　بیضۂ دیدۂ این روغن دو بیا بہ مثل

خونِ سودائی شب زاید و فاسد گردد　　لاجرم نشترِ روزش بکشاید اکحل

روز چون کرمِ بریشم ہمہ بر خویش تند　　ہرچہ شب رد کند از معدہ چو زنبورِ عسل

بعد ازین ترجمۂ روز شود صاحب کل　　بعد ازین شب بہ نگین ثبت کند عبد قِبل

بجائے خود یہ مفہوم خوب ہے۔ لیکن عرفی کی زبان سے ہے۔ اسلئے خوب تر ہو گیا ہے۔ آصفیؔ ایوانِ حمل کی آراستگی سے قصیدہ کی ابتدا کرتے ہیں

"آفتاب کیلئے، فلک نے ایوان حمل کو آراستہ کیا زہرہ، عطارد، مریخ وغیرہ مصاحب و ملازم اپنے فرائض کی انجام دہی مین مصروف ہوئے موتیون کی جگہ تارے نچھاور کرنے کے لئے، چاند کی کشتی مین بھر دیئے اب وہ وقت اور وہ گھڑی مبارک و سعد ہو گی۔ جب شاہِ خاور تختِ جلال پر رونق افروز ہوگا۔ سارے عالم کی یکجی کاری ہوگی۔ خزان کا عمل اُٹھ جائیگا۔ اور نامیہ عالم کو آراستہ و پیراستہ کردے گی دن بڑھنے لگیگا۔ اور رات گھٹ کر نقطے کے برابر رہجائے گی وغیرہ۔

اس بزم کو مولانا کے معجز کلام مین دیکھو۔ عرفیؔ عرفی نہوتا آصفیؔ ہندوستان مین پیدا نہوتے تو بلاخوف تردید ہم یہ دعویٰ کرسکتے تھے کہ روانی، زور، اور تنوع تشبیہات، مین متاخر، متقدم سے بلند ہے فرماتے ہین۔

(قصیدہ بمدح والی رامپور خلد اللہ ملکہ)

چرخ آراست، بشانِ دگر، ایوان حمل　　بہرِ نوروز، ز سازِ طرب مستقبل

صبحِ نوروزِ طرب، خندہ زد از جیبِ افق — بہ فروغے، کہ بود ہم نفسِ صبحِ ازل
شاہِ خاور، صفتِ جم، ز نشاطِ نوروز — قامتِ خویش، بر آراست بہ زرینہ حلل
خوش خوش آن ساعتِ عشرت کہ نہد پائے جلال — بسریرِ شرفِ دولتِ جاوید حمل
طبقِ ماہ بود پُر بہ گہرہائے نجوم — کہ نثارِ شہِ خاور کند از شانِ اجل
مشتری راز نگاہِ شہِ خاور شانیست — کہ فراتر بودش پایہ از قدرِ محل
ترہاتِ ندما داشتہ بہرام بہ چرخ — بر لبِ زہرہ بود نغمہ با ہنگِ غزل
در خمِ چرخ فشردند زبر دینِ انگور — لالہ گون شدہ شرابِ شفقی روئے زحل
پایۂ عزِ عطارد بگزشت از کیوان — کہ گزیدش شہِ خاور بوزیر اعمل
آن وزیرے کہ با قبالِ شہی ملک آرست — عاملِ نامیہ را بہر عمل خواند اول
از نقایص، بہ طبایع نگزارد عیسی — قوتِ نامیہ کز دے شدہ انقص اکمل
سر بانیست بہر ماہیت، از یرتو مہر — قیر کافور شد و عود بہ طبعِ صندل
عودیِ شب شدہ دیباجِ مخطط از نور — کہ بود دہر بہ پیرایۂ از تارِ حلل

وزیر نے نامیہ کو بلا کر حکم دیا "ابھی ماہیتِ دہر سے تمام خرابیاں دور کر دی جائیں" اس نے سب سے پہلے رات سے سیاہی دور کی۔ دو شعر اس مفہوم کے تم نے سن لئے۔ اشنیہ و استعارات کی ندرت دیکھو یہی کو دوسرے شعروں میں کس خوبی اور لطافت سے نظم کیا ہے۔

فارسِ دہر، بہ مضمارِ زمانہ بگزید — ز آخورِ خویش یکے ادہم و دیگر ارجل
لیک شد از جلش از پویہ چنان گرم عنان — کہ شد ادہم چو خرِ لنگ بکہسار روحل

مضمار، گھوڑ دوڑ کا میدان۔ آخور، اصطبل۔ ادہم سیاہ گھوڑا مشکی۔ یہ شب سے استعارہ ہے۔ ارجل وہ گھوڑا جس کا ایک پیر سپید ہو۔ استعارتاً دن۔ فرماتے ہیں

"شہسوارِ زمانہ نے، اپنے اصطبل سے دو گھوڑے، ایک مشکی اور ایک ارجل انتخاب کر کے دونوں کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں جگہ دی مگر ارجل اسقدر تیز رفتار نکلا کہ مشکی اس لنگڑے گدھے کی طرح جو ناہموار زمین پر چل رہا ہو، منہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔"

عارضِ زنگیِ شب، گشت چنان کافوری — کہ شود چشمۂ انوار از و چشمِ زحل
روز، بر دیدۂ حربا، لبِ پیغارہ کشاست — کہ شد از جلوہ پرستاریِ خورشید احول
آن چنان نقطۂ شب محو شد از صفحۂ دہر — کہ سیاہی نکند باز بچشمِ احول

عرفی نے "دیدۂ روز" کو "احول" قرار دیا تھا۔ احول کو ہر چیز دو نظر آتی ہے۔ اسلئے دن کی آنکھ کے احول ہو جانے سے اسکی زیادتی مراد لی۔ یہ مجاز مرسل ہے۔ آصفی نے یہ قافیہ ان دو شعرون مین باندھا ہے جن مین دوسرا شعر عرفی سے بلند ہے۔ شب کو ایک سیاہ نقطہ فرض کرکے زمانہ سے اسکو ایسا ناپید کیا۔ کہ بھینگا زائد دیکھنے کے باوجود نہین دیکھ سکتا۔

دستِ خورشید بآئینۂ زنگاریٔ شب — زدہ با مصقلۂ خطِ شعاعی صیقل

سورج نے رات کے تاریک آئینہ کو اپنے کرن کے آلۂ صیقل سے سپید براق کردیا

اب ہم عرفی اور آصفی کے ہمقافیہ اشعار پہلو بہ پہلو لکھ کر دونون کے مرتبۂ کلام کو نمایان کرتے ہین فیصلہ ناظرین کی سلامت ذوق پر موقوف ہے۔

عرفی:
وقت آن ست کنون کز اثرِ عیش و نشاط
مے نگنجد بصراحی و صراحی بہ بغل

آصفی:
غنچۂ و گل زشرابے کہ بجامِ ابر ست
مست آید بچمن، ساغر و مینا بہ بغل

عرفی یہ کہنا چاہتا ہے۔ کہ "عیش و نشاط کا موسم ہے کوئی کس طرح ضبط کرے۔ شراب خود صراحی سے نکلی پڑتی ہے۔ اور پی لینے کی پنہان دعوت دیتی ہے"

آصفی نے مفہوم تو یہی لکھا۔ مگر جدتِ ادا سے شعر کو بہت لطیف بنا دیا۔ جب تک عالم پر خشکی کا سکہ روان رہتا ہے سبزۂ گل پژمردہ نظر آتے ہین۔ اور ہر سمت مردنی سی چھائی ہوتی ہے لیکن جہان ابر اٹھا۔ اور بارش شروع ہوئی۔ دفعۃً تمام نباتاتی مخلوقات مین زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی فضا مین غنچۂ و گل ناچنے لگتے ہین۔ شراب کا بھی تقریباً یہی اثر ہے۔ ادہر حلق سے اتری، ادھر جذبات زندہ ہوگئے۔ اور انسان جھومنے لگا۔ آصفی بارش کے پانی کو شراب قرار دیکر فرماتے ہین۔

"یہ اس جام ابر ہی کی شراب کا اثر ہے۔ کہ چمن مین کلی، اور پھول، جھومتے ہوئے، ساغر و مینا بغل مین بائے رقصان نظر آتے ہین"

غنچۂ و گل کا پیالہ اور صراحی بغل مین لئے آنا کسقدر لطیف ہے۔ غنچہ و گل کی بناوٹ سے پہلی نظر مین آنکھ اسے حقیقت مان لیتی ہے۔

دیکھو۔ عرفی نے جو سعی کی تھی۔ وہ آصفی کے قلم سے بار آور ہوئی۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ مصحفی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

غنچۂ گل، کہ بود طفل بگہوارۂ شاخ — تن در قماطے کہ قماشش بنود جز مخمل

میکند شوخی و یک لحظہ نمی آساید — دایۂ باد کشد تنگ ز مہرش بہ بغل

کلی ایک ننھا منھا سا پیارا بچہ ہے۔ جو مخمل کے بچھونے پر پڑا ہوا مچل رہا ہے۔ ہوا اسکی دایہ ہے۔ ہٹ دیکھکر اسے بہلاتی ہے اور سینہ سے چمٹا لیتی ہے۔ کہ شاید اسی صورت سے چھپ جائے

بغل کا قافیہ عرفی نے پھر نظم کیاہے۔

عرفی
دشت را لالہ در آید بہ چمن
تا لبالب کند از سنبل و گل جیب و بغل
آصفی
چو رگیسو بہ سیان بستہ در یحانست بدامان و کنار
گلستان را گل و نسرین ستاند جیب بغل

آصفی کا شعر عرفی کے شعر سے لطیف تر ہے۔ "دامان و کنار" اور "جیب و بغل" کا سنگم لطافت دو بالا کر رہا ہے
آصفی نے یہ قافیہ دو جگہ اور نظم کیا ہے۔ فرماتے ہین۔

گر بگلزار بہ مجمر بفشانند سپند
می شود دود چو سنبل بہوا دست و بغل

چمن از سبزہ و سنبل قفسے را ماند
کہ در و سبزک و طوطی ست بہم دست و بغل

سنبل سیاہ رنگ اور پریشان مو ہوتا ہے۔ دھوان بھی جب انگیٹھی سے بلند ہو کر فضا مین سفر کرتا ہے۔ تو سیاہ اور پریشان سا ہوتا ہے۔ شاعر کا تخیل موسم گل مین، دھوین کو سنبل سمجھتا ہے۔ اور مدعی ہے کہ سنبل دراصل دھوان تھا۔ فیض بہار سے پھول کی شکل اختیار کر کے ہوا سے کھیل رہا ہے۔

دوسرا شعر "دست و بغل" کی بہترین توجیہ ہے چڑیا گھر مین تم نے دیکھا ہوگا۔ ایک ایک پنجرے مین دس دس بیس مختلف رنگ کی چڑیان بند ہوتی ہین۔ کوئی سبز ہوتی ہے۔ کوئی خاکی، کوئی سپید وغیرہ۔ چمن مین بھی ایک ایک قطعہ مین متعدد رنگ کے پھول اور کلیان لگی ہوتی ہین۔ شاعر چمن کو قفس سے تشبیہ دیتا ہے۔ جہان سنبل اور سبزہ ایسے باہم گلے مین ہاتھ ڈالے بیٹھے ہین۔ جیسے پنجرے مین طوطا اور سبزک پاس پاس بیٹھے نظر آئین

عرفی
نامیہ، چون چمن سبزہ، دہد ناماتش
ناقص از کارگہ آرند بباغ از مخمل
آصفی
قطرۂ شبنم غلطان، بہ بساط سبزہ
در غلطان بہ نماید بہ بساط مخمل
زا ہتزاز طرب آہنگی سامان بہار
بر ہوا می فگند، سبزہ، کلاہ مخمل

عرفی کا شعر فلک پیما ہے وہ نامیہ کی دستگاہ کرم کو اسدرجہ متاثر بتاتا ہے کہ اگر کارخانہ سے آدھی بنی آدھی بے بنی مخمل اُٹھا لائین اور چمن مین ڈالدین۔ تو نامیہ جہان سبزہ کو پرورش کرے مخمل کو بھی مکمل کردے یہ نہایت لطیف مبالغہ ہے لیکن آصفی نے قافیہ کی بندش بہار یہ اسلوب سے کی ہے۔ پہلا شعر صاف ہے۔ گھانس ہری ہری مخمل ہی بچھی معلوم ہوتی ہے اسپر اوس کے قطرے صبح کے وقت آفتاب کی نوجوان کرنون کے زیر عکس موتی سے بکھرے نظر آتے ہین۔ یہ تشبیہ عام فہم اور منظر کی سچی تصویر ہے۔ دوسرا شعر اہتزاز و طرب کے پہلو کو نمایان کرتا ہے۔

جوش اور وفور جوش مین۔ انسان قابو مین نہین رہتا اس کیفیت کے اظہار کے لئے اس سے بلا اختیار کچھ نئی حرکتین سرزد ہوتی ہین۔ از انجملہ ہوا مین ٹوپیان اچھالتا ہے۔ موسم بہار مین سبزہ ہوا مین لہلہاتا ہوتا ہے۔ تو اس کا پھول یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹوپی ہوا مین اچھالی جا رہی ہے۔ شاعر اس منظر کو شاعرانہ زبان مین بالتوجیہ بیان کرتا ہے۔

"سبزہ" چمن مین کیون مست و سرشار نظر آتا ہے؟ اسلئے کہ چارون طرف عیش و عشرت کا سامان مہیا کرکے بہار نے نوجوانان چمن کو دعوت دی ہے۔ کہ دادِ عیش و نشاط دین۔ خزان کے ستم کے بعد یہ پہلا موقع ہے۔ کہ ایسا سہانا بچھنا عیش میسر ہوا ہے۔ سبزہ اس خوشی مین آپے سے باہر ہوگیا ہے اور بلا ارادہ ہوا مین ٹوپیان اچھال اچھال کر، خوشی کے جوش کو گھٹا رہا ہے"

عرفی — عرق از شبنم گل داغ شود بر رخِ حور / اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

آصفی — فیض نیرنگِ بہاریست در آتش زہوا / بالِ طاؤس کند جلوہ ز دودِ منقل

عرفی اور آصفی دونون ہوا کو معجز اثر مانتے ہین۔ لیکن عرفی اس مین مبالغہ سے کام لیتا ہے اور ہوا کے اثر سے چنگاریون کو سرسبز بناتا ہے گو بات خوب ہے، لیکن صرف بات ہے۔ آصفی قافیہ کو حقیقت نما بنانا چاہتے ہین، شعر کو بغور پڑھو متخیلہ نگاہون کے سامنے، نہایت حسین منظر پیش کرتی ہے

"انگیٹھی مین کوئلہ روشن کیا جائے، تو شعلے اور دھوان ملے جلے باہر نکلتے ہین۔ دھوین کا رنگ یونتو سیاہ سا ہوتا ہے، لیکن ابر مین، مائل بہ سپیدی نظر آتا ہے، چونکہ ابر مین فضا تاریک ہوتی ہے، اسلئے اس سیاہی اور سپیدی سے ایک دوسرا رنگ پیدا ہوجاتا ہے جو ہلکا نیلا یا فیروزی کہا جا سکتا ہے۔ شعلہ عموماً سرخ رنگ معلوم ہوتا ہے، لیکن اکثر اوقات بلند ہوتے وقت اور کبھی کبھی ناپید ہونے سے زرا پہلے، نیلا یا اودا ہوجاتا ہے۔ یہ منظر بالکل عام ہے۔ شاعر بھی دیکھتا ہے، لیکن نگاہ شاعرانہ ہے اسلئے وہ اس سیاہی سفیدی، نیلاہٹ، سرخی، اور اوداہٹ کو یکجا ہوا مین اڑتا دیکھکر، اُسے طاؤس سمجھتا ہے۔

موسم بہار کا، ہوا کا فیض نیرنگی اسکے تخیل پر چھایا ہوا ہے اس لئے اسکا خیال فوراً یقین سے بدل جاتا ہے، وہ یہی طے کرتا ہے کہ فیض ہوا ہے، دھوان اور شعلے، جاندار مور بن گئے ہین یہی مفہوم دوسری جگہ اس طرح نظم کیا ہے۔

تازگی را سر دیگریست بہ گلشن ز سحاب / خرمی را سر و سامانِ دگر از جدول

غنچہ، اخگر شود و سبزہ شود خاکستر / موجِ گل، شعلۂ آتش زہوائے منقل

عرفی — بسکہ ہر خار گلے کردہ عجب نیست اگر / یاسمین بشگفد از نشترِ زنبورِ عسل

آصفی — تلخکامی کہ کشد ساغرِ زہرابۂ غم / بحلاوت ز لبش جوش زند موجِ عسل

عرفی کا شعر یونہی بہار در دامن ہے لیکن "عجب نیست" سے لطف معنی اور زائد ہوگیا۔ مولانا کیفِ بہار کو کائنات مین اس درجہ موثر بتاتے ہین، کہ وہ اعراض و جواہر کی طبیعت تک بدل سکتا ہے۔ اگر موسم گل مین کوئی تلخ کام، غم کا زہر آلود پیالہ پیتا ہے۔ تو شیرینی بہار زہر کی تلخی کو حلاوت مین تبدیل کردے اور پینے والے کے ہونٹون سے، شہد کا دریا موجین مارتا نظر آئے۔ یہ صرف مبالغہ ہے۔ اگر کچھ حقیقت ہے تو اتنی کہ موسم بہار مین طبیعت کچھ بشاش ہوجاتی ہے، اور انسان کو خود بخود سرور سا آنے لگتا ہے اسیکو مولانا نے اسقدر بڑھا دیا ہے

عرفی — بسکہ از سنبل و گل یافت صفا نزدیکیست / کز پئے بوسہ دو لب را بہم آرد جدول

عرفی کا مقصد یہ ہے۔ کہ نہر کے دونون کنارون پر پھولون سے لدے درخت کھڑے ہین۔ جب ہوا چلتی ہے۔ ایک ڈھیر کا ڈھیر دونون طرف نہر مین جا پڑتا ہے۔ یہ روزمرہ کی صورت حال یہان تک پہنچ چکی ہے۔ کہ اب دو چار ہی دن مین، پھولون کا ایک کنارہ دوسرے سے ملجائیگا۔ اور یہ معلوم ہوگا۔ کہ نہر نے اپنے دونون ہونٹ بند کر لئے ہین۔ اس مین شاعر نے "از پے بوسہ" اور اضافہ کر دیا۔ جو عرفی کے منہ سے ضرور اچھا معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نے اس قصیدہ مین تین جگہ یہ قافیہ نظم کیا ہے۔ فرماتے ہین

سبز از فیضِ بہار یست چو برگِ خرم		برگِ خشکے کہ فتادہ ز خزان در جدول
تازگی را سرِ دریست بہ گلشن ز سحاب		خرمی را سرِ سامانِ دگر از جدول

یہ شعر انوری وغیرہ کی زبان سے ہوتے تو اچھے معلوم ہوتے۔ صرف بہار کی تازگی اور خرمی کا اثبات مقصود ہے۔ جہان اوپر سے ابر درختون پر زندگی برساتا ہے۔ سطح زمین پر نہر تازگی کی رنگین ادہر ادہر پھیلا دیتی ہے۔ پانی پر درختون کی سرسبزی اور شادابی کا مدار ہے۔ اسلئے نہر خرمی کا سر و سامان ہے۔ اور ضرور ہے۔ پھر خشک پتہ نہر مین جا پڑے۔ اور خرم نظر آنے لگے۔ تو تعجب کیا ہے

مگر تیسرے شعر مین آصفی نے قافیہ اپنا کر لیا۔ آسمان پر دہنک برسات کا ایک عام منظر ہے۔ بچہ بچہ واقف ہے۔ شاعرانہ الفاظ مین کہا جائے تو یہ جی چاہتا ہے۔ کہ کسی طرح اُوڑ کر اس مین جا بیٹھین موسمِ بہار، ہندوستان مین، برسات کا نام ہے۔ ہر چہار طرف پھول ہی پھول ہوتے ہین۔ ہوا چلتی ہے۔ اور پھول رقص کرتے ہین۔ تو رنگ موجین مارتا نظر آتا ہے۔ ہر چمک دمک والی شے دوسری شے کو اپنے اندر دکھاتی ہے۔ بارش نے گرد و غبار صاف کر کے آسمان کو آئینہ کی طرح روشن کر دیا ہے۔ اسلئے نظر اٹھا کر دیکھئے تو ایک عجیب تماشہ نگاہون کو جذب کئے لیتا ہے۔ آسمان کی نگارین سطح پر پھولون کی رنگین موجین متحرک، یہ معلوم ہوتی ہین۔ کہ قوسِ قزح کی طرح رنگ برنگ کے خط ہین۔ جو دست بگریبان ہین۔ یہ ہے شاعری کا وہ مقام جہان تک مصور کا تخیل بھی رسا نہین۔ فرماتے ہین۔

عکسِ موجِ گل و لالہ صفتِ قوسِ قزح		می کشد بر ورقِ چرخِ نگارین جدول

عرفی		شاید، او عذرِ پرستار پذیرد بحشر		محفلِ باغ ز بتخانہ آذین کم نیست		آصفی
		بسکہ برداشت صفا، صورتِ عزی دہبل		کبریائی گلان نیست کم از لات دہبل

عرفی کا شعر حدِ اعجاز کو پہنچ گیا ہے۔ اور اسکے اس شعر کا تو جواب ممکن نہین

انبساطیست درین فصل، کہ بے کاوشِ عقل		شاید، ار باز شود عقدۂ ما لا ینحل

عرفی		لیلے از گوشۂ محمل بنمود ست جمال		تودہ تودہ زر یاحین ست بصحرا و دمن		آصفی
		یا بود لالہ کہ سر بر زدہ از گوشۂ تل		پشتہ پشتہ بود از لالہ بکوہ و سرِ تل

دشت و گلزار و دمن از گل و نسرین و سمن
چمنے در چمنے دار د و تل بر سرِ تل
آصفی

سدرۂ و طوبیٔ جنت، ز چمن سرزدہ اند
یا کہ شمشاد و سہی سرو دمیدہ سرِ تل

آصفی کا تیسرا شعر عرفی کے برابر ہے۔ مگر پہلے دو شعر اعجاز کی حد تک پہنچ گئے ہین۔ زور، اور روانی، و جوش مین، عرفی کے ہان مخصوص اشعار ہونگے، جوان کے ہم پلہ ہون۔ تو دہ تو دہ۔ پشتہ پشتہ، چمنے در چمنے، اور تل بر سرِ تل، جدتِ تراکیب کی نادر مثالین ہین۔

قطعہ مین پھر مولانا اس قافیہ کو نظم کرتے ہین۔

خوشۂ سنبلہ خرمنِ ماہ کامل حظِ دہقانِ فلک بود ز اجناسِ اقل
عجبے نیست کہ از فیضِ ربیعی گردد کشتِ او سبزد بر دہند بصد خرمن و تل

ابھی تک دہقانِ فلک کو جو کچھ فصل سے حاصل ہوا تھا۔ وہ سنبلہ کے خوشے، اور چاند کا کھلیان تھا۔ اب ربیع کی فصل آپہنچی۔ کچھ عجب نہین۔ اگر اس کے کھیت مین ایک کی جگہ ہزارون خرمن اناج پیدا ہو جائے۔

توازن نے ہمین کہین سے کہین پہنچا دیا۔ اب ہم دونون کی غزلین پہلو بہ پہلو نقل کرتے ہین توازن تم خود کرلو۔

عرفی	آصفی
اے شبِ ہجرِ تو، در دیدۂ خورشید سبل	اے جمالِ تو بہارِ چمنستانِ ازل
چشمِ روح القدس از شوقِ جمالت احول	جلوۂ تست بہشتِ طربِ مستقبل
مژہ برہم نزدم دوش کہ زد بیتِ حزن	غمِ ہم چشمیٔ دشمن بعدم باز کشد
تا صباحم درِ دل کوفت تمنائے اجل	نکنم پیشِ تو زین رشک تمنائے اجل
از دل و دامنِ آلودہ دریاس مزن	کبریائی تو اے آفتِ دین کرد مگر
دجلۂ عفو باینہا نشود مستعمل	کافرین جلوہ بہ بیت الصنمِ لات و ہبل
بعذابِ ابدی، دل نگذارد غمِ دوست	لذتِ دردِ تو در سینۂ حسرت ناسور
این نہ مویست کہ آتش بکند ترکِ عسل	زند آن جوش کہ از دل برود ذوقِ عسل
لذتِ تلخیٔ دردِ تو اگر شرح دہم	زہرِ ناکامیٔ وصلِ تو ز عمرے نوشم
نوشدارد بفرستم بہ سلامِ حنظل	نوش گردد بلبم تلخیٔ طعمِ حنظل

عرفی

چند ازین آتش خس پوش برانگیزی دود
اے بجوش جوہری آئینۂ حسن تو مثل

آصفی

غیرت حسن با آئینہ ازان رو ندہد
کہ شود چشم تماشا زخیالش احول
بہ عیوزی نگزارد بگلستان قدمے
کہ نبوسد کف پا سبزہ چہ خواب مخمل
سیل حسن تو بنائے دل ما کرد خراب
از چہ در خانۂ آئینہ نیفتاد خلل
از پس جور تو بینیم ز ایام جفا
خوے افلاک بخوے تو مگر گشت بدل
باغبان خون شدم از شیرۂ بیدردی تو
ندہی رخصت فریاد نہ آہنگ غزل

مولانا کے اس قصیدہ کی تشبیب کے اکثر اشعار تم پڑھ چکے۔ چونکہ وہ جوش مسابقت کے ممنون ہین۔ اس لئے بلند ہین دو چار شعر وہ بھی سن لو۔ جو زیربار تقابل نہین۔ کسی آئندہ فرصت مین باقی دونون قصیدون سے مقابلہ و موازنہ کیا جائیگا۔

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ میخیزد

بسکہ از تربیت فیض نگاہ نیسان
مادۂ طبع بحارست بکہسار دہ تلل
عجبے نیست کہ ہمچون صدف گوہر خیز
جائے یاقوت گہرزا شود از لال جبل
ابر سرچشمہ کشادہ ست ز شیرینی عیش
موجۂ شہد زند در ریشۂ تخم حنظل
گوہرین تاج نہادہ بسر خسرو گل
دست اقبال بہاران بگزین گوہر طل
بسکہ از فیض لطافت بصفا می بالد
عینک دیدۂ نرگس شود اوراق بصل
بسکہ نیرنگ بہارست بگلزار دمن
ہر نہالے زدہ ہمچون دم طاوس کلل
بہ تمنائی بقولات ربیعی بفلک
فربہی مفت بیالد بہ تن جدی و حمل
نامیہ ہر نفسے رنگ بہار آمیزد
بیکر نیمرخ غنچہ شود مستقبل
عجبے نیست کہ از تربیت فیض بہار
چون رگ لالہ، رگ شعلہ شود در مشعل
سنگ از لطف ہوا وضع نزاکت دارد
کار گاہے دگر از شیشہ گری گشت جبل
سرخی رنگ و سیاہی بدل لالہ بود
ہمچو آن شعلہ کہ بر دود بود در مشعل
دشت و کہسار، شبستان فلک شد از نور
سر زدہ لالہ چو خورشید درخشان ز حمل

چشم بکشا بشکوہ چمن و کوہ وتلل	شد ریا حین کدہ از صنعتِ صناعِ ازل
بعنانِ گل و لالہ ز پس پردۂ خاک	سر برآوردہ بصد ناز چو خوبان بختل
تازہ چون لالۂ نورستہ بود شعلہ لبسنگ	سبز چون دانۂ بالیدہ شرر ہا بہ جبل
آبِ سرچشمۂ خورشید بود سبز مدام	افگند عکس اگر سبزۂ کہسار و تلل
سبز شد آئینۂ آبِ چنان در انہار	سبز دموجِ صبا زنگ بزد در صیقل
گر نسیم سحری سوے فلک رد آرد	می نماید بکواکب چو گل باغ عمل
طبع صیاد چنان طرح صفا ریختہ است	کہ شود چینِ جبینِ چمنش، دامِ حیل
گل کند چارۂ دردش بہ مسیحا نفسی	بلبلے نالہ کشد گر بگلستان زعسل
گلرخان گر بگل تازہ مژہ بکشا نید	موے مژگان برگ گل بنما یند بدل
از گل افشانی و از لالہ دمانی بہار	گلستان دشت و دمن، لالہ ستان کوہ وتلل
آنچنان عہد شکستہ است خزان باز نماند	از پئے عہد بہاران غمِ تحویل وبدل
رنگ بخشد برخِ شاہد امید جہان	بادۂ عشرتِ حال وطربِ مستقبل

(باقی) **خان امتیاز علی عرشی** (رامپوری)

انتخاب نگارستان

(یعنی حضرت نیاز کے ادبی مضامین کا مجموعہ)

وزیر حربیہ کی پُر راز زندگی

وائی کونٹ بائسلے، وزیر جنگ اپنی لیموزین یعنی بند رولس (موٹر کار) کے سامنے کچھ دیر کھڑے رہ کر سگار جلاتے رہے، خادم موٹر کا دروازہ کھولے برہنہ سر مودب کھڑا تھا، جب سگار اچھی طرح روشن ہو گیا تو وائی کونٹ نے پہرے کے سپاہی کی طرف دیکھکر اس کے فوجی سلام کا سر کے اشارے سے جواب دیا اور سگار کا ڈبہ جیب میں رکھتے ہوے موٹر کے اندر بیٹھ گئے، خادم نے نرم کھال کا قیمتی کمل ان کے گھٹنوں پر ڈال کر ٹانگوں کے گرد لپیٹ دیا، کاغذات کا دستی چرمی بکس قرینے سے سامنے براکٹ پر رکھدیا، اور دروازہ بند کرکے شوفر کے ساتھ بیٹھ گیا، موٹر پارلیمنٹ یارڈ سے نکل کر آہستہ آہستہ داہنی طرف سے مڑا، اور وسٹ منسٹر برج سے گزرتا ہوا دکھن کی طرف چلا، نومبر کا مہینہ تھا اور سات بجے شام کا وقت، غضب کی سردی پڑ رہی تھی اور ہر طرف کہر چھایا ہوا تھا، اور ایسا سخت کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، سڑکوں پر آمد و رفت گویا بند تھی، صرف چند موٹریں اپنے لیمپوں کی تیز روشنی ڈالتی ہوئی اور ہارن بجاتی ہوئی آہستہ آہستہ ادھر اُدھر جا رہی تھی، سڑکوں کی روشنی بالکل پھیکی پڑ گئی تھی، کہرے کی وجہ سے سانس لینا دشوار تھا اور ہلکی ہلکی بارش سے سڑک پر چلنا مشکل

کچھ دیر تو وائی کونٹ بائسلے بیٹھے سگار پیتے رہے، پھر انھوں نے سامنے براکٹ سے ایک اخبار نکالا اور اسے کھولکر پڑھنے لگے، پہلے ہی صفحہ پر موٹے حرفوں میں یہ سرخی درج تھی

ہاؤس آف کومنس (دار العوام) میں حیرتناک افشائے راز وزیر جنگ کے خلاف مسٹر انٹونیو
بالشویک ممبر کی تقریر، وزیر جنگ کا غیر تشفی بخش جواب وزارت کی شکست اور اسکے مستعفی ہو جانیکا تیقن

وائی کونٹ بائسلے نے سرخی پڑھنے کے بعد آگے پڑھنا شروع کیا، یہ ایوننگ اسٹار کا ساڑھے پانچ بجے کا پرچہ تھا، سرخی کے آگے لکھا تھا:-

> ہاؤس آف کامنس میں آج چار بجے جب جنرل مارٹن کے خلاف مقدمہ چلائے جانیکا قصہ پیش ہوا تو نائب وزیر جنگ مسٹر گرنڈے نے گورنمنٹ کی طرف سے بیان کیا کہ پشاور کی چھاونی میں جنرل مارٹن جب جنرل افیسر کمانڈنگ تھے تو انھوں نے اپنی بیٹیوں کی شادی کے موقع پر چھاونی کے کئی انگریز اور ہندوستانی ٹھیکہ داروں سے بہت سا روپیہ قرض لیا تھا اور کئی قیمتی تحفے بھی قبول کئے تھے لیکن یہ رقمیں اصل میں رشوت تھیں، انھیں کی غفلت سے سلاح خانہ سے دو ہزار رائفلیں سرحدی ڈاکو چرا لیگئے اور وائسرائے ہند اور کمانڈر انچیف نے انہی اسباب کی بنا پر کورٹ مارشل کے فیصلہ کے بعد جنرل مارٹن کو کمان سے علیحدہ کر دیا تھا"

نائب وزیر جنگ کے اس بیان کے بعد ہر طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہو گئی مگر وہ سبھوں کو یہ کہکر ٹالتے رہے

کہ ابھی صرف اتنی ہی خبریں موصول ہوئی ہیں آئندہ مفصل رپورٹ دونوں مجلسوں کے سامنے پیش کردی جائیگی۔ فرقہ مخالف کے لیڈر کی تشفی کرتے ہوئے انھوں نے اسکا وعدہ کیا کہ آئندہ مجلس میں اس موضوع پر اسکو اظہار رائے کا موقع دیا جائیگا

اس جواب کے بعد دوسری بحث شروع ہوا ہی چاہتی تھی، کہ مسٹر انٹونیو محلہ جلیسی کے منتخب ممبر نے کھڑے ہوکر صدر سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی اور انھوں نے دوران تقریر میں کہا کہ فوج کے دونی، اعلیٰ افسروں کا رشوت کی رقمیں لے لینا بعید از قیاس نہیں جبکہ وزیر جنگ خود ایک ایسا شخص ہے جس نے فریب، دھوکہ، چوری، بے ایمانی، ظلم و ستم سے آج اپنے کو اس قابل بنالیا ہے کہ دارالامراء میں خاندانی رئیسوں کے ساتھ بیٹھکر اس عظیم الشان سلطنت کے حربی وزارت کا نظم و نسق کر رہا ہے

یہ الفاظ اور ایسا حیرت انگیز اتہام سن کر مجمع میں ایک ہلچل مچ گئی اور ہر طرف سے لعنت ملامت کی آوازیں آنے لگیں کچھ لوگ غصہ میں اسپر بھی آمادہ نظر آئے کہ مسٹر انٹونیو کو زدوکوب کریں، لیکن بعض لوگ مطلقاً مرعوب نہ ہوے اور مسکراتے رہے رفتہ رفتہ جب "آرڈر، آرڈر" کی پکار سے شور کم ہوا تو مسٹر انٹونیو نے اپنا سلسلۂ کلام پھر شروع کیا :- "مجھ پر یہ اچھی طرح روشن ہے کہ اس معزز مجلس میں میرا کوئی ساتھی نہیں اور نہ کوئی جماعت میری حمایت کرنے والی ہے، میری ذاتی حالت سارے عالم پر منکشف ہے اور مجھے اس کے اعادہ میں مطلق شرم نہ کرنا چاہیے، کہ میں جوتے بنانے والا ایک غریب چمار ہوں، میری انگلیوں کے گھٹے، یہ بڑھے ہوے ناخن، استرے قینچی سے ناآشنا مونچھ داڑھی کے لمبے لمبے بال، میری سخت زبان اور میرا غیر شایستہ طرز گفتگو یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنکا میں خود معترف ہوں، مگر میں اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتا، میری یہ خامیاں صرف اس کا پتہ دیتی ہیں کہ اس ملک کے بدترین فرقہ میں پیدا ہوں اس شایستہ قوم کی غیر شایستہ اکثریت کا میں ایک عبرت انگیز نتیجہ ہوں ———— جسمیں اقلیت کے چند دولت مند نفوس اکثریت کے جائز حقوق پامال کرنے میں مطلق باک نہیں کرتے، جناب صدر! میں جاہل سہی، گنوار سہی، مردود سہی، مگر میرے پہلو میں دل ہے اور دل میں درد، میں اپنی آنکھوں سے جو دیکھتا ہوں اس سے متاثر ہوتا ہوں اور پھر زبان پر جس طرح بھی آتا ہے بک دیتا ہوں، آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ چار سو شلنگ سالانہ جو مجھکو پارلیمنٹ کے ممبر ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں وہ سب کی سب یا تو میں اپنے محلہ کے اندھوں کے اسپتال کو دیدیتا ہوں، یا اس سے اُن غریب عورتوں کی مدد کرتا ہوں جو مجبوراً شرمناک زندگی گذارنے کے بعد اب موت کی منتظر بیٹھی ہیں ——
جناب میری گذر اسی جوتہ بنانے سے ہوتی ہے، شب کے وقت جب اس مجلس کے تقریباً کل ممبر اچھے اچھے ڈنر کھارہے ہوں گے، یہ دیکھیے سوکھی روٹی اور ٹھنڈا گوشت اپنی جیب سے نکال کر پانی کے چند گھونٹ کے ساتھ حلق کے نیچے اُتار لوں گا

جناب صدر! اپنے اس دکھڑے کے دھرانے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں ممبروں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دوں کہ وزیر جنگ وائی کونٹ بائسلے کے خلاف ایسے سخت اتہام لگانے سے نہ مجھے کسی نفع کی امید ہے اور نہ کوئی میری ایسی جماعت ہے جو اسکے مستعفی ہونے سے فائدہ اٹھا سکتی ہے، جناب میں اسوقت جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں خدا کو حاضر و ناظر سمجھکر کہہ رہا ہوں اور اگر آپ کو میری باتوں کا یقین نہ ہو تو یہ بتائیے کہ جنگ سے پہلے وائی کونٹ بائسلے کون تھے، ایک اجنبی گمنام

تاجر جنھوں نے ۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ سے آکر ایک مختصر پیمانے پر اپنا کاروبار شروع کیا تھا، برائے خدا کوئی یہ بتائے کہ اس سے قبل بھی کسی نے مسٹر میکبسی کا نام سنا تھا، آخر یہ حضرت کون تھے؟ جنوبی افریقہ میں ان کا کیا شغل تھا؟ یکایک ان کے ہاتھ اتنی دولت کیونکر آگئی، جنوبی افریقہ جانے سے پہلے یہ کون تھے اور کیا تھے کوئی ہے اس بڑی مجلس میں جو میرے اس سوال کا جواب دے سکے، کوئی بھی نہیں، کیوں، اسلئے کہ سوائے وہ ایک کے کسی اور کو معلوم ہی نہیں، ہاں چند دن ہوئے میرے پڑوس کی ایک بدنصیب عورت نے مجھے اپنے بستر مرگ کے پاس بلاکر اپنی دکھ بھری رام کہانی سنائی چند کاغذات حوالے کئے چند جملے کہے اور آنکھیں بند کرکے ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی، مگر جناب صدر! عالم نزع میں اس عورت کی مرتعش زبان سے جو الفاظ نکلے تھے وہ ابتک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں سے جو کاغذات میں نے لئے تھے وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔

جناب صدر! جنگ عظیم کے موقع پر ملک کو، قوم کو، سلطنت کو، سامان حرب کی ضرورت تھی، گوشت اور مکھن کی ضرورت تھی، روٹی اور چارہ کی ضرورت تھی اور ضرورت بھی ایسی کہ اگر وہ فوراً نہ پوری کی جاتی تو آج ہم سب جرمنی کے غلام ہوتے، بکنگھم پیلس (قصر شاہی) یہ یا تو ہل چلائے گئے ہوتے، یا اُسے ایک عجائب خانہ بنا دیا گیا ہوتا، یا اس میں کڑی مونچھوں والا کوئی جرمن جنرل لندن کے گورنر کی حیثیت سے مقیم ہوتا، یہ سب چیزیں ہر ممکن طریقہ سے حاصل کی گئیں نہ کسی سے کچھ پوچھا گیا اور نہ کسی کے جواب کا انتظار کیا گیا، میکبسی کون تھا، نہ مجھے پہلے معلوم تھا اور نہ اب، مگر ہاں میرے پاس اسکے ثبوت موجود ہیں کہ اسی میکبسی نے جنگ کے زمانہ میں ارجنٹائن اور برازیل سے قحط کی جھوٹی رپورٹیں بھجوا کر لندن کے بازار میں گوشت اور گیہوں کی قیمت چوگنی بڑھوادی اور خود یہی چیزیں منگوا کر اور گورنمنٹ کے ہاتھ بیچ کر کثیر نفع حاصل کیا، میں ثابت کرسکتا ہوں کہ میکبسی نے وزارت جنگ کے ایک بڑے رکن کو رشوت دیکر کروڑوں کا سامان حرب ردی قرار دیکر نیلام کرادیا اور انھیں کوڑیوں کے مول خرید کر پھر اپنے نام سے گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کرڈالا، میں جانتا ہوں کہ اس نے سلطنت کے راز کی باتیں دشمنوں تک پہونچائیں، میرے پاس اسکے ثبوت موجود ہیں کہ سلطنت برطانیہ کے مختلف مقبوضات میں بغاوتیں اور شورشیں اس کے ایما اور سازش سے ہوئی تھیں، میں اسکے ثبوت میں کاغذات پیش کرسکوں گا کہ جنگ کے بعد کوئلہ کی کانوں میں اس شخص کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس ملک کے لوگ اندھے ہیں، دولت دیکھکر ان کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور پھر یہ نہیں پوچھتے کہ کون کیا تھا اسی موجودہ وزیر جنگ نے ملک کو کس طرح لوٹا، کسی کو کبھی خبر نہیں، اسکی ہستی سلطنت کے لئے کتنی خطرناک ہے کسی کو پرواہ نہیں، مگر کسی کم عہدے کے فوجی افسر نے اگر کسی سے ایک سگریٹ کیس قبول کرلیا، چاندی کی دو تھالیاں لیلیں تو اسکی گردن میں پھانسی لگائی جاتی ہے، صدر صاحب میں تو بالشویک ہوں، فوج کا دشمن ہوں، میں جانتا ہوں کہ یہ ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ مختلف قوموں کو ہمارا غلام بنایا جا۔ ہاں لیکن میں انصاف پسند ہوں کسی کو اگر میری باتوں کا یقین نہ ہو تو کھڑیاں کھلی ہیں، مجھ سے پرسش کرلی جائے اور مجھ سے ثبوت طلب کئے جائیں، جناب صدر اعلیٰ افسروں کو کوئی کچھ نہیں کہتا، لیکن کم درجہ والوں کو برباد کرکے عبرت کے لئے مثالیں قائم کی جاتی ہیں۔"

مسٹر انٹونیو کی تقریر کے بعد ساری مجلس میں دیر تک سناٹا چھایا رہا اور وزیر اعظم صرف اتنا کہکر کہ وہ اس اتہام کا جواب کل دیں گے چیمبر کے باہر نکل آئے، وائی کونٹ بائسلے جو امرا کی نشست گاہ سے یہ تقریر سن رہے تھے اُٹھکر وزیر اعظم کے کمرہ میں چلے گئے۔ قرینہ غالب یہ ہے کہ یا تو مسٹر انٹونیو کے خلاف مقدمہ چلایا جائے گا، یا وزیر جنگ کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑے گا، کیا عجب کہ ملک معظم آج کی رات سینڈرنگھم سے لندن واپس چلے آئیں

وائی کونٹ بائسلے نے مسکراتے ہوئے یہ اخبار موڑ کر رکھدیا، اور دوسرا اخبار کھولکر پڑھنے لگے، روز کا معمول تھا کہ اخبار کی تازہ کاپیاں موٹر میں قرینے سے رکھدی جاتی تھیں اور یہ گھر واپس جاتے ہوئے انھیں پڑھ لیا کرتے تھے، اس دوسرے اخبار میں بھی ممتاز جگہ مسٹر انٹونیو کی تقریر دی گئی تھی، لیکن دوسرے صفحہ پر بحرف جلی یہ لکھا تھا:-

"ہائیکورٹ کے دروازہ پر بم کا پھٹنا اور ہنگامہ میں ایک قیدی کا پراسرار فرار"

آج پانچ بجے جب ڈارٹ مورجیل کے گورنر کے قتل میں ماخوذ ہونے والے قیدی اور گواہ ہائیکورٹ سے باہر لا کر پولیس کی موٹروں میں سوار کیے جا رہے تھے، اسوقت سڑک پر کئی بم پھٹے، مگر دفتی ہنگامہ کے علاوہ کوئی اور نقصان نہ ہوا، جب بدبو کم ہوئی اور لوگ اپنے حواس میں آئے تو معلوم ہوا کہ ایک قیدی جو گواہی کے لئے لایا گیا تھا، مفرور ہے اور زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ وہ قیدی ہندوستانی تھا جو کئی سال سے ڈارٹ مور کے جیل خانہ میں مقید تھا، اور اب چند مہینوں میں رہا ہونیوالا تھا۔"

لارڈ بائسلے اخبار سے نظر اُٹھائے کسی خیال میں محو تھے، سگار بجھ چکا تھا اور اُن کی آنکھیں نیم وا تھیں، کچھ دیر یونہی سوچ میں رہنے کے بعد انھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اسطرح سر کو جنبش دیکر پھر اخبار کو اٹھا لیا جیسے کسی خیال کو کوشش کرکے دور کر رہے ہیں بجھا ہوا سگار انھوں نے داہنی طرف تشتری میں رکھدیا، اور اخبار پڑھنے لگے -

کئی سال گزر چکے ہیں اور ممکن ہے کہ ناظرین کو گذشتہ واقعات یاد نہ ہوں اس لئے اختصار کے ساتھ اس ہندوستانی قیدی کے مقدمہ کا حال ذیل میں درج ہے:-

سنہ ۱۹۱۵ء میں دو ہندوستانی لڑکے کلکتہ یونیورسٹی سے ڈگریاں لیکر لندن آئے اور لندن یونیورسٹی کالج میں داخل ہوئے بڑا بھائی مجتبیٰ فزکس اور کیمیا کے تجربے کرنے لگا، اور چھوٹا بھائی مرتضیٰ سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا، مجتبیٰ بہت جلد جلد ترقی کرنے لگا اور اس نے دو ہی چار مہینے میں کئی علمی مضامین لکھے جو سائنس کے باوقار پرچوں میں چھپے، چھوٹا بھائی مرتضیٰ اپنا زیادہ وقت کھیل کود، تھیٹر، گھوڑ دوڑ میں صرف کیا کرتا تھا دونوں بھائی جس مکان میں رہتے تھے اس مکان کا مالک ایک پنشن یافتہ فوجی سارجنٹ تھا جو اپنی پلٹن کے ساتھ کئی سال ہندوستان میں رہ چکا تھا۔ اسکا نام جیکسن تھا اور اب یہ اپنے مکان کے سامنے ایک تھیٹر میں دربان تھا، اسکی بیٹی مارگریٹ بھی اسی تھیٹر میں ٹکٹ بیچنے پر ملازم تھی، لڑکی جوان اور خوبصورت تھی اور دونوں بھائی مجتبیٰ اور مرتضیٰ اس سے محبت کرنے لگے تھے، مگر مارگریٹ مجتبیٰ کی طرف زیادہ مائل تھی، ایکدن جیکسن اپنے گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اوپر کے کمروں سے ہنگامہ کی آواز آئی، اس نے جا کر دیکھا تو مجتبیٰ اپنے کمرے میں پڑا دم توڑ رہا تھا، اسکی پیٹھ میں ایک بڑا سا چاقو اترا ہوا تھا، اسکے قریب مارگریٹ بیہوش پڑی تھی سامنے مرتضیٰ مبہوت کھڑا تھا - اسکے ہاتھ اور اسکے کپڑے خون سے رنگین تھے جیکسن پولیس بلا لایا، چاقو مرتضیٰ ہی کا تھا اور جب اسپر قتل عمد کا مقدمہ چلایا گیا تو اپنی صفائی میں وہ سوائے انکار کے اور کچھ نہ کہہ سکا - مارگریٹ نے

مرتضی کے خلاف شہادت دیتے ہوئے کہا کہ دونوں بھائی میرے عشق میں لڑ بیٹھے، اور مرتضی نے رقابت میں اپنے بھائی مجتبی کو مار ڈالا" عدالت سے مرتضی کو پھانسی کی سزا کا حکم صادر ہوا، اسی سال ملک معظم ہندوستان تشریف لیجا رہے تھے لندن کے ہندوستانی باشندوں نے رحم کی درخواست کی اور پھانسی کی سزا حبس دوام سے مبدل ہوگئی اسوقت سے مرتضی ڈارٹ مور کے جیلخانہ میں مقید تھا اس کے اچھے اطوار اور اسکی علمی قابلیت نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے قیدیوں کا سردار بنا دیا تھا، اور اب بہت جلد اسکے قید کی بقیہ میعاد معاف ہونیوالی تھی اور وہ بہت جلد رہا ہونیوالا تھا۔ ڈارٹ مور کے جیلخانہ کے گورنر جنرل رچرڈسن کو چند قیدیوں نے ملکر قتل کر ڈالا تھا، اور انھیں کی شناخت کیلئے مرتضی مع چند قیدیوں کے لندن لایا گیا تھا، اور جب مقدمہ کی پیشی کے بعد یہ موٹر میں سوار ہو رہا تھا اسی وقت کئی بم پھٹے اور اس ہنگامہ میں مرتضی فرار ہوگیا پولیس تفتیش کیلئے متعین ہے ممکن ہے کل تک گرفتار ہو جائے۔"

وائی کونٹ بانسلے نے یہ اخبار بھی بند کرکے رکھدیا اور کسی گہرے خیال میں غرق ہوگئے، تھوڑی دیر کے بعد موٹر ایک بڑے مکان کے سامنے رکا، وائی کونٹ اترے، ہال میں ایک بوڑھے سیاہ پوش خادم نے ان کا کوٹ اتارا اور ٹوپی اور چھڑی لیلی اور سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اوپر کی منزل پر چلے گئے، خادم ان کی خوابگاہ کے سامنے کھڑا تھا، کمرے میں جاکر انھوں نے کپڑے اتارے غسل کیا، اور ڈنر سوٹ پہنکر سگار پیتے ہوئے کتب خانے میں چلے آئے ابھی یہ کمرہ کے وسط میں پہونچے بھی نہ تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکی "نانا ابا - نانا ابا"، کہتی ہوئی انکی طرف بڑھی، تقریبًا اسکی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی، میانہ قد چھریرا بدن، اسکے چہرے کی سفیدی پر ہلکے بادامی رنگ کا شتباہ ہوتا تھا گالوں پر سیب کی سی ہلکی گلابی جھلک تھی، مصنوعی رنگ سے رنگے ہوئے بھرے بھرے لب یاقوت کی طرح چمک رہے تھے، اور کمان کی طرح سیاہ بھویں [illegible] تنی ہوئی تھیں جنسے تحیر اور رنج کا پتہ چلتا تھا، ان سے غصہ بھی نمایاں تھا اور کسی امر پر آزردگی بھی، سر کے سیاہ بال پیچھے کی طرف مردوں کی طرح کٹے ہوئے تھے اور سامنے کے بال پیچھے کی طرف لہریا بناتے ہوئے پڑے تھے، کانوں میں ہیرے کے آویزے لٹک رہے تھے، یہ لڑکی نہایت ہی حسین سفید رنگ کے ریشمی کپڑے کا گون پہنے تھی جو گھٹنوں کے اوپر ہی ختم ہوگیا تھا اور اوپر کا حصہ جسم سے بالکل چپاں تھا، پشت بالکل عریاں تھی، شانے کھلے ہوئے تھے، اور یہ گون صرف ہیرے کی ایک پتلی سی ڈوری سے گلے سے آویزاں تھی۔ لڑکی کے بائیں بازو پر پلیٹنم کا ایک کڑا تھا۔ جسمیں بڑے بڑے ہیرے جڑے ہوئے تھے، جرابیں ایسی باریک تھیں کہ ٹانگوں کی نیلی رگیں اندر سے نظر آتی تھیں ان کا رنگ جسم کے رنگ سے اسقدر ملتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ٹانگیں بالکل ننگی ہیں، پیروں میں سفید نقرئی کمخواب کے نازک جوتے تھے، لڑکی نے قریب آکر وائی کونٹ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھکر منہ چوما اور بولی "نانا ابا - لیڈی ایجرٹن کے یہاں رقص میں چلیئے گا نا، میں ٹونی کے ساتھ رٹز میں کھانا کھانے جارہی ہوں اور وہیں سے رقص میں جاؤں گی، لیڈی ایجرٹن کی بڑی لڑکی سیلویا نے آج کی رات مجھے اپنے ساتھ سلانے کا وعدہ کیا ہے آپ بھی آئیے گا نا؟"

لڑکی کے اس اظہار محبت کو دیکھکر بھی وائی کونٹ کے چہرے سے خوشی نمایاں نہ تھی، آنکھوں میں آنسو آگئے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لڑکی کو گلے لگا لیا اور دیر تک اپنے سینہ سے لگائے رہے، لڑکی انکی اس حرکت سے گھبرا سی گئی اور خوفزدہ ہوکر پوچھنے لگی "کیوں نانا ابا کیسا مزاج ہے؟"، کونٹ نے بہت ضبط کرکے جواب دیا:- "نہیں کچھ نہیں، یونہی کچھ یاد آگیا اور دل بھر آیا، گھبراؤ نہیں"

لڑکی ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک آرام کرسی کے پاس لیگئی اور انھیں بٹھلا کر خود کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی اور ان کی گردن میں باہیں ڈالکر کہنے لگی "نانا ابا آپ ان دنوں سخت محنت کرتے ہیں مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کی صحت نہ خراب ہو جائے، دن رات سوائے کام کرنے کوئی اور شغل ہی نہیں، میں بتاؤں سنیئے چند دنوں کیلئے مڈیرا چلیے، میرا بھی لندن کی بارش کہر اور سردی سے دم گھبرا گیا ہے۔ وہاں سردی بہت ہی کم ہوگی، دھوپ بھی خوب ہوگی آپ کی بھی صحت

درست ہو جائے گی اور میرا بھی جی بہلے گا، میں اپنے ساتھ ..... " لڑکی نے محبت بھری نظروں سے کونٹ کو دیکھکر اپنا گال ان کے گال سے ملا دیا۔ اور ایک ہاتھ سے اُن کے شانوں پر ہلکی ہلکی تھپکیاں دینے لگی، ــــــ " نہیں بیٹی مارگیرٹ مجھے ایک منٹ کی فرصت نہیں، پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے بہت سے معاملے زیر تجویز ہیں، بھلا میں کیسے جا سکتا ہوں" لڑکی نے اس انکار پر منھ پھلا کر کہا " تو آپ کو کیا میری خوشی سے زیادہ پارلیمنٹ کا خیال ہے" کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جھجکتے ہوئے اور فوراً شرما کر "نانا ابا میں ایک راز کی بات بتا دوں؟ میں نے آج ٹونی کی درخواست منظور کر لی اور مجبوراً کیونکہ ایک مدت سے لوگ ناک میں دم کئے ہوئے تھے، جہاں گئی بھڑوں کی طرح چمٹ گئے، آخر کار کل کی رات میں نے عاجز آکر فیصلہ کر لیا اور موٹر میں جب ٹونی نے ہزاروں منتیں کیں تو میں نے ہاں کہدیا، غریب ٹونی ہے تو بیوقوف مگر پکے ارادے کا آدمی ہے" "نانا ابا چلئے آپ اور میں اور ٹونی جنوبی فرانس چلے چلیں، چلیئے گا نا؟"

وائی کونٹ ابھی جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ بوڑھے خانساماں نے دروازہ کھول کر ادب سے عرض کیا " لیڈی صاحبہ مسٹر ہالیڈے تشریف لائے ہیں" " انھیں یہیں بلا لو" کہکر لیڈی مارگیرٹ کرسی سے اُٹھی اور آتش دان کے اوپر لگے ہوئے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر سر کے بال درست کرنے لگی، مسٹر انٹونی ہالیڈے نے کمرے میں داخل ہو کر " ہلو میگی" کہتے ہوئے لیڈی مارگیرٹ کی طرف مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ ہنس کر بولی، " بیوقوف لڑکے یہ ہاتھ ملانا کیسا، میرے بوسے کیوں نہیں لیتا، میں نے نانا ابا کو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے" یہ کہکر لیڈی مارگیرٹ نے خود مسٹر ہالیڈے کے کئی بوسے لئے۔

ہالیڈے نے لیڈی مارگیرٹ سے جدا ہو کر وائی کونٹ سے ہاتھ ملا کر کہا:۔ " میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ میگی نے میری درخواست قبول کر لی اور میں جناب کا ممنون ہوں کہ آپ نے بھی اسے منظور کر لیا اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بہت جلد شادی کر کے مارگیرٹ کو برازیل لیتا جاؤں، ابا جان علیل ہیں اور طلبی کے تار پر تار آ رہے ہیں"

وائی کونٹ نے ہالیڈے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا، میاں اگر مارگیرٹ نے تمھیں قبول کر لیا تو پھر میری منظوری کی کیا ضرورت، جب وہ کہیں شادی کر لو، میری دعا ہمیشہ تمھارے شامل حال رہے گی۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے، تم جانتے ہو کہ یہ میری آنکھوں کی پتلی ہے، میں اسے دیکھکر زندہ ہوں۔

لیڈی مارگیرٹ نے نانا کے بوسے لئے۔ ہالیڈے نے گڈ نائٹ سر، کہکر اُن سے مصافحہ کیا اور دونوں باہر چلے گئے۔ دونوں کے جانے کے کچھ دیر بعد وائی کونٹ نے سگار جلایا۔ اور دل میں یہ کہکر " خیر اس بچی کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا، کسی گہرے خیال میں ڈوب گئے۔ دیر تک سگار پیتے رہنے کے بعد انھوں نے دیوار سے لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور فوراً ہی بوڑھا بٹلر دروازہ کھولکر مودب سامنے آکر کھڑا ہو گیا " مارٹن آج مجھے بھوک نہیں ہے کھانا نہ کھاؤں گا، صرف دو ایک بسکٹ اور چند سینڈوچ شراب کی بوتل کے ساتھ رکھدو کسی وقت بھوک لگے گی تو کھا لوں گا، آج مجھے دیر تک کام کرنا ہے، اور ہاں مارٹن تم نے تھیٹر کا وہ نیا تماشہ تو نہیں دیکھا ہے؟ " نہیں مائی لارڈ" " اچھا تو تم اور مسٹر مارٹن آج میری طرف سے اسے دیکھ آؤ بہت پسند کرو گے اور ولیم کو بھی لے لو، کہدو میں سوتے وقت کپڑے خود پہن لوں گا، جگہ کے لئے ٹیلیفون کر دو اور موٹر میں چلے جاؤ

شوفر غریب بھی تماشہ دیکھے گا"

بوڑھا مارٹن "حضور کا بیحد شکریہ" کہکر باہر چلا گیا، اور چند لمحوں کے بعد ایک نقرئی کشتی میں چند بسکٹ اور سینڈوچ لے آیا ایک چھوٹی میز پر ایک چھوٹی کشتی میں شراب کے دو تین کنٹر سوڈا کی ایک سائی فن اور دو تین گلاس رکھے ہوئے تھے - مارٹن نے یہ کل چیزیں سجا کر رکھدیں - آتش دان سے راکھ جھاڑی، کوئلے کے کچھ ٹکڑے آگ میں ڈالے، کھڑکی کے قریب جاکر پردے برابر کردیئے - سگار کے ڈبہ کو کھول کر دیکھ لیا کہ بھرا ہے - پھر ادب سے "گڈ نائٹ مائی لارڈ" کہتا ہوا آہستہ سے دروازہ بند کرکے چلا گیا - مارٹن کے جانے کے بعد وائی کونٹ ایک گھنٹہ تک کسی گہرے خیال میں غرق رہے، ان کے چہرے سے غم اور کبھی غصے کے آثار نمایاں تھے، آنکھیں کبھی غوری جوش سے چمکنے لگتی تھیں اور کبھی ان سے ناامیدی ظاہر ہوتی تھی، دیر کے بعد انھوں نے ایک آہ بھری اور کھڑے ہوگئے - دروازہ کے پاس آکر انھوں نے قفل میں کنجی لگائی اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگے -

"آج مجھے کیا کیا خطاب ملے ہیں، چور - ڈاکو - فریبی - جعل ساز - ظالم اور یہ خطاب مجھے دیئے کس نے؟ ایک جاہل ان پڑھ گنوار چمارنے - مگر میں نے بادشاہ اور سلطنت سے کیا کیا خطاب پائے ہیں - رائٹ آنریبل - ہنری میکسی، وائی کونٹ سلطنت برطانیہ کا وزیر جنگ - کروڑوں کا مالک کچھ دیر چپ رہنے کے بعد "نہیں نہیں وہ پہلے خطاب صحیح ہیں - سچ ہے میں چور ڈاکو فریبی جعل ساز ہوں، لیکن ہاں میں ظالم نہیں ہوں" وردہ مینڈالی واقعہ، اوہ، مدت ہوئی اسکا فیصلہ ہوچکا - رہا جولیا کا قصہ ...."

وائی کونٹ دیر تک خاموش ٹہلتے رہے - اور پھر خود ہی آہستہ آہستہ گویا اپنے ہی کو خطاب کرکے کہنے لگے -

"جولیا کیا تھی، اسٹیج کی ایک آوارہ چھوکری - کچھ ایسی حسین بھی نہ تھی، اب اتنے دنوں کے بعد مجھے یاد بھی نہیں کہ اس کی کونسی بات پسند آگئی تھی" کچھ دیر سوچ کر اور پھر مسکراتے ہوئے "ہاں ہاں - یاد آگیا، ایک دن وہ کورس میں ناچ رہی تھی، اور اس کا فراک سامنے سے بہت نیچا کٹا ہوا تھا، اتفاق سے ناچنے میں برہنہ ہوگئی - اور اسٹیج سے عجیب بدحواسی سے بھاگی - بس اسکا بھاگنا مجھے بھلا معلوم ہوا، تماشہ ختم ہونے کے بعد میں نے اس کے پاس اپنا کارڈ بھیجا، ملاقات کی دعوت دی، ربط بڑھا - اور پھر میری ہوگئی میں نے اسے ایک مکان کرایہ پر لے کردیا تھا، آرام سے رہتی تھی، کمسن تھی شوخ اور چالاک تھی، دن بھر کی محنت اور جانفشانی کے بعد شب کے وقت اس کی صحبت میں چند گھنٹے مزے میں کٹ جاتے تھے - لیکن جب مجھے پہلے پہل خطاب ملا تو اسے بھی "لیڈی" بننے کی سوجھی، فرمایش کی کہ شادی کرلو میں آج اور کل پر ٹالتا ہی رہا، یہانتک کہ بیرن بنادیا گیا - اب اسنے اور بھی ضد شروع کی، اور شرارتیں کرنے لگی - مجبوراً جب میں نے انکار کیا تو مجھے دھمکی دینی شروع کی - میرے کاغذات میں سے چند کاغذات اسے ایسے مل گئے تھے جو سوائے میرے کسی اور کی نظر سے گذرنے کے قابل نہ تھے - ایک رات جب اسنے سخت ہنگامہ کیا تو میں نے اسے مار پیٹ کر گھر سے نکالدیا اور اس دن کے بعد سے مجھے مدتوں اسکی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی - اور ادھر تو میں اسے بالکل ہی بھول چکا تھا، صرف چند دن ہوئے کہ اس کا ایک خط آیا تھا، جس میں لجاجت کے ساتھ ملاقات کی درخواست کی تھی، مجھ سے جدا ہوکر تو اس نے میرے دیئے ہوئے مال پر زندگی گذاری، پھر ادھر ادھر یوں ہی سی ملازمت کرتی رہی - مگر بھلا اس سے کب بسر اوقات ہوسکتی تھی، عسرت سے مجبور ہوکر تنگ دلی

میں پھرنے لگی، اور اسطرح پیٹ پالنے لگی، مگر آخر نتیجہ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے، ایک مہلک اور ناپاک مرض میں مبتلا ہو گئی۔ جب میں ملنے گیا تو اسوقت اسکا مرض طول کھینچ چکا تھا، صحت سے ناامیدی تھی۔ مجھ سے گڑگڑا کر پھر شادی کی درخواست کی۔ اس نے بہت آرزو منت کی، آنسو بہائے، ہاتھ جوڑے، مگر میں مجبور تھا انکار کر کے چلا آیا، اور شاید اسی دن اس نے "انٹونیو" کو بلا کر اپنی داستان سنائی اور وہ کاغذات دے دیئے ...." وائی کونٹ کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر دیر تک کچھ سوچتے رہے۔" جولیا! اگر تونے سچ مچ ایسا کر دیا ہے تو بس میرا خاتمہ ہو گیا، میرے پاس اُن کا کچھ جواب نہیں ہے، یہ سارے الزامات سب کے سب سچ ہیں، گو میں تنہا اس قسم کی باتوں کا گنہگار نہیں ہوں، میرے ہی طرح کتنے اور لارڈ اور بیرونٹ ایسے ہیں جن کی کامیابی کا راز صرف ان کی سیاہکاری ہے ...."

وائی کونٹ ایک لمبی سانس لیتے ہوے کرسی پر بیٹھ گئے اور دیر تک کچھ سوچتے رہے پھر اٹھکر اضطراب میں کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگے۔

"کل نو بجے وزیر اعظم نے جواب مانگا ہے، مگر میرے پاس جواب کیا ہے، میں اگر انکار بھی کر دوں تو کیا ہوتا ہے۔ اگر جولیا نے سچ مچ انٹونیو کو سب کچھ بتا دیا تو میں کہیں کا نہ رہا، کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا، بھلا میں جواب کیا دے سکتا ہوں۔ .... جواب .... جواب تو بس ایک ہے۔ اور .... وہ .... اپنے .... ہاتھوں سے .... موت .... خدا! موت کیسا خوفناک لفظ ہے۔ لیکن اگر موت نہیں تو پھر کیا۔ اس کے بدلے۔ اس کے عوض۔ بدنامی، رسوائی، بے عزتی، اور قید۔ اور کیا عجب۔ کون کہہ سکتا ہے ممکن ہے کہ پھانسی ہو۔ وہ جرمن آبدوز والا واقعہ .... اوہ .... کیوں یاد کروں؟"

وائی کونٹ پھر کرسی پر بیٹھ گئے، دیر کے بعد انھوں نے وسکی کی بوتل سے آدھا گلاس شراب کا انڈیلا اور بغیر سوڈا ملائے پی گئے۔ "آہ۔ اب کچھ سکون ہو چلا ہے میں خائف ہو گیا تھا۔ موت سے ڈرنا کیا؟ آخر مرنا لازمی ہے، اور دوسرے کے ہاتھوں سے مرنے کے بدلے بہتر ہے اگر اپنے ہی ہاتھوں سے مر جاؤں، خیر اگر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کی تو اس کا اتنا افسوس نہیں جتنا مارگیریٹ کی تباہی اور بربادی کا غم ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں مٹی نہ خراب ہو جائے ...."

وائی کونٹ نے اب کی برانڈی کا آدھا گلاس انڈیلا اور پی گئے۔

"اچھا تو جواب لکھدوں اور پھر ...."

میز کے قریب بیٹھ کر خط لکھنے لگے، اور خط ختم کر کے اُسے بلاٹنگ سے چھاپنے کے بعد آہستہ آہستہ پڑھنے لگے۔

"پیارے وزیر اعظم۔ آپ کے سوالات کا میرے پاس بس ایک ہی جواب ہے جو میں آپ کو اس خط کے ملنے کے پہلے دے چکا ہوں گا۔ "آپ کا مخلص بائسلے"

"کافی ہے بس بس اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں" خط لفافہ میں رکھ کر باسلے نے اسپر پتہ لکھا، جہری اور دوسرا خط نواسی کے نام لکھا:-

"پیاری مارگیرٹ، مجھے کچھ ایسی ہی مجبوری آن پڑی تھی کہ میں نے خودکشی کرلینا بہتر سمجھا، مگر تمہارے لئے دل بے چین ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم میرے لئے اپنے کو ہلاک نہ کرڈالو، خدا کیلئے ایسا نہ کرنا" "خدا حافظ"

دونوں خط اونھوں نے میز پر ایک کتاب سے لگاکر رکھدیئے کہ کمرہ میں داخل ہونے والے کی نظر فوراً اونپر پڑے، اسکے بعد باسلے دیر تک بیٹھے سوچتے رہے اور پھر ٹہلنے لگے۔

"کیا ہو اگر بھاگ جاؤں، کہیں چھپ رہوں کسی ملک میں جاکر روپوش ہو جاؤں۔ ابھی بہت وقت ہے۔ کتنے بجے ہیں۔ گیارہ۔ مگر .... جاؤں تو .... کہاں جاؤں .... چھپوں تو کہاں چھپوں اور اگر چھپ بھی سکا تو ایسی زندگی کیا .... مر ہی کیوں نہ جاؤں ...."

دیر تک ساکت کھڑے رہنے کے بعد کانپتے ہوئے چلا اوٹھے:-

"موت۔ موت۔ اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے۔ اُف۔ مجھ سے نہ ہوگا، مرنا کیسا؟ اور خودکشی کیوں؟ نہیں۔ ہرگز نہیں کیوں مروں اور کیوں جان دوں" کچھ دیر ٹہلنے کے بعد "میں کمزور ہوگیا ہوں۔ ذرا سی بات سے خایف ہوجاتا ہوں"

یہ کہکر وہ میز کی طرف بڑھے اور دونوں خط ہاتھ میں لے کر چاہتے تھے کہ چاک کردیں کہ ٹھیر گئے۔ سانس چڑھی ہوئی تھی، اونگلیاں کانپ رہی تھیں اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے تھے، ایک بھیانک آواز میں:-

"کیا بھاگ کر بچ بھی کسی طرح بچ سکوں گا، دنیا کا کون گوشہ ہے جہاں میں چھپ کر بچ سکونگا، اور اگر یہیں رہا تو میرے پاس اون کاغذات کا کیا جواب ہے .... پھر جب بچنا محال ہے تو یہ فضول کا جھگڑا ہے ...."

دائی کونٹ نے پھر شراب پی اور میز کی دراز سے تپنچہ نکالکر دیکھا کہ اس میں کارتوس بھرے تھے، تپنچہ ہاتھ میں لے کر دیر تک ٹہلتے رہے، چہرے کا رنگ منٹ منٹ پر بدل رہا تھا، یکایک اون کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، بدن کانپنے لگا، اور بائیں ہاتھ سے کرسی پکڑکر کھڑے ہوگئے۔

"افسوس۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ مجھے ایک دن اسطرح سے مرنا ہے تو اتنی مصیبت اٹھاکر اس قدر دولت کیوں جمع کرتا۔ پہلی زندگی کیا بری تھی"

یہ کہکر اونھوں نے اپنے دل پر زور دے کر جسم کی تھرتھری کو روکا، کانپتے ہوئے ہاتھ سے تپنچہ سر تک لائے، گھبراکر چاروں طرف دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کرکے سانس روک لی۔ اور اب چاہتے ہی تھے کہ لبلبی دبا دیں کہ کسی آواز سے گھبراکر پلٹے تو دیکھا کہ میز کے سامنے کرسی پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا انہیں غور سے دیکھ رہا ہے۔ وزیراعظم اور مارگیرٹ کے نام کے خطوط اس کے ہاتھ

میں تھے۔ گھبراہٹ میں وائی کونٹ کے ہاتھ سے تیچہ گر گیا، اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ چند قدم اس کی طرف بڑھکر ٹہرے اور پھر پیچھے ہٹے۔ "تم کون" ان کی آواز بہت ضعیف تھی۔ "تم کون ہو؟" ذرا بلند آواز سے۔ "ارے تم کون ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔ جواب دو"

"میں کون ہوں۔ جیکسن کیا اتنے دنوں میں میری صورت اتنی بدل گئی ہے۔ کہ تم مجھے پہچان بھی نہیں سکتے" اجنبی کی آواز سے ایک خوفناک اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ باٹسلے کے پاؤں کانپنے لگے، کلیجہ بیٹھنے لگا۔

"کون! مرتضیٰ۔ مرتضیٰ۔ نہیں ہو نہیں سکتا۔ ممکن ہی نہیں۔ یہ میرے دماغ کی کمزوری کا اثر ہے، یہ میرا صرف واہمہ ہے" کچھ آگے بڑھ کر اور پھر ڈرتے ہوئے۔ "کیا تم مرتضیٰ ہو"

"جیکسن۔ کیا سوجھتا نہیں کہ میں مرتضیٰ ہوں"

"مگر تم تو جیل میں تھے......"

"ہاں تھا تو جیل میں، لیکن آج شام کے وقت میں ہائیکورٹ کے پھاٹک سے بھاگ نکلا اور دیر سے یہاں چھپا ہوا ہوں مگر جیکسن مجھے خوشی اسکی ہے کہ تم اتنے بڑے لارڈ ہونے کے بعد بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ تم اصل میں جیکسن ہو"

لارڈ باٹسلے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھ کر بولے:۔

"انکار سے فائدہ، صرف وقت کی بربادی۔ تمہارا یہاں تک آجانا۔ اس امر کو ثابت کر رہا ہے کہ تم میرے اگلے حالات اور میرے راز سے اچھی طرح واقف ہو۔ مگر مرتضیٰ۔ تمہیں یہاں تک آتے میں کچھ ہراس نہ ہوا، کیا ہو اگر میں تمہیں مار ڈالوں۔ یا گرفتار کرا کے قید کرا دوں؟"

مرتضیٰ نے ہنس کر کہا:۔

"اجی۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ اگر تم نے مجھے مار ڈالا تو بھی اور گرفتار کرا دیا تو بھی، دونوں صورتوں میں ہمارے تمہارے اگلے تعلقات کا دنیا کو پتہ چل جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم نہ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے، اور نہ میرے خلاف اپنی زبان ہلاؤ گے"

باٹسلے نے کچھ دیر چپ رہ کر کہا۔ "ہاں ایک حد تک یہ صحیح ہے مگر یہ بتاؤ کہ تم میرے راز سے کس طرح واقف ہوگئے۔ تم تو آج اٹھارہ انیس سال سے قید میں تھے۔ تمہیں میری حالتیں اور میرا پتہ کیونکر معلوم ہوگیا؟"

"تمہیں یاد نہیں۔ جب تم منسبری امپائر کے تھیٹر میں دربان تھے تو تھیٹر کے سامنے اسمتھ، ایک پست قد آدمی چار روٹی کی دوکان رکھا کرتا تھا"

باٹسلے کی گھبراہٹ کچھ اور بڑھ گئی، مرتضیٰ نے سگار کے ڈبے سے ایک سگار چن کر اٹھا لیا اور جلا کر پینے لگا۔

"جیکسن تجھے قید میں بھجوا کر تم بھی کہیں غائب ہوگئے، اور ایک مدت کے بعد جب لندن میں پھر نمودار ہوئے تو فوراً ہی

رئیس بن گئے۔ اسمتھ ا ب ٹیکسی چلاتا تھا۔ اوس نے تمہیں ایک دن پہچان لیا۔ تمہارا پیچھا کر کے تمہارا گھر اوس نے ڈھونڈ نکالا۔ اور پھر تم تو خود جانتے ہو کہ تمہیں دھمکی دے دے کر اوس نے کئی بار تم سے کثیر رقمیں حاصل کیں۔ مگر جب تم اس سے بہت عاجز ہو گئے تو تم نے اسے گرفتار کرا کے قید کرا دیا۔"

مرتضیٰ دیر تک سگار کے دھوئیں نکال کر آہستہ آہستہ باہر پھینکتا رہا۔

"میری اوس کی ملاقات صرف اتفاق سے ہوئی۔ جب وہ ڈارٹ مور بھیجا گیا تو میں اُن دنوں قیدیوں کا لیڈر تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا۔ وہ میری کوشش سے میرا اسسٹنٹ بنا دیا گیا، اس طرح ہم دونوں کو گفتگو کا خوب موقع ملا، اور ہم نے خفیہ خط و کتابت کے طریقے ایجاد کئے۔ جب وہ رہا ہوا تو مجھے ہر ہفتہ اسی خفیہ طریقے سے کل باتوں کی خبر دیتا رہا۔"

بانسلے کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"مگر تم ہائیکورٹ سے کیسے بھاگ سکے؟"

"صرف اسمتھ کی مدد سے۔ میں نے اسے خبر دے دی تھی کہ میں آج گواہی کے لئے ہائیکورٹ لایا جاؤں گا۔ مقدمہ کے بعد جب قیدی اور گواہ باہر لائے جا رہے تھے، اسمتھ نے کمرے کے اندھیرے میں چند بم پھینکے اور قریب ہی اپنی ٹیکسی لئے کھڑا رہا۔ جب بم کے پھٹنے سے ہنگامہ ہوا تو مجھے اپنی ٹیکسی پر بٹھا کر بھاگا۔ ہم لوگ اپنی جانوں پر کھیل کر کسی نہ کسی طرح یہاں آ گئے۔ موٹر ہم نے سامنے گڑھے میں چھپا دی اور چونکہ اسمتھ اس کمرہ میں کئی بار آ چکا تھا اس لئے اوس نے مجھے اسی کمرہ میں چھپ رہنے کی رائے دی۔ کھڑکیاں بند تھیں مگر اٹھارہ برس قید میں رہ کر میں نے بہت سے نئے ہنر سیکھے ہیں۔ ایک یہ کھڑکی کھول کر اندر چلا آنا مشکل نہ تھا، اور میں یہاں چھپا رہا اور اسمتھ بھی کہیں قریب ہی ہے اور اگر مجھے زیادہ دیر ہوئی تو ممکن ہے کہ وہ بھی آ جائے تم نے نوکروں کو چھٹی دے کر گھر کے باہر بھیج دیا ہے، اب اندر ہم دونوں ہیں اور باہر اسمتھ۔"

اپنی بیکسی اور مجبوری اور مرتضیٰ کی اس دلیری کو سوچ کر لارڈ بانسلے کا دل بیٹھا جاتا تھا کسی طرح مفر کی صورت نظر نہ آتی تھی، اس طرح جان پر کھیل کر مرتضیٰ کے آنے کا صرف ایک مقصد ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اونہوں نے ہمت کر کے رکتے ہوئے پوچھا:۔

"مگر مرتضیٰ اس قدر خطرے اوٹھا کر مجھ تک آنے کی وجہ؟"

"وجہ۔ وجہ پوچھتے ہو۔ جینکسن تم، اور مجھ سے وجہ پوچھتے ہو۔ صرف تمہاری وجہ سے میں اٹھارہ سال سے قید میں مر رہا ہوں، اور پھر تم مجھ سے یہاں تک آنے کی وجہ پوچھتے ہو۔"

مرتضیٰ کا وہ پہلا اطمینان غائب ہو رہا تھا، غصہ کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

"جینکسن تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نے بھتیجے بھائی کو نہیں قتل کیا تھا۔ مگر پھر بھی تم نے میرے خلاف گواہی

دے کر مجھے قید کرا دیا، میں اپنے کمرہ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر بھائی کے کمرہ میں گیا۔ دیکھا تو خون میں ڈوبے ہوئے پڑے، دم توڑ رہے ہیں۔ اور مارگریٹ قریب ہی کھڑی بید کے مانند کانپ رہی تھی۔ ابھی میرے حواس ٹھکانے بھی نہیں ہوئے تھے کہ تم پولیس کے ساتھ آ گئے اور مجھے گرفتار کر لیا گیا، مگر جیکسن تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میں بھائی کا قاتل نہ تھا"

جیکسن دیر تک ساکت رہا، پھر رک رک کر بولا:-

"اگر تم بے قصور تھے تو پھر عدالت کے سامنے قاتل کا نام کیوں نہ بتا دیا، میرا ہی نام بتا دیا ہوتا یا مارگریٹ ہی کا، اُسے تو تم نے آخر اسی کمرے میں پایا تھا"

مرتضیٰ جوش غضب میں کانپ اٹھا اور چلا کر کہنے لگا:-

"جیکسن، آخر میں کس کا نام بتاتا، نہیں میں نے بھائی کے کمرے میں پایا نہ تھا، رہ گئی مارگریٹ، تو کیا اسی کا نام بتا دیتا۔ مارگریٹ کا۔ اپنی پیاری بیوی مارگریٹ کا۔ جس سے میں پاڈنگٹن رجسٹری آفس اور دوکنگ کی مسجد میں دو مہینے پہلے شادی کر چکا تھا، میں نے سمجھا تھا کہ ممکن ہے بھائی نے اس کے ساتھ تنہائی کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا ہو۔ اور مارگریٹ نے اپنی عصمت بچانے کو چھرا مار دیا ہو، اور پھر جب عدالت کے سامنے میرے خلاف گواہی دی تو اسکے اضطراب سے میں نے سمجھا کہ ضرور وہی قاتلہ تھی اور صرف اپنی جان بچانے کے لئے مجھے ماخوذ کرا رہی تھی، میں نے سوچا کہ اگر تم قاتل ہوتے تو مارگریٹ اپنے باپ کے بچانے کو اپنے شوہر کو پھانسی نہ دلواتی۔ مشرقی بیوی تو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتی، مگر میں اپنی اسی مغربی بیوی سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ مجھے اس کی طرف سے کم از کم اتنی امید ضرور تھی کہ باپ اور شوہر میں یہ ضرور شوہر کا ساتھ دے گی۔ بس اسی یقین نے میرے لبوں پر مہر کر دی اور میں چپکا رہ گیا۔ ہاں ایک وجہ اور تھی، میں جانتا تھا کہ مارگریٹ کے بچہ ہونے والا تھا، جیکسن کیا تم اس کی توقع رکھتے تھے کہ میں صرف ایک اپنی جان بچانے کے لئے مارگریٹ اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی اپنی اولاد کا خون کراتا۔ ہرگز نہیں، بس یہی دو سبب تھے کہ لب تک نہ ہلایا۔ اور سر جھکائے قید میں چلا گیا"

جیکسن دیر تک مبہوت بیٹھا رہا، پھر اپنے کو سنبھال کر بولا:-

"مرتضیٰ۔ میں کئی سال ہندوستان میں رہ چکا ہوں۔ مگر مجھے اس وقت تک یہ نہ معلوم تھا کہ ہندوستانی محبت اور وفاداری میں اس طرح جان دیتے ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ اگر روپیہ کی ضرورت ہے، تو میں اس وقت کسی بڑی رقم سے تمہاری مدد تو نہیں کر سکتا۔ شب کے وقت بنک کھلے نہیں رہتے، اور چیک تمہارے کسی کام کا نہ ہوگا۔ پھر بھی گھر میں اتنی رقم ضرور مل جائے گی کہ تمہاری فوری ضرورتوں کے لئے کافی ہو، اس سے زیادہ کی ضرورت ہو تو بعد کو دے سکتا ہوں، سچ ہے تم نے سخت مصیبت اٹھائی اور مجھے اس افسوس کا ہے" یہ کہکر جیکسن نے

.....اپنی جیب سے نوٹ بک نکالنی چاہی، مگر مرتضیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے روکا

"کیا؟ روپیہ کی ضرورت نہیں ہے؟ خیر رہنے دو۔ لیکن اگر رہائی چاہتے ہو تو ابھی وزیر داخلہ کو ٹیلیفون کر کے تمہیں رہا کرا دوں، وہ میری سفارش کو فوراً مان لیں گے۔ یا اگر ہندوستان یا کسی اور ملک کو جانا چاہو تو بھجوا دوں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ تمہیں بلاقصور اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اور میں سچے دل سے اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہوں"

مرتضیٰ نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا:-

تف ہے آپ کے افسوس پر اور نفرین ہے آپ کے اظہار ندامت پر۔ جیکسن تم مجھ جیسے فقیر کو دولت کا لالچ دیتے ہو۔ عمر بھر کے قیدی کو آزادی کی تصویر دکھا کر رجھاتے ہو، تمہیں معلوم ہے کہ میرے ابا جان، پروفیسر مصطفیٰ ایک مدت تک ہیرا بنانے کی کوشش میں تھے، ان کا خیال تھا کہ جب ہیرا اور کوئلہ دونوں کاربن ہیں تو پھر کوئلہ ہیرے کی صورت میں کیوں تبدیل نہیں ہو سکتا۔ ساری عمر کے تجربے اور اپنی ساری دولت صرف کرنے کے بعد وہ صرف یہاں تک دریافت کر سکے کہ اگر مصری کے ذرے کثیر دباؤ کے اندر بہت سخت گرم کر کے پگھلائے جائیں اور پھر ایک خاص مرکب روغن میں دفعتاً ڈال دیئے جائیں تو وہ ہیرے کے نہایت ہی باریک ذرے بن جائیں گے۔ ابا جان صرف یہاں تک دریافت کر چکے تھے کہ مر گئے۔ اور اب یہاں سے بھائی مجتبےٰ نے دریافت شروع کی۔ کہ یہی مہین ذرے کس طرح ملا کر بڑا ہیرا بنائے جا سکتے ہیں، سخت محنت و جانفشانی کے بعد وہ کامیاب ہوئے ہی تھے کہ قتل ہو گئے۔ وہ مجھے اپنے تجربوں کی حالت روز بروز بتاتے جاتے تھے، اور میں محبت کا اندھا کل باتیں مارگریٹ کو بتا دیا کرتا تھا۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ تم بھائی کے مرنے کے بعد افریقہ جا کر مصنوعی ہیرے بنانے لگے۔ ایک کان خریدی اور اصل ہیروں کے ساتھ ان ہیروں کو ملا کر بیچنے لگے اور مالدار ہو کر اب تو وائی کونٹ بن گئے ہو"

مرتضیٰ کا سگار بجھ گیا تھا، انہوں نے اسے پھر جلایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا:-

"جیکسن۔ میں تمہارے پاس روپیہ کی غرض سے نہیں آیا ہوں، کیونکہ اب مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں۔ ہیرا بنانے کا نسخہ مجھے اب بھی یاد ہے، چاہوں تو کروڑپتی بن جاؤں، مگر اب دولت کی تمنا ہی نہیں، میں رہائی کے لئے نہیں آیا ہوں، کیونکہ قید میں بڑے آرام سے کٹ رہی ہے۔ میرے ماں باپ مدت ہوئے مر چکے ہیں خاندان میں اب کوئی بھی باقی نہیں۔ آزاد ہوں تو کس کے لئے، ہاں۔ یہاں تک آنے کی تین وجہیں تھیں، ایک تو اپنی بیٹی مارگریٹ کو دیکھنے کی تمنا۔ اسمتھ نے مجھے قیدخانہ میں بتایا تھا کہ وہ اب جوان ہو گئی ہے۔ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے اس کی ماں کی طرح اس کا بھی نام مارگریٹ ہی رکھا، وہ آرزو اس وقت پوری ہو گئی۔ جیکسن جب میں اس کمرہ کے مخملی پردہ کے پیچھے چھپا ہوا اس مارگریٹ کو دیکھ رہا تھا تو مجھے اپنی مردہ مارگریٹ زندہ نظر آ رہی تھی۔ بارہا جی چاہا کہ اپنے خون سے پلی ہوئی اور اپنی پیاری بیوی کی زندہ تصویر کو گلے لگا لوں، لیکن ضبط کر کے رہ گیا۔ خیر خدا اسے زندہ رکھے۔ مجھے غم نہیں کہ اسے

میرے وجود کا بھی علم نہیں ۔"
مرتضیٰ کی آنکھیں پرنم ہوگئی تھیں، کچھ دیر سگار پینے کے بعد :-
"دوسری غرض یہ تھی کہ تم سے دریافت کروں کہ بھائی نیتھے کو سچ مچ کس نے قتل کیا تھا، تم نے یا مارگریٹ میری بیوی نے، اور تیسری غرض یہ تھی کہ اگر تمہیں قاتل نکلے تو تمہارا گلا گھونٹ دوں، اور ہاں ایک چوتھی غرض یہ تھی کہ بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھ دوں، ان کے دفن کے وقت میں تو قید میں تھا ۔"
جیکسن آنکھیں پھاڑے متحیر خاموش بیٹھا رہا۔ اوس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ مرتضیٰ پھر اوس کی طرف مخاطب ہوئے ۔
"جیکسن، پردے کے پیچھے چھپ کر میں نے تمہاری ساری باتیں سنیں، تم خودکشی کرنے کو تھے وہ بھی میں نے دیکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم خود سے اپنی جان لے لوگے، اس لئے اگر تم ہی قاتل ہو تو میری تیسری آرزو بھی خود بخود پوری ہوجائے گی، اور میرے ہاتھ تمہارے خون سے رنگین نہ ہوں گے، تمہاری عمر کا پیالہ لبریز ہوچکا ہے، انٹونیو کے علاوہ اب مجھے بھی تمہارے راز سے آگاہی ہے۔ مگر برائے خدا مجھے اتنا بتا دو کہ کیا سچ مچ مارگریٹ ہی نے نیتھے کی جان لی تھی ؟"
جیکسن کرسی سے اوٹھ کر ٹہلنے لگا، اور دیر کے بعد بولا :-
"مرتضیٰ، تم سچ کہتے ہو، خودکشی کئے بغیر مجھے کوئی چارہ نہیں۔ اگر تمہارے کرسی پر بیٹھنے کی آواز سے میں چونک نہ پڑتا، تو میں نے تپنچہ سر کو دیا ہوتا، اور اس وقت مردہ ہوتا، سچ ہے تمہیں اپنے ہاتھ نہ رنگین کرنے ہوں گے، گو بہتر ہوتا، اگر یہ کام تم ہی کر دیتے، ممکن ہے مجھ سے خود نہ ہو سکے۔ کیا عجب ہے کہ عین وقت پر میں ہمت ہار جاؤں اور پھر موقع ہاتھ سے نکل جائے
مرتضیٰ نے دوسرا سگار جلا کر جواب دیا :-
"جب مجھے اس کا یقین ہے کہ تم اگر اس وقت نہیں تو بہت جلد وہ کام کر ہی لوگے جس کا ارادہ میں کر کے آیا ہوں، تو پھر میں کیوں گناہ کا مرتکب ہوں جیکسن، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم ہی میرے بھائی کے قاتل ہو تو میرے لئے تمہاری جان لینا جائز ہوگا۔ مگر مجھے اگر رنج ہے تو اس کا کہ میری بیوی مارگریٹ نے دانستہ مجھے پھانسی دلوانی چاہی۔ اور مجھے دکھ ہے تو اس کا کہ اسی نے میرے بھائی کی جان لی ۔"
جیکسن کچھ دیر تک جواب نہ دے سکا، اور پھر رک رک کر کہنے لگا۔
"مرتضیٰ، میں تمہاری اس محبت کی قدر کرتا ہوں، چونکہ میں اب اپنی زندگی کی آخیر گھڑیاں گن رہا ہوں اس لئے چھپانے سے کیا حاصل۔ جب تم نے اپنے بھائی کی دریافت کی تکمیل کا راز مارگریٹ سے کہہ دیا، تو اوس نے اس کی مجھے خبر دے دی، دراصل وہ میرے ہی کہنے پر تم سے محبت کرنے لگی تھی، اور میری غرض صرف تمہارے راز کی دریافت تھی، ہاں مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ مارگریٹ تمہیں دھوکہ دینے میں خود دھوکہ کھا گئی، یعنی اوس نے تم سے شادی کر لی، بہرحال بیٹے نیتھے سے

نسخہ مانگا، اوس نے انکار کیا، میں نے دھمکی دی، بات بڑھ گئی۔ ہم لوگ اولجھ گئے، اور لڑ پڑے، اور میں نے۔ ہاں مرتضیٰ۔ میں نے ہی تمہارے بھائی کو قتل کیا تھا، میں اس کا اقرار کرتا ہوں، تمہارے سامنے تیغچہ رکھا ہے، میں حاضر ہوں، اپنے بھائی کے خون کا جی چاہے تو بدلہ لے لو............"

جیکسن مرتضیٰ کے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے، آنکھیں چمک رہی تھیں اور سانس جلد جلد آجا رہی تھی۔ مرتضیٰ دیر تک مجسمہ حیرت بنے جیکسن کی طرف دیکھتے رہے۔ دل میں سو سو طرح کے جوش موج زن تھے، اونگلیاں جیکسن کے گلے سے چمٹ جانے کو بے قرار ہو ہو کر کانپ رہی تھیں، سر میں چکر تھا اور آنکھوں کو رہ رہ کر کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ دیر تک اسی طرح ساکت رہنے کے بعد مرتضیٰ نے بہت ضبط کر کے نہایت متانت مگر ایک خوفناک اطمینان کیساتھ کہا:-

"جیکسن، مجھے خوشی اس کی ہے کہ مارگریٹ جس پر میں جان و دل سے شیدا تھا، میرے بھائی کی قاتلہ نہ تھی، مجھے یقین ہے کہ میرے خلاف اوس نے گواہی دی وہ تمہارے دباؤ سے اور اگر سچ مچ ایسا ہی تھا تو میں نے خدا کے سامنے اوسے معاف کیا.................. رہ گیا بھائی کے خون کا بدلا.................. وہ تو تم خود ہی لے لو گے میں کیوں اپنا ہاتھ رنگین کروں......."

یہ کہہ کر مرتضیٰ نے گھڑی کی طرف دیکھا اور ادھر کر دروازہ کی طرف بڑھے جیکسن نے ڈانٹ کر کہا:-

"ٹھہر جاؤ۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے، مجھے تو مرنا ہی ہے، لیکن پہلے تم تو مر لو"

یہ کہہ کر جیکسن نے تیغچہ اٹھا لیا اور چاہا کہ مرتضیٰ پر فیر کر دے۔ مگر کسی فوری خیال سے متاثر ہو کر اس نے اپنے سر سے تیغچہ ملا کر سر کر دیا اور گولی دماغ کے پار ہو گئی۔ مرتضیٰ آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرہ سے باہر نکل گئے۔

....

....

صبح صادق کے وقت ووکنگ مسجد کے میناروں سے "اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم" کی صدا بلند ہو رہی تھی، اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب مولانا شمس الدین اذان کہہ چکے تو ایک شخص نے بڑھ کر "اسلام علیکم" کہا۔ مولانا گھبرا گئے۔ سامنے ایک شخص سیاہ کوٹ پہنے کھڑا سر جھکائے چپکے چپکے رو رہا تھا۔

"مولانا گھبرائیے نہیں، آج ایک مدت کے بعد جو اذان کی آواز سنائی دی تو دل بھر آیا، شاید آپ مجھے بھول گئے ہیں میں مرتضیٰ ہوں جو اوس سال سے قید......... " مرتضیٰ اس سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ آواز بھرانے لگی، مولانا نے غور سے دیکھا ضعیفی کی وجہ سے بصارت میں کمزوری آ گئی تھی، مگر جب پہچان چکے تو مرتضیٰ کو گلے لگا کر خود بھی دیر تک روتے رہے۔

"معاف کرنا۔ پہچان نہ سکا تھا، اندھیرے میں اب کم دکھائی دیتا ہے۔ ہاں ہاں بیشک تم مرتضیٰ ہو، لیکن کیسے آئے، کیا رہائی ہو گئی؟"

مرتضیٰ نے اختصار کے ساتھ اپنے واقعات بیان کئے، کچھ دیر تک آنسو بہانے کے بعد دونوں نے نماز پڑھی، اور مولانا گھر سے روٹی لکھن جائے مسجد ہی میں لے آئے۔ جب مرتضیٰ نے سیر ہو کر کھا لیا، تو دونوں مسجد سے نکل کر سڑک پر آئے۔ اسمتھ موٹر سے قریب ہی کھڑا تھا، دونوں موٹر میں سوار ہو کر تھوڑی دیر میں بردک وڈ کے مقبرے میں پہونچے۔ مولانا مرتضیٰ کو ساتھ لئے قبروں کے درمیان ہوتے ہوئے ادھر آئے جدھر مسلمانوں کی قبریں تھیں۔ مرتضیٰ نے جب بھائی کی قبر کے سنگ مزار پر اس کا نام پڑھا تو ڈھاڑیں مار کر قبر سے چمٹ گئے۔ مولانا کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے اور فاتحہ پڑھتے جاتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے مرتضیٰ کو بھائی کی قبر سے علیحدہ کیا اور دونوں مقبرہ سے باہر نکل آئے، موٹر پر سوار ہو کر دونو جب دوکنگ کے تھانے کے پاس پہونچے تو موٹر رکا۔ مرتضیٰ نے مولانا سے گلے مل کر انکا شکریہ ادا کیا، اسمتھ سے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے تھانہ پر جا کر دروازہ کی گھنٹی بجائی، ایک کانسٹبل نے دروازہ کھول کر استعجاب سے دیکھا۔

"میں مرتضیٰ قیدی نمبر ۸۹ ہوں۔ میں شب بھر بغیر اجازت غیر حاضر رہا ہوں مجھے ڈارٹ مور کے جیل خانہ میں بھجوا دیجئے"

مرتضیٰ کمرے کے اندر چلے گئے اور کانسٹبل نے دروازہ بند کر لیا۔

سید علی اکبر کاظمی (بی، ایس سی)

تاریخ مغرب

مترجمہ مولوی محمد جمیل الرحمان صاحب ایم۔ اے، پروفیسر تاریخ اسلامی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔ یہ کتاب ترجمہ ہے البیان المغرب فی اخبار المغرب، مصنفہ علامہ ابن العذاری المراکشی" کا۔ فاضل مترجم نے ترجمہ میں اصل کی تمام خوبیوں کو بہمہ وجوہ قائم رکھا ہے، بلکہ بعض حیثیات سے تو ترجمہ نے اصل پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی اس سے زیادہ مستند و مکمل تاریخ اردو زبان میں اب تک نہیں شایع ہوئی۔ قیمت صرف عہ

خلافت موحدین ترجمہ مولوی محمد نعیم الرحمان صاحب ایم۔ اے، ایم آر، اے، ایس پروفیسر عربی، اندلس (اسپین) اور مراکش کی نہایت مستند تاریخ اور ہر لحاظ سے تمام اردو لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے آخر میں چار انڈکس ہیں، ترجمہ سلیس بامحاورہ اور دلچسپ ہے۔ لکھائی چھپائی صاف عمدہ، کاغذ نفیس ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت صرف للعہ مجلد۔

"منیجر نگار لکھنو"

قرآن مجید کے لطائف ادبی

اور

شعرائے عرب و فارس کا استفادہ

دنیائے تحقیق مین کسی کتاب کا اعجاز و سحر ہونا صرف اس امر پر مبنی نہین ہو سکتا کہ اسکے متبعین اپنے مشاغل حیات کی بنیاد اسپر قایم کرتے یا یہ کہ بعض افراد فرط عقیدت مین اسے سر آنکھون سے لگا کر دل کو تسکین دے لیا کرتے ہین بلکہ جو چیزین پہلی نظر مین کسی محقق کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہین وہ اس کتاب کے محاسن افکار ہوا کرتے ہیں

قدیم تفاسیر کا جو انداز بیان ہے، وہ اُس عہد کے ذوق، اور سیاسی فضا کے اعتبار سے یقیناً قابل ستایش ہے لیکن چونکہ اب تمدن کے ارتقاء کے ساتھ داعیات نفس و روح مین بہت تغیر ہو گیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف زوایائے نگاہ کے ساتھ قرآن پر غور کیا جائے۔

چنانچہ اس مقالہ میں، یہ دیکھنا چاہتا ہون کہ اسنے انسان کے ذوق ادب کو کس حد تک متاثر کیا

قرآن مجید کا اعجاز ادب اور سحر انشا سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے عربی شاعری پر ایک نظر ڈال لی جائے اس لئے ابتداءً جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہون اُسے بحث سے خارج نہ سمجھا جائے کیونکہ اصل مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ان مبادیات سے گزرنا ضرور ہے

ماخذ اور اسپر ایک سرسری تبصرہ

مینے اس مضمون کی ترتیب مین اکثر انگریزی تصانیف سے استفادہ کیا ہے، عربی کتابون مین صرف دیوان حماسہ معلقات سبعہ، اور بخاری میرے پیش نظر ہین۔ قرآن مجید کے اسلوب بیان اور صنایع و بدایع کے متعلق مشہور امریکن مستشرق، میکڈ نلڈ کی کتاب "اسلام مین مذہبی طور اور دینی زندگی" کے اندر ایک عالمانہ بحث ہے، جسکی تلخیص اس مضمون مین آپ کو ملیگی، ڈاکٹر ٹسڈل اور انکی کتاب "ماخذ قرآن" کے متعلق ایک مرتبہ لکھا جا چکا ہے اس نے اپنی کتاب مین ایک جگہ قرآن مجید پر اس حیثیت سے بھی نظر کی ہے کہ آیا اسکے اندر ایسے مصرعے اور فقرے ہین یا نہین جو بجنسہ یا معمولی اختلاف کے ساتھ قدیم شعرائے عرب کے کلام مین پائے جاتے ہین؟ عربی نحو کے متعلق جرمنی کے ایک مشہور مستشرق کیسپری کی کتاب کا انگریزی ترجمہ جو ڈبلو رائٹ کی عالمانہ سعی کا نتیجہ ہے، میرے زیر مطالعہ رہا، ان کتابون کے علاوہ محاسن شاعری، تعیین اخلاق، رموز عشقیہ اور بعض عوالف دماغی کی تشریح مین فلسفہ و نفسیات کی کتابون سے مدد لی گئی ہے، چنانچہ "حکمت گوئتھ" مصنفہ جان اسٹوارٹ بلیکی پروفیسر لسان یونانی "معاشرتی ماحول اور اخلاقی ارتقاء" مصنفہ الفریڈ رسل ویلیس، "شعور جنسی" مصنفہ جمیس فاسٹر اسکاٹ (بی اے، ایم ڈی) اور "مبادی نفسیات" (جلد ۲) مصنفہ ولیم جیمس خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہین، اور انکے اقتباسات

مضمون ہذا میں ملیں گے، اس ضمن میں میں نے فارسی کی ان کتب (تذکرہ تاریخ) سے بھی مدد لی ہے جنکے نایاب قلمی نسخوں کا مطالعہ کرنے کیلئے میں پٹنہ (اورنٹیل لائبریری) میں اقامت گزین رہا

عربی شاعری کے تین ادوار

علما اور ادبا نے عربی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے[۵]، جاہلی، مخضرمی، اور اسلامی، "شعرائے جاہلی" انکو کہتے ہیں جو بعثت اسلام کے قبل گزرے ہیں، اور انکا زمانہ ڈیڑھ سو برس تک رہا ہے، شعرائے جاہلی میں جو مشہور ہیں ان میں "اصحاب معلقات" (سبعہ معلقہ کے مصنفین) اور دوسرے اکابر شامل ہیں جن میں سے چند یہ تھے :-

امرؤالقیس، طرفہ بن عبد، زہیر، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد، حارث بن حلزہ (معلقات کے چھ قصیدے جو عربی شاعری کے لئے سرمایۂ ناز ہیں انہیں کے افکار کا نتیجہ ہیں) نابغہ ذبیانی، اعشیٰ، مہلہل، عروۃ بن الورد، عبد یغوث، عامر بن طفیل، حصین ابن حمام، قیس بن عاصم اور ابو محجن وغیرہ۔ ان شعرا کو جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے انھیں "شعرائے مخضرمی" کہتے ہیں، ان میں جو زیادہ مشہور ہیں انکے نام ہیں حسان ابن ثابت، نابغہ جعدی، کعب بن زہیر، عباس بن مرداس لبید ابن ربیعہ، ابوذویب، عمرو بن معدیکرب، زیاد بن زید، اور جنہوں نے جاہلیت کا زمانہ نہیں پایا بلکہ عہد اسلام میں نشو و نما پائی انہیں "شعرائے اسلامی" کہتے ہیں، ان میں کثیر، جمیل، جریر، الفرزدق، الاخطل، بشار بن برد وغیرہ بہت مشہور ہیں اور جن شعرا نے عہد امویہ و عباسیہ میں نشو و نما پائی انکو "مخضرمی الدولتین" کہتے ہیں اور دولت عباسیہ کے شعرا "مولدین" کے نام سے مشہور ہیں ان میں بشار بن برد کے بعد مسلم بن ولید، ابو العتاہیہ، ابن المعتز، ابن الرومی، متنبی، شریف رضی ابو العلا معری، ابو فراس، حسن بن ہانی طغرائی وغیرہم کا نام پایا جاتا ہے، دیوان حماسہ کی پہلی جلد میں ۶۵ شعرائے جاہلی، ۲۱ شعرائے مخضرمی، اور ۶۳ شعرائے اسلامی کے نام اور انکا نمونہ کلام درج ہے، انگریزی زبان کے ایک دلفریب ادیب، اور سنجیدہ مورخ، سر امیر علی (نور اللہ مرقدہ) نے عہد عباسیہ کے چند شعرا کا نام لکھا ہے، اور ان میں بعض افراد کی ولادت اور وفات کی تاریخ بھی لکھدی ہے، ابو نواس خلیفہ امین کے زمانہ میں تھا اسکی تاریخ ولادت ۷۶۳ء بتائی جاتی ہے، ارباب نظر کا خیال ہے، کہ ابو نواس عہد جاہلیت کے مشہور شاعر امرؤ القیس کا ہم پلہ ہے، اسکے بعد عتبی (متوفی ۸۴۲ء) اور ابو تمام حبیب (متوفی ۸۴۵ء) کا زمانہ شروع ہوتا ہے، بحتری بھی نویں صدی میں گزرا ہے، اور ابو تمام کی طرح ایک "حماسہ" کا مدون ہے، متنبی کی شہرت نے اکثر شعرائے متقدمین کے کمال پر پردہ ڈال دیا

ابو تمام طائی

دیوان حماسہ مطبوعہ دہلی کا جو نسخہ میرے پاس ہے، اس میں (عربی زبان میں) ابو تمام کی ایک مختصر زندگی پائی جاتی ہے وفیات الاعیان، مصنفہ ابن خلکان میں اسکی زندگی پر ایک تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ امیر علی نے اپنی تاریخ، اور جناب مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری نے دیوان حماسہ کی عربی شرح میں، ابو تمام کے حالات زندگی

---

[۵] اس عربی عبارت کا ترجمہ و تلخیص ہے، جو دیوان حماسہ (جلد ا) مطبوعہ دہلی میں ہے، غالباً یہ آغانی کا اقتباس ہے

وفیات الاعیان ہی سے لئے ہین،

مضافات دمشق کے ایک موضع جاسم مین جو دمشق اور طبریہ کے درمیان مین ہے، پیدا ہوا، مصر مین پرورش پائی ایک روایت یہ ہے کہ جامع مصر مین سقہ کی خدمت انجام دیتے تھے، دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ دمشق مین ایک جولاہے کے یہان کپڑا بننے کی نوکری کرتے تھے

ابوتمام بڑا فصیح و بلیغ شاعر گزرا ہے، ارباب علم کا بیان ہے، کہ قبیلہ طے مین تین شخص پیدا ہوئے جن مین ہر ایک اپنے کمال کے اعتبار سے یگانہ روزگار ہوا ہے، حاتم طائی سخاوت مین، داؤد بن نصیر طائی زہد و تقوی مین اور ابوتمام حبیب بن اوس طائی شعر و ادب مین، ایک بار ابوتمام دربار خلافت مین آیا اور احمد بن معتصم کی تعریف مین ایک قصیدہ پڑھا جب اس شعر پر پہونچا،

اقدام عمرو فی سماحۃ حاتم　　فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

دربار عباسیہ کا مشہور فلسفی ابو یوسف یعقوب بن صباح کندی موجود تھا، اسنے ابوتمام کو مخاطب کرکے کہا کہ امیر کی جو تمنے تعریف کی ہے وہ اس سے بالاتر ہین، ابوتمام نے ذرا غور کرکے سر اوٹھایا اور فی البدیہہ دو اشعار کہے۔

لا تنکروا ضربی لہ من دونہ　　مثلا شرودا فی الندی والباس

فاللہ قد ضرب الاقل لنورہ　　مثلا من المشکوۃ والنبراس

مطلب یہ ہے کہ اگر مینے خلیفہ کیلئے عمرو کی بہادری، حاتم کی سخاوت، احنف کے حلم اور ایاس کی ذہانت کی مثال دی ہے جن سے خلیفہ بالاتر ہین تو کوئی نقص کی بات نہین خود اللہ تبارک تعالی نے اپنے لئے "طاق" اور "شمع" کی مثال دی ہے اس سے اشارہ کیا گیا ہے سورۂ نور کی اس آیت کی جانب[۱]

اللہ نور السموت والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح الخ

---

[۱] جتنے بڑے بڑے شعرا گزرے ہین، انکی زندگی مین بدیہہ گوئی کا کوئی نہ کوئی نادر واقعہ ضرور پایا جاتا ہے سلطان محمد جہان شہید کے دربار مین ارباب فتنہ کی شکوہ پردازی کے باعث، خسرو پر جب خواجہ حسن شاعر کے ساتھ ہوا پرستی کا اتہام لگایا گیا تو انہون نے فی البدیہہ ایک رباعی کہی

عشق آمد و شد چون خونم اندر رگ و پوست　　تا کرد مرا تہی و پُر کرد ز دوست +
اجزائے وجودم ہمگی دوست گرفت　　نامیست مرا بر من و باقی ہمہ اوست
(تاریخ فرشتہ)

محمد مقیم الہروی لکھتے ہین کہ اکبر کے دربار مین ملا لطفی منجم ایک شاعر تھے بدیہہ گوئی مین انکو کمال تھا، چنانچہ انکے متعلق لکھتے ہین "تا ہزار بیت در مجلس بر زبان اورد فتنہ" (طبقات اکبری) حسین قلی خان عظیم آبادی اور غلام علی آزاد بلگرامی نے مرزا صائب تبریزی کے حالات مین انکی جودت ذہن، جودت فہم، اور بدیہہ گوئی کے واقعات لکھے ہین چنانچہ حسین قلی خان کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴۴ پر

بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴۳ بعض احباب نے امتحان کی غرض سے ایک بے معنی مصرعہ مرزا صائب کے سامنے پیش کیا، اور کہا کہ اسپر مصرعہ لگائیے، مصرعہ تھا ؎ شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت" مرزا نے فی البدیہہ کہا

امشب از ساقی زبس گرم است محفل میتوان | شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

("نشتر عشق" قلمی نسخہ۔ اورینٹل لائبریری) ــــ غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہین کہ میر عظمۃ اللہ بیخبر بلگرامی "سفینہ اشعار" مین میر عبد الجلیل بلگرامی کی روایت سے جو انہون نے مرزا صائب کے دوست مرزا خاضع سے سنی ہے، بیان کرتے ہین، کہ مرزا خاضع کہتے تھے، کہ مین مدت سے یہ دو مصرعے سنتا چلا آتا تھا اول ؎ "از شیشہ بے مئے بے شیشہ طلب کن" دوم ؎ "دویدن رفتن، استادن نشستن، خفتن ومردن" ایک دن مرزا صائب سے مینے کہا کہ ان پر مصرعے لگائیے۔ انہون نے فوراً کہا،

حق را ز دل خالی ز اندیشہ طلب کن | از شیشہ بے مئے بے شیشہ طلب کن

پھر فرمایا

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را | دویدن رفتن، استادن نشستن، خفتن ومردن (ید بیضا، قلمی نسخہ)

صاحب مجمع الصنایع لکھتے ہین کہ ملک شاہ کے دربار مین امیر معزی کے ملک الشعرا بننے کا واقعہ یون ہے کہ عید کی چاند رات تھی شام کے وقت سلطان ایک کمان لئے ہوئے، امرائے دربار کو ساتھ لیکر اپنے کوٹھے پر آیا، اتفاقاً پہلے پہل بڑی مشکل سے چاند پر سلطان ہی کی نظر پڑی، اور اس نے تمام حاضرین کو دکھلایا اس واقعہ سے قدرتی طور پر اسے نہایت خوشی حاصل ہوئی امیر معزی نے انہین مخاطب کرکے کہا کہ اس موقعہ پر کوئی شعر کہو، امیر نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی

اے ماہ کمان شہریاری گوئی | یا ابروئے آن طرفہ نگاری گوئی

نعلے زدہ از زر عیاری گوئی | در گوش سپہر گوشواری گوئی

ملک شاہ پھڑک گیا، اور اسپ خاص عنایت کیا، اسکے بعد امیر نے پھر ایک رباعی پیش کی

چون آتش خاطر مرا شاہ بدید | از خاک مرا بہ زیر ماہ کشید

چون آب یکے ترانہ از من بشنید | چون باد یکے مرکب خاصم بخشید

سلطان نے مزید ایک ہزار دینار اور چند قسم کے انعام کے ساتھ امیر معزی کا لقب عطا کیا (مجمع الصنایع۔ قلمی نسخہ مقبوضۂ خاکسار)

لیکن ابو تمام نے جس انداز سے مشرق کے اس مشہور فلسفی کا جواب دیا ہے وہ اپنی شان اور طرز کے اعتبار سے بے مثل ہے، حاضرین کا خیال تھا کہ یہ اشعار ابو تمام کے قصیدہ مین لکھے ہوئے ہین لیکن جب انہون نے قصیدہ ہاتھ مین لیا تو انکی حیرت کی کوئی انتہا نہین رہی کہ اس نوجوان شاعر کا علوئے تخیل، اور نکتہ سنجی محض بدیہہ گوئی کا نتیجہ ہے، کندی نے کہا کہ اِنَّ ھٰذا الفتیٰ یموت شابا، لوگون نے اس کا سبب دریافت کیا، انہون نے جواب دیا کہ مین اس جوان کے اندر جدت، ذکاوت، فطانت لطافت حس پاتا ہون، اور اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ نفس روحانیہ اسکا جسم اسی طرح کھا رہا ہے، جس طرح ہندی تلوار اپنے نیام کو کھا جاتی ہے

حماسہ کی تدوین سے ابو تمام نے عربی زبان کی ایک بے مثل خدمت انجام دی ہے، صرف یہی نہین کہ حماسہ کے بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴۸

شاعر کی ذمہ داری | کسی قوم کی شاعری پر غور کرنے سے قبل ایک محقق کا فرض ہے، کہ وہ اس قوم کی معاشرت، سیاسیات، مدنی خصوصیت، اور طبعی ماحول کو مدنظر رکھے، لہذا ضرورت ہے کہ پہلے یہ بتا دیا جائے کہ شاعر کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟!

جان اسٹوارٹ بلیکی نے اپنی تصنیف "صفات گوئٹھ" میں اسکے متعلق ایک نہایت دلچسپ بحث کی ہے وہ لکھتا ہے:-

"وہ عناصر اور قوتیں جو انسان کی استعداد ذہنی کی تعمیر، اور اسکی فضا اور ماحول کی تشکیل میں معاون ہوتی ہیں، دو قسم کی ہیں، باطنی، اور ظاہری، "باطنی" وہ جنھیں ہم فطری عقل و شعور، اور طبعی استعداد و اہلیت، جودت ذہن، اثر پذیری، قوت ارادی، طاقت جسمانی، تحمل، سنجیدگی، جرأت اخلاق وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں، "ظاہری" میں خاندان کی تربیت، مذہب، مدرسہ، اور حکومت کی اثر آفرینی، ہیئت اجتماعیہ، ملک اور آب و ہوا کی انقلاب انگیزی شامل ہیں"

ان اعتبارات سے جب گوئٹھ کی زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو اسمیں وہی نسلی خصوصیات اور قومی سیرت پائی جاتی ہے جو ایک جرمن کی زندگی کا مخصوص پہلو ہونا چاہئے، گوئٹھ جرمن زندگی کا ایسا ہی نمونہ تھا، جس طرح والٹیر فرانسیسی اور سقراط یونانی زندگی کا، لیکن ساتھ ہی وہ ایک واحد نمونہ تھا، اس خلقی قوت، اور کمال سیرت کا جسکی بدولت اسنے اپنی قوم کو کمزوری اور محکومیت

بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴ :- مطالعہ سے ہم قدیم عربوں کے طرز زندگی، آداب معاشرت، اقتصادیات، و سیاسیات عقاید و اوہام سے واقف ہوتے ہیں بلکہ مذہب اسلام کے نشو و ارتقا، سیاسی و اخلاقی افکار، اور تنظیم و تنسیق پر بھی گہری روشنی پڑتی ہے۔

بلاؤن نے علامہ شبلی کے حوالہ سے صائب کو فارسی ادب کا "ابو تمام" قرار دیا ہے، حالانکہ صائب تبریزی نے نہ تو ابو تمام کی طرح اہل فارس کے منتشر کلام کو قعر گمنامی میں گر کر غائب ہونے سے بچایا، اور نہ وہ ابو تمام کی طرح، اشعار فارس کا پہلا مدون ہے اسمیں شک نہیں کہ صائب کے متعلق تذکرہ نویسوں نے بالخصوص والہ داغستانی اور سراج الدین علی خان آرزو، نے لکھا ہے کہ انہوں نے فیضی، نظیری وغیرہ کے کلام کا انتخاب کیا ہے (ریاض الشعراء و مجمع النفائس) اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے لکھ دیا ہے، کہ صائب کے اس مجموعہ منتخبات سے جسکا ایک قلمی نسخہ علامہ موصوف نے حیدر آباد دکن کی لائبریری میں دیکھا تھا، والہ داغستانی اور خان آرزو نے استفادہ کیا ہے ورنہ بہ نظر انصاف دیکھا جائے، تو صائب سے پہلے ابن شرف الدین علی تقی الدین محمد حسنی کاشانی، (خلاصۃ الاشعار) اور تقی بن معین الدین اوحدی نے جو منتخبات اشعار درج کئے ہیں وہ زیادہ قابل قدر ہیں (عرفات العاشقین) صرف اسوجہ سے نہیں کہ تقی اوحدی، اور محمد حسنی کاشانی صائب سے پہلے گزرے ہیں اور انہیں نظیری، ظہوری، عرفی، فیضی اور دوسرے کثیر التعداد شعرائے فارس سے ذاتی ملاقات کا موقعہ ملا تھا، بلکہ حسن انتخاب، اور استعداد فہم کے اعتبار سے بھی قابل داد ہیں، متاخرین میں ابو طالب اصفہانی کے منتخبات میں بھی نہایت عمدہ اور قابل تعریف اسلوب انتخاب پایا جاتا ہے (خلاصۃ الافکار) جسے دیکھکر کسی شاعر کے کمال اور خیال پر صحیح رائے زنی کیجاسکتی ہے، صائب کے کمالات سے انکار نہیں، لیکن تحقیق اس کی امید نہیں کرتی کہ صائب فارسی ادب کا ابو تمام تھا

کی حالت سے خود اعتمادی کے اس معراج کمال پر پہونچا دیا، جہان جرمنی کا تخیل حیات بار آور ہوگیا
لیکن اسکے برخلاف خود گوئٹھ کا عقیدہ ہے، کہ انقلاب زمانہ کیساتھ ماحول مین تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، اور جہانتک
ایک شاعر خارجی اثر پذیری کی اہلیت رکھیگا، اسی حد تک وہ ایک کامیاب شاعر کہلانے کا مستحق ہے شاعر کو اپنی ذاتی فکر و حساس
کی بجائے، احساسات فطری اور عالم خارج کی نقش طرازی کرنی چاہئے، ہملوگ قدیم یونانیون کی (ٹریجڈی) کی تعریف کرتے ہین،
لیکن اگر صحیح نظریہ سے کام لیا جائے تو انفرادی تخصیات کی بجائے قابل قدر وہ زمانہ اور وہ قوم ہے، جسکے ماتحت ایسے افکار کی آفرینش
ہوئی، پھر یہ خصوصیات شان و تخیل صرف ڈرامہ ہی مین نظر نہین آتے، بلکہ غزل و مثنوی، فلسفہ، خطبہ تاریخ و صنعت مین ہر جگہ مطالعہ
کررہے ہین، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ صفات محض افراد کی ذہنیت کا نتیجہ نہ تھین بلکہ تمام قوم کے اندر یہی ایک روح موج
مار رہی تھی،

اسکے بعد گوئٹھ یورپ کے مختلف شعرا پر ایک سرسری تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"شاعر کا فرض نیابت الٰہی کا حق ادا کرنا ہے، یہ نیابت اسی وقت کامل ہوسکتی ہے، جب فطرت کے دوش بدوش
ہو، اور جب ذہن شاعر کی وساطت سے نقوش فطرت کا ایسا صحیح خط و خال پیش نظر ہوجائے کہ ذہن سامع پر
اسکا وہی اثر ہو، جو حقیقیات سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے جہانتک شاعر کے خود ذاتی فکر و احساس کو دخل
ہوگا اسی حد تک وہ تاثیر سے گرے ہونگے، وہ کلام جس مین شاعر صرف اپنے ہی احساسات کی ترجمانی کرتا
ہے، اور اس مین خارجی محاسن نہین پیدا کرتا وہ شعر کے معراج کمال سے گرا ہوا ہوگا، سوفقلس نے سیرت
کے جو نمونے پیش کئے ہین ان مین خود شاعر کی روحانی بلندی نظر آرہی ہے اور یہی شکسپیر کا حال ہے یہی
وہ محاسن ہین جنھین ایک شاعر کو تاریخی واقعات کی ترجمانی مین ملحوظ رکھنا چاہئے، بلکہ شکسپیر کی پرواز
اس سے بھی بالاتر ہے، اور وہ رومیون کو بالکل انگریزون کی شکل مین پیش کرتا ہے، اور وہ حق بجانب تھا
کیونکہ اگر وہ دوسری صورت اختیار کرتا تو اسکی قوم اسکی فکر و احساس کو سمجھتی ہی نہین، کسی شاعر کو ان
تاریخی سیر تونکا علم نہین جنھین انھون نے اپنے کلام مین نقش کیا ہے، اگر اسے معلوم ہوتا، تو وہ انھین اس موضوع
کیلئے منتخب ہی نہ کرتا، شاعر کیلئے صرف یہ علم ضروری ہے، کہ وہ کونسے تاثرات پیدا کرنا چاہتا ہے، اگر شعرا صرف
مورخین کی روایات کا اعادہ کرین، تو انکی ضرورت ہی کیا ہے، شاعر کو مورخ سے بالاتر ہونا چاہئے، اور اگر
ممکن ہو تو اسے اپنے افکار مین ایک مورخ سے زیادہ حسن ادا پیدا کرنا چاہئے[۵۱]

اسکا رٹ کے بیان سے پتہ چلتا ہے، کہ اسے عالم حقیقت کا کیسا وسیع علم تھا جسے اسنے عمر دراز کے درس

---

۵۱ یہی وجہ ہے کہ نظامی اور جامی نے سکندر نامہ، لیلی مجنون، یوسف زلیخا وغیرہ مین تاریخی حیثیت سے بے اعتنائی کی ہے، اور انھین واقعات
تاریخی اسناد کے اعتبار سے غیر ذمہ دارانہ پائے جاتے ہین ۔ ع ۔

و مطالعہ کی بدولت حاصل کیا تھا

بائرن کو صرف ان باتون کے قطع و برید ہی نے جو موروثی اور حب وطن سے متعلق تھین، تباہ نہین کیا بلکہ اسکے انقلاب پسند رجحان، اور اس مستقل دماغی اضطراب نے جو اسکے ساتھ مستلزم رہا کرتا، اسکے فطری عقل و شعور کو ایک معتدل ترقی کا موقعہ نہین دیا اسکے علاوہ اسکے مستقل انکار و تنقیص نے اس کے عمدہ عمدہ تصنیفات کو بھی خراب کیا، چونکہ انکے مطالعہ سے صرف یہی نہین کہ ایک قاری کو شاعر کا فقدان تناسب متاثر کئے بغیر نہین رہسکتا، بلکہ اسکی مخالفت کے اخیر مین نفی پائی جاتی ہے، اور نفی کوئی چیز نہین، اگر مین کسی برے کو برا کہون، تو اس سے مجھے حاصل کیا ہوتا ہے، اگر مین کسی اچھے کو برا کہون، تو یہ ایک نہایت شرارت کی بات ہے، بائرن نے حکومت اور مذہب کے خلاف ہنگامہ بپا کیا انکی تنقیص شروع کی، اس شورش نے اسے انگلستان سے جلا وطن کر دیا اور وہ زمانہ نزدیک تھا کہ اسے یورپ ہی سے جلا وطن ہونا پڑے، اسکا ذہن اعلی اسکی فطانت وہبی تھی، اور میشٹے اس سے بڑھکر کسی مین صحیح شاعرانہ قوت نہین دیکھی، خارجی اشیاء کے ادراک اور حالات ماضیہ کے صحیح فہم مین وہ شکسپیر کی طرح ایک بلند ہستی ہے، لیکن محاسن انفرادیت کے اعتبار سے وہ شکسپیر سے کم ہے،

شاعری پر سیاسیات کا اثر

شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر ایک ناگزیر مسئلہ ہے امن و فساد حزن و مسرت حریت و غلامی کے متضاد قومی مظاہر شاعری کے اندر غیر شعوری طور پر منتقل ہو جاتے ہین اور ایک دقیق النظر انسان، کسی کلام کے مطالعہ سے اس عہد کے سیاسی فضا کے متعلق ایک حد تک صحیح رائے قایم کرنے کا اہل ہو جاتا ہے، شاعری پر منحصر نہین افکار دماغی کے تمام نتائج وقت سے اثر پذیر ہوتے ہین چنانچہ "تاریخ فلسفہ وسطی" مصنفہ مورس ڈی الف سے جس مین فلسفۂ دور وسطی کی خصوصیات اور انکے اسباب پر ایک محققانہ رائے زنی پائی جاتی ہے، اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

شارلمین کی سلطنت کی تباہی کے قبل عہد وسطی کی خمیر مین مفصلہ ذیل قوانین کے ماتحت تدریجی ترقی ہو رہی تھی۔

(الف) رومی دنیا سے اگر ایک طرف ملکی اور سیاسی تنظیم کا درس مل رہا تھا تو دوسری طرف حکمیہ اور فلسفیانہ خیالات کے اجزاء افکار قومی مین جذب و قبول کی کیفیات پیدا کر رہے تھے۔

(ب) جدید اقوام مین شورش ردعمل شروع ہوئی اور انہون نے رومیون کے ان داخلی عناصر کو اپنے رسوم و احکام کے مطابق جذب کر لیا، یہ جدید قومین کلدانی (   ) اور جرمنی (جرمنی قوم مین فرینکس، انگلز، ٹیوٹنس، نورمنز بھی شامل ہین) تھین جرمن قوم کلدانیون مین مخلوط ہو گئی، جو اس سے قبل مغرب مین آباد تھی، اس اتحاد سے مخلوط قومین پیدا ہوئین جن مین مخصوص، گول، اطالیہ، اور ہسپانیہ کی جدید لاطینی قومین، اینگلو کلدانی (جن مین نورمن قوم کا خون ہے) اور رہائن کی ٹیوٹن اور جرمن قومین ہین، یہ تمام قومین تاریخ فلسفہ کی ترتیب کا اہم سلسلہ ہین،

(ج) مسیحیت نے تمام مدارج کی رہنمائی کی، اسے وحشی قومون کی تربیت اور انکو متمدن بنانے مین بڑی وقت لاحق ہوئی، مبلغین اور

راہبون کی جماعت مختلف مقامات مین پھیل گئی۔

شارلیمن کی حکومت مین اسکے جانشینون کے زمانہ مین برہمی پیدا ہوگئی، اور جب حکومت غیر منظم ہوگئی تو مسلمانون نے جنوب سے اور اہل ہنگریا نے مشرق سے حملے کئے، ان حملہ آورونکی بدولت جدید تمدن داخل ہوا، شمال مین نورمن قوم کا اثر قایم ہوگیا، اور تمام آبادی نے اس اختلاط سے ایک رنگ اختیار کر لیا، اسکا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس سے ایسی قومین پیدا ہوئین جو عجیب و غریب محاسن سے آراستہ تھین

یونان کی تاریخ شاعری مین بھی یہی عنصر پایا جاتا ہے، چنانچہ القمن (Alcman) اسپارٹا کا ایک غزلگو تھا دوسری جنگ میسینین کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسکا عہد شروع ہوتا ہے، اسکی شاعری مین اس دور کی وہ خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہین، یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک مین امن تھا، ماحول مین عیش و نشاط کی روح دوڑ رہی تھی، جو اختتام جنگ کے بعد لازمی امر ہے، القمن کے نغمات مین زیادہ تر لذائذ اکل و شرب کی چاشنی پائی جاتی ہے

طبعی ماحول سے شاعر کی اثر پذیری

شعرا کے خیالات ان لطایف فطریہ کا مجموعہ ہین جنکے اجزا ماحول مین منتشر ہوتے ہین اسلئے شاعر پر جغرافیہ طبعی کا اثر ہونا لازمی امر ہے، فلاسفہ کا خیال ہے، کہ کسی انسان کی پرواز فکر اسے اس کے خیالی نشیمن تک نہین پہونچا سکتی جب تک وہ حقیقت کا مطالعہ نہ کر چکا ہو۔ نیرنجات تصور، اور خیال کی عجائب آفرینی سے انکار نہین، لیکن ساتھ ہی لاک (Locke) کے اس نظریہ سے بھی انکار نہین ہو سکتا، کہ دماغ کے اندر کسی معمولی جدید خیال کی بھی تخلیق کی صلاحیت نہین بلکہ نتیجہ ہے ان تجربات حسیہ کا جو بصر و سمع اور دوسرے حواس ظاہری و باطنی کی بدولت ہمین حاصل ہوتے ہین، ہمارے آبگینۂ تصور مین کتنی ہی جلا کیون نہو، لیکن اسمین ایسی تخلیقی قوت نہین، کہ خیالات موجود فی الخارج کے کسی نہ کسی عنصر سے ذات متصورہ ملتی نہو، ولیم جیمس اپنی کتاب "مبادی نفسیات" (جلد ۲) مین لکھتا ہے:۔

وہ حسیات جنکا ایکبار تجربہ ہو جاتا ہے، نظام عصبانی کے وظایف مین شامل ہو جاتے ہین، اسلئے جب اصل تہیج غایب ہو جاتا ہے تو انکی نقلین دماغ مین پھر عود کرتی ہین، دماغ مین کسی ایسے حس کی نقل مرتب ہی نہین ہو سکتی جس کی بلا واسطہ عالم خارج سے کوئی تحریک نہ پیدا ہوئی ہو۔

خواب کے اندر ایک اندھا آدمی بینائی کا، ایک بہرا آدمی آواز کا ادراک کر سکتا ہے، گو انکی بصارت اور قوت سامعہ برسون قبل مفقود ہو چکی ہون، لیکن جو پیدائشی بہرا ہے، وہ نہین سمجھتا کہ آواز کیا ہے؟ اور نہ ایک پیدائشی نابینا دماغ کے اندر بصارت کا ادراک کر سکتا ہے، تمام دماغی خیالات کی اصل کوئی نہ کوئی عالم خارج کی تحریک ہوا کرتی ہے، مصورہ اس قوت کا نام ہے، جو دماغ کے اندر ان چیزون کی نقلین مرتب کرتی ہے، جنکی اصل سے وہ کبھی متاثر ہو چکی ہے، اس تصور کو جسمین نقلین ہو بہو اترین "تصور اعادی" (Reproductive) کہتے ہین اور جس مین مختلف حقایق سے عناصر لیکر ایک مربوط سلسلہ قایم کیا گیا ہو، اُسے "تصور تخلیقی"

Producement کہتے ہین

ڈاکٹر ابرکرامبی کا بھی یہی نظریہ ہے، جو اسکی کتاب "قوائے عقلیہ" مین پایا جاتا ہے، اور جسکا حوالہ "غالب بے نقاب کے حجابات" مین ایک مرتبہ آچکا ہے۔[۵]

امتداد زمانہ، طبعی ماحول، اور سیاسیات وقت کے اثر سے قومون کے اخلاقی معیار بدلتے رہتے ہین، اقوام و ملل کی تاریخ اخلاقی مین حسن و قبح کا معیار مختلف اور بعض اوقات متضاد پایا جاتا ہے، اور یہ نتیجہ ہے اُسی طبعی ماحول اور سیاسیات وقت کا ایک ہی چیز بہ یک وقت ایک ملک مین جائز اور محمود قرار دیجاتی ہے، اور وہی دوسرے ملک مین ناجائز اور مذموم متصور ہوتی ہے، لہذا موجودہ اصول تمدن، ارتقائے شعور، علوئے تہذیب اور اپنے ذاتی احساسات و افکار سے کسی قوم کے اخلاقی محاسن کا مقابلہ کرنا محققانہ اور منصفانہ طریق جستجو کے خلاف ہے، اگر ہملوگ قدیم عربونکے محاسن شاعری کا مطالعہ کرنا چاہتے ہین تو ضروری ہے کہ پہلے تغیر اخلاقی کے اس کلیہ کو ذہن مین قایم کرلین جسکی تفصیل الفریڈ رسل ویلس کی کتاب "معاشرتی ماحول اور اخلاقی ارتقاء" مین پائی جاتی ہے۔[۵۱]

"ایک زمانہ مین یہ عقیدہ متداول تھا اور آج بھی بہت سے حضرات کا یہ خیال ہے۔ کہ ہر انسان مین جائز اور ناجائز کا علم موروثی اور طبعی ہوا کرتا ہے، اور یہ کہ ایک انسان کو اسکی ناجائز حرکات کے باعث صحیح طور پر سزا دیجاسکتی ہے، لیکن یہ نظریہ تمام و کمال صحیح نہین، چونکہ انسان کے مختلف طبقات اور زمانہ کے جداگانہ ادوار مین جائز اور ناجائز کا معیار بدلتا رہتا ہے، وہی فعل جو ایک وقت اور ایک مقام مین جائز قرار دیا جاتا ہے، دوسرے مقام مین اسے بدترین جرایم مین شمار کرتے ہین، اسلئے ہملوگ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہین، کہ جسے ہملوگ اخلاق سے تعبیر کرتے ہین وہ جائز اور ناجائز اطوار کے کسی موروثی اور طبعی ادراک کا نام نہین، بلکہ وہ ایک حد تک مجلسی و اجتماعی چیز ہے، جو مختلف زمانون اور مقامات مین معاشرانہ ترقی کے مدارج و اقسام کے اعتبار سے تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے، کسی کا حقیقی اخلاق بالعموم ماحول کی پیداوار ہے، لیکن یہ مقامی اور عارضی ہوا کرتا ہے، اس سے سیرت پر کوئی مستقل اثر نہین ہوتا،

سیرت مجموعہ ہے، ان قوائے دماغی اور جذبات کا جن سے ذاتی اور قومی انفرادیت کی تعمیر ہوتی ہے، اسے موروثی کہہ سکتے ہین لیکن غالباً جسم کی ہیئت اور شکل کی بہ نسبت اس مین تغیرات کی پذیرائی کا مادہ زیادہ ہے اسکے عناصر و اجزا مین باہمی خلط و ربط اسقدر گہرے طور پر پایا جاتا ہے، کہ انہین عام اصطلاح مین ازلی سے تعبیر کرسکتے ہین، اور یہی وجہ ہے کہ ہر ایک شخص کی ایک ممتاز انفرادیت ہوتی ہے، جسے ہم خطیبون کی خطابت شعراء کی شاعری، اور ارباب عمل کی ہنگامہ آرائیون مین مطالعہ کرتے ہین؛

---

[۵۱] نگار بابت اکتوبر ۱۹۲۸ء ص ۵۲ Social Environment & Social Progress

وہ دماغی قوٰی جو کسی مرد یا عورت کی سیرت بنانے مین معاون ہوتے ہین، بہت زیادہ ہین ان مین زیادہ مقدار ان قوٰی کی ہے، جو کسی فرد یا قوم کی حفاظت و بقاکے لئے لازمی ہین اور بعض وہ ہین جو بالکل معاشرانہ اور اخلاقی ہین، یہ آخری دماغی قوتین جنکی وساطت سے ہملوگون کے اندر صداقت، عدل، خیر خواہی کا رجحان پیدا ہوتا ہے، جب حسب مقدار دوسری دماغی قوتون سے ملکر ایک احساس ذمہ داری پیدا کرتی ہے (جسے ہم سیرت صالح یا اخلاق حسنہ سے تعبیر کرتے ہین) تو اکثر انہین عملی صورت مین دیکھا جاتا ہے، جسے ہیئت اجتماعیہ کا وہ طبقہ جہان ہم بسر کرتے ہین، بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، اور یہ پسندیدگی سیرت پر ردعمل کا کام کرتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اسے اس بہتر صورت مین دیکھا جاتا ہے جو حقیقتاً اس مین مفقود ہوتی ہے۔

بعض اوقات چال چلن پر ہمارے رفیقون اور ندیمون کی پسندیدگی کا اثر ایسا مختلف ہوتا ہے کہ اگر نظر استحسان کی یہ خلش اپنا کام نہ کرتی، تو سیرت مین اختلاف لازمی تھا، خصوصیت کیساتھ یہ حالت ہوقت ہوتی ہے، جبکہ اس پسندیدگی سے ثروت، جاہ، اور نفع کی صورتین پیدا ہوتی ہین انسان ان حالات کے ماتحت اپنے تہیجات طبعی کو روک نہین سکتا، اور اپنے باطنی امیال و عواطف، کو حقیقت کے خلاف پیش کرتا ہے، ایسے آدمیون کو ہملوگ "ارباب تملق" سے تعبیر کرتے ہین چونکہ یہ لوگ ہیئت اجتماعیہ پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہین کہ انکی یہ سیرت بالکل طبعی ہے، حالانکہ وہ نتیجہ ہوا کرتی ہے، اس خیال کا کہ انہین اس ظاہرداری سے کوئی فایدہ ہوگا، اسلئے تمدن کی ایک بہت ہی پیچیدہ ہیئت مین یہ نہایت دقت طلب امر ہے، کہ ہملوگ صحیح طور پر کسی سیرت کے متعلق اخلاقی یا غیر اخلاقی نیک یا بد کا فیصلہ کرسکین، اسکے برعکس سیرت کی ان ذہنی اور جذبی صورتون مین جبکہ عام ماحول کا اثر نہین ہوتا، اور جبکہ پوشیدہ کرنے کے لئے کوئی طمع نہین ہوتی، ایسی دقت نہین پائی جاتی"

عربی شاعری پر جب اخلاقی نظر ڈالی جاتی ہے، تو ہم اسے فارسی اور اردو شاعری سے متمایز پاتے ہین صرف یہی نہین بلکہ کلام عرب کے مطالعہ کے بعد جب ہم سرسری طور پر اخلاقی نتائج مرتب کرتے ہین تو شعرائے عرب سے ہمین چندان ہمدردی اور موانست نہین معلوم ہوتی، لہذا ضرورت ہے کہ جب ہم مین شعرائے عرب کے اخلاق اور سیرت کے متعلق کیفیات عذر یا جذبات ردو احتجاج پیدا ہون تو یہ نہین کہ کمالات شاعری کے اعتبار سے کلام عرب کو ناقابل توجہ خیال کرین، بلکہ ولیم جیمس، اور الفریڈ رسل ویلس کے نظریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عرب کی خصوصیات شاعری پر غور کرین جس مین اخلاق کا اسوۂ حسنہ، خیالات کی سادگی، ظاہر و باطن کا دفاق فکر و احساس کی معصومیت، لہجۂ ادا کی بے تکلفی بہ درجہ کمال پائی جاتی ہے۔

شاہ نظام الدین اولیاء کی ایک عجیب و غریب تصنیف

اور

روایت احادیث کا ایک فتنۂ بے پایان

آج ہم جس کتاب کا تعارف قارئین نگار سے کرانا چاہتے ہین اسکی تعریف اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے کہ:۔

"این جواہر گنج الہام ربانی و این زواہر فصل علوم سبحانی کہ از زبان درر بار و لسان گوہر نثار سلطان المشائخ شیخ شیوخ العالم قطب علامۃ الدنیا بدر الطریقہ برہان الحقیقۃ سید العابدین بدر العارفین عمدۃ الابرار قدوۃ الاخیار تاج الاصفیا سراج الاولیا ملک السالکین برہان العاشقین فرید الحق والشرع والدین متع اللہ المسلمین بطول بقائہ جمع کردہ شد وانچہ ازان تاج الصالحین از عین لفظ ایشان بہ سمع میرسد دراین مجموعہ کہ نام اوست راحۃ القلوب نبشتہ آمد بتوفیق اللہ تعالےٰ

مختصراً یون سمجھئے کہ یہ کتاب بابا فرید شکر گنج کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کی ترتیب حضرت نظام الدین اولیا نے ۱۵ ررجب روز چہار شنبہ سنہ ۶۵۵ھ سے شروع کی تھی، حضرت نظام الدین اولیا اس کتاب مین ایک جگہ ارشاد فرماتے ہین:۔

"دعاگوے مسلمانان کہ یکے از سلک بندگان سلطان الطریقہ فی الارضین ہست نظام الدین احمد بدایونی کہ جامع این معانی است سعادت پائے بوس سید العابدین حاصل کرد ہمانا کلاہ چہار ترکی کہ دولت دین و دنیا بر فرق اوست بدست مبارک خود فرود آورد و برسرِ دعاگوئے نہاد و فرقہ خاص و نعلین چوبین عطا کرد۔ والحمد للہ علیٰ ذلک"

سلطان الطریقہ فی الارضین و سید العابدین کا اشارہ حضرت بابا فرید شکر گنج کی طرف ہے حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت بابا فرید شکر گنج کی جو قدر و منزلت ہندوستان مین ہے اس کو سامنے رکھ کر جب مین نے اس کا مطالعہ کیا تو سب سے پہلے یہ خدشہ میرے دل مین پیدا ہوا کہ یہ کتاب[1] جعلی تو نہین۔ مگر جب مین نے جا بجا حضرت نظام الدین اولیا کے معاصرانہ واقعات مغلون کی دست برد کے دیکھے اور انکے معاصرین کے بہت سے نام پائے اور فارسی عبارت مین بھی وہ ہندوستانیت نہین دیکھی جو ابو الفضل و فیضی کے بعد پیدا ہوئی ہے تو میرے پاس کوئی بڑی وجہ شک کرنے کی باقی نہ رہگئی۔ اگرچہ اس مین بعض ایسے واقعات کا ذکر ہے جو صریحاً خلاف واقعہ و تاریخ ہین مگر چونکہ وہ واقعات ہندوستان کے باہر کے ہین اس لئے

---

[1] اسکا نام راحت القلوب ہے لیکن مجھے اس کا علم نہین کہ چھپ کر شائع ہو گئی ہے یا نہین۔ بہرحال جو نسخہ مجھے دستیاب ہوا ہے وہ قلمی ہے اور بہت زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس کو دیکھ کر مین نے یہ تنقید کی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اسکی تحقیق ہندوستان والون کو اس زمانے مین نہ ہوئی ہو۔

چنانچہ کتاب مین دو جگہ بسلسلہ کرامات اولیاء اللہ مغلون کے حملے مین کا ذکر آیا ہے جو بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مین تحریری غلطی ہو اور یہ کسی ایسی جگہ کا نام ہو جو ملتان سے لفظی مشابہت رکھتا ہو ایک جگہ دمشق پر مغلون کے دخل پانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی خلاف واقعہ ہے کیونکہ پہلا حملہ دمشق پر تیمور کے مغلون نے کیا تھا جو نظام الدین اولیاء کے دو سو برس بعد کا واقعہ ہے۔

ساری کتاب عجیب و غریب باتون سے پُر ہے اور بزرگون کے کرامات اور خصوصاً انکے مجاہدۂ نفسی کے نہایت عجیب غریب واقعات درج ہین بعض جگہ بابا فرید اپنے نیبا د کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے وہان کے پہاڑون کا حال بیان کرتے ہین حالانکہ وہان پہاڑ کوئی بھی نہین ہے۔ بہرحال اسوقت مجھے اپنی توجہ ان بے شمار حدیثون کی طرف مبذول کرنی ہے۔ جس سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔ مین اپنے کو حدیث کا عالم نہین کہتا مگر خدا نے میرے دماغ مین ایسی صلاحیت پیدا کی ہے کہ جب مین کسی کتاب کو غور سے دیکھ لیتا ہون تو اسکے نفس مضمون کو بہت کم فراموش کرتا ہون۔ حدیث کا مطالعہ ایک عامی کی حیثیت سے مین نے بہت کافی کیا ہے اور اگر کوئی کسی حدیث کے متعلق یہ کہدے کہ فلان کتاب مین ہے تو مین اسکی تصدیق و تکذیب بغیر کتاب دیکھے کرسکتا ہون اسواسطے مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا جب مین نے دیکھا کہ اس کتاب مین ایک حدیث بھی ایسی نہین جو موضوعات ہی مین پائی جاتی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ گنجینۂ حقیقت و معرفت درحقیقت واقعی بابا فرید شکر گنج کے ارشادات کا مجموعہ ہے جسے نظام الدین اولیا نے مرتب کیا تو کیا ایسی بے سروپا باتون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا درست ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ اس قسم کی احادیث محض نیک نیتی سے مسلمانون کے اصلاح کی غرض کے لئے وضع کی گئی تھین تو بھی ایسی دور از عقل باتون کو بلا تکلف و بلا سند حدیث قدسی بنا کر پیش کرنا کسی طرح روا نہین ہوسکتا۔ امام غزالی بھی اس مصلحت کوشی کے عادی تھے۔ چنانچہ ایک مصری فاضل نے نہایت محنت سے احیاء العلوم کی حدیثون کے لئے اسناد ڈھونڈنے کی سعی نامشکور کی ہے تاکہ غزالی کے سر سے الزام رفع ہو جائے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے وصال کے دو صدی بعد وضع حدیث کا جو فتنہ اٹھا تھا وہ حضرت بابا فرید شکر گنج کے زمانہ تک بند نہ ہوا۔ اور موضوع حدیثون کا اتنا بڑا انبار جمع ہوگیا کہ اس نے قرآن کو بالکل محو کرا دیا مین اس مضمون مین چند حدیثین ہو بہو نقل کرتا ہون۔ اور قارئین کی رائے پر اسکا فیصلہ چھوڑتا ہون۔ بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ ساری کتاب مین ایک بھی صحیح حدیث کہین نظر نہین آتی اور ایک جگہ تو یہ غضب کیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کی تفسیر مین وہب بن منبہ کی طرف سے ایسی بے سروپا باتین لکھدی ہین کہ انکی خبر وہب کے فرشتون کو بھی خبر نہ ہوگی۔ ایک جگہ سورہ مائدہ کی آیت "اللھم انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیدا لاولنا و آخرنا" کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ مائدہ امت موسیٰ پر نازل ہوا۔ ممکن ہو کوئی یہ کہے کہ غلطی سے بجائے "عیسیٰ" کے موسیٰ لکھ گیا ہو سو اسکو حسن ظن کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بعض اقتباسات ملاحظہ ہون:۔

- برلفظ مبارک راند کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در شب معراج خرقہ یافتہ بود و اینچنان بود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از معراج بازگشت صحابہ کبار رضی اللہ عنہم را پیش خواند و فرمود من خرقہ از پروردگار خود یافتم مرا اذن ست کہ این را بہ یکے از شما بدہم سخن از شما خواہم پرسید تا کدام کسے از شما جواب باصواب دہد تا خرقہ دہم اول رو بسوے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کرد و گفت یا ابابکر اگر این خرقہ بتو دہم چہ کنی گفت یا رسول اللہ صدق ورزم و طاعت خدائے تعالیٰ کنم و انچہ ہست من از مال و متاع دنیا سے دنی باشد جملہ در راہ خدا تعالیٰ صرف کنم بعد ازاں روے بہ امیر المومنین عمر خطاب رضی اللہ عنہ آورد کہ یا عمر اگر این خرقہ ترا دہم چہ کنی۔ گفت یا رسول اللہ اگر این خرقہ مرا دہی عدل کنم و با بندگان خدا تعالیٰ انصاف ورزم و داد مظلومان بدہم۔ بعد ازاں روے بامیر المومنین عثمان رضی اللہ کرد کہ یا عثمان اگر این خرقہ بتو دہم چہ کنی گفت یا رسول اللہ اگر این خرقہ مرا دہی بہ اتفاق یکدیگر کار کنم۔ انچہ حق باشد بجا آرم و حیا ورزم سخاوت کنم۔ بعد ازاں روے بہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کرد کہ یا علی اگر این خرقہ بتو دہم چہ کنی گفت یا رسول اللہ اگر این خرقہ مرا دہی پردہ پوشی کنم و عیب بندگان خدائے تعالیٰ پنہان سازم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمود بستان علی این خرقہ بتو دادم مرا فرمان حضرت عزت ہمین بود کہ ہرکدام از یاران تو این جواب دہد خرقہ بدو دہی "۔ اس حدیث کے بیان کرنے کے بعد شیخ الاسلام روتے روتے حسب معمول بے ہوش ہو جاتے ہیں اور جب ہوش میں آتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ "درویشی پردہ پوشی ہست" یہ ہے تصوف کی تاریخ تکوین ... اور اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام کے ذکر میں خلافت مابعد کی ترتیب کیوں قایم رکھی گئی۔ تو آپ وہ بے شمار حدیثیں ملاحظہ فرمایئے جو حضرت شاہ ولی اللہ ایسے متکلم نے بھی ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء میں بیان کی ہیں

۲- سخن در دنیا می رفت برلفظ مبارک راند کہ در حدیث ست از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ "حب الدنیا راس کل خطیئۃ" یعنی دوستی دنیا سر ہمہ خطاہاست آنگاہ فرمود "قال اہل المعرفۃ من ترک الدنیا ملک ومن اخذ با ہلک"

معلوم نہیں یہ حدیث کہاں ہے۔ البتہ خدا کا یہ ارشاد ضرور معلوم ہے کہ "دنیا کی نعمتوں کو تم پر کس نے حرام کیا" اور یقیناً رسول اللہ بھی قرآن کی اس تعلیم سے ناواقف نہ تھے۔

۳- بعد ازاں فرمود کہ در خبر ست از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ امشب (یعنی شب معراج) از آسمان ہفتاد ہزار فرشتہ مقرب با طبقہائے پر از نور فرود می آیند و نزدیک ہر خانہ در روند ہر کس کہ امشب را زندہ داشتہ باشد و از معاصی دور بود فرمان رب العزت و الجلال چنان می شود کہ بر سر ہائے ایشان این طبقہائے نور نثار کنند "

یہ انھیں لغو و مہمل روایات میں سے ایک روایت ہے جو اسلام کے اندر "علم الاصنام" پیدا کرنے کی

ذمہ دار سمجھی جاتی ہیں۔

۴۔ ابوہریرہ کی ایک مشہور حدیث ہے جو بعض کتب حدیث میں نظر آتی ہے مگر روایت و درایت سے اس کی لغویت[5] ثابت ہو چکی ہے۔ اس حدیث کا ذکر اس طرح ہوتا ہے:۔

"انگاہ ہم درین میان غلبات شوق فرمود کہ چون ایام عمر مہتر موسیٰ صلوات اللہ وسلام علیہ بسر آمد۔ روزے در راہ میگزشت و چون مستان میخرامید کہ با ملک الموت ملاقات شد۔ سلام کرد جواب سلام باز داد پرسید کہ تو کیستی گفت ملک الموت۔ مہتر موسیٰ در شوق و اشتیاق بود۔ دست بر آورد و طپانچہ بر روے ملک الموت چنان زد کہ از پیش موسیٰ علیہ السلام بگریخت (حدیث مسند احمد میں یکانے ہونے کا ذکر ہے) گفت بار دگر نیایم چون ملک الموت بمقام خود باز آمد سر بسجدہ نہاد۔ گفت الٰہی مرا بر کسے فرستادی کہ اگر از پیش او نمی گریختم مرا ہلاک کردے (یا للعجب۔ ملک الموت کو خود اپنی ہلاکت کا اندیشہ) انگاہ خطاب آمد کہ اے ملک الموت نابہ دانی کہ میان محبان ما غیرے کار ندارد و ما دانیم و دوست ما۔ بعد از ان مہتر موسیٰ روز دوم نماز گذاردہ مستقبل قبلہ در بیت المقدس نشستہ بود (کیا خوب تاریخ ہے۔ کہاں جناب موسیٰ اور کہاں بیت المقدس جو ان سے ایک ہزار سال بعد حضرت داؤد کے زمانے میں تعمیر ہوا) مہتر جبرئیل علیہ السلام در آمد و سلام کرد بعد از سلام صلوٰۃ فرستاد سیبے از بہشت آوردہ بود بدست مہتر موسیٰ علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام داد (بالکل یہی واقعہ ذوالنون مصری کے نسبت بھی بیان کیا گیا ہے) ان سیب را بوے کرد بوے دوست از سیب در دماغ او برفت نعرہ بزد و جان بداد"۔ اسکے بعد شیخ الاسلام حسب معمول روتے ہیں اور رولاتے ہیں اور پھر بے ہوش ہو جاتے ہیں

۵۔ از ان سخن در این افتادہ بود کہ خواجہ عبد اللہ ابن مسعود کوتاہ بالا بود۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در حق او فرمودہ اند۔ کینفقتہ العلم یعنی خریطہ علم۔ (میرے پاس فون کریمر کی صحیح کی ہوئی اصابہ بھی ہے اور کامل ابن اثیر اور اسد الغابہ بھی۔ مگر ان میں کہیں انکا ذکر نہیں)

بعد از ان فرمود کہ وقتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میخواست کہ نماز بگزارد۔ و ہیچکس حاضر نبود مگر عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ دست او گرفت و برابر خود آورد و بایستانید چون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یہاں کی عبارت کرم خوردہ ہو گئی ہے۔ شاید برائے نماز دست بربست" ہوگا عبد اللہ ابن عباس از مقام خود بستر آمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نماز بشکست (کہاں ہیں صاحب ہدایہ اور دیگر علماء فقہ و شریعت)۔

---

[5] قال الرازی ... علیہ السلام حکی ذلک عن الیہود لانہ حکاہ عن اللہ تعالیٰ او عن نفسہ الرسول علیہ السلام کان قد ذکر ہذہ الحکایۃ الان الراوی حین دخل ما سمع الا ہذا الکلام فظن انہ علیہ السلام ذکرہ عن نفسہ لا عن الیہود۔ ۱۲

دست او بگرفت و برابر خود بایستانید و نماز شروع کرد۔ باز عبد اللہ رضی اللہ عنہ از جائے پستر آمد تا دو سہ بار ہم چنین کرد بعد از ان حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمود کہ چرا پستر میروی گفت مرا چہ زہرہ است کہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایستم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را حسن ادب او خوش آمد در حق او دعا کرد

ابن عباس کی ایک روایت سے یہ ضرور پایا جاتا ہے کہ ایک رات جب وہ اپنی پھوپھی میمونہ کے ہان سو رہے تھے تو رسول اللہ اٹھے اور وضو کیا۔ ابن عباس بھی جاگ رہے تھے۔ کمسن بچے تھے۔ انھون نے بھی شوق مین وضو کیا اور آپکے ساتھ نماز مین شریک ہوگئے تو رسول اللہ نے انکو اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ مگر جو انداز بیان شیخ الاسلام کا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

۷۔ آنگاہ بر لفظ مبارک راند کہ در حدیث آمدہ است از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ بدرستی و راستی علم و عقل ہر دو شریک یکدگر اند زیرا چہ عقل را چارہ نیست از علم پس فاضل ترین مردمان کیست کہ خود را بشناسد۔ پس درین صورت عقل مختار است

۸۔ فرمود کہ وقتے در عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتے دو بچہ زائید متصل۔ در حضرت رسول عرضداشت کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرما تا از یکدگر جدا شوند۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در تفکر بود کہ درین اثنا جبرئیل علیہ السلام فرود آمد و گفت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمان می شود کہ یک شانہ راست کنید و آن شانہ در سر ہر دو بگردانید۔ بفرمان خدائے عز و جل از ہم جدا خواہند شد رسول فرمود صلی اللہ علیہ وسلم کہ بردید و چنین بکنید۔ یک شانہ در سر ہر دو کردند بعد چند روز از یکدگر جدا شدند

۹۔ شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آمدہ است کہ دو رکعت نماز در اول شب ماہ ذی الحجہ بگزارد و در رکعت اول فاتحہ یکبار و سہ آیت از سورۂ انعام و در رکعت دوم فاتحہ یکبار و قل یا ایہا الکفرون یکبار بخواند حق سبحانہ تعالی ثواب حج کنندگان در نامہ اعمال بنویسد

۱۰۔ وہم درین محل فرمود کہ از وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ آمدہ است کہ حق سبحانہ تعالی ہدیہ فرستاد بر مہتر موسی علیہ السلام مہتر جبرئیل ہدیہ آورد و گفت اے موسی ہر کہ در ایام عشرہ ذی الحجہ درین دہ روز این کلمات بگوید چنانست کہ دوازدہ ہزار بار توریت خواندہ باشد و گویند این کلمات را دہ ہزار نیکی در نامہ اعمال بنویسند و دہ ہزار بدی دور کنند و ہزار فرشتہ صلوات گویند و عمل او از اہل زمین فاضل تر باشد۔

اسکے بعد شیخ الاسلام نے دو صفحون مین بعض کلمات کے پڑھنے سے ایسی ایسی نیکیون کا ملنا ظاہر کیا ہے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "شیخ الاسلام قدس سرہ بر لفظ مبارک راند کہ در عوارف شیخ الاسلام شیخ شہاب الدین سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز بروایت حنفیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالی نوشتہ دیدم

کہ این کلمات در انجیل منزل بود از آسمان - تا بینا از برکت این بینا می شود و نور می آید کہ از آسمان فرود می آید
(افسوس کہ وہ انجیل سوائے فقیہ ابو اللیث کے کسی کی نظر سے نہیں گزری جس کو سوائے اپنی بدبختی اور کور بینی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے)۔

۱۱- روزے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نشستہ بودند و صحابہ رضی اللہ عنہم گرد برگرد - ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ طرف راست بود - جوانے بیاید و سلام کرد - خواجہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمان داد کہ بالاتر ابوبکر صدیق بنشین - ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ متامل شد - یاران دانستند مگر مہتر جبرئیل علیہ السلام است وگرنہ ہیچ یارے را محل آن نباشد کہ بالاتر از ابوبکر رضی اللہ عنہ بنشیند - مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم روے مبارک سوے ابوبکر صدیق کرد بگفت این مردے است آنقدر درود برمن میفرستد کہ ہیچ کس نمی تواند فرستاد - ابوبکر رضی اللہ عنہ گفت یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مگر این جوان آب و طعام نمی خورد و بہ ہیچ مصلحت دیگر مشغول نمی شود بجز درود مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم - فرمود کہ طعام و شراب نیز می خورد و مصالح خود مشغول می شود امّا یکبار در روز و یک بارہ شب برمن این درود میفرستد ہم بطریق بالا۔

اللہ اکبر - کتنا زبردست عمل علوی ہے - اور اسپر بھی اگر کوئی شخص ابوبکر صدیق سے نہ بڑھ جائے تو اسکی بدبختی پر افسوس کرنا چاہئے۔

۱۲- و سخن در آیۃ الکرسی افتادہ بود - بر لفظ مبارک راند آن روز کہ آیۃ الکرسی نازل شد ہفتاد ہزار فرشتہ مقرب گرد برگرد کرسی میایستند بر سر مہتر جبرئیل علیہ السلام در خدمت حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم فرود آمدند و گفتند - پستان پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم با ہزار اعزاز و اکرام لبستاند و برسر و دیدہ نہاد - جبرئیل گفت یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرمان می شود کہ ہر آن بندہ از بندگان سورۃ آیۃ الکرسی کہ مقرر ست بخواند بر ہر حرفے کی در این آیتہ ہست - پس بہر حرف ہزار سال ثواب بنام او ثبت فرماید و ہزار فرشتہ گرد بر کرسی اند خواندہ این را ہزار ثواب ایشان بدہند و او را از مقربان خود گرداند - بعد ازان شیخ الاسلام ہم در این محل فرمود کہ در فتاوی ظہیری نوشتہ است کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نوشتہ است کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ است ہر کہ آیت کرسی بخواند و از خانہ برآید حضرت عزت فرمان دہد ہفتاد ہزار فرشتہ را تا آن زمان کہ آن بندہ باز آید برائے او آمرزش خوانند - اسکے بعد بھی اللہ شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی اور جامع الحکایات آیات الکرسی کے اور بھی طلسماتی اثرات گنائے گئے ہیں۔

۱۳- بعد ازان فرمود کہ وقتے امیر المومنین کرم اللہ وجہہ در جنگ غول بیابانی ماندہ بود و بجان رسیدہ بر رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکتوب نوشت کہ جملہ حیلہا کردم و آنچہ شرط جنگ است بجا آوردم چون این مکتوب بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم آمد از صد دل تنگ شد - در حال جبرئیل علیہ السلام این آیتہ آورد - ربنا اخرجنا من ہذہ القریۃ

الظالم اہلہا تا آخرہ" وایں آیۃ را بہ علی بفرست تا آن را ملازمت نماید حق تعالی از برکت این آیہ مظفر و منصور گرداند
رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمین آیت و تفسیر آن بر شاہ مردان علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فرستادہ شاد شد۔ واین آیۃ را
ملازمت نمود۔ دوم روز جنگ کرد۔ آن غول را زندہ گرفت و در مدینہ آورد۔ اما این فتح از برکت این آیۃ بود۔
(کہان ہین جناب واقدی رحمہ اللہ علیہ جنھون نے اس کا تذکرہ نہین کیا)

۱۴۔ در حدیث آمدہ است " من صام یوم عاشورا فکانما صام الدہر"۔ یعنی ہر کہ روزہ عاشورا را روزہ بدارد و بدرستی وراستی، تمام سال روزہ داشتہ باشد۔ آنگاہ ہم درین محل فرمود کہ در روزہ عاشورا آن ہوا ان دشتی بدرستی خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرزندان خود را شیر نمی دہند پس چرا باشد کہ روزہ را نگاہ ندارند۔
(کتاب کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونون بزرگون کو مغالطہ تھا کہ یوم عاشورا کا روزہ امام حسین کی یاد مین رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ بزرگ بخاری کو پڑھ لیتے تو یہ غلط فہمی رفع ہوجاتی)

۱۵۔ ہم درین محل فرمود کہ وقتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم با جمیع صحابہ کبار نشستہ بود۔ حضرت معاویہ یزید پلید را بر کتف سوار کردہ میرفت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم کرد و گفت سبحان اللہ دوزخی بر کتف بہشتی سوار میرود۔ این سخن امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ بشنید از آن حال پرسید کہ یا رسول اللہ پسر معاویہ است دوزخی از کجا است گفت یا علی این یزید بدبخت کسے ست کہ حسن و حسین و تمامی آل مرا بہ شہادت رساند و بکشد۔ علی برخاست و تیغ از نیام برکشید تا ایشان را بکشد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مانع شد کہ یا علی مکن کہ تقدیر خدائے تعالی برین رفتہ است۔ علی بگریست یا رسول اللہ شما برسر باشید فرمودنے۔ گفت از یاران کسے باشد۔ گفت نے۔ گفت فاطمہ باشد فرمودنے۔ گفت یا رسول اللہ ماتم غریبان من کہ خواہد داشت گفت امثال من۔ بعد ازان علی رضی اللہ عنہ و رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ہر دو بگریستند و شاہزادگان را در کنار گرفتند و نعرہ زدند کہ اے غریبان نمیدانیم کہ مآل شما دران دشت چگونہ خواہد بود

۱۶۔ فرمود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از جبرئیل علیہ السلام این حکایت پرسید چون از ما کسے نباشد تعزیت ایشان (یعنی امام حسین) کہ دارد گفت یا رسول اللہ امتیان تو از برائے فرزندان تو تعزیتہا کنند (یہ ہے جواز تعزیہ داری کا، ہمارے علما کہتے ہین جو اسکے خلاف فتوے دے رہے ہین) و ماتم دارند کہ حقیقت آن بر زبان نیاید و شرح نتوان کرد (ایران کا ماتم تلوارون و زنجیرون سے دیکھنے کے بعد اسکی شرح بیان کیجا سکتی ہے)

۱۷۔ حکایت در ماہ صفر ختم اللہ بالخیر والظفر افتادہ بود۔ بر لفظ مبارک راند گران ماہے و صعب شہرے ست زیرا چہ چون ماہ صفر بودے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگدل شدے و چون بیرون آمدے شاد گشتے۔ این تغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از سبب گرانی ماہ صفر بودے و از حد گران ست۔ بعد ازان ہم درین محل فرمود کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم منقر مایند ہر کہ بگزشتن او صفر بشارت دہد بہ من او را بشارت وہم بدر آمدن بہشت کما قال علیہ السلام۔ من بشرنی بخروج الصفر انا بشرہ بدخول الجنۃ بعد ازین ہم در این محل فرمود حق تعالی در ہر سال وہ لک وہشتاد ہزار بلا از آسمان منزل میکند الا در این ماہ نہ لک وبست ہزار بلا فرد می آید"

الغرض اس قسم کی لغو روایات سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔

ہمارے ملا علی قاری نے جنکے متعلق کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرے اور کہاں دفن ہوئے کیسی حد الگتی بات کہی ہے کہ

" جو اسرائیلیات مین نظر رکھتے تھے (جیسے عبد اللہ بن سلام و عبد اللہ بن عمرو انکو یرموک سے بہت سی کتابین اہل کتاب کی دستیاب ہوئین تو وہ لوگ ان کتابون سے امور غیب (احوال قیامت) وغیرہ روایت کرتے تھے اور اس انداز سے گویا خود رسول اللہ نے ان سے بیان کیا ہے "

ایک اور دوسرے بزرگ نے نخبۃ الفکر کا حاشیہ لکھا ہے انکا نام ابو الامداد ابراہیم ہے۔ لکھتے ہین۔

" بنی اسرائیل کے واقعات ماخوذ کرنے والے حضرت ابو بکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان اور حضرت علی تھے اور جو اصحاب بنی اسرائیل کے قصے بیان کیا کرتے تھے وہ عبد اللہ بن سلام اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص تھے جب شام کا ملک فتح ہوا تمیہ کچھ اونٹ یہود و نصارے کی کتابین لائے عمرو بن عباس انھین کتابون سے روایات بیان کیا کرتے اس لئے ان کی حدیثین کم ہین اور اخبار و قصص بنی اسرائیل بہت زیادہ ہین "

اسی طرح حافظ ابن کثیر کا قول ہے " کان ابن عباس تلقاہ ن الاسرائیلیات " اور نخبۃ الفکر مین بھی حافظ ابن حجر سے ہے " یا خذ من کلام غیرہ کبعض السلف الصالح او قدماء الحکماء او الاسرائیلیات (یعنی اور کبھی ابن عباس لے لیا کرتے تھے دوسرون کے کلام، سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسے بعضے سلف صالحین کی باتین یا قدیم زمانے کے حکما یا بنی اسرائیل کے واقعات) - اور ابو ہریرہ کے متعلق توصاف یہ کہہ دیا گیا کہ براہ راست رسول سے کوئی بات انکو پہنچ ہی نہ سکتی تھی - مگر نخبۃ الفکر کو یون لیا جائے - خود بخاری کی یہ حدیث پتہ دے رہی ہے کہ ہماری اکثر روایات کا ماخذ کیا تھا -

عن عبد اللہ ابن عمر قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغو عنی ولو آیۃ وحدثو عن بنی اسرائیل

میری تبلیغ کردہ بات پہنچا دو خواہ وہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے واقعات بیان کیا کرو

یہ تو حدیث کی پہلی اسناد کا حال تھا۔ مگر حدیثین بعد کو جس طرح وضع کی گئی ہین، وہ بھی ملاحظہ ہو۔ تذریبا الراوی کے جا بجا اقتباسات یہان نقل کئے جاتے ہین اور مین خود ان پر کوئی حاشیہ آرائی نہین کرنا چاہتا۔

۱- امام بخاری تاریخ الاوسط مین ارقام فرماتے ہین کہ مین نے عیسی الیشکری کے واسطے سنا ہے کہ علی بن جریر فرماتے ہین کہ

عمر بن صبیح کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ خود وضع کیا ہے۔

۲- حاکم نے ابی عمار المروزی سے نقل کیا ہے کہ ابی عصمت نوح بن ابی مریم سے کہا گیا کہ کیا بات ہے کہ تم عکرمہ سے اور وہ ابن عباس سے قرآن مجید کے سورتون کے جو فضائل بیان کرتے ہو یہ فضائل عکرمہ کے شاگرد بیان نہین کرتے ان حضرت نے جواب دیا کہ مین نے لوگون کو دیکھا کہ قرآن مجید سے بے پرواہی کرتے ہوئے ابو حنیفہ کی فقہ اور ابن اسحاق کی مغازی مین لگے رہتے ہین۔ پس مین نے اس حدیث کو اس لئے وضع کر دیا۔

۳- ابن حبان نے اپنے ضعفا مین ابن مہدی سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہین کہ مین نے میسرہ بن عبد ربہ سے دریافت کیا کہ تم یہ حدیث کہان سے لاتے ہو کہ جو اسکو اس طرح سے پڑھتا ہے۔ اسکے لئے جنین ہے اور جہان ہے تو انہون نے جواب دیا کہ مین نے ان حدیثون کو اس لئے وضع کیا کہ لوگ اس مین رغبت کرین اور جو ہوشیار لڑکے ہین وہ زہد اختیار کرتے ہوئے شہوات دنیا اور بغداد کے بازارون مین گھومنا اپنی موت کے ڈر سے چھوڑ دین

۴- ابن سمعیل سے مروی ہے کہ مجکو ایک شیخ نے ابی بن کعب سے قرآن مجید کی تمام سورتون کے فضائل مرفوعاً روایت کئے مین نے شیخ صاحب سے دریافت کیا کہ آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے۔ انہون نے فرمایا کہ ایک مدائن کے شخص نے روایت کی ہے جو ابھی زندہ ہے۔ پھر مین انکے پاس آیا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے۔ انھون نے کہا کہ واسط کے ایک شیخ نے بیان کی ہے جو ابھی زندہ ہے پھر مین انکے پاس آیا اور ان سے دریافت کیا۔ انہون نے فرمایا کہ مجکو بصرہ کے ایک شیخ سے موصول ہوئی ہے مین انکے پاس بصرے مین آیا تو انہون نے فرمایا کہ مجکو عبادان کے ایک شیخ سے موصول ہوئی ہے جو ابھی زندہ ہین مین انکے پاس آیا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک گھر مین لیگئے پس دیکھا کہ اس مین بہت صوفی اور عارف باللہ موجود ہین۔ اور انکے ساتھ ایک شیخ ہے پس اس نے کہا کہ مجکو ان شیخ صاحب سے حدیث پہونچی۔ مین نے شیخ صاحب سے دریافت کیا تو انہون نے فرمایا کہ مجھ سے اس حدیث کو کسی نے نہین بیان کیا اصل بات یہ ہے کہ مین نے دیکھا کہ لوگون کو قرآن سے بے رغبتی ہوگئی ہے لھذا مین نے اس حدیث کو خود بنا لیا۔

۵- بدعتیون کی ایک جماعت جو محمد بن کرام سجستانی کی طرف منسوب ہے اور اسی لئے اس جماعت کو کرامیہ کہتے ہین۔ اسی جماعت سے تعلق خواجہ معین الدین چشتی کا تھا ترغیب اور ترہیب مین جھوٹی حدیثین وضع کرنا اپنے خیال مین جائز تصور کرتی تھی۔ چنانچہ وہ ثواب و عذاب مین لوگون کو طاعت کے لئے ترغیب دینے اور گناہون سے بچانے کی غرض سے بالکل جھوٹی حدیثین بنایا کرتے تھے

۶- ابو داؤد نخعی باوجود قائم اللیل اور صائم الدہر ہونے کے جھوٹی حدیثین بنایا کرتے تھے۔

۷- ابن حبان نے کہا ہے کہ ابو بشر احمد بن محمد ...... المروزی باوجود اپنے زمانے مین حامی سنت ہونے کے جھوٹی حدیثین بنا لیا کرتے تھے

۸- ابن عدی نے کہا ہے کہ وہب بن حفص ایسے بڑے بزرگ تھے کہ کسی سے کلام نہیں کرتے تھے باوجود اسکے۔ کان یکذب کذباً فاحشاً۔

۹- محمد بن سعید مصلوب کا بیان ہے۔ "لا باس اذا کان کلام حسن ان تضع له الاسناد" یعنی جب کوئی کلام اچھا ہو تو اسکے لئے سند وضع کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

۱۰- بعض اہل الرائے کا قول ہے جس میں ایک قرطبی بھی ہیں "ما وافق القیاس الجلی جاز ان یعزا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی جب قیاس جلی موافق ہو جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا جائز ہے۔

۱۱- حاکم نے ہارون سے اور انہوں نے ابی عبید اللہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ المہدی عباس کا بیان ہے کہ مجھ سے مقاتل بن سلیمان نے کہا "ان شئت وضعت لک الحدیث" اگر چاہے تو میں تیرے لئے حدیث وضع کر دوں۔ مہدی نے جواب دیا کہ مجکو اسکی ضرورت نہیں۔

۱۲- ابو سعید مدائنی وغیرہ کا یہی پیشہ تھا کہ موضوع قصے بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔

۱۳- حاکم نے کہا ہے کہ محمد بن القاسم "کان یضع الحدیث علی مذہبہم" یعنی وہ اپنے مذہب کے موافق حدیثیں وضع کر لیا کرتا تھا۔

۱۴- ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں عبد اللہ بن یزید کی نسبت بیان کیا کہ ایک بدعتی شخص اپنی بدعت سے جب تائب ہوا تو کہنے لگا کہ اس حدیث کو دیکھو تم اس شخص سے لیتے ہو۔ حالانکہ جب ہم کوئی چیز دیکھتے ہیں۔ "جعلناہ حدیثاً" اسی کے لئے حدیثیں وضع کر لیا کرتے تھے۔

۱۵- حاکم نے المحامی سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو العنیا کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے بعض احادیث وضع کر کے بغداد کے بہت سے شیوخ کے سامنے پیش کیں تو بجز ابن ابی شیبہ علوی کے باقی سب نے قبول کر لیں۔

۱۶- معمر نے جو ابن ابی عوجہ کا بھتیجا تھا اپنی کتاب میں درج کیا یعنی ہم سے زہری سے اور انہوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ سے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت نے علی کی طرف نظر کر کے فرمایا کہ تو دنیا اور آخرت میں سید ہے جو شخص تجکو دوست رکھے اسنے مجکو دوست رکھا اور جس نے مجھے دوست رکھا وہ اللہ کا دوست ہے اور جس نے مجھ سے دشمنی رکھی وہ میرا دشمن ہے اور جو میرا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے۔ پس خرابی ہے اسکے لئے جو میرے بعد تجھ سے بغض رکھے۔

پس اس حدیث کو عبد الرزاق سے اور انہوں نے معمر سے نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث باطل اور موضوع ہے جیساکہ اسکی نسبت یحیٰی ابن معین نے فرمایا ہے۔

۱۷- خطیب بغدادی نے اپنی سند سے معاذ بن سلمہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے ایک شیخ کے ذریعے سے خبر ملی کہ وہ حدیث کے وضع کرنے

کے لئے گیٹیان کیا کرتے تھے۔

۱۸۔ میسرہ بن عبد ربہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی فضیلت مین ستر حدیثین وضع کین

۱۹۔ مامون بن احمد ہروی سے کہا گیا کیا تو نے شافعی کو نہین دیکھا اور انکو جو خراسان مین انکے متبعین ہین تو اس نے کہا کہ ہم سے احمد بن عبد البہنے اور ان سے عبد اللہ بن مندان الازدی نے انس سے مرفوعاً حدیث روایت کی ہے کہ میری امت مین ایک شخص ہوگا جسکو محمد بن ادریس کہینگے وہ میری امت کو شیطان سے زیادہ نقصان پہونچائے گا۔ اور ایک شخص میری امت ہی مین ہوگا کہ جسکو ابوحنیفہ کہین گے وہ میری امت کا چراغ ہوگا۔

۲۰۔ عقیلی نے معاذ بن زیاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کیا یعنی وہ فرماتے ہین۔ کہ "وضعت الزنادقۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اربعۃ عشرۃ الف حدیث منہ عبد الکریم من العوجاء" یعنی فرقہ زنادیق نے آنحضرت صلعم کی طرف سے چودہ ہزار حدیثین وضع کرکے منسوب کی ہین ان مین سے ایک عبد الکریم بن ابی عوجاء ہے (یہ وہی ہے جس نے اپنے قتل کے وقت اقرار کیا تھا کہ خود اس نے چار ہزار حدیثین ایسی بنائی ہین۔ جن مین حلال کو حرام اور حرام کو حلال کردیا ہے)۔

۲۱۔ نسائی نے کہا ہے کہ ابن ابی یحیی جو مدینہ مین تھے اور واقدی جو بغداد مین تھے اور مقاتل بن سلیمان جو خراسان مین تھے اور محمد بن سعید مصلوب جو شام مین تھے حدیث وضع کرنیوالے کذاب مشہور تھے۔

ایک طرف حدیثون کا یہ حال تھا۔ اور دوسری طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے فاطمہ بنت قیس صحابیہ حاضر ہوکر حلفیہ بیان کرتی ہے کہ بقول رسول اللہ تین طلاق والی عورت کے خورد و نوش و اقامت کے صرفہ کا خاوند ذمہ دار نہین۔ اور حضرت عمر فاروق فرماتے ہین کہ مین قرآن مجید کے حکم کو ایک عورت کی روایت سے چھوڑ نہین سکتا کہ جس کے اندر جھوٹ اور اور سچ دونون کا احتمال ہے۔ اسی طرح مسلم کی روایت ہے۔

ات ناسًا یحدثون من رسول اللہ صلی اللہ علیہ عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت مین لوگون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم قال عثمان لا ادری ماھی۔ وسلم کی حدیث بیان کی۔ آپ نے کہا مین اس حدیث کو قبول نہین کرتا۔

ذہبی نے اپنے تذکرۃ الحفاظ مین لکھا ہے کہ ابراہیم نخعی بیان کرتے ہین کہ حضرت عمر نے اپنی خلافت مین ابن مسعود ابو درداء ابومسعود انصاری کو اس جرم مین قید کیا تھا کہ انہون نے حدیث کی روایت کثرت سے کی تھی ۔ اس طرح ابن عتیبہ کا قول ہے کہ حضرت عمر نے ابی بن کعب کے پاس ایک جماعت بیٹھی ہوئی دیکھی۔ جس سے ابی بن کعب حدیث روایت کر رہے تھے حضرت عمر نے انپر کوڑا اٹھوایا ابی بن کعب نے کہا عمر۔ دیکھ خدا تجھ پر رحم فرمادے کیا کرتا ہے حضرت عمر نے فرمایا کہ روایت کرنا تیرے لئے فتنہ اور سننے والون کے لئے عذاب ہے ابوہریرہ سے لوگون نے پوچھا کہ کیا تم حضرت عمر کے زمانے مین بھی اسی طرح حدیثین بیان کرتے انہون نے کہا کہ میری درّے سے خبر لیجاتی۔

"نقاد"

بَابُ الْمُرَاسِلَةِ وَالْمُنَاظَرَةِ

قمر منزل، کوچہ عاقل خاں۔
دھلی ۲۱ مارچ ۳۳ء۔

مولانا المحترم والمکرم

اسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ایک مضمون ارسال خدمت ہے آپکو یہ شکایت تو ہوگی کہ کسی حد تک آپکو (MISREPRESENT) کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن امید ہے کہ یہ امر مضمون کی اشاعت میں مانع نہ ہوگا، دکھانا صرف یہ ہے کہ قدیم رسمی اسلام کے خلاف تعلیم یافتہ طبقہ میں جو جوش و خروش پھیل رہا ہے وہ دراصل تنگ خیال مولویوں اور کٹ ملاؤں کے ظلم و زیادتی کے خلاف رد عمل ہے۔ اور اس کے ذمہ دار تمام تر ملا صاحبان ہیں:۔

خاکسار فضل حمید

نیاز صاحب اور مولوی صاحبان

اللہ تعالیٰ نے مولویوں اور کٹ ملاؤں کو خلق کیا، اور مولویوں اور ملاؤں نے صدیوں کی [illegible] کوششوں اور جد و جہد کے بعد نیاز صاحب کو پیدا کیا، معاذ اللہ! ہم خلق و ابداع کی اعلیٰ صفات سے مولوی اور ملا صاحبان کو متصف کرنے کی جرأت نہیں کرتے، کہنا صرف یہ ہے کہ معنوی طور پر اپنی تخلیق کے لئے نیاز صاحب انہیں حضرات کے مرہون منت ہیں، اب خواہ وہ اس شرف کو تسلیم کریں یا اس سے انکار، ہمیں نیاز صاحب کی مذہبیات و الٰہیات سے چند اصولی اختلافات ہیں لیکن ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ نیاز صاحب اسلام کی ایک مفید اور عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس خدمت کا تعلق اسلام سے صرف "ملا نخیہ بزنار مولوی" کی دلچسپ شکل میں ہے، سینٹ پال اور انکی معنوی ذریات نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور خود بارگاہ خداوندی کے دار و غہ اور عرش کے جمعدار بن بیٹھے، اب اگر ان بزرگواروں کی کوئی مت [illegible] تو زیادہ عیسائی مذہب پر احسان نہیں کر رہا ہو گا عیسائیان۔ مولویوں نے کہا کہ سینما دیکھنا حرام [illegible] اکثر و بیشتر مولویوں نے کہا کہ امام احمد بن حنبل کے بعد کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا، نیاز صاحب نے کہا کہ ہر شخص اپنے میں پیغمبری کا امکان رکھتا ہے، مولویوں نے کہا کہ بلا واسطہ کوئی شخص خدا تک نہیں پہونچ سکتا، نیاز صاحب نے کہا کہ بلا واسطہ [illegible] پہنچنے کے [illegible] کوشش کرے تو خود خدا ہو سکتا ہے، مولویوں نے کہا کہ بغیر [illegible]

اعمال صالحہ کے کوئی فرد بشر بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا، نیاز صاحب نے کہا کہ بغیر معصیت لطیف، کے کوئی انسان نجات حاصل ہی نہیں کر سکتا - وقِس علٰے ھٰذا!

اگر ہم کسی معمولی انسان کو فرشتہ کہیں اور کوئی شخص ترکی بہ ترکی پر عمل کرکے اس کو شیطان کہہ دے تو بتایے کہ قصور کس کا ہے؟ مولویوں نے فروع کے منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، نیاز صاحب کو اصول میں بھی تامل ہوا کہ درست یا نہیں، مولویوں نے ہر موضوع حدیث کو خواہ وہ عقل و انصاف کے کتنے ہی خلاف ہو بلا نقد و نظر کے قرآن کی آیت کا درجہ دے دیا - نیاز صاحب سرے سے نفس حدیث ہی کے منکر ہو گئے، اب گلہ کس سے کیا جائے، نیاز صاحب سے یا تنگ خیال ملاؤں اور نفس پرست مولویوں سے؟ فطرت نے نیاز صاحب کو حق شناس دل عطا کیا تھا، خوف عقوبت و مواخذۂ حشر انکو ارتکاب معاصی سے باز نہیں رہ سکتا تھا، لیکن وہ طبع سلیم کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے، اُنکی ہدایت کے لئے انکی فطرت کا قانون کافی تھا، ان کے ضمیر کی روشنی انکو زندگی کے تیرہ و تار سفر میں مشعل کا کام دیتی تھی، وہ اس لئے بے راہرو نہیں ہوئے کہ انہیں منزل سے دور جا پڑنے کا ڈر تھا بلکہ اس لئے کہ وہ صراط مستقیم ہی کے ذریعہ سے مقصود کو پا سکتے تھے، اُنہوں نے اسی لئے حق پرستی نہیں کہ وہ جنت میں حور و قصور سے ہم آغوش ہوں، بلکہ اس لئے کہ حق آئینۂ حسن ہے اور حسن آئینۂ حق - لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ اُنہوں نے اپنے اوپر اہل دہر کا قیاس کر لیا، انکا طرز استدلال یہ ہے کہ کیونکہ وہ خود نیک ہیں اور بغیر تعزیری قانون کے سلامت روی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں لہذا تعزیری قانون کی عام انسانوں کو بھی ضرورت نہیں ہے -

ایک نیاز صاحب کے نیک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام ہندوستانی نیک ہیں اور تعزیرات ہند قابل منسوخی ہیں یا اگر نیاز صاحب اپنی ذات سے عورتوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں تو کیا صنف لطیف کو اپنے حقوق کے لئے جد و جہد چھوڑ دینی چاہیئے - یہ ہے ہماری رائے میں تفسیر اس تنازعہ کی جو مولانا نیاز فتحپوری، اور مولانا عبد الماجد بی - اے کے درمیان برپا ہے

(نگار) آپ کی تنقید جسے زیادہ اصطلاحی رنگ میں "تحقیق انیق" کہنا چاہیئے، یقیناً بڑی حد تک محل نظر تھی، اگر آپ کی مفسرانہ تحریر اس کے ساتھ نہ ہوتی، آپ نے خود تحریر فرمایا ہے کہ "کسی حد تک آپ کو (MISREPRESENT) کرنے کی کوشش کی گئی ہے" مدعا یہ کہ گرمیٔ سخن قایم رکھنے کے لئے آپ نے کہیں کہیں "تعبیرات غلط" سے کام لیا ہے، اور میرے مسلک کے ظاہر کرنے میں "انحراف و مبالغہ" بھی صرف فرمایا ہے ——— بہرحال مجھے آپ سے کیوں شکایت ہونے لگی، جب خود آپ نے اپنی تنقید کو اس طرح مضمحل بنا دیا اور جواب لکھنے کا بار بڑی حد تک میرے سر سے ہلکا کر دیا، تاہم چونکہ ذکر "مولوی" کا آگیا ہے، اس لئے میرے لئے ناممکن ہے کہ یونہی سرسری گزر جاؤں اور اپنے ہدایائے محبت "جمال سلمٰی" کے حضور میں پیش نہ کر دوں -

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا!

آپ نے ابتدا ہی میں یہ لکھ کر کہ " اللہ تعالیٰ نے مولویوں اور کٹ ملاؤں کو خلق کیا " حقیقتاً ایک اصولی بحث چھیڑ دی ہے اور گویا آپ نے ہر اُس شخص کو جو کچھ بھی "تاریخ طبعی" (NATURAL HISTRY) سے دلچسپی رکھتا ہے دعوت دی ہے کہ خدا کی اس

عجیب وغریب "مخلوق" کی تاریخ خلق وآفرینش اور مدارج ارتقار پر غور کرے، میں نے جہانتک غور کیا ہے "مولوی" کے عالم وجود میں آنے کے متعلق متعدد نظریّے قایم کئے جا سکتے ہیں، مثلاً:- یہ کہ اگر انسان واقعی مٹی سے بنا یا گیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے بعض افراد کسی کنکریلی مٹی سے بن گئے ہوں یا ایسی مٹی سے جس میں عفونت وگندگی پیدا ہوگئی تھی یا ضرورت سے زیادہ اس کا خمیر ہوگیا تھا ——— یا یہ کہ جس طرح امراض جسم خاص خاص جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح امراض روحانی کے لئے خدا اس جماعت کو مخصوص جراثیم پیدا کرنے کے لئے وجود میں لایا ہو ——— یا اگر ایک گستاخ فلسفی کے الفاظ میں "دنیا نام ہو صرف اس مفاہمت باہمی کا جو خدا اور شیطان کے درمیان کسی وقت ہوگئی تھی" تو پھر "مولوی" کو اگر "خدا کا ملز ورہیلو" نہ کہا جائے تو شیطان کا "روشن رُخ" کہنے میں کس کو تامل ہوسکتا ہے ——— اس باب میں زیادہ منطق صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے اُس مفاہمت اولین "کو سمجھ لیجئے کہ کیا ہوسکتی تھی۔ خدا کا منشار یہ تھا کہ کائنات میں سوائے امن وسکون کے کچھ نہ ہو، شیطان کا یہ کہنا تھا کہ سوائے "فتنہ وفساد" کے وہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں، آخر کار سمجھوتا یہ ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ ساتھ رکھا جائے اور مخلوقات کو ایک حد تک اختیار دیدیا جائے کہ وہ ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کریں۔ یا یہ کہ یزدانی واہرمنی دونوں قوتیں اپنے اپنے فرایض انجام دیں اور انسانی چشم وبینش کو ان میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کی فرصت دی جائے

میں بحث کے اس اسلوب سے ہٹ کر جب زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہوں اور تعلیمات الٰہی کو سامنے رکھتا ہوں تو مجھے اس وقت سے لیکر جب اول اول ابلیس نے انسان کی برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا، اور پھر بہکا کر "شجر ممنوع" کی طرف لے گیا تھا، اس وقت تک جتنے دور انسانیت پر فتنہ وفساد کے گذر چکے ہیں ان سب میں، انہیں حضرت کی جلوہ گری دیکھتا ہوں، البتہ فرق یہ ہے کہ زمانہ وماحول کے ساتھ اس کے "اسلوب" بدلتے رہے ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں سے اس کا ظہور ہوتا رہا۔ مثلاً اول اول جب انسان بے انتہا سادہ واقع ہوا تھا، تو ان حضرت نے بھی نہایت سادگی سے بغیر کسی اہتمام کے حوّا سے کہدیا کہ "یہ پھل کھالو" اونھوں نے کھا لیا اور آخر کار یہ پہلا انسانی جوڑا عدن سے نکالدیا گیا، ہرچند شیطان کی یہ پہلی اساس کامیابی تھی لیکن اس میں چند منٹ سے زیادہ صرف نہ ہوئے ہوں گے، اس کے بعد جب عقول انسانی میں ترقی ہوئی، اور علوم وفنون کا زمانہ آیا تو اس نے "مسند علم" پر بیٹھ کر، اپنے علم ہی کے ذریعہ سے برسوں کی عرقریزی سے لوگوں کو بہکایا، اور اب جو زمانہ اجتماعی طور پر کام کرنے کا آیا ہے، تو یہ انجمنیں بنا بنا کر گمراہ کرتا ہے ——— اگر آپ سورۂ اعراف کا دوسرا رکوع ملاحظہ فرمائیں گے تو اس کی مکمل تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی صحت سے آپ کو انکار نہ ہوسکے گا، ——— اسلئے میرے نزدیک اس کا تعلق نہ کسی مخصوص لباس ووضع سے ہے، نہ کسی مخصوص درس تعلیم سے، بلکہ اس کو صرف ہم اس کے کارناموں سے پہچانتے ہیں، اس کے اخلاق سے جانتے ہیں، اور اس کے اُن ارشادات وہدایات سے جن میں سوائے گمراہ کردینے کے اور صلاحیت موجود نہیں ہے ——— معاف فرمایئے ..... اگر میں اس جگہ بطور "دفع دخل" یہ واضح کردوں کہ میری مراد مولوی سے صرف وہ جماعت ہے جو صرف اپنے حرکات کے لحاظ سے "ذریات شیطان" کہلانے کی مستحق ہے، اس لئے اس میں

جس طرح مصر کا جامع ازہر، ہندوستان کا دیوبند شامل ہو سکتا ہے، اسی طرح علیگڈھ کی مسلم یونیورسٹی بھی خارج نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں وہ نفوس شامل سمجھے جائیں گے جو صحیح تعلیم اسلامی سے لوگوں کو منحرف کرتے ہیں، خواہ وہ عمامہ وقبا میں ظاہر ہوں یا کوٹ پتلون میں ——— اب یہ اور بات ہے کہ چونکہ انسان کو دھوکہ ہمیشہ عمامہ وقبا، عبا وجریب، تسبیح وحمائل ہی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے، اس لئے ہم مولوی کی صوری ومعنوی دونوں حیثیتوں کو کسی جماعت میں دیکھ کر ایک کلیہ بنانے پر مجبور ہوں۔

آپ "میری مذہبیات والہیات سے چند اصولی اختلاف" رکھنے کے باوجود بھی مجھے اسلام کی "مفید اور مہتم بالشان خدمت" انجام دینے والا سمجھتے ہیں ——— خیر میں اس باب میں کچھ نہیں کہتا، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر کسی مولوی نے جواب دینے کا قصد کیا تو آپ کے ان الفاظ کے ظاہری تضاد پر وہ اسی طرح ایک مکمل منطقی رسالہ لکھ ماریگا، جس طرح آمین بالجہر یا رفع یدین کے باب میں دفتر کے دفتر سیاہ کرکے رکھدیتا ہے، یا التحیات میں اونگلی نہ اٹھانے والے کی تکفیر میں کتاب کی کتاب تصنیف کر ڈالتا ہے۔

اس کے بعد آپ کے وہ "مغالطات" شروع ہوتے ہیں جن کی طرف آپ نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے، اس لئے مجھے تردید کرنے کی ضرورت نہیں ——— ابھی تو نہیں، لیکن اگر جنگ کی نوعیت یہی رہی تو ممکن ہے آیندہ کوئی ایسی ہستی بھی پیدا ہو جائے جو آپ کے "منسوبات" کے لحاظ سے اس تنقید کی مستحق ہو۔ اور اگر آپ برہم نہ ہوں تو میں اپنے دل کے اس خدشہ کو بھی ظاہر کردوں کہ "کہیں یہ خود سرکار ہی نہ ہوں" ۔ اگر یہ صحیح ہے تو اور کچھ سمجھائیے یا نہ سمجھائیے لیکن خدا کے لئے "اس معیت لطیف" کی تفسیر ضرور کر دیجئے کہ اس کے ذکر سے میرے "ضربات نبض" کا بھی شمار بڑھنے لگتا ہے۔

آپ نے ایک جگہ بہت زیادہ حسن ظن سے کام لیکر میرے نیک ہونے پر بھی حکم لگایا ہے، حالانکہ میری تمامتر تحقیق اس مسئلہ میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکی کہ "بد نہیں ہوں" ——— اگر بد نہ ہونے کا لازمی منطقی نتیجہ نیک ہونا ہے، تو ہم آپ دونوں مجبور ہیں اور کسی نہ کسی طرح اس نیکی کے "اتہام" کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا، ورنہ حقیقتاً میرا مسلک سامان واسباب کے لحاظ سے

شاہد وشعر ست وشراب وشکر

سے زیادہ کچھ نہیں اور غایت ونتیجہ کی حیثیت سے صرف

گرم شد مست شد وشاد شد

جس کے بعد صرف ایک ہی درجہ طے کرنے کو رہ جاتا ہے جسے "اللہ بس باقی ہوس" کہتے ہیں۔

اخیر میں سب سے زیادہ ستم آپ نے یہ کیا کہ میرا اور مولانا عبدالماجد بی۔ اے کا نام ایک ہی سانس میں لے لیا، حالانکہ مجھے اون سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، وہ عالم اجل، میں جاہل ازل۔ وہ طبیب، میں وکیل، ان کا یہ عالم کہ "کان اولاً فیلسوفاً ثم صار صوفیاً متوھباً" اور میں غریب آجتک یہی نہیں سمجھ سکا کہ فلسفی ہونے کے بعد جب انسان صوفی بنتا ہے تو وہ "وہابی صوفی" کیسے ہو جاتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حج کر آئے ہیں عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہو آئے ہیں، اور میں اس ارادہ میں حیدرآباد سے آگے نہیں بڑھ سکا، کم از کم آپ نے اسکا تو خیال کیا ہوتا :۔ مرد خدا، ایں چہ خدا دشمنی ست!

(۳)

خیرآباد - ۱۵ مئی سنہ ۳۰ء

محترمی! نگار آتشیں آیا مگر سادہ لوح بنکر صورت پکار اٹھی "پردۂ زنگاری" میں جلوہ گر رہنے والا آ گیا

لے آمدنت باعث آبادی ما

دکن کے متعلق جو کچھ لکھا اور جس طرح لکھا آپ کا حصہ ہے، ادائے بیان پر یہ خداداد قدرت کسی سحر کار نگار کے بس کی بات نہیں

"سرزمین دکن کی ایک دلنواز" یہ عنوان نہیں ختم ہو جانا چاہیئے تھا [illegible] شب کی مجھ حسرت نصیب کو اپنا اک شعر یاد آگیا

وہ رات مرنے کی ہے جو ہو بات مرنے کی — کلکتہ میں گذری نہ کوئی رات مرنے کی

کاش آپ کے ساتھ دکن ہی میں اک رات ایسی نصیب ہو جاتی، پیری شباب سے بدل جاتی، ایک بوتل میں سب کچھ ہو سکتا تھا ؎

یہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی — راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی (ریاضؔ)

جس دلنواز کا خیال ہے اُسے ہمارا حصہ ہونا چاہیئے تھا، سامعہ نوازی کے لئے بھی دلنوازی کے لئے بھی۔ ایک حد تک نگار نے تصویر

کھینچدی اس کی ضرورت نہ رہی ؎

ہماری آنکھوں میں آؤ تو ہم دکھائیں تمھیں — ادا تمھاری جو تم بھی کہو کہاں کچھ ہے (ریاضؔ)

ادائے بیان کی نوعیت نے تصور ہی میں سب سامان یاران دور افتادہ کے لئے مہیا کر دیا اور یہ کہنے کا موقع نہ رہا ؎

بھر بھر کے جام بزم میں چھلکائے جاتے ہیں — ہم اُن میں ہیں جو دور سے ترسائے جاتے ہیں (ریاضؔ)

حضور صدر المہام کا لطف صحبت بھی خزاں دیدہ ریاضؔ کو انگاروں پر لوٹا دینے والا ہے، جوانی کی طرح وہ راتیں بھی یاد آئیں جب

مہاراجہ بالقابہ صدر اعظم کے دولتکدہ پر آنجہانی سرشارؔ کو مہمان نوازی کی خدمت سپرد تھی۔ دکن میں آپ نے ہماری جگہ لی اور سرشارؔ کی جگہ

ہوشؔ نے، ہوشؔ کا نام لیتے ہی داغؔ کا شعر یاد آگیا۔

پھر دل قابو میں نہ میرا دل ناشاد آیا — وہ مزا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا

میں لکھنؤ گیا آپ دکن میں تھے امتیاز صاحب جیل میں، میں دونوں کے پاس تھا، مگر بنا ہر شباب رفتہ کی طرح دور یہ بھی سن لیجئے

کس ماحول میں کس طرح میری زندگی بسر ہو رہی ہے ؎

کٹ گئے دن بڑے بھلے اپنے — یہ بھی اتنی گذر ہی جائے گی (ریاضؔ)

ماہ مبارک کے آغاز میں کہا تھا ؎

بن کے مہماں ایک دن رندِ روزہ دار آنے کو ہے — شام ہونے کو ہے میرے گھر اُدھار آنے کو ہے (ریاضؔ)

۲۰ شوال کا مضمون شعر میں نہیں ادا ہو سکتا مگر یکم شوال کو کہنا پڑا تھا ؎

میکدے میں عید مجھ مفلس کی ہو جائے ریاضؔ — دے کے اک جام کوئی تیس روزوں کا ثواب (ریاضؔ)

۲۰ شوال کا مضمون نشر میں سننے، میں باہر نکھر رہا تھا، اندر سے پیام آیا ہسپتال کی دائی کو بلوا دیجئے، آدمی گیا دائی کے بدلے لیڈی ڈاکٹر آئی ایک گھنٹے کے بعد وہ بچی باہر نکلی۔ ڈبل فیس۔ یک نہ شد دو شد بھائی بہن توام مبارک، تانگے کا کرایہ بدقت دیا، اور فیس کیلئے جھوٹے وعدے کرنا پڑے، ۶

گرمی، تنگوں سے اور گھر میں بھونی بھانگ نہیں

بچوں کی تعداد بفضلہ ایک ڈیڑھ نصف درجن، مجھے دیکھئے میری عمر دیکھئے۔

اس شیخ کہن سال کی اللہ رے بزرگی جنت میں بھی یہ جاکے جواں ہو نہیں سکتا (ریاض)

میں خوش ہوں آپ دکن سے خوش آئے، مجھے بھی خوش رکھئے، مگر میں کیا خوش رہ سکتا ہوں جب متیاز جیل میں ہیں، گھر میں اور بچوں کو دعا کہیئے، آسی کو بہت بہت سلام، جلد آکر ملوں گا۔ ریاض

(نگار) آج آپ پہلے شخص ہیں جن کے منھ سے "واپسی دکن" کی مبارکباد سن رہا ہوں ——— ورنہ تو اور حسرت یہ ہے کہ مجھے ان "صورتوں" نے بھی نہ پوچھا، جو میرے نام بڑے بڑے "نامہائے فراق" بھیجا کرتی تھیں ——— اور (ظفر کی مسلسل غزل کی طرح) پوچھنا کیسا، بات تک نہ کی!

کوئی نگٹ کی اوٹ سے بھی نظر پھری ہوئی

اس کو آپ جو چاہے کہیئے لیکن میں تو اس کو اپنی مکانکی (MECHANIC) زندگی کا "منطقی نتیجہ" سمجھتا ہوں۔ یاد رکھیئے، کبھی کبھی مجھے اُن "نفوس سادہ" پر رشک آنے لگتا ہے، جو فردا کی امیدیں "امروز" کی "تلخ کامیاں" برداشت کر رہے ہیں ——— حور و قصور، کوثر و سلسبیل حقیقت کے لحاظ سے "طلسم ہوشربا" سہی، لیکن "رعنائی خیال" سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ میری بدنصیبی دیکھئے کہ زندگی کی کلفتوں میں تو سب کے ساتھ برابر کا شریک، لیکن راحت کے باب میں، مولویوں کی طرح "سراب" سے بھی فائدہ اٹھانا میری قسمت میں نہیں ——— اس ذکر سے یہ مقصود نہیں کہ آپ سمجھے بھی اس عالم میں بلائیں جہاں آپ کے رسائی دنیا زندگی بسر کر رہی ہے ——— "در چشم خیال تو جہاں محمل لیلیٰ" درست سہی لیکن اس کا کیا علاج کہ "محو لیلیٰ را بہ محمل کار نیست" ——— میں جس دور سے گذر رہا ہوں، وہ یہ ہے، یہ؟ "اصطلاحی لوگوں نے اس کو "اول تا آخر ہر منتہی" بھی کہا ہے ——— میں نے اس کا ابھی تک کوئی نام نہیں تجویز کیا، "کبریائی" کیسا رہے گا؟ مفہوم تو اس سے کچھ ادا ہو جاتا ہے گو پوری طرح نہیں۔ معاف فرمایئے کا جواب دے رہا تھا آپ کے تحت نامہ کا اور سامنے آ گئیں "ریاض شوخ پارسا"[۱] کی "پاک نیخواریاں"۔ "بہک جانے" کی کوشش میں، بہت سے گم شدہ حواس بھی واپس آ گئے۔ معلوم نہیں یہ آپ کی "کرامت" ہے یا میرا "معجزہ"

---

[۱] "شوخ و پارسا" حرف عطف کے ساتھ نہیں۔

آپ تو "اپنی" ہی سی کہیں گے!!

"سرزمین دکن کی ایک دلنواز — " کے بعد نہ شام کی ضرورت تھی نہ شب کی — درست ہے، مدعا یہ کہ "الزام" کو اور زیادہ سنگین بنادیا۔ آپ کو کیا خبر کہ اس مضمون کے ایک ایک لفظ کی "حساب فہمی" کس کس طرح ہوئی ہے —

خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

پہلا مصرعہ پڑھ کر مفہوم خود پیدا کرلیجئے —

غالب کہتا ہے :- نکتہ چیں ہے، غم دل اسکو سنائے نہ بنے — مرزا غریب تو "غم دل" اسی نکتہ چین کو سنا رہا تھا جسکا غم تھا، لیکن یہاں "غم دل" تھا اور کسی "اور" سے متعلق اس سے نکتہ چینی کی وسعت کا اندازہ فرمایئے — میں تو جواب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کیواسطے

کیونکہ مجھے کافر کہنے، اور سمجھنے میں اب کوئی استثناء باقی نہیں رہا

آپ فرماتے ہیں "جس دلنواز کا حال ہے، اسے ہمارا حصہ ہونا چاہیئے سامعہ نوازی کے لئے بھی، دلنوازی کے لئے بھی" — آمنا وصدقنا۔ سچ ہے جس کے لئے فطرت اس قدر فیاض ہو کہ اس کے عالم شیب میں بھی نتیجۂ دلنوازی "حیات توام" کی صورت میں ارزانی فرمائے۔ اس کو اس سے بھی زیادہ مطالبہ کا حق حاصل ہے — آپ کو اس سلسلہ میں اپنا وہ شعر یاد نہیں آیا جس کا دوسرا مصرعہ یہ ہے :- "لوگ دیکھیں تو کہیں عدہ وفا ہوتا ہے"

آپ کے لئے غالباً یہ امر اور زیادہ "انگار دل پر لٹا دینے والا" ہوگا کہ سر مہاراجہ بہادر شاد آپ کو ابھی تک بھولے نہیں ہیں اور جس وقت میں نے آپ کا ذکر کیا تو وہ تمام صحبتیں ان کو یاد آگئیں، جو سرشار کی معیت میں وہاں برپا ہوتی تھیں، مہاراجہ بہادر نے جس حسرت کے ساتھ آپ کا ذکر سنا، اس کی کیفیت ہنوز میرے دل میں باقی ہے۔ آپ کو یاد فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ "ریاض کو بلا یئے" میں نے عرض کیا کہ "پیر و مرشد بلانا کیسا، انکا تو لانا بھی دشوار ہے، تاہم میں سرکار کا یہ محبت بھرا پیام پہونچا دونگا ممکن ہے اس کی "حیات بخشی" ریاض کو پھر زندہ کرکے بارگاہ شاد تک پہونچادے" بہرحال میں اخیر جون میں پھر حیدرآباد جارہا ہوں۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو "دلے بر اندش" سے کام لوں۔

ہوش کے متعلق آپ "بھولنے والا" نہ کہئے — جو شخص اپنے آپ کو بھلادے، وہ دوسروں کو نہیں بھلا سکتا۔ آپ کے متعلق ان کا بھی وہی اصرار تھا، جو دنیا میں کسی "ریاض شناس" کا ہوسکتا ہے۔

"یک نہ شد دو شد" کے متعلق اب کیا عرض کروں، فطرت کی "غلط بخشیاں" دنیا کا نیا تجربہ نہیں، اگر آپ کے لئے اس میں کوئی مسرت نہیں، تو نہ ہو، قدرت تو آپ کی تکلیف سے مسرور ہوتی ہے۔ آپ ایسا متوکل اور "راضی برضا" قسم کا مسلمان کیا اس سے تسکین نہیں حاصل کرسکتا۔

امتیاز کا جیل چلا جانا باعث فخر و مسرت ہے نہ کہ موجب حزن و ملال، خدا سب کو اس کی توفیق دے۔ یہاں تک کہ آپکو بھی، تاکہ اس فرصت سے فائدہ اٹھاکر بیگم ریاض کو کم از کم یہ کہنے کا تو موقع آپ سے ہو کہ "میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو"

میں نے آپ کا خط بیگم نیاز کو دکھا کر اظہار افسوس کیا، تو اونھوں نے برجستگی کے ساتھ کہا کہ "کیوں گھبراتے ہو ریاض صاحب کو تو ابھی ایک بار بچہ ہوکر پھر دوبارہ عمر طبعی تک پہونچنا ہے" میں نے کہا اگر دوسری مرتبہ پھر اسی "دور تسلسل" کو اونھوں نے قائم کیا تو؟ ـــ بولیں کہ "ہونے دو، اس کی کیا فکر، کیونکہ اس وقت نہ ہم ہوں گے نہ آپ" ـــــ یہ تو خیر وہ لطایف ہیں، جو آپ کے سن و سال کے متعلق ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ڈاکٹر ورناف کو نہ خبر ہو جائے، اور وہ محض اپنی "علمی تفتیش" کی تکمیل کے لئے خیرآباد پہونچ جائے، وہ وقت یقیناً بہت سخت ہوگا، جب آپ کانوں پر ہاتھ دھر دھر کر "حقیقتوں" کا انکار کررہے ہوں گے اور وہ ہنس ہنس کر کہہ رہا ہوگا کہ "نہیں جناب یہ صرف آپ کا انکسار ہے" ـــــ بہرحال جس وقت ڈاکٹر ورناف وہاں پہونچے مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا، شاید کوئی مدد آپ کی کرسکوں۔

نیاز

اخبار الاندلس

یہ کتاب ترجمہ ہے اسکاٹ کی مشہور کتاب "ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ" کا، جسے مولوی خلیل الرحمن صاحب نے حد درجہ کاوش اور محنت کے اردو میں منتقل کیا ہے، مولوی صاحب موصوف اس سے قبل نفح الطیب و تاریخ الخلفاء وغیرہ کا بھی نہایت کامیاب ترجمہ کرچکے ہیں، اسکاٹ کی یہ کتاب سلطنت مور کی ایسی جامع و مکمل تاریخ ہے کہ مشکل سے کوئی کتاب اس موضوع پر ایسی مبسوط پیش کیجا سکتی ہے، حقیقت میں یہ کتاب تمدن عرب سے بھی زیادہ ضروری ہے، کاغذ کتابت و طباعت بہترین۔

قیمت جلد اول مجلد ۵ حصہ دوم مجلد ۳ حصہ سوم مجلد ۲ مکمل سٹ ۱۰

مولدین

امریکی فاضل مسٹر چارلس لی کی مشہور کتاب مورسکوز کا اردو ترجمہ، مولدین کی جلا وطنی ان کو بالجبر عیسائی بنایا جانا، اسلامی رسوم کو ادا کرنے کے جرم میں انکو سخت سزائیں دیا جانا، اور زندہ جلایا جانا، ماؤں کی گود سے شیر خوار بچوں کو چھین کر عیسائی بنایا جانا، مسلم خواتین کی عصمت دری، مسلمانوں کو سور کا گوشت کھانے اور شراب پینے پر مجبور کیا جانا۔ ان کا بار قتل عام، غرضکہ مسلمانوں کی اس قسم کی اور دردانگیز مصیبتوں کا تذکرہ ہے، اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے، قیمت غیر مجلد مجلد ۲

"منیجر نگار لکھنو"

باب الاستفسار

بائبل اور قرآن

(مولوی عطا کریم صاحب - رنگون)

"مین اس جوار مین مناظرہ کرنے والے کی حیثیت سے رہتا ہون اور مناظرہ بھی زیادہ تر عیسائیون سے ہوتا ہے لیکن مذہبی مناظرون کے سلسلہ مین، جس وقت سوال کسی کتاب کے الہامی یا غیر الہامی ہونے کا سامنے آتا ہے تو اسکا یقین کرنا یا کسی اور کو یقین دلانا کہ صرف ایک ہی الہامی کتاب غیر محرف ہے، بہت دشوار ہو جاتا ہے ـــ زبور، توریت، انجیل، اور اخیر مین قرآن شریف، ان سب کو الہامی کلام بتایا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اول الذکر تینون محرف ہو چکی ہین اور قرآن شریف اپنے حال پر قایم ہے۔ اس دعوی کے ثبوت مین، تاریخ جمع قرآن یقیناً بڑی زبردست چیز ہے، لیکن اسے کون مانتا ہے' سوال پیدا ہوتا ہے صرف تعلیمات اخلاق کا اور یہان آکر تمام کتابین متفق و متحد ہو جاتی ہین۔ اس لئے مین بہت ممنون ہونگا اگر آپ بائبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائین کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور کن اسباب کی بنا پر ہم اسے یقینی طور پر محرف کہہ سکتے ہین"

(**نگار**) دنیا مین میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہین ہو سکتا کہ مین کسی "دماغی تربیت" پر اس کے "پیشہ ور" ہونے کی حیثیت سے نگاہ ڈالون۔ مین اس کو پسند کرتا ہون کہ ایک شخص جسمانی ورزش مین تکمیل حاصل کرکے، زنجیر توڑ ڈالے، اپنے سینہ سے وزنی گاڑیان گزر جانے دے، اور اس طرح اپنی قوت کا ہر ممکن مظاہرہ کرکے رزق حاصل کرے، لیکن مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے جب مین یہ دیکھتا ہون کہ ایک شاعر شعر کہتا ہے اس لئے کہ اسے انعام ملے، ایک مولوی واعظ کہتا ہے اس لئے کہ اسباب معیشت فراہم کرے، یا ایک مبلغ تبلیغ مذہب کرتا ہے اس امید پر کہ اس کی ہم مذہب جماعت اس کی روزی کی کفیل ہو۔ یقیناً فی نفسہ شعر کہنا، وعظ و پند کرنا، اخلاق کی تعلیم دینا، نہایت پاکیزہ مشغلہ ہے، لیکن جہان اسنے پیشہ کی صورت اختیار کی اسکی پاکیزگی خاک مین ملی دماغ کا مشغلۂ انعطافی (Sentimental Engagement) ایک نوع کی روحانیت ہے، جس کو مادیت کا ادنی سا لگاؤ بھی داغدار بنا دیتا ہے اور اثرات سے یکسر اجنبی و معرّا

اس لئے مجھے آپ سے ایک پیشہ ور مناظر ہونے کے لحاظ سے تو کوئی ہمدردی نہین ہو سکتی، خصوصاً اس زمانہ مین جبکہ "مناظرہ و تبلیغ" دونون انسانی ترقی اور دنیاوی امن و سکون کے لئے سخت مضرت رسان ثابت ہو رہے ہین، لیکن اس خیال سے

کہ آپ کا استفسار ایک اصولی و علمی بحث کی طرف منجر ہوتا ہے، چند باتین عرض کر دینا نامناسب نہین سمجھتا، بشرطیکہ آپ ان کو اپنا آلۂ کار نہ بنائین اور اس مسئلہ پر آپ خود بھی صرف علمی حیثیت سے غور کرین۔

دنیا مین اس وقت تک کتنی کتابین وجود مین آچکی ہین، جنھین الہامی کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب دینا محال ہے، لیکن اس سوال کو اگر محدود کر دیا جائے اور صرف یہ دریافت کیا جائے کہ تعلیم مذہب و اخلاق کے متعلق کتنے الہامی صحائف نازل ہوئے، تو بیشک اس کا ایک جواب ہو سکتا ہے اور چند ایسی کتابون کے نام بتائے جا سکتے ہین، جنھون نے عہد تاریخ مین کوئی نہ کوئی یادگار اپنی کامیابی کی چھوڑی ہی۔ وہ توریت ہو یا انجیل، ژند ہو یا تالمود اپنی تعلیمی عظمت کے لحاظ سے وہی درجہ رکھتی ہے جو ایک مسلمان کے نزدیک قرآن کو حاصل ہے۔ لیکن آثاری حیثیت سے یعنی اس حیثیت سے کہ بحالت موجودہ ایک الہامی کتاب اپنی اصلی حالت پر قائم ہے یا نہین، بیشک گفتگو ہو سکتی ہے چونکہ اس وقت صرف بائبل کا ذکر ہے اس لئے مین بتا دینا چاہتا ہون کہ اس کی تحریف کے اسقدر ثبوت فراہم ہو سکتے ہین کہ مشکل ہی سے کسی دوسری الہامی کتاب کی تحریف مین پیش ہو سکتے ہین۔

بائبل (Bible) دو حصون پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جسے اولڈ ٹسٹامنٹ (Old Testament) یا عہد قدیم کہتے ہین اور دوسرا وہ جو نیو ٹسٹامنٹ (New Testament) یا عہد جدید کے نام سے موسوم ہے۔ لفظ بائبل (Bible) یونانی لفظ جمع ہے جس کے معنی کتُب یا کتابون کے ہین۔ لیکن لفظ بائبل کا اطلاق ان دونون کے مجموعون پر تیرھوین صدی مین رائج ہوا ہے اور مسیح کے ۴۰۰ سال بعد تک لوگ اس نام سے بالکل ناواقف تھے اور نیو ٹسٹامنٹ کے لکھنے والے یا ترتیب دینے والے عہد قدیم کے مجموعہ کو یونانی عیسائی پہلے اولڈ کنونٹ (Old Covenant) کہتے تھے، پھر لاطینی بولنے والے عیسائیون نے اس کا ترجمہ کر کے اولڈ ٹسٹامنٹ (Old Testament) کر دیا اور بعض نے ان کو صرف اسکرپچرز (Scripturae) کے نام سے موسوم کیا۔

عہد مسیح مین صحیفۂ عہد قدیم جسے توریت کہنا چاہئے دو صورتون اور دو زبانون مین پایا جاتا تھا یعنی ایک مجموعہ اہل فلسطین کا مرتب کیا ہوا جو عبرانی زبان مین تھا اور دوسرا اہل اسکندریہ کا ترتیب دیا ہوا جو یونانی زبان مین تھا۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ ارامی زبان مین ہوا جو اُس وقت کے فلسطینی یہود کی عام زبان تھی۔ پھر عہد وسطیٰ مین لاطینی مین منتقل ہوا اور سنہ ۱۳۸۲ کے قریب لاطینی زبان سے انگریزی مین آیا۔

عبرانی زبان عہد مسیح مین بھی مردہ ہو چکی تھی اور اس کے جاننے والے بہت کم رہ گئے تھے۔ خود مسیح کی زبان ارامی تھی جسے عبرانی سے وہی نسبت حاصل تھی جو انگریزی کو جرمن سے یا موجودہ اٹلی کی زبان کو لاطینی سے ہے۔ اس لئے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توریت کہان سے آئی، کس نے اس کو لکھا اور کس زمانہ مین۔ لیکن ان سوالون کا کوئی جواب نہین دیا جا سکتا اور باوجود مغرب کی تحقیق بلیغ کے یہ مسئلہ ہنوز تاریکی مین ہے۔ مین اس وقت تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالنے کے لئے طیار نہین اور نہ باب الاستفسار مین اسقدر گنجائش ہے، ورنہ تحقیق السنۂ قدیمہ کے سلسلہ مین جو جدید ترین معلومات حاصل ہوئی ہین

اُن کو سامنے رکھ کر بہ آسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ موجودہ توریت کو مطلقاً موسیٰ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور بنی اسرائیل کے پاس بابل مین قید ہونے سے قبل کوئی الہامی کتاب یا تحریر موجود نہ تھی۔

جب بنی اسرائیل کو سارغون (شاہ اسیریا) نے ۷۲۲ء قبل مسیح مین مفتوح و مغلوب کیا اور ان کی جگہ مستعمرین آسیریا نے لیلی جو در اصل بابل و ایران کے باشندے تھے تو یہودیون کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھون نے کالدیا، بابل، ایران، میدیا سیریا اور مصر کی قدیم روایات کو اُن کی زبان سے سنا اور انھین کا مجموعہ بعد کو توریت کہلایا۔ چنانچہ آپ دیکھین گے کہ توراۃ حقیقتاً ایک کشکول کی سی حیثیت رکھتی ہے جس مین رزمیہ نظمین، عاشقانہ غزلین، روایات و امثال، قصص و مواعظ، افسانہ و تمثیل، سبھی کچھ موجود ہے۔ تاریخ کا حصہ اس مین بہت کم ہے اور جو ہے بھی وہ بھی بالکل ساقط الاعتبار، میرا ارادہ نہین ہے کہ زیادہ تفصیل سے کام لون، لیکن بات مین بات بڑھتی جاتی ہے اور مین مجبور ہون کہ اپنے دعوی کے ثبوت مین کچھ دلایل بھی پیش کرون۔ مین نے ابھی عرض کیا کہ تاریخی حیثیت سے بائبل مین جو کچھ نظر آتا ہے وہ قابل اعتبار نہین اور اس کا تعلق بھی بالکل خرافیات سے ہے۔ اس کے ثبوت مین مثلاً آپ صرف یونس نوح اور موسیٰ کے واقعات کو لے لیجئے۔

بائبل مین یہ واقعہ یون درج ہے کہ "نینوا جاتے ہوئے یونس طوفان سے گھر گئے لیکن خدا نہین چاہتا تھا کہ وہ طوفان مین غرق ہون، اس لئے خدا نے ایک مچھلی کو حکم دیا کہ وہ یونس کو نگل لے اور یونس تین دن تین رات اس کے پیٹ مین رہے"۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت قبل یونانیون مین ایک روایت انکے دیوتا ہرقلس (Hercules) کے متعلق بھی یہی پائی جاتی تھی کہ "ہرقلس کو جاپا کے قریب ایک مچھلی نے نگل لیا اور تین دن تین رات وہ اس کے پیٹ مین رہا"۔ بالکل اسی طرح کی ایک روایت سوما دیو بھٹا مین پائی جاتی ہے فرق یہ ہے کہ بجائے یونس کے اس مین سکتی دیو اکا نام پایا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ کوئی اہمیت نہین رکھتا بلکہ یہ صرف ایک روایت ہے جو ایام قدیم سے چلی آرہی تھی اور جسے توراۃ مین بھی جگہ دیدی گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت کی حقیقت کیا ہے، سو میرے نزدیک یہ تعبیرات ہین اور ایک مخصوص رنگ کی انشا، مین طلوع و غروب کے منظر اور کسوف کی کیفیت کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

یونس معرب ہے (Jonah) کا اور ایام قدیم کی بعض اقوام مین سورج کو جوناہ کہتے تھے (Basque) مین آفتاب کو جونا، جون، جوانا کہتے تھے اقوام تراجن مین بھی آفتاب کو جونا کہتے تھے اور اہل ایران جوناہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اہل اسکنڈ نیویا بھی آفتاب کو جان کے نام سے پکارتے تھے یونانیون کے یہان ہرقلس آفتاب ہی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور پولی نیشیا کے علم الاصنام مین مچھلی بولکر زمین مراد لیتے تھے۔ اس بیان سے غالباً یہ امر واضح ہوگیا ہوگا کہ واقعۂ یونس سے حقیقتاً کیا مراد تھی اور لوگون نے کیونکر غلطی سے اسے تاریخی واقعہ سمجھ لیا

یہی حال طوفان نوح کے قصہ کا ہے کہ اس کو تاریخی حقیقت مخصوص بہ نوح سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ روایت بھی بابلیون یا کلدانیون سے بنی اسرائیل مین منتقل ہوئی۔ نینوا کے کھنڈرون سے جو نقوش برآمد ہوئے ہین ان سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان

کا قصہ اہل بابل میں مسیح سے ۲۵۰۰ سال قبل رائج تھا

موسیٰ کی پیدائش، ان کے دریا میں بہا دیئے جانے اور ان کے معجزات کا حال سب کو معلوم ہے لیکن یہ تمام روایات موسیٰ سے بہت قبل جون کی توں دنیا میں رائج تھیں۔ شمال بابل میں اکاد کے لوگ قصہ بیان کیا کرتے تھے کہ انکا بادشاہ شارغون اول (۲۵۰۰ سال قبل مسیح) کس طرح پانی کے اندر رہتا ہوا پایا گیا تھا، اور کیونکہ اس کی ماں نے ٹوکری کے اندر ڈال کر اس کی پیدائش چھپانے کے لئے دریا میں ڈالدیا تھا۔ عصائے موسیٰ کی طرح، آرفیس کے پاس بھی ایک عصا پایا جاتا تھا

الغرض بائبل کے واقعات تاریخی، کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور اس بنا پر اُن کی نسبت یہ کہنا کہ الہامی ہیں درست نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ایک ثبوت موجودہ بائبل کے غیر الہامی ہونے کا یہ ہے کہ وہ مجموعۂ اضداد بھی ہے اور الہامی کتاب میں یہ نقص ہرگز نہیں پایا جاسکتا۔ میں چند مثالوں سے تضاد کی حقیقت کو یہاں واضح کئے دیتا ہوں۔

بائبل اپنے مفہوم کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہے۔ ایک متعلق بہ الہیات، دوسرا اخلاقی نصائح کا، تیسرا واقعات تاریخی کا اور چوتھا عقاید و اصول مذہب کا۔ سو آپ اس میں سے جس حصہ کو لیں گے اُسے اضداد سے معمور پائیں گے۔ ہر تقسیم کے متعلق چند مثالیں اس کی پیش کیجاتی ہیں۔

الہیات

خدا کو آرام کی ضرورت ہے اور تھک جاتا ہے اسکا ذکر ذیل کی آیتوں میں ہے (jer. XV. 6.) (Ex. XXXI 17.) (Is. XXXI. 24)	خدا نہ تھکتا ہے نہ آرام کرتا ہے اسکا ذکر ذیل کی آیتوں میں ہے:- (Is. XL. 28)
خدا منصف ہے اور غیر طرفدار (Deut. XXXIII. 4) (Ps. XCII. 15)	خدا غیر منصف ہے اور طرفدار (Ex. XX. 5)
خدا ان کو ملتا ہے جو اسکی تلاش کرتے ہیں (Prov. VIII. 17)	خدا ان کو نہیں ملتا جو اسکی تلاش کرتے ہیں (Ps XVIII. 41) - (Is. I. 15.)
خدا رحمان و رحیم ہے (james. V. 11.)	خدا ظالم بے رحم، تباہکار اور خونخوار ہے (I Sam. VI. 19.)
خدا جھوٹ نہیں بولتا (Num. 10)	خدا جھوٹ بولتا ہے (I Kings. XX. 11.23)

	صرف ایک خدا ہے (1, Cor. VIII. 4)	خدا ایک سے زاید ہے (1 John V. 7.)
اخلاقی نصائح	چوری و قزاقی ممنوع ہے (Ex. XX. 15) (Lev. XIX. 13)	چوری و قزاقی جائز ہے (Ex. XII. 35, 36) (Ex. III. 21, 22)
	جھوٹ بولنا ناجائز ہے (Prov. XII. 22) (Ex. XX. 16)	جھوٹ بولنا مباح ہے (James II. 25) (1 Sam. XVI. 1, 2)
	قتل کرنا بُرا ہے (Ex. XX. 13)	قتل کرنا درست ہے (2 Kings. XX. 11, 30) (Ex. XXXII. 27)
	زنا ناجائز ہے (Ex. XX. 14.)	زنا درست ہے (Hosea I 2, III. 1, 2, 3) (Num. XXXI, 18)
واقعات تاریخی	یوسف کے باپ کا نام یعقوب تھا (Matt. I. 16)	یوسف کے باپ کا نام ہیلی تھا (Luke. III, 23.)
	مسیح عالم شیرخوارگی مین مصر لیجائے گئے (Matt. II. 14, 15, 19, 21, 23.)	مسیح عالم شیرخوارگی مین مصر نہین لیجائے گئے (Luke. II 22. 39)
	مسیح کو تیسرے گھنٹہ مین سولی دیگئی (Matt. XV. 25)	مسیح کو چھٹے گھنٹے تک سولی نہین دی گئی (John. XIX, 14, 15)
	یہودا پھانسی لگا کر مر گیا (Matt. XXVII. 5)	یہودا کسی اور طریق سے مرا (Act. I. 18.)

مسیح تین دن تین رات قبر مین رہے (Matt. XII. 40)	مسیح دو دن دو رات قبر مین رہے (Mark. XV. 25, 42, 44, 45, 46 & XVI. 9)
ابراہیم کنعان کی طرف گئے (Gen. XII. 5.)	ابراہیم معلوم نہین کہان گئے (Heb. XI. 8)
ابراہیم کے دو بیٹے تھے (Gal. IV. 22.)	ابراہیم کا صرف ایک بیٹا تھا (Heb. XI. 17).
میکائیل کے کوئی بچہ نہ تھا (2. Sam. VI. 23)	میکائیل کے پانچ بچے تھے (2 Sam. XXI. 8.)
اعتقادات مسیح قادر مطلق ہے (Matt. XXVIII. 18.)	مسیح قادر مطلق نہ تھا (Mark. VI. 5.)
مسیح کا پیام امن وسکون تھا (Luke II. 13, 4.)	مسیح کا پیام امن وسکون نہ تھا (Matt. X. 34).
بچون کو اُن والدین کے گناہونکی سزا ملتی ہے (Ex. XX. 5)	.... سزا نہین ملتی (Ezek. XVIII. 20) (Deut. XXIV. 16.)
مردے حشر مین اٹھین گے (1 Cor. XV. 52)	مردے حشر مین نہین اٹھین گے (Job. VII. 9.)

یہ ہے نہایت ہی مختصر اقتباس اُن آیات کا جن سے بائبل کا مجموعۂ تضاد ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کامل استقصار سے پوری ایک کتاب طیار ہوسکتی ہے۔ مین نے بخیال طوالت آیات کو بھی نہین درج کیا بلکہ صرف انکا حوالہ دیدیا ہے تاکہ ہر شخص آسانی سے نکال کے خود مطالعہ کرسکے

اس لئے بحالت موجودہ انجیل کو قرآن کے مقابلہ مین رکھنا کسی طرح درست نہین ہو سکتا، کیونکہ نہ کلام مجید مین کسی جگہ تضاد ہے اور نہ اس کی اخلاقی و روحانی تعلیم مین کوئی نقص پیدا ہو سکتا ہے، رہا کلام مجید کا وہ حصہ جس مین روایات و قصص پائے جاتے ہین، اُن کے متعلق مین فی الحال صرف اسقدر عرض کرونگا کہ اگر غور سے انکا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ بھی حشو و زوائد سے پاک ہین اور اُن کو اس صورت سے پیش نہین کیا گیا کہ اُن سے کوئی تاریخی حقیقت ثابت کیجائے۔ اگر کبھی ضرورت ہوئی تو تفصیل سے اس مسئلہ پر لکھونگا۔ فی الحال انھین چند صفحات پر اکتفا کرتا ہون۔

محلّہ کی رونق

مہرزمانی بیگم، اُس زمانہ کی خاتون تھین، جب عورت کو تعلیم تو نہین دیجاتی تھی، لیکن اس کی تربیت اتنی ہوجاتی تھی کہ خدا کی پناہ! یعنی یہ کہ وہ غلطیان کرکرکے، نقصان اُٹھا اُٹھاکر تجربات حاصل کرنے کے لئے، حوادث واتفاقات کے رحم پر چھوڑ دیجاتی تھی اور آخر کار، سن ڈھلتے ڈھلتے وہ سارے خاندان کے لئے ایک "تلخ حقیقت" اور "ناگزیر مصیبت" ہوکر رہجاتی تھی۔

مہرزمانی بیگم نے چونکہ دنیا مین بہت زیادہ غلطیان کی تھین، اس لئے وہ بہت زیادہ تجربہ کار تھین اور اسی نسبت سے "بے پناہ" ——— جسوقت وہ صبح کو بیدار ہوتین اور پوری قوت کے ساتھ دروازہ کو کھولتی ہوئی، اپنی "ابعادِ ثلثہ" رکھنے والی بھاری، بلند، چوڑی اور کرخت آواز سے خادمہ کو پکارتی ہوئی نکلیتں، تو گھر کا ہر فرد اپنی جگہ گھبراکر اُٹھ بیٹھتا، گویا "اسرافیل" نے کہین قریب ہی کی گلی سے صور پھونکنا شروع کردیا ہے، اور چونکہ بدقسمتی سے وہ تہجد گزار بھی تھین اور سوتی بھی تھین ہمیشہ بارہ کے بعد، اس لئے انکا وجود تمام گھر کے لئے ایک ایسا فتنہ تھا، جو رات دن مین بیس گھنٹے بیدار رہتا تھا اور صرف چار گھنٹے "محوِ خواب" ——— اور "محوِ خواب" بھی کیا صرف "بستر آشنا" کہئے، کیونکہ جب وہ سوجاتی تھین تو اُن کے "خراٹے" جاگ اُٹھتے تھے، جو خود اک مستقل عذاب کی صورت رکھتے تھے۔

مہرزمانی بیگم کا صبح کو اُٹھتے ہی، سب سے پہلے خادمہ (گلشن) کو اپنی خزان رسیدہ اور بھیانک آواز سے پکارنا، گویا "بگل" کی آواز تھی کہ اس کے بعد کسی کا بستر پر پڑے رہنا، اپنے آپ کو "مارشل لا" کی گرفت مین دیدینا تھا۔

مہرزمانی بیگم کی زندگی کی تمام وہ کیفیات، جنھون نے زمانہ کو بے کیف بنا رکھا تھا منحصر تھین صرف ان دو باتون پر کہ اول تو وہ کسی وقت چُپ ہوجانا گناہ سمجھتی تھین اور دوسرے یہ کہ صحیح معنی مین وہ اُس حوّا کی بیٹی تھین جس نے اپنی ضد اور زعم فراست پر جنت ایسی چیز کو ٹھکرادینے مین باک نہ کیا ——— خدا جانے کس نے اُن کو یقین دلا دیا تھا کہ زبان اگر ہر وقت جنبش نہ کرتی رہے تو مفلوج ہوجاتی ہے اور اگر بغیر عیب نکالے ہوئے کسی بات کو مان لیا جائے تو دماغ خراب ہوجاتا ہے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ الزامی اور جواب طلب ہوا کرتی تھی لیکن زبان کی تیزی کا کیا علاج کہ اُن کی ایک بات کا جواب دینے سے پہلے، دوسری بات کا جواب انسان پر عاید ہوجاتا تھا اور آخر کار وہ کسی کا بھی جواب نہ دے سکتا تھا۔ اور بیگم صاحب اس کو اپنے الزامات کی صحت کی دلیل اور زجر و توبیخ کے لئے سند سمجھتی تھین۔

کچھ عرصہ سے یہ بیوہ تھین اور ممکن ہے یہ اطلاع درست ہو کہ اس قبل از وقت بیوگی کی ذمہ دار بہت کچھ وہ خود تھین ——— مرزا فریدون قدر یون بھی فطرتاً نہایت نیک نفس، بے زبان صلح کل اور متواضع انسان تھے اور اگر مہرزمانی بیگم کی جگہ ان کی بیوی کوئی اور ہوتی تو بھی وہ "نمک خوار" ہی قسم کے شوہر ثابت ہوتے، مگر انھون نے تو ان کو کچھ ایسا "خاکسار"

و" فدوی" بنا دیا تھا کہ... تصوف کے تمام منازل جلد جلد طے ہونا شروع ہوگئے، یہانتک کہ " فنا فی اللہ" کی منزل تک پہونچنے مین بھی انھین زیادہ عرصہ نہ لگا۔ انھون نے اپنے بعد ایک جوان لڑکا برجیس قدر چھوڑا اور دو لڑکیان جن مین سے بڑی کی عمر ۱۶ سال کی اور چھوٹی کی ۱۰ سال کی تھی برجیس قدر کی شادی ہو چکی تھی اس لئے بہو بھی گھر مین موجود تھی اور اس طرح علاوہ دو خادمون اور تین خادمہ عورتون کے، مہرزمانی بیگم کے دائرۂ حکومت مین چار نفوس اور بھی شامل تھے۔

اولاد نے تو خیر، اسی استبدادی حکومت مین نشوونما پایا تھا اور ابتدا ہی سے وہ اس کے عادی ہو چکے تھے، لیکن بہو کے لئے ضرور یہان کی غلامی بہت تکلیف دہ تھی۔ مگر جب وہ اپنے شوہر کو اسدرجہ ناچار و مجبور پاتی تھی تو اُسے کبھی منہ کھولنے کی جرات نہ ہوتی تھی اور دل ہی دل مین گھٹ کر رہجاتی تھی ایک دن اسنے ہمت کرکے شوہر سے اپنے ساس کے مظالم کی داستان جستہ جستہ دُہرائی، تو وہ سنکر باہر چلے گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ راضیہ تعلیم یافتہ تھی اور خوشحال گھرانے کی، اس لئے مادی و روحانی دونون جذبات کے لحاظ سے اس کو سسرال مین اذیت پہونچتی تھی، مگر چونکہ ہندوستان کی لڑکی تھی، اس لئے اندر ہی اندر گھلنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی —— خیر، ہمیں کوئی فسانہ تو لکھنا نہین کہ جزئیات سے بحث کرین، بلکہ مقصود صرف مہرزمانی بیگم کا کیرکٹر دکھانا ہے، اس لئے اور تمام جھگڑون کو چھوڑ کر فی الحال اُن کی زندگی کا صرف ایک دن پیش کرنے پر اکتفا کیجاتی ہے۔

۷ر جون کی صبح کو—— ان کے یہان گرمیون مین صبح ہمیشہ ۳ بجے رات کو ہو جاتی تھی اور جاڑون مین انتہائی رعایت کے ساتھ ۵ بجے، گویا طلوع آفتاب سے تین گھنٹے قبل کوّون کے ساتھ ہی ان کی " کائین کائین" کا بھی شروع ہو جانا لازم تھا —— ہان، تو ۷ر جون کی صبح کو جب وہ بیدار ہوئین اور حسب معمول گلشن کو آواز دی، تو گھر مین بالکل خاموشی طاری تھی۔ قاعدہ تھا کہ اُن کی پہلی گھن گرج آواز پر گلشن دوڑ پڑتی تھی اور سارے گھر مین آثار حیات پیدا ہو جاتے تھے۔ لیکن رات کو چونکہ گلشن کو بخار آ گیا تھا اس لئے صبح کو اس کی آنکھ نہین کھلی، بیگم صاحبہ کے نزدیک دنیا میں اس سے زیادہ کوئی قصور نہین ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کو پکارین اور پہلی آواز پر دوڑتا ہوا نہ آئے۔ اس سکوت پر اُن کے غصہ کا پارہ دفعتاً اسقدر چڑھ گیا کہ بیتاب ہو کر، گالیان دیتی ہوئی گلشن کی کوٹھری کی طرف دوڑ پڑین۔ سوء اتفاق دیکھئے کہ شام کو دروازہ کے سامنے سے اسٹول ہٹانا کسی کو یاد نہ رہا اس لئے بیگم صاحبہ جو گھبرا کر باہر نکلین تو انکا کلی دار پائنچہ اس سے الجھ گیا اور وہ بُری طرح منہ کے بل فرش پر گرین —— بیگم صاحبہ چونکہ قد و قامت مین، لندھور بن سعدان کی بہن تھین اس لئے اس دھماکے سے نہ صرف انکا سارا گھر بلکہ آس پاس کے بھی دو چار گھر چونک پڑے کہ یہ تین بجے رات کو دفعتاً کس کی سلامی سر ہونے لگی —— پہلے تو بیگم صاحب نے گرتے ہی شور مچانے کا ارادہ کیا، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ سب لوگ دوڑتے ہوئے آرہے ہین، تو انھون نے اس واقعہ کو زیادہ سنگین بنانے کے لئے بیہوش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ یہ وقت بھی، عجیب وقت تھا کہ بہو، صاحبزادے، صاحبزادیان اور تینون کنیزین پوری قوت کے ساتھ بیگم صاحب کے بے حس و حرکت جسم کو اُٹھانا چاہتی تھین اور انکا جاندار لاشہ کسی طرح جنبش مین نہ آتا تھا آخر کار یہ رائے قرار پائی کہ وہین فرش پر قالین بچھا کر بیگم صاحب کو سرکا کے لٹا دینا مناسب ہے، بیگم صاحب کے کانون مین جو یہ

بھنک پڑی تو انھون نے اپنی غشی کو ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا اور جس طرح وہ بیہوش ہوئی تھین، اسی طرح وہ ہوش مین بھی آنے لگین، پہلے آہستہ آہستہ ہونٹون مین لرزش پیدا کی اور لبون پر جنبش پھر نہایت ضعف کے ساتھ ہات کو ایک طرف ڈھلکا دیا اور تھوڑی دیر مین آنکھین کھولکر اس طرح دیکھنے لگین، گویا کسی اور عالم سے ابھی ابھی تشریف لائی ہین۔ ہرچند اُن کے ہوش مین آجانے سے سب کو اطمینان ہوا، لیکن اسی کے ساتھ اس خیال سے جسم پر لرزہ بھی طاری تھا کہ اسٹول سے ٹکرا کر گر جانے کی خطا مین دیکھئے کس کس کو مجرم قرار دیا جاتا ہے اور کیا سزا تجویز ہوتی ہے۔ صاحبزادہ تو خیر حکیم کے بلانے کے بہانہ سے باہر چلے گئے، لڑکیان اُن کو اُٹھانے اور بہو بستر درست کرنے مین مصروف ہوگئی، ایک گلشن ہی سامنے رہگئی تھی، سو بیگم صاحب نے قرعۂ فال اسی غریب کے نام نکالکر جو گالیون کی بوچھار شروع کی تو ایک منٹ مین بدحواس کر دیا اور اُٹھتے اُٹھتے اس کے سر کے بال پکڑ کر اس طرح جھنجوڑ ڈالا گویا پھلیندے بکھار رہی تھین۔ بیگم صاحب صرف اس ایک سوال کا جواب اُس سے چاہتی تھین کہ "اسٹول کس نے رکھا" اور گلشن یہی کہتی جاتی تھی کہ "سرکار مجھے خبر نہین"۔ بیگم کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی، مصنوعی غشی کے مصنوعی اثرات رفع کرنے کے بعد انکا غصہ پورے جلال کے ساتھ بھڑک رہا تھا اور ہر شخص اپنی جگہ کانپ رہا تھا کہ دیکھئے آج کیا ہوتا ہے۔ حقیقتاً اسٹول ان کی بہو لائی تھین اور اسپر چڑھکر طاق سے کوئی چیز اُٹھائی تھی، لیکن بعد کو اُٹھانا بھول گئیں۔ گلشن کو اس کا علم تھا لیکن وہ کہنا نہین چاہتی تھی کہ مبادا بات زیادہ بڑھجائے۔ مگر وہ کب تک برداشت کرتی، آخرکار اس نے مجبور ہوکر کہہ دیا کہ "دُلھن سے پوچھئے، وہی یہان لائی تھین" —— یہ سننا تھا کہ بیگم نے گلشن کو چھوڑکر غریب دلھن کی طرف رُخ کیا اور اگر اتفاق سے صاحبزادہ صاحب حکیم کے آنے کی اطلاع نہ دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ڈراما کیونکر ختم ہوتا۔

حکیم صاحب اس خاندان کے پُرانے معالج تھے اور چند دن سے بقول خود "ضعف" کا علاج کر رہے تھے۔ اب یہ معلوم نہین کہ اس سے مراد اُن کی "ضعف" دور کرنا تھا یا "ضعف" پیدا کرنا۔ جب انھین معلوم ہوا کہ آج صبح بیگم صاحب کو غش بھی آگیا تو انھون نے نبض دیکھنے اور حالات دریافت کرنے کے بعد دوسرا نسخہ تجویز کر کے چلدئے ان کے جانے کے بعد بیگم نے اپنے بیٹے سے کہا کہ "ذرا نسخہ تو پڑھنا"

انھون نے پہلا جزو "گل بنفشہ کشمیری" پڑھا تھا کہ بیگم صاحب نے چیخنا شروع کیا "خدا غارت کرے ان حکیمون کو، معلوم نہین "بنفشہ" ان کی کوئی سگی لگتی ہے یا کیا کہ بغیر اس کا نام لئے ہوئے، انکا قدم ہی نہین آگے بڑھتا اور مین پوچھتی ہون کہ یہ حکیم صاحب میری کمزوری کا علاج کر رہے ہین یا زکام نزلہ کا لاحول ولاقوۃ۔ معاف کرو، مین باز آئی اس نسخہ سے اور ہان اس کے بعد کیا لکھا ہے؟ —— "تخم گاؤزبان" —— "کیا کہا، تخم گاؤزبان! آنکھین کھول کے پڑھو، برگ گاؤزبان لکھا ہوگا"۔

"جی نہین اس مین تو تخم گاؤزبان ہی لکھا ہے"

—— "لکھنے کی غلطی ہوگی، تخم کاٹ کے برگ کردو" "اچھا آگے چلو"
—— "مویز منقی" —— "کتنے دانے لکھے ہین؟" —— "سات" ——
—— "سات زیادہ ہین، پانچ کافی ہونگے۔ اچھا" —— "تخم کنوت" ——

اس دوا کا نام سننا تھا کہ بیگم آگ ہوگئین اور نسخہ بیٹے کے ہات سے لیکر چاک کرتی ہوئی بولین کہ حکیم صاحب سے کہدینا کہ مہربانی کرکے اب میرے یہان آنے کی زحمت نہ اختیار کرین غضب خدا کا یہ گرمی کا زمانہ، یہ میرا اختلاج یہ ضعف دماغ اور تخم کنوت! معلوم ہوتا ہے میری جان لینے کا ارادہ ہے —— حماقت سے اسی عالم برہمی مین گلشن ناشتہ لے آئی جو غشی کی رعایت سے بہت ہی ہلکے قسم کا یعنی صرف دلیا اور دودھ تھا۔ بیگم نے دیکھتے ہی مارے غصہ کے کشتی پر جو ہاتھ مارا، تو دودھ سے تمام فرش خراب ہوگیا پلیٹ گر کر چور چور ہوگئی —— ایک تو بیگم کو اس بات کا غصہ کہ بجائے پراٹھون انڈون کے ناشتہ مین صرف دودھ اور دلیا لایا گیا، دوسرے اس امر کی برہمی کہ فرش خراب ہوگیا پلیٹ ٹوٹ گئی —— بس یون سمجھ لیجئے کہ بالکل "دوآتشہ" ہورہی تھین، اور آنکھین یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُبل کر باہر آجائین گی —— بیگم کے غصہ کے تین درجے تھے۔ پہلا ہلکے قسم کا غصہ تو وہ تھا جب صرف گالی کو سننے پر کفایت ہوتی تھی اور یہ ایسی استمراری چیز تھا کہ اسکی اہمیت بھی لوگون کے دل سے مٹ گئی تھی اور بیگم کا بڑبڑاتے رہنا، گھر کی رونق کا گویا جزو لازم ہوگیا تھا۔ دوسرا درجہ غصہ کا وہ تھا جب زبان کے ساتھ انکا ہات بھی چلتا تھا اور ہفتہ مین دو تین بار اس کا دورہ پڑنا یقینی تھا، اس کا مظاہرہ زیادہ تر خادمون پر ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی بیٹیون پر۔ لیکن ایک تیسری قسم غصہ کی اور بھی تھی، یعنی یہ کہ اُن کی زبان اور اُن کی ضرب دونون کا صرف خود اُن کی تین من کی درزنی "جان ناتوان" پر ہوا کرتا۔ وہ اس عالم مین اپنا منہ نوچ لینے لگتین، بال کھسوٹنا شروع کردیتین، دیوار سے سر مار دیتین، ہزارون گالیان خود اپنے آپ کو سناڈالتین۔ اس مین شک نہین کہ غصہ کی یہ کیفیت دوسرون کے لئے بےضرر اور پُرامن دسکون تھی، لیکن اس کے اثرات مابعد ہمیشہ دوسری قسم کے غصہ کی صورت مین نمودار ہوتے اور وہ تمام "بےضرری دامن پسندی" اک مستقل ہنگامۂ دار وگیر اختیار کرلیتی۔

اس وقت بھی جب ناشتہ انھون نے اس بُری طرح رد کردیا تو اس خیال سے کہ اب دوپہر تک کسی طرح کھانا نہین ملسکتا اور اُن کو اپنا وہ معدہ جو کسی وقت بغیر ثقیل غذا کے چین سے نہین رہسکتا تھا عرصہ تک خالی رکھنا پڑیگا، دفعتًہ ان کا غصہ تیسرے درجہ تک پہونچگیا اور انھون نے وہی دیوانگی اختیار کرلی جو سارے اہل محلہ کو گوش بر آواز بنا دیتی تھی۔ اس غصہ کا دورہ عمومًا زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ تک جاری رہتا تھا کیونکہ گھر کے سب لوگ چارون طرف سے انھین سنبھال لیتے تھے، خوشامدین کرکرکے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سر پھوڑنے سے باز رکھتے تھے، لیکن اب ان کی طرف سے بیزاریان اس حد تک بڑھگئی تھین کہ ان کی اس حالت کو خدائی انتقام سمجھ کر سب اپنی اپنی جگہ خاموش رہنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ کسی نے ان کو نہین سمجھایا اور انکا جنون بڑھتا ہی رہا، یہانتک کہ چند منٹ مین اُن کے کپڑے تار تار ہوگئے اور جسم

لہولہان ـــــ جب وہ خود تھک کر نیم مُردہ حالت مین گر پڑتین تو سب سے پہلے صاحبزادے آئے اور انھون نے نہایت ہی ادب کے ساتھ عرض کیا کہ " امی جان آپ ناحق اپنے آپ کو اسقدر ایذا پہونچاتی ہین، خدا کے لئے اپنے اوپر اور ہم سب پر رحم فرمایئے یہ آخر کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے "

بیگم صاحب کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہین تھا کہ کوئی شخص ناصحانہ لہجہ مین ان سے گفتگو کرے وہ اس کو سخت توہین سمجھتی تھین ـــــ اس لئے وہ بیٹے کی یہ بزرگانہ گفتگو سُن کر اس سے زیادہ ضبط نہ کر سکین کہ ہات پکڑ کر ان کو فوراً باہر نکالدیا اور اس سانحہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس دن گھر مین کھانا ہی نہین پکا اور بیگم صاحب کے ساتھ سب کو فاقہ کرنا پڑا سہ پہر کو جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلین تو آنکھین سُرخ تھین اور تیوریان چڑھی ہوئی، مُنہ پھولا ہوا تھا اور پیٹ پچکا ہوا ــ نکلتے ہی حکم دیا کہ تانگہ لایا جائے اور تھوڑی دیر مین وہ سوار ہو کر اپنی بہن کے مکان پر جو کسی دوسرے محلہ مین رہتی تھین چلی گئین

بیگم صاحب کی برہمی کا یہ صورت اختیار کر لینا کوئی نئی بات نہ تھی بارہا ایسا ہوا کہ وہ برہم ہو کر چلی گئین اور دو دن بھی اپنے پسماندگان کو چین نہ لینے دیا کہ پھر واپس آ گئین ـ ہر چند ان کی یہ غیر حاضری سب لوگون کو فردوسی سکون عطا کر جاتی تھی، لیکن اس نعمت کے جلد چھین لئے جانے کا خوف اس فرحت سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہونے دیتا تھا ـ

دونون بیٹیون کے لئے اول اول تو بہت جگہ سے پیام آئے، لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ ان کی مان اس مزاج کی ہے تو پھر کسی نے ہمت نہین کی ـ بہو بھی مہینے مین بیس دن اپنے میکہ رہتی تھی اور باقی دس دن مین زیادہ حصہ بہانۂ علالت مین گزر جاتا تھا ـ بر جیس قدر کی یہ کیفیت تھی کہ کسی وقت اتفاق سے گھر آ گئے تو آ گئے، ورنہ زیادہ تر دوست احباب مین یا اپنی بیوی کے گھر اپنا وقت صرف کرتے تھے ـــــ وہ ملازم جو غریب کہین نہین جا سکتے تھے یا وہ اہل محلہ جو اپنے اپنے مکان نہین چھوڑ سکتے تھے، بیشک مستقل تماشائی اس " اکھاڑے " کے تھے اور جب کسی طرف سے کوئی شور و غوغا بلند ہوتا تھا تو بغیر کسی تحقیق کے ہر شخص آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا تھا کہ " ہو نہ ہو یہ بیگم صاحب ہی ہونگی "

افسوس ہے کہ ایک ہفتہ ہوا دفعتہً مہر زمانی بیگم کے قلب کی حرکت بند ہو گئی اور قبل اس کے کہ کوئی طبیب آ کر نسخہ لکھتا اور وہ اسکے اجزا مین حذف و اضافہ کرتین، آناً فاناً انکا انتقال ہو گیا ـ مین تو جنازہ مین شریک نہین ہوا، لیکن سنا ہے کہ کافی ہجوم ساتھ تھا اور ہر شخص کے چہرہ پر کچھ ایسے آثار پیدا تھے، جیسے کوئی بڑی خوشی کی بات ہو گئی ہے اور سب ملکر اس تقریب مسرت سے لطف اُٹھا رہے ہین ـ خود اُنکے گھر والون کے تاثر کا کیا عالم تھا ؟ اس کا اندازہ یون ہو سکتا ہے کہ صبح کو جانیوالی کی یاد مین جب ہر شخص خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد سویا ہے تو دوسری صبح تک کسی کی آنکھ نہین کھلی، لیکن عادت بھی کیا بُری چیز ہے ـ صبح کو چار بجے جب مرحومہ کے کمرہ سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی تو گلشن نیند کی حالت مین یہی سمجھی کہ بیگم صاحب آواز دے رہی ہین اور وہ " حضور، سرکار " کہتی ہوئی اس طرح بدحواس ہو کر دوڑ پڑی جیسے بیگم صاحب کی زندگی مین دوڑ پڑتی تھی ـ بہر حال کوئی کچھ کہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ بیگم محلہ کی رونق تھین اور آج وہ رونق مفقود

شام شفق

دیکھ اے دل سامنے یہ منظر نیرنگ کار
آسمان مغرب مین ہے جوش شفق سے لالہ زار

پتیون کی آڑ مین چھپنے چلا ہے آفتاب
چہرۂ رنگین یہ ڈالے ایک نارنجی نقاب

آہ یہ خورشید زرین یہ شعاعین یہ سکوت
حجلۂ زرتار مین بیٹھی ہے گویا عنکبوت

یا کوئی نازآفرین مستی مین گھبرائی ہوئی
جھانکتی ہے پردۂ زرین سے شرمائی ہوئی

طاس گلگون مین یا ساکت ہے جام احمرین
یا غبار رنگ مین ہے کوئی گل خلوت نشین

ہین فضا مین دوش پر رکھے ردائے شعلہ گین
یا ہے آغوش افق مین ایک بحر آتشین

یا سحاب گل پہ رقصان ہے عروس نوبہار
دیکھ کر جس کی ادائین حسن خود ہے شرمسار

یارہ فردوس مین حورین ہوئی ہین گام زن
گرد رنگین سے ہے جس کے آسمان گل پیرہن

اس فضا مین یا طیور رنگ گلزار جہان
بیٹھے ہین زرین شعاعون پر بنا کر آشیان

یا ہوا پہنے ہے اک گلگون حبابی پیرہن
یا فضا مین کھل رہا ہے احمرین پھولون کا بن

آگ گویا لگ رہی ہے وادی کہسار مین
جنگلون مین، دشت مین، دریاؤن مین گلزار مین

جوش رعنائی سے دود شعلہ آتش رنگ ہے
یہ افق، یہ بربط زرین شرر آہنگ ہے

دختر شام شفق دامن پہ سرمست شباب
غازۂ نارنج رخ پہ مل رہا ہے آفتاب

یہ سکوت شام اور یہ منظر جنت اثر
کھینچتے ہین آہ کس شوخی سے دامان نظر

دیدہ سے دل تک ہے رقصان اک بہار لالہ خیز
ہے شراب عیش و عشرت چار جانب نشہ ریز

دل سے لگ کر سو گیا ہے جوش بیتابی غم
شام کو گہوارۂ ساحل مین جیسے موج یم

آہ یہ زر بیضۂ سیمرغ یعنی آفتاب
اس فضائے احمرین مین کس طرح ہے جلوہ تاب

اک حباب آتشین، تنویر پیرا لالہ فام
ساحل دریا کے نیلم کی طرف ہے مست گام

کوہسار غرب سے اڑ کر سیاہی کا عقاب
آگیا پھیلا کے اپنا بازوئے شیر رنگ ناب

ہو رہی ہے غرق نیارات کے سیلاب مین
چھپ رہا ہے یا کنول اس اسودین گرداب مین

برق جیسے ابر مین، یا سنگ مین جیسے شرر
یا گل انجم فلک پر جیسے ہنگام سحر

وہ فضائے ارغوانی، وہ فروغ نوبہار تھے بساطِ شب پہ گویا رقص نیرنگ شرار

یہ تماشائے حبابی دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں جام زرنگار
یاد آتا ہے وہ تیرا حسن فردوس نظر ڈوب جاتا ہے ہجوم رنگ میں دل سربسر
یاد آتی ہے وہ چشم قوس صہبا آفریں کوندتی ہے سامنے برق شباب احمریں
یاد آتا ہے ترا گل خندۂ راحت نواز یاد آتی ہے ترے شانوں پہ وہ زلفِ دراز

میری کشتی طلسمی مست انفاس صبا
کس طرح ہے اس سنہری موج میں نغمہ سرا

شمیمی۔ بی۔ اے

معارف

شکستہ پائی کا شکوہ ہے اعتراف شکست رگ وجود کے ایڑیاں زمزم کی لہر پیدا کر
متاعِ اشک کو رو رو کے خاک میں نہ ملا اگر تو مرد ہے قطرے سے بحر پیدا کر

یونہی گنوا نہ تلاش سکون میں عمر عزیز تجھے مثال شرر بیقرار رہنا ہے
تو خود ہی دوڑ کے منہ چوم لے امیں انکا جن آندھیوں سے تجھے ہمکنار رہنا ہے

رہین نالہ و شیون! تری بلا جانے مصیبتوں کا یہ رونا ہی خود مصیبت ہے
تجھے خبر بھی ہے؟ قدرت کا ہے یہی قانون کہ غم کو قرد کے احساس غم سے نسبت ہے

حیات خندۂ جاوید ہے حقیقت میں خزاں کے خوف کا گل پر کوئی اثر کیوں ہو؟
امین جو دہر میں انسان بنکے ہو آیا وہ اس حقیقتِ روشن سے بیخبر کیوں ہو؟

امین حزین

تجلیات

ذوقِ صورت سازو شوقِ جلوہ سامان داشتم
یاد ایامے کہ منزل۔ منزل جان داشتم

دست در دست نگارے شوخ و سیر کوہ طور
بود حاصل ہر تمنائے کہ پنہان داشتم

از جمال حسن ساقی صد بہار ان در نظر
وز فروغ بادہ برخود صد گلستان داشتم

گہ بزیر طور بہم دعوت ذوق نظر
گہ بہ سقفش دولت حسن خرامان داشتم

آہ آن ساعت کہ از فیض جمال ہمنشین
ہر نفس در ہر نظر جنت بدامان داشتم

ہم چمن آوارہ ام ہم سر بصحرا دادہ ام
من جگر ہستم ہمان کامروز دور افتادہ ام

یاد ہین ابتک جگر وہ بیقراری کے مزے
دردِ پیہم کی لگاوٹ زخم کاری کے مزے

وہ جبین شوق اپنی وہ کسی کا پائے ناز
سجدہ ریزی کی لطافت اشکباری کے مزے

شوق کی رودادِ پردہ حسن کی بیم ریان
عشق کی فریادِ پردہ شرمساری کے مزے

کہیئے کیا کیفیتِ نازو نیازِ حسن و عشق
رازداری جانتی ہے رازداری کے مزے

وہ اک آہِ آتشین کا جانِ مضطر سے سلوک
وہ نگاہِ شرمگین کی غمگساری کے مزے

انتہائے سادگی و شوق سامانی کے لطف
ابتدائے عاشقی و خامکاری کے مزے

ہر جمالِ نو کی پیہم اللہ اللہ شان خاص
ہر خیالِ تازہ کی نااستواری کے مزے

دل سراپا درد ہے دل ہی سے اکدن پوچھیئے
شام سے لیکر سحر تک دم شماری کے مزے

عشق کے مضبوط ترکِ عہد مطلب کی شکست
حسن کی نامنتقل غفلت شعاری کے مزے

اپنی ہر لغزش سے پیدا عشق کا لطفِ یقین
اُس کے ہر انداز پر بے اعتباری کے مزے

آہ وہ دردِ محبت کی گذشتہ لذتین
خوشگواری کے مزے ناخوشگواری کے مزے

قطرہ قطرہ موجِ صہبا ذرہ ذرہ جامِ جم
اب کہان سے لایئے اس میگساری کے مزے

شورِ مستانہ کجا و جلوۂ ساقی کجا
آہ آن ساقی کجا و آن مئے باقی کجا

اے کہ وابستہ ترے دم سے نظامِ آرزو
سن پیامِ آرزو بعد از سلامِ آرزو

تو کہ جانِ حسن ہے اور حسن تیری جان ہے
ہان مبارک ہو تجھے عیش و دوامِ آرزو

تیری ہر موجِ تبسم تیری ہر موجِ نظر
ایک برقِ طور تھی بالائے بامِ آرزو

تیرا روئے آتشین مسجودِ صبحِ دلبری — تیری زلفِ عنبرین معبودِ شامِ آرزو
چشم و دل پردہ عنایت وہ کرم وہ مرحمت — اللہ اللہ تو کرے یوں احترامِ آرزو
میں نہیں بھولا تجھے تجھکو بھی شاید یاد ہو — تجھ پہ وہ چھایا ہوا کیفِ تمامِ آرزو

حرفے از دردِ دل بے مدعائے گفتنیست
ماجرائے گفتم و صد ماجرائے گفتنیست

جگر مراد آبادی

سلمیٰ!

(Sonnet کے تتبع میں!)

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ!
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے!
بہشتِ رنگ و بو کا تو، سراپا اک نظارا ہے!

تری صورت، سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ!
ترا جسم، اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ!
شبستانِ جوانی کا تو، اک زندہ ستارہ ہے!
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے!
تو اس سنسار میں، اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ!

جہانِ قدس کا تو ایک نورانی فسانہ ہے!
تجھے سلمیٰ! ادیارِ ناز کی اک ساحرہ کہیئے!
صنم آبادِ عفت کی، مقدس کافرہ کہیئے!

ربابِ حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے!
پرستانِ لطافت کی، تو، اک رنگین کہانی ہے!!
جوان فطرت کا تو، اک گم شدہ خوابِ جوانی ہے!!!

اختر شیرانی

"التجا"

اک روز زندگی سے جو مین تنگ آ گیا
کی بارگاہِ حسن مین مینے یہ التجا

(۱)

اے خالقِ اُمید تمناؤن کے خدا　　اے لاشریکِ حسن محبت کے کبریا!
اے مرکزِ خیال تصوّر کے کارساز　　اے سجدہ گاہِ اہلِ نظر، قبلۂ رضا!
اے صورتِ نشاط، معانیٔ انبساط　　اے مقصدِ حیات، عبادت کے مُدعا!
اے زہرۂ جمال مہِ آسمانِ حُسن　　اے جنتِ نگاہ، طلسمِ خدا نما!
اے زندگیٔ رونقِ بازارِ زندگی　　اے مدعائے حاصلِ الفاظِ مُدعا!
اے ساربانِ قافلۂ رہروانِ شوق　　اے ناخدائے کشتیٔ طوفان آشنا!
اے باغبانِ گلشنِ ارمان و آرزو　　اے پاسبانِ خواہشِ اربابِ بینوا!

اے روشنیٔ قلب سکونِ غمِ فراق
اے نورِ لایزال، فریبِ لبِ انا!

(۲)

کچھ یاد ہین تجھے وہ زمانے کی گردشین　　جب چشمِ سحر کار نہ تھی عشق آشنا
تھا لفظِ شرم باعثِ توہینِ کمسنی　　اور رنگِ رُخ، ناز نہ تھا واقفِ حیا
ہر چیز کا مذاق تھا ہر بات کی ہنسی　　اور لب تبسّموں سے نہ تھے دور آشنا
ہر شے نئی نئی تھی نئی خواہشات تھین　　لہو و لعب عزیز تھے طفلی کا دور تھا
ہر رنگ مین خوشی تھی یہ دنیا بہشت تھی　　"دار النشاط" نام اسی غمکدہ کا تھا
مفہومِ غم سمجھ مین نہ آتا تھا اسلئے　　دُنیا کے ہر الم کو ہنسی مین اُڑا دیا

آخر سکون نواز یہ منظر بدل گیا
دیکھا جو غور سے تو تماشہ ہی اور تھا

(۳)

خاموش بڑھ رہی تھی لہو مین نمو کی موج　　شعلے بھڑک چلے تھے رگوں مین ذرا ذرا
آنکھون مین آ چلی تھین جوانی کی سُرخیان　　عارض پہ بہ چلا تھا پسینہ گلاب سا
شانے بھی ہو رہے تھے جوانی کا آئینہ　　چوٹی بھی کھنچ رہی تھی بتدریج کچھ سوا
باتین بھی رفتہ رفتہ ہوئی جا رہی تھین نرم　　نظرین بھی جھک چلی تھین پئے کوششِ حیا
لہجہ مین بھی نسائی لچک آ چلی تھی کچھ　　طرزِ خرام سیکھ رہا تھا کوئی ادا
کم ہو رہا تھا خندۂ آزادنِ بدن　　لب کر چلے تھے صرف تبسّم پہ اکتفا

لیکن ہنوز قلب شباب آشنا نہ تھا
بے ربط لرزشون سے اُسے واسطہ نہ تھا

(۴)

ناگاہ ایک آگ سی دل مین بھڑک اُٹھی　　رگ رگ کو جسنے مخزنِ شعلہ بنا دیا
ندرِ سکون دیکھے ملا حُسن عشق سے　　ہر دو طرف طلسم نے یکسان اثر کیا
ٹکرا گئین نگاہ، شرارے اُچھل پڑے　　دل جل کے بجھ گیا تو جگر سے دھُواں اُٹھا
بجلی سی ایک کوند گئی روح کے قریب　　سوئے ہوئے شباب کو کوئی جگا گیا
چبھنے لگا کسی کا رگِ جان مین نیشتر　　احساسِ ناز مین کوئی چٹکی سی لے گیا
دُنیائے حسّیات مین ہلچل سی مچ گئی　　دریائے خواہشات مین سیلاب سا اُٹھا
سینہ مین اضطراب کی پہلی خلش ہوئی　　ہوش و خرد کو تجربہ اولین ہوا

جاگا نصیبِ عشق" ستارون نے کہدیا!
محکومِ شاہِ حُسن ہوئی گردشِ سما!

(۵)

اک ہیجِ دلکشی دورِ تھا مدہوشیٔ نکارِ ن　　ہر چیز جھومتی تھی ہر اک شے مین رقص تھا
بنگین ٹرھی ہوئی تھین بہم ارتباط کی　　ارمان شباب کے تھے اُمنگون کا جوش تھا
احساس لے چکا تھا کوئی کہربائی موج　　لب ہو چکے تھے واقفِ لذاتِ مُدعا

چشمک زنی کا لطف تھا پلکین زبان تھین — بے معنی گفتگو مین معانی کا رنگ تھا
کرتی تھین سو طرح نگہِ ناز منتیں — دم بھر کے واسطے جو کوئی ہوگیا خفا
آپس مین چھیڑ چھاڑ کے یون سلسلے بڑھے — بگڑا اگر کوئی تو کوئی مسکرا دیا
ہر روز روزِ عید تھا ہر شب شبِ برات — بیداریون مین لطف تھا نیندون مین کیف تھا

پایانِ کار یہ بھی فلک کو برا لگا
اب آنکھ جو کھلی تو زمانہ ہی اور تھا

(۶)

دنیا سیاہ پوش تھی تاریک تھا جہان — ذرون مین کائنات کے اک حشر تھا بپا
دھندلی سی ہوگئی تھی نگاہون مین چاندنی — سورج کی روشنی مین وہ کیف نور تھا
تنہائیان پسند تھین خاموشیان عزیز — سونا خیال و خواب تھا رونے کا شغل تھا
دل مین خلش تھی روح مین سوزش جگر مین یاس — آنکھون مین اشک سر مین جنون لب پہ "یا خدا"
دنیا کے کاروبار مین بے رونقی سی تھی — ہر شے پہ چھا گئی تھی اداسی خزان نما
ہر دم کوئی خیال مین لیتا تھا چٹکیان — ہر وقت سامنے تھا کوئی نقشِ دلربا
بہرون ضمیر عشق نے کی ہیں ملامتین — بھولے سے گر خیال کبھی مسکرا دیا
اکثر بہ تنگ آ کے خدا سے کیا سوال — یارب حصولِ خلقتِ انسان ہے کیا؟
تھی بات لاجواب مگر دل دھڑک اٹھا — گفتا کہ ہوشدار سکون آ رہا لبا!

درکارخانۂ کہ رہِ عقل و علم نیست
وہمِ ضعیف و رائے فضولی کند چرا؟

طالب باغپتی

ترانۂ دل

بیگانۂ راحت ہون، لبریزِ شکایت ہون — چھیڑے نہ کوئی مجھکو مین سازِ محبت ہون!
اک پردۂ رازِ غم، اک موجِ گدازِ غم! — سوزِ پرِ پروانہ شمعِ سرِ تربت ہون!
مشتاقِ جفا تو، مجبورِ وفا ہون مین! — تو نغمۂ عشرت ہے، مین غم کی حکایت ہون!
ساقی ہون، نہ محفل ہون، خندان ہون نہ خوش دل ہون — اک سوز کا پیکر ہون، اک درد کی صورت ہون!
دیکھے نہ کوئی مجھکو اپنا سا بنا دون گا — مین غم کدۂ دل کا آئینۂ حیرت ہون!
ہون ذوقِ مسرت کے مفہوم سے بیگانہ — مین نالۂ عبرت ہون مین نغمۂ حسرت ہون!

کیونکر مین کہون کیا ہون، راز ایک تماشا ہون!
سودائی ہون، مجنون ہون، آوارۂ وحشت ہون!

جمیل بنگش راز کوہاٹی

غزلیات

افسر امروہوی

تمھیں افشائے رازِ عشق کا شکوہ ہے کیوں مجھسے — مین اپنے ہوش مین کب تھا جو کہہ دیتا کبھی دل کی
زمانہ غیر، دشمن آسمان قسمت مخالف ہے — کرے گی اور کیا اس سے زیادہ دوستی دل کی
بالآخر یہ مآلِ اضطراب آرزو نکلا — کہ بے نکلی حدودِ زیست سے دیوانگی دل کی
نشانِ منزلِ مفقود کوسون تک نہین ملتا — کہان کھینچے لئے جاتی ہے مجھکو بیخودی دل کی
خلش زخمِ محبت کی نہ ہوگی کارگر کب تک
مٹا دے گی مجھے آخر کسی دن زندگی دل کی

ثاقب جالندھری

کیا امید کامیابی ہو کہ مقصد دور ہے — مجکو وہ منظور ہے جو ان کو نا منظور ہے
ظلم اوٹھاؤن اور پھر آمادۂ شیون نہ ہون — کتنا دنیائے محبت کا برا دستور ہے
تم ستانا چھوڑ دو مین آہ کرنا چھوڑ دون — اپنی اپنی خو سے دنیا مین ہر اک مجبور ہے
غفلتون نے کر دیا کچھ سبے نیاز جستجو — ورنہ کیا میری رگِ گردن بھی مجھ سے دور ہے
تم نے مجکو پھونک ڈالا شمع نے پروانے کو — کیا جہان کے حسن والون کا یہی دستور ہے
پھر اسی انداز سے ثاقب گری برقِ جمال
پھر تمنائی کوئی بالائے کوہ طور ہے

ریاض خیرابادی

سُن کے یہ قبلے سے ابر اٹھے تو ہے پینا ثواب — لٹ رہا تھا میکدے مین ہم نے بھی لوٹا ثواب
کچھ نہین اعمال دنیا کا ہے عقبےٰ ثواب — جو نہ کام آئے یہان کس کام کا ایسا ثواب
نزع تک قلقل سے رکھتی یاد اللہ اس لئے — پڑھ کے قل بخشی گئی ہم کو قلقل مینا ثواب
پینے سے پہلے ہی کھانا تھا ہمین ساقی کباب — کر کے افطار آج ہم نے مے سے خود دکھویا ثواب
کچھ ہو آب آتشین ہو چاہے آب سرد ہو — ہم ہین پیاسے جو پلائیگا وہ پائیگا ثواب
پی کے مے ذکر خدا شکر خدا یاد خدا — ہے ہمارے واسطے شغل مے و مینا ثواب

ایک دن تو خواب مین آتا لئے جام طہور — پڑھکے قرآن عمر بھر ہم نے جسے بخشا ثواب
راہ سے کعبے کی ہم نے ریزۂ مینا چُنے — کیا عجب اسکی عوض ہم کو ملے حج کا ثواب
روز عید ایسا کوئی امید دلاہے ریاضؔ
ایک چلو دے کے مے لے تیس روزونکا ثواب

شمیمی بی اے

میری نظر کی طرح اب اس جلوہ گاہ مین — تم بھی بھٹک رہے ہو ہجوم نگاہ مین
تھی اک نگاہ وہ ترے جلودن مین کھوگئی — اب تو نہین حجاب کوئی رسم و راہ مین
ہے دلفریب اُن کی اداؤن سے بھی سوا — تجدید رنگ حسن ہجوم نگاہ مین
اک برق بن کے دوڑتی ہے عشق کی تڑپ — میرے حریم دل مین تمھاری نگاہ مین
خود رحم مجھ کو شان کریمی پہ آگیا — ورنہ دھرا ہی کیا تھا نوائے گناہ مین
ملتے ہی آگ شاخ تمنا مین لگ گئی — کیا بجلیان بھری تھین تمھاری نگاہ مین
مین نے کہا یہ ایک دن اے حسن بے خبر ق — غم کھائے جارہا ہے مجھے تیری راہ مین
کیا میرے اضطراب کا کچھ بھی اثر نہین — کیا درد کچھ نہین میری فریاد آہ مین
آئی صدا وہ حسن ہون مین جس کی انجمن — ڈوبی ہوئی ہے پرتو خورشید و ماہ مین
کیا تیری آہ کیا غم دنیا کی آفتین
ان کا گزر نہین ہے مری جلوہ گاہ مین

فرخ بنارسی

نہ ہو نچین گی نگاہین جلوۂ حیرت تقاضا تک — اُٹھا دے دیکھنے والے حجاب چشم بینا تک
فریب التفات حسن کی نیرنگیان توبہ — ہزارون رنگ دل کے ہو گئے خون تمنا تک
جنون مین جب قدم پہلے پہل گھر سے نکالا تھا — عجب عالم نظر آتا تھا آبادی سے صحرا تک
مٹے جب تک دل بیتاب کی الجھن نہین سکتی — کہ مد و جزر دریا ہے بقائے موج دریا تک
بچھا رکھا ہے دام ایسا فریب زندگی تونے — گوارا کر رہے ہین ہم خوشی سے ناگوارا تک
فریب نفس کے باعث ہین غافل کہین ورنہ — ادا کرتا ہے اپنا فرض ہستی ذرہ ذرہ تک
ارزتا ہے ابھی سے دل مزاج یار برہم ہے — یہ عالم ہے تو کیا گزریگی اظہار تمنا تک
الجھ کر رہ گئی فرخ حجابات مظاہر مین — نگاہ نارسا پہونچی نہ حسن بے تماشا تک

معلومات

تصاویر متحرکہ تار پر

ڈاکٹر زوری کن سفو امریکہ کا باشندہ ہے ایک عجیب وغریب آلہ تیار کیا ہے جس کے ذریعہ سے تصاویر متحرکہ تار کے ذریعہ سے منتقل ہو سکین گی۔ سب سے بڑی دقت تصاویر متحرکہ کے منتقل کرنے مین یہ ہے کہ جس رفتار سے سینما مین یہ تصویرین دکھائی جاتی ہین اُس رفتار کا قیام اس طور سے کہ ٹھیک اسی وقفہ کے ساتھ روشنی اور تصویر کے بعد دیگرے تار پر منتقل کی جائین مشکل ہے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف نے اسکی یہ تدبیر کی ہے کہ پردہ کو بہت سے حصون مین تقسیم کر دیا ہے ان مین کا ہر حصہ صحیح مقدار روشنی کی حاصل کر کے ایک مکمل تصویر پیش کر سکے گا یہ حقیقتاً دنیا کی اختراع کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ تار کے ذریعہ سے اس روشنی کو منتقل کیا جائے جو ایک تصویر کے نمایان کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے اس سے قبل ایک انگریزی سائنسدان مسٹر بیرڈ اس قسم کی کوشش کر چکے ہین اور انکو ایک حد تک کامیابی بھی ہو چکی ہے لیکن امریکہ کے اس ڈاکٹر نے اس مسئلہ کو اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ اب نیو یارک مین بیٹھکر ڈربی کی گھوڑ دوڑ دیکھ لینا قطعی ممکن ہو گیا ہے۔

نہ جلنے والے درخت

جرمنی مین اس امر کی کوششین کی جا رہی ہے کہ لکڑی کو آگ کے اندیشہ سے آزاد کر دیا جائے چنانچہ حال ہی مین وہان ایک قسم کی معدنی چیز دریافت کی گئی ہے جو درختون کے اندر پچکاری کے ذریعہ سے پہونچائی جاتی ہے جس سے وہ بڑی حد تک ناقابل احتراق ہو جاتے ہین۔ درختون کے تنون مین جڑ کے قریب چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیتے جاتے ہین اور وہ دوا ان سوراخون کے ذریعہ سے اندر پہونچائی جاتی ہے رفتہ رفتہ درخت کے تمام ریشون مین اس دوا کا اثر دوڑ جاتا ہے۔

ممالک مغرب مین بعض درخت اسقدر قیمتی ہوتے ہین کہ اگر ان کے جنگل مین آگ لگ جائے جو بڑی حد تک ممکن الوقوع ہے تو کرورون روپیہ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اسوقت تک ایسے جنگلون کی حفاظت کے جتنے طریقہ استعمال کئے گئے وہ مفید ثابت نہین ہوئے اسلئے اب انھون نے مجبور ہو کر اس امر کی کوشش کی کہ خود درخت آگ کے خلاف اپنی حفاظت کر سکین۔

آفتاب کی حرارت پر انسانی تصرف

کیا آفتاب کی حرارت پر ہمین اتنا اقتدار حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے اپنے گھر اور صناعی کے کامون مین مدد لے سکین۔ اسوقت دو مشہور سائنس دان نہایت بڑے بڑے آتشی شیشون کے مدد سے اس کا تجربہ کر رہے ہین۔ ہر چند اس سے قبل اس کے تجربات ہو چکے ہین لیکن کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اب بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر اس کو شروع کیا گیا ہے

ایک صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ بہت سے آتشی شیشہ اس ترکیب سے رکھے گئے ہین کہ ان سب کا مرکز شعاع ایک ہی حصہ پر گرمی پہونچائے اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ سے اتنی حدت آفتاب کی حاصل ہو سکے گی کہ لوہے کا ایک ٹکڑا آسانی کے ساتھ پگھل جائے گا۔ اگر یہ تدبیر تکمیل کی حد تک پہونچ گئی تو اس مین شک نہین کہ لاکھون روپیہ کا صرف ہر کارخانہ کو بچ جائیگا۔

ریل کے تصادم سے بچنا

اسپین مین ایک لاسلکی آلہ حال ہی مین اس قسم کا ایجاد ہوا ہے کہ اسنے ریلون کے تصادم کو ناممکن کر دیا ہے۔ یہ آلہ انجن ڈرایور کی گاڑی مین لگا دیا جائیگا۔ جسوقت کوئی گاڑی سامنے سے آتی ہوگی تو یہ آلہ پوری قوت کے ساتھ الارم کی گھنٹی بجائیگا اور نہایت تیز سرخ روشنی پیدا کریگا جو میلون پہلے آنے والی گاڑی کے ڈرایور کو خبردار کر دیگی۔

سب سے ہلکی دہات

لتھیوم سب سے زیادہ ہلکی معدنی چیز ہے اس کا ثقل نوعی پانی سے نصف ہے اور اسی لئے وہ پانی مین تیرتی ہے اس کا رنگ چاندی کی طرح ہوتا ہے اور نرمی مین سیسہ کے مانند۔ دوسری دہاتون سے بہت جلد مل جاتی ہے اور آگ کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔ اسوقت تک یہ دہات بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی اور ایک پونڈ کی قیمت ۵۰ گنی ہوتی تھی کیونکہ اس کے حاصل کرنے مین بہت صرف ہوتا تھا لیکن اب نیویارک کے ایک ڈاکٹر نے ایسا آسان طریقہ اسکے حصول کا دریافت کیا ہے کہ اس کی قیمت بجائے پچاس کے تین گنی فی پونڈ رہ گئی ہے۔ جب یہ دہات ہلیوم گیس مین ملادی جاتی ہے تو اسکی قوت رافعہ پندرہ فیصدی بڑھ جاتی ہے اور ہوائی جہازون کے طیران مین بہت مدد ملتی ہے۔

آگ بجھانے کے آلات مین ایک اضافہ

آگ بجھانے کے لئے بلاد انگلستان مین جو آلات استعمال کئے جاتے ہین اُن مین ایک ضروری چیز سیڑھی بھی ہے جو بہت لمبی ہوتی ہے۔ اس سیڑھی کے ذریعہ آگ بجھانے والے بلند چھتون پر پہونچ جاتے ہین اور لوگون کی جان اور مال بچاتے ہین لیکن ایک خرابی اسمین یہ تھی کہ انکو اس بات کا پتہ نہین چلتا تھا کہ مکان کے کس حصہ مین ہمکو پہلے پہونچنا چاہئے اور کہان کہان لوگ زیادہ خطرہ مین ہین۔ اب اس نقص کے دور کرنے کے لئے سیڑھی کے سرے پر ٹیلیفون لگا دیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے مکان کے لوگ آگ بجھانے والون کو ہدایت کر سکین گے کہ انکو کس جگہ جلد پہونچنا چاہئے۔ چونکہ آگ لگنے کے ہنگامہ مین کوئی شخص کسی کی آواز یون نہین سن سکتا اس لئے ٹیلیفون کا اضافہ زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہوگا۔

شخصیت کی تحقیق معدہ سے

اسوقت تک مجرمون کی شناخت اُن کی انگلیون کے نشان سے ہوتی ہے لیکن آئندہ معدہ کی تصویر سے شناخت کا کام کیا جائیگا۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی مین ڈاکٹر روبرٹ موڈی اس مسئلہ پر طلباء کو لکچر دے رہے ہین اور انہون نے ثابت کیا ہے کہ ہر شخص کی معدہ کی ساخت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اسلئے اگر اکس ریز کے ذریعہ سے ایک شخص کے معدہ کی تصویر لے لی جائے تو ہم ہمیشہ اس کو پہچان سکتے ہین

چورون کی گرفتاری کا نیا طریقہ

لندن کی پولیس بہت کامیاب پولیس سمجھی جاتی ہے اور چونکہ وہان کے چور بھی بہت زیادہ ہوشیار ہوتے ہین اسلئے پولیس کو گرفتاری کے لئے خاص خاص تدابیر سے کام لینا پڑتا ہے سب سے زیادہ دقت وہان چورون کی گرفتاری مین یہ پیدا ہوتی ہے کہ پولیس کے پہونچتے پہونچتے وہ موٹرون پر سوار ہوکر غائب ہوجاتے ہین اس مشکل کو دور کرنے کے لئے وہان کی پولیس کو ٹینس کے گیند کے برابر قمقمے دیئے گئے ہین جن کے اندر جلد سوکھ جانے والا رقیق مادہ بھرا ہوتا ہے۔ جب کوئی چور اسمین سوار ہوکر بھاگتا ہے تو پولیس والا قمقمہ موٹر پر کھینچ مارتا ہے۔ جسوقت یہ قمقمہ ٹوٹتا ہے تو اس سے نہایت تیز بو پیدا ہوتی ہے اور وہ رقیق مادہ موٹر پر کانچ کی طرح جم جاتا ہے اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ موٹر تھوڑی دور آگے چل کر روک دیا جاتا ہے اور دوسرے پولیس والے چورون کو گرفتار کر لیتے ہین۔

بحر و بر کے درمیان سلسلۂ لاسلکی

لاسلکی خبر رسانی کی ایجاد کو زیادہ زمانہ نہین گزرا، مگر اب اس کا استعمال عام ٹیلیفونون کی طرح کثرت سے ہونے لگا ہے اور آیندہ ترقیون کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ مین ایک کوشش یہ ہورہی تھی کہ خشکی و تری کے درمیان بھی اسکا سلسلہ جاری کر دیا جائے تاکہ بحر اٹلانٹک مین سفر کرنے والا ایک تاجر اپنے نیو یارک کے دفتر کو جہاز مین بیٹھے بیٹھے ہدایتین کر سکے۔ اب یہ تجویز پورے طور پر کامیاب ثابت ہوگئی ہے، اور امریکہ نے اس کے اجراء کا اعلان کر دیا ہے۔ چنانچہ نیو یارک کی "ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کمپنی" کے صدر مسٹر جفرڈ نے امریکہ کے ایک جہاز "لویاتھان" سے اسی طرح گفتگو کی۔ یہ جہاز یورپ جارہا تھا اور اگرچہ گفتگو کے وقت امریکہ کے ساحل سے صرف ۴۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا، لیکن خیال ہے کہ اس مین فاصلہ کی کمی و بیشی ناقابل لحاظ ہے کیونکہ یہ گفتگو جس طرح ۴۰۰ میل کے فاصلہ سے ہوسکتی ہے اسی طرح ۱۰۰۰ میل کے فاصلہ سے بھی ممکن ہے۔ مسٹر جفرڈ نے توقع ظاہر کی ہے کہ عنقریب دنیا کے ہر بڑے جہاز مین لاسلکی کا یہی سلسلہ قائم ہوجائیگا تاکہ خشکی و تری کی تفریق قائم نہ رہے۔

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ

- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی عہ
- ملکہ زنوبیہ ۳ر
- قرۃ العین ۳ر
- مخدرات ہر
- جویائے حق للعہ
- بعیت جبین عہ
- فاتح مفتوح ہر
- بابک خرمی ہر
- الفانسو ۱۲ر
- ایام عرب ۶ر
- قیس ولبنیٰ ہر
- یوسف ونجمہ ہر
- زوال بغداد ہر
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین ہر
- رومتہ الکبریٰ ہر
- فلپانا ہر
- شوقین ملکہ ہر
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو ہر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلہن عہ
- بدالنسا کی مصیبت ہر
- سیاہ تلخ ۸ر

- نیکی کا پھل عہ

شوق قدوائی

- ترانۂ شوق ہر
- قاسم وزہرہ ۱۲ر عہ
- نیرنگ جمال ہر

میر ولی اللہ بی اے

- بندگی ۶ر
- کاس الکرام ۳ر
- لسان الغیب جلد اول ۳ر
- " " دوم ۶ر
- " " سوم ۶ر
- " " چہارم ۶ر
- نمکدان فصاحت ہر
- بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری ہر
- بہرام کی گرفتاری عہ

مولانا نیاز فتحپوری

- گیتان جلی ۶ر
- گہوارۂ تمدن ۶ر
- نگارستان ۶ر
- صحابیات ۶ر
- تاریخ الدولتین ہر

سید سجاد حیدر بی اے

- زہرا ۱۲ر
- جلال الدین خوارزم شاہ ہر
- خیالستان ہر
- ثالث بخیر ۸ر

- حکایات واحتساسات ۴ر

دلچسپ تاریخی وجاسوسی ناول

- سراب نیشن [؟] ۸ر
- بالشوک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۱۲ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس عہ
- شیخ چلی عہ
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس ہر
- حسن بنارس ۸ر
- فطرتی جاسوس ہر
- ٹرکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور ہر
- زر پرست ہر
- کنجی کا راز ہر
- عبدالرحمن ناصر ۶ر
- فردوس مصر ۶ر
- سیلاب خون ہر
- کرشمہ ہر
- وفادار دلہن ہر
- عواقب زہین [؟] ہر

- سیاحت زمین ہر
- سیاحت ہوا عہ
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر ۶ر
- اسرار بالشوزم ہر
- روح لیلیٰ ۳ر
- امین بیگ عہ
- حجاج بن یوسف ہر
- یوسف پاشا ہر
- انقلاب عثمانی ہر
- بہرام کی رہائی ہر
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگزشت ہر
- لال کنھور ہر
- پراسرار قتل ۶ر

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب ۳ر
- بزم خیال عہ
- شاطرۂ سخن عہ
- انشاء نسواں ۶ر
- مکاتیب محسن الملک ہر
- لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

- مراثی دبیر ۶ر
- مراثی انیس للعہ
- مراثی ضمیر عہ
- مراثی مونس ۱۲ر
- مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

- تذکرۂ حسینی ۱۱ر
- گلشن ۱۰ر
- سراپائے سخن عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی ۶ر

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز ۱۲ر عہ
- کلیات عراقی ۱۲ر
- دیوان حافظ ہر
- دیوان نعمت خاں عالی عہ
- کلیات انوری ۶ر
- دیوان بیدل ہر
- دیوان عرفی ۱۲ر
- کلیات جامی ہر
- کلیات غالب ہر
- کلیات صائب ۱۲ر
- کلیات حزیں ۶ر
- دیوان عنصری ۱۴ر
- دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
- دیوان غنی کشمیری ۶ر
- دیوان ناصر علی ۶ر
- دیوان ہلالی ۶ر
- کلیات جلال اسیر ۳ر
- کلیات سعدی ہر

دواوین اردو

- دیوان حسن دہلوی ۸ر
- کلیات ظفر ۶ر
- کلیات مومن عہ
- دیوان ناسخ عہ
- کلیات میر ہر
- کلیات سودا ہر
- کلیات انشا ہر
- کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
- گلزار داغ عہ
- دیوان رند
- دیوان ذوق
- کلیات آسیا [؟]
- مراۃ الغیب
- مثنوی عشق
- فریاد داغ ۴ر
- دیوان قاتل [؟] ۸ر
- دیوان شہیدی ۴ر

عجائب وغرائب

- عجائب المخلوقات تصویر رنگین ۵ر
- " باتصویر سادہ للعہ
- مجمع الفنون ۳ر
- طلسم فرنگ ۶ر
- کارخانۂ عالم عہ

رسائل مذہبی و ناولوں کے ترجمے

- الہ دین ولیلی ۱۲ر
- فریب حسن ۶ر
- سوزن عشق ہر
- روزا ایمبرٹ للعہ
- ناول اسرار ۶ر
- شام جوانی ۳ر
- طلسمی فانوس ہر

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات یکجا کردیے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشا میں اسقدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہوجاتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ۶ر

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال، اور جدت اظہار کے ایسے ایسے نادر نمونے موجود ہیں کہ کسی ادبی تصنیف میں نہیں مل سکتے۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں

قیمت علاوہ محصول
دس آنے ۱۰ر

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت، عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور سے پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصر کے مشہور مورخ کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر مکمل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ مولانا نیاز نے کیا ہے اور اسقدر سادگی و سلاست کے ساتھ کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔

قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی حلاوت و شیرینی تمام شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی نظیر و تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے

قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲ر)

تذکرہ خندۂ گل

مولفہ مولوی عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں اور دنیا اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔

حجم ۵۰۰ صحابیات

قیمت مع محصول چار روپیہ (للعہ)

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا سے تہذیب و شایستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نگارستان

(دوسرا اڈیشن) زیر طبع ہے جسمیں حضرت نیاز کے ادبی متعدد مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔

قیمت بعد طباعت متعین کیجائے گی

مینجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ



نیاز فتحپوری

قواعد رسالہ "نگار"

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳ - خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے - جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دیئے جاتے ہیں

۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) معیاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے -

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد

- نبات النعش ۸ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۰ر
- موعظہ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- ؍؍ دوم عہ
- ؍؍ سوم عہ
- الفاروق عہ و ۳ر
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم عہ
- سفرنامہ مصر و شام عہ
- علم الکلام عہ و ۸ر
- الکلام عہ و ۸ر
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول عہ ۱۲ر
- ؍؍ دوم عہ
- ؍؍ سوم عہ
- ؍؍ چہارم عہ
- ؍؍ پنجم عہ ۱۲ر
- موازنہ انیس و دبیر ؍؍
- مضامین عالمگیر عہ و ۱۲ر
- آغاز اسلام ۱۲ر و ۸ر
- کلیات فارسی شبلی عہ
- کلام شبلی اردو عہ و ۸ر

امیر مینائی

- صنم خانۂ عشق عہ
- مراۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- مینائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی عہ

رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار عہ
- خدائی فوجدار عہ
- جام سرشار عہ
- الف لیلہ بطرز ناول عہ
- کامنی عہ
- سوانح عمر و عیار عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس عہ

جوالا پرشاد برق

- مرقع لیلیٰ ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۸ر

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۳۰ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد - ۱۸ | جولائی سنہ ۱۹۳۰ء | شمار - ۱

ملاحظات

"ہر نشیب کے لئے ایک فراز، ہر ہبوط کے لئے ایک صعود اور ہر انحطاط کے لئے ایک عروج ہے" یہ نظریہ ہر چند اپنی عمومیت کے لحاظ سے اسقدر صحیح و درست نہیں، جیسا اسکا "عکس" کہ "ہر کمالے را زوالے"۔ ایک حقیقت مسلمہ سمجھی جاتی ہے، لیکن بعض اوقات اسکی مثالیں بھی اسقدر عجیب و غریب نظر آجاتی ہیں کہ چار و ناچار فطرت کی "فیاضیوں" اور "بیداریوں" کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

مثلاً کون کہہ سکتا تھا کہ "اسلام" جو حالی ہی کے وقت تک "غریب الغربا" ہو گیا تھا، سنہ ۱۹۳۰ء میں جبکہ اس کی حالت "افقر الفقرا" سے بھی گر کر "اعلم العلما" تک پہونچ جائیگی، کوئی "مرد غیب" سرزمین "فرنگی محل" سے نمودار ہوگا اور اس کے "عظام رمیم" میں تازہ روح پھونک کر فرنگیوں کے خدا "مسیح" کی یاد کو زندہ کردینے والا ثابت ہوگا۔ سچ ہے جب "خدا" کے لئے یہ محال نہیں ہے کہ وہ ایک ہی ذات کے اندر سارے عالم کو جمع کردے" تو وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ "سارے عالم" میں ایک ہی ذات کو پھیلا کر "کائنات" بنادے اور وہ انسان صرف فرنگی محل کا ہو۔

ہر چہ در رہ جا نتوان دید بہر جا بینند!

آپ کو معلوم ہے کہ یہ مقدس ہستی کون ہے اور وہ کس معجزہ کو پیش کرکے "احیاء موتیٰ" کا یقین دلانا چاہتی ہے؟

—— یہ ممتاز و متبرک وجود افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، خضر راہ طریقت، مشعل جادۂ حقیقت، حجت الاولین،

سُلالۃ الآخرین، سرخیل اسلام، امام الہمام مولانا و مرشدنا محمد قطب الدین عبد الوالی صاحب قبلہ مدظلہ کا ہے اور وہ معجزہ محیر و مُسکت، ایک ماہوار صحیفہ "قیام الدین" کی صورت مین رونما ہوا ہے، جو آپ ہی کے والد محترم کے نام نامی یا خطاب گرامی پر گزشتہ شوال سے جاری کیا گیا ہے۔

اس سے زیادہ بدقسمتی میری اور کیا ہوسکتی ہے کہ شوال سے محرم تک جبکہ پورے چار مہینے اس مقدس صحیفہ کی اشاعت پر گزر چکے ہین، مین اس کے ظہور سے بالکل بے خبر رہا اور فرنگی محل کے اس "یدِ بیضا" کی روشنی سے محروم رکھا گیا۔ مین نہین کہہ سکتا کہ یہ دورِ محرومی کب تک جاری رہتا۔ اگر بہ حسن اتفاق سے مجھے ایک صاحب اس کی اولین اشاعت کی زیارت سے مشرف نہ فرماتے۔

کسی رسالہ کا پہلا نمبر یا تو اصولاً پورے اہتمام سے نکالا جاتا ہے، تاکہ لوگ جلد اسکی طرف مائل ہون یا مجبوراً ناقص نظم کی وجہ سے پست شائع ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسا ہوتا ہے تو ہمیشہ یہ معذرت بھی ساتھ ہی ساتھ پیش کر دی جاتی ہے کہ "نئے انتظام کے وجہ سے رسالہ حسب خواہش نہین نکل سکا، آیندہ نمبرون مین انشاء اللہ اسکی پوری تلافی کیجائے گی۔" چنانچہ یہ معذرت اس مین بھی موجود ہے کہ بوجہ رمضان مبارک کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ گویا رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس مین قیام الدین ایسے کام کو بھی کامیابی سے نہین کرسکتے۔ یہ ہے پہلا درس مذہبیت و جوش ایمان اس رسالہ کا جو اس دعوائے بلند بانگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے[۱]۔ اچھا اب آگے چلیے اور ہندوستان کے خانوادۂ علم و عمل، مرکز عقل و حکمت، اور مدارِ شریعت و روحانیت (فرنگی محل) کے اس کارنامہ فرید، اور اس انقلاب انگیز اقدام علم و ادب پر بھی ایک نگاہ ڈال لین، قبل اس کے کہ وہ زلزلہ پیدا کرکے زمین و آسمان کی بنیادین منہدم کردے، اور خدا کو بھلا دینے والی موجودہ مخلوق کو فنا کرکے، اس کی جگہ صرف حق سرہ کہنے والیان ہستیان در و دیوار پر بٹھادے۔

کسی رسالہ یا کتاب پر ہمیشہ دو مختلف زاویون سے نگاہ ڈالی جاتی ہے۔ ایک وہ جو صوری محاسن سے متعلق ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو جمال معنوی سے بحث کرتا ہے۔ مین اول الذکر حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا نہین چاہتا۔ کیونکہ جو رسالہ معمولی تقطیع کے صرف ۴۰ صفحات پر مشتمل ہو اور جسکی تکمیل مین ارزان ترین اہتمام طباعت و کتابت حاصل کیا گیا ہو، وہ خود بھی حسن ظاہری کا مدعی نہین ہوسکتا۔ اور پھر یون بھی ایک اسلامی رسالہ کو حسن و تزئین سے کیا واسطہ جبکہ علمائے کرام نے ہمیشہ فنون لطیفہ کی ترقی کو انحطاط ذہن و انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ (گو انکی اندرونی زندگی یکسر "شیفتگان جمال" کی طرح بسر ہوتی ہو) البتہ اسکے

---

[۱] اسی رسالہ مین ایک عنایت نامہ مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محل کا درج ہوا ہے جس مین اونھون نے بھی مضمون نہ لکھنے کا سبب یہ ظاہر کیا ہے کہ رمضان مین اُن کی فطری کاہلی اور نسیان دونون بڑھ جاتے ہین۔ مگر ممکن ہے کہ اسی کے ساتھ ان کی روحانیت بڑھ جاتی ہو۔ جو غالباً کاہلی و نسیان کا دوسرا اصطلاحی نام ہے۔

معنوی محاسن پر ضرور تبصرہ کرنا چاہتا ہوں جو میرا معاصرانہ فرض ہے۔

سب سے پہلے جس وقت مینے فہرست پر نگاہ ڈالی اور بیک وقت سات "مولاناؤن" کے نام نظر آئے، جن مین سے ایک مرحوم اور چھ غیر مرحوم ہین، تو مین حیران رہ گیا کہ دیکھئے آناز بردست اجتماع کیا انقلاب پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہین کہ نوح کا طوفان اُسوقت آیا تھا جب چار سیارے برج آبی مین جمع ہو گئے تھے۔ یہان برج فرنگی مین سات نار دہن کا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے آنیوالے وقت کا اندازہ کرنے کے لئے عقل حیران ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس "اقران اعظم" اس "اجتماع فرید" کے عہد مین کتنا پانی سر سے گزر جانے والا ہے۔

مین نے اولین فرصت مین شروع سے اخیر تک اس رسالہ کا مطالعہ کیا اور کوشش کی کہ سرورق سے لیکر صفحہ آخرین کی اُس سطر تک "جو قیام الدین بک ڈپو فرنگی محل لکھنؤ" کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے، کوئی ایک جملہ، کوئی ایک سطر، کوئی ایک لفظ ایسا مل سکتا، جسے فرنگی محل کی شہرت کے ساتھ (خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز) نسبت دیجا سکتی، لیکن مین اس مین کامیاب نہین ہوا اور گھنٹون سوچتا رہا کہ کیا واقعی ہمارے "علماء کرام" کی ذہنیت اسقدر پست ہو گئی ہے۔ کیا ان کے یہان اظہار علم وفضل کا طریقہ اب یہی رہ گیا ہے کہ بچون کی طرح چند نامربوط سطحی مضامین لکھکر اس پر فخر کرین، کیا خدمت علم و دین ایسے ہی حقیر و نحیف رسائل کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کیا اسی کارنامۂ فضل و کمال پر فرنگی محل کے "دارالعلم والعمل" ہونے کا دعوے کیا جاتا ہے (درآنحالیکہ قیام فرنگی محل سے لیکر اسوقت تک کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہین ملتا جس کی بنا پر ہم صحیح معنے مین اسے "دارالعلم" کہہ سکین چہ جائیکہ دارالعمل جس کا خواب بھی ان غریبون نے کبھی نہین دیکھا۔)

خویش را صورت پریشان ہرزہ رسوا کردہ اند
جلوہ می نا شند و در معنی نقابے بیش نیست

اس رسالہ کے اڈیٹر نے عنوان "تذکریہ" کے تحت مین جو تحریر درج کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مذہب کی اشاعت علوم کی خدمت، اتحاد و اتفاق کی تعلیم، ادبیات کی چاشنی اور نادر کتب خانون کے قابل قدر اقتباسات کو اہل علم کے سامنے پیش کرنا" اُس رسالہ کا مقصد ہے۔ لیکن اسی رسالہ مین ایک مضمون یا دش بخیر ہمارے محترم دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی ہے جنھون نے فرنگی محل کی قدیم علمی روایات کو سراہتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"آج نوجوان فرنگی محل کو جس اصلی حریف سے صف آرا ہونا ہے خوب جان لینا چاہیئے۔ وہ معتزلہ نہین، خوارج نہین (روافض کا ذکر نہین کیا گیا کیونکہ لکھنؤ مین رہنے کے بعد اسکی ہمت نہ تھی) علی گڈھ کے نیچری بھی نہین، وہ کوئی اسلامی فرقہ نہین، بلکہ وہ اشد شدید دشمن ہے جو نفس اسلام کا دشمن ہے، محض فرنگی محل، اکابر فرنگی محل، شیوخ فرنگی محل، عقائد فرنگی محل کا دشمن نہین۔ وہ دشمن ہے شریعت اسلام کا وہ دشمن ہے رسول اسلام کا وہ دشمن ہے خدائے اسلام کا، اُس سے مصالحت کی کوئی صورت نہین، اُس کے ساتھ راضی نامہ ہو جانے کا

کوئی امکان نہین .... وہ دور ہذا کی یاجوجی روح ہے جو قیام الدین ہی کی دشمن قاطع ہے۔ اور
قیام الدین اسی کو مغلوب کرنیکے لئے نکلا ہے۔"

"اس جہاد مین فرنگی محل سب کا شریک اور سب فرنگی محل کے شریک ہین، آج نہ کوئی دیوبندی ہے
نہ فرنگی محلی، نہ لکھنوی، نہ بریلوی، .... سب کے سب اسلام کے سپاہی، سب کے سب اللہ کے
لشکر کے سرفروش پیادے، سب کے سب ناموس رسول کے جانباز فدائی ہین۔

یاجوج، آج اپنے خفیہ و علانیہ تیر چلاتے ہوئے یہ بالکل نہین دیکھ رہا ہے کہ شر اور وہ بہتر فرقون مین
سے کس کے سینے اسکے تیرون سے چھد رہے ہین، اُسے تو عداوت یا بغض جو کچھ ہے وہ اللہ کی توحید اور رسول
کی رسالت سے ہے وہ (خاکم بدہن) اسی کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لئے اُٹھا ہے۔ آج ہم بھی اس یاجوج
کی عداوت و بغض مین سب کی طرف سے اندھے ہوگئے ہین .... اور ہمارے حملون کی زد بھی انشاء اللہ
اسی ایک حریف پر رہے گی۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالہ کا مقصد وحید، یاجوجی روح کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر ہم غلط نہین سمجھتے تو اس سے
مراد ان کی غالباً وہ عقل پسند (Rationalist) (؟) اور ان کے نزدیک وہ احمق طبقہ ہے جو کسی مذہب کی
حقیقت و حقانیت کو بغیر سمجھے ہوئے ماننے کے لئے تیار نہین۔ لیکن اگر اس سے مراد اُنکی کچھ اور ہے تو افسوس ہے کہ مین اسکو
سمجھ نہین سکا۔ کاش وہ اس استعارہ کی خود ہی صراحت فرماتے تاکہ اس یاجوجی تاویل کی ضرورت نہ ہوتی۔

ایک اور بزرگ ہین جن کا نام سید محمد اشفاق حسین رضوی ہے۔ ان کا بھی ایک مبتدیانہ مضمون "قیام الدین اور اتحاد"
کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کی ابتدا ہی یون ہوتی ہے کہ "اگر آپ لوگ متفق ہوکر اس رسالہ کی خریداری پر بجان دل
تیار و آمادہ ہوجائین تو یقیناً لامذہبیت کا خاتمہ ہوجائے۔"

اگر اس کو ہم مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر کا تتمہ خیال کرین تو یہ مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ اس رسالہ کے اجراء کا
مقصد یاجوجی قوت یا لامذہبیت کا مقابلہ کرنا ہے۔ خیر اس کے متعلق تو مین تفصیل کے ساتھ آئندہ صفحات مین (یا اگر گنجائش
نہ ہوئی تو آئندہ ماہ کے ملاحظات مین) عرض کرونگا کہ جس چیز کو وہ لامذہبیت کہتے ہین، اس کی حقیقت کیا ہے اور جس کا نام
مذہب رکھ لیا گیا ہے وہ فی الاصل کیا چیز ہے؟ پہلے ایک سرسری جائزہ اس "دین قائم کرنیوالے" رسالہ کے مقالات عالیہ
کا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شکریہ کے بعد سب سے پہلا مضمون مولانا قیام الدین عبدالباری مرحوم کا نظر آتا ہے جن کے نام کے جزء اول یا لقب سے
اس رسالہ کا نام استعارہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون مولانا موصوف کی تفسیر الطاف الرحمن کا ایک جزو ہے اور تیسرے پارہ کی پہلی
آیت سے متعلق ہے جو تلک الرسل سے شروع ہوکر یفعل ما یرید پر ختم ہوتی ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ مین جو کچھ مولانا

نے فرمایا ہے وہ بالکل وہی ہے جسکی فرنگی محل کے کسی عالم سے توقع کیجا سکتی ہے اور اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو ملا نظام الدین، عبد الحلیم بحر العلوم اور ابو الحسنات عبد الحیؒ کے وقت سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے اور جسکا عنصر واحد کورانہ تقلید، مغالطۂ منطقی اور قدامت پرستی کے سوا کچھ نہین ہے، مولانا عبد الباری مرحوم اس آیت کی تفسیر مین ایک دوسرے پر فضیلت انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھ جاتے ہین کہ "خدا نے فرمایا تم بھی رسولون مین سے ہو بلکہ افضل ترین رسل سے ہو" اسی مین لفظ "افضل ترین" کی صحت و عدم صحت سے بحث نہ کرتے ہوئے، مین صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہون کہ اس آیت سے محمدؐ کی افضلیت تمام رسولون پر کیسے ثابت ہوتی ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مین عیسیٰؑ کی افضلیت کا بیان ہے جسے "اٰتینا عیسیٰ ابن مریم البینات وایدناہ بروح القدس" سے ثابت کیا گیا ہے۔ محمدؐ کی افضلیت کا ذکر کسی جگہ نہین ہے اور نہ سیاق وسباق سے متبادر ہے۔ اسی سلسلہ مین مولانا عبد الباری نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "رسول وہ نبیؐ ہے جس پر کتاب نازل ہوئی ہو اور اُس کی شریعت خاص ہو وہ ۳۶۰ ہین" مین نہین سمجھ سکتا کہ مولانا نے ۳۶۰ کی تحدید وتخصیص کس تحقیق کی بنا پر کی ہے اور کیون نہ مین اس کو ۳۶۵ کہدون تاکہ سال کے پورے دنون کا حساب ہو جائے۔

اس کے بعد ایک صفحہ فتاوائے قیام الدین کے لئے وقف ہے جس مین چند نہایت ہی معمولی مسائل مسواک اور نماز جمعہ وغیرہ کے ایسے پائے جاتے ہین۔ جو فقہ کی ابتدائی کتابون مین بھی ملجاتے ہین۔

صفحہ ۷ سے ایک مسلسل مضمون مولانا عبد الباری مفتی اجمیری کا حیات طیبہ کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ جس سے مقصود مولانا عبد الباری مرحوم کے حالات سے بحث کرنا ہے۔

ابتدائی دو صفحات مین مولانا عبد الباری کی ولادت کا ذکر بالکل اسی لہجہ وانداز مین کیا گیا ہے جو عام طور سے ذکر میلاد کی کتابون مین پایا جاتا ہے اور باقی دو صفحات مین فرنگی محل کی تعریف کا راگ گایا ہے۔ جناب مفتی مولانا بھی ہین اور اجمیری بھی اور اُنکی یہ دونون نسبتین بدرجۂ اتم اس مضمون کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتی ہین۔

اس کے بعد مولانا عبد الماجد بدایونی نے ایک صفحہ مین مرحبا کے عنوان سے قیام الدین کے اجراء پر اظہار مسرت کیا ہے اور دعا فرمائی ہے کہ "یہ رسالہ علمی دنیا کے لئے ایک یادگار چیز ہو" اس دعا کی سادگی اور تمنا کی معصومیت پر عرصہ ہوا غالب اظہار خیال کر گیا ہے کہ "حریف مطلب مشکل نہین فسون نیاز" کاش مولانا کوئی التجا کرتے تو اس نوع کی کہ "دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز" اسکے بعد مولانا عبد الماجد دریابادی کا وہ مضمون ہے جسکا اقتباس ہم پہلے دے چکے ہین اور پھر مولانا شاہ حسین میان پھلواروی کا وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جسمین اُنھون نے مولانا عبد الباری مرحوم کے جوش جہاد و مذہبیت کا ذکر پورے واعظانہ رنگ مین کیا ہے اور جسکا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"جناب مولانا ہمیشہ جہاد کے لئے طیار رہتے تھے۔ ایک بار منت مانی کہ جب دانت ٹوٹین گے تو جہاد کرونگا، چنانچہ تحریک خلافت کے زمانہ مین کسی خاص موقعہ پر جب آپ جہاد کے لئے طیار ہو گئے تھے تو یہ سوچکر کہ منت پوری کرنا ضروری ہے آپ فوراً اسپتال تشریف لیگئے اور سامنے کے چار دانت تڑوا دئے"

مین نہین سمجھ سکتا کہ فاضل مضمون نگار نے اس واقعہ کے اظہار سے مولانا مرحوم کی کس خصوصیت کا اظہار کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہین ہوتا کہ مولانا مرحوم مین جوشِ جہاد زیادہ قوی تھا یا منت پوری کرنے کا خیال۔ جہاد تو خیر اُنھون نے کیا یا نہین لیکن دانت توڑ وا دینا تو سامنے کا واقعہ ہے اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ منت پورا کرنے کا خیال ان مین بہت زیادہ قوی تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ لکھنؤ کی فضا مین پرورش پانے کے بعد اسی قسم کے لسانی اور رسمی جذبات زیادہ نشو ونما پا سکتے ہین۔

اس کے بعد "قیام الدین اور اتحاد" کے عنوان سے اشفاق حسین صاحب رضوی کا مضمون ہے اور پھر مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا عنایت نامہ جن کا اجمالی ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ صفحہ ۶۴ سے زکوٰۃ پر جناب مولانا محمد قطب الدین عبد الوالی صاحب کی تحقیق فریدہ شروع ہوتی ہے جس مین اُنھین خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو ایک واعظ کی طرف سے ہر محراب و منبر پر بیان کئے جاتے ہین، مسئلہ زکوٰۃ کے سلسلہ مین سب سے زیادہ ضروری و اہم چیز اُن اقتصادی مسائل و اصول سرمایہ داری کی بحث ہے جن پر آجکل تمدن کی ترقی کا انحصار ہے اور جو صحیح معنے مین نوع انسانی کو جمہوریت و آزادی کی طرف لیجاتے ہین۔ اور اسی کے ساتھ مسائل زکوٰۃ مین وقت و زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی ضرورت پر اظہار خیال ضروری ہے۔ لیکن ہمین معلوم ہے کہ یہ باتین مولانا کے "نظامی" دسترس سے باہر ہین۔ اور وہ سوائے اُسی ایک ارغنون کی آواز کے جو فرنگی محل کے معلم اول نے ساز کیا تھا، کوئی اور نغمہ پیدا کر ہی نہین سکتے۔

اس کے بعد ایک مضمون مسلسل تصوف پر بشیر احمد صاحب علوی کا ہے اور دوسرا "ہندوستان قبل اسلام" کے عنوان سے جناب اڈیٹر کا۔ ان دونون کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ آخر الذکر مضمون کے لئے جو چار صفحات شائع کئے گئے ہین وہ اول الذکر مضمون ہی کو ملنا چاہیئے تھے۔

اس رسالہ کے مقاصد مین چونکہ "ادبیات کی چاشنی" بھی شامل ہے، اس لئے اس کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمالیجئے اور تھوڑی دیر کے لئے اس حقیقت کو بھلا دیجئے کہ یہ اشعار اس رسالہ مین پائے جاتے ہین جو قیام مذہبیت، تحسین اخلاق، نشر علم و حکمت ایسے سنجیدہ اور اہم مباحث کے لئے اس مقام سے نکلا ہے جسے "دار العلم والعمل" کہنے مین کوئی تامل نہین کیا جاتا۔

شاہ حسین میان کے اس مضمون کے بعد ہی جس مین مولانا عبد الباری مرحوم کے جوش جہاد اور "دندان شہید" کا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب وحید کی ایک غزل درج ہوتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

بے مزہ اس واسطے آوازِ نے ہونے لگی، ریشِ قاضی پنبۂ مینائے مے ہونے لگی،

دونون مصرعے خواہ کتنے ہی بے ربط ہون اور یہ شعر اپنی جگہ کتنا ہی مہمل کیون نہ ہو، لیکن اڈیٹر رسالہ کے حسن انتخاب کی داد دینا ضرور ہے کہ شاہ حسین میان کے اس مضمون کے بعد اس سے بہتر "تنقید تعریضی" اور کوئی نہین ہو سکتی تھی۔

اس غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

کیون نہ وہ طوفان اُٹھائے کیون نہ مجھکو فریب
تیری ہی جانب سے جب دشمن کو شے ہونے لگی

"شے ہونے لگی" کی داد صرف خواجہ عبدالرؤف عشرت دے سکتے ہین جو لکھنؤ کی زباندانی کے سب سے بڑے علمبردار ہین

متسیرا بے پناہ شعر بھی سُن لیجئے:-

ہو گئے بدکیف دشمن تنگ ظرفی کے سبب
اس قدر پی لی کہ آخر سب کو قے ہونے لگی

لطف یہ ہے کہ اس غزل کے بعد ہی "فیوض حضرت بالسنہ" کا اشتہار درج کیا گیا ہے۔

صفحہ ۲۷ پر جناب رشید الکھنوی کی ایک غزل درج ہے آپ کے الہامات شعری بھی ملاحظہ ہون:-

تم جو اٹھلاکے چلو حشر ہی برپا ہو جائے
انھین قدمون کی قسم کیا سے ابھی کیا ہو جائے

دست نازک سے بھلا سر کا قلم ہو نا کیسا
ہاتھ بدتے ہین اگر تیغچہ سید ہا ہو جائے

تیر دزدیدہ نظر دل کا تجسس نہ کرے
سینہ تک آکے ذرا بائین پہ ترچھا ہو جائے

الغرض یہ ہین وہ "ادبیات عالیہ" اور یہ ہین وہ "مذہبیات دعکیات فائقہ" جن کے ذریعہ سے "قیام الدین" دنیا مین ذہنی، علمی، اخلاقی و مذہبی زندگی پیدا کرنے کے لئے رونما ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان عدیم النظیر تحقیقات حکمیہ اور ادبی شاہکارونکو دیکھکر کوئی کافر ہی ہوگا جو اس دعوے کی صحت پر ایمان نہ لے آئے۔

ماہ آیندہ کے ملاحظات مین، ہمارا خطاب صرف مولانا عبدالماجد دریابادی سے ہوگا اور ہم بتائین گے کہ یاجوجی قوت کا حقیقی سرچشمہ کہان ہے اور یہ کہ صحیح معنے مین اس کے عساکر کا اجتماع کہان پایا جاتا ہے۔ جہان "قیام دین" کی ضرورت بتائی جاتی ہے، وہان، یا اس جگہ جہان سے "قیام دین" کی آواز بلند کیجاتی ہے۔

آگاہ نہ تب درون را ، نشتر چہ زنی رگ جنون را

⁂

اس ماہ کی اشاعت مین ہمارے فاضل دوست مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "بحث سنت" پر غور سے پڑھنے کے قابل ہے یہ ماہ آیندہ مین ختم ہو جائے گا۔ اگر مولوی سید مقبول احمد صاحب بی۔اے جنکے جواب مین یہ مقالہ تحریر ہوا ہے، اس پر کوئی ایراد پیش کرینگے تو وہ بھی درج کیا جائے گا۔ اور پھر مین اپنی حقیر رائے اس نزاع پر پیش کرون گا۔ قرآن کے لطائف ادبیہ اور آصفی نظامی دونون مضمون سلسلہ کے ہین۔

ہمارے عزیز دوست مولوی علی اختر صاحب اختر نے جس تکمیل کے ساتھ اس مشکل مسئلہ پر بحث کی ہے وہ تحقیقاً شاعری کی دنیا مین کوئی معمولی چیز نہین۔

نیاز

سلہ محاورہ تو "ناک بدنا" ہے۔

خاقانی ہند قاآنی عصر علامہ آصفی نظامی رح

(مسلسل)

۲۳۔ عرفی کی کائناتِ بہار ختم ہو چکی لیکن آصفی کی حقیقت ابھی تک بے نقاب نہیں ہوئی ہے۔ عرفی معیار بہار نہیں تھا لیکن معیار بہار قاآنی ہے۔ اسلئے اب ہم آصفی کو وہمیات کے بجائے، وجدان اور فطرت میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں یہی اسکا کمال ہے۔ اور اسی جگہ سے اس کے حدود، ایران اور ہندوستان کے تمام شعراء سے الگ ہوتے ہیں۔

درحقیقت آصفی، قاآنی کے پیرو ہیں۔ جو نیچر کا سب سے بڑا غماز ہے اس لئے قصائد پر قصائد پڑھتے چلے جاؤ فطرت اور اس کے رموز واسرار کا بیان ختم ہی نہیں ہوتا۔ ابر و باد، بہار و خزاں گلبن و بوستان، وغیرہ سے متعلق۔ سیکڑوں تشبیہیں لکھی ہیں۔ اور کچھ ایسی بامزہ لکھی ہیں، کہ "لا عین رات ولا اذن سمعت" دنیا مردہ پرست ہے۔ بڑے بڑے نامور ادیب، زندگی میں ایک نگاہ التفات کے لئے ترس کر مر گئے۔ لیکن دنیا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہی ہستیاں مرنے کے بعد علم ادب کی مسجود قرار پائیں، اور ہر شخص نے عقیدت کے دو چار پھول ضرور چڑھائے۔

کمال کی ناقدری کسی خاص زمانہ اور خاص ملک میں شیوۂ عوام و خواص نہیں رہا۔ ہر ملک ہر قوم اور ہر زمانہ میں یہی شکایت نظر آتی ہے۔ ابن رشیق قیروانی صاحب العمدۃ فی صناعۃ الشعر نے ایک قطعہ لکھا ہے۔ صاحب معجم الادبا اسکی شانِ نزول یہ لکھتا ہے۔ کہ ایک ادیب نے طبقات الشعراء لکھنا شروع کی۔ اور تبصرہ میں تقدم و تاخر کو وجہ فضیلت قرار دیا۔ بات بہت کمزور تھی۔ کوئی ضروری نہیں۔ کہ زمانہ کا تقدم، علم و فضل، اور سعادت و فطانت میں بھی پیش پیش رکھے۔ ابن رشیق ان تمام شعراء سے کم سن تھے جنکا کتاب میں ذکر تھا اسلئے یہ سب سے کم رتبہ قرار دیئے گئے تھے۔ انھیں خبر ہوئی تو یہ قطعہ لکھ بھیجا

رفقاً ابا اسحاق بالعالم　　　حصلت فی اضیق من خاتم

لو کان فضل السبق منہ وجہ　　　فضل ابلیس علی آدم

ابو اسحق دنیا سے بہ نرمی و ملائمت پیش آؤ۔ تم انگوٹھی سے تنگ تر حلقہ میں پھنس گئے۔

اگر سابق کی فضیلت میں وسعت ہوتی۔ تو شیطان آدم علیہ السلام سے بزرگ تر تھا۔

جب یہ قطعہ ابو اسحق تک پہنچا۔ تو انھوں نے مجوزہ اسلوب بدل دیا۔ اسی مفہوم کو ابن شرف قیروانی نے دو قطعوں میں ادا کیا ہے

قل لمن لا یری المعاصر حقا　　　ویری للاوائل التقدیما

ان ذاک القدیم کان جدیدا　　　وسیغدو ھذا الجدید قدیما

اس شخص سے کہدو۔ جو اپنے معاصرین کا حق شناس نہیں ہو صرف سلف اور گذشتہ آدمیون کو افضل جانتا ہے، کہ یہ کہنہ بھی کبھی نیا تھا۔ اور عنقریب یہ نیا بھی قدیم ہو جائیگا

دوسرے قطعہ مین اس کی وجہ بھی بیان کرتا ہے۔

اعزی الناس بامتداح القدیم ۔۔۔ و بذم الحدیث غیر الذمیم

لیس الا لانھم حسدوا الحی ۔۔۔ و رقوا علی العظام الرمیم

مطلب یہ ہے۔ کہ لوگ پورانے لوگون کی تعریف اور نئے آدمیون کی برائی صرف اسلئے کرتے ہین۔ کہ انکو دیکھ نہین سکتے۔ حسد کے مارے اور کچھ نہین تو مذمت ہی شروع کر دیتے ہین۔

مولانا آصفی نے بھی متعدد مرتبہ یہی سبق دھرایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انھین بجا شکایت ہے۔ جو ذات متقدمین، متوسطین، متاخرین ہر طبقہ کی حریف ہو وہ یون محروم التفات رہجائے ہزار وصد ہزار حیف ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔

۱۔ قاآنی نے ایک تشبیب مین، بادل کا سمان نظم کیا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہے۔ کہ۔

"بخارات اُٹھ اُٹھکر جو سما مین سیاہ چادر سی بنجاتے ہین۔ ہوا چلتی ہے۔ اور اس سیاہ چادر کو عالم پر تان دیتی ہے۔ بدلیان آتی ہین۔ گرجتی ہین۔ اور برستی ہین۔ بجلیان پیدا ہوتی ہین۔ کڑکتی ہین۔ اور چمکتی ہین۔"

میر محبوب علی خان والئ دکن کی مدح مین، مولانا نے ایک قصیدہ لکھا ہے۔ تشبیب مین، یہی سمان بیان کیا ہے۔ ہم دونون تشبیبین دوش بدوش نقل کرتے ہین۔ انصاف پسند دماغ دیکھین۔ کس طرح ایک ہندی، ایرانی شہسوار سے گوئے سبقت لیجانا چاہتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ان کی جانب سے ابن شوق اور ابن شرف کا جواب دہرایا جائے

قاآنی	آصفی
بگردون تیرہ ابرے، بامدادان بر شد از دریا جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا	چہ دود است این کہ پوشیدہ است وی نیلگون دریا ز دریا سر بر آوردہ، چو دیے شد ہوا پیما
چو چشم اہرمن خیرہ، چو روی زنگیان تیرہ شدہ گفتی ہمہ چیرہ بمغزش علت سودا	رود آشفتہ از جیحون، دود شوریدہ در ہامون پریشان صورت مجنون، و زلفش چون طرۂ لیلی
شبہ گون چون شب عاشق، گرفتہ چون دل عاشق باشک دیدۂ وامق، برنگ طرۂ عذرا	شب تار از تہ زنگی، سیہ چون چہرہ زنگی عیان آثار دلتنگی، نہان جمعیت دلہا
تنش با قیر آلودہ، دلش از شیر آمودہ برون پُر سرمہ سودہ، درون پر لوءلوء لالا	چو شام عاشقان تیرہ، چو مغز کافران خیرہ بہ دشت و کوہ شد چیرہ، بگردون کردہ استیلا

قاآنی	آصفی
بدل گلشن بہ تن زندان، گہے گریان گہے خندان	بود چون کوہِ گردندہ، بسوئے چرخ پویندہ
چو در بزمِ طرب، رندان زشورِ نشاءِ صہبا	ز کانِ خویش ریزندہ، بدریا جوہرِ والا
چو دودے برہوا رفتہ، چو دیوے مست آشفتہ	نہنگے برہوا رفتہ، در آغوشش فلک خفتہ
زدہ بس ورنا سفتہ، زمستی خیرہ در خارا	بکامِ خویش بگرفتہ، چو ماہی، یونس بیضا
شدہ خورشید نور افشان ببالای جرمِ او پنہان	چو پیلے بحر را نوشد، چو شیرِ مست بخروشد
چو شاہِ مصر در زندان، چو ماہِ چرخ در ظلما	چو بیضہ، چرخ را پوشد، کشاید شہپرِ عنقا
دیا در تیرہ چہ بیژن، نہفتہ چہرۂ روشن	ہوا تازندہ کل گونش، برد جولان بہ گردونش
دیار روشن کہ بہمن، شدہ در کامِ اژدرہا	زدشت و کوہ دامونش، محابا نیست نے پروا
زبیمش مرغ جان پرد، ز ہیبش زہرہا درد	بگردون میکشد آوا، ز سودا می کند غوغا
چو او چون اژدہا غرد، و چون رعد کشد آوا	تنش را علتِ سودا، دلش را علتِ صفرا
خرد شد ہر دم از گردون، کہ پوشد برتنِ ہامون	چو عفریت ست روئی او، فرشتہ دار خوئی او
ز سنبل کسوتِ اکسون، ز ژالہ خلعتِ دیبا	ز خشک و تر بسوئی او، بود چشم اہلِ ایما
فشاند بر چمن ژالہ، دماند از دمن لالہ	بہ برنیلی قبا دارد، ز جیبِ اختر فرو بارد
چنان از دل کشد نالہ، کہ رعد از فرقتِ اسما	بکوہ و دشت نگزارد، بنورش گردے از ظلما

یہان سے قاآنی نے چمن کی طرف گریز کی ہے۔ ابر کی کوئی نئی تشبیہ نہین لکھی۔ آصفی کی ندرتِ تشبیہہ پہلے بھی متعدد دلائل گذر چکے ہین۔ یہ قصیدہ مہر ہے۔ جو فطرت نے ختمِ شعر پر ثبت کر دی ہے۔ امثال و نظائر کا دریا امنڈ پڑا ہے۔ دیکھو کس خوبی کے ساتھ قاآنی کی کمی کو ایک ہندی دماغ نے پورا کیا ہے۔ فرماتے ہین۔

جہان از گریہ اش خندان، ز چشمش لولو و مرجان — بجیبِ گلشن و بستان، بکوہ و دامنِ صحرا

درونش مشرقِ بیضا، برونش یک شبِ یلدا — درون چون طلعتِ عذرا، برون چون طرۂ لیلی

گہے چون پیلِ غرندہ، گہے چون نیلِ جوشندہ — گہے چون سیلِ ریزندہ، بسوئی پستی از بالا

گہے رقصیدہ مستانہ، گہے پوئیدہ دیوانہ — بآرد بویرانہ، سمان رہ بردد گہ در وا

بود گریندہ چون عاشق، پریشان چون دلِ وامق — بہ پہنائے شبِ غاسق، ز دردِ فرقتِ عذرا

فشاند شعلۂ آذر، کشد دم صورتِ اژدر — بغرد ہمچو شیرِ نر، کند چون دیو استیلا

جہد از مغز او آذر، چکد از چشم او گوہر — چو گوہر، یکسرہ اختر، چہ اختر، اخترِ رخشا

فلک در قیر آلاید، زمین پرشیر بنماید — دہانِ غنچہ بکشاید، بہ آن شیر طفل آسا

گہے گوہر چکد از دے، گہے صورے دمد از دے　　گہے سنبل شود از وے، اسیر علتِ سودا
سراسر چشمۂ قطرک، شود از دامنش ریزان　　بود در قطرہ اش پنہان، بہارِ عشرتِ دلہا

۲ - شاہزادۂ شجاع السلطنتہ کی مدح مین قاآنی کا ایک قصیدہ ہے سے زد بدلم اے نسیم آتش ہجرانِ یار تشبیب کی ابتدا وصف شراب سے کی ہے۔ مگر ثانی مطلع سے بہار کی طرف گریز ہے۔ آصفی نے میرزا عبدالرحیم معتمد صرف خاص کی ستائش مین جو قصیدہ لکھا ہے۔ وہ اسی بحر مین ہے۔ اور بہاریہ ہے۔

اللہ اللہ۔ قاآنی کے سامنے زبان کھولنا۔ اور پھر وہ بھی حریف بنکر سے

کارے ست کہ ہیچ کس نکرد ست ہنوز

قاآنی　　مژدہ کہ شد در چمن رایت گل آشکار　　بردسوے کوہسار، کوکبہ ابرِ بہار　　آصفی
مژدہ کہ سرزد بہمن از دمن و مرغزار　　بہمن و دی گشت زار، از غمِ آن گیرودار

ابر بہار، اپنے جرار لشکر کو لیکر، خزان کو پامال کرنے کے لئے نکلا ہے۔ پکڑ دھکڑ کے خوف سے بہمن و دے (خزان کے دو ماہ) کے لشکر مین وہ ہلچل پڑی ہے۔ کہ خدا محفوظ رکھے۔

قاآنی　　وجد کنان شاخِ گل از اثر بادِ صبح　　سوری رومی عذار، قلب گرفت استوار　　آصفی
رقص کنان سروِ نازنہ، برطرفِ جوئبار　　لالہ قزلباش وار، صف زدہ در ہر کنار

سوری، ایک قسم کا سرخ رنگ پھول ہے۔ وہ قلب فوج کا کمانڈار ہے۔ ادھر دونون بازو دن میمنہ اور میسرہ پر گل لالہ ترکون کی طرح، ڈٹے کھڑے ہین۔

قاآنی　　لالہ بکف جام مے، گشتہ مہیاے عیش　　تاخت بہر باغ و کشت، لشکر اُردی بہشت　　آصفی
گرچہ ز نقصانِ عمر ہست بدل داغدار　　دشت ازان شد بہشت، راغ شدہ مرغزار

اردی بہشت (بہار کا ایک مہینہ) کا لشکر چارون طرف، کھیتون اور باغون مین جا پہنچا۔ اور خزان کا عمل اُٹھ گیا اب چٹیل میدان، چمن، اور بن سبزہ زار نظر آرہے ہین،

قاآنی　　گوش فرا دادہ گل تا بچمن بشنود　　گیسوئے نرگس بکف نیزہ دود ہر طرف　　آصفی
از دہنِ عندلیب شرحِ غم بیشمار　　خیل خزان صف بصف، شد بسنانش فکار

نرگس نے نیزہ ہاتھ مین لیکر خزان کی صفون کی صفین الٹ دین ہین۔ جدہر دیکھئے۔ زخمی اور مقتولون کے انبار لگے ہین

قاآنی　　زان بزبان فصیح کردہ روایاتِ شوق　　سوسن زنگی سرشت، ہمرہِ اردی بہشت　　آصفی
قصہ ز ہجرانِ گل، شکوہ ز بیدادِ خار　　کرد شبر دبین دخشت، حملہ یمین و یسار

اردی بہشت کے ہمراہ سوسن بھی، چھوٹے چھوٹے برچھے لیکر داہنے اور بائین حملہ آور ہے۔

قاآنی — آصفی

وقتِ سحر گشت باز دیدۂ نرگس زخواب — خنجر سوسن کشاد، یکسرہ خونِ فساد
تاکہ صبوحی زند از پئے دفعِ خمار — سینۂ گلزار داد، خونِ خزانِ آشکار

سوسن نے خزان کے سینہ مین خنجر مار کر، سارا فاسد خون نکالدیا یہ لالہ کاریان، اسی خون کی ہین، جو چمن مین نظر آرہی ہین

قاآنی — آصفی

غنچہ کشاید دہن، تاکہ زپستانِ ابر — خشک وہمہ تر گرفت، بحر وہمہ بر گرفت
از قطراتِ مطر، شیر خورد طفل دار — دشت وچمن در گرفت، موکبِ فصلِ بہار

غرضکہ لشکر بہار نے خشکی اور تری سب پر قبضہ کرلیا۔ اب دشت وچمن، بحر وبر سب اس کے زیر نگین ہے۔

قاآنی — آصفی

باد بر خسارِ باغ غالیہ سائی کند — چند وچہ زاغ وزغن باہمہ رنج ومحن
زلفِ سمن را دہد، نفحۂ مشکِ تتار — رفت بدشت ودمن، از چمن ومرغزار

منحوس ویرانہ پسند پرندے، الو، کوے، اور چیلین سب چمن اور سبزہ زارون کو چھوڑ کر جنگلون مین پناہ گزین ہوگئے ہین۔ اب ان کے لئے یہان جائے امن نہین۔

قاآنی — آصفی

چہرہ ریاحین رود در عرق از آفتاب — فاختہ وہم ہزار، در چمن ومرغزار
مروحہ زان رود ہد، باد بدستِ چنار — کبک وکلنگان وسار، ہر طرف جویبار
لالہ بسانِ صدف ابر دُرد چون گہر — زمزمۂ بلبلان، ہمہمہ صلصلان
شاخ شود باردر، باد شود مشکبار — خندۂ عیشِ گلان، بردہ زدلہا قرار

اب چمن مین اور نہر کے کنارے، فاختہ، بلبل، کبک، کلنگ اور سارس براج رہے ہین۔ اور خوشنوا پرندون کی نغمہ آفرینی، اور پھولون کے خندہ سے دل بے تاب ہوا جاتا ہے۔

قاآنی — آصفی

سوسن ازان رو شدست شہرہ بآزادگی — رقص کنان شاخِ گل، دست فشان مست مل
کز دل وجان میکند مدحِ شہِ کامگار — این بصدائے دہل، وان بنوائے ہزار

قاآنی نے مدح کی طرف گریز کرلی۔ لیکن آصفی کی مواج طبیعت ابھی طوفانی ہے۔ ہوا سے پھولون کی ڈالیان ناچ رہی ہین۔ بلبلین گانے مین مصروف ہین۔ لوگ شراب پی پی کر، دہل کی آواز پر کود رہے ہین

سرو شد آراستہ، چون بتِ نوخاستہ — شد ہمہ دل خواستہ، سازِ نشاطِ بہار
نامیہ از ساحری، ساختہ صنعت گری — بتکدۂ آذری، گشت چمن از نگار

قوتِ نشو ونما نے جادو سا کیا ہے کہ نقش ونگار سے، چمن، آذر کا بتکدہ نظر آتا ہے۔ رنگ برنگ پھول اس خوبصورتی سے بنائے ہین۔ کہ عقل حیرت کرتی ہے۔

ساغر یاقوت رنگ، پُر ز شرابِ فرنگ — یا کہ دمیدہ ز سنگ، لالۂ احمر عذار

گل لالہ، پہاڑون مین کھلا ہوا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یاقوت رنگ پیالہ ہے۔ جس مین یورپ کی سرخ سرخ شراب بھری ہے

غنچہ صراحی بدست، لالہ بود می پرست　　گل ز طرب نیم مست، نرگس از ان در خمار

غنچہ کے ہاتھ مین صراحی ہے۔ لالہ اس مین سے لیکر پی رہا ہے۔ پھول سرخوش ہین۔ اور نرگس پر خمار

ز آتش می بلبلہ۔ سوخت چنان مشعلہ　　شد ہمہ را مشغلہ، بر صفت شعلہ زار

چونکہ شراب کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ اسلئے۔ بیک نظر یہ خیال گزرتا ہے۔ کہ شعلے ہین۔ جو گلاس مین بھر دیئے ہین۔ جب شراب گلاس مین انڈیلی جاتی ہے۔ تو تیزی اور جوش کی وجہ سے جھاگ پیدا کر دیتی ہے۔ جو بالآخر ہوا سے مرجاتے ہین۔ شاعر یہ منظر دیکھ کر خیال کرتا ہے۔ کہ یہ جھاگ نہین ہین۔ مشعلین ہین۔ جو آتش مے سے روشن کر دی گئی ہین۔

بادہ میانِ قدح، جوہرِ جانِ قدح　　دادہ نشانِ قدح، لمعۂ آن ہر کنار

لالہ بود مستِ می، قطرۂ شبنم چو خوی　　ریختہ بر روی وی، ہمچو دُرِ شاہوار

نامیہ چون سر زدہ، بادیہ خرم شدہ　　گشت ہمہ گلکدہ، دشت و دمن، کوہسار

سبزۂ لیلی نسب، زدہ ہوائے طرب　　خیمہ برسم عرب، در چمن و مرغزار

ژالہ بصحرا و راغ، چون گہرِ شب چراغ　　قطرہ براطرافِ باغ، کوکبِ شبہائے تار

غالیہ سا گشت باد، طرۂ سنبل کشاد　　ہم گلِ مشکیجہ داد، نکہت مشک تتار

گشت بفیضِ نسیم، زندہ عظامِ رمیم　　عیسئ گل را شمیم، شد نفس روح بار

دیدۂ نرگس بخواب، طرۂ سنبل بتاب　　عارضِ ہر گل بآب، بلکہ بود شعلہ بار

ایک طرف قاآنی کا قصیدہ پڑھو۔ دوسرے پہلو مین آصفی کی گلکاریان دیکھو حق یہ ہے۔ کہ ہندوستان کا قاآنی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا قلم بھی دریائے مواج کی مانند، غم بلند و پست سے بے نیاز ہے۔ الفاظ کی ہم آہنگی، بحر کی موسیقیت بندش کی چستی، تراکیب کا ترنم، زبان کی چاشنی، وہ کون سی صفت ہے، جو قاآنی مین ہے اور آصفی مین نہین پھر تخیل کا ہلکا ہلکا رنگ اس پر مستزاد ہے۔

۳ - قاآنی نے حاجی آقاسی مرزا کی مدح مین بہار یہ لکھا ہے۔ مطلع ہے۔

عطسۂ مشکین زند ہر دم نسیم مشکبار　　باد، گوئی آہوے چین ست کار دمشک بار

آصفی نے بھی اس بحر مین قصیدہ لکھا ہے۔ تشبیب کی ابتدا صنع باری سے کی ہے۔ فطرت کی چمن آرائیان، قدرت کی نیرنگیان، اور عالم خاک و بادیہ حکمت باری کی گلکاریان بیان کرتے کرتے، بہار کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ فرماتے ہین۔

عالم امثال، اگر خواہی، کہ بینی آشکار　　عینک گلہا بنہ بر دیدہ ہائے اعتبار

دیدۂ اعمی زرہ از خاک، بر گیر و سراغ　　پردۂ چشمش شود گل برگ و شبہائے تار

ہر کجا بینند، ریزد کیسۂ گل زرِ ناب خاک باشد بو تۂ زر، کیمیاگر نو بہار
سبزۂ پیروزہ گون و لالہ ہائی لعل رنگ لاجورد و لعلے آمیزد بہ نقش روزگار
کارگاہِ باغ را بینی پر از چینی حریر دشت را یابی نگارستانے از رومی نگار
دامنِ باغ ست، از لالہ، چو باغِ کاشمر جیبِ باغ ست از گلِ مشکیچہ چون دشتِ تتار

کیسا سادہ لطیف، اور پرکیف طرز ادا ہے۔ ہر ہر شعر بہار در دامن نظر آتا ہے۔ ذیل کے اشعار مین تخیل کی رنگ آمیزی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تاج محل کی پچی کاری ہے۔

عکسِ موجِ لالہ و گل گر بآب جو فتد رنگ چون قوسِ قزح بالد بموجِ جویبار

نہر کے کنارے لالہ اور گلاب لہلہا رہا ہے۔ جب ہوا سے درخت اور پودے جھومتے ہین یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ رنگ کے دریا مین موجین اُٹھ رہی ہین۔ جب اس منظر کا عکس نہر مین دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ نیلے پانی پر دھنک ہے، جو ہوا سے لہرا رہی ہے کیسی خوبصورت مرکب تشبیہ ہے۔

گر صبا از کوہسارا ن جانبِ صحرا رود دامنِ صحرا شود از گرد راہش لالہ زار

پہاڑ کے دامن سے ہوا گذرتی ہے۔ تو اسقدر رنگ بدامن ہو جاتی ہے۔ کہ جس جنگل مین سے گذر جاتی۔ سارا کا سارا گلِ لالہ کا تختہ معلوم ہوتا ہے۔ سبحان اللہ رنگ کا طوفان امنڈ آیا ہے۔ گرد و غبار تک سرخ ہو گیا۔ برسات مین سارا جنگل چمن بنجاتا ہے۔ جس طرف دیکھیے۔ پھول ہی پھول کھلے ہوتے ہین۔ شاعر اسکی وجہ یہ قرار دیتا ہے۔ کہ دامنِ کوہ سے ہوا اپنے ہمراہ جو غبار اڑا لیگئی تھی وہ اس طرح رنگ رنگ کے پھولون کی شکل مین نمایان ہوا ہے۔

شد چمن از سبزۂ خرم چو طوطی سبز پوش بالِ طوطی میدہد جائے گیا در سبزہ زار

ہری ہری گھاس کا جنگل مین دور دورہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحرا طوطا ہے۔ اور گھانس اسکے پر ہین۔

صورتِ سبزک شود، بالِ حواصل سبز رنگ پر فشاند ز اہتزاز باد اگر در مرغزار

سبزک، ایک قسم کا رنگین پرندہ۔ غالباً نیل کنٹھ۔ حواصل دریائی پرندہ، غالباً بگلا۔ اگر مرغزار مین سفید رنگ پرندہ پر پھٹ پھٹائے۔ تو نیل کنٹھ کی طرح رنگین ہو جائے۔

از ہوا، جامِ زمرد گون شود جامِ بلور غورہ گردد قطرۂ شبنم ز عکسِ سبزہ زار
از نمو چون کاکل سنبل شود دودِ چراغ غنچۂ و گل از ہوا گردد چہ شعلہ چہ شرار
بادہ در گوشِ صدف گوید اگر حرفِ بہار غنچۂ رنگین شود در بحر، در شاہوار

سبحان اللہ، حسنِ تخیل، اور جدتِ ادانے کیسی سحر کاری کی ہے اگر سیپ کے کان مین ہوا موسم بہار کی کوئی بات کہدے، تو موتی جو سیپ کے اندر ہوتا ہے۔ اپنی ہیئت تبدیل کرکے اس بات کے اثر سے کلی بنجائے

گل بجود بالد ز عشرت در میانِ شاخسار | سر دمی جنبد بر عنائی کنارِ لالہ زار
بلبل از سازِ طرب بر شاخِ گلبن در نشید | بر گہا دستک زن از سازِ نشاط روزگار
از فروغِ حسنِ نسرین و جمالِ نسترن | ماہِ تابندہ شود ہر کوکبِ شبہائے تار
دشت را از لالہ و گل، گلشنِ رضوان حبیب | گلستان را از گل و ریحان بہشتے در کنار

آصفی کی تشبیب کا بڑا حصہ بہاریہ ہے۔ تنگیٔ وقت اجازت دیتی۔ تو یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام دیتا، مسرت خاص ہی سہی۔

ہم آب ولِ خاک چنان سیراب ست | کہ بود ذرہ چو گرداب ہمہ طوفان کار
قطرہ از جوشِ روانی ہمہ سیلاب شود | سیل از موج کشائی ست چو بحرِ ذخار
تیغ خورشید اگر سبز شود نیست عجب | خیزد از خرمیٔ سبزہ زبس جوشِ بخار
عجبے نیست کہ روید بصدف غنچۂ گل | بسکہ از رنگِ بہار ابر بود دُر بار
عجبے نیست کہ در کاغذِ باد ی ہوا | گوہرین سلک شود رشتہ باینارِ قطار
عجبے نیست اگر ابر ز مستانہ روی | جانبِ دشت کند راہ غلط از گلزار
عجبے نیست کہ چون سبزہ بیالد بر خویش | آبِ آئینہ دہد نشو ونما از زنگار
لالہ زار نیست ز ہر داغ بہ پہلوی پلنگ | جوش زد رنگ بکہسار ز یاقوت شرار
تازہ جانے رسد از نکہت گلہا بمشام | تازہ روحے بقوالب دمد از بوئی بہار
ہر کجا شوق رود، لالہ بہ بیند خرمن | ہر کجا ذوق رسد گل ہمہ یابد ایثار
عجبے نیست کہ از تربیت نشو ونما | نالۂ عشقِ دل سوختہ بالد چو چنار
عجبے نیست کہ داغِ جگر سوختہ ئم | بنسیم سحری طرح کشد از گلزار
کور اگر چشم تماشا بگلے بکشاید | میدمد ہمچو رگِ گل ز نگاہش صد تار
پر تو روے گل و لالہ فتد گر بزمین | از زمین رنگِ شفق جوش زند در شب تار
تودہ تودہ زریا حین بگلستان و دمن | پشتہ پشتہ ز گل و لالہ بدشت و کہسار
برگ برگِ چمن از شورِ جلاجل لبریز | شاخ شاخ ہمہ گلزار صدا خیز چو تار

خوش بود ساقی درین دوران بگلشن می زدن | لالہ جام و غنچہ مینائے بہاران آمدہ ست
خندۂ گل در چمن افگندہ گلدام نشاط | نو بہار از بہرِ صیدِ عندلیبان آمدہ ست

سبحان اللہ۔ خندۂ گل، کو گلدام نشاط قرار دینا، اور بلبل کی وارفتگی کی علت اسکی گرفتاری بتانا کسدرجہ بیلرا مفہوم ہے۔ بیچاری معذور ہے۔ کس صورت سے چمن سے باہر قدم رکھے۔ جال مین پھنسی ہوئی ہے۔ جب تک جال نہ ٹوٹ جائے۔ ہل نہین سکتی۔

در شکر خوابست طفلِ غنچہ در آغوشِ شاخ — باد نوروزی زہر سو مہد جنبان آمدہ ست

سبزۂ نورستہ ہر جا چیدہ فرشِ مخملین — خسرو گل تا پئے سیر گلستان آمدہ ست

ہست گردِ دشت و صحرا آنچنان نکہت فروش — دامن ہر گرد باد عنبر افشان آمدہ ست

گاہ سیر گلشن، از فیضِ بہارِ عکسِ گل — یک گلستانے بحسن سادہ رویان آمدہ ست

صورتِ نقش گرد مصور، ہر چہ آید در خیال — نامیہ نقاش از او ہام امکان آمدہ ست

سبحان اللہ۔ ایک ایک شعر پر وجد طاری ہوتا ہے۔ کہان ہین، ایران پرست دماغ۔ ان اشعار کا جواب لائین۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

بسکہ از جوشِ بہاران، بجہان نشو و نماست — باغ در راغ و دمن و کوہ بہ بینوماناست

نقشِ ہر راز کہ در طبع زمین بود نہان — عکسش از آئینۂ لالۂ گلہا پیداست

تا کجا بار نہد، قافلۂ لالہ و گل — شہر و گلزار و ہمہ دشت و درہ تنگ فضاست

راہِ گلزار و بیابان بجیب در است نہفت — لالۂ و گل کہ بہجوم نمود از جیب رداست

شد زمین سبز و ہوا سبز و فلک شد سرسبز — سبز در سبز نوا بر لب مرغانِ ہواست

غالب نے بہار کی وسعتِ دستگاہ کو ایک شعر مین یون ظاہر کیا ہے

سبزہ کو جب کہین جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

شعر خوب ہے۔ اور اسی لئے تقریباً ہر ادیب سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ مولانا نے بہار کی سرسبزی اور ہمہ گیری کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اب نہ صرف روئے آب سرسبز ہے۔ بلکہ بر روئے ہوا چڑیون کے پیچھے بھی سبز اور تر و تازہ ہین۔

ز آتشِ لالہ چنان شمع بر افروخت ثبت — کز رگِ شعلۂ آن، مد نگاہِ اعمی ست

جنگل مین لالہ کی شمع روشن ہے۔ لیکن وہ معمولی روشنی پیدا نہین کرتی۔ اس کی روشنی اسدرجہ لطیف اور ساری ہے۔ کہ نابینا کی آنکھ کے پردون سے گذر جاتی ہے۔ جب انسان کسی چیز پر نظر ڈالتا ہے۔ اسکی آنکھ اور اس شے کے درمیان ایک مستقیم خط فرض کیا جاتا ہے۔ جو گویا نظر کی کشش ہے۔ شاعر شعلون مین جو خطوط متوہم ہوتے ہین۔

انھین نابینائی مدنگاہ قرار دیتا ہے یا بالفاظِ دیگر شمع کی روشنی ازسرتاپا بینائی ہے۔ لالہ کی سرخی کی دوسری تاویل سنیے۔

زاتشِ نالہ شرارے کہ جہد در کہسار   صفتِ کرمکِ شب تاب، پرافشان بہواست

موسم بہار مین، رات کو درختون پر جگنوؤن کا ہجوم ہوتا ہے ادہر ادہر فضا مین شرارے سے اڑتے نظر آتے ہین۔ اور درخت سر دچراغان بنے ہوئے ہین۔ چونکہ سرخ سرخ گل لالہ سے جنگل مین آگ لگی ہوتی ہے۔ شاعر ان جگنوؤن کو اس سرد آگ کی سرد چنگاریان قرار دیتا ہے۔

سیمِ محلول زند جوش زآب انہار   شورشِ چشمۂ سیماب زموجش پیداست

میرے مخلص دوست مولوی وجاہت حسین صاحب عندلیب شادانی ایم۔ اے نے ایک نظم لکھی تھی۔ دریائی منظر موضوع تھا۔ بہتے پانی کے متعلق ایک تشبیہ بہت نادر تھی۔ ہمارا سب کا خیال تھا۔ کہ غالباً نئی ہے۔ صرف وہ مصرع یاد ہے ؎ پگھلاکے چاندی، گویا بہادی۔ لیکن اب یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ آصفی نے اسی مفہوم کو، باضافہ آج سے تقریباً ۲۵۔ ۳۰ سال بیشتر نظم کردیا ہے "سیم محلول" اور "شورشِ چشمۂ سیماب" کسقدر مکمل تشبیہین ہین اب صرف "برقِ رو" کہنا باقی رہگیا ہے۔ قلعۂ معلیٰ مین دالسرائے کی آمد پر بجلی کا یہ تماشا نظر سے تو گذر چکا ہے۔ لیکن بقید نظم دیکھنے مین نہین آیا۔

نکند میلِ صبوحی بسحر نرگسِ مست   نشۂ بادۂ دوشینہ بہ چشمش برخاست

برلبِ گل بزن انگشت، وشنو نغمۂ راز   گر دلِ تو، چو صبا، رازِ بہاران شنوست

جس وقت ہوا، پھولون کی کیاریون مین سے گذرتی ہے۔ ایک نہایت ہی سُریلی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ شاعر کا خیال ہے۔ کہ یہ پھول کی آواز ہے جہان ہوانے سازِ گل چھیڑا۔ اور اس نے سارا بہار کا چھپا ڈھکا حال کہنا شروع کردیا۔ لیکن یہ صبا کے ساتھ مخصوص نہین۔ اگر تم بھی، نغمۂ راز سننا چاہتے ہو۔ تو ذرا پھول کی پتی پر انگلی ماردو۔ پھر دیکھو۔ کیا ہوتا ہے ؎ "اک ذرا چھیڑیئے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے"

عہدِ خزان، بعہدِ بہاران برابرست   کہسار و دشتہا، بگلستان برابرست

باآن کہ ابرِ دی، بچمن قطرۂ بریخت   لبریز جام ولالۂ نعمان برابرست

دہقانِ باد، گرچہ عرق ریزی نکرد   با سبزِ کشت، دشت وبیابان برابرست

از لطف و نرمئی کہ بود در رگِ سمن   با نے زبانِ خارِ مغیلان برابرست

از تازگی، بشاخِ نہالِ ثمرفشان   در دشت وکوہ، شاخِ غزالان برابرست

برآب وتابِ ذرۂ صحرا مژہ کشا   باآب وتابِ گوہرِ غلطان برابرست

از جوشِ رنگِ لالۂ نعمان دارغوان   گلشن بکانِ لعلِ بدخشان برابرست

ہر قدر دانہ کہ در کشت درین فصل نشاند　　خرمنِ گل بکفِ حاصلِ دہقان آمد

بہار کا موسم تھا۔ نامیہ کو گل کی پرورش اور غور پرداخت مقصود تھی۔ بیچارے کسان نے جسقدر اناج بو یا تھا سب پھولوں کی شکل میں زمین سے برآمد ہوا۔

خاک از عکسِ گل و لالہ بدخشان گردید　　ہر کجا بود چمن، کانِ بدخشان آمد

رخ برافروختہ گل، مشعلۂ را ماند　　کہ بکف مجمر زرّین دبہ نیران آمد

گلاب کے پھول کی نئی تشبیہ ہے پھول کی کٹوری آگ، کو سونے کی انگیٹھی، اور زرِ گل کو آگ قرار دینا جدتِ ادا اور نزاکت تشبیہ کی نادر مثال ہے۔

تا عصائی نکند، شاخ نجزد از جا　　در چمن باد زمین گیر چو مستان آمد

غمزہ شوخ نگاہان فتد از چشم ہوس　　تا بجا دو نظری نرگسِ فتان آمد

قدح از لالہ ستانید، وصبوحی بزنید　　شبِ غم، مرغِ سحر گفت، بپایان آمد

ساغر و جام بلورین بسرِ سنگ زنند　　جام یاقوتی گل در کفِ مستان آمد

کہنا یہ تھا کہ پھول کی بھینی بھینی خوشبو، موسم بہار میں شراب سے زیادہ بدمست کر دیتی ہے۔ انسان سونگھتا ہے۔ اور جھومتا ہے۔ مگر شاعر یون کہتا ہے۔ کہ اب بلور کے پیالون اور گلاسون کی ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ مستون کو ان کے عوض، گلاب کے پھول کا یاقوت رنگ پیالہ مل گیا ہے۔

سحرگاہان، کہ از فیضِ بہار گلشنِ خاور　　شفق گون شد، گلِ خورشید تابان گلِ احمر

صبح کا منظر ان الفاظ سے حسین تر لفظون مین ممکن نہین طلوع کے وقت سورج کو دیکھو۔ بلا مبالغہ سرخ سرخ گلاب کا سا پھول معلوم ہوتا ہے شاعر اس کو گلشن مشرق کی بہار کا فیض قرار دیتا ہے۔ شفق پھولی تمنے بارہا دیکھی ہو گی کیسی گہری سرخ ہوتی ہے شعر مین سورج کو براہِ راست، اور گلاب کے پھول کو بواسطہ شفق رنگ کہا ہے۔

سمن جوشید از ریحان، گلِ نسرین شدہ خندان　　بہارش رنگ زد چندان، زمین شد سیمگون یکسر

چنبیلی اور جوہی کے پھولون کا یہ عالم ہے۔ کہ ساری زمین چاندی کی طرح سفید ہو گئی ہے

چو ریحان یاسمین گشتہ از رومی رنگِ چین گشتہ　　ہمہ روئے زمین گشتہ سمن زار و سمن پرور

سمن زار اور سمن پرور روئے زمین کی سفیدی کے کفیل ہین۔ لیکن ہر جگہ سفید ہی پھول نہین کھلتے۔ سرخ اور سنہری بھی نظر آتے ہین اس منظر کو یون ادا کیا ہے

فلک زرین، ہوا زرین، زمین زرین شدہ گوئی　　جہان شد کانِ زر از زیر تو بال دیرش یکسر

زمان آراستہ با فرشِ زرین عرصۂ گیتی　　بدور آورد صہبائی شفق ہر سو بجامِ زر

زمین رنگین، زبان رنگین، ہوا رنگین جہان رنگین چمن رنگین، دمن رنگین ز گل وز لالۂ احمر

سبحان اللہ! گل گلاب و گل لالہ کی کیا رنگ فروشی ہے۔ سارا عالم رنگین نظر آتا ہے۔ مولانا کی اعجاز بیانی حدِ ثنا سے بالاتر نکلی

نوائے مستی بلبل، ترنگِ شیشہ از قلقل تبسم ریزی ہر گل، ربودہ ہوشِ عقل از سر

مولانا کی دستگاہِ بہار انجام آشنا نہوئی۔ مگر ہم اکتا گئے۔ پردۂ فطرت ہونیکے باعث یہ مضمون وسیع تر ہے۔ اور ہزاروں طرز ادا رکھتا ہے۔ کہانتک کوئی لکھے۔ اور کس طرح خاموشی سے کوئی سنتا رہے ہم چاہتے ہیں اسکو بھی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھیں

باغ تا فصلِ گل بیاید باز نیست این وقت ہائے و ہوئے را

(باقی) خان امتیاز علی عرشی

پھر بحث سُنّت

بے بنیاد دعویٰ اور غلط الزامات

رسالہ نگار میں ایک سال سے "فلسفہ مذہب" کے عنوان سے ڈپٹی سید مقبول احمد صاحب کے متعدد مضامین شائع ہوئے جن میں خود ساختہ اصول، اور ذاتی اجتہادات کے ساتھ ساتھ مفسرین، محدثین، فقہا، علمائے امت اور عام مولویوں پر اس بیباکی سے الزامات قائم کیے گئے، اور انکی تحقیر و توہین کی گئی کہ بہتوں کے دل مجروح ہو گئے، تہذیب و اخلاقی شرافت کے معیار کو الگ رکھیے، نفس اصلاح اور تبلیغ کے یہ طریقہ سود مند نہیں کہ

اور ضد بڑھتی ہے ناصح ترے سمجھانے سے

اگر وہ اپنی انہیں تحقیقات و اجتہادات کو نرمی، لینت، متانت اور سنجیدگی کیساتھ ظاہر کرتے تو شاید وہ نافہم مولوی بھی انکو پڑھکر سمجھنے کی کوشش کرتے، اور ڈپٹی صاحب کے خیالات سے فائدہ اٹھاتے

اسی سلسلہ میں صاحب مضمون نے حدیث و سنت کی بیقدری، نا اعتباری، عدم استناد اور ناقابل قبول اور شریعت اسلامیہ کے قانونی حصہ کے بیکار اور خارج از قرآن ہونے پر بحثیں کیں، میں نے مناظرانہ آویزش سے بچنے کے لئے رسالہ اور صاحب مضمون کا نام لئے بغیر نفس انکے خیالات و تحقیقات کی تردید کی، اور "سنت" اور "شریعت کا قانونی حصہ" کے عنوان سے اگست اور ستمبر سنہ ۶۲ء کے معارف میں دو مضمون لکھے، اور خدا کا شکر ہے کہ یہ دونوں مضمون دلچسپی سے پڑھے گئے اور لوگوں کو ان سے فائدہ ہوا۔

اب چھ سات مہینوں کے بعد صاحب مضمون نے میرے پہلے مضمون سنت کا جواب اپریل سنہ ۶۳ء کے نگار میں دیا ہے جسمیں حسب عادت نہ صرف عام علماء، فقہاء، محدثین کو بلکہ خاص طور سے میرا نام لیکر بہت کچھ کہا ہے۔ میں دل سے پسند کرتا ہوں کہ علمی مباحث میں ذاتی طعن و طنز اور نازیبا تعریض سے احتراز کیا جائے، لیکن افسوس ہے کہ مخاطب نے میرے اس اصول کو ناپسند کیا، اور ایسے لب و لہجہ اور طرز و انداز میں گفتگو کی جو علمی شان سے بہت فروتر ہے، اور اس پر لطف یہ کیا ہے کہ ذاتیات کو اپنی علمی تحقیقات کے ساتھ اس طرح آمیز کر دیا ہے، کہ ان دونوں کو علیحدہ کرنا گوشت سے ناخن کو جدا کرنا ہے۔

مولوی تو اپنے زعم باطل کے لئے بدنام ہیں، مگر ہمارے گرم جوش دوست بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ انکی کلاہ افرنگی میں

وہی طرۂ غرور ونخوت ہے جو مولوی کی دستار فضیلت مین، اُسکے کوٹ و پتلون مین وہی کبر و ناز چین وشکن ہین، جو مولوی کے جبہ وسروال نصف ساق مین، اور جو لفظ لفظ مین گو علماء کی جہالت و نادانی کا مرثیہ پڑھتا ہے، مگر خود اسکے اس مرثیہ سے رجز خود ستائی کی شان نمایان ہوتی ہے۔

کم کن ز کبر و ناز که دیدہ است روزگار چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

"آمدم بر سر مطلب" وہ فرماتے ہین:۔

"جس تبحر کے ساتھ اُنھون نے (سید سلیمان نے) میرے اس قول کا مضحکہ اڑایا ہے کہ حدیث کا منشا اور مسلمانوں کا سنت ہم معنی و مرادف لفظ ہے اسکا تقاضا تو یہ تھا کہ مین مولانا کی خدمت مین عرض کرتا ان کہ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است، آپکی عربی دانی مسلم، مگر معاف کیجئے صرف عربی دانی ہی علامہ اور فاضل اجل ہونے کے لئے کافی نہین، ورنہ میرا بغدادی ملازم حسن یقیناً اتنا ہی اپنی فضیلت پر ناز کر سکتا ہے جتنا ہندوستان کا بڑے سے بڑا عالم"

میرا مضمون دوست دشمن سب نے پڑھا ہوگا، اُس مین مضحکہ تو کجا، میرا تبسم بھی نمایان ہو تو مین اخلاقی مجرم، ہان اگر میرے دلائل کی سخت گرفت سے اُنکو تکلیف محسوس ہوئی ہو تو معذوری ہے بایں ہمہ عرض ہے کہ تنہا انگریزی دانی ہی علامہ اور فاضل اجل ہونے کے لئے کافی نہین ورنہ ہر انگریزی ہوٹل کا خانسامان اور ویٹر یقیناً اتنا ہی فضیلت پر ناز کر سکتا ہے جتنا ہندوستان کا بڑے سے بڑا گریجوایٹ اور ڈپٹی کلکٹر!

فرماتے ہین:۔

"کاش مولانا انگریزی کے صرف اسقدر عالم ہوتے کہ وہ اور نہین تو محض انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضامین کو بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تو مین ان سے عرض کرتا کہ منشا کا مضمون پڑھ لیجئے تاکہ خود آپکو اپنی تحقیق پر ناز نہ ہے اور آپ ایسی جرأت نکرین"

اظہار واقعہ کے طور پر عرض ہے کہ مین بحمد اللہ ڈپٹی صاحب کی آرزو کے مطابق اتنی انگریزی جانتا ہون کہ انسائیکلوپیڈیا کے تاریخی اور مذہبی مضامین انگریزی مین پڑھ اور سمجھ لیتا ہون، مین نے اول تو انسائیکلوپیڈیا مین جھانکا گیارھوان ایڈیشن ہمارے سامنے ہے، کوئی مستقل مضمون مشنا پر نہین پایا، اور عبرانی (ہبرو) کے تحت مین جو ضمنی مضمون اسپر مجکو ملا، اُسمین اُنکی اس "تحقیق انیق" کا پتہ نہ پایا، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، کاش موصوف اہل تحقیق کی طرح انسائیکلوپیڈیا کا حوالہ دیتے وقت ایڈیشن، جلد، صفحہ، یا آرٹیکل کو متعین کر دیتے،

فرماتے ہین:۔

"لیکن شاید اس مین مولانا سید سلیمان کا اتنا قصور نہین جتنا عربی نصاب تعلیم کا ہے جو مولویون کی فضیلت ہے"

" وہ لوگ مرعوب ہوں، جنھوں نے اس راہ کی بادیہ پیمائی نہیں کی "۔

مین بھی جانتا ہون کہ اصول اسلام کے خلاف اس قسم کے خیالات کے اظہار مین ڈپٹی صاحب کا اتنا قصور نہیں جتنا انگریزی نصاب تعلیم کا اور ان نامسلم استادون اور مصنفون کی صحبت کا ہے، جنکے حلقۂ فیض مین ہمارے دوست اس فضیلت کے رتبہ کو پہونچے ہین، ان محققین کی تحقیقات سے وہی مرعوب ہونگے جو اس کوچہ سے نابلد ہین، فرماتے ہین :-

" مذہب اسلام کے سمجھنے کے لئے فلسفۂ مذہب، تاریخ مذاہب، اقوام سامیہ کا لٹریچر تاریخ انقلاب علم انساب کی ضرورت ہے جو دیوبند اور ندوہ کی دسترس سے باہر ہے "

عرض ہے کہ مذہب اسلام کے سمجھنے کے لئے ان کے سوا، قرآن پاک، قرآن پاک کی تفاسیر، احادیث صحیحہ، احکام قرآن، ادب عربی اور لغات عربی پر کامل عبور کی ضرورت ہے، جو انگریزی یونیورسٹیون کی دسترس سے باہر ہے اسکے بعد چپکے سے گذارش ہے کیا یہ تعریض ارض القرآن کے مصنف پر ہے جسکی نہ صرف تعریف وتوصیف آپ نے کی ہے، بلکہ اپنے والانامہ موسومۂ راقم مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء مین آپ نے یہ شریفانہ اعتراف بھی کیا ہے۔

" اور آپ مجھے معاف کرینگے اگر مین یہ کہون کہ اسکے (ارض القرآن) بعض مضامین مین نے اپنے اکثر مضمونون مین سرقہ کئے ہین "

ناظرین باور کرین کہ اس سرقہ کا اعتراف خاکساری کی راہ سے نہیں، بلکہ واقعتاً کیا ہے، کیونکہ انھون نے اپنے مضمونون مین جو شائع ہو چکے ہین، اصل کتاب ومصنف کے نام کا حوالہ تک نہیں دیا ہے، تاکہ حریفون کے سامنے آنکھ نیچی نہو، اور ایک فاضل گریجوایٹ کو ایک " جاہل مولوی " کی خوشہ چینی کی ذلت علی الاعلان گوارا نہ کرنی پڑے،

اللہ اکبر! جلوت وخلوت کا اتنا عظیم فرق! بہرحال مین نہایت کشادہ دلی کے ساتھ موصوف کی درخواست کے مطابق انکے اس جرم کو معاف کرتا ہون، لیکن ڈر ہے کہ ملک کے دوسرے جرائم پیشہ ایک ڈپٹی صاحب کے اس جرم سرقہ کے ارتکاب کی خبر سنکر دلیر نہ ہو جائین،

موصوف اپنے مضمون " فلسفۂ مذہب " کے بعض ٹکرون کو جو معارف مین چھپنے کو بھیجے گئے تھے، معارف مین نہ قبول کئے جانے کے ذکر مین فرماتے ہین کہ :-

" شاید دنیا اس راز کو نہیں جانتی کہ وہ کیون موزون نہیں سمجھے گئے میرے پاس وہ خطاب بھی پڑا ہوگا جس مین سید سلیمان نے میرے حصہ مضمون مذہب اور خوست (شاید قومیت ہو) کو شرف قبولیت بخشا تھا، مگر اسکے بعد ایک گستاخی کے صلہ مین وہ مضمون واپس کر دیا گیا، گستاخی کا واقعہ یہ ہے کہ داڑھی کے سچے جھوٹے ہونے کے متعلق سید سلیمان کے ایک مضمون کا ترجمہ اسلامک ریویو کے کئی نمبرون مین

"دیا تھا، جس مین حسب سنت علما، بڑی بڑی کتابون کا حوالہ دیا گیا تھا، جب عیسائیون کی حالت ہماری طرح تھی تو وہ بھی اس قسم کے مضمونون پر کتابین لکھ ڈالتے تھے، مثلاً عشار ربانی مین، روح فطری ہو یا خمیری، مین نے سید صاحب کی خدمت مین عرض کیا کہ واقدی کے متعلق آخر اس دیدہ ریزی اور اسکے جھوٹ ثابت کرنے کے لئے اتنی بڑی ضخیم کتابون کے حوالہ کی ضرورت ہی کیا تھی، ہمارے عالمون کا ایک زمانہ مین یہ ہنر ہوا کرتا تھا کہ دریا کو کوزہ مین بند کرتے تھے، اب ہمارے عالمون کا بڑا ہنر یہ ہے کہ کوزہ کو دریا (شاید دریا ہو) کر دین اگر یہی چیز عربی مین علت کہلاتی ہے، تو گستاخی معاف انگریزی مین اسکو بند نظری کہتے ہین، اس معروضہ کے تیسرے روز عتاب نامہ مع مضمون واپس آیا، اور اس دن سے نہ مولانا نے مجھے مخاطب کیا اور نہ میرے کسی خط کا جواب دیا"

افسوس ہے کہ سید مقبول احمد کی یہ پوری تحریر صداقت سے حرف حرف خالی ہے، مین اُنکو یہ چیلنج دیتا ہون کہ وہ میرے تمام خطوط پبلک مین شائع کر دین تاکہ دنیا مین یہ "راز" مخفی نہ رہے کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھکر سچ اور جھوٹ کے پرکھنے والے اپنی غیر سرکاری زندگی مین کس طرح حق و باطل کا التباس کرتے ہین، سید مقبول احمد کو علم ہوگا کہ یہ مضمون ایک مشہور مستشرق عیسائی، اور انگلستان کی ایک بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر کے جواب مین، ایک مشہور مسلمان گریجوایٹ خواجہ کمال الدین صاحب کی فرمایش سے لکھا گیا اور اُنکی پسندیدگی سے اسلامک ریویو مین چھپا تھا، یہ تنہا ایک مولوی کا گناہ نہ تھا، بلکہ اُنکے جیسے بی، اے اور اُن سے بہتر گریجوایٹ بھی اس گناہ مین شریک تھے

سید صاحب کا مضمون تقریباً ۸ مہینے میرے پاس پڑا رہا، اور ان کی طلب پر واپس کیا گیا، مین نے ان کو لکھا کہ آپ کے خیالات جس منزل مین ہین، ان کی اصلاح خط و کتابت سے نہین، بلکہ زبانی گفتگو اور ملاقات سے ہوسکتی ہے انہون نے معذرت کی، پھر طرفین سے خاموشی رہی، اس کے بعد مضمون "سنت" چھپنے کے بعد ان کے چند خط آئے اور مین نے جوابات دیے، شاید اسی دسمبر ۲۹ء اور ۳۱ء کے چند خط ان کے پاس ہون گے، اور ان کے میرے پاس پھر یہ کہنا کہان تک صحیح ہے کہ

اسی دن سے نہ مولانا نے مجھے مخاطب کیا، نہ میرے کسی خط کا جواب دیا

مین نہین جانتا کہ یہ "مولویانہ اخلاق" ان مین کہان سے پیدا ہوا، درانحالیکہ شاید کسی عربی مدرسہ مین ایک دن جانے کی بھی ذلت انھون نے گوارا نہین کی

آمدم برسر مطلب.

مضمون زیر بحث مین دو قسم کی بحثین ہین. ایک لفظی اور دوسری معنوی، دونون بحثون کو علیحدہ کر دینا ہے تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے،

لفظی بحث

مناۃ اور سنّت

لفظی بحث یہ ہے کہ ہمارے دوست کا دعوی ہے کہ یہود اپنی زبانی روایات کو "مناۃ" اور مسلمان اپنی زبانی روایات کو سنّت کہتے ہین، مسلمانون کا یہ عربی لفظ "سنّت" یہودیون کے عبرانی لفظ "مناۃ" سے ماخوذ ہے، دونون بالکل ایک لفظ ہین، اور ہم معنی ہین

مین نے اگست ۱۹۲۹ء کے معارف مین مدعی کی اس تحقیق سے اختلاف کیا، اور ثابت کیا کہ اولاً عبرانی لفظ "مناۃ" س سے نہین، بلکہ ش سے ہے، یعنی مشناۃ، اور دوم اسکے معنی عبرانی مین دوسرے، دوہرانے، اور اعادہ، تکرار کے ہین، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اسکا اطلاق موسیٰ کی پانچوین کتاب پر ہوتا ہے، جسکو یونانی مین ڈیٹرونومی کہتے ہین جسکے معنی دوسرے اور دوسرے قانون کے ہین، اور عبرانی مین اسکو مشنا کہا جاتا ہے اور عربی مین ثنا کہتے ہین، اور آجکل تثنیہ الاشتراع دوبارہ قانون سازی کہتے ہین اور ان سب کا ماخذ عبرانی مین "ثنا" اور عربی مین "ثنی" اور ان دونون کے معنون مین دونون زبانون مین دو۔ دوم اور دوہرانے کا مفہوم ہے، اور "سنّت" خالص عربی لفظ ہے، جسکے لغوی معنی راستہ، اور طریق کے ہین اور اصطلاح مین اسکے معنی وہ طریق ہے جسپر محمد رسول اللہ صلعم تمام عمر قائم رہے اسکے معنی زبانی روایات کے معنوی ہین نہ اصطلاحی اسلئے عبرانی مشناہ اور عربی سنّت مین کوئی باہم مشارکت و مماثلت نہین، اور نہ عربی سنّت، عبرانی مشناہ سے ماخوذ ہے۔

ہمارے مخاطب اول نے اس مضمون کو پڑھکر ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مجھے خط لکھا کہ تمھاری تحقیق غلط ہے ڈوٹرونومی کے لئے مناوس لفظ ہے، اور مشنا بالکل جداگانہ لفظ ہے، مین اسکی ایک مدت زائد یہودی معلمین سے اس لفظ کی تحقیقات کرچکا ہون، اور اسکی تائید انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے بھی مل سکے گی،

"اگر اسکے معنی آپ سنّت سے علیحدہ دکھادین تو مین ہارتا ہون"

مین نے اسکے جواب مین انکو جو لکھا اسکا مطلب تھا کہ مشنا تورات کی پانچوین کتاب پر بھی اطلاق کیا گیا اور تالمود کے ایک جزو کا نام بھی ہے یہ کوئی اہم نقطہ اختلاف نہین ہے، بلکہ اصل چیز "مشنا" کے معنی ہین، ساتھ ہی مین نے اطلاع دی کہ "مشنا" کے معنی تعلیم اور سکھانے کے بھی ہین، انھون نے اسکے ماننے سے بھی انکار کیا، اور لکھا کہ تمکو تالمود کے معنی سے دھوکا ہوا ہے جسکے معنی واقعاً تعلیم اور سکھانے کے ہین اب اس تازہ مضمون مین ہمارے دوست نے پھر اپنی پرانی تحقیق کو بہت فخر و ناز کے ساتھ دہرایا ہے، مگر صرف دہرایا ہی ہے، کوئی دلیل یا حوالہ نہین درج فرمایا ہے۔

اب نقطۂ اختلاف دو ہین۔

۱۔ کیا توراۃ کی پانچوین کتاب کو بھی عبرانی مین مشنا بولتے ہین؟

۲۔ کیا سنّت اور مشنا ایک ہین

مشنا توراۃ

توراۃ کی پانچوین کتاب کو میرے "مشنا" کہنے پر مدعی نے میرا مضحکہ اڑایا ہے، اور فرمایا ہے کہ "ایک یہودی بچہ بھی اسکو سنکر ہنس دیگا" مگر مین اونھین یقین دلاتا ہون کہ تحقیق کا راستہ مضحکہ سے براحل دور ہے

توراۃ کی پانچوین کتاب کا نام "قانون ثانی" اسلئے رکھا گیا ہے کہ قانون اوّل کے بعد دریائے اردن کے اس پار حضرت موسیٰ نے اوسکو دوبارہ بیان کیا جیسا کہ اس کتاب کے آغاز مین تحریر ہے، اسکا عبرانی نام "الوہی وبران" بھی ہے مگر بعد کو شاید مصر کے ترجمۂ سبعینی کے وقت سے اسکا نام "مشنا توراۃ" مشہور ہو گیا جسکے معنی "قانونِ دوم" کے ہین، اسی لئے یونانی اور اوس سے یورپ کی زبانون مین اوسکا نام ڈیوٹرونومی، یعنی دوسرا قانون پڑا، اور اسی لئے پرانی عربی مین مشناۃ اور نئی عربی مین اوسکا نام تثنیۃ الاشتراع ہے، یعنی "دوبارہ قانون بنانا" بہرحال ان سب کے معنون مین دو، دوم اور دوہرانے کا مفہوم داخل ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ توراۃ کی اس کتاب کے لئے جس مشنا کا لفظ بولا جاتا ہے وہ ثنی سے ہے، سن یا ث سے نہین، جیسا کہ مدعی کا دعویٰ ہے کیونکہ دو اور دوم کے لئے جو عبرانی مادّہ ہے وہ شنا ہے

حوالون کے لئے سب سے پہلے "ڈکشنری آف بائبل" (مرتبۂ جیمس ہیسٹنگز وغیرہ) جلد اول صفحہ ۵۹۶ مطبوعہ ۱۹۰۰ء ملاحظہ فرمایئے، جس مین لکھا ہے کہ "اسکا نام ڈیوٹرونومی عبرانی الفاظ "مشنا توراۃ" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی نسخۂ ثانیہ کے ہین" اسکے بعد انگریزی کی مشہور مستند ڈکشنری ولسٹر انٹرنیشنل مین لفظ ڈیوٹرونومی Deuteronomy دیکھیئے، اوس مین ہے۔

"ڈیوٹرونومی اسکو اسلئے کہتے ہین کہ یہ موسیٰ کے قانون کا دُہراؤ (یا اعادہ) ہے"

اب عبرانی لغت مین دیکھ لیجئے، کہ دہرانے اور دوسرے اور دوبارہ کرنے کے لئے لفظ مشناہ ہے، مسنا یا ثمنیٰ یا ثمنہ نہین ہے، جیسا کہ ہمارے محقق دوست ہمکو باور کرانا چاہتے ہین، جیسا کہ آگے تفصیل معلوم ہوگا،

میرے مضمون سنّت کی اشاعت کے بعد موصوف نے ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو جو خط مجھے لکھا تھا، اوس مین ارقام فرماتے ہین۔

"شنہ جسکے معنی آپ نے اپنے ڈوٹرونومی کے صحیح لئے ہین وہ مشنا سے بالکل جدا لفظ ہے، اور اسکا تلفظ مسنا ہے"

اب موصوف اپنے تازہ مضمون مین "ڈوٹرونومی" کے لئے ہمکو لفظ ثمنیٰ دیتے ہین

یہ کہئے یہ علم رہے کہئے وہ ارشاد ہے،

آپکے کہنے سے اگر توراۃ پنجم کے لئے مسنا صحیح مانا جائے، تو تالمود کے لئے بھی تو آپ نے مسنا اور مسناۃ ہی ..... پہلے مضمون مین لکھا ہے اب یہ التباس کیونکر دور ہوگا۔

آپ میرے قول کی تکذیب کے لئے توراۃ پنجم اور حصۂ تالمود دونون کے درمیان فرق مسنا اور مشنا یا ثمنہ یا ثمنیٰ ہمکو

لاکھ پیدا کیجئے، سب محکمۂ تحقیق کے سامنے رد ہو جائیگا، دونون لفظ قرشت والی شین منقوطہ سے ہین، سین غیر منقوطہ یا ثا سے ان مین کوئی لفظ نہین، اور ثا کا حرف تو عبرانی مین سرے سے موجود نہین، اسلئے مثنہ یا مثنی تو عبرانی مین ہو ہی نہین سکتا
اب ہمارے دوست غور فرمائین کہ کس کی تحقیق پر "ایک یہودی بچہ بھی ہنس دیگا؟" کیا یہ پڑھ ہون

درسفالین کاسۂ رندان بخواری منگرید این حریفان خدمت جام جہان بین کردہ اند

مشنا مناۃ اور سنت

بہر حال یہ مسئلہ کہ مشنا تالمود مراد ہے، یا مناۃ اور اۃ، ایک ضمنی بحث ہے، اصل سوال یہ ہے کہ کیا عبرانی "مناہ" اور عربی سنت ایک چیز ہے۔

اس سلسلہ مین ہم اپنے محقق دوست کی ایک دلچسپ لفظی تحریف کا ذکر مناسب سمجھتے ہین، اصل عبرانی لفظ مشنا شین منقوطہ ہے، جیسا کہ میرے ٹوکنے پر اب اس دوسرے مضمون مین اونھون نے استعمال کیا ہے، مگر پہلے مضمون مین اوسکا عبرانی تلفظ "سناۃ" بتایا تھا، اور یہ اس غرض سے تاکہ سنت اور سناۃ مین س ن اور ۃ کا اشتراک ہو جائے اور یہ دعوی بہ آسانی ثابت ہو جائے کہ سنت اور سناۃ ایک ہین اور اب جب اونھین معلوم ہوا کہ عبرانی کا حرف شین س اوسکے سوا کوئی اور بھی ہے تو مجبوراً اوسکے لئے دوسرے مضمون مین شنا و شین منقوطہ سے بولے، یا للعجب!

مین نے سنت والے مضمون مین دکھایا تھا اور پھر باعلان دعوی کرتا ہون کہ سنت اور مشنا مین کوئی لفظی معنوی مناسبت نہین ہے، مشنا کے معنی اگر بقول اونکے زبانی روایات کے ہین تو سنت کے معنی عربی مین طریق درروش اور راستے کے ہین، قرآن مین سنت کا لفظ انہین معنون مین بار بار آیا ہے، احادیث مین انھین معنون مین استعمال ہوا ہے اور لغت اور اشعار عرب مین بھی انھین تینون مین یہ لفظ بولا گیا ہے، قرآن پاک مین ہے، "ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا" کیا اسکے یہ معنی ہین کہ تم خدا کی "زبانی روایتون" مین ہرگز تبدیلی نہ پاؤگے، یا یہ معنی ہین کہ تم خدا کے طریق اور طرز عمل مین کوئی تبدیلی نہ پاؤگے؟ احادیث مین ہے، "من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرہا" کیا اسکے معنی یہ ہین کہ جو کوئی اچھی "زبانی روایت" کریگا تو اوسکو اوس قسم کی نیکیان ملینگی۔ یا یہ معنی ہین کہ جو شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ راستہ یا طریقہ نکالے گا تو اوسکو بھی، اوسکی نیکیان ملتی رہینگی مشہور حدیث ہے "النکاح من سنتی" کیا اسکے معنی یہ ہین کہ نکاح میری زبانی روایت ہے، یا یہ معنی ہین کہ نکاح میرا طریقہ ہے، اشعار عرب مین ہے۔

وان الالی بالطف من ال ہاشم تآسوا فسنوا للکرام التآسیا

آل ہاشم مین وہ جو طف مین ہے، اونھون نے باہم غمخواری کی، تو غمخواری کو شریفون کا طریقہ بنادیا،
سنوا کے معنی یہان عملی طریق درروش و طرز عمل کے ہین، یا زبانی روایت کے، زبانی روایت کے معنی ہو بھی سکتے ہین بن بھی سکتے ہین؟

یہ تو عربی زبان کی تحقیق ہوئی، اب آئے عبرانی زبان کی خانہ تلاشی لی جائے کہ آیا "مشنا" کے معنی "زبانی روایات" کے

ہیں؟ اس بارہ میں میں نے پہلے جو کچھ لکھا تھا اوسکو دوہراتا ہون کہ یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں ثنی، تثنیہ، مثنیٰ وغیرہ کی صورت مین ہے اور اسکے معنی "زبانی روایات" کے ہین، مین سوا اسکے اور کیا کہون جیا دنہ دلار جخیر مکن، چیزیکہ نخواندۂ۔ تو

حیا دنہ دلار تو بخجیر مکن چیزیکہ نخواندۂ توتفسیر مکن

اونکی تشفی کے لئے اونکے حسب مشورہ مین سب سے پہلے یورپ کے علمی صحیفہ کو پیش کرتا ہون اسپر اونکا ایمان شاید تمام دوسرے مشرقی صحیفون سے زیادہ ہو، انسائیکلو پیڈیا (طبع یازدہم) کے مضمون تالمود کے شروع مین (جلد ۲۶ صفحہ ۲۸) مین ہے۔ تالمود (عبرانی معنی سیکھنا سکھانا) مشتمل ہے، مشنا پر (عبرانی معنی) (زبانی) دوہرانا۔ Repetition

پھر اسی کتاب کے اسی اڈیشن (یازدہم) کی جلد ۱۳ صفحہ ۱۷۰ مضمون ہیبرو (عبرانی) کے ضمن مین ہے

مشنا کا نام عبرانی لفظ "ثنا" سے مشتق ہے جو آرامی لفظ "تنا" سے مطابق ہے، اور اسی لئے یہ تنا تک کتاب کے لئے موزون ہے جسکے معنی زبانی قانون کے دہرانے یا سیکھانے کے ہین"

ان دونون اقتباسون سے ظاہر ہے کہ اسکے اصلی معنی دہرانے یا سیکھانے کے ہین، لفظ زبانی، یا زبانی قانون کا اضافہ اگر کسی نے کر دیا ہے تو وہ لغت کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف وجہ تسمیہ کی مناسبت دکھانے کے لئے خارج سے اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ نام اسکا کیون پڑا، اسکی تائید کے لئے مین لغات عبرانی کا حوالہ پیش کرتا ہون۔

شنا و شنتہ	بدل جانا، جدا ہوا، دوبارہ کرنا، دوہرانا
شنیم	دو،
شنتیم	دوبارہ
شنتہ	دوسرا درجہ، دوسرے درجہ کا، دوچند
شنا	دوسرا

(لغات عبرانی) مصنفہ پادری ولیم ہوپر، پرنسپل ڈوینٹی کالج شائع کردہ پنجاب، ریلجیس بک سوسائٹی، الہ آباد ۱۸۸۶ء (صفحہ ۲۴۰) شنہ کے معنی بھی عبرانی مین دوبارہ کرنا، دوسرا اور دو ہوتے ہین یہی لفظ عربی مین، اثنین، ثنیتن، ثنتہ، تثنیہ، مثنی، اور ثنی ہے، پہلے تمام الفاظ کے معنی دو، اور دوسرے کے ہین اور آخیر لفظ کے معنی پھیرنے کے ہین

شنا اور اسکے مصدر شنا کے بھی تمام معنی عبرانی انگریزی ڈکشنری شائع کردہ سموال باگسٹر (لندن) صفحہ ۲۷۲ و ۲۷۳ مین ہین تحقیق کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کیجئے، انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹر انٹرنیشنل ڈکشنری ہے، اومین "مشنا" Mishnah کی نسبت حسب ذیل تحقیق ہے:۔

مشنا عبرانی مشناہ، معنی تعلیم (زبانی قانون) عبرانی لفظ شنہ سے ماخوذ ہے، جسکے معنی دہرانے (ربی ہیئت) کے ہین، قدیم بائیبل عبرانی مین اسکے معنی، سیکھنے، سیکھانے کے ہین، یہ یہودیون کے روایتی تعلیمات کو

"کہتے ہیں، جو ربیوں کے زیر نظر خاص طور سے تیسری صدی عیسوی میں مرتب ہوئی تالمود کے ایک حصہ کا نام ہے، جس پر اوسکی بنیاد ہے"

صاف ظاہر ہے کہ زبانی روایات کے اسکے لغوی معنی ہیں اسکے لغوی معنی دوہرانے اور اعادہ کرنے (دو بارہ کرنے کے یا دوسرے درجہ کے ہیں، اسکا اطلاق یہودا کی زبانی روایات کی کتاب پر اسلئے کرتے ہیں کہ وہ گذشتہ قانون کا اعادہ ہے - یا پہلے قانون پر نظر ثانی ہے، یا توراۃ کے مکتوبی قانون کے بعد یہ زبانی روایات کی کتاب دوسرے درجہ پر ہے یا قدیم عبرانی کے مطابق اسکے معنی سیکھنے یا سکھانے کے لیکر اسکی کوئی مناسب وجہ تسمیہ بنائی جائے -

مثناۃ اب میرا کہنا یہی ہے، جو پہلے کہا جا چکا ہے کہ جسکو عبرانی میں مشنا یا مشناہ کہتے ہیں، وہی عربی تلفظ میں مثناۃ ہے جسکے معنی دو یا دوہرانے کے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ عبرانی مشناہ زبانی قانونی کتاب کے معنی میں ہے - اسکے لئے بھی عربی لفظ مثناۃ ہے، اور اسکی جمع "مثانی" ہے، اور خود قرآن پاک نے اسکا کئی مقام پر اپنے اوپر اطلاق کیا ہے -

۱- ولقد اٰتینٰک سبعا من المثانی — اور ہم نے اے پیغمبر تمکو مثانی میں سے سات دئے اور

۲- نزّل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی — خدا نے اتارا بہترین کلام ایک کتاب جو باہم موافق اور "مثانی"

مثناۃ کے معنی کتاب کے بھی عربی میں موجود ہیں نیز مشنا تالمود کے لئے وہی لفظ عربی میں مستعمل ہے، لسان العرب لفظ "مثنی" کے تحت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ایک روایت کی شرح میں ہے -

قیل وما المثناۃ قال ما استکتب من غیر کتاب اللہ کانہ جعل ما استکتب من کتاب اللہ مبدأ وھذا مثنی، قال ابو عبیدۃ سألت رجلا من اھل العلم بالکتاب الاول قد عرفھا وقرأھا عن المثناۃ فقال ان الاحبار والرھبان من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ وضعوا کتابا فیما بینھم علی ما ارادوا من غیر کتاب اللہ فھو المثناۃ،

پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے کہا جو خدا کی کتاب کے سوا لکھا گیا، گویا خدا کی جو کتاب لکھی گئی وہ پہلی تھی، اور یہ دوسری ہے، ابو عبیدہ نے کہا کہ میں نے توراۃ کے ایک عالم سے جو مثناۃ سے واقف تھا اور اوسکو پڑھ چکا تھا پوچھا کہ مثناۃ کیا ہے؟ اوسنے جواب دیا کہ یہودی عالموں اور درویشوں نے حضرت موسیٰ کے بعد اپنے حسب خواہش خدا کی کتاب کے سوا ایک دوسری کتاب بنالی تھی اور یہی مثناۃ ہے -

کیا عبرانی مشنا بعینہ یہی عربی مثناۃ نہیں ہے؟ اب بھی شک کی گنجائش ہے؟

خاتمہ بہر حال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے یا تالمود کی کتاب، دونوں کا ماخذ عبرانی لفظ مشنا اور مشنہ ہے، جسکے معنی، بدلنے، دہرانے یا دوسرا ہونے - یا دوبارہ ہونے کے ہیں یا سیکھنے کے ہیں اور سوا کے غیر معنی کے الفاظ

تننہ ثمنی تتثنیہ اور ثنی اسکے مرادف ہین اور عربی لفظ " سنّت " کو جسکے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اسلامی معنی طریق محمدی کے ہین، اوس سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہین، سنّت کا مادہ س ن ن یعنی سَنَنَ ہے اور شنا یا تشناۃ کا عبرانی مین ش، ن ہ یا الف، اور عربی مین ث ان ی ہے، اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ ہمارے دوست اپنی تحقیق پر مزید نظر ثانی فرماکر، علم اور اسلام دونون کو اپنا ممنون احسان بنائینگے، ورنہ اونکی اس تحقیق کو اونکے ایک یہودی بچہ بھی سنکر ہنس دیگا،"

آخر ایک اور بات عرض کردون کہ شنا" زبانی روایات" کو بھی نہین کہتے، بلکہ اوس کتاب کا نام ہے جس مین یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے اگر گلستان اخلاقی تصص و حکایات کے کسی مجموعہ کا نام ہے تو اسکے یہ معنی نہین کہ گلستان کے معنی اخلاقی قصص و حکایات کے ہین۔

دوران تحقیق مین فرماتے ہین کہ۔

" مولانا کی یہ دلیل اور بھی پر لطف ہے کہ سنّت کا لفظ قرآن مین ہے اسلئے یہ عبرانی زبان سے ماخوذ نہین "

مین نے اگر ایسا کہا ہو تو یہ یقیناً غلط لیکن ع سخن شناس نہ دلبرا خطا این جاست مین نے خدمت والا مین یہ عرض کیا تھا کہ:۔

" سنّت خالص عربی زبان کا لفظ ہے، اسکے لفظی معنی راستہ کے ہین لیکن بول چال مین اسکے معنی اوس طریقہ عمل کے ہین جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے، قرآن پاک مین یہ لفظ اسی معنی مین مستعمل ہے "

ہر صاحب بصیرت میرے استدلال کو سمجھ سکتا ہے کہ عبرانی لفظ شناۃ اش، عربی مین مثناۃ ث ہے، اور جسکے معنی دونون زبانون مین، دوسرے یا دہرانے یا اعادہ کے ہین، اور اوس سے الگ سنّت کا لفظ ہے، جسکے معنی راستہ اور طریق کار کے ہین، اور عربی مین یہ دونون لفظ الگ الگ مستقل صورتون مین وارد ہین اور خود قرآن پاک مین ہین

وآتیناک سبعا من المثانی — ہم نے تمکو " مثانی " مین سے سات دین
مثانی جمع ہے، واحد کی صورت وہی مثناۃ ہے، اور سنّت الگ ہے،

سنة الاولین — پہلون کا راستہ یا طریقہ یا سنّت

اگر مشناہ اور سنت ایک لفظ ہوتے، تو عربی مین مثناۃ اور سنّت دو لفظ موجود نہ ہوتے، اور قرآن انکو دو لفظ دو تلفظون کے ساتھ، دو معنون مین استعمال نہ کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ مشناۃ اور سنّت دو الگ الگ مستقل، اور مختلف المعنی لفظ ہین، یہ ہے میرا استدلال جسکی آپ نے غلط تعبیر کی میرے گذشتہ مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے مضمون نگار کی غلط فہمی واضح ہوسکتی ہے۔

(باقی - باقی)

سید سلیمان ندوی

محبّت کی قربانی

سلسلۂ کوہسار کے دھندلے دامن میں جہاں برساتی نالوں نے چند پُر پیچ وادیاں بنا رکھی ہیں وہیں ایک گاؤں کے سرخ مگر کچے مکان نظر آ رہے ہیں۔ اُن سے کچھ آگے ایک چھوٹی سی بلندی پر ۱۲۰۰ سال پہلے کا ایک گرجا سوگوار حالت میں نظر آ رہا ہے، پاس ہی آٹا پیسنے کی ایک چکی اپنی مسلسل صداؤں سے کوہسار کی ہیبت ناک خموشیوں میں برہمی پیدا کئے ہوئے ہے آج سے سو سال پہلے تین کمسن بچے باہم ملکر دریا کے کنارے کشتی کی بوسیدہ رسیوں اُلجھے بیٹھے ہوئے بادبانوں خس و خاشاک اور زنگ خوردہ زنجیروں سے کھیلا کرتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی تھی۔ اور دو لڑکے۔ لڑکی کا نام اینی تھا۔ جس کا معصوم حسن بندرگاہ کے تمام رہنے والوں کے لئے سرمایۂ انبساط تھا۔ لڑکوں میں سے ایک کا نام فلپ تھا جس کا باپ آٹے کی مشین کا مالک تھا۔ دوسرے کا نام آرڈن تھا۔ جو ایک مشقت کش ملاح کا نور نگاہ تھا۔

یہ تینوں دریا کے کنارے ریت کے قلعے صرف اس لئے تعمیر کرتے کہ دریا کی کوئی موج انہیں بہائے جائے اور وہ چند قدم تک اس موج کا تالیاں بجاتے اچھلتے کودتے ہوئے تعاقب کریں، اور پھر اپنی جگہ آکر دوسری موج کا انتظار کرنے لگ جائیں وہ دن بھر اسی شغل میں لگے رہتے اور جب شام کو واپس آتے تو انکے بے شمار ننھے ننھے نقوش قدم ساحل کی بھیگی ہوئی ریت پر باقی رہ جاتے۔ وہ یہاں دن بھر چھوٹے چھوٹے گھر بناتے۔ اور انہیں میاں بیوی بن کر آباد کرتے ایک دن آرڈن میاں بنتا اور دوسرے دن فلپ لیکن کبھی کبھی آرڈن ہفتہ بھر اس چھوٹی سی بیوی پر غاصبانہ قبضہ جمائے رکھتا۔ اور مایوس فلپ کے سامنے فخریہ انداز میں کہتا:۔ "یہ میرا گھر ہے اور اینی میری بیوی ہے"

فلپ رقیبانہ نگاہوں سے آرڈن کی طرف دیکھتا۔ اور دبی آواز سے بسا اوقات کہہ دیتا "میری بھی ہے"

یہ دونوں کبھی ہاتھا پائی پر اتر آتے۔ مگر دردحزیں فلپ کی نیلی آنکھیں رحم طلب آنسوؤں سے بھیگ جاتیں اور وہ بے بس ہوکر اتنا کہہ کے رہ جاتا "آرڈن، مجھے تم سے نفرت ہے"

نازک دل اینی یہ منظر دیکھ کر رو پڑتی۔ ہاتھ جوڑ کر دونوں کے پاس آتی۔ اپنا واسطہ دیکر مناتی۔ اور وہ عموماً پھر خوش ہوکر گلے مل جاتے

(۲)

رفتہ رفتہ معصومیت و طفلی کا بچپن دور ختم ہوگیا اور عشق و محبت کا آفتاب افق شباب سے طلوع ہوا۔ اینی فلپ و آرڈن کے رقیبانہ تگ و دو کی جولانگہ بن گئی۔ آرڈن نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ لیکن فلپ خاموش رہا اینی فلپ کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتی تھی لیکن دراصل اُسے آرڈن سے ایک نوع کی خاص محبت تھی۔ اور یقیناً اینی

انکار کر دیتی۔ اگر اُس سے دریافت کیا جاتا۔

اب آرڈن کے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی کمائی سے کچھ بچا کر اپنی کشتی خریدے اور اپنی کیلئے ایک خوبصورت گھر تیار کرے۔ قسمت نے یاوری کی۔ تھوڑے عرصہ مین اُس نے کشتی خرید لی۔ اور وہ اُس موجزن ساحل پر جرات و محنت شعاری۔ رحمدلی و ہمدردی مین جلد مشہور ہو گیا۔ اُسنے تین دفعہ ڈوبتے ہوؤن کو دہشت انگیز لہرون سے نکالا۔ اسی لئے ساکنانِ ساحل کے ہان عزت کی نگاہون سے دیکھا جاتا۔ اور عین عنفوانِ شباب مین اُس نے پہاڑ کی ایک چٹان پر اینی کے لئے ایک مختصر سا آشیانہ نما گھر بنالیا۔

گرما کی ایک شام کو جبکہ لوگ تہوار منانے کے لئے سبزہ وادیون مین جمع ہو رہے تھے۔ ان تینون نے بھی تیاری کی لیکن فلپ کو گھنٹہ بھر اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے دیر ہو گئی جب فلپ وہان پہنچا تو آرڈن اینی ایک سبزہ زار پر ہاتھ مین ہاتھ ڈالے آفتاب کی آخری کرنون کا رقص دیکھ رہے تھے۔ اُس نے آرڈن کے مسرور چہرہ اور اینی کی لبریز محبت نگاہون سے اپنا مایوس انجام بھانپ لیا۔ جب اینی نے اپنے لب آرڈن کے لبون پر رکھدیئے۔ تو فلپ کے دل سے بے ساختہ آہ نکلی۔ اور وہ پودون کے ایک بے ترتیب جھنڈ مین کچھ دیر کے لئے بیٹھ گیا۔ لوگ ہنسے۔ کھیلنے کودنے کے بعد پھولون کی ٹوکریان لے کر گھر آئے۔ اور فلپ سینہ مین چند داغ لے کر لوٹا۔

آرڈن اور اینی کی شادی ہو گئی اور پورے راحت و سکون کے ساتھ سات سال گذر گئے۔ اِس عرصہ مین ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کی عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ اُس کی خواہش یہ تھی۔ کہ وہ اس لڑکی کو بہتر تعلیم و تربیت دینے کے لئے کچھ دولت جمع کرے۔ یہ خواہش استوار تر ہو گئی۔ جب ایک خوبصورت بچہ نے اس مسرت مین اور اضافہ کیا۔

(۳)

واقعات کا رُخ دفعتہً تبدیل ہو گیا۔ حالات بدل گئے۔ تقدیر پلٹ گئی۔ ایک دن آرڈن بندرگاہ مین ایک بانس پر چڑھ رہا تھا کہ پاؤن پھسل گیا۔ زمین پر آپڑا۔ اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ایام علالت مین اُس کے ہان ایک لاغر و کمزور سا زرد رنگ کا بچہ پیدا ہوا۔ اس کی تجارت پر بھی ایک ملاح نے قبضہ جما لیا۔ گو آرڈن بہادر۔ محنت شعار اور سنجیدہ آدمی تھا۔ لیکن اِن حوادث سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے بچے کمی غذا سے زرد پڑ گئے۔ اینی کے چہرہ پر حزن و ملال کے آثار نمودار ہو گئے۔ اور آرڈن کی زندگی اِن روز افزون مشکلات سے تاریک تر ہوتی گئی۔

ایک دن بستر علالت پر لیٹے ہوئے وہ اِن تاریک واقعات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اُس کا تصور تیرہ و تار مستقبل مین کھو گیا وہ ایک جھٹکے سے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ دعا نکلی۔

''او کائنات کے مالک۔ میرے بچون کے تمام مصائب میری حیات پر تقسیم کر دے اور انھین اِس سیاہ مستقبل سے محفوظ رکھ''

اس اثنا میں ایک چینی سوداگر آرڈن کے پاس آیا اور بولا:-

"میرا جہاز چین جانے کے لئے ساحل پر تیار کھڑا ہے۔ کیا تم کپتان کی حیثیت سے میرے ہمراہ جا سکو گے؟

لیکن آپ کا جہاز کب روانہ ہوگا؟"

"کم از کم تین ہفتہ کے بعد"

آرڈن۔ (یہ سمجھ کر کہ اُس کی دعا زود اثر نکلی) "بہت اچھا میں اُس وقت تک یقیناً مکمل صحت پا چکوں گا۔ اور میں جناب کی اس تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں

اس غیر متوقع مژدہ کو سُن کر آرڈن سمجھا کہ اس کی چند روزہ سیاہ بختی اُس بادل کے پریشان ٹکڑے کی طرح تھی جو آفتاب کی ضیا پاشیوں کو چند لمحوں کے لئے روک دے۔ لیکن میری غیر حاضری میں بچوں کا محافظ کون ہوگا۔ اور یہ کیونکر اس غربت میں زندگی بسر کر سکیں گے۔"

(کافی دیر تک سوچنے کے بعد) "میں اپنی کشتی بیچ کر اپنی بیوی کے لئے ایک چھوٹی سی دکان چھوڑ جاؤں گا۔ جب ساحل کے ملاح دریا کی طوفانی موجوں میں کشتیاں ڈالے مختلف ممالک جا رہے ہونگے تو ان کی بیویاں اینی سے ضروری سامان خورد و نوش خریدیں گی۔ اور اس طرح وہ اپنی زندگی زیادہ سہولت سے بسر کرے گی۔"

اس سوال کو حل کرنے کے بعد آرڈن اینی کے کمرہ میں گیا۔ اینی نوزائیدہ و ناتوان بچہ کی تیمار داری میں مصروف تھی۔ وہ آرڈن کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک آکر دفعتہً یوں گم ہوگئی گویا وہ بجلی کی ایک شعاع تھی، جو بادل کا دامن چیر کر نکلی۔ اور فضا کی سیاہیوں میں غائب ہوگئی۔ اینی نے بچہ کو اُٹھا کر آرڈن کی گود میں ڈال دیا۔ آرڈن کا سینہ پدرانہ شفقتوں سے اچھلنے لگا۔ بچے کو پیار کیا۔ اور پھر اینی کی گود میں دیدیا۔

اینی کو ابھی تک آرڈن کے نئے ارادوں کا علم نہ تھا۔ دوسرے دن صبح آرڈن نے نئے سفر کی اُسے خبر دی۔ اُس کا دل سنتے ہی دہل گیا۔ اور سختی سے اس ارادہ کی مخالفت کی۔ اینی کی افسردہ نگاہیں پژمردہ رخسار، رحم طلب آنسو۔۔۔۔ آرڈن کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکے اُس نے کشتی بیچ ڈالی روانہ ہونے سے ایک دن پہلے اُس نے مکان کے ایک حصہ کو مرمت کرکے تمام سامانِ تجارت سجا دیا۔ آرڈن دن بھر کی تکلیف سے تھک کر رات کو جی بھر کے سویا لیکن جب صبح ہوئی تو اینی گھبرائی ہوئی تھی۔ کیونکہ آرڈن اس سے جدا ہونے والا تھا۔ آرڈن غسل سے فارغ ہوا۔ کپڑے پہنے اور اینی سے یوں مخاطب ہوا۔

"میری عزیز اینی۔ میرا یہ سفر بے انتہا خوش اقبالیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ نواں بچوں کا خیال رکھنا انہیں اچھے کپڑے پہنانا روزانہ نہلانا۔ ان کے بالوں کو ہر صبح سنوارنا۔ میں جب واپس آؤں گا تو یہ ننھا کمزور بچہ صحت پاکر بڑا ہو چکے گا۔ میں جب چوکھٹ پر پہنچوں گا۔ تو یہ دوڑ کر دروازہ پر میرا استقبال

کریگا۔ میری ٹانگوں سے لپٹ جائیگا میں اسے اُٹھاؤنگا۔ اور رات کو آتشدان کے پاس بیٹھ کر اپنے لیے سفر کی سرگزشت سناؤں گا"

اینی! آزردہ نہ ہو۔ میرا سفر انشاء اللہ تمھارے فضل سے بہت مبارک ثابت ہوگا

اینی نے کہا "پیارے آرڈن، تم بڑے عقلمند ہو۔ اور آنے والے واقعات کا اندازہ کرسکتے ہو۔ لیکن مجھے قطعاً اُمید نہیں۔ کہ میری نگاہیں تمھارے پیارے چہرہ کو پھر دیکھ سکیں گی"

آرڈن نے کہا "میری نگاہیں تو تمھارے چہرہ کو دیکھ سکیں گی۔ دیکھو اینی! ہمارا جہاز اتوار کو دس بجے لنگر اُٹھائے گا۔ تم چھت پر چڑھ کر دوربین سے مجھے دیکھنا۔ تمھیں اُس وقت معلوم ہوگا کہ تمھارے خطرات کتنے ناپائدار ہیں"۔ اینی کے افسردہ لمحات یک بیک گذر گئے۔ اور آخری ساعت آ گئی۔

آرڈن۔ اینی۔ خدا حافظ۔ اطمینان رکھو۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ گھر کی ہر چیز کی حفاظت کرنا۔ اور میرے متعلق قطعاً کوئی تشویش نہ کرنا۔ اللہ پر اعتماد کرو۔ مشرق بعید کے دور دراز حصص میں بھی وہی خدا ہے۔ سمندر اُس کا ہے ہوا اسکی ہے، جس خدا نے یہاں مجھپر ہر طرح کی مہربانیاں کیں۔ وہی خدا مجھے وہاں بھی خطرات سے بچائیگا"

یہ کہہ کر آرڈن اُٹھا۔ اپنی غمزدہ و ملول بیوی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اپنے حیران بچوں کی آنکھوں کو چوما سب سے چھوٹا بچہ رات بھر بیمار رہنے کی وجہ سے سویا ہوا تھا۔ اینی اُسے بیدار کرنے لگی۔ لیکن آرڈن نے یہ کہہ کر روک دیا۔ کہ یہ معصوم ہے واقعات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ آرڈن نے بستر ہی پر بچہ کا مُنہ چوما۔ سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ اینی نے اس بچہ کی پیشانی سے بالوں کا گچھا کاٹ کر بطور یادگار آرڈن کو دیا۔ اسکے بعد آرڈن جلدی سے اُٹھا۔ اسباب اُٹھایا اور نکل گیا۔ مگر دور تک مُڑ مُڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔

(۴)

اینی دوربین لیکر بمشکل تمام اپنی مکان کی چھت پر چڑھ گئی۔ جہاز نے لنگر اُٹھا دیا۔ خدا جانے نظر کمزور تھی۔ یا دوربین سے دیکھنا اسکو نہ آتا تھا۔ بہرحال آرڈن دیر تک تختۂ جہاز پر کھڑے ہوکر رومال ہلاتا رہا۔ لیکن اینی اُسے نہ دیکھ سکی۔ یہانتک کہ آرڈن اُن پر اضطراب لمحوں کو ساتھ لیکر دور نکل گیا۔ اینی چھت سے روتی ہوئی اُتری۔ اور مجبوراً مشاغل زندگی میں مصروف ہو گئی۔ بدقسمتی سے تجارت میں اُسے سخت نقصان ہوا۔ چیزیں اصل سے بھی کم قیمت پر فروخت کرکے بمشکل وقت کاٹنا شروع کیا۔ وہ یہ خیال کرکے کہ آرڈن اسے نااہل سمجھے گا۔ اور زیادہ ملول تھی۔ وہ صبح شام آرڈن کے متعلق ہر نووارد سے دریافت کرتی۔ لیکن کوئی خبر نہ ملی۔ یہانتک کہ اُس کے ذرائع معاش بہت محدود ہوگئے۔ اور اُس کی زندگی سخت تشویش میں بسر ہونے لگی۔ چھوٹا بچہ کمی غذا کی وجہ سے زیادہ کمزور ہوتا گیا۔ اُس کی علالت طویل ہوگئی۔ گو اینی نے اُس کی تیمارداری میں پوری کوشش کی لیکن اُس محبوس طائر کی طرح جو مالک کو غافل پاکر اچانک پرواز کر جائے۔ اُس بچہ کی روح جسم سے

نکل گئی اور اینی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

فلپ نے گو تقریباً ۱۵ سال سے اینی کے ہاں آنا جانا ترک کر رکھا تھا۔ لیکن آرڈن کے جانے کے بعد اُسے کئی دفعہ خیال آیا کہ اینی کی خبرگیری کے لئے اُسے جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ اینی کے گھر پہنچا۔ ڈیوڑھی میں چند لمحوں کے لئے ٹھہرا۔ کئی دفعہ دستک دی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ تو مجبوراً اندر چلا گیا۔ اینی بچے کی تدفین سے ابھی ابھی فارغ ہو کر بیٹھی تھی اور انتہائی قلق میں اُسے انسان کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہ تھی۔ کہ اُس نے فلپ کو دیکھا۔ اس کا دل اور زیادہ بھر آیا۔

فلپ۔ (لڑکھڑاتی زبان سے) میں تم سے ایک عنایت کا طلبگار ہوں۔

اینی۔ عنایت! اور مجھ جیسی تباہ روزگار و پریشان حال سے؟

فلپ۔ ہاں تم سے اور تمہیں سے!

اینی۔ وہ کیا؟

فلپ۔ مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب ہم تینوں بچپن میں مل کر کھیلتے تھے۔ اور وہ دن بھی نہیں بھولا جب تمہاری نظر انتخاب آرڈن پر پڑی کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ عالی ہمت اور زیادہ بلند ارادہ کا انسان تھا۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس انتخاب پر بہت خوش ہوں۔ اس وقت اُس نے یہ طویل سفر اپنا۔ خوشی سے نہیں کیا۔ بلکہ اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تہذیب کے لئے یہ تکلیف گوارا کی ہے۔ بچوں کی عمر ضائع ہو رہی ہے۔ اور آرڈن کے آنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں۔ اگر آرڈن کسی زمانے میں آ گیا۔ تو اُسے یہ دیکھ کر بے حد رنج ہوگا۔ کہ اُس کے بچے بلا تعلیم رہ گئے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم بچے تعلیم کے لئے میرے حوالہ کر دو۔

اینی۔ میں اس وقت حد درجہ شکستہ حال ہوں اور غم کا پہاڑ مجھے دبائے جا رہا ہے۔ تو کیا تم ایک اور بھاری احسان کے نیچے مجھے دبانا چاہتے ہو۔؟

فلپ۔ لیکن جب آرڈن سے میں تمام مصارف دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ تو پھر احسان کی کیا بات ہے

اینی۔ یہ درست ہے۔ کہ آرڈن تمہارے مصارف ادا کر سکے گا۔ لیکن تمہاری اتنی بڑی نوازش کو کیونکر ادا کرے گا۔

فلپ۔ اینی یہ کوئی نوازش نہیں۔ اگر ہے۔ تو اس کی تلافی تم بہتر صورت سے کر سکتی ہو۔

اینی۔ وہ کیونکر

فلپ۔ وہ یوں۔ کہ مجھے بچوں کو سکول میں بٹھانے کی اجازت دو۔

اینی اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اشک آلودہ آنکھوں سے فلپ کی طرف دیکھا۔ اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر محبت سے دبایا اور یہ کہتی ہوئی پائیں باغ میں چلی گئی۔

"اچھا فلپ۔ لیکن تمہارا حق عنایت مجھ جیسی بے بس عورت کیسے ادا کرے گی"

دوسرے روز فلپ نے دونوں بچوں کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ انہیں ضروری کتابیں خرید دیں۔۔۔۔۔۔ اور اپنے حقیقی بیٹوں کی طرح انکی پرورش شروع کر دی۔ فلپ کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ وہ دن میں کم از کم ایک بار اینی کو دیکھ آئے۔ لیکن اس آرزو کو زبان خلق سے ڈر کر بہت کم پورا کرتا۔ ہاں تحفتہً اپنے باغ کے میوے۔ پھول اور کبھی مشین کا آٹا بھیج دیتا۔ گو اینی فلپ کے احسانات کے نیچے دب رہی تھی۔ لیکن آرڈن کا تصور اُس کے دل و دماغ پر اتنا محیط تھا۔ کہ وہ ان جذبات کا اظہار شکریہ کے نامکمل لفظ سے بھی بمشکل کر سکتی۔ بہرحال فلپ اب بچوں کی معصوم توجہات کا مرکز تھا۔ وہ فلپ کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے آتے۔ اور ٹانگوں سے لپٹ کر بہت خوش ہوتے۔ وہ اپنی شکایات اُس کے سامنے بیان کرتے۔ اور اُسے ابا فلپ کہہ کر پکارتے۔ یہی بچے اب فلپ کی مشین کے نیچے مالک تھے۔ اب آرڈن کا تصور بچوں کے دماغ میں خواب کی طرح دھندلا ہو چکا تھا۔ آرڈن کی یاد آہستہ آہستہ یوں مٹ رہی تھی۔ جس طرح کہ شام کی سیاہیوں میں نقوش کوہسار آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہیں۔

(۵)

شام کا وقت ہے۔ آفتاب کی شعاعیں گھنے پتوں سے چھن چھن کر رنگین وادیوں میں بکھر رہی ہیں۔ دور دور تک سکون پھیلا ہوا ہے۔ سیاہیاں بڑھ رہی ہیں۔ اور پھولوں کے ایک خیابان میں اینی فلپ کے ساتھ سر جھکائے سوگوار بیٹھی ہے بچے جھاڑیوں میں کھیل رہے ہیں۔ فلپ کو دفعتہً وہ شام یاد آگئی۔ جب اُس نے پہلی دفعہ نہیں اینی کو آرڈن کے پہلو میں دیکھا تھا۔ فلپ کئی روز سے تنہائی کی تلاش میں تھا تاکہ وہ اینی کے سامنے اپنے جذبات دل ظاہر کر سکے۔ اس وقت بہتر موقعہ سمجھ کر بولا۔

"پیاری اینی پورے دس سال آرڈن کے انتظار میں کٹ گئے۔ تیری جوانی ختم ہو گئی۔ تیری زندگی مسلسل سوگ ہو چکی، یہ حالت آخر تابکے۔ یقین کر۔ کہ آرڈن کا جہاز تباہ ہو چکا ہے۔ اور وہ واپس آنے کا نہیں۔ میں اس آرزو کو کب تک نہاں رکھوں۔ کہ مجھے تجھ سے انتہائی محبت ہے۔ میں تیرے موجودہ غربت و افلاس کو نہیں برداشت کر سکتا۔ میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ اپنے خاندان میں تنہا رہ گیا ہوں۔ مجھے کسی اور کی فکر نہیں۔ تو مجھے شروع سے جانتی ہے۔ اس لئے اگر تو مجھ سے شادی کرے۔ تو مجھے تیرے بچوں کی تعلیم و تربیت اور تیری دلداری میں بے انتہا مسرت ہوگی۔"

اینی۔ پیارے فلپ۔ تو میرے برباد اور ویران غمکدہ میں فرشتۂ مسرت بن کر نازل ہوا ہے۔ لیکن تجھے مجھ سے زیادہ اچھی بیوی کی ضرورت ہے۔ میں ملول ہوں۔ اور دلھن بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ علاوہ ازیں یہ ممکن نہیں۔ کہ ایک دل میں دو صورتیں گھر کر سکیں۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ آرڈن کے بعد تمام دنیا میرے لئے اُجاڑ ہو چکی ہے۔ اور مجھے کائنات کی کسی چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی باقی نہیں۔

فلپ۔ محبت کے لئے نہ سہی، کیا تو مجھے اپنی خدمت کے لئے بھی منظور نہیں کر سکتی

اینی -- اچھا تو کچھ مدت اور ٹھہرو۔ شاید کہ مشرق بعید کا کوئی جھونکا۔ سمندر کی کوئی موج۔ یا افقِ مشرق کا.....
کوئی سیاح بادل آرڈن کی خبر لے آئے۔ یا وہ خود آجائے۔

فلپ - اینی بے سود انتظار نہ کرو۔ کہ آرڈن مدت سے سمندر کی تاریک گہرائیون مین سو رہا ہے۔

اینی - فلپ صرف ایک سال اور ٹھہرو۔ گو میرے لئے ایک سال کا عرصہ بہت طویل ہے۔ لیکن تمھارے لئے بہت طویل نہین۔ مین وعدہ کرتی ہون کہ اس میعاد کے بعد تمھاری ہوجاؤن گی۔ اگر آرڈن نہ آیا۔ میرا دل کہتا ہے۔ کہ وہ ضرور آئیگا۔

دونون کچھ لمحہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ پہاڑون کی بلند ترین چوٹیون سے روشنیان رخصت ہوگئین۔ دھندلی تاریکیان پھیلنے لگین۔ فضا سرد ہوگئی۔ مجبوراً اینی اور فلپ پھولون سے لدے ہوئے بچون کو لیکر رخصت ہوئے۔ چوکھٹ پر پہنچ کر اینی نے ہاتھ ملایا۔ اور اندر چلی گئی

(۶)

"آہ آرڈن تیری یاد مین زندگی تاریک ہوگئی۔ مسرتین بھول گئین۔ میری حیات کا ہر لمحہ فسانۂ درد بن گیا۔ کیا تو واقعی ڈوب کر مر گیا۔ آہ! دل باور نہین کرتا۔ تو آئے گا۔ اور ضرور آئیگا" یہ تھے وہ الفاظ۔ جو ایک صبح اینی کے منہ سے نکل رہے تھے کہ فلپ نمودار ہوا۔ اور بولا۔

فلپ - سال ختم ہوگیا ہے۔ مین تم سے تکمیلِ وعدہ کی درخواست کرتا ہون۔

اینی - ہین؟ سال؟ اتنی جلدی؟ وہ کیسے؟

فلپ - ہان۔ یقیناً وہ سامنے دیکھو۔ کوہسار کے خشک دامنون سے چشمے اُبل رہے ہین۔ سرسبز وادیان پھر پھولون سے بسرہز ہوگئین۔ ببولون کے زرد پھولون پر بھونرے پھر اُڑنے لگے شہد کی مکھیون نے پھر چھتے بنانا شروع کئے۔

اینی - مگر فلپ ایک ماہ اور انتظار کرو۔ ایک ماہ کوئی زیادہ عرصہ نہین۔ شاید کہ آرڈن آجائے۔ آہ آرڈن!!

فلپ - اینی مجھے عذر نہین۔ لیکن پورا ایک ماہ........ پورا ایک ماہ........

اینی - مین تمھاری خاموش اور پائدار محبت کی بے حد قدر کرتی ہون۔ لیکن اتنے بڑے تغیر کے لئے صرف ایک ماہ مہلت چاہتی ہون

فلپ (آبدیدہ ہوکر) تمھاری خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہون۔

چند دن گذر گئے۔ ایک رات اللہ کے حضور مین اینی نے رو رو کر آرڈن کی حیات و موت کے متعلق کسی فیصلہ کن نشان کے متعلق دعائین کین۔ آدھی رات گذر گئی۔ اور وہ روتی رہی۔ آخر اُٹھی انجیل مقدس کو چوما۔ کھولا۔ اور آنکھین بند کرکے ایک آیت پر اُنگلی رکھدی۔

اس آیت کا مفہوم یہ تھا کہ:-

"وہ ایک کھجور کے درخت کے سایہ مین ہے۔ اور اُسپر آفتاب چمک رہا ہے"

اینی اسے اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ سوچتے سوچتے سوگئی۔ خواب مین دیکھا۔ کہ ایک بلندی پر کھجوروں کے نیچے آرڈن بیٹھا ہوا گا رہا ہے۔ اُسے جاگتے ہی یقین ہوگیا۔ کہ آرڈن مرچکا ہے۔ اور اُس کی روح فردوس کی فضا مین مسرور و خرم ہے فوراً فلپ کو پیغام بھیجا۔ اور رسم نکاح ادا ہوگئی۔ ہرچند اب اُن کی زندگی کا نیا دور تھا۔ لیکن اینی کے تصور مین صرف آرڈن اس رہا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نامحسوس چیز کے انتظار مین رہتی۔ اُسکے کان کسی نامسموع آواز کی طرف لگے تھے۔ وہ جب کہین باہر سے گھر لوٹتی۔ تو دروازہ کی کنڈی پکڑ کر گھنٹون کھڑی رہتی۔ وہ بدستور اُداس رہتی۔ تقریباً ایک سال کے بعد اُس کے ہان ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ اینی کے مادرانہ جذبات مین پھر زندگی آگئی۔ فلپ کے ساتھ بھی اُسے دلبستگی پیدا ہوگئی اور آرڈن کی تصویر رفتہ رفتہ اینی کے دماغ سے محو ہوگئی

(۷)

آرڈن چینی جہاز پر سوار ہوکر بعافیت تمام چین پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ وہین رہا۔ واپسی پر بچون کے لئے کھلونے اور اپنی پیاری بیوی کے لئے ہار خریدا۔ جہاز لنگر اُٹھا کر چندیا۔ چند دن اطمینان سے گذرے۔ لیکن ایک صبح اپنے دامن مین سینکڑون طوفان لئے نمودار ہوئی۔ سمندر کی سطح پر ہزارون کوہ پیکر موجین لوٹ رہی تھین۔ گویا سمندر اُبل رہا تھا۔ آندھی اس زور سے چل رہی تھی کہ جہاز کو سنبھلنا دشوار ہوگیا اور راہ سے بھٹک گیا آخر کار آدھی رات کے قریب جہاز ایک چٹان سے ٹکرایا اور پاش پاش ہوگیا۔ آرڈن اور چند مسافر تختون سے لپٹ گئے۔ رات بھر طوفان کے ہچکولے کھاتے رہے۔ صبح کے قریب وہ تختے ایک تنہا دور افتادہ جزیرہ پر جا لگے ان تینون نے پہاڑ کے ایک غار کو کھجور کے پتون سے ڈھانک کر گھر بنایا اور جنگلی میوون پر بسر کرنے لگے۔ پانچ سال کے بعد ان مین سے ایک ساتھی مرگیا اور صرف دو آدمی باقی رہگئے انھون نے ایک بڑے درخت کا تنہ کہین سے ڈھونڈھ لیا اُس تنہ کے اندرونی حصہ کو تیز پتھرون سے کاٹ کر اور چقماق کے شعلون سے جلا کر کشتی بنانے کی کوشش شروع کردی۔ کہ آرڈن کا ساتھی بیمار ہوگیا۔ اور ہفتہ کے اندر وہ بھی مرگیا۔ اب آرڈن تنہائی مین بہت گھبرایا۔ ہر چہار سو سفید سمندر۔ لہرون کی خوفناک آوازین۔ دور تک کوہسار کا بلند سلسلہ۔ ویرانی۔ بربادی۔ خاموشی اداسی۔ سرسبز پہاڑون کی برفانی چوٹیون پر گہرے بادل چھائے رہتے۔ درختون کی جھکی ہوئی چوٹیون کو نسیم و صبا کے آوارہ جھونکے چھیڑتے۔ خوشرنگ وادیون کے رنگ برنگ پھولون پر سنہری تیتریان دن بھر اُڑتین۔ تنون اور شاخون پر لپٹی ہوئی بیلون مین زرد و سفید پھول حسین منظر پیش کرتے۔ کھجورون کے جھنڈ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب مناظر آرڈن کے سامنے تھے۔ لیکن آرڈن کی آنکھین انسانی چہرہ کو ترس رہی تھین دریائی پرندون کی دلفریب صدائین صبح و شام آتی تھین۔ سمندر کی مسلسل موجین چٹانون سے ٹکرا کر ساحل پر نغمے بکھیرتی تھین۔ پتون کے ساز سے ہوا نغمے اچھالتی تھی

پہاڑون کی پیشانی سے پھوٹنے والی ندیان نغمے گاتے ہوئے نکل جاتی تھین۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن آرڈن کے کان صرف انسانی آواز کے لئے مضطرب تھے۔ وہ اپنے جھونپڑے مین بیٹھ کر پانی کی نیلی سطح پر ٹکٹکی جمائے رکھتا۔ وہ ساحل پر بیتابانہ ٹہلتا۔ اور سمندر کو ہمیشہ دیکھتا رہتا۔ کہ شاید کوئی جہاز آتا ہوا دکھائی دے۔ برسون گذر گئے مگر جہاز نہ آنا تھا نہ آیا۔

ہر صبح آفتاب کی اچھوتی کرنین ساحل پر نہانے آتین۔ ہر شام نیلے پانی مین شفق کا ارغوانی عکس عجیب کیفیتین پیش کرتا۔ اسی طرح دن مہینون مین اور مہینے سالون مین تبدیل ہوتے رہے اور کوئی صورت نجات کی اس کو نظر نہ آئی وہ پہرون ایک جگہ یون جم کر بیٹھ جاتا۔ گویا وہ مرچکا ہے۔ آٹھون پہر گھر کا نقشہ آنکھون مین جما رہتا۔ اُسے وہ دن یاد آتے جب اینی سے مل کر وہ پھولون کی سیر کو جایا کرتا تھا۔ بچون کی گفتگو۔ وہ بات بات پر شگفتہ سنتین۔ وہ اُنکے ہلکے ہلکے قہقہے۔ وہ اُن کا مان کی آغوش مین خوش ہو ہو کر لیٹنا۔ یاد آتا۔ غلپ کی مشین اُس کی پیاری آواز۔ وہ کشتی۔ وہ ساحل وہ کچے پکے گھر۔ وہ نومبر کی سردیان۔ وہ کہر آلود صبحین۔ اور وہ دھندلی فضائین۔ آرڈن کو رہ رہ کر ستاتین۔ وہ گو جوان تھا۔ لیکن مسلسل مصائب نے بوڑھا کر دیا تھا۔ کمر جھک گئی تھی۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ اور نجات سے اسقدر مایوس ہو گیا تھا۔ کہ نجات کی خواہش ہی رفتہ رفتہ مٹ چلی تھی۔

(۸)

"جہاز کہین سے کہین آگیا۔ کمپاس خراب ہو چکے ہین۔ رہبر ندارد۔ افسوس کہ اب ہمارا صحیح سالم گھر پہنچنا بہت مشکل ہے"

یہ تھے۔ وہ الفاظ جو ایک کہر آلود صبح کو دھندلکے مین دس سال کے بعد دفعتہً آرڈن کے کانون تک پہنچے۔ وہ اُٹھا ساحل پر آکر دیکھا۔ تو ایک جہاز لنگر ڈالے ہوئے ہے۔ ملاح اس عجیب الہیئت، انسان کو دیکھکر گھبرائے۔ آرڈن نے اشارون سے (دس سال مین گفتگو کرنا بھول چکا تھا) ...... انہین اطمینان دلایا۔ انکی باتین سننے کے بعد آرڈن مین بولنے کی طاقت عود کرآئی۔ اپنی تمام رام کہانی سنائی۔ نیز اُنہین یقین دلایا۔ کہ وہ خود بہتر ملاح اور راہ ورسم منزل سے باخبر ہے۔ اس لئے انہین گھبرانا نہین چاہیے۔ اہل جہاز نے آرڈن کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر ساتھ بٹھالیا۔ اور چل دئے۔

آرڈن کی حالت مین تغیر پیدا ہونا شروع ہوا۔ اُسکی افسردگیان دور ہونے لگین۔ اُس کے چہرے پر دس سال کے بعد مسرت کی جھلک سی نظر آنے لگی۔ وہ ملاحون سے اپنے گھر کے متعلق بار بار پوچھتا۔ لیکن وہ نہ بتا سکتے۔

دن گذرتے گئے۔ آخر پورے دو ماہ کے بعد آرڈن کا وطن نمودار ہوا۔ اُسے دور سے غلپ کی مشین نظر پڑی پھر آہستہ آہستہ وہ کچے مکانات۔ وہ ساحل پر ٹوٹی ہوئی کشتیان نظر آئین۔ اس کا دل لامحدود مسرتون سے اچھلنے لگا ملاحون نے ازراہ ہمدردی کچھ رقم چندہ کرکے آرڈن کو دی۔ جہاز ٹھہرا۔ تو آرڈن فوراً اترا۔ اور گھر کو چلدیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب کی پہاڑیان سیاہ بادلون سے لدی ہوئی تھین۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیاہیان چھا گئین۔ آندھی چل پڑی

کچھ بوندا باندی بھی شروع ہوگئی۔ لیکن آرڈن نہایت تیزی کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ گاؤن مین داخل ہوا۔ چند تاریک گلیون سے گذرنے کے بعد وہ اپنے چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر زور زور سے دستک دینے کو تھا۔ کہ دروازے پر ایک سفید کاغذ نے اُس کی توجہ کھینچ لی۔ بجلی چمکی تو جلی قلم سے لکھے ہوئے یہ الفاظ اُسے نظر پڑے:۔

"یہ مکان فروخت ہوگا" کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ دل بیٹھنے لگا اور بدن پر رعشہ سا طاری ہوگیا۔ آہستہ آہستہ حواس قائم ہوئے۔ تو اُسے یقین ہوگیا۔ کہ اینی مرگئی ہے۔ اور بچے یتیم ہو کر خدا جانے کہان کی خاک چھان رہے ہونگے وہ سال کی طرف لوٹا۔ اور ایک ایسی سرائے مین چلا گیا جس کی مالک ایک بڑھیا تھی۔ جسے آرڈن اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ یہان وہ آغازِ شباب مین دن کا بیشتر حصہ بسر کیا کرتا تھا۔ گو بڑھیا بھی آرڈن سے اچھی طرح واقف تھی۔ لیکن اب قطعًا نہ پہچان سکی۔ آرڈن اُس سرائے مین چند دن رہا۔ لیکن رازِ دل کسی سے نہ کہہ سکا۔ باتون باتون مین اُسے بڑھیا سے معلوم ہوگیا کہ اینی نے دس سال کے طویل انتظار کے بعد فلپ سے شادی کرلی۔ اور اب اُس کے ہان بچہ بھی پیدا ہوچکا ہے۔ بڑھیا نے اینی کی دردناک داستان کو ان الفاظ پر ختم کیا۔ "آہ آرڈن تباہ ہوگیا"

آرڈن نے اک خاموش آہ کی۔ اور یہ سوچ کر کہ اینی ہمیشہ کے لئے اس سے جُدا ہوگئی (بڑھیا کے الفاظ نہایت ہی دردناک لہجہ مین دوہرائے "آہ واقعی آرڈن تباہ ہوگیا"

آرڈن عمومًا سرسبز وادیون مین ان مقامات پر پہرون بیٹھا رہتا جہان اُس نے کوئی شام اینی کی مسرورمعیت مین بسر کی تھی۔ وہ پہاڑ کے دامن سے اپنے پُرانے مکان کو دیر تک دیکھتا رہتا۔ اُس کے دماغ مین ماضی کے تمام فسانے ایک ایک کرکے آتے۔ وہ بسا اوقات ہاتھون سے منہ کو ڈھانک لیتا۔ اور اپنی سیاہ بختی پر پہرون روتا۔

"اسنے ایک دن سوچا کہ کسی نہ کسی طرح اینی کو دیکھنا چاہئے۔ اگر وہ خوش ہو۔ تو مین اپنی سوگوار تنہائیون کو یقینًا گوارا کرلون گا"

اینی کو دیکھنے کا تصور آرڈن کے دل و دماغ پر اتنا مستولی ہوا۔ کہ وہ ایک تاریک شام سرائے سے چل نکلا۔ اور پوچھتے پوچھتے فلپ کے نئے گھر تک جا پہنچا۔ چراغ جل چکے تھے۔ فلپ کا گھر روشنیون سے جگمگا رہا تھا۔ دروازون اور کھڑکیون کی باریک جالی سے لیمپ کی سبز و سفید شعاعین چھن چھن کر بائین باغ کے گھنے درختون تک پہونچ رہی تھین آرڈن چپکے سے بائین باغ مین داخل ہوا۔ اور دبے پاؤن سامنے کھڑکی تک جا پہنچا۔ ہاتھ اُٹھا کر آنکھون کے سامنے کرلئے اور کھڑکی کی آہنی جالی سے اندر جھانکا اُس نے ہشاش بشاش بچے دیکھے۔ فلپ کو دیکھا۔ اینی دیکھی۔ الغرض ایک ایسا گھر نہ دیکھا جسکی مسرتون مین آرڈن کا قطعًا کوئی حصہ نہ تھا۔ سامنے کی صاف میز پر چاندی کے برتن چمک رہے تھے الماریون مین چائے کے سٹ رکھے تھے۔ چار پائیون پر بستر لگے ہوئے تھے۔ وسط مین انگیٹھی دہک رہی تھی۔ جسکے گرد فلپ بچون سمیت بیٹھا تھا۔ فلپ کی دائین طرف اینی تھی۔ بائین طرف اینی کی شکل و صورت کی ایک نوجوان حسین لڑکی نور ائیڈ

بچہ سے کھیل رہی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں ایک رنگدار فیتہ تھا جسے وہ بچے کے ننھے ننھے ہاتھوں تک لے آتی اور جونہی بچہ اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ تو وہ فیتہ کو اوپر کھینچ لیتی۔ بچہ کی اس ناکام کوشش کو فلپ دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ اینی اپنے بڑے بیٹے سے گفتگو کر رہی تھی۔ اور کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی۔

آرڈن نے یہ تمام منظر دیکھا۔ اُسنے اپنی پیاری بیوی۔ خوبصورت اور جوان بچوں کو دیکھا جو امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

آرڈن سخت بے چین و بے قرار ہوگیا۔ قریب تھا۔ کہ اُس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل کر تمام گھر کی مسرتوں کو کوبرہم کردے کہ آرڈن نے بدقت تمام اپنے آپ کو روکا۔ وہاں سے اُٹھا۔ پیچھے ہٹا۔ اور باغ سے باہر آگیا

اس کے بعد آرڈن نے سوچا کہ اپنے بچوں سے بھی ملے۔ یا نہ ملے لیکن اپنے صبر و ضبط پر اعتماد نہ کرتے ہوئے۔ بچوں سے ملنے کا خیال بھی قطعًا ترک کر دیا۔

آرڈن سرائے میں واپس آگیا۔ اب اس کا شبانہ روز کا مشغلہ صرف عبادت تھی۔ جس میں اُسے مکمل سکون ملتا ایک دن یونہی باتوں باتوں میں آرڈن نے سرائے کی مالکہ سے دریافت کیا۔

آرڈن ۔ "کیا فلپ کی بیوی کو یہ خطرہ نہیں۔ کہ اس کا پہلا شوہر زندہ ہو۔ اور آجائے"

مالکہ ۔ "ہاں اُسے رات دن یہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اگر تم یا کوئی اور اُسکے پہلے شوہر کی نسبت کوئی اطلاع دے سکے تو وہ بے حد ممنون ہو"

آرڈن خاموش ہوگیا۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اُسے ضرور ہم راز بنائے گا۔ اسی حالت میں پورا سال گذر گیا۔ آرڈن کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔ مختلف بیماریاں ہجوم کر آئیں۔ اور اُسے موت کا یقین ہوگیا۔ اسی حالت میں اسنے مالکہ کو طلب کرکے کہا کہ

"مقدس بائبل کی قسم کھا کر کہو۔ کہ جو راز میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں۔ اُس کا افشا نہیں کرو گی"

مالکہ ۔ (کچھ سوچنے کے بعد)۔ بہت اچھا میں انجیل کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمھارا راز ظاہر نہیں ہوگا

آرڈن ۔ کیا تو آرڈن کو جانتی تھی؟

مالکہ ۔ یقینًا۔ اُس کی جوانی اُس کی اُٹھی ہوئی گردن۔ اُس کا ابھرا ہوا سینہ دور سے پہچانا جاتا تھا۔

آرڈن ۔ لیکن اُس کی جوانیاں خواب و خیال ہو چکی ہیں۔ اُسکی بلند گردن، برسوں ہوگئے کہ اوپر نہیں اُٹھی اور وہ مصائب کا شکار اس وقت تمھارے سامنے ہے

مالکہ ۔ (چونک کر) ہیں! کیا آرڈن تم ہو۔؟! واقعی؟ نہیں کبھی نہیں۔ وہ تم سے نسبتًا بھرا ہوا اونچا تھا

آرڈن ۔ ہاں یہ درست ہے۔ لیکن یقین کرو۔ کہ آرڈن میں ہی ہوں۔ اینی سے میری ہی شادی ہوئی تھی۔

فلان گھر مین نے ہی آباد کیا تھا۔ اور اس تمام ساحل پر میری ہی محنت، مشقت اور جوانمردی کے ترانے گائے جاتے تھے۔

مالکہ کے آنسو نکل پڑے اور وہ بے اختیار ہو گئی کہ اپنی سے سارا حال کہہ سنائے لیکن آرڈن نے کہا کہ ٹھیرو مین اپنے عہد کو کسی طرح توڑ نہین سکتا اور اس زندگی مین اس سے کسی طرح نہین ملسکتا۔ مگر میری موت قریب آگئی ہے۔ اور مین سامنے دوسری دنیا کے افق پر چمکیلے بادل چھائے ہوئے دیکھ رہا ہون۔ مین تم سے مرنے کے بعد اینی تک ایک پیغام لے جانے کی درخواست کرتا ہون اُس سے کہنا۔ کہ آرڈن واپس آیا۔ اور اُس نے تمھین ایک رات بچون مین خوش وخرم دیکھا۔ اُسے یقین دلانا۔ کہ مرتے دم تک میری محبت مین فرق نہین آیا۔ مین جب تک زندہ رہا۔...... بہبودی کے لئے مصروف دعا رہا۔ اور مرتے وقت لبون پر تیرا نام تھا۔ مین جب مرجاؤن۔ تو بچون کو میری میت پر بھیجدینا۔ انھین اجازت دینا۔ کہ وہ اپنے مصیبت زدہ اور مسافر باپ کی نعش پر چند معصوم آنسو ٹپکائین۔ لیکن اینی اپنی میری میت پر نہ آئے۔ مبادا میرے بے جان چہرہ کی یاد اُسکی زندگی کو تلخ کردے۔

یہ بالون کا گچھا اُسے دینا۔ اور کہنا۔ کہ مین اس گچھے کو دوسری دنیا تک لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن چونکہ میرا وہ بچہ مجھسے پہلے چلا گیا ہے۔ اس لئے اس کی یادگار تمھارے لئے چھوڑ چلا ہون۔ اور خود اس سے جاکر ملا جاتا ہون۔

مالکہ اُٹھکر کاروبار مین مصروف ہو گئی۔ آرڈن دیر تک گفتگو کرنے کی وجہ سے تھک کر سو گیا۔ چند ہی لمحے گذرے تھے کہ آرڈن جھٹکے سے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔

"وہ جہاز آیا۔ جہاز۔ مین بچ گیا۔ مین بچ گیا"

اور ہمیشہ کے لئے خاموش

کہتے ہین۔ کہ اس قصبہ کے باشندون نے کبھی اتنا شاندار جنازہ اُٹھتے نہین دیکھا۔ اور آج تک ساحل کے پہلو مین ایسا "ہیرو" کبھی دفن نہین ہوا۔

(Tennyson)

برق۔ بی۔ اے

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ سابق)

عربی معاشرت میں شاعر کا درجہ

"شاعری اور الہام" کا عقیدہ طبقات انسانی میں مشترک ہے، بالخصوص مشرق کی جن اقوام کی تاریخ شاعری موجود ہے، انکے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے، کہ ہر قوم قدیم زمانہ میں شعراکے ساتھ الہامی خصوصیات کو بھی ضروری سمجھتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان، عرب، فارس میں ہر جگہ یہ عقیدہ پایا جاتا تھا میکڈونلڈ نے پروفیسر گولڈزہر کے حوالے سے اس مسئلہ پر ایک جامع بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے:-

"حقیقت شاعری اور شعرا کی شخصیت کے متعلق قدیم عربوں کا رجحان اور عقیدہ کیا تھا؟ اسکا جواب پروفیسر گولڈزہر کی عالمانہ تحقیقات سے دیا جا سکتا ہے۔ جو اسکی تصنیف "لسان عربیہ" (Arabioebe Philologie) میں شایع ہو چکی ہیں، اس سوال کا جو جواب کتب عربیہ سے مستفاد ہوتا ہے وہ وہی ہے جو قدیم اقوام میں پایا جاتا ہے کہ شاعری ایک ساحرانہ بیان ہے، عالم باطن کا ایک الہام ہے اور شاعر ایک ہی وقت میں ایک پیشینگو بھی ہے اور مصلح بھی ناصح بھی ہے، اور اعدا کے مقابلہ میں اعمال سحر کا ماہر بھی زبان عربی میں (...) کے لئے عام اور قدیم اصطلاح "شاعر" ہے جسکے معنی ہیں "وقوف رکھنے والے" کے معنی کے لحاظ سے یہ عبرانی لفظ "ایدیونی" سے ملتا ہوا ہے لیکن عبرانی اصطلاح معجزانہ خیالات، اور ماالعیاتی دائرہ سے نکلکر "شاعرانہ بیان" کے معنی میں استعمال نہیں ہوئی، عبرانی میں ایک اور لفظ "موشیل" ہے جسکے معنی ہیں ایک خاص قسم کا شاعر جسکے بیان میں ہجو وغیرہ پایا جائے، اور جسکے الفاظ برے نتایج پیدا کریں بنی اسرائیل کی تاریخ میں "موشیل" کے علاوہ ایک اور لفظ "بلعم" نظر آتا ہے جس کا مفہوم وہی ہے جو کسی وقت عرب میں شاعر کا تھا اسلئے سامی دنیا میں شاعر وہ تھا جس میں کلا دنت اور مبنی کی خصوصیات ایک مرکز پر جمع ہو جائیں "بلعم" کے متعلق بظاہر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسے عالم غیب سے کوئی علاقہ ہے، اور علاقہ بھی وہ جو "مابعد الطبیعیات" سے واسطہ رکھتا ہے۔

اہل عرب کا یقین تھا کہ انکا شاعر "جنات" کی دنیا سے رسم و راہ رکھتا ہے، قدیم عربوں میں جنات کی مذہبی حیثیت تھی، جو علم الاصنام میں دیو پری وغیرہ کی حیثیات کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ معمولی قسم کے دیوتا ہیں اور انہیں اسلام نے بھی ایک جداگانہ مخلوق تسلیم کیا ہے، چنانچہ اسلامی عقیدہ کی بنا پر جنات میں بعض مسلمان ہیں بعض کافر اور بعض ارباب شر و فتنہ

"ایک عربی شاعر کو جنات کے ساتھ کیا تعلق تھا، اسکی ایک نظیر حسان ابن ثابت کی زندگی میں پائی جاتی ہے جو رسول اللہ کے ایک باریاب صحابی، اور مدح سرا شاعر تھے، رسول اللہ عموماً شاعری کے مخالف تھے اور اکثر شعرا آپکے خلاف تھے، لیکن حسان ابن ثابت نے ایک خاص قسم کی شاعری سے آپکی حمایت کی، اور خصوصیت کے ساتھ شعرائے کفار کی ہجویہ شاعری اور لعن طعن کا جواب دیا۔ ان کے شاعر بننے کا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بعثت اسلام سے قبل جبکہ وہ ابھی بچہ تھے اور ہنوز کوئی شعر نہ کہا تھا، ایک جنیہ کی بدولت شعر وسخن کا میلان ہو گیا، وہ ان سے مدینہ کی گلی میں ملی اور لپٹ کر انہیں دبایا اور مجبور کیا کہ وہ تین اشعار کہیں، اسکے بعد سے وہ شاعر ہو گئے، اور دوسرے عربی شعرا کی طرح "جن" کی بدولت انہیں اشعار کا الہام ہونے لگا وہ خود فرماتے ہیں کہ کس طرح "جنات" انکی انشا کے لئے الفاظ فراہم کرتے ہیں اور وہ خود معترف ہیں کہ شب کیوقت کیسے وزنی الفاظ انپر نازل ہوئے، یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ اصطلاحات جو انہوں نے استعمال کئے ہیں وہی ہیں جو نزول وحی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں روایات سے یہی پتہ چلتا ہے، کہ رسول اللہ مسجد میں انکے لئے ایک منبر قایم کرتے تھے اور اظہار انبساط کے طور پر آپ نزدیک کھڑے رہتے، اور حسان یہیں سے اعدائے اسلام کے خلاف اشعار پڑھا کرتے یہ ان چند مواقع میں سے ایک موقع تھا جبکہ رسول اللہ شاعری کے موافق نظر آتے ہیں چنانچہ آپکی مشہور حدیث ہے کہ" اللہ تعالی روح القدس سے حسان کی مدد کرتا ہے، جب تک وہ پیغمبر خدا کی حمایت اور مدح کا فخر رکھتے ہیں" لیکن یہاں "روح القدس" سے مسیحیت کے عقیدۂ تثلیث کا جزو ثالث مراد نہیں

حسان کی ابتدائی شاعری اور رسول اللہ کے آغاز نبوت کے متعلق جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان میں ایک ہی اصطلاحات موجود ہیں اور یہ دوسرا غور طلب نظریہ ہے، جس طرح حسان کو ایک نسوانی روح نے دبوچا اور ان سے اشعار کہلائے، اسی طرح ابتداء وحی میں پہلے پہل جبریل نے آن حضرت سے آیتیں پڑھوائیں اس کے علاوہ جس طرح جبرئیل آن حضرت صلعم کے "قرین" کہلاتے ہیں اسی طرح ایک جن ایک شاعر کا قرین ہوتا ہے، اور وہی لفظ "نفث" دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے یہ محمد کے ابتدائی زمانہ کا کابوس تھا اور اسوقت آپکا رجحان بالکل شعر وشاعری کی طرف تھا، یقیناً آپ قدیم عربی طرز کے ایک شاعر تھے، جنھیں ہر چند نظم نگاری کے قواعد واصول کا علم نہ تھا لیکن شاعری کے نہانہ طریق سے خاص شغف رکھتے تھے

مجھے یہاں ان تفصیلات سے بحث نہیں جو شعرا اور انکے سروش غیبی کی ملاقات کے متعلق بیان کیجاتی ہیں کہ "کس طرح ایک شاعر جبتک سکا ہاتف غیبی مکان کے ایک گوشہ سے آکر اسے نہ پکارے بے یارو مددگار پڑا رہتا ہے" "کس طرح شاعر حالت یاس میں اپنے اونٹ پر ریگستان کا رستہ لیتا ہے، اور ایک مقام پر آکر پکارتا ہے" آؤ اپنے بھائی کی مدد کرو، اپنے بھائی کی مدد کرو" اور کس طرح جلد تر مدد پہونچتی ہے۔ "شاعر کس طرح زمین پر

لیٹ جاتا ہے، اور جبتک ایک سو سترہ اشعار نہین کہہ لیتا اپنی جگہ سے نہین ہٹتا" اس قسم کی اور بھی بہت سی حکایات ہین جو بطور تفریح بیان کیجاتی ہین۔

عرب کے شعرا اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کے درمیان جو مشترک خصایص پائے جاتے ہین انکا مطالعہ کرنیکے بعد نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ عربون کے معاشرتی اور سیاسی معاملات مین شاعر کا درجہ کیا تھا؟ کس طرح بنی اسرائیل موسیٰ کی وساطت سے یہوی کے حکم کے مطابق اپنا خیمہ قایم کرتے اور پھر اکھاڑ لیتے تھے، اور کیسے حضرت موسیٰ کی وساطت سے کس طرح ان کی خانہ بدوش زندگی کے قیام و سفر کے صحیح اوقات اور مقامات کے لئے یہوی کی رہنمائی ہوتی، قدیم قبایل عرب مین شعرا کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ زہیر ابن جناب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے:۔

"جب زہیر کہتا ہے، اے اہل قبیلہ سفر کرو، تو وہ سفر کرتے ہین اور جب کہتا ہے، کہ قیام کرو تو وہ قیام کرتے ہین"

ایک شاعر کس طرح مذہبی رنگ مین اپنے قبیلہ کی رہنمائی کرتا مفصلہ ذیل واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔

آغانی (جلد ۱۹) کے حوالہ سے میکڈونلڈ نے اہل عرب کے ایک قاید کے وہ معاشرانہ اصول نقل کئے ہین، جو وہ اپنے قبیلہ کے مختلف طبقات کے لئے پیش کرتا تھا، بنی ازد کا ایک قاید کھڑا ہوتا ہے، اور کہتا ہے۔

جسکے پاس دودھ اور پانی کی مشکین مضبوط ہون، اسے مویشی کے گلہ سے نکلکر "الناس من" چلا جانا چاہئے اور یہان صنعا کے بنی ازد آباد ہین، جو غربت و افلاس مین مبتلا ہو اسے لطن مر مین چلا جانا چاہئے، جہان بنی خزاعہ رہتے ہین، اور تم مین جو شراب و کباب، حکومت و سلطنت، حریر و پرنیان چاہتے ہین، انہین بصرہ اور اور الحضیر مین چلا جانا چاہئے، جو سرزمین شام مین ہے اور جو وہان آباد ہین، آل غسان کہلاتے ہین، اور تم مین جنکے مقاصد بعید ہون، اور انکے پاس مضبوط اونٹ اور اچھا سامان ہو، انہین عمان کے "قصر جدید" مین چلا جانا چاہئے، اور جو وہان آباد ہین، بنی ازد عمان کہلاتے ہین، اور جو لوگ چاہتے ہین کہ چیزین مٹی اور غبار سے پیدا ہون، انہین یثرب مین جانا چاہئے، جو کھجور کے درختون سے مالامال ہے، اور جو یہان رہتے ہین "اوس" اور "خزرج" کہلاتے ہین"

یہ تمام معاشرانہ نظریات مسجع عبارت مین ہین جو کاہنون کے مکالمہ کے لئے مخصوص تھی

اسی لہجہ مین سودا بنت زہرہ کے وہ مقالات پائے جاتے ہین جو اسنے اپنے قبیلہ کے آیندہ ڈرانیوالے کے متعلق کہے تھے یہ قبیلہ قریش کی ایک کاہنہ تھی، اسنے اپنے قبیلہ سے کہا، کہ تم اپنی لڑکیان لاؤ، انہین ایک ڈرانیوالی عورت ہوگی، اور اس سے ایک "ڈرانیوالا مرد" پیدا ہوگا، جب وہ لڑکیان کاہنہ کے پاس لائی گئین تو اسنے ہر ایک کے بارہ مین کچھ نہ کچھ بیان کیا، جب بی بی آمنہ (آنحضرت کی والدہ) کی باری آئی تو کاہنہ نے بتایا کہ یہ وہی ڈرانیوالی

عورت ہے"! (ضمیری)

ایک شاعر جو اس قسم کی باتین کہتا ہے، اپنے قبیلہ کا "قاید" کہلاتا ہے'

اسکے بعد سیکڈونلڈ ایک عربی شاعر کا کلام دیگر رائے زنی کرتا ہے، کہ اسکا لہجہ کہانت کے لہجہ سے ملتا ہوا ہے'

"بنو عامر کے مقابلہ مین مت جاؤ، مین انہین خوب جانتا ہون، مین ان سے بڑا ہون اور وہ مجھ سے لڑے ہین' مین ان پر غالب آیا ہون اور وہ مجھ پر غالب آئے ہین، مینے بنو عامر کی طرح کسی قبیلہ کو منزل مین زیادہ جمین نہین دیکھا، اللہ کی قسم مجھے انکے اندر سراپا شجاعت کی خوبی نظر آتی ہے، وہ اپنے مقام پر مضطرب ہونے کے لئے پڑے نہین رہین گے، بلکہ تم پر ضرور آئینگے، اللہ کی قسم اگر تم آجکی رات سوئے تو تمھین یہ پتہ نہین چلے گا کہ کب انہون نے حملہ کیا"

ڈاکٹر گولڈ زیہر نے جہالت عرب کی تاریخ سے کوئی ایسی نظیر نہین پیش کی جس مین ایک شاعر "اشموئیل" کی طرح بحیثیت قاضی نظر آتا ہو لیکن یہ یقیناً ہمارے نقص ماخذ کا نتیجہ ہے، یہ ایک پر معنی بات ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ مین اخطل ایک مسیحی شاعر ہونیکے باوجود اپنے قبیلہ کی مسجد مین ایک قاضی کی حیثیت سے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ قبل از اسلام قدیم رواج کی یادگار ہوگی، جس مین شاعر کو ایک مذہبی اختیار اور شکوہ حاصل تھا، اسلئے ہملوگ یہ خیال نہین کر سکتے کہ محاسن افکار، بدیعہ اشعار، قدرت کلام یا قبیلہ کی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات کے متعلق گہرے مطالعہ اور تدبر حکومت کے صلہ مین شعرا کو یہ مخصوص منزلت حاصل تھی، بلکہ اس کی کاوش فکر کو الہام سے تعبیر کیا جاتا جب وہ جنگ یا حملہ کے موقعہ پر اپنے قبیلہ کے سامنے اشعار پڑھتا تو اسکی نوعیت ایسی ہوتی جیسے کوئی روح اسکے اندر حلول کر گئی ہے، جب وہ مجلس شوری مین بیٹھتا، اور اچانک ادھکر اپنے پر جوش الفاظ، اور رنگین لہجہ مین اپنا فیصلہ سناتا تو لوگ اسے ایک دیوتا کا بیان تصور کرتے وقتاً فوقتاً ریگستان کی صاف فضا مین اسپر وارفتگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور جب وہ ہوش مین آتا تو اسکے منہ سے عجیب و غریب الفاظ نکلتے، الغرض ریگستان کے خموشی، اور سنسان مقامات مین اور پہاڑون کی تیرہ و تار رہگزر مین اگر کوئی ذات "جن" کو دیکھتی، یا اسکی باتین سنتی، تو وہ شاعر کی ذات تھی - ان اقتباسات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچگئی کہ عرب قوم یقین رکھتی تھی کہ اسکے شعرا عالم غیب سے مستفیض ہوتے ہین اور وہ ان کو کاہن و نبی کی طرح سمجھتے تھے

عرب مصنفین بیشک شاعر کاہن اور اعراف مین امتیاز کرتے ہین - اعراف بھی کاہنون کی ایک قسم ہے، لیکن شاعر اور کاہن سے اسکا درجہ بہت کم ہے تینون جماعتون کے متعلق بیان کیا جاتا تھا کہ عالم بالا سے رہنمائی حاصل کرتے ہین، اعراف بھی کاہن ہی کی طرح اشیائے مسروقہ اور گم شدہ مویشیون کا پتہ بتاتے تھے اور لوگ اس سے ایک طبیب کی طرح بھی مشورہ بھی کرتے - کاہن کا کام یہ تھا کہ وہ مستقبل کی پیشینگوئی کرے، اور اشیائے مخفیہ کا پتہ بتائے،

اکثر وہ ایک خاص معبد مین مقیم رہتا، لفظ "کاہن" ٹھیک عبرانی لفظ (kohen) کی طرح ہے جسکے معنی "مذہبی عالم" کے ہین، اور وہاں لوگ اس سے مشورہ کرتے "شاعر" ان قیود سے آزاد تھا، وہ اپنی قوم کا مُشیر ہوتا تھا، اور اسکا شعور جنات کی وساطت سے ہوتا تھا، وہ ایک انسان، تھا، ایک آزاد مجاہد تھا اور اسکے لئے کسی خاص معبد یا خانقاہ کی گوشہ نشینی لازم نہ تھی، اسکا الہام صرف روح عقل، اور لطافت ادراک ہی تک محدود نہ ہوتا، بلکہ اس کی آتش بیانی بھی الہامی چیز سمجھی جاتی تھی یہ اعتقاد بعثت اسلام کے بعد بھی بہت دنون تک قایم رہا ایک مشرقی شاعر اب بھی اس تخیل سے آزاد نہین ہو سکتا، کہ اسکا کلام بالکل ملہمانہ ہوتا ہے جیسے کسی طرح کاوش ذہن اور جدت خیال کا نتیجہ نہین کہہ سکتے اگر وہ ایک مذہبی آدمی ہے تو اسے سروش غیب اور ہاتف کی صدائین سنائی دیتی ہین، یا حضرت "خضر" سے ملاقات ہوتی ہے جو مسلمانون کے علم الاوہام والاصنام کے ایک نہایت ہی عجیب و غریب ہستی ہین جنھین موت نہین آتی اور جنکا کام یہ ہے کہ کرہ ارض پر پھر پھر کر مخلوق کی مدد کرین، انھین راہ دکھائین، اور مشورہ دین، ساتوین صدی ہجری مین..... ایک حنبلی عالم کا یہ خیال تھا کہ قرآن غیر مخلوق ہے، اور وہ اسکے ثبوت مین یہ دلیل پیش کرتا تھا، کہ اگر ایسا عقیدہ نہ رکھا جائے تو اس مین اور ایک شاعر کے الہام شعر و سخن مین مابہ الامتیاز کیا رہ جاتا ہے

اسلام مین جن اور شیاطین کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہین پایا جاتا، ہم لوگ یقینی طور پر نہین کہہ سکتے کہ لفظ شیطان سے ایک عرب مصنف کا مقصد صرف کسی ذات کے "خبث روحانی" کا اظہار ہوتا ہے، (جو مسیحیت اور یہودیت سے لیا گیا ہے) یا طبقہ جن کا ایک شریر فرد مراد ہوتا ہے۔

قدیم زمانہ مین عربون کا دستور تھا کہ جنگ و جدل کے دن قبیلہ کا ایک شاعر آگے بڑھکر مخالفین کے سامنے ہجو یہ اور طعن آمیز اشعار پڑھتا، اس سے صرف اپنے قبیلہ کی ہمت افزائی اور اعدا کو مضطرب اور شرمگین کرنا مقصود نہ تھا بلکہ یہ اس اعتقاد کی بنا پر تھا کہ شاعر کے الفاظ مین ایک جادو ہوتا ہے، اور اس معمولی طعن کے نمونے ہمین بڑے بڑے شعرائے عرب کے دواوین مین نظر آتے ہین

اسی طرح یہودیون کے درمیان مین گولیتھ کا نام پایا جاتا ہے، جو بنی اسرائیل کے لشکر سے تمسخر اور تضحیک کیا کرتا، اس کی بنیاد صرف اس عقیدہ پر ہے، کہ شعرا کے جسم مین روح حلول کر جاتی ہے، اور انکی تمام شاعرانہ نکتہ آفرینیان اسی کے ہنگامہ عمل کا نتیجہ ہے یعنی شاعر صرف ایک واسطہ ہے جسکے ذریعہ سے "عالم غیب" اپنی کرشمہ آرائیان دکھاتا ہے

عربی شاعری کے متعلق میکڈونلڈ کے خیالات پر تنقیدی نظر

میکڈونلڈ نے قدیم عربون کی ذہنیت پر بحث کرتے ہوئے کہ "شاعری جن کا الہام ہے" عالمانہ تحقیق کا

تاریخ فرشتہ مین حضرت خسرو دہلوی کے متعلق یہ واقعہ پایا جاتا ہے کہ [illegible] حضرت خضر کی ملاقات سے نکات کرشاعری مین آپ صحبت خواجہ خضر [illegible] الخ تذکرہ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی گذشتہ ۶۹۱ھ

کافی ثبوت دیا ہے اور اس مین کلام نہین کہ عربون کا یہ قدیم عقیدہ انکی زبان اور محاورہ میں ایک ضرب المثل بن گیا ہے، چنانچہ عہد اسلام کا ایک شاعر موسی بن جابر کہتا ہے

علامہ فیض الحسن سہارنپوری "شرح فیضی" مین لکھتے ہین

العرب تزعم ان لکل شاعر جنا یلقی الیہ شعرہ وعلیہ قولہ تعالی وما تنزلت بہ الشیٰطین وانہ لقول رسول کریم معناہ ان ھذا القول القاہ جبرئیل علیہ السلام الی الرسول وما تنزلت بہ الشیاطین کما تنزلت شعرفما کان یعجز احدھم عن الشعر لقولون "لفرق منہ جنتہ" ثم شاع استعمالہ فی کل من ضعف طاقتہ،

عربون کا گمان تھا کہ ہر شاعر کیساتھ ایک "جن" ہوتا ہے جو شعار کا الہام کرتا ہے، اسی پر قرآن مجید کے اندر خدا تعالیٰ (سورہ شعرا مین) فرماتا ہے "وما تنزلت بہ الشیاطین وانہ لقول رسول کریم" مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بیان فرماتے ہین اسکے لانیوالے جبرئیل ہین، شیاطین نہین جو شعر کا الہام کرتے ہین اور جب کوئی شخص شعر کہنے سے عاجز ہو جاتا، تو کہتے کہ اسکا "جن" اس سے پھر گیا اسکے بعد اسکا استعمال ہر اس شخص پر ہونے لگا جس کی طاقت گھٹ جائے

الغرض "نفرت جنی" کے عربی محاورہ سے قدیم عربون کے تخیل پر ایک گہری روشنی پڑتی ہے جس پر میکڈونلڈ نے اپنے محققانہ مضمون مین ایک مبسوط بحث کی ہے، اس مین شک نہین کہ عہد اسلام کا ایک شاعر (موسی بن جابر) بھی ...... یہ فقرہ استعمال کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اسنے قدیم معنی مین استعمال نہین کیا ہے، بلکہ اس عام معنی (ضعف و بیچارگی) مین جسمین متاخرین عرب استعمال کرنے لگے تھے، یہ عقیدہ کہ شاعری نتیجہ ہے، جنات کے القا و الہام کا عہد نبوت مین رد کر دیا گیا، اور اسکی بجائے حضرت حسان کے لئے نبی صلعم نے "اللھم ایدہ بروح القدس" کہکر دعا کی، اسکے بعد تمام شعرائے اسلام اپنی شاعری کو القائے جن کی بجائے الہام اور تائید روح القدس سے تعبیر کرنے لگے،

میکڈونلڈ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حسان ابن ثابت قدیم شعرائے عرب کے لہجہ مین اپنے افکار شاعرانہ کو "وحی" سے تعبیر کرتے ہین، اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کو "وحی" اور منزل من اللہ بتاتے ہین، تو گویا اس صورت مین آن حضرت قدیم عربی طرز کے ایک شاعر ہین یہان البتہ مجھے مستشرق موصوف کی محدود علمی واقفیت پر افسوس آتا ہے، تعجب ہے کہ انہون نے لفظ "وحی" کے مختلف معانی پر غور نہین کیا، حالانکہ خود قرآن مجید مین "وحی" مختلف معانی مین استعمال ہوا ہے، سورۂ نحل مین شہد کی مکھی کیساتھ اسکی نسبت دیگئی ہے "فاوحی ربک الی النحل" سورۂ طٰہٰ مین حضرت موسیٰ کی والدہ کے متعلق "اذ اوحینا الی امک ما یوحی" کہا گیا ہے، حالانکہ شہد کی مکھی اور "ام موسی" کو تو امیس نبوت سے کوئی سروکار نہین، اس سے بھی بڑھکر سورہ انعام مین ہے۔

یہان تو شیطانی اغوا، اور طینت خبیثہ کے لئے لفظ "وحی" آیا ہے ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اسی معنی مین ہے، جو انبیا کے لئے مخصوص ہے، شاعر، ادیب، صناع، مغنی اپنے کمالات انفرادی کے باعث ملہم کیے جا سکتے ہین، لیکن اس معنی مین انھین حامل وحی نہین کہا جا سکتا، جس معنی مین سرور کائنات کو کہا جاتا ہے، اور خود "الہام" اور "وحی" کا یہ امتیاز علامہ موصوف نے لکھا ہے، جسکے متعلق "تصوف اسلام" مین ایک ضمنی بحث کر چکا ہون، اس سلسلہ مین علامہ موصوف نے اس حدیث سے بھی غلط طور پر استدلال کیا ہے، جس مین آن حضرت نے حضرت حسان کے متعلق "ایدہ بروح القدس" کہا ہے، یہان میکڈونلڈ کو غلط فہمی ہوئی، یہ تو ایک ضعیف استدلال ہے، شاید انکی نظر اس حدیث تک نہین پہونچی جس مین خواب کو "جزء من تسع واربعین جزء من النبوۃ" کہا گیا ہے، اس مین عام لوگون کی طرف بھی نبوت کا تعلق پیدا کر دیا گیا ہے، حالانکہ "نبوت" اور "مدارج نبوت" کا امتیاز انھون نے نہین سمجھا، تائید روح القدس، رویائے صالحہ، کشف والہام "مدارج نبوت" ہین "کمال نبوت" نہین اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان کے لئے نفس قدسیہ کے ایک بلند نشیمن پر پہونچنے کی دعا کی، نہ یہان نبوت کا کوئی سوال ہے، اور نہ مماثلت نبوت قایم کرنیکی کوئی وجہ[۵]

جنات اور شیاطین کے متعلق اسلام کا معیار بہت صاف ہے، قرآن مجید مین نفس کے خبیث اثرات کو بھی شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ایک ذات[۶] خاص بھی متعین کی گئی ہے، جو نفس کے اندر خبث و شر پیدا کر دیتی ہے، چنانچہ آیت "وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن" سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ شیطان انسان کے نفس مین حلول کر کے فتنہ و شر پیدا کر دیتا ہے[۷]، یہ خیال اس حدیث سے اور راسخ ہو جاتا ہے، جس مین یہ واقعہ ہے کہ آن حضرت نے بی بی صفیہ سے تاریکی شب مین مسجد نبوی کے نزدیک باتین کرتے وقت دو صحابیون کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ "ہی صفیۃ" انھون نے کہا یا رسول اللہ خدا نخواستہ ہم لوگ آپکے متعلق کسی بد گمانی کا ارتکاب کر سکتے ہین؟ آپنے فرمایا کہ شیطان خون کی طرح رگون مین دوڑتا ہے،

جنات، شیاطین، غول، وغیرہ کے متعلق میرا ایک بسیط مضمون رسالہ "جن" مین شایع ہونے والا ہے،

---

[۵] آپ علی الرغم میکڈانلڈ "الہامات شعری" اور "الہامات نبوت" مین امتیاز پیدا کرنا چاہتے ہین، لیکن آپ اس کے لئے کوئی دلیل پیش نہین کرتے۔ قطع نظر اس سے کہ میکڈانلڈ کا استنباط صحیح ہے یا غلط، یہ مسئلہ بجائے خود بحث طلب رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ کو ایک کامل شاعر سے (جہانتک صرف قرآن کا تعلق ہے) کیونکر علیحدہ کر سکتے ہین۔ ممکن ہے آپ آیندہ اس مسئلہ کو صاف کرین (نگار)۔

[۶] قرآن سے کہین یہ ثابت نہین ہوتا کہ شیطان کوئی مخصوص ہستی ہے جو انسان کے اندر حلول کر جاتی ہے۔ (نگار)

[۷] اس آیت سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کے دشمن ہو جاتے ہین جو متمدن و غیر متمدن دونون طبقون سے متعلق ہوتے ہین حلول کا مفہوم کس لفظ سے پیدا کیا گیا (نگار)

جس مین علمائے مغرب کے اسانید، صنمیات کی روایتون، اور مشرقی فلاسفہ و محققین کے نظریات سے اس مسئلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسلئے یہان اس کی تفصیل کی ضرورت نہین،

عربی شاعری کی خصوصیات اور فارسی شاعری سے موازنہ

بعثت اسلام سے قبل عربون کی سیاسیات کسی ایک نظام کے ماتحت نہ تھی، بلکہ تمام آبادی مختلف قبایل مین منقسم تھی، اور ان مین ایک قومی اور ملکی، ہم آہنگی کے بجائے صرف ایک تنگ نظرانہ ہمدردی ایک قبایلی عصبیت اور نفسی تحیر دبا ہات پائی جاتی تھی اس لئے عہد جہالت کی شاعری مین یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہین، البتہ جب افکار قرآنی نے تمدن عرب پر اثر ڈالنا شروع کیا تو یہ رکیک جذبات مٹتے گئے، چنانچہ شعرائے مخضرمی و اسلامی کے کلام سے یہ تدریجی تغیر ظاہر ہوتا ہے۔

شعرائے عرب کی دوسری خصوصیت انکی سادگی بیان، اور بیساختگی بیان ہے، وہ واقعات روزمرہ کو نہایت خوبی سے ادا کرتے ہین نہ اس مین فارسیون کی طرح غلو پایا جاتا ہے، نہ صرف خیالات کا غلو اسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ قدرت نے انہین ایسے طبعی ماحول کے اندر پیدا کیا تھا، کہ انہین تصور کی دور از کار جدت طرازیون، اور تخئیل کی بیجا تاویلات کا موقعہ ہی نہ تھا، انکے سامنے وسیع ریگزار تھا، پہاڑ اور ٹیلے تھے، اونٹ گھوڑے، غزال، وغیرہ قدرتی طور پر اس خطۂ ارضی کے خاص پیداوار تھے سیدھے سادے فلکی مناظر پر انہین غور کرنے کا موقعہ ملا، انکی شاعرانہ تشبیہات، اور عشقیہ استعارے جیساکہ جیمس کا نفسیاتی نظریہ ہے، ماحول سے اثر پذیر ہوئے۔ اسکے برخلاف فارسی شعرا کو سیاسیات اور طبعی ماحول کے اعتبار سے فکر و احساس مین ترقی دینے کے بہت ذرایع حاصل تھے، انکے سامنے اکاسرہ اور قیاصرہ کا جاہ و جلال تھا، انکے نظام تمدن مین وسعت تھی انہین غیر قومون سے تبادلۂ خیالات کا موقعہ تھا انکے سامنے قدرتی مناظر زیادہ دلکش تھے، اسلئے فارسی اور عربی تخئیل مین بعد عظیم ہونا چاہیے۔

رسل ویلس کے نظریہ کے مطابق فارسیون کے علمی اور تمدنی ترقی کیساتھ ظاہر اور باطن کا تضاد ایک لازمی امر تھا، اسکے برخلاف عربون کے اندر جذبات و احساسات کو مخفی رکھکر منافقانہ طرز عمل پیدا کرنا ناممکن تھا، انکی عشقیہ شاعری والہانہ تھی اور تصور کی آورد، اور تخئیل کی آلایش سے پاک تھی، انکی محبت عفیف کا تقاضا تھا کہ وہ صرف حق و صداقت کے کلمات کہین۔

عشقیہ شاعری

ابو تمام نے حماسہ کے اندر شعرائے اسلام کے بھی کلام درج کئے ہین، لیکن معلقات سبعہ تمام و کمال عرب کے دور جہالت کی یادگار ہے، اسمین شک نہین عرب کی عشقیہ شاعری کے اعتبار سے حماسہ ایک نامکمل چیز ہے اور معلقات سبعہ سے قدیم عربون کے افسانہائے عشق و محبت پر ایک ایسی روشنی پڑتی ہے، جسکا اندازہ صرف حماسہ کے مطالعہ سے نہین ہو سکتا یہ صحیح ہے، کہ معلقات کے اندر بھی وہی روح شاعری کارفرما ہے جسکی نظرین ابو تمام نے

شرح وبسط کے ساتھ حماسہ میں جمع کردی ہیں،

ڈاکٹر لسڈل نے "ماخذ قرآن" میں معلقات سبعہ کی تدوین کے متعلق ابوجعفر محمد بن اسمعیل التماس کی مفصل ذیل روایت نقل کی ہے،

واختلفوا فی جامع ھذا القصائد السبع وقیل ان العرب کان اکثرھا یجتمع بعکاظ ویتناشدون الشعر فاذا استحسن الملک قصیدۃً قال علقوھا واثبتوھا فی خزانتی فاما قول من قال علقت فی الکعبۃ فلا یعرفہ احد من الرواۃ واصح ما قیل فی ہذا ان حماد الراویۃ لما رای زھد الناس فی الشعر جمع ھذہ السبع وحضھم علیھا وقال لھم ھذہ ھی المشھورات فسمیت القصائد المشھورۃ لھذا!

ان قصاید سبعہ کے جمع وتدوین کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے ایک قول تو یہ ہے کہ اکثر اہل عرب عکاظ (ایک مقام کا نام ہے) جہاں عرب ایام جہالت میں یونانیوں کے Olympia کی طرح میلہ لگایا کرتے تھے، آنحضرت کے زمانہ میں بھی یہ میلہ لگتا تھا، اور بخاری میں بسلسلہ واقعہ جن مروی ہے کہ آنحضرت وہاں تشریف لیگئے) میں مشاعرہ کرتے تھے، اور جب بادشاہ کو کوئی قصیدہ پسند آتا تو وہ اسے آویزاں کرنے کا حکم دیتا اور اپنے خزانہ میں رکھ لیتا، اور یہ روایت کہ یہ خانہ کعبہ میں آویزاں ہوتے تھے کسی راوی سے نہیں سنی، اور سب سے صحیح قول یہ ہے کہ حماد الراویہ نے جب لوگوں میں شعروشاعری کا شغف دیکھا تو انکی دعوت نشاط کیلئے یہ سات قصاید مرتب کئے، اور کہا کہ یہی "مشہورات" ہیں اسکی وجہ سے پھر اسکا نام "قصاید المشہورہ" پڑگیا۔

⁂

معلقات کے اندر سات قصاید ہیں جنکے مصنفین علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔

امرؤ القیس، عمرو بن عبد ملقب بہ طرفہ، زہیر بن ابی سلمی، لبید ابن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن معاویہ بن شداد حارث بن حلزہ۔

انمیں بہ استثنائے لبید ابن ربیعہ، تمام "شعرائے جاہلی" کے نام سے موسوم ہیں، کیونکہ ان لوگوں نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا لبید نے ایکسو ستاون سال کی عمر پائی، اسلئے مشرف بہ اسلام ہوگئے، اور ۴۱ھ ہجری میں وفات کی، بخاری اور مسلم نے لبید کے اس مصرعہ الا کل شییٍ ماخلا اللہ باطل کے متعلق حدیثین روایت کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصدق کلمۃ قالھا شاعر کلمۃ لبید، یعنی کسی شاعر کا سچا سے سچا کلام ہو سکتا ہے، تو وہ لبید کا یہ مصرعہ ہے، معلقات کے تمام مصنفین نے اپنے قصیدہ میں اپنی لذت عشقیہ کا اظہار کیا ہے، اور جیسا کہ باڈوین نے "اصول نفسیات" میں "قانون تجدید" (Sublimation) کے ماتحت، اور فاسٹر اسکاٹ نے "شعور جنسی" میں یہ مباحث بخشین کی ہیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ عہد جہالت کے یہ قصاید سبعہ ذوق عشقیہ کی پیداوار ہیں، چنانچہ امرؤ القیس کی

معشوقہ عنیزہ تھی، اور کچھ اس درجہ لبریز جذبات ہوکر امرؤالقیس نے اسکا تذکرہ کیا ہے کہ بے اختیارانہ شاعر کے جوش فکر کی داد دینی پڑتی ہے، اس میں شک نہیں اسکی عاشقانہ زندگی رندانہ حیثیت رکھتی ہے، جس میں محبت عفیف کی تلاش بالکل فضول چیز ہے، وہ ایک "رند شاہد باز" تھا، وہ عہد شباب کو معصیت کوشیون کی نذر کرچکا تھا، وہ حسن نسائی کا دلدادہ تھا، اور اسکی عشق مزاجی کے لئے کوئی خاص مرکز نہ تھا وہ عنیزہ کو مخاطب کرکے صاف صاف الفاظ مین اُسکے وصل کا طالب ہوتا ہے، اور اپنی دوسری محبوب عورتوں (ام باب اور ام حویرث) کا تذکرہ کرتا ہے، وہ بہ یکوقت "دارہ جلجل" کی نہایت شہوت پرستانہ ساعت کی بھی یاد کرتا ہے[۵] اور دوسرے وقت "مصوت لتوددی راسها فتمایلت" اپنے اسکا گیسو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ مایل ہوگئی) بھی کہہ بیٹھتا ہے۔ ابو نواس (اسلامی شاعر) عرب مین امرؤالقیس کا مقابل قرار دیا جاتا ہے میرے خیال مین رندانہ عشق بازی کے لئے فارسی شعرا مین حافظ کو امرؤالقیس سے ایک خاص مماثلت ہے اگو دنیا تاویل کرکے "می نوشی" کی طرح حافظ صاحب کی "شاہد پرستی" پر بھی مجاز کا پردہ ڈال دینا پسند کرتی ہے۔ امرؤالقیس کی عشقیہ جادو بیانی انشا، اور تخئیل کے اعتبار سے تو یقیناً معلقات کے بقیہ مصنفین سے بڑھی ہوئی ہے لیکن جہانتک محبت عفیف، اور صفائے باطن کا تعلق ہے، وہ سراپا فسق و فجور ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ جس انداز مین طرفہ نے خولہ، زہیر نے ام ادفی، لبید نے نوار، عمرو بن کلثوم نے ام عمرو، عنترہ نے عبلہ، اور حارث نے اسماء کیلئے عشقیہ جذبات کا اظہار کیا ہے، ان سے امرؤالقیس کا کلام بالکل معرا ہے، امرؤالقیس کے شوق طلب مین شہوت پرستی کارفرما نظر آتی ہے، اور بقیہ شعراء کے شکوہ ہجران مین ایک خاص کیف افزا گداز ہے

معلقات مین شروع سے آخر تک ایک ہی روح شاعری، ایک ہی خیال، اور ایک ہی اسلوب بیان پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ بقیہ چھ قصاید پہلے قصیدہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہین، تمام قصاید کے اندر شاعر نے تشبیب سے ابتدا کی ہے اور اُسکے بعد وحوش صحرائی کے محاسن جسمی اور خصوصیات شمایل کا نقشہ کھینچا ہے، سب نے (باستثنائے طرفہ) دیار محبوبہ کے ٹوٹے پھوٹے مساکن، اور حسرت و درد پیدا کرنے والے مناظر پر کچھ اس والہانہ انداز مین روشنی ڈالی ہے کہ پڑھکر جی بے چین ہوجاتا ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، کہ نفس کی تمام کثافتین دور ہوگئی ہین اور انسان ایک معصومانہ محبت پر نہایت سکون

[۵] "دارہ جلجل" ایک مقام کا نام ہے۔ امرؤالقیس عنیزہ کا شیفتہ تھا، لیکن اسکی نگاہ شوق ہمیشہ وصل محبوب کو ترستی رہتی تھی، ایکدن عنیزہ کا قبیلہ اس مقام سے کوچ کر رہا تھا جہان عارضی طور پر سکونت اختیار کرلی گئی تھی، عنیزہ اپنی سہیلیون کے ساتھ دارہ جلجل مین گئی امرؤالقیس کو خبر ہوئی تو وہ پہلے ہی سے وہان آکر چھپ گیا، عورتین آئین اور اپنے کپڑے اتار کر غسل کرنے لگین امرؤالقیس کمینگاہ سے باہر آیا اور انکے کپڑے لے لئے، عرب کے رسم قدیم کے مطابق عورتین عریان نہا رہی تھین، اب وہ پانی سے نکلین تو کیسے نکلین، ادہر امرؤالقیس نے کہا تم لوگ برہنہ جسم ہی آکر مجھ سے کپڑے لو، چنانچہ سبھون نے ایسا ہی کیا اور وہ اپنی معصیت کوش آنکھین اس شرمناک منظر سے آلودہ کرتا رہا، عنیزہ سطح آب سے نہین نکلتی تھی، ناچار اسے بھی برہنہ آنا پڑا، اور امرؤالقیس نے اسے پس و پیش سے برہنہ دیکھکر اسکا کپڑا دیدیا، (شرح معلقات اربعہ فارسی مرتبہ محمد اسحاق اسلام آبادی) ع۔م

کے ساتھ قربان ہونے کیلئے تیار ہے۔ خاقانی نے اپنے اس مشہور قصیدہ مین جو "ایوان مداین" کی تباہی کے متعلق ہے، تمامتر معلقات کے اسلوب بیان سے استفادہ کیا ہے، اور جیسا کہ مفصلہ ذیل موازنہ سے ثابت ہوگا، خاقانی کے بہت سے اشعار جو ایوان مداین کے مرثیہ مین ہین) لبید ابن ربیعہ کے خیالات، اسلوب بیان اور بعض جگہ پورے پورے مضامین سے ماخوذ ہین،

امرؤ القیس کہتا ہے۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل بسقط اللوی بین الدخول فحومل

"اے میرے دوستو، ٹھہرو، تاکہ ہم اپنی محبوبہ اور اسکے مسکن کو یاد کرکے جو تودۂ ریگ کے کنارہ، اور موضع دخول اور حومل کے درمیان واقع ہے، گریہ و بکا کرلین،"

اسکے بعد چند اشعار مین دیار محبوب کی ویرانی کا نقشہ کھینچکر کہتا ہے کہ "اب نہ محبوبہ ہے، نہ اسکے قبیلہ کی چہل پہل بلکہ وہ مسکن اب ویران ہے جس مین اب صرف ہرنیان رہتی ہین"

زہیر ابن سلمی کہتا ہے،

بها العین والآرام یمشین خلفة واطلاؤها ینهضن من کل مجثم

زہیر ام اوفی پر عاشق تھا، جب وادی عرب کے اس مقام سے جہان ام اوفی کا قبیلہ خیمہ زن تھا، دوسرے مقام پر چلا گیا، تو زہیر اس مسکن ویران مین پہونچتا ہے، اور یہ دیکھکر اُسکے گداز عشق مین ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے کہ خانۂ محبوب مین اب نیل گائے اور ہرن چل پھر رہے ہین، اور انکے بچے ادہر ادُہر کھڑے ہین یعنی مسکن محبوبہ اب وحوش کی جائے قیام بن گیا ہے

اسی طرح عنترہ، اور حارث بن حلزہ نے بھی دیار محبوبہ کی ویرانی کا ماتم کیا ہے، چنانچہ عنترہ اپنی محبوبہ عبلہ کا نام لیکر کہتا ہے۔

یا دار عبلة بالجواء تکلمی وعمی صباحا دار عبلة واسلمی

لیکن لبید ابن ربیعہ (مصنف معلقہ رابعہ) نے کچھ اس اسلوب سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے، کہ اسکے مطالعہ سے اہتزازی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

عفت الدیار محلها فمقامها بمنی تأبد غولها فرجامها

"دیار محبوبہ، اور اسکی اقامتگاہ جو منی مین تھی نابدید ہوگئی، دیار غول اور دیار رجام مین اب وحشت برستی ہے"

فمدافع الریان عری رسمها خلقا کما ضمن الوحی سلامها

"کوہ ریان کے دامن مین جو نالے ہین اس مقام کے ساکنون کے کوچ کرنیکے باعث وحشتناک معلوم ہوتے ہین، اور اس دیار کہنہ کے نشانات اسی طور پر ظاہر ہین جس طرح پتھر پر نقوش"

فرع الایهقان واطفلت بالجلهتین ظباؤها ونعامها

"یعنی بارش کے سبب وہان سبزہ نکل آیا ہے، اور ہرنیون اور وحوش نے اس مین بچے دینا شروع کئے۔"

اس کے بعد فرماتے ہین:۔

وجلا السیول عن الطلول کانّھا — ذُبُرٌ تجدّ متونھا اقلامھا

"یعنی خانہ محبوبہ کے گرد و غبار کو سیلاب نے دھو کر صاف کر دیا، اور گھر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک خط ہے جسکے سطور از سر نو درست کئے گئے ہین"

فوقفت اسألھا وکیف سؤالھا — صُمًّا خوالد ما یُبِنُ کلامھا

"پس مین کھڑا ہو کر دیار محبوبہ کے آثار باقیہ سے اسکے رہنے والون کا حال دریافت کرتا ہون، اور میرا سوال بھی عجیب ہے، پتھر سے بھی کہین جواب ملتا ہے"

اسکے مقابلہ مین خاقانی کے مفصلۂ ذیل اشعار قابل غور ہین۔

ہان اے دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان — ایوان مداین را آئینۂ عبرت دان
از نوحہ جغد الحق مائیم بہ درد سر — از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشان
آرے چہ عجب داری کاندر چمن گیتی — جغد است پے بلبل نوحہ است پے الحان
گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایوان را — تا بو کہ بگوش دل پاسخ شنوی ز ایوان
دندانۂ ہر قصرے پندے دہدت نو نو — پند سر دندانہ بشنو ز بن دندان
این ہست ہمان درگہ کز نقش رخ مردم — خاک در او بودے دیوار نگارستان
پندار ہمان عہد است از دیدہ فکرت بین — در سلسلۂ درگہ در کوکبۂ میدان

خاقانی کے اس مرثیہ مین ۴۲ ابیات ہین اور اس مین شک نہین کہ اسنے اس جوش و خروش سے کہے ہین کہ قلب سامع مین ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور بعض مضامین بھی ایسے نادر ہین کہ کسی دوسرے شاعر کے یہان نہین ملتے خیال کی رفعت، جذبات کی اثیریت، قدرت کلام، لہجۂ ادا تمام باتین کیف آفرین ہین، اور غالبًا خاقانی کا یہ قصیدہ ان چند قصاید مین سے ہے جن مین سہل عبارت اور مانوس الفاظ مستعمل ہین، ورنہ غیر مانوس اور ادق الفاظ مین گہرے معانی لطیف اشارے، اور رمزیات و کنایات، خاقانی کے کلام کی خصوصیت ہے، اور یہی وجہ ہے کہ صاحب گلشن ابراہیم نے لکھا ہے کہ فیضی کو خاقانی کا کلام پسند نہ تھا۔

با اینہمہ ادنی تامل ہر انسان کہہ سکتا ہے، کہ خاقانی نے مذکورۂ بالا اشعار مین، معلقات، (اور بالخصوص لبید) سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، اس مرثیہ کے بقیہ ابیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ مثنوی "زہر عشق" مین "ایوان مدائن" کے نقوش سے کافی مدد لیگئی ہے، خاقانی کہتے ہین،

گفتی کہ کجا رفتند آن تاجوران اینک　　زیشان شکم خاک است آبستن جاویدان

خون دل شیرین است آن می کہ دہد زرین　　ز آب گل پرویز است آن خم کہ دہد دہقان

چندین تن جباران این خاک فرو خوردہ است　　این گرسنہ چشم آخر ہم سیر نشد زیشان

خاقانی کے ان ابیات کے سامنے مضمون کی رباعیات خیام ہیچ معلوم ہوتی ہین، مثنوی زہر عشق مین نواب مرزا نے جہان تمہید، نصیحت، پیام کے دلاویز نقوش پیش کیے ہین وہان صاف خاقانی کے خیالات کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

شاہزادۂ خرم اور ابابیل

شہر کے سب سے بلند حصہ مین ایک بلند مینار پر شہزادۂ خرم کا بت نصب تھا۔ اس مجسمہ پر سر سے پانون تک سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے آنکھون کے حلقون مین درخشان نیلم جڑے تھے۔ اور ایک بڑا لعل اسکے تلوار کے قبضہ پر چمک رہا تھا۔ اس مین شک نہین کہ لوگ اس بت کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایوان بلدیہ کے ایک رکن نے جس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ لوگ اس کے ذوق سلیم کی داد دین ایک روز اس بت کو دیکھ کر کہا کہ :۔ " یہ بت ایسا خوبصورت ہے جیسے مرغ بادنما "۔ پھر اس اندیشہ سے کہ کہین لوگ یہ نہ سمجھ لین کہ وہ غیر عملی آدمی ہے حالانکہ درحقیقت وہ ایسا نہ تھا اس نے اپنے ایراد مین اسقدر اضافہ اور کر دیا کہ " فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کارآمد چیز ہے اور یہ بیکار "

اسی طرح ایک روز ایک چھوٹے بچہ سے جبکہ وہ چاند کے لئے بیقرار تھا اس کی مان نے کہا کہ " تم ایسے کیون نہین ہو جاتے جیسا شہزادہ خرم ہے دیکھو اسکے دل مین کسی چیز کیلئے ضد کرنے اور رونے کا خیال تک نہین آتا "

اسی طرح ایک روز کوئی دلشکستہ اور مایوس آدمی اس حیرت انگیز بت کی طرف دیکھ رہا تھا تو اسکی زبان سے نکلا " مین یہ بات دیکھ کر خوش ہوا کہ دنیا مین کوئی تو ایسا ہے جو واقعی مسرور و شادکام ہے "

ایک روز خیرات خانے کے بچے صاف ستھرے سفید کرتے اور سرخ کوٹ پہنے گرجا سے نکلے تو انھون نے بھی شہزادہ کے بت کو دیکھ کر کہا کہ " شہزادہ تو بالکل فرشتہ معلوم ہوتا ہے "

ریاضی کے استاد نے دریافت کیا کہ :۔ " جب تم لوگون نے کوئی فرشتہ دیکھا ہی نہین تو پھر تمین کیا معلوم کہ فرشتہ کیسا ہوتا ہے " اسکا جواب بچون نے یہ دیا کہ :۔ " دیکھا کیون نہین ہم نے بارہا خواب مین دیکھا ہے "

ماہر ریاضیات برہم ہو کر بچون کو گھورنے لگا کیونکہ وہ اسے پسند نہین کرتا تھا کہ بچے خواب دیکھا کرین۔

ایک رات کو شہر کے اوپر ہی اوپر ایک ننھی سی ابابیل اڑی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھی سب کے سب چھ ہفتہ بیشتر مصر جا چکے تھے اور یہ پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ اسے ایک نہایت خوبصورت نے (نرسل) سے محبت ہو گئی تھی سب سے پہلے ابابیل نے اس حسین " نے " کو اسوقت دیکھا تھا جب ایک زرد رنگ کی تیتری کے تعاقب مین دریا پر اڑی جا رہی تھی خوبصورت نے کی پتلی کمر اس ابابیل کو کچھ ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ وہ اس سے باتین کرنے کے لئے ٹھہر گئی۔

ابابیل نے جو بہت جلد " آمدم برسر مطلب " کہنے کی عادی تھی نے سے پوچھا کہ کیا مین آپ سے محبت کرون ؟ " اور اسنے بھی ادا کیساتھ خم ہو کر اظہار رضامندی کیا۔ پس ابابیل، عاشق زار ابابیل !! اس کا طواف کرنے لگی۔ وہ اڑتی سطح دریا کو اپنے پرون سے مس کرتی اور چھوٹی چھوٹی نقرئی لہرین ڈالتی رہتی۔ یہ گویا اس کا اظہار محبت تھا۔ جو گرمیون بھر

اسی طرح جاری رہا۔

یہ دیکھ کر اور ابابیلیں آپس میں کہنے لگیں "یہ عجیب مضحکہ انگیز عشق ہے۔ اس کے پاس دولت بھی نہیں اور رشتہ دار بھی اسکے بہت ہیں" اور واقعی دریا نرسلوں سے بھرا ہوا تھا۔ الغرض جب فصل خزاں آئی تو تمام ابابیلیں چلدیں۔ انکے چلے جانے کے بعد وہ عاشق مزاج ابابیل تنہائی سے بہت گھبرائی اور اپنے محبوب سے بھی اکتا گئی وہ اپنے دل میں کہتی کہ وہ بات چیت تو کرتا ہی نہیں اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ عشوہ باز اور کرشمہ ساز بھی ہے کیونکہ ہمیشہ ہوا سے اسکی چھیڑ چھاڑ جاری ہوتی ہے"

یہ واقعہ ہے کہ جب ہوا چلتی تو نرسل نہایت خوبصورتی اور لچک کے ساتھ اس کے سامنے جھک جھک جاتا پھر ابابیل کہنے لگی میں جانتی ہوں کہ وہ گھر میں رہنا پسند کرتا ہے اور میں ٹھیری سیر و سیاحت کی دلدادہ اس لئے میرا اس کا کیا ساتھ۔ بالآخر ایک دن ابابیل نے اپنے محبوب سے پوچھا۔ "کیا تمہارا میرا ساتھ ہو سکتا ہے"

لیکن نرسل نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ فقط سر ہلا دیا۔ اسے اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔ یہ دیکھ کر ابابیل نے کہا۔

"اچھا تو معلوم ہوا تم اب تک مجھے بیوقوف ہی بناتے رہے۔ بہتر ہے میں بھی اب اہرام مصری کی طرف چلی"

ابابیل بیچاری دن بھر ماری ماری پھری اور شام کے وقت شہر میں پہونچی۔ رات ہو گئی تھی۔ سوچنے لگی "کہاں ٹھہروں" اس وقت اس کی نظر شہزادہ خرم کے بت پر پڑی جو بلند مینار پر نصب تھا۔ بت کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگی "بس میں یہیں ٹھہر جاؤنگی۔ جگہ بھی اچھی ہے اور تازہ ہوا بھی یہاں کافی ہے" اسلئے اڑ کر شہزادہ خرم کے دونوں پاؤں کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

اس نے اودھر اودھر دیکھا اور دیکھ کر دل میں کہنے لگی "میں بھی کسقدر خوش نصیب ہوں۔ آرام کی جگہ بھی مجھے بالکل زرنگار ملی" اسکے بعد وہ سونے کی تیاری کرنے لگی لیکن جوں ہی وہ اپنا سر پروں میں چھپانے لگی تو اس پر پانی کا ایک بڑا قطرہ ٹپکا۔ وہ گھبرا کر چونک اٹھی اور کہنے لگی "یہ تو عجیب بات ہے۔ آسمان صاف ہے۔ بادل کا پتہ نہیں ستارے جگمگا رہے ہیں۔ لیکن بارش پھر بھی ہو رہی ہے۔ واقعی شمالی یورپ کی آب و ہوا نہایت سخت ہے"

اسکے بعد دوسرا قطرہ ٹپکا۔ ابابیل نے کہا۔

"یہاں سے چلا جانا چاہئے اور کسی مکان کا اچھا سا روشندان ڈھونڈھنا چاہئے۔ ایسے بت سے کیا فائدہ جو پانی کو بھی نہ روک سکے"

یہ کہکر ابابیل وہاں سے اڑنے کو تیار ہوئی اور جوں ہی وہ اڑنے کے لئے پر تول رہی تھی کہ تیسرا قطرہ ٹپکا۔ اب جو ابابیل نے گھبرا کر اوپر کی طرف سر اٹھایا تو دیکھا کہ شہزادہ خرم کی آنکھیں اشکبار ہیں اور اسکے سنہرے رخساروں پر آنسو بہ رہے ہیں۔ شہزادہ کا چہرہ چاندنی میں اسقدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا کہ اس ابابیل کا دل بھی ہمدردی سے بھر آیا۔ اس نے بت سے دریافت کیا۔

"......آپ کون ہیں؟"

بت:۔ مین شہزادہ خرم ہون

ابابیل:۔ پھر آپ روکیون رہے ہین، آپ نے تو مجھے بالکل تر بتر کردیا"

بت:۔ جب مین زندہ تھا اور میرے پہلو مین انسانی دل تھا، تو مین یہ بھی نہین جانتا تھا کہ آنسو کس چیز کا نام ہے۔ کیونکہ مین قصر سانِ شوقی مین رہا کرتا تھا جہان رنج وغم کا پتہ نہ تھا۔ دن بھر مین باغ کے اندر اپنے احباب کے ساتھ کھیلتا تھا اور رات کو بڑے ایوان مین بزم رقص وسرود برپا کرتا تھا باغ کے گرد بڑی اونچی دیوار تھی، لیکن مجھے کبھی تمنا نہ ہوئی کہ کسی سے دریافت کرون، باہر کیا ہے۔ میرے گرد وپیش ہر چیز دلکش اور خوبصورت تھی میرے مصاحب اور درباری مجھے شہزادہ خرم کہا کرتے تھے۔ اور درحقیقت مین تھا بھی ایسا ہی۔ بشرطیکہ عیش وطرب کے معنی خرمی کے ہون۔ الغرض میری تمام زندگی یون ہی گذری اور اس حال مین مرگیا اب مرنے کے بعد لوگون نے میرا بت یہان اسقدر بلند نصب کردیا کہ مین اپنے شہر کی تمام برائیان اور تمام آلام ومصائب خود اپنی آنکھون سے دیکھتا ہون اور ہرچند میرا دل سیسہ کا بنا ہوا ہے لیکن پھر بھی آنسو بہائے بغیر نہین رہ سکتا۔

ابابیل:۔ (دل مین) ہائین! کیا یہ بت ٹھوس سونے کا نہین ہے؟

یہ بات ابابیل نے دل مین اسلئے کہی کہ وہ نہایت مہذب اور با اخلاق چڑیا تھی۔ وہ ہرگز پسند نہین کرتی تھی کہ زور سے کہہ کر کسی کی ذاتیات پر حملہ کرے

بت نے نرم لہجہ مین کہا:۔

"یہان سے دور تنگ کوچہ مین ایک گھر ہے، اسکی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور مین ایک عورت کو میز کے سامنے بیٹھا دیکھ رہا ہون۔ اسکا چہرہ لاغر اور زرد ہے اس کے ہاتھ سوئیون کی نوکین چبھنے سے سرخ اور کھُردرے ہوگئے ہین کیونکہ وہ سلائی کا کام کرتی ہے، اس وقت وہ ملکہ کی ایک جمیل سہیلی کے لئے ساٹھن کے گون پر خوبصورت پھول کاڑھ رہی ہے۔ جسے وہ آیندہ بزم رقص مین زیب تن کریگی۔ کمرہ کے ایک گوشہ مین پلنگ پر اس کا چھوٹا سا بچہ بیمار پڑا ہے۔ بچہ بخار مین مبتلا ہے اور سنترون کے لئے ضد کررہا ہے۔ مان بیچاری کے پاس دریا کے پانی کے سوا کیا دہرا ہے جو اپنے پیارے بچے کو دے اسی لئے بچہ رو رہا ہے۔

ابابیل! اے میری ننھی ابابیل! کیا تم ایسا نہین کرسکتین کہ میری تلوار کے قبضہ مین جو لعل جڑا ہوا ہے وہ نکالکر اس غریب عورت کو دے آؤ۔ میرے پاؤن تو اس کرسی مین جڑے ہوے ہین اور مین حرکت نہین کرسکتا۔

ابابیل ۔ میرا تو مصر مین انتظار ہو رہا ہوگا۔ میرے دوست دریائے نیل کے اوپر خوش خوش اُڑ رہے ہونگے اور گلہائے نیلوفر سے باتین ہو رہی ہونگی وہ رات کو فرعون کے مقبرہ مین جا سوئینگے۔ جو اپنے رنگین اور منقش تابوت مین پڑا سو رہا ہے۔ بادشاہ کی لاش زرد کتان مین ملفوف ہے اور مسالون مین بسی ہوئی پڑی ہے۔ اس کے گلے مین ہلکے سبز رنگ کے بیش قیمت جواہرات کا ہار ہے۔ اور اس کے ہاتھ ایسے خشک ہین جیسے برگہائے خزان دیدہ۔

بُت:۔ کیا واقعی تم میرے پاس رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی اور میرا یہ کام نہ کرو گی؟ دیکھو پیاس کے مارے بچہ کی زبان منھ سے باہر نکلی پڑتی ہے اور اسکی ماں کسقدر ملول ہے"

ابابیل:۔ معاف کیجئے میں لڑکوں کو ہرگز پسند نہیں کرتی پارسال گرمی میں جب میں دریا پر ٹھہری ہوئی تھی تو وہ بیہودہ لڑکے جو چکی والے کے لڑکے تھے ہمیشہ میری طرف ڈھیلے اور پتھر پھینکا کرتے تھے۔ کوئی ڈھیلا یا پتھر میرے لگا تو نہیں کیونکہ ہم ابابیل بہت تیز پر ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں میں اس خاندان کی فرد ہوں جو اپنی تیز پروازی میں ہمیشہ مشہور رہا ہے، لیکن اس طرح ڈھیلے پھینکنا توہین تو ہے"

یہ سنکر شہزادہ خرم بہت رنجیدہ ہوا۔ اسقدر رنجیدہ کہ ابابیل بھی بہت متاثر ہوئی اور آخر کار اسے کہنا پڑا کہ "اچھا میں ایک رات آپ کے پاس قیام کرونگی"

بت:۔ شکریہ!

پس ابابیل نے شہزادہ کی تلوار کے قبضہ سے وہ لعل نکالا اور چونچ میں لیکر مکانوں کی چھتوں پر اڑتا ہوا روانہ ہوگیا۔ وہ گرجا کے مینار کے پاس ہو کر گذرا جہاں فرشتوں کے مجسمے سفید سنگ مرمر کے رکھے ہوئے تھے وہ قصر شاہی کے پاس سے ہو کر گذرا اور رقص و سرود کی آوازیں سنیں۔ ایک جمیل لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ نکلکر بالاخانہ پر آئی۔ اور وہ ستاروں بھری رات کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ ستارے کسقدر دلکش ہیں۔ اور عشق و محبت کی طاقت بھی کسقدر زبردست ہوتی ہے"

لڑکی:۔ "امید ہے کہ بزم رقص و سرود منعقد ہونے تک میری پوشاک بھی تیار ہو جائیگی۔ میں نے حکم دیا ہے کہ اس پر خوبصورت پھول کاڑھے جائیں لیکن یہ سینے والیاں بھی کسقدر کاہل اور سست ہوتی ہیں"

ابابیل اڑتی ہوئی دریا پر سے گذری۔ اور جہازوں کے مستولوں پر لٹکی ہوئی لالٹینیں دیکھیں۔ وہ یہودیوں کے محلہ سے ہو کر گذری۔ اور بڈھے بڈھے یہودیوں کو ایک دوسرے سے سودا کرتے اور تانبہ کی ترازوؤں میں روپیہ تولتے دیکھا۔ آخر وہ اڑتی اڑتی اس گھر تک پہونچی۔ اور اندر جھانکا۔ لڑکا بخار میں مبتلا چارپائی پر تڑپ رہا تھا۔ اور ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بیچاری کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ابابیل کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور اپنے بازوؤں سے لڑکے کی پیشانی کو ہوا دی اور وہ لعل میز پر انگشتانہ کے قریب رکھ دیا۔ اسکے بعد اس نے پلنگ کے گرد آہستہ آہستہ اڑکر بچہ کو ہوا دی وہ بولا۔ "آہ کس قدر کیسی خوشگوار خنکی ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری طبیعت اب اچھی ہوتی جاتی ہے" یہ کہا اور لڑکا پھر سو گیا

ابابیل پھر اڑتی ہوئی شہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور سارا حال بیان کرکے بولی۔

"یہ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ سردی پڑ رہی ہے لیکن مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے"

اسکے بعد ابابیل مختلف قسم کے خیالات مین الجھ گئی اور سوچتے سوچتے سوگئی۔ کیونکہ سوچنے اور فکر کرنے سے ہمیشہ نیند آجاتی ہے۔ صبح کو جب دن نکلا تو وہ دریا کی طرف اڑ گئی نہانے لگی۔ اس وقت اتفاق سے خصوصیات طیور کے ایک پروفیسر پل پر سے گذر رہے تھے۔ ان کی نظر جو ابابیل پر پڑی تو وہ حیران ہو کر کہنے لگے:- "یا مین جاڑے دن مین ابابیل!" اسکے بعد پروفیسر نے ایک بڑا طویل مراسلہ مقامی اخبارون مین شائع کردیا اور ہر اخبار نے اس خط کو شائع کیا

ابابیل نے کہا کہ آج رات کو مین مصر چلی جاؤنگی اور واقعی مصر کے پر لطف مناظر کا خیال کرکے اس وقت وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بعد وہ اڑی اور شہر کے تمام مشہور مقامات کو دوبارہ جاکر دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گرجا کی چوٹی پر بیٹھی رہی۔ جہان جہان ابابیل جاتی اسے دیکھ کر چڑیان چہچہاتین اور آپس مین کہتین "یہ اجنبی کسقدر شاندار اور دلکش چیز ہے" غرض ابابیل نے خوب سیر کی

جب چاند نکلا تو وہ پھر اڑ کر شہزادہ خرم کے پاس گئی اور بولی:- "کیا صاحب عالم کا کوئی کام مصر مین بھی ہے کیونکہ مین روانہ ہو رہی ہون"

بت:- "کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہین ٹھہر سکتین"

ابابیل:- نہین مصر مین میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ کل میرے تمام احباب دوسری آبشار کی طرف چلے جائینگے۔ وہان دریائی گھوڑے پانی مین لہرین لیا کرتی ہے اور سنگ خارا کے ایک تخت پر خداوند ممنون (memnon) متمکن ہے رات بھر اسکی آنکھین آسمان کے ستارون کو تکتی رہتی ہین اور جب صبح کا ستارہ نمودار ہوتا ہے تو وہ ایک نعرۂ مسرت لگاتا ہے۔ اور پھر خاموش ہو جاتا ہے۔ دوپہر کو بھورے اور زرد رنگ کے شیر ببر پانی پینے لب جو آتے ہین۔ جن کی آنکھین ہلکے فیروزون کی طرح چمکتی ہین۔ اور جن کی گرج آبشارون کے شور سے زیادہ بلند ہوتی ہے

بت:- مین ایک نوجوان کو کوٹھے پر بیٹھا دیکھتا ہون۔ وہ ایک میز پر جھکا ہوا ہے جس پر بہت سے کاغذات بکھرے ہوے ہین۔ اسکے برابر ایک گلاس رکھا ہوا ہے جس مین بنفشہ کے افسردہ پھول ہین۔ اسکے بال بھورے اور سخت ہین اسکے لب انار کی طرح سرخ ہین۔ اسکی آنکھین بڑی بڑی اور خمار آلود ہین۔ وہ چاہتا ہے کہ تھیٹر کے ڈائرکٹر کے لئے ایک ڈرامہ جلد ختم کردے لیکن اسکے ہاتھ جاڑے کی شدت سے اکڑے ہوے ہین اور وہ لکھ نہین سکتا۔ آتشدان مین آگ نہین ہے۔ اور بھوک کے مارے وہ بیہوش ہوا جاتا ہے"

یہ سنکر ابابیل نے جو بہت نیکدل چڑیا تھی کہا:- "اچھا مین آپ کے پاس ایک شب اور قیام کرونگی۔ کیا مین اس نوجوان کے پاس کوئی دوسرا لعل لے جاؤن؟"

بت:- افسوس ہے کہ اب میرے پاس اور کوئی لعل نہین۔ صرف میری آنکھین باقی رہگئی ہین۔ یہ نہایت نفیس نیلم کی بنی ہوئی ہین جو تقریباً ایک ہزار سال گذرے ہندوستان سے لائے گئے تھے۔ پس تم میری ایک آنکھ نکال لو

اور اس نوجوان کے پاس لے جاؤ۔ وہ یہ نیلم کسی جوہری کے ہاتھ فروخت کر دیگا۔ اور اس کی قیمت سے وہ کھانا اور لکڑی خرید لے گا۔ اور ڈرامہ ختم کر دیگا۔

یہ سنکر ابابیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ رو کر کہنے لگی:۔ "جناب یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا"

بت :۔ "کوئی حرج نہیں، تم وہی کرو جو میں کہتا ہوں"

مجبور ہوکر ابابیل نے شہزادہ کی ایک آنکھ سے نیلم نکالا اور اسے لیکر نوجوان کے مکان کی طرف اڑ گئی۔ چونکہ چھت میں ایک سوراخ تھا اسلئے اندر داخل ہونا بات آسان تھا۔ نوجوان اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا اسلئے وہ ابابیل کے پروں کی آواز نہ سن سکا۔ اور جب اس نے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا تو اُسنے کھلائے ہوئے گلدستہ میں ایک خوبصورت اور آبدار نیلم دیکھا دیکھتے ہی خوش ہو گیا اور دل میں کہنے لگا:۔ "شاید کسی عظیم الشان ہستی نے میری کوششوں کو بنظر استحسان دیکھا ہے اور یہ تحفہ بھی اسی نے بھیجا ہے۔ بس اب میں اپنا کھیل ختم کر سکونگا"

دوسرے روز ابابیل اڑکر بندرگاہ کی طرف گئی اور ایک بڑے جہاز کے مستول پر بیٹھی اور ملاحوں کو دیکھنے لگی جو نیچے کے گودام سے رسوں میں باندھ کر بڑے بڑے وزنی صندوق نکال رہے تھے۔ جب کوئی صندوق اوپر آجاتا تھا تو وہ نعرہ لگاتے تھے "شاباش میرے بھائی" یہ سنکر ابابیل کو بھی کچھ ہنسی سی آئی اور چلا کر کہنے لگی "میں بھی اب مصر کو چلی" الغرض شام کو جب چاند نکلا تو وہ اڑکر پھر شہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور بولی

"...... اب میں جناب سے رخصت ہونے آئی ہوں"

بت :۔ کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہ ٹھہرو گی؟

ابابیل :۔ اب جاڑوں کا زمانہ ہے اور یہاں بہت جلد برف پڑنے لگے گی۔ لیکن مصر میں ابھی ہرے بھرے نخلستانوں پر آفتاب چمک رہا ہے۔ دریا سے نہنگ نکل کر ساحل کی ریت پر لوٹتے ہیں اور مضمحل نگاہوں سے ایک دوسرے کو [illegible] دیکھتے ہیں۔ میرے ساتھی بعلبک کے مندر میں آشیانہ بنا رہے ہیں۔ سفید قمریاں اور گلابی فاختہ ان ابابیلوں کا [illegible] کر رہی ہیں۔ اچھا مجھے اب رخصت دیجئے۔ میں آپ کی یاد ہمیشہ دل میں رکھونگی اور آئندہ فصل بہار میں ان [illegible] بجائے جو آپ کی دریا دلی نے لوگوں کو عطا فرما دیئے ہیں۔ میں آپ کے لئے دو بہت خوبصورت اور نفیس جواہرات لاؤنگی میرا لعل رنگ اور آب و تاب میں سرخ گلاب سے بھی زیادہ بہتر اور میرا نیلم سمندر کے نیلگوں پانی سے بھی [illegible]

بت :۔ نیچے دیکھو چوک میں ایک چھوٹی سی دیا سلائی فروش لڑکی کھڑی ہے۔ اس نے نابدان میں ڈال کر اپنی تمام دیا سلائیاں خراب کر دی ہیں۔ اب وہ کھڑی رو رہی ہے کیونکہ اگر وہ دیا سلائی بیچکر کچھ پیسے نہ لیگئی تو اسکا باپ [illegible] مار دیگا۔ اس لڑکی کے پاؤں میں نہ جوتیاں ہیں نہ موزے۔ اور اس کا ننھا سا سر بھی ننگا ہے۔ اب تم میری دوسری آنکھ بھی نکال لو اور لیجا کر اس لڑکی کو دے آؤ۔ تاکہ یہ مصیبت سے بچ جائے

ابابیل :۔ مین آپ کے پاس ایک رات اور ٹھہر سکتی ہون لیکن آنکھ نہین نکال سکتی۔ کیونکہ آپ جب دونون آنکھون سے محروم ہو جائینگے تو کیا کرین گے"

بت :۔ "نہین جو مین حکم دیتا ہون وہی کرو"

ابابیل نے شہزادہ کی دوسری آنکھ بھی نکال لی۔ اور لیکر نیچے کی طرف اڑی وہ اس لڑکی کے پاس سے منڈلاتی ہوئی گذری اور اس کی ہتیلی پر وہ نیلم آہستہ سے رکھدیا۔ نیلم کو دیکھ کر لڑکی خوش ہوگئی اور کہنے لگی :۔ "کیا پیارا شیشے کا ٹکڑا ہے" وہ ہنستی ہوئی نیلم لیکر گھر کی طرف دوڑ گئی۔ اسکے بعد۔ ابابیل پھر شہزادہ کے پاس آیا اور بولا۔

......"چونکہ آپ کی بینائی بالکل جاتی رہی ہے اسلئے مین ہمیشہ آپ ہی کی خدمت مین رہا کرون گی

بت :۔ نہین میری پیاری ابابیل! اب تم مصر کی طرف جاؤ"

ابابیل :۔ نہین اب تو مین یہین رہون گی"

اسکے بعد ابابیل پر دن مین سر چھپا کر شہزادہ کے پیرون کے درمیان سوگئی۔ وہ دوسرے روز بھی تمام دن شہزادہ کے قدمون مین بیٹھی رہی۔ اور ممالک غیر مین جو جو باتین اس نے دیکھی تھین ان کا حال بیان کرتی رہی اس نے مصر کی ان سرخ رنگ مقدس چڑیون کا حال بیان کیا جو دریائے نیل کے کنارے لمبی لمبی قطارین باندھے بیٹھی رہتی ہین اور اپنی چونچ سے سنہری مچھلیان پکڑتی ہین۔ اس نے ابوالہول کا ذکر کیا جو اتنا ہی قدیم ہے جتنی دنیا۔ جو ریگستان مین رہتا ہے اور ہر چیز کا حال جانتا ہے۔ اوس نے ان تاجرون کا حال بیان کیا جو قافلہ مین آہستہ آہستہ اونٹون کے ساتھ چلتے ہین اور جن کے ہاتھون مین کہربا کی تسبیحین ہوتی ہین۔ اس نے جبال القمر کے بادشاہ کا قصہ سنایا جو آبنوس کی طرح سیاہ ہے اور ایک بڑے بلور کی پوجا کرتا ہے۔ اس نے اس بڑے سبز رنگ سانپ کا حال سنایا۔ جو ایک کھجور کے درخت مین رہتا ہے۔ اور بیس پجاری اسے دودھ پلاتے ہین۔ اس نے ان بالشتیون کا حال سنایا جو ایک "جھیل مین" بڑے پتون کی کشتیان چلاتے ہین اور تیتریون کے ساتھ ہمیشہ لڑتے رہتے ہین۔

بت :۔ اے ابابیل! تم نے مجھے عجیب عجیب باتین سنائین لیکن ان سب سے زیادہ حیرت انگیز انسان کے آلام و مصائب ہین۔ دنیا کا کوئی راز اسقدر زبردست نہین جتنا رنج و ملال اب تم میرے شہر کی فضا مین پرواز کرو اور جو کچھ تم دیکھو لسے بیان کرو۔

پس وہ ابابیل اس عظیم الشان شہر کی فضا مین اڑا۔ اور امیرون کو دیکھا کہ اپنے خوبصورت محلون مین رنگ رلیان منا رہے ہین۔ اور غربا دروازون پر بیٹھے ہین وہ تنگ و تاریک کوچون مین گیا اور زرد رو بچون کو دیکھا جو فاقے کر رہے ہین اس نے ایک پل کے در مین محراب کے نیچے دو چھوٹے لڑکون کو دیکھا جو ایک دوسرے سے لپٹے پڑے ہوئے ہین تاکہ اسی طرح وہ کسی قدر گرم ہو جائین اور سردی سے محفوظ رہین، لیکن ایک چوکیدار آتا ہے اور انھین ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے کہ "خبردار یہان نہ لیٹنا"

اور وہ دونوں بیچارے پل کے نیچے سے بارش میں نکل جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں دیکھ کر وہ ابابیل اڑتی ہوئی پھر شہزادہ کے پاس واپس آئی اور جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔

بت :۔ دیکھو مجھ پر زر خالص کے پتر چڑھے ہیں۔ تم انھیں نوچ نوچ کر لے جاؤ اور غربا و مساکین کو دو۔

الغرض ابابیل نے سونے کے تمام پتر نوچ لئے حتی کہ شہزادہ خرم بالکل بھدا اور سیسہ کے رنگ کا دکھائی دینے لگا یکے بعد دیگرے وہ سونے کے تمام پتر غربا و مساکین کو لا کر دیدیئے گئے۔ اب بچوں کے چہرے سرخ و سفید نظر آنے لگے۔ وہ آپس میں ہنستے اور گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے۔ اور با آواز بلند کہتے تھے کہ ہاں اب ہم کو روٹی ملتی ہے

اسکے بعد برف پڑنے لگی اور برف کے بعد پالا پڑنا شروع ہوا۔ سڑکیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا چاندی کی بنی ہوئی ہیں برف کی لمبی لمبی قلمیں مکانات کی اولتیوں پر ایسی لٹکتی تھیں گویا بلوری خنجر لٹک رہے ہیں۔ جو شخص باہر نکلتا تھا سمور پہنکر نکلتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے سرخ بانات کی ٹوپیاں پہنے برف پر پھسل پھسل کر کھیلتے تھے،

غریب ابابیل روز بروز ٹھٹھری جاتی تھی۔ لیکن فرط محبت سے شہزادہ کو نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ نانبائی کی دکان کے سامنے سے اسکی غیر حاضری میں روٹی کے ریزے چن چنکر کھاتی اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لئے پر پھٹ پھٹاتی۔ آخر کار اسے محسوس ہونے لگا کہ موت کے دن قریب آ گئے ہیں اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ اڑ کر پھر شہزادہ کے شانہ پر آکر بیٹھ جاتی۔ اُس نے کہا کہ "صاحب عالم! خدا حافظ! کیا آپ مجھے اپنا ہات چومنے کی اجازت دینگے"

بت :۔ میں خوش ہوں کہ اب آخر کار تم مصر جا رہی ہو۔ تم یہاں بہت زیادہ عرصہ تک ٹھہری رہیں لیکن چونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اسلئے ہاتھوں کے بجائے تم میرے لب کو بوسہ دو

ابابیل :۔ نہیں میں مصر نہیں جا رہی ہوں بلکہ دنیا سے جا رہی ہوں"

یہ کہہ کر ابابیل نے شہزادہ کے لبوں پر بوسہ دیا۔ اور مر کر اسکے قدموں میں گر پڑی

عین اُسی وقت کسی چیز کے شق ہونے کی عجیب آواز بت کے اندر سے آئی۔ گویا کوئی چیز ٹوٹی ہے شہزادہ کا دل جو سیسہ کا بنا ہوا تھا پھٹکر بالکل دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ پالا نہایت سخت پڑ رہا تھا۔

دوسرے روز صبح کو امیر بلدیہ معہ اپنے ارکان کے نیچے چوک میں پھر رہا تھا۔ جس وقت یہ لوگ مینار کے پاس سے گذرے تو انھوں نے بت کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی امیر بلدہ بولا :۔ "یہ شہزادہ کا بت کسقدر بھدا نظر آتا ہے"

"بیشک بھدا ہو گیا ہے" ارکان بلدیہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ "ہاں میں ہاں" ملانے کے اصول پر عمل کرتے تھے اور امیر بلدہ کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے۔

امیر بلدہ :۔ تلوار کے قبضہ سے لعل گر چکا ہے۔ آنکھوں سے نیلم نکلکر گر پڑے ہیں۔ اور سونے کے پتر بھی نہیں رہے ہے اب تو شہزادہ فقیر سا نظر آتا ہے۔

ارکان بلدیہ :- درست فرمایا۔ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا ہے

امیر بلدہ :- اور یہ تو دیکھئے شہزادہ کے قدموں میں ایک چڑیا پڑی ہے۔ اب واقعی ایک فرمان جاری کرنا پڑیگا کہ آیندہ کسی پرند کو یہاں آکر مرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

منشی نے فوراً امیر بلدہ کی بات نوٹ کرلی۔ بس ان لوگوں نے شہزادہ کے مجسمہ کو توڑ ڈالا۔ اور یونیورسٹی کے ماہرین فنون لطیفہ نے تو یہاں تک کہدیا کہ :- "چونکہ یہ بت خوبصورت نہیں رہا لہذا مفید بھی نہیں رہا"

شہزادہ کا بت ایک بھٹی میں پگھلا یا گیا۔ اور امیر بلدہ نے ارکان بلدیہ کا ایک ضروری جلسہ طلب کیا تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ بت کی دھات کس کام میں لائی جائے۔ خود امیر بلدہ نے فرمایا کہ "یقیناً ہمیں ایک دوسرا بت بنوانا پڑیگا۔ اور وہ بت میرا ہوگا" اس پر ہر رکن نے "میرا۔ میرا۔ میرا" کا راگ الاپنا شروع کردیا۔ اور آپس میں خوب جنگ ہوئی

کارخانۂ فلزات کے مہتمم نے کاریگروں سے کہا :- "یہ عجیب بات ہے کہ اس بت کا دل بھٹی میں پگھلتا ہی نہیں پھر کیا کیا جائے۔ اچھا اسے پھینکدو"

الغرض انھوں نے شہزادہ کے دل کو مزبلہ پر پھینکدیا جہاں ابابیل کی لاش پہلے سے پڑی ہوئی تھی

خدا نے اپنے فرشتوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ جاؤ اس شہر میں جو سب سے بیش قیمت دو چیزیں ہوں وہ میرے پاس لاؤ۔ فرشتہ آیا اور "سیسہ کا دل اور ابابیل کی لاش" اٹھا لے گیا۔ خدا نے فرمایا :-

"بیشک تم نے نہایت صحیح انتخاب کیا۔ میری فردوس میں یہ پرندہ ہمیشہ چہچہاتا رہیگا۔ اور میرے شہر زرنگار میں شہزادہ خرم ہمیشہ میری حمد و ثنا میں مصروف رہے گا۔ (آسکر وائلڈ)

مادّہ کی رسائی خدا تک

انسانی قوا کی غیر محدود وسعت

گو جسم انسانی محدود ہے لیکن اس کی قوتیں نامحدود ہیں یعنی انسان میں جتنی قوتیں فطرت نے عطا کی ہیں وہ غیر محدود طور پر وسیع ہو سکتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ معمولاً انسان میں یہ قوتیں محدود صورتوں میں پائی جاتی ہیں لیکن یہ حد بندی صرف اسلئے قائم کی گئی ہے کہ انسان ان قوتوں کو خود ترقی دے اور اس طرح وہ خدا سے متحد ہو جائے۔ یہی انسانی زندگی کا مقصود ہے اور یہی ہمارا راز حیات ہے ـــــ جس کے معلوم کرنے کے لئے عبادات سے بطور آلہ و ذریعہ کام لیا جاتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ ترقی کیونکر حاصل ہو؟ کیا صرف تزکیۂ روحانی اسکا واحد ذریعہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ درست نہیں ہے اور ہزارہا سال تک دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہے کہ محض روحانی ترقی سے خدا مل سکتا ہے یورپ مادی ترقی میں ہمہ تن منہمک ہے لیکن اوسنے اسی ترقی ہی کو اصل مقصود قرار دے رکھا ہے، مادی ترقی ہو خواہ روحانی، یہ دونوں کسی مخصوص مقصود کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں، اگر کوئی شخص خود ان ذرائع کو مقصود بنائے تو یہ اوسکی غلطی ہوگی۔ میں یہ نظریہ پیش کرتا ہوں کہ

"مادی ترقی سے بھی خدا مل سکتا ہے"

میں کسی مافوق الفطرت فعل کا سرزد ہونا پیغمبری یا کرامت کی تنہا دلیل نہیں سمجھتا۔ شیر پر سوار ہو کر سانپ کا کوڑا ہاتھ میں لیکر چلنا کبھی تقدس روحانی کی علامت نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان میں معجزہ و کرامت کو اہل تصوف نے مخصوص نسوانی مرض سے موسوم کیا ہے۔ معجزہ و کرامت تو صرف وہ ارادی یا غیر ارادی فعل ہے جو عام انسانی قوت سے بالاتر سمجھا جائے اور جو تقدس کی ادنی دلیل ہے اور جو صرف منکرین کو قایل کرنے کے لئے ظاہر ہوتا ہے۔ میں ہرگز اسلئے مسلمان نہیں ہوں کہ رسول عربی نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے یا جسمانی معراج حاصل کی تھی۔ میں اوپر صرف اسلئے ایمان لایا ہوں کہ اونکی زندگی ایسی عملی مثال پیش کرتی ہے جو ہماری زندگی کی تمام راہوں میں مشعل کا کام دے سکتی ہے

بعض علماء اسلام کا خیال ہے کہ معجزہ صاحب معجزہ کی ذات سے متعلق نہیں ہوتا۔ موسی اور جادوگروں کی جنگ یہ بتا رہی ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ نے اوسوقت ایسی فضا قائم کر دی تھی کہ جو بھی اپنا عصا زمین پر پھینکتا وہی سانپ ہو جاتا۔ اسکے علاوہ معجزہ وقتی حیثیت رکھتا ہے، جسوقت وہ سرزد ہوتا ہے اوسوقت وہ اعلی انسانی قوت کی دلیل ہوتا ہے، لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ مافوق الفطرت رہے آگے آنے والے نقشہ سے آپ پر شاید یہ واضح ہو جائے کہ جو

واقعات ایک زمانہ مین پیغمبرون سے سرزد ہوکر معجزہ کہلائے ہین وہ آج مادی ترقی سے بھی ممکن ہین۔
پیغمبر کی اعلیٰ روحانیت، مافوق الفطرت واقعات کی معین ہوتی ہے اور آج ایک عامل کی اعلیٰ مشق سے بھی وہی واقعات سرزد ہوتے ہین۔
اب رہا یہ سوال (جو میرا نفس مبحث ہے) کہ کیا مادی وروحانی دونون ترقیان دو مختلف ذرائع ہین۔ ایک ہی مقصد کے حصول کے! سو یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے اور غور وخوض کا محتاج ہے۔
بقول سرآرتھر کینن ڈائل "سائینس وحکمت کی گوناگون ترقیان خدا کی قدرت کاملہ اور اوسکے وجود سے انکار کا باعث نہین ہین بلکہ اون سے اوسکی قدرت کاملہ بدرجۂ اتم ظاہر ہوتی ہے"۔ موجودہ مادی ترقیان بجائے اسکے کہ ہماری عقیدتمندیون کو خدا کی طرف سے منحرف کرین اور بھی راسخ کرتی جاتی ہین "ڈاکٹر میکائل پوپن" پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کا خیال ہے کہ "ہماری مادی ترقیان خدا کو ہم سے قریب کر رہی ہین"۔ مسٹر چارلس ہنری پروفیسر ساربانی یونیورسٹی نے انسانی روح کی قدامت کو علم ہندسہ سے ثابت کیا ہے جیسا کہ بقول بعض حضرات کے خدا کی وحدانیت اقلیدس کی ساتوین شکل سے ثابت ہوسکتی ہے۔ تجربہ نے ثابت کردیا ہے کہ ہم مرنے والون کی روحون سے گفتگو کرسکتے ہین۔ ڈاکٹر لیولاب (Dr. S. Loeb?) پروفیسر واشنگٹن یونیورسٹی نے غدود کی تبدیلی سے جو نتائج اخذ کئے ہین اوس سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی زندگی مادی ذرائع سے وسیع ہوسکتی ہے
مغربی اطبا کا ایک مخصوص گروہ مادہ تولید کی تحلیل مین مصروف ہے، مصنوعی مادہ سے چوپایون پر جو تجربہ کیا گیا ہے وہ نہایت امید افزا ہے کیا یہ ترقیان انسان کی عظمت پر دال نہین ہین؟
اس مین شبہ نہین کہ مادیت کا ایک پہلو کسی قدر تاریک ہے۔ لیکن اول تو یہ مادیت کا لازمی نتیجہ نہین ہے، دوسرے یہ کہ جو لوگ واقعی مادی ترقی مین مصروف ہین۔ اونکی زندگی کا اخلاقی پہلو کم تاریک ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ صحیح مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اعداد وشمار بتا رہے ہین کہ بد اخلاقی مین نمایان کمی ہے۔ آج مغرب کے وہ مخصوص افراد جو علوم وفنون کی تحقیق ودریافت مین مصروف ہین۔ اونکی زندگی کا اخلاقی پہلو نہایت پاک وصاف ہے
اسوقت مادی ترقیانکو دو حصون مین تقسیم کی جاسکتی ہین۔ ایک وہ جو ظاہری ذرائع مثلاً علم کیمیا وعلم البرق وغیرہ سے متعلق ہین، یہ قطعی مادی ہین۔ لیکن دوسری ترقی انسانی حسیات کی ہے، جسے قطعی طور پر تو مادی نہین کہا جاسکتا لیکن چونکہ ان ترقیون کے ذرائع مادی ہین اسلئے اونکو بھی مادی کہنا پڑتا ہے۔ میرے خیال مین اول الذکر سے زیادہ موخر الذکر کی ترقی ہمکو خدا سے قریب تر کررہی ہے۔
اسوقت تک مشرقی ومغربی علما کا اسپر اتفاق تھا کہ انسان کے حواس ظاہری پانچ ہین۔ اور ہر حس کے مختلف ذرائع خدا نے قائم کر رکھے ہین، ہاتھ چھونے کے لئے، زبان مزے کے لئے، ناک سونگھنے کیلئے، آنکھ دیکھنے کے لئے اور کان سننے کیواسطے

لیکن موجودہ تحقیقات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ان پانچ کے علاوہ ایک چھٹی حس اور بھی ہے اور اس کا تعلق دماغ سے ہے اسکے ذریعہ سے ایک انسان اپنے خیالات کو دوسرے انسان تک پہونچا سکتا ہے

ابتک انسان نے اپنے ان حواس کا صحیح استعمال کامل طور پر دریافت نہین کیا ہے، تجربات یہ بتا رہے ہین کہ اگر ان حواس کو معقول وسعت نصیب ہوئی تو نہ صرف انسان اپنی تکمیل کی جانب سرعت سے گامزن ہوجائیگا بلکہ دیگر تمامی علوم ظاہری کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مسٹر ہالڈین (Haldane) پروفیسر آکسفورڈ یونیورسٹی کا خیال ہے کہ تمام ظاہری علوم کے اختراع و ایجاد کا سبب محض ہماری قوائے حسیہ سے ناواقفیت ہے

قوائے حسیہ اور ان کے میدان عمل کی وسعت

حواس کی ترقی کے صحیح واقعات پر غور کرنے سے میرے ان خیالات کی کماحقہ تائید ہوتی ہے۔ اول تو آپ یہ ملاحظہ فرمائینگے کہ ایک معمولی شخص سے مشق کے بعد وہ واقعات و حرکات رونما ہوتے ہین جو کسی زمانہ مین معجزہ و کرامت سمجھے جاتے تھے۔ دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ گو یہ ذرائع اک گونہ مادی ہین لیکن ان کے ذریعہ سے انسان روز بروز صفات خداوندی سے زیادہ متصف ہو کر اوس سے قریب تر ہوتا جاتا ہے کیونکہ قربت الٰہی کے کوئی معنے سوائے اس کے نہین کہ اس کے صفات مین اشتراک پیدا ہوجائے خواہ وہ کیسا ہی کمزور کیون نہ ہو، پھر جس وقت انسان تمام صفات الٰہیہ سے متصف ہوجائیگا اوس وقت وہ ذات خداوندی سے قریب تر ہوجائے گا۔

قوت شامہ

قوت شامہ کو اگر ترقی دیجائے تو اکثر وہ کام جو آنکھ، ہاتھ، اور زبان سے ہوسکتے ہین وہ صرف سونگھ کر پورے ہوسکتے ہین میرا عینی مشاہدہ ہے کہ جونپور مین ایک شخص نابینا حافظ منگلی نامی تھے یہ بزرگ محض سونگھ کر کپڑون کا رنگ بتا دیتے تھے

یہ دوسرا واقعہ میرا دیکھا ہوا نہین ہے لیکن ایک ثقہ شخص نے مجھے بتایا کہ وہ ناک سے کام لیکر یہ بھی بتا دیتے تھے کہ قرآن کا کونسا پارہ ہے۔ میرے خیال مین حضرت یعقوب کو یہ قوت بدرجۂ اتم حاصل تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ قوت بینائی کے زوال کے بعد قوت شامہ ترقی کر جاتی ہے، میری رائے مین یہ تخصیص نامناسب ہے، یہ ضرور ہے کہ کسی ایک قوت کے کمزور پڑ جانے کے بعد دوسری قوت ترقی کر جاتی ہے، لیکن قوت شامہ کی ترقی کے لئے اندھا ہونا ضروری نہین۔ اگر قوت شامہ کو ترقی دیجائے تو مجھے یقین ہے کہ جرائم کی تحقیقات مین بہت سی سہولتین پیدا ہوجائینگی۔ چوپایون مین قوت شامہ بیحد قوی ہوتی ہے۔ روس مین کتے مقتول کا خون سونگھ کر قاتل کا پتہ لگا لیتے ہین۔ گھوڑون مین بھی یہ حس بہت قوی ہوتی ہے جن لوگون کو شکار سے دلچسپی ہے انکو معلوم ہوگا کہ درندون کی موجودگی کا علم شکاری سے پہلے گھوڑون کو ہوجاتا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ چوپایون مین بلی اور پتنگون مین شہد کی مکھی کی قوت شامہ بیحد قوی ہوتی ہے

پروفیسر مرے نے (جو خیالی تموج "کے بہت بڑے ناشر ہین) دوران تجربہ مین دو بار قوت شامہ کی

مدد سے بعض واقعات بتا دیئے۔

قوت لامسہ گو ابتک مغربی محققین نے اس مخصوص قوت کی جانب سے بے اعتنائی برتی ہے، لیکن پھر بھی جو ترقی ابتک ہوئی ہے وہ قابل تحسین ہے جن حافظ منگلی کا ذکر میں کر چکا ہون وہ کپڑون کو چھوکر اونکا رنگ بتا دیا کرتے تھے۔ نابینا کی تعلیم کے لئے مغرب مین جو مدارس قائم کئے گئے ہین اون مین اس جانب خاص توجہ کیجاتی ہے۔ گو ابھی ابتدائی حالت ہے لیکن اب بھی لڑکے کاغذ کو چھوکر اوسکا رنگ بتا دیتے ہین۔ ابھی تک تو کتابین ابھرے ہوے حروف سے لکھی جاتی ہین، جنکو لڑکے آسانی سے پڑھ لیتے ہین، لیکن برلن کے مدرسہ کے مدرس اعلی مسٹر گلرٹ کا خیال ہے کہ "چند دنون کے بعد اس مخصوص طرز کتابت کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور وہی کتابین جو آنکھ والے پڑھتے ہین اندھون کے لئے بھی کافی ہونگی کیونکہ اوسوقت تک اونکی قوت لامسہ کو قوی بنانے کی کوشش کامیاب ہو جائیگی۔ ابھی چند دنون کی بات ہے کہ ایک شخص مسٹر ڈیوک نامی ہندوستان مین دورہ کر رہے تھے۔ وہ لکھنؤ مین بھی آئے تھے ہزارہا آدمیون کے ساتھ اونھون نے اپنی قوت لامسہ کے کرشمے دکھائے اونکے آنکھون پر پٹیان باندھدی گئی تھین اور اسکا بخوبی اطمینان کر لیا گیا تھا کہ وہ دیکھتے نہین۔ اس حالت مین جو تحریر اونکے سامنے رکھدی گئی اوسے چھوکر انھون نے اسی طرح تیزی کے ساتھ پڑھا جس طرح ہم آپ دیکھکر پڑھتے ہین۔ انگلستان کے بعض محققین اس قوت کو (TELEPATLY) کے نام سے موسوم کرتے ہین۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان کی وسط پیشانی سے ایک شعاع نکلتی ہے جسے اگر ترقی دیجائے تو وہ بصارت کا کام دیتی ہے۔ کہین خود عامل موصوف نے ایک اخبار کے نمایندہ سے دوران ملاقات مین بتایا کہ یہ قوت لامسہ کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ یوربین محققین کی رائے اسلئے اور بھی قابل قبول نہین معلوم ہوتی کہ دونون صورتون مین لمس کی ضرورت نہین ہے مگر ڈیوک موصوف بغیر انگلیون کی مدد کے کبھی نہین پڑھ سکتے تھے۔

قوت ذائقہ یہ انسان کی کثیف ترین قوت ہے۔ لیکن اگر اسے ترقی دیجائے تو اسکے لئے بھی میدان عمل بجد وسیع ہے میرا خیال ہے کہ یہ قوت قوت لامسہ سے بہت کچھ ملتی ہے اسلئے کہ ان دونون قوتون کا استعمال اعضاء جسمانی کے لگاؤ سے ہوتا ہے۔ آپکو متعدد ایسے لوگ معلوم ہونگے جو زبان سے چکھ کر کپڑون کا رنگ بتا دیتے ہین گو اونکی آنکھیں بند ہوتی ہین۔ مین نے ایک شخص کے متعلق سنا ہے (گو مجھے ذاتی واقفیت نہین) کہ وہ بغیر چھوئے صرف زبان کے مس سے یہ بتا دیا کرتے تھے کہ کون ہاتھ کس کا ہے۔

قوت باصرہ حضرت عمر کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے ایک بار خطبۂ جمعہ کے دوران مین حضرت ابو عبیدہ کو جو صدہا میل کے فاصلہ پر تھے غنیم کے خفیہ حملون سے متنبہ کیا یہ روحانی قوت کا کرشمہ ہے جسے کل تک ہم کرامت کہتے تھے لیکن آج تجربہ نے بتا دیا کہ یہ معمولی فعل ہے جو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص کر سکتا ہے۔

ابھی کل کا واقعہ ہے کہ گسٹن اورین (Gaston Aurien) نامی ایک شخص نے لندن مین اپنی مشق کے کرشمے

دکھائے۔ اوسکی آنکھون پر پہلے تو کاغذ چپکا دیا، اوسکے بعد ایک سیاہ پٹی باندھ دیگئی اور اس امر کا کافی اطمینان کرلیا گیا کہ حاضرین مین سے کوئی شخص اوسکا شریک کار نہین ہے۔ اسکے بعد گسٹین نے تماشے شروع کئے، پہلے تو جو عبارت اُسکے سامنے لکھکر رکھدی گئی اوسنے اوسے پڑھ دیا۔ اوسکے بعد مختلف رنگ کے پھولون مین سے ہر رنگ کے پھول علٰحدہ کردیئے اور بتا دیا کہ کون پھول کس رنگ کا ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز تماشا یہ تھا کہ اوسنے اپنی آنکھون پر پٹی باندھکر نہایت تیزی سے موٹر چلائی اور گو اوسکی آنکھین بند تھین لیکن وہ پولس کانسٹبل کی تمامی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ اوسکا بیان ہے کہ خواہ اوسکی آنکھ بند رہے یا کھلی رہے اوسکے لئے دونون یکسان ہین۔

پروفیسر مرے (Murray) کا خیال ہے کہ کسی قسم کا فاصلہ یا پردہ اس قوت کے استعمال کے لئے مانع نہین ہے۔ اطالیہ کے ایک حکیم نے ایک آلہ کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کی آنکھون سے ایک مخصوص قسم کی شعاع نکلتی ہے اور یہ شعاع خیالات و جذبات کی ہے۔

قوت سامعہ | پروفیسر فرڈیننڈ (Ferdinand) معلم حکمت میلان یونیورسٹی (اطالیہ) نے متعدد تجربات کے بعد یہ بیان دیا ہے کہ وہ نہ صرف دور کی آواز سن سکتا ہے بلکہ خیالات کو بھی سن سکتا ہے لاسلکی کی موجودہ ترقیان اس دعوی کا کافی ثبوت ہین۔

حکیم بوعلی سینا نے صدہا سال قبل یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ آواز سے مریض کا مرض معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اوسکے ایک شاگرد نے اسکی کافی مشق بہم پہونچائی۔ اوسنے ایک بند کمرہ بنایا اور اوس مین ایک چھوٹا سوراخ رکھا مریض کو حکم تھا کہ وہ اس سوراخ سے صرف اپنا نام بتائے اور وہ نسخہ لکھکر پھینکدیا کرتا

فرڈیننڈ مذکور کا حسب ذیل تجربہ قابل غور ہے۔ اوسنے اپنے معمول کو پہلے تو ایک ایسے بکس مین بند کیا کہ لاسلکی کی موجون سے اوسکا دماغ محفوظ رہے، اوسکے بعد اوسنے معمول کے سر کے قریب ایک خود ساختہ آلہ رکھا اور اس آلہ سے اوسنے ایک لاسلکی ٹیلیفون کا تار لگا کر اپنے کانون مین لگایا۔ اسکے نتائج تعجب خیز تھے۔ الفاظ تو خیر نہین سنائی دیئے (اسلئے کہ کوئی گفتگو تو کرتا نہ تھا) مگر معمول کے دماغی حرکات کی سریلی باریک آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ پروفیسر موصوف کا یقین ہے کہ دماغ انسانی ایک برقی آلہ ہے اور اوسکے حرکات برقی مقناطیسی شعاعین ڈالتے ہین۔ آیندہ تجربات یہ بتائینگے کہ ان حرکات کی شعاعین فاصلہ پر کیونکر منتقل کیجا سکتی ہین

ڈاکٹر فرینک کیننگ ہیڈاک (Frank Channing Haddock) نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "قوت ارادی" میں تمام قوا، انسانی کو ترقی دینے کی مشقین لکھی ہین۔ قوت سامعہ کی ترقی دینے کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

"ہمارے ارد گرد ہزارہا آوازین پیدا ہوتی رہتی ہین۔ ان آوازون کا تصادم لمز در آواز کو دبا کر قوی آواز کو ہمارے کانون تک پہونچاتا ہے شاید یہ بات آپکے تجربہ مین آئی ہو کہ اکثر شور و غل مین آپ کسی باریک آواز کو

نہیں سن سکتے لیکن جب دوسری آوازون کی طرف سے غیر متوجہ ہوکر کسی مخصوص باریک آواز کو سننا چاہتے ہین تو وہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس طرح کسی آواز کو سننے کے لئے آپکو دو باتین کرنی ہوتی ہین۔
(۱) مخصوص آواز کی جانب ہمہ تن توجہ (۲) دوسری آوازون کی جانب عدم توجہ۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ اگر قوت ارادی سے کام لیکر ان دونون باتون کی مشق کی جائے تو انسان کوسون کی آواز سن سکتا ہے۔
آواز مین لہرین پیدا ہوتی ہین، اور یہ لہرین ہر سمت دوڑتی ہین، اگر کوئی دوسری آواز انسے متصادم نہو تو یہ ہزارہا کوس تک جا سکتی ہین،،

ڈاکٹر موصوف نے اس کی چھ مشقین بتائی ہین جنکا بالاختصار ذکر خالی از فائدہ نہوگا۔ ہر مشق دس روز تک کم سے کم کرتی چاہیے، گھڑی کی آواز بہترین آواز مشق کے لئے ہے

"مشق نمبر۱) سب سے پہلے یہ غور کیجئے کہ آپکے کانون تک کتنی آوازین پہونچ رہی ہین۔ اون کو شمار کیجئے۔ سنئے اور ہر آواز مین امتیاز پیدا کیجئے پھر یہ دیکھئے کہ ادن آوازون کا رخ کس جانب ہے، اونکے اسباب کیا ہین ان کے لہجے کیسے ہین اونکی طاقت مین کیا فرق ہے، یہ سب معلوم کرنے کے بعد اونکو مختلف نوعیتون مین تقسیم کیجئے۔
(مشق نمبر۲) مختلف آوازون مین کسی ایک آواز کو منتخب کر لیجئے اور اوسکے زیروبم پر غور کیجئے۔
(مشق نمبر۳) ہر آواز مین مختلف و متعدد چھوٹی چھوٹی آوازین شامل ہوتی ہین۔ منتخب شدہ آواز مین سے باریک ترین آواز کو علیحدہ کیجئے ایسا کرنے مین ایسی باریک آواز کا انتخاب بہتر ہوتا ہے جو دوسری آوازون سے ممتاز ہو۔
(مشق نمبر۴) منتخب شدہ باریک آواز پر غور کیجئے اور دوسری آوازون کو نظر انداز کیجئے۔
(مشق نمبر۵) اس باریک آواز مین ایک نغمہ ہوگا۔ اس نغمہ کے ساتھ دلچسپی پیدا کیجئے اور لطف سے سنئے
(مشق نمبر۶) رفتہ رفتہ فاصلہ کو بعید کرتے جائے

ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ دو ماہ کی مشق کے بعد ایک شخص نہایت آسانی کے ساتھ کوسون کی آواز سن سکتا ہے، موجودہ تحقیقات نے اس قوت انسانی کا پتہ چلایا ہے۔ یہ قوت تمام قوائے انسانی سے زیادہ سریع اور قوی ہے اور اسکے لئے ترقی کی بیحد گنجائش ہے ابتک انسانی دماغ کی کامل اور قابل اطمینان تشریح نہین ہوسکی ہے لیکن جسقدر بھی ہوسکی ہے اوس سے ہم نہایت مفید نتائج پر پہونچ سکے ہین۔ کھوپڑی کے نیچے ایک بھورے رنگ کا مادہ ہوتا ہے اور اوسکے نیچے ایک سپید شے ہوتی ہے۔ اول الذکر دراصل متعدد چھوٹے چھوٹے شریانی نظام پر مشتمل ہے اور موخر الذکر کی بھی حالت وہی ہے صرف اسکے خانے پیچیدہ ہین بھورے رنگ کا مادہ تمام محسوسات انسانی کا مخزن و منبع ہے اگر یہ موجود نہو تو دماغ بیکار رہے۔ سپید مادہ کی حیثیت محکوم کی ہے بقول ڈاکٹر فریزر ہیرس (Fraser Harris) اگر سپید مادہ نہو تو دماغ کی بالکل وہی حالت ہو گی

جس طرح ٹیلیفون کی بغیر تارون کے ہوتی ہے - اور اگر بھورے رنگ کا مادہ نہو تو دماغ کی حالت اوس ریلوے کی ہو گی جو نہ کسی اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے اور نہ کہین ختم ہوتی ہے -

دماغی محسوسات دو طرح کے ہوتے ہین ایک ظاہری اور ایک باطنی - قوی محسوسات کا اثر ظاہری ہوتا ہے اور ضعیف کا باطنی - اول الذکر کا احساس ہر عامی کو ہوتا ہے اور موخر الذکر کا احساس مخصوص لوگون مین ہوتا ہے - عام طور موخر الذکر کو ہم بوقت احساس محسوس بھی نہین کرتے لیکن اوسکا اثر دماغ پر قائم رہتا ہے جو کسی وقت ظاہر ہوتا ہے - یہی موخر الذکر قوت ہے جو ہمارے موجودہ مبحث کا موضوع ہے -

مسٹر جے - اس - ہیلڈین (J. S. Haldane) پروفیسر اکسفورڈ یونیورسٹی نے اخبار ویسٹ منسٹر گزٹ (Westminster Gazette) کے نمایندہ سے دوران ملاقات مین بیان کیا کہ انسان اپنے خیالات دوسرے شخص کے دماغ مین بآسانی منتقل کر سکتا ہے اور اسکا ذریعہ وہ آواز کی لہرین ہین جو باطنی محسوسات سے برآمد ہوتی ہین - پروفیسر موصوف اس قوت کو قوت سامعہ مین شامل کرتے ہین - لیکن مسٹر مرے (Murray) جنکا ذکر گزشتہ صفحات مین ہو چکا ہے اسکو علیحدہ قوت النسانی سمجھتے ہین - سر ولیم بیرٹ (Sir William Barrett) ایف - آر - سی - اس - صدر انجمن روحانیات اس قوت کو روحانی قوت بتاتے ہین - موصوف کا خیال ہے کہ اسکا تعلق دماغ سے نہین ہے بلکہ یہ تو "روحون کی گفتگو ہے"

بہر نوع اسکی جو صورت بھی ہو یہ امر مسلم ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے خیالات معلوم کر سکتا ہے خواہ وہ کتنی ہی دور کیون نہو - پروفیسر مرے (Murray) نے لندن مین اپنی اس قوت کے مشاہدات صدہا لوگون کے سامنے پیش کئے - فرڈینینڈ ٹیکنر ایلی جنکا ذکر گذشتہ صفحات مین ہو چکا ہے وہ اسکو "موج دماغی" پر محمول کرتے ہین - روبی لکھن ( ) ایک جرمن عالم نے اپنی قوت کے اظہار سے ایک عالم کو متحیر کر رکھا ہے - لوبی موصوف مسٹر مرے کا ہم خیال ہے - ایک مجمع کے سامنے جس مین مسٹر بار تھاد ( ) سابق وزیر اعظم و وزیر خارجیہ موجود تھے لوبی نے ایک عورت کے خیالات من وعن بیان کر دے -

مسٹر جمس ڈگلس اس غیر معمولی واقعہ کے ناقل ہین کہ عین اوسوقت جب ایک شخص ڈیور (Dewar) مین موٹر کے تصادم سے زخمی ہوا اوسوقت اوسکی ماں نے اپنے شوہر سے کہا کہ "میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شے مجھسے چھین لی گئی تصادم ۵ بجکر ۵۰ منٹ پر ہوا تھا اور اوسوقت ماں سو رہی تھی - یک بیک وہ نیند سے چونک اوٹھی اوسکے شوہر نے اوسکو تسلی دینے کی بیحد کوشش کی لیکن وہ برابر یہی کہتی رہی کہ اوسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوسکا لڑکا کسی مصیبت مین مبتلا ہے -

اب آپ غور کرین تو اس واقعہ سے نہایت ہی مفید نتائج برآمد ہوتے ہین - ابتک صرف واقعات حاضرہ کا علم ہم اس کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایک وقت آئیگا جب آیندہ واقعات کا بھی اس سے پتہ چل جایا

کرینگا اور ممکن ہے کہ حضرت یوسف مین یہ قوت رہی ہو۔ دراصل خواب کی حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ صدہا آیندہ واقعات کو خواب مین دیکھتے ہین اور وہی واقعات من وعن چند دنون کے بعد پیش آتے ہین ۔ یہ ایسا واقعہ ہے کہ کسی تفصیل کا محتاج نہین محققین خواب کا خیال ہے کہ خواب بھی اسی قوت حسیہ کا نتیجہ ہے ۔ اسوقت تک خواب کی صحیح ماہیت دریافت نہین ہوسکی ہے ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جسوقت ہمنے اسکی کنہ کو دریافت کرلیا اوسوقت ہم بیداری مین بھی اس واقعات کو معلوم کرسکینگے ۔

خاتمہ اسقدر عرض کرنے کے بعد غالبًا آپ مجھسے متفق ہونگے کہ انسان کے قوا غیر محدود وسعت حاصل کرسکتے ہین ۔ اور وہ زمانہ دور نہین جب انسان کی مکمل مادی ترقیان اوسے خدا سے قریب کردینگی ۔ ایک ہندوستانی بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ نماز مین مشغول تھے تو ٹرین رک گئی ۔ آج اسٹریلیا کا ایک مسمریزمی عامل جلتے ہوئے انجن کو روک کر بھی یہی تماشہ دکھا سکتا ہے

ذیل کے نقشہ سے مضمون بالا کی تشریح وتفصیل مقصود ہے

نمبر	معجزہ یا کرامت ۔ بحوالہ صاحب معجزہ وکرامت (روحانی ترقی)	موجودہ مادی ترقیان بحوالہ واقعات ودلائل
۱	حضرت سلیمان کا ہوائی تخت	ہوائی جہاز اور جرمنی نے جو راکٹ ایجاد کیا ہے اوسکا مستقبل اور زیادہ شاندار ہے
۲	حضرت یونس کا مچھلی کے پیٹ مین تون رہنا اگر وہ تعمیر ہو	ابھی چند دن ہوئے کہ جنوبی ہند کے ایک عامل نے یہ تماشا دکھایا کہ وہ گھنٹون زمین مین مدفون رہا ۔ یعنی حبس دم بآسانی ممکن ہے ۔
۳	حضرت داؤد کا نغمہ	نغمہ اور موسیقی کے اثرات ظاہر ہین ۔ ماہرین فن کا یہ ادنی کرشمہ ہے کہ وہ راگ سے چراغ روشن کردین ، پانی برسادین اور لوگون کو بیہوش کردین ۔ چنانچہ فارابی کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ اوسنے اپنے راگ سے ساری محفل کو محو خواب کردیا تھا ۔ آواز کے اثر کی مختصر سی تفصیل عرض کرچکا ہون ۔ ہر آواز مین لہرین پیدا ہوتی ہین جو فضا مین دور تک جاتی ہین ۔ اور عادات کے لحاظ سے ان موجون مین اختلاف پیدا ہوجاتا ہے ۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ جذبات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ موجون کے رنگ بدلتے رہتے ہین ۔

۴	حضرت یعقوب نے باوجود فاصلہ "پیراہن یوسفی" کی بو محسوس کر لی تھی۔	یہ صرف قوت شامہ کی ذکاوت پر منحصر ہے جسکی مثالیں میں گزشتہ صفحات میں دے چکا ہون۔ قوت سامعہ کی ترقی کے لئے جو مشق دی گئی ہے وہی مشق اسکے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے
۵	حضرت یوسف نے خواب فرعون کی صحیح تعبیر بتائی۔	جو لوگ تعبیر خواب کے اصول سے واقف ہین وہ اس واقعہ کو تعجب خیز نہین سمجھین گے۔ چونکہ ۔۔۔۔ حضرت یوسف کی قوت متخیلہ بیحد قوی تھی یا اسلئے انکے دماغ کی موجین آیندہ واقعات کو محسوس کرتی تھین۔ انگریزی مین ایک ضرب المثل ہے کہ "آیندہ واقعات اپنا عکس سامنے ڈالتے ہین" یہی وہ عکس ہے جسکا احساس حضرت کو تھا اور یہ صرف احساس کی ذکاوت پر منحصر ہے جو مشق سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسرا نہایت باریک نکتہ (جسے مین بخوف غلط فہمی کہنا نہین چاہتا تھا) یہ ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے خود تین حصہ ہین۔ گذشتہ موجودہ۔ آیندہ۔ اور ہم ہر وقت بہ لحاظ ضرورت فطرت تینون زمانون مین رہتے ہین۔ آپکا مستقبل ہمارا ماضی ہے اور ہمارا ماضی آپکا حال ہے۔ فرانسیسی منجم کیمیلی فلیمیران Camille Flammarion کا خیال ہے کہ وقت و زمانہ کوئی واقعی حیثیت نہین رکھتے۔ وہ قحط جو فرعون کے لئے مستقبل تھا وہ حضرت یوسف کی نظرون مین حال تھا۔
۶	حضرت ابراہیم کا آگ مین نہ جلنا	اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے مین آتے ہین۔ ابھی حال کا واقعہ کہ ایک شخص نے یہی تماشہ جنوبی ہند مین دکھایا تھا۔ اسٹیٹسمین مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۳۵ء مین بھی اس قسم کا ایک واقعہ شائع ہوا ہے۔ آگ پر چلنے والون کی ایک جماعت نے اسٹریلیا مین یہ تماشہ دکھایا تھا جسکی صدارت پروفیسر سائیس (Sayce) نے کی تھی۔ اس جماعت کے ایک عامل نے یہ بیان دیا ہے کہ یہ مشق صرف حسن اعتقاد پر مبنی ہے۔ شراب و گوشت سے پرہیز لازم ہے اور خیال و عمل کی پاکی اسکے لئے

ضروری ہے۔

۷ حضرت عیسیٰ کی مسیحائی

آج قوت ارادی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مرض کی تکلیف تمامتر محسوسات انسانی کی ذکاوت پر منحصر ہے اجب تکلیف کا احساس نہیں تو مرض نہیں سنہ ۶ء میں ایک مصری عامل نے لندن میں اپنی قوت ارادی کے صدہا اس قسم کے تماشے دکھائے وہ مریض کو ہپناٹزم کے ذریعہ سے بیہوش کر دیتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد مریض تندرست ہو جاتا۔ ایک لندن کے اخبار کے نمایندے سے دوران ملاقات میں اس نے بیان کیا کہ یہ بات مافوق الفطرت نہیں ہے اور ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے یہ مشق اس طرح کی کہ پہلے تو میں نے اپنے جسم کو آفتاب کی تمازت میں خوب جلایا۔ زبان کو اپنے حلق کے سوراخ میں ڈالدیا کرتا تاکہ پیاس نہ معلوم ہو۔ اس مشق کو اسوقت تک میں نے جاری رکھا جب تک کہ میں خود کو اپنی مرضی سے بیہوش نہ کر لیتا۔ اس نے بڑے مجمع میں خود کو ایک بکس کے اندر بند کر کے زمین میں دفن کرا دیا اور پانچ روز تک دفن رہا۔

مارگزیدہ کے علاج کی تحقیقات کے دوران میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ اکثر وہ لوگ جو مردہ سمجھے جاتے ہیں وہ واقعی مردہ نہیں ہوتے۔ دماغ کے اندرونی درمیانی حصہ میں ایک خانہ ہوتا ہے جس سے جان بہت دیر میں نکلتی ہے۔ اکثر مریض پانچ روز تک اس حالت میں رہے ہیں۔ جنرل سر جیمس ویلکاکس نے اپنا ذاتی مشاہدہ اخبار ایوننگ نیوز (Evening News) میں بیان کیا ہے کہ ایک بچہ جسکو اوسکی ماں نے مردہ سمجھکر چھوڑ دیا تھا اوسکو ایک ہمالیہ کے فقیر نے اچھا کر دیا۔

۸ معجزہ سنگریزہ و ابوجہل

گزشتہ صفحات میں میں عرض کر چکا ہوں کہ ایک قوی الدماغ شخص دوسرے کمزور دماغ والے شخص کے خیالات پر کیونکر اثر قائم کر سکتا ہے ڈاکٹر بوس نے جب یہ نظریہ پیش کیا کہ نباتات میں جان ہے اور وہ بھی بیرونی اثرات محسوس کرتے ہیں۔ تو دنیا کو حیرت ہوئی لیکن آج یہ امر پایہ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ پودے گاتے ہیں۔ حال کا نظریہ ایک

نمبر		
		امریکن ڈاکٹر نے پیش کیا ہے کہ پتھر بھی جاندار ہوتے ہیں - چنانچہ "نغمۂ ریگستان" ایک بدیہی حقیقت ہے۔
۱۰	حضرت عمر کا ممبر سے ابو عبیدہ کو جو صدہا میل پر واقع تھے دشمن کے خفیہ حملہ سے متنبہ کرنا	گزشتہ صفحات مین اسکے متعلق مفصل بحث ہو چکی ہے
۱۱	حضرت علی کی کرامت در خیبر۔	روحانی حس و ارادی طاقت کی طرح انسان کی جسمانی طاقت بھی محدود ہے اور مشق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان صدہا من کے وزن بھی اوٹھا سکتا ہے۔ ایک قوی الجثہ شخص اگر مسمریزم کی مشق... رکھتا ہے تو وہ انجن کو روک سکتا ہے۔ آسٹریلیا کے ایک عامل نے انجن کو روک کر دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ عامل معروف انسان کے بیٔے شہوانی تعلقات کو بہت مضر بتاتا ہے۔
۱۲	سعدی نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ شیر پر سوار ہو کر اور ہاتھ مین سانپ کا کوڑا لیکر چلتے تھے، جنھون نے اپنی اس قوت کی توجیہ یون کی تھی۔ تو ہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ	جن لوگون نے سرکس کے تماشے دیکھے ہین وہ اس کی حقیقت سے خوب واقف ہین آج مغرب مین شیر و دیگر درندون کا پالنا ایک عام مشغلہ ہے۔ متعدد عورتین سانپ پالتی ہین مین نے خود ایک شخص کو دیکھا ہے جو ہر وقت اپنی گردن مین سانپ ڈالے رہتا اور لطف یہ کہ اُن کے زہریلے دانت بدستور قائم تھے۔

آزاد

اخبار الاندلس

مطبوعات موصولہ

افادات سلیم

مجموعہ ہے مولوی وحید الدین سلیم (مرحوم) کے چند مقالات کا جسے محمد سردار علی صاحب اڈیٹر تجلی حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ مولوی سلیم نے حیدرآباد میں بہ حیثیت پروفیسر اردو ہونے کے اور اس سے قبل بہ حیثیت ایک کامیاب صحافی و ادیب ہونے کے جو خدمت اردو زبان کی انجام دی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس لئے اب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں، ہمارا فرض یہی ہونا چاہئے کہ ان کے خیالات و افادات ملک کے سامنے پیش کریں۔ بنابران ملک کو محمد سردار علی صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کی ابتدا کردی ہے اور پہلی قسط میں وہ مضامین یکجا کردیئے ہیں جو صحیح معنی میں "خدمت ادب" کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اس مجموعہ میں دس مضامین پائے جاتے ہیں اور سب اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن تلمیحات پر جو افادات سلیم مرحوم نے پیش کئے ہیں یا "ہندوستان کی عام زبان" پر جن خیالات و تدابیر کو ظاہر کیا ہے، وہ ایسے ہیں کہ ہر شخص کے مطالعہ میں آنا چاہیئے۔ قیمت بہ حجم کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد ہے

عرب کی شاعری

یہ بھی مولانا سلیم مرحوم کا ایک مضمون ہے جو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں عرب کے ایام جاہلیت کی شاعری کے ساتھ ساتھ عہد بنی امیہ کی شاعری کو بھی شامل کرلیا ہے اور عمومی تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عربوں کی شاعری، نہ صرف بہ لحاظ شعر بلکہ بہ اعتبار اخلاق و اطوار کیا چیز تھی۔ یہ مضمون شروع سے اخیر تک اسقدر دلچسپ، اسقدر مفید اور پُر از معلومات ہے کہ نہ اس کا مطالعہ دل پر بار ہوتا ہے اور نہ اس کے ختم کرنے کے بعد ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اسنے کوئی فایدہ اس سے نہیں اٹھایا۔ یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۵۶ صفحات کو محیط ہے اور ۴ر میں کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد سے ملسکتا ہے

دیوان تابان

میر عبدالحئی رضوی تاباں، اس دور کے شاعر تھے جسنے دہلی کی شاعری کو حقیقی معنی میں شاعری کی حیثیت سے پیش کیا۔ میر و سودا کے ہمعصر تھے اور انھیں کی طرح ذوق سلیم کے مالک تھے، لیکن وہ دونوں عمر طبعی کو پہونچے اور یہ عنفوان شباب ہی میں چل بسے۔ یہ وہی تاباں ہیں جن کے حسن و جمال کا ذکر مؤلف آبحیات نے اپنی عادت کے مطابق نہایت غیر محتاط طریقہ سے کیا ہے۔ یہ میرزا مظہر جانجاناں کے نہایت محبوب مریدوں میں سے تھے، لیکن میخواری کے اسقدر عادی تھے کہ آخر کار یہی مشغلہ ان کی جوانمرگی کا باعث ہوا۔ استاد حکیت میر حاتم کے شاگرد تھے اور تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی خوش فکری کی تعریف کی ہے۔ یہانتک کہ میر ایسا بد دماغ شخص بھی ان کی رنگین بیانی کا قایل ہے۔

ان کا دیوان کمیاب کیا نایاب تھا، لیکن اب سید بادشاہ حسن صاحب نے حیدر آباد کے متعدد قلمی نسخون کو فراہم کرکے اسے شایع کیا ہے اور شروع مین ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ جذبات کے لحاظ سے تابان کا جو رنگ ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

عجب احوال ہے تابان کا تیرے ۔۔۔ کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

ملک کو جناب سید بادشاہ حسن صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھون نے ایسی بے بہا چیز کو پبلک کے لئے وقف کردیا۔ مین اس کو وقف ہی کہونگا جبکہ اس کی قیمت انھون نے صرف ایک روپیہ رکھی ہے۔ اس کا نسخہ بزم ادب نظام کالج حیدر آباد سے ملسکتا ہے

دلگداز افسانے مولوی سید علی کوثر چاندپوری ملک کے نوجوان لکھنے والون مین سے ہین اور علاوہ فن طب کے جس کے وہ ماہر ہین ادبیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے ہین۔ یہ مجموعہ آپ ہی کے چند افسانون کا ہے جسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ افسانون کی زبان صاف، پلاٹ ناقابل اعتراض اور سیرت نگاری مستحق ستائش ہے۔ شروع مین ایک مقدمہ بھی جناب کوثر نے لکھا ہے جس مین فن فسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کی قیمت عہ کچھ زاید ہے۔

معانی و بیان مولوی محمد رفیع نے جو فاضل دیوبند بھی ہین اور جدید مشرقی امتحانات بھی پاس کرچکے ہین۔ یہ رسالہ مرتب کیا ہے موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ معانی و بیان، بدیع و عروض کے ضروری مسایل صاف و سہل زبان مین بیان کئے جائین اور مثالون سے بھی ان کو سمجھایا جائے۔ اس قسم کی کتابین ہر چند دلچسپ نہین ہوتین، کیونکہ انکا تعلق قواعد سے ہوتا ہے جو عموماً خشک ہوتے ہین، لیکن علمی حیثیت سے انکا مطالعہ ناگزیر بھی ہے۔ اس لئے ہم اس کتاب کو ہر حیثیت سے مفید کہنے پر مجبور ہین۔ یہ رسالہ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ الہ آباد سے عہ مین ملسکتا ہے۔

تذکرۂ ریختی جناب سید تمکین کاظمی حیدرآبادی نے ریختی گو شعرا کا تذکرہ اس نام سے مرتب کیا ہے جس مین ۴۳ شعراء کا حال معہ انتخاب کلام درج کیا گیا ہے۔ ابتدا مین حسب دستور جدید ایک مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے جناب تمکین کی یہ سعی قابل قدر ہے۔ یہ تذکرہ ایک روپیہ مین مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے ملسکتا ہے

مآثر دکن یہ کتاب بلدۂ حیدرآباد و مضافات بلدہ کے آثار پر مولوی سید علی اصغر بلگرامی نے تحریر فرمائی ہے جو اس سے قبل وہان آثار قدیمہ کے ناظم تھے۔ سرزمین دکن جس طرح تاریخی حیثیت سے نوادر کی مالک ہے، اسی طرح آثاری لحاظ سے بھی وہ گنج شایگان کا مرتبہ رکھتی ہے۔ وہان کی تاریخ پر تو خیر متعدد کتابین لکھی گئی ہین، لیکن آثار کے متعلق کوئی ایسی جامع، مستند، مکمل و مصور کتاب شایع نہین ہوئی تھی، جیسے ہمارے فاضل دوست مولوی اصغر بلگرامی نے

شایع کی ہے۔ معلوم نہین اس کا کریڈٹ جناب اصغر کو دیا جائے یا اُس خطۂ پاک بلگرام کو جس سے انھین نسبت حاصل ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین مین قابل مولف نے جس تحقیق و تفتیش، جس کاوش وسعی سے کام لیا ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ ایک "ناظم آثار قدیمہ" ہی کی طرف سے ظاہر ہوسکتی تھی اور وہی شخص اس کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب دے سکتا تھا، جو جناب اصغر کا سا صاف سلجھا ہوا دماغ اور صحیح مورخانہ ذوق رکھتا ہو۔ اس کتاب مین ۵۷ تصاویر بھی شامل ہین جنھون نے اس کی اہمیت و افادیت کو بہت زیادہ وزنی بنا دیا ہے۔ وہ حضرات جو تاریخ دکن سے دلچسپی رکھتے ہین، یا جو دکن کی سیاحت کرنا چاہتے ہین ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ تاریخی کتابون کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ضروری ہے، جتنا آج کل موسم گرما مین طعام لذیذ کے ساتھ آب خنک۔ اس کی قیمت چار روپیہ ہے اور مہتمم مکتبۂ یوسفیہ چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے ملسکتی ہے۔

اس کتاب کا ایک انگریزی اڈیشن بھی "Land marks of the Deccan" کے نام سے آپ نے شایع کیا ہے اور اس کی قیمت پانچ روپیہ ہے۔

معاشیات

مولوی حبیب الرحمان صاحب ام اے۔ ال ال بی، مددگار پروفیسر معاشیات کلیہ جامعۂ عثمانیہ نے فن معاشیات (Economics) پر یہ قابل قدر کتاب اُردو زبان مین تحریر فرمائی ہے۔ یہ فن نہایت ہی خشک فن سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے مفید و کارآمد ہونے سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔

ہر چند اس فن پر اُردو مین یہ کوئی نئی کتاب نہین ہے، لیکن اختصار و جامعیت کے لحاظ سے یہ تالیف غالبًا بالکل پہلی چیز ہے۔

معاشیات کے جتنے اہم مباحث ہوسکتے ہین وہ سب بلا استثنا، مبادیانہ و غیر مبادیانہ حیثیت سے اس مین پائے جاتے ہین اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ ہر شخص ادنیٰ غور و تامل کے بعد ان کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور (ستہ) مین مولف سے ملسکتی ہے۔

تاریخ الامت حصۂ ہفتم

مولانا اسلم جیراجپوری نے تاریخ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، یہ جلد اس کا ساتوان حصہ ہے جس مین ترکی سلاطین کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ جو اسلوب بیان، انداز جمع و التقاط اس سے قبل کے حصون مین پایا جاتا ہے، اس مین بھی قایم رکھا گیا ہے اور ۱۲۰ صفحات مین سرسری طور پر وہ سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے جو قیام سلطنت ترکی سے لیکر اس کے زوال و انحلال تک بیان کیا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب ایک روپیہ مین جامعۂ ملیہ دہلی سے ملسکتی ہے۔

فارسی بلگرام

مولوی سید علی اصغر بلگرامی مددگار معتمد عدالت و کوتوالی نے حیدرآباد کے شعبۂ جامعۂ معارف مین ایک لکچر فارسی زبان مین دیا تھا، جس کا موضوع قصبۂ بلگرام کے اکابر و فضلا کے علمی کارنامون پر روشنی ڈالنا تھا

اس مقالہ مین تقریباً ۳۲ اکابر بلگرام کے علمی وادبی کارنامون پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ایسے منتخب و پاکیزہ الفاظ مین جو ایک بلگرامی ہی کو میسر آسکتے تھے۔ اس کی قیمت ۶ر ہے اور فاضل مولف سے ملسکتا ہے

گلشن گفتار اردو شاعرون کے تذکرہ مین نکات الشعراء اور تذکرہ فتح علی گرویزی بہت قدیم تذکرے سمجھے جاتے ہین اور علاوہ ان کے اُس عہد کا کوئی اور تذکرہ دستیاب نہ ہوا تھا، لیکن اب ایک اور تذکرہ اُسی عہد کا لکھا ہوا ملا ہے جس کا نام گلشن گفتار ہے اور جو ۱۱۶۵ھ مین ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا مولف خواجہ خان حمید اورنگ آبادی تھا جو عارف الدین خان عاجز کا شاگرد تھا۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان مین ہے اور علاوہ قدیم دکنی شعراء کے شمالی ہند کے معاصر شعراء کا بھی ذکر اس مین کیا گیا ہے

جناب مولوی سید محمد صاحب ایم۔اے نے اس کو مرتب کیا ہے اور ان کی تحقیقات مین یہ شعراء اُردو کا اولین تذکرہ ہے۔ فاضل مرتب نے ساتھ ہی ساتھ ہر شاعر کے حالات کے ساتھ دوسرے قدیم تذکرون کے بیانات بھی شائع کردیئے ہین جس سے یہ کتاب اور زیادہ مفید و دلچسپ ہوگئی ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے مل سکتا ہے۔

ہمارے رسول اس مختصر رسالہ مین نبی آخرالزمان کے حالات اور ان کی سیرت پر مبتدیانہ تبصرہ کیا گیا ہے تاکہ معمولی پڑھے لکھے اور بچے آسانی کے ساتھ سمجھ سکین۔ عبارت بہت سادہ و سلیس ہے اور طباعت و کتابت پسندیدہ۔ صحت روایات کا بھی کافی لحاظ کیا گیا ہے۔ قیمت ۶ر۔ ملنے کا پتہ۔ جامعہ ملیہ دہلی۔

دیوان مجذوب حیدرآباد کے ایک صاحب حکیم میرنادرعلی صاحب رعد ہین، جن کے کتب خانہ سے ایک دیوان فارسی "دیوان مجذوب" کے نام سے ۱۰۶۲ھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا تھا اور اب اس کو بعد طباعت شائع کیا گیا ہے۔ میرے پاس جو حصہ دیوان کا ریویو کے لئے آیا ہے وہ ردیف دال کا ہے۔ اس سے قبل کے حصے مین نے نہین دیکھے اور نہ یہ معلوم ہے کہ مجذوب کے متعلق کیا معلومات پہلے حصہ مین درج کی گئی ہین۔ مجذوب تبریز کے رہنے والے تھے اور میر نادرعلی صاحب رعد کا خیال ہے کہ خواجہ حافظ شیرازی کے رنگ مین یہ شعر کہتے تھے۔ مین نے ردیف دال کی غزلون کو جستہ جستہ دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجذوب نے یقیناً حافظ کا تتبع کیا ہے اور کافی کیفیت و رنگینی کے ساتھ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہین کہ

نسبت شعر من و حافظ بگویم باتو چیست هست انگشتے کہ کار سجۂ صد دانہ کرد

لیکن میری سمجھ مین نہین آیا کہ اس سے مقصود ان کا کیا ہے۔

تذکرہ نویس چونکہ مجذوب کے حالات سے ساکت ہین، اس لئے نہین کہا جاسکتا کہ حزین سے کتنے زمانہ قبل پائے جاتے تھے اور کن حالات مین کہان زندگی بسر کی — بہرحال چونکہ یہ دیوان نایاب تھا اس لئے ملک کو

ممنون ہونا چاہئے جناب رعد کا کہ انھون نے اس کو شایع کرکے ملک عام کردیا۔ اس کے ابتدائی اجزا اگر موصول ہوئے تو مکرر زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھ سکونگا۔ اس باب مین جو صاحب خط و کتابت کرنا چاہین حکیم صاحب موصوف سے واڑی جنکشن کے پتہ پر کرسکتے ہین۔

جواہر اللغات ایک جیبی لغت ہے فارسی سے اردو کا جسے منشی بشمبھر دیال صاحب نے اس نام سے مرتب کیا ہے۔ اس لغت کی تقطیع تقریباً وہی ہے جو انگریزی مین "Pocket" ڈکشنری کی ہے اور حجم ۵۰۷ صفحات کا ہے۔ ہر صفحہ مین کم و بیش ۴۰ الفاظ درج ہین اس لئے یہ لغت تقریباً ۲۰ ہزار الفاظ کا ہے جس مین قدیم و جدید دونون الفاظ شامل ہین۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لغات مین تحقیق کا کوئی سوال نہین ہوتا بلکہ صرف اختصار کا ہوتا ہے اس لئے غلطیون کا امکان ضرور ہے۔ لیکن اس کے مفید و کارآمد ہونے سے انکار نہین ہو سکتا۔ جو حضرات فارسی زبان کا مختصر مگر جامع لغت رکھنا چاہتے ہین ان کے لئے اس کی خریداری ضروری ہے خصوصیت کے ساتھ طلبہ کہ ان کو اس سے استفادہ کرنے مین بڑی سہولت ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب ۱۲؍ مین رام نراین لال کتب فروش الہ آباد سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

زنگاری بیگم لیڈی از ٹیور فرانسیسی زبان کا مزاحیہ ڈراما ہے جسے ڈاکٹر اس۔ اس نہرو پی اچ ڈی نے انگریزی زبان مین منتقل کیا تھا اور انگریزی سے اردو مین ہمارے فاضل شاعر جناب اثر لکھنوی نے زنگاری بیگم کے نام سے نظم مین منتقل کیا ہے۔

جناب اثر ایسے کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہین کہ جس حد تک نظم کرنے کا تعلق ہے ان کی اس سعی کے متعلق کسی کو گفتگو کی گنجایش ہو ہی نہین سکتی، لیکن مجھے حیرت اسپر ہے کہ باوجود اپنے عدالتی مشاغل کی کثرت کے کیونکر انھون نے اتنا وقت نکال لیا۔ یہ ڈراما مجلد شایع ہوا ہے اور ۱۲؍ مین سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے ملسکتا ہے۔

نقش و نگار جناب جلیل احمد قدوائی کی نظمون اور غزلون کا مجموعہ ہے جو ایک روپیہ مین مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ سے ملسکتا ہے۔ جناب جلیل غزل مین حسرت موہانی کا تتبع کرتے ہین اور نظمون مین اپنی غزل سرائی کا اس لئے غزلین اور نظمین دونون خوب کہتے ہیں۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

(بلقیس رعنا۔ ۱۰۔ پھول گلی۔ بمبئی)

نیاز بے نیاز

"مسٹر" لکھنا آپ کی توہین ہے اور مولانا کہنا آپ کی چڑ ہے اس لئے صرف نیاز پر اکتفا مناسب تھا......

...... مگر بے نیاز کے اضافہ سے تھوڑی سی شاعری بھی صرف کر دی گئی معلوم نہیں آپ اس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔

میں عرصہ سے ان تمام انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہوں جو تدریجاً آپ کے ذہن و دماغ میں پیدا ہوتے جاتے ہیں اور نہیں کہہ سکتی کہ ان کا سلسلہ کب اور کس طرح ختم ہوگا۔ لیکن اگر میں قیاس سے کام لوں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت جلد خدا اور خدا کی آخری الہامی کتاب سے بھی انکار کرنے والے نظر آتے ہیں جس کا ثبوت ماہ جون کے استفسار کے جواب میں بہ آسانی مل سکتا ہے۔

میں آپ کی آزادانہ تنقید کو یقیناً پسند کرتی ہوں، لیکن مجھے ابھی تک اس جذبہ کی حقیقت کا علم نہیں ہوا جو محض باعث آپ کے موجودہ مذہبی لٹریچر کا ہے۔ کیا آپ اس پر کوئی روشنی ڈالکر مجھے "ظن و گمان" کی معصیت سے بچا لیں گے؟

بہرحال، میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتی کہ اگر آپ کے تمام مقالات حقیقتاً خلوص نیت پر مبنی ہیں تو میں خدا سے انکار کرنے کی حد تک بھی آپ کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہوں، اور اگر آپ کسی مصلحت سے فی الحال اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتے جو چند ماہ یا چند سال بعد آپ پیش کرنے والے ہیں تو میں آپکو مشورہ دونگی کہ اس پردہ مصلحت کو فوراً چاک کر دیجئے اور جو اصل مقصود ہے اسے ابھی ظاہر کر دیجئے، کیونکہ میں آپ میں اخلاق کی اتنی کمزوری بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی

(نگار) آپ نے اپنے تو خیر مسٹر اور مولانا کا قصہ پیدا کرکے بے نیازانہ انداز میں کچھ شاعری سے کام لے بھی لیا، لیکن میں کیا کروں جبکہ مجھے یہی علم نہیں کہ آپ مِسَن ہیں یا مِسز، ماسٹر ہیں یا مِسٹر۔

بقول اکبر الہ آبادی یقیناً نہ میں مسٹر ہوں نہ مولانا اور اس لئے میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اس نیازمند کو...... صرف نیاز کے لفظ سے یاد کرتیں لیکن آپ نے بے نیاز کے اضافہ سے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس کو عطیہ جان کر قبول کر لوں، یا طعن سمجھکر اس کے واپس لینے کی استدعا آپ کے حضور میں پیش کروں۔ میں اس وقت شاعری سے کام نہیں لے رہا، اس لئے یہ

"ردوقبول" کا قصہ بھی پیش آیا، ورنہ "تسمیہ وخطاب" کے متعلق ایک عربی شاعر مجدالدین طوسی عجیب وغریب دلنشین نکتہ بتا گیا ہے کہ۔

احبّ اذا نودیت باسمی واننی — اذا قیل لی "یا عبدہا" لسمیع

لا تدعنی الا "بیا عبدہا" — فانہ اشرف اسمائی [۵]

چہ جائیکہ آپ خود کوئی نام تجویز کریں اور میں اسے گردن جھکا کر قبول نہ کر لوں "نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ" میری طرف سے "پسندیدگی وعدم پسندیدگی" کی خلش میں آپ کے دشمن مبتلا ہوں۔ جب تک "خونِ دو عالم" اپنی گردن پر لینے لے دنیا میں موجود ہیں آپ کیوں اپنی "عشق" کی ناکامی کے خیال سے فکرمند ہوں۔

جلوہ بر خود کن و مارا بہ نگاہے دریاب

۲۔ "آپ عرصہ سے میرے ذہنی انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہیں"! اس سے زیادہ خوش بختی میری اور کیا ہو سکتی ہے "خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردہ" لیکن معاف فرمائے اگر میں عرض کروں کہ آپ نے میرے "انقلابات ذہنی" کے انجام پر صحیح رائے زنی نہیں فرمائی اور آپ بھی وہی کہنے لگیں جو دنیا کہہ رہی ہے۔

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

اگر آپ باور کریں تو کہوں کہ میں دنیا میں ہر چیز سے انکار کر سکتا ہوں، یہاں تک کہ آفتاب کے طلوع وغروب کا بھی انکار کر سکتا ہوں جو کائنات کا روشن ترین مشاہدہ ہے، لیکن خدا کا انکار مجھ سے ممکن نہیں، کیونکہ اس کی عظمت وجلال اس کی وسعت وپہنائی، اسکی ابدیت ولا نہایت کا علم مجھے نہایت عمیق مطالعہ کے بعد حاصل ہوا ہے اور میں اسکو اسدرجہ عزیز رکھتا ہوں کہ شاید ہی اپنی جان کو بھی کافی معاوضہ اس "لطف واکرام" کا قرار دوں جو "فطرت صحیحہ" نے اس اعتقاد راسخ کی صورت میں مجھے ارزانی فرمایا ہے۔ حیرت ہے مجھے لوگوں کی بے بصری اور کوتاہ فکری پر کہ وہ 'خدا' کو خدا کہتے ہیں اور پھر بھی "سطحیات مذہب" پر جان دیتے ہیں۔

خدا نام ہے "خالق کل" کا لیکن مذہب والوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر ٹکڑے کا نام علیحدہ علیحدہ 'خدا' رکھ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خدا نام ہے "محبت" کا اور "محبت" ہی سے کائنات کو معمور ہونا چاہئے کہ یہی ہے اصل مفہوم خدا کے "محیط" ہونے کا، اگر مسجد ومندر کی پوجا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدا ایک آتشیں حربہ والا دیوتا ہے جس کے منہ سے چنگاریاں اور ہاتھوں سے شعلے نکل نکل کر سوائے ایک مخصوص طبقہ کے دنیا کو خاک سیاہ کر رہے ہیں۔ بہرحال خدا کا جو مفہوم میں نے قرار دیا ہے وہ صرف اس صورت سے پورا ہونا ہے کہ ایک مذہب کا مفہوم صرف اخوت عامہ قرار دیا جائے

---

۵ جب وقت لوگ میرا نام لیکر پکارتے ہیں تو میں بہرا ہو جاتا ہوں اور جب "اے فلاں کے غلام" کہکر پکارتے ہیں تو میں سن لیتا ہوں۔ اسلئے اے لوگو مجھے تو تم "اس کا غلام" ہی کہکر پکارا کرو کہ میرا یہی نام سب سے زیادہ بہتر ہے۔ —

اور کلام مجید کے مطالعہ سے مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس نے اسی مقصد کی تعلیم دی ہے اور اسلام کا صحیح درس یہی ہے۔

مین نہین سمجھ سکتا کہ کن اسباب کی بنا پر آپ کو میری نیت کے خلوص کی طرف سے ریب و شک پیدا ہوا، کیونکہ وہ شخص جو تمام افراد نوعِ انسانی کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، اس کے حق مین تو غرض و مصلحت کے سوال کی کوئی گنجائش ہی نہین رہ جاتی۔ ہان، البتہ اگر آپ کو میرے مقصود کی طرف سے کوئی شبہ پیدا ہوتا ہو، تو بیشک آپ کا یہ فرمانا ایک حد تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

۳- مین گزشتہ ماہ کے استفسار کا جواب دینے کے بعد سمجھتا تھا کہ بعض حضرات اُس سے وہی نتیجہ نکالین گے جو آپ نے فرمایا، لیکن مین اس کا جواب دینے پر مجبور نہین ہون، جب تک اس مسئلہ مین منھ کھول کر کوئی بات نہ کیجائے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کے اسرائیلی قصص کو "واقعات تاریخی" کی حیثیت سے ثابت کرنے کا مدعی ہے تو اس کو چاہئے کہ پہلے ان باتون کا جواب دے، جنھین مین نے بائبل کے سلسلہ مین ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد مین ظاہر کرونگا کہ قرآن مجید مین ان قصص کو کس انداز سے اور کس مقصود کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

۴- آپ نے اخیر مین یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مین یہ سب کچھ خلوص نیت کے ساتھ کہتا ہون تو آپ منکر خدا کی حیثیت سے بھی میرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہین۔ اس کے متعلق سوائے اسکے کیا عرض کرون کہ مین تو اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کہتا ہون وہ خلوص نیت ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آپ میرا ساتھ نہ دین تو یہ میری بدقسمتی ہے۔ لیکن اگر آپکی معیت کی تنہا شرط خدا کا انکار ہے، تو آئیے یہ بھی کر دیکھین۔

من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

※

اُردو جواہر پارے

خاکِ پروانہ منشی پریم چند کے لاجواب فسانون کا مجموعہ قیمت (عہ/)

نوائے اسیر طالع محمد صاحب کی ایک دلفریب نظم قیمت (۲/)

نقشِ زرنگ محمد جلیل الدین صاحب اکبر کی غزلیات کا بہترین مجموعہ قیمت (عہ/)

طرزِ زندگی - جناب نسیم صاحب نونوی اڈیٹر انکشاف کی خانگی معاملات پر ایک بہترین کتاب ہے جو افسانے کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ قیمت (عہ/)

ادبی خطوطِ غالب جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے کی لاجواب تصنیف غالب کے خطوط اس سے بہتر شکل مین اب تک نہین شائع ہوئے۔ اس کتاب کی تمام خوبیان ملاحظہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہین۔ قیمت (عہ/)

منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

باب الاستفسار

زحمت و تکلیف کا محل استعمال

(جناب عاصی - ناگپور)

"سارا ہندوستان جس مقام پر لفظ تکلیف استعمال کرتا ہے وہاں اہل لکھنؤ کی جدت طرازی نے لفظ زحمت کو اختیار کر لیا ہے۔ صرف اہل لکھنؤ ہی اگر اسے استعمال کیے جاتے تو چنداں مضائقہ کی بات نہ تھی کیونکہ انکی دنیا ہی گومتی کے کنارے پر الگ آباد ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس اختراع کو لکھنؤ کے غیر لکھنوی شعراء بھی قبول کر چکے ہیں۔ اور کبھی کبھی آپ خود بھی اسکے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اسلئے ہمیں بغرض تحقیق آپ کے باب الاستفسار کھٹکھٹانا پڑا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے اسکی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ لفظ تکلیف اور زحمت اگرچہ دونوں قریب المعنے ہیں لیکن ابتک استعمال میں فرق رہا ہے۔ لفظ تکلیف تکلف کے معنے میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ یعنے تکلیف اختیاری اور غیر اختیاری دونوں جگہ اسکا استعمال تھا۔ لیکن لفظ زحمت کا استعمال ہمیشہ مجبوری اور پریشانی ہی کے لئے تھا۔ مثلاً زحمت سفر۔ زحمت مرض۔

"رحمت بہ یک نقطہ زحمت شود"

اب جو یہ لفظ ذرا سی تکلف کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ہے تو میرے خیال کے مطابق اس لفظ کی خصوصیت جاتی رہی۔ اور اگر کسی شخص کو تکلیف کا مرتبہ بڑا کرنا نے کی ضرورت ہو تو وہ کسی لفظ موزوں میں نہیں بتا سکتا اسطرح وسعت لسانی بھی زحمت میں پڑ گئی۔

لکھنؤ کے ایک غیر لکھنوی شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

شعر:- آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ۔۔۔ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

مجھے اس کے متعلق یہ کہنا ہے کہ زحمت بھی اور ذرا کچھ سمجھ میں آنیوالی بات نہیں۔ بولتے تو یوں ہیں کہ ذرا تکلیف کیجیے یا بڑی زحمت ہوئی۔ "اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی"

یہ کیا بات ہوئی۔ اس لئے التماس ہے کہ از راہ عنایت تھوڑی سی تکلیف فرما کر یا بڑی زحمت گوارا کر کے آپ ان دونوں الفاظ پر روشنی ڈالئے۔ اور بتایئے کہ ان دونوں الفاظ میں نسبت تطابق ہے یا تباین۔ عام خاص من وجہ

یا عام خاص مطلق۔ اور جس تعمیم کے ساتھ تکلیف کے تکلف کو اٹھا کر اہل لکھنؤ زحمت آرائی فرما رہے ہیں اسکے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

(نگار) مجھے اس کا علم نہیں کہ اہل لکھنؤ لفظ تکلیف زیادہ استعمال کرتے ہیں یا لفظ زحمت، لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ میں ہمیشہ زحمت ہی استعمال کرتا ہوں اور جس محل پر اردو میں لفظ تکلیف بولا جاتا ہے، اسے غلط سمجھتا ہوں۔

یہ دونوں لفظ عربی کے ہیں، اس لئے اصولاً سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس زبان میں انکا محل استعمال کیا ہے عربی میں زحمت، زحام، اور ازدحام سب کے معنے انبوہ یا بھیڑ کے ہوتے ہیں۔ اور تکلیف کہتے ہیں کسی ایسے کام کا حکم دینے کو جس کا انجام دینا بہت شاق ہو۔ یہان تک کہ ٹیکس عائد کرنے کے لئے بھی وہان لفظ تکلیف ہی استعمال ہوتا ہے۔ تکلف کہتے ہیں کسی محنت شاقہ کے برداشت کرنے کو۔

اس لئے یہ بات ظاہر ہے کہ زحمت اور تکلیف دونوں لفظ اردو میں اپنے حقیقی معنے سے ہٹ کر استعمال ہوتے ہیں فارسی میں لفظ تکلیف تقریباً اپنے حقیقی معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ سوائے اسکے کہ وہ لوگ صرف حکم کرنے کے مفہوم میں بھی بولتے اور لکھتے ہیں مرزا صائب لکھتا ہے:-

تکلیف توبہ ہر کہ در ایام گل کند ٭ خونش بخاک ریز کہ از اہل بدعت ست

درویش والہ ہروی کا شعر ہے:-

شد ارکہ مقتضائے پیری ٭ تکلیف کند بہ گوشہ گیری

دونوں جگہ تکلیف بہ معنی امر کردن (حکم دینا) استعمال ہوا ہے۔

فارسی میں لفظ زحمت کا استعمال البتہ مجازی صورت سے بہ معنی رنج و مشقت آتا ہے۔

نظیری لکھتا ہے:-

حسن تو زیور تو بس ست این قدر چرا ٭ بر گردنش سینہ زحمت زیور نہادہ

اردو میں ان دونوں لفظوں کا استعمال فارسی سے آیا ہے، اس لئے یہ ظاہر ہے کہ جس موقعہ پر اردو میں لفظ تکلیف استعمال ہوتا ہے، وہ فارسی کے بالکل مخالف ہے، البتہ زحمت کا استعمال فارسی کے مطابق ہوتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے بجائے تکلیف کے لفظ تکلف استعمال ہوتا ہوگا۔ (جو بالکل صحیح ہے)، لیکن بعد کو غلطی سے ان دونوں کو ہم معنے سمجھ کر تکلیف کا استعمال بجائے تکلف کے ہونے لگا۔

اس لئے اگر گفتگو ہو سکتی ہے تو تکلف و زحمت کے درمیان نہ کہ تکلیف و زحمت کے باب میں۔ کیونکہ تکلیف بالکل غلط معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ تکلّف اور زحمت مین محنت شاقہ کس لفظ سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے تو لغوی تحقیق اس کی مؤید ہے کہ تکلّف زیادہ محنت کو ظاہر کرتا ہے اور زحمت مین نسبتًا اس کی کمی ہے۔ کیونکہ تکلّف تکلیف کا نتیجہ ہے جس کے معنے ہین "ناقابل برداشت کام کا حکم دینا" اور زحمت مجازی معنی مین صرف اس قسم کی ہلکی اُلجھن یا کشاکش کو ظاہر کرتا ہے جو ایک بھیڑ یا ہجوم مین ہوا کرتی ہے۔

آپ نے جو شعر درج فرمایا ہے، اس مین کوئی معنوی خرابی نہین پائی جاتی۔ لفظ زحمت یون بھی ادنےٰ قسم کی محنت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے اک ذرا کا اضافہ کرنے سے اس مین اور تخفیف پیدا ہوگئی۔ اور یہی مدعا شاعر کا ہے۔ "اک ذرا" لکھنؤ کا خاص محاورہ ہے اور بجائے لفظ تکلیف کے زحمت کا لفظ استعمال کرنے مین یہ لوگ بالکل حق بجانب ہین۔ اور محض اس لئے کہ وہ گومتی کے کنارے رہتے ہین۔ (جو آپ کے نزدیک شاید کوئی بڑی معیوب بات ہے) ان کے "صحیح" کو "سقیم" نہین کہہ سکتے۔

اور اگر لفظ تکلیف "متعدی معنے کے ساتھ ہی اُردو مین استعمال کیا جائے اور کھینچ تان کر اس کا مفہوم محنت مشقت کا پیدا کیا جائے، تو بھی ظاہر ہے کہ بہ نسبت زحمت کے اس مین پریشانی و مجبوری کا مفہوم زیادہ قوی پایا جاتا ہے جو آپکے دعوے کے بالکل خلاف ہے۔

جنوری سنہ ۳۱ء کے رسالہ کے متعلق ایک تجویز

گزشتہ تین سال سے نگار کا جنوری نمبر تقریبًا دوچند ضخامت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے سنہ ۲۸ء کا پہلا پرچہ مومن کیلئے مخصوص تھا۔ سنہ ۲۹ء کے جنوری نمبر مین سنہ ۲۲ء کی جلد کا اقتباس تھا۔ اور سنہ ۳۰ء کا جنوری نمبر ظفر کے لئے وقف کیا گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ سنہ ۳۱ء کا جنوری نمبر کیا ہو؟ پہلے مین نے یہ خیال کیا تھا کہ اسکو مصحفی کیلئے مخصوص کردیا جائے۔ لیکن اب یہ خیال مضمحل ہوگیا ہے اسلئے کہ اول تو مصحفی پر ایک طویل مضمون نگار مین نکل چکا ہے، دوسرے یہ کہ مجھے اسکا یقین نہین کہ لکھنے والے اسطرف توجہ کرینگے اور تیسرے یہ کہ ناظرین نگار، شاعری کے قصہ کو زیادہ پسند بھی نہین کرتے۔ پھر اب کیا ہونا چاہئیے؟ میری دو تجویزین ہین۔ ایک یہ کہ جنوری سنہ ۳۱ء کا پورا پرچہ میرے ہی مضامین سے پُر ہو اور دوسرے یہ کہ اسوقت تک کے باب الاستفسار کو تین حصہ کرکے ایک حصہ جنوری سنہ ۳۱ء مین شائع کردیا جائے گویا اسطرح تین سال کے اندر استفسارات کا پورا مجموعہ لوگون کے پاس پہونچ جائیگا۔ ہرچند اس مین میرا تجارتی خسارہ کھُلا ہوا ہے لیکن مین اس خسارہ کو برداشت کرونگا۔ کیونکہ اسطرح مین آسانی سے اور جلد، پبلک کی ایک بڑی خواہش کو پورا کرسکون گا۔

بہرحال مین آپ حضرات سے رائے طلب کرتا ہون کہ ان مین سے کس تجویز پر عمل کیا جائے۔

نیاز

عجب انداز سے بڑہنا۔ عجب انداز سے چڑہنا　که دل محو تماشائے خرام مہر تابان ہے
کوئی شاعر نگار آتشین رُخ۔ اُسکو کہتا ہے　کوئی دار فتۂ رفتار۔ یون وقف ترنم ہے

پریشان کاکل و آغوش و امستانه می آئی
فدایت جان و دل بادا۔ چہ بے باکانه می آئی

شوق۔ مرادآبادی

محبت کا پہلا گیت

کسی کی اُلفت مین کھو گیا ہون کسیکو اپنا بنا رہا ہون　کسی خیالی مجسمہ کا حسین نقشہ جما رہا ہون
فنا کے نغمے سُنا رہا ہون، فنا کی تانین اُڑا رہا ہون　مین اپنی ہستی مٹا مٹا کر دوئی کا پردا اُٹھا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

کبھی ہے ذرہ نظر مین دنیا کبھی ہے دنیا نظر مین ذرہ　کبھی ہے بیگانہ تجھ سے دنیا، کبھی مین پاتا ہون تجھکو ہر جا
کبھی محبت سے تیری نفرت کبھی اداؤن کا تیری شیدا　غرض یون ہی مین بقا کی کشتی عدم کی جانب بڑھا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

غم والم پر ہے میرا تکیہ، مصیبتون سے ہے مجھکو راحت　کبھی مین راحت سے بھاگتا ہون، کبھی ہون مجبور فکر عشرت
فضا کا رہتا ہون منتظر مین بقا سے ہوتی ہے مجھکو وحشت　زمین کے نیچے نظر سے پنہان مین اپنا مسکن بنا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

کسی کے گلگون لبون کا شیدا کسیکی ترچھی نظر کا بسمل　کسی غزالہ کا قتل کردہ کسی کی قاتل ادا پہ مائل
کسی کی صورت نظر مین رقصان کسیکے جلوہ کا دل سے حاصل　کسیکی جادو بھری نظر سے مین اپنی نظرین لڑا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

مری صداؤن مین ہے ترنم ہر اک تنفس ہے میرا نغمہ　ہر اک رگِ جان رباب سامان ہر ایک جنبش سے درد پیدا
سراسر اک دل ہے میری ہستی مجسم اک حادثہ ہون گویا　مین رشتۂ سوز و ساز بن کر خدا سے سبکو ملا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

سلطان محمود ساز اجمیری

مارچ کی ایک دوپہر

ابر سے عریان ہے اب یہ مرغزار نیلگون
ہر طرف گاتی ہے مستی مین بہار نیلگون
نغمۂ رنگین سے میرا سازِ دل معمور ہے
جسطرف اُٹھتی ہین آنکھین اک جہانِ نور ہے
یعنی سنتا ہون ترنم ہائے مہر نیم روز
ہر شعاع نغمہ ہے مجھکو بہار دل فروز

⁂

شور آبادی سے دور اک گوشۂ گلزار مین
آکے بیٹھا ہون سکوتِ سایۂ اشجار مین
مہر عالمتاب اوڑھے اک ردائے زرفشان
دیکھتا ہے بام گردون سے تماشائے جہان
نیند مین ہین پتیان گل سطرح ہین محو خواب
رات بھر جیسے سُنی ہو داستانِ ماہتاب
گاکے رکھدیتا ہے مطرب ہاتھ سے جسدم ستار
دیر تک ہلتا ہے جوش نغمہ سے اک ایک تار
کانپتی ہے جوش بیتابی سے یون ہی کل فضا
جسم پر پہنے ہوئے زرین شعاعون کی قبا

⁂

اوڑھ کر ہلکی ردائین اُڑ رہی ہین تتلیان،
ہو فضائے گُل مین رقصان جیسے رنگین بجلیان
یا ہواؤنمین اُڑائے اپنے گلگون بادبان،
تیرتی ہین نور کے دریا مین ننھی کشتیان،
دیکھ کر تجھکو چمن مین اے بہار رنگ و بُو،
میرے دل مین کوندتا ہے اک شرار رنگ و بُو،
یاد آتی ہے مجھے وہ عہد طفلی کی بہار،
دیکھ کر جب تجھ کو اے رقاصۂ نیرنگ کار،
تیرے پیچھے دوڑتا تھا دشت مین گلزار مین،
چوٹیون پر کوہ کی اور دامن کہسار مین

⁂

اک بہارِ حسن اس وحشت مین بھی رقصندہ ہے
لیکن اپنے نغمۂ خاموش مین تابندہ ہے
جس طرح دست صبا مین جامِ صہبائے شمیم
یا حریم بزم گل مین حسُنِ رخسار نسیم،
اپنے ہر پیراہنِ اظہار مین مستور ہے،
تو نمود خواب سے اے خواب کتنی دور ہے

شمیمی

⁂

نگار

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۲ء

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد (۱۸) اگست ۱۹۳۶ء شمار (۲)

ملاحظات

میں نے گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں بہ سلسلۂ تنقید رسالہ "قیام الدین" وعدہ کیا تھا کہ اس مہینہ کے رسالہ میں جناب عبدالماجد صاحب دریابادی سے خطاب کرکے بتاؤں گا کہ "یاجوجی" قوت جو آج کل جہات ستہ میں انھیں ہر جگہ نظر آرہی ہے۔ اور جس کا ذکر بار بار اُن کی زبان پہ آجاتا ہے وہ فی الاصل کہاں پائی جاتی ہے اور اُسکی حقیقت کیا ہے۔

حال ہی میں جب الناظر پریس سے ضمانت طلب ہوئی اور اخبار سچ کو بند کرتے ہوئے اُس کے فاضل مرتب و محرر نے اس کا اعلان کیا تو اس کے عنوان میں بھی یاجوجی قوت کا ذکر تھا، اس لئے یہ انکشاف میرے لئے بالکل جدید تھا کہ جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کی مراد یاجوجی قوت سے صرف وہی قوت نہیں ہے جو اُنکے مزعومات مذہب و ایمان کے خلاف تنقید کرے بلکہ اس میں حکومت وقت بھی شامل ہے جو آزادی ملک و وطن کے جذبات کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ کل کوئی اور واقعہ جناب دریابادی کے خلاف مزاج ظاہر ہو اور وہ اُس کو بھی "ایں ہم بچۂ شتر ست" کہکر یاجوجی قوت سے نامزد کریں۔ اس لئے بغیر اس کے کہ میں اس لفظ کی اُس تمام وسعت و عمق سے بحث کروں جو صرف جناب دریابادی کے ذہن و دماغ میں پائی جاتی ہے، صرف اس پہلو سے بحث کرنا چاہتا ہوں، جس کا تعلق (ان کے پندار میں) دہریت و لامذہبیت سے ہے۔

اصولاً سب سے پہلے یہ متعین کرلینا چاہئیے کہ "دہریت و لامذہبیت" کس کیفیت کا نام ہے۔ ہر چند یہ تعین ہمارا فرض نہیں ہے بلکہ اُن کا فرض ہے جو یہ الزام قائم کررہے ہیں، تاہم بحث کو بغیر کسی استفسار و مزید انتظار کے شروع کردینے کے لئے ضرور ہے کہ

ہمیں اس کا مفہوم بھی متعین کر دیں ـــــ اگر جناب عبدالماجد صاحب کی مراد اس سے تمام وہ آبادی دنیا کی ہے جو مسلمان کے لقب سے یاد نہیں کیجا سکتی (کیونکہ وہ ایک مخصوص طریق عبادت کی پابند نہیں ہے۔ شریعت اسلام پر عامل نہیں ہے) یعنی اگر "دہریت و لامذہبیت" سے اُن کا مقصود صرف "لا اسلامیت و غیر مسلمیت" ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے، کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بہت پُرانی چیز ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ وہ "عہد رسالت" میں اب سے کہیں زیادہ پائی جاتی تھی، کیونکہ مسلمانوں کی تعداد اُسوقت بہت کم تھی۔ اور اب اس سے بدرجہا زائد ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد اُن کی دنیا کا وہ موجودہ میلان ہے جس نے نہ صرف مذہب اسلام بلکہ تمام مذاہب کی طرف سے انسان کو بے پروا و مستغنی بنا دیا ہے، تو یہ درد ایسا معمولی نہیں ہے کہ اس کا علاج اس کو صرف "یاجوجی قوت" کہہ کر بُرا کہدینے، یا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کوسنے و ینے سے ہو سکے۔ سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئیے کہ ارتقاء مذاہب کا فلسفہ کیا ہے۔ ترقی تہذیب و تمدن کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے، عہد حاضر کی ذہنیت کا ساتھ دینے کے لئے مذہب کس حد تک تیار ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ اگر مذہب کی ضرورت اب بھی باقی ہے تو کیوں؟

میں عبدالماجد صاحب دریابادی کو نہایت ہی راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتا ہوں، لیکن اسی قدر جہاں تک "اشدّاء علی الکفار" کا تعلق ہے۔ ممکن ہے "رحماء بینھم" کا بھی کوئی قابل ذکر واقعہ ان کی مذہبی، سیاسی اور انسانی زندگی میں پایا جاتا ہو، لیکن کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اُن کی حیات کا سب سے زیادہ عظیم الشان تبلیغی یا مذہبی کارنامہ اخبار سچ کا اجراء تھا۔ لیکن اس نے اپنی ساری عمر اسی تنقید و تنقیص میں بسر کر دی، کہ مغرب میں اسقدر شراب پی جاتی ہے، اس حد تک قمار بازی ہوتی ہے، اتنے جرائم ہوتے ہیں، یہ اعداد و شمار مظالم کے ہیں، اور اتنی بے حیائیاں موجودہ تہذیب و تمدن میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی اس امر پر غور نہیں کیا گیا کہ دوسروں کے نقائص کے اظہار سے اپنی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور اگر اس سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان ذمیم حرکات کے بُرے نتائج دکھا کر احتراز کی تعلیم دی جائے، تو اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ جس قوم کی بُرائیاں کیجاتی ہیں، اُن کے محاسن بھی پیش کئے جائیں۔ اور اُن کے اختیار کرنے کی تعلیم دیجائے۔ بہرحال عبدالماجد صاحب نے اخبار سچ کے ذریعہ سے دوسروں کی بینائی کا نقص تو ضرور ظاہر کیا۔ لیکن اپنی آنکھ کے شہتیر کی طرف کبھی نگاہ نہیں کی۔ اور اسی لئے اس میں بجائے مصلحانہ رنگ ہونے کے ہمیشہ جارحانہ کیفیت پائی گئی۔ اور عام طور پر یہی ہوتا بھی ہے کہ انتہائی مجبوری و بیکسی میں زبان پر گالیاں ہی آتی ہیں، اور انھیں سے کچھ دیر فطرت انسانی اپنی تسکین کر لیا کرتی ہے۔

میں جناب عبدالماجد صاحب کے جوش مذہبی اور خلوص نیت کا معترف ہوں، لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جو طریق کار اُنھوں نے اختیار کیا وہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے نادرست تھا اور جن خیالات کے ماتحت اُنھوں نے تبلیغ کی وہ بڑی حد تک تنگ و پست تھے۔ ان کو سب سے پہلے غور کرنا چاہئیے تھا کہ اسلام کا حقیقی مشن کیا تھا اور عہد حاضر کے مبلغین کس طرح اُسے پیش کر رہے ہیں اور اب جبکہ علوم و فنون کی ترقی نے تمام دنیا کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر کے مذہب

کی ضرورت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ کیونکہ انھیں اس طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یورپ کی بادہ خواریوں کے افسانے تو بیان کئے۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ مسلمانوں کے بے پئے ہوئے بہک جانے کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے مغرب کی تمام اخلاق شکن روایات کے ظاہر کرنے میں تو سارا زور قلم صرف کر دیا، لیکن خود اپنے اخلاق کے اسباب خرابی متعین کرنے کی جرأت کبھی انھوں نے نہیں کی۔ انھوں نے تمام یورپ کو تو معصیت کدہ سمجھ کر سب وشتم کا بازار گرم کر دیا، لیکن اپنے ہاں کے اکابر ملت کے خلوت کدوں کا ذکر کبھی نہیں کیا: جن کی طہارت وعصمت کی داستانیں اور جن کی قدوسیت وللہیت کے افسانے یورپ کے کسی بڑے سے بڑے "عشرت کدہ" کو منفعل کر سکتے ہیں۔ جناب عبدالماجد صاحب کی طرح میں بھی اسی امر کا خواہشمند ہوں، کہ یہ قوم ترقی کرے، اس کے اخلاق درست ہوں، اور موعودہ خلافت ارض اس کے ہاتھ آئے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے مولانا زیادہ تر اپنا وقت اس سعی میں صرف کرتے ہیں کہ دوسروں کے معائب کو ظاہر کر کے اپنے نقائص کو ہلکا ثابت کیا جائے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تنقید گھر ہی سے شروع ہو اور سب سے پہلے "غریب خانہ" ہی کو دیکھا جائے کہ اس کے "مشرق" میں کتنا "مغرب" چھپا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جرأت اخلاق جو غیروں کے اصلاح میں صرف کی جاتی ہے۔ اس سے خود اپنی ہی جماعت کی تہذیب کا کام کیوں نہیں لیا جاتا۔ اور وہ قوت احتساب جو تمام اقطاع مغرب کے حالات کو محیط ہے اس کو خود اپنے اور اپنی جماعت کے اوپر کیوں استعمال نہیں کیا جاتا۔

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل ربا ادائیں،

جناب دریابادی خلافت کمیٹی میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جمعیۃ العلماء کی مجلس میں بھی ان کو کافی درخور حاصل ہے، کانگرسی خیال کے لوگوں میں بھی وہ نامقبول نہیں ہیں، اسی انجمن کے بھی وہ رکن ہیں جس نے لامذہبیت و دہریت کا مقابلہ کرنے کے لئے فرنگی محل کے منبر و محراب پر اسی سال انگڑائی لی ہے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد خیال، آزاد مقال، نقاد مذہب و دین بھی سمجھتے ہیں۔ اس لئے کیا ان کی ان تمام حیثیات بلند کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمیں حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ کہ کبھی انھوں نے اخبار سچ کے ذریعہ سے نہ جمعیۃ العلماء کے ارکان کو ان کی فرض شناسی کی طرف توجہ دلائی نہ کانگرس کے مطمح نظر کو سامنے رکھکر انھوں نے عملی قدم اٹھایا اور نہ کبھی اس امر کی جستجو کی کہ دنیا میں لامذہبیت کیوں پھیلتی جا رہی ہے، اور ان تمام خرابیوں کا علاج کیا سوائے یورپ کو برا کہنے کے۔ کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے وہ نابلد نہ ہوں گے، وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایک مصلح یا پیغمبر کی مسجع و مقفےٰ گفتگو کو کبھی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ نہیں سمجھا گیا، وہ جانتے ہوں گے کہ سکندر کی فتوحات پاؤں توڑ کر مقدونیہ میں بیٹھے رہنے سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے بھی بخوبی آگاہ ہوں گے کہ اکاسرۂ عجم کی قوت صرف وعظ

وتلقین سے پارہ پارہ نہیں ہوئی۔ اور بہ حیثیت ایک صوفی انسان ہونے کے اُن سے زیادہ کون اس حقیقت کا رمز شناس ہو سکتا ہے کہ

رہرو کعبہ بشارت ز قبولش نہ دہند
جز بداں خار کہ از بادیہ در پا ماند

اس لئے وہ کون چیز ہے جو میدانِ عمل میں قدم اُٹھانے سے اُنھیں باز رکھتی ہے اور اس کانٹے کے چبھنے سے کیوں اُن کے پانوں میں کپکپی پیدا ہوتی ہے، جس کی خلش حاصل کئے بغیر منزل تک پہونچنا محال ہے۔ وہ کیوں اپنی قوت تنقید سے اُس جماعت کو ختم کر دینے کا کام نہیں لیتے، جس کے طویل جُبہ وعمامہ میں قوم کی تباہیوں کے جراثیم اور اخلاق کی بربادیوں کے اسباب ہزار اندر ہزار پنہاں ہیں۔ اور وہ سب سے پہلے اِن "علمائے کرام" اور "مولویانِ عظام" کو صفحۂ زمین سے محو کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جنھوں نے اپنے اعمال رویہ اور افعال سخیفہ سے عالم اخلاق کو سوگوار اور دنیائے ہمت وعمل کو حزین وملول بنا رکھا ہے۔ وہ اب اس حد سے گزر گئے ہیں کہ اُن کی اصلاح ہو سکے، اُن کی ذہنیت کی پستی اب کبھی اُس بلندی کی طرف نہیں آسکتی جو کسی وقت اسلام کی خصوصیت خاصہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ ہماری جماعت کا ایک ایسا عضو مأوف ہیں جس کا قطع کر دینا ہی تنہا علاج ہے، اس لئے اب اگر کوئی سعی کامیاب ہو سکتی ہے تو صرف اسی صورت سے کہ پہلے اس جماعت کو منہدم کیا جائے۔ راہ کو اس خارزار سے صاف کیا جائے اور بالکل جدید اُصول سے، از سرِ نو اس درس کی یاد تازہ کی جائے۔ جو ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے یکساں مشعل راہ ہو سکتا ہے اور وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لب ولہجہ اور طریقِ استدلال میں تبدیلی پیدا کی جائے اور اس طرح اُس لچک کو قائم رکھا جائے جو ایک فطری مذہب میں ہونا چاہیئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ماجد بھی میری ہی طرح

ہر چہ بینند بہ عنوان تماشا بینند

اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ میں "بہ من شراب و بہ زہاد مژدۂ تسنیم" کی مفاہمت پر قانع نظر آتا ہوں اور وہ غریب اس لطف سے بھی محروم ہیں۔

میں نے ابتداءِ ملاحظات میں اس یاجوجی قوت سے بحث کرنے کا وعدہ کیا تھا جس کے خلاف فاضل دریابادی اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں، لیکن سلسلۂ کلام میں، بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی اور اصل مقصود پر گفتگو نہ ہو سکی، علاوہ اس کے یوں بھی ملاحظات کے محدود صفحات اس کو انجام تک پہونچانے میں کامیاب نہ ہوتے اس لئے میں اس مبحث اس کو ملتوی رکھتے ہوئے آیندہ کے لئے اُن عنوانات کی تعیین کئے دیتا ہوں۔ جن پر بہ سلسلۂ ملاحظات یا کسی مستقل مضمون کی صورت میں مجھے بحث کرنا ہے۔ سب سے پہلے میں مذاہب کے فلسفۂ ارتقاء پر گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد مذہب سے بغاوت کے اسباب پر غور کروں گا اور پھر یہ کہ مذاہب کا مستقبل کیا ہے یا یہ کہ مستقبل میں مذہب کے بقاء کی کوئی صورت ہے یا نہیں، میں چاہتا

ہوں کہ اسطرح ایک بار اور ہمیشہ کے لئے اپنے خیالات ظاہر کردوں تاکہ ناظرین نگار کو میرے حقیقی مقصود کے سمجھنے میں آسانی ہو اور انھیں معلوم ہو سکے کہ یاجوجی قوت کا سرچشمہ حقیقتاً کہاں پایا جاتا ہے۔

آجکل ہندوستان جس حالت منتظرہ سے گزر رہا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ اور ملک کی سیاسیات نے جو صورت اختیار کی ہے وہ اہل نظر کو معلوم ہے۔ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا دنیا کا نیا واقعہ ہے، کیا تاریخ عالم میں کسی ملک کے اضطرار و اضطراب کے وقت کبھی وہ کچھ نہیں ہوا جو اب ہو رہا ہے؟ نہیں، ہمیشہ یہی ہوا ہے جو اب ہو رہا ہے ....

....

یہ حقیقت تسلیم ہو چکی ہے کہ دور سرمایہ داری اب روئے زمین پر کسی جگہ قائم نہیں رہ سکتا، اور نوع انسانی خواہ وہ افریقہ میں ہو یا قطب شمالی میں اپنے اس فطری حق کے لئے بیتاب ہے۔ جو خدا نے اپنے بندوں کو عطا کیا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ ملک جس کو آج بیدار ہو جانا چاہیئے۔ کل بیدار ہو، اور وہ جو کل بیدار ہو چکا ہے اس کو اس سے قبل بیدار ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن یہ ناممکن ہے کہ اب تقدم شخصی قائم رہے۔

دنیا میں ہمیشہ دو قوتیں پائی گئی ہیں، ایک وہ جو .... اپنے اہرمنی اغراض کو پورا کرتی ہے اور دوسری وہ اخلاقی قوت جو بغیر کسی جسمانی یا مادی استحکام کے زمانہ کا مقابلہ کرتی ہے، پھر ایسا تو ہوا ہے کہ جب ایک قوم کا اخلاقی احساس محو ہو گیا تو قہرمانیت اس پر غالب آگئی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک قوم کے اخلاق میں بیداری پیدا ہوئی ہو اور استملاکیت عرصہ تک قائم رہ سکی ہو۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ کیا اُسوقت ہندوستان بیدار ہو گیا ہے، کیا اس میں اپنی ذلت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا جواب آسان نہیں۔

اگر ملک سے مراد اس کی وہ تمام مختلف الخیال ومختلف المذاہب آبادی ہے جس کو حقیقتاً بہ لحاظ وطنیت ایک ہی سررشتہ سے وابستہ ہونا چاہیئے، تو ہمکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں،

لیکن اگر اس سے مراد کوئی خاص آبادی یا جماعت ہے، تو ثبوت طلب کرنے کی ضرورت نہیں، ....

.... وہ قومیں بھی جنھوں نے صرف تماشائی کی حیثیت سے ان تمام مناظر کا لطف اُٹھایا ہے اس سے آگاہ ہیں۔

یہ درست ہے کہ قوم اپنی جگہ خواہ کتنی ہی حساس کیوں نہ ہو، لیکن ہمیشہ سے اسکو کسی قائد ورہنما کی ضرورت ہوئی ہے

اور اقدام و رجعت میں بڑا حصہ رہنماؤں اور لیڈروں کا ہوا کرتا ہے، اس لئے اگر اس نظریہ کو سامنے رکھکر غور کیا جائے تو ہم آسانی سے دو جماعتوں کے مستقبل پر حکم لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک جماعت وہ ہے جس کی رہنمائی گاندھی، نہرو و پٹیل وغیرہ کر رہے ہیں۔ اور دوسری وہ جسے محمد علی، شوکت علی، شفاعت احمد خاں وغیرہ کی سیادت نصیب ہوئی، . . .

. . . .

. . . . اب معلوم نہیں دنیا ان دونوں میں سے کس کی حماقت پر حکم لگائیگی اور کون کہہ سکتا ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے کسکو مستحق آفرین و مبارکباد قرار دیا جائے گا۔

حکومت برطانیہ کے اس احسان کو کبھی ہندوستان فراموش نہیں کر سکتا کہ اس کی دماغی تہذیب و تربیت اُسکی تعلیمی و ذہنی ترقی حکومت ہی کی ممنون ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمیشہ رعایا کے مطالبات اور ارباب ملک کی خواہشات کا خیال رکھا۔ اگر آج بجائے برطانیہ کے . . . کوئی دوسری مستبد حکومت یہاں ہوتی تو تحریک آزادی و انقلاب کو کبھی اس حد تک بڑھنے نہ دیا جاتا، لیکن چونکہ حکومت ہند ایک خاص آئین کی پابند ہے۔ اس لئے وہ کبھی اُس کے خلاف کوئی عمل نہیں کر سکتی، اور وہ پوری احتیاط کے ساتھ ملک کی صلاحیت پر غور کر رہی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ملک کے صحیح و جائز مطالبات کو رد کر دے اور قوم اس باب میں کیوں اسکی طرف سے مایوس ہو . . . .

. . . .

. . . .

آیندہ ماہ میں آصفی نظامی ختم ہو جائے گا۔ جناب خان امتیاز علی عرشی نے جس کاوش سے اس مضمون کو مرتب کیا ہے وہ یقیناً مستحق ستائش و آفرین ہے، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آصفی نظامی نے اپنے تمام قصائد قاآنی و عرفی کو سامنے رکھکر کیوں لکھے اور اس "تتبع و تقلید" سے ہٹ کر کیوں اُنھوں نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا اور اگر لکھا تو کس حد تک کامیاب ہوا۔ افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "بحث سنت" اس مہینے میں ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب اسکا جواب دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ جہاں تک لفظی بحث کا تعلق ہے، وہ کوئی مفید چیز نہیں خواہ فیصلہ مولانا سید سلیمان کے حق میں ہو یا سید مقبول احمد صاحب کے حق میں لیکن معنوی بحث ضرور قابل توجہ ہے۔ ہر چند اسوقت میں کوئی گفتگو اس باب میں نہیں کرنا چاہتا ہوں لیکن مولانا سے اسقدر ضرور عرض کرونگا کہ جن اُصول کے ماتحت وہ احادیث کے نظری ہونیکے قائل ہیں، کیا اُنکی بناء پر کبھی کوئی ضعیف سی کوشش اُنھوں نے اس طرف کی

کی ہے کہ وہ احادیث کو منتخ کر کے صرف بخاری ہی کا ملخص پیش کر دیتے تا کہ احادیث کے باب میں جو نزاع اسوقت پیش ہے وہ دور ہو جاتی۔ قرآن کے لطائف ادبیہ پر ہمارے فاضل دوست مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی جو کچھ لکھ رہے ہیں اسکے متعلق میں زیادہ معرفانہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ عبد الماجد کا اکتشاف "نگار" ہی نے کیا ہے اور اپنی چیز کو اچھا کہنا مشرقی تہذیب میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

جناب اعظم کریوی کا افسانہ الضاف انکے رنگ سے علحدہ نہیں ہے وہ رنگ ایسا کم نہیں نوجوان شہزادہ آسکر وائلڈ کے افسانہ کا ترجمہ ہے اور بالکل "وقت و موسم" کی چیز۔ محمد باقر نسیم کا مضمون معاشیات پر گو بالکل ابتدائی ہے لیکن غیر اہم نہیں۔ شطرنج والا مضمون بھی برا نہیں ہے۔

قدر کا غیر مطبوعہ قطعہ جناب نواب عقیل جنگ بہادر (حیدر آباد) کا عطیہ ہے جو مولانا ہوش کے وساطت سے پہونچا ہے۔ شام نشاط میں ہمارے عزیز دوست مولوی علی اختر صاحب نے جس انداز سے اپنے شباب کی ماتم داری کی ہے، اس پر جتنی بھی ہمدردی صاحب موصوف سے کی جائے کم ہے۔ جان حزیں میں ہمارے محترم دوست امین حزیں نے اپنے مشن کو پوری طرح ظاہر کیا ہے اور نیرنگ نمک سازی میں مولانا امید امیٹھوی نے حسن حسن کیساتھ بیک وقت اقدام و احتراز دونوں کا پورا پورا ساتھ دیا ہے وہ ملا غذجانچ سے کمتر درجہ کے انسان کے بس کی بات تھی۔ اس نظم کی فارسیت اس عہد میں کس قدر عجیب و غریب چیز ہے۔ غزلوں کا یکجائی ذکر اس طرح کئے دیتا ہوں کہ "ماشاء اللہ خوب فرمایا ہے۔"

نیاز

کتاب فلسفۂ مذہب تیار ہے

اور ۲۰ راگست سے روانگی شروع ہو جائیگی

جن حضرات کے آرڈر اس سے قبل آچکے ہیں۔ وہ براہ کرم پھر یاد دہانی کریں، کیونکہ یہاں کوئی رکارڈ موجود نہیں ہے۔ بصورت دیگر تعمیل نہیں ہو سکتی۔

یہ کتاب ۲۰×۲۶ تقطیع کے گیارہ جزو کو محیط ہے اور قیمت مع محصول عہ رکھی گئی ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

خاقانیِ ہند، قاآنیِ عصر علامہ آصفی نظامی

(بہ سلسلۂ ماسبق)



فخریہ فخریہ مین اپنے کمالات کا اظہار، حریفون کی جہالت اور کم علمی، زمانہ کی شکایت، اور ابنائے عصر کی قدرناشناسی کا شکوہ ہوتا ہے۔ گو اس صنف مین قدما اور متوسطین کے ہان بھی کافی ذخیرہ موجود ہے جن مین خاقانی سرگروہ ہین، مگر فیضی اور عرفی نے خودبینی، خودستائی، اور تعلی کا ایک مستقل جہان پیدا کر دیا ہے۔ جو شخص حسب و نسب پر اسقدر نازان ہو کہ اپنے مقابلہ مین دنیا کو ہیچ خیال کرے، وہ علم و فضل پر جسقدر بھی فخر کرے، بجا ہے جسکی خودی اور کوتاہ بینی کا یہ عالم ہو۔ کہ امرا تو درکنار خود بادشاہ کے سامنے بھی بمشکل سر نیاز خم کرتا ہو، وہ جو کچھ کہے، درست ہے۔

فیضی کا کلام سردست مہیا نہین۔ صرف عرفی سے تقابل کرکے، مولانا کا پایۂ سخن ظاہر کرتے ہین۔ روشن دماغ کیلئے اسقدر بھی زائد ہے۔ منکرین اور حاسدین کو خدا بھی خوش نکر سکا۔

عرفی نے دو قصیدے لکھے ہین۔ ایک کی صرف تشبیب اور دوسرا تمام فخریہ ہے۔ چونکہ آصفی کی تشبیب طویل ہوتی ہین۔ اسلئے ہمکو صرف ہمقافیہ اشعار پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ پہلے دو چار شعر "انانیت" کے سن لو عرفی لکھتا ہے۔

۱- منم آن سحر بیان کز مدد طبع سلیم	نہ برد ناطقہ نام سخنم بے تعظیم
۲- منم آن مایۂ فطرت کہ گر انصاف بود	باوجودم نتوان گفت باندیشہ فہیم
۳- منم آن بحر لبالب ز معانی کہ بود	قطرۂ آب ز شرم سخنم در یتیم

عرفی کا ادعا ہے "مین سحر بیان ہون۔ قوت نطق کے لئے میرا کلام مایۂ صد فخر و ناز ہے۔ میرے روبرو خود قوت متخیلہ ناکارہ ہے۔ مین معانی کا دریا ہون۔ اور میرے شعر موتی سے زائد آبدار ہین۔

یہ مفہوم نثر مین ادا کیا جائے۔ تب بھی مزیدار معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان بالطبع خود ہی پسند ہے۔ لیکن یہی بقید نظم ہو تو زیادہ لطف ہو جاتا ہے۔ خاص کر جب عرفی کی زبان سے ادا ہو۔ چونکہ عرفی اس زمانہ مین پیدا ہوا تھا جب مبالغہ

کلام کا لاینفک جزو ہو چکا تھا۔ اسلئے اس نے اپنی خودی آشکار کرنے کے لئے مبالغہ ہی کا دامن پکڑا۔
مولانا آصفی نے بھی "انانیت" کا کوس بجایا۔ مگر مبالغہ کے لباس مین، اسرارِ حقیقت آشکار کئے۔ فرماتے ہین

منم آن تازہ نہالے ز گلستانِ قدیم ۔۔۔ کہ کشد ریشۂ او آب ز ادراکِ حکیم
آن نہالے کہ برد مند ز فیضِ ازلی ست ۔۔۔ ریزد از شاخچۂ او ثمرِ باغِ نعیم

استعارہ لفظی مناسبات سے بریز ہوتا ہے۔ جب انسان کو سورج کہتے ہین۔ تو اسکے بعد ایسی صفات ضرور بیان کرتے ہین جس مین سورج کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے۔ مولانا نے، اپنی ذات کو گلستانِ قدیم کا تازہ نہال قرار دیا ہے۔ اسلئے از سر تا پا نہال کے متناسب صفات مذکور ہوئے۔ یہ خود ایک صنعت ہے۔ لیکن ہم اسکو ترک کرتے ہین
جس طرح، کاریگر کی قدرتِ فن، اور نزاکتِ صنعت اسکی مصنوعات کی ندرت سے ظاہر ہوتی ہے اسی طرح نادرہ کار صناع کی طرف منسوب ہو جانے سے بھی، اشیا کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ انسان ایک ایسے صناع کی ساختہ مشین ہے۔ جو اپنی صفات مین بے مثل و نظیر ہے۔ اس لئے اس کی ہمسری بھی دشوار ہے۔ یہ تصرف کا مسلمہ ہے۔ کہ انسان کی حقیقت پا جانا مشکل ہے۔ خود مذہب نے بھی طے کر دیا ہے۔ کہ روح یا انسانی زندگی کا محرک فہم سے بالاتر ہے۔ اہل دانش کی کوششین بھی ناکام ثابت ہو چکی ہین۔ لہذا مولانا دعوی کرتے ہین۔

"مین زیدی باغ کی تر و تازہ شاخ ہون۔ میری حقیقت تک حکمت و فلسفہ کی رسائی ممکن نہین۔
ازلی فیض نے آبیاری کرکے مجھے بارآور کیا ہے۔ اور جو کچھ میری زبان سے ادا ہوتا ہے بہشت کا میوہ ہے"

اگر اس حقیقت کے چہرہ سے مجاز کا نقاب الٹ دیا جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ جس طرح خالق کی حقیقت سمجھ مین نہین آتی اسکی مخلوق بھی فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ انسانِ کامل نے اپنے اس قول مین اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کہ جس نے خود اپنی ذات یعنی انسان کی حقیقت دریافت کر لی اسے معرفت حاصل ہو گئی۔
عرفی کا پہلا دعوی یہ تھا۔ کہ مین "سحر بیان" ہون۔ آصفی کہتے ہین مین "انسان کامل" ہون۔ اب تم ہی فیصلہ کر دو۔ بلند مرتبہ سحر بیان ہو سکتا ہے۔ یا انسانِ کامل۔ ظاہر ہے موخر الذکر تمام کمالات کا جامع ہے۔ اسلئے خود سحر بیانی بھی اسکی ایک صفت ہے۔ مگر عرفی نے صرف سحر بیانی ہی پر اکتفا نہین کیا۔ مقتضائے طبع سے اس مین بھی خصوصیت پیدا کی۔ اور دعوی کیا۔ کہ سحر بیانی بھی ایسی کہ "ناطقہ" ادب سے نام لیتی ہے۔ لیکن غور کرکے دیکھا جائے۔ تو اس سے کچھ زائد اضافہ نہین ہوتا۔ چونکہ ہر شخص کی زبان جادو کا اثر نہین رکھتی ہر طبیعت سلیم ہوتی ہے۔ لہذا نتیجہ عیان ہے جو جادو بیان ہوگا قوتِ ناطقہ کیلئے لامحالہ واجب التعظیم ہوگا۔ البتہ کمال انسانیت کا دعوی جن الفاظ مین کیا گیا ہے۔ وہ برابر اضافہ کر رہے ہین تازہ نہالِ گلستانِ قدیم۔ آب از ادراکِ حکیم می کشد۔ ز فیض ازلی برد مند ست، و از شاخچۂ خود ثمر باغ نعیم میریزد۔ چار ٹکڑے ہین۔ جو علی التواتر نظم ہوئے ہین

ہر پچھلا، پہلے الفاظ کے معانی مین خوش آیند اضافہ پیدا کر رہا ہے۔ چنانچہ جب چارون کو یکجا کر لیا جائے۔ تو مفہوم یہ ہو جاتا ہے، کہ "من انسانِ کامل ہستم" اس کے بعد فرماتے ہین۔

منم آن جوہرِ ادراک، کہ در علم ازل   داشت بر جوہر فعال، وجودم تقدیم

"جوہر فعال" فلسفہ کی اصطلاح مین وہ ذات ہے جس نے نوین آسمان اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔

جوہرِ ادراک" خلاصۂ معلومات۔ اشرفِ مخلوقات۔ فرماتے ہین۔

مین وہ خلاصۂ موجودات و اشرفِ مخلوقات ہون جو جوہر فعال سے بہت پہلے، خدا کے ازلی علم مین موجود تھا" حدیث قدسی ہے "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق" مفہوم یہ ہے۔ کہ خدا نے دنیا صرف اس لئے آباد کی۔ کہ لوگ اسے پہچانین۔ اور اسکی قوتِ کاملہ کا اظہار ہو۔ اس مفہوم کی طرف آیۂ کریمہ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" بھی اشارہ کرتی ہے۔ دوسری حدیث ہے۔ "ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ" خدا نے آدم کو اپنی مجوزہ ہئیت سے مشرف کیا ہے۔ علاوہ ازین طبقہ اہلِ تصوف مین، حدیث "لولاک لما خلقت الافلاک" بھی بہت مشہور ہے جسکا مفہوم یہ ہے۔ کہ تخلیق عالم کی غرض انسان ہے۔ ان اقوال کے ساتھ ساتھ شعر کو دیکھو۔ عرفی کا دوسرا دعوی یہ تھا کہ مین مایۂ فطرت ہون۔ میرے ہوتے ہوئے "اندیشۂ وخیال" کو صاحب فہم نہین کہا جا سکتا۔ یہ سراسر غلو ہے۔ آصفی کہتے ہین۔ مین "جوہرِ ادراک" ہون۔ اور میرا وجود ازلی ہے۔ یہ حقیقت اور قوم کا مسلمہ ہے اب تم ہی انصاف کرو کون بجا فخر کر رہا ہے؟

آگے چل کر فرماتے ہین

منم آن ابر گہر ریز حقائق کہ بگوش   ریزم، از دامنِ ایثارِ نفس، درِ یتیم

منم آن ابرِ گہر زائے معانی، کہ بود   بیشِ ایثارِ رگِ خامۂ من بحرِ لئیم

ان دونون شعرون کا مفہوم واضح ہے، ان کے مقابلہ مین عرفی کا تیسرا شعر پڑھو۔ اب ہم مقافیہ اشعار لکھتے ہین

عرفی   گر بیاید سخنم، عود بر آتش مانند   جوش ہستی شود از مغز عدم عطسہ کشا

آصفی   حشرِ اموات شود ہر طرف از نشرِ شمیم   از نسیم دمِ احیا، چو کنم نشترِ شمیم

دونون شعرون کا مفہوم قریب قریب ایک ہے دونون عیسیٰ بننا چاہتے ہین لیکن عرفی بلند اڑا ہے۔ سبحان اللہ کلام تو کلام، وہ عود بھی مسیحائی کرتا ہے، جو عرفی کے کلام کی یاد مین سلگا دیا جائے۔ چونکہ اس مفہوم کا دروازہ آنے والے شاعرون پر بلند ہو چکا تھا۔ اسلئے آصفی نے نئی راہ نکالی۔

"عدم" "ہستی" کا مقابل ہے۔ "ہستی" کا اطلاق اس شے پر ہوتا ہے۔ جو موجود ہو۔ "عدم کے معنی ہین" نہ ہونا" جس طرح

اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو ہو کر ناپید ہو گئی ہو۔ اس طرح اس چیز پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو سرے سے وجود ہی نہ رکھتی ہو
عرفی نے صرف یہی دعویٰ کیا تھا۔ کہ میرا کلام مردے زندہ کرتا ہے۔ آصفی کو موقع مل گیا۔ فوراً کہہ اٹھے۔ کہ میرا
کلام نہ صرف مردوں ہی کو زندگی واپس بخشتا ہے۔ بلکہ اُن چیزوں کو بھی حیات آشنا کر دیتا ہے۔ جو سرے سے معدوم ہیں۔
آصفی نے دوبارہ اس قافیہ کو پھر نظم کیا ہے۔ چونکہ مفہوم عرفی سے جدا ہے۔ اسلئے خوب ہی ہو گا۔ فرماتے ہیں۔

بوئے فردوس زند جوش بمغزِ امکان	از بہارِ سخن آندم کہ کنم نشرِ شمیم

یعنی میرا کلام سرمایۂ بہار ہے۔ اس کی ایک ایک پیٹ اسقدر خوشبو در دامن ہوتی ہے۔ کہ جب فضا میں پھیلتی ہے
تمام عالمِ امکان کے دماغ میں فردوسی خوشبو کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

عرفی	از حجابِ سخنم، بسکہ عرق داد برون	صورتِ شیشہ برآورد زلالِ تسنیم
آصفی	گزرد گر بسرِ چشمۂ نوشم، رضوان	افگند از کفِ خود، جامِ زلالِ تسنیم

کہنا دونوں کو یہ ہے۔ کہ ہمارے کلام میں شیرینی ہے مگر طرزِ ادا مختلف ہے۔ عرفی اس کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ
"نہر تسنیم کا شیریں پانی میرے کلام کو دیکھکر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا چنانچہ اب وہ شیشہ کی طرح خشک
اور منجمد نظر آتا ہے" یہ نہایت پاکیزہ غلو ہے۔ لیکن آصفی نے مذکورہ مفہوم کو نہایت سادہ، مگر دلنشین الفاظ میں جلوہ گر
کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اگر رضوان کا میرے سخن کے چشمہ پر سے گذر ہو جائے۔ تو یقین ہے۔ کہ نہر تسنیم کے شہد سے زائد شیریں اور دودھ
سے زائد سپید پانی کے پیالہ کو زمین پر دے مارے"

قاعدہ یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ انسان کہ اپنی چیز دنیا سے بڑھکر معلوم ہوتی ہے اسلئے دوسری شے کی فضیلت صرف
اسی وقت نظر آتی ہے۔ جب وہ اسقدر نمایاں ہو۔ کہ مالک کے پاس کوئی عذر ہی نہ رہے۔ علاوہ ازیں جس شے کے کھانے یا
پینے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس کے سوا دوسری اشیاء خواہ اس سے بہتر ہی کیوں نہوں ناگوار ہی معلوم ہوتی ہیں۔ جو لوگ
کنوئیں کا پانی پیا کرتے ہیں انھیں نل یا بارش کا شیریں پانی تلخ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیوں۔ صرف اسلئے کہ ان کی ذائقہ کھاری پانی
ہی کی عادی ہے۔ دوسرا پانی اسکے لئے نیا ہے۔ اور نئی شئے کی پذیرائی کو ایک مدت چاہیے۔
مگر آصفی کا کلام اسقدر ذائقہ نواز ہے۔ کہ صرف ایک بار چکھ لینے سے، انسان شیریں ترین شئے کو بھی ہمیشہ
کے لئے خیرباد کہہ سکتا ہے۔ گو وہ اسکا عادی ہی کیوں نہوں ہمارے خیال میں عرفی کا شعر معناً سقیم ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ قافیہ
آصفی نے اپنا کر لیا۔
اسی قافیہ کو آصفی دوبارہ نظم کرتے ہیں

جوئے از نوش کشادم بزمین امکاں	کز حلاوت رگ حنظل شدہ موجِ تسنیم

مقصد وہی ہے۔ لیکن ادا مین جدت ہونیکے باعث شعر بے پناہ ہوگیا ہے۔

دنیا مین غصہ سے زائد تلخ کوئی شے نہین۔ اس تلخی کو اگر کوئی شیرینی دبا سکتی ہے۔ تو وہ میٹھی بات کی شیرینی ہے۔ جہان دو چار میٹھی باتین کین اور انسان موم ہوگیا۔ ابھی غصہ کے مارے بھوت اور دیو نظر آتا تھا چند لمحون کے بعد جو دیکھا تو فرشتہ کی طرح سادہ اور نرم ہے۔ چونکہ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ اسلئے مثالین لکھنے کی ضرورت نہین

آصفی مدعی ہین۔ کہ میرے شیرین کلام نے عالمِ امکان کی طبیعت مین تغیر و تبدل پیدا کر دیا ہے۔ حنظل سے تلخ تر ترکوئی پھل نہین۔ آج وہ بھی اسقدر شیرین ہوچکا ہے۔ کہ رگ رگ سے شہد کی دھارین نکلتی ہین۔

اب تم خود فیصلہ کرو۔ کیا یہ دعویٰ بادر ہوا ہے۔ ہم یہ نہین کہتے۔ کہ شاعرانہ طرزِ بیان مبالغہ سے بالکل ہی معرا ہو لیکن جہان تک ممکن ہو، اسے ہمارے روزمرہ سے قریب ہونا چاہیئے عرفی کا یہ شعر اس معیار پر پورا نہین اترتا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہین۔ کہ آصفی نے یہان اپنے پیشرو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

عرفی	در حرمگاہِ دل و حجلہ گہِ طبع من ست حاملہ مریم و جز مریم اگر ہست عقیم	
آصفی	ہمچو مریم، بحرمگاہِ دلم، عیسیٰ زاست بکرِ معنی، کہ نشد حاملہ و بود عقیم	

مریم علیہا السلام کے متعلق مروی ہے۔ کہ آپ کو کبھی کسی مرد نے ہاتھ نہین لگایا۔ برابر باکرہ رہین۔ تا آنکہ فرشتہ نے عیسیٰ کی روح آپ کے پیٹ مین پھونکدی۔ عرفی تلمیحاً کہتا ہے۔ کہ میرے حرمگاہِ دل مین، باکرہ کو حمل رہجاتا ہے۔ خواہ وہ مریم ہو یا کوئی اور مقصود یہ ہے۔ کہ مین بڑا اطباع ہون۔ وہ وہ معانی پیدا کرتا ہون۔ کہ باید و شاید۔

گو تلمیح خوب ہے شعر لفظاً و معنیً سقیم ہے اولاً تو ”حرمگاہِ دل“ اور ”حجلہ گہِ طبع“ کا سنگھم بے فائدہ ہے دوسرے مریمؑ کا ذکر بے ادبانہ کیا گیا ہے۔ تیسرے ”جز مریم اگر ہست عقیم“ کا ٹکڑا مصرع کو زبان پر گران کرتا ہے۔

آصفی نے یہی مضمون نظم کیا ہے۔ عرفی کے شعر مین جو کوتاہیان تھین۔ وہ ان کے سامنے تھین۔ اس لئے انھون نے کوشش کرکے نہ صرف نقائص دور کئے، بلکہ شعر کو رواں اور بلند کر دیا۔ فرماتے ہین ”میرے حرمگاہِ دل مین، مریم کی طرح، بکرِ معنی سے عیسیٰ مثال پیدا ہوتے ہین۔“ عیسیٰؑ علیہ السلام کا مشہور وصف مردے زندہ کرنا تھا۔ فصیح و بلیغ کلام بھی ایسی ہی اثر رکھتا ہے۔ حدیث شریف مین مروی ہے ” وان من البیان سحرا وان من الشعر لحکمۃ“۔ کہ بعض تقریرین جادو اور بعض اشعار حکمت و موعظت سے لبریز ہوتے ہین۔ اسلئے انکا دعویٰ مسیحائی کلام غلو نہین کہا جاسکتا۔

عرفی	در پذیرد، زدمم صورتِ دیوار حیات مایۂ فطرت ازو وام کند فہم حکیم	
آصفی	نفسم روح حکم گرچہ تنِ زار و مد رود از خویشتن، از جلوہ اش، ادراکِ حکیم	

عرفی کا یہ شعر بہت بلند ہے۔ کہتا ہے۔ میرا کلام صرف جادو اثر ہی نہین ہوتا۔ اسرار و رموز سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ اگر مین اپنے دم سے دیوار پر منقوش تصویر کو زندہ کر دون۔ تو وہ اسقدر معارف آشنا اُٹھے۔ کہ حکما کو عقل و فہم قرض دے۔

آصفی نے "حکیم" قافیہ نظم کیا۔ لیکن معنی کے لحاظ سے شعر آدھا رہا۔ اس نے ایک ہی شعر مین دو دعوے کئے تھے مسیحا دم ہون۔ اور حقائق آشنا ہون۔ اُنھون نے صرف آخری دعوے لکھا۔ اور دست بردار ہوگئے۔

عرفی — آن خردمند حکیم کہ بسا بہ عقل　　گیرم اندر جرم جوہر کل، نبض سقیم

آصفی — آن بہ شکل کہ بہ تاثیر نگاہم یابند　　ہمچو قانون شفا، نسخۂ احوال سقیم

عرفی کا مقصد یہ ہے کہ مین اس قدر دانا ہون کہ اپنے عقل و ذکا سے اُن اشیاء مین بھی نقص کو پالیتا ہون جو بظاہر نقصان سے بالا سمجھی جاتی ہین۔

بات خوب ہے۔ لیکن ناقص ہے۔ حکیم کی حذاقت صرف نباضی سے ظاہر نہین ہوتی۔ ممکن ہے کہ وہ دیکھتے ہی مرض دریافت کرلے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہین آتا۔ کہ اس کے علاج سے مریض کو صحت بھی ہو جائے۔ آصفی اس نقص معنوی سے فائدہ اُٹھا کر فرماتے ہین:۔

"مین طبیب حاذق ہون۔ میری نگاہ مین یہ اثر ہے کہ ادھر سقیم یا مریض کو دیکھا۔ اور اُدھر وہ تندرست ہو گیا"

ہر چند عرفی نے غلو کا دامن پکڑا۔ مگر فلک پیمائی میسر نہ ہوئی۔ آصفی سیدھی سادھی بات لیکر آگے نکل گئے۔ یہ طب کا مسئلہ ہے۔ کہ مرض کی دافع خود طبیعت ہے۔ وہ اسکی اعانت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سینکڑون جاڑے بخار کے مریض کسی عامل سے تعویذ حاصل کرکے اچھے ہو جاتے ہین۔ موجودہ اصول مسمریزم (　　) سے اسکی تائید ہوتی ہے۔ حکیم حاذق پر ہر مریض کا اعتقاد ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حکیم صاحب آئے۔ اور مین نے مرض سے نجات پائی۔ اس لئے آصفی کا دعوی کسقدر بلند اور سادہ نظر آتا ہے۔ سبحان اللہ! ادھر مریض پر نگاہ پڑی۔ ادھر مرض نے روپوشی اختیار کی

عرفی کے شعر مین بعض الفاظ بھرتی کے بھی ہین۔ مثلاً "خردمند" حکیم کی صفت ہے۔ صفت موصوف مین کچھ اضافہ کرتی ہے۔ یا یون کہئے کہ ان باتون کو بتاتی ہے۔ جو اُس مین اور افراد سے زائد ہون۔ مگر یہان مطلق نئی بات نہین نکلتی۔ حکیم کے معنے مین خردمندی داخل ہے۔ یعنی جو خردمند نہین اُسکو حکیم نہین کہا جاسکتا۔ عرفی سے ایسی توقع ہرگز نہین تھی۔

آصفی کے مخصوص قوافی رہیے جاتے ہین۔ اس لئے ہم تقابل سے دست کش ہو کر دو چار شعر لکھتے ہین:۔

فیض اشراق ضمیرم، ز حقائق تعلیم　　ہمچو آئینۂ خورشید کند طبع حکیم

"میرا ضمیر و حقائق و معارف کا گنجینہ ہے۔ اگر اس کا پرتو، حکیم کی طبیعت پر پڑ جائے، تو اسے خورشید کی طرح درخشان بنادے"

ازفروغِ گہرِ فطرتِ من، آب شود   درکنارِ صدفِ بحر، دلِ دُرِّ یتیم

"میری روشن فطرت یکتا موتی کو شرماتی ہے۔ دیکھئے بیچارہ سیپ میں شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا ہے، اس میں دریا کے پانی کو اشارۃً موتی کا پسینہ قرار دیا ہے۔ یہ مزید لطف ہے۔

مہر و مہ را از فروغِ دل و طبعِ روشن   بزمِ اشراقِ ضمیرم بگزیدست ندیم
از دلم، نکہتِ معنی، صفتِ غنچۂ گل   عطر آلودہ برآید، چو دمِ بادِ نسیم
روحِ معنی بدم تازہ دمیدم ز نوی   بود الفاظِ کہن بر صفتِ عظمِ رمیم
اہتزازے شود از معنیٔ من در دلِ سنگ   گرچہ در طبعِ جمادی نبود ذوقِ سلیم
گوہرِ سرِ شیوناتِ جہاں را ابرم   کہ کنم گنجِ لآلی، صدفِ گوشِ فہیم
دمِ طغیانِ معانی، صفتِ بحرِ محیط   چکد از موجِ رگِ خامۂ من فیضِ قدیم
سازِ خاموشم و خیزد ز دلِ من آہنگ   حرفِ من داشتہ بر جنبشِ لبہا تقدیم
اثرِ معجزِ فیضِ سخنم گر یابد   نطق چو شد صفتِ بو، ز گلِ گوشِ صمیم
آن سحا کیم کہ ز شستِ گہرش جوش زند   از کمالاتِ حکم، موجۂ اسرارِ قدیم

ان اشعار کی بلند آہنگی، جوشِ بیان، ندرتِ استعارات اور حقیقت کشائی پر صفحے کے صفحے سیاہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن فرصت اجازت نہیں دیتی۔

عرفی کا دوسرا قصیدہ ہے "رفتم اے علم زدہ در حرم شتابان رفتم" اس زمین میں آصفی نے بھی ایک مرد، عہدہ معتمد صرفِ خاصِ شاہی کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔ تشبیب فخریہ ہے۔ اس لئے دو چار شعر اس پر بھی نذر ہیں۔

لیکن اس پر کچھ لکھنے سے پہلے ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے۔ کہ عرفی کا یہ قصیدہ لاجواب ہے۔ آصفی نے جوشِ مسابقت میں بہت جانفشانی کی ہے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھتے وقت ناظرین خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ لیکن بجز چند اشعار کے، انکی سعی مشکور نہیں ہوئی۔ اس قصیدہ میں آصفی عرفی کے ہمنوا نہیں معلوم ہوتے۔ شعر پر شعر پڑھتے چلے جائیے۔ بیدل کے ساز کی سی آواز معلوم دیتی ہے۔ اور کچھ نہیں۔

گذشتہ قصائد کے برخلاف، یہاں آصفی کو خود اس کا احساس ہے۔ عرفی کے ان قوافی پر جو حدِ اعجاز کو پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے قلم نہیں اٹھایا۔ یہی امر اس احساس کا غماز ہے۔ اور جب یہ بات مسلم ہے تو پھر ہم کیوں حسبت گواہ نہیں۔

لیکن جب ہم قصیدہ کے خاتمہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ شعر سامنے آتے ہیں۔

این گہرہا کہ برآوردہ ام از معدنِ دل   نہ شماری کہ بغارتگری کان رفتم
ہمرہِ عرفی و فیضی و حزین و شوکت   اندرین مرحلہ چون بہ شتابان رفتم

سعی اندیشہ درین عرصہ قدم پیش گذاشت گرچہ در وادیٔ ہستی پس ایشان رفتم

ان اشعار مین کھلا ہوا تقدم نظر آتا ہے۔ لہذا ہمین دیکھنا چاہیئے کہ آخر یہ قصہ کہانتک درست ہے۔ ہماری اپنی رائے جب ہم تقابل سے پہلے ظاہر کر دینا مناسب سمجھتے ہین۔ یہ ہے کہ عرفی کو مستثنٰی کر کے باقی ہمراہیون سے آصفی پیش پیش ہین۔ ذٰلک فضل اللہ

ہمقافیہ اشعار سے پیشتر "انانیت" کے دعوے سُن لو۔ چونکہ فخریہ کی ردیف یہی ہے۔ اس لئے بڑی حد تک اس سے اندازہ ہو سکے گا۔

عرفی

منم آن قطرہ کہ صد سینہ و دل کردم داغ
تا ز نوکِ مژہ غلطیدہ بدامان رفتم
منم آن یوسفِ بدرود نہ کہ نارفتہ بہ مصر
چون برون آمدن از چاہ بزندان رفتم

آصفی

منم آن حسرتِ دیدہ کہ بہ پیشِ محمل
آہ مجنون شدہ در دشتِ حدی خوان رفتم
منم آن طائرِ آزاد کہ در بندِ قفس
پر بہ آوردہ بہ گلزار پر افشان رفتم

یہ دونون شعر ہم معنی ہین۔ مدعا یہ ہے کہ اس ناشاد دنیا مین راحت سے پہلے غم نصیب ہوا۔ ابھی جی بھر کر لطف اندوزِ حیات بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ قیدی حوادث ہو گئے۔ اس مفہوم کو عرفی نے یوسف۔ مصر۔ اور زندان کی تلمیح کے نذر کر دیا۔ آصفی نے طائر، قفس اور گلزار کی پناہ لی۔ لیکن اسقدر فرق رہا کہ عرفی اس کو بدروزی قرار دیکر ماتم کر رہا ہے آصفی اسکو آزادی سمجھ کر شادان ہین۔ و بینہما بون بعید ط

عرفی

منم آن غنچۂ پژمردہ کہ از بادِ خزان
خندہ برلب گرہ و سر بگریبان رفتم

آصفی

منم آن نکہتِ پیراہنِ یوسف کہ ز مصر
بہ دماغ و دلِ یعقوب بہ کنعان رفتم

عرفی نے پھر وہی رونا رویا ہے۔ بادِ خزان نے اُسکو کھلنے سے پہلے مُرجھلا دیا تھا۔ اس لئے ہر شعر فریادی ہے۔ آصفی یہان بھی "حیات نوید" ہین۔ یوسف علیہ السلام کی قمیص، یعقوبؑ کی اندھی آنکھون کے واسطے نور بخش۔ جب یوسف علیہ السلام کو بھائیون نے شناخت کر لیا۔ اور اپنے کرتوت پر پشیمان ہوئے، تو اُنھون نے فرمایا۔ اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علیٰ وجہ ابی یات بصیرا "یہ میرا کرتہ لیجاؤ اور اُنکے چہرہ پر ڈالدو وہ بینا ہو کر چلے آئین گے"

آصفی کا دعوی بھی یہی ہے۔ ان کا کلام اپنی معنوی حقائق و معارف اور لفظی محاسن کے باعث مذاق سلیم کے لئے روحانی غذا ہے۔ اس لئے وہ بجا فرماتے ہین۔ کہ مین دنیا کے لئے پیام زیست ہون۔

عرفی

منم آن ہیکلِ روحانیٔ اندیشۂ خدا
کہ در آب زدم بماثر نان رفتم

آصفی

منم آن عاشقِ شوریدہ کہ بالشکرِ شوق
ہمرہِ بسم زنی بزمِ رقیبان رفتم

عرفی کہتا ہے۔ عالم تجرد مین بن خدائی اندیشہ کی روحانی صورت تھا۔ مگر قسمت مین ذلت لکھی تھی۔ اس

دنیا میں آکر آب و دانہ کے لئے در بدر مارا مارا پھرنا پڑا۔" چونکہ وہ صاحب کمال تھا۔ اس لئے اپنی ذات کو برتر دیکھنا چاہتا تھا۔ خانخاناں اور میر ابو الفتح کی قدردانی نے اشک شوئی کی۔ مگر ہندوستان کی داد و دہش نے، جو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے معاصرین کو مالامال کر چکی تھی۔ اسکی طرف پورا التفات نہیں کیا۔ اس لئے قصیدہ بھر میں یہی رونا رویا ہے۔

آصفی بھی صاحب کمال تھے۔ انھوں نے بھی ناقدردانی کے مظالم سہے۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے اجہد خوانوں کو شہرت کے تخت پر جلوہ دیکھا۔ مگر یہ دنیا میں عمل کی تعلیم لے کر آئے تھے۔ اس لئے شور و واویلا کی جگہ ہمت کا سبق دیتے ہیں فرماتے ہیں:۔

"میں ایسا شوریدہ مزاج عاشق ہوں، کہ اپنے شوق کے ہمراہ رقیبوں پر چڑھ دوڑوں گا۔ اور ساری بزم درہم برہم ہو جائے گی۔" بالفاظ دیگر انسان کو رقابت کے باعث دل چھوڑ دینا ہرگز نہ چاہئیے۔ ازل سے ابد تک بیان "تنازع للبقا" جاری رہے گا۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ ہمیں چاہئیے کہ اپنی قوت و استعداد سے خود راستہ صاف کریں۔ مواقع دیکھکر رونا بزدلی ہے۔

منم آن شیوۂ ارزندہ بہ لبستانِ کمال	که بدست و دہن ذائقہ ارزان رفتم — عرفی
منم آن ہد ہد پیغام بر عالم شوق	سوئے بلقیس لصد شوقِ سلیمان رفتم — آصفی

عرفی کو وہی فلک کی شکایت ہے۔ آصفی کو وہی شوق وہی آرزوئے عمل اور اُسی دعوتِ کار کا ذوق ہے۔

منم آن سبزۂ جان گشتہ کہ با تیغ و کفن	بدر خانۂ جلاد غزل خوان رفتم — عرفی
منم آن نالہ کہ با برگ خراشیدنِ جان	از دلِ خستۂ فرہاد لبساماں رفتم — آصفی

یہاں بھی گذشتہ اختلافِ خیال کارگر ہے۔ عرفی کو یاس و حرمان نے جان سے بیزار کر دیا ہے۔ اب وہ اس کو زندگی سمجھتا ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح زنجیرِ حیات سے پاؤں نکال لے۔ مگر آصفی محروم رہ کر بھی جان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتے۔ مانا کہ وہ فرہاد کے خستہ دل کے نالہ پرسوز ہیں۔ لیکن پھر بھی اس قدر "اثر در دامن" ہیں کہ زمین و آسمان کو ہلا ڈالیں گے۔

عرفی کی "انانیت" ختم ہو گئی۔ لیکن آصفی کا دعوٰے تمام نہیں ہوا۔ یہ زنجیر کی چند کڑیاں تھیں۔ باقی حصہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ فرماتے ہیں۔

منم آن نالہ کہ با برگ خراشیدنِ جان	از دلِ خستۂ فرہاد لبساماں رفتم
گاہ از حسرتِ جان بخشئی لعلِ لب یار	جوش خون گشتم و از دیدہ گریان رفتم
گاہ از کشمکشِ رنجِ خمارِ امکان،	صورتِ نشئہ می از سرِ مستان رفتم

گاہ از گرمیِ داغِ جگر سوختہ ہمچو آہے ز دلِ تنگِ یتیمان رفتم
گاہ از بہر جلائے نظرِ چشمِ کمال کحل بینش شدم و سوئے صفاہان رفتم
گاہ چون دلولۂ شوقِ زلیخا از مصر بہ طلبگاریٔ یوسف سوئے کنعان رفتم
گاہ چون آینہ در محفلِ رعنا صنمان رفتم از خویش، دلے با دلِ حیران رفتم
گاہ چون بوئے گل از شیوۂ آزادہ روی دست در دستِ صبا، از چمنستان رفتم
گہ ز رنگینیٔ لعلِ سخنِ شعلہ فگن آتشِ رشک شدم، سوئے گلستان رفتم

ان اشعار کو پڑھو۔ عرفی کا قصیدہ خوب تر ہے۔ لیکن خوبی خدا نہین ہے۔ ممکن ہے۔ کئی چیزین خوب نکلین۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۷ اور آٹھوان شعر، شاعری کی تصویر ہے۔

عرفی نے "منت ناپذیری" کا راگ الاپنا چاہا ہے۔ احسان قافیہ استعمال کرتا ہے۔

آرزو کشتم و خون خوردم و عشرت کردم نہ در جور زدم، نے بر احسان رفتم

مدعا یہ ہے کہ آرزوؤن کا خون کرنا مین نے گوارا کیا۔ لیکن تیرے میرے آگے فریاد لیکر نہین گیا۔ بات بالکل معمولی ہے۔ لیکن مصرع اول کے اجزاء ترکیبی سے حسن پیدا ہو گیا ہے۔ آصفی نے بھی اس قافیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہین۔

خلشِ نشترِ غیرتِ منت نہ گزاشت جوشِ خونابہ شدم از رگِ احسان رفتم

شریان خون کا گھر ہے۔ اور خون پر زندگی کا مدار ہے۔ ادھر شریان چھڑی، اور معتد بہ حصہ خون نکلا کہ ادھر سلسلۂ حیات ختم ہو گیا۔ شاعر "احسان" کو انسان فرض کر کے، اپنی ذات کو اس مین دوڑنے پھرنے والا خون تصور کرتا ہے۔ رگ نشتر وغیرہ نوکیلی چیز سے چھیڑی جاتی ہے۔ "غیرتِ منت" مین، باہمت کے لئے، کافی سامانِ خلش ہے۔ اسلئے احسان کا بار، اس کے لئے نشتر کا کام دیتا ہے۔ ادھر احسان قبول کیا۔ ادھر خون کی طرح باہر آ رہا۔ اس مفہوم کو جدت نے بلند اور مضبوط بنا دیا ہے۔ فرماتے ہین۔

"مین احسان اُٹھا ہی نہین سکتا۔ کیونکہ مین رگِ احسان کا خون ہون۔ اور منت نشتر ہے۔ نشتر کی نوک کے آگے خون کی کیا مجال کہ باہر نہ نکلے"۔ بالفاظِ دیگر میرے حق مین "احسان" کا وجود ہی نہین۔ اس لئے کہ مین اُس کی زندگی ہون۔ جب مین ہی اس سے جدا ہو گیا۔ تو وہ کس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔

اسی مفہوم کو دوسری جگہ پھر نظم کیا ہے۔ فرماتے ہین:۔

بختم از ہمت بے حامیم داشت نشان برق گردیدم و بر خرمنِ احسان رفتم

چونکہ قسمت میری یاور تھی۔ اس لئے ازل سے ہمت ساتھ لایا تھا۔ گو اس سے حاصل کچھ نہ ہوا۔ لیکن سہارا تو تھا۔ لہذا مین نے بجلی بنکر خرمنِ احسان کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ نہ دنیا مین احسان کا وجود ہوگا۔ اور نہ دنیا کی اسباب

تنگ و عار میں طوفان نظر آئے گا۔"

عرفی نے صرف خود "احسان" کا بار نہیں اٹھایا لیکن آصفی نے سرے سے احسان کا وجود ہی مٹا ڈالا۔ بغور پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ گو عرفی کا شعر بھی اپنی جگہ خوب ہے۔ لیکن آصفی کے دونوں شعر خوب تر اور مضبوط ترین ہیں
آگے چلکر آصفی نے پھر یہی مضمون نظم کیا ہے۔ لیکن قافیہ اور ہے۔ اس لئے جدت زیادہ نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں۔

در جہانے، کہ خموشی نہ کشد ننگ سوال	حرفِ احسان شدم، از یاد کریمان رفتم

سبحان اللہ! شاعر کے تخیل میں ایسی دنیا بھی موجود ہے۔ جہاں خاموشی، سوال کو باعثِ ننگ سمجھتی ہے۔

عرفی	از پریشانیٔ دل سوختم و بہرِ علاج	ہم بدریوزۂ دلہائے پریشان رفتم
آصفی	اندرین دشت بدوشِ طلبِ نالۂ شوق	چون جرس، از دلِ شوریدہ پریشان رفتم
عرفی	زان شکستم کہ بدنبالِ دلِ خویش مدام	در نشیب شکنِ زلفِ پریشان رفتم
آصفی	صورتِ نغمۂ نے، از غمِ این کوچۂ تنگ	ہر نفس دست بدیوار و پریشان رفتم

مضمون طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے ان قوافی پر تم خود غور کرو۔ آصفی نے یہ دونوں شعر بھی عرفی سے بہتر لکھے ہیں۔ آصفی کے یہ شعر بھی لطافت در دامن کے جا سکتے ہیں:۔

گردشِ ساغرِ این بزم دماغم آشفت	صورتِ ہوش، نہ ہم بزمیِ مستان رفتم
نشۂ فطرتِ من، در خورِ ہر مغز نبود	جوشِ صہبا شدم از شیشۂ امکان رفتم
برگ برگ چمن دہر خزانی دیدم	شورِ بلبل شدم از سیرِ گلستان رفتم
کلفتِ خاطرِ من بود پریشان آہنگ	گرد بادے شدم و سوئے بیابان رفتم
عشرتِ ہستی من بود ز تلخیٔ حیات	نوش جستم پئے زہرابۂ ثعبان رفتم
رمز نشگفتم از خندۂ گلہائے بہار	زین چمن، غنچہ صفت، سر بگریبان رفتم
کوچۂ زخمِ دلِ بسمل حسرت جستم	بر قفائے اثرِ شوخیٔ پیکان رفتم
بسکہ کوچک دلِ آبلہ پا دل داد	راہِ صحرائے جنون با بن دندان رفتم
کار دانم ز قفا دیدۂ غارت میداشت	خوابِ شیرین شدم از چشمِ نگہبان رفتم
یاس گردید رفیقِ سفرِ ناکامی،	بخت نازد کہ سبکسار ز ہجران رفتم
شوخیٔ حسن برسوائیٔ نظارہ کشید	دامن آلودہ تر از بادِ بہاران رفتم

(باقی)　　　　خان امتیاز علی عرشی

پھر بحث سنت

(بہ سلسلۂ ماسبق)

معنوی بحث آیندہ صفحات مین مدعی کے اُن وعدون پر بحث ہے، جنکا تعلق معنوی مباحث سے ہے، موصوف نے اپنے تازہ مضمون کے دو نمبر لکھے ہین۔ اور یہ ایک مین اپنے دعوی انکار حدیث یا تذبذب فی الحدیث کے کچھ دلائل دئے ہین۔ ذیل کے صفحات مین بہ ترتیب، پہلے اُن کے پہلے نمبر کے، اور بعد کو اونکے دوسرے نمبر کے دلائل پر نظر کرنا ہے، پہلے نمبر مین دو حسب ذیل دلیلین ہین۔ جنکو بڑے غور و فکر کے بعد دلیل کی حسب ذیل صورت مین کوئی مرتب کرسکتا ہے:

۱۔ کتب حدیث مین جو عقائد اور مسائل مذکور ہین وہ یہودیون کے عقائد اور مسائل سے ملتے جلتے ہین، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ یہودیون سے ماخوذ ہین۔

۲۔ حدیثون کی روایت اور کتب حدیث کی تدوین تمامتر عجمیون نے کی ہے۔ اس لئے یہ اعتبار کے قابل نہین۔

یہی اونکی دو عروۃ الوثقیٰ دلیلین ہین جو پرانی "مولویانہ منطق" کے مغالطۂ عامۃ الورود کی طرح اس جدید مذہبی محقق کے ہر مضمون اور ہر تحقیق مین بار بار دہرائی جاتی ہین۔

حدیث کے عقائد اور مسائل میں یہود کی مشابہت مین یہ سمجھنے سے عاجز ہون کہ ایک طرف تو وہ تمام آسمانی مذاہب کے برحق اور من جانب اللہ ہونیکے قابل ہین، دوسری طرف تورات یا یہودیون کے بعض عقائد اور مسائل مین مشابہت ہونیکی وجہ سے بلا تمیز تمام احادیث و سنن سے یکسر دست بردار ہوجانیکو آمادہ ہین، کیا وہ سر ولیم مور یا دوسرے عیسائی مصنفین کے طعنون سے گھبرا کر اسی دلیل کے رو سے قرآن پاک سے بھی دست بردار ہوجانیکو آمادہ ہین، عقیدۂ توحید، عقیدۂ نبوت و رسالت بعض جانورون کی حرمت، نکاح و طلاق و مہر وغیرہ اور بہت سے احکام اور قصص قرآن و تورات مین، اور عقیدۂ قیامت، اور عقیدہ جنت و دوزخ قرآن و انجیل مین مشترک ہیں، تو کیا موصوف یہود و النصاری کی اس مشابہت سے گھبرا کر وہ ان تمام اُصولون سے منحرف ہوجائینگے، حالانکہ اگر یہ سچ ہے کہ یہ تمام مذاہب ایک ہی سرچشمۂ آسمانی سے نکلے ہین۔ تو ان مین یہ مشابہت و مماثلت ناگزیر ہے، اور خود قرآن نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے

۲۔ ان ھذا لفی الصحف الاولی صحف ابراھیم وموسیٰ۔	بیشک جو یہ قرآن مین ہے، وہ اگلی کتابون مین بھی ہے، ابراہیم اور موسیٰ کی کتابون مین ہے۔
شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ الخ (شوریٰ)	اور دین مین سے وہی شرع بنایا تمہارے لئے جو نوح سے وصیت کی تھی اور جو تمہاری طرف وحی بھیجی اور جو ابراہیم اور موسیٰ و عیسیٰ کو وصیت کی۔ الخ
ما یقال لک الا ما قد قیل الرسل من قبلک (حم سجدہ)	تجھ سے (اے محمد) نہین کہا جاتا، لیکن وہی جو تجھ سے پہلے پیغمبرون سے کہا گیا۔
اولئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ (انعام)	یہی وہ پہلے پیغمبر ہین جنکو خدا نے سیدھی راہ دکھائی تو تو بھی انھین کی راہ کی پیروی کر۔

آخر مین وہ آیت پیش ہے، جس مین لفظ سنت بھی موجود ہے، نکاح وطلاق اور محرمات کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے۔

یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم ویتوب علیکم واللہ علیم حکیم ○ (نساء۔ ۵)	اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تمکو اگلی قومون کی سنتون کی ہدایت کرے اور تمکو معاف کرے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔
انہ لفی زبر الاولین (شعراء)	یہ پہلون کی کتابون مین ہے۔

اس بناء پر اہل کتاب کے احکام سے صرف مشابہت اور مماثلت خطاکاری اور غلطی کی دلیل نہین ہے، جبتک یہ نہ ثابت ہوجائے کہ یہ قرآن پاک یا سنت صحیحہ سے ثابت نہین یا وہ اونکے خلاف ہے۔

اگر بعض یہود کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت موسیٰ کو خدا کی طرف سے زبانی ایسے احکام بھی ملے تھے جو تورات مین نہین اور جو ڈیڑھ ہزار برس تک سینہ بہ سینہ نقل ہوتے چلے آئے اور حضرت عیسیٰ کے عہد سے پس وپیش زمانہ مین تحریر کی صورت مین مدون ہوئے، تو نفس یہ عقیدہ یا یہ اصول قابل الزام نہین، بلکہ ان زبانی احکام کا صحیح طریقہ سے حضرت موسیٰ تک ثبوت نہ پہنچ سکنا۔ اور اس عدم ثبوت پر بھی اونکو تسلیم کرنا اور اونکو تورات پر مرجح کرنا قابل الزام ہے۔ اس لئے یہودیون کے بعض عقائد ومسائل سے کسی نہ کسی طرح صرف مشابہت ومماثلت دکھا دینے سے کوئی چیز صحیح یا غلط نہین ہوسکتی، جب تک اوسکے ساتھ اس بات کے دلائل نہ ہون، کہ یہ امور کلام الٰہی سے ماخوذ نہین ہین۔

یہودیون کے تمام عقائد، احکام اور مسائل یک قلم سرتاپا غلط، محرف اور باطل نہین ہین کہ کسی عقیدہ یا مسئلہ کی نسبت یہ کہدینا کہ یہ یہودیون کے ہان بھی ہے، اوس عقیدہ یا مسئلہ کی غلطی ثابت کرنے کے لئے کافی ہوجائے، ایسا کہنا بقول صاحب مضمون "فلسفۂ مذہب" "تاریخ مذاہب" اور "اقوام سامیہ کے لٹریچر" سے ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے، اور اگر ایسا ہی اس مشابہت ومماثلت سے گریز ہے، تو وہ نازنچگانہ کی سند سامی مذاہب وصحف کے حوالون سے کیون مانگا کرتے ہین۔

احادیث وسنن کی تدوین مین عجمی ہاتھ

یہ واقعہ تاہم صحیح ہے کہ احادیث وسنن کی ترتیب وتدوین مین اہل عرب سے زیادہ اہل عجم کی کوششین شامل ہیں، لیکن یہ نہ صرف احادیث وسنن کے ساتھ واقعہ ہوا بلکہ تمام اسلامی علوم خواہ وہ دینی ہون یا دنیاوی سب کے ساتھ یہ واقعہ ہے۔ اس سے ابن خلدون کے نظریہ کے مطابق اہل عرب کی علوم سے غفلت یا فطری نامناسبت ثابت ہو تو ہو، مگر اس سے یہ کہان ثابت ہوتا ہے کہ اس لئے یہ غلط ہین کہ انکو اہل عجم نے مدون کیا، کیا نعوذ باللہ ہر غیر عرب مسلمان منافق تھا، یا اسلام کے مٹانے کے درپے تھا، یا قرآن کی تحریف کے لئے کوشان تھا کہ یہ کہدیا جائے کہ یہ کام غیر عرب مسلمانون نے کیا ہے، اس لئے یہ غلط ہے، کیا قرآن کی پیشین گوئی والذین لم یلحقوا بھم (کہ اور اون قومون کے لئے بھی محمدؐ رسول ہین جو ابتک مسلمان نہین ہوئین بلکہ آیندہ مسلمان ہونگی) کی صریح مخالفت نہین۔

اور اگر اس اصول کو مان بھی لین کہ غیر عرب مسلمان کے ہر کام کو شبہ اور خطرہ کی نظر سے دیکھا جائے تو پھر اُسکے لئے دوسری اور تیسری صدی اور تیرہوین اور چودہوین ہجری مین فرق کیون کیا جائے۔ جبکہ اوس زمانہ سے آج علم اور دیانت دونون کم ہین، اسی اُصول کی بنا پر بخارائے محمدؐ بن اسماعیل بخاری، ترمذ کے ابو عیسیٰ ترمذی، اور نیشاپور کے مسلم بن حجاج نیشاپوری، نیز بجنور یا الہ آباد اور امرتسر یا لاہور کے اہل تحقیق، سب کے کام، اور سب کی باتین، اور سب کی تحقیقات مشتبہ اور پر خطر ہین، کیون دوسری اور تیسری صدی کے غیر عرب اہل علم کو منافق، مخالف دین، محرّف قرآن باور کیا جائے اور تیرہوین اور چودہوین صدی کے غیر عرب محققین پر منافق، مخالف دین اور محرف قرآن ہونے کا الزام نہ لگایا جائے، اگر ساقط الاعتبار ہین تو دونون، اور اعتبار کے لائق ہین تو دونون، اگر گذشتہ غیر عرب یہودیت ومجوسیت سے متاثر ہونے کی بنا پر قابل الزام تھے، تو آج کے اہل تحقیق، عیسائیت، افرنگیت، یورپیت اور مستشرقیت کے اثر سے متاثر ہین، اگر دوسری اور تیسری صدی کے غیر عربون کی عربی مادری زبان نہ تھی تو آج کے غیر عرب خصوصاً ہندوستانی اہل تنقید کی زبان عربی بدرجۂ اولےٰ مادری نہین۔

لیکن آئیے ہم آپ مل کر مصالحت کا راستہ نکالین، اور وہ یہ ہے کہ ہم آپ صرف اون احادیث وروایات کو تسلیم کرلین جو قرون اولےٰ کے عرب مصنفین نے قبول کئے ہین، روایات وانساب سے تحقیق کرکے کہ امام شافعی تو عرب مکہ کے باشندے، اور خاص قریش کی نسل سے تھے، اسی طرح امام مالک تو خاص عرب، مدینہ کے باشندے اور یمن کی قحطانی نسل سے تھے، ان دونون خالص عربون نے جو روایتین کی ہون، اور اپنی کتابون مین درج کی ہون، اونکو صحیح مان لین، امام شافعی کی مرویات جو کتاب الام وغیرہ اونکی کتابون مین ہین وہ مسند شافعی مین جمع ہین، اور امام مالک کی روایتین موطا مین ہین، ان دونون عرب مدونین حدیث وجامعین سنن پر شبہ نہین بلکہ مین درگذر کرکے صرف موطا پر قناعت کرنے کا مشورہ دیتا ہون جس کا نہ صرف جامع ومدوّن، بلکہ اوسکے اکثر راوی تک عرب ہین، اور جسکی حدیثون مین صحابی اور جامع کتاب مین

صرف ایک یا دو راویوں کا فصل ہے، اور یہ وہ راوی ہیں، جن کے اعتبار و استناد میں شبہ نہیں کیا جا سکتا، کیا یہ پیغام صلح منظور ہے؟

چند اور "دلائل" موصوف نے مضمون کے دوسرے نمبر میں اپنے دعوے کے ثبوت میں چند اور "دلائل" پیدا کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

۱۔ صحابہ اور تابعین تک یہودیوں سے روایات اخذ کرتے تھے،

۲۔ متعدد اشخاص وضع احادیث کے مجرم تھے، اور جعلی حدیثیں بناتے تھے۔

۳۔ کتب احادیث میں بہت سی ضعیف یا غیر صحیح حدیثیں ہیں۔

سب سے پہلے میں اپنے محقق دوست کو اونکی اس محنت و جانفشانی کی داد دیتا ہوں، جو اونھوں نے اپنے ان معلومات کے لئے جنکی اس نمبر میں جا بجا نمائش کی گئی ہے کی ہے، اور اسوقت اردو کی وقعت میری آنکھوں میں دو چند ہو جاتی ہے کہ اب اوس میں ہر قسم کے معلومات کا اتنا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس اوس میں سے مطلوبہ معلومات حاصل کر کے اچھا خاصہ وزندار اور رعب انداز مضمون، اصل کتابوں کے حوالہ سے لکھ سکتا ہے، اور اپنے معلومات سے اردو خوان ناظرین کو مرعوب کر سکتا ہے۔

موصوف نے حدیث و اصول حدیث و رجال کی بڑی بڑی کتابوں کے حوالے دئے ہیں، مگر خیریت ہے ایک کے بھی مقام، باب یا صفحہ کسی چیز کی تعین نہیں کی ہے، کیا ہمارے دوست کے اصل ماخذ میں بھی ان کتابوں کے اسی طرح حوالے ہیں، اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ پرانے مولویوں کا قاعدہ تھا تو موصوف کا عذر ظاہر ہے، تاہم تنقید بخاری وغیرہ کا نام لینا بھی کیا برا تھا، کیا اردو کی کسی کتاب کے حوالہ سے یا کسی دوسری کتاب سے بے حوالہ کچھ لے لینے سے لکھنے والے کی قدر و منزلت لوگوں کی نگاہوں میں کچھ کمی تھوڑی ہی آجاتی ہے۔

بہر حال ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں، کہ ہمارے دوست کے معلومات "سکنڈ ہینڈ" نہیں ہیں، بلکہ خود اونکی محنت و کوشش کے نتائج ہیں، اس پر یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ اونھوں نے اصل کتابونکے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی، یا مطالب میں دانستہ تحریف کی،

موصوف نے لکھا ہے،

"ایک دوسرا خطرناک پہلو اسرائیلیات کا ہے، جس سے خود اصحاب مثل ابن عمر، ابوہریرہ، ابن عباس بھی نہیں بچے"،

پھر اس دعوے کے ثبوت میں وہ ابو الامداد ابراہیم کے حاشیۂ النخبۃ الفکر سے حسب ذیل اُردو عبارت نقل کرتے ہیں:-

"جو صحابہ بنی اسرائیل کے واقعات ماخوذ کرنے والے ہیں۔ وہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت

علیؓ ہیں، اور جو اصحاب ان سے لیا کرتے ہیں وہ عبداللہ بن سلام، اور بعض نے کہا عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں، کہ جب شام کا ملک فتح ہوا تو ایک بار اونٹ (؟) یہود و نصاریٰ کی کتابیں لاتے اور ان میں واقعات بیان کرتے، پس عمرو بن عاص (؟) سے لوگ ان واقعات کو ماخوذ کر لیا کرتے، اسواسطے ان کی حدیثیں کم ہیں، مگر وہ باتیں جو کثرت سے ان سے منقول ہیں وہ صرف اخبار و قصص بنی اسرائیل اور روایات اہل کتاب کی ہیں۔ کہ انکی حدیثیں ابوہریرہ سے بھی زیادہ ہیں۔"

اول تو ابوالامداد ابراہیم نامی صاحب کوئی بڑے پایہ کے آدمی نہیں جنکے سرسری بیانات یوں مان لئے جائیں، دوسرے یہ کہ دنیا یہ راز" جانکر حیرت میں رہ جائیگی کہ اس میں ابوالامداد صاحب کا آتنا قصور نہیں جتنا ہمارے محقق کا، اس "طرز تحقیق" کی کوئی حد ہے کہ لوگوں کی اصل عبارتوں میں بیجا تصرف کر لیا جائے، دنیا میں کون شخص ہے جو یہ کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علیؑ بنی اسرائیل سے واقعات اخذ کرتے تھے، یہ علمی بیباکی کی انتہا ہے۔

ابوالامداد نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل اسکا اُلٹا ہے، اوسکی اصل عبارت مع ترجمہ حسب ذیل ہے:-

ومثال الصحابي الذي لم يأخذ من الاسرائيليات ابوبكرؓ عمرؓ عثمانؓ وعليؓ، ومثال من اخذ عنها عبدالله بن سلامؓ وقيل عبدالله بن عمرو بن العاص فانه لما فتح الشام اخذ حمل بعير من كتاب اهل الكتاب كان يحدث منه،	اوس صحابی کی مثال جس نے اسرائیلیات سے اخذ نہیں کیا، ابوبکر وعمر وعثمان وعلی (رضی اللہ عنہم) ہیں اور اوسکی مثال جس نے اسرائیلیات سے اخذ کیا عبداللہ بن سلامؓ ہیں، اور کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں کیونکہ جب شام فتح ہوا تو اونھوں نے ایک بار شتر کتابیں اہل کتاب کی لیں اور وہ ان کتابوں سے روایت کرتے تھے۔

غور کیجئے کہ اس عبارت میں حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علیؑ کے اسمائے مبارکہ اون صحابہ کی مثال میں ہیں جنھوں نے اسرائیلیات کو ہاتھ نہیں لگایا، مگر محقق جدید عبارت کا غلط ترجمہ کرکے کس دلیری سے ان بزرگوں کو اسرائیلیات کے راویوں میں شامل کرتا ہے، حالانکہ اسرائیلیات سے روایت کرنے والوں میں صرف ایک نام اس میں قطعی طور پر لیا گیا ہے، اور وہ عبداللہ بن سلام کا نام ہے، اور بطور ایک کمزور رائے کے عبداللہ بن عمرو بن عاص کا نام گنایا ہے اور فتح شام میں اہل کتاب کے ذخیرہ کتب اونکے ہاتھ لگ جانے اور اونکے واقعات بیان کرنے کا ذکر ہے، مگر یاد رہے کہ یہ کمزور رائے سراسر کمزور ہی ہے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کتابیں اونکو ملی ہوں، مگر اونکے واقعات بیان کرنے اور اُسکے بعد یہ اظہار خیال کہ اسواسطے اون کی حدیثیں کم ہیں، اور اخبار و قصص بنی اسرائیل اون سے زیادہ مروی ہیں، اور اس لئے اونکی حدیثیں ابوہریرہ سے زیادہ ہیں یہ تمام دعوے یکسر غلط ہیں، نہ تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیثیں اونکی اسرائیلیات سے کم ہیں، اور نہ اون سے بکثرت اسرائیلیات مروی ہیں، اور نہ اونکی روایتیں حضرت ابوہریرہ سے تعداد میں زیادہ ہیں، یہ دعوے غلط در غلط ہیں،

اور ابوالامداد ابراہیم کے اوہام ہیں۔

واقعہ یرموک حضرت عمر کے عہد خلافت کا واقعہ ہے، مال غنیمت میں اگر اس قسم کی کتابیں آتیں، تو کتب فتوح میں انکا ذکر ہوتا، پھر حضرت عمر کے عہد میں یہ کتابیں ہاتھ آتیں تو شخصی تصرف میں کبھی نہ آتیں، اور نہ حضرت عمر ایسی بلائے عظیم افراد کے ہاتھ میں دینے والے تھے، اور مجھے اس میں بھی شک ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص جنگ یرموک میں شریک بھی تھے؟ تاہم وہ اون صحابہ میں تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور سب سے پہلے صحابی ہیں جو خود آنحضرت صلعم کے عہد میں احادیث نبوی کو قلم بند کر لیا کرتے تھے، اور اسی لئے حضرت ابوہریرہ نے یہ کہا ہے کہ مجھ سے زیادہ صحابہ میں کوئی حدیث جاننے والا نہ تھا، اِلّا عبداللہ بن عمرو بن عاص، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا (دیکھو صحیح بخاری باب کتابتہ العلم) بایں ہمہ اونکی روایتیں حضرت ابوہریرہ سے کم ہیں کہ اونکی سات سو اور ابوہریرہ کی ۵۳۷۴ ہیں، علاوہ ازیں جنھوں نے یرموک میں کتابوں کا اونکے ہاتھ لگنا بیان کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ان کتابوں سے روایت ناپسند کرتے تھے (لسان العرب و مجمع البحار لفظ ثنا و ثنی) اور اگر کبھی کرتے تو لوگ اون سے کہدیتے کہ نہیں رسول کی حدیث سنائیے (فتح المغیث سخاوی ص ۱۵ نولکشور)

نیز یہ واقعہ بھی کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص اسرائیلیات کے بڑے راوی ہیں، سراسر غلط ہے، اگر کسی کو توفیق ہو تو مسند احمد بن حنبل میں اونکی روایتوں پر ایک نظر ڈال کر میری تصدیق کر لے، البتہ یہ صحیح ہے کہ وہ صحف تورات سے واقف تھے، جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آنحضرت صلعم کی توراۃ میں پیشگوئی کے حوالہ سے ظاہر ہے۔ باقی رہے عبداللہ بن سلام تو ظاہر ہے کہ وہ یہودی عالم تھے، اور بعد کو آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے، اونکا اسرائیلیات کا ذکر کرنا چنداں تعجب انگیز نہیں، لیکن خود صحابہ اونکی اسرائیلی روایتوں کو ناپسند کرتے تھے، اسکی مثالیں حدیثوں میں مذکور ہیں، مگر اس قسم کی روایتوں کو وہ خود صحف انبیاے اسرائیل کے حوالہ سے نقل کرتے تھے، رسولؐ اسلام کے حوالہ سے حدیث کہکر نہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارے دوست کا حضرت عبداللہ بن عمر کا نام لینا سراسر سہو و مسامحت ہے، حضرت عبداللہ بن عمر یعنی عبداللہ بن عمر بن خطاب سب سے بڑے متبع سنت تھے، انکو اسرائیلیات سے کوئی لگاؤ نہ تھا، شاید مضمون نگار کو اون پر عبداللہ بن عمرو (ابن عاص) کا دہوکا ہوا۔

حضرت ابن عباس کے نام سے بیشک تفسیروں میں اسرائیلی قصے مذکور ہیں، مگر محققین کی تصریح ہے کہ یہ حضرت ابن عباس کا کام نہ تھا، بلکہ زیادہ تر بعد کے لوگوں نے اونکی طرف انکو منسوب کر دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ نے چند اسرائیلی قصے بیان کئے ہیں، مگر اونھوں نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اونھوں نے کس سے سنا کیونکہ اونھوں نے خود کہدیا ہے کہ میں نے تورات نہیں پڑھی (بخاری بدء الخلق) اور سخاوی نے تصریح کی ہے کہ وہ اہل کتاب سے نہیں لیا کرتے تھے۔

اس تشریح و تفصیل کے بعد گذارش ہے کہ اسرائیلیات کا موضوع قصص و حکایات ہیں، احکام و سنن نہیں،

بنی اسرائیل سے اگر کسی ایک صحابی نے یا تابعی مفسروں نے واقعات نقل کئے ہیں تو وہ آسمان و زمین کی پیدائش، عجائب عالم پیغمبروں کے قصص اور پیشنگوئیاں ہیں، وہ احکام اور سنن اور امر و نواہی نہیں، اور یہاں گفتگو احکام و سنن اور اوامر و نواہی میں ہے، اور اسی سے اسرائیلیات کا پہچان لینا فن حدیث کی معمولی مہارت سے بھی نہایت آسان ہے۔

پھر تمام محدثین اور آئمہ حدیث اور علماء نے ان اسرائیلیات کا غیر معتبر ہونا بتصریح لکھدیا ہے اور اس قسم کی روایتوں کو گنا دیا ہے، اور اونکی علامتیں بتا دی ہیں، اور ان اسرائیلیات کے نقل کرنیوالے زیادہ تر کعب احبار، ابن منبہ وغیرہ نو مسلم یہودی ہیں، اسی لئے اونکی روایتوں کا جو رتبہ علمائے حدیث کے نزدیک ہے وہ اس فن کے ادنے طالبعلم پر بھی واضح ہے۔

غلط ترجمہ

حافظ ابن کثیر کا یہ قول کہ "ابن عباس بنی اسرائیل سے واقعات اخذ کرلیا کرتے تھے" معلوم نہیں مضمون نگار نے کہاں سے لیا ہے، کیونکہ اس میں اوس نے کتاب تک کا بھی حوالہ نہیں دیا، مگر بہرحال حافظ ابن کثیر کا جو عربی فقرہ نقل کیا ہے، اوسکا عربی ترجمہ تمامتر غلط کیا ہے، اور غلط نتیجہ نکالا ہے، حافظ موصوف کا حسب ذیل فقرہ نقل کیا ہے۔

وکان ابن عباس تلقاہ من الاسرائیلیات　　　　اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ :-

"یہ واقعہ ابن عباس نے اسرائیلیات سے لیا ہے"

اس فقرہ کا مطلب اسی قدر ہے کہ ابن عباس نے کوئی مخصوص واقعہ اسرائیلیات میں سے نقل کیا ہے نہ کہ عموم و استمرار عادت جو مضمون نگار نے ترجمہ سے ظاہر کیا ہے کہ :-

"ابن عباس بنی اسرائیل سے واقعات کو اخذ کرلیا کرتے تھے"

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا،

ایک اور تحریف

مضمون نگار نے حافظ ابن حجر کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ :-

"یاخذ من کلام غیرہ کبعض السلف الصالح او قدماء الحکماء او الاسرائیلیات"

یہ نہیں لکھا کہ ابن حجر کا یہ قول کہاں سے اوسکو ہاتھ آیا، توجیہ النظر شرح نخبۃ الفکر میں یہ عبارت موجود ہے، مضمون نگار نے ابن حجر کے اس قول کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے :-

"ابن عباس کبھی لے لیا کرتے تھے دوسروں کے کلام ماسوائے رسول اللہ صلعم کے جیسے بعض سلف صالحین کی باتیں، یا قدیم زمانہ کے حکماء کا کلام یا بنی اسرائیل کے واقعات"

مضمون نگار نے اس تحریف میں سب سے بڑی جرأت اور دلیری کی ہے، کہ اس عبارت میں ابن عباسؓ کا نام نامی کوسوں نہیں ہے، اونکا اشارہ تک بھی نہیں ہے، پھر یہ کہ واقعہ کی صورت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے، بلکہ فرضی صورت بیان کی گئی ہے، اصل عبارت مع ترجمہ حسب ذیل ہے :-

ثم المروی قد یخترعہ الواضع وتارۃ یاخذ من کلام غیرہ　　　　پھر روایت کو یا تو جعل بنانے والا خود گڑھ لیتا ہے اور یا کبھی وہ

کبعض السلف الصالح اوقدماء الحکماء او الاسرائیلیات (صفحہ ۴۱ مطبوعہ فاروقی) | غیر رسول جیسے بعض سلف صالح یا قدیم حکماء یا اسرائیلیات کے کلام سے لے لیتا ہے"

اللہ اکبر! اس عالمانہ جراًت، فاضلانہ دلیری اور محققانہ بیباکی کی مثال کہیں مل سکتی ہے؟ حافظ ابن حجر تو یہ کہتے ہیں کہ جعلی حدیث بنانیوالا کبھی خود عبارت گڑھ کر حدیث بنا لیتا ہے، اور کبھی دوسرے سلف صالحین یا پرانے حکماء اور یا اسرائیلیات کی باتوں کو حدیث بنا کر پیش کرتا ہے، اس کو نعوذ باللہ حضرت ابن عباس کا فعل بتانا، کس درجہ گستاخی ہے، مضمون نگار کا اس عبارت میں واضع کو جو فاعل ہے حذف کرکے، ترجمہ میں حضرت عباس کا نام بڑھا دینا، میں نہیں جانتا کہ اسکو فن اخلاق کی کس اصطلاح سے تعبیر کروں۔ اسرار وجود کے متعلق قرآن سے زائد معلومات کی اہل عرب کو تلاش ہوتی تھی جیسا کہ نفس انسانی کی فطرت ہے، تو وہ اہل کتاب سے دریافت کرنے سے، جو اونھیں کی طرح اونکے ملک میں بدوی تھے اور سنی سنائی باتیں جانتے تھے وہی باتیں وہ اون سے بیان کردیتے تھے، اور یہ زیادہ تر مین کے حمیر قبیلہ والے تھے جو اسلام سے پہلے یہودی تھے، اس کے بعد موصوف نے لکھا ہے،

فلما اسلموا بقوا علی ماکان عندھم مما لاتعلق لہ بالاحکام الشرعیۃ التی یحتاطون لھا مثل اخبار بدء الخلقۃ وما یرجع الی الحدثان والملاحم وامثال ذالک، وھولاء مثل کعب الاحبار ووھب بن منبہ وعبداللہ بن سلام وامثالھم فامتلأت التفاسیر من المنقولات عندھم۔

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

"تو جب یہ (حمیری یہودی) اسلام لائے تو جو معلومات اونکے پاس ایسے تھے جن کا کوئی تعلق اون شرعی احکام سے نہ تھا جسکے لئے وہ احتیاط کرتے تھے (بلکہ اون کا تعلق قصص وغیرہ سے تھا، جیسے آغاز آفرینش کے حالات، یا پیش آنیوالے حوادث اور فتنوں کی پیشین گوئیاں اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے متعلق وہ اون پر قائم رہے، اور یہ لوگ کعب احبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام اور اونکے جیسے دوسرے اشخاص ہیں تو نقلی، تفسیریں اونکی منقولات سے بھر گئیں"

ذرا اس عبارت کو مضمون نگار کے ترجمہ سے ملا کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اوس نے اپنے مطلب کے لئے کہاں کہاں الفاظ گھٹائے اور بڑھائے ہیں۔

یہ بے معنی الفاظ "تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کیجاتی ہے تعلق نہ تھا"، سراسر محرف ہیں، حکیم ابن خلدون کا تو یہ کہنا ہے کہ اسلام کے شرعی احکام کے علاوہ جن میں وہ پوری احتیاط کرتے تھے، آغاز پیدائش وغیرہ کے وہ قصے جنکی تفصیل قرآن میں نہیں، اور جن سے ان اہل کتاب کو واقفیت تھی، اہل عرب ان سے اونکو پوچھتے تھے، اور وہ بیان کرتے تھے۔

اسی طرح "قرب قیامت کی نشانیوں" کے الفاظ شاید مضمون نگار نے ملاحم کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ یہود کا اکثر حصہ سرے سے قیامت ہی کا قائل نہیں، قرب قیامت کے کیا معنی، ملاحم کے معنی فتنہ انگیز لڑائیوں کے ہیں اور محدثین فتنوں کے معنی میں یہ الفاظ بولتے ہیں۔

"جنتوں کی خبریں" کے الفاظ ابن خلدون کی عبارت میں سرے سے نہیں، یہ مطلب خیز اضافہ، موجودہ عہد دیانتداری کی

بہترین مثال ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے نہایت بے احتیاطی سے ایک ساتھ تمام دنیا کو احادیث کے مزخرفات میں شمار کر دیا ہے، کہتا ہے:۔

"نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح ترحدیثوں میں قصص ہوشربا، زمانِ ماضیہ کے عجیب و غریب واقعات، زمین کی پیدائش، اسکا قیام، زلزلہ، پہاڑ اور درخت حیوانات، انسان کی پیدائش کے حیرت افزا حالات، آسمان، چاند و سورج (؟) عرش، کرسی، لوح محفوظ، فرشتوں، بادلوں، بجلی رعد کی داستانیں، قبر کا عذاب، میزان، پل صراط، دوزخ و جنت، حور و قصور کے حیرت افزا کرشمے، معراج آسمانی، معجزات پیدائش ونزول، جیسے دجّال۔ مہدیؑ، صحابہ اور اہلبیتؑ کے مناقب اور مثالب، انکی مذمت و (؟) قیامت کی پیشین گوئیاں، بادشاہوں کے جور و ستم، اور انکی برائیاں، قربانی اور اسکا ثواب، حلال و حرام جانور، حدِ زنا، پاکی و ناپاکی اور ارکانِ دین کی باریکیاں جبل شرعی (؟ حیل شرعی) غرض جسقدر خرافات اہل کتاب کا قرآن نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ان سب سے حدیث، فقہ اور تفسیر پٹ گئی"

ہمارے دوست نے ایک سانس میں حق و باطل، رطب و یابس صحیح و غلط کی بیسیوں مثالیں ایک ساتھ لکھ ڈالیں، حالانکہ صحیح تر حدیثیں ان میں سے اکثر خرافات سے تامتر پاک ہیں، آغاز آفرینش، پہاڑ، زلزلہ، بادل، معجزات پیدائش وغیرہ کے حیرت انگیز واقعات سے وہ مبرا ہیں، باقی باتیں وہ ہیں، جو کسی نہ کسی طرح خود قرآن مجید میں ہیں، یا وہ سرے سے مزخرف اور لغو ہیں، اور ان میں سے اکثر امور کے متعلق احادیث کا ضعیف موضوع اور ناقابلِ اعتبار ہونا، خود محدثین نے واضح کر دیا ہے، اور اون میں سے ایک ایک حدیث کو گنا دیا ہے۔ اور اونکے راویوں کو بتا دیا ہے اور اونکا بے اصل ہونا ثابت کر دیا ہے، اور اونھیں کا یہ احسان ہے جسکے سبب سے آپ اس قابل ہوئے کہ ان موضوعات کو شمار کرا سکیں، تو جن روایتوں اور باتوں کا بے اصل ہونا خود اونھوں نے ثابت کر دیا ہے، اونکو صحیح مان کر اون پر اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

"یہ تو صحابہ کا حال تھا، اور جنھوں نے صحابہ تک سند پہنچائی انکا حال بھی سُن لیجئے۔ ابن الحجر (؟) نخبۃ الفکر میں کہتے ہیں:۔ یاخذ حدیثا ضعیف الاسناد فیرکب لہ اسنادا صحیحا یعنی کسی لغو روایت کی اسناد ضعیف پاتے تو اوسکو سند سے ترکیب دے ڈالتے،

ابن حجر کی یہ عبارت نخبۃ الفکر میں تو نہیں ہے، البتہ توضیح النظر فی شرح نخبۃ الفکر میں ضرور ہے، مگر یہاں دو تحریفیں کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اس کا فاعل خود تابعین کو بنا لیا گیا ہے، حالانکہ زیرحوالہ کتاب میں اوسی پہلی عبارت کے بعد یہ فقرہ ہے جس میں فاعل "واضع" یعنی جالی حدیث بنانے والا ہے، نہ کہ تابعین، یا تبع تابعین یا کسی اور عہد کی تخصیص ہے، دوسری تحریف یہ ہے کہ ابن حجر نے اسکو بصورت واقعہ مستمرہ نہیں لکھا ہے کہ "پاتے اور اوسکو ترکیب دے ڈالتے"، بلکہ یہ لکھا ہے کہ جعلی حدیث بنانے کی مختلف صورتیں ہیں، یا نفس کوئی جھوٹا واقعہ گڑھ لے، یا بزرگوں اور حکیموں کے اقوال کو پیغمبر کی جانب منسوب کر دے یا یہ کسی حدیث کی سند ضعیف ہو تو اوسکے لئے اوسکے بجائے کوئی عمدہ سند بنا کر اوسکی روایت کر دے، یہ سب صورتیں ہیں، مضمون نگار کا

انکو صحابہ تک سند پہنچانیوالوں کی عمومی اور استمراری حالت ظاہر کرنا کتاب کی عبارت میں تصرف کرنا ہے، ترجمہ میں مضمون نگار نے جو تغیر و اضافہ کیا ہے، اوسکی شکایت کہانتک کیجائے۔

مقدمۂ ابن خلدون میں تحریف اسی سلسلہ میں مضمون نگار نے مقدمہ ابن خلدون کی ایک عبارت ان الفاظ میں نقل کی ہے:-

"جو لوگ یہودی تھے، جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کیجاتی ہے، لتعلق نہ تھا، مثلاً ابتدائے خلق اور قرب قیامت کی نشانیاں، اور جنگوں کی خبریں، وہ سب انکی وجہ سے مسلمانوں میں ابتک رہ گئی (؟)"

یہ بے معنی فقرے جنکا کوئی مطلب ہی نہیں سمجھا جاسکتا، حکیم ابن خلدون کا مفہوم نہیں، حکیم موصوف نے یہ لکھا ہے، کہ نقلی تفسیر میں رطب و یابس اور مقبول و مردود کی ہر قسم کی روایتیں بھر گئی ہیں، جسکا سبب یہ ہے کہ اہل عرب کے پاس کوئی سابق کتاب یا علم نہ تھا تو اسباب خلق دنیا، ابتدائے آفرینش وغیرہ وہ اسرائیلیات سے لے لیتے تھے۔

وضع احادیث اس سے بھی انکار نہیں کہ بعض لوگ جعلی حدیثوں کے بنانے کے مجرم تھے، نہ صرف یہ چند لوگ جن کے نام مضمون نگار نے لکھے ہیں، بلکہ اور بھی اشخاص اس گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن آئمہ حدیث، ماہرین رجالیوں اور محققین فن نے اس قسم کی ہر روایت کا پتہ لگایا ہے، اس قسم کے ہر راوی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا ہے، اور اس پر مبسوط کتابیں لکھی ہیں ابن ابی حاتم، ابن جوزی، مقدسی، سخاوی، شوکانی، سیوطی، ملا علی قاری، طاہر فتنی، وغیرہ کی موضوعات کی تفصیل میں کتابیں موجود ہیں، اور ان میں سے اکثر چھپ گئی ہیں، جن میں ایک ایک موضوع حدیث کو گنا دیا ہے، اور بتا دیا ہے اب اگر کسی کو اس پر بھی پورا اطمینان نہ ہو، تو وہ اس باب میں مزید تحقیق کرسکتا ہے، یا انکو مشکوک کہہ یا جاے، مگر اس کا یہ نتیجہ نہیں ہوسکتا کہ تمام احادیث کا بالکلیہ انکار کردیا جائے، اگر چند آدمیوں کا جھوٹا ہونا ہم پر ثابت ہوجاتا ہے، تو ہم کبھی بھی یہ نہیں کرتے کہ ہم بالکلیہ تمام آدمیوں کو جھوٹا سمجھ کر، دنیا کی تمام روایتوں اور باتوں کے تسلیم کرنے سے قطعی انکار کردیں۔

کتب حدیث میں ضعیف روایتیں یہ بھی صحیح ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں۔ مگر یہ بھی کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، علمائے حدیث اور آئمہ فن نے ان کتابوں پر تنقیدی بحثیں کرکے ہر ایک کا درجہ متعین کردیا ہے، اور جو چند واقعات آپ نے لکھے ہیں وہ اونھیں کی خوشہ چینی ہے، تاہم اگر آپکو اونکی تحقیقات پر بھروسہ نہیں، تو آپ خود اون اصولوں کے ساتھ جو فن میں مدون ہیں تحقیق مزید کرلیجئے، اس کا یہ نتیجہ تو نہیں ہوسکتا کہ سرے سے تمام کتابوں کو ساقط الاعتبار قرار دیدیجئے۔ فن کے اماموں نے خود صحیح بخاری پر تنقیدیں کی ہیں، اونکے بعض بدعتی راویوں پر اعتراض کئے ہیں، یہ آپ بھی مہارت فن کے بعد کرسکتے ہیں، یہ کوئی بُری بات نہیں،

چند اور بے بنیاد دعوے مضمون نگار لکھتا ہے:-

"حد ہوگئی کہ حضرت عائشہؓ تین برس میں آنحضرت صلعم سے بیاہی جاتی ہیں، اور چھ سال میں ان سے ہمبستری ہوتی ہے"

اللہ اکبر! یہ کذب وافترا! اپنے اس دعوے کی تائید میں مضمون نگار کوئی چھوٹی سی چھوٹی حدیث بھی پیش کردے، تو میں اوسکے تمام دعووں کو بے دلیل ماننے کے لئے تیار ہوں، احادیث میں جو کچھ ہے وہ تو یہ ہے کہ چھ یا سات برس میں نکاح، اور نو برس میں رخصتی، یا خلوت، آخر مضمون نگار کو اس دانستہ غلط بیانی سے کیا حاصل؟

ایک جگہ بکمال تحقیق فرماتے ہیں:-

"واضح ہو کہ التحیات خود ایک بدعت ہے جو نماز میں بعد کو زیادہ کی گئی اور حدیث سے ثابت نہیں اور اسطرح بہت سے ارکان کا اتلاف اور حذف جو حنفیوں میں ہے، اوسکی کوئی سند حدیثوں میں نہیں۔"

اس سرتاپا بے بنیاد اور بے دلیل دعوے کو کیا کہا جائے، کیا یہ ارشاد ہو سکتا ہے کہ یہ بدعت اسلام میں کب داخل ہوئی اور اسکی تاریخ کیا ہے؟ اور اس کا بانی کون ہے؟ ایک حدیث نہیں، بیسیوں حدیثوں سے التحیات کا ثبوت ملتا ہے، یہاں تک کہ صحابی فرماتے ہیں کہ "ہمیں آنحضرت صلعم اوس تاکید واہتمام سے التحیات سکھاتے تھے۔ جیسے قرآن کی سورہ" حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی۔ جسکی کتاب الصلوٰۃ میں اسکے متعلق حدیثیں نہ ہوں، میں آسانی کی خاطر حدیث کی چند کتابوں کا حوالہ دیتا ہوں، صحیح بخاری صحیح مسلم، ترمذی، ابوداود وغیرہ کتب معتبرہ کی کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد ملاحظہ فرمائے، اور تحقیق کی داد دیجئے، کیا اسی "مستشرقانہ تحقیق" کی ہم جاہل مولویوں کو دعوت دیجاتی ہے،

پھر التحیات کے سلسلہ میں حنفیوں کی تخصیص سمجھ میں نہیں آتی، یہ تو حنفی شافعی، مالکی، حنبلی، اہل حدیث، مقلد اور غیر مقلد، بلکہ شاید شیعوں میں بھی بلکہ تمام اسلامی فرقوں کی نماز کا ایک جزء ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے بنیاد دعوے کی ہمت ایک لکھا پڑھا آدمی کیونکر کرسکتا ہے۔

اشاعت اسلام میں رکاوٹ فرماتے ہیں:-

"کم سے کم میری ہمت نہیں پڑتی، کہ انگریزی پبلک کے ہاتھوں میں کوئی حدیث وفقہ وتفسیر کی کتاب دے سکوں، یا اس کے بعد مجھے امید باقی رہے گی کہ وہ اسلام کو قبول کرے گا۔"

ہاں بیشک آپکو یہ ہمت نہیں پڑسکے گی، جسکو خود اطمینان نہیں، وہ دوسروں کو اطمینان کیا دلاسکے گا۔ مگر دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں، جنکو اس پر اطمینان ہے اور وہ اوسکو نہ صرف "انگریزی پبلک" بلکہ تمام یورپ کی پبلک بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور وہ کامیاب ہیں، اور لوگ اونکو دیکھکر مسلمان بھی ہوجاتے ہیں، مگر آپ کی اس بے اطمینانی سے تو شاید ایک بھی مسلمان نہ ہوا ہو، کہ آپ کے اصلاح یافتہ نماز جسکا نقشہ آپ نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے اوسمیں اور اوسکی گرجا کی نماز میں کیا فرق ہے؟ کیوں صاحب! پُرانے یہودیوں اور مجوسیوں کی نماز کی نقالی تو سراسر گمراہی، جسمیں نعوذ باللہ، رسولِ اکرم، صحابۂ کرام، آئمہ علام، اور عامۂ مسلمین گرفتار ہوگئے، مگر نئے یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کی نقالی کیوں موجب برکت ہے؟ کیا اس لئے کہ آج اتفاقِ زمانہ سے وہ برسراوج اور ہمارے حکمراں ہیں، اپنی مجوزہ اسلامی نماز کا

کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"لیکن مجھے ہمیشہ یہ خلجان رہا کہ عجمیوں اور غیر حافظ قرآن کا نماز میں قرآن پڑھنا جبکہ (قرآن کتاب میں ہے) کیا اس طرح ممکن نہیں کہ امام قرآن کو اپنے سامنے منبر پر کھول کر حاضرین کی طرف منھ کرکے قرأت کے ساتھ پڑھے، اور پھر اسکے معنی و تشریح کرے جس طرح یہودی اور عیسائی اپنے معابد میں انجیل و توراۃ کے ساتھ عمل کرتے ہیں، اور قرآن کے ختم کے بعد رکوع و سجدہ میں خدا کی تسبیح کے ساتھ نماز ختم کردی جائے، پھر اسکے بعد خوش الحانی اور نغمہ کے ساتھ مناجات اور دعائیں مانگی جائیں"

لیکن مسلمان نمازی اگر آپ کے حسب مشورہ عمل کریں، تو کیا آپ کے بعد کوئی آپ ہی جیسا اور محقق کرکے نئی ینابیع القرآن یا ینابیع الاسلام نہ لکھ ڈالے گا، اور اسرائیلیات و نصرانیات فی الاسلام کا آپ سے بھی زیادہ تیز و تند طعن نہ دے گا، قدیم اہل کتاب کی مشارکت و مماثلت سے اس شدت کے ساتھ اظہار نفرت بھی، اور جدید اہل کتاب کے اسرائیلیات و نصرانیات کی طرف میلان بھی یہ تضاد کا عالم فہم سے بالاتر ہے، اور یورپ اپنی موجودہ پر تکلف مصنوعی نماز سے گھبرا کر اسلام کی سادہ، بے تکلف، بے تصنع اور فطری مکالمہ الہی کی طرف تڑپتا ہے، اوسکو اسلام کی اس اکیسویں صدی عیسوی کی مجوزہ اسلامی نماز سے کیا سکون قلب میسر ہو سکتا ہے کیا یہ چیز پہلے سے اوسکے پاس نہیں ہے؟

فلسفۂ شک اور احادیث

بالآخر ہمارے کرمفرما ان تمام محرف اور غیر ثابت دلائل کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:۔

"پس حدیث کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کی بنیاد اور اوسکا حلال و حرام اور اوسکا جواز و عدم جواز مشکوک روایات پر قائم ہو سکتا ہے، اور یا قرآن کے صریح احکام کے مقابل مشکوک کو ترجیح دیجائے گی، اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا تو کسی حدیث کو صرف اس لئے مان لینا کہ بخاری شریف کے مضمون میں موجود ہے، اگر بخاری پرستی نہیں تو اور کیا ہے"

مجھے نہایت خوشی ہے کہ ہمارے منکر حدیث دوست اس حد تک تو اُتر آئے کہ احادیث کے اصولی انکار کی جگہ، اونکے مشکوک ہونے کی وجہ سے عدم قبول پر مائل ہوئے، یہ بڑی کامیابی ہے، اب صرف یہ کرنا باقی ہے کہ اون کے شک کو یقین سے بدلدیا جائے۔

موصوف کی مراد اس شک سے اگر منطقی اور فلسفیانہ معنی میں شک ہے تو ظاہر ہے کہ ہر گذشتہ، اور موجودہ، بلکہ ہر واقعہ پر منطقی اور فلسفیانہ کاوش کی بنا پر شک ہو سکتا ہے تا آنکہ وہ بداہت اور مشاہدۂ حواس سے ثابت ہوجائے، اور مشاہدۂ حواس پر بھی اوس فلسفی کو کیا اطمینان ہو سکتا ہے جو حواس کی غلطی پر یقین رکھتا ہے،

موصوف نے "اجماع امت" کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ "اجماع" کے قائل ہیں، اگر یہی اُصول وہ تسلیم کرلیں تو بھی ہمارے اونکے بہت سے اختلافات دور ہوجائیں، اور اُصول میں خواہ کچھ فرق ہو، مگر نتائج میں وہ اور عام مسلمان

متفق ہو جائیں۔

یہ کہنا کہ "حدیث کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں" ایک ایسا دعوےٰ ہے جو نقل اور حوالہ کا محتاج ہے، صرف چند کتابوں یا چند حدیثوں کی نسبت شک ثابت کر دینے سے مطلق حدیث کے متعلق یہ کہدینا کہ "امت کا اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں" غلط منطق ہے، چند افراد کے استقصاء سے کلیہ نہیں درست ہوتا۔

بہر حال اگر "شک" سے مراد ذہنی شک یا فلسفیانہ شک ہے تو یقیناً تمام تر احادیث مشکوک ہیں، اور نہ صرف احادیث بلکہ تمام دنیا کے اخبار، تواریخ ایام، واقعات مسموعہ، اور روزمرہ کے واقعات کے اطلاعات، سب مشکوک ہیں، لیکن روزانہ کے عملی کاروباروں، قانونی شہادتوں، اور دوسرے عملی اداروں میں اس فلسفیانہ شک کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، اور نہ ہم آپ کوئی اس فلسفیانہ شک کے سبب سے روزانہ کے کاروبار میں عملاً شک کرتے ہیں، ہر خط جو کہیں سے آتا ہے، یا خبر جو ہمارے پاس پہنچتی ہے، ہر سرکاری فرمان و مراسلہ جو آپکے دفتر میں موصول ہوتا ہے، اون سب کے اصلی ہونے کے متعلق ہزاروں منطقی اور فلسفیانہ شکوک ہیں، جن کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، مگر کیا آپ کبھی عملاً ان پر شک کر کے انکو رد کر دیتے ہیں؟ اور ان احکام کے تعمیل سے آپ اپنے افسروں کی گرفت سے یہ کہکر نجات پا سکتے ہیں کہ ہمکو اسی حکم نامہ یا مراسلۂ سرکاری ہونے میں فلسفیانہ دلائل کی وجہ سے شک تھا کیونکہ ممکن ہے کہ کسی نے سرکاری کاغذ و لفافہ کو چرا کر، آپکے نقلی دستخط بنا کر بھیجدیا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے شکوک آدمی کا عملی دنیا میں کیا حشر ہوگا؟

گھر سے ایک خادم آکر آپ کو اطلاع دیتا ہے کہ آپکی اندر طلبی ہے، آپ فوراً اُٹھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، کیونکہ عملاً آپ خادم پر اعتبار کرتے ہیں تو اوسکے حالات سے اوس کا جھوٹا ہونا ثابت نہیں، اور آپ یہ نہیں کہتے کہ ممکن ہے کہ یہ اس وقت جھوٹ بول رہا ہو، یا اوس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو، یا کسی دوسرے کے نام کو میرا نام سمجھا ہو، یا اوس نے کانوں سے سننے میں غلطی کی، حالانکہ یہ تمام فلسفیانہ احتمالات اسمیں ممکن ہیں۔

بہر حال احادیث کی دو قسمیں ہیں، ایک احاد، یعنی جس کے سلسلہ میں ایک ہی ناقل واقعہ ہو، اور نہ اوسکی کوئی دوسری موید روایت ہے، ایسی روایتوں کو بیشک آپ مشکوک کہہ سکتے ہیں، نیز معنعن روایتوں میں بھی آپ گفتگو کر سکتے ہیں، لیکن وہ حدیثیں اور روایتیں جو مختلف راویوں سے متعدد اور کثیر طریقوں اور سلسلوں سے مذکور ہیں، قریب قریب معنوی تواتر تک پہنچ کر شک وشبہ سے بالاتر ہیں، اسلام کے تمام ضروری ارکان اور اعمال الحمدللہ کہ اسی قسم کی روایتوں سے ثابت ہیں، اور ساتھ ہی سنت متواترہ اونکی تائید میں ہے،

ہاں۔ اگر کوئی ایسی صحیح حدیث ہو جو قرآن کے صریح مخالف ہو تو یقیناً وہ رد کر دینے کے قابل ہے، اور خود علمائے اُصول نے یہ بات تسلیم کی ہے، اور خود آپ نے ابن جوزی کی یہ عبارت نقل کی ہے، کہ ان کے نزدیک ہر وہ روایت جو قرآن یا سنت متواترہ، یا اجماع قطعی، یا عقل صریح کے مخالف ہو، ناقابلِ اعتبار ہے" یہی حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے، (دیکھو شرح

تحفہ ابن حجر صفحہ ۱۴۱، فاروقی) تو جب یہ اُصول علمائے حدیث خود تسلیم کرتے ہیں، تو پھر اون پر آپ کا اعتراض کیا رہا، مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ قرآن یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا عقل صریح کی مخالفت واقعی ثابت ہو، صرف آپ کا غلط اجتہاد، زعم باطل، اور قیاس مع الفارق نہ ہو،

اس تفصیل کے بعد اگر آپ کسی ایسے شخص کو پاتے ہیں، جو قرآن، یا سنت متواترہ، یا اجماع قطعی، یا عقل صریح کے مخالف ہونے یا کسی اور روایتی نقص کے باوجود وہ بخاری شریف کے مضمون میں موجود ہونے کے باعث کسی روایت کو تسلیم کر لینے پر اڑا ہو، تو ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر اوس پر "بخاری پرستی" کا الزام لگانے کو تیار ہیں،

اعتراف اس تمام اخذ ورد، سوال وجواب، اور قیل وقال کے بعد میں مضمون نگار کی اس انصاف پسندی، قبول حق، اور رجوع عن الباطل کے جذبہ کی پوری قدر کرتا ہوں، اور یہ دیکھکر مجھے حد درجہ خوشی ہوئی کہ گو موصوف نے میرے مضمون سنت کا جواب لکھا ہے، مگر اس نقطۂ نظر اور نتیجۂ بحث کو اونھوں نے نہایت عمدگی سے قبول کر لیا ہے جسکی خاطر وہ مضمون لکھا گیا تھا، چنانچہ ممدوح نے نہایت تفصیل، وضاحت، اور فراخدلی کے ساتھ یہ تسلیم کیا ہے کہ:-

"سنت، فقہ، حدیث، تین مختلف چیزیں ہیں، جنھوں نے قرآن کی جگہ اسلام میں لے رکھی ہے"

موصوف نے کس خوبی سے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ سنت اور حدیث دو مستقل چیزیں ہیں، اور حدیث یعنی "زبانی روایات" جنکو یہ "مشنا" کہتے ہیں، وہ اور سنت دو مختلف اور مستقل چیزیں ہیں۔

اس کے بعد موصوف نے "سنت کو قرآن کی جگہ دے لینے" کا جو الزام علمائے اسلام پر قائم کیا ہے، اس کے بعد ہی موصوف نے بہت خوبی کے ساتھ سنت کو مذہب کا صحیح اصول تسلیم کر کے علمائے اسلام کی ہم آہنگی کی ہے، فرماتے ہیں:-

"سنت وہ زبانی طریقے (رہ) اعمال ہیں جو مسلمان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ابتداء سے چلے آئے، اور اوس پر عامل رہے یعنی رسول اللہ کے طریقہ کو اصحاب نے دیکھا، اصحاب کو تابعین نے، تابعین کو تبع تابعین نے اور اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ ایک طریقہ اسلام کے مذہبی اعمال کا مسلمانوں میں جاری رہا، سنت کا ساتھ قرآن کے ساتھ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ عمل ظاہری ایسے صاف تھے کہ اس پر کسی رد وقدح کی ضرورت نہ تھی، اور نہ سنت متواترہ پر کسی قضا عقل کو کلام یا اعتراض ہو سکتا ہے، خود قرآن شریف میں اگرچہ نماز کے طریقہ پر سکوت اختیار کیا گیا ہے، مگر ایک آیت میں اسکا پتہ ضرور چلتا ہے کہ سنت متواترہ پر عمل کرنیکی رائے دی گئی ہے، (کیا اللہ میاں نے بطور مشورہ کے رائے دی ہے؟ سلیمان) چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ تم نماز پڑھو جیسی تمکو سکھلائی گئی ہے، مسلمان اس سے مشکل سے انکار کرے گا، کہ جو نماز مسلمانوں کی جماعت پڑھ رہی ہے، وہ بجز معمولی فروعی اختلاف کے سنت متواترہ نہیں ہے عملی مذہب کے لئے سنت متواترہ کا اصول ضروری ہے، اور یہ صورت اسلام میں قائم رہی، اگر فقہاء کا دور دورہ نہ ہوتا جن کے مبارک وجود نے اسلام کو سیاست (؟) سے گذار کر کے اسلام کو ایک قومی مذہب بنا دیا"

اخیر فقرہ کے علاوہ ہمارے دوست کے یہ خیالات حرف حرف میرے مضمون سنت کی تائید میں ہیں ، مجھے موصوف کے ان فقروں کو پڑھ کر اون سے آیندہ بہت کچھ نیک توقع پیدا ہوگئی ہے ، اور امید پیدا ہو چلی ہے کہ شاید دو چار تحریروں کے بعد وہ پوری طرح ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے ۔

راہ پر اونکو لگا لائے تو ہیں باتوں میں ،
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں ،

سید سلیمان ندوی

نوجوان بادشاہ

جو دن تاجپوشی کے لئے مقرر تھا، اس سے ایک رات قبل نوجوان بادشاہ اپنے خوبصورت ایوان میں بیٹھا ہوا تھا، تمام درباری حسب قاعدہ زمین بوس ہو ہو کر قصرِ شاہی کے بڑے کمرے میں افسر تشریفات سے ہونیوالے دربار کے آداب حاضری و حضوری کے چند آخری سبق لینے چلے گئے تھے، کیونکہ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جن کے اطوار ابھی بالکل فطری تھے، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک دربار کے اندر اس قسم کے اطوار سخت ناپسندیدہ خیال کئے جاتے ہیں

نوعمر بادشاہ نے جسکی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ ان درباریوں کے چلے جانے کے بعد اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چپر کھٹ کے زرکار نرم گدوں پر لیٹ گیا۔ اس کے لب کھلے ہوئے تھے، اور آنکھیں حیران، گویا وہ کوئی ہرن تھا، جسے جنگل میں شکاریوں نے ابھی گرفتار کیا ہو۔

اور یہ واقعہ بھی تھا کہ وہ برہنہ ہاتھ میں بانسری لئے گڈریہ کے گلہ کے پیچھے پیچھے جارہا تھا کہ اُسے پکڑ لائے۔ یہ بڈھے بادشاہ کی اکلوتی بیٹی کا لڑکا تھا جس نے ایک ادنے درجہ کے آدمی سے خفیہ طور پر نکاح کر لیا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ شخص کوئی اجنبی تھا جس نے اپنی عجیب وغریب جادو بھری بانسری بجاکر شہزادی کو فریفتہ کر لیا تھا، اور بعض کا یہ قول تھا کہ وہ شخص ریمینی کا رہنے والا ایک نقاش تھا جسکی شہزادی نے ضرورت سے زیادہ عزت افزائی کی تھی۔ اور جو بعد کو گرجا میں اپنا کام نامکمل چھوڑ کر شہر سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔

یہ لڑکا ابھی صرف ایک ہفتہ کا ہوگا کہ سوتا ہوا اپنے ماں کے پہلو سے چُرا لیا گیا، اور پرورش کے لئے ایک معمولی کسان کو دیدیا گیا تھا جو ایک دن سے زیادہ کی مسافت پر جنگل کے ایک دور افتادہ حصہ میں رہا کرتا تھا۔ اور اُس حسین شہزادی کا یہ حشر ہوا کہ ٹھیک اُسوقت جبکہ معتمد شاہی بچہ کو اپنے آگے گھوڑے کی زین پر لٹا کر لے گیا، اور اُس نے اپنے تھکے ہوئے مرکب سے اُتر کر اس غریب گڈریہ کی جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا، تو اس شہزادی کی لاش ایک ویران قبرستان میں قبر کے اندر اُتاری جارہی تھی، جہاں ایک اور لاش بھی پہلے سے موجود تھی جو کسی نہایت ہی جمیل مگر اجنبی نوجوان کی تھی، اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے، اور اُسکے سینہ پر خنجر کے بہت سے سُرخ سُرخ زخم تھے، اطباء دربار تو یہ کہتے تھے کہ شہزادی کی موت فرطِ غم یا طاعون سے واقع ہوئی۔ لیکن بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب شہزادی بیدار ہوئی تو کوئی نہایت سریع الاثر اطالوی زہر شراب کے ایک جام میں ملاکر اسکو پلادیا گیا جس کے اثر سے وہ ایک گھنٹہ کے اندر مر گئی۔

جب بڈھا بادشاہ مرض الموت میں گرفتار ہو کر صاحب فراش ہوا، تو اُس نے یا تو اپنے گناہ پر پشیماں ہو کر یا اس

خیال سے کہ سلطنت اُسکے خاندان سے باہر نہ نکلے، اُس لڑکے کو بلا بھیجا، اور اربابِ حکومت کے سامنے اسکو اپنا ولی عہد تسلیم کرلیا۔
اُسی اولین لمحہ سے جب وہ ولیعہد تسلیم کیا گیا، حسن وجمال کے ساتھ اسکی پسندیدگی کا اظہار ہوگیا تھا، جس کا اُس کی آیندہ زندگی پر اثر انداز ہونا مقسوم ہو چکا تھا۔ جو لوگ اس کے معیت میں رہتے تھے اُنکا بیان ہے کہ جب خوبصورت زرکار ملبوس اور جواہر کو دیکھتا جو اُسکے لئے فراہم کئے گئے تھے تو اُسکے منھ سے بیساختہ نعرۂ مسرت نکل جاتا اور فرطِ مسرت سے اپنا چرمی کرتا اور بھدی پوستین اُتار کر پھینکدیتا۔ اگرچہ بعض اوقات اپنی صحرائی زندگی کی دلپسند آزادی کا خیال بھی اُسے آجاتا تھا اور وہ اکثر ان تکلیف دہ درباری مراسم کا مذاق بھی اُڑاتا تھا جن میں دن کا بڑا حصہ اُسے ہر روز گذارنا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسکا شاندار محل بھی اُسے ایک نئی دنیا نظر آتا تھا، جو اُس کے عیش وراحت اور مسرت وشادمانی کے لئے از سرِنو آراستہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ جونہی اُسے بزمِ مشاورت یا ایوانِ دربار سے فرصت ملتی، وہ دوڑ کر محل کے اس عظیم الشان زینہ پر چڑھ جاتا جسکی سیڑھیاں سنگِ سماق کی تھیں اور جس کے دونوں طرف طلائی ملمع کئے ہوئے برنجی شیر نصب تھے۔ محل میں پہونچکر ایک کمرہ سے دوسرے کمرے میں اور ایک غلام گردش سے دوسری غلام گردش میں اس طرح پھرتا گویا وہ ان مناظر جمیل میں اپنے زخم کا مرہم اور درد کا علاج ڈھونڈھ رہا تھا۔

چہل قدمی اُس کے لئے ایک ایسی سیاحت تھی جس کے ذریعہ سے گویا وہ کسی طلسم بند سرزمین میں پہونچ جاتا تھا، اور وہاں کے حیرتناک مناظر میں یکسر غرق ہوجاتا تھا، اس سیاحت میں اکثر وبیشتر وہ تنہا ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی وہ چند نازک بدن، عنبریں مو نوجوان خدام بھی اُس کے ساتھ ہوتے، جن کی ڈھیلی عباؤں کے دامن اور خوشرنگ فیتے ہوا میں اُڑکر رنگین توجہ پیدا کرتے تھے لیکن اس کا یہ احساس ہمیشہ تنہائی میں بیدار ہوتا اور فنونِ لطیفہ کے اسرار خلوت ہی میں خوب منکشف ہوتے ہیں، اور حسن وجمال کی دیوی اسی پرستار کو عزیز رکھتی ہے جو اُسکی پرستش تنہائی میں کرے۔

اس زمانہ میں اس کے متعلق بہت سی عجیب وغریب باتیں بیان کی جاتی تھیں، ایک قصہ یہ تھا کہ کسی تنومند اور لحیم وشحیم امیر نے جو شہر کے لوگوں کے سامنے ایک تقریر میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہانے آیا تھا، نوعمر بادشاہ کو ایک بڑی تصویر کے آگے جو ابھی وینس سے آئی تھی اس طرح دوزانو بیٹھے ہوئے عالم محویت میں دیکھا گویا وہ سچ مچ اس کی پوجا کر رہا ہے اور اس طرح شاید اب ملک میں بعض جدید دیوتاؤں کی پوجا کا رواج ہونیوالا ہے۔ ایک اور موقعہ پر نوعمر بادشاہ کئی گھنٹہ تک مسلسل لوگوں کی نظروں سے غائب رہا اور کافی تجسس کے بعد جب اسے قصر شاہی کے شمالی برج میں دیکھا گیا تو حالت یہ تھی کہ وہ عالم محویت میں ایک جواہر کی طرف دیکھ رہا تھا، جس پر ایڈونیس[1] دیوتا کی تصویر کندہ تھی، ایک قصہ یہ بھی ہے کہ ایک روز اُسے اس حالت میں دیکھا گیا کہ حسین بُت کی مرمریں پیشانی کو بوسہ دے رہا تھا، یہ بُت ایک سنگین پُل کی تعمیر کے وقت دریا

---

[1] ایڈونیس (Adonis) قدیم یونانیوں کا ایک نہایت خوبصورت اور نوجوان دیوتا تھا جس پر وینس (Venus) عشق ومحبت کی

کی تہ سے برآمد ہوا تھا، اور اس پر شہنشاہ ہیڈرین[1] (HADIAN) کی ایک خوبصورت کنیز کا نام کندہ تھا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ رات بھر بیٹھا دیکھتا رہا کہ اینڈیمیون[2] (ENDYMION) کے نقرئی بُت پر چاندنی کا کیا اثر ہوتا ہے۔

الغرض تمام نادر اور بیش قیمت چیزیں اُسکے لئے ایک زبردست کشش رکھتی تھیں، اور عمدہ اور بیش قیمت چیزوں کے شوق میں اس نے بہت سے تاجر دوسرے ملکوں کی طرف روانہ کئے۔ بعض کو شمالی سمندروں کی طرف بھیجا کہ وہاں کے ماہی گیروں سے عنبر خرید کر لائیں۔ بعض کو مصر روانہ کیا کہ وہاں سے وہ عجیب وغریب نادر و بیش قیمت سبزی مائل فیروزے مول لائیں، جن میں خاص طلسمی خاصیتیں بیان کی جاتی ہیں، اور جو صرف فراعنۂ مصر کی قبروں میں دستیاب ہوتے ہیں، کچھ تاجر ایران بھیجے گئے کہ وہاں سے ریشمی قالین اور منقش ظروف حاصل کریں۔ کچھ ہندوستان کی طرف روانہ کئے گئے تاکہ وہاں سے باریک ململیں، منقش ہاتھی دانت کا سامان، نیلم کے کنگن، صندل اور نفیس پشمینہ کے دوشالے فراہم کرکے لائیں۔

لیکن سب سے زیادہ توجہ نوعمر بادشاہ کی اپنی اس پوشاک پر تھی، جسے وہ تاجپوشی کے روز پہننے والا تھا، یہ پوشاک اعلیٰ درجہ کے زر لفت کی بنائی گئی تھی، تاج جواہر نگار تھا، جس میں بڑے بڑے قیمتی لعل نصب تھے اور مرصع عصائے شاہی تھا جس پر درہائے شاہوار جڑے گئے تھے وہ اپنے پُر تکلف بستر پر لیٹا ہوا شاہ بلوط کے اس بڑے لٹھے کو دیکھ رہا تھا جو کھلے آتشدان میں جل جلکر غائب ہوتا جاتا تھا، اور انھیں باتوں پر غور کر رہا تھا۔ مہینوں پہلے بڑے بڑے ماہرین فن نے بہترین نمونے اس کے پاس بھیجدیئے تھے، اور اُس نے تمام مشہور کاریگروں کو طلب کرکے حکم دیدیا تھا کہ شب و روز محنت کرکے ان کو تیار کریں، وہ عالم خیال میں اپنے آپ کو شاہی لباس پہنے بڑے گرجا میں کھڑا دیکھتا تھا۔ اور اُسکے نوجوان بدن پر ایک تبسم لرزاں انبساطی کیفیت کا اظہار کر رہا تھا، جسکی جھلک اُسکی سیاہ وحشی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور دودکش کے منقش سائبان کے سہارے کھڑا ہوکر کمرہ میں جہاں اسوقت بہت دھیمی روشنی تھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دیواروں پر بیش قیمت مشجر کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرہ کے ایک کونے میں کپڑوں کی ایک خوبصورت الماری سجی ہوئی تھی۔ جس پر عقیق اور لاجورد سے مینت کاری کی گئی تھی۔ اور دریچہ کے سامنے ایک عجیب وضع کی بند الماری تھی۔ جس پر طلائی تاروں کے علاوہ مرگانگ کا بھی کام بنا ہوا تھا۔ اس پر شہر وینس کے بنے ہوئے چند نہایت نازک اور خوبصورت

دیوی دل وجان سے فریفتہ تھی۔ اس جوان دیوتا کو شکار کھیلتے وقت ایک دوسرے دیوتا مریخ نے جو وینس کا عاشق اور اڈونیس کا رقیب تھا جنگلی سور بنکر مار ڈالا۔ جب وہ مردوں کی دنیا میں گیا تو وہاں اُس پر پلوٹو (PLUTO) کی بیوی جو پاتال کا دیوتا تھا عاشق ہوگئی۔ بالآخر اڈونیس کو اس شرط پر دوبارہ زندہ کردیا گیا، کہ وہ چھ مہینے تک دنیا میں اور چھ مہینہ پاتال میں رہا کرے۔ ۱۲۔

[1] ہیڈرین (HADRIAN) روم کا بہت بڑا اور مشہور شہنشاہ تھا (۷۶ لغایت ۱۳۸ء) وہ ۱۲۱ء میں برطانیہ گیا اور نیوکیسل و کارلائل کے درمیان دیوار تعمیر کی۔

[2] اینڈیمیون (ENDYMION) ضرافیات یونانی کا ایک نوجوان اور خوبصورت دیوتا جسپہ چاند کی دیوی عاشق تھی یہ ہر وقت سوتا رہتا تھا۔

بلوریں جام رکھے ہوئے تھے اور سیاہ رگون کے ایک ڈال سنگ سلیمانی کا ترشا ہوا پیالہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ریشمی پلنگ پوش پر زرد ریشم سے لالہ کے پھول کاڑھے گئے تھے۔ جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا کسی سونے والے کے ہاتھ سے عالم بے خبری میں ابھی ابھی بستر پر گرے ہیں، پلنگ کا مخملی شامیانہ ہاتھی دانت کے ڈنڈوں پر تنا ہوا تھا۔ جس کے کنارے ہلکی نقرئی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ اور چھت میں شتر مرغ کے پروں کے بڑے بڑے گچھے آویزاں تھے۔ جو بالکل کف دریا معلوم ہوتے تھے۔ شامیانہ کے اوپر یونانیوں کے خود پرست دیوتا نارکی سس[۵] (NARCISSUS) کا ایک سبز برنجی بت نصب تھا جس کے ہاتھ میں جو سر کی طرف بلند تھا ایک مصقل آئینہ تھا۔ اور میز پر نیلم کا ترشا ہوا ایک جوڑا اور کھلے منھ کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔

محل سے باہر اسے بڑے گرجا کا عظیم الشان گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تاریک سمندر میں ایک بہت بڑا حباب تیر رہا ہے دریا کے کنارہ پشتہ پر سپاہی سستی کے ساتھ ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بھی دکھائی دیتے تھے اور فاصلہ پر کسی باغ میں ایک بلبل چہک رہا تھا۔ غرفہ میں سے سمن ونسترن کی بھینی بھینی خوشبو کمرہ کے اندر آرہی تھی۔ اُس نے اپنے سنہرے بالوں کو جو پیشانی پر منتشر تھے۔ انگلیوں سے شانہ کرکے پیچھے ہٹادیا اور اپنی بانسری لیکر ایک دل آویز راگنی چھیڑی۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں آنکھوں پر جھک آئیں اور عجیب قسم کی سستی بدن پر طاری ہونے لگی۔

جس وقت گھنٹہ گھر میں بارہ بجے اُس نے ایک گھنٹی بجائی۔ خدام فوراً حاضر ہوئے اور نہایت سلیقہ کے ساتھ اس کا لباس اتارا۔ گلاب سے اس کے ہاتھ دُھلائے اور سیج پر پھولوں کے تکئے لگادئے۔ چند منٹ بعد یہ کمرہ سے نکل کر باہر چلے گئے جب بادشاہ سو گیا تو اُس نے ایک خواب دیکھا کہ:-

"وہ ایک لمبی مگر نیچی چھت کے بالاخانہ پر کھڑا ہوا ہے۔ اور اسکے چاروں طرف کپڑا بننے کے کرگھے چل رہے ہیں۔ جن سے ایک شور برپا ہے۔ سلاخدار کھڑکیوں میں سے آفتاب کی دھندلی روشنی اندر آرہی ہے۔ اور اس روشنی میں اُس نے دیکھا کہ جُلاہوں کے لاغر ونحیف جسم اپنے اپنے کاموں پر جھکے ہوئے ہیں۔ سامنے کے ٹیڑے تختوں پر زرد رو، بیمار صورت بچے پیٹ کے بل پڑے لوٹ رہے ہیں۔ جب تانے کے اندر نلیاں دوڑتی ہیں تو وہ بھاری راچھ کو اُبھار دیتے ہیں۔ اور جب نلیاں رُک جاتی ہیں تو وہ راچھ کو گرا کر تاگا ٹھوکتے ہیں۔ اُنکے چہروں سے افلاس برستا ہے اور نقاہت سے اُن کے پتلے دُبلے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ چند لاغر و ناتوان عورتیں ایک میز کے سامنے بیٹھی ہوئی سینے پرونے میں مصروف ہیں۔ چاروں طرف سخت بدبو پھیل رہی ہے۔ ہوا کی عفونت سے دم گھٹا جاتا ہے اور مکان کی دیواروں پر نمی کے باعث چاروں طرف لونی لگی ہوئی ہے۔"

---

[۵] یہ دریا کے دیوتا سیفی سوس (CEPHISUS) کا بیٹا اور خوبصورت نوجوان تھا۔ ایکو (ECHO) نامی جل پری اُس پر فریفتہ ہوگئی۔ لیکن اس شخص نے اُس سے محبت نہ کی۔ اس پر ناراض ہوکر وینس دیوی نے یہ انتقام لیا کہ وہ تالاب میں اپنے ہی سایہ پر عاشق ہوگیا اور جب وہ سایہ اس کے ساتھ نہ آیا تو خودکشی کرلی۔

نوعمر بادشاہ ایک جلاہہ کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا اور اُسکے کام کو دیکھنے لگا۔ جلاہہ نے آنکھ اُٹھاکر سخت نگاہ سے اسکی طرف دیکھا اور پوچھا:۔

" تو کون ہے اور یہاں کھڑا ہوا مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کیا تو ہمارے مالک کا بھیجا ہوا کوئی جاسوس ہے؟"

بادشاہ۔ تمہارا مالک کون ہے؟

جلاہہ۔ (تیور پر بل ڈال کر) ہمارا مالک! وہ بھی مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میں چیتھڑے پہنے پھرتا ہوں اور وہ اعلےٰ درجہ کی پوشاک پہن کر نکلتا ہے۔ اگر میں فاقے کرتے کرتے ضعیف وناتواں ہوگیا ہوں تو اُسے سوئے ہضم کی حد تک کھالینے میں بھی تکلف نہیں ہوتا۔

بادشاہ۔ ملک آزاد ہے۔ تم کسی کے غلام نہیں ہو۔

جلاہہ۔ جب جنگ ہوتی ہے تو طاقتور کمزوروں کو غلام بنالیتے ہیں۔ اور جب امن ہوتا ہے تو مالدار مفلس کو غلام بناتے ہیں۔ ہم لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ ہمکو اسقدر ذلیل اُجرت دیتے ہیں کہ ہم مشکل سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ ہم دن دن بھر محنت کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے خزانوں میں دولت جمع کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے بچے گھُل گھُل کر قبل از وقت مرجاتے ہیں۔ ہم لوگ انگوروں کو نچوڑ نچوڑ کر اپنے ہاتھ دُکھاتے ہیں۔ اور دوسرے شراب پیتے ہیں۔ ہم کھیت میں بیج بوتے ہیں اور ہمارا ہی گھر غلہ سے خالی رہتا ہے۔ ہم طوق وسلاسل میں گرفتار ہیں۔ لیکن کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم غلام ہیں اور لوگ ہمیں آزاد کہتے ہیں۔"

بادشاہ۔ کیا تم سب کا یہی حال ہے؟

جلاہہ۔ جی ہاں سب کا یہی حال ہے۔ جوان سے لیکر بوڑھے تک۔ مرد سے لیکر عورت تک۔ اور بچہ سے لیکر ضعیف تک سب کا یہی حال ہے۔ سوداگر ہمیں پیسے ڈالتے ہیں۔ اور ہمیں اُن کے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ پادری صاحب رہوار پر سوار تسبیح پڑھتے ہوئے پاس سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن ہم سے نہیں پوچھتے کہ تمہارا کیا حال ہے؟ الغرض ہماری تاریک گلیوں میں سوائے افلاس کے کچھ نہیں ہے۔ ہمارے دن اک مستقل مصیبت ہیں اور ہماری راتیں معصیت لیکن تمہیں ان باتوں سے کیا غرض؟ تم تو ہم میں سے نہیں ہو، تمہارا چہرہ تو بہت شاداب ہے۔

یہ کہکر جلاہہ نے بادشاہ کی طرف سے منھ پھیر لیا اور تانے کے اندر پھر نلی کو دوڑانے لگا۔ نوعمر بادشاہ نے دیکھا کہ نلی میں سنہرے کلابتوں کا تار ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے جلاہہ سے پوچھا:۔

" یہ کپڑا تم کس کے لئے بن رہے ہو؟"

جلاہہ۔ یہ تھان اُس پوشاک کے لئے تیار کیا جارہا ہے جسے نوعمر بادشاہ تاجپوشی کے دن پہنے گا۔ لیکن تمہیں ان باتوں سے کیا غرض ہے؟

یہ سنتے ہی بادشاہ کے منھ سے ایک زور کی چیخ نکلی اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرفہ سے اُس نے دیکھا کہ سامنے سفید چاند

تاریک فضا میں معلق ہے۔ اس کے بعد وہ پھر سو گیا۔ اوسنے خواب میں دیکھا کہ:-

ایک بہت بڑی کشتی ہے جسے سو غلام کھیتے ہیں۔ اسکے پہلو میں کشتی کا مالک ایک قالین پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شخص ایک سیاہ فام حبشی ہے جس کے سر پر قرمزی رنگ کا ریشمی عمامہ تھا۔ چاندی کے بڑے بڑے بالے کان کی موٹی موٹی لو میں لٹک رہے تھے۔ اور اسکے ہاتھ میں ہاتھی دانت کی ترازو تھی۔

پھٹے ہوئے تہمد کے سوا، غلاموں کے بدن پر کچھ نہ تھا۔ اور ہر غلام اپنے برابر والے ساتھی سے زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ تیز دھوپ ان لوگوں کے سر پر پڑ رہی تھی اور حبشی لوگ چاروں طرف دوڑ دوڑ کر ان کو چرمی کوڑوں سے مارتے جاتے تھے۔ یہ غلام اپنے لاغر بازو پھیلا کر بھاری بھاری چپو چلا رہے تھے۔ جن سے کھاری پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ یہ کشتی ایک چھوٹی سی خلیج میں پہونچی۔ ساحل کی طرف سے ایک ہوا چلی اور عرشہ و بادبان گرد و غبار سے اٹ گئے۔ اتنے میں تین عرب جو گدھوں پر سوار تھے وہاں پہونچے اور اُنھوں نے کشتی کے آدمیوں پر نیزے پھینک کر مارے۔ کشتی کے مالک نے ایک رنگین کمان ہاتھ میں اُٹھائی۔ تیر جوڑا اور ایک عرب کو مجروح کر دیا۔ جو سمندر کی موجوں میں گرا اور اُسکے دونوں ساتھی فرار ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت آہستہ آہستہ اونٹ پر سوار جا رہی تھی جو مُڑ مُڑ کر مقتول عرب کی لاش کو دیکھتی جاتی تھی۔

کشتی لنگر انداز ہوئی۔ بادبان اُتار لئے گئے۔ حبشی کشتی کے اندر سے رسی کی بنی ہوئی ایک سیڑھی لائے جو سیسہ باندھکر وزنی کر دی گئی تھی۔ کشتی کے مالک نے وہ سیڑھی کشتی کے پہلو میں پھینکی اور اوپر کا سرا دو آہنی حلقوں میں مضبوط باندھ دیا۔ اسکے بعد حبشیوں نے ایک سب سے کم عمر غلام کو پکڑا۔ اسکے پاؤں کی زنجیریں کھول دیں۔ اُسکے نتھنوں اور کانوں میں موم کی ڈاٹ لگائی اور اُسکی کمر سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا۔ وہ غلام آہستہ آہستہ سیڑھی کے ذریعہ سے نیچے اترا۔ اور غوطہ مار کر سمندر میں غائب ہو گیا۔ جہاں اُسنے غوطہ لگایا تھا وہاں بلبلے اُٹھنے لگے۔ اور کشتی کے سرے پہ ایک شخص ڈھول پیٹ پیٹ کر کوئی افسوں پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ غوطہ خور غلام پانی سے باہر نکلا اور ہانپتا ہوا سیڑھی سے چمٹ گیا۔ اسکے داہنے ہاتھ میں ایک موتی تھا۔ حبشیوں نے وہ موتی اس سے چھین لیا اور غوطہ کھانے کے لئے پھر لوٹا دیا۔ غلام ہاتھوں میں چپو لئے اسیطرح پابہ زنجیر سو گئے۔

وہ غوطہ خور غلام بار بار پانی پر اُبھرتا اور ہر مرتبہ اپنے ساتھ ایک خوبصورت موتی لاتا۔ کشتی کا مالک کانٹے میں رکھ کر ان موتیوں کو تولتا اور ایک سبز رنگ کی چرمی تھیلی میں ڈالتا جاتا۔

نوعمر بادشاہ نے بات کرنا چاہی لیکن اُسکی زبان نے کام نہ دیا۔ اور لب نہ کھلے۔ تھوڑی دیر بعد حبشی ایک خوبصورت ہار پر آپس میں لڑ پڑے۔ دو سارس آئے اور کشتی کے گرد چکر لگانے لگے۔

غوطہ خور آخری مرتبہ باہر آیا اور اس مرتبہ جو موتی اس کے ہاتھ میں تھا وہ جزیرہ ہرمز اور بحرین کے تمام موتیوں سے زیادہ خوش آب تھا۔ اسکی شکل بدر کامل سے مشابہ تھی اور وہ ستارہ صبح سے بھی زیادہ درخشاں تھا۔ لیکن اسوقت غوطہ خور کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا۔ اور جوں ہی وہ کشتی میں آیا گر پڑا اور اسکے کانوں اور نتھنوں سے خون جاری ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کانپتا

رہا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ حبشیوں نے اُٹھ کر اُسکی لاش سمندر میں پھینکدی۔ کشتی کا مالک خوب ہنسا۔ اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر وہ موتی لے لیا۔ جوں ہی اُس نے وہ موتی دیکھا تو اُس نے پیشانی سے لگا کر سر جھکایا اور کہنے لگا:" یہ موتی نوعمر بادشاہ کے عصا میں جڑا جائیگا۔" اسکے بعد اُس نے حبشیوں کو لنگر اُٹھانیکا حکم دیدیا۔

جب نوعمر بادشاہ نے یہ بات سنی تو اسکے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ جاگ پڑا۔ کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو دیکھا کہ صبح کی نورانی اونگلیاں کھلائے ہوئے ستاروں کے پھول چُن رہی ہیں۔

اسکے بعد بادشاہ پھر سو گیا اور اُس نے خواب میں دیکھا کہ:-

" وہ ایک تاریک گھنے جنگل میں پھر رہا ہے۔ جس کے درختوں میں عجیب قسم کے پھل اور خوبصورت زہریلے پھول لگے ہوئے ہیں۔ جسوقت وہ جنگل میں قدم اُٹھاتا تھا تو کالے ناگ پھنکار مارتے تھے۔ اور خوبصورت پروں والے طوطے شاخ بہ شاخ اُڑتے پھرتے تھے۔ گرم کیچڑ پر بڑے بڑے کچھوے پڑے سو رہے تھے اور تمام درختوں پر طاؤس اور بندر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ آگے بڑھتا چلا گیا دیکھا کہ آدمیوں کا ایک انبوہ خشک دریا کی زمین پر جمع ہے۔ دریا کے کنارہ ٹیکرے پر آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ اور لوگ دریا کی تہ میں گہرے گڈھے کھود کر اُن میں اُتر رہے ہیں۔ بعض کے ہاتھوں میں کُدالیں تھیں۔ جن سے وہ چٹانیں کھود رہے تھے اور بعض ریت میں کچھ ٹٹول رہے تھے۔ لوگوں نے ناگ پھنی کے درخت جڑوں سے اُکھاڑ کر پھینکدئے اور اس کے خوبصورت سرخ پھولوں کو پاؤں سے روند ڈالا۔ وہ ایک دوسرے کو بلاتے اور ادھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ اور کوئی شخص بھی بے کار نہ تھا۔

ایک تاریک غار سے موت اور طمع ان لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اتنے میں موت نے کہا:" میں بہت تھک گئی ہوں۔ تم مجھے ان میں سے صرف تیسرا حصہ دیدو اور جانے دو۔"

طمع۔ (سر ہلا کر) نہیں! یہ لوگ میرے خادم ہیں۔ میرے غلام ہیں۔

موت۔ یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟

طمع۔ میرے پاس غلہ کے تین دانے ہیں۔ تجھے کیا؟

موت۔ لاؤ ان میں سے ایک مجھے دیدو۔ میں اپنے باغ میں لگا لوں گی۔ بس صرف ایک دیدو اور میں چلی جاؤں گی۔

طمع۔ میں تجھے کچھ نہ دونگی۔ اور یہ کہکر اُس نے اپنا ہاتھ دامن میں چھپا لیا۔

موت ہنسی اور ایک پیالہ نکالا۔ اور اُسے پانی کے ایک گڈھے میں ڈبو دیا۔ پیالہ میں سے تپ ولرزہ پیدا ہوا جو اس ہجوم سے گذرا اور تہائی حصہ کو ہلاک کرتا چلا گیا۔

جب طمع نے یہ دیکھا کہ ایک ثلث آدمی ہلاک ہو گئے ہیں تو وہ سینہ کوبی اور گریہ وزاری کرنے لگی اور چیخ کر بولی:" ہائے ہائے تو نے میرے ایک تہائی خادم مار ڈالے۔ نکلجا یہاں سے۔ جا اور دیکھ وہ کوہستان تاتار میں جنگ ہو رہی ہے۔ فریقین کے بادشاہ

تجھے بلا رہے ہیں۔ وہ دیکھ افغانی میدان جنگ کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور ڈھالیں ہیں۔ ان کے سروں پر آہنی خود ہیں۔ جا کمبخت یہاں سے نکل۔ میری وادی میں کیا رکھا ہے جو تو یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ چل نکل! دور ہو۔ یہاں کبھی نہ آنا۔

موت۔ نہیں۔ جب تک تو مجھے غلہ کا ایک دانہ نہ دیگی اسوقت تک میں ہرگز نہ جاؤں گی۔

طمع۔ (مٹھی بند کرکے اور دانت بھینچکر) میں ہرگز تجھے کوئی چیز نہ دونگی۔

موت ہنسی۔ اوس نے ایک سیاہ پتھر نکالا۔ اور جنگل میں پھینکدیا۔ جو زقوم کی جھاڑیوں میں جا گرا۔ جھاڑیوں میں سے شعلہ رنگ بخار پیدا ہوا۔ جو اس اژدحام میں سے گذرا۔ اور جس جس کو اس نے چھوا وہ ہلاک ہوگیا جس گھاس پر وہ بخار چلتا تھا جلکر رہ جاتی تھی۔ یہ بات دیکھکر طمع کانپ گئی۔ اس نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور چلا کر کہنے لگی "موت تو بڑی ظالم ہے! تو بڑی ستم شعار ہے!! دور ہو یہاں سے۔ جا وہ دیکھ ہندوستان کے شہروں میں قحط پڑ رہا ہے۔ جاؤ سمرقند کے تمام تالاب اور دریا خشک ہوگئے۔ مصر کو دیکھ وہاں کے شہروں میں بھی قحط پڑ رہا ہے۔ وہاں ریگستان سے ٹڈی دل آگیا ہے۔ امسال دریائے نیل میں طغیانی نہیں ہوئی اور نہ اسکا پانی کناروں سے بہا۔ جا کمبخت وہاں جا۔ جہاں تیری ضرورت ہے۔ اور میرے آدمیوں کو چھوڑ"

موت۔ نہیں جب تک تو مجھے غلّہ کا ایک دانہ نہ دے گی۔ نہیں ہرگز نہ جاؤں گی۔

طمع۔ مگر میں تو تجھے ہرگز کوئی چیز نہ دونگی۔

موت پھر ہنسی۔ اُس نے منہ میں اُنگلیاں ڈالیں اور سیٹی بجائی۔ فوراً ایک عورت ہوا میں اُڑتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اُس کی پیشانی پر "وبا" لکھا ہوا تھا۔ اسکے چاروں طرف دُبلے کرگسوں کی ایک ٹکڑی چکر لگا رہی تھی۔ اس عورت نے آتے ہی تمام وادی پر اپنے پر پھیلا دئے۔ اور ایک متنفس بھی زندہ نہ رہا۔

یہ دیکھ کر طمع چیختی چلاتی جنگل میں بھاگی۔ موت بھی اُچک کر اپنے سُرنگ گھوڑے پر سوار ہوئی اور سرپٹ دوڑ گئی۔ وادی کی تہ میں جو کیچڑ تھی۔ اس میں سے اژدہا اور دوسرے خوفناک حشرات پیدا ہوئے۔ گیدڑ ریت پر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور اپنی تھوتھنیوں سے ہوا کو سونگھنے لگے۔ یہ باتیں دیکھ کر نوعمر بادشاہ رو دیا۔ اور بولا۔

یہ کون لوگ تھے اور کیا ڈھونڈھ رہے تھے؟

ایک آواز۔ تاج شاہی کے لئے لعل نکال رہے تھے۔

یہ آواز سُن کر بادشاہ چونکا۔ منہ پھیر کر دیکھا تو ایک شخص جاتریوں کا سا لباس پہنے کھڑا تھا ہاتھ میں چاندی کا مصقل آئینہ تھا۔ اسوقت بادشاہ کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ اُس نے پوچھا۔

کس بادشاہ کے تاج کے لئے؟

جاتری۔ اس آئینہ میں دیکھو، تمھیں اسکی صورت نظر آجائے گی۔

بادشاہ نے آئینہ میں دیکھا تو اپنی ہی صورت نظر آئی۔ اس کے منھ سے ایک زبردست چیخ نکلی اور وہ بیدار ہو گیا آفتاب کی منور شعاعیں کمرہ میں کھیل رہی تھیں اور قصر شاہی کے باغ میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

افسر تشریفات اور دیگر ارکان دولت حاضر ہوئے اور مجرا عرض کیا۔ خدام نے تاج عصا اور لباس زرکار سامنے لاکر پیش کیا۔

نوعمر بادشاہ نے ان چیزوں کی طرف دیکھا یہ تینوں بہت خوبصورت تھیں۔ اسقدر خوبصورت کہ آجتک کوئی چیز اسکی نظر سے نہ گذری تھی۔ لیکن بادشاہ کو رات کے خواب کی باتیں یاد تھیں۔ اس لئے اُس نے اُمراء سے کہا: "یہ چیزیں میرے سامنے سے اُٹھالیجاؤ۔ میں انھیں کبھی نہیں استعمال کروں گا"

ارکان دولت سخت حیران ہوئے۔ اور بعض تو یہ خیال کرکے کہ بادشاہ مذاق کر رہا ہے ہنس بھی پڑے۔ لیکن بادشاہ نے دوبارہ سختی سے کہا: "لیجاؤ یہ چیزیں اور کہیں چھپا دو تاکہ میری نظر ان پر نہ پڑے۔ ہرچند آج میری تاجپوشی کا دن ہے۔ مگر میں انھیں ہرگز نہیں استعمال کروں گا۔ کیونکہ یہ لباس "رنج وغم" کے کرگھے پر بُنا گیا ہے۔ اور "درد وکرب" کے ضعیف ہاتھوں نے تیار کیا ہے۔ ان لعلوں کے جگر میں خون اور اس موتی کے قلب میں موت ہے" اس کے بعد بادشاہ نے لوگوں سے اپنے تینوں خواب بیان کئے۔ جب اہل دربار نے خواب کی باتیں سُنی تو وہ باہم سرگوشیاں کرنے لگے: "یقیناً بادشاہ پاگل ہو گیا ہے۔ کیونکہ خواب تو آخر خواب ہی ہوتا ہے۔ اسکی باتوں کا کیا اعتبار؟ وہ کوئی اصلی باتیں تو ہوتی نہیں جو انکی پرواکی جائے۔ اور پھر سوچئے تو سہی ہمیں ان لوگوں کی جانوں سے کیا تعلق جو ہمارے لئے محنت کرتے ہیں۔ کیا کوئی آدمی روٹی نہیں کھاتا جب تک غلہ بونیوالے کو نہ دیکھ لے یا شراب نہیں پیتا جبتک بنانیوالے کی صورت نہ دیکھے"؟

اس کے بعد افسر تشریفات نے نوعمر بادشاہ سے عرض کیا: "ولی نعمت اس قسم کے الم انگیز خیالات کو اپنے دل سے نکال دیں۔ یہ لباس زیب تن فرمائیے۔ اور اس تاج کو سر پر رکھیے۔ اگر لباس شاہی جسم پہ نہ ہوا تو لوگوں کو کیونکر معلوم ہوگا کہ ان کا بادشاہ اور آقا کون ہے"؟

بادشاہ۔ (غور سے دیکھ کر) کیا واقعی اگر میں یہ لباس نہ پہنوں تو لوگ مجھے اپنا بادشاہ نہ جانیں گے؟

افسر تشریفات۔ بے شک نہیں جانیں گے۔

بادشاہ۔ میں خیال کرتا تھا کہ دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کی صورت سے بادشاہی ٹپکتی ہے۔ لیکن میں شاید اُن میں نہیں ہوں ـــــ بہرحال نہ میں یہ لباس پہنوں گا۔ نہ یہ تاج سر پہ رکھوں گا۔ بلکہ جس حالت سے اس قصر شاہی میں داخل ہوا تھا، اسی حالت کے ساتھ نکلجاؤں گا"

یہ کہکر بادشاہ نے ایک خادم کے سوا جو اُس سے عمر میں سال بھر کم اور اس کا رفیق تھا۔ سب آدمیوں کو چلے جانے کا حکم دیدیا۔ صرف ایک آدمی خدمت کے لئے رکھ لیا۔ اس نے صاف پانی سے غسل کیا۔ ایک بڑا رنگین صندوق کھولا اور اُس میں سے

اپنی پُرانی چرمی قمیص اور بھدّی پوستین نکالی۔ یہ وہ لباس تھا۔ جسے پہاڑی کے اطراف میں بھیڑ بکریاں چراتے وقت پہنا کرتا تھا۔ اُس نے یہ لباس پہنا اور گڈریہ والا ڈنڈا ہاتھ میں لے لیا۔

نوعمر خادم نے کہا:۔ "خیر! لباس شاہی" اور "عصائے شہریاری" تو ہو گیا لیکن "تاج خسروی" کہاں ہے؟

یہ سُن کر نوعمر بادشاہ نے ایک جنگلی بیل کی شاخ توڑی جو بالاخانہ پر چڑھی ہوئی تھی۔ موڑ کر اس کا ایک حلقہ بنایا اور سر پر رکھ کر بولا:۔ "دیکھو یہ میرا تاج خسروی"۔

یہی لباس پہنے ہوئے وہ اپنے کمرہ سے نکلکر ایوان عام میں پہونچا۔ جہاں اُمراء دولت اور اعیان سلطنت اُس کے منتظر تھے۔

یہ حال دیکھکر لوگ ہنس پڑے۔ اور بعض نے پکار کر کہا:۔ "لوگ بادشاہ کے منتظر ہیں۔ نہ کہ گدائے بینوا کے" بعض لوگ بگڑ کر بولے:۔ "اس شخص نے ہماری سلطنت کو ذلیل کر دیا۔ یہ ہمارا بادشاہ بننے کے ہرگز قابل نہیں"۔ لیکن نوعمر بادشاہ نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا۔ بلکہ نکلا چلا گیا۔ وہ سنگ سماق کے چمکدار زینہ سے اُترا۔ برنجی پھاٹکوں سے باہر نکلا۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور سیدھا گرجا کی طرف چلا۔ ایک آدمی مجمع میں سے نکلکر بادشاہ کے پاس آیا اور بگڑ کر بولا:۔ "آپ نہیں جانتے کہ امراء کی عیش پسندیاں غرباء کی زندگی ہیں۔ آپ کے جاہ و حشم سے ہماری پرورش ہوتی ہے۔ اور آپ کے عیبوں اور گناہوں سے ہم کو روٹیاں ملتی ہیں ایک سخت گیر آقا کے لئے محنت کرنا ضرور ناگوار گذرتا ہے۔ لیکن یہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے کہ کوئی آقا ہی نہ ہو، جس کی خدمت کیجائے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ چیل کوّے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں؟ بتائیے آپ نے ان تمام باتوں کا کیا علاج سوچا ہے۔ کیا آپ کسی خریدار سے یہ کہیں گے کہ "اتنا سودا نہ خریدو"۔ یا دوکاندار کو حکم دینگے کہ "یہ مال اس قیمت کو فروخت کرو"۔ میں یقین کرتا ہوں۔ آپ ایسا نہیں کرینگے۔ لہذا جائیے اور اپنے محل کو تشریف لے جائیے۔ اور اپنا نفیس لباس اور زرکار پوشاک زیب تن فرمائیے۔ آپ کو کیا معلوم کہ آپ ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اور ہمکو کسقدر تکلیف ہو رہی ہے"؟

بادشاہ۔ تو کیا امیر اور غریب دونوں بھائی بھائی نہیں ہیں؟

آدمی۔ ہیں تو سہی لیکن امیر بھائی کا نام قابیل ہے۔

یہ سُن کر نوعمر بادشاہ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا نکلا چلا گیا۔ لیکن وہ چھوٹا سا خادم ڈرا اور اُس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جب نوعمر بادشاہ بڑے گرجا کے پھاٹک پر پہونچا تو اسے دیکھ کر فوجی سپاہیوں نے شمشیریں کھینچ لیں اور بولے:۔ "تو کون ہے؟ یہاں کیا لینے آیا ہے؟ اس دروازہ سے بادشاہ کے سوائے اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا"۔

بادشاہ کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا۔ اور اُس نے سپاہیوں سے کہا:۔ "میں ہی بادشاہ ہوں"۔ یہ کہکر اُس نے سپاہیوں کی تلواریں ہٹا دیں اور اندر داخل ہو گیا۔

جب بڈھے اسقف نے اُسے اس طرح ایک گڈریہ کے لباس میں آتے دیکھا تو وہ حیرت زدہ ہو کر اُٹھا اور بولا:۔

"کیا یہی بادشاہ کا لباس ہے۔ میں کس تاج سے تمہاری تاجپوشی کروں اور کون ساعصا تمھارے ہاتھ میں دوں۔ یقیناً آج کا دن تو تمہارے لئے مسرت و شادمانی کا دن ہونا چاہیئے نہ کہ ذلت و رسوائی کا"

بادشاہ۔ کیا رنج وغم کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز پر مسرت و شادمانی پیدا کرسکتی ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے تینوں خواب سُنائے۔ خواب سُن کر اسقف کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اُس نے بادشاہ سے کہا:" میں بڈھا آدمی ہوں، اور خزاں رسیدہ، میں جانتا ہوں کہ دنیا میں بہت سی باتیں بُری ہوتی ہیں۔ خونخوار ڈاکو پہاڑوں سے اُتر کر تاخت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑلے جاتے ہیں، اور اُنھیں عربوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ قافلوں کے رستہ میں شیر چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ جو کمینگاہوں سے نکل کر اونٹوں پر حملہ کرتے ہیں۔ وادیوں میں جنگلی سور فصلیں کھوڈالتے ہیں۔ اور پہاڑیوں پر لومڑیاں انگوروں کی بیلیں کتر دیتی ہیں۔ بحری قزاق ساحلوں کو اُجاڑ دیتے ہیں۔ ماہی گیروں کے جہاز پھونک دیتے ہیں۔ اور اُنکے جہاز چھین لیجاتے ہیں۔ شور زمین کی دلدلوں میں جذامی رہتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں گھاس پھوس سے بنائی جاتی ہیں۔ اور کوئی بھی اُنکے پاس نہیں جاتا۔ بھکاری شہروں میں پھرتے اور کتوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔ کیا تم ایسا کرسکتے ہو کہ یہ باتیں نہ ہونے پائیں۔ کیا تم کسی جذامی کو اپنے بستر پر لیکر سوجاؤگے یا کسی فقیر کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھالوگے؟ کیا شیر ببر تمہارے حکم کی تعمیل کریں گے، کیا جنگلی سور تمہارا کہنا مانیں گے۔ کیا وہ خدا نہیں جس نے محتاجوں اور مصیبت زدہ لوگوں کو تم سے زیادہ عقلمند بنایا بہرحال جو کچھ تم نے کیا ہے میں اسکو پسند نہیں کرسکتا۔ اور تم سے کہتا ہوں کہ قصر شاہی کو واپس جاؤ۔ اور جو لباس بادشاہوں کے لائق ہے اُسے پہنو۔ پھر میں تمہارے سر پر طلائی تاج رکھوں گا۔ اور عصائے شاہی تمھیں دوں گا۔ ایک آدمی کا کام نہیں کہ تمام دنیا کا بوجھ اُٹھاسکے۔ اکیلا دل دنیا بھر کا رنج وغم برداشت نہیں کرسکتا"

"اے شخص تو خدا کے گھر میں بیٹھکر ایسی باتیں کہتا ہے"؟ نوعمر بادشاہ نے یہ کہا اور اسقف کے پاس سے گذر کر قربانگاہ کے زینہ پر چڑھ گیا۔ اور یسوع مسیح کے بُت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

وہ مسیح کے بت کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے داہنے بائیں نہایت خوبصورت طلائی ظروف، شراب زرد رنگ سے لبریز جام، اور مقدس تیل سے بھری ہوئی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسیح کے بت کے سامنے دوزانو ہوگیا۔ سجدہ گاہ پر بڑی بڑی شمعیں کافوری روشن تھیں۔ عنبر کا دھواں بل کھاتا ہوا گنبد کی طرف چڑھ رہا تھا۔ بادشاہ نے سر جھکا کر دعا مانگی اور پادری قربان گاہ کے پاس سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

اچانک باہر سڑک سے شور وغل کی آواز آئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُمرا و رؤسا شمشیر بکف، خودوں پر کلغیاں لگائے ہوئے۔ اور پشت پر صیقل شدہ ڈھالیں لٹکائے گرجا میں داخل ہوئے۔ اور چلائے:" کہاں ہے وہ خوابوں کا دیکھنے والا؟ کہاں ہے وہ بادشاہ جو فقیروں جیسا لباس پہنے ہوئے ہے؟ کہاں ہے وہ جو ہماری سلطنت کی ذلت کرتا ہے؟ ہم اُسے ضرور مارڈالیں گے۔ یہ نالائق ہرگز اس قابل نہیں کہ ہم پر حکومت کرسکے"

نوعمر بادشاہ نے اپنا سر پھر جھکا لیا۔ اور دعا مانگتا رہا۔ جب وہ اپنی دعا ختم کر چکا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کی طرف دیکھا ٹھیک اُسی وقت کھڑکی سے آفتاب کی منور شعاعیں اس پر پڑیں۔ کرنوں نے اُس کے جسم کو ایسی نورانی پوشاک پہنادی جو اس شاہی لباس سے بدرجہا خوبصورت و دلفریب تھی۔ اُس کے ہاتھ کا خشک عصا خود بخود ہرا ہو گیا۔ اور اُس میں سفید کلیاں نکل آئیں جو سچے موتیوں سے زیادہ خوبصورت اور سفید تھیں۔ خشک کانٹے ہرے بھرے ہوگئے، اور اُنمیں گلاب کے اسقدر خوبصورت پھول نکل آئے جو لعلہائے بدخشاں سے بھی زیادہ خوش رنگ تھے۔ اس میں موتیوں سے زیادہ سفید پھول نکل آئے جس کی ڈنڈیاں چاندی کی تھیں۔

نوعمر بادشاہ لباس شاہی میں کھڑا تھا۔ اور خدا کے جلال کا نور ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ مخلوق گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ اُمراء نے اپنی تلواریں نیام میں کر کے بیعت کی۔ پادری کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ اور وہ بھی بادشاہ کے سامنے گھٹنوں کے بل دونا نو ہو کر بولا: "میرے ہاتھوں ایسی شاندار تاجپوشی کہاں ہو سکتی تھی؟"

نوعمر بادشاہ قربان گاہ سے نیچے اُترا۔ اور مجمع سے گذر کر قصر شاہی کو واپس آگیا۔ کسی کی جراءت نہ ہوئی کہ اُسکے چہرہ کی طرف دیکھ سکے کیونکہ اُس کا چہرہ ایسا تھا جیسے کسی فرشتہ کا۔ (آسکر وائلڈ)

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

شعرائے حماسہ اور لطائف عشقیہ

عہد اسلام کا ایک مشہور شاعر عبید بن ماویہ طائی کہتا ہے:-

الا حی لیلی و اطلالها　　و رملة ریا و اجبالها
و انعم بما ارسلت بالها　　و نال التحیة من نالها

ہاں میرا سلام پہونچا دے لیلی اور اُسکی قیام گاہ کے کھنڈروں کو، اور رملہ ریا اور اُسکی پہاڑیوں کو جواب سلام بھیجنے کے بدلے خدا لیلی کے دل کو خوش کرے، اور سلام کا لطف اُس نے پایا جسے لیلی ملی۔

شاعر نے جس استغراق اور کیف میں یہ شعر کہے ہیں اُن کا قدرتی تقاضا ہے کہ ذہن سامع پہ ایک خاص کیفیت طاری ہو، محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے، اس لئے لیلی کے ارد گرد جو قدرتی مناظر اور معاشرتی سامان ہیں ان سے شاعر کی ہمدردی ایک ناگزیر امر ہے، وہ "تصور جاناں" میں محو ہے، اور گویا وہ اس دنیا میں پہونچ گیا ہے، جہاں دیدۂ بصیرت لیلی اور لیلی کے ارد گرد رہنے والے مناظر کو بہ نظر محبت دیکھ رہی ہے۔ . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

تھا۔ خواجہ سلمان ساوجی نے ایک خاص انداز میں اسی طرح عناصر کو مخاطب کیا ہے
کہ وہ اُنکے محبوب تک انکا سلام پہونچا دیں۔

نسیم صبح سلامم بہ دلستاں برساں پیام بلبل عاشق بہ گلستاں برساں
مجال دم زدنت گر بود دراں حضرت زمیں ببوس و دعایم زماں زماں برساں
بر آستاں مرسانش غبار من لیکن بر من غبارے ازاں عالی آستان برساں

مگر اس کے بعد وہی فارسیت آگئی ہے، وہی نو وصنعت کا شوق غالب آگیا، فرماتے ہیں :۔

کمند طرۂ او با کمر چو در پیچد دقیقۂ ز تن من دراں میاں برساں
دل مرا کہ کباب است می چکد خونش ببر بر آتش رخسار دلستاں برساں

اسی طرح ایک دوسرا اسلامی شاعر عدیل بن فرخ عجلی، سراپائے محبوب کی تصویر کھینچتا ہے :۔

الا یا اسلمی ذات الدمالیج والعقد وذات الثنایا الغر والفاحم الجعد

تو ہمیشہ سلامت رہے اے بازو بند اور ہار والی، اور اے گنجان سیاہ بال اور چمکدار دانتوں والی ؟ ؟ ؟

وذات اللثات الحمّ والعارض الذی بہ ابرقت عمداً بابیض کالشھد

مسی مالیدہ مسوڑہوں والی اور ایسے سفید دانتوں والی جن کو بالقصد ایسے لعاب دہن کیساتھ نمایاں کیا ہے، جو شہد کیطرح شیریں ہے

کان ثنایاھا اغتبقن مدامۃً ثوت حججاً فی راس ذی قنۃ فرد

گویا اُسکے ان دانتوں کو بوقت شب شراب کہنہ جو سالہا سال کسی الگ تھلگ پہاڑ کی چوٹی پر رہی ہو، پلائی گئی ہے ، ؟ ؟

جری بفراق العامریۃ غدوۃ سواجح سود ما الغید و ما تبدی

سیاہ کوے علی الصباح لیلی عامریہ کے فراق کی خبر لے کر روانہ ہوئے، حالانکہ اون کے اختیار میں کچھ نہیں ؟

اس میں شک نہیں عجلی کے ان اشعار میں عربی ذہنیت کے قدیم رجحان سے اختلاف ضرور پایا جاتا ہے، جاہلی شعرا کے کلام میں اس طرح کے لطیف احساسات کم ہیں، اسکی بڑی وجہ یہ ہے، کہ عجلی اسلامی دور میں پیدا ہوا، اور اُسنے اسلام میں قیصریت اور کسرویت کا منظر دیکھکر یہ اشعار کہے۔

ایک اور شاعر جابر بن ثعلب الطائی کہتا ہے :۔

ولم یلث فی بوس اذا بات لیلۃ یناغی غزالا فاطر الطرف اکحلا

ایک غزال رعنا سرگیں چشم، جادو نظر کی پیاری باتوں میں جب رات گذرتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا کبھی مصیبت میں نہیں گذری تھی،

ریگستان عرب جادو نظر ہرنوں کا مسکن تھا، وادی عرب کے ان رعنا وحشیوں کو دیکھکر حسن کی طرف توجہ کا مبذول ہو جانا ایک قدرتی امر تھا، عربی شاعر نے ماحول کی اس قدرتی پیداوار سے کما حقہ فائدہ اوٹھایا "غزال" کے ساتھ "فاترالطرف" کا تعلق ایک خاص کیفیت افزا ہے، نابغہ ذبیانی نے اسی کو "ناعس الطرف" کہکر ادا کیا ہے، فارسیوں نے عربوں ہی سے یہ تشبیہ لی ہے، حافظ فرماتے ہیں، ے صبا بہ لطف بہ گو آں غزال رعنا را،

سید محمد عرفی نے اسی رعنائی چشم کا نقشہ کھینچا ہے،

زنیم مستی ماناز کرشمہ می بارد　　کہ چشم شاہد عشقست نیم مستی ما،

قرآن مجید میں ہے "وعندھم قصرات الطرف اتراب" (سورہ ص) اور انکے پاس نیچی نگاہ والیاں کم عمر ہونگی غالباً حسن نسائی کی یہ دلکش تفسیر (نیچی نگاہ والیاں) قرآن کا اختراع ہے۔

محبوبان عالم کی جادو نظری کا افسانہ، ان کا سرگیں چشم ہونا، فارسی اور اردو شعرانے عربوں سے سیکھا۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نظر کے لئے نرگس شہلا کی تشبیہ خاص فارسی زبان کی پیداوار ہے، اور یہ اثر ہے اس قدرتی دلکشی کا جسکے لئے سرزمین فارس دنیا میں ایک امتیاز رکھتی ہے، اور "جہاں" "لالہ کوہی" دیکھ کر فارسی شعرانے بیسیوں نئے مضامین پیدا کر دئے۔

فارسی شعرا نے بعض عربی تشبیہات سے لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ "نسیم صبا" "تیر نظر" "شراب و کباب" کی تشبیہات اور فقرے بجنسہ فارسی شعراء کے یہاں ملتے ہیں امرؤالقیس کہتا ہے۔

اذا قامتا تضوع المسک منھما　　نسیم الصبا جاءت بریا القرنفل

یعنی جب ام رباب اور ام حویرث کھڑی ہوتی ہیں تو ان سے مشک کی بو پھیلتی ہے، اسطرح، جس طرح نسیم صبا لونگ سے گزرتی ہوئی آوے۔

جامیؔ کہتے ہیں۔

گر کند غنچہ با تو دعوے لطف　　بردہانش زند "نسیم صبا"،

امرؤالقیس کہتا ہے:-

وما ذرفت عیناک الا لتضربی　　بسھمیک فی اعشار قلب مقتل

میری محبوبہ کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے ہیں بلکہ وہ اپنے تیر نظر سے پارہ ہائے جگر پر نشانہ لگا رہی ہے،

فارسی شاعری میں "تیر نظر" جس کثرت سے استعمال کیا گیا ظاہر ہے،

بعض جگہ عربی شاعری میں محبت عفیف کے ایسے جذبات پائے جاتے ہیں کہ انسان فارسی شاعری کے تصنع آمیز جوش و خروش کو بھول جاتا ہے، لبیث بن حریث کہتا ہے،

محبوبہ ام سلسبیل کا تصور آیا، حالانکہ میرے اور اُسکے درمیان تیز رفتار قاصد کے لئے ایک مہینہ کی راہ ہے، میںنے اھلاً سھلاً اور مرحبا کہا تو اُس نے بھی ان الفاظ کو دہرایا۔

والہ داغستانی نے ریاض الشعرا میں سراج الدین خاں آرزو (مصنف مجمع النفائس) کی وہ جرح لکھی ہے جو اُنھوں نے حزین لاہجی کے اس شعر پر کی ہے۔

ہر چہ خواہی بکن از دوری دیدار مگو وحشت آباد مکن خانہ ویرانی را

اسمیں شک نہیں شیخ کا دوسرا مصرعہ قابل جرح ہے، لیکن لطف یہ ہے کہ خان آرزو نے جوش تنقید میں پہلے مصرعہ پر بھی اعتراض کیا ہے، وہ کہتے ہیں: "گویم در ینجا معشوق مخاطب ست وخطاب خود حالت وصل صورت نمی بندد" لیکن وہ لبعیث کے اس شعر کا کیا جواب دینگے۔

نقلت لہ اھلاً وسھلاً ومرحباً فردت تاھیل وسھل ومرحب

حالانکہ بعیث کو اُمّ السلسبیل کا وصل میسّر نہیں بلکہ وہ صرف خیال "ام السلسبیل" کی نیرنگیوں سے لطف حاصل کر رہا ہے

عربوں کی شاعری میں جس طرح تیر و سنان کے ہولناک مناظر کا نقشہ دکھایا گیا ہے، وہاں جذبات لطیف کی وہ درد و حزن پیدا کرنیوالے کیفیات بھی موجود ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد دل میں خود بخود درد پیدا ہوتا ہے۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے:-

زمانہ نے فراق یار، اور اہل وہمسایہ کی مصیبتوں سے یہاں تک ڈرایا، کہ نہ جدائی کا مجھکو خوف رہا اور نہ مصیبت کا ڈر، زمانہ نے میری کوئی دلآویز چیز نہیں چھوڑی، سب کچھ مجھ سے جدا کر لیا، اب کیا رہگیا، جسکے لئے میں بخل کروں۔

لم یترك الدّھر لی علقاً اضن بہ الا اصطفاہ بنأی او بھجران

اسی طرح ایک دوسرا شاعر طفیل غنوی کہتا ہے:-

میں لذت آشنائے فراق ہوں۔ کیونکہ مہربان ہمسایوں کا درد جدائی مجھے ہمیشہ دیا گیا میں جدائی احباب کے لائق ہوں، کیونکہ جب کوئی دوست مجھے عزیز ہوا، جدا ہو گیا۔

عہد بنی امیہ کا ایک شاعر "راعی" کہتا ہے:-

وقد قاد فی الجیران حیناً وقد تھم دفادقت حتی ماتحنّ جما لیا،

ایک زمانہ تک میرے اور ہمسایوں کے درمیان محبت والفت کی کشش جاری رہی پھر میں جدا ہو گیا، یہانتک کہ اب میری اونٹیاں بھی بسبب اشتیاق وطن نہیں بلبلاتیں،

کم و بیش یہی خیالات فارسی شعراء کے یہاں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن تمام ایرانی ماحول کے تھا۔

اخلاقی شاعری

قرآن مجید نے عربی ذہنیت پر کیا اثر کیا؟ اس کا مطالعہ کرنا ہو، تو عربی شاعری پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے، میں اسوقت تمام اخلاقی مباحث پر بحث کرنا نہیں چاہتا، بلکہ صرف دو تین مسائل کو لیتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ نزول قرآن مجید کے قبل عربوں کی ذہنیت میں فلسفۂ اخلاق کے اعتبار سے کیا کیا ذمائم پائے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سارا عرب اخلاق کے اعتبار سے ایک پست حالت میں تھا، شراب نوشی قمار بازی، دختر کشی، فسق و فجور، افتخار نسبی، جدل و قتل، یہ تمام باتیں ان میں موجود تھیں، حسب و نسب کے متعلق عربوں کے خیالات حد درجہ حماقت آمیز تھے، اور قوم و ملک پر انکا بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔

قرآن مجید میں ہے:۔

واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ،	اور جب انمیں کسی کو بیٹی کی خبر دیجائے، تو سارے دن اس کا چہرہ
مسودًا وھو کظیم یتوارٰی من القوم	بے رونق رہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے، جس چیز کی
من سوء ما بشر بہ ایمسکہ علی ھون	اسکو خبر دیگئی ہے، اسکے عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے، آیا اسکو
ام یدسہ فی التراب الا ساء ما یحکمون	ذلت پر لئے رہے، یا اسکو مٹی میں گاڑدے، خوب سمجھ لو انکی تجویز بہت ہی بُری ہے

چنانچہ شعرائے اسلام کے کلام میں اکثر یہ انقلاب پایا جاتا ہے، عہد اسلام کا مشہور شاعر اسحق ابن خلف کہتا ہے:۔

اگر میری بیٹی امیمہ نہ ہوتی، تو افلاس سے میں پریشان نہ ہوتا، اور نہ شب تاریک میں تاریکی کی تکلیف اوٹھاتا، اقرباکی جفاؤں کے وقت اس نتیجہ کی ذلت و خواری کا علم، جس نے مجھکو زندگی کا زیادہ خواہشمند بنادیا ہے، میں ڈرتا ہوں اس پر کسی دن افلاس کی مصیبت نازل ہو، اور اس ذلیل و خوار لڑکی کا پردہ اُٹھادے جسکو طاقت مدافعت نہیں ہے لڑکی میری زندگی کی خواہاں ہے، اور میں اسکی تکلیف کے خوف سے اس کی موت کا خواہاں ہوں، اور موت عورتوں کا بہترین مہمان ہے، مجھے چچا کی سنگدلی، بھائی کے ظلم کا خوف ہے، اور میں باتوں کی تکلیف سے بھی اس پر رحم کرتا ہوں۔

حطان ابن معلی عرب کا ایک دوسرا اسلامی شاعر کہتا ہے:۔

اگر قطا (ایک جانور کا نام ہے، جسے فارسی میں سنگ خوار کہتے ہیں، جنگل میں اس جانور کے بولنے سے مسافروں کو معلوم ہوجاتا ہے، کہ یہاں کوئی چشمہ ہے) کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح میری ننھی ننھی لڑکیاں نہ ہوتیں، جو میری موت کے بعد ایک دوسرے کے پاس بھیجی جاوینگی (اور انکی کوئی پرورش نہ کرے گا) تو میرے لئے طویل و عریض زمین میں کشادہ میدان ہوتا، ہمارے بچے پارۂ جگر ہیں۔ ہمارے سامنے اُچھلتے کودتے ہیں، اگر ہوا بھی چل جاتی ہے، تو انکی تکلیف کے خوف سے آنکھوں میں نیند حرام ہوجاتی ہے،

اس میں شک نہیں ایسا خیال عہد جاہلیت کے ایک شاعر امیہ بن ابی الصلت کے کلام میں بھی موجود ہے، جس میں اولاد کو بچپن کی پرورش کی یاد دلائی گئی ہے، وہ کہتا ہے :-

غذوتک مولودا و علتک یافعا تعل بما ادنی الیک و تنھل[1]

لیکن امیہ ابن ابی الصلت کے متعلق خود سرور کائنات کا بیان ہے، جو مسلم شریف اور بخاری شریف میں موجود ہے، وکاد امیۃ ابن ابی الصلت ان یسلم یعنی امیہ بن ابی الصلت خیالات اسلام سے قریب تھا، شعرائے جاہلی میں امیہ کو یہ شرف حاصل ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکی تعریف کی، لیکن اسکے علاوہ عہد جہالت کے دوسرے شاعر کے یہاں ایسے خیالات نہیں، شعرائے اسلام کے خیالات تعلیم قرآن کا نتیجہ تھے، اس میں شک نہیں اسحق ابن خلف، اور حطان ابن معلی کے مفصلہ بالا کلام میں عرب کے ایام جہالت کی ذہنیت غالب ہے، اور یہ صرف اسلام اور تعلیم قرآن کی برکت ہے، کہ وہ دختر کشی پر آمادہ نہیں ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو" قرآن مجید کے اس درس اخلاق اور معاشرانہ اصلاح کے متعلق عہد اسلام کا ایک عربی شاعر یوں اعتراف کرتا ہے۔

فلا تطلبنھا یا ابن کوز فانہ غذا الناس مذ قام النبی بجواریا

ابن کوز تو اس لڑکی کو مت طلب کر، کیونکہ جب سے نبی صلعم مبعوث ہوئے لوگ لڑکیوں والے ہو گئے، ؁ ؁

اسحق اور حطان کے جذبات سے پتہ چلتا ہے، کہ ایک طرف ان میں عرب کی معاشرانہ ذہنیت کام کر رہی تھی اور دوسری طرف قرآن مجید کا درس اخلاق مل رہا تھا، قرآن مجید کا یہی اعجاز تھا کہ آخرکار حطان دختر کشی کے بجائے، اپنی بچیوں کو دیکھکر کہتا ہے :-

وانما اولادنا بیننا ؁ ؁ اکبادنا تمشی علی الارض

ہمارے بچے پارۂ جگر ہیں، ہمارے سامنے زمین پر اچھلتے کودتے ہیں،

خاقانی نے منوچہر شروان شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ کے اندر اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور گویا قرآن مجید کی آیت سے لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے استفادہ کیا ہے۔

اگر نہ فضل تو فریاد من رسد بیم است کہ قتل من کند او وقت خشیۃ الاملاق

عرب ہی پر موقوف نہیں، دنیا کے اکثر غیر مہذب اور وحشی اقوام بلکہ متمدن اقوام کے جاہل افراد بھی خانگی تعلقات میں احترام جذبات کی پروا نہیں کرتے، بنی ہزان کی ایک شاعرہ ام ثواب اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر

---

[1] میں نے بچپن میں تیری پرورش کی اور جب نوجوان ہوا، تو میں نے تیری کفالت کی جو کچھ میں لاتا تو اس سے بار بار سیراب ہوتا،

کرتی ہے، اور گویا اس نے خانہ بدوش عربوں کی عائلی زندگی کا ایک مرقع پیش کردیا ہے، وہ کہتی ہے،

بیٹے اسکی (بیٹے کی)، ایسی حالت میں پرورش کی، جبکہ وہ اس چوزہ کے شکل تھا جس کا بزرگ ترین عضو معدہ (پوٹا) ہو اور جسکی جلد پر بجائے پروں کے رونگٹے ہوں، یہاں تک کہ وہ اس درخت کھجور کے مانند جسکی شاخوں کو مالی چھانٹ دے اور اسکے تنہ سے ڈالیوں کو کاٹ دے، بلند بالا ہوا، تو وہ میرے کپڑے پھاڑنے اور میری تادیب کرنے لگا، کیا وہ اس بڑھاپے میں مجھ سے ادب اور تہذیب کا خواہاں ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہی عجیب وغریب فلسفہ نفس پر روشنی ڈالی ہے، جو متمدن اور وحشی دونوں اقوام میں ساس بہو کے تعلقات کا مشترک عنصر ہے۔

قالت لہ عرسہ یوماً لتسمعنی ۔۔۔ مہلاً فان لنا فی امنا ارباً
ولو رأتنی فی نار مسعرۃ ۔۔۔ ثم استطاعت لزادت فوقہا حطباً

یعنی ایک دن اسکی بیوی نے میرے سنانے کے لئے میرے ذکر کے سلسلہ میں کہا کہ اگر مجھکو بھڑکتی ہوئی آگ میں دیکھے تو آگ میں اور لکڑیاں ڈال دے۔

عربی شاعری کی ایک اور خصوصیت اس کا رزمیہ جوش وخروش ہے "عہد جاہلیت" میں یہ عنصر تمام شعرا کے کلام میں عمومی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی مناسبت کے باعث ابو تمام نے اس مجموعہ کلام کا نام "حماسہ" رکھا، جسکے معنی بہادری اور شجاعت کے ہیں۔

"ثار" اسی عہد کی سیاسی خصوصیات میں ہے، امیر علی نے "روح اسلام" (دی اسپرٹ آف اسلام) میں اسکی تصریح کی ہے، یہ عہد جہالت کی نہایت ہیبتناک یادگار ہے، چنانچہ اس کا اثر بعض شعرائے اسلام کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، زیادۃ الحارثی ایک شاعر تھا، اسے ایک شخص ہدبہ بن خشرم نے قتل کرڈالا، اس کا بیٹا "مسور" تھا، ہدبہ کی طرف سے سعید بن عاص نے سات دیت دے کر اسے راضی کرنا چاہا لیکن اس نے صاف انکار کردیا، اور چند اشعار کہے، جن میں ایک یہ ہے:-

فان لم انل ثاری من الیوم اوغد ۔۔۔ بنی عمنا فالدھر ذو متطول

اے بنی عم اگر ہم آج یا کل اپنا انتقام نہیں لے سکے تو کوئی پرواہ نہیں، زمانہ میں بہت گنجائش ہے،

قرآن مجید نے اس خبطی اور انتقامی ذہنیت کو ایک اخلاقی سطح پر لانے کے لئے یہ معجزانہ خیالات ظاہر کئے،

کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ فمن عفی لہ من اخیہ شیء فاتباع بالمعروف واداء الیہ باحسان ذالک تخفیف من ربکم ورحمۃ فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم o ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب (بقرہ)

یوں تو عرب میں دیت (خوں بہا) کا رواج پہلے بھی تھا، لیکن ایک کمزور قبیلہ کا رکن مضبوط قبیلہ کے رکن کے سامنے دیت نہیں پا سکتا تھا، چنانچہ قبیلہ طے کا ایک "جاہلی" شاعر کہتا ہے:-

قوم اذا ما جنی جانیھم امنوا　　من لوم احسابھم ان یقتلوا قودا

یعنی ہماری قوم کا کوئی فرد کسی کو قتل کرتا ہے، تو اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا،

دیت کے لئے بھی خونریزی ہوتی، زورآور قبائل عموماً دیت دیکر آزاد ہو جاتے، اور کمزور قبائل کے اراکین کو اکثر دیت کے بدل قتل ہی کیا جاتا، قرآن مجید نے قوت و ضعف کی تفریق اٹھا دی، اور اس نے عام طور پر مقتول کے وارثوں کو حق دیدیا کہ انکی خوشی پر ہے، خواہ قاتل کا خون بہا لیں یا دیت لیکر چھوڑ دیں۔ ذالک تخفیف من ربکم۔ قصاص ضروری قرار دیا۔ یہ نہیں کہ ایک امیر آدمی قتل کرے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے یا صرف دیت لیکر چھوڑ دیا جائے اور قاتل غریب ہو تو اسے قتل کر دیا جائے، اور دیت بھی قبول نہ کیجائے۔

عرب کے "عہد جاہلیت" کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے، کہ فردوسی نے شاہنامہ اور نظامی نے سکندرنامہ میں بڑی حد تک اسی عہد کی شاعری سے استفادہ کیا ہے،

قرآن مجید کا اسلوب بیان

میکڈانلڈ نے اپنی کتاب "رلجس ایٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام" میں قرآن مجید کے اسلوب بیان اور طرز انشا پر ایک عالمانہ بحث کی ہے، وہ ایک عیسائی ہیں اس لئے انھیں اپنی تحقیق میں بعض ایسے خیالات پیش کرنے میں مضائقہ ہی کیا تھا جو اسلام کے بنیادی اعتقادات کے سخت مخالف ہوں، لہذا پہلے میں انکے بیان کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، اسکے بعد ایک محاکمہ کرکے بتاؤں گا، کہ انھوں نے کہاں کہاں زیادتی کی ہے، انکی تحقیق کے بعض حصہ سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کر سکتا، وہ لکھتے ہیں،

اہل عرب اور اسلام میں نبی کا کیا درجہ ہوتا ہے، اس پر بحث و تمحیص سے قبل یہ ضروری ہے، کہ "کاہن" کے متعلق تفصیلی روشنی ڈالی جائے، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ لفظ، لغوی حیثیت سے عبرانی لفظ "کوہین" کے برابر ہے، میرا اس وقت طلب مسئلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتا، کہ کس طرح توریت میں لطیفر، جیھرو، اور حضرت داؤد کے بیٹوں کو "کوہین" کہا گیا ہے عرب میں یہ مسئلہ اس قدر اہمیت نہیں رکھتا، عرب میں کاہن یا تو کسی خاص معبد میں جاگزیں ہوتا، یا کسی قبیلہ میں رہتا، اور یہاں اسکی عملی زندگی کا وہی نقشہ ہوتا جو شیلو" میں "ایلی" اور اشموئیل کی زندگانی کا، ایک کاہن کے نزدیک تمام پُر اسرار اور مبہم باتیں بیان کیجاتیں، وہ لوگ قضاۃ کی طرح بھی کام کرتے، لیکن ساتھ ہی مستقبل اور غائب کے متعلق بھی پیشین گوئی کرتے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عربوں کے نزدیک کاہنوں کی پیشین گوئیاں کس قدر حقیقت کا پہلو رکھتی تھیں۔ اس واقعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ خود انکو بھی کاہنوں کے علم غیب کا اعتراف کرنا پڑا، لیکن جس امر پہ لوگوں کو اپنی توجہ زیادہ مبذول کرنا، وہ کاہنوں کا ناقابل تغیر طریق بیان ہے، جو تقریباً تمام پُر اسرار

معلومات کے اظہار کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، جسطرح یونانیوں کا ندائے غیبی نظم میں بیان کیا جاتا تھا، اسی طرح ایک
عرب کاہن اپنے اکتشافات غیبی نظم یا مسجع عبارت میں ساز کرتا، جس کے لغوی معنی "آواز کبوتر" کے ہیں، ہمیں یاد ہوگا
کہ عیسائیہ میں کسطرح "ایدیونم" چھپا گئے تھے، وہاں بھی لفظ ہاگہ ("یاہاحہ") ہے جو کبوتر کے غٹ غٹ کرنیکے معنی میں
استعمال ہوتا ہے، اور اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے، کہ ان دونوں میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے "سجع"
جو کہ السنہ اسلامیہ کے اندر بلاغت ومعانی کے اعتبار سے ایک عام طرز سخن سجعی قرار پا گیا ہے، نثر میں چھوٹے چھوٹے
فقروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، یعنی اس میں کسی مقررہ بحر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا لیکن "اسیر" وزن کی قید ہوتی ہے، اب
اگر اس وزن کو ایک قاعدہ کے ماتحت رکھا جائے، تو با وزن نظم تیار ہو جائے، عبرانی زبان میں بھی اس کا وجود تھا
لیکن اس کا استعمال صرف ایک علمی حیثیت رکھتا تھا، عربوں میں شاعری نے اوزان اور بحر کے اعتبار سے اچھی طرح
ترقی کرلی تھی، اور انشا کا قدیم طریقہ یعنی سجع باقی رہ گیا جو قدیم شعر کا طرز خاص اور کاہنوں کے بیان کے لئے مخصوص
تھا، لیکن یہ "سجع" اس ابتدائی زمانہ میں شعر کی ایک قسم تھا وہ علمی طریق انشاء نہ تھا، جس کا رواج اہل اسلام
میں آخری دور میں پایا جاتا ہے۔

محمد کا ادبی درجہ کیا تھا؟ زمانہ کے کس ادبی طرز کو اُنھوں نے اختیار کیا؟ اس کا جواب بہت آسان ہے، اور ہر وہ
شخص جس نے قرآن کے چند سطور، اور بالخصوص اسکے آخری حصوں کا مطالعہ کیا ہوگا، آسانی سے جواب دے
سکتا ہے، قرآن تمام و کمال "سجع" میں لکھا ہوا ہے، سجع حصے جنھیں "آیات" کہتے ہیں، طول میں باہم مختلف ہیں، ابتدائی
سورتوں میں یہ آیتیں مختصر ہیں لیکن طرز ادا میں جدت اور روانی ہے، آخر سورتیں، مطول، رنگین اور افسردہ ہیں، اور
انکیں وزن کی پابندی نہایت بُری طرح پر ملحوظ رکھی گئی ہے، یہ ظاہر ہے کہ محمد کے پہلے بیانات کاہنوں سے ملتے ہوئے
ہیں، اور ان میں وہی روح پائی جاتی ہے، جو کہانت کا طغرائے امتیاز ہے، یعنی وہ انھیں اسطرح پیش کرتے جیسے ایک غیر
متصرفانہ طور پر کسی خارجی دباؤ کے ماتحت انکے دل و دماغ سے اُبل رہے ہیں، مفصلہ ذیل واقعہ سے جاہلیت عرب کے زمانہ
کی ایک نہایت ہی پُر لطف اور دلکش تصویر سامنے آجاتی ہے، جو اثر نبوت (یا پیشین گوئی) کے ماتحت ایک کاہن کے
متعلق ہے۔

بادشاہ حجر نے (مشہور جاہلی شاعر امرؤ القیس کا باپ تھا) بنو اسد پر درد ناک ظلم کیا اور انھیں انکے مقبوضات سے نکال
دیا، آغانی کے اندر امرؤ القیس کی زندگی کے ماتحت مفصلہ ذیل روایت پائی جاتی ہے۔

بنو اسد اس کے بعد آگے بڑھے، یہاں تک کہ وہ تہامہ سے ایک دن کی منزل پر پہونچے، انکے کاہن نے جو عوف ابن ربیعہ
تھا، پیشین گوئی کی اور ان سے کہا "اے میرے بندو" انھوں نے کہا "اے میرے مولا! حاضر" اوس نے کہا اونٹوں کے
درمیان میں جیسے غزال کا ایک جھنڈ ہو، کون ہے؟ وہ بادشاہ، وہ فاتح کل، غیر مفتوح۔ جس کے سر پر کوئی خود نہیں،

اس کا خون چاروں طرف بہیگا، کل وہ سب سے پہلے پارہ پارہ تباہ ہوگا، اُنھوں نے کہا اے میرے مولا! یہ کون ہے؟ اُس نے کہا اگر میری تڑپتی ہوئی روح میں مزید اضطراب نہ ہوتا تو میں صاف صاف کہتا، کہ یہ حجر بادشاہ ہے، تب وہ گھوڑوں پر سوار ہوکر چلے، اور ابھی اچھی طرح دن کی روشنی بھی نہیں پھیلی تھی، کہ وہ حجر کے لشکر پر آئے اور انکے خیموں پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد اور واقعات پائے جاتے ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے، کہ کس طرح کاہن کی پیشین گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی، لیکن اس سے ہمیں دلچسپی نہیں، یہاں پیشین گوئی کے طریقہ اور لہجہ سے بحث ہے، وہ لفظ کا ترجمہ ہے "پیشین گوئی" کی، کیا ہے" تکاھن" ہے جس کے معنی ہیں" اس پر ایک ملہمانہ بیہوشی طاری ہوئی" ظاہر ہے کہ وہ اسوقت اپنے ہوش میں نہ تھا، اس کا طرز بیان مسجع تھا، جس کے متعلق میں سطور بالا میں لکھ چکا ہوں، قابل غور امر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے رفیق کی حیثیت سے مخاطب نہیں کرتا بلکہ انھیں" عباد" سے موسوم کرتا ہے، اور وہ "عباد" بھی وہی لہجہ اختیار کرتے ہیں جو خدا کے لئے مخصوص ہے، یعنی" اے میرے مولا" کہکر جواب دیتے ہیں

یہ تمام باتیں محمدؐ کی ابتدائی وحی میں موجود ہیں، انہیں اسی قسم کی تصویر ہے، اور انکا لہجہ بھی ایسا ہی ہے، تصدا خود مخاطب کررہا ہے، اور اُنکی مابعد کی زندگی میں سلسلہ وحی کا اس لہجہ میں ہونا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اُنھوں نے اس طرز میں ابتدا کی تھی، یہ وہی طریقہ تھا، جس میں انبیا نے اپنا پیغام دیا، محمدؐ نے اس طرز میں چونکہ شروع کیا تھا اس لئے انھیں اخیر تک اس طریق کو جاری رکھنا ضرور تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ان پر ایک قسم کا عالم بیخودی طاری ہوتا تھا، پہلے پہل خود انھیں خیال ہوا، کہ ان پر کسی جن کا تسلط ہے، (جیسے وہ اپنے عقائد کے مطابق ایک بری روح سمجھتے تھے) لیکن بتدریج انھیں یقین ہوتا گیا کہ یہ الہام ربانی ہے، ارواح خبیثہ کا اغوا نہیں، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ ان کیفیات نے جو ان پر طاری ہوتی تھیں، اخیر تک انھیں مشوش رکھا۔ لیکن جب اُنھوں نے سمجھا کہ یہ الہام ربانی کا ایک ذریعہ ہے، تو انھیں اس قسم کے دوسرے مظاہر سے دلچسپی ہونے لگی۔ مثال کے طور پر اُنھوں نے بتایا کہ کس طرح بعض اوقات انکی پیشین گوئی میں صادق ہوتے ہیں"۔

میکڈانلڈ نے بخاری، آغانی، مصابیح، اور پروفیسر گولڈ زیہر کی کتاب" علوم اسلامیہ" کے حوالہ سے عہد نبوت کی ایک عجیب شخصیت ابن صیاد کی مختصر حالت لکھی ہے، اور اُسکی زندگی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خصائص نبویہ، اور نوامیس ملکوتیہ کا مقابلہ کیا ہے، جو واقعات لکھے ہیں، وہ بعینہ بخاری (کتاب الادب) میں موجود ہیں، البتہ آغانی اور مصابیح سے جو واقعات درج کئے ہیں۔ وہ بخاری کے اندر نہیں، اس لئے میں پروفیسر گولڈ زیہر کی روایت کا ترجمہ درج کرنے کی بجائے بخاری کی روایت پیش کرتا ہوں، حضرت عبد اللہ ابن عمر اس حدیث کے راوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

حضرت عمر اور کئی اصحاب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابن صیاد کے پاس تشریف لیگئے، دیکھا تو وہ لڑکوں کے ساتھ بنی مغالہ کے مکانوں میں کھیل رہا ہے، ان دنوں یہ جوانی کے قریب تھا اسکو (کھیل میں) خبر نہ ہوئی یہاں تک کہ

آنحضرتؐ نے اپنا ہاتھ اسکی پیٹھ پر مارا پھر فرمانے لگے تو اس بات کی گواہی دیتا ہے، کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں، آپ نے اس کو ڈھکیل دیا اور فرمایا کہ میں اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لایا پھر آپ نے اس سے پوچھا، بتا تجھے کیا دکھائی دیتا ہے، کہنے لگا میرے پاس سچے اور جھوٹے دونوں آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر تو تیرا کام سب غلط ملط ہوگیا، پھر آپ نے فرمایا اچھا میں نے تیرے لئے ایک بات دل میں ٹھان لی ہے، بھلا بتا تو، اس نے کہا "دخ" ہے، آپ نے فرمایا چل دور ہو بس تیرا اتنا ہی حوصلہ ہے، اس سے بڑھ کہاں سکتا ہے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ اجازت دیجئے، میں اس کی گردن اُڑا دوں، آپ نے فرمایا اگر یہ دجال ہے تو تو اسکو مار ہی نہیں سکتا، اور اگر دجال نہیں ہے تو اس کے مارنے میں فائدہ ہی کیا ہوگا؟ (ان یکن ہو لا تسلط علیہ وان لم یکن ہو فلا خیر لک فی قتلہ) سالم نے کہا میں نے عبداللہ ابن عمرؓ سے اس واقعہ کے بعد ایک بار اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ابی بن کعب کو ساتھ لیکر اس باغ کے قصد سے چلے جہاں ابن صیاد رہا کرتا تھا، جب باغ میں پہونچے تو آنحضرتؐ نے کھجور کی ٹہنیوں میں چھپنا شروع کیا آپ کا مطلب یہ تھا کہ ابن صیاد آپ کو نہ دیکھے اور آپ اسکی باتیں سن لیں، اُسوقت ابن صیاد چادر اوڑھے گن گنا رہا تھا (مضطجع علی فراشہ فی قطیفۃ لہ فیہا رمرمۃ او زمزمۃ) لیکن ہوا یہ کہ اسکی ماں نے آنحضرتؐ کو دیکھ لیا، اور ابن صیاد کو خبر کردی، یہ سنتے ہی وہ خاموش ہو رہا، آنحضرتؐ نے فرمایا اگر اسکی ماں چپ رہتی تو ابن صیاد کی باتوں سے اس کا کچھ حال معلوم ہوتا،

گولڈ زیہر[۵] کے ترجمہ سے، میکڈانلڈ نے جو اقتباس درج کیا ہے، وہ یہیں تک ہے، لیکن حدیث یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد اور بھی واقعات پائے جاتے ہیں، اسی سلسلہ میں ہے۔

سالم نے کہا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں کھڑے ہوئے اور اللہ کی تعریف کی جیسی چاہیئے، پھر دجال کا ذکر کیا فرمایا کہ میں تم کو دجال سے ڈراتا ہوں، اور ہر ایک پیغمبر نے اپنی امت کو اس سے ڈرایا ہے، یہاں تک کہ نوح پیغمبر نے بھی، لیکن میں تم کو دجال کی ایسی نشانی بتلاتا ہوں جو کسی پیغمبر نے اپنی امت کو نہیں بتائی، وہ کانا ہے، دجال کانا ہوگا، خدائے تعالےٰ کانا نہیں ہے۔

میکڈانلڈ اب اس واقعہ پر تبصرہ کرتا ہے۔

"مجلس استقرار نفسیہ" کے طریقہ کے مطابق، ایک پیغمبر کا دوسرے پیغمبر کی تحقیق کرانے کے متعلق یہ ایک نہایت دلچسپ قصہ ہے، محمدؐ نے ظاہر طور پر اپنا اطمینان کرلیا، کہ وہ خطرناک نہیں، وہ مسلمان ہوگیا اور ۶۳ھ تک زندہ رہا، لوگ اسے مشتبہ

۵۔ گولڈ زیہر کے ترجمہ میں "اک صاف وھو اسمر" کا فقرہ نہیں ہے، میکڈانلڈ نے یہ اضافہ البتہ کیا ہے، کہ یہودی ابن صیاد کو اپنا نبی تصور کرنے لگے تھے، جو حدیث میں نہیں،

سمجھتے رہے۔ اور ہر چند اس کا ایک لڑکا حدیث کا ایک ثقہ راوی گزرا ہے (بحوالہ نووی) خود ابن صیاد سے لوگوں نے مقاطعہ کر لیا تھا، الفرزدق شاعر ایک بار مدینہ میں آیا اور نادانستہ ابن صیاد کے گھر میں داخل ہوا، اُس نے کہا کہ لوگ اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے (بحوالہ آغانی) دوسرے احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے شکایت کی کہ میں ایک مسلمان ہوں، مدینہ اور مکہ میں میرے لڑکے موجود ہیں، اور یہ مسیح دجال کے لئے ناممکن ہے (بحوالہ مصابیح) لیکن دوسرے لوگ خیال کرنے لگے کہ اس پردہ میں وہ اپنی معاندانہ فکر واحساس کا مبلغ، اور اغراض ذاتی کا طالب ہے، ظاہر ہے کہ ابن صیاد کی زندگی میں محمدؐ نے وہی مظاہر دیکھے جنھیں آپ نے اپنی زندگی میں مطالعہ کیا، لیکن اُنھوں نے اطمینان کر لیا کہ اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

آپ کا طرز خطابت، لہجہ ادا، اسلوب بیان ہر چند کاہنوں سے ملتا ہوا ہے، اور اگر یہ ان لیا جائے کہ آپ کو روح القدس سے فیضان ہوتا تھا تو بھی باوجود اُس پُرزور بیان کے جو آپ نے کاہن اور اپنے درمیان امتیاز پیدا کرنے کیلئے پیش کیا۔ آپ کے مخالفین آپ کو شاعر کہنے لگے، ظاہر ہے کہ اس سے انکی یہ غرض نہ تھی کہ ان شعرائے متاخرین کے ساتھ آپکی مشابہت قائم کریں، جو انشا اور لطافت ادبی کے لحاظ سے صحیح وزن و بحر میں اشعار کہتے تھے جسکی استعداد آپ میں موجود نہ تھی۔ بلکہ اُنکی مراد اُن شعراء سے تھی جو حالت بیخودی میں عالم غیب سے ایک رشتہ اتحاد رکھتے، یا جن پر وہ جن کا تسلط بتاتے، آپ کاہن سے ممتاز تھے مگر اس طرح جسطرح بنی اسرائیل سرزمین نبوت"، کو خط "نبھیم" (NEBHiiM) سے ممتاز کرتے تھے، جس میں بیخودی کی تحریک تو پائی جاتی تھی، لیکن کسی واضح مذہبی تخیل کا فقدان تھا، (باقی)

عبدالمالک آروی،

شاعر کا انجام

اِنصاف

(فسانہ)

سارا چوماسہ گذر گیا لیکن پانی کی ایک بوند نہ گری۔ بادل گرجتے گھنگھور گھٹائیں آتیں لیکن پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ مالدار زمینداروں نے کچھ عرصہ تک تو چرسا لگوا کر کنوئیں کے پانی سے اپنے کھیتوں کو سینچوایا لیکن آخر کار اُنھوں نے بھی ہمت ہار دی۔ کسانوں کی نظریں آسمان سے لگی رہتیں۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اندر دیوتا کی ناراضگی کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔ بڑی ذات والوں نے کتھائیں کرائیں۔ مندروں میں پوجا پاٹ کیا۔ نیچ ذات والوں نے "سنکٹا دیوی" کی منتیں مانیں۔ مسلمانوں نے مسجدوں میں دُعائیں مانگیں لیکن سب بے سود ہوا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے ننگے بدن ایک لنگوٹی باندھے گاؤں بھر میں چلاتے پھرتے "چھوچی لگری بیل پیاسا بیگھا با با پانی دے"۔ بچوں کے ساتھ ہی سادھو سنت لوگ بھی صدا لگاتے "برسیں گے برسا دیں گے۔ کوڑی ڈھیر لگا دیں گے۔ کوڑی گئی ریت میں۔ پانی آیا کھیت میں"۔ لیکن ان دیہاتی ترانوں اور ٹوٹکوں سے بھی اندر دیوتا کا دل نہ پسیجا اور قحط پڑ گیا۔ اس قحط سالی میں "بدن پور" کے اندر اگر کسی کی چاندی تھی تو وہ گیادین مہاجن کی۔ صبح سے شام تک اُس کے دروازہ پر آدمیوں کا ہجوم رہتا وہ دس روپیہ کا زیور مشکل سے ایک روپیہ میں گروی رکھتا۔ اور اس پر بھی ایک آنہ فی روپیہ سے کم سود نہ لیتا۔ جب اُس نے گاؤں کو اچھی طرح سے سود در سود کے جال میں پھنسا لیا تو پھر حاجتمندوں کو اپنی ڈیوڑھی سے بھگانے لگا۔

گیادین کے والدین بڑے غریب تھے۔ گڑ چبینا بیچ بیچ کر اُنھوں نے بڑی مشکل سے اپنی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن اُن کے مرتے ہی گیادین پر لکشمی دیوی کی کرپا ہو گئی۔ مہاراج دینا ناتھ گاؤں کے ایک بڑے کاشتکار تھے۔ جب وہ جگن ناتھ جی کی یاترا کو جانے لگے تو اُنھوں نے ایک ہزار روپے گیادین کے پاس امانت رکھدئے۔ لیکن جگن ناتھ جی جا کر مہاراج دینا ناتھ گھر واپس نہ ہوئے معلوم نہیں کہ وہ مر گئے یا کیا ہوئے۔ کئی سال گذر گئے ان کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ ان کے رشتہ داروں نے گیادین سے روپے واپس لینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن گیادین صاف مُکر گیا۔ اُس نے کہا کہ مہاراج نے اُس کے پاس کوئی امانت نہیں رکھی۔ رشتہ دار اسکا کوئی ثبوت نہ دے سکے۔ چنانچہ وہ سب روپے گیادین کے ہو گئے اور اسی سے اُس نے لین دین کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ مالدار سیٹھ بن گیا۔

(۲)

قریباً دس بجے دن کا وقت رہا ہوگا گیادین مہاجن گھٹنوں تک چڑھی ہوئی پرانی دہوتی اور پھٹی مرزئی پہنے اپنی ڈیوڑھی میں ایک ٹاٹ پر بیٹھے روکڑ بہی لکھ رہے تھے۔ ان کے قریب ہی انکی بیوی ستیا بیٹھی ہوئی گیہوں پھٹک رہی تھی کہ متی، گبنی،

نے اندر آکر سیٹھ جی کو سلام کیا۔ سیٹھ جی نے اسکی طرف دیکھکر کہا "کہو متّی کیسے آئے؟"
"کچھ روپے کی ضرورت ہے"
مہاجن نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا "آج کل ہاتھ بہت تنگ ہے جانتے تو ہو نہیں تو میں بھلا تم سے انکار کرتا"
متّی ابھی ناامید نہیں ہوا تھا اُس نے پھر کہا "سیٹھ جی! دیا ہو جائے۔ رام دے ہم لوگ بڑی مصیبت ماں (میں) ہیں۔ کل رات سے ہلوگ روٹی نہیں کھاوا (کھایا) بچن بھوکن مرت ہیں (بچے بھوکے مرتے ہیں)" یہ کہکر متّی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔

عورت کا دل نازک ہوتا ہے۔ رشیا اُٹھکر وہاں سے چلی گئی۔ لیکن مہاجن کا دل پتھر کا تھا۔ اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہوا ایسے ایسے نہ معلوم کتنے متّی صبح سے شام تک مہاجن کے سامنے آکر ماتھا رگڑ کر چلے جاتے تھے۔ اُنھوں نے اخیر میں کہا "متّی! میں تمہارے ساتھ بس اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ اگر تم کوئی چیز گروی رکھو تو جہاں سے بھی ہوگا تمہارے لئے روپے کا بندوبست کر دونگا"
متّی۔ گھر میں دو چار برتن تھے وہ پہلے ہی سے تمہارے پاس گروی رکھے ہیں۔ اب تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔
"جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا آگے تمہاری مرضی۔ زمانہ نازک ہے ایسے میں گروی رکھے بغیر کوئی روپیہ ندیگا"
متّی نے بہت خوشامدیں کیں لیکن ایک دفعہ گیا دین کی زبان سے جو "نہیں" نکل گیا۔ تو پھر اُنھوں نے "ہاں" نہ کی۔ مایوس ہو کر متّی اپنے گھر واپس ہوا۔ اسکے بچے بھوک کے مارے تڑپ رہے تھے۔ متّی کو دیکھکر سب اسکی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن متّی کے پاس کیا تھا جو ان کی شکم پُری کرتا۔ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھ کر رہگیا۔ اس کے گھر کے قریب ہی گاؤں کے چودھری کا مکان تھا وہاں آج حاکم علاقہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن کے اور اُن کے نوکروں کے لئے کڑاہیاں چڑھی تھیں۔ خستہ کچوری کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن غریب متّی کے یہاں فاقہ تھا۔

رُکیا نے اپنے شوہر سے کہا "تو اسطرح کے دن کام چلیئے۔ (چلے گا۔)
متّی۔ تو میں کا کر سکت ہوں (میں کیا کر سکتا ہوں)
رُکیا۔ نہ ہو مور سونے والا تویج گروی رکھ دیو (کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میرا طلائی تعویذ گروی رکھ دو)
متّی۔ کون تویج (تعویذ)
رُکیا۔ وہی جو تم پردیس سے بنوا لاؤ رہا (بنوا لائے تھے)
گزشتہ سال متی جب کلکتہ نوکری کرنے گیا تھا تو وہاں سے وہ ایک طلائی تعویذ رُکیا کیلئے لے آیا تھا۔ عورتوں کو گہنا بہت پیارا ہوتا ہے۔ جس وقت رُکیا نے اپنی پٹاری سے تعویذ نکال کر متّی کے ہاتھ پر رکھا تو اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
متّی تعویذ لے کر خوش خوش مہاجن کے پاس پہونچا اور بولا "لو مہاجن یہ تویج (تعویذ) گروی رکھ لو"
مہاجن نے تعویذ کو ہاتھ میں لیکر خوب غور سے دیکھا اور کسوٹی پر پرکھ کر کہا "کتنے روپیوں کی ضرورت ہے؟"

متّی۔ کم سے کم تین روپے میں تو کام چلے میں (یکر ساٹھ روپیہ دیوں رہا جنہیں اسکے ساٹھ روپیے دئے تھے۔)

مہاجن۔ لیکن میں تو اسکے پندرہ روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دے سکتا آگے تمہاری خوشی۔

آخر کار بڑی مشکل سے گیا دین نے متّی کو بیس روپے دئے جب متّی روپے لیکر چلنے لگا تو مہاجن نے کہا" بیاج معلوم ہے"

متّی۔ ہاں وہی دو پیسہ روپیہ۔

مہاجن۔ اس بھرم میں بھی نہ رہنا ایک آنہ روپیہ سے کم سود نہ لوں گا۔

مہاجن سے اب کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ متّی نے گیا دین ہی کے یہاں سے گڑ اور ستو خریدا اور گھر پہونچکر سب کو پیٹ بھر کر کھلا دیا۔ بہت دنوں کے بعد آج متّی نے اپنے ناریل کو تازہ کیا۔ رکیا نے چلم بھری اور متّی نے بڑی بیفکری کے ساتھ حقہ پیا۔ اس کے دو چار ہی دن کے بعد متّی نوکری کرنے کے لئے کانپور چلا گیا اور وہاں کسی کارخانہ میں نوکر ہوگیا۔

(۳)

دو سال کے بعد جب متّی اپنے گاؤں میں واپس آیا تو اُس کو گاؤں کا نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ کئی نئی پختہ عمارتیں بن چکی تھیں۔ گیا دین مہاجن کے کچے مکان کی جگہ پر اب اسے ایک عالیشان کوٹھی نظر آئی۔ لیکن متّی کا جھونپڑا بدستور اُسی حالت میں تھا جس حالت میں وہ اُسے چھوڑ گیا تھا۔ متّی کانپور سے اپنے گھر کے لئے برابر خرچ بھیجتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مہاجن کا بھی قرض ادا کر چکا تھا صرف سود دینا باقی رہگیا تھا۔ جب اسے گھر کے کاموں سے فرصت ملی تو وہ مہاجن کے یہاں سے اپنا سونے کا تعویذ چھڑانے چلا۔ کوٹھی پر پہونچکر متّی نے چاہا کہ ہمیشہ کی طرح وہ اندر گھس کر مہاجن کے پاس پہونچ جائے۔ لیکن دربان نے ڈانٹ بتائی۔ "بڑے آئے کہیں کے بغیر مالک کے اجازت کے اندر جانے کا کسی کو حکم نہیں ہے۔ چل ہٹ یہاں سے"۔ متّی بھی اب مفلوک الحال نہ تھا اسوقت اُسکی جیب میں چاندی کے سکے پڑے تھے وہ جب غریب تھا تو بلا روک ٹوک مہاجن کے پاس پہونچ جاتا تھا اور اب تو وہ پردیس سے کما کر آیا تھا اُسے اندر جانے سے کون روک سکتا تھا اور پھر ایک معمولی پیادہ ڈانٹ بتائے یہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا اکڑ کر بولا" تو موکا ہیں روک سکت میں مہاجن کے پاس جرور جیہوں۔ میں اپن سونے کا توتج چھڑاون آؤں ہوں (تو مجھے نہیں روک سکتا میں مہاجن کے پاس ضرور جاؤں گا۔ میں اپنا سونے کا تعویذ چھڑانے آیا ہوں)

دربان نے سوچا بڑے بڑے زمیندار اور رئیس تو اس ڈیوڑھی پر سر جھکاتے آتے ہیں۔ آخر یہ کورمی کہاں کا تیس مار خاں ہے جو مجھ پر اپنا رعب جماتا ہے۔ تیوری چڑھا کر بولا" تو اتنا گرم کیوں ہوتا ہے۔ میں تیرا نوکر نہیں ہوں۔ کہ تیری دھونس میں آجاؤں تو وہی تو ہے جو پہلے گاؤں میں مارا مارا پھرتا تھا کھانے تک کو کچھ نصیب نہ تھا پردیس سے کما کر کیا لایا ہے کہ اپنی ذات بھول گیا مگر اس ڈیوڑھی پر تو تجھ ایسے تین سو ساٹھ روزانہ آکر اپنی ناک رگڑا کر چلے جاتے ہیں۔ اگر تیرا زیور گروی رکھا ہے تو پہلے وہ جو منیم جی سامنے بیٹھے ہیں اُن سے جاکر بات چیت کر۔ رہ گیا سیٹھ جی سے ملنا تو جب تک اُنکی اجازت نہ ہوگی میں تجھے اندر نہ جانے دونگا"

باتیں تھیں تو معقول مگر زہر میں بجھی ہوئیں۔ انہیں مٹھاس نام کو بھی نہ تھی۔ نفسیات کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ چاہے کوئی بیوقوفی کی باتیں ہی کیوں نہ کر رہا ہو لیکن وہ پسند نہ کرے گا کہ کوئی اُسے بیوقوف کہے۔ متئی دربان کے سامنے اپنی شکست ماننے کیلئے تیار نہ تھا۔ اسکو بھی روپے کی گرمی تھی۔ جس طرح برسات کا پانی پا کر ندی نالے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح متئی پر اسکی پردیس کی کمائی نے اثر کیا اُس نے بگڑ کر دربان سے کہا " دربان جی! موسے کا اکڑت ہو۔ میں تمہرے باپ دادوں سے کھوب واکف ہوں۔ تمہارا دادا مورے یہاں بھینس چراوت رہا۔ چار روپلی پر یہ دھونس۔ میں تمہار ساری ہیکڑی بھلائے دیہوں (مجھ سے کیا اکڑتے ہو۔ میں تمہارے باپ دادوں سے خوب واقف ہوں۔ تمہارا دادا میرے یہاں بھینس چراتا تھا۔ چار روپے پر اتنا رعب کیوں جماتے ہو۔ میں تمہاری ساری شیخی نکال دونگا)

ناخلف سے ناخلف اولاد بھی یہ پسند نہ کرے گی کہ کوئی اس کے سامنے اس کے باپ دادوں کی برائی کرے دربان نے آگے بڑھکر متئی کو مارنا چاہا۔ ادھر متئی اسکے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اگر دربان کو اپنی قوت پر ناز تھا تو متئی کو بھی اپنی پہلوانی کا بڑا دعوی تھا وہ اب سے پہلے کئی کشتیاں مار چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ممکن تھا کہ متئی دربان کو خوب ٹھونکتا لیکن سیٹھ جی کی کوٹھی پر دربان سے جھگڑا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ دربان کی پکار سُن کر سیٹھ کے نوکر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور متئی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

(۴)

متئی سیٹھ جی کے یہاں سے پٹ کر نکلا تو جوش انتقام سے پاگل ہو رہا تھا۔ راہ میں شکرو اچار نے متئی سے کہا "بڑا جلم (ظلم) ہے"۔ متئی جلا ہوا تھا تڑپ کر بولا "جلم (ظلم) نہیں تو اور کا (کیا)، ہے مدا (لیکن) میں بھی دبنے والا اسامی نہیں ہوں۔ دربان سالے کو تو سمجھوں گا ہی مدا (لیکن) گیا دین کی ہیکڑی نہ بھلا دیوں تو مور (میرا) نام متئی نہیں۔ گورنمنٹی راج ہے ہنسی کھیل نہیں۔

اسی جگہ عبدالحی خانصاحب آ گئے۔ کسی زمانہ میں وہ رسالہ میں نوکری کر چکے تھے۔ لیکن اب تک ان میں فوجی دم خم باقی تھا۔ ان سے اور سیٹھ گیا دین سے کبھی کسی بات پر تکرار ہو چکی تھی۔ یہی بدلہ لینے کا موقع تھا۔ متئی سے بولے " تمہاری جگہ پر میں ہوتا تو خدا کی قسم خون کی ندی بہا دیتا۔ جب میں رسالہ میں نوکر تھا تو ایک مرتبہ ایک لکھ پتی سیٹھ سے میری تکرار ہو گئی۔ میں نے فوراً اُسے گولی مار دی اور جا کر اپنے کمانیر صاحب بہادر سے سب حال کہدیا۔ واہ! واہ! پہلے زمانہ کے افسر بھی راجہ ہوتے تھے مجھسے کہنے لگے "ول خانصاحب ٹم نے بڑی بہادری کا کام کیا کوئی فکر کا بات نہیں ہے۔ ہم تمہارا ساتھ دے گا۔ بس کیا تھا پولیس نے تو تھے پھانسنے کی بہت کوشش کی لیکن میرا کچھ نہ بگاڑ سکے"

گانوں والے خانصاحب کی بہادری کے بہت سے افسانے سُن چکے تھے۔ اُن کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی شکرو اچار نے چٹکی لیکر کہا "خانصاحب آپ کی اور بات ہے مدا (لیکن) بیچارے متئی اور سیٹھ کا کیا مقابلہ" "کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی" متئی نے جل کر کہا۔ " سیٹھ ہوگا تو اپنے گھر کا مور (میرا) کا (کیا) بگاڑ سکت ہے (سکتا ہے) میں ابھی تھانہ ماں جاکر رپٹ

لکھاوت ہوں پھر دیکھو کا مجا آوت ہے (میں ابھی تھانہ میں جاکر رپورٹ لکھاتا ہوں پھر دیکھنا کیا مزہ آتا ہے)

جب متئی تھانہ میں رپٹ لکھانے چلا تو رُکیا نے کہا "جانے دیو سیٹھ جی سے کاہے کو جھگڑا بڑہاوت ہو جو ہوئے کا رہا ہوئے گیا۔ رپٹ لکھاوے سے کچھ فائدہ نہ ہوئے گا۔ اور سچ تو ہے ہمارا اور سیٹھ جی کی کون برابری۔ ہم غریب وہ امیر۔ سب اوکر ساتھ دیہیں۔ (جانے دو سیٹھ جی سے کیوں جھگڑا بڑہاتے ہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ رپٹ لکھانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہم غریب ہیں وہ امیر ہے۔ سب اُسی کا ساتھ دیں گے۔)

متئی نے جھڑک کر کہا۔ "تو چپ بیٹھی رہ مورِ بڑی بے اجتی بھئی ہے میں جرور بدلہ لیہوں (میری بڑی بیعزتی ہوئی ہے میں ضرور بدلہ لوں گا۔) جب متئی تھانہ میں پہونچا تو اُسے یہ دیکھکر سخت تعجب ہوا کہ دربان اور سیٹھ کے آدمی وہاں پہلے ہی سے موجود ہیں۔

سیٹھ گیاوین لڑائی جھگڑے کے نام سے دور بھاگتے تھے مگر لوگوں نے انھیں سمجھایا کہ اگر متئی نے پہلے رپٹ کردی تو مصیبت آجائے گی۔ اسوجہ سے سیٹھ جی کو مجبوراً پولیس والوں کی خوشامد کرنی پڑی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں پولیس تو ایسے ہی سیٹھوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ سیٹھ جی سمجھتے تھے کہ دوچار روپے میں کام بن جائے گا۔ مگر پانچسو روپے خرچ ہو گئے تب کہیں بڑی مشکل سے دولت کے پجاریوں کا مزاج درست ہوا۔ دربان کے زیادہ چوٹ نہ آئی تھی لیکن اس کی طرف سے بڑی زوردار رپٹ لکھدی گئی۔ اور اُس کو ڈاکٹری ملاحظہ کے لئے سول سرجن کے پاس بھیج دیا گیا لیکن جب متئی رپٹ لکھانے کے لئے پہونچا اور فریاد کی تو کانسٹبلوں نے اسے دھکے مار کر تھانہ سے باہر کردیا اور کہا "جا عدالت میں نالش کر۔ یہاں کچھ نہیں ہوسکتا"

انصاف کا بھوکا متئی حیران و پریشان گھر واپس ہوا۔ اب اسکو پتہ چلا کہ انصاف نام ہے دولت کا۔ دنیا میں اسی کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے جو دولتمند ہو غریبوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔

ادھر سیٹھ جی کی رشوت اور پولیس کی کوشش سے دربان کو ضرب شدید کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ پھر کیا تھا پولیس والوں کی بن آئی۔ اُنھوں نے متئی کو گرفتار کرکے اُس پر فوجداری کا مقدمہ چلادیا۔ رُکیا تمام گاؤں میں فریاد کرتی پھری لیکن کسی کو اُس پر رحم نہ آیا۔ متئی کی مدد کرنا گویا سیٹھ جی سے لڑائی مول لینا تھا۔ اور یہ کسی میں طاقت نہ تھی عبدالحی خان صاحب بھی جو بڑی دون کی لیتے تھے وہ بھی متئی کی مدد نہ کرسکے۔ عدالت میں پولیس نے متئی کے خلاف مکمل شہادت پیش کی۔ متئی اپنی صفائی میں ایک گواہ بھی نہ پیش کرسکا۔ عدالت کا فیصلہ تو صرف شہادت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس نے متئی کو ۶ ماہ قید سخت کی سزا دیدی۔ انصاف اسی کا نام ہے۔ متئی کا رونا اور فریاد کرنا عدالت میں کام نہ آیا۔

(۵)

عجب اتفاق ہے کہ متئی کو جیل بھجوا کر سیٹھ جی بھی چین سے نہ رہ سکے۔ لوگوں نے اُسے خدائی انصاف سمجھا خیر کوئی بھی سبب رہا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ سیٹھ جی کے کاروبار میں یکبارگی خلاف توقع زوال آنا شروع ہوگیا۔ وہ سال بھر کے

گانوں کے ایک کاشتکار للو نے پچاس روپے قرض لئے تھے۔ کسی بات پر للو اور سیٹھ جی میں کچھ تکرار ہوگئی۔ سیٹھ جی نے اسکا بدلہ یہ لیا کہ للو پر پچاس روپے کے بجائے پانچسو روپے اور سود در سود کی نالش ٹھونک دی۔ اس طریقہ سے وہ کئی آدمیوں کو تباہ کر چکے تھے۔ جعلی رقعہ بنانا اُنکے لئے معمولی بات تھی وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے اپنے اور سرکش قرضداروں کو برباد کر دیا تھا اسیطرح وہ للو کو بھی کوڑی کوڑی کے لئے محتاج کر دیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ گانوں والوں نے جو اب سیٹھ جی کی سرمایہ داری سے سخت نالاں تھے للو کا ساتھ دیدیا اور ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ جس نے بڑی محنت سے مقدمہ کی پیروی کی اور عدالت پر ثابت کر دیا کہ سیٹھ جی کا رقعہ جعلی ہے اصل میں صرف پچاس روپے قرض لئے گئے تھے۔ اسکی تصدیق سرکاری طور سے بھی ہوگئی۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اسی سلسلہ میں سیٹھ جی کی اور جعل سازیوں کا بھی پردہ فاش ہوگیا۔ اور ان پر کئی مقدمات چلائے گئے۔ جس میں سیٹھ جی کے ہزاروں روپے خرچ ہو گئے۔ پھر بھی وہ سزا سے نہ بچ سکے اور اُنھیں دو سال قید سخت اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا ہوگئی۔ سیٹھ جی نے ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن وہاں بھی سزا بحال رہی۔ مقدمہ کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں سیٹھ جی بالکل مفلس ہو گئے اور اُن کا تمام کاروبار تباہ ہو گیا۔

جسدن سیٹھ جی جیل خانہ میں پہونچے ہیں اتفاق سے وہ متئی کی رہائی کا دن تھا۔ جیل کے پھاٹک پر اس کا سامنا سیٹھ جی سے ہو گیا۔ دشمن کو مصیبت میں دیکھ کر کس کو خوشی نہ ہو گی۔ سیٹھ جی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی دیکھکر متئی کی آنکھیں خوشی کے مارے چمکنے لگیں "اور کریں جلم (ظلم) —— یہ سب موری (میری) آہ کا اثر ہے۔ اب تو ساری سیٹھائی نکل گئی نا —— یہ ایشوری نیائے ہے عدالت کا انصاف نا ہیں (نہیں) ہے۔

پہلے اسی قسم کے خیالات متئی کے دل میں آئے، لیکن پھر اس کے ضمیر نے ملامت کی۔ سیٹھ اب اپنی پہلی حالت میں نہ تھے جیل خانہ میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ متئی گو انتقام کا بھوکا تھا پھر بھی دل شکنی پایا تھا۔ سیٹھ جی کو تو سزا مل چکی تھی۔ اب وہ کس سے انتقام لیتا۔ سیٹھ جی سر جھکائے کھڑے تھے متئی سے نظر ملانے کی انہیں ہمت نہ تھی۔ یہ سزا سب سزاؤں سے زیادہ تکلیف دہ اور سنگین تھی جس متئی کو کبھی اُنھوں نے بلا قصور سزا دلائی تھی۔ جب اُس نے آگے بڑھ کر نہایت ادب سے سیٹھ جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور دلی ہمدردی ظاہر کی تو سیٹھ جی شرم کے مارے پانی پانی ہو گئے۔ کیا بچوں اور غریبوں کا دل بھی اتنا صاف اور شریف ہوتا ہے۔ یہ سیٹھ جی کے کبھی وہم و گماں میں بھی نہ آیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ وہ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکے "متئی بھیّا! مجھے معاف کر دو۔ مجھے کرنی کا پھل ملگیا" متئی اسکے جواب میں دنیگا۔ سیٹھ جی نے سمجھا کہ شاید اسکا دل ابھی صاف نہیں ہوا۔ پھر کہنے لگے "متئی بھیّا! معاف کر دو جبتک تم اپنی زبان سے نہ کہو گے میری آتما کو شانتی نہ ہو گی" متئی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں ماف (معاف) کر لیا مور پرماتما ماف کرس ہدینے معاف کیا میرے پرماتما نے معاف کیا) سیٹھ جی کا جی ہلکا ہو گیا۔ جیل سے نکلکر جب متئی اپنے گانوں میں پہونچا تو سب سے پہلے وسٹھانی سے ملا اور اپنی دلی ہمدردی ظاہر کی اس پر گانوں والوں کو سخت تعجب معلوم ہوا اور اکثر لوگوں نے اسکا مذاق بھی اڑایا لیکن متئی نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پرواہ نہ کی اور جبتک سیٹھ جی جیل میں رہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق سیٹھانی کی برابر خدمت کرتا رہا۔

(اعظم کریوی)

شطرنج کا موجد کون ہے؟

اور اسکی اشاعت کیونکر ہوئی؟

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہی سال مصر کے مجلہ الہلال اور ہندوستان کے رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر سے کیا گیا تھا، اس کا جواب ہر دو ایڈیٹروں نے اپنے اپنے رسالوں کے باب الاستفسار کے تحت اتنا اختصار کے ساتھ دیا کہ زبان ستفہام سراپا تشنہ کام ہی رہ گئی اور اُنکے مطالعہ سے ناظرین کو قطعاً اطمینان نہیں ہوا تو عبد العزیز مظفر بغدادی نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا اور الہلال ماہ مارچ ۱۹۲۹ء میں کافی بحث و تمحیص کے بعد ایک رائے پیش کی جو یقیناً دلائل کے لحاظ سے قوی ہے۔ نیز صاحب تحقیق نے ناظرین کے لئے کافی معلومات بہم پہونچا دئے ہیں۔

عموماً قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جسکی شہرت تامہ ہو اُسکی اصلیت اور ہسٹری میں اس قدر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں کہ غور کرنیوالا شب و روز کی محنتوں اور کامل فکر و مطالعہ کی صعوبتوں کے بعد بھی محقق طور پر مستقل رائے نہیں پیش کر سکتا۔ کیونکہ تضاد و اختلافات کی موجیں ایسی سدِ راہ ہو جاتی ہیں کہ علمی شاہراہ پر گامزن ہو جانیوالا کبھی نصف راہ اور کبھی منزلِ مقصود تک پہونچتے پہونچتے ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اور تلاش و جستجو کی باگ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

جسطرح الف لیلہ، دیوار قہقہہ، آئینہ سکندری اور جام جم باوجود اپنی شہرت کے بھی اپنے وجود، موجد و مولد کا صحیح پتہ نہیں بتا سکتے، اسیطرح شطرنج بھی کافی ہر دلعزیز و مقبول ہونے کے باوجود اپنے مولد و موجد کا صحیح پتہ بتانے سے مجبور ہے۔

ایسا عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے اور جس پر محققین و مدققین کی نظرِ تحقیق گہری پڑتی ہے وہ شئے اسی قدر طلسم بن کر رہجاتی ہے۔ لہذا اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے شطرنج کے مولد و موجد کے تعین میں اگر بعید متضاد اور لاتحصلی اختلافات پیدا ہو گئے اور آجتک کوئی محکم رائے قائم نہ کیجا سکی۔ یا ایک شخص دوسرے کی تحقیق کو غلط ثابت کر رہا ہے تو یہ قابل استعجاب و تحیر نہیں ہے بلکہ یہ شطرنج کی مقبولیت اور اسکی اہمیت کی دلیل ہے۔

اسی طرح اختلافات و تضاد کے ہوتے ہوئے محققین کے اس اصول کے مطابق کہ "اجماع و کثرت آرا مختلف فیہ امور

کی صحت کی دلیل بن سکتی ہے"۔ لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں فاضل عبدالعزیز کی اس رائے سے اتفاق نہ کروں کہ شطرنج ہندوستان کی پیداوار ہے اور عربوں کی دریادلی کی بدولت اکناف عالم میں اشاعت پذیر ہوا۔

ایسی چیز جو خاص ہندوستان کی ایجاد ہو اسکی اصلیت اور تاریخ سے ہندوستانیوں کا بے خبر رہنا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا، اس لئے میں اس مفید مضمون کا محض ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتا ہوں تاکہ وہ اس نقش اول کو دیکھکر اپنی ایجادات کی تحقیق و تفتیش کی طرف متوجہ ہو جائیں اور جلد سے جلد زبان اردو کی گود فراموش شدہ معلومات سے بھردیں۔

مورخین کی ایک کثیر جماعت کا خیال ہے کہ شطرنج ہندوستان کے برہمی فلاسفر صیصہ[۱] یا رسیساک، کی ایجاد ہے، جس نے پانچویں میلاد کے اوائل میں ضرورتاً اس کا اختراع کیا تھا، اس کو قصہ یوں ہے :-

"عہد میلاد مرقوم بالا میں ایک بادشاہ تھا جو باوجود خوش طبع و خلیق ہونیکے اپنے کاہل احباب و مصاحبین کی معیت کے باعث انتظامات ملکی سے غافل ہو بیٹھا تھا، جس سے رعایا کی تکالیف میں اضافہ ہوگیا۔ اور بادشاہ کی غفلت کی وجہ سے انکی دادرسی کرنیوالا کوئی نہیں رہا۔ تو رعایا نے بادشاہ کے رحیمانہ و کریمانہ فضائل کا پاس و خیال کرتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح بادشاہ کو امورات حکومت کیطرف متوجہ کیا جائے۔ چنانچہ اس پر غور و خوض کرنے کے لئے ملک کے مدبروں کی ایک بڑی جماعت دارالمشورہ میں بیٹھی لیکن شاہانہ رعب داب کی وجہ سے تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے سے جھجکتی رہی۔ ان حکما و زعما کی جماعت سے ایک شخص صیصہ نامی اٹھا اور اس نے اعلان کیا کہ میں بہت جلد ملک کی خدمت اور بادشاہ کی توجہ حکومت کی طرف منعطف کرانے میں عملی قدم بڑھاؤنگا ابھی اس تدبیر میں زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ صیصہ اپنے خیال میں کامیاب و مسرور تھا اور ملک ایوان کے سامنے ایک دلچسپ کھیل موجود تھا جس میں برہمی فلاسفر نے بتایا تھا کہ بادشاہ کے تغافل کی بدولت ارکان و اعیان دولت اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ملک کی تباہی اور حکومت کی بربادی ہوتا ہے۔ وقت کی بات اور صداقت کی کامیابی کو دیکھئے کہ یہ کھیل اپنے حقیقی مقصد کے ساتھ چند دنوں ہی میں ایسا مقبول ہوگیا کہ بادشاہ کی رنگ رلیاں اور عیش و طرب کی مجلس کبھی خالی نہ رہی اور آخر وہی ہوا جو موجد کا مقصد تھا۔ یعنے وزرا کو حکم شاہی ہوا کہ اس کے موجد کو حاضر دربار کیا جائے۔ کہاں تو موجد اپنی کامیابی پر تعلیاں لے رہا تھا اب جو حکم شاہی سنا تو دم بخود ہو کر رہ گیا کہ دیکھئے قسمت کیا دکھاتی ہے؟ لیکن وطن کی اصلاح کے سامنے جان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ نیز وہ اب بھی حکیم و مدبر تھا فوراً دربار شاہی میں حاضر ہوا اور بادشاہ کو اس کے اصول و قوانین کی اسطرح تعلیم دی کہ بادشاہ فوراً خواب خرگوش سے چونک پڑا اور بول اٹھا کہ اے حکیم بتا تجھے کیا اس کا صلہ دیا جائے

---

[۱] بعض محققین نے صیصہ کو صصہ (صاد مفتوح میم ساکن) بن داھر ابن فیلسوف لکھا ہے اور بعض نے اس کا موجد حکیم بجلاج کو لکھا ہے (فتحی)

صیصہ مودبانہ کھڑا ہوگیا اور بولا ، جاہ پناہ میں کسی صلہ کا خواہاں نہیں ہوں اگر حضور دینا ہی چاہتے ہیں تو لیجئے بساط کے پہلے خانہ میں ایک رکھدیجئے ، پھر دوسرے خانہ میں دو ، پھر چوتھے خانہ میں تین ، پھر آٹھویں خانہ میں چار ، اسی طرح شطرنج کے سارے گھروں کو بھردیجئے ۔ بادشاہ اس مطالبہ کو سُن کر حواس باختہ ہوگیا اور اُس کو کوئی جواب بن نہ پڑا ۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا کہ بادشاہ کی ساری مملکت کی دولت اور اس سے بھی کہیں زیادہ ثروت اس کے متحمل نہیں ہوسکتی تھی آخر فلاسفر مذکور شاداں و فرحاں اُٹھا اور اپنی کامیابی پر خوشی خوشی گھر روانہ ہوگیا ۔ بادشاہ امورات مملکت اور انتظامات حکومت و نیز رفاہ عام کی طرف ایسا متوجہ ہوا کہ لوگوں کو حیرت ہونے لگی ۔

لفظ شطرنج کی وجہ تسمیہ

جسطرح شطرنج کے موجد میں اختلاف ہے ، اسیطرح اس کے اشتقاق و استخراج اور وجہ تسمیہ و تلفظ میں میں بھی اختلاف ہے ۔ لیکن میں یہاں انھیں اقوال و آراء کو پیش کروں گا جو کچھ بھی اہمیت رکھتی ہیں (اس کا صحیح تلفظ شین بالکسر ہے لیکن بعض نے بالفتح لکھا ہے مگر صحیح کسرہ ہی کے ساتھ ہے ۔ فتح)

(۱) بعض مورخین کا خیال ہے کہ شطرنج "چاتورآنگا" TCHATORANGA کا محرف ہے اور یہ لفظ سنسکرت زبان کا مرکب لفظ ہے ، جسکے معنی ارکان اربع کے ہیں ۔ نیز لغات سنسکرت میں TCHATARANGA چاتورآنگا لشکر کے معنی میں بھی آیا ہے لہذا شطرنج کی وجہ تسمیہ یہ ہوا کہ حکیم صیصہ کے عہد میں چونکہ ہندوستانی افواج چار حصوں میں منقسم ہوتی تھیں ، اس لئے موجد نے بھی اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کھیل کو چار حصوں میں منقسم کیا ، فیلہ ، کشتی ، سوار ، پیادے ،

(۲) بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ شطرنج شاترانش (عالم فلکی کا ایک نظام) کا محرف ہے اور چونکہ یہ کھیل اُنھیں نظام کے مطابق ہے ، جو شاترانش کے ہیں ، اس لئے اسکو بھی شاترانش یا شطرنج کہنے لگے ۔

(۳) اختراع شطرنج کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ دارالسلطنت لنکا (سرندیپ) میں ۲۸۰۰ قبل مسیح ایک بادشاہ (راون) تھا جس کا مشغلہ شب و روز جنگ و نبرد آزمائی تھا ، اس وجہ سے وہ اپنے بال بچوں کے پاس بہت ہی کم رہتا اور یہ جدائی اُسکی بی بی کے لئے سوہان روح سے کم نہ تھی ، اس لئے اس نے ملک کے تمام حکماء و عقلاء کو جمع کیا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ کوئی ایسی صورت بتائیں کہ بادشاہ بجائے جنگل و بیابان کی ہوا کھانے کے رنگ محلوں میں عیش و راحت کے ساتھ زندگی گذارے ، اور ہم سبھوں کے ساتھ دل کے کنول کھلائے ۔ ملکہ کے حکم کی دیر تھی ، اختراع و ایجاد کرنیوالے داغوں کی کمی نہ تھی ۔ ابھی ہفتہ عشرہ بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ ایک کھیل جس میں جنگ و میدان کارزار کی دلچسپی کے سامان پیدا کئے گئے تھے ۔ ملک والوں کے سامنے موجود تھا ، جسکی اُن لوگوں نے ساترانش (دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنیوالا) کے نام سے پذیرائی کی ۔ لیکن مورخین کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے ، کیونکہ بادشاہ اس ایجاد سے پیشتر ہی ملکہ ماند حادہاری (MANDADHARI) کا شیدائی اور حقیقی معنوں میں

رفیق تھا، اور ہمہ وقت اس کے پاس موجود رہتا تھا۔

(۴) ایسا ہی مورخوں کا دوسرا طبقہ یہ کہتا ہے کہ شطرنج بودھ مت کی ایجاد ہے اور اُن ہی سے براہمہ نے سیکھا تھا چونکہ بودھ مت کی تعلیم جنگ کی منافی ہے۔ اس لئے کھیل کے ذریعہ اس کے نقصانات و معائب کو بتا کر عقیدت مندوں کو باز رکھنے کی کوشش کیجاتی تھی۔

(۵) اسی طرح چینیوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ ہماری ایجاد ہے، اور ہمارے ہاں تنو برس قبل میلاد سے رائج ہے۔ اپنے اس قول کی دلیل میں یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ کوتستو (KASTSU) نے شنشی (SCHENSI) کی جنگ میں لشکروں کی جودت طبع و دلچسپی کے لئے ہان سنگ (HAN SINGH) کو لکر یہ کھیل اختراع کرایا تھا اور اس کا نام اسی مناسبت چوک چوہونگ کی (TCHAUKTCHOHONGKI) "فن حرب کا کھیل" رکھا گیا۔

(۶) ماہرین علم کا ایک طبقہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ فارس کی ایجاد ہے اور ثبوت میں بتاتا ہے کہ شطرنج دو کلموں یعنے ششش رنگ[لہ] (چھ رنگ) سے بنا ہے جو اشارہ ہے، شاہ، وزیر، اسپ، رخ، فیل، پیادہ کی طرف اور یہی طبقہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسکو نظام فلکی کی مانند ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لئے اسکا نام شاترالنش رکھا گیا۔

لیکن ایرانی مورخین و شعراء خصوصًا فردوسی اس سے انکار کرتے ہیں۔ فردوسی نے تو شاہنامہ کے اندر صاف لفظوں میں لکھدیا ہے کہ ہندی بادشاہ نے کسریٰ نوشیرواں کے پاس جب وفد بھیجا تو اُس کے ساتھ شطرنج اور شطرنج کے قواعد و رموز اور اُسکی ساری ضروری اشیا بھیجی تھیں۔ فردوسی کے اس خیال کو تقویت پہونچانے کیلئے یہ روایت بھی کافی ہے کہ کسریٰ نوشیرواں یا اُسکے کسی عزیز نے نرد کو اسی لئے ایجاد کیا تا کہ لوگ ہندوستانی کھیل (شطرنج) کی طرف راغب ہو جائیں۔

(۷) رومی شاعر ورگل (VIRGELE) کا گمان ہے کہ اس کھیل کو قائد اعظم پالامیڈس (PALAMEDES) نے ٹروئے (TROIE) کی جنگ میں سپاہیوں کی دلجوئی کے لئے ایجاد کیا تھا۔ لیکن یہ کھیل شطرنج سے مختلف ہے جسکا نام لودوکالکولور (LUDUS CALCULARWU) ہے۔

(۸) اسی طرح ایک اور بڑی جماعت ہے جو اس کو روما، فارسی، عرب، یونان، آئرلینڈ وغیرہ کی طرف منسوب کرتی ہے۔ لیکن اُس کے پاس نہ تو کوئی علمی ثبوت ہے اور نہ تاریخی دلائل، اور نہ اُن کے براہین، عقل سلیم رکھنے والوں کے لئے قابل قبول ہیں۔

اس افراتفری سے یہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی ایجاد ہے۔ اور یہیں سے براعظم ہوتا ہوا یورپ، امریکہ

لہ بہار عجم والے نے شطرنج کو ستر نگ بہ معنی گنجفہ قرار دیا ہے اور بعض نے رفت رنج کا مرادف بتایا ہے۔ اور بعض نے صدرنگ بہ معنی سینکڑوں حیلے کا کھیل لکھا ہے۔ (فتحی)

اور سارے عالم میں اشاعت پذیر ہوا۔ خواہ وجہ اختراع کچھ بھی ہو،

شطرنج کی مقبولیت

شطرنج کی مقبولیت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ عرصہ طویل تک یہ ہندوستان ہی کی زمین میں لوگوں کے لئے باعث دلچسپی و مسرت بنا رہا۔ لیکن پانچویں میلادی میں جبکہ براہمہ کا دور ہوا اور اُنکی سخت گیریوں کے باعث بودھ مت کو یہاں سے نکل پڑا تو جسطرح اُن کے ساتھ اُن کی دلچسپیاں بھی ہندوستان سے منتقل ہو کر دیگر ممالک میں پھیل گئیں۔ شطرنج بھی جو خاص ان کی ایجاد تھی اپنے موجد کے ساتھ ملک ملک کی ٹھوکریں کھاتا اور آوارہ گردی کرتا ہوا فارس اور فارس سے عرب جا پہونچا۔ جہاں اسکی گرمجوشی کے ساتھ پذیرائی کی گئی۔ اب یہاں سے یہ اپنے ایرانی اور عربی النسل فاتح کے ساتھ یورپ اور ایشیا میں داخل ہوتا رہا اور غم غلط کرنے کیلئے انکی مجلس طرب و نشاط میں موجود ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ فاتح کی ہر ایک ادا کی تقلید کے ساتھ ساتھ یہ بھی اشاعت پذیر ہوگیا۔ یا مفتوح کے دیگر املاک کی طرح یہ بھی عربوں سے نکلکر دوسروں کی دلچسپی کا باعث بن گیا۔

چنانچہ بعض اقوال اس پر شاہد ہیں کہ یہ عربوں کی وجہ سے مقبول عام بنا، اور یہ ہے بھی صحیح، اس کا ثبوت اکثر تاریخوں میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ ایک جگہ مذکور ہے کہ ہارون رشید نے شارلمان کو جو تحائف و ہدایا بھیجے تھے، اُسمیں شطرنج بھی تھا۔

گرچہ انگریز مورخین اس واقعہ کو نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شطرنج عربوں کی وجہ سے ضرور پھیلا، لیکن یورپ والوں کو اندلسی عربوں سے حروف صلیبیہ کی پہلی جنگ میں حاصل ہوا تھا۔ میرے خیال میں انگریز مورخوں کی رائے درست ہے۔ کیونکہ **ابوالفداء** لکھتا ہے کہ ۸۰۲ء میں ہارون رشید کو شاہ روم نے جو خط لکھا تھا وہ یہ تھا:۔

بادشاہ روم نقفور (NIECPHORUS) کی طرف سے بادشاہ عرب ہارون رشید کو۔ اما بعد ملکہ (LRANE) جو مجھ سے پیشتر آپ کے لئے رُخ کا کام دے رہی تھی حقیقتاً وہ پیادہ کی چال چل رہی تھی، چنانچہ آپ نے دیکھا کہ اُس نے آپ پر اس چال سے جو حقیقت میں اُسکی چال نہ تھی، حملہ کردیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُسکے مقابلہ کی تاب نہ لاسکی اور یہ اُسکی نسوانی کمزوری اور حماقت تھی۔

جب میری تحریر تمہاری نظر سے گذرے تو فوراً اطلاع دو کہ تم نے اسکی تلافی کی کیا صورت سوچ رکھی ہے اور خسارہ و نقصان کی تلافی کس طرح کر سکتے ہو، اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو سمجھ لو کہ اس کا فیصلہ ہماری تلوار کرے گی۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شطرنج وہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خط میں رُخ اور پیادہ کی مثال دی گئی ہے۔

اس خیال کو مزید تقویت پہونچانے کے لئے ہم فاتیکان کے کتب خانہ کے اُس وثیقہ کو پیش کرتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حروب صلیبیہ سے پیشتر بھی یورپ والوں کے لئے شطرنج دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا اور وہاں کے پادری اور راہبین

اس کو ہر وقت کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ ادہر جس وثیقہ کا میں نے تذکرہ کیا ہے اُس میں پطرس دامیان (PETRS DAMIAN) اسکندر ثانی کو سنہ ۱۰۶۱ء میں جو خط لکھا ہے اس میں شطرنج کی ترویج کی مذمت ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"حکمت و قیادت کے بالکل منافی ہے کہ ایک راہب غرور کو اپنا شیوہ بنائے اور اپنے وقت کو شطرنج کھیلنے میں ضائع کرے، اور ان مقدس جگہوں اور مبارک ہاتھوں کو لہو و لعب میں استعمال کرے اپنی اس زبان کو جو خدمت خلق اور عبادت رب کے لئے مخصوص ہے، اس طرح لغویات میں استعمال کرے۔ اسیطرح لیعقوب وی ساسو نی پہلا محقق و مصنف شطرنج لکھتا ہے کہ یہ کھیل نویں میلاد کے اوائل ہی میں یورپ کے اندر اشاعت پذیر ہوچکا تھا۔ جسکی تائید میں وہ ان احکامات کو پیش کرتا ہے جو کلیساؤں اور عیسائی عبادتگاہوں سے شطرنج کی تحریم پر صادر کئے گئے تھے"۔

چنانچہ وہ ان احکامات و ہدایت میں سے چند واقعات اپنی کتاب میں نقل کرتا ہے۔ جنکا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ فرانسیسی پادری دی ساسونی نے فیلپ اوغسطس کے زمانہ میں جو ہدایت بادشاہ کے نام لکھی تھی وہ ان الفاظ میں تھی:۔ "اکلیروس پر اس کھیل کا کھیلنا حرام کیا جاتا ہے"۔ دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"سافٹ لولیں شاہ فرانس کے عہد میں تو اس کھیل سے دلچسپی رکھنے والوں اور کھیلنے والوں کو تاوان دینا پڑتا تھا" اور کینسر النا (ELNA) سے یہ حکم نافذ ہوا تھا کہ جو پادری اس کھیل کو کھیلے گا وہ گرجوں میں داخل نہ ہو۔

بہر حال ان سارے احکامات و ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شطرنج حروب صلیبیہ سے پہلے ہی یورپ والوں کے دلوں میں گھر بنا چکا تھا، اگرچہ اُسوقت اس کے کھیلنے کا جو طریقہ تھا وہ آجکل سے بہت ہی متضاد و مخالف تھا اور یہ تغیر عظیم بوجہ امتداد زمانہ اور تغیرات کثیرہ کے واقع ہوا۔

یورپ والوں کے لئے سب سے پہلے جس نے شطرنج کھیلنے کے آداب و طریقے بتائے اور اُسکی ترتیب کی وہ جرمن مولف روی لوبزدی سیفورا (RAY LOBEZ DE SEBURA) ہے، کیونکہ پہلی تصنیف سنہ ۱۵۶۱ء میں اسی نے اس موضوع پر کی جسکی مدد سے اہل یورپ اس سے واقف ہوگئے۔ مختصر یہ کہ فن شطرنج پر بے شمار طبع آزمائیاں کی گئی ہیں اور ہر عہد و قرن میں اس پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ ان لاتعداد تصانیف میں سے کوئی تصنیف اختلافات و تضاد سے خالی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کو کوئی ایک رائے قائم کرنی مشکل پڑ جاتی ہے لیکن پھر بھی ان متضاد و متباین تصانیف میں سے صرف ایک کتاب ایسی پائی جاتی ہے جو کسی حد تک معلومات و کثرت دلائل سے مملو نظر آتی ہے۔ اور کتاب وان ڈر لنڈ جرمنی کی تصنیف "تاریخ الشطرنج و آدابہ" ہے۔

اہل یورپ کے نزدیک شطرنج اسقدر مقبول و محبوب ہے کہ آج خاص اس موضوع پر متعدد رسائل و اخبار نکل رہے ہیں جیسے شاش زیتونگ، جرمن کا خاص طور پر قابل تذکرہ ہے، کیونکہ سنہ ۱۸۴۶ء سے یہ رسالہ مستقل طور پر شطرنج

کی خدمت کر رہا ہے۔ اور اپنی برادری میں بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی کے قدم بقدم التعبہ (KASLRATGIA) ۱۸۶۷ء سے شائع ہو رہا ہو۔

یورپ میں رسائل و اخبارات ہی تک اس کی مقبولیت و دلچسپی تمام نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے وہاں متعدد انجمن مخصوص ہیں جن میں روزانہ مختلف گروہ اور پارٹی کے شائقین شطرنج کھیلنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، اور اسی قسم کی انجمن ۱۸۵۱ء سے برابر شطرنج کی خدمت کر رہی ہیں جن میں روز افزوں ترقی ہے۔ نیز وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں شطرنج کے مقابلہ کا اعلان برابر ہوتا رہتا ہے۔ جن میں کثرت کے ساتھ تماشہ میں اور دلچسپی لینے والے پہنچ جاتے ہیں۔

یہی حال وہاں یونیورسٹیوں کا ہے کہ ایک یونیورسٹی کے لڑکے دوسری یونیورسٹی کے لڑکوں سے مقابلہ کرتے ہیں امریکہ میں تو کبھی کبھی بجلی کے ذریعہ بھی مقابلہ ہوتا ہے اور یہ ۱۸۹۹ء سے جاری ہے۔ اسی طرح کیمرج اور اکسفورڈ کے طلباء کے درمیان سالانہ مقابلہ ۱۸۷۳ء سے برابر ہوا کرتا ہے۔

شطرنج کے مہرے

شطرنج کے وہ واقعات جو اس کی تاریخ سے متعلق تھے میں نے بیان کر دئے، اب مہرے کی ہسٹری بیان کی جاتی ہے:۔

جیسا کہ اس کے ناموں سے ظاہر ہے کہ یہ چھ قسم کے ہوتے ہیں، شاہ، فرزین، رخ، فیل، اسپ، پیادے لیکن یورپ والے فرزی کو نادانی سے ملکہ کہتے ہیں، اور یقیناً انکی یہ غلطی ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ مشرق کی پیداوار ہے۔ تو مشرقی عادات کے مطابق اسکی ترتیب ہو گی اور چونکہ مشرقی ملکہ کی توہین سمجھتے ہیں کہ اُسے مہمات و نبرد آزمائی کے لئے میدانِ جنگ میں بھیجا جائے تو یورپ والوں کا مشرقی کھیل میں ملکہ کا شریک کرنا قطعاً بھول ہے۔

میرا جہاں تک خیال ہے کہ یورپ میں شروع شروع فرزی کو فرزی ہی کہتے تھے۔ لیکن ان لوگوں نے کثرت استعمال کی وجہ سے اسکے تلفظ کو بگاڑ کر فرجی (VIRGE) کر دیا جس کے معنی کنواری لڑکی کے ہیں۔ اور اسی وجہ سے فرزی ملکہ یا سیدہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

یورپین زبانوں میں مہرے کے نام ایک دوسری زبان سے بہت ہی مختلف ہیں۔ مثلاً فیل ہی کو لیجئے کہ لنڈن والے اسکو پوپ (FERCIA) اور فرانسیسی دیوانہ (FOU) اور جرمنی راکعن کہتے ہیں، غرض کہ سارے اسماء میں بجد آزاد ہے اس لئے میں مضمون ختم کرتے ہوئے چاہتا ہوں۔ کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے جدول میں مہروں کے اُردو، عربی، انگریزی، فرانسیسی جرمنی اسماء جمع کر دوں۔

⁂

اُردو	عربی	انگریزی	فرانسیسی	جرمنی
شطرنج	شطرنج	CHESS	ECHECS	SCHACHSHIEL
شاہ	شاہ = الملک	KING	RCR	DERKOENIG
وزیر = فرزی	الفرز = ملکہ	QUEEN	(اسیدہ) DAME	(ملکہ) DIEKOENIGIU
فیل = پیلہ	الفیل (پوپ)	BISHOH	(دیوانہ) FOU	(راکفن) DERLAEUFER
اسپ = گھوڑا	الفرس (سوار)	KINGHL	(سوار) CAVALIER	(تخت) DERSHRIUGER
کشتی = رُخ	الرخ = (رُخ)	ROOK	(برج) FOWR	(برج) DERTURM
پیدل = پیادہ	البیادق = (ڈاکیہ)	PAWNS	(گروہ) PIONS	(نجات پانیوالے) DIEBAUERN

"فخر" (بھاگلپور)

معاشیات کا ایک اہم سوال

تعین قیمت و مقدارِ زر

قیمت اور زر کا تعلق کسی چیز کی قیمت ہمیشہ اصطلاحاتِ زر میں ناپی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ قدر سے مختلف ہے عام طور پر ہم قدر اور قیمت کو ایک ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر علم معاشیات میں دونوں کا مفہوم جدا ہے۔ کسی چیز کی قدر سے مراد دیگر اشیا کی وہ مقدار ہے جس سے شئے مذکور کا تبادلہ ہوسکے۔ مگر کسی چیز کی قیمت زر کی وہ مقدار ہے۔ جس سے وہ چیز خریدی جاسکے۔ قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اگر رسدِ موادِ زر بڑھ جائے۔ تو زر کی قوتِ خرید کم ہوجائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چیزوں کی قیمت بڑھ جائیگی۔ علیٰ ہذالقیاس اگر رسدِ موادِ زر کا فقدان ہوجائے۔ تو زر کی قوتِ خرید بڑھ جائیگی۔ اور چیزوں کی قیمت گرجائیگی۔ قیمت اور زر کے تعلق کے متعلق یہ نظریہ چند شرائط کے ماتحت بالکل صحیح ہے۔ اور وہ شرائط یہ ہیں کہ:۔

(۱) مقدارِ تجارت جس سے کہ طلبِ زر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ہمیشہ یکساں رہے۔
(۲) اعتباری کاروبار (جو کہ زر کی مدد کے بغیر کیا جاتا ہے) کی حیثیت بھی ہمیشہ یکساں رہے
(۳) زر کی رفتارِ گردش یکساں رہے۔

اگر مذکورہ بالا تمام شرائط پوری ہوجائیں۔ تو زر کی قدر میں رسدِ زر کی کمی اور بیشی سے علی الترتیب بیشی اور کمی واقع ہوتی ہے۔ مگر کسی ملک میں بھی یہ تمام شرائط پوری نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں بھی جہاں کہ ابھی اعتباری کاروبار معراج پر نہیں پہونچا۔ مسئلۂ مقدارِ زر[۵۱] پورے طور پر عمل پذیر نہیں۔ یہ نمائندہ اعداد[۵۲] سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۴ء اور سنہ ۱۹۱۲ء کے مابین کے نمائندہ اعداد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس عرصہ میں مقدارِ زر ۶۴ فی صدی کے حساب سے بڑھ گئی تھی۔ مگر اشیا کی قیمتوں میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اور اسی طرح پر قیمتوں کی ارزانی مقدارِ زر کی قلت کے تناسب سے نہیں ہوئی۔

---

[۵۱] مسئلۂ مقدارِ زر یہ ہے کہ زر کی قدر میں رسدِ زر کی کمی اور بیشی سے علی الترتیب بیشی اور کمی واقع ہوتی ہے۔
[۵۲] اس کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیے

نمایندہ اعداد

اشیاء کی قیمت ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتی۔ بلکہ اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ بعض دفعہ یہ تغیر قلیل عرصہ میں رُونما ہوتا ہے جس کا سبب ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت ہوتی ہے، عام طور پر یہ تغیر مقدارِ زر کی کمی اور بیشی سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ تمام چیزوں کی قیمت کی گرانی اور ارزانی کا رُخ ایک نہیں ہوتا۔ جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ قیمتیں اور بھی کئی اسباب کی بنا پر گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ جن کی وجہ سے قیمتوں کی تبدیلی کو ماننے کے لئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کئی دفعہ قیمتوں کی سطح کو ماننا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستانی اشیاء کی شرح مبادلہ قائم کرنے کے لئے ہندوستانی اشیاء کی قیمتوں کا علم لازمی ہے۔

قیمتوں کا اندازہ صرف نمایندہ اعداد سے لگایا جاتا ہے۔ جن کی ترتیب و تشکیل کے لئے مندرجہ ذیل اطلاعات کا بہم پہونچانا ضروری ہے:۔

(۱) زمانہ کا انتخاب:۔ اشیاء کی قیمتوں کے موازنہ کیلئے ہمیں ایسے زمانہ کا انتخاب کرنا چاہیئے جسمیں کہ چیزوں کی قیمت معمولی ہو۔

(۲) اشیاء کا انتخاب:۔ اس انتخاب کا انحصار اُس مخصوص استعمال پر ہے۔ جس کے لئے نمایندہ اعداد مرتب کئے جائیں گے۔ اگر ہمارا مدعا دو مختلف زمانوں کے مزدوروں کی حالت کا موازنہ کرنا ہے۔ تو ہم انھیں اشیاء کا انتخاب کریں گے۔ جو اُنکے استعمال میں آتی ہیں:۔

(۳) اشیاء کی قیمت:۔ ہمیں اُن اشیاء کی قیمت بھی تلاش کرنی ہوگی۔ جو ہمارے نمایندہ اعداد سے متعلق ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم خوردہ فروشی کی قیمتوں کو لیں گے۔ یا تھوک فروشی کی قیمتوں کو۔ اگر ہمارا مدعا ایک جماعت کے مصارفِ حیات کے تغیر کو معلوم کرنا ہے تو ہمیں خوردہ فروشی کی قیمتوں کو ہی لینا پڑے گا۔

(۴) قیمتوں کی اوسط:۔ چوتھا کام موازنہ کے زمانوں کی قیمت کی اوسط کی تحصیل ہے۔ عام طور پر حساب کی رُو سے اوسط نکالی جاتی ہے۔ کہ یہی آسان ترین طریقہ ہے۔

اگر مختلف ازمنہ کے ان چار عناصر کو مختلف خانوں میں باترتیب درج کر دیا جائے تو نمایندہ اعداد تیار ہو جائینگے جن سے کہ مختلف ازمنہ کی مختلف اشیاء کی قیمتوں کا موازنہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

قیمتوں کی گرانی کے اسباب

اشیاء کی قیمتوں کی کمی بیشی کے کئی اسباب ہیں۔ جب قیمتیں گراں ہو جاتی ہیں۔ تو اُسوقت زر کی قدر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کمی کو فرسود گی زر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:۔

(۱) ناکافی رسدِ اشیاء:۔ بعض دفعہ فرسودگی زر رسدِ زر سے بالکل غیر متعلق ہوتی ہے۔ اگر وہ سرمایۂ زر بھی یکساں رہے جو کہ تبادلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو قیمتیں ناکافی رسدِ اشیاء سے گراں ہو جاتی ہیں۔ جب رسدِ اشیاء طلبِ اشیاء کے لئے ناکافی ہو تو اُس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ قیمتیں گراں ہو جائیں گی۔

(۲) تکثیر زر:۔ قیمتوں کی گرانی عموماً تکثیر زر سے عمل میں آتی ہے۔ اگر ایک کا منتظم دستور زر[۵۱] ہو۔ تو قیمتوں میں عموماً بیشی ہوتی رہے گی۔ کیونکہ وہ افسر جس کو زر کا انتظام سپرد کیا گیا ہوگا۔ ملک کی ضروریات کا صحیح اندازہ نہ لگا سکنے کی وجہ سے مطالبا زر کو پورا نہ کر سکے گا۔ ہندوستان قیمتوں کی بیشی عموماً اسی وجہ سے واقع پذیر ہوتی ہے۔

(۳) تکثیر اعتبار:۔ فرسودگی زر یا قیمتوں میں گرانی بسا اوقات آلاتِ اعتبار[۵۲] کی تکثیر سے بھی ہو جاتی ہے۔ گو تکثیر آلاتِ اعتبار قیمتوں کو اُس حد تک متاثر نہیں کرتی جتنی کہ تکثیر زر۔ تاہم یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ کہ اس کا اثر قیمتوں پر ضرور ہوتا ہے۔

(۴) سریع رفتارِ گردش زر:۔ قیمتوں میں گرانی زر کی رفتار گردش کی سرعت کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ یہ سرعت بنکوں کے وسیع پیمانے پر جاری ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں موجودہ قیمتوں کی گرانی کے ذمہ دار یہی بنک ہیں۔

ہندوستان اور قیمتوں کی گرانی

ہندوستان میں قیمتیں اندرونی اور بیرونی دونوں اسباب سے متاثر ہوتی ہیں آجکل کی بین الاقوامی تجارت کے زمانہ میں ہندوستانی قیمتیں تمام دنیا کی قیمتوں کے ساتھ کم و بیش ہوتی رہتی ہیں۔ اگر لندن میں گندم کی قیمت بڑھ جائے تو لازماً ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ ہندوستانی گندم کی برآمد کرنیوالوں کے لئے گندم کو لندن برآمد کرنا پُرمنفعت ہوگا۔ اور نتیجتاً ہندوستانی بازار میں بھی گندم کی مانگ بڑھ جائے گی۔ اور اس کا اثر قیمتوں پر پڑے گا۔

پچھلے دنوں سے تمام دُنیا کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:۔

(۱) طلب اشیاء معیارِ تمدن بلند ہو جانیکی وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔

(۲) جنگِ عظیم میں اشیاء کی بربادی اور غیر بار آور محنتِ انسانی بھی اس کی ذمہ دار ہے۔

---

[۵۱] منتظم دستور زر وہ دستور زر ہے جس کا انتظام ایسے ہاتھوں کے سپرد کیا گیا ہو۔ جو مطالبات زر کا صحیح اندازہ لگائے بغیر زر کا انتظام کریں۔ جیسے کہ ہندوستان میں زر کی منتظم حکومت ہے۔ جو ملک کی ضروریات کا صحیح اندازہ لگائے بغیر مقدار زر میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔ اس دستور کے علی الرغم ہندوستان سے زیادہ متمدن ممالک کا دستور زر ہے۔ جسے مرتبہ دستور زر کے نام سے پکارا جاتا ہے اس دستورِ زر سے مراد وہ دستور ہے جو ملک کے صحیح مطالباتِ زر کے مطابق ملک میں مقدار زر کو پھیلائے یہ عام طور پر ایک مرکزی بنک کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ یعنی زر کا منتظم حکومت کی بجائے مرکزی بنک ہوتا ہے جو ملک کے مطالبات زر کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے اور اسطرح برمناسب مقدار زر کو ملک میں پھیلاتا ہے۔

[۵۲] آلاتِ اعتبار سے مراد وہ آلاتِ مبادلہ ہیں جنہیں زر کی ضرورت نہ ہو۔ جیسے ہنڈی پرچہ، تمسک وغیرہ۔

(۳) اعتباری دستور کی وسعت سے بھی قیمتوں کو گراں کر دیا ہے۔ مغربی ممالک میں عموماً کاروبار آلاتِ اعتبار سے ہوتا ہے۔ بلکہ زر کی بجائے حالاتِ اعتبار زیادہ مستعمل ہیں۔

یہ تو بیرونی اسباب ہیں جنھوں نے کہ تمام دنیا کے ساتھ ہندوستان کی قیمتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ان کے علاوہ چند اندرونی اسباب بھی ہیں جنھوں نے کہ خاص طور پر ہندوستان کی قیمتوں کو متاثر کیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:-

(۱) تکثیر آبادی:- ہندوستان کی آبادی رسدِ خوراک کی بہ نسبت زیادہ بڑھ رہی ہے۔ رسدِ خوراک آبادی کے قدم بقدم نہیں چل سکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوراک کی قیمت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ مالتھس کا قضیۂ آبادی ہندوستان میں شدت سے عمل پذیر ہے۔

(۲) برآمد گندم:- ہندوستان سے ہر سال ایک کثیر مقدار گندم اور دیگر پیداوار کی دیگر ممالک کو بھیجی جاتی ہے۔ ہندوستان کا معیارِ تمدن بلند ہونے کی وجہ سے اسے بدیشی اشیاء کا بہت سا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جن کے تبادلہ میں اسے بہت سی پیداوار دیگر ممالک کو ارسال کرنی ہوتی ہے۔

(۳) قلتِ باراں:- ہندوستان میں عموماً اشیاء کی گرانی فصلوں کے خراب ہو جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی زراعت، صنعت و حرفت کا انحصار بارش پر ہے۔ فصلیں قلتِ بارش یا غیر موسمی بارش سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے دن ہندوستان میں قحط پڑتا رہتا ہے۔

(۴) ذرائع آمد و رفت کی وسعت سے بھی قیمتوں کو بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ اگر ذرائع آمد و رفت بہتر ہو جائیں تو اس تمام ملک کی قیمتیں تقریباً ایک سطح پر آجاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک چیز ایک جگہ پر گراں ہوتی ہے تو دوسری جگہوں پر بھی گرانی ظہور پذیر ہوگی۔ اب چونکہ ہندوستان میں مالتھس کا قضیۂ آبادی عمل پذیر ہے تو اس کا اثر یہ ہے کہ ذرائع آمد و رفت کی وسعت کے ساتھ قیمتیں بھی گراں ہوتی جا رہی ہیں۔

قیمتوں کے تغیر و تبدل کا مختلف طبقات پر اثر

قیمتوں کی گرانی مختلف طبقات کے لوگوں کو مختلف طور پر متاثر کرتی ہے۔

---

۵ مالتھس کا قضیۂ آبادی یہ ہے کہ کسی ملک کی آبادی ہر سال سلسلۂ ہندسیہ کے حساب سے بڑھتی ہے۔ اور پیداوار سلسلۂ حسابیہ کے حساب سے بڑھتی ہے، یعنی اگر آبادی پہلے سال ایک ہے۔ تو دوسرے سال دُگنی۔ تیسرے سال چوگنی۔ اور چوتھے سال آٹھ گنی ہو جائے گی۔ مگر پیداوار اگر پہلے سال ایک ہے۔ تو دوسرے سال دُگنی۔ تیسرے سال تگنی۔ اور چوتھے سال چوگنی ہو جائے گی۔ یعنی چوتھے سال کے بعد آبادی آٹھ گنی ہو جاتی ہے۔ اور پیداوار چوگنی جس کا مطلب یہ ہے کہ آبادی کے لحاظ سے پیداوار کی قلت ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ قیمتوں پر پڑتا ہے۔

(۱) آخر کو قیمتوں کے گراں ہونے سے نفع حاصل ہوگا۔ کیونکہ اُس کی اشیاء پہلے سے گراں نرخ پر فروخت ہوا کرینگی مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ یہ منافع اُسی حالت میں حاصل کر سکتا ہے۔ جبکہ قیمتوں کی گرانی کے ساتھ مصارف پیدائش نہ بڑھ جائیں۔

(۲) قرضدار:- قیمتوں کے گراں ہونے سے قرضدار کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ قرض دہندگان کو وہی زر بمع سُود ادا کرے گا۔ جس کی قدر قرض لینے کے وقت زیادہ تھی۔ مگر دینے کے وقت قیمتوں کی گرانی کے سبب کم ہو جائے گی۔

(۳) چھوٹے زمیندار بھی قیمتوں کے گراں ہونے سے مستفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی زمین کی پیداوار کی قیمت تو بڑھ جاتی ہے۔ مگر اُن کا لگان وہی رہتا ہے۔

(۴) بڑے زمیندار جن کی آمدنی کا انحصار اُس لگان پر ہوتا ہے۔ جو وہ مزارعان سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جسے وہ بڑھا نہیں سکتے۔ قیمتوں کی گرانی سے نقصان اُٹھاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ درحالیکہ اُن کی آمدنی وہی رہتی ہے۔

(۵) مستقل آمدنی والے اصحاب کو بھی قیمتوں کی گرانی سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکاری ملازم۔ وکلاء اور ڈاکٹر جن کی تنخواہ اور فیس مقرر ہوتی ہے۔ قیمتوں کی گرانی کے سبب بہت نقصان اُٹھاتے ہیں۔

(۶) مزدور بے چارے کی تنخواہ پر قیمتوں کی گرانی کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ آجر خودغرض ہونے کے سبب مزدور کی تنخواہ نہیں بڑھاتا۔ اور اُس کی مزدوری کے زائد منافع سے خود متمتع ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ایسی کوئی تنظیمی انجمن نہیں۔ جو کہ آجر کو مجبور کرکے مزدور کی تنخواہ میں اضافہ کرا سکے۔ انجمن اتحادِ مزدوراں کی تحریک ہندوستان میں تاہنوز مستقل طور پر کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہی۔

کیا قیمتوں کی گرانی ملک کیلئے مفید ہے؟

ہندوستانی ماہرینِ معاشیات کی متفقہ رائے ہے کہ قیمتوں کی گرانی ملک کے لئے مفید ہے۔ جس کے لئے ذیل کی وجوہات پیش کی ہیں:-

(۱) قیمتوں کی گرانی نے ہندوستان کی پیداوار کی ترقی میں گرانقدر مدد دی ہے۔

(۲) قیمتوں کی گرانی نے ملک کی دولت میں بہت اضافہ کیا ہے۔ کیونکہ ملک کا صنعتی اور زراعتی منافع بہت بڑھ گیا ہے۔

(۳) ہندوستانی تجارت برآمد بہت بڑھ گئی ہے جسکی وجہ سے توازنِ تجارت ہندوستان کے موافق ہوگیا ہے۔ اور یہ توازن مساوی کرنے کیلئے ہندوستان دیگر ممالک سے قیمتی دھاتیں درآمد کرتا ہے۔ (۴) مزدور جماعتوں کی تنخواہیں بڑھ گئی ہیں۔ جو ملک کی خوشحالی پر دلالت کرتی ہیں۔

ملک محمد باقر نسیم رضوی

اصطلاحات

PRICE قیمت MONEY زر VALUE قدر ECONOMIC SCIENCE علم معاشیات

EXCHANGE تبادلہ SUPPLY رسد PURCHASING POWER قوتِ خرید

VOLUME OF TRADE مقدارِ تجارت DEMAND FOR MONEY طلبِ زر

CREDIT TRANSACTION اعتباری کاروبار VELOCITY OF CIRCULATION رفتارِ گردش

QUANTITY THEORY OF MONEY مسئلہ مقدارِ زر INDEN NUMBERS نمائندہ اعداد

RATE OF EXCHANGE شرح مبادلہ NORMAL PRICE معمولی قیمت

LABOURER مزدور RETAIL SALE خوردہ فروشی

WHOLESALE تھوک فروشی COST OF LIVING مصارفِ حیات

DEPRECIATION OF MONEY فرسودگیٔ زر INFLATION تکثیر زر

MANAGED SYSTEM OF CURRENCY منتظم دستورِ زر CENTRAL BANK مرکزی بینک

GROWTH OF CREDIT تکثیرِ اعتبار INSTRUMENTS OF CREDIT آلاتِ اعتبار

BILL ہنڈی BOND تمسک INTERNAL & EXTERNAL CAUSES اندرونی و بیرونی اسباب

INTERNATIONAL TRADE بین الاقوامی تجارت EXPORT برآمد INPORT درآمد

MARKET بازار STANDARD OF LIVING معیارِ تمدن UNSKILLED LABOURER بے مہارت مزدور

INPRODUCTIONE LABOUR غیر بارآور محنت CREDIT SYSTEM دستورِ اعتبار GROWTH OF POPULATION تکثیرِ آبادی

FOOD SUPPLY رسدِ خوراک MALTHUSIAN DOCTRINE OF POPULATION مالتھس کا فلسفۂ آبادی

ARITHMETIC PROGRESSION سلسلۂ حسابیہ GEOMETRIC PROGRESSION سلسلۂ ہندسیہ

AGRICULTURAAL INDUSTRY زراعتی صنعت و حرفت MEANS OF COMMUNICATION ذرائعِ آمد و رفت

COST OF PRODUCTION مصارفِ پیدائش DEBTOR قرضدار

CREDITOR قرض دہندہ RENT لگان

TRADE UNION انجمن اتحادِ مزدوراں BALANCE OF TRADE توازنِ تجارت

(TERMS اصطلاحات)

باب المراسلۃ والمناظرہ

(بلقیس رعنا۔ پھول گلی۔ بمبئی)

"آپ نے جولائی کے "نگار" میں جس کیفیت کے ساتھ میری تحریر کا جواب عنایت فرمایا ہے۔ اُس کا شکریہ قبول فرمائیے، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی "ادبیت" ایک افسوں ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آپکی تحریر دل سے خاص لطف اُٹھاتے ہیں۔ آپ نے مذہبی تنقیدوں میں بھی اپنے زورِ قلم سے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے کہ جی چاہے یا نہ چاہے لیکن اُن کو دیکھکر ایمان متنزلزل ہی کرنا پڑتا ہے۔ "کافرماجرائی" کی ایسی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔

میں پہلے بھی سمجھتی تھی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ خلوص سے خالی نہیں اور اب آپکے جواب سے اور زیادہ یقین اسکا ہو گیا ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کی "تلقین" کو مانتے ہی ایک قسم کا خوف معلوم ہوتا ہے اور جی ہچکچاتا ہے، کیا آپ اس کا سبب بتا سکتے ہیں؟

میں آیندہ کے لئے یہ نہیں چاہتی کہ میری تحریروں کا نگار کے ذریعہ سے جواب دیا جائے، بلکہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ پرائیویٹ طور پر میرے اُن خدشوں کو دُور کیا جائے جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے ہیں، اور جن کو میں آپ کے سامنے پیش کرتی رہوں گی۔ فی الحال میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے نزدیک سب سے بہتر مذہب کونسا ہے اور کیوں؟ اصولِ اسلام میں آپ کو کیا خرابیاں نظر آتی ہیں اور وہ کیونکر دور ہو سکتی ہیں؟

(نگار) آپ نے میری "ادبیت" کی "فسوں زائی" اور انشا پردازی کی تعریف میں جو کچھ سپردِ قلم فرمایا ہے، وہ خواہ کتنا ہی خلاف حقیقت کیوں نہ ہو، لیکن مجھے مغرور بنا دینے کے لئے کافی سے زائد ہے۔

خوشا لطافتِ اندازۂ ادا فہمی!

اگر میں اپنی زندگی میں کسی ایک ہی کا ایمان (بقول آپ کے) "متنزلزل" کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے خود بھی اِس "کافرماجرائی" پر فخر کرنا چاہئیے۔ مگر اے میری محترم خاتون، کبھی آپ نے اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ جس کیفیت کو دنیا "کفر و ایمان" سے نامزد کرتی ہے، وہ صرف "تعبیرات لفظی" کی نزاع تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ہی چیز کے دو جدا جدا نام رکھکر مجادلہ ہو رہا ہو، آہ، دنیا کی عمر اس بحث و اختلاف میں گذر گئی ہے کہ پردۂ جمال کو "حجاب" کہیں یا "نقاب" اور یہ ہوش کسی کو نہیں کہ "طرفِ نقاب" اُٹھا کر "حسنِ مستور" کا مشاہدہ کیا جائے، جو ان تمام ظاہری امتیازات سے بہت

بلند وانع ہے، منصور و فرہاد کی سرگزشت پر جو تنقید چاہے کرو۔ لیکن آخر کار حقیقت وہی ایک نظر آئیگی کہ:-

آشفتہ نوائے بہ سردار بر آمد،

شوریدہ ادائے بدم تیشہ رواں داد،

کیا اب بھی آپ مجھ سے دریافت کرینگی کہ میرے نزدیک سب سے بہتر مذہب کون ہے؟ دیکھئے اُن لوگوں سے جن کا مذہب صرف "مسلک عشق" ہو، اس قسم کے سوالات نہیں کئے جاتے۔ کیا آپ نے نہیں سُنا:-

با دلشدگاں ہر کہ در افتاد بر افتاد،

کسی "حیران" سے یہ نہ دریافت کیجئے کہ اُسے "جلوۂ محبوب" کہاں نظر نہیں آتا اور ایک "عاجز و سرگشتہ" سے یہ نہ پوچھئے کہ اس نے شاہد مقصود کو کس جگہ پایا۔ وہ تو آسانی سے کہہ دے گا کہ "ہر جگہ اور کہیں نہیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس جواب کو سُن کر اپنی ہنسی ضبط کر سکیں گی؟

بیدل کہتا ہے:-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست
چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست

دیر زیں عقدہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم
کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

اے سمندر بہ ہوس داغ خودش آتش کو
ماہیاں تشنہ بہ میرید دم آب کجاست

لیکن شبلی وغیرہ جنکی سطح بیں نگاہ صرف الفاظ کو دیکھتی ہے، اُس پر ہنستے ہیں:-

---

آپ کو میری "تلقین" پر یقین لاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے۔ "جی ہچکچاتا ہے" — یوں کیوں نہ کہئے کہ "کلیجہ دھڑکتا ہے"۔ اس کا جواب بہت عرصہ ہوا دہلی کا ایک شاعر ان الفاظ میں دے چکا ہے کہ:-

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی،
پکڑ لیں چور کا دل ہم یہیں سے،

مجھے آپ کے اسی خوف اور اسی دھڑکن سے حقیقت کا سُراغ ملتا ہے اور غالباً وہ وقت دُور نہیں جب میں آپ کو اپنے "حلقۂ خیال" کا اسیر دیکھ کر آزادی سے کہہ سکوں گا۔

کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگاں مائی،

میں کوشش کروں گا کہ آپ کے "خدشات" دور کرنے میں کامیاب ہوں اور اگر آپ نگار کے ذریعہ سے مناسب نہیں سمجھتیں تو اُسی طرح سہی جسطرح آپ چاہتی ہیں۔

دل را بہ طرہائے خم اندر خم افگنم،

نیاز

باب الاستفسار

دعا اور توبہ

(سید ذاکر علی صاحب۔ شاہجہاں پور)

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر دعا مقبول ہوتی ہے، اور خدا دعاؤں کا قبول کرنیوالا ہے، اسی طرح توبہ کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ جب تک آفتاب مغرب سے نہ نکلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے اور دعا و توبہ کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟"

(نگار) دعا اور توبہ کا مسئلہ بھی منجملہ اُن دیگر مسائل کے ہے، جن کا مفہوم مسلمانوں میں عام طور پر بالکل غلط لیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی نے بڑی حد تک اس قوم کے قوائے عمل کو مضمحل کر دیا ہے۔ دعا کے لغوی معنے پکارنے، طلب کرنے مدد مانگنے اور طلب خیر کے ہیں۔ مذہب کی اصطلاح میں بھی معنے یہی رہتے ہیں، لیکن ندا و استعانت کا تعلق صرف خدا سے ہو جاتا ہے۔ یعنی دعا نام ہے اُس التجا یا پکار کا جو خدا کے حضور میں پیش کیجائے۔ اس حد تک دعا کا مفہوم اسقدر بلند، اس درجہ برتر و اعلےٰ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر طریقہ "خود اعتمادی" پیدا کرنے کا کوئی اور ہو۔ لیکن ہمارے عقائد جن معنے میں اس سے متعلق ہیں۔ وہ بہت پست و دنی ہیں۔

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مصیبت و تکلیف میں، ہر کلفت و آزار میں خدا سے اس کے دور کرنے کی التجا کرنا کافی تدبیر ہے، اور اگر کوئی خواہش کسی چیز کے حصول کی پیدا ہو، تو ہم خدا سے اسے طلب کر سکتے ہیں اور وہ ہمیں دینے کا ذمہ دار ہے کیونکہ "ادعونی استجب لکم" کی نص قطعی قرآن میں موجود ہے۔ حالانکہ دعا کی حقیقی روح یہ نہیں ہے، اور نہ ایسا ہونا خدا کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے موافق ہے۔ اس غلط فہمی نے رفتہ رفتہ ایسی نامعقول صورت اختیار کر لی کہ صحت و بیماری، اولاد و موت، دولت و افلاس، سب کچھ دعا پر منحصر ہو گیا، اور دعا، گنڈا، تعویذ، وغیرہ کی بنیاد پڑ گئی، جو حد درجہ لغو و مہمل چیز ہے پھر یہی نہیں بلکہ خود قرآن بطور تعویذ کے استعمال ہونے لگا، لاکٹ کے اندر بند کر کے گلے میں لوگ اس کو لٹکانے لگے اور اسطرح آخر کار، خدا، قرآن اور دعا سب کا مفہوم واہمہ پرستی ہو کر رہ گیا۔

نظام عالم ایک خاص اسلوب و قانون کے ماتحت چل رہا ہے۔ اور تمام حوادث و واقعات اُسی کے زیر اثر ظاہر

ہوتے ہیں۔ اگر اُن اصول کے خلاف ساری دنیا سر پٹک کر مر جائے تو بھی کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ خدا ہر شخص کی دعا کو سُن کر قبول کر لیتا ہے، حد درجہ سفیہانہ اعتقاد ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آج تک نہ کسی ماں کا بیٹا مرتا اور نہ کسی بیوی کا شوہر فنا ہوتا۔ علاوہ اس کے خدا سخت خلجان میں پڑ جاتا کہ وہ دو متضاد دعاؤں میں سے کس کو منظور کرے اور کس کو نامنظور۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کسی کی دعا قبول کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے تو کیوں اُس سے دعا کیجائے۔ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اگر دعا کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ہر خواہش کو پوری کرتا ہے تو یقیناً دعا فعل عبث ہے، اور اس سے زیادہ احمقانہ حرکت کوئی نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے کہ اسلام سے قبل جو مذاہب رونما ہوئے اُن میں دعا کا مفہوم یہی رہا ہو اور روز کی خوراک بھی اسی سے طلب کیجاتی ہو، لیکن اسلام نے کبھی اس کاہلی کی تعلیم نہیں دی اور اُس نے عملی زندگی کا وہ زبردست قانون بنا کر پیش کیا جسے کہیں "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور کہیں "لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" سے — (میں اس کو اسی دنیا کے انجام سے متعلق سمجھتا ہوں، اور جس چیز کا نام آخرت ہے وہ ہماری اس دنیا وی زندگانی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے) —

جن لوگوں نے تعلیماتِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اُن سے مخفی نہیں کہ اس سے زیادہ عملی زندگی پیدا کرنیوالا کوئی مسلک نہیں، نہ وہاں واہمہ پرستی ہے، نہ رسم و رواج، نہ قانون فطرت کے خلاف کوئی تلقین کی گئی ہے، اور نہ محض بر بنائے اعتقاد آسمانی برکات کے نزول کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسلام کا ایک اور صرف ایک سادہ فلسفہ یہ ہے کہ:-

"سینہ دار بروں شو، سمندوار بیا"

اضطرابِ عمل، حرکت، ارتقا، اقدام اصلاح اس کا تنہا مقصود ہے اور ترقی تمدن، تہذیب اخلاق و تشکیل اجتماعی اس کا مقصد فرید، لیکن اسی کے ساتھ اس نے خدا سے بے نیاز و بے پرواہ ہو جانے کو بھی کبھی روا نہیں رکھا۔

اور اس میں بھی ایک خاص نفسیاتی نکتہ پنہاں ہے جو بآسانی ہر شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کوئی کام کرتا ہے، کسی سعی و عمل میں مصروف ہوتا ہے تو قدرتاً اس کا بھی متمنی ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ جلد پیدا ہو اور وہ اس سے متمتع ہو۔ لیکن چونکہ اسباب و حالات پر نہ اس کا اختیار ہوتا ہے نہ پوری نظر، اس لئے بعض اوقات جب وہ اپنی کسی کوشش میں ناکام ہوتا ہے تو اس پر مایوسی و تعطل کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور قوائے عمل میں اضمحلال اس لئے ضرور تھا کہ اس جذبہ کو فنا کیا جائے۔ اور اسی بنا پر یہ تعلیم دی گئی کہ تمام حوادث طبیعی کی طرح انسانی مساعی کے نتائج بھی خدا ہی پیدا کرتا ہے اور ہر حال میں خواہ ہم کامیاب ہوں یا ناکام، اسکی مصلحتیں ہمارے لئے زیادہ مفید ہیں، اور اگر یہاں نہیں تو دوسرے عالم میں ان کا نتیجہ پیدا ہوگا۔ یہ ایک ایسی تعلیم ہے جو انسان پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہونے دیتی۔ اور اسکی عملی زندگی ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ ہر چند دوسرے عالم سے حیات بعد الممات کا عالم مراد لینا میرے نزدیک درست نہیں

اور اس سے مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ "کوشش کرتے رہو اگر آج نہیں تو کل کامیاب ہوگے"۔ لیکن چونکہ انسان زمانۂ نامعلوم سے مذہبی زندگی کا عادی چلا آرہا ہے، اور ہمیشہ مذہب ہی کی نہ سمجھ میں آنیوالی قوت کے ذریعہ سے اصلاح امم کا کام لیا گیا ہے، اسلئے اسلام نے بھی اسی مصلحت اندیشی سے کام لیا، اور وہی تعلیم دی جو نفسیات مذہب کے ماتحت انسان کے دل و دماغ کو متاثر کردینے والی تھی۔

دعا بھی منجملہ اُن دیگر تدابیر کے ہے جو کافۂ انام کی اصلاح کے لئے اختیار کی گئیں۔ دعا کا مفہوم صرف طلب خیر ہے یعنی خدا سے نیکی و عمل کی توفیق طلب کرنا۔ تاکہ اپنے اندر ولولہ پیدا ہو۔ اور پورے جوش کے ساتھ ہم میدان عمل میں آسکیں۔ اس میں نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ جبوقت انسان خدا سے دعا کرتا ہے تو اُس کے اندر ایک کیفیت یقین، تکمیل آرزو کی پیدا ہوتی ہے اور یہ کیفیت اس میں خاص جوش پیدا کردیتی ہے۔ جو اصل زر کامیابی کا ہے۔ اس سے زائد دعا کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا کا مفہوم خدا پر بھروسہ کرکے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اور اسی طرح وہ لوگ راستی پر نہیں۔ جو یہ یقین کرتے ہیں کہ بغیر کوشش کے خدا ہماری آرزوؤں کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔

توبہ اور دعا میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دعا نام ہے آیندہ کے لئے طلب خیر کا اور توبہ کہتے ہیں گزشتہ غلطیوں کا اعتراف اور اُن سے احتراز کرنے کو۔ دعا کرنے والے کے دل میں توبہ کا خیال آنا ضروری ہے اور جو شخص توبہ کرتا ہے وہ بمعنا گویا طلب خیر بھی کرتا ہے جو مدعا ہے دعا کا۔ رہا یہ امر کہ جب تک آفتاب مغرب سے نہ نکلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اور ہر وقت توبہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ آفتاب مغرب سے کبھی نہ نکلے گا۔ اور جب مغرب سے نکلے گا تو وہی مشرق ہوجائے گا۔ اسی قسم کی باتیں ہر زبان کی انشا میں پائی جاتی ہیں۔ اور [illegible] لغوی معنے مراد لینا درست نہیں۔

اُمت اور اُسکی اجل

(جناب شیخ نور حسین صاحب۔ ہیڈ ماسٹر لیا مظفر گڈھ)

"جناب کی توجہ۔ قرآن کریم کی سورۃ اعراف کے رکوع ۴ کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے۔ فرمایا۔ "ولکل امۃ اجل ط فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون" ط

اس آیت میں "امۃ" سے کیا مراد ہے؟ اور "اجل" کے کیا معنے ہیں؟ براہ مہربانی آیت بالا کے ترجمہ اور تفسیر پر روشنی ڈالیں، اور عام لوگوں کے فوائد کے لئے ان مطالب کو اخبار نگار کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کردیں۔

"نیز اس آیت کے بعد (متصل) ایک اور آیت آتی ہے:- یابنی آدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم
ایاتی، فمن اتقی واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ط
عرض ہے کہ پہلی آیت کا دوسری آیت سے کیا تعلق ہے؟ ان کا باہمی ربط بیان کرتے ہوئے واضح کیا جائے کہ بنی آدم
سے کون مراد ہیں؟ اور "رسل" کا آیات کس رنگ میں ہے؟ جب کہ فعل "یاتینکم" (نون ثقیلہ) مستقبل پہ
دلالت کرتا ہے۔
امید ہے کہ ان سب امور کو مفصل بیان کیا جائے؟
ان ہر دو آیات کے بعد یہ آیت آتی ہے۔ والذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنھا اولئک اصحب النار ھم
فیھا خالدون۔
سے واضح ہوتا ہے کہ "بنی آدم" "رسل" کے آنے پر ان کے آیات کی "تکذیب" کے جرم میں "اصحاب النار" قرار دئے
جاکر "خلود" کی سزا کے مستحق ہونگے۔
سوان تینوں آیات بالا کی تفسیر اور تشریح کرکے رسالہ "نگار" میں شائع کردیں۔

(نگار) امت سے مراد قوم انسانی ہے اور اجل سے مراد اس قوم کا تباہ و برباد ہوجانا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہر قوم ایک عمر لے کر آتی ہے اور اُسکی عمر اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب وہ اپنے اعمال شنیعہ سے اپنے آپ کو تباہی و بربادی کی حد تک لے آئے۔

اس کے بعد جو دو آیتیں آتی ہیں وہ بھی اسی سے متعلق ہیں اور اسی فلسفہ کی صراحت کرتی ہیں کہ جن لوگوں نے انبیا و رسل کی تعلیمات پر عمل کیا۔ اُنھوں نے ترقی کی اور جنھوں نے انحراف کیا وہ تباہ ہوئے۔ اصحاب نار سے مراد تباہ و ذلیل ہوجانے والے لوگ ہیں اور خالدون سے مقصود یہ ہے کہ رہ راست سے ہٹے رہنے کی حالت میں وہ کبھی تباہی سے نہیں نکل سکتے۔

یہ آیتیں تو بہت صاف ہیں۔ معلوم نہیں کیوں آپ کو تفسیر و تشریح کی ضرورت ہوئی۔ اور اگر کوئی خاص شبہ آپ کو پیدا ہوا ہے تو آپ نے اس کی صراحت نہیں فرمائی۔

قدر کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ

یہ غیر مطبوعہ قطعہ اُسکا ہے جو سنہ ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۱۳۰۱ھ میں ناپید ہوگیا اور اُسوقت سے لکھنؤ میں قیامت کی نیند سو رہا ہے۔ یہ وہ ہے جس نے سحرؔ و برقؔ سے بندش کے بند سیکھے تھے۔ یہ وہ ہے جس نے غالبؔ و بحرؔ سے اپنے لباس شعر میں پیوند لگوائے تھے۔ جبھی تو دنیائے شاعری اسکو قدرؔ کے نام سے پکارنے لگی۔

نظامیؔ کی "عروضی روح" اسکی قواعد العروض میں موجود۔ سحرؔ و برقؔ کی بندشوں کی چستی اور غالبؔ و بحرؔ کے لفظی پیوند اُس کے دیوان کے ہر صفحہ میں دیکھ لیجئے۔

نواب عماد الملک کے خلف الصدق نواب عقیل جنگ بہادر بلگرامی صدر المہام تعمیرات عامہ سلطنت دکن جن سے مجھکو یہ قطعہ ملا ہے۔ فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت غفران مکان قدرؔ کی طرز اصلاح کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اور قدر کا طرز بھی سب سے اس لئے الگ تھا کہ قدرؔ بادشاہوں کی نازک مزاجی سے واقف تھے۔ جس شعر میں زبان و محاورہ یا مضمون کا کوئی نقص پاتے تھے تو فن شعر کا جب تذکرہ ہوتا تو باتوں باتوں میں عرض کر دیتے تھے کہ فلاں مضمون یا محاورہ کو فلاں اُستاد نے اسطرح باندھا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی ذہانت خود بخود اپنے شعر کی اصلاح کر لیتی تھی۔

عسرت و تنگ دستی شعرا کی عام قسمت ہے۔ قدرؔ بھی اس میں مبتلا تھے۔ جب دکن کی مہنگی زندگی کی تاب لا سکے تو قطعہ کی لپیٹ میں نواب عماد الملک بہادر اعلی اللہ مقامہ سے نہ معلوم کیا کیا کہہ گئے۔ نصف صدی پہلے کے جینے والے کے احساسات دیکھئے جس میں خودداری کے ساتھ اپنی جیب کی مفلسی کا رونا بھی ہے۔

ہوش بلگرامی

قطعہ

چاند کا غرہ ہوا شہر میں شہرا ہوا ، صبح کا بھولا ہوا آ تو گیا شام کو ،
چھائی شب ماہتاب خوب شب تار پہ کفر کا قلعہ ملا لشکرِ اسلام کو
پھیل گئی چاندنی کب شب تاریک میں لت کیا کافوریں مشک سیہ فام کو

قبضۂ قدرت میں ہے جسکے سپید و سیاہ
فرش بنی چاندنی ہو گیا فراش ماہ
کسکا بنا مجمرئی پشت خمیدہ ہلال،
میر علی یار خاں مؤتمن جنگ کا،
علم و عمل عقل و حلم سامنے اسکے ہے یوں
خذ بیدی مرحبا مجھ سے نگہ رو برو
کیا کہوں میں اپنا حال ہے مری صورت سوال
بخت بنا قلعہ دار فوج بنی رنج و غم
پھر مجھے دے کر شکست اسمیں کیا قلعہ بند
عقل و خرد فہم و ہوش ہو گئے سب مجھسے دو
ایسا جھکایا مجھے خاک بسر کر دیا
آہ نے اٹھکر کہا لے یہی پہرا ہوا
ہند میں دو سو روپے پاتا تھا کلدار میں
اب تو مری آبرو آپ ہی کے ہاتھ ہے
یا تو ملیں چار سو اور دکن میں رہوں
عرض مری دوسری ہو جو پسند آپ کو
یہ تو سمجھتا نہیں مجھ سے کروگے دریغ
آپ ہی سوچیں ذرا کس سے کہوں ماجرا
قدر کا یہ منہ بھلا وصف لکھے آپ کا
مدح سرائی گئی اپنی ہی گانے لگا
ترجمہ کرنے لگا آپ کی حب مدح کا

اُس نے یہ نقرہ کیا ابلق ایام کو،
خوب جھکا جھک گیا صحن و در و بام کو
پایا جو انعام میں مملکت شام کو
نام ہے سید حسین عزہ نہیں نام کو
سامنے آقا کے ہو رتبہ جو خدام کو
عرش سے ٹکر رہے تیرے لب بام کو
چھٹی زبانِ مقال جاکے مرے کام کو
لیکے بنایا حصار گردشِ ایام کو
پاؤں کی بیڑی کیا رشتۂ اوہام کو
ہونے لگی روک ٹوک برسوں کے خدام کو
جیل کی وردی ملی بندۂ ناکام کو
شرم کی میعاد میں ننگ نہیں نام کو
کل مری بگڑی تمام سوچا نہ انجام کو
دیجیئے کا واگوئی ابلق ایام کو
یا وہی دو سو ملیں ہند میں اس خام کو
دام وہ منصب میں ہوں اور رہوں ما وام کو
پھر بھی ستاؤں گا میں آپکے خدام کو
کون سنے گا بھلا اس مرے آلام کو
محفل جم میں کجا رتبہ سگِ جام کو
کرنے لگا کون کام آیا تھا کس کام کو
سعدی شیراز بھی بول اٹھے فرجام کو

وصف ترا یا کریں یا نہ کریں اہل فضل
حاجت مشاطہ کیا روئے دلآرام کو

شامِ نشاط

وہ ہوائیں، نغمۂ دلکشا، وہ فضا حسین و طرب فزا — وہ سکوتِ شام، وہ سرخوشی، وہ شفق کی بادہ چکاں ضیا
وہ طراوتِ چمن آشنا، وہ تبسمِ سمن آفریں — وہ نشاطِ روح، وہ دلکشی، وہ تجلیاں نظر آزما
لبِ نہر، نورِ شگفتگی، سرِ مہر، حلقۂ تیرگی — وہ خرامِ آب، وہ نرم رو، وہ سکوں فروش رمِ ہوا
وہ ہر ایک ذرہ زباں کشا، وہ ہر ایک جلوہ ضیا فگن — وہ ہجومِ کیف، وہ بیخودی، مئے رنگ و بو، سمن و صبا
وہ نظر حجاب سے بیخبر، وہ تڑپ جبیں نیاز میں — وہ حریمِ جلوۂ ناز وا، وہ سرودِ راز چھڑا ہوا
وہ ہر ایک ذرے کو جستجو، کوئی مجھ سے آنکھ ملائے تو — یہ ہر ایک غنچے کی آرزو، کوئی میری سمت بھی دیکھتا
وہ خیالِ حسنِ نہاں کہ اب سرِ بزم آئینہ توڑ دے — وہ پیامِ ذوقِ نظر، کہ آ، کوئی زلفِ راز بنا چکا
وہ جمالِ ناز کی بخششیں، وہ ترنمِ دلِ آرزو — وہ قبولِ عام کی ساعتیں، وہ تبسمِ لبِ التجا
وہ حیاتِ کشمکش آزما، طلبِ نشاط میں گرم رو — وہ ضمیرِ ہستیٔ مضطرب، رہِ جستجو میں شکستہ پا
پئے ہر نظر وہ ضیا فشاں، چمنِ حقائقِ زندگی — سرِ ہر نفس، وہ ترانہ گر، اثرِ طرب کدۂ فنا

کبھی میں بھی وقفِ حیات تھا، کبھی میرے دل میں بھی روح تھی
مری صبح، موجِ بہار تھی، مری شام نغمۂ جانفزا

مگر آہ، اب نہ وہ شام ہے، نہ وہ کیفِ عشرتِ سرمدی — وہ نشاطِ روح کدھر گئی؟ یہ سکونِ قلب کو کیا ہوا؟
ہوئیں مدتیں کہ تجھے نہیں، مرے حالِ زار کی جستجو — نہ وہ عرضِ مسرتِ دلنشیں، وہ نازِ حوصلہ آزما
تجھے یاد ہے؟ وہ مسرتیں، وہ لطیف نغمۂ بیخودی — سرِ شام سیرِ چمن، کبھی لبِ نہر لطفِ رمِ صبا
وہ تڑپ کے گھر بنا، کبھی جو نگاہ ذرے سے لڑ گئی — وہ چہک کے، پھول ہوا، کہیں جو کسی شگوفے کو چھو دیا
سرِ خاک بارشِ گل ہوئی، کبھی مسکرا کے جو بات کی — شبِ ماہ، پاؤں پہ جھک گئی، جو نقاب رخ سے ہٹا دیا
مرے اشک تھے وہ جمے ہوئے، جو گہر بنے ترے ہار میں — تجھے یاد ہے؟ کہ تری ہی موجِ نگاہ کا یہ کرشمہ تھا
جو حریمِ روح میں کر رہا تھا، ترے خیال سے روشنی — وہ چراغِ موجِ ہوائے غم کی ستمگری نے بجھا دیا
تو بہارِ جلوۂ ناز بن، خبرِ نشاطِ دوام ہو — وہی سیر ہو، وہی لطف ہو، مری شام پھر وہی شام ہو

علی اختر، اختر

جانِ حزیں

ضمیرِ جہانِ مکافات ہے تو   ضیا گیرِ نور السموات ہے تو
مری جان! آئینۂ ذات ہے تو
جو کہتا ہوں میں گر یہ سب کچھ نہیں تو   تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

بہ ظاہر تو اک نقطۂ نور ہے تو   بہ باطن مگر رشکِ صد طور ہے تو
میری جان! اک شعرِ منثور ہے تو
جو سمجھا ہوں میں گر یہ سب کچھ نہیں تو   تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

جہانِ محبت کی ہستی ہے تجھ سے   مئے جامِ فطرت کی مستی ہے تجھ سے
یہ ساری بلندی و پستی ہے تجھ سے
جو سنتا ہوں میں گر یہ سب کچھ نہیں تو   تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

تو ہی شاہدِ بزمِ ارض و سما ہے   نگہ تیری ہر ذرہ کا آسرا ہے
یہ ہنگامہ سارا تجھی سے بپا ہے
اگر در حقیقت یہ سب کچھ نہیں تو!   تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

ہے تیری محبت عبادت میں داخل   ہے تیرا تحفظ ریاضت میں داخل
بجا صرف تیرا شہادت میں داخل
متاعِ گرانمایہ ہے بالیقیں تو   کسی کی امانت ہے جانِ حزیں تو!

امین حزیں

نیرنگِ نمکسازی

باقسمتِ خود ہر کس باشد بہ کُل انبازی　　ما و شکر از لعلش گاندھی و نمک سازی
حق شرف و دولت حاصل نہ شود ہرگز　　از معرکہ آرائی وز عربدہ و پردازی
ایں نکتہ بیاموزید از من نہ ز فارابی　　ایں رازِ نہاں از من خواہید نہ از رازی
ایں جا نہ بیاد آرند از شافعی و حنبل　　اینجا نہ سخن رانند از جوزی و شیرازی
ایں معنیِ بیگانہ ایں گوہرِ یکدانہ　　ہرگز نتواں جستن در ترکی و در تازی
من بالبِ نوشینت کردم نمکے تازہ　　شکر چہ بدشنامے شاید کہ تو بنوازی
تا در نمک اندازی جمعے نمک انگیزند　　در مجمع تو گرداں تو ہم شکر اندازی
زیں بیش نمک یارا مفروش بدل ریشاں　　تا دل شکنی بگسل نیرنگ نمک سازی
از انجمن نازت دل بر نہ کنم حاشا　　چوں عود اگرم سوزی چوں شمع چو بگدازی
از دیدہ دلم از تو غیر از تو نمی خواہد　　خواہم بہ نگہ داری خواہ از نظر اندازی
آنکس کہ در گاہت سرتافت چو گیسویت　　پامال کفِ پا شد با جملہ سر افرازی
امید مرا صبرے و الطاف ترا یادا　　من با تو ہمی سازم با من تو نمی سازی
اے آنکہ تو میدانی خود را بہ سخن داناں　　اے آنکہ تو بہ نشانی خود را بہ سخن سازی
اے آنکہ نمی یابی از مشربِ من راہے　　اے آنکہ نمی داری ایں بادۂ شیرازی
تکریر اگر از حرفے بینید بہ تحریرم　　عیبم نہ شمارید از کج رائی و کج بازی
لائے عرقِ ہند از جامِ دگراں درکش　　جوشد مئے صافِ من در شیشۂ شیرازی
از بزم بد انجامت وز صحبت خودکامت　　برگیرم و بردارم دل را کہ بد آغازی
اشعار بد خود را خوانی و نکو خوانی　　گفتار بد خود را پوشی بہ خوش آوازی
امروز من از دادت صد شکوہ بدل سنجم　　رفت آنکہ ز بیدادت بودم بہ نگہ سازی
شکر شکنا تا در آتش نمک افگندن　　شوریدہ سرا در مے تا کے نمک اندازی
اے از تو نمی آید ہمکاری و ہمراہی　　اے از تو نمی خیزد ہمرزمی و ہمرازی
اے با تو نمی باید عیاری و غداری　　اے با تو نمی شاید نمامی و غمازی
سوزن بہ جگر دوزی گویند کہ خیاطی　　دیبائے حمق بافی نامند کہ بزازی
باشیر نرت روزے ترسیم کہ برساند　　بز خوئی و بزکاری بز گیری و بز بازی
پندے گمنت یارا از مصلحت اندیشی!　　دل را مشکن بہ شکن قانون نمک سازی

(امید امیٹھوی)

غزلیات

(باسط بسوانی)

اور ہوتی باعث عزت وہ رسوائی مجھے
تم بھی اپنے منہ سے کہدیتے جو سودائی مجھے

اب یہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کیوں گریباں چاک ہے
آپ ہی نے ہنس کے فرمایا تھا سودائی مجھے،

چھوڑ کر عشق بتاں حوروں سے میں الفت کروں
حضرتِ ناصح نے اچھی بات سمجھائی مجھے

پردہ دوری مرے دست تصور سے اُٹھا
انجمن اُن کو مبارک۔ میری تنہائی ہے مجھے

آتا ہی کہکر جان دیدی باسط اُنکے سامنے
دیکھنا ہے آپ کا رنگ مسیحائی ہے مجھے

(جگر بسوانی)

عداوت بڑھ رہی ہے باغباں سے
دھواں اُٹھیگا اک دن آشیاں سے

تھکے ماندے مسافر کچھ خبر ہے
وہاں جانا ہے آیا ہے جہاں سے

چلے سوئے قفس ہم کس خوشی سے
لگا کر آگ نکلے آشیاں سے

....

لدی پھولوں سے تھی شاخِ نشیمن
چلے تھے جب قفس کو آشیاں سے

مسہری پر بچھائے جا رہے ہیں
یہ آخر پھول آئے ہیں کہاں سے

جو اُٹھواتے ہو اتنا حکم دیدو
لپٹ کر رو تو لیں ہم آستاں سے

....

....

تمہیں ظالم کہے سارا زمانہ
مگر ہم کیا کہیں اپنی زباں سے

ابھی ہے منزل مقصود کوسوں
رہے پیچھے جگر ہم کارواں سے

(دِل شاہجہانپوری)

دامانِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے
آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

آئی بہار حاصلِ دنیا لئے ہوئے
ہر شاخِ گل ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

سعیِ طلب سے پہلے ہی شکلِ مآل دیکھ
اک آئینہ ہے نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

ہر اشکِ خوں کو دیکھ رہا ہوں محیطِ غم
قطرے مری نظر میں ہیں دریا لئے ہوئے

ساقی اسی نظر سے جو کیف آفریں رہا
رند اُٹھ چلیں گے ساغر و مینا لئے ہوئے

مٹ کر بڑھا کچھ اور بھی ہنگامۂ جنوں
اُٹھا غبارِ قیس تو صحرا لئے ہوئے

نشتر سے دل کو چھیڑ تو دو بزمِ ناز میں
پھر دیکھ لو کہ بیٹھے ہیں کیا کیا لئے ہوئے

تھرا رہا ہے دعوئے پندار و اتقا
آتا ہے کوئی ساغر و مینا لئے ہوئے

بالا ہے بزمِ طور سے بھی جو مقامِ دید
پہونچے وہاں ہم اُن کی تمنا لئے ہوئے

اے احترامِ ساقیِ محفل سنبھالنا
لغزش ہوئی ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

اے دلؔ سب اُنکی راہ میں ہوتے ہیں پائمال
تم بھی بڑھے چلو یہ تمنا لئے ہوئے

عشقؔ رامپوری

کیا بتاؤں کون سا اندازِ دل تڑپا گیا
اک نظر سے دیکھنا اونکا قیامت ڈھا گیا،

جستجوئے حسن نے ایسا بڑھایا اضطراب
موت سے پیمانۂ عمرِ رواں ٹکرا گیا،

سُن رہا ہوں سکی چپ بیٹھا محبت میں تری
دل میں جو آتی ہے کہہ جاتا ہے ہر آیا گیا،

یہ تسلی کیا کہ جب آیا تسلی کے لئے
کیسی تسکیں اور بھی ظالم مجھے تڑپا گیا،

بزمِ عشرت میں بھی قسمت سے رہا محرومِ مے
دیکھتے ہی دیکھتے ساغر کو چکر آگیا،

کیا کہوں کیا بات تھی کیوں آگیا دل کو قرار
وہ کچھ ایسا ہی نگاہوں نے مجھے سمجھا گیا،

مار ڈالا عشقؔ اسکے التفاتِ ناز نے
کھا گیا ہاں عمر بھر میں آج دھوکا کھا گیا،

(فرخ بنارسی)

وصال و ہجر کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
خیال بن کے وہ دل میں سمائے جاتے ہیں

ملے بھی وہ تو ادائے ستم نہیں جاتی
نگاہ پھیرے ہوئے مسکرائے جاتے ہیں

مشاہدات کی رنگینیاں بڑھانے کو
حجاب ناز سے جلوے دکھائے جاتے ہیں

شب فراق کا عالم ارے معاذ اللہ
چراغ شام ہی سے جھلملائے جاتے ہیں

فنا بقا ہیں وہ آئینے جن میں عاشق کو
عتاب و لطف کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

بقائے دولت آشفتہ خاطری کے لئے
تعینات کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں

نہ راز میکدۂ عشق پوچھ اے زاہد
ہمیں تو ساغر وحدت پلائے جاتے ہیں

الٰہی کیسے کٹے گی جنونِ عشق کی راہ
خیال ہی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

غرض یہ ہے کہ حقیقت شناس ہو کوئی
ہزار رنگ کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

دکھا کے آئینۂ حسن مجاز کا فرخ
حقیقتوں کے تماشے دکھائے جاتے ہیں

ڈاکٹر قیس شروانی

آتے آتے ہاتھ میں دامانِ ساحل رہ گیا
دہر میں افسانۂ بربادیٔ دل رہ گیا

آہ میری ہمتوں نے کب دیا مجھکو جواب
دور جب دو چار گز دامانِ ساحل رہ گیا

ہٹ گیا آکر وطن میں دل سے غربت کا خیال
اک تصور میں سوادِ شامِ منزل رہ گیا

آہ وہ جوشِ جوانی وہ جنونِ انبساط
یاد جب آیا مجھے میں تھام کر دل رہ گیا

ہو اسے کیا عشرتِ آزادیٔ دل کی خبر
دہر میں جو ہو کے پابند سلاسل رہ گیا

سب نے لوٹا اس حیات چند روزہ کا نشاط
ایک میں نیرنگیٔ قسمت سے غافل رہ گیا

پوچھ دیکھو قلب پروانہ سے لذت عشق کی
ہو کے جو قربان حسن شمع محفل رہ گیا

مجھ سے اے زنجیریٔ صحرا نوردی کچھ نہ پوچھ
کس طرف لیلائے آزادی کا محمل رہ گیا

دیکھ اس واماندۂ تقدیر کی مجبوریاں
قیس جو کر کے نگاہیں سوئے منزل رہ گیا

نظیر لدھیانوی

بسکہ بھایا تھا ترے عشق میں ویراں ہونا
ورنہ منظور نہ تھا خاک کو انساں ہونا

زیر شمشیر کھلا ابن براہیم پہ یہ
کام اول ہے رہ عشق میں قرباں ہونا

غم نے چھوڑی نہ تری یاد بھی دل میں آخر
اسمیں یہ ہے بھرے گھر کا بیاباں ہونا

آہ محفل میں ترا راز نہ چھپنے دے گا
مثل فانوس میرا شعلہ بداماں ہونا

چھپ گیا روزِ ازل خارِ الم ہر رگ میں
تھا مری خاک کی قسمت میں گلستاں ہونا

برق ہوں، صبح کا تارا ہوں، حباب آسا ہوں
یعنی ہر طرح عیاں ہے مرا مہماں ہونا

بٹ گئی خلد کی نعمت بھی صنم خانوں میں
میرے کچھ کام بھی آیا نہ مسلماں ہونا

دور ہے پھر مری آنکھوں سے کوئی شمع جمال
دیکھ اے شام سیہ میرا پریشاں ہونا

آج اس دشمن ایماں کی حکومت میں نظیرؔ
جان سے ہاتھ اٹھانا ہے مسلماں ہونا

جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کے رسالہ کے متعلق ایک تجویز

گزشتہ تین سال سے نگار کا جنوری نمبر تقریباً دو چند ضخامت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے سنہ ۲۸ء کا پہلا پرچہ مومن کیلئے مخصوص تھا۔ سنہ ۲۹ء کے جنوری نمبر میں سنہ ۲۲ء کی جلد کا اقتباس تھا اور سنہ ۱۹۳۰ء کا جنوری نمبر ظفر کیلئے وقف کیا گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ سنہ ۳۱ء کا جنوری نمبر کیا ہو؟ پہلے میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اسکو مصحفی کیلئے مخصوص کردیا جائے لیکن اب یہ خیال مضمحل ہوگیا ہے اسلئے کہ اول تو مصحفی پر ایک طویل مضمون نگار میں نکل چکا ہے، دوسرے یہ کہ مجھے اس کا یقین نہیں کہ لکھنے والے اسطرف توجہ کرینگے اور تیسرے یہ کہ ناظرین نگار، شاعری کے قصہ کو زیادہ پسند بھی نہیں کرتے پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟ میری دو تجویزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کا پورا پرچہ میرے ہی مضامین سے پُر ہو اور دوسرے یہ کہ اسوقت تک کے باب الاستفسار کے تین حصہ کرکے ایک حصہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع کردیا جائے گویا اسطرح تین سال کے اندر استفسارات کا پورا مجموعہ لوگوں کے پاس پہونچ جائیگا۔ ہر چند اسمیں میرا تجارتی خسارہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن میں اس خسارہ کو برداشت کرونگا۔ کیونکہ اسطرح میں آسانی سے اور جلد، پبلک کی ایک بڑی خواہش کو پورا کرسکونگا۔ بہرحال میں آپ حضرات سے رائے طلب کرتا ہوں کہ ان میں سے کس تجویز پر عمل کیا جائے۔ **نیاز**

معلومات

عجائباتِ قدرت پر انسانی تصرف کی ایک مثال

یورپ و امریکہ میں، جھریوں کے ازالہ، ناکوں کی اصلاح، آنکھوں کی تحسین کے لئے جراح کے نشتر سے کام لیا جاتا ہے

بڑھاپے میں جب آنکھوں کے نیچے رخساروں پر جھریاں پڑ جاتی ہیں، تو جراح نشتر سے کان کے پاس کی تھوڑی سی جلد کاٹ لیتا ہے۔ پھر اُسکو برابر کرکے دھاگے سے سی دیتا ہے۔ اس ترکیب کے بعد چہرہ کی تمام بدنمائی جاتی رہتی ہے۔ اسیطرح لمبی اور بھدی ناکوں کو بھی کاٹ کر متناسب طوطی کی طرح شبک اور حسین بنا دیتا ہے۔ سینما کی اکثر عورتیں گوشۂ چشم کی طرف سے آنکھوں کو کشادہ بنوانے کیلئے جراحوں کے پاس جاتی ہیں اور کامیاب ہو کر آتی ہیں۔

قطع و جراحت کے علاوہ تکمیل اور تحسین کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے یہ طریقہ صرف غذا اور تدلیک کے ساتھ ساتھ ریاضت کی مشق ہے۔ ایکٹ کرنیوالی نوجوان عورتیں ہمیشہ ریاضت کرتی ہیں۔ اور جسم کو فربہ بنانیوالی غذائیں مطلق نہیں کھاتیں۔ اس سے اُنکے حسن و جمال کی رونق اور بڑہتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے سامان بھی تیار کئے گئے ہیں جنکو استعمال کرنیکے بعد ایک بھدی عورت کے جسم کی تمام ناہمواریاں زائل ہو جاتی ہیں۔

متمدن دنیا کے اندر زینت اور سنگار کے کارخانوں میں حسن و جمال کے بہت سے مخصوص سامان موجود ہیں۔ اگر شمار کیا جائے تو یورپ و امریکہ میں اسوقت کروڑوں اشرفیوں کے صرف غازے اور پوڈر ہوں گے۔ ناظرین متحیر نہ ہوں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یورپ کی غیر معمولی تجارت کا ۳/۴ حصہ صرف مستورات و خواتین کے سامانات زینت کے لئے وقف ہے۔

لیکن لعبتانِ فرنگ کو تجربوں کے بعد معلوم ہوا کہ جلد کے کاٹنے سے چہرہ کی کوئی پائدار اصلاح نہیں ہوتی بلکہ تھوڑے ہی دنوں میں پہلے کی طرح پھر ناہمواری آجاتی ہے۔ نیز پوڈروں اور غازوں کے استعمال سے بھی جلد کو صدمہ پہونچتا ہے اسی لئے ماہرینِ فن نے آجکل ایسے جدید آلات ایجاد کئے ہیں۔ جنکو استعمال کرنیکے بعد اُدھیڑ عورتوں کے خشک چہروں میں شباب کی سی تازگی آجاتی ہے۔ ۴۰ برس کے سن میں رخسارے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ہڈیاں نکل آتی ہیں۔ لیکن یہ جدید اختراع جو طوق کی شکل پر ایجاد کی گئی ہے ان تمام بدنمائیوں کا بڑی خوبی کے ساتھ خاتمہ کر دیتی ہے۔ یہ طوق سر کے گرد لگایا جاتا ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں رخساروں کی تمام ناہمواریونکو ہموار بنا دیتا ہے۔ دن بھر لگائے رہنے کے بعد ایک مسن عورت کے رخسارے بیس برس کی دوشیزہ کے حسین گال ہو جاتے ہیں اور اس عمل کا اثر چند مہینوں تک باقی رہتا ہے۔

ہونٹوں کی ہمواری اور تبسم کی دلفریبی کے لئے بھی ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے۔ اس آلہ کو نوجوان یا ادھیڑ عورتیں شب میں

سونے سے پہلے لگاتی ہیں، یہ آلہ دونوں گوشوں میں باندھ دیا جاتا ہے اور صبح تک ہونٹوں میں غیر معمولی نزاکت آجاتی ہے۔

نکلے ہوئے ناہموار کانوں کو درست بنانے کے لئے بھی ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے، یورپ و امریکہ میں ننھے ننھے بچوں کے کان ٹھیک کرنے کے لئے یہ آلہ برابر خریدا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ حسن و جمال کے اور بھی بہت سے جدید آلات ایجاد کئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل نہ معلوم ہونیکی وجہ سے سر دست انکو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

یہ جدید طریقے جراحی سے زیادہ کارآمد اور بہتر ہیں، اس نئے طرز میں وہ دشواریاں بالکل نہیں ہوتیں جو اگلے طریقوں میں تھیں، کہا جاتا ہے کہ ماہرین فن بعض ایسے آلات بنانے میں مصروف ہیں جن کے بعد امید ہے کہ دنیا سے بدصورتی کا قطعاً خاتمہ ہو جائے گا۔ (بدر اصلاحی)

باب زریں

باب زریں قسطنطنیہ کے آثار قدیمہ میں عجیب و غریب چیز ہے۔ اسکو شاہ تھیوڈوسس نے ۳۸۸ء اور ۳۹۱ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا۔ دروازہ کی محراب پر یہ کتبہ تھا" ایک جہانسوز کے مرجانیکے بعد تھیوڈوسس نے اسکو تعمیر کرایا۔ اور باب زریں کا بنوانے والا یقیناً صاحب حیات زریں ہے"۔ اس زمانہ سے اب تک اس کے متعلق عجیب و غریب حکایات و روایات چلی آرہی ہیں۔ اگلے زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ اس میں سے گذرنے والا شخص قسطنطنیہ کا بادشاہ ہو سکتا ہے۔ ترکوں کی یورش کے بعد سے اسکو قطعی بند رکھنے کا حکم جاری کر دیا گیا تھا تاکہ کوئی خوش نصیب اسمیں سے گذر کر مدعی سلطنت نہ بنجائے۔ ۱۹۱۸ء میں جب انگریزی فوج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو یہ بات عام شہریوں کے زبان زد تھی کہ فوج باب زریں سے داخل نہیں ہوئی ہے اسلئے اس قوم کی حکومت یہاں قائم نہیں رہ سکتی اور حیرت ہے کہ یہ واقعہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ پانچ سال بعد انگریزوں کا تسلط نہ رہا۔

اس دروازہ کی موجودہ حالت افسوسناک ہے۔ یوں تو مدتوں سے زلزلہ اسکو نقصان پہنچاتا رہا ہے۔ لیکن ۱۸۹۴ء کے شدید زلزلہ نے اسکی برجیاں اور محرابیں بالکل منہدم کر دیں۔ بقیۃ الآثار میں پھر بھی بہت سی چیزیں عجائبات سے خالی نہیں۔ اُسکی محراب بہت وسیع ہے جسکے حجم کو اینٹیں دور تک وسعت دیتی چلی گئی ہیں۔ اسکی بنیاد خالص سنگ مرمر کی تخت نما سطح پر قائم ہے۔ ستون بھی سنگ مرمر کے ہیں اسیطرح پینتالیس ۴۵ ستون اور ہیں۔ کھودنے سے قبل یہ دروازہ منوں مٹی سے لدا ہوا تھا اور اُسکے تمام تاریخی صنائع زیر زمین تھے۔ مدت تک مٹی ہٹائی جاتی رہی تب کہیں صفائی ہو سکی۔ برآمد شدہ اشیاء کو برٹش اکاڈیمی نے استنبول کے عجائب خانہ میں پہنچا دیا۔ اس دروازہ کے بالمقابل ایک چھوٹی محراب اور تھی۔ یہ دونوں راہیں صرف فاتحان وقت کے گذرنیکے لئے مخصوص تھیں۔ چنانچہ ہرکلس یا ہرقل بھی فارس کی مراجعت کے بعد اسی دروازہ سے شہر میں داخل ہوا تھا۔

اسکو کھودنیکا مقصد یہ تھا کہ بیشتر یہاں سیاحوں کے بیانکے موافق بارہ اور خوبصورت سنگ مرمر کے ستون تھے جو ۱۷۹۱ء میں غائب ہو گئے۔ ایک فرنچ سیاح نے ۱۵۴۴ء میں پورے بارہ ستون دیکھے تھے۔ سرطامس پیرو بمشکل امیزات سے چھ ستون ۱۶۲۵ء تک جمع کر سکا مگر وہ نہایت خراب حالت میں دستیاب ہوئے۔ مسٹر ٹی نے ۶۰۰ کراؤن کے عوض مقامی محافظوں سے انکو خریدنا چاہا مگر وہ لوگ اپنی

تاریخی صنعت فروخت کرنے پر راضی نہوئے۔ آخر سرطامس رو اور مسٹر پٹی کو لوگوں کی ناراضگی کے خوف سے فرار ہونا پڑا۔ شہریوں کا عقیدہ تھا کہ دروازہ کی تمام سنگ تراشی "سحر بند" ہے اور اُسکے پاس سے ہٹتے ہی ان پر کوئی آفت نازل ہو جائیگی۔ سرطامس رو لکھتا ہے:۔ "خواہ یہ صحیح ہو یا غلط مگر اُن پتھروں کو چھونے کی کوشش کرنے سے قبل ہی وہ لوگ تو ہمارے لئے مصیبت بنگئے تھے"۔ آخر اُن پتھروں میں کیا صنعت تھی کہ سرطامس اور مسٹر پٹی اُنپر دندان آز تیز کئے بیٹھے تھے؟ طامس رو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیرکلیس، پیگاسیس اور اینڈیمیون کی صنعت کے بہترین نمونے تھے۔ بہر صورت وہ انگریزوں کے ہاتھ پڑ ہی گئے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس بیش بہا شے کی حفاظت شہریوں نے ۱۶۲۵ء میں اسقدر اولوالعزمی سے کی تھی وہ ایک صدی بعد مفت میں اغیار کے ہاتھ پڑ گئی۔

ان سنگ تراشی کے نمونوں میں پہلا بہ لحاظ اپنی صنعت و کاریگری کے بہت اچھا تھا۔ اسپر ماہتاب کا پورا چہرہ بنا ہوا تھا اور رومن کے زمانہ کی صناعی معلوم ہوتا تھا۔ وہ بذات خود اصل تھا یونانیوں کی کسی صنعت کا چربہ نہ تھا۔ ماہتاب کا غمگین چہرہ جس کے سر پہ دو چھوٹے چھوٹے سینگ تھے۔ سنگ تراش نے نہایت کاریگری سے تراشا تھا۔ دوسرا نمونہ گو اس قدر خوبصورت نہ تھا مگر اپنی ندرت کے اعتبار سے وہ بھی خوب تھا۔ سنگ مرمر کا ایک سالم ہاتھ تراشا گیا تھا جو روشن مشعل لئے ہوئے تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی صنعت کے دو مختلف نمونے نہ تھے بلکہ غمگین چاند افسردگی کے عالم میں آسمان پر نظریں جمائے مشعل بکف ایک ہی ستون میں تراشا گیا تھا۔ اینڈی میون کی صنعت زیادہ نمایاں نہ تھی۔

ان نمونوں کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے بُت تھے۔ ایک بہت بڑے گھوڑے کا سر برآمد ہوا لیکن افسوس سحر کار بُت تراش کی یہ تمام صنعتیں نہایت خراب حالت میں دستیاب ہوئیں۔ اسکی وجہ یہی معلوم دیتی ہے کہ وہ بت شکن مسلمانوں کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

دروازے تین ہیں۔ دائیں بائیں چھوٹے ہیں درمیان کا دروازہ بڑا ہے۔ شاید جسٹی نین کے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے اسقدر بڑا دروازہ رکھنا خطرہ سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان دروازوں کی وسعت کم کرکے اُنکو مستطیل کر دیا گیا۔ گیارھویں یا دسویں صدی میں بائیں جانب کا چھوٹا دروازہ بالکل مسدود کر دیا گیا اور وسطی دروازہ پر محراب رکھکر اسکو داہنی جانب کے دروازہ کے برابر کر دیا گیا مگر اس کو بھی مخدوش سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ شب و روز شہر پر یورش ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس کو بھی تیغہ لگا دیا گیا اور صرف ایک باقی رہنے دیا گیا۔

ترکوں کی دست برد کے بعد بقیۃ الآثار میں ایک شے اور دستیاب ہوئی۔ یہ ایک فولادی خود تھا جسکو اٹلی کی پندرھویں صدی کی صنعت سمجھنا چاہیئے۔ ترکوں کے زمانہ میں یہ باب زریں ایک قلعہ کی شکل میں آگیا اور "ہفت منارہ" مشہور ہوا۔ سالہا سال تک اُن ممالک کے سفیر اور ایلچی وغیرہ مقید رہے جن سے سلطنت ٹرکی اس زمانہ میں مصروف پیکار تھی۔ ان قیدیوں نے اپنی اسیری کے زمانہ میں جو الفاظ دیواروں پہ کندہ کئے۔ وہ ابتک وہاں نظر آتے ہیں۔ سب سے نمایاں وینس کے ایک بحری افسر کی عبارت ہے جو سات سال تک وہاں مقید رہا تھا۔

(قیسی)

بےتاب ۱۲؍
روحِ ہنی ۱۰؍

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
ملکہ زنوبیہ ۳؍
قرۃ العین ۳؍
مخدرات ۸؍
جویائے حق للعہ
لعبتِ چین عہ
فاتح مفتوح ۸؍
بابک خرمی ۸؍
الفانسو ۱۲؍
ایام عرب ۸؍
قیس و لبنیٰ ۸؍
یوسف و نجمہ ۸؍
زوال بغداد ۸؍
مینا بازار عہ
مقدس نازنین ۸؍
رومۃ الکبریٰ ۸؍
فلپانا ۸؍
شوقین ملکہ ۸؍
منصور موہنا ۸؍
حسن انجلینا ۸؍
ملک العزیز ورجنا ۱۲؍
فردوس بریں ۸؍
حسن کا ڈاکو ۸؍
دربار حرام پور ۱۰؍
غیب دان دولہن عہ
بدر النساء کی مصیبت ۸؍
بدھ کا تلخ ۸؍

نیکی کا پھل عہ

شوق قدوائی

ترانۂ شوق ۸؍
قاسم و زہرہ ۱۲؍ و عہ
نیرنگ جمال ۸؍

میر ولی اللہ بی اے

بندگی عہ
کاس الکرام ۸؍
لسان الغیب جلد اول ۸؍
" دوم عہ
" سوم عہ
" چہارم عہ
نمکدان فصاحت ۸؍
بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹؍
نیلی چھتری ۸؍
بہرام کی گرفتاری عہ

مولانا نیاز فتحپوری

گیتان جلی عہ
گہوارۂ تمدن عہ
نگارستان عہ
صحابیات عہ
تاریخ الدولتین ۸؍

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا ۱۲؍
جلال الدین خلجی رزم شاہ ۱۲؍
خیالستان ۸؍
شالِ بحر ۸؍

حکایات و احتساسات ۸؍

دلچسپ تاریخی جاسوسی ناول

سراب نیشن ۸؍
بالشوک شہزادی ۸؍
شہید وفا ۸؍
ممتاز بیگم ۱۲؍
شعلۂ رنگین ۸؍
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی عہ
بہادر ترک ۸؍
بہرام کی واپسی ۴؍
انقلاب فرانس ۸؍
حسن بنارس ۸؍
فطرتی جاسوس ۸؍
ٹرکی حرم سرا ۸؍
جنگ طرابلس ۸؍
بہرام چہارم ۸؍
زر پرست ۸؍
کنجی کا راز ۸؍
عبدالرحمن ناصر عہ
عروس مصر عہ
سیلاب خون ۸؍
کرشمہ ۸؍
وفادار دلہن ۸؍
عوات زمین عہ

سیاحت زمین ۸؍
سیاحت ہوا عہ
نازنین مراکش ۸؍
سمندر کی سیر عہ
اسرار بالشوزم ۸؍
روح لیلیٰ ۸؍
امین بک عہ
حجاج بن یوسف ۸؍
یوسف پاشا ۸؍
انقلاب عثمانی ۸؍
بہرام کی رہائی ۸؍
بہرام کی آزادی ۱۲؍
بہرام کی سرگزشت ۸؍
لال گنجھور ۸؍
پر اسرار قتل عہ

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ۸؍
بزم خیال عہ
مشاطۂ سخن عہ
انشاء نسواں ۶؍
مکاتیب محسن الملک ۸؍
لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸؍

مراثی

مراثی دبیر عہ
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ

مراثی مونس ۱۲؍
مراثی دلگیر ۱۲؍

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی ۱۱؍
گلشن ۱۰؍
سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبر آبادی عہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۱۲؍
کلیات عراقی ۱۲؍
دیوان حافظ ۸؍
دیوان نعمت خان عالی عہ
کلیات انوری عہ
دیوان بیدل ۸؍
دیوان عرفی ۱۲؍
کلیات جامی ۸؍
کلیات غالب ۸؍
کلیات صائب ۱۲؍
کلیات حزیں ۱۲؍
دیوان عنصری ۱۴؍
دیوان ظہیر فاریابی ۶؍
دیوان غنی کشمیری ۶؍
دیوان ناصر علی ۶؍
دیوان ہلالی ۶؍
کلیات جلال اسیر ۸؍
کلیات سعدی ۸؍

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی ۸؍
کلیات ظفر عہ
کلیات مومن عہ

دیوان ناسخ عہ
کلیات میر ۸؍
کلیات سودا ۸؍
کلیات انشا ۸؍
کلیات نظیر اکبر آبادی عہ
گلزار داغ ۸؍
دیوان رند ۹؍
دیوان ذوق ۱۲؍
کلیات اسمٰعیل عہ
مرآۃ الغیب عہ
صحیفۂ عشق عہ
فریاد داغ ۴؍
دیوان قاتل ۸؍
دیوان شہیدی ۴؍

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات / تصویر رنگین عہ
" با تصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ۸؍
طلسم فرنگ عہ
کارخانۂ عالم عہ

ناولوں کے ترجمے

الہ دین ڈیلی ۱۲؍
فریب حسن عہ
سوزن عشق ۸؍
روزا لیمبرٹ للعہ
ناول اسرار ۸؍
شام جوانی ۸؍
طلسمی فانوس ۸؍

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ کمال کے درجہ تک پہونچی ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات یکجا کردیے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشامیں اسقدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہوجاتے ہیں

قیمت علاوہ محصول

عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال، اور جدت اظہار کے ایسے نادر نمونے ہیں جو کہ کسی ادبی تصنیف میں نہیں مل سکتے۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔

قیمت علاوہ محصول

دس آنے ۱۰/

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور سے پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱/۸

تاریخ الدولتین

مصر کے مشہور مورخ کی تاریخ جرجی زیدان کی ایک حصہ کا ترجمہ جس میں تمدن اسلامی کے سیاسی تاریخ پر عہد اسبعہ و بنی عباس کی تبصرہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ مولانا نیاز نے کیا ہے اور اسقدر سادگی و تسلسل بے مثل کے ساتھ کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔

قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی حلاوت و شیرینی تمام شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی نظیر و تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے

قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲/)

تذکرہ خندہ گل

مولفہ مولوی عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔

حجم ۵۰۰ صفحات

قیمت مع محصول چار روپیہ (للعہ)

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا تہذیب و شایستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے، قیمت علاوہ محصول عہ

نگارستان

(دوسرا اڈیشن) زیر طبع ہے جس میں حضرت نیاز کے ادبی و متعدد ادبی مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے جس درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت بعد طباعت تعین کیجائے گی

بسم اللہ

نگار

جلد ۱۸ فہرستِ مضامین ماہِ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء شمارہ ۳

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء شمارہ ۳

ملاحظات

جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، لازم و متعدی اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غور و فکر کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی نہ سوچنے دے۔

یہ دماغی بیماری مذہب کے غلو اور مذہبی جماعت کی عدم صلاحیت نے پیدا کی اور جس وقت تک ناحق کوش علماء مذہب کا وجود باقی ہے، دنیا کبھی امن و سکون سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے:- تصدیق بالجنان و اقرار باللسان۔ یعنی ضمیر کا اطمینان اور اس کا زبان سے اقرار۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہوگا، ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور جب یہ نقش اچھی طرح دلنشیں ہو جائے گا، تو زبان سے اسکا اقرار اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔ اس اطمینان نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے۔ یہانتک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدہ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینان قلب بتایا گیا۔ ہر چند اب دنیا اس منزل میں نہیں ہے۔ کہ وجود باری پر یقین لانے کے لئے وہ رویت ظاہری کو ضروری قرار دے، تاہم ریب و شک، وہم و ظن، اشتباہ و التباس کی کارگاہ ہنوز قائم ہے۔ اور غالباً زیادہ وسعت و فراوانی کے ساتھ، زیادہ الجھن اور پیچیدگی لئے ہوئے۔ پھر یہ

کسقدر عجیب و غریب ذہنیت انسانی ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کیجاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینان قلب کے لئے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا، اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دیجاتی کہ ہم ان جانشینانِ رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بنا پر اپنے آپ کو حامل دین متین سمجھتے ہیں اور وہ دین متین کیا ہے جو فطرتِ انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا کا تنہا فطری مذہب ہمکو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر، تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے، وہ ہمکو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح، نظام عالم پر غور کرنا، کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ نقد و اعتبار سے دیکھنا ہے، لیکن یہ مذہب کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ بتاتا ہے وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ بلند میں ظاہر کرتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا، دیا جا چکا ہے، اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل، کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس ترقی کی حد کیا ہو گی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لئے تڑپنے والا ابتک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی و ہرزہ کاری کا، دین نام ہے صرف احمقانہ تقلید و اتباع کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہو اس تبلیغ کا نام اس نے "اعلاء کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے۔ در آنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام اور اس سے زیادہ اشاعت کفر والحاد کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیئین و سجین کے ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتشِ دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ اپنی ہمہ دانی کی ہیبت جاہلوں پر طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشاف حقائق کا، استقرا و مشاہدہ کا، اور اس لئے ٹھیک اسوقت جبکہ وہ منبر پر بیٹھکر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے، صاحبانِ عقل و دانش اس پر ہنستے ہوتے ہیں، اور جس اصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے، اسے دیکھکر لوگ اور اس سے ہٹتے جاتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم حق و صداقت کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے۔ کیونکہ دنیا سے مذہب اٹھ چکا ہے اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی۔ پھر اگر کوئی اس دورِ ذہنیت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ مادیات میں جبکہ انسان صرف ایک "مکانکی" چیز ہو کر رہگیا ہے، روح کا اضطرار سکون کا طلبگار رہے، جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں "دنیا کا امن" کہا جاتا ہے۔ غالباً مبلغین مذہب کو اسکا علم نہ ہو گا کہ وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے، اسکے لئے مذہب میں ایک نہایت

ہی جامع و پُر معنی لفظ "صراطِ مستقیم" کا استعمال کیا گیا ہے، جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا۔

جس طرح دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیا میں اُس منزل تک پہونچنے کے لئے بھی جو ارتقاءِ انسانیت کا نصب العین ہے، ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے جسے اسلام نے بتایا اور جو تمام نوعِ انسانی کو بلا تفریقِ نسل و قومیت بلا امتیازِ ملک و ملت یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔ لیکن کیا اسلام کی یہ صلح کل تعلیم، یہ ہمہ گیر درسِ اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب ان کلید برداران فردوس سے چاہو، اُن اجارہ داران خلد سے طلب کرو اور ان قائدین اسلام و رہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو، جن کے یہاں اخلاقِ اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع و صورت کا ایک مخصوص رسم و رواج کا اور جو آفرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر و سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا، پھر وہ لوگ جو خدا کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، کیا اُن سے میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا تو خیر، ورنہ از راہِ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں

"لکلِ امۃ جعلنا نسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر" کا کیا مفہوم ہے۔ اور "لکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ" سے کیا مراد ہے۔ کیا عبادت و منسک ایک ہی چیز ہیں، کیا نماز اور منسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ ہیں؟

اسوقت دنیا اس اعلان کے لئے گوش بر آواز ہے جو شملہ کی چوٹی سے سنایا جانیوالا ہے اور جس پر ہندوستان کی سیاسیات کا مستقبل بڑی حد تک منحصر ہے۔ آج ۲۶ اگست تک سوائے اسکے کوئی اہم خبر موصول نہیں ہوئی کہ سر سپرو اور مسٹر جیکار شملہ پہونچکر وائسرائے سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ اور اُن شرائط کو پیش کر چکے ہیں۔ جو ہندوستان کے زعماءِ سیاست کی طرف سے طے پائی ہیں۔ اخبارات نے ظن و تخمین سے کام لیکر بڑی حد تک ان شرائط کی تصریح بھی کر دی ہے اور ممکن ہے کہ وہ بڑی حد تک صحیح ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ وقت و مصلحت کا اقتضاء یہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو، موجودہ نزاع کو ملتوی کیا جائے اور گزشتہ چند ماہ کے اندر جو توازن اقتصاد و معاشرت درہم برہم ہو گیا ہے اُسے اپنے اصلی حال پر لایا جائے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ حکومت ہند کو بھی اطمینان سے غور کرنے کا موقعہ ملے گا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وہ کیونکر ہندوستان کے جذبات کی صحیح نمایندگی کر سکتی ہے اور دوسری طرف خود کارکنان قوم کو آیندہ زیادہ قوت و جوش کے ساتھ کام کرنیکا حوصلہ ہوگا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس حقیقتاً کوئی معنے نہیں رکھتی اگر کانگرس کی نمایندگی وہاں نہ ہو اس لئے قیدیوں کی آزادی

کا مسئلہ اس جگہ آکر بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ البتہ حکومت ہند کے لئے یہ وعدہ کرنا کہ وہاں ڈومی نین رُول ہی پر گفتگو ہوگی بیشک دشوار ہے۔ علی الخصوص اُسوقت جبکہ لیبر پارٹی سے بھی اس باب میں زیادہ فیاضی کی توقع نہیں کیجاتی۔ بہرحال یہ گھڑیاں بڑی فیصلہ کُن گھڑیاں ہیں اور ملک کو بغیر کسی قسم کے اضمحلال کے نتیجہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

حال ہی میں مسلمانوں نے پھر اُسی عجیب وغریب چیز میں روح پھونکنا چاہی ہے جو اس سے قبل بھی اسی تنظیم کانفرنس کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ اس کے ناشرین میں سے فی الحال سب سے زیادہ اہم ہستیاں جناب ماجد بدایونی اور شوکت علی کی ہیں، جو بدقسمتی سے دونوں مولانا ہیں، ایک بہ لحاظ اپنے جبہ وعمامہ کے اور دوسرے بہ حیثیت اپنے شحم ولحم کے تنظیم کانفرنس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کے ذریعہ سے کیسی کیسی اہم خدمات انجام دیجائیں گی۔ اسکا جواب زیادہ دشوار نہیں۔ ایک انسان کے ماضی کو دیکھ لو مستقبل آپ سامنے آجائے گا، جنھوں نے انجمن تبلیغ میں اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں جناب بدایونی کے کارنامے دیکھے ہیں اور جنھوں نے خلافت کی تحریک میں شوکت علی صاحب کی کارگزاریوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بہ آسانی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تنظیم کانفرنس کا کیا حشر ہوگا اور وہ ملک وقوم کی دشواریوں میں کتنی آسانیاں پیدا کریگی۔

اول اول جسوقت مسٹر کچلو نے اس کانفرنس کی بنیاد رکھی تو یہی شوکت علی تھے جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی اور اب بھی اپنے تمام "ابعاد ثلثہ" کے ساتھ وہی شوکت علی ہیں جو اس کو اصل کار اور "کعبہ مراد" بتارہے ہیں۔ اس بوالعجبی کا اظہار ایسی ہستیوں سے مستبعد نہیں ہیں، کیونکہ ان حضرات کو نہ قوم و ملک سے کوئی صحیح تعلق ہے، نہ مذہب وانسانیت سے۔ یہ وہ بندگان ہوس وغرض ہیں جنھوں نے ہمیشہ یہی کیا اور کرتے رہیں گے۔ البتہ امتداد زمانہ سے اتنا انقلاب ضرور ہوا ہے کہ لوگ پہلے ان سے واقف نہ تھے اور اب کچھ حقیقت آشنا ہو چلے ہیں۔

جسوقت سید جالب اڈیٹر ہمدم کا انتقال ہوا میں حیدرآباد میں تھا۔ یہاں آنیکے بعد مجھے صرف ایک یا دو ماہ کے ملاحظات میں اس واقعہ کے اظہار کا موقعہ ملا، لیکن وہ "قیام الدین" اور اُس کے متعلقات کے نذر ہوگئے۔ تاہم میں نے یہاں کے ایک مقامی روزانہ اخبار میں، اپنے خیالات بغرض اشاعت روانہ کردئے تھے جنھیں اُس نے کسی مصلحت کی بنا پر شائع نہیں کیا۔ بہرحال اب میں اس تعویق پر عذر پیش کرتے ہوئے سید جالب کی وفات پر اظہار ملال کرتا ہوں، اور یقیناً اس سانحہ کو اُردو صحافت کا سخت حادثہ سمجھتا ہوں۔

سید جالب نہ صرف ایک صحافی بلکہ ایک انسان ہونے کے لحاظ سے بھی عجیب وغریب چیز تھے۔ مجھے اول اول ۱۹۱۴ء میں اُن سے دہلی میں ملنے کا فخر حاصل ہوا تھا، جب میں اُنکے مکان کے سامنے ہی رہا کرتا تھا۔ وہ دہلی کی قدیم تہذیب وشائستگی کے یادگار تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ شرافت وانسانیت کے لحاظ سے کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں۔ اُردو صحافت میں تجربہ اور معلومات کے لحاظ سے جو مرتبہ اُن کا تھا وہ ظاہر ہے۔ اخیر میں جب وہ ہمدم سے علحدہ ہوئے تو ہمت جاری کیا

جو ابتک قائم ہے۔ ہر چند اپنی پالیسی کے لحاظ سے وہ سید جالب کی زندگی میں بھی کبھی قابل قدر وتحسین نہیں سمجھا گیا تاہم انکی شخصیت کی وجہ سے وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ اب چونکہ اُن کے پسماندگان نہ وہ اثر رکھتے ہیں نہ وسعتِ نظر، اس لئے بحالت موجودہ اسکا چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا وجود ملک کے لئے نہ باعث خیر و برکت ہے نہ موجب لطف و تفریح۔ میں نے جو تجویز اس اخبار کے قائم رکھنے کیلئے پیش کی تھی وہ منظور نہیں کی گئی ورنہ شاید یہ ایک بہتر یادگار مرحوم کی ہوتا۔ بہرحال سید جالب خود بہت قابل قدر شخص تھے اور اس فقدان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارے عزیز دوست جناب مجنوں بی۔ اے گورکھپوری نے جن سے نگار کا حلقہ بخوبی واقف ہے۔ گورکھپور میں ایک "ایوانِ اشاعت" قائم کیا ہے۔ جس سے مقصود ملک میں ادب و تنقید، علم و تاریخ کا بلند ذوق پیدا کرنا ہے۔ یہ تحریک صرف اُن کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کام کو وہ اجتماعی حیثیت سے انجام دینا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ گورکھپور کے بعض ارباب علم و ثروت نے اسمیں کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوانِ اشاعت کی پہلی کتاب جس میں فلسفۂ شوپنہار پر نہایت پُر لطف روشنی ڈالی گئی ہے شائع ہو چکی ہے۔ جناب مجنوں نہ صرف ایک بلند ذوق کے ادیب ہیں۔ بلکہ وہ فلسفہ کا بھی نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں اور تنقید کی صلاحیت بھی۔ اس لئے اگر ایوان اشاعت ان کے اہتمام میں ملک و زبان کی قابل قدر خدمات انجام دے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ دوسری کتاب جو بہت جلد شائع ہونیوالی ہے وہ مثنوی زہر عشق ہے۔ جو بہترین تنقید کے ساتھ مع چند تصاویر کے نہایت اعلےٰ طباعت و کتابت کے ساتھ پیش کیجائے گی۔

میں ملک کو متوجہ کرتا ہوں کہ ایوان اشاعت کی امداد کریں، اور اسکی ممبری وغیرہ کے قواعد ان سے طلب کر کے اسکو کامیاب بنانے میں ہر ممکن سعی سے کام لیں۔

جناب نسیم انہونوی مدیر الکشاف نے ارادہ کیا ہے کہ لکھنؤ سے ایک نسائی رسالہ جاری کریں جو اپنے ذوق کے لحاظ سے بہت بلند و دلچسپ ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ ملک میں نسائی رسالوں کی بہت کمی ہے، حالانکہ اس کمی کو سب سے پہلے پورا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قوم عبارت ہے ملک کے بچوں سے اور بچوں کی تربیت منحصر ہے ملک کی ماؤں پر اسلئے حقیقی خدمت یہی ہے کہ اس طبقہ میں ذوق علم پیدا کیا جائے اور اس کی ذہنیت میں اصلاح

اس رسالہ کا نام حریم ہوگا۔ یہ وہی نام ہے جو میں نے سب سے پہلے ایک زنانہ رسالہ کیلئے تجویز کیا تھا اور جس کو بیدل مرحوم کے امارت میں شائع کرنیکا ارادہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ جناب نسیم میری اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے پورے جوش کے ساتھ آمادہ ہیں اور جس حد تک اُن کی محنت و کاوش کا تعلق ہے۔ مجھے ان کی کامیابی کا بھی یقین ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب جس نہج و اصول پر ہوگی، وہ میری ہی رائے سے طے پایا ہے اور اگر پابندی کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا تو میں کہہ سکتا ہوں

کہ یہ ہندوستان کا پہلا رسالہ ہوگا جو حقیقی معنی میں دنیا کی اس "اہم مخلوق" کی خدمت کرنے والا ثابت ہوگا۔ یہ رسالہ غالباً نومبر کی کسی تاریخ میں شائع ہوجائے گا۔ جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو وہ اس کے متعلق پوری معلومات "دفتر رسالہ حریم لکھنؤ" سے طلب کریں۔

عرصہ سے ارادہ تھا کہ فرصت ہو تو صوبۂ سرحد کے اضلاع جاکر دیکھوں جہاں کے لوگوں کو نگار اور اس کے مقاصد سے اسقدر دلچسپی ہے۔ لیکن چونکہ فرصت و اسباب کا یہاں ہمیشہ فقدان رہتا ہے بنابراں اسوقت تک اس ارادہ کی تکمیل کی کوئی صورت نہ نکل سکی تھی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے اب وقت آیا ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہو جس کا امتیاز تمامتر جناب سردار احمد خانصاحب سول جج پشاور اور اُن کے احباب کو حاصل ہے۔ جن کی دعوت کو رد کرنا میرے اختیار سے باہر ہے اور جن کے لطف و محبت، صدق و خلوص کا نگار ہمیشہ زیر بار رہا ہے۔

غالباً اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں یہاں سے روانگی ہوگی اور پانچ دن پشاور میں قیام کرنے کے بعد، بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے احباب سے ملتا ہوا آخر اکتوبر تک واپس آؤں گا۔ خدا کرے وہاں کے سیاسی اضطراب میں اسوقت تک سکون ہوچکا ہو۔ لیکن نہ اس حد تک کہ سفر کی "رومانیت" ہی مفقود ہو جائے۔ میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ جناب مکرم سردار احمد خانصاحب کا نامۂ گرامی پشاور سے موصول ہوا جس میں انھوں نے وہاں کے موجودہ عدم سکون کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا ہے۔ بہرحال اگر حالات میں کوئی قابل اطمینان انقلاب پیدا ہوا تو سفر یقینی ہے۔ روانگی سے قبل میں اپنے احباب سرحد کے پاس مستقل پروگرام سفر کا بھیجدوں گا۔ تاکہ مجھے بھی ملنے میں آسانی ہو اور وہ بھی بیجا زحمت انتظار سے بچیں۔

بمبئی میں ایک جماعت حال ہی میں پیدا ہوئی ہے جو تمام مذاہب کی جماعت علمائے کے خلاف پروپگنڈا کرنا چاہتی ہے چونکہ اس کے دائرۂ عمل میں بیرون ہند کے بھی تمام ممالک شامل ہیں۔ اس لئے اس کا لٹریچر انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے۔ اور غالباً زیادہ استواری کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میرے پاس جو کاغذات آئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو اُصولی طور پر چلانے کے لئے ضرور ہے کہ وہ اپنے احاطۂ عمل کو وسیع کریں اور زیادہ واقف الحال لوگوں سے مدد چاہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ اب دنیا کی بیزاریاں اس طبقہ کی طرف سے ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں جب اُنکا بُت توڑ کر خدا کی زمین کو انکے ناپاک وجود سے پاک صاف کردیا جائے گا۔

"قرآن کے لطائف ادبیہ" کا سلسلہ اکتوبر یا نومبر میں ختم ہو جائے گا۔ اسکے بعد مولوی عبد المالک صاحب اس سے بھی زیادہ اہم مضمون شروع کرنیوالے ہیں۔ جس کی ابتدا دسمبر سے ہو گی۔ آصفی نظامی کے عقائد پر تنقید اس مہینے میں ختم ہو گئی۔ ممکن ہے بعض حضرات کو اسکی طوالت ناگوار رہی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مضمون نگار نے پوری سعی و کاوش سے اس مقالہ کو مرتب کیا۔ اور آصفی کے کلام کی داد دینے میں اُنھوں نے اپنے پورے اعتقاد سے کام لیا۔ تصویر کی قیمت افسانہ ہے اور پلاٹ کے لحاظ سے بہت دلچسپ۔ "مذہب کی ضرورت" اس مضمون کا عنوان ہے جبکا بہ سلسلۂ تنقید رسالہ "قیام الدین" وعدہ کیا گیا تھا۔ آیندہ ماہ میں غالبًا یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ نظامی گنجوی کے دیوان کے متعلق جناب آسی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ خود میں نے بھی یہ دیوان دیکھا ہے۔ لیکن میں آسی صاحب سے اس مسئلہ میں متفق نہیں ہوں کہ نظامی کی غزلیں بھی وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو انکی مثنوی کا ہے۔

زخم دل آسکر وائلڈ کے ایک افسانہ کا ترجمہ۔ انگریزی میں اس رنگ کے افسانے استعاری (ALLEGORICAL) کہلاتے ہیں۔ اور آسکر وائلڈ اس رنگ کے فسانے خوب لکھتا تھا۔ اردو میں بھی اول اول اس کا تتبع بعض حضرات نے کیا تھا، لیکن شاید زیادہ کامیابی کے ساتھ نہیں۔ آسکر وائلڈ کا یہ فسانہ بھی سابق دو فسانوں کی طرح اشتراکیت کے ان اُصول پر قائم ہے۔ جنھوں نے اب روس میں کمیونزم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس بار باب الاستفسار بالکل تاریخی ہے اور یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ نظموں میں مولوی سید علی اختر اختر کی نظم محبت کے عنوان سے بہت دلچسپ و پُر مغز ہے حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب خوب سوچتے ہیں خوب لکھتے ہیں، اور ممکن ہے کہ یہ نتیجہ ہو "اُس بُوئے جانفزا" کا جسکی فضا میں وہ ہر وقت سانس لیتے رہتے ہیں۔ خاقانی کی طرح تیس سال کے بعد مجھے بھی یہ آج ہی معلوم ہوا ہے کہ یہ "ذوق ایں دو ندانی بخدا تا نہ چشی" کا اصل مفہوم کیا ہے۔

ملیریا کا زمانہ ہے اور ہر شخص اپنی جگہ پر پریشان۔ نگار کا کاتب، پریس کا مشین مین، اور دفتر کے کام کرنیوالے تقریبًا سبھی مبتلا ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ مجھے کس وقت اس کا خیر مقدم کرنا پڑے۔ بیگم نے کل ابتدا کر ہی دی ہے اور اسوقت ۱۰۴ ڈگری سے زیادہ تپ موجود ہے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ اگر اکتوبر کا نگار دو چار دن کی تعویق سے شائع ہو تو اُسکو ان طبیعی حوادث پر محمول کرنا چاہیئے۔

رسالۂ جن کی اشاعت بھی اس قسم کے بعض اسباب سے تعویق میں آجاتی ہے اور لوگوں کو شکایت ہوتی ہے۔

آیندہ سے نگار نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۰ تک اور جن کی ۲۵ تک آنا چاہیئے۔

خاقانیِ ہند، قاآنیِ عصر علامہ آصفی نظامی

(بہ سلسلہ ماسبق)

آصفی کا تیسرا فخریہ "دبستانش" اور "حیرانش" ہے، غالباً ان قوافی میں سب سے پہلے انوری نے قصیدہ لکھا تھا، خاقانی، عرفی، اور قاآنی وغیرہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے تو اُنھوں نے بھی اپنے پیش رو کا تتبع کیا۔ لیکن جہاں تک ہماری نظر ہے، خاقانی کا قصیدہ سب سے بہتر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے تشبیب میں سب سے پہلے متصوفانہ نغمہ استعمال کیا۔ اور آیندہ کے لئے نئی راہ پیدا کردی۔ متاخرین میں صرف عرفی سے امید تھی۔ کہ اس روش کو اختیار کرے گا لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب اس کا قصیدہ بایں الفاظ ہماری نظر سے گذرتا ہے کہ

دلِ من باغبانِ عشق و حیرانی گلستانش!
ازل دروازۂ باغ و ابد حسد خیابانش!

عرفی نے قصیدہ کیا لکھا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ تم خود خاقانی اور عرفی کے قصیدے کو پہلو بہ پہلو رکھکر دیکھ لو۔ کہاں تصوف کے نازک ترین معاملات، اور کہاں گل، گلستان، باغبان، اور باغ وغیرہ کا بیجا صرف۔ خیر اس میں بھی کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اکثر شعرا نے اس پردہ میں لیلیٰ جمال کو جلوہ گر دیکھا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ یہاں عرفی اپنی سلکِ شعر کو خیر باد کہہ چکا ہے۔ اگر اس کے کلیات کے تمام نسخوں میں یہ قصیدہ مندرج نہ ہوتا تو شاید ہی یقین آتا کہ یہ الحاقی نہیں ہے۔

اس کے برخلاف آصفی نے اس دریا کو مشاق ترین تیراک کی طرح عبور کیا۔ اُنھوں نے ٹھیک اُسی جگہ قدم رکھا جہاں سے خاقانی نے قدم اُٹھایا تھا۔ مگر اسی طرح نہیں۔ زیادہ سنبھل کر، اور زیادہ تیزی سے فرماتے ہیں۔

دلم طفلے، و درسش عشق، و خاموشی دبستانش — معلم فیضِ ہستی، نقشِ امکاں حرفِ نسیانش
سرِ زانو بجنبش بود اندم تختۂ مشقے، — کہ عقلِ اولیں گردد سبق آموزِ امکانش
بجز فیضِ معلم، در نگاہِ حیرت ایجادش — نمی گردے سیاہی، از کمینِ چشمِ حیرانش
سوادِ ہوش روشن کرد چوں از فطرتِ عالی — نمودِ خود بحالِ خویشتن میداشت گریانش
معلم دید استعدادِ فطرت از فنا ایمن! — سرشکِ خوں بدامن پاک فرمودہ زمژگانش
بہ پیشِ چشم او آئینۂ بنہاد از رازنے! — کہ عکسش بے نیازی داشت از اعیانِ امکانش

تجلی برق زد بر دیدۂ اوراک او آمدم! — کہ عکس و آئینہ شد محو و ماندہ چشم حیرانش
پس از حیرت نگاہی یافت چوں سرمایۂ بینش! — تجلی کرد دیگر جلوہ در آغوشِ مژگانش
باں پر توِ چشمِ او فروغ آگہی آمد — کہ خواہد در کنارش چرخ و صد خورشیدِ تابانش
شیونات تکثر در محیطِ نقطہ دیدہ! — کہ از پرکار وحدت بود ہم عنوان و پایانش
نہ نقطہ، بلکہ از میمِ محمدؐ چشمہ بودہ — کہ از ہر قطرہ اش سر بر زدے صد چرخ و کیوانش

ان اشعار کو پڑھو۔ اور دیکھو صوفیانہ نقطۂ نظر سے، انسان اور عالم کی حقیقت کا اظہار کس پختگی سے کیا گیا ہے خاقانی نے بھی یہی نغمہ الاپا ہے۔ لیکن الحق کہ اس درجہ معجز نہیں۔ مولانا آگے چلکر فرماتے ہیں۔

ز طفلے گوش کن اسرارِ ہستی کز نو آموزی — معلم بود فیضِ لایزالی در دبستانش
ز لوحِ عشق درسِ خامشی زاں پیش بگرفتم — کہ عقل اولیں از کاف نوں گرد و سبق خوانش،
دراں مکتب کہ باشد حیرت انشا خانۂ فطرت — نہ باشد غیرِ مشقِ خامشی در لوحِ عنوانش
ز وردِ عشق خاموشی بہ است از نالہ انگیزی — کہ می نالد طبیبِ عقل از اندوہ درمانش

مخلص سلسلۂ کلام میں نامعلوم طور پر، کسی کی تعریف یا مذمت شروع کر دینا، مخلص یا گریز کہلاتا ہے۔ بہتر مخلص وہ مانا جاتا ہے۔ جہاں اس خوبی سے مدعا بیان کیا جائے، کہ سننے والا اُسے ماقبل کا نتیجہ خیال کرے۔ ذہن سرعت سے اسطرف منتقل ہو سکے، اور طبیعت میں استعجاب نہ پیدا ہو۔

شعرانے عموماً مخلص میں زور لگایا ہے۔ آصفی نے بھی بڑے حسن سے اس فرض کو انجام دیا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) نعتیہ قصیدہ لکھ رہے ہیں۔ تشبیب میں علوِ ہمت کی تعلیم، خودداری اور منت ناپذیری کی تلقین، اور گداگری کی مذمت کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

گر حرص کشد دامنِ فقرت بسوالے — سلطانِ عرب وا یہ دہد دخل عجم را
آں شاہِ جہاں گرد جہاں بخش کہ جودش — طغرائے کمال ست منا شیرِ کرم را

(۲) بہار کی لطافت سے صفحے رو کشِ گلزار ہیں، نشو ونما کی فراوانی سے عالم خطۂ کشمیر نظر آ رہا ہے۔ گلہائے تر کے جوشِ رنگ و بو سے دشت و صحرا کو گلبن و بوستاں کی ہمسری کا دعوے ہے، یاسمین و نسترن اور سنبل و نرگس سے دنیا بھری ہے، رندان مے آشام رنگ رلیاں منا رہے ہیں، دنیا میں عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہیں، ہجولی کھیل کود میں مشغول ہیں۔ احباب باہم مبارکباد دے رہے ہیں، مصاحب رؤسا و سلاطین کے حضور میں تہنیت نامے پیش کر رہے ہیں گو شاعر گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے، مگر اُسے کچھ ایسی لو لگی ہے کہ صرف ایک ہی آستانہ کا

پرستار اور ایک ہی ذات کا والہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ بلبلوں کے نغمے سُن کر ضبط نہیں کر سکتا۔ اور آسمانی ترانہ شروع کر دیتا ہے۔
یہ مضمون آصفی کے ہاں یوں ادا ہوا ہے۔ بہار کا تذکرہ کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

دریں بہار، کہ ہرکس کشادہ بر رخ دل در نشاط پرستی و عیش ایواں را
عجب کہ سجدہ زمستی، بپائے خم نکنند کہ گشت میکدہ و بیت الحرام مستاں را

نہد اساس بہ وضع ہنروری کمال ندیم، رسم ستائش گری سلطاں را
با تہزار طرب از درونہ جوش زند بلب ترانۂ گل، بلبل خوش الحاں را

بگرمئ نفس افروختم بہ کلبۂ تار زلفتِ نور خدا، شمع دین و ایماں را
ظہورِ ہستئ حق، عینِ قدرتِ اعجاز کہ کرد پارہ لب پا بہ، ماہ تاباں را

(۳) صنم پرستی میں عمر کا گراں مایہ حصہ صرف ہو چکا ہے، نیاز عشق پتھر کے مغرور و بیجان مجسمہ کے روبرو نیم بسمل ہے۔ مگر بے سود۔ یکایک معاملہ ضبط کی حدود سے گذر جاتا ہے، اور طبیعت دیر کی جگہ حرم اور صنم کی جگہ خدا کی جویا ہوتی ہے۔ مگر راستہ دشوار گذار اور منزل کٹھن ہے۔ ادھر سامنے راہ ناپید ہے۔ نگاہ اُٹھتی ہے اور ناپید کنار وسعت میں گم ہو کر رہجاتی ہے۔
عقل سرگرداں ہے۔ کہ راہ پر کہاں سے لائے۔ یکایک ممدوح کا خیال آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہر چند کہ ایں مرحلہ از صعب گزاری فرسودہ کند حوصلۂ اہل ہمم را
اما عجبے نیست، کند آصفِ دوراں خضر رہ من، قائدِ توفیق کرم را

(۴) برسات کا موسم ہے۔ تمازتِ آفتاب نے بخارات کے انبار لگا دئے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں اور ان فروں کو فلک تاز بنا دیتی ہیں۔ ذرات بادل بادل کالی کالی گھٹائیں بنکر عالم پر چھا جاتی ہیں، بادل گرجتا ہے، بجلی چمکتی ہے اور دنیا مارے ڈر کے سہمی جاتی ہے۔ شاعر دیکھ کر حیران ہے۔ اللہ۔ اللہ کسقدر ڈراؤنی گھٹا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ سچ ہے،

جہاں در ظلمتش خفتے، ہمہ انوار بنہفتے
بنو دے عدل سلطانِ دکن، گر مطلع بیضا

(۵) بہار کا موسم ہے۔ اور دنیا رشکِ فردوس نظر آرہی ہے۔ مگر شاعر اپنے تنگ و تاریک گھر ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ مناظرِ قدرت کا تماشا کرے۔ مگر یہ ہے کہ پڑا گھٹ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دل سے نہیں رہا جاتا۔ اور مجبور ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔

عالمے از بادۂ عشقم دماغے تازہ کرد — مغز جانم از خمارِ غم پریشاں آمدہ است
تو دریں خلوت نشستی، عرصہ بر من تنگ شد — وقتِ چاکِ جیب و داماں و گریباں آمدہ است
تا بکے در کنجِ تنہائی، بجلوت خوں شدن — غنچہ آسا تا بلب خونابِ شریاں آمدہ است

شاعر سُنکر جواب دیتا ہے۔

گفتمش باشد جنوں بے یار و ساقی سیرِ باغ — گرچہ در گلزار، سازِ باغِ رضواں آمدہ است
تانہ باشد ساغر و مینا بہ پیشِ میگسار — لالہ و گل ہمچو خونابِ شہیداں آمدہ است

دل ہوا و ہوس کا مطیع بندہ ہوتا۔ تو اسے منظور کر لیتا۔ لیکن وہ "عرشِ الٰہی" ہے۔ لہٰذا اس پر برہم کو سنجیدہ فہمائش شروع کرتا ہے۔

گفت نبود غیر ہوائے نفس، ساقی و شراب — عقل زیں سازِ ہوس، ابر خویش لرزاں آمدہ است
دل بہ مہر سادگاں بستن، زفسق ست و فجور — صحبتِ ام الخبائث، کارِ شیطاں آمدہ است
از حضورِ نفس بگذر، ہمہ می عقل کن — آں چہ زنداں ستّ ایں چوں باغِ رضواں آمدہ است

شاعر اس کا جواب یہی دیتا ہے۔ جو ہر امرد پرست صوفی دیا کرتا ہے۔ یعنی "ہم ان خاکی نقوش میں صنعِ باری کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قضائی شہوت مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ

ہرچہ خوباں را بود خوبی حسن از خط و خال — حسنِ صانع، در نقابِ خطِ خوباں آمدہ است

دل یہ جواب سن کر ہنس پڑتا ہے۔ یا اللہ کسقدر مکار لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ مغالطے میں ڈالتے ہیں۔ کیا فطرت کا مظہر صرف یہی ہے۔ کیا قدرت کی گلکاریاں اسقدر محدود تھیں، کہ اُن سے صرف انسان ہی بہرہ مند ہو سکا، سبحانک ہذا بہتانٌ عظیم" فطرت کی توہین کرنیوالے۔

عالمِ نیرنگ وارد، ہمہ گلے اندر کنار — عالمِ امثال از گلشن نمایاں آمدہ است

کیونکہ

ہر گلے آئینہ دار لالہ رویاں آمدہ است

جلوۂ ہر نقش را بیں، در پیچش دل مبند — بستنِ دل بر صور، از نقصِ انساں آمدہ است
گر نہ داری آگہی، او ضائعِ عالم را نگر — کز حدوثِ ذات، نقصانش بامکاں آمدہ است

شاعر کی عقل سے غفلت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ایسی رہنما ذات کہاں تلاش کرے، جو اسرارِ عالم سے کماحقہ واقف ہو۔ اس پر دل رہنمائی کرتا ہے۔ اور رسول خدا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

گفت برگیر از کمالِ ذاتِ پیغمبر سبق — آنکہ ذاتش مظہرِ اسرارِ اکواں آمدہ است

گلبنِ باغِ نبوت، گلشنِ آرائے شرف — آنکہ خاشاکِ حریمش، باغِ رضواں آمدہ است

(۶) بہار دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ درخت، شاخ، پھول، پھل، پتے، کونپلیں، گھاس، غرض ہر وہ شے جس میں نمو کام کر سکتا ہے، سرمست ہے۔ یوں تو ہر زمانہ میں شراب خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن خاصکر ایسے زندہ وقت میں تو یہ صرف مزہ ہی نہیں، ہمہ زندگی ہے۔ اس عیش نوید ہنگام سے زمانہ حظ اُٹھا رہا ہے۔ لیکن شاعر اب بھی غم نصیب ہے۔ کیونکہ

چرخ بمن داشت جنگ، غصہ دلم تنگ داشت
پیکرِ بیرنگ داشت، بخت ستیزہ شعار

یکایک دروازہ پر کوئی دستک دیتا ہے۔ شاعر دیوانہ وار دوڑتا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی، آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے۔ سامنے وہ ذات نظر آتی ہے، جو مختصراً الفاظ میں اسکی روح ہے، لیکن یہ کس لئے، کیا آج اسکی امیدیں بر آئیں گی۔ ہاں، بیشک۔ کیونکہ آج اُس نے آتے ہی

لب بہ لبِ من نہاد، جاں بہ تنِ مردہ داد
غنچۂ دل بر کشاد، ہمچو نسیمِ بہار

جب شاعر کی رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے، تو وہ ہر طرح دادِ عیش دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ معشوق ساقی بنتا ہے۔ اور ایسی مجلس میں شراب ہی شراب ہے! جب ذرا دماغ بادۂ عیش سے تازہ ہو جاتا ہے تو معشوق خسروِ دکن کی مدحت شروع کرتا ہے کہ وہ ایسا بہادر کرم گستر، سخی اور سیتا ہے کہ زمانہ میں نظیر نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس میں تو مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی تو واقعہ ہے کہ اس ذات تک رسائی کہاں۔ اہلِ جاہ وہاں رسا ہیں وہی فیض یاب بھی ہوں گے۔ معشوق۔

گفت ندانی مگر، نیست ترا زاں خبر — بادشہِ دادگر، از خرد خوردہ کار
از ہمہ دانشوراں، وز ہمہ نام آوراں — زعمِ وگر برتراں، کرد گزیں مردِ کار
صدرِ امیراں گزید، بدرِ مشیراں گزید — فخرِ دبیراں گزید، شاہ عدالت شعار
حضرت عبدالرحیم، کز خردِ مستقیم — معتقدست دکریم، ہمہ عفار دکیار

(۷) معشوق نے آکر شاعر کو بیتابِ شوق کر دیا۔ آہ۔ کوئی کس طرح قابو میں رہ سکتا ہے۔ جبکہ

صورتِ عقدِ ثریا، کہ بود در شفقے — بود در حقۂ یاقوتِ لبش سلکِ گہر
بود از پرتوِ رخسارۂ او شب کافور — بود کافور سیہ از سایۂ شب چوں عنبر
از حریرِ تنِ صافی گہرش می لغزید — گر رسیدے بہ تنہا اوز ہوس دستِ نظر

ذوق از لعل لبش در شکرستاں آمد لذتش برو ز دل لذتِ قند و شکر
سنبلِ غالیہ گونش بدماغم افگند شورِ سودائے جنونے بہ ہوائے دگر

جسطرح تشنہ سراب کو دیکھ کر دیوانہ دوڑ پڑتا ہے، ٹھیک اُسی اضطراب و رشوق کے ساتھ شاعر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے۔ ناز و غمزہ کے بعد معشوق کہتا ہے "یہ تونے اپنا حال کیا بنا لیا ہے۔ نہ سیر باغ ہے۔ نہ بادہ و ساغر ہے۔ دنیا میں مجلسِ عیش آراستہ ہے۔ تجھے دیکھو تو سیہ خانہ میں پڑا ہوا ہے۔ نہ معشوقِ شیریں کام در پہ ہے۔ نہ انیس و جلیس میسر" شاعر جواب دیتا ہے "یہاں ساغرِ شراب، اور شاہد روح پرور کا کیا ذکر۔ یہاں تو صدائے "اللہ اکبر" کانوں میں آجاتی ہے۔ اور بس۔ ہر طرف رندی و ہوسناکی کے عوض، زہد و اتقا کا دور دورہ ہے" وہ پوچھتا ہے "یہ کون مقام ہے" ہم نے تو ایسی جگہ نہ دیکھی نہ سنی۔ یہاں کا فرماں روا کون ہے۔ اور وزارت کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے" شاعر جواب دیتا ہے

گفتم ایں شہر نہ باشد کہ بہشتِ امن ست مطمئن ہست دلِ خلق ز ہر گونہ حذر
میر محبوب علی خانِ نظام آصف جاہ کہ بود فخر سلاطین و خدیو کشور
آسماں جاہ ارسطوئے زماں دستور لیست کہ پئے عز و جلال ست و جودش مفخر

(۳) سورج اپنی خواب گاہ میں استراحت کو جاچکا ہے۔ نیلے آسمان پر، روشن فرشتے جلوہ آرا ہیں، چاند سب سیاروں کو ہمراہ لیکر، مجلس میں آبیٹھا ہے شمعیں روشن ہیں، حسین رقاصہ کھڑی ہے، اور ارباب نشاط سامعہ نوازی کر رہے ہیں، شاعر اپنے تاریک صحن میں لیٹا ہوا، رشک آمیز نگاہوں سے یہ ماجرا دیکھ رہا ہے۔ کاش اسکا دل بھی پہلو میں ہوتا کہ اتنے میں

ماہِ دو ہفتہ من، کونت در بستہ من داد آوازِ مستی بنوائے دف و چنگ
یہ کفے بساغرے، در کفِ دیگر میداشت لبِ مے را چو عقابے، کہ بگردورِ جنگ
گفتم اے نازِ تو سابق قدم از فتنۂ حشر وی بتاراجِ نگاہِ تو ہمہ چین و فرنگ
طرۂ لیلیٔ شب، مشکِ سیہ افشاند تو دریں پردۂ نیرنگ چہ دارائی آہنگ
پردۂ کحلیٔ شب، مشکِ فروش خوابست خفت در مشک بایں لحظہ چہ دم ست چہ زنگ
سر بالش بنہ و نرگس نشتاں بربند محتسب تا نخند عربدہا با سرِ جنگ
گفت امشب بہ یکے بادہ ست اندو خراب عس و محتسب و شحنہ بود یا سرِ سنگ
گفتم اندازہ گفتار نگہدار بہوش تو مپندار بہ مستی، کہ جہان ست پلنگ
گفت ہشیاریٔ چو تو بدر غفلت زد و حال کشور چہ شناسی تو دریں گوشۂ تنگ
امشب اندو سعت مشرب بد کن و ادصلا جشنِ سالِ شہِ زینت دہ تاج و اورنگ

(۹) نواب سر نزل اللہ خاں بہادر رئیس بھیکم پور کی مدح میں میمیہ قصیدہ لکھا ہے۔ یہاں جس بے ساختگی کے ساتھ گریز کی ہے اُس کی مثالیں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں ہلالِ رمضاں شد شرف افزائے صیام تافت از وے بفلک اخترِ عزِّ اسلام
سبحلِ روزہ بر آراست چناں مفتیٔ روز کہ بر آفاق حلالش ہمہ گردید حرام
گر مسیحا ز فلک مائدہ می آورد بودے از نعمتِ جنت متنفر لب و کام
فی المثل خضر اگر آبِ حیات آوردے حرمتش بود لصائم صفتِ آبِ حرام

بانگِ تہلیل بہم گشت ز ہر سینہ بلند شورِ تسبیح ز دل بست بلبہا احرام
جائے گلبانگِ صراحی، نفسِ توبہ پرست جائے مے بود سرشکِ شفقی اندر جام

نارسا گشت چناں سلسلۂ زلفِ دراز کز کشاکش دلِ شوریدہ پذیرفت آرام
از دکن روئے نہادم بسوئے کشورِ ہند پائے جولاں بگشادم بہ سفر از آرام
دلِ آشفتہ نمی یافت تسلی کدہ طبعِ شوریدہ نمی کرد بہ یک جائے مقام
چارمیں ہفتہ شد آخر چو ازاں ماہِ صیام ماہِ دو ہفتۂ من آمدہ چوں ماہِ تمام
جنبشِ ابروئے او برقِ قیامت آثار مستیٔ نرگسِ او فتنۂ محشر انجام
گردشِ چشمِ سیہ، فتنۂ دورِ گردوں حلقۂ زلفِ رسا، سلسلۂ روزِ قیام
ور او بگاہِ نیازش ز خمِ ابروئے پشت دستے بزمیں داشت مہِ نو بسلام
شوخِ مستانہ، لبِ راز نہادہ بلبم بوئے صہبائے لبش برد ز سر ہوشِ انجام
گفت سلخِ رمضان ست بغربت مپسند کہ کنم صبر زمے تا سحرِ عیدِ صیام
ساز و برگِ طرب آرائے کہ بمن از ماہے بادۂ ثانیٔ عشرت رمضان کرد حرام
گفتم اے شوخ بغربت چہ طرب می جوئی ساقی و بادہ کجا ست و کجا شیشہ و جام

نہ حریفے کہ ببازیم باو سازِ طرب نہ جلیسے کہ طرازیم باو بزمِ مدام
چوں من و تو ز سفر سوئے وطن باز رسیم بگزینیم بہم ہمدمی شیشہ و جام

اس پر معشوق برافروختہ ہو گیا۔ ریائی زہد کے طعنے دئے۔ اور ترکِ ملاقات کی دھمکیاں دیں۔ اور

شکستِ توبہ پر آمادہ کیا۔

گفتم ازمستیٔ چشم تو جہاں مست مدام گفتم اے بادۂ لعلِ تو خمارِ امکاں
کہ پشیماں شوی از رنج خمارِ انجام اندریں کشورِ بیگانہ مشو عیش پرست
جرگہ بندند بگردِ من و تو زیں آشام عسس و محتسب و قاضیٔ کشور برسند

اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ ہے وہ نقطۂ جہاں سے بیک جولانیٔ فکر آصفی ممدوح کیطرف متوجہ ہوجاتے ہیں یعنی

پیشِ فرزانۂ دیں پرورِ عزِ اسلام ماجرائے من و تو فاشِ و ہم صبح کنند

مذکورہ مثالیں صحیح اندازہ کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ مزید شوق کے لئے کلیات میں کافی سامانِ سکون ہے۔

خاتمہ خاتمہ اصطلاحِ شاعری میں، قصیدہ کے وہ آخری اشعار کہلاتے ہیں، جن میں ممدوح کی درازیٔ عمر و جاہ وغیرہ کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ عربی قصائد میں ابتداءً اس کا التزام نہ تھا۔ یا تو مدح پر قصیدہ کو ختم ہی کر دیتے، یا کچھ تھوڑی بہت استدعا بھی کر لیتے تھے۔ غالباً خاتمہ کی زیرِ بحث شکل اس وقت معرضِ وجود میں آئی ہے۔ جب عرب کے قصائد فارسی رنگ روپ اختیار کر چکے تھے۔ بہرحال فارسی میں خاتمہ قصیدہ کا لازمی جزو رہا ہے۔

خاتمہ میں شعرا نے سب سے زیادہ غلو کیا ہے۔ جس قصیدہ کو اٹھا کر دیکھو۔ زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ سب سے کمزور غلو غالب نے اپنے ایک قطعہ میں استعمال کیا ہے۔ کہتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قصیدہ، مدحیہ نظم کا نام ہے۔ مدح کسی مطلب سے کیجاتی ہے۔ اس لئے چناں و چنیں کے بعد حرفِ مطلب زبان پر آنا لازمی ہے۔ مداح فرض کرتا ہے۔ کہ ممدوح ستائش پر خوش ہو کر صلا دیگا۔ اسلئے اسکو زائد خوش کرنے کیلئے، بدعا طلبی کے بعد، اس کے لئے دعا کرتا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ سب سے پہلے جس نے دعا دی ہو۔ وہ پرخلوص ہو۔ لیکن کاغذ نے جن قصیدوں کو محفوظ رکھا ہے انمیں بلا استثنا کوئی ایک بھی سچی اور صحیح دعا پر حاوی نہیں۔ جب اوصاف میں، اسقدر ملمع برتا گیا ہے، تو دعا کسطرح سادی رہ سکتی تھی۔ سب سے زائد جس شئے سے انسان کو محبت ہے، وہ عمر ہے۔ انسان کسی حالت میں ہو۔ سچے دل سے موت کی تمنا کبھی نہیں کرتا۔ دولت کے ساتھ ساتھ یہ حالت زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ جو جسقدر زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔ اسیقدر زندگی پر زیادہ حریص بھی ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے دامن آزمیں، عمرِ خضر و الیاس کے بھی چند لمحے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ طوالتِ عمر

کی دعا سے خوش ہوتا ہے۔ شاعر جو کچھ لینا چاہتا ہے۔ چند لفظ خرچ کرکے، اسکی آرزو کو تسکین دیدیتا ہے۔ اور کچھ لے بھاگتا ہے، رہ گئی قبولیت، تو نہ اسے قبولیت سے کچھ فائدہ، اور نہ عدمِ قبولیت پر کوئی نقصان۔

خیر، مقصد یہ ہے، کہ آصفی نے بھی اپنے خاتموں میں سراسر تقلید برتی ہے جس راہ پر شعرائے سلف چلتے رہے تھے، وہی اختیار کرلی۔ بہت ممکن تھا، کہ وہ اجتہادی قدم اُٹھاتے، لیکن یہ یقینی ہے، کہ وقتی فضا میں اُن کے لئے آزادی کا سانس لینا محال تھا۔ وہ اسوقت پیدا ہوئے تھے، جب بزمِ مدح کا خمار حد سے گذر چکا تھا طبیعتیں فرضیات کی عادی ہوگئی تھیں۔ اس لئے خمار شکنی کے لئے بھی اُسی شراب کی ضرورت تھی، مجبوراً اُنھیں وہی پیش کرنا پڑی۔ البتہ بعض مقامات پر یہ کوشش ضرور کی، کہ واقعاتی دنیا، فرض و ادعا کو اپنے ہمراہ لیلے۔ مگر یہ پہاڑ کے مقابلہ میں رائی کا دانہ تھا۔

شاعر کے فرض و ادعا کو سب سے زائد پناہ نعت میں ملتی ہے۔ نعت میں ممدوح وہ ذات ہوتی ہے۔ جو اعتقاداتی دنیا میں خدا کے بعد سب سے بزرگ و برتر ہے۔ اس لئے اس کے اوصاف میں بھی، زبان وقلم سے وہ تمام اسماءِ صفت نکل جاتے ہیں، جو حقیقت پر محمول کئے جائیں، تو بلا اشتنا انسان کی ہستی سے بالاتر نکلیں، مگر اس کے باوجود قائل کی عقیدت "ہل من مزید" پکارتی ہے۔ وہ جسقدر مبالغہ کرتا ہے۔ اپنے الفاظ کو اسیقدر کوتاہ پاتا ہے۔ آخر مجبور ہوکر دعا کرتا ہے اور جوشِ شوق میں سب کچھ مانگ بیٹھتا ہے، چونکہ مدحت نگاری میں اسکو قصور کا اعتراف ہے، اس لئے ہم مناجات میں اسکو مقابلتہً ؎ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز۔ کا مصداق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس کے برخلاف ہم کو یقین ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ غیر ممکن ہی نہیں۔ دتوعی ہے۔ ذیل کی مثالیں اسکی وضاحت کرتی ہیں، جب اُنہیں تم یہ دیکھوگے کہ صرف وہی درخواست کی گئی ہے کہ جو نعت کے اندر کسی حالت میں بھی مبالغہ نہیں کہی جاسکتی، تو تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ اسی قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں آصفی کے دل میں، دوسرے عاشقانِ رسالت سے کم پیدا نہیں ہوئیں۔ فرماتے ہیں۔

تا در چمن و دشت بود فیضِ بہاراں — از لالہ و گلہائے مطرا، چمن آرا

تا سینۂ کہسار بود خون ز دلِ لعل — تا لعلِ جگر رنگ بر آرند زخارا

بادا رخِ احباب تو در گلشنِ ہستی — از بادۂ عشرت، صفتِ لالۂ حمرا

چوں لعل زافشردنِ سر پنجۂ غم باد — خوں بستہ دل اندر جگرِ سینۂ اعدا

جب تک دنیا میں، بہار کا دور دورہ رہے، اور پہاڑوں میں، پتھر کے اندر سے خونیں رنگ لعل نکلیں، تیرے دوست سُرخ رو اور دشمن، خونیں دل رہیں۔

"تا حرف و رقم، مبدءِ اسرارِ کمال اند — با حرف و رقم تا کہ فتد کارِ قلم را

کلکِ ازلی نقش طراز ندہ کند صرف — در مدحتِ ذاتِ تو، ہمہ حرف و رقم را

جبتک دنیا میں، اسرار و رموز کے اظہار کا ذریعہ تحریر سمجھی جائے، اور تحریر کے لئے قلم درکار ہو، تمام حروف

صرف تیری نعت میں صرف ہوا کریں۔ اور دنیا کو اپنے مطالب کے اظہار کیلئے کوئی حرف نہ ملے۔

بدہر تاکہ زخوئے ستیزہ کار فلک — شود نزول زبالا بہ زیر حدثاں را
زخوئے فتنۂ و سنگِ حوادثِ گردوں — دلِ شکستہ رواں خستہ باد خصماں را

جبتک آسمان، دنیا پر حوادثات کی بارش کرتا رہے۔ تیرے دشمنوں کے دل زخمی رہیں۔

ہاں آصفی دعا، دم صبح اجابت ست — کو مطلعِ قبول بر آرد سر آفتاب
تا از پئے صبوحئ مستانِ صبح خیز — در بزمِ روزگار بود ساغر آفتاب
در محفلِ شہود و بدساقئ ازل — با میکشانِ عشقِ تو از کوثر آفتاب
در جامِ بجنتِ خصمِ تو درد حمیم باد — ہر جرعہ شعلہ قطرہ کند اخگر آفتاب

جبتک دنیا میں سورج نکلتا رہے، تیرے دوستوں کو شراب طہور، اور دشمنوں کو پیپ اور لہو پینے کو ملے۔

آصفی گوید دعائے ذاتت اے ختم الرسل — زاں نمط کز نصِ قطعی ہم بقرآں آمدہ است
باد فرمانِ نبوت، سر بمہر ختم تو — تا قضا گوید فلاں رفتہ ست بہماں آمدہ است

جبتک دنیا میں، پیدائش و وفات کا سلسلہ جاری رہے، تیرا شریک نبوت نہ پیدا ہو۔

تا غزالانِ حرم را بود دام کمیں — تا زحسرت، دلِ صیادِ ستمگر شکند
چرخ ہر دامِ جفائی کہ نہد در راہم — نیروئے عدلِ تو ہر حلقۂ و چنبر شکند

جبتک حرم کی ہرنیاں، شکاریوں پر حرام رہیں، اور جبتک ظالم شکاری انھیں دیکھکر کفِ افسوس ملے، میرے راستہ میں جسقدر مشکلات حائل ہوں، تیرے عدل و انصاف سے سب دور ہو جایا کریں۔

تاکہ دولابِ چرخِ گردندہ — دیو زریں بچہ در اندازد
صورتِ دیو مہر، چرخ، بجاہ — دشمناں را نگوں سر اندازد

جب دنیا میں سورج غروب ہو، آسمان تیرے دشمنوں کو ذلیل و خوار رکھے۔

شود تا شاخِ خشکِ خامہ تر از رشحۂ معنی — کند تا آبیاری مطالب لالہ افشانش
شود گلدستہ گلہائے معنی زیب بزم او — معطر باد از بویش دماغ آل و یارانش
پئے گلدستہ بندِ نعت او از حضرت باری — شود فردوس نزول و باغ آرا باد رضوانش
رسد با آصفی از فیضِ نقش نکہتِ رحمت — پئے تعطیر مغز آرزو ای از فیضِ بستانش

تا بہار چمنِ دہر ز ہستی جوشد — تا دہد آب، سحابِ کرم فیضِ ازل

لبِ ہر غنچہ، ارم خندہ زفیضت بادا　　بہ نشاطِ دلِ مخلوق بگلریزِ امل
رونقِ محشر ز پئے امتِ تو چوں نوروز　　عرصۂ حشر بخورشید شود برجِ حمل

تا دلِ پاک تمنا کند از فیضِ ازل　　منتہی تا نشود سلسلۂ عہدِ قدیم
تا کشد نقمتِ عصیاں بسوئے قعرِ سقر　　تا بود عفوِ گناہاں بطرب گاہِ نعیم
بادِ احبابِ ترا گلشنِ فردوس مقام　　بادِ اعدائے ترا منزلے از قعرِ جحیم

تا فراقِ تو مرا آرد بایجادِ فغاں　　تا کہ باشد عرش جولانگاہِ ہایا ہائے من
شورِ محشر باد ازعشقت نوائے ذوقِ من　　صورِ اسرافیل ہم آہنگِ ایں غوغائے من
آستانِ حضرتت بادا مرا دارالسلام　　عشرت آبادِ تمنا جنت المعلائے من

ان دعاؤں میں، کوئی ایک دعا بھی ایسی نہیں جسکو ہم یہ کہہ سکیں کہ "مطلب مشکل" ہے، اس لئے "مضمون نیاز" اس کا حریف نہ ہوگا، آصفی مسلمان ہیں۔ عقیدت کیش ہیں۔ عاشق ہیں۔ وہ آرزو کرتے ہیں، کہ رسول اللہ کے دشمن مقہور اور دوست کامگار رہیں۔ یا آپ کی پاک اور مقدس محبت، اُن کے دل کو جلوہ زار بنا دے، یا قیامت میں، آپ کے اتباع کرنیوالوں پر رحمت نازل ہو۔ ایک عقیدتمند یہی چاہتا ہے، اور عنقا جیسی چیز کا طالب نہیں، پھر اسکی تحدید میں، جو مدت ذکر کرتا ہے، وہ مثلاً یہ ہے کہ جب سورج طلوع ہوا کرے، یا جبتک نیکی نیکی اور بدی بدی کہلائے، وغیرہ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں، کہ جبتک دنیا کا موجودہ نظام قائم رہے، یعنی قیامت تک چونکہ رسول اللہ خاتم النبین ہیں اور آپ کا مذہب عالمگیر قانون ہے، اس لئے یہ دعائیں بالکل ایسی ہیں، جیسے کوئی کہے۔ خداوندا فلاں شخص کو اتنی عمر دے، جتنی وہ پائے گا۔ اور جسطرح یہ محال طلبی نہیں۔ اسی طرح وہ بھی محال طلبی نہیں۔

لیکن اب اس کے مقابل وہ دعائیں رکھی جائیں جو دوسرے ممدوحوں کے حق میں ہیں، تو معاملہ برعکس ہو جاتا ہے۔ وہ معمولی انسان ہیں، اس لئے انہیں ہر صفت، بشرطیکہ وہ پائی بھی جائے بالکل سادہ ہوتی ہے، لیکن شاعر اس نقص کو مٹاتا ہے، اور ممدوح کو محامد کی بلند ترین چوٹی پر بٹھا دیتا ہے، اس حالت میں صرف یہی دعا کہ آپ پھلتے پھولتے رہیں۔ ایسی ہے جو محاورہ نہ ہو، تو قطعاً غیر منطقی ہے، پھر اس پر اس سے کہیں زائد بلند اوصاف کو، اور کہیں مشکل باتوں کو اس کے لئے مانگنا تو بالکل ایسا ہوتا ہے، جیسے کوئی کہے "اللہ میاں تو مجھے خدا بنا دے" ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے، اور اس قسم کی دعا کرنیوالے کو اگر کچھ ہی نہ کہا جائے تو زبودہ کہتے ہیں۔

لیکن زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر، قوم کی بہترین ہستیاں اپنے آپ کو اس ذلیل لفظ کا مصداق بناتی ہیں، چونکہ اس قسم کی مجبوریاں آصفی کو پیش آئی ہیں، اسلئے انکے ہاں بھی مذکورہ قسم کی دعائیں بکثرت ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تا بہرۂ ایثار کفِ ہمت نیساں — گوہر کدہ، بازو گہر دامنِ یم را
از دستِ سخا، ہمتِ فیاضِ تو بخشد — گنجینہ لعل و گہر اصنافِ امم را
در موکبِ اقبالِ تو دوراں پئے نصرت — رنگیں کند از خونِ عدو، پائے الم را

الٰہی تاکہ در گیہاں، روان ست از قضا فرماں — ز اجلالِ قدر ہر آں، بود ہر شہ جبیں فرسا
جہاں را او بود آمر، زماں را او بود قاہر — ز فرمانش شود ظاہر، تسلط بر ہمہ دنیا
ز ملکِ ہند تا دکھن، ز عدلِ او شود گلشن — جہاں را در کنش مامن، زماں را عتبہ اش ملجا

تا ہمہ کائنات ز سرچشمۂ وجود — فیضِ بقا بچشمۂ حیواں برابر ست
تا صبح و شام را فلقِ نور و تیرگی — ہم بہ نظامِ عالمِ امکاں برابر ست
بادا بقائے تو بجہاں ہمچو مہر و ماہ — بارائے تو، قواعدِ گیہاں برابر ست

تا دورِ آسماں بہ ترقی مساعد ست — تا پایۂ رفیع بخورشید خاور ست
باشی چو آفتاب، باوجِ سپہر جاہ — کز بختِ تو جہانِ معانی منور ست

تا کہ در عالمِ امکاں بود آثارِ عروج — وز رتب فرۂ اجلال باعیاں گردد
آں مراتب کہ بود در خورِ ادراکِ عقول — از عروجِ تو نشانمند بامکاں گردد

وقت آن ست کہ بالدِ نفسِ عرضِ دعا — بہ نیازے کہ اجابت کشد ادرا بکنار
شاہ را عمر چناں باد کہ دورِ پسیں — عمرِ صد خضر بصرف گرہ آید بہ شمار
سال و مہ، ہفتہ و دہر روز کند جشنِ طرب — بسر آرد بہ نشاطِ ابدی لیل و نہار
خلق را باد نظامے بہ نظامِ عدلش — ملک پرداختہ از فتنۂ چرخِ دوّار

تاکہ چکد از سحاب، قطرۂ درِ خوشاب — تاکہ بآں درِ ناب، دہر کند گوشوار
سال و مہت چوں گہر، منتظم یک دگر — چوں قطراتِ مطر، بیش بود از شمار
چرخ کند گوشوار، زاں گہرِ بے شمار — زینتِ لیل و نہار، باد بہ آں گوشوار
ساقیٔ دورِ زماں، از طرب جاوداں — با تو دہد شادماں، جام بہ لیل و نہار

تاکہ در عالمِ ایجاد بود عشرت و غم — تاکشد دوست مٔی و خصم خورد خونِ جگر
دوستاں را زمٔے عشرتِ کوثر ساغر — دشمناں را قدحِ زہر ز زقومِ سقر
بہرہ یابند ز خوانِ کرمت صبح و مسا — درخورِ حوصلۂ خواہشِ خود، اہلِ ہنر

تاکہ گوہر گسلد ابرِ بہاری بصدف — تا شود آبروئے بحر و صدف از گوہر
بہ نثارِ تو قدر گوہرِ شب تابِ نجوم — دائم آرد بکف از دامنِ بحرِ اخضر

تاکہ خوابد شبِ دیجور، در آغوشِ ظلام — تاکہ از چشمِ فلک خواب برد آبِ غطاط
شاہدِ بختِ تو بیدار بماند دائم — باد روز و شبِ تو، روز و شبِ عیش و نشاط

تاکہ خورشید جہانتاب ز دورِ عشرت — نہد از حوت بآہنگِ طرب رو بحمل
عہدِ نوروز بود آخرِ عہدِ عمرت — روزِ نوروز بود ثانیٔ روزت اوّل
تا بود طبعِ سخنور زِ سخن گوہرزا — تاکہ باشد نسقِ گوہرِ معنی بہ کلام
گوہرِ اہلِ سخن باد نثارِ مدحت — باد آغازِ ثنائے تو زِ حسنِ انجام
سایۂ ذاتِ تو مبسوط بود بر سرِ خلق — بارگاہِ تو بود موئلِ اعیانِ کرام
باد با عمرِ تو عمرِ خضری ہم سوگند — بادۂ عیشِ تو چوں آبِ بقا باد مدام

تا بود دورِ بقا و تا بود دورِ فنا — تاکہ در باغِ جہاں آید بہار و ہم خزاں
گلبنِ ذاتش ہمیشہ باد ریّاں از بقا — وز بہارِ عیش صحت باد دائم گلفشاں
تاکہ آبادی و ویرانی ست در ملکِ جور — تا بہ نیرنگی بود برپا طلسمِ آسماں

خلق باد اندادو عدلش کا جوئی کامیاب　　　　ملک باد از نصفت او از جواد شادماں

ان دعاؤں میں یا تو یہ خواہش ہے، کہ ممدوح کو غیر فانی ہستی عطا کیجائے، اور یا یہ کہ اُس کو وہ مرتبہ ملے، جو ہر بلند مرتبہ شئے سے اعلےٰ ہو۔ اول محال ہے، دوسرا تقریباً غیر ممکن، غیر ممکن یا محال شئے کی طلب میں خلوص پیدا ہونا بھی اسیطرح غیر ممکن یا محال ہے، لیکن چونکہ یہ حصہ قصیدہ کا جزہے، اور قصیدہ ترقی کرکے سرتاپا غلو ہو چکا ہے، اس لئے اس میں بھی غلو ہی غلو جلوہ گر ہے۔

بعض قصائد میں، آصفی نے ایسی دعا بھی دی ہے، جو تھوڑی سی تاویل کے بعد معمولی بول چال میں شامل ہو جاتی ہے۔ مثلاً

تا در حرم و دیر بود رسم پرستش　　　　معبود حقیقی و دگر سنگ صنم را
اندر حرم سینہ دہد شام و سحر گاہ　　　　چوں شمع حرم، قلب تو انوار قدم را

مقصد یہ ہے کہ تیرا سینہ نور ایمان سے روشن رہے۔ لیکن شاعرانہ ادا نے اس کو ذرا نثر سے الگ کر دیا ہے فرماتے ہیں۔" جبتک دیر و حرم میں خدا اور بت کی پرستش ہو، تیرا دل، شمع حرم کی طرح، سینہ کو انوار الٰہی سے روشن رکھے" یا فرماتے ہیں۔

تا صوم و صلاتے و دگر حج و زکاتے　　　　از طاعت خلاق کند عرض نشاں را
بر کام دل صائم امید فزا ید　　　　ابروئے آعیش مہ عید رمضاں را
اقبال ترا سلسلۂ عہد ابد باد　　　　چندانکہ بود سلسلۂ دور زماں را
در عہد تو پیوستہ ز قانون عدالت　　　　بر دامن تو دوراں نگزیند حدثاں را

یعنی" جب تک دنیا میں، خدا کی پرستش و بندگی میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ داخل رہیں، تیرا اقبال پائندہ اور تیرا عدل عالمگیر رہے۔ امیدوار تجھے دیکھے، تو ایسی خوشی محسوس کرے، جیسے روزہ دار عید کا چاند دیکھکر باغ باغ ہو جاتا ہے" بالفاظ دیگر تو سدا اقبال مند، عدالت شعار، اور کرم گستر رہے۔

اسی مضمون کی مختصر دعا۔ ان الفاظ میں نظم فرماتے ہیں۔

تا ہلال عید باشد در جہاں عشرت نوید　　　　تا کہ باشد از نشاط عید صائم کامیاب
ابروئے اقبال او در آسمان عز و جاہ　　　　چوں ہلال عید عشرت باد بہر شیخ و شاب

تا بود سلطان انجم بر سپہر جلوہ میں　　　　از جلال و احتشام خویشتن گردوں جناب
بارگاہ افسر الدولہ بہادر در دکن　　　　بہر اعیاں ملجا و بہر سراں باد مآب

دشمنان سر زنند اندر آتش رشکش چو عود　　ناکساں نالند از غم صورتِ چنگ و رباب

یعنی جبتک، آسمان پہ آفتاب جلوہ فگن رہے، تیری بارگاہ، اعیانِ ملک و قوم کا ملجا رہے، اور دشمن آتشِ حسد سے جل بھن کر خاک ہوا کریں۔

تا نسق را بہ دکن شیوۂ تجدید بود　　تا مدارِ نسق و نظم بعقلِ دانا ست

بہرہر نظم و نسق باد بعقلِ تو مدار　　حکمراں تا کہ نظامِ دکن ملک آراست

یعنی جبتک، دکن میں نظم و نسق کے نئے نئے طریق پیدا ہوتے رہیں، اور دنیا عقل کو مدارِ انتظام شمار کرے ہر موقعہ پر صرف تیری ہی عقل راہنمائی کرے۔

بود تا کہ دورِ سپہرِ کبود،　　رسد تا بہ گیتی بہارِ لسبنت

بہ بزمِ وزیرِ دکن پیشکار،　　بہاراں شود پیشکارِ لسبنت

بمدحش نئے خامۂ آصفی　　شود بلبلِ نو بہارِ لسبنت

یعنی تیری بزم سدا تر و تازہ رہے، اور آصفی کے اشعار سے ہمیشہ مالامال۔

تا قضا دفترِ ایجاد طراز دبو جو　　داورِ یگاہ بدیوانِ قضا تا بنشیند

تا براتِ اہلِ اہلِ جہاں بنویسد　　تا کہ از خامۂ قدرت خطِ اجرا بنشیند

سرورِ جنگ بود تا قسمِ ارزاقِ جہاں　　بہرۂ بخت از و مخلص و اعدا بنشیند

نخلِ بخشش کہ خورد آب ز جوئی اقبال　　ثمر افشانِ کمالِ جسم و دارا بنشیند

یعنی سرورِ جنگ کے ہاں سدا لنگر جاری رہے، جس سے دوست دشمن، سب فیضیاب ہوں، اور تا ابد جمشید و دارا کی طرح صاحبِ اقبال رہے۔

تا کہ میدارد تسلسل زلفِ عمرِ کائنات　　زلفِ عمرت چوں حیاتِ خضر طولانی کند

تا کہ زلفِ شاہدِ کشور بدستش روزگار　　گہ بجمعیت بود گاہے پریشانی کند

زلفِ رعنا شاہدِ ملکِ دکن مجموع باد　　عدل و انصافِ تو دائم شانہ گردانی کند

مقصد یہ ہے کہ خدا آپ کی عمر بڑھائے، اور عدالت کی توفیق دے۔

مولانا شبلی مرحوم کو دعا دیتے ہیں۔

جائے شبلی بدکن باد چو بلبل بچمن　　کز نوا سنجیٔ او در رونقِ لبستاں آمد

نواب ماہر جنگ کے لئے آرزو ہے کہ

فلک مراتبِ او آنقدر کہ افزاید　　بروں ز دائرۂ عقلش انحصار کند

خدا آپ کو اسقدر مراتب عطا کرے کہ ہم گن بھی نہ سکیں۔
نواب فخر الملک وزیر تعلیمات سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

تا کہ از لیل و نہار ست نظام عالم — تا بود مہر و مہ و گردش چرخ دوار
جمع آیند بدرگاہ تو اصحاب علوم — کام یابند ز جود و کرمت لیل و نہار
ہمچو خورشید فروزندہ جہاں آرا باد — نیر رائے منیر تو ز نور الانوار

مقصد یہ ہے کہ سدا تیری مجلس میں علما اور فضلا کا مجمع رہے۔ اور تیری روشن رائے سورج کی طرح سب سے ممتاز ہو۔
مذکورہ بالا مثالوں میں، آصفی نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی دعائیں صرف معمولی مبالغہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ کامیاب بھی ہو گئے، ان کے کلیات میں اس قسم کی اور مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حتی الامکان قدیم شاہراہ سے الگ چلنا چاہتے ہیں۔

یہاں بہ ظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دعاؤں میں بھی کافی غلو ہے۔ اسلئے کہ تقریباً ہر جگہ یہی کہا گیا ہے، کہ جب تک سورج طلوع ہو، یا حوادث نازل ہوں، یا جبتک یہ نظام عالم قائم رہے، وغیرہ پھر ان مثالوں کو واقعاتی کسطرح کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر ذرا بھی دقتِ نظری سے کام لیا جائے۔ تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے، مدعا یہ نہیں کہ کلام مبالغہ سے خالی ہو جائے مقصد یہ ہے کہ جو دعا کیجائے وہ دعا غلو نہ ہو۔ رہی تحدید وقت تو وہ کتنے ہی سیدھے سادے الفاظ میں ہو غلو ہی رہیگی۔ مثلاً صرف یہی کہدیا جائے کہ "سدا ایسا ہو جیو" تو یہ بھی حقیقتاً واقعیت سے دور ہے ——— پہلی مثالیں واقعیت آشنا آرزو سے خالی ہیں، ان میں اسقدر حقیقت سے دور راستہ اختیار کیا گیا ہے، کہ صاف بناوٹ نظر آتی ہے اسکے برخلاف ان خواہشوں میں ذرا سی فکر بھی درکار نہیں ہوتی۔ سامع سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ باا ثر ہے۔ یہ کیوں، صرف اسلئے کہ اگر زیادہ سے زیادہ کچھ طلب کیا ہے تو اقبالمندی۔ عدالت شعاری وغیرہ، رہی درازیٔ عمر، تو اولاً تو اسکے لئے براہ راست کوئی خواہش ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو تشبیہ کے سہارے، یعنی خضر کی طرح بڑی عمر ہو۔ چونکہ تشبیہ کے لئے صرف معمولی وجہ شبہ کافی ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں، "مقصد یہ نہیں ہے کہ عمر بالکل خضر کی برابر ہو، بلکہ جسطرح انکی عمر دراز ہے، ممدوح بھی بڑی عمر پائے"!

تبصرہ کے ان صفحات میں، مولانا آصفی کے قصائد کے اجزا اور خصوصیات کا ہر پہلو روشن ہو چکا ہے، بات حد سے زائد بڑھ گئی، اس لئے ہم علحدہ علحدہ تخیل، تشبیہ، زور، اور چستی وغیرہ کی مثالیں نہیں دیتے۔

خان امتیاز علی عرشی

ایک تصویر کی قیمت

(ایک المیہ رومان)

بادشاہ کے محل میں ایک ہندو خادمہ چمپا بھی تھی، جسپر لوگ کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ محل میں اسکے آنے کا واقعہ ایک ایسا سادہ سا واقعہ تھا کہ حیرت کی کوئی بات اسمیں نہیں ہو سکتی۔ نواب کے محل کی ایک خادمہ پنّا جب اپنے بھائی سے ملنے گئی تو اُسکو معلوم ہوا کہ پڑوسن آج ہی صبح ایک بچی چھوڑ کر مرگئی ہے، اور اس کا کوئی نگراں نہیں ہے۔ اسنے ترس کھا کر اس لڑکی کو اپنے آغوش میں لے لیا اور اپنے ساتھ نواب کے محل میں لے آئی۔

جب محل میں یہ لڑکی داخل ہوئی تو دوسری کنیزوں نے پنّا کی اس حرکت پر بہت ہنسی اُڑائی اور بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت مول لینے پر اسکی بہت تضحیک کی، لیکن پنّا کے کوئی اولاد نہ تھی، اسلئے وہ بے یار و مددگار چمپا کی معصومانہ آنکھیں دیکھکر ان تمام باتوں کو فراموش کر دیتی تھی اور اس بچی کی پرورش کر رہی تھی،

پنّا سب سے بڑی بیگم کی منھ چڑھی خادمہ تھی، اسلئے اسے کام بہت ہی کم کرنا پڑتا تھا اور تنخواہ سب سے زیادہ ملتی تھی۔

پنّا کی پرورش گو حرم کی زہریلی فضا میں ہوئی تھی، مگر چمپا پر اس کا اثر نہیں ہوا تھا، چونکہ پنّا اب بہت نحیف و ضعیف ہو گئی تھی، اس لئے اس کا بہت سا کام نوجوان چمپا کو انجام دینا پڑتا تھا۔ نواب شہنشاہ بیگم چمپا کو کسی قدر التفات کی نظروں سے دیکھتی تھیں، کیونکہ اسوقت اس کے محل میں یہی ایک کنیز ایسی تھی، جسپر مکان کو فخر ہو سکتا ہے، جوں جوں بیگم کی عمر میں اضافہ ہوتا گیا، اسکی محفلیں سرد پڑتی گئیں۔ حتیٰ کہ نواب نے بھی آنا جانا کم کر دیا، ایک وقت تھا جب اس کا حجلۂ شباب روشنی سے جگمگاتا اور پھولوں سے معطر ہوتا تھا، مگر اب یہ حالت تھی کہ روشنیاں شام ہی سے گل کر دی جاتی تھیں اور مرجھائے ہوئے پھول فرش پر بکھرے رہتے تھے۔

البتہ نوجوان شہزادے کی محفلیں ضرور جگمگانے لگیں، جہاں نہ کبھی روشنیاں گل ہوتی تھیں اور نہ پھول مرجھاتے تھے، شہزادہ کے لئے اور زیادہ کنیزوں کی ضرورت روز بروز محسوس ہونے لگی اور محل کے ہر ہر گوشہ کا حسن و جمال کھنچکر اس کے قصر میں آگیا، صرف چمپا ہی ایک ایسی نوجوان کنیز تھی جو بوڑھی بیگم کے محل میں تنہا رہ گئی تھی۔ چمپا پر کام کا بار بہت تھا،

لیکن جب ضروری کاموں سے اسکو فرصت ملتی، تو وہ بیگم کے پاس زردوزی اور کشیدہ کاری کا کام بھی ضرور سیکھتی تھی۔ بوڑھی بیگم شباب رفتہ کی شاکی اور خاوند کی محبت و التفات سے محروم تھی، وہ عیش و عشرت سے تنگ آ گئی تھی اور عمر کے آخری ایام اس لڑکی کے ساتھ گذارتی تھی تاکہ اُس کا دل بہلتا رہے، اور ایام رفتہ کی یاد دل نہ دکھائے، وہ چمپا کو زردوزی بہت شوق سے سکھاتی تھی، جسکی وہ اچھی ماہر تھی

جب شام ہونے لگتی اور غبار شب محیط ہونے لگتا تو زردوزی کا مشغلہ بھی مجبورًا بند کر دیا جاتا تھا، کیونکہ جب آسمان کے سیاہ مخملی غلاف میں زر تار تارے چمکنے لگتے تو زردوزی کے روپہلے اور سنہرے تاروں میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

چمپا اپنی خدمات سے فارغ ہونے کے بعد محل سے نکلکر اس غلام گردش میں چلی جاتی تھی، جہاں سامنے ہی نوجوان شہزادہ کا محل تھا، اسے اس محل کی کھڑکیوں سے رنگین روشنی دکھائی دیتی اور پھولوں کی رومانی خوشبو آتی، اور گانیکی آوازیں اسکے دل میں ایک تلاطم سا پیدا کر دیتی تھیں۔

مریم اور گلابی شہزادہ کی نئی کنیزیں کبھی کبھی اسکے پاس آجاتی تھیں، اور شہزادہ کے حرم میں جو جو کچھ ہوتا تھا وہ سب چمپا کے سامنے دُہراتی تھیں۔

ایک صبح جب چمپا اُٹھی تو محل میں اُسے غیر معمولی چہل پہل نظر آئی، اور اُسے معلوم ہوا کہ بادشاہ اور اُسکا نوجوان شہزادہ آج محل میں آنیوالے تھے۔ بیگم ان دونوں کے خیر مقدم کے لئے تیاریاں کر رہی تھیں، چمپا بھی تیاری میں مصروف تھی۔ لیکن آج اُس کا دل کام میں نہیں لگتا تھا وہ آج کوئی غیر معمولی بےچینی محسوس کر رہی تھی،

(۲)

چمپا رات کی آمد کا بےچینی سے انتظار کر رہی تھی، وہ محل کے کمروں میں مضطرب پھر رہی تھی، بیگم کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تھی، وہ خوش تھی کہ اُسے پھر ایک بار بادشاہ (اپنے شوہر) کا التفات نصیب ہوا۔ مگر چمپا کا دل خدا جانے کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ کہ دفعتًا کمروں کے اندر سے ستار کی سُریلی آواز بلند ہوئی اور قبل اس کے کہ چمپا کسی دروازے کے پیچھے چھپ جاتی، بادشاہ معہ شہزادہ کے اسکے سامنے سے گزرا، چمپا نکلکر باغ میں ایک جگہ جا بیٹھی تاریکی اسکے چاروں طرف محیط ہو گئی، ہوا نے گلاب کی کٹوریوں کو متحرک کیا، مگر چمپا بےحس و حرکت بیٹھی رہی۔

شہزادہ کو اپنی ماں کا محل کچھ پسند نہیں آیا، وہ اِدھر اُدھر اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا، بادشاہ کی عمر مضطرب ہونیکی نہ تھی، اسلئے وہ ایک مکلف کوچ پر پڑا ہوا رقص دیکھ رہا تھا، ماں نے لڑکے کے اضطراب و پریشانی کو تاڑ لیا، اُسکے محل میں متعدد چیزیں دیکھنے کے قابل تھیں، ضرورت تھی کہ کوئی اسے لیجا کر سب چیزیں دکھالائے۔ خود وہ نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ بادشاہ کو کیونکر اکیلا چھوڑا جا سکتا تھا، کنیزیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ چمپا کہیں دکھائی نہیں دی۔ بیگم نے جالیوں میں سے جھانک کر اُسے پکارا۔ اور بادل ناخواستہ چمپا نے دمکتے ہوئے ستاروں کے نیچے سے

اپنی نظریں ہٹائیں اور آہستہ آہستہ محل کی طرف چلی۔

جونہی وہ کمرہ کے دروازہ پر پہونچی، بیگم نے حکم دیا "شہزادہ کو مشرق کی جانب لیجاؤ اور سب چیزوں کی سیر کراؤ۔ ایک شمع ساتھ لیو"۔

شہزادہ نے چمپا پر ایک غلط انداز نظر ڈالی، اور چمپا نے شمعدان اُٹھایا اور شرمائی ہوئی آگے بڑھی اور شہزادہ پیچھے پیچھے۔ متعدد کمرے دکھائے گئے، کسی میں قیمتی ہاتھی دانت کا سامان تھا، اور کسی میں کشمیر کے زرکار کپڑے اور کشیدہ کاری کے عمدہ نمونے۔ غلام گردش کے سب سے آخری کونہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں قفل لگا ہوا تھا، جہاں تک چمپا کی یاد کام کرتی تھی، اُس نے اسے ہمیشہ مقفل دیکھا تھا، شہزادہ اس دروازہ کے سامنے پہونچکر رُک گیا اور پوچھا "یہ بند کیوں ہے؟ اس میں کیا ہے؟" چمپا اپنے دل میں جواب کے لئے مناسب الفاظ سوچ رہی تھی کہ بوڑھی ننا لکڑی ٹیکتی ہوئی ایک طرف سے برآمد ہوئی۔ شمعدان کی ناکافی روشنی اس وسیع جگہ کو روشن نہیں کرسکتی تھی، اس تاریکی میں ننا کا سفید سر اور جھریاں پڑا چہرہ ایک عجب سماں پیدا کررہا تھا، شہزادہ یہ منظر دیکھکر ڈر گیا، اور کسی قدر خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔

(۳)

بوڑھی خادمہ جھک کر آداب بجالائی، اور بولی کہ "حضور! آپ خوفزدہ نہوں میں آپکی پرانی خادمہ ننا ہوں میں آپکی دایہ ہوں، لیکن اب میری صورت بدل گئی ہے، آپ چمپا سے اس کمرہ کی بابت پوچھتے ہیں۔ حضور! بھلا اس لڑکی کو کیا معلوم ہوسکتا ہے؟ جس ہولناک واقعہ کے بعد یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے مقفل کیا گیا تھا، اسے ایک زمانہ گذر چکا ہے، اُسوقت میں جوان تھی، اسکی کنجی میرے پاس ہے، میں اسے پچاس سال سے محفوظ رکھے ہوئے ہوں، شاید آپ نے اپنے دادا کی پُراسرار موت کا حال تو سُنا ہوگا۔ اسکی تصویر آپ کے تصویر خانہ میں نہیں ہے، کیا آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسکی تصویر کہاں ہے؟"

شہزادہ نے سر ہلایا، معلوم ہوتا تھا اُس سے قوت گویائی چھین لی گئی ہے۔ بوڑھی خادمہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنجی نکالی اور قفل کھولا، کمرہ کا دروازہ بغیر کسی دقت کے کھل گیا، شہزادہ باہر کھڑا رہا، خادمہ اندر گئی اور وہاں سے پکارا۔

چمپا جو بُت بنی کھڑی تھی چونک پڑی اور شمعدان لئے ہوئے اندر داخل ہوئی، اس کے پیچھے شہزادہ داخل ہوا، کمرہ آراستہ تھا، لیکن مخمل کے پردوں کا رنگ اُڑ چلا تھا، دیوار کے قریب ایک بڑا عروسی پلنگ رکھا ہوا تھا جس پہ پژمردہ پھولوں کے ہار بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے، اُسکے قریب ہی دیوار پر ایک قدآدم آئینہ آویزاں تھا کسی سخت ضرب کی وجہ سے اسکے دو برابر کے حصّے ہوگئے تھے، فانوسوں کا عکس آئینہ کے دونوں حصّوں پر پڑ رہا تھا۔

جونہی شہزادہ کمرہ میں داخل ہوا اُسکا عکس اس آئینہ میں پڑا، چمپا دفعتاً چونک پڑی، کیونکہ آئینہ میں شہزادہ کے عکس کے علاوہ اسی کی شکل و شمائل کا ایک دوسرا عکس بھی پڑ رہا تھا۔ شہزادہ کے پیچھے ایک اور ویسا ہی عکس تھا اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، لیکن شہزادہ کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔

پنّا کی آواز پھر کمرہ میں سنائی دی "حضور دیکھئے آئینہ کے عین سامنے آپکے دادا کی شبیہ لٹک رہی ہے اور وہ شکستہ آئینہ میں آپکو نظر آرہی ہے، جب یہ تصویر بنی تھی اُسوقت اُنکی عمر آپ ہی کے برابر تھی، لیکن اسکے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ہولناک رات آئی جس نے ہمیں اُن سے جدا کردیا"

یہ کہکر تمام مجمع تصویر کی جانب بڑھا۔ یہ کوئی روغنی تصویر نہ تھی بلکہ کسی صنّاع نے نیلگوں مخمل پر سُنہرے و روپہلے تاروں سے اسکی خوبصورت شبیہ کاڑھی تھی، زردوزی کا شاہکار تھا، یہ تصویر اب بھی جاندار معلوم ہوتی تھی امتدادِ زمانہ سے کام وحشند لا سا معلوم ہوتا تھا۔

جھرمٹ میں سے کسی نوجوان لڑکی نے کہا "کیسی خوبصورت تصویر بنائی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ایسی چیزیں تیار کرسکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس نے بنائی ہے"؟

بوڑھی عورت نے جواب دیا "اسکا بنانیوالا عرصہ ہوا مرگیا۔ وہ اپنے فن کا اُستاد تھا اُس نے یہ تصویر نا تمام چھوڑی، کیونکہ قبل اسکے کہ یہ پایۂ تکمیل کو پہونچے اسکی بینائی نے جواب دیدیا، کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہوگیا، لیکن اُس کے بیٹے نے اسکو پورا کردیا"

نوجوان لڑکی بولی "اسکا اندھا ہوجانا یقینی تھا! میں اپنی بصارت اس شخص کی تصویر بنانے کے لئے دینے کو تیار ہوں جو اسی کی برابر خوبصورت ہے"! لڑکی کی متبسم نظریں شہزادہ کی طرف مائل تھیں

شہزادہ اپنے دادا کی شبیہ کو ایک سرد مہر نقّاد کی طرح دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر بعد اسکی نظریں ادھر سے ہٹیں اور کہا "امینہ! محض خوبصورت ہونا ہی کام نہیں دیتا ویسی ہی قسمت بھی ہونی چاہیئے، تم اپنی مرضی سے مجھ پر اپنی آنکھیں قربان کرسکتی ہو، لیکن تم میں وہ جوہر نہیں ہے اور اگر کوئی ایسا ماہرِ فن مل بھی جائے جو ایسی ہی شبیہ مخمل پہ کاڑھ سکے تو وہ کب اپنی آنکھیں برباد کرنی گوارا کرے گا"

امینہ نے ہنسکر جواب دیا "اگر کوئی ایسا قربانی کرنیوالا مل جائے تو آپ کیا دینگے"؟

شہزادہ نے بھی جواب دیا "کیا دونگا؟ سب کچھ جو میرا ہے"!

اب کوئی چیز دیکھنے کے لئے باقی نہ رہی تھی اس لئے سب لوگ رخصت ہوگئے۔

رات کو جب روشنیاں گل ہوگئیں، چمپا غلام گردش کو طے کرکے پنّا کے آخری کمرہ کی جانب جاتی ہوئی دکھائی دی۔ جونہی چمپا کمرہ میں داخل ہوئی وہ چلّائی۔ "ہائیں! اسوقت تم یہاں کیوں آئی ہو"؟

چمپا نے پوچھا "وہ شخص جس نے نواب کی تصویر کی تکمیل کی تھی اب کہاں ہے؟"
بوڑھی عورت نے پہلے تو چمپا کی طرف متحیر ہو کر دیکھا اور پھر کہا "کیا تو اس سے زر دوزی کا کام سیکھنا چاہتی ہے! نادان لڑکی اس خیال خام سے باز آ اور یاد رکھ کہ اگر ایسے مہلک کام میں ہاتھ ڈالا تو دو ہی سال کے اندر اندر تیری بینائی جاتی رہیگی، تو نے بیگم سے جتنا سیکھ لیا اسی پر اکتفا کر۔ رحمت جس نے تصویر کو مکمل کیا تھا، بینائی کے ضائع ہونے کے خوف سے اس کام سے دست بردار ہو گیا ہے! اور اب آگرہ میں ہے۔"
چمپا نے بوڑھی کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور کہا "بس اب میں جاتی ہوں!"
شام سے طوفان کے آثار تھے، لیکن اب سکون تھا، گلابی باغ میں زرد پتے اپنا مجنونانہ رقص ختم کر چکے تھے ایک لڑکی کا نازک جسم گلاب کے کنجوں میں سے گذرتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہی سکون طاری ہو گیا۔

(۴)

گذشتہ ساٹھ سال کی زندگی میں رحمت کو کبھی اس سال کی سی سردی کا تجربہ نہ ہوا تھا، جب سے وہ آگرہ میں آکر رہا تھا، ہمیشہ سردی کی شکایت کرتا تھا، لیکن امسال تو وہ بالکل ٹھٹھرا جا رہا تھا۔
جب سورج بلند ہوا وہ اپنی چارپائی سے اٹھا لیکن قبل اسکے کہ وہ ضروریات سے فارغ ہوتا، دفعتاً دروازہ کھلا اور کوئی شخص اندر داخل ہوا، جسکے بعد ایک خاموشی چھا گئی۔ رحمت نے متعجب ہو کر اپنی آنکھیں کھولیں کیونکہ اس کے دوستوں میں سے کسی کو بھی خاموشی کی عادت نہ تھی۔ پہلے تو رحمت یہ سمجھا کہ سن و سال کا تقاضہ ہے اور اسے کوئی وہمی شکل دکھائی دے رہی ہے مگر مسلسل گھورنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ سامنے نیلگوں چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کھڑی ہے، رحمت ایک نوجوان لڑکی کو اپنے کمرہ میں دیکھکر کسی قدر پریشان ہوا، وہ متحیر تھا کہ اس وقت کیا کرے کہ نو وارد نے پوچھا "کیا جناب یہی رحمت علی کا مکان ہے؟"
"ہاں! میں ہی رحمت ہوں! تم کہاں سے آئی ہو؟" رحمت نے کسیقدر حواس مجتمع کر کے جواب دیا۔"
"میرا نام چمپا ہے۔ میں بادشاہ کے محل سے آئی ہوں!"

(۵)

یہ سنکر رحمت کو ایک ایک کر کے جوانی کے تمام واقعات یاد آنے لگے۔ اس نے لڑکی سے پوچھا "تم کیا چاہتی ہو؟ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"
"کسی نے نہیں۔ میں اپنے کام کے لئے آئی ہوں۔ میں آپ سے کچھ متوقع ہوں۔"
رحمت نے سوچا شاید یہ کوئی بھکارن ہے، مانگتی ہوئی آگرہ آئی ہے، رحمت نے کسیقدر نرم لہجہ میں کہا "بیٹی! تم مجھ سے فقیر سے کیا متوقع ہو، مجھے روح و جسم کا تعلق قائم رکھنے کے لئے خود دوسروں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے، یہاں امیروں کے مکانات بھی ہیں وہاں جاؤ شاید تمہاری مدد ہو جاوے گی۔"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں تم سے روپیہ کی بھیک نہیں مانگتی۔ میں تم سے اس سے زیادہ کی متوقع ہوں، مجھے زردوزی سکھا دو"!

زردوزی! رحمت خوفزدہ ہوا کیونکہ اُس نے آنکھوں کے ضائع ہونے کے خوف سے عرصہ ہوا اس فن کو خیرباد کہہ رکھا تھا، مگر اب بھی کبھی کبھی ایک آدھ ٹانکا بھر لیا کرتا تھا تاکہ مشق نہ چھوٹے، اس لڑکی کی درخواست نے اسکی جوانی کے تمام تاثرات کی تجدید کردی اور وہ زردوزی کے لئے اپنے اندر ایک نیا جوش محسوس کرنے لگا۔ اُس نے لڑکی کو اپنی شاگردی میں لیلیا اور پہلا سبق دیا۔

رحمت کے گھر میں چونکہ کوئی عورت نہ تھی، اسوجہ سے چمپا کو فاطمہ نامی ایک عورت کے ہاں جاکر رہنا پڑا، جو رحمت کے ہاں کام کاج کرنے کبھی کبھی آیا جایا کرتی تھی۔

اسی طرح چمپا کو رہتے ہوئے عرصہ گذر گیا لیکن تصویر بنانیکی ابھی تک نوبت نہ آئی، کیونکہ اُستاد نے ابھی اسکا امتحان نہیں لیا تھا، چمپا بہت محنت و عرق ریزی سے مختلف قسم کے پھول، بیل بوٹے، اور جانوروں کی شکلیں بنالیتی تھی، لیکن اسکا دماغ ہمیشہ محل کے اس کمرہ میں چکر لگاتا رہتا تھا جہاں خوبصورت زردوزی تصویر آویزاں تھی۔

(۶)

اسی طرح چمپا پر زندگی کا پورا ایک سال ختم ہوگیا اور اس زمانہ میں اُس نے اسقدر محنت کی کہ تاج محل کی زردوزی کی تصویر اُس نے تیار کرلی، جسے اُستاد نے بہت پسند کیا اور اُسے امید ہوئی کہ اب وہ شہزادہ کی تصویر بنانے میں کامیاب ہوجائے گی۔

اُسے بصارت ضائع ہونے کا خوف ابتدا ہی سے تھا، اسلئے اب وہ بہت محتاط ہوگئی تھی اور رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اُسے شہزادہ کی تصویر تیار کرنا تھی اس لئے وہ اپنی آنکھیں کھونے کے لئے تیار نہ تھی، وہ اب صرف دن کی تیز روشنی میں کام کیا کرتی تھی۔

چمپا کا اثاثہ چند دنوں کے بعد کم ہونے لگا، فاطمہ نے مزید روپیہ کی فرمائش کی جسے چمپا پیش کرنے سے قاصر تھی، چمپا نے ایک وقت کھانا بند کردیا اور دیگر اخراجات میں بھی کمی کردی مگر تصویر بنانے کے لئے سنہرے روپہلے تار ضرور کہیں نہ کہیں سے مہیا کرتی۔

ایک وقت کھانے اور شب و روز کی محنت کرنیکی وجہ سے چمپا کی صحت نے جواب دینا شروع کردیا، کیا رحمت کی تنبیہ صحیح تھی کہ ضرورت سے زیادہ محنت کی وجہ سے وہ آنکھیں کھو بیٹھیگی؟ ہاں! اُسے اب شبہ ہونے لگا تھا، کیونکہ وہ محسوس کررہی تھی کہ اُسکی بصارت روز بروز کم ہورہی تھی۔ وہ اب کام میں بھی بہت غلطیاں کرتی تھی، تصویر ختم ہونے میں ابھی کافی عرصہ تھا اب اُس نے رات کو مٹی کے چراغ کے سامنے کام کرنا شروع کردیا، کیونکہ دنکو سورج کی چمک سنہرے تاروں پر پڑکر اسکی

آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی تھی۔

دن رات محنت کرنیکی وجہ سے اسکی آنکھوں سے پانی بہنے لگا، مگر تصویر اب قریب الختم تھی، خزاں کا موسم تھا رات بھیانک اور ڈراؤنی تھی اور وہ جلد جلد سوئیاں نکال رہی تھی۔ آج کی رات اسے وہ طوفانی رات یاد آئی جب وہ محل سے رخصت ہوئی تھی۔

چمپا اب آگرہ سے رخصت ہونیکی تیاریاں کر رہی تھی کیونکہ تصویر ختم ہونیوالی تھی۔ فاطمہ صبح ہوتے ہی کہیں باہر نکل گئی اور چمپا اپنا کام لیکر بیٹھ گئی۔ اب عمل کی تکمیل ہو رہی تھی۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ تاریکی نے ادھر اُدھر سے بڑھنا شروع کیا، اسنے سوچا ابر آیا ہے مگر جب اس نے باہر نکل کر آسمان کو دیکھا تو وہ بالکل صاف تھا، وہ پھر کمرہ میں آبیٹھی اور کام میں لگ گئی۔ تاریکی پھر عود کر آئی اور اُس نے آنکھیں ملکر ادھر ادھر دیکھا مگر اُسکی آنکھیں دہندلی سی تھیں، کیا وہ مصیبت جسے دُور کرنیکے لئے اُسنے انتہائی کوشش کی تھی اب آنیوالی تھی؟

چمپا خوفزدہ ہوگئی کیا اُسکی آنکھیں نور بصارت سے محروم ہو رہی تھیں، کیا اسکی زندگی کا سرمایہ چند آخری ٹانکوں سے محروم رہیگا؟ کیا شاہکار زندگی ناتمام رہیگا؟ کیا وہ نذر پیش نہ کر سکیگی؟ یہ خیالات تھے جو چمپا کے دماغ پر چھاگئے۔ اور وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آئی، اسوقت اُسکے سامنے شہزادہ کی تصویر تھی۔ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ وہ خوبصورت شہزادہ سامنے کھڑا ہوا تھا، تصویر ہر طرح مکمل تھی ـــــ مگر آنکھیں عجیب و بے کیف تھیں! تصویر کی آنکھیں بیجان و مُردہ تھیں، ان میں جسم کے بقیہ حصّوں کی سی حیات نہ تھی، کیا چمپا اپنی زندگی کی قربانی سے ان آنکھوں میں حسن پیدا کر سکتی تھی؟

چمپا نے ایک غیر انسانی قوت کے ماتحت حواس کو مجتمع کیا اور مخمل لیکر کھڑکی کے قریب روشنی میں آبیٹھی۔ کمرہ کی تاریکی ہر طرف سے ہجوم کر رہی تھی، آج چمپا اس سیاہ مخمل میں اس خزانہ کو تفویض کر رہی تھی جو اُسکے نہاں خانۂ دل میں عرصہ دراز سے پوشیدہ تھا ـــــ آہ وہ نظریں! ـــــ شہزادہ کی مخمور نگاہیں تو اسوقت تک صرف چمپا کے اعماق دل میں پنہاں تھیں، آج مخملی سطح پر مادی صورت میں تبدیل ہونیوالی تھیں۔ سنہرے ٹانکے سیاہ مخمل پر اسطرح متحرک تھے گویا تاریک آسمان پر بجلی کوند رہی تھی۔ آخری ٹانکا ختم ہوتے ہی خوبصورت شہزادہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں ـــــ اب اُنمیں جان تھی!

چمپا نے سوئی ہاتھ سے رکھدی اور متبسم ہو کر اپنے شاہکار کو اُٹھایا اور نگاہ سے دُور رکھکر دیکھا ـــــ ایک بجلی سی کوندی اور پھر اسکے بعد تمام کائنات پر ایک سیاہ پردہ آہستہ آہستہ گرنے لگا!

(۷)

ابھی تک پو نہیں پھٹی تھی اور ستارہ صبح اپنی آخری کرنیں زمین پر ڈال رہا تھا کہ ایک تاریک دہلی سڑک پر سے دو عورتیں گذرتی ہوئی نظر آئیں، ایک بوڑھی تھی دوسری جوان۔ بڑھیا کی بغل میں ایک بنڈل تھا اور ایک ہاتھ سے

وہ جوان عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے لیجا رہی تھی۔ کہر کی نقاب چھائی ہوئی تھی اور ہر چیز ایک سایہ معلوم ہوتی تھی۔ جوان عورت کے پاس بھی ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جسے وہ بہت احتیاط کے ساتھ چادر میں چھپائے ہوئے تھی۔

بوڑھی عورت نے دفعتاً بلند آواز سے کہا میں تھک گئی ہوں۔ اب آگے نہیں جا سکتی! محل قریب آگیا ہے، تھوڑی دیر آرام کرو، پھر چلیں گے۔ محل وہی ہے نا ـــــ "سفید سی برجی!

لڑکی نے سر ہلا کر کہا "اچھا تو بیٹھ جاؤ"۔

قریب ہی ایک درخت کے نیچے دونوں عورتیں بیٹھ گئیں، بوڑھی عورت نے لڑکی سے کہا "بیٹی جب فاطمہ مجھ سے ملی تھی تو تمہارے متعلق یہ کہا تھا کہ تم محل کی عورت ہو، اور تمہارے پاس بہت روپیہ ہے تم آگرہ سے ہمارے گاؤں تک پیدل کیوں آئیں؟"

نابینا لڑکی نے اپنی بے بصر آنکھیں اسکی طرف کر کے کہا "میں محل کی شہزادی نہیں ہوں! میں تو ایک غریب خادمہ تھی! میرے پاس جو کچھ بھی تھوڑا بہت روپیہ تھا وہ ختم ہو گیا"۔

"اوہ! تم خادمہ ہو! دیکھو فاطمہ کتنی جھوٹی عورت ہے! کمبخت! بیٹی تیری آنکھیں کیونکر ضائع ہو گئیں"۔ لڑکی کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے جواب دیا "میں نے یہ آنکھیں اپنے خداوند کے حضور میں نذر کر دی ہیں ـــــ" اور یہ کہکر رونے لگی۔

عورت نے تسلی دیکر کہا "بیٹی رو نہیں! صبر کر! خدا تیری مصیبت آسان کرے گا۔ بیٹی اس بنڈل میں کیا ہے؟ سونا یا چاندی؟"

"سونا! چاندی! ـــــ ان سب سے زیادہ قیمتی چیز! کیونکہ میں نے اسکے لئے اپنی زندگی قربان کی ہے۔ یہ بہت بیش قیمت چیز ہے"!

بوڑھی عورت نے دل میں کہا سونا چاندی سے بھی زیادہ قیمتی یقیناً جواہرات ہونگے، اور محل سے چرائے ہونگے۔

چمپا بالکل تھک گئی تھی، اس لئے وہ درخت کے نیچے پڑ کر سو رہی۔ بوڑھی عورت بھی سو رہی، مگر وہ جلد اُٹھ بیٹھی۔ چمپا کو سوتے سوتے کئی گھنٹے ہو گئے تو بوڑھی عورت نے اسے جگایا اور کہا "بیٹی اب شام ہونے آئی چلو محل کی طرف چلیں، ورنہ چلتے چلتے رات ہو جائے گی"۔ چمپا یہ سنکر اُٹھ بیٹھی اور کپڑے جھاڑ کر پھر چل پڑی۔ جب دونوں محل پر پہنچ گئے تو اس نے بوڑھی سے کہا کہ اس دربان کو ایک روپیہ دو اور اس سے کہو کہ ہمیں شہزادہ کے حرم میں لیچلے"۔

چمپا مرمریں زینہ پر سے ہوتی ہوئی اوپر چڑھی۔ اب اسکی بے بصری کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرتی تھی کیونکہ اسکے تمام حواس نے اسکی مدد کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ محل کے چپہ چپہ سے واقف تھی۔

چمپا کو اب وہ زمانہ یاد آ رہا تھا، جب وہ پرانے محل کے بیرونی غلام گردش میں کھڑی رہا کرتی تھی۔ شاید اب

بوڑھی بیگم گلابی باغ میں جا بیٹھی ہونگی، کیونکہ وہ اسی وقت جایا کرتی تھیں، چمپا یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی کہ بوڑھی پنّا بھی زندہ ہے یا نہیں!

(۸)

چمپا اب ملاقاتی کمرہ کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اسکی زندگی کے صبر آزما لمحات قریب سے قریب تر ہو رہے تھے اسکے قدم آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے، تمام جوش ختم ہو چکا تھا، وہ بہت کچھ کہنے آئی تھی، مگر اب ایک لفظ بھی اس کے دماغ میں نہ تھا۔

دربان چمپا کو وزیر کے حوالہ کرکے رخصت ہو گیا اور وزیر نے چمپا سے مخاطب ہو کر کہا "میرے ساتھ آؤ"۔ چمپا نے ہمت کرکے آگے قدم بڑھایا اس حال میں کہ اسکا قیمتی خزانہ سینہ سے لگا ہوا تھا۔

قدموں کے نیچے نرم قالین کے مس ہونے اور پھولوں کی خوشبو سے چمپا نے سمجھ لیا کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ گئی وزیر نے جھک کر سلام کیا اور با آواز بلند کہا "جہاں پناہ! ایک بھکارن حضور کی قدمبوسی کرنا چاہتی ہے"۔ چمپا نے تمام حاضرین کی آنکھیں اپنی طرف مرکوز ہوتی ہوئی محسوس کیں۔ کیا کوئی اسے پہچان سکتا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ وہ کبھی اس محل میں نہیں آئی تھی اور شہزادہ نے بھی اُسے صرف ایک بار سرسری طور پر دیکھا تھا۔

کوئی شخص قریب آیا۔ قدمونکی آہٹ وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی اور نہ اُسکی آواز اجنبی تھی جس نے یہ پوچھا کہ "تو کیا چاہتی ہے؟"

یہ الفاظ چمپا کے کانوں میں گونجے اور کئی دفعہ اس نے جواب دینے کی کوشش کی، مگر وفور شوق نے اُسے بولنے نہ دیا۔ پھر پوچھا گیا "تم یہاں کس لئے آئی ہو؟ کیا چاہتی ہو؟"

چمپا نے بہ مشکل تمام ایک گلوگیر آواز سے جواب دیا "میں مانگنے نہیں آئی ہوں۔ دینے آئی ہوں"۔ چمپا نے محسوس کیا کہ تمام محفل میں ایک حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی۔

شہزادہ نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور کہا "ہاں! بیشک، وہ کیا ہے؟"

چمپا نے اپنی زندگی کا سرمایہ ―― وہ خزانہ جسکی کوئی قیمت نہ تھی اور جسے اُسنے اپنی آنکھیں قربان کرکے تیار کیا تھا ―― آگے بڑھایا اور شہزادہ کو دیا۔ شہزادہ نے مضطربانہ انداز سے اسے لیلیا۔

چمپا کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ قالین پر ہانپتی ہوئی بیٹھ گئی۔ سینہ بلیوں اُچھل رہا تھا اور اُسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

کہ دفعتاً بنڈل کے اوپر سے غلاف کے کھلنے کی آواز آئی اور اب چمپا نے سمجھا کہ ―― اسکی زندگی کا راز کھلنے والا تھا!

دفعتاً ایک قہقہہ کی آواز فضا میں گونجی! چمپا سرد پڑ گئی! اسکا جسم ایک سنگین مجسمہ بنگیا! کیا اسکی تمام زندگی کے سرمایہ کی یہی قیمت تھی: ایک طنزیہ قہقہہ! آہ! اس قہقہہ کا کیا مطلب تھا؟

ایک آواز سنائی دی "کیا یہ عورت دیوانی ہو گئی ہے! دیکھو کیسی گستاخ ہے! شہزادہ کے حضور میں چند چیتھڑے پیش کرنے لائی ہے"۔

چیتھڑے! وہ کیا سن رہی تھی اسکا دماغ چکرا رہا تھا!

چمپا ایک کپکپی کے بعد شہزادہ کے قدموں میں گر پڑی، وہ اندرونی نور جس نے اسوقت تک نابینا لڑکی کو منور کر رکھا تھا آج ہمیشہ کے لئے جھلملا کر ختم ہو گیا۔

شہزادہ نے برافروختہ ہو کر کہا "اس بدبخت و گستاخ لڑکی کو یہاں سے نکال دو، اس نے میری محفل کو مکدّر کر دیا، لیجاؤ ابھی میرے سامنے سے ہٹاؤ اگر یہ مر گئی ہو"!

شہزادہ کی ایک محبوبہ بولی "بھلا اس لڑکی کو یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ آج صبح ہی آگرہ کی ایک بڑھیا نے زردوزی کا ایک شاہکار پیش کیا تھا، شہزادہ اُسے دیکھکر کتنا خوش ہوا تھا اور بڑھیا کو کتنا انعام دیا! شاید یہ بھی اسی لالچ میں آئی تھی۔ ہم سمجھے تھے جسطرح صبح ایک عمدہ تحفہ حاصل ہوا تھا، شام کو بھی ایسا ہی ملے گا، مگر نہیں یہ لڑکی مذاق کر رہی تھی! اور بیوقوف بنانے آئی تھی"!

سارا مجمع چمپا کے بیحس جسم پر حقارت آمیز نظریں ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ مقابل کی دیوار پر ایک زردوز مجسمہ لٹک رہا تھا جسکی دو خوبصورت آنکھیں ——— جنہیں زندہ کرنے کے لئے چمپا نے اپنی بصارت کی قربانی کی تھی ——— اُسکے بیحس جسم اور آنکھوں کے گمشدہ نور کی طرف دیکھ رہی تھیں!

(ماخوذ)

ظفر قریشی دہلوی

نظامی گنجوی کا نایاب و گمشدہ دیوان

ایک جوہر گرانمایہ کی دستیابی



مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ چھٹی صدی ہجری کی اُن مقتدر اور مایۂ ناز ہستیوں میں تھے جنکے کمال کو ہر فرد مانتا تھا اور بہ لحاظ تصنیف اُن کا شمار ایسے لوگوں میں تھا جنکی تقلید و اتباع کو لوگ فخر جانتے تھے۔ اُن کے مخزن اسرار کے سینکڑوں جواب لکھے گئے۔ ایران کا جو مشہور شاعر اُٹھا۔ اُس نے سب سے پہلے خمسے کے جواب کے لئے قلم اُٹھایا۔

دوسری تیسری صدی ہجری سے ایران میں ادبیات کے مٹے ہوئے نقش پھر اُبھر آئے تھے۔ شاعری ترقیوں کے مدارج طے کر رہی تھی۔ ہر صنف کلام میں جان پڑتی جاتی تھی۔ اور ہر شعبہ میں ایک انداز کا اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ ترقی ایک محدود دائرہ اور ایک خاص حد سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ایک منزل خاص مقرر تھی کہ ہر ایک وہاں پہونچکر یا خود ٹھہر جاتا تھا یا اتنی سکت ہی باقی نہ رہتی تھی۔ کہ دو چار قدم اور آگے بڑھے۔ اسمیں کسکو کلام ہے کہ عسجدی۔ فرخی۔ حکیم ناصر خسرو۔ غضائری رازی۔ بندار رازی۔ امیر معزی۔ اسدی۔ طوسی۔ عنصری۔ فردوسی۔ ابوالعلا گنجوی۔ انوری۔ وغیرہ سب کے سب خدائے سخن تھے۔ اور ایک راستہ نکال گئے۔ نظامی بھی اگر اسی راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلتے تو زیادہ سے زیادہ وہ بھی اسی منزل پر پہونچ جاتے جسپر یہ سب پہونچے تھے۔ مگر اُنھوں نے صرف اتنی بات کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا۔ وہ اور آگے بڑھے اور اتنا بڑھے کہ پیشرو تو پیشرو اونکے پس روؤں میں بھی کوئی شخص وہاں تک نہیں پہونچا۔ اُنھوں نے نظم میں جس جس چیز کو ترقی دی اُنکی تفصیل کے لئے گو زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ مگر مجملاً یہ ہے۔ کہ شعر کو چار چاند لگا دئے۔ اور اُنھیں پہلے نقوش میں معمول سے زیادہ گلکاریاں کیں۔ کلام میں زور بڑھایا۔ بلاغت کو فصاحت کے ساتھ شامل کیا۔ استعارات میں جدت۔ تشبیہات میں اختراع سے کام لیا۔ قوت خیال کو بہت بڑھایا۔ سادگی میں رنگینیاں پیدا کیں۔ اور بہت سی باتیں ایسی ایجاد کیں جنکی وجہ سے انکو بڑے نقادوں نے موجد تسلیم کر لیا۔ سب باتوں کو نظر انداز کر کے اگر صرف اسی بات کو مدِ نظر رکھا جائے کہ اُسوقت تک جتنے شعرا تھے وہ صرف ایک ایک چیز میں باکمال تھے۔ مثلاً فردوسی صرف رزم کے۔ خیام فلسفہ کے۔ انوری قصائد کے۔ سنائی نصائح کے۔ تو بھی نظامی کا درجہ بہت بلند رہتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے سب چیزوں کو اپنے کلام میں اسطرح جمع کر دیا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

ہر صنف کلام میں عمر کا پورا حصّہ صرف کیا ہے۔ رزم۔ بزم۔ وعظ و پند۔ تصوف۔ عاشقی و مستی۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ غرضکہ یہ تمام چیزیں تنہا انکے کلام میں نظر آتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر چیز گل سرسبد ہے۔

آج اگر دیکھا جاتا ہے تو نظامی کا نام صرف اُن کے خمسے کے نام سے اور خمسے میں بھی بیشتر سکندر نامہ کے نام سے زندہ ہے باقی نقوش غیر فانی ہی سہی مگر اتنے دھندلے اور اتنے تاریک ہیں جو نظر نہیں آتے۔

یہ بات کسی طرح قیاس میں نہیں آتی کہ اُنھوں نے عاشقانہ شاعری بھی اُسی درجہ کی نہ کی ہو۔ جو اُن کے شایان شان تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اُنکا عاشقانہ کلام ایسا گم ہے کہ اب اُسکے متعلق شکوک اسدرجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ کوئی صحیح صحیح یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ کب تھا؟ کہاں تھا؟ اور تھا تو کتنا تھا؟ کس انداز کا تھا؟ کس نے اُسکو جمع کیا۔ اور کیا کیا اوسمیں موجود تھا یہ تو سب کہتے ہیں کہ اونکا عاشقانہ کلام جسکو دیوان کے نام سے نامزد کیا جاتا ہے تھا۔ مگر اسمیں سخت اختلاف ہے کہ کتنا تھا؟ اور کس رنگ کا تھا؟ نقادوں نے سخت سے سخت تحقیقاتیں کیں ہیں مگر دیوان کی نایابی نے سب کی آنکھوں پر شکوک داوہام کے گہرے پردے چھوڑ دئے۔ دیوان تھا اور ضرور تھا۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ اُنکے قصائد۔ موشحات۔ اور صنائع وغیرہ کے بیس ہزار شعر ہیں۔ مگر جب لکھتے ہیں تو ثبوت میں صرف ایک غزل کے آٹھ شعر نقل کرتے ہیں۔

شب تیرہ است درہ مشکل خبیبت راعناں درکش ۔۔۔ زمانے رخصت ہستی را بخلوت گاہ جاں درکش

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر بروں کردی ۔۔۔ کسے رمزش نمی داند عناں درکش عناں درکش

بیس ہزار شعروں کے دیوان کا ذکر کرکے ایک قصیدہ نما غزل کے آٹھ شعر نقل کرنیکے اسکے سوا اور کوئی معنے نہیں ہیں کہ سمرقندی نے صرف ایک سُنی سُنائی بات لکھدی ہے۔ دیوان ہرگز نظر سے نہیں گزرا۔

لطف علی آذر اپنے آتشکدہ میں دیوان کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:۔

"گویند بیست ہزار بیت از قصائد و غزلیات و قطعات و رُباعیات سوائے خمسہ داشتہ کہ حال درمیاں نیست ایں چند بیت از تذکرہ چند ملاحظہ و انتخاب شد۔"

یہ لکھکر اکثر اشعار نقل کئے ہیں۔ مگر اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ دیوان اُنھوں نے بھی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا بہت ممکن ہے کہ صرف دولت شاہ کے تذکرہ میں دیکھ کر تعداد اشعار لکھدی ہو۔ اور دوسری جگہوں سے منتخب اشعار کو نقل کر دیا ہو۔

عوفی یزدی نے اپنے **لباب الالباب** میں بہت صاف صاف کہدیا ہے کہ ان (موجودہ) مثنویوں کے سوائے نظامی نے بہت کم شعر لکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص کی زبان سے سُنے ہوئے کچھ شعر لکھدئے ہیں۔ باقی کوئی ذکر دیوان کا نہیں۔

کشف الظنون میں دیوان نظامی کا ذکر ہے۔ مگر وہ صرف ذکر ہی ذکر ہے۔

مصنف تذکرہ مجمع الفصحا نے کچھ شعر قصائد کے کچھ غزلیں اور ایک رباعی نقل کردی ہے دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے کا کوئی ذکر نہیں۔

یورپ کے مشہور و معروف مستشرق ڈاکٹر ایتھے نے انسائیکلوپیڈیا میں نظامی پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے اوسمیں دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ۵۸۴ھ میں اُنھوں نے اپنا دیوان خود مرتب کیا۔ اور اس بات کی تردید کی ہے کہ اُنکے دیوان میں بیس ہزار شعر ہیں۔ بلکہ لکھا ہے کہ اس دیوان کے چند نسخوں میں جو ہکو دستیاب ہوا اشعار کی ایک قلیل تعداد موجود ہے۔ مگر یہ تحقیق تذکرہ دولت شاہ کے مصنف کی تحقیق کے سراسر خلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نظامی کا انتقال ۵۷۶ھ میں ہوا۔ اگرچہ اسمیں کلام نہیں ہے کہ اونکے سن وفات میں سخت اختلاف ہے جیسا کہ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ تقی کاشی ۶۰۶ھ اونکا سال وفات لکھتے ہیں اور مولانا کا خود بھی یہی خیال ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُنکی وفات ہوئی۔

ایک اور مستشرق ڈاکٹر ولہم باخر جنھوں نے نظامی کے حال میں ایک محققانہ کتاب لکھی ہے۔ وہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ انکا دیوان موجود تھا جو ۵۸۴ھ میں لیلی مجنوں کے تصنیف کے ساتھ ساتھ مرتب ہوا تھا اور اسکا ثبوت یہ کہ اونکو نظامی کے اس کلام سے ملا ہے۔

روزے بہ مبارکی و شادی — بودم بہ نشاط کیقبادی
ابروئے ہلالیم کشادہ — دیوان نظامیم نہادہ
آئینۂ بخت پیش رویم — اقبال بہ شانہ کردہ نویم
در حال رسید قاصد راہ — آورد مثال حضرت شاہ

اس سے معلوم ہوا کہ جسوقت شاہی قاصد مثنوی لیلی مجنوں کے لکھنے کے لئے حکم لایا تو یہ اپنا دیوان دیکھ رہے تھے یا مرتب کر رہے تھے۔

ان شہادتوں کے علاوہ بعض بیرونی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے نظامی کے دیوان یا کلام عاشقانہ کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبد القادر بدایونی نے نظیری کے حال میں لکھا ہے کہ اس نے شیخ نظامی کے قصیدے کے تتبع میں جسکا مطلع یہ ہے ؎

ملک الملوک فضلم بہ فضیلت معانی — زمی و زماں گرفتہ بمثال آسمانی

اسی طرح حضرت شاہ نعمت اللہ نے ۸۰۱ھ میں نظامی کے اسی قصیدے کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا ہے جسکا ایک شعر یہ ہے ؎

بجہاں کجا نظامی کہ بہ طیبتش بگویم — کہ من ایں ترانہ گفتم تو بگو اگر توانی

جامی نے بھی ایک غزل نظامی کی غزل کے جواب میں لکھی ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اُنکا دیوان موجود تھا۔ اور اُنکا کلام عاشقانہ قابل اتباع تھا۔

خود نظامی کے خمسہ میں بعض بعض شعر ایسے موجود ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشقانہ غزلیں کہتے تھے مثلاً

غزلہائے نظامی را غزالاں   زدہ بر زخمہائے چنگ نالاں

ایسے ایسے متعدد شعر اُنکی مثنویوں میں موجود ہیں جو تائید کرتے ہیں کہ وہ غزل کہتے تھے۔ اور خوب کہتے تھے۔ مولانا شبلی ان کے دیوان کی بابت شعر العجم میں لکھتے ہیں" پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے"۔ اس کے بعد دولت شاہ کا قول نقل کرتے اور تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں" تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انھیں کی بدولت وجود میں آئیں۔ لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں"۔ اگرچہ ہمکو مولانا کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے کہ اونکی غزلیں بیمزہ اور پھیکی ہیں۔ کیونکہ جس شخص سے عاشقانہ شاعری کا وجود ہوا۔ پھر اوسکے یہاں ایسے کلام کا پھیکا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر بھی مولانا کے اس قول سے ہماری اتنی تائید ہوتی ہے کہ نظامی کا دیوان موجود تھا۔ ہرچند کہ مولانا نے دیوان اپنی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور نہ بغیر دیوان کے دیکھے ہوئے یہ تنقید کرنے کا حق تھا۔ پھر بھی اتنی تائید بہت کافی ہے۔

مگر پروفیسر براؤن جو آخری دور کے ایک زبردست مستشرق اور کامل محقق تھے۔ ان سب شواہد کے باوجود بھی سب سے الگ ہیں۔ اور ان کو اس باب میں سخت تامل ہے کہ مثنویات کے علاوہ نظامی کا کوئی اور کلام بھی تھا۔ لطف یہ ہے کہ اُنکو ایک یہ بھی دھوکا ہے کہ اسی تخلص کے کئی شاعر گذرے ہیں جنھیں ممکن ہے کہ ہمارے غلط نویس تذکرہ نویسوں نے نظامی گنجوی سمجھا ہو۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نظامی کا کوئی دیوان تھا تو یہ بھی صحیح ہے کہ وہ مدت مدید سے بالکل معدوم اور نایاب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دولت شاہ جس کے یہاں سے متقدمین میں نظامی کے دیوان کی موجودگی ثابت ہوتی ہے غیر محتاط ہے مگر یہ خیال کرنا کہ ایسا نہ ہو نظامی عروضی کا دیوان اُنکے نام سے موسوم ہو گیا ہو۔ سخت غلطی ہے۔ نظامی عروضی کا کلام ہرگز نظامی سے مماثل نہ تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے غلطی سے مثنوی ویسہ ورامین کو مولانا نظامی سے منسوب کر دیا ہے۔ اور ہرگز باور نہیں کرتے کہ یہ کلام اوس نظامی کا ہو سکتا ہے جس نے سکندر نامہ کہا ہو، لطف علی آذر آتشکدہ میں لکھتے ہیں:-

"مثنوی حکایت ویسہ ورامین را بعضے بہ شیخ نسبت و بعضے بہ نظامی عروضی نسبت میدہند و بہ زعم فقیر اگر از منظومات جناب شیخ باشد ورا وایل حال کے کلام ہنوز پختگی بہم نرسانیدہ بود گفتہ بہرحال نظر بہ خمسہ شیخ را احتیاطی بآں نیست"۔

جب یہ حال ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ پورا دیوان ان سے منسوب ہو گیا ہو۔ یہ ایک نظری غلطی ہے۔ جس کا ثبوت خود کلام کو معائنہ سے ہو سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی تذکرہ نویس اونکے دیوان کا دیکھنا بیان نہیں کرتا۔ مگر اسکے یہ معنے نہیں ہیں کہ اُنکا دیوان ہی

نہ تھا۔ چنانچہ حال ہی میں معارف کے فروری ۲۰ء نمبر میں جناب قاضی اختر میاں جوناگڈھی نے اس جملہ کی تردید میں ایک زبردست محققانہ مضمون لکھا تھا جس میں سے اکثر باتیں ہم نے بھی اپنے مضمون میں استدلالاً پیش کی ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے کہ ہندوستان میں کوئی نسخہ دیوان نظامی کا موجود نہیں۔ البتہ آغا احمد علی کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جسکی نسبت وہ فرماتے ہیں۔

"نزد بندہ احمد یک موجود دیوان شیخ نظامی گنجوی محتوی بر قصائد و غزلیات و رباعیات عارفانہ کے تخمیناً بگی بالفد بیت خواہد بود موجود است و کتابخانہ ام را از و شرفی نامحدود۔"

اسکے علاوہ قاضی صاحب موصوف پروفیسر ہولسٹا کے تین نسخہ نظامی کے دریافت کرنیکی بابت بھی لکھتے ہیں۔ جس میں سے دو اکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں۔ اور تیسرا نسخہ ڈاکٹر اسپرنگر کے ذخیرہ کتب میں ہے جو اسوقت برلن کی پروشین نیشنل لائبریری میں موجود ہے۔

ان سب بیانات سے بھی پروفیسر براؤن کے قول کی تردید ہوتی تھی اور یوں بھی کہ اسوقت نظامی کا دیوان خود ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ نسخہ نولکشور پریس کے کتب خانہ میں موجود ہے اُسکے آخر دیوان میں یہ عبارت درج ہے۔

"دیوان حضرت اولیائے نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ در دارالخلافت شاہجہان آباد بہ اشتیاق تمام بہ سرعت بتاریخ دوازدہم ماہ اگست ۱۸۳۵ء روز دوشنبہ بخط پنڈت دہرم نرائن اختتام پزیرفت۔"

اس نسخہ میں ۷۳ صفحات ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد مصنف ہفت اقلیم کے دیوان سے بہت زیادہ یعنے نوسو پچاس ہے جس میں دس قصیدے ایکسو چھ غزلیں چار قطعے اور سینتیس رباعیاں شامل ہیں۔ خط نہایت پختہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کاتب نے یا تو عجلت کی وجہ سے نہایت ہی جلدی میں لکھا ہے یا غلطیاں جو رہ گئی ہیں۔ وہ منقول منہ کی خرابی کی وجہ سے ہیں۔ مطبع نولکشور کا کتب قدیم کے بارہ میں جو رویہ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ سینکڑوں ایسی ایسی نادرالوجود کتابیں طبع کی ہیں کہ اگر طبع نہ کیجاتیں تو آج انکا کہیں بھی نشان نہ ملتا۔ اس لئے اپنے علو ہمت سے مطبع کا خیال ہے کہ اس نایاب کتاب کو بھی شائع کیا جائے۔ مگر چونکہ اس میں غلطیاں ہیں۔ اور دوسرا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے اسواسطے سخت دقتیں لاحق ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ وہ حضرات جن کے پاس کوئی قلمی نسخہ دیوان نظامی موجود ہو اُس سے مطلع فرمائیں گے اور عاریتاً یا جسطرح ممکن ہو مرحمت فرمائیں گے۔ تعداد اشعار وغیرہ کو دیکھکر یہ نسخہ سب سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ مگر اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہی اصل دیوان نظامی ہے۔ کیونکہ اسمیں تمام وہ اشعار موجود ہیں جو مولانا نظامی کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

آخر میں ہم اس دیوان کے چند اشعار منتخب کرکے بتانا چاہتے ہیں کہ نظامی تغزل کے رنگ میں کس درجہ بلند تھے۔

با تو پدید می کنم حال تباہ خویش را — تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را

چوں ز نقاب برکشی روئے چو ماہ خویش را — عرضہ کنند عاشقاں حال تباہ خویش را

سفرے بسوئے ماکن گذرے بکوئے ماکن	نظرے بروئے ماکن زبرائے روز فردا
بزغمت چو من ہزارے بچنیں بلا وخواری	اگرم فرو گذاری من وکوہ و دشت صحرا

اے دیدہ ترا بما نظر نیست	اے عقل ترا بما گذر نیست
از دیدۂ و عقل تا چہ گویم	کاں رفت ز دوست وزاں اثر نیست
راضی نہ شود بہ دیں قدر نیز	جاں دادن اگرچہ مختصر نیست
بردار نظامیا دل و جاں	کایں جائے سکونت و مقر نیست

ہر آں کش را چنیں معشوق باشد	بہر دو عالمش خلوت مہیا است

اے پیک خجستہ یار چون است	من بیدلم آں نگار چون است
من بر سر آتشم شب و روز	آں نرگس آبدار چون است
اندر ہمہ عمر خود نپرسید	کاں شیفتہ را قرار چون است

تا بہ چہل سالگی زاہد پنہاں شدم	زاہد پیدا اکنوں کافر پنہانی است

بر ہمہ خستہ دلاں دادگری کردہ	چوں بہ نظامی رسید قصد دگرگوں چرا ست

رہ میخانہ و مسجد کدام است	کہ ہر دو بر من مسکیں حرام است

کردم سوالہا بامید از دہانِ تو	معذوری اے نگار کہ جائے جواب نیست
گفتی نظامیا ز غمت عافیت مباد	دل شاد میزیم کہ دعا مستجاب نیست

عاشقاں خوردند مے واں مفلساں گشتند مست	باش تا روز پسیں نوبت بہ ہشیاراں رسد

عمرے زجہاں قسمت من بے جگری بود
دیں آرزوئے عشق توام خیرہ سری بود
تو نیز دلم بردی و در پردہ نشستی
مقصود ت ازیں پردہ ہمیں پردہ دری بود

نام لبش شنیدہ ام خرقہ ازاں دریدہ ام
بادہ ناچشیدہ ہیں تا چہ خمار میکند

ہمہ جہاں ز تو در عافیت گناہم چیست
کہ از تو بر سر ما جز بلائی آید

داد من غم کشتۂ مسکیں بدہ از وصل
زاں پیش کہ ایں قصہ بہر انجمن افتد

بچشمہائے عزیزت نمی توانم گفت
کہ بے تو عمر عزیزم چہ خوار می گردد
سرکشی میکن کہ بارت می کشم
وز دل صافی غبارت می کشم
روزگارم می کشد در جور تو
جور او از روزگارت می کشم
مستم از عشقت کہ روشن بادہ است
لاجرم رنج خمارت می کشم

تدبیر کنم ہر شب تا دل ز تو برگیرم
چوں روز فرود آید مہر تو ز سر گیرم
پیش ازیں افتادہ ام در عشق خوباں چندبار
بر من مسکیں نگر کیں بار زار افتادہ ام
گفتی نظامیا بغم من صبور باش
در من کجاست صبر مگر از زبان تو
ہر جا کہ غمے بینی خواہی ز برائے من
ہر جا کہ دلے بینم خواہم ز برائے تو

از دست فراق تو کسے زندہ نماندہ است
پس باز چہ پرسیم کہ چونی و کجائی
اندر طلب عشق تو بودہ است نظامی
منعش مکن اے دوست کہ کاریست قضائی

آسی

زخمِ عشق

مدرسہ کے طلبا، روز شام کو واپسی کے وقت جبار کے باغ میں جاتے وہاں انکے کھیل کود اور ہر قسم کی دلچسپیوں کے کافی اسباب موجود تھے۔ یہ باغ نہایت وسیع، سر سبز اور شاداب تھا۔ اس کے دلکش اور دلفریب مناظر آنکھوں کو سرور اور دل کو فرحت و بہجت سے معمور کر دیتے۔ زمین پر سبز پودوں کی مخملی چادر بچھی تھی۔ جس میں رنگ برنگ کے پھول پتے جڑے تھے اس باغ میں چند عالیشان مکانات تھے۔ جن کے درمیان شفتالو کے درخت تھے۔ جو بہار میں خوشنما کلیوں اور خریف میں عمدہ اور لذیذ میوے سے لدے رہتے۔ درختوں پر ہر وقت چڑیوں کے چہچہے باغ کی رونق اور دلفریبی میں اور اضافہ کر دیتے۔ یہ چڑیاں دن بھر مصروف نغمہ و سرود رہتیں۔ درخت کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے اسطرح جھومتیں گویا چڑیوں کی نغمہ طرازیوں پر تالیاں بجا رہی ہیں۔ لڑکے بھی یہ دلفریب منظر دیکھ کر بیخود ہوجاتے اور حالت طرب میں ہر طرف چھلانگیں مارتے اور ایک دوسرے سے خوش خوش کہتے کہ ہمارے کھیل کود کے لئے کیسا اچھا مقام ہے۔

اسی باغ کا مالک جبار تھا جو اپنی ضرورت سے کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اسکی عدم موجودگی میں لڑکوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ ہر روز شام کو آتے اور بخوف و خطر باغ کی سیر کرتے، اس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور دلپسند گیت گاگا کر دل خوش کرتے۔ جبار سفر سے واپس آیا اور لڑکوں کو باغ میں کھیلتے دیکھکر غصہ سے بھر گیا اُس نے چیخ کر کرخت لہجہ میں کہا کہ تم لوگ یہاں کیا کرتے ہو۔ لڑکے یہ سخت آواز سُن کر سہم گئے اور سب نے بدحواسی کے عالم میں اپنا اپنا راستہ پکڑا، تھوڑے ہی دور گئے ہونگے کہ انکے کانوں نے ویسی ہی کرخت آواز سُنی کہ "کیا تم جانتے نہیں کہ یہ میرا باغ ہے۔ اسمیں ہرگز کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

چند ہی روز بعد اس نے باغ کے اردگرد ایک مضبوط حصار تعمیر کرا دیا اور دروازہ پر لکھدیا کہ "ہرگز کسی کو باغ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اسکی خلاف ورزی کرنے پر وہ مورد عتاب ہوگا"

جبار اپنی خودبینی اور خود نمائی سنگ دلی اور بے مروتی میں ضرب المثل تھا، اوسکا دل مخلوق کے رحم و محبت سے بالکل خالی تھا اب اسکے بعد لڑکے کھیل کود سے بھی محروم ہوگئے۔

بارہا اُنھوں نے ارادہ کیا کہ وہ راستہ یا سڑک پر اپنے کھیل جاری رکھیں، لیکن راستہ کی ناہمواری، ڈھیلوں اور کنکروں کی کثرت اور گرد و غبار انکے اس شوق میں سخت مزاحم تھے۔ وہ ہر روز مدرسہ سے واپسی کے وقت حصار کے

ارد گرد حسرت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے پھرتے اور گذشتہ آزادی کا تذکرہ نہایت غم و افسردگی سے کرتے۔

جاڑے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے، چڑیوں کے نغمے، درختوں کی شادابی، کلیوں کا دلفریب تبسم ہر طرف فصل بہار کی آمد آمد کی خوشخبری دے رہا ہے۔ لیکن جبار کے باغ پر ابھی وہی ویرانی اور وہی خزاں بدستور مسلط ہے کیونکہ باغ میں لڑکے نہیں ہیں۔ درخت کی شاداب شاخیں بھی خشک ہو رہی ہیں۔ پتوں اور کلیوں کا کہیں وجود نہیں۔ ایک خوبصورت کلی نے شگوفہ سے سر نکالا۔ لیکن دروازے کا اعلان پڑھکر لڑکوں کی محرومی اور حالتِ زار پر متاسف ہوئی۔ اور پھر منھ ڈھانپکر سوگئی۔ برف اور کُہر کو بہار کے نہ آنیکی بڑی خوشی تھی۔ وہ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے سے کہتیں کہ بہار اس باغ میں آنا بھول گئی اچھا ہوا مزے سے سال بھر ہمارا اسی باغ پر تسلط رہے گا۔

برف نے آرام سے اپنی سفید چادر تان دی اور درختوں کی شاخوں کو ڈھک لیا۔ اس خوشی میں بادصرصر کو بھی دعوت دی۔ اُس نے انکی دعوت قبول کی اور اپنی تباہ کن تیزی اور برودت کے ساتھ مسلسل گھنٹوں تک باغ پر مسلط رہی۔ برف اور کُہر کی دعوت پر بدلی نے بھی مسلسل تین روز اپنے دل کا بخار نکالا۔ پانی کی کثرت سے مکانوں کی دیواریں ہل گیئں۔ کھڑکیوں کے اکثر شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے۔ غرض بادصرصر کی ستم رانیوں سے جو ذخیرہ بچ رہا تھا وہ موسلا دھار بارش کی نظر ہو گیا۔

جبار کو آٹھ پہر فصلِ بہار کے انتظار میں گذرتے۔ ایک روز وہ حالت اضطراب میں اُٹھا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باغ پر ایک پُرحسرت نگاہ ڈالی۔ دیکھا کہ ہر طرف خزاں اور برف کا دور دورہ ہے۔ اُسکی زبان سے بے اختیار نکلا "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سال بہار کہاں غائب ہو گئی"۔ اُس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا "اب آنا ہی چاہتی ہے اے باغ صبر کر کیونکہ ہر خزاں کے بعد بہار اور ہر تکلیف کے بعد آسائش ہے"۔ لیکن بہار کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ عالم کے گوشہ گوشہ میں بہار آچکی تھی۔ درخت پتوں اور پھلوں سے آراستہ ہو چکے تھے، لیکن جبار کا ایک اکیلا باغ تھا جسکو بہار نے اپنے نظر کرم کا مستحق نہ سمجھا، کیونکہ جبار تند مزاج اور سنگ دل تھا۔ جاڑا اپنے پورے سازوسامان، برف، ٹھنڈ، بدلی اور ہوا کی تیزی کے ساتھ بدستور قائم رہا۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ جبار اپنی چارپائی پر غنودگی کے عالم میں پڑا ہوا تھا، اُسکے کانوں میں ایک دلکش اور سُریلی آواز آئی۔ جبار سمجھا شاید باغ کے کنارے سے گانیوالوں کا کوئی طائفہ گذر رہا ہے۔ لیکن یہ آواز گانے کی آواز نہ تھی، ایک چڑیا کی آواز تھی جو باہر ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی گا رہی تھی۔ اب جاڑا بھی رخصت ہو گیا، ہوا کی رفتار معتدل ہو گئی اور سارا مکان بھینی بھینی خوشبو سے معمور ہو گیا۔ جبار جلدی سے بستر سے اُٹھا اور کھڑکی سے سر باہر نکالا کہ "اب بہار ضرور آگئی ہے"۔ لیکن اس نے اپنے سامنے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا، جس کا اسے کبھی گمان تک نہ تھا۔ لڑکے جو باغ سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ ان سے رہا نہ گیا اور اُنھوں نے چہار دیواری کے ایک کمزور حصہ میں

نقب لگائی اور اندر داخل ہو کر باغ میں چھپ گئے۔ جبار کی نظر جس درخت پر پڑتی اُسکے نیچے ایک لڑکا نظر آتا۔

اُس نے دیکھا کہ باغ کے مکانات جوشِ محبت میں لڑکوں پر جھک پڑے ہیں۔ کلیاں شوق میں بیتابانہ باہر نکل آئی ہیں۔ درخت کی نرم شاخیں ان معصوم بچوں کو پیار کرنے کے لئے جھک پڑی ہیں۔ چڑیاں نیچے کی شاخوں پہ عالمِ بیخودی میں نغمہ سنج ہیں۔ لیکن ابھی تک باغ کا ایک گوشہ بدستور برف، ٹھنڈا اور خزاں کا شکار بنا ہوا ہے، اُسمیں ایک ننھا بچہ روتا اور شور کرتا ہے وہ درخت پر چڑھنے کے لئے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ لیکن چڑھ نہیں سکتا۔ درخت بھی برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور اُس پر تیز ہوا چل رہی ہے۔ درخت کو ترس آیا اُس نے اپنی شاخیں جھکا دیں اور لڑکے سے نہایت ترنم ریز لہجہ میں کہا۔ آ! آ! اے پیارے بچے آجا۔ میری گود میں آجا۔ لڑکے نے پھر اپنے ننھے ہاتھ اوپر کئے اور شاخیں پکڑنے کا ارادہ کیا لیکن پہونچ نہ سکا۔

جبار دور سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا اوسکا دل نرم ہو گیا۔ اسکے دل میں رحم و محبت کا جذبہ موجیں لینے لگا اُس نے کہا میں کتنا سخت اور سنگ دل ہوں میں کتنا مغرور اور خودبیں ہوں۔ آج مجھے بہار کی تاخیر کا سبب معلوم ہوا افسوس میں نے اپنی ساری عمر گناہوں میں بسر کی۔ مجھے اب اسکا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ میں جاؤں اور معصوم بچے کو درخت پر چڑھا دوں۔ چہار دیواری بھی منہدم کرادوں اور باغ کو بچوں کے لئے وقف کردوں وہ اسمیں جو چاہیں کریں۔ دل میں یہ باتیں کہیں اور مکان سے نکلکر تیزی سے باغ کی طرف چلا لیکن لڑکے اسے دیکھتے ہی چلائے اور بھاگ گئے اور اُنھیں کے ساتھ بہار بھی اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی اور کچھ دیر کیلئے پھر خزاں کا دور دورہ ہو گیا۔

باغ میں سوائے اس ایک چھوٹے لڑکے کے کوئی باقی نہیں رہا۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اسی لئے وہ جبار کو نہ دیکھ سکا۔ جبار تیزی سے جھپٹ کر لڑکے کے پاس پہونچا۔ اور اسکو پیار سے سینہ سے لگا لیا اور درخت پر چڑھا دیا۔ اس کے چڑھتے ہی درخت پتوں اور کلیوں سے لد گیا اور اس کے پاس کی فضا طیور کی نغمہ طرازیوں سے معمور ہو گئی۔

لڑکوں نے جب یہ ماجرا دیکھا انکو خیال آیا کہ جبار اب اپنی شرارت اور سنگدلی سے باز آ گیا۔ سب کے سب پھر باغ میں واپس آئے اور انھیں کے ساتھ ساتھ بہار بھی اپنی سرسبزی اور چمک دمک کے ساتھ واپس آئی۔

جبار نے لڑکوں کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور منت سماجت سے کہا کہ میرے پیارے بچو! اب یہ باغ تمہارا ہے۔ اب تمھیں کوئی روک نہیں سکتا۔ اب تم اس میں جو چاہو کرو، وہ ایک کُدال لیکر اُٹھا اور چہار دیواری بھی منہدم کرادی۔

راہرو باغ کے کنارے کے راستے سے گذرتے اور اس ناگہانی انقلاب پہ حیرت زدہ ہوجاتے۔ چہار دیواری اب منہدم تھی۔ جبار لڑکوں میں ٹہل رہا تھا اور اس کا رشک فردوس باغ بچوں کی حکومت میں تھا۔ لوگ باغ کا منظر دیکھتے اور مبہوت ہوجاتے۔ اس سے پہلے انکو باغ کی سرسبزی، شادابی، رونق اور دلکشی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہونے کا

اقرار تھا لیکن اب انھیں نظر آیا کہ چھوٹے بچوں کی وجہ سے جو تازہ حسن و جمال اسمیں ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔

آج لڑکوں کی تعطیل کا دن تھا وہ دن بھر کھیل کود میں مشغول رہے۔ شام کو گھر جانے لگے تو جبار کے پاس سلام کے لئے گئے۔ جبار کا دل اس چھوٹے بچے کی محبت سے معمور تھا ان سے دریافت کیا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ مجھے نظر نہیں آتا سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور یک زبان ہوکر کہا کہ اس سے قبل ہم نے اسکو دیکھا بھی نہیں۔ نہیں جانتے وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں گیا۔ جبار اُسکی محبت میں سرشار تھا وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا اسکا دم گھٹنے لگا۔ زبان رُک گئی۔

لڑکے روزانہ شام کو باغ میں آتے۔ انکے ساتھ جبار بھی کھیل کود میں دلچسپی لیتا اگرچہ وہ سب لڑکوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتا۔ لیکن اُس کی آنکھیں اُسی ایک کی تلاش میں بیتاب تھیں۔ اُسکا دل اُسی ایک کے پالینے کی تمنا رکھتا تھا دل میں کہتا (کاش اُسے دیکھ لیتا) اُسی اضطراب اور بے چینی میں جبار نے کئی سال بسر کئے اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا اُسکے اعضاء میں اضمحلال آگیا تھا اب اس میں پہلی سی طاقت باقی نہ تھی۔ اب وہ لڑکوں کے کھیل میں بھی شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ جاتا اور انکا کھیل دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دل میں کہتا کہ اگرچہ باغ میں عمدہ عمدہ پھول۔ شاداب پتے خوشنما کلیاں اور طرح طرح کی زینت کے سامان موجود ہیں لیکن لڑکے ہر زینت سے بڑھ کر ہیں۔ بہار کا زمانہ تھا جبار سو کر اُٹھا اور کپڑے بدلکر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوکر باغ کی سیر میں مشغول ہوگیا۔ اسوقت اس پر نشاط اور کیف کا عالم طاری تھا اسے چھوٹے سے چھوٹے رنج و الم کا بھی کھٹکا نہ تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ بہار کا زمانہ نشاط و شادمانی کا زمانہ ہے۔ دفعتاً اسے ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا اُسنے پریشانی کے عالم میں اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ اسے اُسی پہلے گوشہ میں ایک درخت نظر آیا جو سفید خوبصورت کلیوں سے لدا ہوا تھا۔ اسکی نرم و نازک شاخوں پر پھل لٹک رہے تھے اور اسکا وہی کمسن محبوب درخت کے نیچے پھل چننے میں مشغول تھا اسے دیکھتے ہی جبار بجلی کی طرح ایک لمحہ میں باغ کو طے کرکے اُس کے پاس پہونچا۔ اُسے لڑکے کے ہاتھ اور پیر زخمی نظر آئے یہ دیکھ کر وہ بیتاب ہوگیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ زور سے چیخ لگائی اور کہا "یہ زخم کیسے ہیں"؟ اُس نے مکرر سوال کیا یہ زخم کیسے ہیں؟ جلد بتا تاکہ اُس ظالم کے خون سے دل کو تسکین دوں لڑکے نے جواب دیا" یہ زخم عشق کا زخم ہے"!

جبار اس جواب سے تھرا اُٹھا اور لڑکے کے سامنے زانو ٹیک کر پوچھا آپ کون ہیں؟ لڑکے نے ہنستے ہوئے نرم لہجہ میں جواب دیا" تم نے مجھے اپنے باغ میں کھیلنے کی اجازت دی اب میں تم کو اپنے باغ یعنے جنت میں لیچلونگا"!

شام کے وقت لڑکے باغ میں آئے۔ اور جبار کو اُسی درخت کے نیچے سفید کلیوں سے ڈھکا ہوا مردہ حالت میں پایا۔ (ماخوذ)

شیر محمد اصلاحی

باب المراسلة والمناظرہ

(جناب سید جعفری صاحب ۔ کامٹی)

آپ نے بلقیس رعنا کے خطوں کا جواب دیتے ہوئے ایسی پُر لطف چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ اسکو دیر تک جاری رکھنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ اب نہ انکے خطوط نگار میں شائع ہونگے اور نہ آپکا جواب میں آپ کے اس فیصلہ سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ جب اُنکے خطوط ایسے اُمور پر مشتمل ہوتے ہیں جنکا تعلق پبلک سے ہو سکتا ہے۔ اور صرف ذاتیات سے بحث نہیں ہوتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انکو شائع نہ کیا جائے۔

میں جناب بلقیس رعنا سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس خیال کو ترک کردیں اور آپ سے بھی یہی التجا ہے کہ ایسا نہ کیجئے ، کیونکہ میں آپ کے ہر لفظ کو خواہ وہ کیسی ہی خلوت کا کیوں نہ ہو، ملک عام سمجھتا ہوں۔

(نگار) آپ ہی کیطرح اور بعض احباب نے بھی اس سلسلہ کو نگار میں شائع کرنیکی رائے دی ہے اور بعض نے مخالفت بھی کی ہے۔ لیکن موافق و مخالف دلیلوں میں سے کسی کو سامنے نہ رکھتے ہوئے میں دونوں جماعتوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی تک ان دو خطوں کے علاوہ اور کوئی تحریر میرے پاس نہیں آئی کہ اُسکی اشاعت یا عدم اشاعت کا سوال پیدا ہوتا۔ لیکن اگر آیندہ کوئی خط موصول ہوا تو میں اُصولاً اُسکی اشاعت نہیں کر سکتا جبتک اسکا لکھنے والا اس پر راضی نہ ہو۔ میں اس باب میں نہ جناب بلقیس رعنا سے کوئی مراسلت کرنا چاہتا ہوں اور نہ اسکو "چھیڑ چھاڑ" سمجھکر لطف لینے والوں کے لئے اشاعت پر اصرار کر سکتا ہوں۔

میرا مسلک اس باب میں بالکل وہی ہے جو فطرت کا ۔ بلورات ثلجی (Snow crystals) کی تعمیر میں ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ہوگا اُسی خصوصیت کے ساتھ، اسی تزئین و تحسین کے ساتھ ورنہ نہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہدیا کہ وہ لوگ جنکی سنجیدگی میری اس نوع کی تحریروں کو بھی پسند نہیں کرتی، وہ اپنی جگہ مایوس ہو جائیں اور جو اس روش کو پسند کرتے ہیں وہ میری طرف سے مطمئن ہوکر اُسوقت کا انتظار کریں جب "بلقیسیات" کی یاد تازہ کرنیوالی کوئی تحریر "لغرض اشاعت" میرے پاس آئے۔

یہ بھی کسقدر عجیب و غریب واقعہ ہے کہ مردوں کا ایک گروہ مجھے عورت کا پرستار کہتا ہے اور برہم ہے۔ دوسری طرف عورتوں کی ایک جماعت مجھے بقول ایک خاتون کے "عورت بیزار" کہتی ہے اور چیں بر جبیں ہے وہ اس لئے کہ نسائیات

عرصہ تک میرا موضوع گفتگو رہا ہے اور یہ اس بنا پر کہ میں اُنکے افسانہ نگاری و غزل سرائی کو پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ حقیقت اس زیادہ نہیں کہ میں انسان ہوں اور اُن تمام "کمزوریوں اور قوتوں" کے ساتھ، جو ایک انسان میں پائی جاتی ہیں، اگر میں عورت کے ذکر پر بے قابو ہو جاتا ہوں، تو زیادہ سے زیادہ آپ اسکو میرے احساس کی قوت کہہ سکتے ہیں اور اگر میں اُن کے "معشقیات" کی عریانی کو پسند نہیں کرتا تو اس کو میری "اخلاقی کمزوری" کہئے کہ اسطرح اُنکے حدود انسانیت سے گذر جانیکا مخالف ہوں

بہرحال جو سبب بھی ہو، اس کیفیت سے میں ناخوش نہیں ہوں، بلکہ اسوقت سے ڈرتا ہوں جب جماعت اول کی "خوشی" مجھے صرف "تہجد گزار" بنا کر میرے خواب صباحی کی شیرینی کو مجھ سے چھین لے اور جماعت ثانی کی موافقت مجھے اخلاق کے اس درجۂ انحطاط پر پہونچا دے جہاں انسانیت نام "عمرانیت" کا نہیں بلکہ "حیوانیت" کا ہے۔

(جناب محمد ذکی صاحب۔ لاہوری گیٹ امرتسر)

دنیا آپ کی کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو، لیکن ایک وقت آئیگا جب آپ کے خیالات کی قدر کیجائیگی اور لوگ سمجھیں گے کہ حقیقت وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن معاف فرمائے اگر میں آپ کی اس کمزوری کا ذکر کروں جس نے آپ کو ایک جگہ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کیا ہے اور آپ کو مختلف مقامات پر جا کر اپنے مشن کی تبلیغ سے باز رکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ میں ہمیشہ ہر مصلح کی مخالفت ہوئی ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے، کہ کبھی کسی مصلح نے مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ اس لئے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ تحریروں کے علاوہ تقریروں سے بھی آپ اپنے خیالات کی اشاعت کیجئے اور یہ غالباً آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہونگے کہ

وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

(نگار) آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب "می گویم و بعد از من گویند بدستانہا" کی عام کیفیت زمانہ میں پیدا ہو جائے گی، اور جس تیزی کے ساتھ انسانی ذہنیت میں انقلاب رونما ہو رہا ہے وہ ممکن ہے کہ ہماری آپکی زندگی ہی میں اس حقیقی شرف و امتیاز کو قائم کر دے جس پر ایک انسان فخر کر سکتا ہے، لیکن آپ کا مجھے مصلح کے لقب سے یاد کرنا، حقیقتاً غلط تعبیر ہے۔ مجھ میں مطلقاً اسکی صلاحیت نہیں ہے اور نہ یہ "کار عظیم" میرے بس کا ہے۔ اس میں کوئی مولویانہ یا شاعرانہ "انکسار غرور آمیز" شامل نہیں ہے۔ بلکہ بالکل حقیقت و واقعیت کا اظہار ہے۔

میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے دل کی بے ساختہ پکار ہے، میری روح کی دردمندیوں کی ناقابل ضبط فریاد ہے جس کو زیادہ سے زیادہ "درماں طلبی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، میں خود جستجو کی منزل سے باہر نہیں نکلا، دوسروں کے لئے دلیل راہ کیا بن سکتا ہوں، میں بہت درماندہ و عاجز ہوں، بہت بے مایہ و کمزور ہوں۔ اور یہ غالباً آپ کو بھی معلوم ہوگا۔

کہ سلطاں نخواہد خراج از خراب

پھر آپ کے مطالبہ کو میں کیونکر پورا کرسکتا ہوں اور کس طرح مجھ میں وہ مصلحانہ جرأت پیدا ہوسکتی ہے جس کا ذکر آپ نے اپنی تحریر میں کیا ہے۔

میرے حالات کا اقتضا نہیں ہے کہ میں مختلف مقامات میں جاکر اپنی آواز لوگوں تک پہونچاؤں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ مجھ میں وہ "جرأت رندانہ" نہیں ہے جو "فکر فضول" کے ساتھ مل کر ایک انسان کو نا شناب بنا سکتی ہے لیکن میرے نزدیک اسکی بڑی وجہ وہی ہے جسے میخواروں کی اصطلاح میں "نارسائی بادہ" کہتے ہیں۔ یہ تو ہوا حقیقت کا اظہار۔ لیکن اگر میں شاعری کرنے پر آؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کے نزدیک وہ وقت نہیں ہے کہ "درخانہ نشینی بیکار" تو میرے نزدیک یہ قرین مصلحت نہیں ہے کہ "از پردہ بروں افتد راز" فی الحال خاموش رہیے، جس وقت میں مصلحانہ ادعا، مہدیانہ دعوت اور پیغمبرانہ عزم کے ساتھ اٹھوں گا تو جناب کے حواریین کی فہرست میں سب سے پہلا نام آپ کا ہوگا۔

باب الاستفسار

سندھ میں عربی حکومت کا نشو و زوال
عہد بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ
اور
مقام قندہار کی تعیین

(جناب سید اکبر حسین صاحب۔ شاہ گنج۔ الہ آباد)

میں آجکل تاریخ ہند کا مطالعہ کر رہا ہوں اور بعض مسائل میں آپ کی رہبری کا طالب ہوں۔ بہ لحاظ اختصار میں اپنے سوالات کی تعیین علیحدہ علیحدہ کئے دیتا ہوں۔

(۱) سندھ میں عربی حکومت کا آغاز کیونکر ہوا۔ اس کے مدارج ترقی کیا تھے اور زوال کیونکر ہوا؟

(۲) حقیقی معنی میں اسلامی حکومت ہند کب سے شروع ہوئی۔

(۳) اگر کوئی شخص حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا مطالعہ اصلی ماخذوں سے کرنا چاہے تو اُسے کن کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیئے اور ان کتابوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟

(۴) سندھ کی ابتدائی فتوحات میں ایک مقام قندہار کا بھی ذکر آتا ہے۔ کیا اس سے مراد موجودہ قندہار ہی ہے؟

(نگار) ہر چند آج کل مجھے وہ سکون دلجمعی میسر نہیں ہے، جو آپ کے اس اہم مجموعۂ استفسارات کا جواب دینے کے لئے حاصل ہونا چاہیئے، تاہم کوشش کروں گا کہ اس حالت بے اطمینانی میں بھی کسی حد تک آپکو مطمئن کر سکوں۔

رحلت نبوی کے بعد بیس سال کے اندر اہل عرب نے جس تیزی کے ساتھ، شام و فلسطین، مصر و ایران کو زیر کر کے حکومت اسلام وہاں قائم کر دی، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ ہر چند ہمارے موضوع سے یہ بحث بالکل جدا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے عرب کے دشتیوں میں یہ شاہانہ عزم پیدا کیا اور وہ کیا انقلاب ذہنی تھا جس نے پست و جاہل قوم کو یکا یک اس قدر زبردست ولولۂ عمل سے لبریز کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب پہلی صدی ہجری میں اہل عرب تمام قدیم دنیا میں منتشر ہو گئے تو اُنھوں نے اپنے مقبوضات وسیع کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا اور اُسوقت تک وہ اپنے فاتحانہ اقدام سے باز نہیں آئے، جبتک خود فطرت نے ان کے سامنے ناقابل تسخیر حجابات پیدا نہیں کر دیئے۔ وہ شمالی افریقہ میں پھیل گئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کہاں جا کر ٹھہرتے اگر خشک و گرم ریگستان ان کے سامنے حائل نہ ہو جاتا، اسی طرح اُنھوں نے جب ہسپانیہ کو زیر نگیں کیا تو اپنی حدود سلطنت وسیع کرنے کے لئے اسوقت تک برابر مضطرب رہے، جبتک بحر اٹلانٹک کی موجوں نے انکے سامنے خط فاصل نہیں کھینچ دیا۔ بالکل یہی صورت مشرق میں پیش آئی کہ وہ فارس کو فتح کر کے آگے بڑھے اور اگر ہندو کُش کی برف پوش سنگین دیواریں سامنے نہ ہوتیں تو سرزمین ہند تک ان کا پہونچ جانا یقینی امر تھا۔

ہر چند اہل عرب ان دولتوں سے آگاہ نہ تھے جن سے سمندر کی گہرائیاں مالامال ہیں، تاہم وہ مغربی ہند کے سواحل سے بیخبر نہ تھے، جہاں زمانۂ قدیم سے عرب تاجروں کی آمد و رفت پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ خلیج فارس کو عبور کر کے دریائے سندھ کے دہانہ تک اور وہاں سے سپرا، کمبایت اور کبھی کبھی کالی کٹ اور ساحل مالابار کی بندرگاہوں تک پہونچ جاتے تھے۔

اس سے مدعا یہ ہے کہ اہل عرب ہندوستان سے ناواقف نہ تھے اور تجارتی تعلق ان دونوں ملکوں کے درمیان پہلے سے قائم تھا جس میں کوئی ملوکانہ اقدام شامل نہ تھا۔ سب سے پہلی فوجی مہم ساحل ہند پر [۱۵] ھ میں خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں روانہ کی گئی، جو بمبئی کے قریب تھانہ[۵۱] پر قابض ہو کر بھروچ[۵۲] تک پہونچ گئی تھی۔

چونکہ خلیفۂ دوم اسکو پسند نہ کرتے تھے کہ اہل عرب اپنے ملک سے بہت دور رہکر وہیں کے ہو جائیں اس لئے اُنھوں نے بحری تاختوں کو ممنوع قرار دیا اور تھانہ و بھروچ کی یہ مہم بے مقصد ہو کر رہ گئی۔

خلیفۂ ثالث (عثمان غنیؓ) کے زمانہ میں حکیم بن جبلہ ہند و سندھ کا حال دریافت کرنے کیلئے مامور کئے گئے۔ لیکن انھوں نے ایسے مایوس کُن حالات بیان کئے کہ اسطرف بڑھنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

عہد خلیفۂ چہارم (جناب امیرؑ) میں البتہ ایک مہم آخر [۳۸] ھ میں روانہ کی گئی جو کوہ قیقان[۵۳] تک پہونچی اور حارث بن مرہ

---

۵۱ بلاذری نے اس مقام کا نام تانہ لکھا ہے۔

۵۲ معجم البلدان میں بھروچ کو بروج اور بروص لکھا ہے۔

۵۳ بلاذری کی تحقیق ہے کہ قیقان سندھ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔

یادِ ایّام

(۱)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا! کہاں وہ دن کہ جب دل میں تڑپ تھی!
تصوّر محوِ حیرت تھا فلک پر! تخیّل کی عناصر سے جھڑپ تھی!

(۲)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا! کہاں وہ دن کہ جب دل میں ضیا تھی!
گدائے نور تھے انجم مہ و مہر! خدا جانے وہ شمعِ بزم کیا تھی!

(۳)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا! کہاں وہ دن کہ جب دل میں سحر تھی!
حریمِ ناز تھی میری کفِ خاک! شبِ دیجور کی کس کو خبر تھی!

(۴)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا! کہاں وہ دن کہ جب دل میں خلش تھی!
مرے نالوں میں تھا اک عالمِ سوز! رگِ جانِ حزیں وقفِ تپش تھی!

امین حزیں

اک لمحۂ حیات!

اُن کے ہونٹوں پر تبسم ہو نہایت بے حجاب ہو گیا شاید مرا حالِ تباہی کامیاب
یہ مری مایوسیاں اور اس قدر ہنگامہ خیز یہ مری ناکامیاں یا رب! اور اتنی کامیاب
میں اس اک لمحے کو عمرِ جاوداں سمجھا کیا جس میں آیا اور رخصت ہو گیا عہدِ شباب

ساغر (نظامی)

غزلیات

(اظہر نعمانی)

تابکے اے ہم نفس خونِ تمنا کیجئے　　بیزباں بن جایئے اور ان کو دیکھا کیجئے
گھٹ رہی ہے گوشۂ دلمیں تمنائے جمال　　آپ یوں مشتاق نظروں سے نہ پردا کیجئے
تابِ نظارہ کہاں ہے صورتِ چشم کلیم　　محوِ حیرت کو نہ ممنونِ تماشا کیجئے
المدد اے نالۂ دل ضبط کی حد ہو چکی　　خود بھی رسوا ہو جیئے اُنکو بھی رسوا کیجئے
ہے ترحم کی ادا طرزِ تغافل کے خلاف　　وعدۂ باطل کو کیوں مرہونِ ایفا کیجئے
عرضِ مطلب سُنکے پڑجاتی ہو ماتھے پہ شکن　　روبرو اُنکے نہ چپ رہیئے تو پھر کیا کیجئے
خود سکونِ قلب وجہ انتشار قلب ہے　　زندگی بے کیف ہے پھر درد پیدا کیجئے

حیلہ جوئی ہے شعار اُنکا تو اظہر کس لئے
انتظار وعدۂ امروز و فردا کیجئے

(جگر بریلوی)

لیجئے تابانیٔ عالم کے ساماں ہو گئے　　دل کے ذرے اُڑکے ہر جانب پریشاں ہو گئے
فرطِ تنہائی سے مرجانا تو کچھ مشکل نہ تھا　　کیا کہیں غم سے مگر کچھ عہد و پیماں ہو گئے
اب میں سمجھا سینۂ سوزاں کے شق ہونیکا راز　　آپ پنہاں کیا ہوئے گویا نمایاں ہو گئے
جن کو ہونا ہی نہ تھا راہِ محبت میں غبار　　کسطرح وہ خاک کے پتلے پھر انساں ہو گئے
صحبت احباب میں حاصل ہوا وہ لطفِ زیست　　آج ہم بھی قائلِ فردوسِ رضواں ہو گئے
حسن نے روزِ ازل جب رُخ سے سرکائی نقاب　　چند جلوے رنگ بنکر بزمِ امکاں ہو گئے

رفتہ رفتہ آرزوئے رستگاری مٹ گئی
رہ کے زنداں میں جگر آزادِ زنداں ہو گئے

(سنجر عظیم آبادی)

بیدار کر تو جلوۂ بے انتہا سے مجھے
ہے خواب زندگی ستم ناروا مجھے

اے کیف بیخودی ترے صدقے ہزار ہوش
رگ رگ میں پھر رہا ہی کوئی ڈھونڈھتا مجھے

دہرا رہا ہوں قصۂ ہستی کو بار بار
ملتا نہیں ہے دہر میں میرا پتا مجھے،

ہر شوق بزم ناز میں ایذا پسند ہے
مرنے نہ دیگی حشر میں تیری ادا مجھے

وہ صورت مجاز میں شاید ہو جلوہ گر
اے دل اسی امید پہ جینا پڑا مجھے

دلتنگی زمانہ سے امیدواریاں
اس وسعت خیال نے رسوا کیا مجھے

صبح وطن کے جلوۂ پنہاں ہیں منتشر
کس نے یہ خواب زیست سے چونکا دیا مجھے

حیراں کئے ہے محفل ہستی میں ایک ایک
سنجر یہ عکس آئینہ خود نما مجھے

(شاد صابری)

نہ پہونچا ہے نہ پہونچیگا تصور تک ہاں اپنا
جہاں جلووں میں نظریں ڈھونڈھتی ہیں آشیاں اپنا

اگر ملتی مجھے آزادی فکر تصور بھی
قفس کے سامنے تعمیر کرتا گلستاں اپنا

نہ دے تکلیف اظہار حقیقت اے دل ناداں
میں جبکہ راز ہوں وہ آپ ہی ہیں رازداں اپنا

وہیں کھولی ہو چشم ضبط میری سوزش دل نے
مقید تھا جہاں نظارۂ جوش نہاں اپنا

فضائے لامکاں تو آگئی، پرواز اب کبتک
دکھا اے طاہر حسن تصور، آشیاں اپنا

ضعیفی نے مٹا دی طاقت و تاب و تواں بالکل
کہاں لوٹا گیا اللہ اکبر کارواں اپنا

در مقصود پر لاکھوں سجود شوق ادا کرکے
جبین شوق کو اے شاد سمجھا آستاں اپنا

(شباب بدایونی)

کیا سمجھکر شکوہ سنج اضطراب دل ہوں میں،
ناز ہے مجھکو کہ جور دوست کے قابل ہوں میں

کام آتی ہیں زمانے کے مری ناکامیاں
دیدۂ عبرت طلب کی سعی کا حاصل ہوں میں

دیکھ یہ آنکھوں سے ٹپکے اشکِ خوں اے چارہ گر
ترکِ عشق اچھا ہے لیکن کیا اب اس قابل ہوئیں؟

کم نگاہی نے تری کھویا مگر ذوقِ نظر
یوں تو ہونے کے لئے ہوں اور سرِ محفل ہوئیں!

کیا کہوں کیا کیا تھپیڑے دے رہی ہے موجِ غم
آکے ساحل پر بھی وقفِ حسرتِ ساحل ہوئیں

ایک مجبورِ الم کی ہائے یہ ناکامیاں
جان دینے کو بھی وقفِ منتِ قاتل ہوئیں

چارہ گر اب درد کو حد سے گزر جانے بھی دے
رحم کر مجبور کہ جو باعثِ سکونِ دل ہوئیں

بیش و کم اب کس لئے راہِ طلب آسان ہے
مژدہ اے دل بے نیازِ خطرۂ منزل ہوئیں

ہو بھی تو دل سے کوئی سرگرمِ سعیِ جستجو
دل اُٹھے شوقِ طلب خود رہبرِ منزل ہوئیں

بے وفا سے کر رہا ہوں شکوۂ فرقت شباب
وائے ناکامی کہ محوِ سعیِ لاحاصل ہوئیں

(سید محمد عمر شمس حیدرآبادی)

فلک بھی کانپتا ہو جس سے میں وہ آہِ بسمل ہوں
مری فریاد سے ڈرنا کہ میں ٹوٹا ہوا دل ہوں

مری وارفتگی ہی میری بربادی کا باعث ہے
میں اپنے حق میں گویا خود ہی اک زہرِ ہلاہل ہوں

سراپا اک نگاہِ یاس ہوں اس بزمِ ہستی میں
نہ اُبھرا جو کسی صورت سے وہ بیٹھا ہوا دل ہوں

حیات اور موت کی تصویر ہے رودادِ الفت کی
کبھی زندوں میں شامل ہوں کبھی مردوں میں داخل ہوں

عجب پُر کیف حالت ہے کہاں جھگڑے من و تو کے
بھلا دے دل سے جو دنیا کو وہ محویتِ دل ہوں

خود ہی نے پردۂ غفلت مری آنکھوں پہ ڈالا ہے
مآلِ کار سے جو بے خبر ہے میں وہ غافل ہوں

نہ تابِ ضبط ہے دل کو نہ یارائے فغاں مجھ میں
ورائے کاروانِ یاس ہوں، گم کردہ منزل ہوں

اُمیدیں مجھ سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہیں حسرت سے
میں اس بحرِ حوادث میں لبِ خاموشِ ساحل ہوں

یہ ہستی شمس میری کیا سراپا ننگِ ہستی ہے
نہ میں دنیا کے لائق تھا نہ میں عقبیٰ کے قابل ہوں

(قیس شیروانی)

راہِ الفت میں سکوں کیسا کہ منزل دور ہے
ہاں ابھی انجامِ کارِ حسرتِ دل دور ہے

ہو نہ جائے کشتیِ دل رہنِ گردابِ فنا
موجزن دریائے بیتابی ہے ساحل دور ہے

یہ فریبِ جذبِ دل ہے یا طلسمِ آرزو
جان سے نزدیک ہوتے ہیں مگر دل دور ہے

حسرتِ دل رہروانِ عشق کی ہے دیدنی
راستہ ہمت شکن ہے اور منزل دور ہے

کیوں ہجوم یاس و حسرت گوشہ گیر دل نہ ہو
قطع ہے دستِ طلب دامانِ ساحل دور ہے

قیس ہے دامن کشاں بیہودہ لیلائے اُمید
جبکہ آوازِ جرس کہتی ہے محمل دور ہے!

(محمود الہ آبادی)

ہاں جنوں انگیز اتنا نعرۂ مستانہ تھا
ذرے ذرے میں جہاں کے کیفِ مجنونانہ تھا

اضطرابِ دل سے میرے پاؤں تک اُٹھتے نہ تھے
میں کھڑا تھا سامنے اور داورِ جانانہ تھا

اُسکے ایک اک لفظ پر سب اہلِ دل روتے رہے
درد و غم میں اسقدر ڈوبا ہوا افسانہ تھا

روح کو کیونکر پلاتا بادۂ ذوقِ نشاط
ساغرِ دل میرا اک ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

ذرہ ذرہ کر رہا ہے رقص بزمِ دہر کا
اللہ اللہ کس بلا کا نعرۂ مستانہ تھا

یہ بھی اک اعجاز تھا محمود وحشت کا مری
جسطرف آنکھ اُٹھ گئی ویرانہ ہی ویرانہ تھا

(ناطق جیلانی گلاوٹھوی)

ہمیں جو یاد ہے ہم تو اُسی سے کام لیتے ہیں
کسی کا نام لینا ہو اُسی کا نام لیتے ہیں،

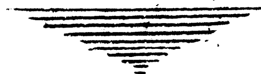
ابھی ہم جان دیکر سوئے ہیں دم لیکے اُٹھینگے
نہ چھیڑ اے شورِ محشر ہٹ ذرا آرام لیتے ہیں

نکل جاتے ہیں جب وہ ہاتھ آکر کیا کہیں دل کی
نکل جاتا ہے جب دامن کلیجہ تھام لیتے ہیں

کسی نے کیا کہا ہم کیا بتائیں یہ تو دنیا ہے
ہزاروں نام رکھتے ہیں ہزاروں نام لیتے ہیں

نہیں لینا ہے کچھ جا کر اگر بازار ہستی میں
تو اچھا لاؤ دیدہ و ہم دل ناکام لیتے ہیں

غضب ہے ناکہ اُن کو شرم بھی آتی نہیں ناطق
ڈبو کر نام جو اپنے بڑوں کا نام لیتے ہیں،



مطبُوعاتِ موصُولہ

موجِ تبسم

جناب شوکت تھانوی کے بعض مضامین کا مجموعہ ہے جسے بجائے "طوفانِ تبسم" یا "سیلابِ تبسم" کے "موجِ تبسم" کے نام سے جناب نسیم انہونوی نے شائع کیا ہے۔ ممکن ہے لفظ موج کی تعیین کی نسیم صاحب نے خود اپنے نام کی لطافت و نزاکت کا لحاظ رکھا ہو۔

شوکت تھانوی اُن چند مخصوص مزاحیہ نگاروں میں سے ہے جن کے ذکر سے اُردو لٹریچر کی تاریخ خالی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو مزاح شوکت کے مضامین میں پایا جاتا ہے وہ ایسا نازم، لطیف و سُبک ہے کہ کسی اور جگہ پایا ہی نہیں جاتا۔

جس طرح شاعر پیدا ہوتا ہے اُسی طرح مزاحیہ نگار بھی بنتا نہیں۔ لیکن اُسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جسطرح ایک شاعر فرطِ احساس یا ماحول کے اثرات سے بگڑ کر مرثیہ گو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مزاحیہ نگار بھی ادنے ابے احتیاطی سے مسخرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ ملک کے موجودہ مزاحیہ نگاروں میں سے بعض اسی مصیبت میں مبتلا نظر آتے ہیں جسطرح بعض لکھنوی غزل گو، مرثیہ نگاری کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

مزاحیہ نگاری حقیقتاً تنقید کی ایک قسم ہے اور میرے خیال میں بہترین قسم کی ہے۔ چونکہ اس رنگ کے لکھنے والے کی "تلخ گفتاریاں" ہمیشہ خوشی سے برداشت کر لیجاتی ہیں۔ اس لئے "شخص مجروح" کو بھی سمجھنے اور انصاف کرنے کا موقعہ ملجاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں نہیں پہونچتی۔

مزاحیہ نگاری حقیقتاً ایک مستقل موضوع ہے، جس پر اصولاً، تاریخاً اور روایتاً بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن اس کا موقع موجِ تبسم کے تنقید کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ تاہم اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوکت تھانوی کی یہ کتاب آپ جس نگاہ سے بھی دیکھیں گے قابلِ قدر نظر آئے گی۔

ہر چند نگار میں اسوقت تک شوکت صاحب کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ لیکن ملک کے مختلف رسائل میں اُنکے افکار شائع ہوتے رہتے ہیں، اور پورے لطف کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں تقریباً ایک درجن مضامین ہیں، جن میں سے بعض غیر مطبوعہ بھی ہیں اور بلا استثنا سب کے سب پُر لطف ہیں۔

اس مجموعہ میں جناب نسیم کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے اور خوب ہے۔ لیکن ان کی یہ ستم ظریفی ضرور قابلِ ذکر ہے کہ اُنھوں نے اس مجموعہ میں فہرست شامل نہ کر کے کم از کم مجھے ضرور اُس ریب و وہم میں مبتلا کر دیا کہ اگر کوئی

مجھ سے پوچھے کہ اس مجموعہ میں کتنے مضامین ہیں تو میں کبھی صحت کے ساتھ نہ کہہ سکوں گا۔

شوکت صاحب اور نسیم صاحب کی تصاویر بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ جس سے مقصود شاید اس ردِ عمل میں قوت پیدا کرنا ہے، جو "مزاحیہ صحبت" کے بعد کبھی کبھی از خود رونما ہوتا ہے، لیکن میں ناظرین نگار کو یقین دلاتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کی صورت حقیقتاً ویسی نہیں ہے جیسی اُن کی تصویروں سے ظاہر ہوتی ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ معہ محصول ہے اور نگار بک ایجنسی سے مل سکتا ہے۔

شوپنہار یہ ایک رسالہ ہے جسے نگار کے مشہور فسانہ نویس مجنوں گورکھپوری نے جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات اور اُس کے فلسفہ کی تنقید میں لکھا ہے۔ شوپنہار دورِ حاضر کے اُن فلاسفہ میں سے تھا جن کی نظیر تاریخ عالم میں بمشکل سے ملتی ہے۔ یہ فخر صرف شوپنہار ہی کو حاصل تھا کہ اس کی فلسفہ طرازیوں سے لوگوں نے شعر و شاعری کا سا لطف اُٹھایا۔

غالباً کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ مجنوں نہ صرف افسانہ نگار ہیں، بلکہ وہ نہایت بلند فلسفیانہ ذوق بھی رکھتے ہیں اور یہ دونوں باتیں ان میں اسقدر حسن کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ شوپنہار کی طرح ہم اُنکے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں میں سے کونسا عنصر ان میں غالب پایا جاتا ہے۔ اس لئے شوپنہار کے فلسفہ کو اُردو میں منتقل کرنیکے لئے مجنوں سے زیادہ اہل کوئی دوسرا شخص ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ فلسفہ کے خشک مباحث پر اُنھوں نے کسقدر شگفتگی و ادبیت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور مجھے افسوس ہوگا اگر ناظرین نے اس خصوصیت کا لطف حاصل نہ کیا۔ کتاب نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ سنہری جلد میں شائع ہوئی ہے اور شوپنہار کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے قیمت عہ ہے اور ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے۔ ۔۔ و دفتر نگار سے بھی

موجِ تبسم!

یعنی جناب شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جو حال ہی میں نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ قیمت معہ محصول (عہ)

اسی ماہ میں اڈیٹر نگار کی رائے اس کتاب پر ملاحظہ فرمایئے۔ مینجر نگار لکھنؤ

بسم اللہ

نگار

جلد ۱۰ فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۴۳ء شمارہ ۴

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء شمار (۴)

ملاحظات

حکومت ترکی کی آزادروی کے متعلق ہندوستان کے مسلم اخباروں میں، جسوقت کوئی خبر نظر آتی ہے، تو مجھے اتنا متعجب نہیں ہوتا، جس قدر ان اخباروں کی توجیہ و تاویل کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ اگر کبھی وہاں سے خبر آجاتی ہے کہ حکومت ترکی نے قدیم شکستہ مسجدوں کو مسمار کرکے چمن بنادئے ہیں، اذان کا طریقہ اُنھوں نے لاسلکی یکبر الصوت کی صورت میں رائج کیا ہے، عورتیں برافگندہ نقاب احتفالات رقص میں شریک ہوتی ہیں۔ عربی رسم الخط کو مٹاکر انگریزی حروف کو اختیار کیا جارہا ہے۔ مغربی ٹوپی لباس کا جزو قرار دیگئی ہے، مذہبی و فقہی تعلیم کے ساتھ ہمدردی اُٹھتی جارہی ہے، علماء مذہب کو کوئی مخصوص شرف و امتیاز نہیں دیا جاتا، نماز کا مفہوم وہاں صرف عبادت (اور عبادت بھی قومی اجتماع کے اُصول پر) قرار دے کر اسوقت بینڈ بجانے کا دستور ہوتا جارہا ہے، الغرض ترکی کے متعلق جب کوئی خبر ایسی آجاتی ہے جو ہندی مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے قابل نفرت و استکراہ ہے، تو بعض اڈیٹروں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ ان خبروں کو دشمنوں کا پروپگنڈا قرار دیکر، ان کی صحت سے انکار کردیتے ہیں، کیونکہ ان کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایک قوم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے اس قدر "نامسلمانی" کا اظہار کرے، اور بعض انکو صحیح جان کر ترکی کی گمراہی و ضلالت و الحاد پر اظہار افسوس کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔

پھر سوال یہ نہیں ہے کہ ترکی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے یا نہیں۔ بلکہ گفتگو اس میں ہونی چاہیئے کہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اگر آج غلط ہے تو کل تک صحیح ہونیوالا ہے یا نہیں۔ اگر اندیشہ ہونے کا ہے تو پھر یہ غور کرنا چاہیئے کہ اسکے اسباب کیا ہیں؟

ہمارے یہاں کے علمار کرام کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر آج ساری دنیا کے مسلمان ان عقائد سے ہٹ جائیں جن پر مذہب اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا ظاہر کیا جاتا ہے، تو وہ ضرور جبہ استغنا کے ساتھ کہدینگے کہ اسلام اور خدائے اسلام کسی کا محتاج نہیں اگر روئے زمین پر کوئی مسلمان (سوائے اُن کے) باقی نہ رہے تو کیا پرواہ ہے۔ حالانکہ ان کو غور کرنا چاہیئے کہ اگر وہ تمام عالم کے مسلمانوں کو جہنم کے سپرد کر کے خود تنہا جنت چلے گئے تو انھیں کیا خاک لطف آئے گا۔ اور حور و قصور، فردوس و سلسبیل کی ضرورت وجود پر کس چیز کو بطور حجت پیش کیا جائیگا۔ برخلاف اس کے اگر وہ اپنی محدود و مختصر جماعت کو علحدہ کر کے باقی سب کو فردوس کا مستحق قرار دیں تو بیشک اس میں ایک بات ہے اور اس سے کچھ خدا کی خدائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ یوں تو کائنات کا مفہوم صرف ایک خدا اور چند مولویوں سے زیادہ کچھ نہیں قرار پاتا۔

الغرض یہ لوگ خدا کی بے نیازی ظاہر کرنے میں یہ تو آسانی سے کہدیتے ہیں کہ اسے مطلق پرواہ نہیں، اگر ساری دنیا کافر ہو جائے، لیکن کبھی وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا خدا، اسلام کا پابند ہے، اور جسطرح وہ سارے عالم سے بے نیاز ہے، کیا اسی طرح وہ اسلام سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کا مبتلائے کفر ہو جانا اسکو نقصان نہیں پہونچا سکتا، تو سارے عالم کا مسلمان ہو جانا بھی اسکی عظمت و برتری میں کسی اضافہ کا باعث نہیں ہو سکتا۔

پھر جب مذہب و ملت کے مسائل میں، خدا اور اسکی مرضی کا سوال اُٹھ گیا، تو کفر و اسلام کا فرق کوئی خدائی انتیاز نہ رہا، بلکہ صرف عقائد کا اختلاف اور اُصول اخلاق کا اختلاف ہوا اور عقائد و اُصول بھی وہ جنھیں خود انسان نے بنایا ہے پھر ایک انسان یہ دعوے تو کر سکتا ہے کہ اُسکے بنائے ہوئے قواعد حیات و معاشرت ایک مخصوص ملک و عہد کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، لیکن وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو اُصول زندگی اب سے دو ہزار برس قبل پائے جاتے تھے، وہی اب بھی پائے جاتے ہیں یا جو اب موجود ہیں وہ آئیندہ دو ہزار سال کے بعد بھی اسیطرح قائم رہیں گے۔ جبکہ اصول اخلاق و معاشرت انسان کی ذہنیت کے تابع ہیں اور انسانی ذہنیت کا وقت اور ماحول کے لحاظ سے تغیر پذیر ہونا ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے۔

پھر اگر آج ترکی، مولویوں کے بنائے ہوئے اُصول و قواعد سے منحرف ہو رہا ہے تو دنیا میں وہ کونسی قوت ہے جو اسکی موجودہ ذہنیت کو بدل سکتی ہے، جبکہ اس کا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اس کی ترقی کا راز ہی ان اصول سے انحراف کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ترکی کی ترقی اُسوقت سے شروع ہوتی ہے جب اُس نے خلافت کی زنجیر سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور چونکہ خلافت بھی مولویوں ہی کا مسلط کیا ہوا عذاب تھا۔ اس لئے قدرتاً اس کو اس جماعت سے متنفر ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس تنفر کے بعد قدرتاً اُن تمام اُصول سے بیزار ہو جانا چاہیئے جو اُسکے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اسلئے اگر حالات یہی ہیں تو بہت جلد وہ وقت آنیوالا ہے

حسب مذہب کا بعید ترین واسطہ بھی مفقود ہو جائے گا۔ اور اگر اُنھوں نے زیادہ تنگ نظری سے کام لیا تو ان کے مذہب کا نام ترکیت بلکہ صرف انسانیت قرار پائے گا جو نہ وضع و لباس کو دیکھتی ہے، نہ کسی مخصوص عبادت و نیالیش کو بلکہ صرف اخلاق کو، اصول تہذیب و تمدن کو، اور اُس جذبہ کو جو تمام انسان کو ایک ہی رشتہ سے منسلک کرنیوالا ہے۔ پھر اگر یہ اصول حقیقتاً غلط ہیں، اگر یہ ذہنیت گمراہی ہے، تو اس غلطی و ضلالت کے ثبوت کا بار کس پر ہے؟ اُن پر جو اُن کو صحیح سمجھکر اختیار کئے ہوئے ہیں، یا اُن پر جو اُن کی غلطی کے مدعی ہیں۔

ہمارے یہاں کے علمبرداران مذہب اس امر کے لئے تو بیقرار ہیں کہ اُنکا اقتدار بدستور قائم رہے، منصب ہدایت ان سے نہ چھینا جائے، لیکن وہ اس کی فکر نہیں کرتے کہ لوگوں کے خدشات قلب دور کریں، اپنی تعلیمات میں تمدن حاضرہ کے اقتضاء کے مطابق تغیر و تبدل کریں، اور خود اپنے اندر وہ ذہنیت پیدا کریں جو اس دور علم و حکمت کی ترقیوں کا ساتھ دے سکے۔

اب زمانہ وہ ہے کہ الہام و وحی کے مفہوم کو صرف تبلیغی مکر و فریب سمجھا جاتا ہے، کتب مقدسہ و ملہمہ کے بیانات کو بربنائے تحقیقات تاریخی غلط ٹھیرایا جا رہا ہے، تعلیمات مذہبی کو ناقص و نامکمل ثابت کرکے اُسے تقویم پارینہ بتایا جا رہا ہے اسلئے میرے نزدیک اب سوال مقابلہ کا نہیں ہے، بلکہ سپر ڈالدینے کا ہے یا پھر مذہب کو اسقدر بلند لیجانے کا کہ ان تمام اعتراضات کی دسترس سے دور ہو جائے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ایران کی موجودہ ذہنیت کو پیدا ہوئے چند سال سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا، لیکن وہاں کا بھی یہ عالم ہے کہ جو خواتین گھروں کے اندر سے باہر دہلیز میں بھی قدم رکھنا پسند نہ کرتی تھیں، آج بے نقاب ہیں، آزاد ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ اپنے بالوں کو بھی مغربی تقلید میں خیرباد کہہ چکی ہیں۔ مصر پر اس سے قبل ہی یہ زمانہ آ چکا ہے اور افغانستان بھی خدا جانے کہاں پہونچ گیا ہوتا اگر وہاں کی ترقی کو قصداً قوت و عسکریت سے نہ دبا دیا جاتا۔

موجودہ عہد صرف علم و عمل کا عہد ہے، لیکن وہ علم و عمل نہیں جو صرف خانقاہوں اور مسجدوں کو آباد کرنیوالا ہے بلکہ وہ، جو انسان کی خوشحالی، نشاط انگیزی اور آسودگی قلب و دماغ کا ضامن ہے، اور جسے ہم جنات عدن بھی کہہ سکتے ہیں اور فردوس بریں بھی۔ پھر دنیا کا کوئی ملک نہیں جو اس کے حصول کے لئے بیتاب نہ ہو، اور مغرب سے بلند ہونیوالے اس سیلاب میں کودپڑنے کے لئے مضطرب نہ ہو۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جو ملک آزاد ہیں وہ اس طوفان میں اپنے آپ کو ڈال چکے ہیں اور جو آزاد نہیں ہیں وہ اپنی ذہنی غلامی کی بدولت اس کی جسارت نہیں کرسکتے اور حسرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس لئے اگر اس وقت تک ہندوستان کی مولوی میں کچھ جان باقی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ واقعی وہ زندہ رہنے کے قابل ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ اُسکی موت کے اسباب ابھی پیدا نہیں ہوئے اور اگر ترکی، مصر اور ایران وغیرہ میں، اس مخلوق کو فنا کر دیا گیا ہے تو صرف اسوجہ سے کہ اُنھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ مولوی کی موت قوم کی حیات ہے۔

اور چونکہ وہ ٹھیکیدار ہیں، حکومت اُن کی ہے ملک اُن کا ہے، اس لئے اُنھیں اختیار حاصل ہے کہ اپنے جس عضو ماؤف و مفلوج کو چاہیں قطع کر کے پھینکدیں۔ یہاں جب ہماری جسمانی صحت کے لئے حکومت آجتک تالاب کے مچھروں اور ملیریا کے جراثیم کو فنا نہیں کر سکی، تو مولویوں کی تباہکاریوں کا اسکو کیا خیال ہوسکتا ہے، جبکہ وہ خود بھی کبھی کبھی اخلاق میں عفونت پھیلانے کا کام اُن سے لیا کرتی ہے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اکثر ممبر "دیار دوست" کی طرف روانہ ہوچکے ہیں اور جو رہ گئے ہیں وہ عازم سفر ہیں اس درمیان میں متعدد بار اخباروں میں یہ خبر آچکی ہے کہ مہاتما گاندھی کی رہائی کا مسئلہ درپیش ہے۔ اور وہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہونگے۔ مہاتما گاندھی رہا ہوں یا نہ ہوں، کانفرنس میں اُنکی شرکت ممکن ہو یا ناممکن، لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جاسکتا ہے کہ اس کانفرنس کی تکمیل کی طرف سے لوگ مطمئن نہیں ہیں اور وہ اس میں کسی ایسے عنصر کی کمی محسوس کر رہے ہیں جسکا فقدان اس اجتماع کو بے معنی بنا دینے والا ہے۔

اس سے نمائندگانِ انگلستان کی استبداد پسند جماعت کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ سیاسیات ہند کا موجودہ مفہوم صرف کانگرس سے پیدا ہوتا ہے اور ہندوستان کی وہی ایک جماعت ایسی ہے جو اسوقت ملک کے حصۂ غالب کی ذہنیت پر حکمرانی کر رہی ہے، پھر ظاہر ہے کہ کوئی ایسی کانفرنس جو ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتی ہے کس طرح اپنے آپکو کانگرس کی نیابت سے بے نیاز ثابت کر سکتی ہے۔ اور اگر اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ ہو بھی تو اس کا نفاذ اور نفاذ کے بعد قیام امن و سکون کیونکر ممکن ہے۔ جس کی جستجو اور حصول کا دعوےٰ کیا جاتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جن ممبران کی نامزدگی ہوئی ہے وہ اس کے اہل نہیں یا ہندوستان کی اور جماعتوں کی نیابت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن چونکہ کانگرس کی کوئی آواز وہاں بلند ہونیوالی نہیں ہے، اس لئے یہ تمام نظم و اہتمام، یہ جملہ مصارف کسی ٹھکانے لگتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے اور یہ حقیقت غالبًا حکومت برطانیہ سے بھی مخفی نہیں ہے کہ "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی" فی الاصل کوئی معقول بات نہیں ہے۔

کانگرس کا لائحہ عمل مفید ہو یا مضر ہمیں اس سے بحث نہیں، کیونکہ نفع و ضرر کے متعلق پیشین گوئی کرنے کا سوال اُسوقت پیدا ہوتا ہے جب نتائج سامنے نہ ہوں۔ لیکن ایک تحریک کا مدعا میری سمجھ میں نہیں آتا اور وہ یہ کہ تعلیم گاہوں کو کیوں خیرباد کہا جا رہا ہے، اگر اس سے مقصود صرف بچوں میں ہیجان سیاسی پیدا کرنا ہے تو مفید مطلب نہیں اور اگر مراد تعلیم گاہوں کو نقصان پہونچانا ہے تو فعل عبث ہے، کیونکہ ایک مدرسہ یا کالج کا نقصان اُسوقت ہوگا جب پہلے طلبہ کا نقصان ہو جائے اور یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی کہ سیاسی اغراض اور دماغی تربیت کی تخریب میں باہم کیا نسبت ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موجودہ درسگاہیں تعلیم صالح کا ذریعہ نہیں ہیں تو بھی تعلیم غیر صالح، عدم تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے۔ جناب امیر کا ارشاد ہے کہ "کم دینے سے نہ حجاب کرو کیونکہ نہ دینا کم دینے سے بھی کم ہے"۔

بہرحال تعلیم کے متعلق ارباب سیاست کا موجودہ فیصلہ و طریق عمل میرے نزدیک مناسب نہیں ہے اور نہ لڑکوں میں سیاسی ہیجان پیدا کرنا قرین عقل و انصاف ہے، کیونکہ اس سے ایک طرف اُن کی تعلیم کا نقصان ہوگا اور دوسری طرف عدم استشداد کی پالیسی بھی مجروح ہوگی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے مضمون "بحث سنت" کے بعد مولوی سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے کا ایک مضمون اور موصول ہوا ہے، لیکن چونکہ ایک دوسرے صاحب کا مضمون (جس میں سید صاحب سے خطاب کیا گیا ہے) اس سے قبل کاتب کو دیا جا چکا تھا، اس لئے ترتیب نگار کے اصول کو دیکھتے ہوئے دونوں مضمونوں کا اجتماع مناسب نہ سمجھا گیا۔ آئندہ اشاعت میں اسے درج کیا جائے گا۔ یہ میں نے اس لئے لکھ دیا کہ کہیں ایک سید کو دوسرے سید کی طرف سے غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے اور تاخیر اشاعت کا سبب بھی مضمون نگار کے علم میں آجائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "بحث سنت" کے متعلق جو لفظی تحقیق اپنے مقالہ میں کی ہے، اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس نزاع ماخذ و مصدر کا فیصلہ سید صاحب ہی کے حق میں کیا جائے، تو کیا اس سے اصل بحث "حدیث و سنت" کے فرق و امتیاز کی اُٹھ جاتی ہے، اور کیا اس دلیل سے ایک شخص کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب و مسلک، اپنے یقین و اعتقاد کی بنیاد کتب احادیث پر قائم کرے۔ اسوقت سب سے زیادہ اہم سوال ہمارے علمائے کرام کے سامنے یہی ہے کہ وہ یا تو متفقہ طور پر حدیث کی اہمیت سے انکار کر دیں یا اسکا کوئی مجموعہ السا مرتب کریں۔ جسے قرآن کے بعد صحیح معنے میں کوئی اصولی و با معنی چیز قرار دیا جائے۔

بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ نگار میں جو مذہبی مباحث ہوتے ہیں، وہ صرف دل دکان قائم رکھنے کے لئے ہیں، اور اُن سے تحقیق حق مقصود نہیں ہے۔ ہر شخص قیاس کرنے کا مجاز ہے اور اس قیاس کے لحاظ سے نتیجہ تک پہونچنے کے لئے بھی آزاد۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی یہ بحث اپنی جگہ بدستور قائم رہتی ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے (خواہ وہ کسی نیت سے ہو) قابل غور و اعتناء ہے یا نہیں۔

فرض کیجئے ایک شخص جو داڑھی منڈاتا ہے، کسی دوسرے کی داڑھی کو دیکھ کر کہتا ہے کہ کس قدر کثیف اور اُلجھی ہوئی چیز ہے۔ پھر یہ ممکن ہے کہ اس کا کہنا صرف اس بناء پر ہو کہ وہ اپنی صفائی ریش و بروت کا پروپاگنڈا کر رہا ہے، لیکن اس سے اُس داڑھی کی کثافت و ژولیدگی تو دور نہیں ہوتی، وہ تو اسی طرح اپنے حال پر قائم رہتی ہے۔

اس لئے اگر میں مولویوں کی موجودہ سیرت پر تنقید کرتا ہوں، اگر میں اُن کی گمراہ کن تعلیمات سے لوگوں کو متنبہ

کرتا ہوں، اور اگر میں اسلام کا ایک ایسا مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں جو تمام عالم کے نزدیک قابلِ قبول ہو، تو اگر اس سے میرا مدعا صرف ذوق و کان ہٰنہٰ تو بھی اس سے ایک مولوی اور اس کے اسلام کی پاکبازی کیونکر شک ہو سکتی ہے، جبکہ اسکی حالت ہر شخص کو تنقید کی دعوت دے رہی ہے، خواہ تنقید کرنیوالے کی نیت تحقیق حق ہو یا تجارت کی گرم بازاری۔

اسی کو کہتے ہیں کسی بحث میں ذاتیات پہ اُتر آنا اور بعض کے نزدیک یہ اولین منزل ہے اعتراف شکست و اقرار مغلوبیت کی بہرحال میں ان دونوں میں سے کسی پر اعتماد نہ کرتے ہوئے یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تحقیق حق کے لئے کسی خاص امر کے اظہار یا اقرار کی ضرورت ہے تو مجھے بتا دیجائے، میں اس باب میں ہر شرط کے ماننے کے لئے طیار ہوں، کیونکہ اس سے میرے مقاصد کو کسیطرح نقصان نہیں ہو سکتا، میں نے تو پرائیویٹ خط و کتابت کے ذریعہ سے بہت سے امور کو طے کرنا چاہا لیکن اسکا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ چنانچہ جسوقت میں نے ایک مطبوعہ استفتاء ہندوستان کے تمام علماء کرام کے نام روانہ کیا اس سے بھی مقصود صرف طمانیت نفس تھی لیکن بعد کو اُن بات کی حقیقت بھی یوں منکشف ہو گئی کہ جب میں نے اُنھیں جواب دینے والے علماء میں سے ایک سے انکے جواب کی اشاعت کا خیال ظاہر کیا تو وہ پریشان ہو گئے اور اُنھوں نے فرمایا کہ اسکی اشاعت مناسب نہیں ہے۔

سفر پشاور کے متعلق ۱۰ اکتوبر کے بعد فیصلہ ہو سکے گا لیکن میں احباب سرحد کو ان کے خطوط کے جواب میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جب کبھی اُسطرف آؤنگا، انھیں ضرور اطلاع دونگا۔

کوہاٹ جیل سے جن بزرگ کا پیام مجھ تک پہونچا ہے، اُنکو اطمینان دلاتا ہوں کہ کوہاٹ ۲۶ اکتوبر کے بعد ہی پہونچوں گا۔ اور کبھی اُنکے خلوص سے اپنے آپ کو محروم رکھنا گوارا نہ کرونگا۔

ایک خاتون نے اپنی بنائی ہوئی چار چیزیں مجھے مرحمت کیں۔ کاجل، سرمہ، چورن، منجن، تاکہ میں انکا تجربہ کر کے اپنی رائے ظاہر کروں۔ میرے نزدیک چاروں چیزیں مفید و قابل قدر ہیں میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ انکی طیاری میں خدا معلوم کیا کیا دوائیں اور جڑی بوٹیاں فراہم کرتی ہیں۔ کاجل میں خود استعمال کر رہا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ آنکھیں بہت صاف اور منجلی رہتی ہیں۔ چورن میں نے کئی بچوں کو دیا اور درد کے دور کرنے میں اکسیر پایا۔ سرمہ بھی بعض لوگوں کو دیا گیا اور سب نے تعریف کی۔

مجھے امید ہے کہ ناظرین نگار خاتون موصوف کے جذبۂ عمل کی قدر کرینگے۔ اور ان مفید دواؤں سے خود بھی فائدہ اُٹھائینگے اور دوسروں کو بھی اسطرف متوجہ کرینگے۔ اس ماہ کی اشاعت میں کسی جگہ انکا اشتہار بھی درج کیا گیا ہے۔

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مقالہ سلسلہ کا ہے۔ جو آئندہ اشاعت میں ختم ہو جائیگا، اُس کے اختتام پر جو رائے میری اس مضمون کے متعلق ہے اس کو کسی قدر تفصیل سے ظاہر کرونگا۔

"جہنم میں دو گھنٹے" میرا مضمون طنزیات کے رنگ کی تنقید ہے۔ یہ یونہی اس لئے لکھدیا کہ کہیں میرے اس مضمون کو میرے خلاف "وجود جہنم" کے ثبوت میں نہ پیش کیا جائے۔

جس مضمون میں مولانا سید سلیمان ندوی سے خطاب کیا گیا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے، اگر اُس کا کوئی جواب دیا جائیگا تو نگار اُس کی اشاعت کے لئے موجود ہے۔

"دنیا اور ضرورت مذہب" پر دوسری قسط اس سالنامہ میں شائع ہو رہی ہے۔ آئندہ مہینے میں اسکو بھی ختم سمجھیئے۔ "مرشد" ملک کے مشہور مزاح نگار مسٹر رشید احمد صدیقی کا مضمون ہے اور "آج" ایک نوجوان ادیب کا جنکے ساتھ میری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

باب الاستفسار میں بھی ایک جواب مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ غالباً آئندہ اشاعت میں ختم ہو جائے۔ "برسات" کی نظم جناب جوش کی ہے اور غیر مطبوعہ لیکر میرے پاس بھیجی گئی ہے۔ نظم کی خوبی پر گفتگو فضول ہے۔ "میری دنیا" مولوی علی اختر صاحب اختر کی فکر عمیق کا نتیجہ ہے۔ اور "عورت" جناب فرخ بنارسی کی فکر جمیل کا۔ "مزدور کی آواز" پر جناب کاظمی نے بہت بامعنی اور برمحل اظہار خیال کیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۱ء کے نگار کا انتظار کیجئے اور بے چینی کے ساتھ ماہ آئندہ میں آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز ہوگا؟ اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو یہ بھی سوچ لیجئے کہ اپنے دائرہ احباب میں آپ کس کسکو "حلقۂ نگار" سے وابستہ کرنے کی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

نیاز

رسالہ "جن" کی اشاعتیں

اسوقت تک حسب ذیل مضامین نکل چکے ہیں:۔

عمل تنویم۔ غیر معمولی تمثیل۔ بھوت پریت۔ خواب کی دنیا۔ مقناطیسیت اور جسم بیجان۔ مسمریزم۔ کیا مُردوں سے باتیں کر سکتے ہیں؟ انسانی کی روح۔ حالات مابعد الموت۔ ماضی کا مشاہدہ حال کی آنکھوں سے۔ روحانی علاج۔ مغرب اور روحانیت۔ کیا روحیں شکل اختیار کرتی ہیں۔ حیات بعد الممات۔ خواب و غیب کی خبریں۔ ملاقیتی یا طور بینی۔ افکار غزنی۔ ستارہ باھر کے حوادث سماوی۔ مغرب کا ایک جدید انکشاف و غیرہ۔

یہ تمام مضامین آپکو صرف ایک روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ نگار کے خریدار نہیں یا بنے رہیں۔

مینجر نگار لکھنؤ

جنوری ۱۹۳۱ء کا نگار غیر معمولی حجم کا

زیر ترتیب ہے اور دلچسپیوں و رنگینیوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ آئندہ سے جن حضرات کا چندہ ختم ہو رہا ہے (خواہ وہ اکتوبر میں ختم ہو یا نومبر دسمبر میں) اُن کے ساتھ حسب ذیل رعایت کیجائیگی۔

تذکرہ خندۂ گل۔ شاعر کا انجام۔ نصف قیمت پر دئے جائینگے اور "سائنس کے عجائب" مفت۔ اسی کے ساتھ رسالہ جن کے گذشتہ پرچے مارچ سے لیکر آئندہ تک بجائے ۴ کے ۲ فی پرچہ کے حساب سے دئے جائینگے۔ جنوری و فروری کا جن موجود نہیں ہے۔ جو حضرات یہ تمام چیزیں طلب کرینگے اُن سے محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

مینجر نگار لکھنؤ

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ سابق)

قرآن مجید پر "صور شعریہ" کے اعتبار سے ایک نظر

قبل اسکے کہ قرآن مجید کے محاسن ادبی پر صور شعریہ کے اُصول کے مطابق روشنی ڈالی جائے یہ ضروری ہے کہ خود اصطلاح "صور شعریہ" کی شرح کردیجائے، دور جدید میں شعر کی تنقید کے لئے "صور شعریہ" ایک معیار مقرر کیا گیا ہے، اسکی تفسیر میں ڈاکٹر زکی مبارک[۵] لکھتا ہے۔

الصورة الشعرية هي اثر الشاعر المفلق الذی یصف "المرئیات" وصفاً یجعل قارئ شعره مایدری ان یقرأ قصیدة مسطورة ام یشاهد مناظراً موجوداً

صُورِ شعریہ تعبیر ہے ایک ذہین شاعر کی اثر آفرینی سے اگر اس نے "مرئیات" (جسکو آنکھ سے دیکھ سکیں) کی تعریف کی ہے، تو اس پیرایہ میں کہ پڑھنے والا کو تمیز نہیں ہوتا کہ آیا وہ ایک لکھا ہوا قصیدہ پڑھ رہا ہے، یا کسی منظر فطریہ کا مشاہدہ کررہا ہے، اور اگر شاعر نے

---

[۵] ڈاکٹر زکی مبارک مصر کی جدید علمی تحریک کا ایک مایۂ ناز ادیب ہے، قدیم عربی رسائل، طرز انشا جسمیں سجع کا لحاظ اور قوافی کی پابندی پائی جاتی تھی مصریوں نے اسے بدل دیا، اب مصر کے اخبار و رسائل اور جدید مطبوعات میں انشا کا وہی سلف ہے، جو السنہ یورپ میں آج کل پایا جاتا ہے، ڈاکٹر زکی بیک وقت ایک بلند پایہ انشا پرداز بھی ہے اور فلسفیانہ اور تاریخی تحقیقات کا ناشر بھی، قدرت کی طرف سے وہ بہت بڑا جدت طراز دماغ لیکر آیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسکی کتابیں جدید علمی طبقہ میں نہایت مقبول ہیں اسنے بعض ایسے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں کہ اس سے قبل عربی میں ایسی کتابیں نہیں لکھی گئیں، بلکہ جہانتک میرے ذاتی مطالعہ کا تعلق ہے میں نے مغربی زبان میں بھی ایسی کتابیں نہیں دیکھیں، لطائف ادبیہ کے سلسلہ میں اسکی مفصلہ ذیل کتابیں ہیں۔ مدامع العشاق - اغان الجمال - موازنة بین الشعراء - الاخلاق عند الغزالی - آراء الجاحظ الفلسفیه والادبیه - حب ابن ابی ربیعه - الاخلاق عند الغزالی میں اسنے امام غزالی کے فلسفہ اور ڈیکارٹ، ہوبس، کالیل، اسپینوزا، کے فلسفیانہ نظریات سے موازنہ کیا ہے، اسی تصنیف پر جامع ازہر کے شیوخ نے زکی مبارک کو "ڈاکٹر" کا خطاب دیا ہے، اسکی دو کتابیں الموازنة بین الشعراء اور مدامع العشاق عربی زبان کی جدید ترقی میں قابل قدر اضافہ ہیں، موازنہ میں ڈاکٹر صاحب نے اُصول تنقید بتائے ہیں اور کثیر التعداد قدیم و جدید عربی شعرا کے کلام کا موازنہ کیا ہے، اور اپنے پاکیزہ تنقیدی نکتے اسکے گیارہویں باب میں قرآن مجید کے محاسن ادبیہ پر شاعرانہ پہلو سے تبصرہ کیا ہے جسکا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ مدامع العشاق میں ایسے مضامین سے بحث کی ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں ملتے۔ انھوں نے آہ و نالہ، ہجر و فراق، شکوہ و عتاب، قاصد و رقیب، محبوب کی بیوفائی اور سنگدلی، اور سینکڑوں دوسرے عاشقانہ (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

والذی یصف الوجد ایات" وصفاً یجعل للقاری انہ یناجی نفسہ ویحاور ضمیرہ لا انہ یقرأ قطعتہ مختارۃ لشاعر مجید ؕ

"وجد انیات" کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے تو پڑھنے والے کو خیال نہیں ہوتا کہ آیا یہ کسی بڑے شاعر کا کلام ہے، یا خود اسکے نفس کی آواز اور ضمیر کا اظہار ہے۔

بعض ادیبوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ "صور شعریہ" ایک قسم کا استعارہ تمثیلی ہے، حالانکہ دونوں میں فرق ہے، استعارہ تمثیلیہ "صورت معنوی" کا اظہار کرتا ہے، اسکے برعکس صور شعریہ ایک "غرض" کی مثال ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالے فرماتا ہے "والسماء مطویات بیمینہ" یہ ایک قسم کی تمثیل ہے جس سے ایک خاص معنی کا اداکرنا مراد ہے، اور وہ "قدرت الٰہی" ہے لیکن "صورت شعریہ" کے مطابق غرض کی تصویر سورہ مائدہ کی مفصلہ ذیل آیتوں سے ثابت ہوتی ہے۔

واذ قال اللہ یا عیسی ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللہ قال سبحٰنک ما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق ط ان کنت قلتہ فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک ط انک انت علام الغیوب ؕ ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم وکنت علیھم شھیداً ما دمت فیھم ج فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم ط وانت علی کل شیء شھید ط ان تعذبھم فانھم عبادک ج وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم ؕ

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ تعالے فرماوینگے کہ اے عیسی ابن مریم کیا تم نے ان لوگوں سے کہدیا تھا کہ مجکو اور میری ماں کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دیلو۔ تو عیسیٰ عرض کرینگے کہ میں آپکو منزہ سمجھتا ہوں مجھکو کسیطرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جسکے کہنے کا مجھکو کوئی حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا تو آپکو اسکا علم ہوگا آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں اور میں آپکے علم میں جو کچھ ہے اسکو نہیں جانتا۔ تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہیں، میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جو آپ نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے میں انپر مطلع رہا جبتک میں انمیں رہا، پھر جب آپنے مجھکو اٹھالیا تو آپ انپر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں اگر آپ انکو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ انکو معاف فرمادیں تو آپ زبردست حکمت والے ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ مفصلہ بالا آیتوں میں معنی کی بجائے غرض کی تصویر پیش کی گئی ہے، اور معنی غرض کا ایک

(بقیہ صفحہ ۹) امیال وعواطف کے متعلق تمام مشہور عربی شعراء کے کلام کا ایک دیوان مرتب کردیا ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھیں کھٹکا تھا کہ انکے اخلاق اور کیرکٹر کے متعلق علماء ومشائخ نہایت غضب آلود خیالات ظاہر کرینگے۔ اور فاسق وفاجر کہیں گے۔ غزالی کے بارے میں ایک طبقہ نے انپر کفر والحاد کا فتویٰ بھی صادر کیا، لیکن نکتہ شناس دماغوں نے انھیں "ڈاکٹر" کا لقب عطا ہی کردیا۔ "افنان الجمال" زیر طبع ہے، اس میں انھوں نے شعراء کے وہ کلام جمع کردیئے ہیں جو محبوب کے حسن جمال سے متعلق ہیں، زکی مبارک کی دوسری کتابیں جو زیر طبع ہیں وہ یہ ہیں، الصورالشعریہ صبابہ ابن الاحنف۔ خمریات ابی نواس۔

جزء ہے۔ یہ قرآن کا ایک پیش کردہ مرقع ہے، جو حضرت باری اور اُسکے بندہ اور رسول حضرت عیسیٰ کے درمیان ہوگا جس میں غرض کلی کے تمام نقوش موجود ہیں اور جزوی معانی کے اعتبار سے بھی بعض افکار پائے جاتے ہیں۔ پس معنی جزوی کی تصویر کا نام استعارہ یا تمثیل ہے، اور غرض کلی کی تصویر تعبیر ہے "صور شعریہ" سے۔

سورہ توبہ کی مفصلہ ذیل آیتوں میں صور شعریہ کے تمام محاسن پائے جاتے ہیں۔

واذان من اللہ ورسولہ الی الناس
یوم الحج الاکبر ان اللہ بریٓء من
المشرکین ۵ ورسولہ ط فان تبتم فھو خیر
لکم ج وان تولیتم فاعلموا انکم غیر معجزی
اللہ ط وبشر الذین کفروا بعذاب الیم ۵ الا
الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم
ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا
فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ط ان اللہ
یحب المتقین ۵ فاذا انسلخ الاشھر الحرم
فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم
واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان
تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم
ان اللہ غفور رحیم ۵ وان احد من
المشرکین استجارک فاجرہ حتی
یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ط ذالک
بانھم قوم لا یعلمون ۵ کیف یکون للمشرکین
عھد عند اللہ وعند رسولہ الا الذین
عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقا
موا لکم فاستقیموا لھم ط ان اللہ یحب المتقین
کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم
الا ولا ذمۃ ط یرضونکم بافواھھم وتابی

اور اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں
میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے، کہ
اللہ اور اُسکا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں
ان مشرکین سے پھر اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے
اور اگر تمنے اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز
نہیں کرسکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر
سنا دیجئے، ہاں مگر وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا
پھر اُنھوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے
مقابلہ میں کسی کی مدد کی سو انکے معاہدہ کو انکی مدت تک
پورا کردو، واقعی اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو
پسند کرتے ہیں، سو جب اشہر حرم (وہ مہینے جنمیں لڑائی
حرام ہے) گزر جاویں تو ان مشرکین کو جہاں چاہو مارو
پکڑو، اور داؤگھات کے موقعوں میں انکی تاک میں بیٹھو
پھر اگر توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں
تو انکا راستہ چھوڑ دو، واقعی اللہ تعالےٰ بڑی مغفرت
کرنیوالے ہیں، اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے
پناہ کا طالب ہو تو آپ اسکو پناہ دیجئے، تا کہ وہ کلام الٰہی
سُن لے پھر اُسکو اسکے امن کی جگہ میں پہونچا دیجئے، یہ حکم
اس سبب سے ہے، کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے
ان مشرکین کا عہد اللہ کے نزدیک اور اسکے رسول کے نزدیک
کیسے رہیگا مگر جن لوگوں نے مسجد حرام کے نزدیک تم سے عہد لیا ہے

قلوبهم واکثرهم فاسقون ○ اشتروا بآیات
الله ثمناً قلیلاً فصدوا عن سبیله ط انهم
ساء ما کانوا یعملون ○ لا یرقبون فی مؤمن
الا ولا ذمة ط واولئک هم المعتدون ○ فان
تابوا واقاموا الصلوٰة واتوا الزکوٰة فاخوانکم
فی الدین ط ونفصل الآیات لقوم یعلمون ○
وان نکثوا ایمانهم من بعد عهدهم و
طعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمة الکفر لا انهم
لا ایمان لهم لعلهم ینتهون ○ الا تقاتلو
ن قوماً نکثوا ایمانهم وهموا باخراج الرسو
ل وهم بدؤکم اول مرة ط اتخشونهم
فالله احق ان تخشوه ان کنتم مؤمنین
قاتلوهم یعذبهم الله بایدیکم و
یخزهم وینصرکم علیهم ویشف
صدور قوم مؤمنین ویذهب غیظ
قلوبهم ط ویتوب الله علی من یشاء
والله علیم حکیم ○ ام حسبتم ان
تترکوا ولما یعلم الله الذین جاهدوا
منکم ولم یتخذوا من
دون الله ولا رسوله ولا
المؤمنین ولیجة ط و
الله خبیر بما تعملون ○

سو جبتک یہ لوگ تمسے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو
بلاشبہ اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں، کیسے حالانکہ
انکی حالت یہ ہے کہ اگر وہ کہیں تم پر غلبہ پالیں تو تمہارے بارہ میں نہ
قرابت کا پاس کریں اور نہ قول قرار کا یہ لوگ تمکو اپنی زبانی باتوں سے
راضی کر رہے ہیں اور انکے دل نہیں مانتے اور ان میں زیادہ آدمی شریر
ہیں انہوں نے احکام الہیہ کے عوض میں متاع ناپائدار کو اختیار کر رکھا
ہے سو یہ لوگ اللہ کے رستے سے ہٹے ہوئے ہیں یقیناً انکا عمل بہت ہی برا
ہے یہ لوگ کسی مسلمان کے بارہ میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول قرار
کا اور یہ لوگ بہت ہی زیادتی کر رہے ہیں سو اگر یہ لوگ توبہ کرلیں
اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائینگے
اور ہم سمجھدار لوگوں کیلئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور اگر یہ
لوگ عہد کرنیکے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو تم لوگ
اس قصد سے کہ یہ باز آجاویں ان پیشوایان کفر سے لڑو، انکی قسمیں نہیں
رہیں تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور
رسول کو جلا وطن کرنے کی تجویز کی اور انہوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی کیا
ان سے ڈرتے ہو سو اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو
اگر تم ایمان رکھتے ہو ان سے لڑو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دیگا
اور انکو ذلیل کریگا اور تمکو انپر غالب کریگا اور بہت سے مسلمانوں کے قلوب کو شفا
دیگا، اور انکے قلوب کے غیظ کو دور کریگا اور جسپر منظور ہوگا اللہ تعالیٰ
توجہ فرمائیگا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں کیا تم
یہ خیال کرتے ہو کہ تم یونہی چھوڑ دئے جاؤ گے، حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ
نے انلوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو، اور اللہ تعالیٰ
اور رسول کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو، اور
اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے،

قرآن مجید میں "صور شعریہ" کے امتیازی پہلو وہاں نمایاں ہیں جہاں مقام کے لحاظ سے معنوی تثبیت اور تاکید مراد

ہوتی ہے، قرآن مجید کی مفصلہ بالا آیات میں شروع سے آخر تک مشرکین کی لعنت، اُنکی تحقیر، اُنکے مبتلائے عذاب ہونے ذلیل خوار ہوکر مارے جانیکے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور انھیں اغراض اساسی کا اذکر نا یہاں مطلوب ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ مہربانی کا حکم ہوتا ہے، جب کہا جاتا ہے" اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے پناہ کا طالب ہو تو آپ اُسکو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی سن لے، پھر اُسکو اُسکے امن کی جگہ پر پہونچا دیجئے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے" اسکے بعد غضب کی ڈانٹ بتائی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے" ان مشرکین کا عہد اللہ کے نزدیک اور اُس کے رسول کے نزدیک کیسے رہیگا، مگر جن لوگوں نے تم سے مسجد حرام کے نزدیک عہد لیا ہے، سو جبتک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو، بلاشبہ اللہ تعالےٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں، حالانکہ اُنکی حالت یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پاجائیں تو تمہارے بارہ میں، نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا یہ لوگ تم کو اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور انکے دل نہیں مانتے اور انمیں زیادہ آدمی شریر ہیں" یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ پیاپے کہا جاتا ہے،" اُنھوں نے احکام الہیہ کے عوض میں متاع ناپائیدار کو اختیار کر رکھا ہے سو یہ لوگ اللہ کے رستہ سے ہٹے ہوئے ہیں، یقیناً ان کا یہ عمل بہت ہی بُرا ہے" اسکے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے" تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا، اور رسول کے جلاوطن کردینے کی تجویز کی اور اُنھوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی، کیا ان سے ڈرتے ہو، سو اللہ تعالےٰ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو" اس کے بعد جوش میں آتا ہے" ان سے لڑو، اللہ تعالےٰ انکو تمہارے ہاتھوں سزا دیگا، اور ان کو ذلیل کریگا اور تم پر انکو غالب کریگا اور بہت سے مسلمانوں کے قلوب کو شفا دیگا اور انکے قلوب کے غیظ کو دور کریگا، اور جسپر منظور ہوگا اللہ تعالےٰ توجہ فرمادیگا، اور اللہ تعالےٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

اگر قاری اس واقعہ پر غور کرے تو زیادہ بہتر ہے، کہ رسول اللہ کا زمانہ فتنہ جہل اور گمراہی کا زمانہ تھا، اور یہ غضب جسکا قرآن مجید کی مفصلہ بالا آیات سے اظہار ہو رہا ہے، ایک طبعی غضب ہے، نہ اسمیں کوئی بُرائی ہے، نہ دشمنی، یہ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ قاری اس راز سے آگاہ ہوجائے کہ میں قرآن مجید سے صور شعریہ کی مثالیں پیش کر رہا ہوں حالانکہ نبی صلعم شاعر نہ تھے، پس قرآن محض ایک شعری کتاب ہی نہیں بلکہ وہ مسائل کو آسان پیرایہ میں شرح کے ساتھ بیان کرتا ہے، اور اُسکے بعد قوت اور جبروت کے ساتھ بلاتا ہے۔

ایک انوکھے قسم کے صور شعریہ کی مثال قرآن مجید کی مفصلہ ذیل آیات میں ملتی ہے۔

واتل علیھم نبا ابراھیم اذ قال لابیہ	اور انکے سامنے حضرت ابراہیم کا قصہ بیان کیجئے
وقومہ ما تعبدون قالوا نعبد اصناما	جبکہ اُنھوں نے اپنے والد اور قوم سے کہا کہ آپ
فنظل لھا عاکفین ۵ قال ہل یسمعونکم	لوگ کس کی پرستش کرتے ہیں اُنھوں نے کہا کہ ہم
اذ تدعون، او ینفعونکم او یضرون ۵	بتوں کی پرستش کرتے ہیں.........

قالوا بل وجدنا آباءنا كذلك يفعلون ۝
قال أفرأيتم ما كنتم تعبدون
أنتم وآباؤكم الأقدمون ، فإنهم
عدو لي إلا رب العالمين ، الذي خلقني
فهو يهدين ، والذي هو يطعمني
ويسقين وإذا مرضت فهو يشفين
والذي يميتني ثم يحيين والذي أطمع أن
يغفر لي خطيئتي يوم الدين ، رب هب
لي حكما وألحقني بالصالحين ، واجعل
لي لسان صدق في الآخرين واجعلني
من ورثة جنة النعيم واغفر لأبي إنه
كان من الضالين ، ولا تخزني يوم
يبعثون ، يوم لا ينفع مال ولا بنون
إلا من أتى الله بقلب سليم ۝

ابراہیم نے فرمایا کیا وہ آپکی فریاد سنتے ہیں، کیا آپکو کوئی نفع
یا نقصان پہونچاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمنے اپنے اگلوں کو
اسی طرح عبادت کرتے دیکھا ہے، آپنے فرمایا کہ تم اور تمہارے
اگلے جسکی پرستش کرتے ہیں، وہ کس خیال پر مبنی ہے،
یہ تمہارے دشمن ہیں، حقیقی معبود اللہ ہے، جسنے
ہمیں پیدا کیا اور ہدایت کرتا ہے جو کھلاتا ہے پلاتا ہے
اور جب ہم بیمار پڑتے ہیں تو شفا دیتا ہے، اور جو
موت کے بعد زندہ کرتا ہے، وہ جس سے امید رکھتا
ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ معاف کردے گا
خداوندا، مجھے حکمت عطا کر، اور نیکوکاروں کے
ساتھ مجھے ملادے...... اور مجھے جنت النعیم کا وارث
بنا، اور ہمارے والد کو بخشدیجیے جو گناہگاروں میں سے تھا اور
مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کیجیے، جس دن نہ مال کام آویگا اور نہ
اولاد، مگر وہ جسے خدا نے قلب سلیم عطا کیا ہے۔

قاری اسے ایک مرتبہ دو مرتبہ، تین مرتبہ پڑھے، اور بتائیے کیا اس سے بھی بڑھکر کوئی شیریں کلام ہوسکتا ہے، کیا سامعہ نے کبھی اس سے زیادہ نرم و حزیں آوازیں سنیں، کیا قلب نے اس سے زیادہ کوئی دلکش چیز محسوس کی، کیا نفس اس سے زیادہ ملائم اور نرم احساسات سے اثر پذیر ہوا۔[1]

شعرائے فارس کا استفادہ قرآنی

پہلی صدی ہجری سے فارسی زبان اسلامی زبان ہوگئی، اور اس کی شاعری میں وہ تمام خیالات منتقل ہونے لگے، جو دنیا کے کسی ذہنی انقلاب اور نفسیاتی ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں، عرب کی قدیم شاعری قرآن مجید کی جدید تخیل سیاسیات و معاشرت کے تغیر و تبدل اقوام

[1] یہ تمام تاثرات نتیجہ ہیں صرف اس اعتقاد کا کہ کلام مجید کی عبارت حد درجہ فصیح و بلیغ ہے۔ وہ لوگ جو یہ اعتقاد نہیں رکھتے یا جو عربی زبان سے وقوف تمام نہیں رکھتے انھیں نہ اس میں کوئی شیرینی نظر آتی ہے نہ دلکشی۔ ایک برہمن سنسکرت کا اشلوک پڑھتا ہے تو وہ بھی بالکل یہی کیفیات اپنے اندر پاتا ہے، درآنحالیکہ ہمارے نزدیک وہ ایک مجموعہ ہے لغو و مہمل الفاظ کا۔ اس لئے ابھی تک یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کا کوئی ایسا ثبوت پیش نہیں کیا گیا جو غیر مسلم کے لئے قابل تسلیم ہو اور نہ یہ ثبوت ممکن ہے، کیونکہ جہانتک الفاظ کا تعلق ہے قرآن کو کسی معجزہ کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔

وملل کے اختلاط وارتباط نے مسلمانوں کے دماغ پر گہرا اثر کیا اور اس لئے انکی تاریخ ادب و شاعری نے بھی ایک جدید صورت اختیار کرلی، چنانچہ شعرائے مولدین (عرب) کے کلام کے مطالعہ سے یہ نظریہ پایہ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے، اسی طرح فارسی شاعری کے مختلف زبانوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی کی عشقیہ اور صوفیانہ شاعری بھی اسی انقلاب ذہنی سے اثر پذیر ہوئی ہے۔

عہد اسلام کے اکابر شعرائے فارس چونکہ عموماً عربی علوم کے بڑے ماہر گزرے ہیں، اس لئے انکی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ انکے کلام میں عربیت کا کس قدر غلبہ تھا، انکے اشعار میں عربی فقرے اور محاورات کی ایسی ہی کثرت ہے، جیسی مرزا غالب کے اردو کلام میں فارسی کی، فارس (اسلامی) کی ابتدائی شاعری سے لیکر آٹھویں صدی تک عربی اور فارسی فقروں اور جملوں کی یہ آمیزش عام طور پر مروج تھی، چنانچہ سعدی و رومی، وخاقانی، و انوری، وحافظ، وجامی وغیرہم کے کلام میں یہ اختلاط ظاہر ہے، حافظ اور جامی نے تو غزلیات کے اندر بھی بہت کثرت سے عربی مصرعے چسپاں کئے ہیں، عربی و فارسی جملوں کی آمیزش رومی کی غزلیات میں کم ہے، اور خسرو کے رنگ تغزل میں تقریباً شاذ کی حیثیت رکھتی ہے، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ رومی نے قرآن و حدیث سے الفاظ کی بجائے روح معانی سے استفادہ کیا ہے، جو ان کی "مثنوی" اور "دیوان" (شمس تبریز) دونوں سے ظاہر ہوتا ہے، خسرو دہلوی پر ماحول و مقامی تمدن کا اثر پڑا، انکی توجہ زیادہ تر ہندی زبان اور اسکی شاعری کی طرف مبذول ہوگئی، اور یہی وجہ ہے کہ انکے فارسی کلام میں عربی فقرے اور مصرعے شاذ و نادر پائے جاتے ہیں، متاخرین میں عرفی شیرازی سے لیکر، علی حزین تک جتنے بڑے بڑے شعرائے فارس نظیری، ظہوری صائب وغیرہ گزرے ہیں انمیں باستثنائے فیضی و حزیں تمام اساتذہ کے کلام میں بالکل سادہ فارسی زبان پائی جاتی ہے، حزین نے سادگی الفاظ اور نزاکت خیال میں تو کمال پیدا کیا، لیکن اکثر انھوں نے حافظ اور جامی کے تتبع میں فارسی مصرعوں کے ساتھ عربی مصرعے شامل کئے ہیں، اساتذہ فارس نے عربی اور فارسی زبان کا یہ خلط ملط دو طریقہ سے شروع کیا، ایک تو یہ صورت پائی جاتی ہے کہ مسلم مصرعے یا بعض فقرے عربی ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات یا فقروں کو فارسی مصرعوں کے ساتھ مخلوط کرلیا ہے اس قرآنی استفادہ کی بھی دو صورتیں ہیں ایک الفاظ قرآن کی شمولیت، دوسری قرآن کے بعض بیان کردہ واقعات کی طرف اشارہ، اور تقریباً فارسی زبان کا کوئی ایسا شاعر نہیں جس نے قرآن مجید کے اعجاز ادب سے ان دونوں صورتوں میں سے دونوں یا ایک سے استفادہ نہ کیا ہو،

فارسی شاعری کا تمام کمال مطالعہ کرنیکے بعد اگر اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جائے، تو غالباً ایک ضخیم جلد میں یہ اشعار مرتب ہوسکیں، یہاں چونکہ صرف مثال مقصود ہے، اس لئے اختصار اور ایجاز سے کام لیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کا لفظی استفادہ

سعدی شیرازی بغداد یونیورسٹی کے تربیت یافتہ تھے، انکو عربی زبان پر بھی کامل مہارت تھی، بوستاں میں ابوبکر سعد بن زندگی کی مدح کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

فطوبی لباب کبیت العتیق　　حوالیہ من کل فج عمیق

کیا خوب بارگاہ (ممدوح) ہے جو خانۂ کعبہ کے مثل مامون ہے، اور لوگ اسکی طرف دور دراز رستوں سے آتے ہیں، ؏

اسکے قبل فارسی کا ایک بیت لاچکے ہیں جسکا ایک مصرعہ ہے، سے ندارد جز ایں کشور آرامگاہ

اب اس "کشور" کے لئے خانۂ کعبہ کی تشبیہ لائے ہیں اور اسکے لئے سورہ حج کی مفصلہ ذیل آیات کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسکے بعض فقروں سے مستفید ہوئے ہیں۔

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا　　اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، لوگ تمہارے پاس پیادہ پا بھی چلے

وعلی کل فج عمیق　　آئینگے، اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز رستوں سے پہونچی ہونگی۔

ایک آیت کے بعد پھر یہ حکم ہے۔

ثم لیقضوا تفثھم ولیوفوا نذورھم　　پھر لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دور کردیں اور اپنے واجبات کو

ولیطوفوا بالبیت العتیق　　پورا کردیں، اور اس مامون گھر کا طواف کریں۔

جلال الدین رومی تو مولانا تھے، انکا کلام مولویت اور تصوف کا صحیح مرقع ہے، اپنی بعض غزلیات میں انھوں نے بھی قرآن مجید کے فقرے استعمال کئے ہیں۔

چو عنکبوت چنیں صیدہائے زفت گرفت　　ببیں کہ تا چہ کند دام ربی الاعلیٰ

جب مکڑی نے اتنا بڑا شکار پکڑا ہے، (تو) دیکھو کہ "ربی الاعلیٰ" کا دام کیا کرتا ہے،

ڈاکٹر رینالڈ انے نکلسن نے اپنے "انتخاب دیوان شمس تبریز" مطبوعہ کیمبرج میں یہ شعر بھی لکھا ہے، اور اسکی شرح میں لکھتے ہیں کہ قرآن میں یہ فقرہ ربی الاعلیٰ" نہیں پایا جاتا، لیکن غالباً فرعون کے تکبر آمیز بیان "انا ربکم الاعلیٰ" کی طرف اشارہ ہے، "باب" کے خطابات میں سے ایک حضرت ربی الاعلیٰ بھی تھا (بحوالہ تاریخ "باب" مصنفہ براؤن)

نکلسن نے جس قرآنی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہاں چسپاں نہیں ہوتی، صرف اس وجہ سے نہیں، کہ الفاظ میں اختلاف ہے، بلکہ معنی کے اعتبار سے بھی کوئی مناسبت نہیں، "سورہ نزعت" میں ہے۔

اذھب الی فرعون انہ طغیٰ　　فقل ھل لک الی ان تزکی

واھدیک الی ربک فتخشیٰ　　فاراہ الآیۃ الکبریٰ

فکذب وعصیٰ　　ثم ادبر یسعیٰ

فحشر فنادیٰ، فقال انا ربکم الاعلیٰ　　فاخذہ اللہ نکال الآخرۃ والاولیٰ

موسیٰ کو فرعون کی ہدایت کا حکم ہوتا ہے، آپ معجزہ دکھاتے ہیں، وہ تکذیب نبوت کرتا ہے، اور قبطیوں کو مخاطب کرکے انا ربکم الاعلیٰ کہتا ہے، اس پر خدا فرماتے ہیں وہ دنیا اور آخرت کی بدبختی میں گرفتار ہوا،

ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے سیاق و سباق سے رومی کے شعر کو نسبت نہیں، اور خود رومی کے اس شعر میں تسلسل مضمون کا لحاظ پایا جاتا ہے، اوپر والے اشعار میں جستجوئے عشق کے لئے خیال ناموس سے بے التفاتی، فنا گزینی اور صحرا نوردی کی تلقین کی ہے، اس کے قبل ایک شعر ہے،

گے قبا بدرید و گہے بہ کوہ دوید　　گہے ز زہر چشید و گہے گزید فنا

یعنی عاشق کے لئے جامہ دری، فنا گزینی، لاپروائی ناموس، اور دشت پیمائی ناگزیر ہیں اب چونکہ ایک جان ناتواں کے ساتھ یہ سرشاریاں ہیں وکان الانسان ضعیفا اس لئے مولانا نے سیرت نبوی صلعم کے ایک نہایت اہم واقعہ غار ثور کی طرف اشارہ کیا ہے، جب آنحضرتؐ ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں چھپ گئے، تو دہانہ غار پر ایک کڑی نے جالا بنا دیا تھا یہ خیال رومی کے پہلے مصرعہ سے اور راسخ ہو جاتا ہے، کہ انھوں نے "عنکبوت" کے لئے "صید ہائے زفت" لکھا ہے، جس سے دونوں مبارک ذاتیں مراد ہیں اور اسکے بعد حام ربی الاعلیٰ" کے منتظر ہیں، یعنی جسطرح کڑی نے آنحضرتؐ اور ابوبکر صدیق کو اپنے جال میں گرفتار تو کر لیا، اسی طرح عشق اختیار کر کے نفس انسان نے مقامات ورد طے کر لئے، یہ گویا کڑی کی طرح "صید زفت" گرفتار کرتا ہے، لیکن جسطرح کڑی کے جال کو خدا نے متجسس کافروں کے مقابلہ میں کامیاب کر دیا اسیطرح دروہائے عشق کی مصیبتوں کو اٹھانے کے بعد نفس کو منزل عرفاں اسیوقت حاصل ہو سکتا ہے، "حب ربی الاعلیٰ" کا فضل ہو، چنانچہ نکلسن نے "صوفیائے اسلام" میں علامہ ہجویری کے حوالہ سے، اور مولانا محمد حسین سبزواری نے جواہر الاسرار شرح مثنوی معنوی میں تصوف کی اصطلاح "حال" کے متعلق بحثیں کی ہیں، جو محض ایک فیضان الٰہی ہے، اور ارادہ انسانی سے بالاتر، اس شعر میں "نزعت" کی آیت انا ربکم الاعلیٰ" کی بہ نسبت سورہ اعلیٰ کی آیت سبح اسم ربک الاعلیٰ سے زیادہ مناسبت ہے، ہرچند یہاں بھی ربی الاعلیٰ" کی بجائے "ربک الاعلیٰ" ہے

تو باز خاص بدی در وثاق پیر زنے　　چو طبل باز شنیدی بہ لامکاں رفتی

ڈاکٹر نکلسن نے "طبل باز" کی شرح میں لکھا ہے کہ مثنوی کے فرہنگ میں ایک جگہ اس کا یہ معنی بتایا گیا ہے کہ شکاری جب اپنے باز کو آسمان سے واپس لانا چاہتا ہے تو ایک نقارہ بجاتا ہے، چونکہ "باز" کو نقارہ کی آواز سے ایک انس رہتا ہے اس لئے وہ فوراً اتر آتا ہے،

اب مولانا کے شعر کا مطلب صاف ہے، یعنی ارجعی الی ربک (سورہ فجر) "طبل باز" کے مثل ہے، اور انسان کو اس کی آواز سننے کے بعد جلد از جلد طلب مولا کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

خاقانی کو تلمیحات میں خاص کمال ہے، اور اسکے قصائد میں واقعات کی طرف ایسے لطیف اشارے اور کنائے پائے جاتے ہیں، کہ شعر بعض اوقات ایک معمہ بنجاتا ہے، اس نے فسانہ، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، نجوم، قرآن، حدیث، فقہ تمام مسائل کے متعلق بے شمار تلمیحات پیش کئے ہیں، انوری، سلمان، ساوجی، حافظ، جامی وغیرہ کی طرح اس کے یہاں بھی بکثرت

قرآن مجید کے بعض فقرے اور واقعات قرآن کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

خاقانی کا ایک قصیدہ ہے، جس میں یہ اشعار ہیں۔

اگر نہ فضل تو زیادہ من رسیدیم است | کہ قتل من کند او وقت خشیۃ الاملاق

مدام در حق ملکت دعائے خاقانی | قبول باد زحق بالعشی والاشراق

پہلے شعر کے متعلق اگلے سطر میں لکھا جا چکا ہے، دوسری بیت میں بھی قرآنی استفادہ ہے، سورۂ ص میں ہے۔
انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق | اور ہم نے پہاڑوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ان کے ساتھ شام و صبح تسبیح کریں

خاقانی کے اس قصیدے میں ایک اور شعر ہے، جسکا قافیہ قرآن سے مستعار ہے، "وان مین خنقان دم زمانہ فواق"۔
یہاں "فواق" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں سورۂ ص کے اندر اسکا استعمال ہوا ہے۔

وما ینظر ھؤلاء الا صیحۃ واحدۃ ما لھا من فواق | اور یہ لوگ بس ایک زور کی چیخ کے منتظر ہیں جس میں دم لینے کی گنجائش نہیں۔

خاقانی کا ایک اور مطول قصیدہ بائیہ ہے جس میں اکثر قرآنی قوافی پائے جاتے ہیں۔

زمن حکیمے سوگند نامہ درخواست | بنام شاہجہاں قبلۂ اولو الالباب"

دعاش گفتم و اکنوں پناہ من بخداست | "الیہ ادعوا بر خواندہ ام" "والیہ مآب"

خسرو دہلوی کے دیوان میں جستجو کے بعد یہ شعر ملتا ہے۔

منم و شاہد بردارے خواجہ مودن | تو در مسجد خود زن والی ربک فارغب

اسمیں سورہ انشراح کی آیت سے لفظی استفادہ کیا گیا ہے۔

سلمان ساوجی کو علامہ شبلی موجد نکات اور خیال آفریں نہیں مانتے ہرچند اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ خواجہ سلمان کے قبل خاقانی قصیدہ گوئی کے وہ تمام دلآویز نقوش پیش کر چکا، جنھوں نے اسکی حیات کو غیر فانی بنا دیا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ اکثر متاخرین نے اپنے خیالات میں خاقانی سے مدد لی ہے، قصیدہ گوئی میں وہ تمام شعرا کا امام کہا جا سکتا ہے، بایں ہمہ سلمان ساوجی کے قصائد اپنی سادگی بیان، لطافت احساس، عذوبت الفاظ، غرابت معانی وغیرہ کے اعتبار سے بےمثل ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ میدان قصیدہ میں اُنھوں نے اپنی بالکل بدا گانہ راہ اختیار کی ہے۔

خاقانی کی طرح خواجہ سلمان نے بھی اپنے قصائد میں قرآنی الفاظ اور فقروں سے، استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں،

بزم اجابت ہمہ جنت عدنٍ خالدین | روز اعدایت ہمہ یوماً عبوساً قمطریرا

قرآن مجید میں سورۂ دہر کے اندر ہے، انا نخاف من ربنا یوماً عبوساً قمطریرا، ترجمہ ہم اپنے رب کی طرف

سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

اشکوت اولت سبع سموت طباق　　نقش درگاہ تو طبتم فادخلوہا خالدین

خواجہ سلمان نے پہلے مصرعہ میں سورۂ نوح کی آیت الذی خلق سبع سموات طباقا، اور دوسرے مصرعہ میں سورۂ زمر کی مفصلہ ذیل آیت سے استفادہ کیا ہے۔

وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا حتی　　اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے، گروہ گروہ کرکے جنت کیطرف روانہ

اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا　　کئے جائیں گے، یہانتک جب کہ پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے

سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین　　کھلے ہوئے ہونگے، تو وہاں کے محافظ ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مزے میں رہو، سو اس میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ

حور و ولدان پائے کوبان طرب چار روز بزم　　در طواف آیند غلمان بکاس من معین

معنی کے اعتبار سے شعر گویا سورۂ دہر کی آیت ویطوف علیھم ولدان مخلدون اور و یشربون من کاس کا ترجمان ہے، آخری تین الفاظ قرآنی ہیں، جو سورۂ صفت کی آیت سے لئے گئے ہیں "یطاف علیھم بکاس من معین"

(ان کے پاس لیا جام شراب لایا جاوے گا جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جاوے گا)

جنتے اینک رواں باجنت ورخت ساحت　　حور و مقصور و ورخت و طوبیٰ و ماء معین

اسمیں سورۂ ملک کی آیت فمن یاتیکم بماءٍ معین سے استفادہ کیا گیا ہے،

آفتابی از زوال مانور رحمت و اگیر　　آسمانی از سر ما ظل ہمت وا بدار

تا دعائے دولتت از سر امن و امان　　می کند اندر اناء اللیل و اطراف النہار

چوتھے مصرعہ میں سورۂ ھود کی مشہور آیت واقم الصلوٰۃ طرفی النہار و زلفاً من اللیل اور آپ اپنے نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں، اور رات کے کچھ حصہ میں سورۂ آل عمران میں ایک جگہ "اناء اللیل" استعمال ہوا ہے لیسوا سواءً من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیت اللہ اناء اللیل۔

بر براق فکر رایت عزم معراجے نہ ساخت　　کاسمان تسبیح "سبحان الذی اسریٰ" نہ کرد

اس کے متعلق رومی کے سلسلہ میں لکھا جا چکا،

بر گرفتی ز سر من ہمی سایۂ لطف　　سرد نورستہ "من انبتک اللہ" چرا

یہ غالباً اشارہ ہے، سورۂ نوح کی آیت واللہ انبتکم من الارض نباتا کی طرف اسمیں "انبتک اللہ" کا فقرہ تو نہیں تاہم قرآن کے لفظی استفادہ سے انکار نہیں ہو سکتا، اور تلمیح تو صاف ہے، خواجہ سلمان نے ایک دوسرے شعر میں سورۂ آل عمران کی آیت فتقبلھا ربھا بقبول حسن وانبتھا نباتا حسنا کی طرف اشارہ کیا ہے،

روح اندیشہ ز سر سدرہ گفت　　انبتھا اللہ نباتا حسن

حافظ اور جامی نے جس کثرت سے فارسی اشعار میں عربی فقرے اور مصرعے استعمال کئے ہیں، اسکی نظیر باوجود تلاش بھی (باستثنائے خاقانی) کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی، اور حق تو یہ ہے کہ عربی کلام کی اس آمیزش نے حافظ اور جامی کے کلام کو چار چاند لگا دئیے ہیں، حافظ کہتے ہیں،

بہ حسن عارض و قد تو بردہ اند پناہ — بہشت و طوبیٰ طوبیٰ لھم وحسن مآب

سورۂ ص کی آیت ہے، وان لہ عندنا لزلفی وحسن مآب اور ہمارے یہاں انکی قربت اور نیک انجامی ہے،

کدام طاعت شائستہ آید از من مست — کہ رنگ صبح ندانم ز فالق الاصباح

سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ اپنے متعلق فرماتا ہے، فالق الحب والنوی (تخم اور گٹھلیوں کا پھاڑنیوالا) اور فالق الاصباح (صبح کا پھاڑنیوالا)

قصۃ العشق لا انفصام لھا — وصمت ھھنا لسان لحال،

مطلب یہ ہے کہ قصہ عشق تو ختم ہو نہیں سکتا، لیکن زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ کیفیات عشق کی بسط و کشاد ہو سکے، یہاں بھی شعر کا فقرہ "لا انفصام لھا" قرآن سے مستعار ہے، فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا (بقرہ) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا، جسکو کبھی شکستگی نہیں۔

بیا ساقی بدہ رطل گرانم — سقاک اللہ من کاس دھاقا

ساقی! آ اور بڑے پیمانہ میں شراب دے اللہ تعالیٰ تجھے لبالب بھرے ہوئے جام شراب پلائے،

پندرہ اشعار کی ایک غزل ہے اور اسمیں کثرت سے عربی فقرے، مصرعے، اور پورے عربی اشعار پائے جاتے ہیں لہجہ اداسے بالکل معلوم ہوتا ہے، عربی خیالات کی اقتدا میں اشعار کہے گئے ہیں یعنی عہد اموی و عباسی کی عربی شاعری کا مزہ آرہا ہے، چنانچہ خود حافظ نے ایک شعر میں اقرار بھی کیا ہے،

بساز اے مطرب خوش خوان و خوش گوئے — بہ شعر پارسی صوت عراقی،

ہر چند "صوت عراقی" موسیقی میں ایک راگ ہے، جیسے "حجازی" "نیم شبی" وغیرہ لیکن "شعر پارسی" کہکر حافظ صاحب نے اسکی خصوصیت کو تعمیم سے بدل دیا ہے، یا پھر یوں کہئے اسے ذو معنی کر دیا ہے، بہرحال یہاں بھی حافظ صاحب نے سورۂ نبا کی آیت سے استفادہ کیا ہے، ان للمتقین مفازا ٭ حدائق واعنابا ٭ وکواعب اترابا ٭ وکاسا دھاقا، ساتھ ہی بیان میں حافظ نے غضب کی شوخی اور ظرافت پیدا کر دی ہے، جس سے مقصود "بخیۂ وضع زاہدان خام" کو چھیڑنا ہے۔

مولانا جامی نے غزلیات میں بالکل حافظ کا تتبع کیا ہے، اور انکا کلام اکثر حافظ سے ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ جامی کے اشعار میں صوفیانہ خیالات کا غلبہ ہے، اور حافظ کی غزلیات میں رندانہ خیالات کا،

شد برقع روئے چو مہت زلف شب آسا — سبحان قد جعل اللیل لباسا

یعنی معشوق کا چہرہ ماہتاب کے مثل ہے، اور اُس کا زلف شب کے مثل ہے، تو اس صانع مطلق کی حکمت بالغہ قابل تعریف ہے، کہ اُس نے رات کو پردہ کی چیز بنادیا، یعنی زلف محبوب اُسکے رُخ انور کا پردہ دار ہے، جامی نے بھی سورہ بنا کی آیت وجعل اللیل لباسا سے استفادہ کیا ہے،

خوش آں برق رخشاں کہ از کوئے جاناں — درخشد چو بر آسماں نجم ثاقب

"سورہ طارق" میں وما ادرک ما الطارق ؟ النجم الثاقب (اور آپکو معلوم ہے، وہ رات کو نمودار ہونیوالی چیز کیا ہے ؟ وہ روشن ستارہ ہے) ہے قرآن مجید میں ستاروں کا بیان ہے، اور جامی نے بھی اس معنی میں استعمال کیا ہے،

چشمت بہ غمزہ لب بہ شکر خندہ می کند — تفسیر آیت خلق الموت والحیات

چشم محبوب سے غمزہ ٹپکتا ہے، اور یہی عشاق کے لئے موت کا سامان ہے، لب معشوق اپنی شیرینیت کے لئے امتیاز رکھتا ہے، تو یہ گویا حیات کی تفسیر ہوئی، یہ فقرہ "سورہ ملک" کی آیت وخلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً سے مستفاد ہے،

بس دلکش است قصۂ خوباں زماں میاں — تو یوسفی وقصہ تو "احسن القصص"

محبوبان عالم کا فسانہ تو یوں بھی دلکش ہوتا ہے، لیکن تم چونکہ یوسف زماں ہو، اس لئے تمہارا افسانہ بھی احسن القصص (بہترین قصہ) ہے اسمیں جامی نے لفظاً اور معنی دونوں اعتبار سے استفادہ قرآنی کیا ہے، حیات یوسفی کو خود اللہ تعالےٰ احسن القصص سے تعبیر کرتا ہے۔ نحن نقص علیک احسن القصص،

جامہ ز غم کبود کنم چوں نمی رسد — بر نیل معصیت زخم "صبغۃ اللّٰہم"

اسمیں جامی عمدہ استعارہ لائے ہیں، پہلے مصرعہ میں جامہ کبود اور دوسرے مصرعہ میں "نیل معصیت" کی رعایت لفظی قابل داد ہے سورہ بقرہ کی مشہور آیت ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ

اے برخت ہر نفس مہر دلم افزوں — وجہک شمس الضحیٰ "ونحن لہ عابدون"

اے وہ کہ تمہارے رُخ سے ہر گھڑی میری قلبی محبت بڑھتی ہے، تمہاری صورت دوپہر دن چڑھے آفتاب کی طرح ہے، اور ہم اسکے پوجاری ہیں،

قرآن مجید میں ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون۔

ابروے وقد خوشت صورت "نون والقلم" — نقش خط دلکشت معنی "ما یسطرون"

سورہ "نون والقلم" کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالےٰ نے نبی صلعم کی تعریف کی ہے، "وما یسطرون" اسی ابتدائی سورہ کا ایک فقرہ ہے، جامی نے نعت میں یہ شعر کہا ہے، یعنی سورہ نون والقلم کے لفظ "نون" کی طرح آنحضرت کا ابرو خمدار ہے چونکہ "نون" کی شکل خمدار رہتی ہے اور آپکا قد "قلم" کی طرح بلند بالا اور سیدھا ہے، اور آپکا حلیہ مبارک گویا تفسیر ہے،

"وما یسطرون" کی یعنی اللہ تعالےٰ کی قدرت نگارش آپکی صورت سے ٹپک رہی ہے غالب کہتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کسکی شوخیٔ تحریر کا ۔۔۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

عرفی کی غزلیات میں باوجود تلاش بھی کوئی ایسا شعر نہیں ملتا، عرفی نے اپنی غزلیات میں عربی فقرے اور مصرعے بہت کم استعمال کئے ہیں، کلیات حزیں میں البتہ فارسی اشعار کے ساتھ عربی فقروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔

بہ افسون لبے چوں نے حزیں ازخود تہی گشتم ۔۔۔ تو آگاہی زحال بیخوداں اے عالم النجویٰ

یہ سورہ مجادلہ کی مفصلہ ذیل آیات کی طرف اشارہ ہے جنیں نجویٰ (کانا پھوسی) کے تفصیلی ہدایات ہیں۔

الم تر ان اللہ یعلم ما فی السموٰت والارض	کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا آسمان اور زمین کے تمام حالات سے مطلع ہے
ما یکون من نجویٰ ثلاثۃ الا ھو رابعھم	کسی خفیہ صحبت میں تین آدمی نہیں ہوتے مگر یہ کہ چوتھا خدا ہوتا ہے
ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنیٰ من	اور پانچ آدمی نہیں ہوتے مگر یہ کہ چھٹا خدا ہوتا ہے، اور اس سے
ذالک ولا اکثر الا ھو معھم۔	کم یا زیادہ آدمی نہیں ہوتے، مگر یہ کہ خدا انکے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں معنی اور لفظ دونوں اعتبار سے استفادہ پایا جاتا ہے، اسی طرح حزیں کا دوسرا شعر ہے،

حزیں نہ باشد غم نہانی سحر نمودن زنختہ دانی ۔۔۔ کہ یار جانی چنانکہ دانی بکل شیٔ احاط علما

اسمیں شک نہیں حزیں نے سورۂ طلاق کی مفصلہ ذیل آیت سے استفادہ کیا ہے۔

اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیٔ قدیر وان اللہ قد احاط بکل شیٔ علما۔

لیکن قرآن مجید میں "احاطہ بکل شیٔ علما" ہے، حزیں نے ضرورت شعریہ کے لحاظ سے الفاظ الٹ دیئے ہیں۔ "بکل شیٔ احاط علما" کہا ہے، استفادہ قرآنی کا یہ معیوب طریقہ ہے، اور اس کی نظیر اساتذہ کے کلام میں مشکل سے ملتی ہے۔

تلمیحات قرآنیہ

شعرائے فارس نے استفادہ قرآنی کی دوسری صورت یہ اختیار کی تھی، کہ رمزیات (SYMBOLISM) کے طور پر قرآن مجید کے تفصیلی واقعات کی طرف اشارے کرتے، چنانچہ اُنھوں نے اس موضوع کے لئے چند واقعات مخصوص کر لئے ہیں، واقعات حضرت داؤد وسلیمان، ابراہیم و نمرود، یعقوب و یوسف، موسیٰ و خضر، اور عیسیٰ اسکے لئے امتیاز رکھتے ہیں اور انھیں کے اجزا و تفصیلات کے متعلق فارسی شاعری میں اشارے پائے جاتے ہیں۔

یوسف و زلیخا کے واقعات حسن و عشق، گریہ یعقوب، یوسف کا دور غلامی، اور دور سلطنت، دیوار خضر، چشمہ حیوان، بدرقہ راہ، عصائے موسیٰ، ید بیضا، دم عیسیٰ، احیائے موتیٰ، مائدہ سما کے متعلق مختصر الفاظ میں ایسی ایسی دقیقہ سنجیاں کی گئی ہیں کہ اگر واقعات قرآن پر نظر نہ ہو، تو ایسے اشعار کا سمجھنا ناممکن ہے اور بالفرض صرف واقعات ہی معلوم ہوں

تو بھی الفاظ کی نکتہ آفرینیاں قلب سامع پر وہ کیفیات طاری نہیں کرسکتیں، جو الفاظ قرآن کا علم رکھنے کے بعد پیدا ہوسکتی ہیں۔

لحنِ داؤد و بادِ سلیمان

چو گل سوار شود بر ہوا سلیمان وار
سحر کہ مرغ در آید بہ نغمۂ داؤد (حافظ)

حافظ از دولت عشق تو سلیمانی یافت (حافظ) یعنی از وصل تو اش نیست بجز باد بدست

پست شد خسرو مسکیں بہ لکد کوب فراق (خسرو) مور در خاک فرو رفت سلیماں چو نشست

چہ بود سے کہ یک مرغ پراں شد سے (رومی) بر و طوق سرّ سلیماں با

پہلے شعر میں "لحن داؤد" اور پہلے اور دوسرے اشعار میں حضرت سلیمان کے اس عالمگیر قبضہ و اقتدار کی طرف اشارہ ہے، جسکا بیان قرآن میں "سورۂ انبیاء" کے اندر وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر (اور ہمنے داؤد کے ساتھ پہاڑ کو تابع کردیا تھا کہ وہ تسبیح کیا کرتے تھے، اور پرندوں کو بھی) اور ولسلیمٰن الریح عاصفۃ تجری بامرہٖ الی الارض التی بارکنا فیھا (اور ہمنے سلیمان کا زور کی ہوا کو تابع بنادیا تھا، کہ وہ انکے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی تھی) آیا ہے، حافظ صاحب نے صبح کے وقت نغمۂ طیور، اور شگفتگی گل منظر دکھایا ہے، اور اسکے لئے "باد سلیمان" اور "تسبیح داؤد" کی تشبیہ لائے ہیں۔

خسرو اور رومی نے "سورۂ نمل" کی مفصلہ ذیل آیات کی طرف اشارہ کیا ہے،

حتی اذا اتوا علی واد النمل قالت نملۃ یا ایھا النمل ادخلوا مسٰکنکم لا یحطمنکم سلیمٰن وجنودہ وھم لا یشعرون فتبسم ضاحکا من قولھا (یہانتک کہ جب وہ (سلیمان) چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تمکو سلیمان اور انکا لشکر بیخبری میں نہ کچل ڈالیں۔)

اذھب بکتابی ھذا فالقہ الیھم (سلیمان نے کہا) یہ خط لے جا (ہدہد کو خطاب ہے) اور اسکو انکے پاس ڈال دینا (یعنی قبیلہ سبا میں)

اب خسرو اور رومی کے اشعار کا مطلب صاف ہے، خسرو فرماتے ہیں کہ میرا محبوب بمنزلہ سلیمان ہے اور میں اسکے آگے ایک چیونٹی کے مثل ہوں، اسکے فراق میرا ایسا ہی ہوں، جسکا کھٹکا "لا یحطمنکم" لکر ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو دلایا تھا، کہہ سکتے ہیں کہ "مور در خاک فرو رفت سلیماں چو نشست" لکر جناب خسرو نے اپنے معشوق پر تعریض کی ہے، یعنی حضرت سلیمان تو چیونٹی کے کلام پر ہنس پڑے، انکو تو چیونٹی کی خبر ہوگئی، لیکن نہ معلوم میرے محبوب کو میری پامالی کی اطلاع

رومی کے یہاں صوفیانہ خیال ہے، اور وہ اپنے "طائر روح" کے گردن میں سلیمان کی طرح اپنا خط قبیلہ سبا کی شاہزادی بلقیس کی بجائے "جو نشیمن فانی" کی ملکہ ہے، وہاں بھیجنا چاہتے ہیں جسکی تمنا علی حزیں لاہجی نے اس شعر میں ظاہر کی ہے،

تو رشک یوسف مصری فتادہ در چہ تن
تو باز کنگر عرشی بہ خاکدان چونی،

گلخن ابراہیم

چراغ عشق بہ گلخن شود دلیل مرا
بہ کشت گلخن خود می برد خلیل مرا
(عرفی)

یعنی محبت کی رہنمائی یہ ہے کہ میں دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑوں، جو میرے نزدیک کسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے اس گلخن (آگ کی بھٹی) سے کم نہیں جس میں چمن کا لطف حاصل تھا، یہ بھی قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

قالوا حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین ۞ قلنا یا نار کونی بردا و سلاما علی ابراہیم

وہ لوگ (نمرود اور اُسکے رفقا) کہنے لگے انکو (ابراہیم) آگ میں جلا دو، اور اپنے معبودوں کا بدلہ لو، اگر تم کو کچھ کرنا ہے، اور ہمنے کہا اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند بن جا (ابراہیم کے حق میں)

صبر ایوب

ناصبوری گر کند عرفی دلم عیش مکن
ناصبوری شرط اصلاحست ایوب مرا

عرفی نے قرآن مجید کے واقعہ سے استفادہ عکسی کیا ہے، حضرت ایوب بڑے صابر تھے، انکی اولاد، دولت، جائداد تمام چیزیں تباہ ہوگئیں، آخر میں جسم سڑ گیا، کیڑے پڑ گئے، تاہم وہ لذت صبر سے آشنا رہے، آخرکار کردگار عالم نے اس صبر و تحمل کے صلہ میں انھیں پھر یہ نعمتیں عطا کردیں، اسی کا تذکرہ سورۂ انبیا میں ہے،

وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین فستجبنا لہ فکشفنا ما بہ من ضر واتینٰہ اھلہ ومثلھم معھم رحمۃ من عندنا

اور ایوب کا تذکرہ کیجئے، جبکہ اُنھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھکو یہ تکلیف پہونچ رہی ہے، اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں، سو ہم نے انکی دعا قبول اور انکو جو تکلیف تھی اُسکو دور کر دیا، اور ہمنے انکو انکا کنبہ عطا فرمایا اور انکے ساتھ انکے برابر اور بھی اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے۔

عرفی کہتے ہیں کہ حضرت ایوب کی اصلاح کا سبب تو صبر اور جفاکیشی تھی، میری اصلاح کے لئے ناصبوری شرط ہے اور اس لئے میرے دل ناصبور کا گلہ نہیں کرنا چاہیئے۔

(باقی دارد)

(عبدالمالک آروی)

دو گھنٹے جہنم میں

صبح تک میں خود بھی اپنے آپ کو ایسا بیمار نہ سمجھتا تھا کہ وصیت کی فکر کرتا یا اُن سب ناتمام کاموں کا انتظام کرجاتا جن کو میں کبھی اپنی ۴۰ سال کی عمر میں پورا نہ کر سکا تھا اور نہ شاید کبھی انجام تک پہونچا سکتا، خواہ اتنی ہی عمر اور کیوں نہ ملجاتی، صرف کبھی کبھی قلب کے حوالی میں درد کی چمک محسوس ہوتی تھی اور میں سینہ پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا، دوپہر تک مجھے اور سب کو یہی یقین رہا کہ ریاح کا تحالف ہے، فکر کی بات نہیں، لیکن جب شام کے وقت درد کے شدید پے درپے حملوں نے تشویش پیدا کی تو ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ یہ میرے پرانے رفیق تھے۔ ان کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ اِس زمانہ میں لوگ تداخل فصلین کے وقت بھی اس قدر بیمار نہیں پڑتے، جتنے پہلے اچھے موسم میں صاحب فراش ہوجاتے تھے، اس میں شک نہیں کہ آدمی ذہین تھے، تجربہ کار تھے، لیکن معلوم نہیں کیوں وہ ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ بہرحال وہ اس کی تاویل ہی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی نبض دیکھی آنکھوں کے پپوٹے چیر کر معائینہ کئے، زبان نکلوا کر اسکا رنگ دیکھا اور پھر آلہ سینہ پر رکھ کر ضربات قلب کی حالت دیکھی اور حد درجہ مایوسانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر میرے اعزہ اور تیمارداروں سے کہا کہ "آپ لوگ اگر چند منٹ کے لئے باہر چلے جاتے تو بہتر تھا۔" میں اسوقت سکون کی حالت میں تھا۔ جب تنہائی ہوگئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ بہت جری آدمی ہیں اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ گھبرائیں گے نہیں اگر میں یہ کہوں کہ آپ جلد سے جلد اپنی وصیت مرتب کرلیجئے اور جو ہدایتیں اپنے پسماندگان کو کرنا ہیں۔ کردیجئے، کیونکہ آپ کے قلب کی حالت بہت نازک ہے اور مشکل ہی سے شاید دو گھنٹے اور وہ اپنا کام کرسکے"۔

اس میں کلام نہیں کہ میں فطرتاً بہت جری ہوں اور بڑی سی بڑی مصیبت میں بھی کبھی نہیں گھبرایا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسقدر ناگہاں طور پر مجھے صرف دو گھنٹہ کا نوٹس، اُس دنیا سے چلے جانیکا دیا جس میں میں اپنی زندگی کے چالیس سال اس قدر انہماک و تعلق شدید کے ساتھ بسر کر چکا تھا — میں واقعی گھبرا گیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا کہ میں کمزور طبیعت کا انسان نہیں ہوں، لیکن یہ غلط ہوگا کہ اگر یہ کہا جائے کہ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرا خیال کیا یقین تھا کہ کم از کم ۸۰ سال ضرور جیوں گا، کیونکہ میری صحت اچھی تھی، میرے قوا صحیح تھے، بیمار بہت کم پڑتا تھا، پورے دو من کا وزن رکھتا تھا اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ مجھے دنیا میں بہت سے کام کرنا تھے اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ فطرت اسقدر ظالم ہوسکتی ہے کہ وہ مجھے قبل از وقت اُٹھالے درآنحالیکہ میرے رہنے سے اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اس لئے جب میں نے یہ سنا کہ ۸۰ سال میں سے دفعتہً ۴۰ سال کم ہوگئے ہیں اور میں اپنے تمام کاموں کو ادھورا چھوڑ جانے پر مجبور ہوں، تو میری تمام جرات و ہمت مفقود ہوگئی، اور میری حالت اس کبوتر کی سی ہوگئی جو باز کے پنجہ میں پہونچکر، بازو پھٹ پھٹانے کی بھی قوت

کھو بیٹھتا ہے، سب سے پہلے مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ اس صدمہ کو کیونکر برداشت کریں گی، بیس برس کی میعت کا یوں دفعتہً ختم ہوجانا، ان کو کسقدر بیتاب کر دے گا، اس کے بعد میں نے سوچا کہ میرے دو بچے جن کی تعلیم بھی ابھی پوری نہیں ہوئی کیا کرینگے۔ میری چھوٹی بچی جو مجھی کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے، کیونکر زندہ رہ سکے گی، روپیہ اپنی بے احتیاطیوں کی وجہ سے کبھی پس انداز نہیں کرسکا، کاروبار کی حالت درست نہیں اور ہو بھی تو اس کا چلانے والا کون ہے، بیمہ کی رقم بھی اتنی نہیں کہ بیوی بچوں کے لئے معقول سہارا ہوسکے۔ الغرض یہ تمام ہولناک خیالات مجسم ہو ہو کر سامنے آگئے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ جسم کے ریشہ ریشہ میں کسی نے برف پگھلا کر بھر دیا ہے۔ سرد پیشانی سے ٹھنڈا پسینہ بہ بہ کر ٹپکنے لگا، اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے پڑگئے گویا کہ اُن کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی جواب دوں لیکن زبان نے کام نہ دیا اور میں بیہوش ہوکر وہیں پلنگ پر گر پڑا.......

اس کے بعد مجھے مطلق ہوش نہیں کہ میں کب مرا اور کس وقت قبرستان پہونچایا گیا۔

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ سامنے سے ایک بڑا شعلہ چلا آرہا ہے، لیکن تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اس کی روشنی بالکل نہیں پھیل سکتی اور گرمی کی شدت سے دم گھٹا جارہا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے تو معلوم ہوا کہ میں کسی گڈھے کے اندر بند ہوں اور جگہ اس قدر تنگ ہے کہ اُٹھکر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ وہ شعلہ بڑھتے بڑھتے قریب آیا اور دو حصوں میں تقسیم ہوکر میرے دونوں پاؤں کے اوپر قائم ہوگیا۔ اب گرمی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اور کیفیت یہ تھی کہ جسم پسینہ کے ساتھ گھلا جارہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹنے چاہے کہ کہیں یہ دونوں شعلے مجھے جلا نہ دیں، لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں روشنیاں طول میں بڑھنے لگیں، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک بہت لمبی سلاخ سی بن گئی، اور عجیب قسم کے بھیانک سے چہرے ان میں سے پیدا ہوکر میری طرف گھورنے لگے۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہوگئیں اور عجیب قسم کی ہیبت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ کہیں نکیرین یہی تو نہیں ہیں۔ جنکا ذکر میں نے کتابوں میں دیکھا تھا، اور اس خیال کے آتے ہی میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا نہایت ہی وزنی گرز سر پر مار رہے ہیں اور میرا دماغ پاش پاش ہوا جارہا ہے۔ میں چیخ اُٹھا کہ خدا کے لئے مجھے کیوں مارتے ہو اُنھوں نے کہا کہ "آج تو ہمیں خدا کا واسطہ دلاتا ہے، لیکن یہ تو بتا کہ کبھی تونے بھی خدا سے کوئی واسطہ رکھا تھا، تونے اُسکو ہمیشہ ایک قوت سمجھا اور قوت بھی مجبور قسم کی جو مقررہ اصول کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی۔ پھر آج کیا ہوا جو اُسکی پناہ میں آنا چاہتا ہے"۔

اب مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ "یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بات کا جواب بھی نہیں سنتے اور مارنا شروع کر دیتے ہو۔ مجھ سے سوال کیا ہے تو اُس کا جواب سُن لو پھر مارنے نہ مارنے کا تمہیں اختیار ہے"۔

وہ لفظ "انسانیت" سن کر بہت ہنسے۔ (ان کی ہنسی بہت ہی مہیب قسم کا زہرخند تھی) اور بولے کہ "اے بیوقوف "انسان" اور "انسانیت" یہ سب دنیا اور مادی عالم کی اصطلاحیں ہیں، یہاں ان کا استعمال درست نہیں۔ پھر یہ کہ ہم انسان کب ہیں جو ہم سے انسانیت کی توقع رکھتا ہے۔ ہم لوگ فرشتے ہیں، فرشتے، یوں ہی گرز چلاتے چلاتے نامعلوم زمانہ

گذر گیا ہے اور دشمنی کی وہ آگ جو آدم کی پیدائش کے وقت سے مخفی طور پر ہماری مخلوق میں انسان کی طرف سے بھڑکتی آرہی ہے، اُسے اسی طرح بجھایا کرتے ہیں۔ بیشک ہم نے آدم کو سجدہ کیا تھا، لیکن وہ سجدہ مجبوری کا تھا، نہ کہ دلی خوشی کا"

میں نے یہ خیال کرکے کہ انکی گفتگو سے تو کچھ خدا کی طرف سے بھی بیزاری پائی جاتی ہے، بہت خوش ہوکر کہا کہ "سچ کہتے ہو، واقعی تمہاری سخت توہین کی گئی، کہ خاک کے پتلے کے سامنے جھکنے پر مجبور کئے گئے۔ اس لئے اگر تم لوگ مجھے مہلت دو، تو میں تمہیں خدا کی بندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے آمادہ ہوں، اور سچ پوچھو تو خدا تمہیں کو ہونا چاہیئے کہ تمہارے گرز سے سام ونریمان، رستم واسفندیار کا کلیجہ بھی دہل سکتا ہے۔ میں نے تو خدا کا واسطہ صرف اس عادت کی بنا پر دلایا تھا جو دنیا کی زندگی میں پڑگئی تھی، اور جس سے مقصود گفتگو میں زور دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھا تو مجھے اُٹھاؤ اور اس تاریک غار سے باہر نکالو تاکہ میں آزادی سے سانس لیکر سوچوں کہ کیونکر تمہاری خدائی دنیا میں قائم ہوسکتی ہے"۔

وہ یہ سُن کر بہت ہنسے اور بولے کہ "ساری عمر میں تو ہی آج پہلا مُردہ ایسا ملا ہے جو ہمیں بہکا کر خدا سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔ احمق تجھے نہیں معلوم کہ ہماری تمام حرکتیں مشین کی طرح ہیں، اور ہمکو نہ سوچنے کا اختیار ہے، نہ اُس کے علاوہ کچھ کرنے کا، جو بلے اختیارانہ طور پر ہم سے سرزد ہوتا رہتا ہے، زیادہ بک بک نہ کر، اُٹھ، جہنم تیرا انتظار کر رہا ہے، اور آگ کے شعلے تجھے ڈھونڈھ رہے ہیں"۔

اب مجھکو پہلی مرتبہ واقعی طور پر معلوم ہوا کہ میں مرگیا ہوں اور جہنم کا نام سُنکر پھر میرے حواس نے جواب دینا شروع کیا۔ آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ نکیرین غائب ہیں۔ اور میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے تپتے ہوئے ریگستان کے اوپر سے گھسیٹتی ہوئی کسی طرف لئے جارہی ہے۔ ادھر، ادھر جو میں نے نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ دور دور فاصلہ پر مجھ ایسے سینکڑوں مُردے گھسیٹے جارہے ہیں۔ انیں سے کوئی چیخ رہا ہے کوئی تڑپ رہا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو میری طرح بالکل خاموش ہیں، اور خدا جانے بیچارگی کے ساتھ گھسیٹے جارہے ہیں۔ تھوڑی دور چلکر میں نے دیکھا کہ ہر مردہ کی سمت رفتار بدل گئی ہے، اور اب میں تنہا رہ گیا ہوں، وہ زنجیر دفعۃً مجھے غار تک پہونچا کر غائب ہوگئی۔ اور میں اُس کے اندر اس تیزی سے جانے لگا جیسے کوئی اژدہا اپنی گرم و مسموم سانس سے کھینچ رہا ہو، مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک اسطرح گھسٹتا رہا، دفعۃً یہ کشش بھی دور ہوئی، اور میں نے اپنے آپ کو ایسے میدان میں پایا جو حد نظر تک وسیع تھا اور آگ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سُرخ آندھی چھائی ہو۔ جا بجا چنگاریوں کے بگولے بلند ہو رہے تھے۔ اور کہیں کہیں آگ کے فیل پیکر شعلے جن میں سے بعض بالکل تاریک تھے، اور بعض بالکل سفید، اس طرح اُٹھ رہے تھے۔ جیسے طوفان میں سمندر موجیں لے رہا ہو۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا، زبان باہر نکل پڑی تھی، تالو چٹخا جارہا تھا، اور حلق میں کانٹے پڑگئے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں سے کھولتا ہوا پانی ہی میسر آجائے لیکن بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ پر عذاب ہی ہونا ہے، تو وہ کیوں نہیں شروع ہوجاتا، اور کیوں

نہیں مجھے آگ میں ڈالدیا جاتا تاکہ جل بھن کر خاک ہو جاؤں اور اس تکلیف سے نجات پاؤں۔ ناگہاں ایک فرشتہ سامنے سے اُترتا ہوا نظر آیا۔ جس کے پر و بازو شعلہ کی طرح چمک رہے تھے، اور جس کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کھولتا ہوا تانبہ۔ اس چہرہ میں صرف ایک آنکھ چاندی کی طرح درمیان میں چمک رہی تھی جس کے اندر سے کبود رنگ کی شعاعیں، ببول کے کانٹوں کی طرح نکل نکل کر جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ میرے سامنے آکر قائم ہو گیا اس حال میں کہ اُس کا سارا جسم ایسا نظر آتا تھا، جیسے گندھک کے ڈھیر میں آگ دیدی گئی ہو۔

اُس نے کہا "تمہارے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ فی الحال چند دن تک جہنم میں آزاد چھوڑ دئے جاؤ اور سوائے اس ایذا کے جو یہاں کی فضا میں از خود تمہیں پہونچ جائے کوئی اور عذاب مسلط نہ کیا جائے"۔

یہ کہکر فرشتہ دھوئیں کی شکل اختیار کر کے فضا میں از خود تحلیل ہو گیا اور میں حیران کہ آزادی بھی ملی تو کہاں جا کر، لیکن اس خیال سے کہ خیر فردوس کی پابندی سے بہرحال جہنم کی آزادی بہتر ہے، آگے بڑھا اور یہ دیکھکر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اب بجائے چٹیل میدان کے نہایت وسیع قلعہ کا سا حصار سامنے تھا۔ میں اُس پھاٹک پر تھا جو سرنگ کی طرح بالکل تھا۔ وفعتہً دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک طرف نہایت وسیع جھیل کھولتے ہوئے پانی کی تھی، جس میں نئے مردے لا لاکر غوطہ دئے جارہے تھے۔ اور اس طرح گویا سب سے پہلے اُن کی چربی نکالنے کی رسم پوری ہو رہی تھی۔ عفونت سے دماغ سڑا جارہا تھا اور چیخ پکار سے کلیجہ دہلا جاتا تھا۔ داہنی طرف نگاہ گئی تو بہت سے آہنی مکان نظر آئے، جنکی دیواریں بلند تھیں لیکن شعلے اُن کے اوپر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر مکان کا ایک دروازہ تھا، لیکن بہت تنگ اور اُسکے اندر سے بھی دہکتی ہوئی آگ اس طرح نظر آتی تھی جیسے انجن کی بھٹی دروازہ کھلنے کے بعد ——

سب سے پہلے مکان کے دروازہ پر آتشیں حروف میں ابلیس کے نام کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ لیکن یہ مکان مکین سے خالی تھا، کیونکہ قیامت کے دن تک یہ دنیا میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اندر صرف دھواں سا اُٹھ رہا تھا اور آتشکدے ہنوز روشن نہیں کئے گئے تھے،

اس کے پاس ہی دوسرے مکان پر فرعون کا نام درج تھا۔ یہ نام دیکھتے ہی تمام وہ جھگڑے سامنے آگئے۔ جو اُسکے اور موسیٰ کے درمیان پیدا ہوئے تھے اور بیتابانہ اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک نہایت ہی مہیب شکل کا انسان بیتابانہ ایدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا ہے۔ تمام جسم میں اُسکے سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں۔ اور وہ اُن کے زہر کی تکلیف سے بیچین ہو کر قریب ہی ایک گڑھے میں جس کا پانی سرد معلوم ہوتا ہے کود پڑتا ہے۔ لیکن اس کے کودتے ہی آگ لگجاتی ہے، اور وہ پھر وہاں سے گھبرا کر باہر نکل آتا ہے۔ میں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر کچھ حالات دریافت کروں لیکن اس کی بیتابی کسی ایک جگہ لمحہ بھر کے لئے بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتی تھی، اس لئے میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ سامنے اسکے عذاب کا مفصل پروگرام دیوار پر منقوش تھا اور اسکے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہزار طرح کے عذابوں میں سے یہ صرف دوسرے قسم کا عذاب تھا جو ایک ہزار

سال تک اسی طرح قائم رہے گا، اس کے بعد تیسرے عذاب کا زمانہ آئے گا۔ پھر چوتھے کا یہانتک کہ جب یہ ہزار قسم کے عذاب پورے ہو جائیں گے تو پھر دس لاکھ سال کا دوسرا پروگرام بنایا جائے گا۔

میں گھبرا کر یہاں سے نکلا، تو قریب ہی قریب، ہامان و شداد کے مکان نظر آئے، لیکن میں اندر نہیں گیا۔ اسیطرح قارون، نمرود، سامری، ضحاک وغیرہ کی عذاب گاہوں سے گزر گیا، لیکن جب دفعتہً میری نگاہ کلیو پٹرا کے بورڈ پر پڑی تو میں ٹھہر گیا، کیونکہ مجھے اسکی زیارت کا بڑا شوق تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ دیکھوں اس میں وہ کونسی بات تھی۔ جسنے مصر قدیم کو دیوانہ بنا رکھا تھا، اندر گیا تو سب سے پہلے ایک آتشیں آبشار نظر آئی جو ایک سنگین مورت پر تیزی کے ساتھ گر رہی تھی، جس وقت اس آبشار کی دھار اُس بُت پر پڑتی تھی تو فوارہ کی شکل میں اس سے چنگاریاں بلند ہونے لگتی تھیں، یہ بُت کلیوپٹرا کا تھا، بلند بالا۔ پُر شباب، آشفتہ گیسو، اور سر سے پاؤں تک بالکل عُریاں و بے پردہ۔ میں حیران تھا کہ اگر کلیوپٹرا کو پتھر بنا کر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے تو اسکو خدا کے جمالیاتی ذوق کی رعایت کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ دفعتاً وہ بُت شق ہوا اور اُسکے اندر سے ایک عورت شکل و صورت اور خد و خال کی نمودار ہوئی۔ اُس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلے موتی کی طرح جھلک رہے تھے، لبوں سے خون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر آبلوں پر رنگین خط ڈالتے ہوئے نیچے گر رہے تھے، گلے میں سفید انگاروں کا ایک ہار پڑا ہوا، آگ کی لپیٹ سے جنبش میں آ آ کر جسم سے مس کرتا تھا اور ہر بار اُس کے گورے گورے جسم پر ایک سُرخ نشان چھوڑ جاتا تھا، اس عالم میں بھی اس پر ایک شاہانہ جمال کا رنگ پیدا تھا۔ اور قیصر و انطانی اگر اس حال میں بھی اُسے دیکھ لیتے، تو شاید اس سے دوبارہ ملجانے کے گناہ میں ایک عمر دوزخ اور بسر کرنیکے لئے آمادہ ہو سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اسکی وہ نگاہیں دیکھوں جنسے مسحور ہو کر انسان خوشی سے جام زہر پی جایا کرتا تھا، اسکی لانبی لانبی پلکیں خون تو ضرور ٹپکاتی رہیں، لیکن اُسکی نگاہوں نے بلند ہو کر فضا کو مسموم نہیں کیا، تھوڑی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ بُت پھر شق ہوا اور اُسکے اندر کلیوپٹرا سمانے لگی، یہ غالباً اُس کے لئے سب سے بڑا عذاب تھا، کیونکہ جتنا حصہ اس کے جسم کا پتھر میں تبدیل ہوتا جاتا تھا اس قدر زیادہ اس کے چہرہ سے کرب و ملال کے آثار ظاہر ہوتے جاتے تھے، یہانتک کہ جب گردن تک وہ پتھر کی ہوگئی تو ایک ایسی چیخ اُس کے منہ سے نکلی جیسے سینکڑوں من بوجھ کے نیچے دب گئی ہو اور پھر دفعتہً اُس کا چہرہ و سر بھی اسی سنگین حالت میں منتقل ہو گیا۔ دوزخ میں آنیکے بعد یہ پہلا منظر تھا جسنے بجائے غم و غصہ کے ملال کی کیفیت میرے اندر پیدا کی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے نینوا و بابل کی اس مشہور رقاصہ کا مکان ملا۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہاروت ماروت کو مبتلائے حسن کر کے اس نے اسم اعظم سیکھ لیا تھا اور آسمان پر زہرہ بنکر اُڑ گئی تھی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ آسمان پر اُڑ جانا غلط خبر تھی، بلکہ وہ قعر جہنم میں ہاروت ماروت کے ساتھ پھینکدی گئی تھی۔ میں اُس کے بھی دیکھنے کا شائق تھا اس لئے اندر گیا۔ یہاں میں نے نہایت ہی تاریک دھواں دیکھا، جس میں چنگاریاں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں۔ دیر تک آنکھیں

ملنے کے بعد اسی تاریکی میں دور ایک عورت نظر آئی۔ جو انگاروں پر لوٹ رہی تھی، اس کے جسم سے چربی اور خون کے جو قطرے ٹپک ٹپک کر آگ پر گرتے تھے، تو سخت عفونت پیدا ہوتی تھی۔ میں یہاں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکا اور فوراً ناک بند کرکے باہر نکل آیا۔

میں یہاں سے نکل کر کہاں گیا، اور کن کن لوگوں کو عذاب میں مبتلا پایا، اسکی تفصیل کو آئندہ صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب اُس طبقہ میں پہونچا جو صرف شاعروں کے لئے مخصوص تھا تو میرؔ، مصحفیؔ ناسخؔ، آتشؔ، وغیرہ خدا معلوم کن کن شاعروں سے مل کر غالب کے پاس پہونچا، تو وہاں ایک عجیب و غریب لطیفہ اُنھوں نے سنایا کہ:۔

"جب میرے اعمال کا محاسبہ ہوا اور دوزخ کے قابل نہ سمجھکر مجھے جنت کے ایک نہایت ہی حقیر حصہ میں لیجا کر ایک ایسے حجرہ میں بند کر دیا۔ جہاں سوائے ایک خشک گملے کے اور کچھ نہ تھا تو مجھ سے دریافت کیا کہ تم اپنی بہت سی زندگی ناکمل چھوڑ کر آئے ہو، اور تمھارے بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت ہنوز داد طلب پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے بتاؤ ان میں سے کوئی ایک آج پوری ہوسکتی ہے۔ میں نے فرط مسرت میں گھبرا کر کہدیا کہ "کوئی ایک"۔ میرے منھ سے یہ نکلا ہی تھا کہ فردوس کے اس حجرہ کو اُٹھا کر یہاں دوزخ میں ڈالدیا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ میری کونسی آرزو تھی جو اس طرح پوری کیجارہی ہے کہ ناگہاں سامنے دیوار پر یہ مصرعہ نظر آیا کہ:۔

دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے اوپر اس مصرعہ کی وجہ سے یہ عذاب نازل کیا گیا ہے۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن میری سمجھ میں آجتک یہ نہ آیا کہ اس شعر کا پہلا مصرعہ" طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ" خدا کو سُنایا گیا یا نہیں ظاہر ہے کہ وہاں تک یہ بات نہیں پہونچی۔ ورنہ مجھے تو فردوس سے بھی بلند کوئی چیز ملنی چاہیئے تھی نہ کہ ایسا حقیر و کثیف حُجرہ، جو اگر جہنم میں نہ ڈالدیا جاتا تو میں خود اُس کے اندر آگ جلا کر اسکی گندگی و عفونت کو دور کرتا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ ان ظاہر پرست ملاؤں نے یہاں بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا ہے اور افسوس ہے کہ اب فردوس بھی رہنے کے قابل جگہ نہ رہی"۔

میں نے یہ سنکر کہا کہ "آپ کا یہ خیال غالباً درست نہیں، کیونکہ میں نے تو آج ایسے ایسے مولویوں اور تہجد گزار بزرگوں کو دوزخ میں جلتے اور سسکتے دیکھا ہے کہ اُن کی نسبت کبھی گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اعلےٰ علیین سے ایک قدم نیچے اُتریں گے"۔

یہ سن کر وہ بہت متحیر ہوئے اور بولے کہ" پھر تو دوزخ بھی رہنے کے قابل نہ رہی۔ تمام عمر اُن کے صلاح و تقوے کے وعظ نے مجھے دنیا میں چین نہ لینے دیا۔ فردوس کا حال معلوم نہیں کہ وہاں میں نے کچھ دیکھا نہیں۔ جہنم میں آیا تو

معلوم ہوا کہ یہ عذاب یہاں بھی موجود ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کہو تم یہاں کس سلسلہ سے آئے ہو"

میں نے عرض کیا کہ مجھے ابھی تک بالکل اس کا علم نہیں۔ فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا ہوں۔ آیندہ دیکھیے کیا فیصلہ ہوتا ہے ڈرتا ہوں کہ شاعروں کے سلسلہ میں کہیں جگہ نہ دیجائے کیونکہ ان پر جس قسم کا عذاب ہوتے میں نے دیکھا ہے وہ حد درجہ توہین آمیز ہے۔ اُن کے ہر ہر جھوٹے شعر کی ایک تمثالی صورت عذاب کی صورت میں پیش کیجاتی ہے اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شاعر کس کسطرح جھوٹ بولتا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے یہ شعر

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں اب تو دے

کسی واقعہ کی بنا پر کہا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شعر جھوٹ کہا گیا ہے تو یقیناً یہ حرکت آپ کو یہاں کرنا پڑے گی اور ایک ہزار سال تک جو یہاں کی ریاضی کی اکائی ہے برابر آپ کو کسی نہایت ہی کریہ شکل والے کے پاؤں دابنا پڑینگے۔ الغرض میں اس وقت سے کانپتا ہوں جب شعراء کے زمرہ میں مجھ پر عذاب نازل کیا جائے۔ ہر چند اس کا اندیشہ کم ہے کیونکہ اول تو میں نے شعر ہی بہت کم کہے ہیں اور جو چند کہے بھی ہیں تو وہ شعروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔

وہ اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ دفعتہً اپنے ہاتھوں سے اپنا منھ نوچنے لگے، سینہ زخمی کرنے لگے میں نے خیال کیا کہ یقیناً یہ بھی "عذاب شعری" ہے اور دیر تک سوچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ داد ہے اُن کے اس شعر کی۔

تا بند نقاب کہ کشو دست کہ غالب
رخسارہ بہ ناخن صلہ وادیم و جگر ہم

میں یہ دیکھ کر یہاں سے دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ اور سوچتا رہا کہ دیکھیے اب کبتک غریب غالب اس حال میں مبتلا رہتا ہے۔

جہنم کے کتنے طبقات ہیں اس کا علم مجھے نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہر گروہ و جماعت کے لئے ایک ایک حصہ مقرر ہے۔ مثلاً ایک حصہ جہنمی بادشاہوں کا ہے، جن میں سے صرف فرعون کا حال میں نے لکھا، دوسرا حصہ حکماء اور علماء کا ہے۔ جن میں سے ارسطو، افلاطون، فیثا غورث وغیرہ سینکڑوں کو مختلف عذاب میں مینے مبتلا دیکھا، ایک حصہ مولویوں، متقیوں اور نمازیوں کا بھی ہے، اور یہ دیکھکر مجھے کتنی حیرت ہوئی کہ ان میں سے بعض ایسے ایسے اکابر بھی مبتلائے عذاب تھے جنھوں نے دنیا میں اپنی مستقل شریعتیں قائم کر رکھی تھیں، لیکن سب سے زیادہ ہنسی مجھے اُس وقت آئی جب مینے اپنے محلہ کے ایک مولوی کو بھی یہاں دیکھا اور وہ مجھے دیکھکر سخت شرمندہ ہوا۔ کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کافر اور جہنمی کہا کرتا تھا اور اپنے آپ کو رضواں کے بیٹے سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے آزاد پھرتا دیکھ کر اسے بڑا رشک آیا، لیکن مینے کوئی طعن آمیز فقرہ استعمال نہیں کیا، کیونکہ اُس کی حالت خون اور پیپ پیتے پیتے بہت سقیم ہو گئی تھی اور اُس کی زبان پر

ببول کے کانٹوں کی طرح سینکڑوں خار پیدا ہو گئے تھے جنکی وجہ سے وہ زبان کو اندر نہ لیجا سکتا تھا۔

جب بادشاہوں، امیروں، فیلسوفوں، مولویوں، شاعروں اور مصنفوں کے طبقات سے گزر کر میں اس حصہ میں پہونچا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھا تو مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے قطب مینار سے اُٹھا کر مجھے نیچے پھینکدیا۔ میں چونک پڑا اور آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بیوی بُری طرح رو رہی ہیں، بچے تڑپ رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ کفن لاکر میرے غسل کی طیاری میں مصروف ہیں۔ ٹھیک ۵ بجے شام کو ڈاکٹر صاحب نے میری دو گھنٹہ کی زندگی کا اعلان کیا تھا اور ۷ بجے شام کو دو گھنٹے بعد جو میری آنکھ کھلی تو میں زندہ تھا۔

غالبًا اس کا ذکر فضول ہے کہ اس واقعہ سے کیسی عجیب و غریب لہر مسرت کی سارے گھر بھر میں دوڑ گئی ہوگی لیکن اس کا اظہار ضروری ہے کہ باوجود اس علم کے بھی کہ میں واقعی زندہ ہوں دیر تک اپنے آپ کو مردہ سمجھا کیا اور جہنم کا ایک ایک نظارہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

میں حیران تھا کہ کیا واقعی جہنم کوئی حقیقی چیز ہو سکتی ہے، اور اگر ہے تو کیا خدا بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے کسی طرح دل اسکے ماننے کے لئے آمادہ نہ ہوتا تھا۔

میری عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اگر خدا واقعی اپنے مخلوق کو اسی طرح مبتلائے عذاب کرتا ہے تو کیوں نیرو، چنگیز، ہلاکو کو بُرا کہا جائے اور کیوں نہ ایسے خدا سے پناہ مانگی جائے۔ اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سے خدا کی خدائی کو کیا نقصان پہونچتا ہے، جو وہ ایک وحشی، جاہل اور خونخوار بادشاہ کی طرح مخلوق کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچا کر اپنی خواہش انتقام کو پورا کرتا ہے۔

اگر جہنم کے یہ تمام بیانات حقیقی نہیں بلکہ تمثالی ہیں اور مقصود ان سے صرف لوگوں کو ڈرانا ہے تاکہ وہ اس خوف سے اچھے کام کریں تو اُس کا سوسائٹی اور اخلاق پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ جبتک لوگ اچھے کام کو اچھا کام سمجھکر ایک فرض انسانی جان کر بغیر کسی مزد کی توقع یا سزا کے اندیشہ کے نہ کریں، اُسوقت تک کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر جہنم کے عذاب سے ڈرا کر کسی شخص کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے، تو ہم اُس بندر یا ریچھ کو بھی انسان کہہ سکتے ہیں جو لکڑی کے بل پر ناچنے لگتا ہے۔

دوسری صبح کو اُٹھکر سب سے پہلے میں نے اسی "سیاحت جہنم" کو قلمبند کیا، جس کے چند اوراق یہ ہیں ارادہ ہے کہ اسی طرح حصہ حصہ کر کے ان تمام مناظر کو الف کو پیش کر دوں جو میری نظر سے وہاں گزرے

نیاز

سید سلیمان ندوی جواب دیں

کہ

کیا واقعی احادیث کی کوئی دینی قیمت ہے

رسالہ نگار میں مولوی مقبول احمد صاحب کے ایک مضمون پر مولانا سید سلیمان صاحب نے سنت کی لفظی اور معنوی حیثیت سے دو نمبروں میں بحث کی ہے لیکن اصل چیز جس پر بحث شروع ہوئی تھی، اس کا ذکر تک کہیں آنے نہیں دیا یعنی سنت کی دینی حیثیت سے کوئی اعتنا نہیں کیا گیا اور سارا زور، صرف اُن ضمنی امور پر صرف کیا گیا جو سنت کی نوعیت یا اس کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں اُن ضمنی باتوں کی بحث کو مولوی مقبول احمد صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں وہ جو جواب دینا مناسب سمجھیں گے لکھیں گے، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اصل بحث جو شروع ہوئی تھی وہ تاریخی الجھاؤ میں کیوں ڈالی جائے، اور کیوں نہ اس معاملہ کو صاف کیا جائے کہ سنت کی دینی حیثیت کیا ہے۔

مولانا اور اُن کے جملہ ہم خیالوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ

" احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں "

لہٰذا اسی پر بحث ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ ہمارے نزدیک دین اور خالص دین قرآن اور صرف قرآن ہے۔ اس لئے جو شخص بھی اس معاملہ میں ہمارے ساتھ مناظرہ کرنا چاہے اس کا فرض یہ ہے کہ قرآن ہی سے استدلال کرے کیونکہ وہی فریقین کی مسلم کتاب اور بمنزلہ اصول متعارفہ کے ہے۔ حدیثوں کو ہم دینی حجت نہیں مانتے اور اجماع و قیاس ہمارے نزدیک محض وقتی اور ہنگامی چیزیں ہیں۔

ہر چند کہ ہمارا یہ دعوےٰ سلبی ہے اور اُصول مناظرہ کے مطابق حدیثوں کے دین ہونے کا بار ثبوت مخالف کے ذمہ ہے مگر مزید وضاحت کے لئے ہم اپنے اس دعوے پر قرآنی دلائل بھی پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

قرآن نے شروع سے آخر تک کہیں بھی یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نبی سے حدیثیں روایت کرکے اُن کو اپنا دین بنالو بلکہ جابجا اس نے تصریح کردی ہے کہ قرآن ہی کا اتباع کرو۔

وہذا کتاب انزلناہ مبارک فاتبعوہ — یہ کتاب جسکو ہمنے اتارا ہے مبارک ہے۔ اسکی پیروی کرو۔

ایک آیت میں تصریح فرمادی ہے کہ سوائے قرآن کے اور کسی چیز کی پیروی نہ کرو

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء — اسکی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا اور اُسکے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

حدیث کی بنیاد اسی پر ہے کہ لوگوں نے بزرگان دین کو اولیاء یعنے مقربین الٰہی سمجھکر انکی روایتوں کو واجب الاتباع اور دین سمجھ لیا تھا

اب اس نص صریح کے بعد کسی مومن شخص کے لئے مزید دلیل کی حاجت نہیں رہجاتی۔

لاریب قرآن پاک سے رسول کی پیروی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی — کہدے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

مگر خود رسول کو بار بار تصریح کے ساتھ احکام دئے گئے ہیں کہ

واتبع ما یوحی الیک — اُسکی پیروی کر جو تجھے وحی بھیجی جاتی ہے

دوسری آیت سے زیادہ وضاحت اور حصر کے ساتھ ہے۔

قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی — کہدے کہ میں تو بس اُسکی پیروی کرتا ہوں جو وحی میرے رب کیطرف سے مجھپر بھیجی جاتی ہے۔

جب رسول بھی قرآن ہی کا تابع ہے تو اتباع قرآن اور اتباع رسول دراصل دونوں ایک ہی چیز ہوئی۔

اتباع سنت کے متعلق ادنےٰ اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سنت طریقہ کو کہتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حیثیتیں مختلف تھیں۔ ایک یہ حیثیت تھی کہ آپ انسان تھے اور وہ طبعی فرائض اور اعمال آپ بھی ادا کرتے تھے۔ جو دوسرے انسان ادا کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔ قضائے حاجت۔ لباس وغیرہ۔ دوسری حیثیت عرب ہونے کی تھی۔ کہ اس ماحول میں جس طریقہ سے زندگی بسر کیجاتی تھی اسکی بہت سی باتوں کی پابندی آپ کو بھی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً عرب میں رہنا۔ عربی زبان بولنا۔ عربی لباس پہننا۔ عربی عورتوں سے شادیاں کرنا وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمامتر دنیاوی اُمور ہیں جن میں رسول کے طریقہ کی پابندی نہ دین کا جزو ہو سکتی ہے نہ دنیا سے کرائی جاسکتی ہے۔ اسلئے سنت یعنے طریقۂ زندگی رسول مامور بہ کیونکر ہو سکتی ہے۔

بے شک آپکی معظم ترین حیثیت رسول اللہ اور معلم امت کی تھی۔ اور آپ اوامر الٰہی کے اولین مامور تھے اور اُنکو عمل کرکے دکھلاتے تھے تاکہ امت کے لئے نمونہ ہوں۔ اس حیثیت سے آپکی ذات پیشوائے امت تھی۔ یعنے تعمیل احکام الٰہی کا

نمونہ آپکی ذات سے سیکھا جاتا تھا۔ اور یہ سنت نہیں ہے بلکہ اسکو قرآن نے اُسوہ رسول کہا ہے۔
لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

سنت اور اُسوہ

اُسوہ رسول یہ ہے کہ رسول اللہ احکام الٰہی پر عمل کر کے دکھلائیں اور امت کے لئے نمونہ بنیں اس نمونہ کو اللہ تعالےٰ نے امت کے لئے اچھا نمونہ قرار دیا اور یہ شرع اور دین ہے۔ اور سنت مطلقاً طریقۂ زندگی رسول کو کہتے ہیں خواہ کسی حیثیت سے ہو۔ جس میں سے بڑا حصّہ محض لسان اور عرب ہونیکی وجہ سے تھا جو نہ دین ہے نہ شرع نہ مامور بہ۔

مولانا نے اسی اسوہ بلکہ تعامل امت کا نام سنت رسول رکھا ہے اور اس اصطلاح پر انکو ناز بھی ہے چنانچہ اپنے مضمون کے آخری حصہ میں وہ مولوی مقبول احمد صاحب کی مدح سرائی کرتے ہیں کہ انھوں نے سنت کا وہی مفہوم لیا جو میں نے لیا ہے اور یہ کہ سنت اور حدیث دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کی مراد سنت سے وہی اُسوہ رسول ہے جو امت میں متواتر معمول بہ چلا آتا ہے تو پھر ہمارے اور آپکے درمیان زیادہ بحث باقی نہیں رہجاتی۔ لیکن اگر آپ سنت کا لفظ بول کر اور اس سے تعامل امت مراد لیکر روایات کے وہ دفاتر ہم سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ جو بقول مولوی مقبول احمد صاحب نہیں بلکہ حقیقتاً مظنون اور مشکوک ہیں تو یہ مناظرانہ فریب ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا مقصد یہی ہے۔ اسلئے کہ آپ نہایت مصالحانہ انداز سے فرماتے ہیں۔

"آیئے ہم آپ ملکر مصالحت کا راستہ نکالیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم آپ صرف ان احادیث و روایات کو تسلیم کرلیں جو قرون اولےٰ کے عرب مصنفین نے قبول کئے ہیں"

دیکھئے سنت کا لفظ بولکر آپ احادیث کے تسلیم کرانے پر اُتر آئے یا نہیں جو خود آپ کے قول کے مطابق سنت سے ایک جداگانہ حقیقت رکھتی ہے۔ اسکے آگے پھر آپ لکھتے ہیں۔

"میں درگزر کر کے صرف موطا پر قناعت کرنے کا مشورہ دیتا ہوں جس کا نہ صرف جامع وغیرہ بلکہ اسکے اکثر راوی تک عرب ہیں"

کیا عجیب بات ہے!! میں پوچھتا ہوں کہ کیا عرب کی صداقت پر کوئی آسمانی محضر آپ کے پاس ہے؟

راویوں کو جانے دیجئے میں گڑے مُردے اُکھیڑنے کا عادی نہیں ہوں لیکن امام مالک جامع موطا کی سوانحعمری تو خود آپ نے لکھی ہے۔ امام مغازی محمد بن اسحاق نے انکے متعلق جو جرح کی ہے وہ تو نظر سے گذری ہوگی۔ تفصیل کیلئے کتاب فضل العلم و اہلہ لابن عبد البر ملاحظہ فرمالیں۔ اور کیا اس سے آپ کو انکار ہے کہ جبتک امام مالک زندہ رہے ہر سال کچھ نہ کچھ اپنی کتاب میں ردوبدل کرتے رہے؟

حیرت یہ ہے کہ احادیث کے بیان کرنیوالے۔ راوی۔ راویوں کو ثقہ کہنے والے۔ راوی۔ اور ان ثقہ کہنے والونکی

ضمانت کرنے والے۔ راوی۔ ایک چراغ کی تلاش کے لئے دوسرا چراغ۔ دوسرے کے لئے تیسرا۔..........
کیا اللہ تعالےٰ جو حکیم و علیم ہے اپنے بندوں کو ایسے چکر میں ڈالنا پسند کرے گا

فلسفۂ شک

مولانا شک سے بہت گھبراتے ہیں۔ کیونکہ یقین انکو بہت سستے داموں ملجاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔
"گھر سے ایک خادم آکر آپ کو اطلاع دیتا ہے کہ اندر طلبی ہے۔ آپ اٹھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ممکن ہے اسوقت جھوٹ بول رہا ہو۔ یا اس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو"۔
میں تمثیل کا قائل نہیں۔ کیا اگر اس خادم کو میں جھوٹا سمجھ لوں تو میرے اوپر کوئی کفر کا فتوےٰ لگائیگا۔ پھر آپ روایت حدیث کے متعلق شک کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے ہیں۔
یہ مغالطہ چونکہ قائلین حدیث کی طرف سے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلئے میں اس باب میں کسی قدر تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔
روزانہ معاملات بے شک اعتبار پر چلتے ہیں لیکن انہیں شک کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ اور کبھی کبھی قرائن دیکھکر ہم شک کرتے بھی ہیں۔ لیکن یہی معاملات جب آج کل کی عدالتوں میں جاتے ہیں تو حکام تحریری دستاویزوں کی بھی تصدیق طلب کرتے ہیں۔ حاشیئے کے گواہ لیتے ہیں۔ اور بلا اچھی طرح جانچے انکو تسلیم نہیں کرتے۔ کیا آپ نے دینی امور کو اسقدر خفیف سمجھ رکھا ہے کہ انیں وہ معمولی احتیاطیں بھی نہ کی جائیں جو دنیاوی عدالتیں متخاصمین کے معاملات میں کرتی ہیں۔
بخاری یا مسلم سے روایت کرتے ہیں۔ لازم تھا کہ اس روایت کے دو شاہد عدل ہوتے۔ پھر وہ راوی جس سے روایت کرتا ہے اُسکے بھی دو گواہ معتبر درکار تھے۔ کیا اس اصول کے مطابق آپ کے پاس ایک حدیث بھی ہے؟
راوی ایک حدیث بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سُنی۔ پھر وہ دعوےٰ کرتا ہے کہ اس سے اس کو فلاں نے بیان کیا۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ رسول اللہ تک پہونچتا ہے۔ اور کسی درجہ میں نہ کوئی شاہد ہے نہ کوئی گواہ۔
پھر کیا شہادت۔ در شہادت۔ در شہادت۔ در شہادت۔ در شہادت سے آپ کسی اسلامی یا غیر اسلامی عدالت سے ایک پائی کا بھی فیصلہ اپنے حق میں لے سکتے ہیں؟
میں پھر کہتا ہوں کہ حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ تاریخی علوم ہیں نہ کہ دینی۔

اطاعتِ رسول

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کیلئے یہ ہے کہ قرآنیں حکم ہے۔
اطیعو اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم
اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن امرا کی جو تم میں سے ہوں
کہتے ہیں کہ جبتک حدیثیں تسلیم نہ کی جائیں رسولؐ کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے؟
اس کے دو جواب ہیں ایک الزامی اور دوسرا تحقیقی۔

الزامی جواب یہ ہے کہ اطاعتِ رسول کے ساتھ ہی ساتھ امرا اسلام کی بھی اطاعت کا حکم ہے۔ آپ نے احادیث رسول کے دفاتر تو تیار کر لئے لیکن امرا اسلام کی احادیث کے مجموعے کیوں نہ بنائے کہ دین کا جزو ہوتے۔ کیونکہ بلا انکی احادیث کے اُن کی اطاعت کیونکر ہوسکتی ہے۔

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض الآیۃ — کیا تم کتاب کے ایک ٹکڑے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے پر نہیں۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کو ہم بھی فرض سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ — اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اسلئے کہ اذن الٰہی سے اسکی اطاعت کیجائے۔

لیکن رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جسکی اتباع وہ خود کرتا ہے اُسکی پیروی کیجائے۔ قرآن میں یہی ہے۔

فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون

جو لوگ اس پر (رسول) ایمان لائے اور اُسکی مدد کی اور ساتھ دیا اور اس نور (قرآن) کی پیروی کی جو اسکے ساتھ اُتارا گیا ہے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

یہ ہرگز رسول کی اطاعت نہیں کہ اسکے نام کی طرف جو کوئی سچ یا جھوٹ منسوب کرے اسکو ہم مانیں۔ کیونکہ یہ ہمارے نزدیک دین اور انسانیت دونوں کی اہانت ہے۔ ہمارا ایمان تو اس نورانی کتاب پر ہے جسکو اُتارنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اُس فرشتہ کو آسمان میں نامزد فرمایا۔ جو ملائکہ میں امین ہے اور زمین میں اس رسول کو منتخب کیا جو انسانوں میں امین تھا۔ زمین سے آسمان تک شہاب ثاقب کے پہرے شیطانوں پر قائم کئے کہ اس مقدس کلام میں آمیزش نہ کرسکیں۔ اُتارنے والا امین۔ راستہ مامون۔ جسپر وہ اُتارا گیا وہ امین۔ پاک کلام۔ ہر آمیزش سے بری۔ سراسر حق۔ جسکی شان یہ ہے۔

وبالحق انزلناہ وبالحق نزل — ہم نے حق کے ساتھ قرآن کو اتارا اور وہ حق کے ساتھ اترا۔

ہماری نگاہ میں جملہ مجموعہ احادیث قرآن کے ایک حرف کی بھی قیمت نہیں رکھتا۔ ہم جب امام یحیٰی بن معین وغیرہ ائمہ جرح وتعدیل کے یہ الفاظ سنتے ہیں کہ "حدیث قرآن پر قاضی ہے"۔ یا علماء اصول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ سنت قرآن کی ناسخ ہوسکتی ہے تو اس روایت پرستی پر ہمکو سخت حیرت ہوتی ہے۔ ہم تو ان لوگوں کو اصل علم مانتے ہیں جنکی نسبت قرآن کریم کہتا ہے۔

ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق

جنکو علم دیا گیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ تجھپر تیرے رب کیطرف سے اُتارا گیا ہے وہی حق ہے

یقیناً حدیث پرستوں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ ہم جھوٹ اور سچ کو جانچ لیتے ہیں۔ اور ائمہ حدیث نے بخاری وغیرہ کی حدیثوں کو تنقید کرکے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ رواۃ کی صداقت ایک باطنی وصف ہے۔ جسپر قطعی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہ شہادت خود ظنی ہے۔ اور ازیں قبیل حدیث کی تصحیح اور تغلیط کے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ بجائے خود صحیح نہیں ہیں۔ اہل نظر متکلمین نے قدم قدم پر اختلافات کئے مگر شخصیت پرستی کے جذبہ میں محدثین نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ اور انہیں کمزور اصولوں پر حدیث کی عمارت کھڑی کردی

اس صورت میں ہم ہر راوی کے بیان کو اسی کا قول سمجھتے ہیں نہ کہ قول رسول۔ اور قرآن نے یہ زریں اُصول سکھلایا ہے۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن

روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر انکی اطاعت کرو تو اللہ کی راہ سے وہ تمکو گمراہ کرینگے وہ پیروی نہیں کرتے مگر ظن کی

علماء حدیث احادیث کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ اور ظنیات سے دین کا کام نہیں چلتا۔

ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً ظن حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

امام غزالی المستصفیٰ میں لکھتے ہیں (جلد اول صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ مصر)

خبر الواحد لا یفید العلم خبر واحد مفید یقین نہیں۔

خبر واحد کسکو کہتے ہیں؟ یہ بھی اسی صفحہ میں انہیں کے قلم سے دیکھئے۔

انا نرید بخبر الواحد فی ہذا المقام مالا ینتہی الی حد التواتر۔ فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فہو خبر الواحد

ہم خبر واحد سے اس مقام پر وہ حدیث مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک نہ پہنچی ہو مثلاً جو حدیث ایک جماعت یا پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

بے شک متواتر یقینی ہے کیونکہ تواتر یقینیات کی ایک قسم ہے۔ مگر کسی متواتر حدیث کے وجود ہی میں بحث ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین حدیثیں ہیں۔ جنکو لوگوں نے متواتر کہا ہے۔ امام ابن صلاح اور ابن تیمیہ کا ذکر چھوڑیئے۔ کیونکہ ان دونوں حضرات کو حدیث کے معاملہ میں غلو ہے۔ بخاری اور مسلم کی حدیثیں جو جملہ آئمہ حدیث کے نزدیک غیر متواتر اور ظنی ہیں۔ انکے نزدیک یقینی ہیں اور بجز اپنے عقیدہ کے اور کوئی دلیل انکے پاس نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم

بعض لوگ حدیث کے مشغلے کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں۔

اسمیں بغیر علم کا لفظ خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہے کہ ائمہ حدیث نے حدیث کو مفید علم نہیں قرار دیا ہے۔

الغرض جسکا نام لوگوں نے سنت رکھا ہے اُسکی کوئی تائید قرآن سے نہیں ملتی بلکہ مخالفت پائی جاتی ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب نے ایک آیت سے سنت پر استدلال کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ یہ ہے۔

"یرید اللہ لیبین لکم و یہدیکم سنن الذین من قبلکم"

"اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کردے اور تمکو اگلوں کے راستوں کی ہدایت کرے"

اللہ جس سنت کو خود بیان کرنا چاہتا ہے وہ وہی ہے جو اُس نے انبیائے سابقین کو سکھلایا تھا اور اسی کو ہماری ہدایت کیلئے ہمارے واسطے بیان کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ وہی صراط مستقیم ہے جسکی ہدایت ہم ہر نماز میں مانگتے ہیں۔ یعنے ایمان۔ تقوٰے۔ تزکیہ نفس۔ اصلاح اعمال۔ ادائے فرائض و حقوق وغیرہ جنکے ساتھ دنیا اور آخرت کی سعادت وابستہ ہے اور جو آسمانی دین ہے۔ نہ کہ اس قسم کی سنت

کہ رسول اللہ نے زندگی بھر تہجد اور عمامہ باندھا۔ داڑھی چھوڑی اور مونچھ ترشائی۔ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے۔ اور دنیا کی چیزوں میں خوشبو اور عورت مرغوب خاطر تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ شخصی حالات ہیں جو تاریخ ہیں نہ کہ دین۔

قرنہا قرن گزر گئے کہ امت اسلامیہ اسی مشکوک اور ظنی تاریخ کو دین کے نام سے حاصل کرتی چلی آتی ہے اور اپنی فرقہ بندیوں میں اس سے امداد لیکر اصل دین کو جو قرآن ہے چھوڑ بیٹھی ہے جس سے دنیا بھی گئی اور دین بھی گیا۔ اور عقلی اور علمی خرابیاں تو حد شمار سے زیادہ پیدا ہو گئیں۔

عہد اول

سب سے پہلے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں حدیث کی حیثیت کو دیکھنا چاہیئے کہ کیا تھی؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے برخلاف قرآن کے حدیث کی حفاظت کی طرف کبھی توجہ نہ فرمائی بلکہ آپ نے یہ حکم دیا کہ:-

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً فلیمحہ

مجھے سوائے قرآن کچھ نہ لکھو۔ اور جس نے مجھے کچھ لیا ہو چاہیئے کہ اسکو مٹا ڈالے

خلیفہ اول نے چند حدیثیں لکھی تھیں لیکن آخر میں انکو جلا دیا۔

قاضی مکہ ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ تم لوگ حدیثیں بیان کرتے ہو جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلافات کرینگے اسلئے رسول اللہ صلعم سے کوئی روایت نہ کرو۔

خلیفہ اول قبول حدیث میں بہت محتاط تھے۔ اور بغیر شہادت کے کسی کی روایت نہیں مانتے تھے۔ جدہ کی وراثت کے متعلق حضرت مغیرہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم ایک سدس دلوایا کرتے تھے۔ اس پر ان سے شہادت طلب کی۔

حضرت عمر بھی بلا شہادت کے کسی کی روایت نہیں مانتے تھے یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابی سے بھی انھوں نے اس روایت پر کہ رسول اللہ سے میں نے سنا ہے کہ جب کوئی تین بار پکارے اور مکان سے آواز نہ آئے تو واپس چلا جائے۔ شہادت طلب کی اور کہا کہ اگر نہ لاؤگے تو خبر لوں گا۔

امام ابو سلمہ نے حضرت ابو ہریرہ سے پوچھا کہ کیا تم حضرت عمر کے عہد میں اسی طرح روایت کرتے تھے انھوں نے کہا کہ میں انکے زمانہ میں اسطرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھکو اپنے درّے سے پیٹ ڈالتے۔

حضرت عمر صحابہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ جہانتک ہوسکے رسول اللہ صلعم سے روایتیں کم کریں۔ جب عراق کی طرف فوج روانہ کی تو خود مشایعت کیلئے گئے۔ اور رخصت کرتے وقت فرمایا کہ میں اسی لئے تمکو پہونچانے آیا تھا کہ یہ نصیحت کروں کہ تم ایسی جگہ جاتے ہو جہاں لوگ قرآن میں مشغول ہیں۔ دیکھو روایتیں بیان کرکے انکو قرآن سے نہ روکنا۔

حضرت عثمان روایتوں کو نہیں مانتے تھے۔ انکے پاس محمد بن علی بن ابی طالب اپنے باپ کے پاس سے وہ صحیفہ لیکر

گئے جس میں زکوٰۃ کے احکام تھے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے سامنے بشیر بن کعب نے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انھوں نے نہیں سُنا۔ اسپر بشیر نے کہا کہ میں رسول اللہ کی حدیثیں بیان کرتا ہوں اور آپ نہیں سنتے۔ فرمایا کہ ہم اُسوقت حدیثیں سنتے تھے جب رسول اللہ پر لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اب جب سے لوگ ہر قسم کی رطب یابس باتیں کہنے لگے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت "الوضوء مما مستہ النار" کو تسلیم نہیں کیا۔ نہ حضرت علیؓ کی حرمت متعہ والی روایت کو مانا۔ ابن عمر کے سامنے جب ابو ہریرہ کی روایت کلب زرع کے متعلق بیان کی گئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ ابو ہریرہ کے پاس کھیتی ہے۔[۵]

انصاف کی بات یہ ہے کہ جب میں حدیث کو خود دینی حجت نہیں سمجھتا تو دوسروں پر خواہ اُسکو دین تسلیم بھی کرتے ہوں کیونکر اس سے حجت لاؤں۔ لیکن یہاں صحابہ کا طرز عمل حدیث اور روایت کے ساتھ میں نے اس لئے دکھلایا کہ ناظرین یہ سمجھ لیں کہ صحابہ کرام نے حدیث کو دینی حجت نہیں سمجھا۔ اُنھوں نے اسکی حفاظت بھی نہیں کی۔ بلکہ اُسکو فتنہ سمجھکر روکتے رہے۔ انکے زمانہ ہی میں لوگ جھوٹ بولنے لگے تھے۔ اسوجہ سے بہت سے صحابہ نے حدیث کو چھوڑ بھی دیا تھا۔ امام شعبی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سال تک ابن عمر کی خدمت میں رہا۔ اور اُنکی زبان سے کوئی حدیث نہ سُنی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر بھی شاذونادر ہی کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی موطا دوسری صدی ہجری اور بخاری اور مسلم تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئیں۔ جبکہ حدیثوں نے دینی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور ائمہ حدیث مقدس اور مقتدائے امت سمجھے جانے لگے تھے مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ اور ہر ہر فریق اپنے اپنے فرقے کی حمایت میں حدیثیں پیش کرنے لگا تھا۔ اسوجہ سے وضع جعل اور کذب کے امکانات حدیثوں میں بہ نسبت تاریخ کے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ اور جو اُصول تصحیح حدیث کے لئے مرتب کئے گئے۔ وہ عقلی طور پر بیشتر غلط اور محض شخصی اعتبار پر قائم کئے گئے۔ جن کی وجہ سے حدیثوں کی حیثیت ایک ظنی تاریخ سے زیادہ نہیں نہ وہ قرآن کے کسی خاص کو عام اور عام کو خاص کر سکتی ہیں۔ نہ مطلق کو مقید اور مقید کو مطلق۔ اور زیادتی علی الکتاب کا تو خیال ہی مہمل ہے۔ اور نسخ کا اس سے زیادہ۔　　(مسلمان)

۵؎ یہ جملہ روایات کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر مصنفہ شیخ طاہر جزائری سے میں نے نقل کی ہیں

مُرشد

ایک سفر مجھکو چند مارواڑی عورتوں اور ——— مُرشد کے ساتھ کرنا پڑا۔ میرے سفر کی محرک اکثر دو چیزیں ہوتی ہیں۔ آپریشن کرانا یا سفر خرچ وصول کرنا جسکے مجموعہ کا نام بڑے لوگوں نے قومی کام رکھا ہے۔ پھر ایسے سفر کا کیا پوچھنا جس میں دونوں مقاصد پیش نظر ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہوگا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ لیکن یہاں امکان سے بحث نہیں ہے، واقعہ سے بحث ہے۔ اور واقعہ کی حیثیت سے ہر واقعہ برابر ہے خواہ وہ کانگرس کی صدارت ہو یا راؤنڈ ٹیبل کی شرکت!

بہرحال ناظرین سمجھ لیں کہ ایسا اکثر ہوا اور ——— سفر بھی شروع ہوا، چنانچہ مُرشد پہلو میں تھے، پاؤں کے تلے اوپر، ادھر اُدھر وہی بڑے سے سنے ہوئے پتے، بیڑی اور دیا سلائی کے نیم سوختہ ٹکڑے، پانی سے لبریز لیکن ٹپکتی ہوئی بالٹی، برتھ سے لٹکتی ہوئی ایک نمناک دھوتی، برساتی ہوا اور ——— معلوم نہیں کس کس چیز میں بسی ہوئی۔ سامنے مارواڑی عورتیں اور وہ بھی اُسی رازدارانہ مالے محجابانہ انداز سے جسکی کچھ دھندلی سی مصوری غالب نے کی ہے۔

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں!

میرے اس میلان طبع کو جس چیز پر چاہیے محمول کر لیجئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھکو مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے سے سخت کوفت ہوتی ہے اور یہ عجیب سانحہ تھا کہ اس سفر میں میرے ہمسفر یہ تمام لوگ اور شاید اُنکی اعجوبہ ترین نمونے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرشد ہمراہ نہ ہوتے تو میں یا تو زنجیر کھینچ لیتا یا سمت مخالف سے آنے والی گاڑی پر کود جاتا، خواہ وہ اپنی پوری رفتار کے ساتھ جاتی ہوتی۔ ایک میں نقصان مال تھا اور دوسری میں اتلاف جان لیکن کچھ ہوتا یہ کیا کم تھا کہ اپنا ہی ہوتا دوسرے کا نہ ہوتا۔ لیکن قومی نقطہ نظر سے یہ صورت کچھ زیادہ مفید یا مستحسن نہ تھی اور پھر مرشد کا ساتھ جنکی معیت میں ایک بار میں کانگرس کے پنڈال میں بھی ہو آیا تھا اور حکیم اجمل خانصاحب مرحوم سے بھی مل سکا تھا چنانچہ قوم کی خاطر میں نے زندہ رہنا گوارا کر ہی لیا۔

بہرحال انھیں قومی اور ذاتی مسائل کی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ یکایک مرشد پر نظر جا پڑی تو معلوم ہوا کہ وہاں برہمی یا انقباض طبع کے بجائے افسردگی کا عالم ہے۔ مرشد کا افسردہ ہونا میرے نزدیک سانحات عالم میں سے ہے لیکن خیریت یہ ہے کہ اس افسردگی کی بھی دو نوعیتیں ہیں اور دونوں میں بلحاظ اہمیت بیّن فرق ہے۔ مرشد کی افسردگی کا ایک تو وہ موقعہ ہوتا ہے۔ اور جو اکثر پیش آتا رہتا ہے۔ جب مرشد بھوکے ہوتے ہیں اور دوسرے ——— اس کا موقعہ صرف

ایک دفعہ پیش آیا جو میرے اور مرشد کے درمیان بحیثیت ایک راز کے مدت سے چلا آتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہر راز کی ایک عمر ہوتی ہے جسکے بعد اسکو صیغۂ راز میں رکھنا بدمذاقی ہے۔

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جس سال نان کوآپریشن کا حملہ ام اے او کالج پر ہوا ہے، مرشد اور میں، ہم نوالہ، ہم اقامہ، ہم سبق، اور ــــ ہمخیال تھے، مرشد ان طلبا میں سے تھے جن سے کالج کے ارباب حل و عقد بجا طور پر مرعوب تھے اور شاید اس کا سبب یہ تھا کہ مرشد کی حاضری ہمیشہ کم رہتی تھی اور یونیورسٹی میں اچھے سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے یونین کے بے پناہ مقرروں میں تھے، کرتا، پاجامہ، اور داڑھی شرعی، شیروانی حیدرآبادی، غذا ڈائننگ ہال کی، ناشتہ دوسروں کا اور دوا دہلی کی! مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ اُنکی تندرستی خطرہ میں ہے اور اس فکر میں وہ آس پاس کے تمام اطبا سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس میں حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب بھی شامل تھے اور ایسے حکیم اور ڈاکٹر بھی جن کا نام سوا اُنکے سائن بورڈ یا خود مرشد کے کسی کو معلوم نہ تھا یا پھر

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد!

مرشد ساری دوائیں خرید لاتے اور اسمیں انگریزی، یونانی، اور ویدک سب شامل ہوتیں، کیونکہ مرشد دہلی جا کر ہر قسم کے اطبا سے ملتے اور اُن سب کی تجویز کردہ دوائیں بڑے تکلف اور احترام سے لاتے۔ دواؤں کے ساتھ، دہلی سے ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں بھی لاتے، ہر اسٹیشن پر خوانچہ والے سے کچھ نہ کچھ خریدتے اور وہ بھی ساتھ لاتے۔ بورڈنگ ہاؤس پہونچ کر صلائے عام دیتے لیکن شرط یہ تھی کہ جو شخص پھل یا مٹھائی وغیرہ میں شریک ہو اُسکو دوا بھی کھانی پڑے گی۔ مرشد ہر دوا کے افعال و خواص کو اس جوش اور شدت کے ساتھ بیان فرماتے کہ ہر شخص کو شریک ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ یہی نہیں مرشد کو بعض امراض کی شناخت کا بھی عجیب و غریب ملکہ تھا، اگر کسی شخص نے دوا کھانے میں ذرا تامل کیا تو پھر اُسی جوش و شدت کے ساتھ اس پر یہ بھی ثابت کردیا کرتے تھے کہ وہ فی الحقیقت کسی مرض میں مبتلا ہے اور اس کے شدید و سنگین نتائج جلد از جلد رونما ہونیوالے ہیں۔ مرشد نے اپنی لائی ہوئی دوا شاید کبھی نہیں کھائی۔ لیکن جہاں کہیں پہونچ جاتے اور کوئی دوا رکھی ہوئی ملجاتی اسکو بغیر کھائے ہوئے نہیں رہتے تھے، خواہ کسی قسم کے مرض یا مریض کی دوا تیار ہونے کا اہتمام یا چندہ ہوتا مرشد اسمیں ضرور شریک ہوتے، قدمے، درمے، سخنے!

ایک دفعہ کا واقعہ ہے، مرشد، ہمارے دوست عطاء اللہ خاں کے کمرہ میں پہونچ گئے۔ ہمارے دوست عطاء اللہ خاں بھی عجیب و غریب شخص تھے، معلوم نہیں اسوقت مرحوم علیین میں ہیں یا امریکہ میں۔ خان کو کھچڑی پکانے اور کیمیا بنانے کا خبط تھا، صبح سے شام تک کچی بارک کے برآمدہ میں انگیٹھی دہکتی رہتی تھی، کھچڑی پکا چکتے تو کیمیا بنانے میں مصروف ہوجاتے اور کیمیا سے سیر ہوجاتے تو کھچڑی کی دیگچی آگ پر رکھدیتے۔ یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے مسلسل تمام دن تیار ہوتی

رہتیں۔ ممونیا سے ڈرتے تھے، اور ایک لڑکی پر عاشق تھے۔ مرشد نے فرمایا۔ بھوکا ہوں، کچھ کھلاؤ، خاں نے فرمایا، کھچڑی میں تو دیر ہے اور اسکے علاوہ اس وقت کوئی چیز موجود نہیں ہے، مرشد نے بریکٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا اور اس مرتبان میں کیا ہے، فرمایا، معجون جالینوس، ابھی ابھی دہلی سے منگایا ہے، اتنے میں خان کسی دوسری طرف متوجہ ہوئے اور مرشد نے ساری دوا مرتبان سے معدہ میں منتقل کر دی۔

مرشد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، پوچھنے پر فرمایا کہ ہندوستانی دواؤں میں شکر اور خوشبو یا بدبو کے علاوہ کوئی اور چیز قابل اعتنا نہیں ہوتی، اس لئے انکے استعمال میں مقدار کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا، میں نے کہا پھر ان دواؤں کے استعمال کا فائدہ ہی کیا ہے۔ کہنے لگے واقعہ تو یہ ہے کہ دواؤں کی ایجاد اور انکا استعمال غلط اُصول پر کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا مرشد یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی، ایجاد کا غلط اُصول پر ہونا تو کچھ یونہی سا معلوم ہوتا ہے، اس کو ذرا اور واضح کیجیئے، مرشد نے بگڑ کر فرمایا، تم بھی جان کر انجان بن جاتے ہو، اچھا یہ تو بتاؤ اطبا ریونانی نے خراطین کا استعمال کس اُصول پر مفید قرار دیا ہے، میں نے کہا، میں تو اس کے استعمال سے واقف ہوں، لیکن اُصول سے قطعاً ناآشنا! فرمایا۔ اس کا اُصول تمھاری سمجھ سے باہر ہے، تعلیم بالغاں اگر مانٹی سوری سسٹم سے دیکھا جائے تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہوجائے گا، میں نے کہا تعلیم بالغاں کیلئے آپ نے تو متعدد "شبینہ" درسگاہیں کھول رکھی ہیں، اس کا بھی انتظام کہیں کیا ہے یا نہیں، بگڑ کر فرمایا، تم پھر ذاتیات پر اُتر آئے اور میں تمہاری درسگاہ کی خبر لوں تو کیسی رہیگی، میں نے کہا کوئی ہرج بھی نہیں، معاملہ صرف ممبر اسٹاف اور ممبر کورس ہی کے درمیان رہے گا!

میں نے کہا ہاں مرشد، وہ بات تو رہ ہی گئی، مرشد نے فرمایا، بس بس اب آپ خراطین کے نفع پر اپنا اطمینان کرلیں تو پھر مزید گفتگو ہو۔ میں نے عرض کیا، قصہ تو آپ نے ہی خراطین کا چھیڑا تھا، مجھے صرف تشابہ لگا تھا اور بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی، بہرحال خراطین کی طرف سے مطمئن ہو کر فرمایا، بھئی سنو، اطبا مرض کا علاج کرتے ہیں، حالانکہ انکو مریض کا علاج کرنا چاہیئے، مرض قطعاً ایک غیر شخصی چیز ہے اور مریض ایک شخصیت۔ عام طور پر اطبا اور انکا طریقہ، علاج نے دونوں کو ایک قرار دیدیا ہے اور اسی سبب سے اکثر مرض جاتا بھی رہتا ہے تو مریض ہمیشہ کیلئے ماؤف ہوجاتا ہے۔ میں نے کہا مرشد اگر آپ معجون جالینوس کے مورد نہیں بلکہ موجد ہوتے تو اسوقت دنیا کو کس اصول یا طریقہ، علاج کا زیر بار منت ہونا پڑتا، فرمایا میں تو ہر مرض کا علاج اچھے سے اچھے کھانے سے کرتا، میں نے کہا علاج الغربا اسی اُصول پر تصنیف ہوئی ہے۔ فرمایا، پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اظہار قابلیت مقصود ہے یا مذاق کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا دونوں، اس پر جھلا پڑے، فرمایا، ایک سے تو آپ کی جاہلیت متعین ہوتی ہے اور دوسرے سے جیلخانہ جانے کے آثار ہویدا ہیں، میں نے عرض کیا مرشد اچھا اتنا اور بتا دیجئے، جہالت کی بنا پر لوگ جیلخانہ جاتے ہیں یا جیل خانہ کا نتیجہ جہالت ہے۔ فرمایا، تم پھر ذاتیات پر حملہ کرنے لگے۔ جیلخانہ جانیوالے محب قوم ہوتے ہیں، میں نے کہا اُس

قوم کے بارہ میں آپ کا خیال ہے، جو اپنے محبوں کو جیل خانہ بھجواتی ہے اور خود جیل خانہ کے باہر ہے، فرمایا یہ قوم اس قوم سے بہرحال بہتر ہے جو اپنے محبوں کو کونسل اور اسمبلی میں بھجواتی ہے!

میں نے کہا مرشد ذاتیات اور قومیات دونوں پر لعنت بھیجئے، اس قوم کی باتیں آپ دہلی اور میں علی گڈھ پہونچکر شروع کرینگے۔ فی الحال مجھے یہ بتائیے کہ اچھے سے اچھے کھانے سے علاج کرنا کس اُصول پر مبنی ہے اور پھر یہ اصول صحیح بھی ہو تو آپ یہ بتائیے کہ ہندوستان ایسے مفلس ملک میں آپ کا یہ علاج کس طور پر کامیاب ہو سکتا ہے۔ فرمایا، جب ہندوستان کے لوگ ڈاکٹر ورناف کے علاج المامون بالیمون کے متحمل ہو سکتے ہیں تو پھر علاج بالغذا کے کیوں نہ متحمل ہوں گے، میں نے کہا مرشد خوب یاد دلایا اور یہ تو بتائیے یہ علاج بالغدود آپکے نزدیک کیسا ہے۔ فرمایا یہ علاج میمونی ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ صرف علاج الاعضا بالاعضا کرائیں گے اور آج سے کم و بیش سو سال کے اندر آپ دیکھیں گے طبیبوں کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ آیندہ سرجن انجنیئر ہوا کریں گے۔ ہر بیماری کا علاج سرجری سے ہوا کرے گا۔ جتنے انسانی اعضا ہیں وہ سب کے سب علحدہ علحدہ مربہ اور اچار کی مانند مرتبانوں میں رکھکر دواخانوں میں فروخت ہوا کرینگے۔ ہر سائز اور ہر قسم کے ہونگے جیسے گھڑی اور موٹر کے پُرزے۔ جو انسانی عضو خراب ہوگا اُسکو نکال دیا جائیگا اور اُسکے بجائے دوسرا مصنوعی عضو فٹ کر دیا جائے گا، ہر عضو اسکرو (SCREW) (پیچ) پر ہوگا، جب چاہا نکال لیا اور جب چاہا فٹ کر دیا۔ میں نے پوچھا، کیوں مرشد آپکا کیا خیال ہے۔ اس طریقہ علاج سے لوگوں کے تعلقات خانہ داری پر کیا اثر پڑیگا فرمایا اس سے تعلقات نہایت خوشگوار رہیں گے، بدگمانی کا عنصر بالکل حذف ہو جائے گا، اس میں شک نہیں حکومت ملک کو اس کے لئے خاص قوانین وضع اور نافذ کرنے پڑیں گے۔ مثلاً کسی شخص کو اس کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ ایک سے زائد عضو اپنے قبضہ میں رکھ سکے، ہر شخص کو لائسنس لینا پڑے گا جس طور پر شراب یا مسکرات بچوں کے ہاتھ نہیں فروخت کئے جاسکتے، اسی طور پر کوئی عضو بچہ کے ہاتھ نہیں فروخت کیا جائے گا۔ بعض اعضا ایسے بھی ہوں گے جن کا استعمال صرف اپنے مکان مسکونہ پر ہو سکے گا، اشنان درگاہوں، اور تفریح گاہوں پر ان کے لیجانیکی سخت ممانعت ہوگی، اس کے لئے قرنطینہ اور کسٹم ہاؤس قائم ہوں گی۔ جہاں ہر شخص کے بارہ میں پہلے سے اطمینان کر لیا جائے گا کہ اس کے پاس کوئی عضو ایسا تو نہیں ہے، جس سے شارداایکٹ قسم کے جھگڑا پیدا ہونے کا امکان ہو۔ میں نے کہا مرشد یہ تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ چوروں، ڈاکوؤں اور پولیس کے خطرہ سے کس طور پر عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ فرمایا، یہ اندیشہ تو یقیناً رہے گا، لیکن میرا خیال ہے اسوقت تک تمام دنیا کی حکومت بالشوک اُصول کی پابند ہو جائے گی۔ جس طور پر ہر مال و ملکیت کی مالک حکومت ہو گی، اسی طور پر انسانی اعضا بھی حکومت کے ملک ہوں گے۔ ممکن ہے ہر ہر محلہ میں دوزی خانہ کے ساتھ اعضا خانہ بھی ہوں، مقررہ وقت پر دو چار روٹیاں، کچھ سالن اور ایک عضو دیدیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ، میں نے کہا مرشد یہ تو بڑا پُر آشوب دور ہوگا، آپ کو اور مجھے کون پوچھے گا، فرمایا ہم لوگ رعایا نہیں حکومت ہونگے، میں نے کہا مرشد خدا تمہاری زبان مبارک کرے!

میں نے کہا مرشد، امراض کا علاج غذا سے تو بہت مفید ہوگا، لیکن کوئی ترکیب ایسی نہیں ہوسکتی کہ آپ کوئی نہایت مفید اور مجرب علاج جو نہایت ہی سستا ہو دریافت کر دیتے۔ فرمایا، سب سے مقوی اور مفرح چیز تو ٹھنڈا پانی ہے آپ کو تو معلوم ہے بعض مولویوں نے بعض خاص مواقعہ کے لئے وضو کر لینا نہایت مفید بتایا ہے، میں نے کہا اگر غلطی سے وضو کے بجائے کوئی غسل کر لے تو کیا ہو، فرمایا ظاہر ہے پھر غسل کرنے کی حاجت نہ ہوگی، میں نے کہا مرشد یہ سب جانے دیجئے۔ تکلف برطرف، یہ تو فرمائیے، بعض خاص امراض کے ازالہ کی بہترین صورت کیا ہوسکتی ہے۔ کسی قدر ترش رو ہو کر فرمایا، خاص امراض کیا؟ میں نے کہا مرشد.......... بس سمجھ جائیے۔ مثلاً خاص الخاص۔ بے اختیار اور تقریباً آپے سے باہر ہو کر فرمایا، وہ تو ظاہر ہے۔

ماء اللحم خاص الخاص!

اچھا، یہ تو صفحہ معترضہ تھا۔ اصل حکایت مرشد کے افسردہ ہونیکی تھی، مرشد کے قول و فعل میں ایک طرح کی تلخی اور ترش پیدا ہو گئی ہے لیکن تھوڑی سی صفائی اور صیقل کے بعد اصلی اور قدیم جوہر بہت جلد نکھر آتا ہے۔

مرشد کی شادی، کہا جاتا ہے، ایسے زمانہ میں ہوئی جب مرشد کو نہ سوء ہضم کی پروا تھی اور نہ ہضم سوم کی تمنا۔ مدتوں فریضۂ سحری حق اللہ سمجھکر ادا کرتے رہے نہ کہ حق العباد۔ آم کی فصلیں اور کالج کی تعطیلیں آتی رہیں اور گذرتی رہیں تاآنکہ مرشد نے مردم شماری کی رپورٹ میں تابڑ توڑ دو تین غلطیاں پیدا کیں، یہ سب کچھ ہوا لیکن مرشد کے سرپرست اور نگران جج صاحب فرخ آبادی رہے!

چنانچہ ایک عرصہ تک خالو صاحب کرتے پاجامے، جج صاحب روپلے، کالج ڈگریاں اور بیوی بچے دیتی رہیں مرشد کے والدین اوائل طفولیت ہی میں داغ مفارقت دے چکے تھے، اس کے بعد پے بہ پے تین نوجوان، تعلیم یافتہ ہونہار اور معقول ترین بھائیوں نے رحلت کی جنکی ذہانت اور شرافت کالج میں ضرب المثل تھی۔ ایک دن شام کو گنگناتے ہوئے آئے اور فرمایا دونوں بچے بھی چل بسے! بایں ہمہ مرشد کی طبعی شگفتگی نے کبھی مرشد کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

ہاں تو تذکرہ تھا ام۔ اے۔ او کالج پر نان کو آپریشن کے حملہ کا۔ چنانچہ وہ دن بھی آیا، جس کا اشارہ صفحات ماقبل میں کہیں آچکا ہے، مرشد کو تحریک نان کو آپریشن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، بلکہ جس وقت ہمارا کالج اسکی زد میں آیا ہے مرشد جماعت تنظیمن کے ایک طور پر دست راست تھے۔ میں اور مرشد دونوں برابر ان جلسوں اور ہنگاموں میں شریک ہوا کرتے تھے، جو اُن دنوں اتنا ہی عام تھے، جتنا اِن دنوں گرفتاریوں اور سزایابیاں۔ ہر جلسہ اور ہنگامہ صرف جلسہ اور ہنگامہ تک محدود رہتا تھا، اور اس سے ہم دونوں ایک طرح سے مسرور اور مطمئن تھے اور وہ رات اب بھی یاد آتی ہے جب میں اور مرشد فتنہ پرداز دل

کی "سعی بے حاصل" پر صاحب باغ میں مسرور اور مطمئن، بیٹھے اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ صبح کالج تو جانا نہیں ہے پھر ناشتہ میں دنیا کے بجائے کھچڑی کیوں نہ ہو۔ ان دنوں کے جلسوں اور ہنگاموں کے مانند ابھی کوئی امر تیقن نہیں ہوا تھا کہ مولوی نصیر الدین علوی صاحب، گاتے گالی دیتے اور ہکلاتے ہوئے آگئے۔ ان سب سے فارغ ہو کر یوں گویا ہوئے، ابھی صبح مجھے غسل کر کے مولانا محمد علی صاحب کی تقریر کا جواب سوچنا ہے، مرشد بول اُٹھے مجھے بھی غسل کرنا ہے اور محمد علی صاحب کی تقریر کا جواب دینا ہے۔ نصیر صاحب نے فرمایا میں پہلے غسل کروں گا، مرشد نے کہا غسل تو پہلے میں کروں گا۔ بات طوالت پکڑتی جاتی تھی، نصیر صاحب ضرورت غسل کے ثبوت میں کوئی غیر شاعرانہ تقریر گلو گیر کرنے والے ہی تھے، اور مرشد کی طبیعت بھی کچھ موزوں ہونے لگی تھی کہ میں نے عرض کیا، آپ لوگ غسل کرنے پر اسدرجہ آمادہ نقض امن ہیں، لیکن پہلے یہ تو معلوم ہونا چاہیئے کہ حق کس کا مرجح ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ بیچارے مولانا محمد علی، دو "بے غسلوں" کے درمیان بالکل معصوم ہیں، اس پر یہ قضیہ چھڑ گیا کہ کون پہلے اپنے وجوہ پیش کرے، میں نے آخر میں عرض کیا "گذشتہ را صلواۃ۔ آپ لوگ اسوقت آرام فرمائیں۔ کل صبح تک کی مہلت دیجاتی ہے۔ اگر اس درمیان میں کسی کو "حق غسل" پیدا ہوا تو خیر ورنہ کل صبح غسلخانہ آپ دونوں پر بند!"

صبح ہوئی۔ آج کا دن اس سارے ہنگامہ کے سکرات کا تھا، اور یہ دن بخیر گذر جاتا تو آج مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دونوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ زندگی اور زندگی ہی نہیں بلکہ کارنامے بھی مختلف ہوتے، یونین میں جلسہ ہوا میں اور مرشد بھی ایک طرف بیٹھ رہے، مولانا محمد علی صاحب نے تقریر کی اور بیٹھ گئے، مولانا شوکت علی صاحب نے تقریر شروع کی، دوپہر ہونیوالی تھی اور دونوں بھائی دوپہر کی گاڑی سے کہیں باہر جانیوالے تھے تقریروں اور انکے اثرات کے سیلاب کی آخری اور کمزور موجیں کنار ساحل سے ہم آغوش ہونیوالی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک یوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر پڑھا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

اور بیٹھ گئے، مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہے، میں دم بخود ہو گیا، اب جو دیکھتا ہوں تو ہنگامہ محفل، نعرہ مجاہدین میں تبدیل ہو چکا تھا، ایک سیلاب تھا جو ساحلوں کو پاش پاش کر رہا تھا، ایک طوفان تھا جو نظم ہستی کو زیر و زبر کر رہا تھا، ایک ہولناک گونج تھی جس نے دنیا کی آوازوں کو ہضم کر لیا تھا یا غالب کے الفاظ میں۔

زمیں سے آسماں تک سَعن کا باب تھا

میں مرشد کو گھسیٹتا ہوا مجمع سے باہر لایا!

باہر نکل کر میں نے مرشد سے پوچھا، یہ کیا ہوا، فرمایا، رشید صاحب الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا ہے، انجام

کی دعا کیجئے گا ۔ میرے پاس جو کچھ میرا تھا، اُسے یوسف اور محمود کے سپرد کر دیجئے گا، کالج کے کاغذات ہوں گے، انکو واپس کر دیجئیگا
میں نے کہا مرشد آپ سے تو اس تحریک کے متعلق اکثر گفتگو رہی، اور آپ کچھ اس طریقۂ کار کے مؤید بھی نہ تھے پھر یہ کیا ہوا، مرشد
نے فرمایا، تحریک غلط ہو یا صحیح اس کے بارہ میں کوئی شخص یقین اور صحت کے ساتھ حکم نہیں لگا سکتا ۔ مجھے جس چیز نے بے دست و پا
کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ آخر میں کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڈھ نے ایک ایسی تحریک میں حصہ لیا جس میں صرف ہلاکت اور فلاکت تھی،
مجھے تو یہ بتانا ہے کہ تحریک صحیح ہو یا غلط، فرزندان علی گڈھ رزم و بزم دونوں میں برابر کے شریک ہیں، رنگینیٔ محفل ہو اور صدائے
نائے و نوش یا میدان جہاد اور نعرۂ تکبیر وہ دونوں کے لئے یکساں سر بکف ہیں ۔ اجل سے نا آشنا رہکر علی گڈھ اپنی زندگی کا ثبوت کیونکر
دے سکتا ہے، آپ میرے مزاحم نہ ہوں، پانسہ پھینکا جا چکا ہے، بازی بھی لگ چکی ہے، جبتک نتیجہ برآمد نہ ہو کسی کو میرے فعل
پر کوئی حکم لگانے کا حق نہیں حاصل ہے، اچھا، خدا حافظ،

سلام علی نجد و اہل نجد

اچھا تو قصہ یہ تھا کہ مرشد پر افسردگی کا عالم طاری تھا، میں نے دریافت کیا، مرشد، آخر کس سوچ میں پڑ گئے ۔ فرمایا،
اور یہ آپ پر کیسا اختلال طاری ہے، میں نے کہا، اختلال؟ اور یہ تو بتایئے اس فضا میں انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے،
جس کو برطانوی فضا راس آتی ہو اسکو اس فضا سے کیوں شکایت ہو، میں نے کہا مرشد پہلے تو یہ بتانا ہوگا کہ یہ آپ کا فرمانا اللہ واسطے
ہے یا محض پروپگنڈا ۔ اگر اللہ واسطے ہے تو تھوڑی دیر اور صبر کیجئے، ابھی دو چار اور بزرگ بھی اس ڈبہ میں موجود ہیں ۔ اس
قسم کے نمونے ان کی طرف سے پیش ہونیوالے ہی ہیں اور اگر محض پروپگنڈا ہے تو میں زنجیر کھینچتا ہوں ۔ فرمایا، جانے بھی دیجئے ۔
یہ تو کہتے نہیں بھوک لگی ہے اور دھمکی دیتے ہیں زنجیر کھینچ لینے کی ۔ اور زنجیر کھینچ کر آپ میرا کر کیا لیں گے؟ مجھے تو سادھو سنت
کی تحت میں ریلوے والے چھوڑ دینے پر مجبور ہوں گے ۔ رہے آپ میں کہدوں گا یہ اوور ہالنگ (OVER HAULING) کے
خوف سے آپریشن کرانے جا رہے ہیں ۔ میں نے کہا مرشد آپ تو ذاتیات پر اُتر آئے ۔ فرمایا ذاتیات سے آپ اتنا خائف کیوں ہوتے
ہیں اور کیوں صاحب کیا میرا بھوکا ہونا ذاتیات سے متعلق نہ تھا، جسکو آپ بالکل گول کر گئے تھے، یہ کہتے کہتے ایک ایسی آہ
سرد کھینچی کہ وہ دونوں شرعی مسلمان بھی چونک پڑے، جو مقابل کی نشست پر رونق افروز تھے، جن میں کے ایک حضرت "وضو بنا"
رہے تھے اور دوسرے ناشتہ کھول رہے تھے ۔ آہ ختم ہونے پر آئی تو فرمایا، اور کسی قدر بلند آواز سے کہ قرونِ اولٰے کے مسلمان
تو عرب کے بادیہ نشین تھے، جنکی مہمان نوازی دوست اور دشمن دونوں کے لئے یکساں تھی ۔ میں نے کہا اور یہ دو بدّو قسم کے
بزرگ جو اس ڈبہ میں موجود ہیں، کیسے ہیں، فرمایا، اللہ جل شانہ نے قلب مومن کو اپنی دو انگلیوں کے درمیان رکھا ہے ۔
نہیں معلوم کس وقت کیا ہو جائے ۔ میں نے کہا آپ تو نان کوآپریٹر بھی ہیں ۔ اور نمازی بھی ۔ کچھ بتا سکتے ہیں، ان دو مومنین کے
قلب کے ساتھ خدائی انگلیاں کیا سلوک کر رہی ہیں یا کرنے والی ہیں، فرمایا، دونوں نماز پڑھیں گے یا دونوں ناشتہ کھائیں گے ۔

میں نے کہا مرشد یہ تو اللہ میاں اور اللہ والوں کی بات ہوئی۔ کیا آپ دنیاداروں کے نقطۂ نظر سے بتا سکتے ہیں کہ اسوقت ان کا نماز پڑھنا مفید ہوگا یا ناشتہ کھانا، فرمایا اگر ان دونوں نے کھانا کھانا شروع کیا تو نماز کی خیر نہیں اور نماز پڑھلی تو پھر کھانے کی خیر نہیں۔ میں نے کہا ان دونوں فعل میں کسکو مقدم اور کسکو موخر رکھنا ایک مومن کا فرض ہے، فرمایا، بھئی سنو، ایک حق اللہ ہے اور دوسرا زاد المسافرین۔ اور میاں، جانے بھی دو، دماغ چاٹ گئے،

تجھے اٹھکیلیاں سوجھے ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں!

میں نے کہا مرشد، آپ کو تو معلوم ہے۔ بھلے مانس اسی قسم کے فرسودہ مصرعے نہیں پڑھا کرتے، بھوک میں آداب مجلس بھی بھول گئے۔ گھبرانیکی کوئی بات نہیں ہے، زاد المسافرین میرے ساتھ بھی ہے، مسکرائے، پھر فرمایا۔ تو آپ بھی عجیب شخص ہیں۔ پہلے ہی کہدیا ہوتا تو کیا نقصان ہوتا۔ آپ نے خواہ مخواہ دو مسلمانوں کے خلاف بدگمان کردیا!

ریل پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خریدلینے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر ایسے فعل کے لئے آزاد ہیں جس سے ڈبہ میں گندگی پھیلتی ہو یا بلوہ ہوجانے کا امکان ہو، ڈبہ میں داخل ہوں گے تو اس بدگمانی اور ارادہ کے ساتھ گویا تمام دوسرے مسافروں نے انکے حقوق راحت غصب کرلئے ہیں اور یہ نان کوآپریٹر قسم کے مظلوم ہیں، یعنی ان کو اختیار ہے، یہ جتنا ظلم چاہیں کرلیں۔ دوسروں کو کوئی حق شکایت یا تدارک کا نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف دوسرے مسافر اس پر تلے ہوئے ہیں کہ نان کوآپریشن کامیاب ہو یا ناکامیاب دواروں کی جان کی خیر نہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی ایسی کر گذرتے ہیں، اور بعد میں ایسے گھل مل جاتے ہیں گویا برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں!

ہاں تو تذکرہ تھا ایک بزرگ کے "وضو بنانے" کا۔ اول تو جہاں تک دیکھا گیا ہے، وضو کرنے کا لوٹا اکثر ٹکٹ ہوتا ہے اور میلا بھی ہوتا ہے، میلا ہونا اور نہ ہونا تو قطعاً ایک شرعی مسئلہ ہے۔ یعنے جبتک کوئی چیز طاہر ہے اسوقت تک اُسکے میلے ہونے نہ ہونے کا سوال غیر متعلق ہے۔ اگر کسی مولوی کو اس نظریہ سے اختلاف ہے تو اُس کو اپنی تہمد میں منھ ڈال کر اس بیان کی اہمیت پر عذر کرنا چاہیئے۔ محاورہ تو گریبان میں منھ ڈالنے کا ہے۔ لیکن اگر ضرورت شعری کی بنا پر اُصول شعر گوئی سے اعتراف کیا جاسکتا ہے تو پھر ضرورت واقعی کے خیال سے محاورہ سے انحراف کرنا بھی کوئی جرم نہیں ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مولوی کا تہمد شرعی اُصول سے ہمیشہ طاہر ہوگا، لیکن حفظان صحت کے معیار سے اُس کا معاینہ کیا جائے تو مجھے یقین ہے اس میں کیمیاوی اور جراثیمی دونوں اقسام کی "اشیا" بکثرت ملیں گی۔

چنانچہ وضو بنایا جارہا ہے غسل خانہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور وضو اس طور پر کیا جارہا ہے کہ کچھ پانی غسلخانہ کے فرش پر گر رہا ہے اور کچھ اس سے باہر اور شاید دونوں کا مرکب جسم پر۔ "وضو بن گیا" اور اب اس فاتحانہ انداز سے کھڑے ہوئے جیسے کوئی دیہاتی تھانیدار دفعہ ۴۸ کے ملزم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا ہو، پانی کے قطرے ادھر اُدھر گر رہے ہیں۔

اس پر اگر کوئی معترض ہو تو پھر اس طور پر بگڑیں گے، اور آمادہ فساد ہوں گے گویا اسلام خطرہ میں ہے اور صرف یہی ایک مسلمان دجال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے باقی رہ گئے ہیں۔

گاڑی کان پور پہونچی، اتفاق سے یہ نماز کا وقت تھا۔ دونوں بزرگ گاڑی سے اُتر پڑے، انکو دیکھ کر بعض دوسرے مجاہدین بھی جھپٹتے ہوئے آن پہونچے اور پلیٹ فارم سے نادیہ قائمہ بناتی ہوئی نماز باجماعت شروع ہو گئی، یہ بھی ایک عجیب سانحہ تھا کہ اُسی دن کوئی بزرگ نان کوآپریشن وغیرہ کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے اور پلیٹ فارم سے گاڑی میں لائے جارہے تھے۔ وہ ہنگامہ، ہجوم اور شور وغل تھا کہ ہر معقول شخص کو اپنی عزت و عافیت خطرہ میں نظر آتی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا اس وقت نماز باجماعت ادا نہ کرنے سے اسلام کس طور پر خطرہ میں تھا، میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ میدانِ جنگ میں بھی نماز باجماعت ہوا کی ہے اور ہونی چاہئیے لیکن میں اسکو کبھی نہیں مان سکتا کہ اسوقت کانپور کے پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا اور پھر یہ بھی کیا ضرور ہے کہ نماز باجماعت صرف ایسے مقام پر ہو، جہاں ہجوم اور آدمیوں کی آمد و رفت کی کثرت ہو، اور ہر شخص کو جس میں مسلمان بھی شامل ہوں، راحت اور آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے میں دقت یا خطرہ ہو، پھر اس سوال کا کیا جواب ہے اگر اس ہنگامہ رستخیز میں نماز ادا کی جاسکتی ہے تو پھر مسجد کے سامنے باجا بجنے پر مسلمان نماز ادا کرنے سے کیونکر قاصر رہتے ہیں۔

میں ابھی اسی پیچ و تاب میں مبتلا تھا۔ اور رہرنیا اور اناڑی ریفارمر ابتدا میں اسی قسم کی منہ زوری سے کام لیتا ہے اور بے ضرورت آمادہ شہادت رہتا ہے۔ اپنے اس جوش و شدت کی داد لینے کی غرض سے میں مرشد کی طرف متوجہ ہوا، تو یہ دیکھکر کیسی کوفت ہوئی کہ مرشد پر غنودگی طاری ہے۔ کہاں تو میں، شہدا، مجاہدین اور مصلیین کی صف اول میں داخل ہونے کیلئے کیا کیا نہیں کر گذرا اور تھوڑی سی ہمت افزائی سے خدا جانے اور کیا نہ گذرتا، کہاں مرشد ہیں کہ اونگھ رہے ہیں۔ میں جھلاّ پڑا، اور مرشد کو جھنجوڑ کر بولا، دیکھتے نہیں بھارت ماتا کے سپوت مہا بھارت مچا رہے ہیں، اسلامی مجاہدین کی صرف آخری صف میدانِ جنگ میں باقی رہ گئی ہے، یا قرونِ اولے کے مسلمان "محمود و ایاز" سمیت صف بند ہیں۔ یہ وقت سونے کا ہے، یا گورنمنٹ کو گالی دینے اور خود مر جانے کا۔ لاحول ولا قوۃ، مرشد نے آنکھ کھولدی، سامنے سے ایک خوانچہ والا گذر رہا تھا۔ اُس سے کچھ دہی بڑے چکانے لگے۔ پوچھا کونسا اسٹیشن ہے، بڑا مجمع ہے کوئی بڑا ہی اسٹیشن ہوگا۔ اُس نے کہا کانپور ہے، فرمایا، ہیں وہ کانپور والی مسجد ہے، میں نے کہا یہ خطرہ آپ کو کیسے گذرا، فرمایا، کچھ نہیں۔ یہی پلیٹ فارم کے نمازیوں کو دیکھکر خیال آیا اور ہاں دیکھئیے گا وہ ہمارے دوست بھی تو جماعت میں شامل ہیں، معلوم نہیں ان کے ناشتہ کا کیا حشر ہوا، میں نے کہا مرشد کھانے اور سونے دونوں سے نفرت۔ ذرا یہ تو بتاؤ اس وقت پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کرنیکی کیا ضرورت لاحق تھی۔

کہنے لگے بھئی، سنو، یہ نمازی اور تم دونوں حماقت میں مبتلا ہیں۔ نمازیوں کا تو یہ خیال ہے کہ جبتک نماز پڑھتے جائیں، اسوقت تک عقل کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تم کو یہ مغالطہ ہے کہ جبتک عقل ہے اُسوقت تک نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آپ ہر اُس شخص کے پیچھے ڈنڈا لئے پھریں جو آپکے خیالات یا افعال کا مؤید

نہ ہو، ہر شخص جداگانہ طبیعت، جداگانہ مذاق اور جداگانہ مقاصد رکھتا ہے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ سب کے سب آپ کا اتباع کرنے لگیں۔ آپ کا شمار نہ تو آئمہ معصومین سے ہے اور نہ حکومت برطانیہ سے کہ آپ سے غلطی کا ارتکاب ناممکن ہو۔ پھر لوگ اپنے میلان و مذاق کے کیوں پیرو ہوں، بھلا مانس وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ہم آہنگ رہ سکے۔ ہم آہنگ کا لفظ میں نے نہایت وسیع مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی یہ کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس کے وجود سے بہرہ مند ہوں اور کم سے کم لوگوں سے وہ خود بہرہ مند ہو۔ وہ جو خود باعث رحمت ہوتا ہو اسکو کسی دوسرے کے احسان و کرم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اسلام کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ میں نے کہا میں اسلام کے بارہ میں آپ سے استفادہ نہیں کرتا۔ میرا اعتراض تو اس قسم کے مسلمانوں سے ہے، جو ہر کام اس خیال و نیت سے کرتے ہیں کہ لوگ ان کو صرف مسلمان سمجھیں۔ فرمایا، مثلاً؟ میں نے کہا، اول تو یہی دیکھ لیجئے، اس پلیٹ فارم پر نماز باجماعت کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ آپ نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہوگا وہ اس تیور اور تبختر کے ساتھ "آمادۂ نماز" ہوں گے گویا اُن کے علاوہ سارے مسلمان جو اسوقت انکی اقتدا میں نماز نہ پڑھیں گے وہ دوزخی ہیں اور یہی نہیں، بلکہ نماز میں یہ بزرگ اپنے "خاتمہ بخیر" ہونے کے بجائے شاید دوسروں کے جہنمی ہونیکی دعا پہلے مانگیں گے ۔۔۔ وہ بھی اُسی شاندار ذہنیت کے ساتھ جس سے ملت اسلامیہ ہندیہ گورنمنٹ عالیہ برطانیہ سے اپنے حقوق طلب کرتی ہے۔

چنانچہ یہ کچھ نماز ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بعض لوگ روزہ بھی اسی ذہنیت کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان حضرات کے روزہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شریف شخص نہ ان سے مل سکتا ہے اور نہ یہ خود کسی شخص سے شرافت کے ساتھ ملسکتے ہیں۔ آپ شکایت کرینگے صاحب میں آپ سے ملنے گیا تھا معلوم ہوا کہ آپ سو رہے ہیں، فرمائیں گے، بھئی کیا کروں روزہ ہے آپ کہیں گے آپ نے فلاں کام کا وعدہ کیا تھا، ابتک پورا نہ کیا، فرمائیں گے۔ روزہ ہے۔ آپ نے خط کیوں نہیں بنوایا، اور کپڑے کیوں میلے ہیں؟ جواب ملے گا، روزہ ہے، آپ ہنستے کیوں نہیں؟ روزہ ہے، آپ دوسروں کو کیوں نہیں ہنسنے دیتے؟ روزہ ہے! آپ روتے کیوں ہیں؟ روزہ ہے! اور دوسرے نہیں روتے تو بگڑتے کیوں ہیں؟ روزہ ہے! آپ انتقال کیوں نہیں فرماتے؟ تم جہنمی ہو!

مرشد نے فرمایا، بھئی، روزہ کا ذکر کرتے کرتے تو دماغ چاٹ گئے، لیکن تم کو معلوم بھی ہے۔ روزہ اور روزہ کے تذکرہ کا اثر معدہ پر کیسا پڑتا ہے، خصوصًا ایسی حالت میں جب اسمیں پہلے ہی سے خلاء محض ہو۔ پہلے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو، اس کے بعد روزہ پر زیادہ صحت و سلامتی کے ساتھ بحث ہو سکے گی۔ چنانچہ کھانا نکالا گیا، مرشد نے پہلے کھانے کا جائزہ لیا اور ایک ذہنی اطمینان کے ساتھ پہلا لقمہ نذر دہن کیا اس کے بعد ہی ایک پورا گلاس پانی کا اسکی تعاقب میں روانہ کیا گیا، پھر فرمایا، آج کل فرائض مذہبیہ کا ادا کرنا لوگوں نے احسان کرنے کا مترادف سمجھ رکھا ہے، روزہ اس لئے نہیں رکھتے کہ روزہ رکھنا شعائر اسلامیہ میں سے ہے، یا اس قسم کی پابندیاں تنظیم حیات کی موجب ہوتی ہیں اور بجائے خود ممکن ہے

کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن انکا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگی پہ نہایت مفید اور مستقل پڑتا ہے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ روزہ رکھنا روزہ نہ رکھنے والوں کے خلاف ایک شدید جنگ ہے، یا خود اللہ میاں پر ایک احسانِ بیکراں، روزہ رکھنے والوں یا اس قسم کی کوئی اور پابندی اختیار کرنے والوں کی بالعموم یہ ذہنیت ہوتی ہے کہ ہم تو تکلیف اٹھاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اُنکے ذہن و خیال کو خود اُنکے لئے جو چیز اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیتی ہے وہ یہ خیال ہے کہ اس صلہ میں اللہ میاں ہمارے لئے حوریں کیوں نہیں بھیج دیتے اور دنیا والے ہمارا جلوس کیوں نہیں نکالتے دوسری طرف روزہ نہ رکھنے والے ہیضہ میں کیوں نہیں مبتلا ہو جاتے یا جیل خانہ کیوں نہیں بھیجدئے جاتے!

میں نے کہا مرشد بالکل صحیح فرمایا، یہی ذہنیت آپکے علاوہ غالباً تمام نان کو آپریٹیروں کی بھی ہے یعنی یہ کہ ہم کھدر پہنتے ہیں اور جیلخانہ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ململ پہنتے ہیں اور یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں! مرشد نے فرمایا آخر مجھپر اتنا احسان کیوں فرماتے ہیں، مجھے کیا کچھ کم غصہ آتا ہے کہ آپ لوگ گلفام بنے پھرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، مرشد، گلفام بننا کچھ اتنا زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہے، جتنا لال یا سفید دیو کی ذہنیت کا حامل ہونا! مرشد یہ سنتے جارہے تھے کہ یکایک ایک پورا شامی کباب منھ میں رکھا اور گلاس اُٹھا کر ایک ایسے لہجہ میں جس میں شوخی اور سنجیدگی دونوں ہم آہنگ تھیں، فرمایا!

راجہ ہوں میں قوم کا اندر ہے میرا نام!

میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا، گھونگٹ، گندگی، اور گہنا، کم ذی روح ایسے ہوں گے جن پر سونے چاندی اور گندگی کا اتنا انبار ہو، اُن کو دیکھکر مجھے اکثر وہ تصویریں یاد آجاتی ہیں جو ٹائمس ویکلی کے (Times Weekly) پہلے صفحہ پر نظر آتی ہیں، زیور کا منشا اولین تو شاید ظاہری جسمانی آرائش رہی ہوگی، اس کے بعد ممکن ہے اس کا شمار دولت میں ہونے لگا ہو، لیکن اسمیں شک نہیں مارواڑیوں نے اسکو صرف دولت قرار دیدیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی عورتوں کو انھوں نے زیور کی باربرداری کا ایک اچھا جانور سمجھ رکھا ہے۔ مارواڑی عورتوں نے زیور کے منشاء اولین کو بھی نظرانداز کردیا ہے۔ اگر اُن کا شمار زیور میں ہوسکتا ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ زیور کا ایسا بھدا اور بھونڈا نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے۔

عورتیں اکثر رنگین کپڑوں کی شائق ہوتی ہیں، لیکن جہاں تک مارواڑی عورتوں کا تعلق ہے وہ صرف رنگین کپڑوں کی دلدادہ نہیں ہوتیں، بلکہ ان کو ایک طرح پہ رنگین گندگی کا بنڈل کہنا زیادہ موزوں ہے۔ گھونگٹ کا مصرف اگر صرف چہرہ کا چھپانا ہے تو اس میں مارواڑی عورتیں سب سے سبقت لیگئی ہیں۔ لیکن اُنکے گھونگٹ کے معنی یہ ہیں کہ جسم کے بقیہ حصے نقاب و حجاب سے بالکل بے نیاز ہوں، نہانا بھی شاید اُنکے فرائض مذہبی میں شامل ہے، ریل کے سفر میں نہانے کی سہولتیں تو فراہم نہیں ہوسکتیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان عورتوں یا ان کے مردوں نے خود نہانے میں اتنی سہولتیں پیدا کرلی ہیں کہ ریلوے کے حکام کو اس طرف توجہ کرنیکی شاید ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ جس کپڑے میں بیٹھی ہوں گی اُسی کے ساتھ پلیٹ فارم پر اترآئینگی

اور پانی والے مہراج، دو تین لٹیاں پانی کی سر پر ڈالدیں گے۔ اور یہ کافی ہے۔ اس کو غسل کرنا کیوں کہئیے یہ تو خشک گندگی کو تر بنانا اور اسکو منتشر کرنے کا صرف ایک وسیلہ ہے۔ اور پھر اس تر بتر کپڑے کے ساتھ ڈبّے میں داخل ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جیسے اسمبلی میں بم کا گولہ گرنا تعجب انگیز نہیں ہے۔

ان عورتوں کے ساتھ جتنے مرد دیکھے گئے ہیں انکے کیرکٹر کا ایک پہلو خاصا عبرت ناک ہے، اگر اتفاق سے دو تین مرد ساتھ ہوئے تو پھر یہ اپنی مارواڑی زبان میں گفتگو کا ایسا سلسلہ شروع کریں گے جو کبھی ختم نہ ہوگا، اور اس شور اور شدت کے ساتھ بولیں گے کہ آپ پر زندگی کی تمام راحتیں حرام ہو جائیں گی۔ یہی حالت بنگالیوں کی ہے، سفر میں ان کا محبوب ترین اور تنہا مشغلہ کھانا اور بکنا ہے۔ دنیا کی خرافات ترین اور کم سے کم داموں والی چیزیں کثیر ترین مقدار میں خریدیں گے اور کھائینگے۔ دو چار پیسہ سے زیادہ کی چیز نہیں خریدینگے اور بیچنے والے سے اس قدر حجت کرینگے گویا ہندوستان کی حکومت خود اختیاری پر نمائندگان برطانیہ سے ردوکد کر رہے ہیں۔ اگر ہر اسٹیشن پر گاڑی کے ٹھہرنے کا وقت محدود نہ ہو تو مجھے یقین ہے ان لوگوں کی خرید فروخت ہمیشہ جرائم قابل دست اندازی پولس پر ختم ہو۔ گاڑی اسٹیشن پر رُکی تو یہ کھانے کی چیز خریدینگے۔ چلتی رہے تو غسل خانہ میں اُصول حفظان صحت کی بحث و نزاع یا شکست و ریخت میں مصروف ہوں گے اور ان دونوں سے فارغ ہوں تو ہمسفر ساتھیوں کی راحت میں خلل انداز ہوں گے۔ یعنے کھاتے ہوں گے، بکتے ہوں گے، یا بیڑی پیتے ہوں گے، یا ان سب کا نتیجہ خدا جانے اور کیا کیا کرتے ہوں گے۔

بنگالیوں، مارواڑیوں اور بنیوں میں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ یعنے اگر انکے ساتھ عورتیں یا بچے ہونگی تو یہ ہمیشہ عورتوں اور بچوں کی راحت کو اپنی راحت پر قربان کرینگے۔ میں نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ یہ اپنے سونے اور بیٹھنے کیلئے پہلے جگہ تلاش کرکے مخصوص کرلیگا۔ عورتیں اور بچے تنگ سے تنگ جگہ پر بیٹھے ہونگے۔ دھوپ اور ہوا سے انکو سخت تکلیف پہونچتی ہو گی لیکن مرد کو اسکی کوئی پروا نہیں، یہ سارے کپڑے اتار کر صرف دھوتی باندھ کر پوری سیٹ پر پڑ رہے گا۔ اور اسوقت تک پڑا رہے گا، جبتک اسکو پھر بھوک یا پاخانہ نہ لگے۔ ان کی دھوتی ستر پوشی کا اتنا کام نہیں دیتی جتنا موقعہ ستر کی نمائش اور نمایندگی کرتی ہے۔ ممکن ہے، کرشمۂ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست کا مردانہ مفہوم آسی قسم کی دھوتی ہو!

مارواڑی کو سوتا پاکر مرشد نے بھی ایک جھپکی لی، اور دونوں کو غافل پاکر ایک شرعی مسلمان نے کلام پاک کی تلاوت شروع کردی، اور اس زور و شور کے ساتھ کہ ایک چھوٹا شیر خوار بچہ جاگ پڑا اور اُس نے رونا چیخنا شروع کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مرشد بھی جاگ پڑے، اور اُٹھ کر بیٹھ گئے لیکن آنکھیں بند تھیں، اور بظاہر اس امر کا اندازہ لگا رہے تھے کہ اگر یہ سارا ہنگامہ بیداری کا نہیں بلکہ عالم خواب کا ہو تو ایک بار پھر لیٹ رہیں، لیکن اس ہنگامہ سے بنگالی مسافر کی بھوک اور بکواس کو تحریک ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے مرشد سے دریافت کیا کہ کیا وقت ہے اور اگلے اسٹیشن پر کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں، مرشد ابھی کچھ جواب نہ دینے پائے تھے، کہ مارواڑی بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اُس نے سب سے پہلے بیوی کا جائزہ لیا اور اس خوف و اندیشہ کے ساتھ کہ کہیں ڈبہ میں چور تو نہیں

گھس آئے تھے، اور زیور پر حملہ تو نہیں ہوا، بیوی کو محفوظ اور بچے کو پاخانہ پھرتا پا کر پھر لیٹ رہا۔ مارواڑی عورت نے پاؤں کو اصلی معنوں میں قدمچہ بنا کر بچہ کو پاخانہ پھرایا، لوٹیا سے بالٹی میں سے پانی نکالا اور بچہ کو پاک اور سارے ڈبہ محمولہ مرشد و اشیاء منقولہ و غیر منقولہ، ذی روح و غیر ذی روح کو ناپاک کر دیا، مرشد قریب ہی تھے، اس تمام ہنگامہ سے ایسا ہی مطمئن یا مسرور تھے، گویا مارواڑی عورت اور اس کا بچہ خود انکی بیوی اور بچہ تھے!

میں نے دریافت کیا، کیوں مرشد اگر سوراج مل گیا تو آپ ان بدعنوانیوں کا کیا علاج کرینگے۔ فرمایا، سوراج کچھ آپ کی یونیورسٹی (University) تو ہے نہیں کہ قوم کی ساری ضروریات کی کفیل ہونے کا دعوی کر سکے۔ میں نے کہا اگر سوراج ملنے پر بھی ہندوستانیوں کو سکنڈ کلاس میں سفر کرنا نہ آیا تو حیف ہے آپ پر اور آپ کے سوراج پر۔ فرمایا، ہندوستانیوں کو سکنڈ کلاس میں نہیں بلکہ تھرڈ کلاس میں ٹھکانے سے سفر کرنا آجائے تو پھر سوراج کی ضرورت بھی باقی نہ رہے۔ میں نے کہا جس قوم کو قضائے حاجت کا بھی سلیقہ نہ ہو، اس کا سوراج طلب کرنا کہاں تک روا ہے، فرمایا اور جو حکومت سو سال تک کسی قوم کی اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی ضروریات کی کفیل رہنے کی دعویدار رہی ہو اور پھر اسکی رعایا کو قضائے حاجت کا سلیقہ نہ ہو، وہ خود حکومت کرنیکی کہاں تک اہل ہے۔ میں نے کہا مرشد، جہاں تک انگریز اور ہندوستانیوں کا تعلق ہے، موخر الذکر کی قضائے حاجت محض ایک اضطراری فعل ہے، اس لئے قابل معافی۔ قضائے حاجت تو ہندوستانیوں کے خمیر میں داخل ہو گیا ہے کلکٹر صاحب کا سامنا ہو اور ہندوستانی کو قضائے حاجت پر قدرت ہو، اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا ایک بنگالی دوسرے بنگالی کو دیکھ پائے اور خاموش رہے۔ یا آپ کی گاندھی ٹوپی دیکھکر مجھ کو پیچ و تاب نہ ہو۔ فرمایا، ہیٹ اوڑھکر گاندھی کیپ پر پیچ و تاب کھانا بھی ایک مسئلہ ہے، جسپر کبھی غور فرما لیا کیجئے۔

پورب سے کالا کالا جل سا بادل اٹھا، گھٹتا، جھومتا، پھنکارتا، بل کھاتا ہوا، ——— جیسے انگریزوں کا کوئی ڈریڈ ناٹ کہیں پیغام صلح لئے جا رہا ہو ——— یا کسی چارن پر جوانی چھا رہی ہو ——— اعوذ باللہ من شرور انفسنا .... الخ

ممکن ہے بعض ثقات پر "چارن" گراں گذرے، لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس موقعہ پر یا تو "چارن" اختیار کیجاتی یا پھر یہ شعر،

ہرا اوامستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

پھر الفاظ شرط ہے اردو یا ہندوستانی شاعری میں اور وہ بھی ایک اردو ہی شاعر کی زبانی "کافر" کا مفہوم چارن نہیں تو ادا کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس مسئلہ نے کبھی طوالت کھینچی تو میں یقیناً اپنی جوابدہی میں مسٹر چغتائی کو پیش کروں گا۔ کیونکہ مرشد کا بھی خیال ہے کہ اگر متذکرہ صدر شعر کو "نقش فریادی" کے سلسلہ میں کبھی مسٹر چغتائی نے پیش کیا تو وہ یقیناً کسی "نوجوان چارن" کی ہوگی۔ اور مرشد نے مجھے اطمینان دلا دیا ہے، اور اسی بنا پر میں اڈیٹر صاحب نگار کو بھی یقین دلاتا ہوں کہ "نوجوان چارن"

اُسوقت تک کبھی خطرناک نہیں ہے، جبتک اس کا سابقہ کسی نوجوان چمارؔ سے نہ ہو، اور مجھے یقین ہے ناظرین نگار میں سے کوئی صاحب اس فضیلت کے دعویدار بھی نہ ہوں گے، بشرطیکہ وہ کوئی ممبر کونسل نہ ہوں!

شام ہونے لگی اور پانی برسنے لگا، میں نے کہا مرشد، ہندوستان کی برسات سے بھی زیادہ پُرکیف منظر آپ کی نظر سے گذرا ہے؟ کیسی گھٹا اُٹھی ہے، کیسی روح پرور ہوا ہے اور کتنی اچھی بارش ہوتی ہے۔ آپ تو بڑے جہانیاں جہاں گشت ہیں، کچھ سُنائیے۔ فرمایا،

بن بادل بجلی کہاں چمکی، بن، با،

اتنے میں ایک ٹکٹ کلکٹر داخل ہوا، مرشد لیٹ گئے، بقیہ نغمے حلق کے بجائے ناک سے برآمد ہو رہے تھے۔
اور میں بھی لکھتے لکھتے تھک گیا!

رشید احمد صدیقی (ایم اے) مسلم یونیورسٹی

کیا دنیا کو مذہب کی ضرورت ہے؟

(بہ سلسلۂ ماسبق)

گزشتہ مہینے کے نگار میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ دنیا میں مذہب کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی اور ملل اولین کے مذہبی عقائد فی الحقیقت کیا چیز تھے اور ان کے خیالات میں کس طرح تدریجی ارتقا ہوا۔

چونکہ مذاہب کا وجود، علی الخصوص ان مذاہب کا جو اپنے آپ کو اخلاق و معاشرت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، قدرتاً متاثر ہوا کرتا ہے، وقت و ماحول سے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انسانی تمدن تو قوانین ارتقاء کے ماتحت ترقی کرے اور مذہب اپنے حال پہ قائم رہے، کیونکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان مذہب کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مذہب خود کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک کیفیت و عرض ہے جو انسان پر اس کی دماغی تربیت، تمدنی ماحول اور نظام اجتماعی کے ماتحت لاحق و طاری ہوتی ہے، اس لئے اگر کوئی مذہب یہ دعوے کرے کہ اسکی اولین شریعت ہمیشہ یکساں طور پر ہر زمانہ و ملک کی موافقت کر سکتی ہے تو اس سے زیادہ جھوٹ دنیا میں صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک وزنی چیز کو بلندی کیطرف پھینکیں اور کہیں کہ زمین اسکو اپنی طرف نہ کھینچے گی۔

خود انسان کی تاریخ پر آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے اس پر لاکھوں برس کا وہ لامعلوم زمانہ گزرا جب اس میں اور ایک جانور میں قطعی کوئی فرق نہ تھا، اس کے بعد پانچ، چھ لاکھ سال کا وہ زمانہ آیا جب اس نے پتھر کے بھدے آلات بنانا سیکھے، پھر حجری عہد عتیق آیا جو تین چار ہزار سال تک قائم رہا، پھر مسیح سے ۲۰ ہزار سال قبل عہد حجری جدید شروع ہوا جو ۳ ۱/۲ ہزار سال قبل مسیح تک جاری رہا۔ اس کے بعد عہد تاریخی شروع ہوا، جسکی ارتقائی صورت موجودہ عہد تہذیب و تمدن ہے۔

انسان کے ان مختلف منازل ارتقاء میں، مذہب کے اندر جس جسطرح تبدیلیاں ہوئیں انکا ذکر ہم ماہ گزشتہ کے رسالہ میں کر چکے ہیں کہ اول اول مذہب کا خیال کس طرح صرف وہم و گمان پر قائم ہوا، اس کے بعد کیونکر مظاہر قدرت اور آثار فطرت کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اخلاق پر اسکی بنیاد رکھ کر کس طرح ان مذاہب کو پیدا کیا گیا جنھیں الہامی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مختلف ممالک کے مذہبی معتقدات میں باوجود اختلاف کسقدر مشارکت پائی جاتی ہے اور عقائد کی اشاعت کن اصول کے ماتحت کی گئی۔ جبتک انسان کا مذہب کسی مرتب و مدون صورت میں نہیں آیا وہ بالکل ذاتی اور بغیر

چیز تھا، لیکن اس کے بعد جب ایک مخصوص جماعت علم مذہب یا علم رسم و رواج جاننے والی پیدا ہوگئی تو اُس نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنایا اور اول وقت سے لیکر آج تک کوئی زمانہ، کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا جو اس نوع کے کاذب مدعیان مذہب کا مجروح نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اس جماعت کا یہ اقتدار عرصہ تک قائم رہا، لیکن جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی، عقول انسانی میں سمجھنے اور غور کرنے کی اہلیت پیدا ہوئی، تو رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی ظاہر ہونے لگی، جس نے احکام مذاہب، معتقدات مذاہب پر غور کرنا شروع کیا، اور آہستہ آہستہ فقہ کے ساتھ علم کلام کی بھی بنیاد پڑی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔ اور جبتک ایک متنفس بھی مذہب کا ماننے والا موجود ہے۔ اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ علم کلام کی انتہا اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ مذہب سے انکار کر دیا جائے اور اسکی پابندیوں کو بالکل توڑ کر رکھ دیا جائے۔ وہم و خیال کی آپ کتنی ہی تاویل کرتے جائیے۔ وہم و خیال ہی رہیگا۔ اس لئے اسکا اختتام اسی طرح ممکن ہے کہ آپ وہم و خیال ہی سے گذر جائیں۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد قدیم کی قوموں میں اول اول بُت پرستی کس طرح شروع ہوئی اور متعدد بتوں کا وجود مٹ کر کیونکر صرف ایک بڑے بُت کی ہستی قائم ہوئی۔ یہ گویا سب سے پہلا خیال تھا جسے ہم ایک لحاظ سے توحید کہہ سکتے ہیں، لیکن چونکہ اس میں بھی بہت کچھ مادیت پائی جاتی تھی، اس لئے فطرت انسانی مطمئن نہ تھی اور کبھی کبھی اس میں بغاوت کے آثار پائے جانے لگتے تھے، چنانچہ زردشت، کنفوشس اور بودھ انھیں لوگوں میں تھے جو مادیت سے علیحدہ ہو کر اپنے مذاہب کی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے، اور اسمیں کلام نہیں کہ اُسوقت زمانہ کے لحاظ سے جو کچھ اُنھوں نے کیا وہ بالکل وہی تھا جیسے آج کوئی معقول پسندی کے بنا پر تمام مذاہب کی ضرورت سے انکار کر دے۔

عہد آخر کے مذاہب میں سب سے اخیری مذہب جسکے بعد اسلام کا ظہور ہوا اور جس نے غیر معمولی وسعت اختیار کی عیسوی مذہب تھا، لیکن اُسکی جو حالت ہوئی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنیوالوں سے مخفی نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم غور سے اس کا مطالعہ کریں تو ہمارے لئے بہت کچھ سامانِ عبرت و بصیرت اس میں موجود ہے۔

میں نے اسوقت تک اسلام سے کوئی بحث نہیں کی اس پر سب سے اخیر میں بطور نتیجہ بحث کرکے بتاؤں گا کہ اس تمام تلاطم خیال میں سکون پیدا کرنے والا صرف اسلام ہی ہو سکتا تھا، لیکن وہ اسلام نہیں، جو آجکل پایا جاتا ہے اور نہ وہ اسلامی تعلیمات جو مولویوں، فقیہوں اور محدثوں نے ہمیں بتائیں۔ بلکہ وہ تعلیم و تلقین جو خدا نے ظاہر کی، جو قرآن میں موجود ہے اور جو ایسی حقیقت و صداقت ہے کہ اگر اسکو سمجھ لیا جائے، تو تمام انسانی تفرقے خواہ وہ تمدن و مذہب سے متعلق ہوں، یا سیاست و اقتصاد سے فوراً مٹ سکتے ہیں۔ اور ساری دنیا ایک ہی مقصد کو سامنے رکھکر ایک ہی جادہ پر دست و بغل ہو کر گامزن ہو سکتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کو اس عیسوی مذہب کے ارتقاء و زوال کے مناظر دکھاؤں جو آج دنیا کی متمدن ترین اقوام کا معمول بنایا جاتا ہے، کیونکہ اس مذہب کی تاریخ کا بہت بڑا اثر اسلام پر پڑا ہے اور جو جو صورتیں کلیسہ اصحاب کلیسہ کے

انہدام کی وہاں پیدا ہوئیں، وہی اسلام کے لئے پیدا ہو رہی ہیں اور ان کا کامیاب ہونا یقینی ہے، اگر علمبرداران اسلام نے اب بھی موقعہ کی نزاکت کو محسوس نہ کیا، جس طرح تمام مذاہب کی ابتدائی حالت میں معلمین مذہب کا اقتدار رہا ہے اسی طرح مسیحیت میں بھی پادریوں کا اثر بہت قائم تھا، لیکن جب اُنھوں نے دین عیسوی کو رسم و رواج کی پابندیوں کا ایک طلسم بنا دیا جیسا کہ موجودہ اسلام میں پایا جاتا ہے تو لوگ رفتہ رفتہ اس سے گھبرانے لگے۔ اور سب سے پہلے لیوتھر اور کالوین نے ایک جدید اصلاح یافتہ مذہب "پروٹسٹانیت" (PROTESTANTISM) کے نام سے قائم کیا، لیکن چونکہ یہ اصلاح بھی پوری طرح دل کو نہ لگتی تھی اس لئے جب یورپ میں دور نہضت (RENAISSAUCE) شروع ہوا تو تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں میں مذہبی عقائد و مسائل کی چھان بین بھی ہونے لگی اور انھیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نہ انجیل سے تعلق رکھتی ہیں نہ کلیسہ سے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روم میں عہد شہنشاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا، اطالیہ سے یہ ذوق منتقل ہو کر رفتہ رفتہ فرانس اور انگلستان پہونچا، اور وہاں بھی اسی قسم کے مباحث ہونے لگے۔ یہ وقت وہ تھا جب انگلستان میں شکسپیر سے پہلے انگلستان کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس مارلو (MAR LOWE) سر والٹر ریلے (WALTERRALEIGH) اور بہت سے دیگر روشن خیال لوگوں نے متشککین کا ایک کلب قائم کر رکھا تھا اور مذہبی اُمور پر بحث کیا کرتے تھے۔ جس وقت اطالیہ کی طرف سے ان خیالات کی تائید ہوئی تو تحقیق و تدقیق کا بازار زیادہ گرم ہو گیا۔ اور جو باتیں بائبل میں درج تھیں ان کا از روئے درایت مضحکہ اُڑایا جانے لگا۔ اسوقت سیاح لوگ مختلف ممالک کا اکتشاف عمل میں لا رہے تھے، پردۂ اخفا سے ایسی ایسی نئی زمینیں برآمد ہو رہی تھیں جو مصنفین بائبل کے خواب میں بھی نہ آئی تھیں، دوسری طرف نگاہیں دوربینوں کے ذریعہ سے فلک الافلاک تک پہونچ رہی تھیں۔ اور آسمان کے متعلق تمام بائبلی معلومات لغو و مہمل ثابت ہو رہی تھیں۔

الغرض جدید معلومات کے سامنے مذہب کی قدیم معلومات پادر ہوا نظر آ رہی تھیں اور پرانے معتقدات کا شیرازہ درہم برہم ہوا جاتا تھا۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ جس چیز کو "الہامی" اور "ربانی" مذہب بتایا جاتا ہے وہ درحقیقت معمولی بلکہ ادنےٰ دماغوں کے منتشر خیالات ہیں۔ اور رفتہ رفتہ مذہب کی وقعت اُن کے دلوں سے اسقدر محو ہو گئی کہ قومی و ملی اغراض کے مقابلہ میں بھی اس کو نظر انداز کیا جانے لگا۔

چند دنوں میں متشککین، لاادریین، اور معقولیین (RATIONALISTS) کا ایک گروہ ہر ملک میں قائم ہو گیا، جنھوں نے آزادی کے ساتھ مذہب کے متعلق لکھنا شروع کر دیا۔ سترہویں صدی کے وسط سے لیکر اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان میں بڑے بڑے زبردست لاادریہ مصنفین گذرے۔ جنمیں بہت زیادہ مشہور ہربرٹ (HERBERT) بلاؤنٹ (BLOUNT) ٹنڈیل (TINDEL) ٹولینڈ (TOLAND) لارڈ شیفٹسبری (SHAFTHSTEURY) لارڈ بولنگبروک (BOLINGBROKE) کولنس (COLLINS) وغیرہ تھے۔ خشک مسیحیوں (BURITAUS) کا زمانہ گذر چکا تھا، ملک میں ہر جگہ آزادی ضمیر کا دور دورہ تھا اور پادریوں کے اخلاق اسقدر گر گئے تھے کہ کلیسہ کے اسقف حرامکاری کو عیب نہ سمجھتے تھے اور

امراء کی ناجائز اولادیں آسانی سے اسقف کا مرتبہ حاصل کر سکتی تھیں۔ اس زمانہ کی ملکۂ انگلستان کیرولائن (CAROLINE) (سنہ ۱۶۸۳ء ــــــ سنہ ۱۷۳۷ء) بھی اسقدر متشکک واقع ہوئی تھی کہ مرتے وقت اس نے کلیسہ کا توشہ لینے سے انکار کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ الغرض اس زمانہ کے بڑے بڑے مدبرین اور صاحبان علم و فضل معقولیت پسند تھے، یہ لوگ مجز خدا کے معجزہ و وحی وغیرہ کو نہیں مانتے تھے اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ قدیم کلیسہ کے معتقدین نے ان کا نام "فرو ملحد" رکھ دیا تھا۔ الغرض گذشتہ دو سو برس سے مخالفین مسیحیت کی ایک زبردست جماعت انگلستان میں چلی رہی ہے اور جسقدر تعلیم بڑھتی جاتی ہے۔ اُسی قدر اس جماعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پریس کی ایجاد اور ارزاں کتب کی اشاعت نے ہر جگہ مذہب کے خلاف ہیجان پیدا کر دیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جب اٹھارہویں صدی میں صنعت، حرفت و تجارت کا بازار گرم ہوا اور ہر طرف امن و سکون قائم ہوا تو اشاعت علوم و فنون کے ساتھ "عقلیت" (RATIONALISM) کو بھی ترقی ہوئی۔ گیٹے (GAETHE) شلیر (SHILLER) اور کانٹ (KANT) وغیرہ سیکڑوں شعرا اور فلسفی پیدا ہو گئے۔ جن کے دلنشین کلام اور شیوا بیانیوں نے عوام کے دل میں جگہ کی اور مذہبی روایات کی عمارت متزلزل ہو کر زمین پر آ رہی۔

اسی زمانہ میں انگلستان کی طرح فرانس میں بھی آزادی کا دور شروع ہوا۔ پروٹسٹنٹ جماعت کے قتل عام کے بعد فرقۂ یسوعی (JESUIT) ملک سے نکال دیا گیا تھا، لوگ مذہبی فرقوں کے جھگڑوں سے تنگ آ گئے تھے اور ان کا دل مذہب کی طرف سے بیزار تھا۔ فلسفیوں نے جدید معلومات کی بنا پر بائبل اور مسیحیت پر حملے کرنا شروع کر دئے۔ اور اصحاب کلیسہ اسقدر برہم ہوئے کہ جب والٹر (VOLTAIRE) نے اپنے "فلسفیانہ خطوط" (PHILOSOPHICAL LETTERS) شائع کئے تو اس کی جلدیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فراہم کر کے جلا یا گیا۔ اور غریب والٹیئر کو جان بچانے کے لئے ایک نواب کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقۂ علما کی رہی سہی وقعت بھی لوگوں کے دلوں سے اُٹھ گئی۔

والٹیئر کا ہمعصر روسو (ROUSSEAU) بھی موحد تھا۔ اس نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے مسیح کا حُلۂ تقدس چاک کر کے پھینکدیا۔ اور لوگوں پر ثابت کیا کہ جس یسوع ناصری کو مسیحی دنیا خدا مان رہی ہے اس میں ذرہ برابر بھی الوہیت نہیں تھی اور وہ خدا کا ایک سیدھا سادہ پرہیزگار بندہ تھا۔ الغرض یہ عقیدہ تمام فرانس میں پھیل گیا۔ اور وہاں سے ہسپانیہ و جرمنی وغیرہ پہونچا اور اس طرح اکثر بلاد یوروپ کا مذہب "والٹیریت" ہو گیا۔ ہر جگہ درباروں اور بازاروں میں والٹیئر کی تصانیف کا چرچا تھا۔ اور سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اس کی کتابیں پڑھی جاتی ہوں۔

مسیحی مقتدایان دین نے والٹیئر کو دجال (ANTI-CHRIST) بنایا اور جس قدر ہو سکا گالیاں دیں۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دنیا اسی دجال کی پیرو ہوتی گئی۔ اسی زمانہ میں یوروپ کا اہم ترین واقعہ انقلاب فرانس رونما ہوا۔ جس نے اگرچہ قدیم نظام حکومت کو تہ و بالا کر دیا۔ لیکن سیاسی اور مذہبی آزادی اور تقویت پہونچائی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس نے تین نہایت زبردست

اور سحر بیان اہل قلم طامس پین (THOMAS PAINE) روشو (RAUSSEAU) اور والٹیر (VOLTAIRE) پیدا کئے۔ یہ تینوں خدا پر ایمان رکھتے تھے لیکن وحی کے قائل نہ تھے۔

اس کے بعد یورپ میں "مشککین" (SCEPTICS) کی ایک جدید جماعت پیدا ہوئی جنھوں نے ایمان باللہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔ یہ لوگ ملحد (ATHEISTS) یا مادئین (MATERIALISTS) کہلائے۔ اس جماعت میں بھی بڑے بڑے اہل قلم لوگ تھے۔ مثلاً دیدرو (DIDEROT) ہولباش (HOLBACH) قندورسے (CONDORCET) اور ہلویٹیس (HELVETIUS) یہ لوگ فیلسوفوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور اُن کی قیادت میں مذہب کے خلاف بغاوت برابر بڑھتی رہی۔

یہ ریب و شک کوئی "ہوا کا رُخ" نہ تھا کہ مٹ جاتا۔ بلکہ توسیع علوم و فنون کے ساتھ اس میں زیادہ شدت و عمومیت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ فرانس کے "حکماء" کے تشکک پر گہرا علمی رنگ چڑھ گیا۔ اور فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ (DESCARTES) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جانوروں میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے "روح" (SOUL) کہا جا سکے۔ اسکے نزدیک ایک بندر یا عقاب کا جسم "مشین" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

علاوہ ازیں ڈیکارٹ نے دنیا کے سامنے ایک نظریہ ارتقاء یہ بھی پیش کیا کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت و سیارگان سدیم یا ذرات نور (NEBULA — COSMIC DUST) سے پیدا ہوئے ہیں اور اسطرح گو یا ذات واجب الوجود کی ہستی کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر تک اس تحریک میں علمی رنگ زیادہ غالب ہو گیا اور بائبل کی نکتہ چینی ایک علمی مشغلہ ہو گیا۔ یعنی لوگ اصل عبرانی بائبل کا بہت زیادہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے لگے اور اس تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبرانی عہد نامۂ عتیق کا راز فاش ہو گیا۔ اور یہ بات ظاہر ہو گئی کہ قدیم صحف انبیاء بنی اسرائیل مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں۔ جن کو بہت کچھ تحریف و ترمیم کے بعد ایک جگہ مدون کر دیا گیا ہے۔ اور یہ کام مقتدایان دین یہود نے عیسیٰ سے چند صدی پیشتر کیا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جسے بائبل کی تنقید اعلےٰ کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہم مختلف زمانوں کی اُردو یا فارسی زبانوں میں تفریق و تمیز کر سکتے ہیں۔ اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ زبان ولیؔ دکھنی کی ہے۔ یا میرؔ کی۔ انشاؔ کی ہے یا داغؔ و غالبؔ کی اسی طرح جدید فن تنقید کے ذریعہ سے قدیم صحف بنی اسرائیل یا تالمود کے زمانۂ تصنیف کا تعین ہو جاتا ہے۔ جدید علوم خصوصاً نظریۂ ارتقاء نے توریت کے باب پیدائش کی بُری طرح دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اور اب چونکہ آثار قدیمہ کے اکتشاف سے صحیح تاریخی معلومات حاصل ہو چکی ہے۔ اس لئے بائبل کی تاریخی نوعیت بھی خاک میں مل گئی ہے۔

اسی زمانہ میں فن تاریخ نے بھی علمی صورت اختیار کر لی۔ ہیوم (HUME) اور گبن (GIBBON) نے قدیم تاریخی روایات و حکایات کو معیار درایت پر کس کر ایسی تاریخیں لکھیں کہ اُن کے مقابلہ میں تمام قدیم تاریخیں داستانیں ہو کر رہ گئیں۔ خصوصاً گبن کی تاریخ کے ایک باب نے جو "عروج مسیحیت" پر ہے دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور اس تحریک کو اور زیادہ

تقویت پہونچائی۔ گبن ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عالم بشری کی تاریخ اساطیر الاولین سے معرّیٰ کرکے لکھی۔ اور جسطرح مشہور فرانسیسی ماہر فلکیات لاپلے (LAPLACE 1749-1827) اور جرمن فلسفی وہیئت داں کانٹ (KANT-1724-1804) یہ نظریہ قائم کرکے کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت و سیارگان "سدیم" یا "لطخات سحابیہ" یا "ذرات نور" (NEBULAE) کے ذریعے سے پیدا ہوئے ہیں کسی خالق السماء کی ضرورت باقی نہیں رکھی، اسی طرح گبن نے بھی ثابت کردیا کہ تاریخ انسانی میں بھی کسی خالق الارض کا ہاتھ نہیں ہے۔ الغرض جدید علم تاریخ نے تمام خرافی قصے صفحات تاریخ سے نکالکر پھینک دئے اور ثابت کردیا کہ تاریخ عالم کا نشو و نما اصول ارتقاء کے ماتحت ہوا ہے۔

جدید علم تاریخ کا ایک اثر دنیا پر اور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ دنیا قدیم یونانی و رومی تمدن و شائستگی کی مداح ہوگئی۔ اور ان کے قدیم علوم و فنون از سر نو زندہ ہوگئے۔ ابتک مسیحی دنیا قدیم یونانیوں اور رومیوں کو مشرک و بت پرست سمجھکر سزاوار جہنم سمجھتی تھی۔ لیکن جدید علم تاریخ نے ثابت کردیا کہ عہد نامہ جدید یعنی مجموعہ اناجیل میں ایک بھی پاکیزہ خیال یا تعلیم ایسی نہیں ہے جو اقوال فلاطون (PLATO) یا حکماء "رواقیین" (STOICS) کی تعلیمات میں موجود نہ ہو۔ اس انکشاف نے ارباب تشکیک کے ہاتھوں میں جدید حربہ دیدیا اور وہ اور بھی زیادہ قوی ہوگئے۔ اس کے بعد حفریات اثری (ARCHEOLOGICAL EXCAVATIONS) کا دور شروع ہوا۔ جب نپولین اعظم نے مصر فتح کرلیا تو یوروپ کے صدہا علماء مصر پہونچ گئے۔ اور انھوں نے آثار برآمد کرکے بائبل کی تاریخ اور روایات کو اور بھی زیادہ مشکوک کردیا۔ اسکے بعد جب حفریات بابل و نینوا سے دنیا کی آنکھیں کھل گئیں۔ جب یہاں کے آثار برآمد ہوئے تو مٹی کی تختیوں اور منقوشات اشوریہ (CUNIFORMS) وغیرہ سے عجیب و غریب تاریخی حالات معلوم ہوئے اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء بنی اسرائیل نے جو روایات و حکایات دنیا کے سامنے الہامی کہہ کر پیش کی تھیں وہ درحقیقت روایات بابل و نینوا کا مجموعہ ہیں جن کو مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد پیش کردیا گیا۔ بابل و نینوا میں جو روایات پانچ چھ ہزار برس پیشتر رائج تھیں وہی درحقیقت "اسرائیلیات" بن گئیں۔ تخلیق عالم، پیدائش آدم و حوا جنت عدن۔ ہبوط آدم۔ طوفان نوح وغیرہ کی تمام اسرائیلی روایات لفظ بہ لفظ بابلی روایات ہیں۔ ان انکشافات کے باعث قصص بائبل سے لوگوں کا ایمان اٹھ گیا اور وہ وحی و الہام کے بھی منکر ہوگئے۔ اور جب انھوں نے توریت کی کتاب پیدائش کے حالات کو علم طبقات الارض کی روشنی میں دیکھا تو وہ بائبل سے اور زیادہ بدگمان ہوگئے۔ کیونکہ یہ روایات قدیم بابل و نینوا میں اس وقت رائج تھیں۔ جب عبرانیوں کو لکھنا پڑھنا تک نہ آتا تھا۔

آثار قدیمہ کے ساتھ ہی ساتھ فلسفہ نے بھی لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ جب "عقیدۂ الہیت" (DEISM) نے وحی و الہام کے عقیدہ کی بیخ و بنیاد کو متزلزل کردیا۔ تو لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ ہستی روح اور وجود باری تعالے کو منطقی دلائل کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے۔ کیونکہ جب تک ان دونوں کا وجود ثابت نہ ہو جائے وحی والہام لاشے محض ٹھہرتے ہیں۔ یعنی وحی سے پہلے یہ ثابت کرنیکی ضرورت ہے کہ کوئی وحی بھیجنے والا موجود بھی ہے۔ الغرض فلسفیوں

نے جملہ "اسباب علل" سامنے رکھ کر بحث کی۔ بہت سے دلائل غیر اطمینان بخش ثابت ہوئے اور اس طرح عقائد مذہبی کو اور زیادہ صدمہ پہونچا۔

وہ آخری چیز جس نے عقائد مذہبی پر ضرب کاری لگائی "سائنس" (SCIENCE) ہے مختلف علوم متداولہ نے ستاروں۔ پھولوں۔ پتھروں، جانوروں، اعضاء جسمانی، جوہر مادی، وغیرہ کی نسبت وہ رازہائے سربستہ منکشف کئے کہ دنیا محو حیرت ہوگئی۔ ہر شخص سائنس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگیا، علاوہ ازیں سائنس نے وہ مہندسی وکیمیاوی کارنامے پیش کئے کہ ان پر کسی شخص کو شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس لئے جب سائنس میدان میں آیا تو لوگ اسکی طرف اسقدر زیادہ مائل ہوئے کہ تاریخ یا فلسفہ کے بھی اتنے گرویدہ نہ ہوئے تھے۔ مذہب وسائنس میں آویزش اسوقت سے شروع ہوئی جب ڈارون (DARWIN) کی کتاب "مصدر الانواع" (ORIGIN OF SPECIES) شائع ہوئی۔ ڈارون کا کمال یہ ہے کہ اس نے قانون ارتقاء کو اس خوش اسلوبی اور واقعاتی بنیاد پر پیش کیا کہ ہر شخص کی توجہ اس طرف مائل ہوگئی۔ پادریوں کو نظریہ ارتقاء سے اس لئے سخت مخالفت پیدا ہوئی کہ از روئے بائبل آدم کی پیدائش کو صرف چھ ہزار سال گذرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے انسان کے بنائے ہوئے وہ آلات حجری پیش کردئے جو پندرہ بیس ہزار سال پیشتر کے بنے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بائبل کی طرف سے مینار بابل اور اختلاف السنہ کی روایت پیش کی جاتی ہے۔ لیکن سائنس نے انیسویں صدی میں ایک جدید علم کی بنیاد ڈالی جسے عرف عام میں "علم الالسنہ" (PHILOLOGY) کہتے ہیں۔ اس علم نے تحقیق وتدقیق کے بعد یہ ثابت کردیا کہ سنسکرت، فارسی اور اکثر یوروپین زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق رکھتی ہیں گویا وہ سب ایک ہی قدیم زبان کی شاخیں ہیں۔ اور اس طرح بائبل کی روایت دربارہ اختلاف السنہ غلط قرار پاتی ہے۔

بائبل کا بیان ہے کہ خدا نے نوح کے زمانہ میں تمام دنیا کو تباہ کردیا تھا۔ اور دنیا کی آبادی کو صرف چھ ہزار سال گذرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے طبقات الارض کی مدد سے ثابت کردیا کہ کرۂ زمین کی خشک سطح رفتہ رفتہ کروروں برس کے بعد بنی ہے اور زمین کی ساخت بھی قانون ارتقاء کے ماتحت ہوئی

بائبل کی پہلی آیت یہ ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ لیکن فلکیات نے ثابت کردیا کہ اجرام سماوی دفعتاً نہیں بنے۔ بلکہ قانون ارتقاء کے ماتحت رفتہ رفتہ سدیم یا ذرات نور سے بنے ہیں۔

الغرض موجودہ زمانہ میں انسان کے قلب ودماغ دونوں مذہب سے باغی ہوگئے ہیں۔ اور اب ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس کے زمین وآسمان بالکل نئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا۔ کہ اب نسل انسانی اور ہی کچھ ہوگئی ہے اس کی زندگی ومعاشرت ملل سابقہ سے قطعی جداگانہ ہے، اس کے آئین وقوانین کی توضیع وتسوید عرش بریں پر نہیں ہوتی۔ اسکا دستور العمل لوح محفوظ سے نقل ہو کر نہیں آتا بلکہ انھیں کے دماغ ان کو سوچتے اور انھیں کے فاؤنٹن پن انھیں ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔

انسانی خیالات و معتقدات کی کایا پلٹ سب سے زیادہ ان انکشافات نے کی ہے جو فلکیات سے متعلق ہیں۔ اب یہ امر بھی متحقق ہو گیا ہے کہ کس ستارہ کی عمر کتنی ہے۔ اگر "کن فیکون" کے ساتھ ہی تمام اجرام سماوی معرض ظہور میں آئے ہوتے تو خواہ وہ "سبع شداد" ہوتے یا نجوم لاتعد ولاتحصٰے ان سب کی عمریں برابر ہوتیں۔ لیکن سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مختلف ستاروں کی عمروں میں اربوں سال کا تفاوت ہے۔ اور بہت سے اجرام سماوی ایسے ہیں جو ہنوز سحابی یا سدیمی حالت میں ہیں۔ گویا ہماری کائنات ہی نئی ہے۔ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا اور ہماری دنیاوی زندگی ابدی سلسلۂ حیات کی ایسی حقیر کڑی ہے، جس کے لئے سوال و جواب، میزان و صراط اور بہشت و دوزخ کا طول امل کوئی معنی نہیں رکھتا

اس سے قبل کا زمانہ وہ تھا جب لکھنا پڑھنا صرف مقتدایان دین تک محدود تھا۔ مسلمانان ہند چھوٹی قوموں کو سوا پارہ سے زیادہ قرآن اور "راہ نجات" یا "صبح کا ستارہ" سے زیادہ فقہ نہیں پڑھنے دیتے تھے اور ہندوؤں کے نزدیک تو کسی شودر کے کانوں تک وید منتر کا پہنچنا ہی گناہ عظیم تھا۔ لیکن اب دنیا بدل گئی ہے۔ زمانہ اور ہے۔ اب کوئی گاؤں اور قصبہ اسکول سے خالی نہیں ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں درجنوں ہائی اسکول اور متعدد کالج نظر آتے ہیں۔ قدم قدم پر یونیورسٹیاں کھائی دیتی ہیں۔ کوئی قوم ایسی باقی نہیں جس نے اپنا جداگانہ ادارۂ تعلیم قائم نہ کر لیا ہو۔ جگہ جگہ بڑے بڑے کتبخانے اور دارالمطالعہ قائم ہیں ابتدائی تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔ اور چند سال بعد دنیا میں کوئی شخص ناخواندہ نہ رہے گا۔ لاسلکی و ریڈیو نے زمین کی طنابیں کھینچکر فاصلۂ زمان و مکان کو محو کر دیا ہے اور ایک شخص دہلی یا لکھنؤ کے کسی مکان میں بیٹھکر، لندن۔ امریکہ و جاپان کی باتیں اسی طرح سن سکتا ہے گویا اس کے سامنے کوئی شخص جلسہ میں تقریر کر رہا ہے۔ الغرض اب دنیا بہ لحاظ علم و فضل بہت دور پہونچ گئی ہے۔ اور ناممکن ہے کہ قدامت پرست مقتدایان دین کی حکومت عرصہ تک قائم رہے

پہلے برسوں میں ایک کتاب کی نقل ہوتی تھی۔ لیکن اب ایک دن میں لاکھوں نسخے تیار ہو سکتے ہیں علاوہ ازیں سلسلہ نقل و حمل اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ لندن کی چھپی ہوئی ایک کتاب دو ہفتہ کے اندر دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ جاتی ہے۔

الغرض اب نئی زمین اور نیا آسمان ہے، ترکوں نے ادارۂ خلافت کو ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ وہ پانسو برس سے اس پر اپنی جانیں قربان کرتے چلے آتے تھے۔ ہندوستان میں جدید روح کے زیر اثر خود ہندوؤں نے بت شکنی شروع کر دی ہے اور پہلے جو پنڈت اور اونچی ذات کے ہندو شودر کے سایہ کو بھی ناپاک سمجھتے تھے اب وہ انھیں سے بغلگیر نظر آتے ہیں۔ چینیوں نے اپنی لمبی لمبی چوٹیاں کاٹ کر پھینکدی ہیں، اہل مصر اپنی معاشرتی، مذہبی اور سیاسی آزادی کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ افریقہ کے حبشی بھی اب اس قدر روشن خیال ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی ملی حکومت علٰحدہ قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایران، افغانستان جو اب تک مجتہدین اور ملاؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تباہ ہو رہے تھے اب رفتہ رفتہ آزاد ہو رہے ہیں، ریاست میکسیکو کے لوگ مذہب سے اس قدر بیزار ہو گئے ہیں کہ وہ پادریوں کو نشانۂ بندوق بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور ہزاروں گرجا غیر آباد ہو کر مسمار ہوتے جا رہے ہیں۔

یقیناً یہ دنیا کا بالکل نیا دور ہے اور آج تک ایسا ذہنی انقلاب کرۂ ارض پر کبھی رونما نہ ہوا تھا۔ اور نہ اصلاح معاشرت کا اس قدر زبردست جہاد اس سے قبل کبھی کیا گیا۔ اب مذہب کی جگہ "خدمت العباد" لیتی جاتی ہے اور ہزاروں قسم کے ادارے خدمت بنی نوع انسان کے لئے کھلتے جاتے ہیں۔ اب دنیا "دوزخ و جنت" کی حقیقت کو سمجھ گئی ہے۔ اب وہ "نفس مطمئن" کو اپنی جنت اور "ضمیر کی لعنت و ملامت" کو اپنا جہنم جانتی ہے۔ اب دنیا عبادت سے متنفر ہوتی جاتی ہے۔ وہ "عبادت" کو ایسا ہی سمجھتی ہے جیسے سلاطین مستبد کی خوشامد۔ الغرض یہ دنیا ایک نئی دنیا ہے۔ ایک انقلابی دنیا ہے۔ اور اس کے در و دیوار نعرہائے "انقلاب" سے گونج رہے ہیں (باقی)

نیاز

اُپج

نگار

ساری دنیا سے نرالی بات کہنے کا شوق، بعض لوگوں میں مرض کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ معمولی سی چیز کو اعجوبۂ روز بتانا، اور نہ صرف یہی بلکہ اُسے جملہ براہینِ منطقیہ اور دلائلِ فلسفیہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا، اتنا ہی دشوار ہے جتنی کسی مسلّم صداقت کی تکذیب ــــ مگر خدا کی وسیع دنیا میں خدا کی ایک مخلوق ایسی بھی ہے جو محض لطفِ مخالفت کے لئے، حقائق کو اکاذیب اور توہمات کو واقعات ثابت کرنیکی سعیِ لاحاصل میں راتوں کی نیند کھو چکی ہے۔

قدرت کی اس عجیب و غریب جنس کی موجودگی کا علم تو مجھے بہت زمانے سے تھا لیکن کسی ایسے بزرگ سے، جو ان نادر خصوصیات کے جامع ہوں، اب تک شناسائی کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کسی ذہنیت سے میں ڈرا کرتا تھا تو وہ یہی "کایا پلٹ" نقلِ ہیئت، یا بعض اوقات مسخ صورت کو پسند کرنیوالی ذہنیت تھی۔ میں اپنی فطرت کے اعتبار سے کوئی انوکھا انسان نہیں ہوں، معمولی سی ترکیب جسمی، معمولی سے قوائے دماغی اور معمولی سے [illegible] قلب سے بڑھ کر نہ کبھی خود میں نے اپنے میں کسی چیز کا وجود تسلیم کیا نہ لوگوں نے مجھے یقین کرانے کی کوشش کی۔ پھر بالکل تقاضائے طبیعت ہے کہ میں اپنے قریب ایسے لوگوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتا جو انتہا پسندی، بیگانہ روی، حد سے بڑھے ہوئے استغنار، تمام دنیا سے جدا اسلوبِ فکر، سارے زمانے سے مختلف اندازِ کلام کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ تمام ملکوں اور تمام موسموں میں دن ہو، یا رات، صبح ہو، یا شام، دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں اور میرا یہ ایمان اس قدر "سخت و سنگین" ہے کہ جب کبھی کوئی ماہرِ ریاضی محض مجھے مرعوب کرنے کی خاطر، نہایت نازک اور ناقابلِ فہم حد تک دقیق طریقِ استدلال سے یہ بات ثابت کرتا ہے تو میں بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکتا ہوں ــــ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اُسکی فضیلت و علم کے احساس سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ ایک سادہ سی بات کو اسقدر پُرپیچ اور اُلجھے ہوئے طریقے سے ثابت کرنے کے لئے اتنا پریشان ہے۔ دو اور دو چار یقیناً ہوتے ہیں مگر اس کی کوئی دلیل نہیں، اگر ہے تو صرف اس قدر کہ یہ واقعہ ہے ناقابلِ انکار!

بہرحال ابتک یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اپنے حلقۂ احباب میں میرا کسی ایسے شخص سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ اسے اتفاق کہئے یا میری کوشش مگر ہوا یہی کہ میں ایسے لوگوں سے جو جدت طرازی کے نقاب میں حقائق کی سادگی کو مجروح کرنے پر تُلے ہوئے ہیں، دور رہا۔

مگر آخر کار کل ساعتِ موعودہ آہی گئی! میں شام کے وقت اپنے ایک دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا نہایت دلچسپی

اور اطمینان خاطر کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ خادم نے اک ملاقاتی کارڈ لاکر میرے میزبان کے سامنے پیش کیا۔ وہ پہلے تو اس کارڈ کو دیکھ کر کچھ بے چین ہوئے، مجھے دیکھا، پھر کارڈ کو پڑھا، کچھ سوچا اور آخر کار مسکرا کر خادم سے کہا "یہاں لے آؤ"۔ خادم کے جانے کے بعد انھوں نے مجھے بتایا، کہ اُن کے اک بہت "عزیز اور مخلص" کرم فرما ابھی حال میں ہی ولایت کا حج کرکے تشریف لائے ہیں اور اسوقت وہی باہر موجود ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ نصیحت بھی کر دی کہ میں ہوشیار رہوں۔ وقت نہ تھا ورنہ میں اپنے دوست سے اس نیم شوخ اور نیم حریفانہ نگاہ کا سبب پوچھتا جو انھوں نے یہ کہتے ہوئے مجھ پر ڈالی تھی، مگر میں اتنا ضرور سمجھ سکا کہ کوئی خطرہ قریب ہے اور حواس کو مجتمع کر لینا سخت ضروری۔

چنانچہ ان نووارد کا استقبال کیا گیا۔ میرے دوست نے مجھے اُن سے بہت سلیقہ سے متعارف کرایا اور میں نے اس غیر متوقع ملاقات پر اظہار مسرت کرنے میں مسابقت کی۔

میں ان "بازگشتگان دیار حبیب" کی صحبت میں جس لذت اور مسرت کا احساس کرتا ہوں وہ یقیناً ناقابل بیان ہے! کچھ تو اس لئے مجھے ان سے وابستگی ہے کہ ان حضرات کے دماغ اُس عملی قطعۂ زمین کی آب وہوا کے اثر سے یکسر عملی بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح اگرچہ اپنی نزاکت حس پر یہ لوگ بہت زیادہ فخر نہ کرسکیں تاہم سب سے الگ چلنے کی وہ اُمنگ جو نیم تہذیب یافتگی نے اسقدر عام کر رکھی ہے، ان خشک مزاجوں میں مفقود ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی موجودگی مجھ جیسے مشرقی کے لئے دلچسپ نہ ہوتے ہوئے بھی پُرسکون ضرور ہوتی ہے۔ اور کچھ اس لئے بھی مجھے ان لوگوں سے عقیدت ہے کہ جس حسرتناک زبان میں یہ اُس "فردوس گمشدہ" کا ذکر کرتے ہیں، وہ مرثیہ اور قصیدہ، غزل و مثنوی کا اک ایسا مثالی مُرکب ہوتا ہے، کہ تقریباً ہر مذاق کا شخص اُسکی داد دینے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے!

خیر۔ تو جہانتک ظاہری ہیئت اور وضع کا تعلق ہے مسٹر عاصم میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ آرائش لباس میں وہی توغل، لئے دئیے رہنے کی وہی مخصوص عادت، حرکات و سکنات میں وہی دانستہ بے پرواہی جو اس گروہ کی مشترکہ صفات ہیں ان میں بھی موجود تھیں اور یہ کافی وجہ تھی اس بات کی کہ میں اُنکی جانب سے مطمئن ہو جاتا۔ لیکن کچھ اپنے دوست کی نصیحت کے خیال سے، کچھ اُس غیر فطری فلسفیانہ چمک سے ڈر کر جو مسٹر عاصم کی آنکھوں میں مجھے نظر آئی میں خاموش تھا اور منتظر کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ دل میں بدگمانیاں، شکوک اور شبہات اک طوفان پیدا کر رہے تھے۔ یکایک مسٹر عاصم نے مجھ سے سوال کیا "کیا آپ واقعی مجھ سے ملکر بہت مسرور ہوئے؟ ابھی آپ نے فرمایا ہے"! سوال کی ندرت، طرز کی بیباکی، متکلم کی بے محل سنجیدگی نے مجھے مبہوت کیا برق زدہ سا کر دیا! میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرا تحیر کب تک باقی رہا۔ مگر میں نے میزبان کے منھ سے یہ جملہ سُنا "تو عاصم صاحب آپ کو اس میں کچھ شک بھی ہے؟" جس شوخ اور مجادلانہ انداز میں یہ سوال کیا گیا وہ اور بھی وحشت خیز تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔

"شک"؟ عاصم نے بیباکی سے میرے دوست سے مخاطب ہو کر کہا "شک کیا معنی! مجھے یقین ہے کہ یہ

جملہ کہتے ہوئے آپ کے دوست کی مراد سوائے اس کے نہ کچھ بھی اور نہ ہوسکتی ہے کہ تعارف و ملاقات کے رسمی اصول کی پابندی کیجائے ۔میں عادی ہوں کہ پابندیوں کے ایسے مظاہرے دیکھوں اور ضبط کروں ۔مگران غلط ساختہ آداب مجلسی کا مفہوم جہاں غلط بیانی ہوتی ہے میری قوت برداشت ختم ہوجاتی ہے۔

"محبت اور اُلفت کی دنیا میں تو خیر میں سنتا ہوں ، یہ نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے ملے اور غالباً فرط مسرت وانبساط سے اُس کا دماغ ماؤف اور عقل معطل ہوجائے ۔لیکن یہ شکل بہرحال اسوقت خارج از بحث ہے ۔پھر جب یہ صحیح ہے کہ کوئی ذی ہوش انسان کسی سے پہلی مرتبہ ملکر اسوقت تک خوش یا ناخوش نہیں ہوسکتا جبتک کہ اُسکے حالات سے فی الجملہ باخبری نہ رکھتا ہو ،تو آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ وہ مجھ سے مل کر بہت مسرور ہوئے ۔یقیناً اک غلط بیانی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ مشرق میں غلط بیانی بہت زمانے سے شاعری کا جزوِ لازم سمجھی جاتی رہی ہے ۔مجھے معلوم ہے کہ یہاں کے بہترین شاعر وہی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ دروغگوئی کو اک مستقل فنِ لطیف کی حیثیت سے پیش کیا ۔بہت ممکن ہے میں مشرقی ادب کی اس کمزوری کو نظرانداز کردوں صرف اس لئے کہ ہر قوم کے ادب میں چند ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو دوسری اقوام کے ادب سے اُسے جُدا کرتی ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ دروغگوئی مشرقی ادب کی اُنھی مابہ الامتیاز خصوصیات میں سے ہو مگر میرا عقیدہ ہے کہ شعر و ادب کے مختصر رقبہ سے باہر مشرق میں جھوٹ ہمیشہ ایک ناقابل عفو جرم سمجھا گیا ہے ۔اس کے برخلاف مغربی دنیا میں صداقت اور سچائی کی آئینہ دار اگر کوئی چیز ہے تو وہ وہاں کا ادب اور صرف ادب ۔ہوتا ہے ۔اکثر ہوتا ہے ،کہ اک مصنف یا شاعر محض اظہار حق اور بیان واقعہ کی خاطر اپنی ادبی تحریرات کی شگفتگی اور اثر کو غارت کردیتا ہے ، ورڈز ورتھ کو دنیا کی کوئی قوت ، قبروں کے درمیانی فاصلوں ، ون کے گھنٹوں اور ایسی ہی فرسودہ مگر سچی باتوں پر شعر تصنیف کرنے سے باز نہ رکھ سکی ۔وہ شعر بیرنگ ہوں تو ہوں غلط نہیں ہیں ۔مگر دنیا میں شاید ہی کوئی انکار کرے کہ مغرب کی عام زندگی میں جھوٹ اور غلط گوئی تقریباً ناقابل علاج حد تک سرایت کرچکی ہے ۔ہر وظیفۂ حیات اک جھوٹ کا محتاج ہے ہر فرض زندگی اک دروغ بیانی کے بغیر نامکمل! اس کی معمولی سی مثال لیجئے ۔جب آپ کسی اجنبی سے متعارف ہوں تو مغربی آداب کی رُو سے آپ پر لازم ہے کہ آپ خواستہ یا ناخواستہ اسپر اظہار مسرت کریں ۔آپ کا "اجتماعی ضمیر" آپ کو یہ بات کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ آپ اُس سے مل کر بہت خوش ہوئے ۔حالانکہ بیک وقت آپ کا "انفرادی ضمیر" اور خود اُس شخص کا "انفرادی ضمیر" خوب جانتا ہے کہ اس میں بقدر یک ذرہ بھی سچائی نہیں ۔پھر بھی بشری نظام اخلاق کی قید و بند اُسے اُکسنے نہیں دیتی!

"مغرب نے بہت سے زہر مشرق کی رگوں میں اُتارے مگر سب سے زیادہ مُہلک ، یہ سچائی اور جھوٹ کی طرف سے بے پرواہی کا زہر ہے جو تہذیب و شائستگی کے نام سے ہمارے حلق میں ڈالا جارہا ہے ۔اور مشرق ہے کہ

ہر مغربی ادا، ہر مغربی طرز کی نقالی کو معراج کمال سمجھے ہوئے ہے!

"آپ خود سوچئے" یہ کہتے ہوئے عاصم نے میری طرف دیکھا "مجھ سے ملے ہوئے ابھی آپ کو چند منٹ گذرے ہیں۔ غالباً آپ کو میرا پورا نام بھی نہیں معلوم۔ آپ کو کچھ خبر نہیں کہ میری طبیعت آپ کی افتادِ خیال سے کس قدر مخالف یا موافق ہے، آپ میرے نظریوں میرے اعتقادات سے قطعاً لاعلم ہیں مگر با ایں ہمہ ناواقفی، آپ بلاتامل، بغیر سوچے سمجھے، نہایت شد و مد کے ساتھ، اپنے نزدیک ایک حقیقت کبریٰ کا اعلان فرما رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ آپ کو مجھ سے مل کر بہت مسرت ہوئی! آپ کی لرزشِ آواز، اگر اس کی وجہ گھبراہٹ نہیں! آپ کا منکسرانہ تبسم، اگر یہ آپ کی عادت نہیں! آپ کی جھکی ہوئی نظریں، اگر یہ اظہار شرم نہیں! یقیناً آج کل کے شائستہ مطالبات ہیں میری جانب سے بھی اظہار مسرت کے لئے۔ مگر آپ مطمئن رہیئے میں اس مغربی جادو سے بچا ہوا ہوں اور سمجھ لیجئے کہ میں آپ کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کرونگا۔ جبتک مجھے اُسکی درستی کا وثوق نہ ہوجائے۔

"معاف کیجئے گا، میری عادت ہے کیا تو خاموش رہتا ہوں، یا بولتا ہوں تو پھر چُپ نہیں ہوتا، جب تک میرا سامع، میرے دلائل کی مضبوطی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض تھک کر ہتیار نہ ڈالدے" میرے دوست کی طرف مخاطب ہوکر "چائے اور منگائیے یہ تو ٹھنڈی ہوچکی"۔

عاصم صاحب نے تقریر ختم کی تو میں نے سانس لیا۔ ہمارے میزبان نے گرم چائے منگائی اور اگرچہ شام کا باقی ماندہ حصّہ نہایت دلچسپی سے کٹا مگر عاصم صاحب کا خوف میرے دل میں اب بھی باقی ہے میں وہاں بھی یہی سوچتا رہا اور تمام شب بھی اسی سوچ میں کٹی اور طے نہیں کرسکا، کہ عاصم کی گفتگو، جدّت طرازی کا مظاہرہ تھی یا علالت دماغ کی علامت!

سخت غلطی کی، کم از کم وطن ضرور پوچھنا تھا! شاید کچھ پتہ چلتا

انیس احمد رُشدی

تنقید

تنقید ایک علم کی حیثیت سے دور حاضرہ کی پیداوار ہے۔ یہ علم مغرب میں معراج کمال کو پہونچ چکا ہے، لیکن مشرقی زبانوں میں عموماً اور اُردو میں خصوصاً اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی مختصر اور ناکافی ہے۔ اول تو اردو کی عمر ہی کتنی ہے، پھر اس کے سرمایہ علوم و فنون کی کیا بساط؟ مزید برآں سیاسی تغیرات اور سماجی پراگندگی نے کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ اپنے علوم و معارف کو کھوٹا کھرا پرکھنے کے لئے ایک مستقل علم وضع کیا جائے

اُردو کے اہم عناصر ترکیبی تین ہیں:۔ عربی، فارسی، اور ہندوستانی زبانیں۔ لیکن بدقسمتی کہو یا جو کچھ سمجھو میرا دیانتدارانہ خیال تو یہ ہے کہ علمی حیثیت سے اُردو نے ہندوستانی علوم کے خزانوں سے بہت کم فائدہ اُٹھایا اور علمی خیالات اور اصطلاحات ایک حد تک عربی، پھر فارسی، اور سب کے بعد لیکن کافی مقدار میں مغربی زبانوں کی وساطت سے اُردو میں رُوشناس ہوئے

عربی و فارسی جن ملکوں کی زبانیں ہیں اُن کے علوم و فنون خود ایک عرصہ دراز سے کس مپرسی اور جمود کی حالت میں پڑے ہوئے تھے اور سیاسی اختلال اور علمی سرد بازاری نے انھیں ایک مدت سے موقع نہیں دیا کہ وہ ترقی کے میدان میں شریک مقابلہ ہو سکیں۔

ایک صبر آزما طویل سکوت اور خطرناک غفلت کے بعد اب کچھ عرصہ سے اِدھر ایران میں اُدھر مصر میں ہنگامۂ مغرب سے متاثر ہو کر علمی زندگی کے آثار نمودار ہو چکے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہاں روز بروز علمی ذخیرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اُن کا سرمایۂ معارف ہنوز محدود ہے اور یہ ترقی ابھی اس مرتبہ تک نہیں پہونچی ہے۔ جہاں پہونچکر قوموں کی ذہنی غلامی کی زنجیریں خود بخود کٹکر گر جایا کرتی ہیں

فارسی میں تو کہنا چاہیئے کہ علمی حیثیت سے تنقید کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ عربی کے قرون اولیٰ میں تنقید کا پتہ چلتا ہی مگر وہ زیادہ تر لغوی اور ادبی تنقید تک محدود تھی۔ اگر عربی سماج میں انتشار سرایت نہ کرتا اور اُسکے دارالعلوم بدستور ترقی پذیر رہتے تو بلاشبہ عربی میں تنقید موجودہ متمدن زبانوں کے دوش بدوش ارتقائی منازل طے کر چکی ہوتی۔ باقی رہیں مغربی زبانیں اور مغربی علوم و معارف تو ان سے استفادہ کا بھی اُردو کو بہت کم موقع ملا ہے اور جو ذخیرہ منتقل ہو چکا ہے وہ ابھی اتنا کافی نہیں ہے جس پر تنقید جیسے وسیع و ہمہ گیر علم کی بنیاد رکھی جا سکے مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں اُردو میں علم تنقید روشناس نہ ہونیکے تین اسباب ہیں:۔

(۱) خود "اُردو" کی علمی بیمائگی،

(۲) جن مشرقی زبانوں سے اُردو مستفید ہوئی اُنہیں علم تنقید کے متعلق کافی مواد موجود نہ ہونا۔ اور
(۳) مغربی زبانوں سے پورا پورا فائدہ حاصل نہ کر سکنا۔

یہ گزارش بھی بے محل نہ ہوگی کہ اُردو میں ادب و شاعری کے متعلق جو تنقیدی سرمایہ ہے اس سے ناواقف نہیں ہوں، لیکن یہ عرض کرنیکی اجازت چاہتا ہوں کہ "تنقید" کے وسیع اور ہمہ گیر مفہوم کے لحاظ سے یہ محدود سرمایہ، جو بیشتر سطحی ہے، علمی تشنگی ذوق کو سیراب نہیں کر سکتا ——!

ذیل کا مضمون عربی سے لیا گیا ہے۔ ترجمہ کی ضروریات اور "مفہوم" کو "ہندوستانی" مانوس لباس میں پیش کرنیکی کوشش نے اسقدر تبدیلیاں پیدا کردیں کہ مضمون کو بہ مشکل ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اس الہامی زبان کے فیضان سے مجھے انکار نہیں۔ چونکہ موضوع بالکل نیا ہے اسلئے لغزشیں ہونا بھی اغلب ہے۔

علم تنقید میں اہل مغرب کی متعدد معرکتہ الآرا تصانیف ہیں۔ یہ علم اُن کی تاریخ میں قدامت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے تاہم موجودہ ترقی یافتہ شکل پر اسی وقت پہونچ سکا ہے جب صدیوں تک ارتقائی انقلابات کا تختۂ مشق بنا رہا۔ سب سے پہلے یونانیوں نے اس پر کتابیں لکھیں، ان سے رومیوں نے اخذ کیا اور رومیوں کے بعد یورپ کی موجودہ اقوام نے اسوقت حاصل کیا جب قسطنطنیہ پر علم اسلام لہرایا اور یونانی علما ترک وطن کرکے اطالیہ چلے گئے۔ اطالیہ میں اُنھیں امرا اور رؤسا کی دستگیری سے یہ موقع ملا کہ علوم و معارف کے ان خزانوں کو جو قدیم کتابوں کے بوسیدہ اوراق میں دفن ہو چکے تھے، دوبارہ منظر عام پر لائیں اور یہیں سے تمدن جدید کی بنیاد پڑتی ہے۔ یورپ بھی عرصہ دراز کی جہالت و مدہوشی کے بعد جونکا اور رفتہ رفتہ علوم و فنون کو ترقی ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ موجودہ حالت تک پہنچ گئے۔ انہی ترقی یافتہ علوم میں سے ایک "علم تنقید" بھی ہے۔

لیکن علم تنقید نے موجودہ مرتبہ اسوقت حاصل کیا ہے جب علمی روح کافی پھیل چکی تھی، علوم و فنون کئی شاخوں میں تقسیم ہو کر ترقی کر چکے تھے، اور مسالک آرا میں اختلاف رونما ہو کر بہت سے گروہ پیدا ہو چکے تھے۔ اس لئے تنقید کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی تاکہ صحیح و فاسد اور کھوٹے کھرے میں امتیاز کیا جا سکے۔ مثلاً اہل مغرب کے یہاں نظم کی بہت سی قسمیں ہیں جن کے پورے پورے استیعاب کے لئے ایک مستقل رسالہ درکار ہے۔ ان میں زیادہ اہم اور بڑی قسمیں تین ہیں۔ پہلی قسم میں وہ نظمیں شامل ہیں، جو قصص سے متعلق ہیں، دوسری قسم میں راگ اور راگنیاں داخل ہیں، اور تیسری قسم میں تمثیلی[۱] نظمیں شمار کیجاتی ہیں۔ یہ تین بڑی قسمیں بہت سی ضمنی فروع پر پھیل جاتی ہیں۔ قصصی نظموں میں بعض محض تخیلی ہوتی ہیں جیسے ہومر کی ایلیڈ (ILIADE) بعض میں کوئی واقعہ نظم کیا جاتا ہے جیسے (LEGENDE DES SIECLES) تمثیلی نظموں کی دو مشہور قسمیں ہیں، یعنی

---

[۱] "تمثیل"، یعنی ایکٹ کرنا۔ "تمثیلی" منسوب بہ تمثیل (سراسی)

ٹریجڈی (المیہ) ور کامیڈی (طربیہ) جیسے مولیئر کا "بخیل" نظم کی دوسری اقسام بھی ہیں جنھیں اقسام ثانویہ (GENRES SECONDAIRES) کہتے ہیں۔ انمیں وہ حکایات بھی شامل ہیں جو حیوانات کی زبان سے بیان کی گئی ہیں ، (FABLE) جیسے کلیلہ و دمنہ اُردو میں مفصلہ بالا اقسام نظم میں سے صرف ایک دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں دوسرے جدید علوم بھی بہت کم معرض بحث میں لائے گئے ہیں۔ اسی لئے ہمیں تنقید کی ضرورت کم پڑی اور ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اوس میں ترقی بھی نہ ہو سکی۔

علم تنقید فرانس میں اوج کمال تک پہنچ چکا ہے۔ اہل فرانس کی فطری نفاست پسندی و جدت نوازی نے اونھیں اس کے موضوع کے ساتھ خاص مناسبت پیدا کر دی ہے کیونکہ وہ لوگ طبعاً ذہین، تیز فہم، نکتہ رس، اور خوش طبع ہوتے ہیں تنقید بھی تمام علوم کیطرح ارتقائی منازل طے کرتی رہی ، اور خوش قسمتی سے اسے ہر زمانہ میں ایسے لوگ ملتے رہے جو پورے انہماک کے ساتھ اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ یہانتک کہ وہ ایک مستقل علم بن گیا اور اُسکے لئے خاص اُصول و قواعد وضع ہو گئے جس شخص نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور عالم ادب میں تنقید کے اثرات کو غور سے دیکھا ہے وہ محسوس کر سکتا ہے کہ تنقید کو ان علوم و فنون کی ترقی میں کہانتک دخل ہے۔ جن کی جانب اوسکی عنان توجہ منعطف ہو گئی۔

اہل فرانس کو اس علم کے ساتھ خاص شغف ہے اور نقاد کو وہ غیر معمولی عظمت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ اہل قلم ناقدین کی رائے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے کیونکہ عام طور پر جمہور ان کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اور نقاد انھیں جس رنگ میں چاہتے ہیں رنگ دیتے ہیں۔ ایک مورخ کا قول ہے کہ اُنیسویں صدی میں فرانس کا ترقی یافتہ طبقہ نوے فی صدی ٹین (TAINE) کا رہین منت ہے۔ ٹین ایک مشہور ماہر تنقید ہے اور اپنے زمانہ کے نوجوانوں پر اسکا غیر معمولی اثر تھا۔

فرانس میں ناقدین کے اقتدار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ مذکورہ بالا نقاد ٹین نے کسی رسالہ میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں نفسیاتی مباحث کے متعلق فرنچ ماہر نفسیات استندہال (STENDHAL) کی اصابت رائے کو بہت سراہا۔ اسوقت تک استندہال کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور جو لوگ اس سے واقف تھے یا جنھوں نے اسکی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا وہ بھی اسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس مضمون کو شائع ہوئے دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ استندہال کی شہرت کے غلغلوں سے فضا گونج اُٹھی اور اُس کے تمام ہمعصر اس پر رشک کرنے لگے۔

ٹین کا دوسرا تنقیدی معجزہ فرنچ فلسفی اگسٹ کومٹ (AUGUST COMTE) کے واقعہ میں ظاہر ہوا۔ یہ فلسفی اپنے زمانہ میں معمولی طور پر مشہور تھا۔ لیکن اس نقاد نے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ اسے روشناس کرایا تو اسکی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور اطراف عالم میں اس کے نظریات کی دہوم مچ گئی۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مصنف نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی حالانکہ وہ درحقیقت اس کا مستحق نہیں تھا۔ اسکے بعد اُسکی کوئی تصنیف شائع ہوئی جسے عام طور پر پسند کیا گیا اور اُسکی ہزاروں جلدیں طبع کرائی گئیں۔ اسوقت ایک نقاد اُٹھا اور

تصنیف پر ایسی سخت تنقید لکھدی کہ اوسکی تمام قدر و منزلت خاک میں مل گئی، مصنف اور اُس کے ہوا خواہ منہہ دیکھتے رہگئے اور دنیا نے اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا حتیٰ کہ اب کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔

قدیم علم تنقید

قدیم سے جب قوم میں علوم و فنون کو رواج حاصل ہوا اوس میں تنقید کا بھی وجود پایا جاتا ہے لیکن گذشتہ صدی سے پہلے اسے ایک باقاعدہ اور با اصول علم کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا ماضی بعید میں صرف قواعد لغوی کی پابندی اور متقدمین نے ہر ایک علم و فن کے لئے جو اُصول و شرائط متعین کر دیئے ہیں۔ اون سے نیز اونکی تصانیف سے جو قوانین مستنبط ہو سکتے ہیں اون پر مکمل عملدرآمد میں تنقید کا انحصار کر دیا گیا تھا۔ گویا انھیں معیار حسن و خوبی تسلیم کر کے انکی پوری پوری اتباع لازمی قرار دیدی گئی تھی۔ وہ اُصول و قوانین ذوق سلیم اور فطرت صحیحہ سے حرف بحرف منطبق ہوتے ہیں کیونکہ متقدمین فطرت سے قریب تر اور فضول تصنعات سے منزہ تھے ان کی بڑی غرض یہ ہوتی تھی کہ ہر چیز کی ہو بہو بے تکلف تصویر کھینچ کر رکھدیں۔ ان کے بعد جو لوگ عیش و عشرت اور زیادہ تہذیب و تمدن کے زمانہ میں پیدا ہوئے انھیں یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ مثلاً ہر زبان کے دور اول کے شعراء جن کی عادتوں کو مصنوعی تمدن و خصارت نے خراب نہیں کیا تھا اور جو حقیقت کا بے نقاب چہرہ بناوٹ اور تصنع کی تمام کدورتوں سے پاک صاف فطرت کے آئینہ میں مشاہدہ کرتے تھے، سیدھے سادھے الفاظ میں شعر کہتے چلے جاتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ریشم پر موتی ڈھلک آیا، یا گلاب کا ایک تر و تازہ پھول ہری بھری ٹہنی پر رکھا ہوا اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ اوس مبارک عہد میں یہ سادگی پسند کیجاتی اور جو لوگ اُنکے بعد آتے وہ اُن کے اشعار کو معیار حسن و خوبی تصور کرتے۔ ہومر کی الیڈ (ILIADE) شعراء جاہلیت کے معلقات، شاہنامۂ فردوسی، بوستانِ سعدی، اور میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔

اردو میں علم عروض فارسی کی وساطت سے عربی سے آیا ہے۔ جب ہم غور کرتے ہیں کہ عرب میں شعر کے یہ اوزان مخصوصہ کیونکر پیدا ہوئے تو اس سے بھی مذکورہ بالا نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ جرجی زیدان نے "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" کے جزو اول میں لکھا ہے:۔

> "ظن غالب یہ ہے کہ اوزان شعر دراصل صحرا میں اونٹوں کی چال کے زیر و بم سے پیدا ہوئے ہیں اور تقطیع کی بنیاد اونٹوں کے قدم پڑنے کے موافق رکھی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ اہل عرب نے شعر کو سب سے پہلے نغمہ سرائی کے لئے استعمال کیا ہے اُن کی اصطلاح میں "حدی" کہتے ہیں۔ گویا اس کی ایجاد ہی اسی لئے ہوئی ہے۔ کیونکہ عرب اپنے وقت کا زیادہ حصہ اونٹوں کے معاملات میں صرف کرتا ہے ...... جب اُنھوں نے اوزان وضع کر لئے تو ان کا گانا چند مقررہ راگوں میں مخصوص ہو گیا اور اُنھوں نے ہر ایک راگ یا لحن کے لئے ایک خاص وزن متعین کر دیا۔ چنانچہ بعض اوزان کو مرثیہ گوئی کیلئے اور بعض کو رزمیہ شاعری کیلئے مخصوص کر دیا...... اسلام کے بعد تک ہر راگ کو کسی ایک وزن کے ساتھ تخصیص حاصل تھی۔ ہمارے خیال میں اس طرح عرب میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔"

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ عربوں کو صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کیلئے وقت اور فرصت کی کمی نہ تھی، اس لئے اُنھوں نے غور کرتے کرتے بالآخر اپنے اشعار کے لئے اوزان پیدا کرلئے اور اپنی نظم کی اقسام متعین کرلیں۔ شعرا متاخرین نے قدما کے صاف کئے ہوئے راستے پر چلنا کافی سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ تہذیب تمدن کے ہنگاموں میں مبتلا ہو کر مزید اوزان شعریہ کی ایجاد اُن کی استطاعت سے باہر بھی تھی کیونکہ وہ فطرت سے دور پڑ چکے تھے۔

جو قواعد متقدمین کے ورثہ سے مستنبط ہیں اون پر عملدرآمد کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک قسم کے تمام آثارِ فنی میں تشابہ پیدا ہو گیا۔ اور مرتب شدہ کلام میں وحدت کی علامات نمایاں ہو گئیں۔ اگر یہ قیود اُٹھ جاتیں تو ہم کو فروع ادب میں خاص حدبندی اور مقررہ شرائط کا پتہ نہ چلتا۔ فرض کیجیے کہ اگر شعرا اپنے کلام میں اوزان معروفہ اور قواعد معلومہ کی رعایت ملحوظ نہ رکھتے اور اُن میں سے ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا تو اوزان اسقدر کثیر التعداد ہو جاتے کہ نظم کو نثر سے امتیاز کرنا اور اُس سے لطف اندوز ہونا متعذر ہو جاتا۔ چونکہ اوزان شعریہ جس صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ اوسی طرح ہمارے ذہن میں محفوظ ہو چکے ہیں، اس لئے اگر کسی نامانوس وزن کی نظم ہمارے سامنے پڑھی جائے تو ہمیں اس میں مزہ نہیں آسکتا اگرچہ شاعر نے نفاست الفاظ اور نزاکتِ معانی کے لحاظ سے اُس میں اپنے حسنِ انتخاب کا پورا پورا ثبوت پیش کیا ہو۔

جدید علم تنقید اُنیسویں صدی گزشتہ صدیوں سے انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں علمی روح کی تعمیم کے ساتھ ممتاز ہوتی ہے۔ اس صدی میں علوم و معارف نے ایک ایسا رخ اختیار کیا ہے جسے صحیح معنوں میں "تجدید" کہہ سکتے ہیں۔ علمی جستجو کے طفیل میں، جو مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے، علوم و معارف کی عمارت، جدید مضبوط بنیادوں پر تعمیر کی گئی اور قدیم طریقے کو پس پشت ڈال دیا گیا، جس میں صرف آثار سلف اور بزرگوں کے موروثی عقائد و نظریات پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ منقولات کو چھوڑ کر قدیم علوم و فنون ـــ اگر سب نہیں تو اکثر ـــ ارسطو کی تصانیف پر مبنی تھے جو قدیم سے ہر علم و فن کے لئے مرجع اعلیٰ بنی ہوئی تھیں اور مرکزی حیثیت رکھتی تھیں۔ جب عصر جدید کی روشنی پھیلی اور تمام مختلف قوموں نے اپنی اپنی جگہ پر دقیانوسی قیود سے آزادی حاصل کرلی تو یہ علمی روح تمام علوم و معارف میں سرایت کر گئی اور اہل فکر و تدبر نے متقدمین کے غیر ضروری اقتدار سے انکار کر دیا۔ کیونکہ کورانہ تقلید علمی و مادی ترقی کے راستہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل ہو رہی تھی۔ قدامت پرستی کا طریقہ ترک کرنے کے بعد اُنھوں نے ایک جدید راستہ اختیار کیا جس میں تمام اغراض سے بالاتر ہو کر طلب حقیقت کے جذبہ نے اُن کی رہنمائی کی۔

اس کے بعد اُنھوں نے علوم کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے، انھیں ترتیب دینے، ان کی اُصولی و فروعی تقسیم کرنے، اور اُن میں باہمی مناسبت و ارتباط کی توضیح کرنے کی جانب توجہ کی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ کئی مستقل علوم پیدا ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موضوع کے لئے نامزد ہو گیا۔ مثلاً اجتماعی مباحث کو لے لو! قدیم زمانہ سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور اکثر لوگوں نے جماعتوں کے احوال، احکام اور خصائل سے بحث کی ہے لیکن وہ دوسرے مباحث کے

ذیل میں ان اُمور کا بھی تذکرہ کردیا کرتے تھے، یہاں تک کہ گزشتہ صدی میں ایک علم کی حیثیت سے "اجتماعیات" کی تدوین ہوئی، اس کے اغراض و مقاصد متعین کردیے گئے اور وہ بذاتہ ایک مستقل علم قرار پایا "علم الاجتماع" اس حیثیت سے ایک جدید علم ہی آخری چند صدیوں میں عموماً اور گزشتہ صدی میں خصوصاً علوم و فنون کی ترقی اور اُن کے موجودہ حالت تک پہونچنے میں "علم تنقید" کو بہت کچھ دخل ہے۔

تنقید موجودہ مرتبہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے کئی دور۔۔۔ سے گزرچکی ہے۔ ہم آئندہ اوس کے ارتقائی منازل اور اُس کے متعلق مختلف آرا و نظریات کا تذکرہ کریں گے۔

تنقید آج ایک قائم بالذات اور مستقل علم ہے، اسے دوسرے علوم کے ساتھ نگرانی اور فیصلہ کے علاوہ کسی قسم کا علاقہ نہیں ہے، اس نگرانی و فیصلہ میں اوس کا طریق کار مخصوص و متعین ہے، جیسے بیان کیا جائے گا، اوس کے مقاصد میں تشریح، فیصلہ، اور ترتیب، شامل ہیں۔ وہ آثار فنی کے اُصول و اسباب سے بحث کرتا ہے، اُن کے جزئیات و کلیات کو مرتب کرتا ہے، اور اُن کی علمی تشریح کرتا ہے۔ لیکن وہ بسا اوقات علم کی حدود سے نکل کر کبھی فلسفہ اور کبھی فنون لطیفہ (آرٹ) کے میدانوں میں جا نکلتا ہے۔ اس لئے وہ ایک ہی وقت میں علم بھی ہے، فن بھی اور فلسفہ بھی! وہ علم ہونیکی حیثیت سے تشریح کرتا ہے، اسباب بیان کرتا ہے اور نتیجہ نکالتا ہے، فن ہونیکی حیثیت سے صحیح عملی اُصول کا استخراج کرتا ہے اور قابل اعتماد صنعتی راستوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے، اور فلسفہ ہونیکی حیثیت سے احکام نفسی، اسباب بعیدہ اور مخفی لگاؤ کا انکشاف مدنظر رکھتا ہے!!

کتابوں کی تنقید کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تصنیف سے، موضوع سے، مصنف اور ماحول کے ساتھ اُنکے علاقہ سے، اور اس باب میں مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں جو دوسری تصانیف شائع ہوئی ہوں اونکے ساتھ موازنہ بحث کی جائے۔ اوسکی یہ غرض نہیں ہوتی کہ خالص علمی نظریات کی دیکھ بھال کے درپے ہو۔ کیونکہ نقاد کے لئے لازمی نہیں ہے کہ ہر ایک زیر تنقید موضوع کے متعلق ایک خاص رائے بھی رکھتا ہو۔ اُس کے لئے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کی علمی تاریخ کا ماہر ہو اور اوس کے متعلق مشہور آرا سے پوری واقفیت رکھتا ہو تاکہ اُسے کتابوں کے موازنہ اور ناظرین کے لئے اونکا مرتبہ بیان کرنے میں آسانی ہو۔ اور اسی بنیاد پر تاریخ ادب اور علم تنقید کا رشتہ اتصال مضبوط ہوتا ہے۔

جدید علم تنقید کے اغراض

تنقید کی تین مشہور اغراض ہیں:۔
تشریح، فیصلہ، اور ترتیب!

جو شخص کسی کتاب کی تنقید کرنا چاہے اوسے لازم ہے کہ سب سے پہلے کتاب کو سمجھے اور اس پر اچھی طرح عبور حاصل کرے، پھر اُسکی پوری پوری تشریح کرے تاکہ اسکے متعلق آسانی سے صحیح فیصلہ کرسکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس موضوع کی متعدد کتابیں اسکے پیش نظر ہوں تاکہ انکے اعتبار سے زیر تنقید کتاب کا مرتبہ قائم کیا جاسکے اور اس سے پہلے یا دوسرے یا

تیسرے درجہ میں رکھا جاسکے۔

ہم کہہ چکے ہیں قدیم زمانہ میں تنقید موضوع کتاب کی تفصیل، اوسکے مضامین کے بیان اور معانی، لغت اور صرف ونحو کے لحاظ سے اُسکی جانچ پر ختم ہوجاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ ظاہری اور سطحی معنی میں محصور تھی گویا ناظرین کی سمجھ بوجھ کو مقاصد بعیدہ اور وسیع تر توجیہات کے ادراک سے معذور سمجھا جاتا تھا۔

لیکن آج تنقید کا میدان اپنی ہمہ گیری اور عظمت کے لحاظ سے بہت وسیع ہوچکا ہے۔ علماء تنقید جدید کی اصطلاح میں صحیح تشریح کا مفہوم سطحی تفسیر کے علاوہ یہ ہے کہ تاریخ آداب میں زیر تنقید کتاب کے درجہ کی وضاحت کیجائے، اس موضوع کے خاص قواعد کے رو سے اُسکی جانچ کیجائے جس عہد میں کتاب لکھی گئی ہے اوس کے ساتھ کتاب کا علاقہ بیان کیا جائے تصنیف اور مصنف کے مابین رابطہ تلاش کیا جائے اور مصنف کا ماحول جسمیں اوس نے زندگی گزاری ہو دریافت کیا جائے۔

سب سے پہلی چیز جس کا جاننا ضروری ہے وہ مصنف کی زندگی ہے۔ اس لئے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اوس کا وطن معلوم ہونا چاہیئے ــــ اُسکی "فضائی" حالت معلوم ہونی چاہیئے ــــ وہ قوم یا نسل معلوم ہونی چاہیئے جس سے اُس کا تعلق ہو ــــ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ خاندان جس میں اُس نے پرورش پائی فارغ البال تھا یا تنگدست؟ ــــ کیا اُس کے بچپن کا زمانہ اطمینان سے گزرا؟ ــــ عام طور پر اس کی زندگی کامیاب رہی یا ناکام؟ ــــ اُس کی خانگی تربیت کیونکر ہوئی؟ اور اُس نے کہاں کہاں کن کن اُستادوں سے تعلیم حاصل کی؟ ــــ اُسکی عام معاشرت، محبت، پرہیزگاری اور زندگی کی تلخی یا خوشگواری کی کیا کیفیت رہی؟ ــــ کیا دوسرے ممالک کی بھی سیاحت کی؟ ــــ کیا تجربہ اور بصیرت سے بہرہ یاب تھا؟

پھر اُس کے اخلاق وعادات اور صحت جسمانی کے حالات دریافت کرنے چاہئیں، کیونکہ آدمی کی صحت کا اثر نمایاں طور پر اُس کے اخلاق اور اُسکی تصانیف پر پڑتا ہے۔ اس کے بعد جس علم یا فن کی تصنیف ہے اُس کے متعلق مصنف کی آرائے خصوصی کا امتحان کرے، اپنی تصانیف میں اس نے جو جدت صرف کی ہو اُسے دیکھے اور مصنف کی تصنیفات اس موضوع کی دوسری تصانیف سے جس حیثیت سے ممتاز ہوں اوس پر نظر ڈالے یہ اُمور مصنف کے تعارف، اُس کی تصنیف کی شرح اور دونوں کے درمیان رشتۂ اتصال کے ادراک میں اعانت کریں گے۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تصانیف سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے مصنف کے خصائل طبعی اور ذاتی اخلاق کی شہادت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً ریاض خیرآبادی کی "خمریات" محتاج تعارف نہیں ہیں حالانکہ شاعر نے تمام عمر میں ایک دفعہ بھی پیا تو درکنار، شراب کو چھوا تک نہ ہوگا۔ اسی طرح امیر مینائی کا "صنم خانہ" ناواقف کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے یہ دیوان منشی صاحب کی آخر عمر کی کمائی ہے اور ایسے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ جب مصنف کو تقویٰ وطہارت کے سوا خیالات فاسد" بھی پریشان نہ کرتے ہوں گے۔ پھر یوں بھی منشی صاحب فرشتہ صورت فرشتہ سیرت اور رامپور کے مفتی تھے۔

لیکن دیوان کھول کر دیکھئے تو وہ کچھ "گل افشانی" کی ہے کہ نوجوانوں کی جوانی کو شرماتی ہے۔ مولف اور تالیف کے اس تناقض سے مولف کی پختہ شخصیت اور مضبوط قوت ارادی کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے جذبات و خواہشات پہ کتنا قابو تھا۔

مصنف کی زندگی سے واقفیت کے بعد اس کے ماحول، اوس زمانہ کے عام رجحان خیالات اور علوم و فنون کی حالت معلوم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مصنف جو باتیں لکھتا ہے۔ ان میں اپنی جانب سے بہت کم کوئی نئی بات داخل کرتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر وہی خیالات و نظریات ہوتے ہیں جو اوس کے زمانہ میں اور اُس کے معاصرین میں عام طور پر رائج ہوں، ہماری آرا و افکار ہمارے ماحول کا ایک چربہ ہوتی ہیں۔ انعکاس افکار عموماً غیر محسوس طریقہ سے ہوتا ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اچھوتی بات کہہ رہے ہیں حالانکہ ہم صرف نقال ہوتے ہیں۔ رائے عامہ کی ایسی مثال ہے جیسے ہوا، جس میں بجائے خود ہر شخص سانس لیتا ہے۔

نقاد کے لئے یہ امر باقی رہ گیا کہ کتاب کو اس کے موضوع کے لحاظ سے پرکھے۔ اور اس باب میں جو تصانیف پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ اون سے موازنہ کرے۔ کبھی مصنف ایک ایسے موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے جسے اس کے پہلے دوسرے لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں، غرض وہی کہ دوسروں سے علیحدہ اچھوتی چیز پیش کرے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی پیروی اور اُنکے راستہ پر چلنا لابدی ہوتا ہے اگرچہ کسی قدر انحراف کر کے جدت پیدا کر دیجائے۔ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی کتاب ایک نئی کڑی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جو زنجیر میں بڑھا دی جائے۔ یہ کڑی بقیہ کڑیوں سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے اور یہ ایک طبعی امر ہے کیونکہ اختلاف اور تنوع انسانیت کے دوامی ارتقا کے لئے لازمی شرط ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موازنہ کے لزوم اور اس کے افادہ کے متعلق ایک مشہور اُصول بیان کر دیں اس کا احصل یہ ہے کہ "کل کی معرفت کے بغیر اجزا کی معرفت اور اجزا کی معرفت کے بغیر کل کی معرفت محال ہے"۔ نقاد کے لئے بہتر ہے کہ زیر تنقید کتاب کا اس موضوع کی دوسری تمام تصانیف سے موازنہ کرے، نہ صرف اس زبان کی تصانیف سے جس میں یہ کتاب ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں کی تصانیف سے بھی، کیونکہ دنیا کی تمام اقوام کو انسانیت اور فکر کے روابط باہم مربوط کرتے ہیں اور ہر ایک قوم کے علوم بقیہ اقوام کے علوم پر اثر انداز ہوتے ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں۔

تشریح کے بعد فیصلہ اور ترتیب کا درجہ ہے۔ فیصلہ تشریح کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ حالات کا طبعی تسلسل فیصلہ کو خود بخود ظاہر کر دیتا ہے۔ فیصلہ کے درست اور منصفانہ ہونے کے لئے نقاد پر لازم ہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کو نظر انداز کر دے، اپنی پسند پہ معقولیت کو مقدم رکھے اور تنقید میں صحیح قواعد و قوانین اور وہ اُصول پیش نظر رکھے جنھیں ذوق سلیم نے تنقید کے لئے بنیاد قرار دیدیا ہے مثلاً اگر اسے تاریخ سے لگاؤ ہے تو محض اس وجہ سے ادب لطیف کا مضحکہ نہ اڑانا چاہیئے۔ اور اگر وہ ذوق کو پسند کرتا ہے تو غالب کی عظمت سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ آزاد تنقید نگار پر لازم ہے کہ جس مصنف پر تنقید کر رہا ہے اوس کے بجائے اپنے نفس کو فرض کرے تا کہ

اوس کے اخلاق، امتیازات اور دوسرے حالات کی جانچ کرسکے۔ اور تصور کرے کہ وہ خود "مصنف" ہے، اسی کی طرح تصنیف وتالیف میں مصروف ہے، اور اُسی کے ماحول، مسکن اور زمانہ میں زندگی بسر کررہا ہے۔ اسطرح وہ مصنف سے پوری طور پر واقف ہوجائے گا اور اُس کے متعلق ایسا فیصلہ کرے گا جسمیں اظہار حقیقت کے سوا اس کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہوگی۔ نقاد کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اقسام فنون میں سے کسی خاص فن کے ساتھ اسے کوئی شخصی خصوصیت نہ ہو، نہ تالیف کے طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کی جانب اس کا ذاتی رجحان پایا جائے۔ تاکہ وہ تنقید کے فرائض غیر جانبدارانہ طریقہ پر ادا کرسکے۔

فیصلہ سے ترتیب کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔ ترتیب کا یہ مفہوم ہے کہ زیر تنقید کتاب کا فیصلہ کے بعد صحیح درجہ متعین کیا جائے۔ مثلاً تم سحرالبیان، گلزار نسیم، اور زہر عشق، پڑھتے ہو اور مذاق سلیم تمہیں مشورہ دیتا ہے کہ مثنوی میر حسن کو پہلے درجہ میں، گلزار نسیم کو دوسرے درجہ میں اور زہر عشق کو تیسرے درجہ میں جگہ دو! ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ دوسری تصانیف کے مقابلہ میں زیر تنقید کتاب کا صحیح مرتبہ متعین ہوجاتا ہے کیونکہ حسن و قبح نسبتی اُمور ہیں، جب تم کہتے ہو کہ زید دراز قامت اور حامد پست قامت ہے تو یہ کہنا اوسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب تمہارے ذہن میں ایک متوسط القامت انسان کا تصور موجود ہو۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ایسے موقع پر یوں کہا جائے کہ فلاں سے بہتر اور فلاں سے کمتر بس، کسی چیز کی پہچان صرف موازنہ کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اور موازنہ لازماً ترتیب تک پہنچا دیتا ہے، سحرالبیان، گلزار نسیم، اور زہر عشق تینوں اچھی مثنویاں ہیں۔ لیکن تم نے سحرالبیان کو گلزار نسیم پر اور گلزار نسیم کو زہر عشق پر ترجیح دی۔ اسی طرح اگر گلزار نسیم سے بہتر کوئی مثنوی اُردو میں موجود نہ ہوتی تو گلزار نسیم کو اولیت حاصل ہوجاتی!!

ہمیں تنقید کے احسانات کے متعلق چند مختصر الفاظ کہنا باقی ہیں۔ یہ احسان آداب و فنون پر نہیں ہے بلکہ ان میں حصہ لینے والوں اور اُن کے مطالعہ کرنیوالوں پر ہے۔

ہر وہ شخص جو کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اچھے بُرے میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ جنھیں قدرت کی طرف سے قوت تمیز عطا ہوتی ہے وہ کم ہوتے ہیں، اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنھیں دوسرے ضروری مشاغل نقد و تبصرہ کا موقع نہیں دیتے اور وہ بذات خود بہتر و ناقص میں تفریق کرنے سے مجبور رہتے ہیں۔

مصنفین بھی بہت ہیں۔ اور اُن کی تصانیف بھی بکثرت ہیں۔ ہر سال ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جن میں سے بہت کم ہمارے مطالعہ میں آتی ہیں اور ان میں بھی لبا اوقات ایسی کتابوں سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں دیکھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے موقعہ پر "تنقید" کا فرض ہے کہ وہ مفید کتابوں کو نمایاں کرے اور ان کے مطالعہ کی ترغیب دلائے۔ مطالعہ کرنیوالوں کو اس سے مفید اور بروقت امداد حاصل ہوگی، کیونکہ اس کی وجہ سے ان تصانیف کی جانب رہنمائی ہوگی جو فائدہ مند ہوں اور پڑھنے والے کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی مولف کتاب بھی تنقید کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے لوگوں کی توجہ مصنف کی جانب منعطف ہو جاتی ہے اور اسے جائز شہرت جس کا وہ حقدار ہوتا ہے، حاصل ہو جاتی ہے، لیکن اگر کتاب ردی اور بیکار ہے اور کسی قیمت کی مستحق نہیں ہے تو "تنقید" اسے اور اُس کے مصنف کو گوشہ گمنامی میں دفن کرکے فنا کردیتی ہے اور اس طرح حق و باطل کا فرق زیادہ نمایاں اور صاف ہو جاتا ہے ——!

منظور سروش (بھوپالی)

ایک حکیم کا مطب

(شوکت تھانوی کے ایک مضمون کا اقتباس کہیں کہیں سے)

مطب کا عام منظر میدان حشر کی طرح کا ہوتا ہے ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ لوگ اپنی اپنی بولیاں بولا کرتے ہیں اور حکیم یا ڈاکٹر گردن جھکائے نسخہ لکھا کرتے ہیں اگر کوئی شخص اپنے علاج کے لئے نہیں۔ بلکہ مطب کی سیر کرنے کو مطب میں چلا جائے تو اس کو عجیب کیفیت نظر آئے گی۔ کچھ لوگ بچوں کو کندھے سے لگائے ان کو بہلاتے اور چمکارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ کچھ لوگ لکڑی ٹیکے اور کھانستے ہوئے اور ہانپتے دکھائی دینگے۔ کچھ ڈولی پر پڑے ہوئے کراہتے ہوں گے۔ کچھ لوگ قارورے کو اخبار سے بار بار لپیٹ رہے ہوں گے۔ کچھ پردہ دار ڈولیوں کے پاس انچارج بنے کھڑے ہوں گے اور اس جدوجہد میں مصروف ہوں گے کہ اب کی ہم حکیم صاحب کے سامنے پیش ہو جائیں۔ کسی طرف سے آواز آتی ہوگی "حکیم صاحب رات سے جاڑا لگ کر بخار آیا"۔ کوئی کہتا ہوگا "حکیم جی کھانسی دم نہیں لینے دیتی"۔ اور جب سب ایک دم سے بولتے ہوں گے تو مختلف آوازیں آتی ہوں گی کہ رات سے بخار ہے، کمر میں درد ہے۔ متلی نہیں جاتی، قبض ہوگیا ہے، سر گھومتا ہے، پیروں پر ورم ہے، بھوک نہیں لگتی۔ حکیم جی اے حکیم صاحب۔ حکیم جی۔ اے حکیم جی بابوجی بابو صاحب وغیرہ وغیرہ۔

اس تمام شوروغل میں حکیم صاحب نہایت اطمینان کے ساتھ ایک ایک مریض کو بلاتے جاتے ہیں۔ اور چاہے ٹانگ میں درد ہو یا حال سنانے والے کی بیوی بیمار ہو۔ مگر حکیم صاحب نبض دیکھنے کے لئے ہاتھ ضرور بڑھاتے جاتے ہیں۔ نسخہ دیکھتے ہیں اور سوال شروع کرتے ہیں۔ کیا غذا ہوئی؟ نیند آئی؟ اب افاقہ ہے؟ لیپ لگایا تھا؟ غرارہ کیا تھا؟ اجابت ہوتی ہے قبض کے ساتھ ورم میں کمی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب پانے کے بعد اب اگر مریض آیا ہے تو پیٹ ضرور دیکھتے ہیں اور دریافت کرتے جاتے ہیں یہاں درد ہے؟ یہاں؟ اچھا یہاں؟ اور پھر دریافت فرماتے ہیں قارورہ لائے؟ ان تمام باتوں کے بعد آپ پھر نسخہ دیکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کی طرف نظر اُٹھا کر فرماتے ہیں۔ لکھو نسخہ معجون فلاسفہ اول بجوزند وعقب آں گل بنفشہ کشمیری، برگ گاؤزبان، پوست بیخ کاسنی، تخم خطمی، تخم خبازی، عناب ولائتی، سپستان، گلوئے نیب تازہ، خاکسی، شاہترہ، درآب جوشانیدہ صاف نمودہ شربت بنفشہ حل کردہ نیم گرم بنوشند۔ "اُٹھاؤ مہراڈولی ہلاؤ قارورہ" حیرت ہے کہ نسخہ لکھنے والے نسخہ میں "اٹھاؤ مہراڈولی ہلاؤ قارورہ" کیوں نہیں لکھ جاتے اسلئے کہ یہ فقرہ بالکل نسخہ کے ساتھ ساتھ بولا جاتا ہے۔

یہ مضمون مکمل اور متعدد اسیطرح کے دلچسپ مضامین موجِ تبسم میں درج ہیں جو زیریں جلد میں شائع ہوئی ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت معہ محصول دو روپیہ

نوٹ۔ اگر کتاب پسند نہ ہو تو واپس کرکے دام لے لیجئے۔ مینجر نگار۔ لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(جناب خورشید حسن صاحب - اٹاوہ)

مذہب کے بارہ میں یہ آخر آپ کر کیا رہے ہیں - اور آپ کا مقصود کیا ہے - براہ کرم صاف و صریح الفاظ میں اپنا نصب العین تحریر فرمائیے۔

(نگار) میں مذہب کے باب میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا شاعرانہ جواب تو صرف یہ ہے کہ

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر مسجد ویران ہے تو یہ نتیجہ ہے اس حقیقت کا کہ اس میں دلکشی باقی نہیں رہی اور اس لئے ایک غیر دلچسپ، غیر افادی اور لا یعنی چیز کی بربادی سے یہی فائدہ اٹھانا چاہیئے کہ اس پر کسی دلچسپ و مفید مشغلہ کی بنیاد قائم کیجائے۔ جسے شاعر اپنی تماس زبان میں "خانۂ در کوئے ترسایاں" سے تعبیر کرتا ہے۔ نہ یہ کہ پھر اسی ویران چیز کو تعمیر کر کے ایک مستقل یادگار ویرانی کی قائم کر دیجائے شاعر کفر و الحاد کا مرتکب ہوا ہو یا اس سے بھی زیادہ اور کسی سنگین جرم کا، اسکی تحقیق و تعیین میرے مسلک سے علحدہ ہے، لیکن میری طرف سے جو جواب آپ کے سوال کا ہو سکتا ہے اور جسے میں خلوت و جلوت، دونوں حالتوں میں پوری سنجیدگی و عزم راسخ کے ساتھ ہر جگہ ظاہر کر سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں کہ

"میں دنیا میں صرف انسانیت ہی کو انسان کا اخلاقی مسلک دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر مذاہب کا وجود میرے اس مقصود کے منافی ہے تو میں مذاہب کا انہدام چاہتا ہوں"

دنیا کا کوئی مذہب الہامی یا خدائی اس معنی میں نہیں ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے مختلف مذاہب کی تعیین خود کی کیونکہ ایسا تسلیم کرنا خدا کو غرض و احتیاج کا پابند ثابت کرنا ہے، حالانکہ اُس کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔ خدا کو مطلقاً اس کی غرض نہیں کہ دنیا میں کوئی مذہب ہو۔ اور نہ انسان کا اخلاقی یا تمدنی عروج و زوال اس کو فائدہ یا نقصان پہونچا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض انسانی دماغوں کی ساخت فطرت کی طرف سے ایسی مکمل و مہذب تھی کہ اُنھوں نے اجتماعی و اصلاحی اُصول قائم کئے اور انکو مذہب و شریعت قرار دیا، اس لئے اگر اس اعتبار سے مذاہب و شرائع کو الہامی یا مذہبی قرار دیا جائے کہ وہ ایک ایسے انسانوں کے بتائے

ہوئے ہیں۔ جو خدا کی طرف سے ایسا سوچنے والا دماغ لائے تھے، تو بیشک درست ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ خدا ایسا چاہتا تھا اور اس کا مقصود یہ تھا کہ دنیا میں اوقات مختلفہ مختلف مذاہب پائے جائیں اور ان مذاہب کی تعلیمات خود اُس نے روح القدس یا جبرئیل کو بھیجکر القا کیں تو میں اسکو خدا کی توہین سمجھتا ہوں، کیونکہ اس سے جو تخیل خدا کا قائم ہوتا ہے وہ سخت سفیہانہ اور غیر الہانہ ہے۔

بہرحال تمام مذاہب عالم، ذہن انسانی کی پیداوار ہیں، جو وقت و ماحول کے زیر اثر مختلف خیالات و تدابیر کو پیش کرتے رہتے ہیں اس لئے مذاہب کا پیدا ہونا، تمدنی ضروریات کا نتیجہ لازم ہے، جسے ملک و زمانہ کے لحاظ سے مختلف ہونا چاہئے۔ زمانۂ وحشت کے مذاہب میں بھی اتنی ہی وحشت پائی جاتی تھی جتنی اُس عہد کے حالات کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھی۔ اور جب آہستہ آہستہ انسان نے تمدنی ترقی شروع کی تو مذہب میں بھی اس لحاظ سے بلندی پیدا ہونے لگی۔

ابراہیمؑ و داؤدؑ کا مذہب اُس وقت کے لئے موزوں رہا ہوگا، لیکن اب وہ بیکار ہے۔ موسیٰؑ و مسیحؑ کی تعلیمات اُس زمانہ کے لئے مناسب رہی ہونگی، لیکن اب لوگ ان میں سینکڑوں تاریخی و علمی نقائص نکال رہے ہیں۔

جس وقت تک تاریخ و جغرافیہ کی محدود معلومات نے دنیا کو بہت تنگ و مختصر سمجھ رکھا تھا، جبتک فلکیات کے ناقص علم نے کائنات کا مفہوم صرف کرۂ ارض قرار دے رکھا تھا اور جس زمانہ تک شیوع حالات، اشاعت خیالات، نشر معلومات اور توسیع تمدن و تہذیب کے ذرائع عام نہ تھے۔ ایک محدود ملک و جماعت، ایک مختصر قوم و ملت کے لئے وہ سب کچھ صحیح و درست تھا جو ادیان سابقہ نے پیش کیا، لیکن اب جبکہ کائنات کا مفہوم بدل گیا ہے۔ علمی تحقیقات نے دنیا کے ہر گوشہ سے تاریکی کو محو کر دیا ہے، زمان و مکان کے معنے کچھ اور ہو گئے ہیں، برق و ہوا پر حاکمانہ اقتدار انسان کو حاصل ہو گیا ہے، عقل و ذہن کی موشگافیوں نے سینکڑوں جدید مظاہر و آثار قدرت کے سامنے کھول کر رکھدئے ہیں، اشاعت اطلاعات کے لحاظ سے فاصلہ و زمانہ کا وجود باقی نہیں رہا ہے، زمین کی طنابیں کھینچکر دنیا کا ہر انسان دوسرے انسان سے ہر وقت تبادلۂ خیالات کر سکتا ہے اور علوم و فنون کی ترقیوں نے انسان کو صحیح معنی میں نائب خدا ہونے کا منصب عطا کر دیا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے زمانۂ "ہوش و گوش" میں قدیم مذاہب کے اُصول کیا کام دے سکتے ہیں۔ اور دنیا کیونکر ان پر کاربند ہو سکتی ہے۔

پہلے ایک مذہب کا مخاطبہ صرف ایک مخصوص ملک و جماعت سے ہوتا تھا، اب اس کو ساری دنیا سے واسطہ ہے، مختلف تہذیب و تمدن کے لوگوں سے علاقہ ہے، مختلف ذہن و دماغ رکھنے والوں سے تعلق ہے۔ اور مختلف ذوق و طبیعت کے انسانوں سے عہدہ برآ ہونا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اب وہی مذہب اصلاح تمدن و اخلاق کا دعوے کر سکتا ہے، جو بہت زیادہ روشن، باخبر، اور وسیع الخیال ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو تمام رسم و رواج سے علیحدہ ہو کر، تمام مادی ذرائع نمائش سے جدا ہو کر صرف انسانیت کو معبود قرار دے

اور صرف اخلاق کے اُن اُصول کی تعلیم دے، جن سے بہ حیثیت انسان ہونے کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔
پھر اب سوال یہ ہے کہ کیا اس غرض کے لئے کسی جدید مذہب کی ضرورت ہے، یا کوئی انھیں قدیم مذاہب میں سے اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کا جواب آپ کو ماہ آئندہ کے رسالہ میں ملے گا۔ جب میرا نیچے مقالۂ جاریہ (مذہب کی ضرورت) کو ختم کر کے اس مسئلہ سے بحث کروں گا۔

باب الاستفسار

(بسلسلۂ استفسار ماہ گزشتہ)

حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ

(نگار) جناب سید اکبر حسین صاحب نے گزشتہ ماہ میں چار سوال تاریخ ہند و سندھ کے متعلق کئے تھے، جن میں سے تین سوالوں کا جواب گزشتہ ستمبر کے رسالہ میں دیا جا چکا ہے۔ ایک سوال باقی رہ گیا تھا کہ:-

"اگر کوئی شخص حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا مطالعہ اصلی ماخذوں سے کرنا چاہے تو اسے کن کتابوں سے استفادہ کرنا چاہئے اور ان کتابوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے"

چونکہ اس سوال کا جواب زیادہ تفصیل کا محتاج تھا اس لئے ماہ گزشتہ کے رسالہ میں اس طرف اعتنا نہ کر سکا تھا اب میں اس مسئلہ پر توجہ کرتا ہوں۔

سب سے پہلے عہد بابر سے قبل اسلامی ہند کی تاریخ کو مختلف حصوں اور زمانوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور پھر غور کرنا چاہئے کہ ہر زمانہ کی تاریخیں کب اور کیونکر لکھی گئیں اور ان کی تاریخی اہمیت کیا ہے۔

سب سے پہلے اس تقسیم کے لحاظ سے سندھ کو دیکھنا چاہئے۔ اس کے بعد خاندان غزنی اور غور کے زمانہ کو لیکن یہ تینوں عہد وہ تھے جنکو حکومت ہند سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی حکومت حقیقتاً غلاموں کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جن کے بعد خلجیوں، تغلقوں، سیدوں اور لودیوں کا زمانہ آیا۔ چونکہ آپ صرف حملۂ بابر تک کی تاریخوں سے بحث چاہتے ہیں۔ اس لئے اس کے معنے گویا یہ ہوئے کہ صرف لودیوں کے وقت تک کی تحقیق درکار ہے اور اس طرح گویا حکومت سندھ اور حملۂ غزنی و غور کو ملا کر کل آٹھ زمانوں یا خاندانوں سے بحث کرنا ہے جن کی ترتیب یہ ہونا چاہئے۔

(۱) سندھ (۲) عہد غزنی (۳) عہد غور (۴) عہد غلام (۵) عہد خلجی (۶) عہد تغلق (۷) عہد سید (۸) عہد لودی۔

اس میں شک نہیں کہ کسی زمانہ کی سب سے بہتر و معتبر تاریخ وہی سمجھی جاتی ہے جو اسی زمانہ میں لکھی گئی

ہو۔ اس کے بعد اس تالیف کا مرتبہ ہے جو قریب ترزمانہ میں تحریر ہوئی ہو۔ چنانچہ اسی طرح بعد زمانی کے لحاظ سے ایک تاریخی کتاب کی اہمیت میں کمی ہوتی جاتی ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی زمانہ کی تاریخ بہت بعد کو لکھی گئی لیکن لکھنے والے نے اسقدر محنت وکاوش، تحقیق وتدقیق اور شرح وبسط سے کام لیا کہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی۔ اس لئے میں یہاں اسکی پابندی نہیں کرونگا کہ پہلے ان تاریخوں کو لوں جو پہلے لکھی گئی ہیں اور پھر اس کے بعد، دوسری تاریخوں کو جو بعد میں مرتب ہوئیں۔ بلکہ یکجائی طور پر بغیر کسی خاص ترتیب کے ان کتابوں کا ذکر کرونگا، جن سے کسی عہد کے تاریخی حالات معلوم ہوسکتے ہیں اور اُسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ کتاب کس حد تک قابل اعتبار ہے۔

۱۔ تاریخ سندھ سے بحث کرنیوالے کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے

مروج الذہب (مسعودی)، اشکال البلاد (ابن حوقل)، فتوح البلدان (بلاذری)، چچ نامہ، تحفۃ الکرام، تاریخ معصومی، تاریخ طاہری، بیگلار نامہ اور ترخان نامہ

اول الذکر دو کتابیں عرب کے مشہور ماہرین جغرافیہ کی ہیں اور سندھ کے حالات خود اُنھوں نے دیکھکر قلمبند کئے تھے۔ مسعودی ۳۰۳ھ میں سندھ آیا جب دولت عباسیہ کا زوال شروع ہوگیا تھا، اور سندھ سے دربار خلافت کا اقتدار اُٹھ چکا تھا۔ اس کے تقریباً تیس سال بعد خلیفۃ المطیع باللہ کے عہد میں ابن حوقل ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے چشم دید حالات لکھے۔ بلاذری (صاحب فتوح البلدان) اگرچہ مسعودی اور ابن حوقل سے قدیم العہد تھا، لیکن یہ سندھ نہیں آیا۔ اس نے فتوحات سندھ کے حالات دوسری معتبر کتابوں سے نقل کئے اور کچھ زبانی روایات سے بھی۔ کیونکہ اسوقت ایسے لوگ بھی زندہ تھے جنھوں نے سندھ کی ابتدائی فتوحات کو دیکھا تھا، انھیں میں سے ایک شخص ابوالحسن علی بن محمد المدائنی تھا جس نے خود بلاذری سے مل کر تمام حالات بیان کئے۔ بلاذری نے منصور ابن حاتم اور اس کی تاریخ سندھ کا بھی ذکر کیا ہے اور ابن الکلبی کی تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس لئے بلاذری نے جو کچھ سندھ کے متعلق لکھا ہے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی یہ تاریخ (فتوح البلدان) تاریخ طبری سے پہلے کی چیز ہے اور عربی زبان کی نہایت قدیم تاریخوں میں شمار کیجاتی ہے۔

فتوحات محمد قاسم کے متعلق سب سے زیادہ معتبر کتاب وہ ہے جسے عام طور پر چچ نامہ کہتے ہیں (چچ، اس برہمن کا نام تھا جو عربوں کے حملہ کے وقت سندھ میں حکمراں تھا) اس کتاب کی ابتدا میں اس کا نام فتح نامہ بھی درج ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کو الفنسٹن اپنی کتاب میں تاریخ ہند وسندھ سے تعبیر کرتا ہے، اور جس کا نام نورالحق صاحب زبدۃ التواریخ اور مصنف طبقات اکبری نے منہاج المسالک بتایا ہے

اصل کتاب عربی میں تھی جسے محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ناصرالدین قباچہ کے عہد میں فارسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اس کو اسماعیل بن علیؑ سے ملی تھی جو عثمان ثقفی کی اولاد میں سے تھے۔ اس کتاب کا زمانۂ تصنیف

۱۳۶ھ سے قبل رہا ہوگا۔ کیونکہ اس میں شہر منصورہ کا ذکر نہیں ہے۔ جو ۱۳۶ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ اکثر بعد کے مورخین نے اسی کتاب سے فتوحاتِ سندھ کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں۔

تحفۃ الکرام (مصنفہ علی شیر قانع) کی تیسری جلد میں بھی سندھ کی تاریخ پائی جاتی ہے۔ اس میں ابتدا ان برہمنوں کے حالات سے کی گئی ہے جو عربوں کے فتوحات سے قبل سندھ میں پائے جاتے تھے، اور فتوحاتِ عرب کا حال بالکل چچ نامہ سے لیا ہے۔ اس کے بعد ان سمرا اور سما خاندانوں کے گورنروں کا حال ہے جو فرمانروایانِ دہلی کی طرف سے مامور ہوئے تھے پھر قبائل ترخان اور ارغون کی تاریخ درج کی ہے اور ازاں بعد گورنران تیموریہ و خاندان کلہوڑا کا حال لکھ کر نصف جلد میں تاریخ سندھ کو ختم کر دیا ہے، باقی نصف حصہ میں اس عہد کے مشائخ و مساوات، اولیاء و علماء کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ ۱۱۸۱ھ میں مرتب ہوئی۔ لیکن اس کو جلال الدین سیوطی کی تحفۃ الکرام نہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔

تاریخ معصومی، سندھ کی تمام تاریخوں میں سب سے زیادہ مفصل تاریخ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں عہد اکبری تک کی تاریخ سندھ پائی جاتی ہے۔ اس کا مصنف میر معصوم کرمانی الاصل تھا لیکن یہ خود بھکر میں پیدا ہوا تھا یہ کتاب اس نے ۱۰۰۶ھ میں مرتب کی اور فتوحاتِ عرب کے متعلق اپنا ماخذ صرف چچ نامہ کو قرار دیا۔ بعد کے مورخین نے مثلاً بدایونی حیدر رازی صاحب آثر الامراء مصنف تاریخ طاہری و مراۃ دولت عباسیہ نے اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

میر طاہر محمد بن سید حسین ساکن ٹھٹھا کی تاریخ طاہری میں عرب حکومت کا کوئی حال درج نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے چچ نامہ اور تاریخ معصومی کا بھی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس نے زیادہ تر ترخان خاندان کی مدح سرائی کی ہے جس سے خود اس کا خاندان وابستۂ ملازمت تھا۔

بیگ لار نامہ کے مصنف کا نام نامعلوم ہے لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ بیگلار خاندان کا ملازم تھا۔ اس کتاب میں پہلے مختصراً عربی فتوحاتِ سندھ کا بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر ارغون خاندان سے بحث کر کے عہد امیر قاسم (بیگ لار) کے واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

ترخان نامہ یا ارغون نامہ ایک ہی کتاب کا نام ہے۔ اس کا مصنف سید جمال ابن میر جلال الدین حسین شیرازی تھا۔ یہ کتاب ۱۰۶۵ھ کی تالیف ہے جس میں زیادہ تر ارغون اور ترخان خاندانوں کے حالات سے بحث کی گئی ہے تاریخ معصومی سے اسکی ترتیب میں بہت مدد لی گئی ہے۔

الغرض تاریخ سندھ کا مطالعہ کرتے وقت ان کتابوں کو نہ بھولنا چاہیئے۔ خصوصیت کے ساتھ مروج الذہب، فتوح البلدان، چچ نامہ اور تاریخ معصومی کو، کہ یہ فی الحقیقت اصل ماخذ ہیں، سندھ کی تمام موجودہ تاریخوں کے۔

اس سلسلہ میں ایک کتاب کا ذکر میں بھول گیا جو خاص اہمیت رکھتی ہے اس کا نام کتاب المسالک والممالک ہے جو عام طور پر ابن خورداذبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے مختلف ممالک کی جغرافی تحقیقات کر کے سنہ ۲۳۰ھ سے قبل اس کو تصنیف کیا۔ اس میں بھی سندھ کی ابتدائی تاریخ اسلامی کے متعلق بعض نہایت دلچسپ وکارآمد واقعات ملتے ہیں۔

(باقی)

ابوریحان بیرونی

(جناب فضل الٰہی صاحب۔ ہوشیارپور)

"ابوریحان مشہور ریاضی داں اور فلسفی ہوا ہے اور اس کے ساتھ لفظ بیرونی کی نسبت اس قدر عام و معروف ہے کہ گویا اس کے نام کا کوئی جزو اصلی ہے۔

بیرونی کے معنے بظاہر یہی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ کسی مقام بیرون کا رہنے والا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جگہ کہاں تھی؟ اور اب بھی ہے یا نہیں؟

(نگار) اس کا نام محمد بن احمد تھا، ابوریحان کینت تھی، یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ بیرون کی نسبت سے بہت مشہور ہے۔ لیکن گفتگو اسی میں ہے کہ بیرون واقعی کوئی مقام تھا یا نہیں اور اگر نہیں تھا تو اس کو بیرونی کہنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

شہرزوری اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں لکھتا ہے کہ "وہ بیرون میں پیدا ہوا جو سندھ کا نہایت خوبصورت شہر ہے۔"

حاجی خلیفہ نے بھی اسی بیان کا تتبع کیا ہے اور ابوالفداء نے بھی ابوسعید کی اسنادت سے یہی لکھا ہے۔

فرانسیسی مورخ ام۔ رینآں (M. REINAND) نے بھی اس کو سندھی ظاہر کیا ہے۔ اس لئے اب قابل غور امر یہ ہے کہ بیرون سندھ میں کس جگہ تھا یا ہے۔ جہاں اب حیدرآباد (سندھ) واقع ہے، اسی کے قریب ایک مقام نیرون یا نیرون کوٹ ضرور واقع ہے۔

چونکہ نیرون صرف ایک نقطہ کے فرق سے بیرون پڑھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ مورخین سے پڑھنے

میں غلطی ہو گئی ہو۔

اور کسی نے شہر منصورہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے دریائے مہران کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ بیرون سے ہوتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ بہرحال بیرون کوئی مقام سندھ میں نہ تھا ورنہ اگر ہوتا تو خود ابوریحان اپنے جغرافیۂ ہند میں ضرور اسکا ذکر کرتا۔

سمعانی نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ بیرونی فارسی لفظ ہے جس کے معنے ہیں "باہر کا" اور ہر وہ شخص جو پایۂ تخت سے باہر پیدا ہوتا تھا اُسے بیرونی کہتے تھے صمعانی نے اسے خوارزمی لکھا ہے اور بہت سے مورخین نے اسی بناء پر اس کا خوارزمی ہونا ظاہر کیا ہے۔

مسٹر زاخان نے بھی خوارزم کا باشندہ ہونا ظاہر کیا ہے، جس کا ثبوت یہ دیا جاتا ہے کہ خوارزم کی تقویم شمسی نہایت مکمل تھی اور ابوریحان اس سے بخوبی واقف تھا۔

مسٹر ساشار (ALBERUNIS INDIA) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کے عہد میں خوارزم مامونی خاندان کے زیر حکومت تھا اور ابوریحان اپنے وطن خوارزم میں فرمانروائے عہد کا مشیر تھا۔ جب محمود نے خوارزم کو فتح کیا تو مال غنیمت کے ساتھ بہت سے قیدی بھی لایا۔ ان قیدیوں میں سے ایک ابوریحان بھی تھا"

الغرض ان تمام بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرون کوئی مقام نہ تھا۔ بلکہ بیرون تھا اور اگر ابوریحان ہندوستان میں پیدا ہوا ہوگا تو بیرون ہند میں ہوا ہوگا۔ لیکن بیرون میں پیدا ہونے کی تردید اول تو اس طرح ہوتی ہے کہ خود ابوریحان نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اسکو اپنے جغرافیۂ ہند یا تحقیق الہند میں اس مسئلہ پر لکھنے کا کافی موقعہ حاصل تھا، دوسرے یہ کہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان اول اول اُسوقت آیا جب محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کی حکومت تھی اس لئے اسکو خوارزمی ہی ماننا پڑے گا اور بیرونی کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ وہی قرار دیجائیگی جو سمعانی نے ظاہر کی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے :-

برگس (BRIGGS) نے تاریخ فرشتہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس نے بجائے ابوریحان کے انوریحان لکھدیا ہے۔ اس پر بعض مورخین صرف اظہار حیرت کرکے خاموش ہو گئے اور بعض نے برگس کا اعتبار کرکے وہی انوریحان لکھدیا ہے، حالانکہ حقیقت اس غلطی کی یہ ہے کہ برگس نے ابوریحان کو انوریحان پڑھ لیا (کیونکہ نقطوں کا محل بدلجانے سے بہ آسانی یہ غلطی ہو سکتی ہے) اور بعد کو بعض مورخین اسی غلطی پر قائم رہے، اور بعض نے تنقید بھی کی تو اس کا الزام فرشتہ پر رکھا کہ اس نے کیسے انوریحان لکھدیا، حالانکہ ان غریبوں کو یہ خبر نہیں کہ یہ غلطی خود اُن کی ہے جنہوں نے ابوریحان کو انوریحان پڑھا نہ کہ فرشتہ کی۔

معلوم ہوتا ہے نقطوں کی غلطی ابوریحان کی قسمت ہی میں لکھدی گئی تھی کہ پہلے بیرون و نیرون کے مسئلہ

نزاع ہوا اور پھر ابوریحان کو انوریحان بنا دیا گیا۔

RHYTHM کا ترجمہ

(جناب شمس الدین خانصاحب۔ دہلی)

انگریزی لفظ (RHYTHM) کا ترجمہ کیا ہونا چاہیے اور (RHIME) کو کیا کہنا چاہیے۔؟

(نگار) (RHYTHM) اور (RHIME) دونوں غالباً یونانی لفظ (ARITHMOS) سے نکلے ہیں۔ اسی (ARITHMOS) سے (ARITHMETIC) بھی ہے، جسے علم الحساب کہتے ہیں۔ اس لئے ان سب الفاظ میں باقاعدگی، نظام، اور اصول مقررہ کا مفہوم پنہاں ہے۔ یعنی جس طرح (ARITHMETIC) علم الحساب میں ایک قاعدہ و انتظام پایا جاتا ہے، اسی طرح (RHYME) اور (RHYTHM) میں بھی ہونا چاہیے۔

(RHYME) خالص فن شعر کی اصطلاح ہے، جسے قافیہ کہتے ہیں، لیکن کبھی کبھی نثر میں بھی اس کی پابندی کی جاتی ہے، اور اس صورت میں وہ نثر بھی مقفیٰ کہلاتی ہے۔

(RHYTHM) کا ترجمہ ذرا دشوار ہے، کیونکہ یہ لفظ بہت وسیع المعنی ہے، اور جہاں جس جگہ بات میں کوئی باقاعدہ نظام، کوئی مقررہ ترتیب، کوئی اصولی حرکت یا جنبش پائی جائے، وہاں اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم میں، وقت، مکان، حرکت، ترتیب، آواز اور جسم سب شامل ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک مجسمہ آتا ہے، جس کے اعضاء بہت سڈول ہیں، تو ہم کہہ سکیں گے کہ اُس کے اعضاء میں (RHYTHM) پایا جاتا ہے، جسے لفظ تناسب سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے اعضاء میں منظم جنبش ہوتی ہے تو ہم اس حرکت کو (RHYTHM) کہہ سکتے ہیں، جس کا نام رقص یا حرکات رقصیہ بھی ہے۔ اور اگر آواز میں باقاعدہ وقف و امتداد پایا جاتا ہے تو وہ بھی یہی ہے جس کا اصطلاحی نام موسیقی ہے۔ اور اگر اس آواز میں الفاظ ہیں تو وہ شعر ہے یا نثر مقفیٰ۔

الغرض اس لفظ کا مفہوم بہت وسیع ہے اور مختلف محل کے لحاظ سے اس کے اصطلاحی نام بھی مختلف ہیں جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا۔ لیکن جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے، اس کے لئے عربی میں ایک خاص لفظ ایقاع پایا جاتا ہے جس کی جمع ایقاعات آتی ہے۔ اور جب یورپ نے منجملہ دیگر علوم و فنون کے موسیقی کا فن بھی اہل عرب اور اُن کی تصانیف سے حاصل کیا تو ایقاع

سے بھی اُنھوں نے فائدہ اُٹھایا (جسے ہندی میں تال سم کہتے ہیں) چنانچہ اُن کے یہاں موسیقی کی اصطلاحوں میں جو الفاظ (OCHETUS) (HOKETUS) یا (HOGUETUS) پائے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایقاعات کی لاطینی صورتیں ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت قرطبہ کی یونیورسٹی علوم و فنون کا مرکز بنی ہوئی تھی اور تمام یورپ کے طلبہ کھنچکر وہاں آرہے تھے۔ اسی وقت دیگر علوم کی کتابوں کے ساتھ فارابی کی احصاء العلوم اور کتاب الموسیقی کا بھی ترجمہ یورپین زبانوں میں کیا گیا۔ اور وہیں سے ایقاع یا تال سم کی معلومات یورپ نے حاصل کیں۔ اس فن کا سب سے پہلا ماہر عربوں میں جو بھی رہا ہو، لیکن تصنیفی حیثیت سے الخلیل الکندی سب کا پیش رو ہے، جس نے اس فن پر ایک مستقل تصنیف کتاب الایقاع کے نام سے تحریر کی۔ اسی سے غالباً فارابی نے اپنی کتاب الموسیقی میں اور ابن سینا نے اپنی تصنیف شفا میں استفادہ کیا اور ان کتابوں سے اہل یورپ نے۔

اس بیان سے غالباً آپ کو لفظ (RHYTHM) کی وسعت معنی کا علم ہو گیا ہوگا، لیکن چونکہ ہر موقعہ و محل کے لحاظ سے اسکے الگ الگ نام ہو گئے ہیں۔ اور ان سب کے لئے آپکی زبان میں الفاظ موجود ہیں، مثلاً رقص، تناسب، موسیقی تال سم، قافیہ و سجع وغیرہ) اس لئے میری رائے میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ کو اس پر اصرار ہے کہ کوئی ایک لفظ ایسا ہونا چاہیئے، جو کم و بیش تمام محلات استعمال پر حاوی ہو تو میرے نزدیک وہ صرف لفظ تسجیع ہو سکتا ہے، جس کا مفہوم ہندی زبان کے ایک لفظ سبھاؤ سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔

برسات

(جناب جوش ملیح آبادی)

فردوس عطا کی مجھے ساون کے مہینے،
اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار
مینھ جتنا برستا تھا سر دامنِ کہسار
شانوں پہ ادھر کاکلِ شبرنگ کی لہریں
تھا یاد تو یہ فرمان کہ اس سرد ہوا میں
یا شکوۂ پیہم تھا نزاکت کے لبوں پر
تھا پیشِ نظر جسکے لئے ہجر میں برسوں

ایک گل رخ نسریں بدن و سروِ سہی نے
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے
اُتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے
گردوں پہ ادھر ابر خراماں کے سفینے
ہم منھ سے نہ بولیں گے اگر پی نہ کسی نے
طوفاں وہ اُٹھائے تھے مری بادہ کشی نے
مانگیں تھیں دعائیں مرے آغوش تہی نے

دل طعن سے ہر بار یہ دیتا تھا صدائیں
کیا ظرف فانی تھا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا
اب اے فلک اور یہ سامان بھی چھینے
دی کتنی ہی آواز حیات ابدی نے

اے جوش ہر ایک سانس نسیم سحری تھی
جنت میں بھی یاد آئیں گے یہ چند مہینے

اڈیٹر نگار سترہ اکتوبر کی رات کو پشاور پہونچ جائیں گے اور جناب سردار احمد خانصاحب سول جج پشاور کے مہمان ہونگے، یہاں ۵-۶ دن قیام کرنے کے بعد دیگر اضلاع سرحد تشریف لیجائیں گے۔ نومبر کے ہفتہ اول میں واپسی ہوگی (منیجر نگار)

مرے احباب ہیں، شفاف نہریں، نرم رو موجیں
مرے چہرے سے موجیں گردِ غم کو پاک کرتی ہیں
مجھے افسردگی سے آشنا ہونے نہیں دیتی
گراں ہوتا نہیں میری خوشی پہ اُن کو سمجھانا
مرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتی ہے
مرے کھوئے ہوئے احساس کو ہشیار کرتی ہے
یہ کس نے روح کی گہرائیوں میں شورشیں بھر دیں
رگِ گل، پختگی کی شان میں ہوتی ہے جب ظاہر
مری شامِ سکوں پرور میں نغموں کا خزانہ ہے
خزاں میرے چمن کی حد میں داخل ہو نہیں سکتی

لطافت آشنا غنچے ہیں، تیر رشتہ دار دنیں
رہا کرتا ہے رقصِ شادمانی آبشاروں میں
صباحت ہے کچھ ایسی پھول کے رنگیں، عذاروں میں
جو گل زیبِ گلستاں ہیں، وہ گندھجاتے ہیں ہاروں میں
وہ لرزش سی جو رہتی ہے نمایاں شب کو تاروں میں
وہ جنبش سی جو ہوتی ہے سحر کو شاخساروں میں
کوئی مطرب چھپا بیٹھا تھا، شاید شاخساروں میں
تو روحِ زندگانی دوڑنے لگتی ہے خاروں میں
مری روشن سحر ہے، حسن کے آئینہ داروں میں
کہ نکلیں جادو داں رکھا گیا ہے، ان بہاروں میں

ابھی اب میں ہوں، یہ عشرت گاہ ہے، وارفتہ حالی
مری دنیا، غم و افکار کے جھگڑوں سے خالی ہے

علی اختر اختر

کیا آپ ان دو سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں؟

۱- مذہب کسے کہتے ہیں؟

اور

۲- مذہب کی حقیقت کیا ہے؟

مزدور کی آواز

سازِ غمِ ماضی ہوں عکسِ رخِ فردا ہوں،
محنت میری دولت ہے مزدور کا بیٹا ہوں

پلتی ہے میری قسمت تدبیر کے دامن میں،
خوابیدہ ہیں امیدیں تقدیر کے دامن میں

مجھ سے ہوئی آبادی ویرانۂ ہستی کی
ہے خون مرا سرخی افسانۂ ہستی کی

دنیا میں کھلائے ہیں گلزارِ ارم میں نے
کعبہ میں اٹھائی ہے دیوارِ حرم میں نے

بیدار مری محنت ہر سازِ ترنم میں
نہروں کی روانی میں کلیوں کے تبسم میں

ہے کشتِ عمل تازہ محنت کے پسینے سے،
ہنگامۂ دنیا ہے مزدور کے جینے سے

نافہم سمجھتے ہیں یہ امر ہے تقدیری
محنت کی جہاں سازی دولت کی جہانگیری

سکھلا دے اگر کوئی مزدور کو خودداری
پھر آپ ہی گھٹ جائے سرمایہ کی بیماری

ہیں دوں نہ اگر جنبش بازوئے مشقت میں
رعشہ ابھی آ جائے اعضائے تجارت میں

ہیں میرے مٹانے کو سو طرح کی تدبیریں،
قانون کے پھندے ہیں تہذیب کی زنجیریں

قانون کے ہاتھوں میں حربہ جو ہے مذہب کا
چلتا ہوا جادو ہے دنیائے مہذب کا،

اک راز ہے پوشیدہ اس پردۂ رسوا میں
بنیادِ شہنشاہی تعمیرِ کلیسا میں

برگشتہ ہوئی دنیا پیغام سے مذہب کے
اٹھتے رہے سو فتنے اک نام سے مذہب کے

مذہب نے غریبوں سے سوزِ جگری چھینا
"تعلیمِ قناعت" دی "احساسِ خودی" چھینا

ہے روحِ عمل مردہ اس خوئے توکل سے
دوزخ ہے مری دنیا جنت کے تخیل سے

مستقبلِ زریں ہے اس خواب حقیقت میں
آنے دو ذرا طاقت اس بازوئے محنت میں

دیوارِ ملوکیت تیشوں سے گرا دوں گا،
اس کہنہ تمدن کی بنیاد ہلا دوں گا

معمار نئے ہوں گے تعمیر نئی ہو گی،
جب خواب نیا ہو گا تعبیر نئی ہو گی

پہونچے گا وہاں طائر پروازِ خیالی کا،
جو نقطۂ آخر ہے دنیا کی ترقی کا،

پھل سرو میں آئے گا پھولوں سے بھرے ہونگے
صحرا بھی چمن ہو گا کانٹے بھی ہرے ہونگے

مذہب نہ سہی لیکن احساسِ وفا ہو گا
ہر سر میں خودی ہو گی ہر دل میں خدا ہو گا،

سوئی ہوئی طاقت کو اس روز جگائیں گے
سمجھا ہے کبھی تم نے کیا راز ترقی ہے
مقصد کی ظفر مندی موقوف ہے ہمت پر
مغرب سے خزاں آئی مشرق کا چمن اُجڑا
کانٹوں کا بیاباں ہے خاک اُڑتی ہے گلشن میں
اے منتظر فردا اے نوحہ گرِ ماضی
ہے مطلع مشرق سے آثارِ سحر پیدا
جو ابر کہ اُٹھا تھا فاران کی چوٹی پر
تبت کے پہاڑوں پر توران کے صحرا میں
ہے جنبشِ بیداری ٹھہرے ہوئے پانی میں
فریادِ اسیراں سے جنبش ہوئی زنداں کو
اے ملک کے غمخوارو - اے قوم کے فریادی
محنت کی ضرورت ہے بیکار ہیں تقریریں
روٹھی ہوئی عظمت کو بھارت کی مناؤ گا
فریاد نہیں سنتے "ارباب اثر" میری
تلخی کشِ محنت ہوں رد کردہ دنیا ہوں

اک دن اسی دنیا کو فردوس بنائیں گے
مغرب کی نئی دُنیا کیوں جنت ارضی ہے
تقدیر چمکتی ہے پیشانی محنت پر
گلچیں کے قدم آئے گلزار وطن اُجڑا
پھولوں کا خزانہ ہے گلچینوں کے دامن میں
ابتک ہے گلستاں میں رنگِ اثرِ ماضی،
محنت کی عرق ریزی کرتی ہے گہر پیدا
وہ آج برستا ہے مزدور کی کھیتی پر
آئی ہے گھٹا گھر کر "بستانِ مصلا" میں
ہنگامہ طوفاں ہے گنگا کی روانی میں
سبزے نے بھی کروٹ لی مژدہ ہو گلستاں کا
مزدور کی بیداری ہے ملک کی آزادی
دو مجھکو توانائی میں توڑ دوں زنجیریں
تم مجھکو جگا دو - میں قسمت کو جگا لوں گا
اے "جذبہ خودداری" لے آکے خبر میری
مظلوم تمدن ہوں پروردہ صحرا ہوں

جمیل مظہری کاظمی

غزلیات

(افسر صدیقی امروہوی)

دُور تک کوئی نشانِ جادۂ منزل نہیں
اب ہوا ثابت کہ جوشِ رہروی کامل نہیں

بار اُٹھاتا عشق کا اتنی بساطِ دل نہیں
مہربانی ہے تمہاری میں کسی قابل نہیں

زندہ باد اے یادِ ایامِ گزشتہ زندہ باد
حال اچھا ہے مرا تشویشِ مستقبل نہیں

ضبطِ غم کا پاس غالب ہے خیالِ مرگ پر
جی رہا ہوں گو کہ لطفِ زندگی حاصل نہیں

رات بھر آتی ہے کانوں میں نوائے جاں فزا
شکر ہے اللہ کا خاموش سازِ دل نہیں،

آؤ چل کر طور کی مٹی میں پھونکیں روحِ عشق،
غش ہوئے ہیں جب سے موسیٰ گرمیٔ محفل نہیں

رنگ بھرنا رہ گیا ہے حسرتوں کے خون سے
میں وہ تصویرِ وفا ہوں جو ابھی کامل نہیں

کشتیٔ دل کا خدا حافظ ہے بحرِ عشق میں،
جا رہی ہے اُس طرف کو جس طرف ساحل نہیں

اُڑ رہی ہے رہروِ راہِ طلب سے دُور دُور
گردِ منزل بھی شریکِ زحمتِ منزل نہیں

رات کی خاموش تاریکی میں افسر غور کر
چودھویں منزل سے پہلے ماہ کیوں کامل نہیں

طفیل احمد شمیمی

نہ سحرِ ساقی نگار، نہ جامِ رنج گداز
دلِ غریب و پریشانیٔ دیارِ مجاز

دل آج زلزلۂ عشق سے ہے محشر ساز
اُڑائے ساز کو پھرتی ہے ساز کی آواز،

کہیں نہ محفلِ ہستی، نہ جلوہ ہائے مجاز
خیال پردۂ دل پر ہے محو نقش طراز

خدا دکھائے نہ پھر خواب ایسی جنت کا،
نہ رقصِ شاہد و ساقی نہ بانگِ چنگ نواز

سکوت پردۂ گل سے سرودِ بلبل تک،
طلسم ساز ہے ہر رنگ میں مری آواز

وہی ہے دستِ تصور کی نقش آرائی
وہی تخیلِ حسن اور رنگ ناز و نیاز

پلا کے مے یہ تری کم نگاہیاں ساقی
کبھی تو عالمِ مستی میں پوچھیں قصۂ راز

حریم دل میں ہے چھایا سکوت حسرت ریز
نہ اب وہ ناز کی رنگینیاں نہ جوش نیاز

بجائے دل کو کوئی کیا فریب ہستی سے
نظر کو ذوق تماشا، خیال۔ شعبدہ باز

اُٹھا نوائے محبت پہ گام بے پروا،
نہیں ہے وادئ دل میں کہیں نشیبِ فراز

اس انجمن میں ہوں زندانیِ خیال ہنوز
نہ آشنائے حقیقت، نہ نکتہ دانِ مجاز

بہ اعتبار فنا ہے کشش اس عالم کی،
شرار گُل سے چمن ہے فروغِ دیدہ نواز

طلسم خانہ ہستی میں کیا غم و عشرت
بقدر وہم ہے اس دشت میں نشیب فراز

وہی مناظر شام و سحر وہی محفل،
ہنوز دہر ہے سرمست جرعۂ آغاز

فضائے گنبد ہستی وہی، وہی مطرب
کہاں تک آہ سنوں میں سُنی ہوئی آواز

طرب پذیر تغیر ہے خاطر انساں
اب اور نغمہ سے آباد کر یہ پردۂ ساز

(قیس شیروانی)

جب جوانی حسنِ فطرت بن گئی،،
سادگی خود زیب و زینت بن گئی،،

مسکرائے پھر وہ مجھ کو دیکھ کر،،
عہد مرے جینے کی صورت بن گئی،،

دیکھتی ہے آنکھ پھر نیرنگ حُسن،،
عقل پھر تصویر حیرت بن گئی،،

بڑھ گئی جب حد سے بیتابی مری،،
وجہ تسکینِ طبیعت بن گئی،،

کھُل گئیں آنکھیں جو پی میں نے شراب،،
بے خودی چشم بصیرت بن گئی،،

جب پڑا ناکامیوں سے سابقہ،،
زندگی زنجیر حسرت بن گئی،،

ہوگیا دل بے نیاز ہست و بود،،
بے کسی وجہ فراغت بن گئی،،

درد کا آخر کوئی انجام ہے،،
بے کلی پیغام راحت بن گئی،،

پوچھتے کیا ہو نگاہ لطف سے،،
بن گئی، جینے کی صورت بن گئی،،

ابتدا میں جس کو سمجھتے تھے کسک
بڑھتے بڑھتے دردِ اُلفت بن گئی،،



(نیّر آروی)

طاقت کہاں ہے ضبط کی بار دگر مجھے ، / اے اضطراب شوق نہ لیجا اُدھر مجھے

اعدا کے روبرو یہ مرا حال ہائے ہائے ، / اتنا نہ کر ذلیل تو اے چشم تر مجھے

یہ درد وہ نہیں ہے جو درماں پذیر ہو ، / ہمدردین کے چھیڑ نہ اے چارہ گر مجھے

کیا کیا نہ شوق دید میں ناکامیاں ہوئیں / اب تو فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

سمجھوں گا میں فریب ہی اُسکو اگر کبھی / دیکھے نگاہ لطف سے وہ فتنہ گر مجھے

میں خود طریق عشق میں گم کردہ راہ ہوں / کسواسطے بنائے کوئی راہبر مجھے

دامن پہ ہے نظر تری اور دل ہے چاک چاک / اب حاجت رفو نہیں اے بخیہ گر مجھے

دنیا کی بستیوں سے الگ ہو جہاں مقام / اے رہنمائے عشق تو لے چل ادھر مجھے

وہ دن گئے کہ دل میں تھا ہنگامۂ نشاط / اب حسرتوں کی بھی نہیں اپنی خبر مجھے ،

کیا کیا نہ عاشقی کی بدولت ملے خطاب
کہتے ہیں لوگ نیّر آشفتہ سر مجھے

بسم اللہ

نگار

جلد ۱۸ فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۲ء شمارہ ۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء شمارہ ۵

ملاحظات

میں آخر کار یکم نومبر کو پھر اُسی سرزمین فکر و آلام میں پہونچ گیا، جہاں سے سولہ دن قبل اُس دیار دور افتادہ کی طرف روانہ ہوا تھا، جو حقیقی انسانیت کے بہت سے فراموش کردہ مناظر اب بھی اپنے سنگستانی دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔

سرحد جاکر وہاں کی زندگی، وہاں کی تہذیب، وہاں کی معاشرت اور سب سے زیادہ وہاں کی سیاسی کیفیات کے مطالعہ کرنے کا شوق عرصہ سے دل میں موجزن تھا اور ناشکری ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ باندازۂ شوق اس میں زیادہ ناکامیاب رہا۔

میرا سفر یہاں سے اُس تاریخ کو شروع ہوا جب وہاں کی فضا میں سکون تھا، اور سیاسی مطلع گرد و غبار سے پاک، لیکن پشاور پہونچتے ہی مجھے یہ خبر سُنائی گئی کہ اب حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ امن و سکون کی صحبتوں میں کس قدر برہمی پیدا ہو۔ کہنے والوں نے تو اس کا اظہار تاسف کے ساتھ کیا، لیکن میں اپنی جگہ مسرور تھا، کیونکہ سرحد کا سفر کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، اگر وہاں بھی اسی اطمینان و آئین زندگی سے واسطہ پڑے، جو بسا اوقات انسان کو تھکا کر کبھی کبھی جرم و معصیت پر بھی آمادہ کر دیتا ہے، چہ جائیکہ خطرے میں پڑنا، کہ میں تو اس کے اندر بہت سے حیات بخش لمحات اپنے لئے مستور پاتا ہوں۔

پھر یہ کہ میں نے اپنے دوران قیام میں وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن تاثرات کو اپنے ساتھ لایا، یہ ایک مستقل بیان چاہتا ہے، جس کو میں آیندہ کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں، کیونکہ ممکن ہے مجھے اس سلسلہ میں بعض تصاویر کا دینا بھی ضروری

ہوجائے۔ اس قدر ذکر میں نے صرف اس لئے کردیا کہ ناظرینِ نگار کو میری واپسی کا علم ہوجائے اور اُن احباب کو مایوسی، جو مجھے واپسی کے وقت مختلف مقامات پر روکنا چاہتے تھے۔ متعدد تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کسی متعین مقام کا عزم کرنے کے بعد راستہ میں کسی اور جگہ قطع سفر کرکے قیام کرنا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔ اور میں آئندہ بھول کر بھی کوئی وعدہ ایسا نہ کرونگا کہ آخرکار معذرت کی ضرورت پڑے۔

اس سے قبل ناظرینِ نگار کو معلوم ہوچکا ہے کہ ہمارے صوبۂ متحدہ میں گورنمنٹ نے اُردو ہندی زبانوں کی خدمت کے لئے ایک اکاڈیمی قائم کی ہے اور خزانۂ حکومت سے سالانہ معقول امداد اس کو ملتی ہے، اس کا نظام کیا ہے، اور اکاڈیمی کیا تدابیر خدمت زبان کے لئے اختیار کر رہی ہے۔ اس کی تفصیل یا اس پر تنقید کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں۔ فی الحال میں ایک اور مسئلہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ جسکو ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔

اکاڈیمی کے دستور اساسی و نظم عمل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک جریدہ ایسے لٹریچر کے ساتھ پیش کیا جائے جو ایک طرف حقیقی معنے میں اکاڈیمی کی شہرت و وقار کو قائم رکھنے والا ہو اور دوسری طرف واقعی خدمت زبان اس سے مقصود ہو۔ چنانچہ اب قیام اکاڈیمی کے تقریباً چار سال کے بعد یہ تحریک بروئے کار آرہی ہے اور ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء وہاں سے ہو رہا ہے لیکن قبل اسکے کہ وہ جاری ہو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعد اشاعت، حدود تنقید کو تنگ کرنے کے لئے، قبل اشاعت ہی ان مشوروں کو پیش کردیا جائے، جو اپنی توقعات کے لحاظ سے ہم پیش کرسکتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ جب سے اُردو ہندی زبان کی تفریق و نزاع شروع ہوئی ہے، اسوقت سے ایک خاص جماعت ارباب فکر کی ایسی پیدا ہوگئی ہے جو ان دونوں میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنیکی مدعی ہے اور جہاں تک اُردو انشا کا تعلق ہے وہ چاہتی ہے کہ اُسکو اس قدر سہل و آسان بنادیا جائے کہ غیر مسلم یا غیر عربی و فارسی داں حضرات بھی بغیر کسی تکلیف کے آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ تجویز یا نیت بظاہر نہایت خوشنما اور دلپذیر معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک نگاہ غائر اس تجویز میں چند در چند نقائص محسوس کرسکتی ہے۔ اچھا اب آئیے عملی نقطۂ نظر سے اس خیال کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ نتیجہ کس صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اگر اردو انشا کو سہل بنایا جائے، یعنی عربی فارسی الفاظ ترک کرکے عوام کی نہایت ہی آسان زبان استعمال کیجائے، تو اس کے معنے صرف یہ ہوں گے کہ اُردو میں جو کچھ لکھا جائے اسی ذہنیت کو سامنے رکھکر لکھا جائے جسے عوام کی ذہنیت کہتے ہیں۔ یعنی اُردو میں سوائے معمولی قصے کہانیوں، داستانوں، افسانوں اور بعض ابتدائی علوم کے مبادیات کے کسی اور سنجیدہ و دقیق مبحث پر گفتگو نہ کیجائے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہئیے کہ اُردو بولنے اور لکھنے والی جماعت کو جس میں عنصر غالب مسلمانوں کا سمجھا جاتا ہے، مطلقاً تربیت ذہن و دماغ کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو ہمیشہ سطحیات میں مبتلا رکھنا چاہئے۔

تاکہ وہ بدستور جاہل بنے رہیں۔ اور اُن میں دقیق مسائل پر سوچنے اور خود اپنے اندر ذہن خلاق پیدا کرنے کی اہلیت نہ پائی جائے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ میں اس نتیجہ پر کیونکر پہونچا، لیکن ادنیٰ تامل سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خیال کی بلندی و دقت از خود زبان کو بلند و دقیق بنا دیتی ہے۔ اگر ہم زندگی کے نہایت معمولی روز کے واقعات بیان کریں تو آسان زبان کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم علم الحیات، نفسیات وغیرہ دیگر علوم دقیقہ سے بحث کریں گے۔ یا خود انشاء کے اندر نازک خیالی اور بلندیٔ تخیل سے کام لیکر زبان کو معانی جدیدہ، اور نکات نادرہ سے آشنا کرنا چاہیں گے تو زبان خود دشوار ہو جائے گی۔ اور ہم مجبور ہونگے کہ عربی فارسی کے الفاظ اور ان کے ترکیبی فقروں سے کام لیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر موضوع کے لئے ایک مخصوص زبان ہوا کرتی ہے، جو زبان ہم ایک افسانہ میں استعمال کرتے ہیں، کیا وہ نفسیات کے کسی مضمون کے لئے مناسب ہو سکتی ہے، کیا جس زبان میں ہم مذہبی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، وہ ایک سیاسی خطیب کے لئے موزوں ہے۔ الغرض اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معانی و مطالب کے اشکال کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی اشکال بڑھتا ہے اور اس لئے یہ مشورہ دینا کہ اردو کو نہایت سہل اور حد درجہ عوام پسند بنا دیا جائے۔ یہی معنی رکھتا ہے کہ اسکو علمی بلند زبان بنانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

اس نوع کا مشورہ دینے والے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مسلمانوں کا ہے، جو فارسی عربی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا اور جس نے اپنے گہوارہ ہی میں انگریزی ماحول کو دیکھا دوسرا گروہ ہندوؤں کا ہے، جو اردو زبان میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کیا معنے یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اردو رسم الخط قائم رہے۔ اگر ہندوؤں کی یہ ذہنیت صرف اس بناء پر ہوتی کہ اُن کو عربی فارسی سے قدرتاً کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ تو وہ زیادہ قابل الزام نہ تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اس تحریک میں سیاسی غرض پنہاں ہے۔ اور وہ ہندی کو ترقی دینے کیلئے جنگ کے ان تمام اصول سے کام لے رہے ہیں۔ جو حصول مدعا کے لئے کسی نہ کسی نہج سے مفید ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے زیادہ وقت نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ دس سال کے اندر ہندی لٹریچر نے جو صورت اختیار کی ہے، وہ ایک ایسی قوی شہادت ہے، جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو جماعت کے سامنے اردو زبان کو سہل بنانے کی کوشش میں دونوں جماعتوں کا اتحاد خیال و زبان مقصود ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ وہ ہندی میں بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے یعنی جس طرح وہ اردو کو عربی و فارسی کے الفاظ سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ ہندی کو بھی سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے ناآشنا رکھتے، لیکن کس قدر حیرت ہے کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنی زبان کی خصوصیات کو ترک کرکے اس کو ہندوستانی زبان بناؤ، لیکن دوسری طرف جسوقت ہندی زبان کا مسئلہ اُنکے سامنے آتا ہے۔ تو وہ کوئی دقیقہ اسکو دشوار بنانے کی کوشش میں نہیں اُٹھا رکھتے اور اُسکو ہندوستانی زبان بنانے کے بجائے دیوبانی بنانے میں مطلقاً کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اول اول جسوقت اردو ہندی کی نزاع شروع ہوئی تو دنیا کو بتایا گیا کہ یہ صرف رسم الخط کی تبدیلی ہے اور انشا کے لحاظ سے ہندی میں اردو سے کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن بعد کو رفتہ رفتہ حجاب اٹھتا گیا

اور یہ حقیقت آخر کار ظاہر ہو کر رہی کہ جس چیز کو صرف رسم الخط کا امتیاز کہا جاتا تھا، اس میں تینوں کا کھوٹ شامل تھا، اور وہ امتیاز حقیقتاً مذاہب کا اختلاف تھا، تمدن و معاشرت کا اختلاف تھا، اور اس عصبیت کا اختلاف تھا جو ایک مسلمان کے دل سے تو محو ہو سکتی ہے، لیکن ایک ہندو جو مسلمان کو ہندوستان کا غیر مستحق باشندہ سمجھتا ہے کبھی اس سے منفک نظر نہیں آسکتا۔

پھر آج ہندی کے رسالوں کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان کو سہل بنانے کا درس دینے والے، خود ہندی زبان کو مسلمانوں کے لئے کس درجہ ناقابل فہم معمہ بناتے جاتے ہیں۔ اور اردو کے وہ معمولی الفاظ بھی جو حقیقتاً سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت رکھتے ہیں، کس طرح ترک کئے جا رہے ہیں۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ کیا صداقت اسی طرز عمل کی مقتضی ہے اور کیا دونوں قوموں کو متحد دیکھنے کی آرزو اسی طریق کار سے پوری ہو سکتی ہے۔

مجھ سے زیادہ دونوں قوموں کے اتحاد کا شاید ہی کوئی حامی ہو، لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کے لئے دونوں قوموں کو اپنی زبان کی خصوصیات بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ البتہ بجائے اسکے اگر اس امر کی تبلیغ کیجائے کہ دونوں جماعتیں دونوں زبانوں کا اتنا علم حاصل کریں کہ وہ ایکدوسرے کے علوم سے مستفید ہو سکیں تو بیشک میں اسکو ایک نتیجہ خیز بات کہہ سکتا ہوں۔ اسکے کوئی معنی نہیں کہ ہندو جماعت اردو کو تو تہی مایہ بنانیکی کوشش کرتی رہے اور ہندی کے باب میں وہ اس اصول کو ترک کر کے اختلاف زبان کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کرتی جائے۔

ہندو جماعت میں اول تو اردو کے انشاپرداز بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ فسانہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے، لیکن گزشتہ دس سال کے اندر انھوں نے جس قدر تغیر اپنی اردو میں پیدا کر لیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسٹر پریم چند اردو کے مشہور فسانہ نگار ہیں لیکن اب سے چند سال قبل کے افسانے ان کے دیکھئے اور پھر ان سے مقابلہ کیجئے ان کے موجودہ افسانوں کا تو معلوم ہوگا کہ زبان و خیال دونوں حیثیتوں سے ایک تغیر عظیم ان میں پایا جاتا ہے، اور وہ ذہنیت جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ نولکشور پریس کی طرف سے جو اردو کی ریڈریں تیار کی گئی ہیں ان کو ملاحظہ کیجئے کہ مسٹر پریم چند نے کس بیدردی کے ساتھ اردو کو ذبح کیا ہے اور خیال و زبان دونوں اعتبار سے اس میں کس قدر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اول اول جب یہ ریڈریں لکھی گئیں تو ان کی زبان کافی سادہ تھی۔ لیکن تھی اردو۔ مگر جب جناب پریم چند کے سامنے حک و اصلاح کیلئے آئیں تو انھوں نے کوئی دقیقہ انکی زبان کو مسخ کرنے کا اوٹھا نہ رکھا۔ یقیناً پریم چند صاحب اردو میں فسانہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں لیکن انکو اردو زبان کا ماہر یا صاحب نظر مصنف تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً نہیں سمجھ سکتے کہ اردو کی خصوصیات کیا ہیں، عربی فارسی ترکیبوں پر اسکی معنوی خوبی کا کسقدر انحصار ہے۔ اگر وہ عربی فارسی کے جاننے والے ہوتے، اگر وہ بجائے فسانوں کے علمی یا تنقیدی مضامین بھی لکھتے تو انکو معلوم ہوتا کہ اردو کو کسی طرح عربی فارسی سے بے نیاز نہیں بنایا جا سکتا جسطرح وہ خود اپنے ہندی مضامین کو سنسکرت کی ترکیبوں سے خالی نہیں کر سکتے۔ یہ میں نے اسلئے ظاہر کیا کہ اگر کوئی شخص جواب میں پریم چند صاحب کی انشا کو پیش کرے تو پہلے سے ہی اسکو میرا جواب بطور رفع دخل معلوم ہو جائے۔

اس قدر تمہید و تفصیل کے بعد میں اب ہندوستانی اکاڈمی، اسکے ممبران، اور رسالہ کے اڈیٹران سے خطاب کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکاڈیمی کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ اردو کا جاری ہونیوالا ہے، وہ کس ذہنیت کے ماتحت شائع ہوگا اور ملک و قوم کو اسکی طرف سے کیا توقعات قائم کرنا چاہئیں۔

چونکہ خود مجھے بھی اکاڈمی کے ممبر ہونے کی عزت حاصل ہو چکی ہے اور میں اس ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں جو زبان کے متعلق وہاں کی فضا میں پائی جاتی ہے۔ اسلئے مجھے اندیشہ ہے کہ زیر تجویز رسالہ کہیں غلط اُصول پر نہ جاری کیا جائے اور مبادا وہ بھی سیاسی اغراض کا شکار ہو جائے۔ اس اندیشہ کی تصدیق اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مسٹر دیا نرائن نگم سے بواسطہ جناب مشیر احمد صاحب علوی مجھ تک پہونچی ہے کہ اس رسالہ کا نام صرف ہندوستانی ہوگا اور اسپر بجائے سہ ماہی رسالہ کے "تہ ماہی رسالہ" درج کیا جائے گا (معلوم نہیں ہے تہ ماہی لکھنے میں صحیح رسم خط استعمال کیا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ اسکو تاہی لکھیں) ۔ مجھے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ تجویز پروفیسر صدیقی صاحب کی ہے۔ میں پروفیسر صدیقی سے واقف نہیں ہوں اور غالباً میری طرح کوئی اور بھی اُنکی خدمت زبان کے کارناموں سے آگاہ نہیں ہے۔ لیکن پروفیسر صدیقی کی طرف سے اس تجویز کا پیش ہونا محض اسوجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں (قوم کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی، جبکہ معلوم ہے کہ وہ اپنے مصالح مقامی کے لحاظ سے کبھی اسکی جرأت نہ کر سکتے تھے کہ ارباب اکاڈمی کے ہندو عنصر کے خلاف مزاج کوئی تجویز پیش کر سکیں مسلمان لاکھ بیوقوف سہی لیکن زمانہ نے اُن کو اتنا باخبر ضرور کر دیا ہے کہ وہ اس نوع کے تحریک و تجویز کی اہمیت اور اُسکی شاطرانہ چال کو نہ سمجھ سکیں۔

حکومت کی طرف سے اکاڈمی کو جو امداد ملتی ہے وہ صرف ترقی زبان کے لئے ملتی ہے اور اس مقصد کے تحت میں کوئی اور غرض شامل نہیں ہے۔ پھر اُصولاً صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُردو کی ترقی کیونکر ممکن ہے۔ اگر سہ ماہی کو تاہی کرنا علامت ترقی میں شامل ہے صرف اسوجہ سے کہ اسطرح فارسی لفظ سہ مجوہوتا ہے تو ہندی رسالہ میں بجائے کسی اور سنسکرت ترکیب کے سہ ماہی لکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہاں سے سنسکرت عنصر کم کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندی رسالہ میں تو وہ تمام اغلاق روا رکھا جائے جسکو یقیناً اکثر ہندو حضرات بھی نہیں پسند کر سکتے لیکن اُردو سے اُن معمولی عربی فارسی کی ترکیبوں کو بھی نکالدیا جائے جو ہندو زبانوں پر بھی عرصہ سے رائج چلی آتی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ وطن کے بجائے اردو میں جنم بھوم کیوں لکھا جائے، زیور کی جگہ بھوشن کو کیوں رائج کیا جائے، موسم و وقت کے بجائے سمے کا کیوں استعمال ہو، لیکن کی جگہ پرنتو کیوں لکھا جائے، کیا کوئی ہندو ایسا ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ وطن، زیور، موسم، اور لیکن کا مفہوم نہیں جانتا اور روز کی زندگی میں وہ بجائے ان الفاظ کے جنم بھوم، بھوشن، سمے اور پرنتو کا استعمال کرتا ہو، پھر جب مقصود یہ ہے کہ زبان کو سہل الفہم بنایا جائے تو وہ الفاظ جاریہ کو قائم رکھنے سے حاصل ہوتا ہے یا اُن میں غیر مانوس تبدیلی کرنے سے؟ میں پوچھتا ہوں کہ سہ ماہی میں کیا خرابی یا اشکال ہے جو اُسکو تاہی بنایا جا رہا ہے اور اس سے مدعا کیا ہے؟

بہر حال میں ارباب اکاڈمی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُردو رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے ارباب نظم و نسق میں سے تاہی ذہنیت رکھنے والے عناصر کو بالکل علیحدہ کر دیں، کیونکہ یہ لوگ یقیناً اُردو کے بہی خواہ نہیں ہیں اور اسکو انھیں خصوصیات کے ساتھ جاری کریں جو اس کو عام سطح سے بلند کرنیوالی ہے۔ یقیناً اس میں عام سطحی افسانوں کے علاوہ علمی و تنقیدی مضامین بھی درج کئے جائینگے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مضامین کی جو زبان ہوگی وہ کسیطرح تاہی کی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی، اور اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا ضرورتاً و مجبوراً استعمال یقیناً ہوگا۔ پھر جب اس کوشش کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا تو میں حیران ہوں کہ صرف سہ ماہی کو تاہی کر دینے سے جذبہ اصلاح کیونکر پورا ہو سکتا ہے البتہ اگر وہ اکاڈمی کے رسالہ کو صرف بچوں کا کھیل اور ادنے درجہ کے معمولی و سطحی مضامین کا مجموعہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے کوئی واسطہ

نہیں، خواہ اسکا نام تباہی رکھیں یا ٹری ماسی پتہ کا، البتہ اسوقت یہ مطالبہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ کیا حکومت کی امداد کا مصرف صحیح بھی ہے اور کیا جو رقم اُردو زبان کی ترقی کے لئے دیجا رہی ہے، اُس کو اسطرح فی الحقیقت ہندی زبان کی اُستواری میں صرف نہیں کیا جاتا

جو کچھ مینے عرض کیا وہ بالکل خلوص نیت لیکن پوری آزادیِ رائے کے ساتھ ظاہر کیا ہے، لیکن اگر اسکو عصبیت کے رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے، تو میں باوجود اپنی اس تمام حریت رائے کے جو مذاہب، مسالک اور ملل و اقوام کے باب میں ہر شخص پر ظاہر ہے اُسکو عصبیت تسلیم کرنے پر بھی آمادہ ہوجاؤں گا، اور کبھی اسکو گوارا نہ کرونگا کہ اُردو زبان کو سیاسی اغراض کا نشانہ بنایا جائے اور اسکو ترقی دینے کے بجائے مسمار و منہدم کیا جائے۔

گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لئے تمام تمہیدی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور ہندوستان کے سیاسی اضطراب کے انحطاط سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ جو فضا وہاں پیدا ہو رہی ہے وہ شاید یہاں کی حقیقی امیدوں کے خلاف نہیں ہے۔

اگر آزادیِ کامل کا مطالبہ بہ مرگِ شِ بگیر کے اُصول پر صرف ڈومی نین ہوم رول کے حصول کو متعین کرنے کیلئے نہ تھا۔ تو ہمیں اسکی تو پر افسوس ہے، جبکہ آثار اول اول اسیوقت پیدا ہوچلے تھے جب مہاتما گاندھی نے گفتگوئے صلح کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا۔

یہ امر بڑی حد تک یقینی ہے کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کو ہوم رول دیئے جانے کی تجویز پاس ہوجائے گی، جو رفتہ رفتہ تدریج کے ساتھ تکمیل کی حد تک پہونچے گی۔ ہندوستان کی ماڈریٹ جماعت جسکو کانفرنس میں پوری نمایندگی حاصل ہے، اس عطیہ کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کرے گی۔ اور اسے قبول کرنا چاہیئے، لیکن میرا خیال ہو کہ آخر کار آزادیِ کامل کے طلبگار بھی اس سے انحراف نہ کرینگے اور جنگ زرگری کے اُصول پر تنہائی میں باہمد گر بغلگیر ہوکر اپنی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک باد کہیں گے۔

رہ گیا مسلمانوں کا مسئلہ، سو وہ بھی ایسا زیادہ "عقدۂ مشکل" نہیں ہے۔ ہر قوم اپنا مستقبل خود بناتی ہے اور خود ہی بگاڑتی ہے۔ چونکہ ہندو مسلمان ابھی تک ایک قومیت کے قائل نہیں ہیں اور دونوں کے درمیان افتراق کا فاصلہ برابر بڑھتا ہی جارہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ دونوں قومیں اپنے مقاصد و اغراض بالکل جدا جدا رکھتی ہیں اور اسی خیال کے ماتحت دستور العمل بنارہی ہیں؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ دونوں کے حالات پر غور کرو اور سمجھ لو کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ فطرت ہمدردی کے جذبے سے بالکل معرّا ہے، اسوقت تک وہ خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ کرچکی ہے اور آیندہ اسی طرح کرتی رہیگی، اس لئے اگر ہندوستان کی بھی کوئی ضعیف قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جائے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ مخصوص اسباب کے ماتحت مخصوص نتیجہ پیدا ہونا ضروری ہے خواہ وہ کتنے ہی زبردست الہامی مذہب کے پیرو ہونے کا مدعی کیوں نہ ہو

جنوری سنہ ۳۱ء کا نگار کیا ہوگا؟

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آیندہ اشاعت میں اس کا اظہار کیا جائیگا۔ چنانچہ آج ہم بتانا چاہتے ہیں کہ جنوری سنہ ۳۱ء کا نگار کیا چیز ہوگا اور اس کو نہ حاصل کرنا کس چیز کو ہاتھ سے دیدینا ہے۔

جنوری سنہ ۳۱ء کا نگار۔ رسالہ نہیں ہوگا، بلکہ کتاب ہوگا اور ایک ایسے موضوع پر جو اس سے قبل اُردو زبان میں آیا ہی نہیں۔ جس طرح ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر ایک شخص کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں، اسی طرح آپ ایک شخص کے سوادِ خط کو دیکھکر اسکی سیرت کا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ فن بہت ترقی یافتہ فن ہے جسکی طرف ایشیا میں مطلق توجہ نہیں کی گئی۔

ہماری خواہش پر ایک صاحب نے جو اس فن کے ماہر ہیں اور عرصہ سے اس مسئلہ میں تحقیق و تفتیش کر رہے تھے ایک کتاب مرتب کی ہے، جس میں اس فن کی تاریخ، اور اس کے اُصول درج کر کے اقسام تحریر سے بحث کی ہے، اور مثالوں سے نمونوں سے دستخطوں سے بتایا گیا ہے کہ ہم ایک شخص کا خط دیکھکر کیونکر اس کی سیرت اور اس کے مستقبل کو معلوم کرسکتے ہیں۔ اس علم کا نام فراست التحریر ہے۔ اور اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو تکمیل کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ایک طویل فسانہ مولانا نیاز فتحپوری کا ہوگا جس کا عنوان یہ ہے:۔

داستانِ حسن و عشق کا وقتِ خونیں

اور

جلوۂ بے محابا کی ایک قاتل رات

دوسرا افسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کا خواب و خیال کے عنوان سے ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک اور معرکۃ الآرا بحث علماء ہند کے اُن فتاویٰ پر ہوگی جو مولانا نیاز کے ایک استفتاء پر اُن کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

وہ حضرات جن کا چندہ نگار کا ختم ہو رہا ہے (خواہ وہ نومبر میں ختم ہو یا دسمبر میں) خریدار رہنے کی صورت میں حسب ذیل رعایت کے مستحق ہونگے۔ تذکرۂ خندۂ گل۔ شاعر کا انجام نصف قیمت پر دیئے جائینگے اور "سائنس کے عجائب" مفت۔ اسی کے ساتھ رسالہ جن کے گزشتہ پرچے مارچ سنہ ۳۰ء سے آیندہ تک بجائے ۴ر فی پرچہ کے ۲ر فی پرچہ کے حساب سے دئے جائیں گے۔ جو حضرات یہ تمام چیزیں طلب کرینگے اُن سے محصولڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

"مینجر نگار"

قرآن کے لطائفِ ادبیہ

(مسلسل)

گنج قارون

گنج قارون کہ فرومی رود از قہر ہنوز
خواندہ باشی تو کہ از غیرت درویشان است　　(حافظ)

سورۂ قصص میں قارون کا واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، یہاں پر اس واقعہ کے تین اجزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، "گنج قارون" "فرومی رود از قہر" اور "از غیرت درویشاں" تینوں کے متعلق قرآن میں مفصلہ ذیل آیات ہیں،

واٰتینٰہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ	اور ہمنے اسکو (قارون) اسقدر خزانے دئے تھے کہ انکی کنجیاں کئی کئی زور آور آدمیوں کو گرانبار کردیتی تھیں۔
فخسفنا بہ وبدارہ الارض	اور ہمنے اس قارون کو اور اُسکے محلسرا کو زمین میں دھنسا دیا
وابتغ فی ما اٰتٰک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک	اور تجھکو خدا نے جتنا دیا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ مت فراموش کر اور جس طرح خدا تعالےٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی احسان کر۔

اب معنی میں کوئی پیچیدگی نہیں معلوم ہوتی، حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ فقیروں کی غیرت ایسی ہے، کہ گنج قارون زمین میں برابر دھنستا چلا جارہا ہے۔ ہرچند قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں کہ وہ ابھی تک دھنستا جاتا ہے۔ بلکہ صرف ماضی کا صیغہ "خسفنا" استعمال ہوا ہے، لیکن عربی زبان میں صیغۂ ماضی حال اور استقبال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اگر علماء، اسلامی روایات سے اسکی تصدیق کردیں کہ قارون ہنوز زمین میں دھنسا جارہا ہے، تو لفظ قرآن میں اسکی گنجائش موجود ہے، ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ متاخرین کا اضافہ ہے، اور حافظ صاحب نے اپنے شعر میں قرآنی واقعہ کو اسی عامیانہ وہم کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اعجاز موسوی

موسیٰؑ کے ساتھ خضرؑ کا واقعہ متلازم ہے، اور شعرا نے اکثر کمالات موسیٰؑ کے سلسلہ میں خضرؑ کا بھی تذکرہ کیا ہے، مگر چونکہ میں "خضرؑ" پر آئندہ پوری بحث کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اشعار کے اسی پہلو پر روشنی ڈالوں گا جس میں صرف موسیٰؑ کا تذکرہ ہے۔

بہ ہر قصبے ز آتش گل شاخ شگوفہ (جامی) از جیب بروں کردہ چو موسےٰ ید بیضا است

آں ہمہ شعبدہا عقل کہ می کرد آنجا (حافظ) سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

حزیں از خامہ ات خیزد سرش وادی ایمن (حزیں) تجلی طور می سازد نئے آتش نوا ہا را

جائے کہ برقص آید طور از "ارنی" گفتن (حزیں) مستان لقا دانند بیہوشی موسیٰ را

جامی نے اپنی ایک غزل میں تسلسل مضامین کا لحاظ رکھتے ہوئے، گلگشت چمن اور نظارہ خیاباں کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک طرف غنچہ نے برقع اُتار دیا ہے، تو دوسری طرف نرگس ہمہ تن چشم بنکر محو تماشا ہے، گلاب کی ہری ہری ٹہنیوں میں جو "سوزن زنگار" ہیں وہ گویا میرے دل سے وہ کانٹا نکال رہے ہیں جو غم سے میرے جگر میں ٹوٹ کر رہگیا ہے۔

تا گل تتق غنچہ ز رخسار کشادہ است		نرگس ہمہ تن چشم شدہ بہر تماشاست
شبرہ کشد از سوزن زنگار گرفتہ		خارے کہ شکستہ ز غم اندر جگر ماست

غضب کا زور بیان ہے اسکے بعد فرماتے ہیں۔

بہر قصبے ز آتش گل شاخ شگوفہ		از جیب بروں کردہ چو موسےٰ ید بیضاست

یعنی شاخ شگوفہ، کھلے ہوئے (گلاب کے) پھولوں سے لپٹ رہی ہے، اور اسکا مقصد ہے کہ "آتش گل" سے کچھ لے، شاخ شگوفہ کا گلاب کے پھولوں پر ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر گرنا ایسا منظر پیش کر رہا ہے، جیسے موسیٰ کے ید بیضا کے مبارک بال گریباں سے نکلنے کے بعد فوراً چمک اوٹھے ہوں۔

یہاں پر اس لطیف خیال کے ساتھ جسے عمدہ سے عمدہ محاسن ادب کا جزو کہہ سکتے ہیں جامی نے قرآن کے بیان کردہ واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور تلمیح کے لئے قرآنی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، جب حضرت موسیٰؑ اپنی بیوی کے ساتھ وادی ایمن میں پہونچے تو آگ کی ضرورت ہوئی۔

اذ رأی ناراً فقال لاھلہ امکثوا انی		جبکہ اُنھوں نے ایک آگ دیکھی، سو اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم
اٰنست ناراً لعلی اٰتیکم منھا بقبسٍ او		ٹھیرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمہارے
اجد علی النار ھدی (طٰہٰ)		پاس کوئی شعلہ لاؤں، یا آگ کے پاس رستہ کا پتہ مجھکو ملجائے۔

مولانا جامی نے جو لفظ "قبس" اپنے شعر میں استعمال کیا ہے، وہ قرآن سے مستعار ہے، اور بالکل اسی معنی میں جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، یعنی گل بہ منزلہ آتش ہے، اور شاخ شگوفہ کو اس سے استفادہ کرتا ہے، اسی طرح جسطرح حضرت موسیٰؑ وادیٔ ایمن میں آگ دیکھکر "اتیکم منہا بقبس" فرماتے ہیں، دوسرے مصرعہ میں قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے، جن میں حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا کا تذکرہ ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ واقعہ سورۂ طٰہٰ، اور قصص میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

واضمم یدك الی جناحك تخرج بیضاء من غیر سوء ۔ اور تم اپنا ہاتھ بغل میں دے لو، وہ بلا کسی عیب کے روشن ہو کر نکلے گا۔

دوسرے شعر (۲) میں حافظ نے جو تلمیح قرآنی پیش کیا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے قابل جرح ہے۔

آں ہمہ شعبدہا عقل کہ می کرد آنجا ۔ سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

یعنی لطائف روحانیہ اور اعجازات ملکوتیہ کے نزدیک عقل کی رد و قدح وہی معنی رکھتی ہے، جو عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے سامنے سامری کی، قرآن مجید میں جہاں سامری کا بیان ہے وہاں عجلاً جسداً لہ خوار آیا ہے اور اس نے اگر موسیٰ کی مخالفت کی تو یہی کہ انکی غیبت میں بنی اسرائیل سے بچھڑا کی پرستش کرائی، قد فتنا قومك من بعدك واضلھم السامری یہ بیضا اور موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون کے ساحروں نے البتہ شعبدے کئے تھے۔

قالوا ان ھذان لسحران یریدان ان یخرجکم ۔ کہنے لگے کہ بیشک دو نو جادوگر ہیں، انکا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو سے

من ارضکم بسحرہما ویذھبا بطریقتکم ۔ تمکو تمہاری سرزمین سے نکالدیں اور تمہارے عمدہ طریقہ کا دفتر ہی اُٹھا دیں

المثلی + فاجمعوا کیدکم ثم ائتوا صفا ۔ تو اب تم ملکر اپنی تدبیر کا انتظام کرو، اور صفیں آراستہ کرو،

اس کے بعد انکے شعبدے اور نیرنجات کا تذکرہ ہے۔ فاذا حبالھم وعصیھم یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ (پس یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں انکی نظر بندی سے موسیٰ کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں، جیسے چلتی دوڑتی ہوں) تلمیح قرآنی سے انکار نہیں لیکن "سامری پیش عصا و ید بیضا شعبدہا می کرد" کا واقعہ قرآن میں نہیں، سامری کی مخالفت اور اس کا مردود بارگاہ نبوت ہونا اسوقت کا واقعہ ہے، جب حضرت موسیٰ طور پر تشریف لے گئے، ظاہر ہے کہ اس کے قبل آپ کو معجزات عصا و ید بیضا عطا ہو چکے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ "ید بیضا اور عصا" سے خود ذات موسوی مراد ہے، تو بھی کہا جا سکتا ہے، کہ موسیٰ کے مقابلہ میں سامری نے تو نیرنجات سحر دکھائے نہ تھے، اور ید بیضا اور عصا سے ذات موسوی مراد لینے پر بھی "ید بیضا اور عصا" سے "شعبدۂ سامری" کو جدا نہیں کر سکتے۔

شیخ علی حزیں نے اپنے پہلے شعر میں قرآن مجید کے دو بیان کردہ واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، "شرر وادیٔ ایمن" اور "تجلی طور می سازد" دو فقرے قابل تشریح ہیں۔

فلما اتیھا نودی من شاطئ الواد ۔ سو وہ جب اس آگ کے پاس پہونچے تو ان کو اس میدان کے

الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یا موسیٰ انی انا اللہ رب العالمین (قصص) — داہنی جانب سے اس مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی میں اللہ رب العالمین ہوں،

یہ ہے سروش وادی ایمن،

فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا و خر موسیٰ صعقا (اعراف) — پس انکے رب نے اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اسکے پرخچے اُڑا دئے اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر گئے،

اور یہ ہے "تجلی طور می سازد"۔

اب حزیں کے شعر کا معنی صاف ہے، فرماتے ہیں، میرے قلم سے جو کچھ نکل رہا ہے، وہ گویا نطق الہامی ہے، اور اس گرانی الہام کے باعث میرا قلم طور کی طرح ٹوٹ رہا ہے "جعلہ دکا" یا میرا قلم طور کی طرح محیط انوار الٰہی ہو رہا ہے۔

حزیں کے دوسرے شعر میں بھی دو فقرے قرآنی کے واقعات سے مستعار ہیں "طرازارنی گفتن بر قصر آید" اور "بیہوشی موسیٰ" موسیٰ نے کہا تھا "رب ارنی انظر الیک" لیکن تجلی کی تاب نہ لا سکے، اور بیہوش ہو گئے "خر موسیٰ صعقا" شعر کا مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب ایسا جمال بدیع رکھتا ہے کہ اگر اس کا پرتو طور پر پڑ جائے تو وہ بھی رقص میں آ جاوے، اور یہ اشارہ ہے قرآنی آیت "جعلہ دکا" کی طرف) اور اُس کے جمال کا نظارہ کرنیوالے سمجھ جائیں کہ موسیٰ کی بیہوشی کی حقیقت کیا تھی؟

واقعات یوسفی

حضرت یوسف کے جزدی واقعات اس کثرت سے شعرائے فارس کے کلام میں پائے جاتے ہیں کہ اُن کے یکجا کرنے سے حضرت یوسف کی پوری زندگی مرتب ہو سکتی ہے، فارسی غزلیات کے اندر جو تلمیحات قرآنیہ پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تو سورہ یوسف سے مستفاد ہیں۔

نہ یوسفے بہ سفر رفت از پدر گریاں — نہ ور سفر بہ سعادت رسید ملک و ظفر (رومی)

کند بر تخت عزت جا چو از تن جاں بروں آید — بہ شاہی میرسد یوسف چوں از زنداں بروں آید (حزیں)

مرا دل گفت گنج فقر داری در جہاں منگر — نسیم مصر دیدہ گیں چہ باید قحط کنعانش (خاقانی)

من چو یعقوب زبس گریہ شدم دیدہ سفید — آخر آں یوسف گم گشتہ بہ زنداں چو نست (خسرو)

یعقوب را دو دیدہ ز حسرت سفید شد — آوازہ ز مصر بہ کنعاں نمی رسد (حافظ)

دیر می جنبد بشیرا اے باد بر کنعاں گزر — مژدۂ پیراہن یوسف ببر یعقوب را (جامی)

چہ سود قافلہ مصر حسن یوسف — متاع عشق چو در کارواں کنعان است (جامی)

گریہ را ذوقست کاز تہمتے باعث نشست — ورنہ یوسف در گریباں است یعقوب مرا (عرفی)

بہ کنعاں چشم پاکے در سراغ خویشتن دارد — نمی ماند بہ کف پیراہن یوسف زلیخا را (حزیں)

قرآن مجید میں جسطرح یوسف کی ابتدائے عمر سے عہد آخر تک کے حالات زندگی ایک جگہ مرقوم ہیں اسقدر

کسی پیغمبر کے حالات ترتیب وار نہیں ملتے، شعرائے فارس نے تقریباً قرآنی واقعات کے تمام اجزار کی طرف اشارے کئے ہیں، بھائیوں کے ساتھ جنگل میں جانا، قافلہ مصر، غلامی، فتنۂ عشق، زنداں، آزادی، جاہ و مرتبت، قحط تمام واقعات فارسی شعرا کے یہاں غیر مربوط طریقہ سے غزلیات کے اندر ملتے ہیں، چنانچہ امثلہ بالاسے یہ نظریہ ثابت ہو جاتا ہے،

رومی اور حزیں کے خیالات ایک ہی واقعہ پر مبنی ہیں، رومی کہتے ہیں کہ حضرت یوسف باپ سے روتے ہوئے جُدا ہوئے تو حکومت پائی، اس لئے انسان کو چاہیئے کہ عالم مادہ سے عالم روح کا سفر اختیار کرے، حزیں کا بھی یہی مطلب ہے، لیکن رومی کے پہلے اور حزیں کے دوسرے مصرعہ میں دو واقعات قرآنی کی طرف اشارہ ہے، رومی نے ابتدائے عمر کا واقعہ بیان کیا ہے، جب بھائیوں نے قافلہ مصر کے ہات یوسفؑ کو بیچ ڈالا، وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ حزیں نے حیات یوسفی کے آخری دور کی طرف اشارہ کیا ہے، جب قید خانہ سے چھوٹ کر دربار شاہی میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے اور آخر میں بادشاہ ہو گئے۔ وقال الملك ائتونی بہٖ استخلصہ لنفسی فلما کلمہ، قال انک الیوم لدینا مکین امین۔ معنی کے اعتبار سے دونوں میں ایک ہی خیال وا کیا گیا ہے، خاقانی نے بھی رومی سے ملتا ہوا خیال ظاہر کیا ہے۔ اور یہ یقیناً اُسوقت کا کلام ہے، جب دربار سے تعلق ترک کر دیا تھا، کہتے ہیں کہ میرے دل میں گنج فقر ہے، یعنی قناعت ہے، اس لئے مجھے دنیا میں تلاش مال و دولت کی ضرورت نہیں، اور میرے گنج فقر کی یہی مثال ہے۔ جیسے "نعیم مصر" کہ اُسکے رہتے ہوئے اہل کنعاں (برادران یوسف) قحط کی مصیبت میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے، یہ اشارہ ہے قرآن کی آیت "الا ترون انی اوف الکیل وانا خیر المنزلین" کی طرف حضرت یوسف اپنے بھائیوں کو غلہ دیکر کہتے ہیں کہ اگلی مرتبہ آنا تو اپنے چھوٹے بھائی (ابن یامین) کو ساتھ لانا کیا نہیں دیکھتے کہ میں غلہ پورا دیتا ہوں، اور مہمان نواز ہوں، خسرو اور حافظ نے "وابیضت عیناہ من الحزن" کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ معانی میں اختلاف ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ حضرت یعقوب کی طرح میری آنکھیں سفید ہو گئیں، نہیں معلوم میرا محبوب جسکے فراق میں، میں نابینا ہو گیا قید خانہ میں کسطرح ہے، حافظ کہتے ہیں میری آنکھیں حضرت یعقوب کی طرح حسرت دیدار میں سفید ہو گئیں، لیکن تعجب ہے کہ یوسفؑ مصر میں بادشاہ ہیں اور اسکی خبر کنعاں میں نہیں پہونچتی، جامی نے پہلے شعر میں قرآن مجید کی آیت "فلما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف" اور "فلما ان جاء البشیر القٰہ علی وجھہ فارتد بصیرا" کی طرف اشارہ کیا ہے، حضرت یوسفؑ نے پیراہن دیکر بھائیوں کو بھیجا ہے۔ کہ باپ کو خوشخبری دیں لیکن انلوگوں کے پہونچنے سے قبل حضرت یعقوب فرماتے ہیں انی لاجد ریح یوسف مجھے حضرت یوسُف کی خوشبو آرہی ہے۔ دوسرے شعر میں جامی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ "قافلہ مصر" اسوجہ سے "حسن یوسفی" سے مستفید نہ ہو سکا، کہ عشق تو کنعان میں تھا یعنی اہل قافلہ حسن ظاہری کے محاسن جانتے تھے، اور یعقوب اوصاف باطنی سے واقف تھے، اس لئے "حسن یوسفی" سے "تاجران مصر" کے اندر کوئی عشقیہ کیفیت نہیں پیدا ہوئی، یہاں سے وہ معرکتہ الآرا مسئلہ طے پا سکتا ہے، کہ قرآن مجید

نے جمال یوسفی کو اعجاز کی صورت میں پیش کیا ہے یا نہیں، جامی کے اس شعر سے جمال یوسف کے متعلق وہ ہیجان پیدا کرنوالی بحث جو نگار میں شائع ہو چکی ہے، ایک حد تک پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے، چونکہ مولانا جامی کہتے ہیں کہ جمال یوسفی سے (جو عام سطح حسن سے بالاتر نہ تھا یا جسے اعجاز نہیں کہہ سکتے) عشق کی اثیری کیفیت کے فقدان کے باعث اہل قافلہ کو کوئی فائدہ نہ پہونچا یعنی مولانا جامی کے نزدیک حسن یوسف میں ایسا ظاہری بدرع نہ تھا، جسکے باعث قافلہ کو کوئی گہرا اثر ہوتا بلکہ اثر پذیری کے لئے، "عشق کنعانی" یا بہ الفاظ دیگر حضرت یعقوب کے التہاب عشقیہ کی ضرورت بتاتے ہیں، جو یقیناً حسن صورت پر مبنی نہ تھا بلکہ حسن معنی پر مبنی تھا۔[۵]

عرفی کہتے ہیں مجھے رونے میں لذت ملتی ہے، اس لئے روتا ہوں، ورنہ یعقوب کی طرح میں اپنے "یوسف" سے جدا نہیں ہوں، میرا یوسف میرے گریبان میں ہے۔ یہاں حضرت یعقوب پر ایک شاعرانہ تعریض بھی ہے وہ یہ کہ حضرت یعقوب ایک وقت فراق یوسفی میں "یا اسفی علی یوسف" (ہائے افسوس، یوسف) کہتے ہیں روتے روتے نابینا ہو جاتے ہیں، حتی تکون حرضاً او تکون من الھالکین اور پھر اسی دور فراق میں "انی لاجد ریح یوسف" کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے انھیں غم و حزن میں لذت ملتی تھی، اس لئے روتے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ فراق یوسفی ہے۔ اگر یوسف سے فراق ہی تھا تو "بوئے یوسف" کہاں سے محسوس کر رہے ہیں، حزیں کہتے ہیں زلیخا کے ہاتھ میں پیراہن یوسف نہ آسکا اسکی وجہ یہ تھی کہ یعقوب کا فیض باطن انکی نگہبانی کر رہا تھا، (استبقا الباب وقدت قمیصہ من دبر (اور دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور زلیخا نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھاڑ ڈالا-)

حضرت عیسیٰ کا احیائے موتیٰ و مایدہ سماء

شعرا نے "دم مسیح" کی اثر آفرینیوں کا بہت کثرت سے تذکرہ کیا ہے، چنانچہ ذیل کے اشعار سے یہ خیال واضح ہوتا ہے۔

لبت بہ خندہ مرا می کشد چہ بد بختم	کہ داد خوئے اجل بخت من مسیحا را	(عرفی)
با کہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگیں دل	کشت مارا و دم عیسیٰ مریم با اوست	(حافظ)
مرا چوں دعوت عیسیٰ است عید ہر زمانِ دل	دلم قربان عید فقر و گنج گاؤ قربانش	(خاقانی)

---

[۵] مولانا نیاز مدظلہ نے جمال یوسفی کا انکار کیا تھا تو صرف اس بنا پر کہ قرآن مجید نے اسے اعجاز نبوت کی صورت میں نہیں پیش کیا اور نہ جمالیات کسی الہامی مذہب کا موضوع ہو سکتی ہے، اس ضمن میں انھوں نے اس حدیث کی صحت کا انکار کر دیا تھا جس میں حسن یوسفی کے متعلق سرور کائنات نے اظہار خیال فرمایا ہے، مجھے (مولانا کے) اس آخری خیال سے اتفاق نہیں اور نہ مولانا کو اپنے نظریہ کی تائید میں اسکی ضرورت ہے، حسن یوسف کے متعلق صحیح حدیث ہے، لیکن بحث تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے اسے اس صورت میں نہیں پیش کیا جس صورت میں عام لوگوں نے خیال کر رکھا ہے، چنانچہ ایک مصری عالم ڈاکٹر زکی مبارک کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

عرفی اور حافظ کا خیال "احی الموتیٰ باذن اللہ" (آل عمران) پر مبنی ہے، (سورہ مایدہ میں اسکی تفصیل ہے) البتہ اسلوب بیان میں کچھ فرق ہے، عرفی کہتے ہیں میری بدبختی کی یہ انتہا ہو گئی کہ مسیح بھی میرے لئے باعث اجل بن رہا ہے، اس کا ایک "متبسم سحر آفریں" میرا شیرازۂ حیات منتشر کرنے کے لئے کافی ہے، حافظ کے بیان میں بالکل سادگی ہے، وہ کہتے ہیں میرا محبوب دم مسیح رکھتا ہے، لیکن باوجود اس کے اس نے میری جان لی، یہ ایک عجیب نکتہ ہے، خاقانی کہتے ہیں کہ فقر کی عید سے میرے اندر ایک ایسا نشاط باطن موجود ہے، کہ میں ہمیشہ دعوت عیسیٰ کا لطف اٹھا رہا ہوں، اور ایسی عید پر "گنج گاؤ" بھی قربان ہے، خاقانی نے پہلے مصرعہ میں سورہ مایدہ کی آیت ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیدا لاولنا و اٰخرنا و اٰیۃ منک (اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائے کہ وہ ہمارے لئے یعنی جو ہم میں اول ہیں اور جو بعد ہیں سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے، اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے)، کی طرف اشارہ کیا ہے خاقانی کے شعر میں لفظ "عید" بھی قرآن سے مستعار ہے۔

میرے پاس کلیات خاقانی کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ ہے، جسکی تاریخ کتابت سے پتہ چلتا ہے، عہد ظفر میں لکھی گئی ہے، اس میں خاقانی کے تمام فارسی قصائد ہیں، مرقومہ بالا شعر کی شرح میں حاشیہ پر لکھا ہوا ہے،

"و گنج گاؤ آنست کہ مردمے در بنی اسرائیل پوست گاؤ بہ دینارہائے زر پر کردہ، بہائے گاؤ دادہ بود، کما قولہ تعالےٰ اذ قال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ و بعضے گویند کہ "گنج گاؤ" آنست کہ فریدوں در اثنائے راہ در زمین کشت زار یافتہ بود۔"

شارح کا پہلا نظریہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، سورہ بقرہ میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، مندرجہ بالا آیت سے واقعہ کی ابتدا ہوتی ہے، اور ویریکم اٰیٰتہ لعلکم تعقلون تک ختم ہوا ہے، فریدوں نے "گنج گاؤ" نہیں پایا تھا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ یہ جمشید کا خزانہ تھا اور زمین کے اندر سونے چاندی کے بیل، بچھڑے، اور قسم قسم کے جانور تھے، بہرام گور نے اسے پایا اور کل فقیروں کو بانٹ دیا اور یہ نظریہ خاقانی کے فقرہ "گنج گاؤ قربانش" سے بھی پایہ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے، "قربان" سے یہاں ذبح گاؤ مراد نہیں بلکہ وہی فقرا اور غربا کے درمیان میں تقسیم مراد ہے،

حالات خضر[۱] پر دینیاتی اور صنمیاتی نظر

فارسی شعرا نے "خضر" کے متعلق بہت سی نکتہ سنجیاں کی ہیں چونکہ اسلامی دنیا میں بعض احادیث کی بنا پر سورہ کہف کے ایک واقعہ کو خضر ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس لئے اس مسئلہ میں فارسی شعرا کی تلمیحات قرآنیہ پر غور کرنے سے پہلے

---

[۱] "خضر" کی بحث نگار میں ایک مرتبہ آچکی ہے، اور حضرت مولانا نیاز صاحب مدظلہ، اور حضرت مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کے باہمی نزاع کفر و ایمان کی تاریخ بھی اسی مسئلہ سے شروع ہوئی، اور میں نے "شبیہ نیاز" (جو اخباری دنیا میں میری زندگی کا سب سے پہلا مضمون تھا) (بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

ضروری ہے کہ خود خضر کی ہستی اور اُن سے متعلقہ واقعات پر تنقیدی روشنی ڈالی جائے، اس مسئلہ میں ہمارے سامنے علم و معارف، تحقیق و تنقید، واقعات و روایات کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔

اپنی موجودہ تحقیق کی بنا پر ہم حالات خضر پر، مذہبی ضمیاتی اور شاعرانہ تین پہلوؤں سے بحث کرسکتے ہیں، مذہبی عنوان کے ماتحت قرآن مجید، صحیح حدیث، صوفی ادبیات ہیں، سورہ کہف میں موسیٰ کے سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں اس واقعہ کو خضر اور موسیٰ کا واقعہ بتایا ہے، اور اسکی تائید میں بہت طویل حدیث روایت کی ہے، اسی طرح جامیؒ نے نفحات الانس میں احمد بن الحواری، اور ابو بکر کتانی کے سلسلہ میں تیسری اور چوتھی صدی کے افسانہ ہائے خضر کے متعلق بہت دلخوش کن باتیں لکھی ہیں، تاریخ فرشتہ میں بہ سلسلہ خسرو دہلوی خضر کا ایک دلچسپ واقعہ پایا جاتا ہے۔ اور جب ایک محقق کی نظر "انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ اتھکس" کے اس نظریہ پر پڑتی ہے، کہ قدیم اسرائیلی ادبیات میں خضر کا وجود تھا اور اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے اعمال خضر کے متعلق جو واقعات بیان کئے ہیں وہ جامی کے بیان کردہ واقعات سے خاص مماثلت رکھتے ہیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ تصوف اسلام پر یہودیت کا بھی اثر پڑا ہے، یونانی، بابلی اور اسرائیلی ضمیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا میں خضر کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں انکے بعض اجزاء سکندر اعظم کے فسانہ میں ہیں، اور بعض

(بقیہ صفحہ ۱۵) اسی نوک جھوک سے متاثر ہو کر لکھا تھا، اسمیں شک نہیں، مضمون لکھنے کی تحریک نگار بابت مارچ سنہ ۱۹۲۸ء کے اس نمبر سے ہوئی جس میں مولانا نیاز صاحب مدظلہ کی شبیہ شائع ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ میری اخباری زندگی اور مستقل مضمون نگاری، ہندوستان کے دو نامور، اور فاضل ادیبوں کے رد و احتجاج کی پیداوار ہے، جسکے لئے میں دونوں حضرات کا مرہون منت ہوں، لیکن ساتھ ہی حضرات علماء سے یہ شکایت کرنیکو جی ضرور چاہتا ہے کہ قوم کے نوجوانوں کی علمی ہمت افزائی میں وہ بہت بخل سے کام لیتے ہیں، اور بعض حضرات کے متعلق تو میرا خیال ہے، کہ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی طالب العلم انکے نقش قدم پر چلکر ادیب یا فاضل بننے کی کوشش کرے، اس معاملہ میں ایک ہستی کے ساتھ میری عقیدت اور نیازیش پرستش کے حد تک پہونچ گئی ہے یعنی مولانا نیاز صاحب نے حسن معیت قلبی، اور بزرگانہ اخلاص و عطوفت کیساتھ مجھے ادبی ذوق ولایا، وہ میری تمام زندگی کا واحد تجربہ ہے اور بعض اوقات یقیناً اصحاب جبہ و دستار کے مقابلہ میں حافظ کا یہ شعر پڑھ لینے کو جی چاہتا ہے ؎ بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن ۔ مرو بصومعہ کا نجا سیاہ کار انند ۔ بات میں بات نکلتی ہے، دراصل فٹ نوٹ میں لکھنا چاہتا تھا کہ نگار بابت جون و جولائی سنہ ۱۹۳۰ء کے نمبروں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا نیاز صاحب مدظلہ نے اب ایک دوسرا ادبی شگوفہ جو حضرات علماء کی اصطلاح میں مذہب اسلام پر ایک جدید حملہ کے مترادف ہے، یہ کھلایا ہے کہ قرآنی قصص کو تاریخی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ صاف یوں کہئے قصص قرآنی کے تاریخی پہلو سے وہ انکار کرتے ہیں، یہ کوئی جدید اعتراض نہیں ڈاکٹر ٹسڈل نے "ماخذ قرآنیہ" قرآن کے اکثر بیان کردہ قصص کو افسانہ، حکایات، اور اوہام و اساطیر بتایا ہے، میرے مخدوم مکرم جسوقت اس مسئلہ پر قلم اٹھائینگے میں تفصیل سے مستشرقین کے اعتراضات قدیم، افسانوں کے تراجم، قرآنی قصص کا صحیح تاریخی پہلو پیش کرونگا۔ بحمد اللہ یہ مضمون میرے ذوق کی چیز بھی ہے، مجھے فخر ہے اور فخریہ کہتا بھی ہوں کہ "النشأ" میں حضرت مولانا نیاز مخدوم میرے اُستاد ہیں، اس لئے اس معرکہ آرائی پر ناظرین نگار کو دعوت لطف و نشاط ضرور دیجا سکتی ہے۔

حصے "اسرائیلی اوہام واساطیر" میں پائے جاتے ہیں، جمیس کے قاموس المذہب والاخلاق (انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس) میں خضر کے متعلق ایک بسیط مقالہ ہے، جس پر ضمیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے، اس کا ترجمہ وتلخیص ہدیہ ناظرین ہے، مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی تائید "بابلی علم الاصنام والاوہام" اور "اسرائیلی ضمیات" سے بھی ہوتی ہے، جنکے نسخے ہمارے پیش نظر ہیں۔

حالات خضر پر بحث کرنیکے سلسلہ میں پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے اس پر کس انداز سے روشنی ڈالی ہے، اور مستشرقین یورپ نے اس ضمن میں قرآن مجید پر جو اعتراض کیا ہے، اس کی کہاں تک اصلیت ہے؟ سورۂ کہف کے آٹھویں رکوع میں مفصلہ ذیل واقعات ملتے ہیں،

" اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں برابر چلا جاؤں گا، یہانتک کہ اس موقعہ پر پہونچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں، یا یوں ہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا، پس جب وہ دونوں دو دریاؤں کے جمع ہونے کے موقعہ پر پہونچے، اس اپنی مچھلی کو دونو بھول گئے، اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی، اور چلدی، پھر جب دونوں آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ، ہمکو تو اس سفر میں بڑی تکلیف پہونچی، خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھیرے تھے سو میں اس مچھلی کو بھول گیا۔ اور مجھکو شیطان ہی نے بھلا دیا، کہ میں اسکا ذکر کرتا اور اس مچھلی نے دریا میں عجیب طور پر راہ لی، موسیٰ نے فرمایا کہ یہی وہ موقعہ ہے جسکی ہمکو تلاش تھی، سو دونو اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے الٹے لوٹے، سو انھوں نے میرے بندوں میں سے ایک خاص بندہ کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت دی تھی، اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا، موسیٰ نے اُن سے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو سکھلایا گیا ہے، اسمیں سے آپ مجھکو بھی سکھلادیں، ان بزرگ نے جواب دیا، آپ سے میرے ساتھ رہکر صبر نہ ہوسکے گا، اور ایسے امور پر آپ کیسے صبر کرسکینگے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں، موسیٰ نے فرمایا آپ مجھکو انشاء اللہ صابر پائیں گے، اور میں کسی بات میں آپکے خلاف حکم نہ کرونگا، ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں، جبتک کہ اس کے متعلق خود ہی ابتداً ذکر نہ کردوں"

" پھر دونوں چلے یہانتک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے، تو ان بزرگ نے اس کشتی میں چھید کردیا موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے تاکہ اسکے بیٹھنے والوں کو ....

غرق کردیں آپ نے بڑی بھاری بات کی ان بزرگ نے کہا کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہوسکیگا۔ موسیٰ نے فرمایا کہ آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے، اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے، پھر دونوں چلے یہانتک کہ جب ایک لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اسکو مار ڈالا، موسیٰ کہنے لگے کہ آپ نے ایک بیگناہ جان کو بے کسی جان کے بدلے مار ڈالا، بے شک آپ نے بڑی بیجا حرکت کی، ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے

نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ نے فرمایا اگر اس مرتبہ کے بعد آپ سے کسی امر کے متعلق
کچھ پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر کو پہونچ چکے ہیں، پھر دونوں چلے
یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا، تو وہاں کے باشندوں سے کھانے کو مانگا تو انھوں نے انکی مہمانی کرنے
سے انکار کردیا، اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی، تو ان بزرگ نے اسکو سیدھا کردیا، موسیٰ نے
کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اُجرت ہی لے لیتے، ان بزرگ نے کہا، کہ یہ وقت ہماری اور آپکی علٰحدگی کا ہے، میں
ان چیزوں کی حقیقت بتائے دیتا ہوں، جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکے گا"

"وہ جو کشتی تھی سو وہ چند غریب آدمیوں کی تھی، جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، سو میں نے چاہا کہ اس میں
عیب ڈالدوں، اور ان لوگوں کے آگے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا، اور رہا وہ لڑکا
سو اُس کے ماں باپ ایماندار تھے، سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈالدے، پس ہمکو منظور
ہوا کہ بجائے اس کے انکا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے، جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو، اور محبت کرنے میں اس سے
بڑھکر ہو، اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں ہیں اور اس دیوار کے نیچے اُن کا کچھ مال
مدفون تھا، اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو
پہونچ جاویں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن
پر آپ سے صبر نہ ہو سکا"

بخاری کے اندر کتاب التفسیر میں تفصیل کے ساتھ قرآن کے اس واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، چونکہ حدیث میں چند
باتوں کے سوا وہی باتیں مذکور ہیں جو قرآن میں ہیں، اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں، ہاں بعض وہ باتیں لکھدینا ضروری ہیں جن
سے قرآن کے بعض اجمال کی تفصیل ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید میں خضر کا نام نہیں، صرف "عبداً من عبادنا" (میرے بندوں
میں سے ایک بندہ) کہا گیا ہے، حدیث نے بتایا کہ یہ خضر تھے،

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ	عن سعید ابن جبیر قال لابن عباس
"نوف بکالی" کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کے موسیٰ وہ نہیں ہیں جو خضر	ان نوفا البکالی یزعم ان موسی بنی اسرائیل
کے موسیٰ تھے، حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ اللہ کے دشمن نے	لیس بموسی الخضر فقال کذب عدو الله
جھوٹ کہا ہم سے حضرت ابی ابن کعب نے بیان کیا انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ	حدثنا ابی ابن کعب عن رسول الله صلی الله
سنا آپ نے فرمایا کہ موسیٰ بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے (تا آخر حدیث)	علیه وسلم قال قام موسی خطیبًا فی بنی اسرائیل الخ

اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ سے دریافت کیا کہ صفحہ ارض پر سب سے زیادہ کون علیم ہے
آپ نے کہا میں، اس پر خدانے ان کو سفر کرنے کی ہدایت کی، اور خضر سے ملایا، جسکی تفصیل قرآن میں ہے، قرآن مجید میں صرف

عبدؒ من عبادنا ہے اور اس کے بعد اسکی ضمیر محذوف آئی ہے، لیکن حدیث میں مذکور ہے، کہ صاف طور پر آنحضرت نے "خضر" کا نام لیا ہے، مثلاً "قال لہ الخضر یاموسی"۔ قرآن مجید میں کہیں "چشمۂ حیواں" کا تذکرہ نہیں، لیکن حدیث میں مروی ہے کہ موسیٰ کے خادم یوشع بن نون جنھیں انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار یونانی ضنمیات کے حوالہ سے (Andreas) کا مبدل منہ بتاتا ہے، ایک چشمہ پر پہونچے تو یوشع بن نون کے ساتھ جو مچھلیاں تھیں ان پر پانی پڑا اور وہ زندہ ہو کر دریا میں روانہ ہوگئیں

قال وفی اصل الصخرۃ عین یقال لھا الحیاۃ لا یصیب من ماءِ بھا شیٔ الا حی فاصاب الحوت من ماءِ تلک العین قال فتحرک وانسل من المکتل فدخل البحر۔

(امام بخاری نے عبادہ کی حدیث معلقاً بیان کردی ہے، پوری حدیث حاکم نے نقل کی ہے) اُنھوں (عبادہ) نے کہا کہ اس چٹان کی جڑ میں ایک چشمہ تھا جسے لوگ "حیات" کہتے تھے، جس شے پر اس کا پانی پڑ جاتا وہ زندہ ہو جاتی، پس اس چشمہ کا پانی ان مچھلیوں پر پڑ گیا، اُنھوں نے کہا پس وہ حرکت کرنے لگیں اور جھولی سے کود کر دریا میں چلی گئیں،

قرآن مجید میں صرف مچھلی کے چلے جانے کا تذکرہ ہے۔

فلما بلغ مجمع بینھما نسیا حوتھما فاتخذ سبیلہ فی البحر سربا۔

جب دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہونچے اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے، اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی،

ان واقعات کے مقابلہ میں "انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس" کے ایک مقالہ کا حسب ذیل ترجمہ قابل غور ہے۔

"خضر" (سبز آدمی) ایک مسلمان ولی کا نام یا لقب ہے جو اہل اسلام کے عام خیال کے مطابق ہنوز زندہ ہیں، باوجود چند مساعی کے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ اس نام کی ابتدا کہاں سے ہوئی، لفظ "خضر" کی ابتدا جس طرح بھی ہوئی ہو، لیکن یہ قطعی امر ہے، کہ خضر کی ہستی کے متعلق (جیسا خیال اسلام میں پایا جاتا ہے) کوئی واحد مخصوص ماخذ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مجموعہ ہے ان اوہام اور اساطیر کا، جو مختلف صورتوں میں ان ممالک اسلامیہ کے اندر مشہور تھے جن پر بعد میں مسلمانوں نے قبضہ کیا۔"

"یہ صحیح طور پر کہا جاتا ہے، کہ خضر (Mohammadan Syncretism)[۵] کی پیداوار ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خضر کا تمام تر وجود، باوجود اس کے کہ وہ جماعات اسلامیہ میں ایک معروف حیثیت رکھتے ہیں، محض غیر اسلامی عناصر پر مبنی ہے، اسلام کو اس سے یہی تعلق ہے کہ ان تمام متضاد روایات کو ایک مربوط

---

۵ (Syncretism) کہتے ہیں ان افکار، عقائد کی عجب تاویل اور تطبیق کو یا ان مختلف جماعات کی یگانگت ثابت کرنے کو جو باہم متنازع ہیں۔

واقعہ کی صورت میں مرتب کر لیا گیا ہے، یہاں پر افسانہ خضر کے پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرنا ناممکن ہے، ہم لوگ مختصر طور پر ان ماخذ کا تذکرہ کریں گے، جہاں جہاں سے یہ فسانہ لیا گیا"

"عام طور سے اسلامی ادبیات اور بے شمار فارسی اشعار میں خضر کے متعلق اعتراف کیا گیا ہے، کہ اُنھوں نے آب حیات نوش کر کے غیر فانی زندگی حاصل کر لی، ایک قدیم اسلامی مورخ کے قطعی فیصلہ کے مطابق "خضر" ذوالقرنین (جو شامی عربی اصطلاح میں اسکندر اعظم کا خطاب ہے[۵۱]) کے وزیر تھے، جنہوں نے چشمہ حیواں کا پتہ لگا لیا، جسے اُنکے ولی نعمت نہ پا سکے، یہ واقعہ بلا ریب ہم لوگوں کی توجہ "چشمہ حیواں" کے اس قصہ کی طرف مبذول کراتا ہے، جو کہ "فسانہ سکندر یونانی" میں پایا جاتا ہے، اور جو .... (PSEudo Callisthenes) کے نام سے شروع ہوتا ہے، یہ کتاب ۳۰۰ء میں ختم ہوئی اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ "اسکندر ابدی زندگی حاصل کرنے کی امید میں چشمہ حیوان کی تلاش کے لئے نکلا اتفاقاً اُسکے باورچی کو (جو بعض روایات میں (Andreas) کے نام سے مشہور ہے) یہ چشمہ مل گیا وہ ایک نمک آلود یا خشک مچھلی چشمہ میں دھو رہا تھا کہ یکایک مچھلی میں جان آگئی، اور وہ پانی میں غائب ہو گئی باورچی نے چشمہ سے پانی نوش کیا اور حیات سرمدی حاصل کر لی، اسکندر نے جب پھر چشمۂ حیواں کا پتہ نہ لگ سکا، حسد اور یاس میں باورچی کو مار ڈالنے کا فیصلہ کیا، لیکن چونکہ وہ ایک غیر فانی زندگی حاصل کر چکا تھا، اسکندر نے اُسکے گلے میں ایک بڑا پتھر لٹکا کر اُسے دریا میں پھینک دیا، جہاں وہ ایک "بحری شیطان" (Sea-Demon) ہو گیا"

یہ قصہ جو ابتداءً ایک جداگانہ افسانہ کی حیثیت رکھتا تھا اس حیثیت سے شامیوں میں مشہور ہوا اور اُنکی وساطت سے عربوں میں مقبول ہوا، اس کا ایک پر تو قرآن میں پایا جاتا ہے، جس میں دوسرے ضمنی روایات کی طرح یہ بھی مرقوم ہے، اسلامی ماخذ سے پتہ چلتا ہے، کہ اسکندر کے باورچی جسنے نمک آلود مچھلی کے ذریعہ چشمہ حیوان کا پتہ لگایا "خضر" ہی ایک قیاس کے مطابق جسے چند علماء پیش کرتے ہیں (اور جو میرے نزدیک نامعتبر ہے) "خضر" اس بحری شیطان کا لقب ہے، جسمیں نہ یا نہ باورچی تو شکل کر دیا گیا تھا جبکہ اسے سمندر میں ڈالا گیا۔[۵۲]

---

۵۱ - یہ غلط "شامی عربی" اصطلاح ہے، ذوالقرنین سکندر بن فیلقوس یونانی کا لقب نہیں نہ قرآن میں وہ مراد ہے، بلکہ اس سے ایک یمنی سلطان مراد ہے جو اپنے تاج میں ہلال کی شکل لگایا کرتا تھا، پیشانی پر اگر ہلال کی شکل بنائیں تو معلوم ہوگا کہ دو سینگ ایک داہنی جانب دوسری بائیں جانب ہے، "ویلی پسرٹ آف سلام" میں تفصیلی بحث ہے۔

۵۲ - مندرجہ بالا حاشیہ میں لکھا ہے کہ "چشمہ حیواں" کا قصہ (GLAUKES) ضمیات سے بھی ایک دلچسپ مماثلت رکھتا ہے، یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے اور میں اسپر یقین رکھتا ہوں، کہ "خضر" اور (TLAUKOS) جو ہم معنی الفاظ میں وجود کے اعتبار سے بھی ایک ہی حیثیت رکھتے ہوں بعض لوگوں نے خضر کو (KHASISATRA) کی تحریف قرار دی ہے جو گلگامیش (بابلی ضمیات کے ہیرو) کا مورث اعلیٰ تھا اور جسکے واقعات بابلی ضمیات میں ملتے ہیں۔

خضر کی دوسری یقینی پیغمبر ایلیاہ (ELIJAH) کی شخصیت میں کیجاتی ہے۔ یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ایلیا (ELIJAH) کے فرائض میں یہ داخل ہے، کہ وہ یہودیوں کی ہر تقریب میں حاضر رہتے ہیں۔ بہ شرطیکہ شراب کا ایک پیالہ اُنکے لئے بھی الگ رکھدیا جائے، (ELIJAH) کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ علما اور فضلا پر وحی کرتے ہیں، اور اُن کے قلوب میں انوار الہیہ ودیعت کرتے ہیں۔ اور یہودی قانون کے مختلف مسائل کا علم عطا کرتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ ان سے راہ اور ویرانہ میں ملاقات ہوتی ہے، عہد آخری کے یہودی صوفیہ (KABBALISTS) "الہام ایلیا" (REVELATION OF ELIJAH) کا عام عقیدہ رکھتے تھے، اور ان میں بہتیرے افراد کا دعوی ہے کہ اُنکے صوفیانہ خیالات بلکہ اُنکی پوری کتاب اس پیغمبر کی ذاتی رفاقت کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کا ایک قصہ جب گیارہویں صدی میں ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے۔ (لیکن چونکہ بلاشبہ بہت قدیم عہد کی چیز ہے) یہاں پر لکھدینا مناسب ہے، اس قصہ میں بیان کیا گیا ہے، کہ ایلیاہ (ELIJAH) تیسری صدی کے ایک "ربی" (RABBI) کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور وہ بہت سے ایسے حادثات دکھاتے ہیں جو بظاہر عدل خداوندی کے خلاف ہیں۔ لیکن جب پیغمبر "ایلیا" اسکی تشریح کرتے ہیں تو وہی حادثات حکمت اور عدل الٰہیہ کا ایک تعجب انگیز نمونہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ قصہ یا اس کے بعض ابتدائی اجزائے قرآن میں داخلہ پا یا "تلمود" کے "ربی" کی جگہ موسیٰ نے لی اور ایلیا (ELIJAH) کی جگہ ایک مجہول اور بے نام شخص "میرے بندوں میں سے ایک بندہ" نے پائی۔

محمد کے زمانہ میں یہودی عقیدہ مشہور تھا، چونکہ "ایلیا" کی طرح خضر کی خاص صفت انکی ابدی زندگی ہے، اسلئے ان دونوں ہستیوں کو ایک قرار دینا بالکل تقاضائے فطرت تھا پس اسلامی علما اور فقہا حیرت انگیز طور سے متفق الرائے ہو کر ظاہر کرتے ہیں کہ "بندہ" سے جسکا تذکرہ قرآن میں ہے "خضر" کے سوا کوئی دوسری ہستی مراد نہیں"

یہ دو ضمیاتی افکار یعنی "چشمہ حیوان" اور "فسانہ ایلیا" جو ایک دوسرے سے بالکل علحدہ چیز اور مختلف ذہن اور مختلف مآاک کی پیداوار تھے، ایک صنوعی اور پیچیدہ طریقہ سے قرآن کے اندر ایک ہی واقعہ کی صورت میں بیان کر دئے گئے اور صرف یہی نہیں کہ اسلامی علمائے دین قرآن کے اس بیان کردہ واقعہ کو ایک واحد مسلسل حقیقت تصور کرتے ہیں۔ بلکہ ان معلومات کا علم ہوتے ہوئے بھی "جو حقیقت پس پردہ" کا درجہ رکھتے ہیں مغربی علما بھی واقعہ کی یگانگت اور دو مختلف روایات کا واحد مسلسل واقعہ ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

ان دو واقعات کی مخلوط صورت کا یہ اثر ہوا کہ قدیم لامذہب (PAGAN) قوموں میں خضر کے متعلق بحری شیطان ہونے کا جو عقیدہ تھا وہ مٹ گیا اسلام میں خضر کا تقدس لیا گیا اور بعض علمائے اسلام نے انھیں ولی اور پیغمبر، اور بعض نے فرشتہ ثابت کیا، اسلامی علمائے قصص واساطیر نے خضر کو باورچی سے وزیر کے درجہ پر لا کھڑا کیا،

اسمیں شک نہیں کہ مسلمان ابتدا (ELIJAH) اور خضر کی اساطیری قسم کی حیثیت میں کافی مماثلت پاتے تھے،

کیونکہ انکا خیال ہے کہ خضر کا اصلی نام ایلیا (عبر، ILY) ہے جو یہودی (ELIJAH) کی تحریف ہے وہ یہودی جو اسلامی ممالک میں رہتے تھے ان دو اسماء کے باہمی تناسب معنوی کے قائل تھے، چونکہ جسکا نام (ELIJAH) ہوتا وہ خود کو "خضر" کہا کرتا، اور ترک آج بھی ہمارے پیغمبر کو "خضر لاس" (خضر الیاس) لکھکر دونوں لفظ کے ہم معنی ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

جو بات زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے، کہ "ایلیا" کی خصوصیات اور کمالات کو خضر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے خضر کو ایلیا کی طرح ہر جگہ حاضر بتایا جاتا ہے، اور جب انکا نام لیا جاتا ہے، تو حاضر ہو جاتے ہیں، وہ حاجت کے وقت ایک مددگار اور صلاح کار ہوتے ہیں، وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ان کی رفاقت کے لائق ہوتے ہیں اور علم اسرار الٰہیہ سکھاتے ہیں، ایک حدیث کے مطابق وہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ کی تسلی کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہودیوں کے (KABBALISTS) کی طرح صوفیائے اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ خضر کی رفاقت کا شرف حاصل کرتے ہیں، بیشمار قصے مشہور ہیں کہ کس طرح خضر نے خاص خاص صوفیائے کرام کو اپنی تعلیم و تربیت سے مستفیض کیا اور عبادت و ریاضت کے طریقے بتائے، اور بہتیری کتابوں کے متعلق انکے مصنفین کا دعویٰ ہے کہ وہ خضر کی بلا واسطہ تعلیم کا نتیجہ ہیں خضر اور ایلیا کے قصوں میں اور بھی قریبی مماثلت یوں پائی جاتی ہے، کہ جسطرح تصنیفات میں ایلیا کو (PHINEHAS) سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح اسلامی تصنیفات میں خضر کا بھی حال ہے، اور جس طرح مسلمان قصہ نگاروں کی کتاب میں خضر کو ایک بدوی کے بھیس میں پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح "تلمود" میں ایلیا کے متعلق بھی واقعات ملتے ہیں اور بھی اس قسم کی بہتیری مثالیں ہیں، جن سے دونوں واقعات کے تمثل اور ...... یگانگت پر کافی روشنی پڑتی ہے،

اس وجہ سے کہ قرآن کے اندر ایلیا کا نام یونانی شامی زبان میں الیاس وارد ہوا ہے اور الیاس کا واقعہ (POSHBIBCHICAL) سے زیادہ بائبلی رنگ میں پایا جاتا ہے، علمائے اسلام مجبور ہوئے کہ "خضر ایلیا" اور الیاس کو دو ہستیاں تصور کریں، الیاس اور خضر کا ابتدائی کارنامہ اس عقیدہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ جو مسلمانوں میں مسلم ہے، اور جس کی وضاحت قصص کی بے شمار روایات سے ہوتی ہے، چونکہ دونوں پیغمبروں پہ مسافروں کو انکے سفر میں مدد کرنیکی ذمہ داری ہے، اس لئے ایلیا "مکلف فی البر" (خشکی پر متعین ہیں اور ..... خضر "مکلف فی البحر" (تری میں مدد کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں مفتوح قومیں اسلام کے اندر اپنی بعض تعلیم بھی ساتھ لائیں اس صورت سے اسلامی ممالک محروسہ میں "خضر" مختلف عقائد و اوہام کا مرکز قرار پا گیا، جہانتک ملک شام کا تعلق ہے "کرلش" اور "سی کلرمونٹ گینو"

کی تصنیفات سے خضر کے متعلق بعض اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ کرٹس کا بیان ہے، کہ اس نے سواحل شام پر خضر کے نام سے بہتیرے معابد (SANCTUARIES) دیکھے جہاں پر آج انکے (خضر) کے نام پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں، اور جانور کا پہلا بچہ قربان کیا جاتا ہے، چنانچہ کرٹس کا بیان ہے کہ اس سے ایک مسلمان نے کہا کہ "خضر نزدیک ہیں اور خدا دور ہے"، خضر کے ساتھ ایسی تعظیمی عقیدت (جسے عبادت سے تعبیر کر سکتے ہیں) کا واقعہ دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ قدیم سامی عقائد آج تک متداول ہیں، خصوصیت کے ساتھ قدیم "بابلی تاغر" تعلیم کی روح ہنوز باقی ہے،

اسلامی علمائے دین ہمیشہ اس افراط کے مخالف ہیں اُنھوں نے اس حدیث صحیح کے مطابق کہ "نبی صلعم کی وفات کے بعد خضر تشریف لائے" وجود خضر کو تو تسلیم کیا لیکن اُنھوں نے یہ بتایا کہ وہ آنحضرت کے معاصر تھے، اور آپکی وفات کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد انتقال کر گئے، لیکن یہ تعلیم چونکہ صوفیہ کے "اوہام خضر" کے مخالف تھی، اسلئے کامیاب نہ ہو سکی۔

انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کا اعتراض یہ ہے کہ خضر کے سلسلہ میں جو واقعات قرآن نے پیش کئے ہیں انھیں علم الاصنام کے وہ مختلف واقعات کی صناعانہ رنگینی بیان سے تعبیر کر سکتے ہیں، حالانکہ ہر شخص باونے تامل سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے موسیٰ اور انکے خادم کے سلسلہ میں مچھلی کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اُسکا ماخذ یونانی ضمیات نہیں ہو سکتی، چونکہ یونانی علم الاصنام کی بنا پر "انڈریاز" کو آب حیوان پینے اور حیات جاوید حاصل کرنے پر اپنی ناکامی کے غضب میں اسکندر نے دریا میں ڈالدیا اور وہ ایک بحری شیطان ہو گیا، حالانکہ موسیٰ اور اُنکے خادم یوشع بن نون کے درمیان اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا، صرف مچھلی کے غائب ہونے کے مسئلہ پر اگر قرآنی اور ضمیاتی (یونانی) واقعہ میں یکرنگی پائی جاتی ہے تو اس سے ہرگز یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا، کہ یونانی ضمیات قرآنی واقعہ کا ماخذ ہے، اگر قرآن نے یہ بیان کیا ہوتا کہ موسیٰ نے یوشع بن نون کو مچھلی کے غائب ہونیکے غصہ میں دریا کے اندر ڈالدیا، تو البتہ ایک وجہ مماثلت تھی، کیونکہ اسکندر اور انڈریاز کے افسانہ میں، اصل فسانہ "انڈریاز" کا "بحری شیطان" بننا ہے، نہ کہ مچھلی کا غائب ہو جانا اس لئے معلوم ہوا کہ قرآن نے موسیٰ اور یوشع کے جو واقعات بیان کئے ہیں انکو اسکندر اور انڈریاز کے افسانہ سے تعلق نہیں۔

البتہ اسرائیلی روایات سے مدد لیکر موسیٰ اور خضر کی موافقت اور مکالمہ کے متعلق جو کچھ انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے وہ ایک حد تک قرآن کے بیان کردہ واقعات سے ملتا ہوا ہے، اور اسمیں جرح بھی نہیں چونکہ بہت سے اسرائیلی واقعات قرآن میں پائے جاتے ہیں، البتہ مقالہ نگار نے اسرائیلی واقعہ کو (POST BIBBICAL) بتایا جاتا ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے علم الاصنام میں یہ واقعات ملتے ہیں انکا یہ کوئی مذہبی عقیدہ نہیں بہرحال دماغ انسانی کی عجوبہ نوازیاں ہر قدیم واقعہ کے ساتھ ملکر حقیقت پر پردہ ڈالدیتی ہیں اور اس لئے آیندہ نسلیں درایت کے لحاظ سے انھیں نامعتبر خیال کر کے

یکسر وہم و افسانہ کہدیتی ہیں" علم الاصنام والاوہام" (MYTHS OF LEGENDS) کے بہتیرے افسانے حقیقتوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، خضر کا تعلق حقیقات سے ہے لیکن ضمیات نے ان پر اپنا گہرا اثر پیدا کر دیا ہے، خضر کو اسلامی ضمیات کے درجہ پر پہونچانیوالے اور صوفی شعرا تھے، چنانچہ حضرت جامی حضرت احمد بن الحواری تیسری صدی کے ایک مشہور ولی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

احمد بن السماک بیمار تھے (احمد بن الحواری فرماتے ہیں) میں ایک نصرانی طبیب کے یہاں انکا قارورہ لیکر چلا راستہ میں ایک خوبصورت آدمی ملے، جو عمدہ اور خوشبودار لباس پہنے ہوئے تھے، انھوں نے فرمایا کہاں جاتے ہو، میں نے کہا فلاں طبیب کے یہاں جاتا ہوں تاکہ ابن سماک کا قارورہ دکھاؤں، انھوں نے فرمایا، کہ سبحان اللہ خدا کے دوست کے علاج میں خدا کے دشمنوں سے مدد لیتے ہیں اس قارورہ کو زمین پر پٹک دو، اور ابن سماک سے کہو کہ جہاں درد ہے، اپنا ہاتھ رکھکر کہے بالحق انزلناہ و بالحق نزل پھر ایسا غائب ہوگئے کہ میں نے نہ دیکھا پس ابن سماک کے پاس میں آیا اور واقعہ بیان کیا، انھوں نے درد کی جگہ پر اپنا ہاتھ رکھا اور جو کچھ اس آدمی نے سکھایا تھا کہا، اوسی وقت تندرست ہوگئے اور فرمایا "آن مرد خضر بود علیہ السلام"۔

اسی طرح ابوبکر کتانی (متوفی ۳۲۲ھ) کے سلسلہ میں افسانہ خضر کے بہت دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔

شیخ الاسلام گفت کہ وے صحبت دار خضر بود، وقتے خضر وے راگفت یا با بکر ہمہ مرداں ازیں طائفہ مرا می شناسند ومن ایشاں را نمی شناسم ودلے گفت کہ خضر گفت کہ در مسجد صفا بودم بہ ین مردم بر عبدالرزاق حدیث می اسند و در گوشۂ مسجد جوانے بود سر در گریباں فرو بردہ، گفتم مردم بر ...... عبدالرزاق حدیث می خوانند و تو اینجا نشستہ چرا نہ روی و از وے حدیث نشنوی گفت من اینجا از" رزاق" می شنوم تو مرا با عبدالرزاق می خوانی گفتم اگر راست می گوئی من کیم گفت خضر و سر در گریباں فرو برد"۔

یہ واقعات بالکل یہودیت سے ماخوذ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقرا نے یہودی صوفیہ (KABBALISTS) کی ہمنوائی میں یہ ضعف اعتقاد پیدا کر لیا ہے کیونکہ یہ تخیلات انسائیکلوپیڈیائی تصریحات کے مطابق، صوفیائے یہود میں مروج تھے۔

چونکہ ڈاکٹر نکلسن نے ثابت کر دیا ہے کہ ارتقائے تصوف میں یہودیت نے بھی حصہ لیا ہے، اس لئے بہت ممکن ہے، خضر کی رہبری تعلیم وغیرہ کے متعلق جو کچھ صوفی ادبیات میں پایا جاتا ہے، وہ یہودیت سے ماخوذ ہو۔

فارسی زبان کے اکثر ابتدائی شعرا خود صوفی تھے، اس لئے انھوں نے علم الاصنام کے وہ تمام افسانے اپنی شاعری میں منتقل کرنا شروع کئے جنکا اسلام کی مذہبی ادبیات سے چنداں تعلق نہیں، چنانچہ خاقانی کہتے ہیں۔

کسے کیں خضر معنی راست دامنش گیر چون سی ٭ کف موسیٰ و آب خضر بینی در گریبانش

خاقانی کی زندگی کے دو اہم پہلو تمام مورخین نے بیان کئے ہیں چنانچہ تذکرہ دولت شاہ اور نفحات الانس جامی میں آپکے روحانی تقدس اور باطنی اوصاف کا اعتراف کیا گیا ہے، مولانا جامی لکھتے ہیں۔

ہر چند وے شاگرد فلکی شاعر است وبہ شعر شہرت تمام یافتہ چنیں گویند کہ ویرا در راہ طور شعر طور دیگر بودہ است کہ شعر در جنب آں کم بودہ (نفحات الانس)

اسی طرح صاحب صحف ابراہیم کا قول (مولانا عرفی و خاقانی (مطبوعہ نگار بابت دسمبر ۲۸ء) کے سلسلہ میں لکھا جا چکا جس سے آپکے ذوق صوفیانہ پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن خاقانی کی زندگی کا ایک تیسرا رخ سید نور الدین بن سید شریف الحسینی، المرعشی الشوستری نے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

طریقہ شیخ سنائی پیمودہ، نقش مذہب حق اہل بیت بر لوح اعتقادی نگاشت اما چوں در روزگار حکیم خاقانی حکیم اسماعیلیان در جمیع مواطن جاری بود، ولہٰذا تقیہ در طائفہ علیہ شیعہ مرتضویہ ساری لاجرم بعض از عقائد خود را، در قطعہ مشہور کہ مذکور خواہد شد، بہ طریق کنایت ادا نمودہ (مجالس المومنین قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

مصنف نے اسی طرح خواجہ سلمان ساوجی کو بھی مذہب باطنیہ (شیعہ) کا متبع بنایا ہے، حالانکہ انھوں نے کلام سے استدلال کیا ہے اسکی مثالیں اکثر شعرائے فارس کے یہاں ملتی ہیں اور اگر سیاسی فضا کی بناپر خاقانی کو تقیہ کی ضرورت پڑی تھی، جسکی اصلیت ایک وراز کار قیاس کے سوا کچھ نہیں تو اسی طرح تمام شعراء کو بھی شیعی عقائد کا پابند اور تقیہ پر عامل کہا جا سکتا ہے، خیر یہ تو ایک خارجی بحث تھی۔

خاقانی نے اپنے شعر میں تصوف کے ایک خاص عمل "مراقبہ و مکاشفہ" کی تفصیل کی ہے، چنانچہ اسی ضمن میں یہ شعر بھی لکھا ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے موسیٰ کی طرح اس "خضر معنی" کا دامن پکڑا تو کف موسیٰ (یعنی ید بیضا) اور چشمہ حیواں اسکے گریبان میں نظر آوے گا، خاقانی کے خیال کا ایک جزو تو قرآنی روایت پر مبنی ہے، اور دوسرا جزو وہی علم الاصنام سے لیا گیا ہے، یعنی موسیٰ اور خضر کی مرافقت کا حال تو قرآن میں مذکور ہے، لیکن "آب خضر" تصوف کا وہ حقیقہ ہے جو ضمیات کا منت پذیر ہے،

خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

حجاب ظلمت ازاں بست آب خضر کہ گشت　　ز نظم حافظ و ایں طبع ہمچوں آب خجل

حافظ کہتے ہیں کہ میری طبیعت کے جوش و خروش اور نظم کی بلند پایگی نے چشمہ حیواں کو شرمادیا اور اُس نے پردۂ ظلمات میں اپنا منہ چھپالیا یہ خیال تو سراپا علم الاصنام سے لیا گیا ہے،

حضرت خسرو دہلوی کہتے ہیں

آگہی کے دادہ از اسکندر تشنہ جگر　　خضر تنہا خوارہ کو با آب حیواں خو گرفت

مطلب یہ ہے کہ جناب خضر تو اکیلے اکیلے آب حیواں نوش فرمانے کے عادی ہوگئے ہیں اور ایسے کہ پردہ ظلمات ہی میں نشیمن اختیار کرلیا اب انھیں کیا پڑی ہے کہ بیچارے تشنہ کام اسکندر کی خبر لیں،

یہ صوفیہ کا وہ عقیدہ ہے جو علم الاصنام سے تصوف میں آیا اور پھر فارسی شعرا نے مختلف پیرایہ میں بیان کیا۔

شیخ علی حزیں لاہجی فرماتے ہیں،

بخشید حیات تن اگر آب سکندر ۔۔۔ دل زندگی از چشمہ حیوان تو یابد

یعنی اگر آب حیات سے جسم زندہ ہوتا ہے تو محبوب کے چشمہ حیواں سے روح اور قلب کو حیات ملتی ہے،

اسی طرح ملا نورالدین ظہوری ترشیزی فرماتے ہیں۔

در حلق خضر گشتہ گرہ آب حسرتے ۔۔۔ دانستہ است مردنم از آرزوئے کیست

شعر کا مطلب یہ ہے کہ خضر نے آب حیات تو پی لیا لیکن وہ آب حسرت بن کر انکے حلق میں کھٹک رہا ہے، چونکہ کسی کی طلب و آرزو میں میرا مرنا وہ رشک سے دیکھ رہے ہیں، لیکن خود نہیں مرسکتے۔

دنیا جانتی ہے کہ خضر کو آب حیواں پلانیوالا قرآن نہیں بلکہ وہ علم الاصنام ہے، اس لئے جناب ظہوری کی روح قبر میں بھی یہ سن کر بچین ہو جاوے گی کہ حضرت جس رقیب (خضر) کو کسی شاہد رعنا کی محبت میں اپنا شریک مرگ بنانا نہیں چاہتے اور یہ کہکر اپنے ہیجان رقابت کو تسکین دے رہے ہیں کہ وہ تو آب حیات پی کر اس دنیائے آب و گل میں مقید ہوگئے، وہ مدت ہوئی دنیا سے سفر کرکے استعلائے روحانی حاصل کرچکے، کیونکہ قرآن انھیں ویسے مادی کا مقید نہیں بتاتا اب رہی وہ حدیث جس میں وفات بنی صلعم کے وقت انھیں زندہ بتایا گیا ہے، تو یہ اُصول حدیث کے مطابق بہت کچھ محل نظر ہے، علاوہ ازیں بخاری میں میری نظر سے یہ حدیث نہیں گزری، انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

ناظرین کرام! میری اس تمام کاوکاو خامہ فرسائی کی اصل غرض یہ ہے کہ ہمارے ارباب وطن جن میں ادبی ذوق کچھ نہ کچھ ضرور پایا جاتا ہے، قرآن مجید کی طرف اس ادبی نقطۂ نظر سے ضرور توجہ کریں، ہندوستان میں آج کثیر التعداد نوجوان لکھنے والے موجود ہیں وہ اپنے مضامین میں ہیوم اور اسپنسر، شکسپیر اور ملٹن، اسکر وایلڈ اور ہارڈی اور دوسرے مغربی ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے کلام اور نتائج فکر کے حوالے دیتے ہیں، لیکن انھیں دلچسپی نہیں ہے تو صرف قرآن مجید سے حالانکہ اس میں شعر و ادب کے محاسن، اقتصادیات و سیاسیات کے مسائل، اخلاق و تمدن کے قوانین، نفس و قیافہ کی باریکیاں موجود ہیں، الغرض ایک طرف قرآن ہیں مادہ کی کثافتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، تو دوسری طرف لطائف روحانیہ کے اجزا و تفصیلات معرض بحث میں لائے گئے ہیں امثال بالا سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری کی تمام خصوصیات وہی سمجھ سکتا ہے، جو قرآن مجید سے باخبر ہو اور اسوقت جبکہ اردو کی ارتقا میں عربی و فارسی سے لفظی و معنوی

ذخائر منتقل کئے جارہے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے، ایک اردو زبان کا ادیب صحیح معنی میں قرآن کے مطالب پر نظر رکھے بغیر ادیب لبیب کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

ادبی جرائد و صحائف کا مطالعہ کرنیوالے حضرات، اگر صبح کے وقت نصف گھنٹہ یا پندرہ ہی منٹ قرآن مجید کی چند آیتیں باترجمہ پڑھ لیں تو انکے ذوق ادبیہ کی ایک نئی زندگی ہوجاوے گی، مسلمان قرآن مجید پڑھتے ہیں تو صرف برکت سمجھ کر، حالانکہ برکت جس "اعجوبہ" کا نام ہے، وہ اس کے سوا دوسری بات نہیں کہ علم و معرفت میں ضیا، اخلاق و تہذیب میں استواری، روح و جسم میں ایک تازگی پیدا ہوجائے، اور ہم جب تک دنیا میں رہیں، دنیا کی نظر میں باعزت رہیں، اور جب مریں ایک کیف اور روحانی نشاط کے ساتھ، مادہ اور روح کی انھیں وحشت پیمائیوں میں بدرقہ راہ کا نام قرآن ہے اسلئے جب ہم فلاسفہ اور شعرا کے حوالے دینے لگیں، جب ہم گوئٹے کے تغزل اور ڈینٹ (DANTE) کے صوفیانہ خیالات پر روشنی ڈالیں، جب ہم روسی اور یوروپی افسانے لکھ لکھکر قلوب میں درد و رقت یا عزم و ثبات کی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کریں، تو خدارا قرآن کے اس عالمگیر (UNIVERSAL) پیام و دعوت کا بھی خیال رکھیں بتیان لکل شئ قرآن میں ہماری اس دنیائے آب و گل سے متعلق جتنی ضروریات ہیں سب پائی جاتی ہیں، اگر ایام نے مساعدت کی تو میں چھوٹے چھوٹے مضامین کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرونگا کہ ہم قرآن کے مطالعہ سے سیاسی اور ماہر اقتصادیات کیونکر بن سکتے ہیں؟ ہم اخلاق و معاشرت کا فلسفہ کیونکر حل کرسکتے ہیں، الغرض ہم روح اور مادہ کی کشمکش کے اندر دماغ انسانی میں پیدا ہونیوالے سوالات کا (جنھوں نے آج مختلف علوم کی صورت اختیار کرلی ہے) کیا جواب دے سکتے ہیں؟ کیا میں نوجوانان وطن سے ہم آہنگی کے ساتھ عمل پیرائی کی امید کرسکتا ہوں، بہرحال ؎

حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم،

عبد الماالک آروی

(نگار) ہمارے عزیز و فاضل دوست مولوی عبد الماالک صاحب کا مضمون ختم ہوگیا اور یقیناً اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اس کی ترتیب میں کافی کاوش و جستجو سے کام لیا اور نگار شکر گذار ہے کہ "بے منت و بے سوال و بے استحقاق" یہ مقالہ اس کو مرحمت فرمایا گیا۔

اول اول جب اس مضمون کے ابتدائی اجزاء میرے پاس آئے اور عنوان کے لحاظ سے تمہیدی بحث کو میں نے دیکھا تو کچھ مضطرب سا ہوا اور میں نے فاضل مضمون نگار کو لکھا کہ "میں تمہید کو دیکھ کر کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ آپ سے عنوان بدلنے کی درخواست کروں" یعنی ابتدائی گفتگو کیوں اس مقصود سے دور ہے جو عنوان سے ظاہر کیا گیا ہے۔

اس کا جواب اُنھوں نے دیا جسکا مفہوم غالباً یہ تھا کہ ممکن ہے تمہید کی وسعت سے انتشار خیال کا شبہ پیدا ہو، لیکن آیندہ اجزا مقصود سے بعید نہیں ہیں۔ لیکن میں نے اس مضمون کا تعارف کراتے ہوئے ملاحظات میں اپنا یہ خیال ظاہر کردیا کہ مجھے نہیں معلوم، اس بحث میں اُنھوں نے قرآن کی فصاحت و بلاغت سے بہ حیثیت معجزہ اعتنا کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو میں انھیں مشورہ دوں گا کہ اسی سلسلہ میں اس موضوع پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں"۔

یہ لکھنے کے بعد میں خاموش رہا اور میں نے بدستور "قرآن کے لطائف ادبیہ" کے عنوان سے اس مضمون کا سلسلہ جاری رکھا اور غور کرتا رہا کہ دیکھوں قرآن کے لطائف ادبی کون کون سے لکھے جاتے ہیں اور شعرائے عرب و فارس کا ان سے استفادہ کیا معنی رکھتا ہے؟

(اس مضمون کا پورا عنوان یہ تھا "قرآن مجید کے لطائف ادبی اور شعرائے عرب و فارس کا استفادہ")

لیکن اب کہ یہ مضمون ختم ہو چکا ہے اور میں اس کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے لطائف ادبی کا ابھی تک اس میں ذکر نہیں آیا اور شعرائے عرب و عجم کے استفادہ کی جو صورت فاضل مقالہ نگار نے بتائی ہے، اس کے لحاظ سے اسکا عنوان زیادہ سے زیادہ

"عرب و عجم کی شاعری میں تلمیحات قرآنی"

ہونا چاہیئے تھا، اور یقیناً اس عنوان کے لحاظ سے یہ مضمون بہت زیادہ قابل ستائش ہے۔

اس مضمون کے حصۂ اول میں مولوی عبدالمالک صاحب نے عربی شاعری کے تین دور، اور نفس شاعری کے اثر و تاثر سے بحث کی ہے، اور اس کی خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حصہ میں میکڈانلڈ کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے کہانت کے انداز سے قرآن کے اسلوب بیان کو متمائز کرنے کی سعی کرتے ہوئے، وحی پیغمبرانہ اور الہام شاعرانہ کے فرق کو بیان کیا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے خوب لکھا ہے اور ممکن ہے کہ مولویوں کی اصطلاح میں ان کو اس کی جزائے خیر بھی ملے، لیکن افسوس ہے کہ وہ استدلال کے لحاظ سے نہ میکڈانلڈ کو ساکت کرنے والا ہے نہ کسی اور غیر مسلم کو۔ ضرورت تھی کہ مختلف مثالیں دیکر قرآن کی ادبیت کو "انداز کہانت" سے بلند و برتر ثابت کیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا، کیونکہ ایسا نہیں کیا جاسکتا اور تاوقتیکہ کوئی شخص پہلے ہی سے قرآن پر ایمان نہ لے آئے، ان دونوں میں کوئی فرق و امتیاز محسوس نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے عبدالمالک صاحب کو آخر کار اسی فرسودہ منقولی حجت سے کام لینا پڑا جو ایک مولوی کا سب سے بڑا لیکن نہایت ہی ضعیف حربہ ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے عربی شاعری کی خصوصیات کا بالاختصار ذکر کرتے ہوئے اس کی عشقیہ شاعری سے گفتگو کی ہے، اور پھر قرآن نے جو اخلاقی رنگ اس میں پیدا کیا اس کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ مذہبیات میں اخلاقی شاعری

عشقیہ شاعری سے کوئی بلند مرتبہ کی چیز ہوگی، لیکن ادبیات کے سلسلہ میں مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے۔

اس کے بعد "صور شعریہ" کے لحاظ سے قرآن کی بعض عبارتوں کو معیاری چیز ظاہر کیا ہے، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا اور پھر شعرائے فارس کے کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ انھوں نے قرآنی قصص سے کتنی تلمیحات اپنے یہاں لیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے موسیٰ، عیسیٰ، قارون، سلیمان، یوسف، اور خضر وغیرہ کے افسانوں سے متعلق بعض شعرائے فارس کا کلام مثالاً پیش کیا ہے۔

میں یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کی تکرار کرتا ہوں کہ مولوی عبدالمالک صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ ان کی کاوش اور محنت کو کسی طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کے لطائف ادبیہ کا کہیں ذکر نہیں آیا جسے عنوان کا جزو اول قرار دیا گیا تھا اور نہ یہ ثابت کیا گیا کہ اگر شعرائے عرب و عجم نے تلمیحات قرآنی کو استعمال کیا تو اسے "استفادہ" کیوں کہا جائے، جبکہ محض ان تلمیحات کی وجہ سے رتبۂ شاعری بلند نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

اگر اسی سلسلہ میں، قرآن کی ادبیت کے متعلق کوئی گفتگو کروں تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔ عام طور پر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کلام مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے، اور ہر چند یہ خیال مسلمانوں میں بہت بعد کو اسوقت پیدا ہوا جب وہ اسلام کی تمام صحیح تعلیمات سے منحرف ہو کر محض رسم و رواج اور تفاخر بیجا میں مبتلا ہو گئے اور اسلام کی دوسری ہدایات کی طرح قرآن کی حقیقت سے بھی اغماض کر کے صرف اس کی فصاحت و بلاغت میں پھنس کر رہ گئے، لیکن چونکہ اب غلطی سے اس اعتقاد کو بھی داخل ایمان قرار دے لیا گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مختصراً اس غلطی کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

تمام قرآن میں ایک جگہ بھی آپ کو ایسی آیت نہ ملے گی جس میں فصاحت و بلاغت پر مخالفین سے معارضہ کیا گیا ہو، بلکہ میرے نزدیک اس کی تردید کی گئی ہے۔

اہل عرب ہر اس کلام کو جس میں خوبصورت الفاظ، دلچسپ بندش، اور سلاست و لطافت پائی جاتی، شعر کہا کرتے تھے خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔ اور چونکہ قرآن میں بھی ان کو وہی فصاحت و بلاغت نظر آتی تھی۔ جو دوسرے شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے، اس لئے وہ قرآن کو بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن قرآن کے شعر و شاعری ہونے سے ہمیشہ انکار کیا گیا کیونکہ شعر کی بنیاد محض سطحی و مادی جذبات پر ہوتی ہے اور قرآن کا مقصود صرف تربیت اخلاق و تزکیۂ نفس و روح تھا جو شعر و شاعری سے بہت بلند چیز ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ قرآن نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ اس کی فصاحت و بلاغت کو اہمیت دے کر اس کے اصل مقصود کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹائی جائے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ - ان ھو الا ذکر وقرآن مبین -
یعنی ہم نے رسول کو شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ شاعری اس کے شایان شان ہے قرآن تو صرف نصیحت ہے اور کھلی ہوئی پند و وعظ کی کتاب۔

دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ نسبت شعری سے یوں انکار کیا گیا ہے:۔

والشعراء یتبعھم الغاؤن - الم تر انھم فی کل واد یھیمون -
یعنی تم لوگ جو رسول کو شاعر کہتے ہو تو یہ نہیں سمجھتے کہ شاعروں کی تو ایک گمراہ جماعت ہے جو وہم و خیال کی دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہے اور اسی قسم کے لوگ انکا اتباع کرتے ہیں -

کفار عرب کا قرآن کو نہ صرف شاعری بلکہ خیالات پریشاں کا مجموعہ کہنا خود کلام مجید سے ثابت ہے:۔

بل قالوا اضغاث احلام بل افتراہ بل ھو شاعر

لیکن اس کا جواب قرآن کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ

ما ھو بقول شاعر قلیلا ما تؤمنون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون

الغرض قرآن میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت کو کسی جگہ اہمیت نہیں دی گئی، بلکہ ان لوگوں کی مخالفت کی گئی، جو اس کو خصوصیات شعری کے لحاظ سے دیکھتے تھے۔

وہ لوگ جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بھی معجزہ قرار دیتے ہیں۔ ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ کلام مجید میں متعدد بار کفار سے خطاب کیا گیا ہے کہ اگر ان کے امکان میں ہے تو ایک آدھ ہی سورۃ ایسی بنا کے لے آئیں یعنی ان کے نزدیک ایسا کہنا گویا فصاحت و بلاغت کے نقطۂ نظر سے ہے، لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔

منجملہ ان آیات کے جن میں قرآن کا مثل پیش کرنے کا معارضہ کیا گیا ہے۔ چند یہ ہیں:۔

(۱) ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا
شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین

(اگر تمہیں قرآن کی صداقت کی طرف سے شک ہے تو ایک ہی سورۃ ایسی بنا لاؤ اور اپنے حمایتوں کو بھی یکجا کرو اگر تم سچے ہو۔)

(۲) ام یقولون افتراہ - قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریت وادعوا من
استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین -

(اچھا اگر تم یہ کہتے ہو کہ قرآن من گھڑت چیز ہے تو دس سورتیں ایسی ہی گڑھی ہوئی تم بھی لے آؤ اور جس سے جی چاہے اس کام میں مدد لے لو)

(۳) قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ہٰذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیرا۔
(اگر تمام انس و جن جمع ہو جائیں کہ قرآن کا مثل بنا سکیں تو ان سے ممکن نہ ہوگا)

(۴) ام یقولون تقولہ بل لا یومنون۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین
(کیا لوگ کہتے ہیں کہ رسول نے اسکو خود گڑھ لیا ہے، اچھا تو ان سے کہو کہ کوئی ایک ہی بات اسکی سی بنا لائیں اگر سچے ہیں)

ان تمام آیات کے دیکھنے کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں کفار عرب کو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے چیلنج دیا گیا تھا۔ اگر کوئی ایسا دعوےٰ کرتا ہے تو میرے نزدیک وہ غلطی پر ہے کیونکہ خود ان آیات پر غور کرنے سے اس کی تردید ہوتی ہے، پہلی، دوسری اور چوتھی آیت میں چیلنج دینے کی صورت یہ ہے کہ

"اگر تم کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے یا تم اسکو من گھڑت چیز جانتے ہو"

تو اس کا جواب پیش کرو۔ اس انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفار عرب اسے انسانی کلام سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اور اس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی سکہ ان کے قلب پر ایسا نہ جما تھا کہ وہ اسے کلام انسانی سے زیادہ کچھ اور سمجھتے، چنانچہ وہ یہی کہا کرتے تھے کہ اس میں ہے کیا۔ لونشاء لقلنا مثل ہذا۔ ان ہذا الا اساطیر الاولین (سورہ انفال آیت ۰)
خدا نے ان کے اسی اعتراض کا جواب یہ دیا کہ جس نقطۂ نظر سے تم کلام مجید کو دیکھ رہے ہو وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ فصاحت و بلاغت یا شاعرانہ انداز بیان قرآن کا مقصود نہیں ہے۔ جو چیز دیکھنے کی ہے وہ اس کا ہادیانہ و مرشدانہ پہلو ہے، اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر کسی کے امکان میں ہو تو ایسی جامع کتاب ہدایت، ایسی مکمل شریعت، اخلاق ایسا پاکیزہ قانون تمدن اور ایسا کامل نظامِ جامعۂ انسانیت، پیش کر کے دکھاؤ۔

اگر فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معارضہ ہوتا تو تمام جن و انس سے خطاب کرنیکی ضرورت نہ تھی جیسا کہ آیت نمبر ۳، مندرجۂ بالا میں کیا گیا ہے۔ صرف یہ کہا جاتا کہ اگر دنیا کے تمام شعراء یا خطیب جمع ہو جائیں تو قرآن کا مثل پیدا نہیں کرسکتے

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو اسوقت تمام اہل عرب کی زبان تھی اور اس میں وہی الفاظ، وہی اسلوب بیان اور وہی ترکیبیں استعمال کی گئیں جو اسوقت عام طور پر رائج تھیں۔ اس لئے یہ دعوےٰ کرنا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے اور اس کا مثل پیش نہیں کیا جا سکتا درست نہیں۔ کیونکہ جس طرح کلام مجید کے متعلق یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے اسی طرح دنیا کی اور کتابوں کے متعلق بھی یہی دعوےٰ ہو سکتا ہے۔ اگر قرآن کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کوئی جواب نہیں ہوسکتا، تو مہلہل، امرؤالقیس، ابوالقاسم حریری کے کلام کا بھی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ "استحالۂ مثل" کا مسئلہ تو اس قدر صاف ہے کہ دنیا میں کسی چیز کا بھی مثل پیش نہیں ہو سکتا، جو چیز اپنی جگہ ہے، بے مثل ہے، اور وہ وہی رہے گی جو ہے۔

آج مسلمان خواہ کتنا ہی مضحکہ اڑائیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیلمہ کا بنایا ہوا قرآن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کچھ کم تھا۔ کیا یہ اس کی سحر بیانی و فصاحت و بلاغت نہ تھی کہ عین عہد سعادت میں سینکڑوں قبائل اس کے اعجاز بیان سے مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر اگر محض شاعرانہ اعجاز بیان ہی قرآن کا دعوےٰ ہوتا تو وہ بھی آج مسیلمہ کذاب کے قرآن کی طرح فنا ہو گیا ہوتا، اگر آج مسیلمہ کے ماننے والے دنیا میں نہیں ہیں، تو اس کا سبب یہی ہے کہ اس کا اعجاز فصاحت و بلاغت تھا اور اگر آج قرآن کے ماننے والے کروروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا معجزہ صرف اس کی اخلاقی تعلیم تھی۔

رسول بار بار شعر و شاعری سے اپنے آپ کو علیحدہ بتاتا ہے، شاعروں کی برائی کرتا ہے، کہیں ایک جگہ بھی فصاحت و بلاغت کا ذکر نہیں آتا۔ اور قرآن کی خصوصیت وہ صرف ہدایت، ذکریٰ، قول حق اور بصائر ظاہر کرتا ہے، لیکن مسلمان کہتا ہے "جی نہیں، یہ تو آپ کا صرف شاعرانہ انکسار ہے"۔ اور اس کی شاعری کی بھی داد دیتا ہے، حالانکہ اس طرح وہ اسے اس درجہ پر کھینچکر لے آتا ہے، جہاں سے اگر بآسانی اس کو نیچے گرایا نہیں جا سکتا، تو دوسروں کو ضرور وہاں تک پہونچایا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی میں اور اس کے چند دن بعد تک، جب اسلام صحیح معنے میں ایک سادہ عملی مذہب تھا، کسی نے نہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ قرار دیا اور نہ اس لحاظ سے اس پر کوئی ایمان لایا، وہ اس کی دلنشیں تعلیمات کو پڑھتے تھے اور اس کے گرویدہ ہو ہو کر مصروف سعی و اقدام ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد کو جب فتوحات اسلامی وسیع ہوئیں، مختلف ممالک کے لوگوں سے مل کر خیالات میں تبادلہ ہوا، امن و سکون سے بیٹھنے کے بعد فضول خیال آرائیوں کا موقعہ ملا، اور وہ قوت عمل مضمحل ہو گئی جس نے ان کو "اعلون فی الارض" بنا دیا تھا، تو وہ مباحث شروع ہو گئے جو دنیائے الہام سے فروتر، صرف دنیائے ایجاد و اختراع اور عالم بحث و تاویل سے متعلق تھے۔ چونکہ خود ان کی عملی زندگی مفقود ہو چکی تھی اور اس کے پیش کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے اب اسباب تفاخر و تفوق فراہم کرنے میں سوائے اسکے چارہ کار نہ تھا کہ وہ ہر اس رطب و یابس کو لے لیں، جس کی علوم دنیاوی میں کبھی کمی نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ انھوں نے قرآن کے مفہوم کو پس پشت ڈال کر صرف اس کے الفاظ کو لے لیا۔

جنت و دوزخ کی مادی تحقیق شروع کر دی، معاد و آخرت کا اسرائیلی مفہوم لینے لگے، صراط و میزان کے اساطیری معنے اختیار کئے، اور آخر کار یہانتک سطح و قشر پر اتر آئے کہ قرآن کو شعر و شاعری سمجھ کر اس میں فصاحت و بلاغت کی جستجو کرنے لگے، زباندانی کے اصول اس سے مستنبط کرنے لگے، علم معانی و بیان اور صرف و نحو کے قواعد کی بنیاد اس پر قائم ہونے لگی۔ پھر قرآن سے یہ دوری و استبعاد، اسلام سے یہ ہجر و فراق امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا ہی رہا اور عہد عباسیہ تک آکر اس حد تک پس پشت ڈالدیا گیا کہ ہارون الرشید ایسا صاحب علم و فضل، حامل عقل و فراست بادشاہ بھی اپنی سلطنت کے بقا کے لئے قرآن کی آیات سے استفادہ نہیں کرتا، بلکہ فلکیات کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اگر آج ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد قرآن کا مصرف صرف یہ رہ گیا ہے کہ اُسے اطلس کے جزدان میں لپیٹ کر رکھدیا جائے، اور جب نکالا جائے تو اُس کو بوسہ دیکر اور ہاتھ کو اُس سے مس کر کے جسم پر پھیر لیا جائے، اس کے اوراق کی ہوا سے دفع مرض چاہا جائے، اُس کی آیتیں گھول گھول کر پلائی جائیں (کیونکہ ان کے نزدیک فیہ شفاء للناس سے شفاء امراض روحانی مراد نہیں ہے) اور گلے میں اُس کے لاکٹ بنا بنا کر ڈالے جائیں۔ تو حیرت نہ کرنا چاہئیے، کیونکہ خیالات کا جو انحطاط اب سے بارہ صدی قبل پیدا ہوا تھا۔ اس کو اسی حد تک آجانا چاہئیے تھا۔

ہمارے عزیز دوست مولوی عبد المالک صاحب نے بھی اختتام مضمون پر یہ ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن کا مطالعہ ادبی نقطۂ نظر سے کم از کم آدھ گھنٹہ روزانہ کر لینا چاہئیے۔ یہ نتیجہ ہے اسی ذہنیت کا جو مسلمانوں میں عرصہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ قرآن میں سب کچھ موجود ہے، یہاں تک کہ اس میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت اور لطائف ادبی میں معجزہ کی حد تک پائے جاتے ہیں۔

خضر کے متعلق جو اظہار خیال اُنھوں نے کیا ہے وہ اسی طرح ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے، جس طرح اور اسرائیلی قصص جو کلام مجید میں پائے جاتے ہیں۔ عبد المالک صاحب نے کسی جگہ فٹ نوٹ میں ظاہر کیا ہے کہ یہ مبحث خاص انکے ذوق کی چیز ہے، اس لئے میں بہت ممنون ہوں گا اگر وہ اخذ قرآن کے متعلق تمام ان اعتراضات کی طرف توجہ کریں جو اہل مغرب کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلے میں قلم اُٹھاؤں، کیوں نہ وہ خود اسکی ابتدا کریں اور مجھے صرف سمجھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔

اخیر میں مجھے پھر یہ عرض کرنا ہے کہ اس تحریر سے میرا مقصود صرف قرآن کے ادبی پہلو کے متعلق ایک اصولی گفتگو کرنا تھا۔ امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اس کو کسی اور جذبہ پر محمول نہ کریں گے۔ کیونکہ میں ان کی تفتیش و تحقیق، ان کے ذوق علم و ادب کا معترف ہوں، اور اس وقت کا بیچینی کے ساتھ منتظر ہوں، جب میرے انکے درمیان مذہب کے افہام و تفہیم کے متعلق جو چند اصولی اختلافات ہیں دور ہو جائیں، اور مجھے ان کے سامنے دست ارادت پھیلانے میں تامل نہ ہو۔

نیاز

شعلہ زارِ الفت

(۱)

خفیف سی دھند رامینی کے گرد و نواح کو گھیرے ہوئے تھی۔ پہاڑیوں کے پیچھے آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اس کی زرد امن شعاعیں، جنکی حرارت تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں پر پڑ رہی تھیں۔ فرانسیسکا، رامینی کے نواب کی بیوی، درختوں کی زردی کو تک رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے بے خیالی ٹپک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پرانے خیالات، غیر ارادی طور پر اُسکے دماغ میں گشت کر رہے ہیں۔ اس کے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، جن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ اُسکی نظریں باغ کی ٹہنیوں پر پڑیں، پھر روشوں پر، اور پھر نرگس کے کنج پر چشمہ کے کنارے۔ اور بالآخر اس کی نظریں زُہرہ کے مرمریں مجسمہ پر جمکر رہ گئیں جو چشمے کے وسط میں سنگ مرمر کے ایک خوبصورت چبوترے پر نصب تھا۔

"زہرہ۔ اے میری مالکہ۔ میری دیوی، میں خدا کی نہیں تیری اور تیرے بیٹے کیوپڈ کی پرستار ہوں۔ پاؤلو نے مجھے تیرا غلام بنا دیا۔ پاؤلو کے عشق نے مجھے تیرا غلام بنا دیا۔ تیری وجہ سے پاؤلو میرا پرستار ہے۔ اور کیوپڈ کی وجہ سے میں پاؤلو کی پرستار ہوں۔ اے زُہرہ تو ہمیشہ اپنا سایہ میرے سر پر قائم رکھ کہ پاؤلو مجھے چاہتا رہے۔ اور اے کیوپڈ تو اپنے چند اور شیریں تیر چلا کہ ہماری محبت ابدی محبت بن جائے۔"

ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اُسکے چہرے پر نورِ مسرت برس رہا تھا جس میں خشوع و خضوع کی جھلک تھی۔ ایک کیف کے عالم میں اس نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے محسوس کیا کہ یونانی صنم پرستوں کی دیوی زُہرہ اُسکے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہی ہے، اس لطیف تخیل سے اُسکی روح میں ایک لرزشِ مسرت طاری ہو گئی۔ اس کے لبوں پر ایک لطیف تبسم پیدا ہو گیا۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی رفتہ رفتہ چھائی جا رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سیاہی مائل نظر آ رہی تھیں۔ ایک غلام شمعیں روشن کر رہا تھا۔

معاً اسے اپنے شوہر کا خیال آ گیا۔ اس شخص کا جسکے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے سات سال گذارے تھے۔ جو ہمیشہ اس سے محبت کرتا رہا۔ جس نے ہمیشہ اپنے قوی بازوؤں میں اسے اٹھا کر بچوں کی طرح اسے بہلایا۔ اس کا شوہر یوحنا، رامینی کا نواب۔ جو سات سال تک اُسکی اُلفت کا مرکز رہا۔ اور وہ خود بھی اپنے شوہر کی الفت کا مرکز بنی رہی۔

اور اب بھی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی کہ وہ اپنے خاوند کو دھوکا دے کر ایک دوسرے سے محبت کر رہی تھی۔ دفعتًا اُسکی نظر پھر زُہرہ کے مجسمے پر پڑی جو چشمے کے وسط میں ہاتھی دانت کی طرح چمک رہا تھا، اور اُس کے ساتھ ہی اُسے پاؤلو کا حسین چہرہ اور سچی روح یاد آگئی۔

اُسے وہ شام یاد آگئی جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ کشتی پر بیٹھی چاندنی رات میں جھیل کی سیر کر رہی تھی، ایک اجنبی ساحل پر آیا اور ایک دوسری کشتی پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کرنے لگا۔ ایک مرتبہ اُسکی کشتی بہت قریب سے ہو کر نکلی، اجنبی سے اُسکی نگاہیں ملیں، اور معلوم نہیں کیوں شرم اور شوق کی ایک ملی جلی لہر اُس کے قلب میں دوڑ گئی، اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا، اور وہ اپنے شوہر سے باتیں کرنے لگی۔

پھر اُسے وہ دن یاد آگیا جب اوسیڈ کے یہاں دعوت میں دوسری مرتبہ وہ اس اجنبی سے ملی، پہلی ملاقات اُسکے ذہن سے تقریبًا رفع ہو چکی تھی۔ اوسیڈ نے اجنبی کا تعارف اُس سے اور اُس کے شوہر سے کرایا، اُس کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پاؤلو — یہی اجنبی کا نام تھا — کے حرکات و سکنات میں ایک دلکشی سی ہے۔ دلکشی نہیں — اُس کا قلب زیادہ سے زیادہ یہ اعتراف کر سکا کہ صرف دلچسپی۔

اجنبی — اب وہ اجنبی نہیں پاؤلو تھا — اُس کے شوہر سے بہت بے تکلف ہو گیا۔ اور کئی بار وہ اُن کے گھر آمینی بھی آیا۔ نواب یوحنا، اُسکو اپنا معتبر دوست سمجھنے لگا۔

پھر وہ دن اُس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے، جن میں پاؤلو سے اُسکی واقفیت بڑھتی گئی۔ پاؤلو کی اندرونی خوبیاں، اُسکی صداقتِ قلب، اُسکا گداز دل اُس پر رفتہ رفتہ ظاہر ہونے لگا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ گویا اُس پر ایک سحر سا ہو رہا ہے۔ لیکن اس خیال کو اُس نے دل کی ایک کمزوری سمجھ کر نکال دیا۔

پھر اُسے وہ وقت یاد آگیا، کہ جب شمعوں کی روشنی میں بیٹھا ہوا، پاؤلو کوئی گیت گا رہا تھا۔ شمع کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے شمعوں کے اُجالے میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اُسکی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جو رازِ محبت کی غمازی کر رہی تھی۔ یہ چمک جذبۂ محبت کی نہ تھی بلکہ ایک لطیف احساسِ الفت کی۔ اُسکی نظریں، پاؤلو کے چہرے پر پڑیں اور وہ شرما گئی، حجاب اور بیچینی سے اُس کا سر جھکانے لگا۔ اُس کا شوہر نواب یوحنا آج روم گیا ہوا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں اکیلے تھے۔ اُس اضطراب اور بیچینی نے جو فرانسیسکا پر طاری تھی۔ پاؤلو پر بھی اثر کیا اُس نے نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر تک ایک خاموشی سی طاری رہی۔ فرانسیسکا نے اس ناگوار خاموشی کو محسوس کیا اور پاؤلو سے کچھ اور گانے کی فرمائش کی، پاؤلو اب تک اپنے اضطراب پر قابو نہ پا چکا تھا تاہم اُس نے سارنگی اُٹھائی اور ایک نہایت لطیف نغمۂ محبت گانا شروع کیا۔

پاؤلو بیخودی میں گاتا رہا۔ فرانسیسکا پر ایک حجاب آمیز اضطراب طاری ہو گیا۔ تاہم اُس کو موسیقی کے اثر کا

اپنے دل سے اعتراف کرنا ہی پڑا۔

فرانسیسکا کے چہرے پر شرم اور بےچینی کے اثر سے سرخی چھا گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ گویا وہ انگاروں پر بیٹھی ہے۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اُٹھ کر چلی جائے اور پھر کبھی اُس شخص سے نہ ملے، مگر وہ بیٹھی رہی۔ شاید اُس میں اُٹھ کے جانے کی طاقت نہ تھی۔ اُس کے چہرے سے غصے، شرم، بےچینی اور تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ پاؤلو نے اُس کی طرف دیکھا، اور اپنی اس لغزش پر جو محض اظہار الفت کا ایک ذریعہ تھا، اپنے دل میں ایک ملامت محسوس کی۔ اُسے کیا حق تھا کہ وہ ایک عورت کو جسے اپنے شوہر سے محبت تھی، جسکی ازدواجی زندگی مسرت سے لبریز تھی، اپنی محبت کی داستان سُنا کر کشمکش اور تکلیف میں مبتلا کرے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنے اس جذبے کو اپنے دل ہی میں دفن کئے رہتا۔ یہاں کہیں اور چلا جاتا۔ اُس نے گھٹنے ٹیک کر فرانسیسکا سے معافی مانگی اور اس کا اقرار کیا کہ یہ اُس کے دل کی ایک بےجا لغزش ہے۔ اب کبھی وہ اس سے نہ ملے گا۔ اور اٹلی سے ہجرت کر کے قرطاجنہ یا مصر چلا جائے گا۔

فرانسیسکا کو اُس کا معافی مانگنا یاد آ گیا۔ اُس کے چہرے پر ایک مظلومیت سی برس رہی تھی۔ جیسے کوئی گنہگار رحم کی التجا کر رہا ہو۔ اس کی مظلومیت کی ادا نے اُسے بےقابو کر دیا اور انجام سے بےخبر ہو کر اُس نے پاؤلو کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور اُس کے لبوں پر محبت کے اقرار کا پہلا نشان ثبت کر دیا۔

فرانسیسکا کو وہ گھڑی یاد آ گئی۔ جو اُس کی زندگی میں ایک انقلاب کی گھڑی تھی۔ جس نے اُسے ایک نئی زندگی ایک نئی لذت اور ایک نئے گناہ سے آشنا کیا۔

"میں رات کا کھانا نہ کھاؤں گی۔ پاؤلو کے سوا کسی اور سے نہ ملوں گی ......، تم جا کر سو جاؤ، سُنا آرلینڈر"

یہ الفاظ اُس نے اپنے حبشی غلام سے کہے جو شمعیں روشن کر رہا تھا۔ یوحنا آج ہی کسی شہر کو گیا ہوا تھا اور کل سہ پہر سے پیشتر اُس کے واپس آنیکی اُمید نہ تھی۔

(۲)

باغ میں سنگ مرمر کی نشستگاہ پر پاؤلو اور فرانسیسکا دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرانسیسکا کا ایک ہاتھ پاؤلو کے گلے میں حمائل تھا۔ نرگس کا کنج ان دونوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ رات کافی تاریک تھی۔

چشمے کا پانی چمک رہا تھا۔

وینس کا سفید بت دمک رہا تھا۔

دونوں محبت کی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میٹھی محبت بھری باتیں جو ہزاروں بار دہرائی جا چکی ہیں۔ دونوں گویا ایک بہشت خیال میں تھے۔ جہاں تک اس دنیا کی فکروں کی رسائی نہیں۔ پاؤلو جھکا اور فرانسیسکا کے نازک لبوں کو چوم لیا۔ نرگس کے کنج میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ رات کی تاریکی میں سیاہ لبادے میں

یوحنا کا پرخشم چہرہ نظر آرہا تھا۔ اسکی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے ایک قدم ان دونوں کی طرف بڑھایا اسکے ہر ہر عضو سے عزم، استقلال، حوصلہ، اور بہادری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے دونوں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، شرم ندامت، ذلت، بیوفائی کا احساس تلخ دونوں کو لرزا رہا تھا۔

"فرانسیسکا۔ بدبخت بے وفا عورت۔ تو جانتی ہے تیرا انجام کیا ہے!" نہایت خشمگیں آواز میں یوحنا نے یہ الفاظ ادا کئے اور ایک تیز خنجر تاریکی میں چمکتا ہوا نظر آیا۔

خوف کی ایک تیز لہر فرانسیسکا کے قلب کو دہلا گئی۔ وہ پاؤلو سے لپٹ گئی اور دونوں یکجا بیٹھ گئے۔

ہوا میں خنجر دو مرتبہ چمکا اور دو لاشے زمین پر تڑپنے لگے۔

(۳)

تخیل کے پر لگائے ہوئے، اطالیہ کا سب سے بڑا شاعر ڈانٹے، دوزخ کے دوسرے طبقہ میں داخل ہوا۔ عالم بالا کی سیر میں ورجل، اُس کا رہنما تھا۔

کلیوپٹرا ملی، وادی نیل کی ملکہ، اور اپنا افسانۂ محبت سنایا۔

پھر ہیلن ملی، وہ لڑائی کی دیوی جس نے یونان اور ٹروجن میں سالہا سال تک خونریزی کرائی۔ اور اُس نے بھی اپنی محبت کی کہانی سنائی۔

دوزخ کا دوسرا طبقہ گنہگار عاشقوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور یہاں خاکدانِ ارضی کے شاعر نے بہت سے چاہنے والوں کو دیکھا۔

اسی شعلہ زارِ الفت میں فرانسیسکا بھی تھی۔ اور اس کا عاشق پاؤلو بھی۔

اور اُس نے بھی اپنا افسانۂ الفت ڈانٹے کو سنایا۔

"میں نے پاؤلو کی محبت میں اپنے شوہر کو چھوڑا، خدا کو چھوڑا، دنیا کو چھوڑا اور محبت صرف محبت کو اختیار کیا شوہر نے مجھے قتل کیا۔ خدا نے مجھے دوزخ میں ڈلوا دیا۔ مگر محبت نے اب بھی مجھے نہیں چھوڑا۔ یہ شعلہ زار جہنم میرے لئے فردوسِ الفت ہے۔"

وہ آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی، چاروں طرف آگ ہی آگ۔ جس کی حدت، اطالیہ کا شاعر اپنے تخیل کے لبادے کے باوجود بھی محسوس کر رہا تھا۔

"یہ شعلہ زار جہنم ہمارے لئے فردوسِ الفت ہے۔"

یہ کہکر جہنم کے زہرہ گداز شعلوں میں فرانسیسکا نے پاؤلو کا بوسہ لیا۔ اور اطالیہ کا شاعر نے ڈھر کتے ہوئے

قلب سے دیکھا کہ جہنم کی آگ بھی، اُن کی محبت کے شعلوں کے سامنے ہیچ تھی۔ جس محبت کے شعلے اُن کو فنا کر چکے تھے۔ اُسی محبت نے اُنھیں حیاتِ جاودانی بھی عطا کی تھی۔

ڈانٹے کا سر چکرانے لگا۔ اور اگر ورجل اُس کا بازو پکڑ نہ لیتا تو شاید وہ رحم کے جذبے سے بیہوش ہو جاتا۔ دلوں میں محبت کا بیج بونیوالی ہستی نے شاعر کو حکم دیا کہ اس بدنام محبت کا راز آشکار اکرے بہت سے لوگ اس راز کو صحیح سمجھیں گے۔

اور بہت سے لوگ غلط۔

اور بہت کم رازِ محبت کو صرف راز ہی سمجھیں گے۔

عزیز احمد

سودیشی ریل

(شوکت تھانوی کے ایک مضمون کا اقتباس کہیں کہیں سے)

ہمارے ایسے آدمی کے لئے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اُسوقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خریدلیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہونچکر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانککر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

"بابوجی! کانپور کا سکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیدیجئے۔"

بابوجی نے بجائے اسکے کہ ٹکٹ دیدیتے پہلے تو ہم کو گھورا۔ پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے:۔

"ایک بات کہدیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابوجی مذاق کر رہے ہیں۔ اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابوجی نے پھر کہا:۔

"جناب سنئے تین روپے ہوئے لائیے روپئے اور ٹکٹ لے لیجئے۔" اب تو مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا۔ "جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے، آپ کہتے ہیں تین روپے، مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیئے ہے۔ کانپور کا سکنڈ کلاس"

بابوجی نے ذرا ترش رو ہوکر جواب دیا "جناب والا میں بہرا نہیں ہوں۔ سُن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے ہے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے۔ کوڑی کم نہ لوں گا جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے۔"

میں۔ مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنے کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا"

بابو۔ "کل کی بات کل کے ساتھ۔ آج ودلیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراجیہ مل گیا ہے"

میں۔ یہ کہیے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔

بابو۔ لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دیدیجئے۔ اور ٹکٹ لے لیجئے۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آرہی تھی اور کچھ غصہ آرہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے اگر گاڑی چھوٹ گئی تو مصیبت آگئی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرونگا اور یہ سوچکر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا مجھکو جاتا ہوا دیکھکر مجھکو بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

(یہ مضمون مکمل اور متعدد اسی طرح کے دلچسپ مضامین "موجِ تبسم" میں درج ہیں جو زیر طبع حلد میں شائع ہوئی ہے۔ حجم ۲۰۸ صفحات قیمت معہ محصول دو روپیہ) نوٹ۔ اگر کتاب پسند نہ ہو واپس کرکے دام لے لیجئے۔

مینجر۔ نگار۔ لکھنؤ

کیا دنیا کو مذہب کی ضرورت ہے؟

(بہ سلسلۂ سابق)

گزشتہ دو ماہ کی اشاعتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مذہب کی ابتدا دنیا میں کیونکر ہوئی، اور عہد حاضر میں اسکے ضعف و اضمحلال کے کیا اسباب ہیں؟ اس پر قیاس کرکے مستقبل کے لئے بہ آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب جو عملی طور پر اب بھی تقریباً فنا ہو چکا ہے، اقتصادی و ذہنی اعتبار سے بھی محو ہو جائے گا۔ اور ایک زمانہ آنیوالا ہے جب مذہب کی تعلیمات و اعتقادات کو اس نگاہ سے دیکھا جائے گا جس طرح آج "سکونِ زمین و حرکت افلاک" کے نظریۂ قدیم کو دیکھا جاتا ہے، یا جس طرح ایک ماہر آثار قدیمہ پرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

مذہب کو سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والے اسباب کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں، انکا تفصیلی ذکر ماہ گذشتہ کے نگار میں آ چکا ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کا ہر وہ قدم جو علم و حکمت کی طرف بڑھتا ہے، مذہب کو سو قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے اور بدقسمتی سے مذہب کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو انکا مقابلہ کرکے اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔

علوم و فنون کے سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ مذہب کو جس چیز سے پہونچا وہ "قانونِ ارتقاء" کی تحقیق تھی، اس نے نہ صرف مذہب کے بہت سے مسلمات تاریخی کو پارہ پارہ کرکے رکھدیا، بلکہ خود مذہب کے اندر اسی اصول ارتقاء کے ماتحت تغیر و تبدل کا ہونا فطری اقتضاء قرار پایا۔ اور جو لوگ قدامت پرستی کو اصل مذہب سمجھتے تھے، خود ان کے ایمان متزلزل ہو گئے اور انھوں نے بھی اس اصول کی صداقت مانکر مذہبی معتقدات میں تغیر و تبدل کو گوارا کیا۔

چونکہ مذہب کی بنا صرف یقین پر ہے اور فطرت انسانی صرف ان باتوں کا یقین کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے مشاہدہ و تجربہ میں آئیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ علمی مشاہدات و تجربات کے مقابلہ میں مذہبی بیانات کو ترجیح دیجاتی اور انسانی ضمیر ان پر مطمئن ہو جاتا۔

اول اول جب مذہب و حکومت میں زیادہ فرق نہ تھا اور حکومت کے مفہوم سے اس کی مذہبیت کو جدا نہیں کر سکتے تھے، تو بربنائے اس استبداد کے جو شخصی حکومتوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے، جبراً بزور شمشیر مذہب کا تلخ گھونٹ ہر شخص کو گوارا کرنا پڑتا تھا اور قوت و عسکریت سے علم و حکمت کی تبلیغ اور آزادی فکر و ضمیر کو محو کیا جاتا تھا، چنانچہ تمام مذاہب کی تاریخ میں

اس نوع کے سینکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ فرعومات مذہب کے خلاف جب کسی نے نکتہ چینی کی تو اس کو قید و بند میں ڈالا گیا، دار پر کھینچا گیا، جلایا گیا، اور جس طرح ممکن ہوا حریت فکر و رائے کی اشاعت کو روکا گیا۔

جب یونان قدیم کے باشندوں نے، ایران، کریٹ اور مصر والوں سے علوم و فنون کے حصول کا ذوق حاصل کیا، اور انھوں نے محسوس کیا کہ روایات مذہبی بالکل لغو چیز ہیں اور انسان کو خود اپنے عقل و حواس سے کام لیکر کس نتیجہ پر پہونچنا چاہیئے، تو وہ جہاں بھی گئے اس خیال کو ساتھ لے گئے اور چونکہ یہ تاریخی صداقت ہے کہ جب کسی قوم میں آزادی اور تحقیق کی جستجو بڑھتی ہے تو مذہب کا انحطاط ہونے لگتا ہے، اس لئے اہل مذاہب نے ان کو ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جب وہ ایتھنیہ (Athens) پہونچے جو اس زمانہ کا بڑا عظیم الشان شہر تھا۔ تو وہاں علم و حکمت کے ساتھ لوگوں کی دشمنی اور زیادہ شدید پائی۔ یہاں تک کہ انکسا غورس نے جب وہاں ایک علمی درسگاہ قائم کرنا چاہی تو اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی اور آخر کار اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ایتھنیہ کے فلاسفر کا دعوےٰ تھا کہ وہ صرف روحانی حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ غریب سقراط باوجود تبلیغ روحانیت اپنی جان نہ لیجا سکا۔

اس کے کئی صدی بعد اسکندریہ میں جسے یونانی مصری شہر کہنا چاہیئے، زیادہ موافق حالات کے ماتحت علم و عقل کی کارگاہ قائم ہوئی، ہر چند یہاں اتنے مذاہب پائے جاتے تھے کہ خداؤں کی تعداد کے لحاظ سے پجاری بھی کافی نہیں تھے۔ لیکن شاید مذہبی گمراہی کے ردعمل کا وقت تھا یا اور لوگوں نے کافی توجہ کی اور علم و حکمت کی ترقی ہونے لگی، مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک اور نئے مذہب مسیحیت نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا اور اس نے یونانی عقل و حکمت کے آخری چراغ (Hypatia)[1] کو بھی گل کر کے رکھدیا۔ پہلا ایک ہزار سال کا زمانہ جو (Thales)[2] سے شروع ہو کر (Hypatia) پر ختم ہوتا ہے، علم و مذہب کی جنگ کا نہایت اہم زمانہ ہوا ہے اور سب سے زیادہ جس مذہب نے عقل کی مخالفت کی وہ عیسوی مذہب تھا۔

---

[1] (Hypatia) اسکندریہ کے ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کی بیٹی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں پیدا ہوئی۔ اس کی فراست و دانائی کے سبب سے اسکندریہ میں اسکا خاص اثر تھا اور مشرق کے تمام حصوں سے طلبہ آ آکر اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس نے فلسفۂ اشراقیین اور فلسفۂ ارسطو کو ملا کر ایک جدید فلسفۂ انتخابیت (Eclecticism) پیدا کیا تھا۔ یہ فلکیات اور علوم مسکانکی کی بڑی ماہر تھی۔ آخر کار وہاں کے اسقف اعظم نے بعض وحشی راہبوں کو متعین کیا جو اسے گاڑی سے کھینچکر کلیسہ میں لے گئے اور وہاں عریاں کر کے اس کے کوڑے مارے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیا۔

[2] (Thales) یونان کا نہایت قدیم فلاسفر تھا جو مسیح سے سات سو سال قبل پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا یونانی تھا، جس نے تخلیق کائنات پر بحث کی۔ اور بتایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے۔

(کل شیٔ حی من الماء)!

اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اور علم کی روشنی مذاہب کے ظلمتکدوں میں نہ پھیل سکی۔ ہرچند علم و فراست کے تمام خزانے یونانی کتابوں میں محفوظ تھے لیکن یونان کی عیسائی حکومت کے زمانہ میں کس کو ان کے تلاش کی جرأت ہو سکی تھی۔

آخرکار اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے عرب کے وحشیوں میں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس نے بعد کو دمشق و بغداد میں گہوارۂ علم و حکمت کی صورت اختیار کی اور چاروں طرف سے عقل کی روشنی سمٹ کر وہاں آنے لگی، یونانی، ایرانی اور شامی علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے اور مذہب اسلام نے ان کی اشاعت کو گوارا کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن خلفاء امراء و سلاطین اسلام نے پوری ہمدردی و اعانت سے کام لیا۔ دمشق و بغداد سے منتقل ہوکر یہ تہذیب شمالی افریقہ ہوتی ہوئی اسپین پہونچی اور وہاں علوم و فنون کی ترقی نے وہی رنگ اختیار کیا جو یونان قدیم میں کسی وقت پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد چند یہودی و مسیحی سیاح یہاں آئے اور عربوں کے تراجم و تصانیف کو اٹلی، فرانس اور انگلستان لے گئے، پھر چونکہ مسلمان صقلیہ اور اطالیہ کے جنوب میں بھی آباد تھے، اس لئے یہاں سے بھی چشمۂ علم یورپ کی طرف بہا اور عقلیت کی ترقی ہونے لگی۔ لیکن کلیسہ نے جس قدر اس کی مخالفت کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ بیکن کو اپنی آدھی زندگی زندان کلیسہ میں بسر کرنا پڑی۔ البرٹ گریٹ کو کلیسہ کا اسقف اعظم کی خدمت دیکر خاموش کیا گیا، کوپرنیکس نے فیثاغورس کے اصول کی تصدیق کا اسوقت تک اعلان نہیں کیا جب تک وہ عذاب استنطاق (INQUISITION) کی دسترس سے باہر نہیں ہو گیا۔ آرنلڈ کا ایک مجرم کی طرح جا بجا تعاقب کیا گیا، جین ڈی روکیوٹالیڈ نے زنداں میں جان دی۔ سکواسکولی اور برونو جلائے گئے۔ گلیلیو سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا اور دسالیس مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ لیکن چونکہ دنیا میں عقل و حکمت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس کا نشہ ایسا نہیں جو آسانی سے اتر جائے۔ اس لئے باوصف کلیسہ کی شدید ترین مخالفت کے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جب مذہب میں ضعف ہوا تو اتنی رعایت اہل علم کے ساتھ روا رکھی جانے لگی کہ کیمیا، طبیعیات و فلکیات کی تعلیم پر انکا آگ میں جلایا جانا بند ہو گیا۔

جب انیسویں صدی شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ علم و حکمت کے انشعابات نے ساری دنیا پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، تو مذہب کے سخت گیر دیوتا کا بت ٹوٹا اور عقیدت نے توریت و انجیل میں تاریخی، آثاری، علمی، اخلاقی، ہزاروں قسم کے نقائص نکال کر مسیحیت کا جنازہ نکالدیا۔ اور اب پہلی دفعہ ارباب علم و فن نے اطمینان سے بیٹھ کر سمجھا کہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی، اسکی تاریخ کیا ہے؟ مذہب کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی الہامی حیثیت کس مکر و فریب کا نام ہے۔ اور یہ آزادی خیال رفتہ رفتہ اس قدر بڑھی کہ اب گفتگو بائبل کے الہامی و غیر الہامی ہونے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بائبل ایسی لغو و مہمل کتاب کو کیوں مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اور یہ کہ آیا مسیح کا حقیقتاً کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔

جو لوگ بائبل کو مدارس سے خارج کرنا چاہتے ہیں انھوں نے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں:-

(۱) اگر بائبل الہامی ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہوا۔ لیکن اب کسی ملک کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ لہذا کوئی ضرورت

نہیں کہ بچوں کے معصوم دلوں میں تعصبات مذہبی پیدا کئے جائیں۔ اگر بائبل الہامی نہیں بلکہ انسان کی تصنیف ہے تو اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں ہے۔ اور اسکو پڑھانا بچوں کا وقت ضائع کرنا ہے۔

(۲) بائبل دو ہزار برس قبل کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور وہ زمانہ انسان کے عالم طفولیت کا تھا۔ اب انسان جوان ہے لہذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کی سی باتیں جوانوں کو پڑھائی جائیں۔

(۳) بائبل خود کوئی کتاب نہیں بلکہ مجموعۂ صحائف ہے۔ جو مختلف زبانوں میں تصنیف ہوئے۔ علاوہ ازیں بائبلوں میں بھی فرق ہے۔ یعنی عبرانی بائبل ۳۹ صحائف پر مشتمل ہے۔ انگریزی پروٹسٹنٹ بائبل میں صرف ۳۶ صحائف ہیں۔ رومن کیتھولک بائبل میں ان سب کے علاوہ ایک صحیفہ موسوم بہ "ابوقریفہ" (APOCRYPHA) اور بھی ہے۔ اس طرح سب ملا کر ۴۲ صحائف ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کون سا مجموعہ صحیح ہے۔ لہذا ایسی مشتبہ کتاب کا پڑھانا مضرت رساں ہے۔

(۴) اصلی بائبل عبرانی زبان میں تھی۔ رائج الوقت بائبلیں اس کا ترجمہ ہیں۔ ترجمہ میں معانی اکثر بدل جاتے ہیں لہذا اگر بائبل پڑھی جائے تو اصل پڑھی جائے۔ ترجمہ کا پڑھانا فضول ہے۔ اور چونکہ اسکول کا ہر بچہ عبرانی نہیں پڑھ سکتا اور نہ ایک مردہ زبان کے پڑھانیکی ضرورت ہے۔ لہذا بائبل کے ترجمہ کا درس موقوف کیا جائے۔

(۵) بائبل میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو علوم و انکشافات جدیدہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہذا غلط کتاب کا بچوں کو پڑھانا ان کے ذہنی رجحانات کو تباہ کرنا ہے۔

(۶) بائبل کے مختلف صحیفے مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غزلیں بھی ہیں۔ قصے کہانیاں بھی ہیں، ڈرامے بھی ہیں، روایات بھی ہیں، خرافات بھی ہیں، اور تھوڑی سی تاریخ بھی ہے۔ اور یہ سب مختلف زبانوں کی تصانیف بھی ہیں، لیکن پڑھاتے وقت بچوں کو انکی نسبت کچھ نہیں بتایا جا سکتا، اس لئے ایسی مجہول کتاب کی تعلیم میں وقت کا ضائع کرنا ہے۔

(۷) بائبل میں بہت سے معجزات درج ہیں۔ جو از روئے سائنس خلاف فطرت ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بچوں میں توہم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ جو عقل و دماغ کے لئے مضر ہے۔

(۸) سائنس نام ہے عقل منظم اور دانش مرتب کا۔ لیکن بائبل نام ہے خلاف عقل باتوں کے مجموعہ کا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عقلی پر بے عقل کو کیونکر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

(۹) بائبل مجموعۂ اضداد ہے۔ اور اس لئے وہ کوئی اخلاقی تعلیم بھی صحیح معنے میں نہیں دے سکتی۔

(۱۰) بائبل، ملوکیت اور مشرقی ظلم و استبداد سکھاتی ہے۔ مثلاً "خدا سے ڈرو بادشاہ کی عزت کرو" اور دنیا اب ملوکیت و استبداد کے اصول کو قائم نہیں رکھ سکتی۔

(۱۱) بائبل عورت کو ذلیل بتاتی ہے۔ حالانکہ از روئے انصاف مرد و عورت دونوں کا درجہ مساوی ہونا لازم ہے۔

(۱۲)، بائبل جنگ کی تعلیم دیتی ہے۔ حالانکہ دنیا کو امن و صلح کی ضرورت ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب کے فنا ہونیکے چند در چند اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیمات ترقی علوم و فنون کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں، دوسرے یہ کہ دنیا سے ملوکیت واستبداد کی رسم اٹھی اور اصول حکمرانی میں مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھا گیا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بائبل سے ان کی زندگی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ حیات انسانی کی جستجو کا شافی جواب دے سکتی ہے۔ اس کا تاریخی پہلو بالکل لغو علمی پہلو بالکل مہمل ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیم یکسر ناقابل عمل ہے۔ وہی یورپ جس نے مسیح اور تعلیم مسیح کی حمایت میں شدید ترین ظلم کرنے سے بھی حجاب نہ کیا تھا آج اس کا یہ عالم ہے کہ وہ مسیح کو جاہل محض اور بائبل کو مجموعۂ مزخرفات بتاتا ہے۔ وہ انجیل کی اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں یونس کا تین دن تین رات تک مچھلی کے پیٹ میں رہنا بیان کیا جاتا ہے، اور ہنستے ہیں، وہ علانیہ کہتے ہیں کہ مسیح کو اتنا علم دنیا اور قدرت کا حاصل نہ تھا جتنا آج ایک اسکول کے لڑکے کو حاصل ہے۔ نہ وہ تاریخ سے آگاہ تھے نہ جغرافیہ سے نہ علم الحیات سے ان کو آگاہی تھی۔ نہ طبیعیات سے، نہ فلکیات کا علم اُنھیں حاصل تھا نہ سیاسیات کا۔ رہ گئی تعلیم اخلاق سو اُس کا یہ حال ہے کہ نہ پہلے کبھی اس پر کوئی انسان عمل کر سکتا تھا نہ آج اس کا امکان ہے۔

فرض کیجئے گزشتہ جنگ کے موقع پر مسیح اتحادیئن کی جنگی کونسل کے موقعہ پر موجود ہیں، اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں" اپنے دشمن سے محبت کرو" دریافت کیا جاتا ہے" کیا ایسے دشمن سے محبت کی جا سکتی ہے جو سر سے پاؤں تک مسلح حالت میں ہو کر گھر تباہ کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہے"۔ وہ فرماتے ہیں" اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو"۔ پھر پوچھا جاتا ہے کہ" دشمن کے تمام مظالم کا کیا علاج ہے"۔ مسیح جواب دیتے ہیں"۔ جو تم سے نفرت کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھلائی کرو، ان کے لئے دعائے خیر مانگو جو تم سے بُرا سلوک کرتے ہیں"۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل کی باتیں ہیں اور اگر مسیح واقعی جنگی کونسل میں شریک ہو کر یہی تلقین کرتے تو اُنکے ساتھ وہی سلوک نہ ہوتا جو کسی وقت یہودیوں اور اہل رومہ نے کیا تھا۔ یقیناً ہوتا کیونکہ مسیح کی یہ تلقین اخلاق آج بہ لحاظ سیاست و تجارت، تمدن و معاشرت، ایسی لغو و ناقابل عمل تعلیم ہے کہ اس سے زیادہ ناقص ذہن انسانی میں کوئی اور بات آہی نہیں سکتی۔

مسیح کہتے ہیں کہ" اگر کبھی ایک حقیر سی چڑیا بھی مر کر زمین پر گرتی ہے تو آسمانی باپ کا دل دُکھ جاتا ہے"۔ لیکن اگر واقعی کوئی آسمانی باپ ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیوں نہیں وہ ان تمام مظالم کو روکتا جو حقیر چڑیا کیا معنی بڑی بڑی انسانی ہستیوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

مسیح کا ارشاد ہے کہ" آسمانی باپ سر کے تمام بالوں کا شمار رکھتا ہے"۔ لیکن ایک سائنس داں دریافت کر سکتا ہے کہ کیا وہ آسمانی باپ اُن خوردبینی خلایا کا بھی شمار رکھتا ہے، جو رحم کے اندر خدا معلوم کسی مقدس راہب کی تعمیر میں مصروف ہیں یا کسی قزاق و رہزن کی آفرینش میں۔

مسیح فرماتے ہیں :- "ایک باپ اپنے بیٹے کو روٹی دینے پر بھی قادر نہیں ہے، یہ آسمانی باپ ہی کا کام ہے جو مانگنے والوں کو دیتا ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتا ہے"۔ لیکن آج تک نہیں دیکھا گیا کہ کسی مرنے والے کی ماں یا بیوی کی دعا اس کی جان بچانے میں مقبول ہوئی ہو، یا کوئی بڑے سے بڑا راہب، مولوی یا ولی اس کا دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنی دعا سے رائفل کی گولی کو راستہ میں روک دے گا۔ اب وہ زمانہ ہے جب دنیا اس حقیقت کو جان گئی ہے کہ اگر ہمارا رومال کثیف ہے تو اسے ایک پیسہ کا صابن ہی صاف کر سکتا ہے اور اگر سارے زمانہ کے اولیائے کرام اپنی تمام عمر محض دعا کی مدد سے اس کو صاف اور اُجلا کرنے کی کوشش میں صرف کر دیں تو کامیاب نہ ہوں گے۔

مسیح کہتے ہیں۔ "آسمانی باپ کتنا مہربان ہے جو اچھے بُرے دونوں پر پانی برساتا ہے"۔ حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے یہ امر کس قدر مضحکہ خیز ہے، اگر واقعی پانی کا برسانا اسی آسمانی باپ کے ہاتھ میں ہے تو وہ اپنے اس اختیار کو کسقدر بے اصولی سے استعمال کرتا ہے کہ جہاں ضرورت نہیں وہاں تو وہ سیلاب کے سیلاب برپا کر دیتا ہے اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں گرتا اور ہزاروں لاکھوں انسان قحط سے مرجاتے ہیں۔

مسیح کا نظریہ عفو و درگزر کے باب میں "سات ستر مرتبہ" ہے یعنی ۴۹۰ بار۔ انگلستان کا وزیر حربیہ مسیح سے پوچھتا ہے کہ "ہم ایک جرمن آبدوز کشتی کے کپتان کو جس نے ایک اسپتالی جہاز ڈبو دیا ہے کتنی مرتبہ معاف کریں"۔ جواب ملتا ہے کہ "جب تک وہ ۴۹۰ اسپتالی جہاز نہ ڈبو چکے"۔ ایک حاکم عدالت دریافت کرتا ہے کہ "ایک شخص کو جو اپنی بیوی کو بے قصور چھوڑ رہا ہے اور اس کے معاش کا کفیل نہیں ہوتا کتنی مرتبہ معاف کر کے رہا کریں" - "وہی ۴۹۰ مرتبہ"۔ مسیح کہتے ہیں "ہاں"

وزیر حربیہ اور مجسٹریٹ دونوں یہ جواب سن کر اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں کہ "مسیح تو یونہی کہا کرتے ہیں، تم تو اس جرمن آبدوز کے کپتان کو فوراً گولی سے مار دو اور اس شخص کو جیل میں بند کر دو جب تک ۳۰ پونڈ ماہوار بطور معاش اپنی بیوی کو دیتے رہنے کی ضمانت نہ داخل کرے"۔

الغرض جس حد تک مذہبی معتقدات کا تعلق ہے۔ مسیحیت کا وجود دنیا میں باقی نہیں رہا، اور نہ موجودہ علمی و تمدنی ترقیوں کے زمانہ میں اس کے باقی رہنے کی کوئی صورت تھی۔ اسوقت یورپ و امریکہ کا اپنے آپ کو مسیحی یا عیسائی کہنا حقیقتاً ایک قومی یا نسلی تعین سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور نہ دنیا میں کوئی مذہب باقی رہ سکتا ہے اگر وہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں، اگر اس کی تعلیمات اس قدر وسیع جامع اور حاوی ہیں کہ ترقی ذہن و خیال کی رفتار کا ساتھ دے سکیں تو بیشک اس کا وجود باقی رہ سکتا ہے، ورنہ اس کے قائم رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اب ان تمام تمہیدی بیانات کے بعد آئیے مذہب اسلام پر غور کریں کہ اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کے متعلق یہ دعوے کرنا کہ وہ مذہبی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے کس حد تک صحیح ہے۔

مذہب اسلام کی تعلیمی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور اس کے بعد محمد کی سیرت کہ ان دونوں میں

اصولاً کوئی فرق نہ ہونا چاہیئے۔ ان دو ذریعوں کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی احادیث کا مجموعہ اور مذہب اسلام کی تاریخ ان کو کوئی حقیقی یا معیاری ذریعہ تحقیق کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان سے اگر کوئی کام لیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اسلام نے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی کس قدر موافقت کی، لوگوں نے اسلام کے مفہوم میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور یہ کہ اس میں حشو و زوائد کا اضافہ کب اور کن اسباب کے ماتحت ہوتا رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اسلام کی تعلیمات سے بحث کریں، مذہب کے مفہوم کو متعین کر لینا ضروری ہے۔

مذہب اگر انسان کے لئے کوئی ضروری چیز ہے تو دیکھنا چاہیئے کہ یہ ضرورت اس کی فطرت کے اقتضاء سے پیدا ہوئی ہے یا صرف ماحول کے اثر سے۔

اس کا جواب دینے کے لئے زیادہ غور و تامل کی حاجت نہیں، ابتدائے آفرینش سے لیکر اسوقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہونچنے میں ہماری مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری چیز ہے اور وہ محض اس لئے کہ انسان بالطبع تمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام بہت کچھ منحصر ہے، کسی اعتقادی قانون پر۔ یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے۔ بلکہ فطری اقتضاء ہے۔

اس لئے ایک مذہب کے بہترین مذہب ہونے کی علامت اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصول فطرت کے مطابق ہو، یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جسقدر ترقی کرتی جائے، مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے۔ یہ ایک ایسا اصول کسی مذہب پر تنقید کرنے کا ہے کہ اس کی صحت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اچھا تو آئیے سب سے پہلے اسی کو سامنے رکھکر اسلام کی جانچ کریں کہ وہ کس حد تک اس معیار پر پورا اُترتا ہے۔

قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کی گئی ہے، یہ ہیں:۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ ولا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک الدین القیم۔ یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرت الٰہی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے، اور فطرت الٰہی یہ ہے کہ جو قانون نظام عالم کا اس نے بنا دیا ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی وہ مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ ان چند الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر حاوی اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اس کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ:۔

"مذہب اسلام فطرت انسانی کا ساتھ دینے والا ہے اور اس بام ترقی تک پہونچانے والا ہے جو انسان کے تمام قوا کا منصہ کو بروئے کار لانے کے بعد بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر اُسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ترقی کے اصول کیا ہیں؟ یعنی اُس کلیہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا کہ جو اصول نظام عالم اور ارتقا کا قدرت نے مقرر کر دیا ہے اس میں کبھی

تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، اور ایک انسان کا فرض ہے کہ ہمیشہ سعی و کوشش سے کام لیکر ترقی کی راہیں پیدا کرے۔ اسی اصل کو خدا نے کہیں آیات محکمات کہا ہے، کسی جگہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا سے تعبیر کیا ہے، کبھی بصائر للناس بتایا ہے اور کبھی حبل اللہ سے اس کی صراحت کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اس امر کو سمجھ کر کاربند ہوا اور اگر اس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ "لیس للانسان الا ما سعی" (ایک شخص کو اتنا ملے گا جتنی وہ کوشش کرے گا)، تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہو گا، ترقی کی صورت کیا ہو گی، ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض یعنی اگر لوگوں نے مقررہ اصول حیات و ترقی کا یقین کر لیا اور انھوں نے اس پر کاربند ہو کر سعی و کوشش کی تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا دیں گے۔ کرۂ ارض کا وارث کر دیں گے اور وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے زبردست اقتدار و حکومت کے مستحق قرار پائیں گے۔

یہ ہے اصل روح اس تعلیم کی جو مذہب اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ عملی تعلیم نہ اس سے قبل کسی مذہب نے دی اور نہ آئندہ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش ہے۔

اسلام کی اولین شرط توحید ہے، لیکن چونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جا رہا ہے، اس لئے مختصراً اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آپ جس مولوی سے پوچھیے گا کہ توحید کسے کہتے ہیں، وہ یہی جواب دے گا کہ خدا کو ایک ماننا توحید ہے۔ حالانکہ اس مفہوم کی غلطی اسی سے ظاہر ہے کہ جب خدا کو زمان و مکان سے بے نیاز مانا جاتا ہے تو اس کو ایک کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جبکہ ایک کے مفہوم میں زمان و مکاں دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ اس سے مقصود وہ مفہوم ہے جو لفظ کُل سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، اسی لئے میرے نزدیک اگر خدا کا کوئی موزوں و مناسب نام ہو سکتا ہے تو وہ صرف کُل ہے اور اسی کو اسکا اسم اعظم قرار دینا چاہیئے۔ یہ مفہوم خدا کا ایسا ہے جس میں نہ کبھی شائبۂ شرک پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ صورتیں جو عام طور پر شرک سمجھی جاتی ہیں، داخل شرک ہو سکتی ہیں۔

خدا کو کُل سمجھنا، یعنی اس کو تمام کائنات کا محیط اعظم، دائرۂ کونین کا مرکز حقیقی موجودات کا خالق اصلی، عالم اسباب کا علۃ العلل قرار دینا، یہی مفہوم ہے اسلام کی توحید کا اور یہی مدعا ہے صوفیہ کی وحدت الوجود کا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ صوفیہ نے وحدت الوجود کو خوارق عادات اور کرامات فوق العادت کی بنیاد قرار دے کر اپنے آپ کو عضو بیکار بنا لیا اور سائنس نے اس کُل کو مظاہر جزئیات سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح معنے میں علم "خلیفۃ اللہی" بلند کیا۔

میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اگر کوئی شخص بت پرستی کرتا ہے، تو وہ شرک میں مبتلا ہے، کیونکہ بت پرستی حقیقتاً اسی کُل کے مختلف مظاہر و آثار کا مطالعہ ہے اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام

کاموں کا انحصار حقیقتاً انہیں پتھر کی مورتوں پر ہے۔

خدا کے مفہوم کی تعین میں سب سے بڑی غلطی ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ ہوئی ہے کہ اس کو دنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح پیش کیا گیا۔ جو خوش بھی ہو سکتا ہے، اور برہم بھی، حالانکہ ان دونوں کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا اگر کوئی شخص عمر بھر خدا کو گالیاں دے تو وہ برہم ہو کر اپنے قانون کو نہیں بدل سکتا، اور اگر کوئی ہر وقت سجدہ ہی میں پڑا رہے تو خوش ہو کر اس کی سعی سے زیادہ نہیں دے سکتا، اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بتوں کے سامنے جھکتی ہے متعدد خداؤں کی قائل ہے، تو وہ صرف اسی وجہ سے عنداللہ مغضوب ہے، درست نہیں، البتہ اگر اس کی بت پرستی یا شرک اُسے اوہام باطلہ میں مبتلا کر کے اس نصب العین سے ہٹا دینے والے ہیں، جو خدا کو واحد یا کل ماننے کی حالت میں سعی و عمل، کاوش و جستجو، اقدام و ترقی کی صورت میں رونما ہوتا ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت اس سے برہم ہے اور اُس کی برہمی یہی ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و حقیر رہیں، اور غلامی و اسیری کی زندگی بسر کریں۔

انتم الاعلون ان کنتم مومنین (تم کو بلند مرتبہ والا ہونا چاہیئے اگر تم مومن ہو) اسلام کی تعلیم ہے، اور یہیں سے ایمان کی حقیقت واضح ہوتی ہے، اور اُس توحید کی جو ایمان کی بنیاد ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص تمام عمر خدا کے ایک ہونے کا وظیفہ رٹتا رہے، لیکن وہ اس کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا رہتے ہوئے، سوائے مسجد میں اذان دینے کے اور کچھ نہیں کرتا تو کیا ایسے انسان کو اُن مومنین میں شامل کر سکتے ہیں، جن کے ایمان کا نتیجہ لازمی اقتدار و مرتبۂ بلند بتایا گیا ہے۔

اس لئے اگر ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہے، تو اس توحید کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا کو ایک سمجھا جائے، بلکہ اُس کو محیط کل باور کیا جائے، اصول فطرت کا مطالعہ کیا جائے، عالم اسباب پر نگاہ ڈالی جائے، اجتہاد و عمل کو معمول بنایا جائے، دماغی و ذہنی قوتوں سے کام لیا جائے اور کائنات کو مسخر کر لیا جائے۔ چنانچہ صراحتاً بیان ہوتا ہے کہ:-

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذالک
لآیات لقوم یتفکرون ؁

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے تابع فرمان ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ تم غور و فکر، تامل و تدبر، سعی و کاوش سے کام لو۔ پھر دیکھو کہ کیا بحر و بر کی تسخیر انسان کے لئے ناممکن ہے، کیا جبال و انہار پر آج انسانی اقتدار نہیں پایا جاتا۔ پانی، ہوا، آگ، بجلی، بادل، فضا، روشنی، حرارت، ہوا کے طیور، زمین کے چوپائے، پہاڑوں کے معدنیات پانی کے وجوات، الغرض دنیا میں کوئی چیز، کوئی کیفیت، کوئی قوت ایسی نہیں ہے، جو آج انسان کے اقتدار سے باہر ہو، لیکن کیا دنیا کا کوئی مذہب اس کا دعوے کر سکتا ہے کہ اس نے انسان کی ان جملہ ذہنی ترقیوں کا درس اسی طرح کھلے ہوئے الفاظ میں دیا ہے جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسلام نام ہے صرف قرآن کے تعلیمات پر عمل کرنے کا، اور اس لئے ہر وہ جماعت جو اس کی عامل ہے، مسلمان کہلائے گی خواہ وہ مسیح کی اولاد میں سے ہو، یا رام و لچھمن کی ذریات میں سے اور

جو اس پر عامل نہیں ہے، وہ یقیناً کافر، مشرک اور غیر مسلم کہلائے گی۔ خواہ وہ آلِ فاطمہ ہی سے کیوں نہ نسبت رکھے۔ یہ ہے قرآن کا فیصلۂ آخرین جو اس نے ایک مسلم و کافر کی تفریق و امتیاز کے متعلق سب کو سُنا دیا ہے، اور جس میں کبھی کبھی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو سکتی، خواہ انسانی ذہن و تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے، ہر جگہ تعلیم کی یہی عمومیت و درس کا یہی احاطۂ کامل اور تہذیب عمل کی یہی ہمہ گیری نظر آئے گی، عبادات کی تعلیم، صلاح و تقدس کا درس، غور و تامل کی ہدایت، تفکر و تدبر کی تاکید، الغرض ہر ارشاد اسی ایک اصول ترقی پر منحصر ہے، اور کسی جگہ رسمی، ظاہری، تمہیدی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدتِ عمل کا نظارہ ہے، روزہ میں بھی اسی احساسِ انسانیت کی تعلیم ہے، زکوٰۃ میں بھی وہ تعاون و ہمدردی کا سبق ہے، حج میں بھی وحدتِ عمل مقصود ہے، اور جہاد نفس و مال اس محنت و جفاکشی، اُس ایثار و قربانی کی تعلیم ہے، جو اساس ارتقاء اور بنیادِ اخلاق ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہونچا وہ ڈارون کا اصول ارتقاء (EVOLUTION) تھا، لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کی حقیقت پر گفتگو کی وہ اسلام ہی کا پیرو، ابو النصر محمد فارابی تھا اور ڈارون سے بہت قبل ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ، حکمائے اسلام ہی تھے، جنھوں نے اصولِ ارتقاء کو بڑی حد تک مدون کیا۔

ممکن ہے آج مولوی اس کو بھی کفر و الحاد کہیں اور قدیم حکمائے اسلام کو کافر و ملحد کے خطاب سے یاد کریں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج و اصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ آج چونکہ ڈارون کے نام سے یہ نظریہ منسوب کیا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے، علمائے کرام اس کی تضحیک کرتے ہیں، حالانکہ اگر نظر وسیع ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے دریافت کا فخر بھی فرزندانِ اسلام ہی کو حاصل ہے، اور قرآن میں خود جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

۱- ربنا الذی اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ہدیٰ۔

(میرا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت و جبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مائل کیا۔)

کیا ڈارون کے اصولِ تنازع کا کوئی دوسرا مفہوم ہے۔

۲- لیس للانسان ما سعیٰ - رفع بعضکم فوق درجات۔

کیا تنازع للبقاء اور صلاحیت کے لحاظ سے، مختلف درجات قیام کی تعیین اور بقائے اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا کلام مجید میں مومنین، مسلمین، صالحین، قانتین وغیرہ کے جو سینکڑوں الفاظ آئے ہیں، وہ افراد اصلح کو ظاہر نہیں کرتے اور کیا (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

۳۔ ھوالذی انشاءکم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع۔

کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (PROTON) بھی کہتے ہیں، کوئی دوسری چیز ہے۔ کیا فمستقر سلسلۂ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا اور کیا مستودع سے سلسلۂ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الغرض نظریۂ ارتقاء کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے، جس کی طرف قرآن نے رہبری نہ کی ہو۔ اور اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علم وحکمت کے اس محکم ترین نظریہ کا ہم آہنگ نظر آتا ہے اور پھر ایک اسی مسئلہ پر کیا موقوف ہے، تمام وہ مسائل جو اساسی طور پر کسی نہ کسی نہج سے مذہب کے متصادم ہو سکتے ہیں۔ سب کے لئے قرآن میں بہترین اشارات پائے جاتے ہیں، اور ایسے مستحکم ومضبوط کہ ذہن انسانی اپنے بلند ترین نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد بھی ان میں جنبش پیدا نہیں کر سکتا۔

فلکیات میں بطلیموس اور ارسطاطالیسی نظام کی تردید سب سے پہلے جس نے کی وہ قرآن ہی تھا کہ اس نے ان اجرام کو کل فلک یسبحون کہکر یہ بتایا کہ یہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کوپرنیکی نظام قائم ہوا جس میں غلطی سے سورج کو اپنی جگہ ساکن مانا گیا، پھر ایک زمانہ کے بعد ہرشل نے گزشتہ صدی میں ثابت کیا کہ آفتاب مع اپنے تمام سیارگاں کے خود کسی اور چیز کا طواف کر رہا ہے، حالانکہ قرآن اس سے بہت قبل اس حقیقت کا اظہار کر چکا ہے کہ والشمس تجری لمستقر لھا۔ اسی طرح علوم جدیدہ کے اور بہت سے اساسی مسائل ایسے ہیں جو تعلیمات قرآنی کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں اور اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے تو یہ دعوےٰ غالباً غلط نہ ہوگا۔

اب رہ گئی اس کی اخلاقی تعلیم جو حقیقتاً اساس تہذیب وتمدن ہے، سو اس کے متعلق غالباً مخالفین کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اسلام سے زیادہ عملی درس دینے والا، اور زندگی کو کسر اضطراب عمل ثابت کرنے والا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد نہ خرافیات پر ہے نہ صنمیات پر، نہ جس کا انحصار اساطیر الاولین کے ماننے پر ہے نہ کسی مخصوص رسم ورواج اور طریق عبادت ونیایش پر، اس نے صرف ایک تعلیم دی ہے کہ دنیا میں آئے ہو تو کائنات پر غور کرو، مظاہر قدرت کا مطالعہ کرکے اپنی اُن قوتوں کو بروئے کار لاؤ، جو تمہارے اندر ودلیعت کر دی گئی ہیں، نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت پیدا کرو، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی کرو اور اپنی سعی وکوشش سے دنیا کو اپنے لئے فردوس بنالو۔ پھر جو شخص اس اصول پر کاربند ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی کے اُصول پر کاربند کہلائے گا خواہ وہ کسی رنگ ونسل کا ہو اور جو اس پر عامل نہیں ہے اُس کو مسلمان کہلائے جانے کا کوئی حق حاصل نہیں، خواہ حطیم کعبہ ہی کے اندر اس کی ماں نے کیوں نہ اسکو جنا ہو۔

نماز اصولاً ورزش اجتماع ہے، زکوٰۃ اصولاً جذبۂ تعاون ہے، روزہ اصولاً حسیات لطیف کی بیداری ہے، اور حج اخوت و انسانیت کا احساس وسیع پیمانہ پر۔ اس لئے اگر قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کے لئے ان کے لئے مخصوص قواعد مرتب کئے جائیں۔ تو تعلیم الٰہی کے منافی نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ یہ تمام قواعد و ضوابط صرف سوسائٹی سے متعلق ہیں۔ اور انسانی معاشرت کو اسلوب بلند پر لانے کے لئے ہمیشہ ایسے قوانین مرتب کئے جاتے ہیں جو جماعت کے افراد میں باہم انتشار خیال و اختلاف اعمال کے امکانات کو دور کرکے ہیئت اجتماعی کو متاثر نہ ہونے دیں، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ آج کا بنایا ہوا قانون کل اور کل کا بنایا ہوا پرسوں کام نہیں دے سکتا۔ اور اس میں زمانہ و ملک کے لحاظ سے تبدیلی کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کو ہمارے علمائے کرام نے نہیں سمجھا اور یہی مسئلہ میرے ان کے درمیان استخوان جنگ بنا ہوا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی فقہ ایک چیز ہے، میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام نام ہے صرف ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنے کا، مقررہ قواعد کے ماتحت روزہ رکھنے کا متعین مقدار کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ طریقے اور قاعدے اصل چیز نہیں ہیں بلکہ ہر زمانہ کے لحاظ سے بدلنے کی چیزیں ہیں اس لئے نہ ان پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور نہ ان کو مذہب میں داخل کرنے کی۔ بلکہ اگر آج ترقی تمدن ضروریات معاشرت، اقتضاء مشاغل یا کسی اور مصلحت کی بناء پر جس کی رعایت ہماری دنیوی فلاح کے لئے ضروری ہے۔ فقہ کو بدل ڈالنا اصول عبادت میں تغیر و تبدل کر دینا، ضابطۂ معاشرت میں ترمیم و تنسیخ کر دینا، مناسب ہو تو ایسا کر دینا چاہئے اور یہی اولین فرض ہے، ایک ذی شعور عالم دین کا۔ ایک صاحب فہم اخلاقی رہبر کا۔ اور ہر اس ہادی مذہب کا جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا تحریف مذہب ہوگی، اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تو دعوے بالکل غلط ہوگا، کیونکہ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو آج حنبلی فقہ، حنفی فقہ، شافعی فقہ کی تفریق کیوں ہوتی۔ اشاعرہ و معتزلہ کی جماعتیں کیونکر پیدا ہوتیں، قرون اولےٰ میں تاویلات کا دروازہ کیوں کھلتا، اجتہادات و قیاسات میں اختلاف کیوں ہوتا اور اقوال آئمہ و مجتہدین میں اس قدر اصولی اختلافات کیسے پیدا ہوتا کہ آج یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ رسول اللہ واقعی ہاتھ باندھکر نماز پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ کھول کر۔

ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد وہ مسائل نہیں ہوا کرتے جن میں دو گروہ کے اختلاف کو گوارا کیا جا سکتا ہے، بلکہ اساس مذہب صرف وہ مقصود ہوتا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، پھر مذہب اسلام کا اساسی اصول صرف ایک ہے، جسے قرآن میں ہر جگہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا میں اخوت عامہ و انسانیت کے رشتہ کو مضبوط کرو۔ اور ہر ممکن ترقی کے حصول پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر اس سے کسی کو اختلاف ہو تو بیشک ہم کہیں گے کہ وہ اسلام سے خارج ہے انسانیت سے علیحدہ ہے، لیکن جب تک کوئی شخص اس اصل تعلیم کو مانتا ہے، اور اس پر عامل ہے اسوقت تک کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے دائرۂ مذہب سے خارج کر دے، خواہ وہ نماز کا عادی ہو، یا نہ ہو، روزہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ یہ درست

ہے۔ کہ قرآن میں ان شعائر اسلامی کی پابندی کا ذکر موجود ہے۔ لیکن صرف ایک منقضی الوقت و منقضی المقام قانون کی حیثیت سے اور آج اگر ضرورت ہو تو ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ کلام مجید کی عظمت کو اس سے صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

حقیقت سے ہٹ کر فروغ کو اصل قرار دینے کی داستان بہت طویل ہے اور اگر اس کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد عہد سعادت کے ختم ہوتے ہی پڑ گئی تھی، لیکن بعد کو اس میں اور اضافے ہوتے گئے، گمراہیوں میں اشتداد ہوتا رہا، صراط مستقیم سے ہٹنے کے بعد زیادہ پیچ در پیچ راہوں میں الجھتے گئے، یہاں تک کہ آج اسلام کا مفہوم ہی بالکل بدل گیا۔ اور وہ انسانیت کی سطح بلند سے گر کر رسم و رواج، اوہام باطلہ، اعتقاد سخیفہ، مفروضات ردیہ اور مزعومات کاذبہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا۔ اور چونکہ گمراہی شدید ہے، ضلالت سخت ہے، اور اسلام کا درس اولین دماغ سے بالکل محو ہو چکا ہے۔ اس لئے اب جو صحیح بات بتائی جاتی ہے تو اس کو بھی غلط سمجھا جاتا ہے اور عرصہ تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔

اسلام و ایمان حقیقتاً نام تھا صرف اتحاد امت کا، نفسی و مالی جہاد کا، سعی و عمل کا، مکارم اخلاق کا، سیر و افی الارض کا۔ اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو، جہاد سے جی چرانے کو، محنت و کوشش سے منحرف ہونے کو، اصول اخلاق سے ہٹ جانے، اور پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ جانے کو۔ لیکن اب اسلام ہے نام صرف تسبیح و عمامہ کا، جبہ و دستار کا، رسمی نماز ادا کر لینے کا، اور سر منڈا کر رسماً و تقلیداً حرم کے طواف کر لینے کا۔ اسی طرح کفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہو گیا ہے۔ اگر آج میں کسی مولوی سے فلسفہ عبودیت پر بحث کر کے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں، تو وہ مجھے کافر، ملحد، فاسق و فاجر کہکر ٹال دیتا ہے۔

بہر حال دنیا میں مذہب کی ضرورت یقیناً ہے، کیونکہ جامعہ بشری اس کا محتاج ہے، اخلاق کی تعلیم کے لئے کسی نہ کسی ایسی بنیاد کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے قوانین لوگوں پر عائد کر سکے۔ وہ مذہب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اسلام ہے، جس کی آغوش ساری دنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات فطری ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد غالباً یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ دنیا میں یا جوجی قوت کونسی ہو سکتی ہے۔ وہ جو اپنی تنگ نظری سے خود اپنے افراد کو بھی علحدہ کر رہی ہے۔ یا وہ جو ساری دنیا کو دعوت عمل دے کر ایک مرکز پر ایک غرض مشترک کے ساتھ جمع کرنا چاہتی ہے۔

نیاز

ایک چتا میں دو شعلے

آفتاب غروب نہ ہوا تھا لیکن آسمان پر اتنا گہرا بادل چھایا ہوا تھا کہ اندھیرا کافی ہو گیا تھا، اور تیز ہوا کی وجہ سے گرد و غبار اٹ گیا تھا جس نے اور بھی رہی سہی روشنی محو کر دی تھی، عین اُسوقت راج کشور اپنی نوعروس کو لئے ہوئے معہ اپنے چند عزیزوں کے کشتی پر دیگھا گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا تیز ہونے لگی اور دفعتًا اس زور کی آندھی اور بارش شروع ہوئی کہ ملاحوں کے حواس گم ہو گئے اور وہی ہوا جس کا خطرہ تھا یعنی کشتی اُلٹ گئی۔

ایک گھنٹہ کے بعد بادل برس کے نکل گیا۔ ہوا بھی تھم گئی۔ آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ چاند چمک رہا تھا اور اسکی نکھری ہوئی شفاف روشنی گنگا کی پر سکوت سطح پر مچل رہی تھی۔ راج کشور کو جب ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو بھیگے ہوئے کپڑوں میں ریت پر پڑا پایا۔ متوحش نگاہوں سے اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ کشتی کا اُلٹنا یاد آتے ہی اُسے چکر سا آ گیا۔ اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب اوسان کچھ بجا ہوئے تو بے اختیار ادھر اُدھر مضطرب ہو کر دیکھنے لگا۔ اس خیال سے کہ معلوم نہیں اُس کے ہمراہیوں کا کیا حشر ہوا؛ اپنے باپ کا جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ خیال آتے ہی وہ بلبلا کر رونے لگا۔ اسی طرح اُسے اپنی نئی دلہن کا جسے اس نے ابھی دیکھا بھی نہ تھا خیال آیا۔ وحشت میں وہ ادھر ادھر پھر رہا تھا کہ ناگاہ چاندنی میں اُس نے دیکھا کہ کوئی چیز سُرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی پڑی ہے۔ وہ امید و بیم کے ساتھ اس طرف بڑھا۔ دیکھا کہ کوئی لڑکی عروسی کے کپڑے پہنے بھیگی ہوئی خوف کے مارے سمٹی جا رہی ہے۔ لڑکی اس کو اپنی طرف آتا دیکھکر اور سہم گئی اور اپنی سُرخ چادر اپنے چاروں طرف لپیٹ لی۔ راج کشور کو یہ سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی کہ وہ کون ہے۔ وہ بے اختیار بول اُٹھا:-

"پرماتما نے تم کو بھی میری طرح بچا لیا" لڑکی خاموش رہی۔ بلکہ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ راج کشور نے کہا:-

"میں تمہارا بدنصیب شوہر ہوں۔ اب اس مصیبت میں شرم و حیا فضول ہے۔ تم کو اور لوگوں کی بھی کچھ خبر ہے؟"

"جی نہیں" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

راج کشور کا جی پھر اُمنڈنے لگا۔ اس جگہ کی مایوس کن تنہائی سے اس کا دم اُلجھ رہا تھا۔ آخر کار وہ رونے لگا۔ اور اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ لڑکی کے بھی اس سانحہ سے ہوش و حواس صحیح نہ تھے۔ راج کشور کو روتا دیکھکر وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ راج کشور سے نہ رہا گیا۔ اُس نے ایک بے بسی کے انداز میں اپنی آغوش اُسکے سامنے کر دی۔

اور جب صبح ہوئی تو آفتاب کی سنہری کرنیں دو معصوم ہستیوں پر پڑ رہی تھیں۔ جو دنیا و مافیہا سے بے خبر چمکتے ہوئے ریت پر غافل پڑی تھیں۔

راج کشور کی آنکھ پہلے کھلی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے ماحول کو محسوس کر کے وہ پھر پریشان ہو گیا۔ اشنان کر کے لڑکی کو بھی جگایا۔ وہ بیچاری بھی اسی طرح بدحواس تھی۔ راج کشور نے اسکو تسلی دی۔ اور پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"— "کسوم"۔ لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ راج کشور "کسوم" کو وہیں چھوڑ کر بہت دور دور تک سر مار آیا۔ لیکن اس کے ہمراہیوں کا نشان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کسوم کے پاس واپس آ کر اپنی ناکامی کا حال تبلایا۔ دونوں پریشان تھے کہ کیا کریں۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک ملاح اپنی کشتی کھیتا جا رہا ہے۔ راج کشور نے اسے پکارا جب وہ کنارے آیا تو دونوں کشتی پر سوار ہو گئے اور چند گھنٹوں کے بعد دیگھا گھاٹ پہونچ گئے۔

راج کشور کا اب کوئی قریب کا عزیز باقی نہ رہا تھا۔ وہ وکالت کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس کے باپ کے ایک قدیم ملنے والے منشی برج نرائن پنشنر ہیڈ ماسٹر کلکتہ میں مستقل طور پر رہتے تھے۔ راج کشور نے ان کو اپنے والد کی اچانک موت کی خبر دی مگر شادی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ انھوں نے اس کو کلکتہ بلا لیا۔ اس نے وہیں کرایہ پر ایک مکان لے کر پریکٹس شروع کر دی۔ ذہانت اور سخت جفاکشی کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں معقول آمدنی ہونے لگی۔ اب اس نے کسوم کو بھی وہیں بلا لیا۔ لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ بابو برج نرائن سے اس نے اس کو مخفی رکھا۔ چھ مہینے ہنسی خوشی سے گذر گئے کسوم کی صرف یہ کوشش تھی کہ وہ راج کشور کو خوش رکھ سکے۔ راج کشور بھی اس کی بھولی بھالی اداؤں کا جو معصومیت اور اخلاص سے لبریز ہوتی تھیں۔ پہروں مزہ لیا کرتا۔ ایک روز باتوں باتوں میں راج کشور نے پوچھا۔ کسوم تم کو اپنا گھر تو بہت نہیں یاد آتا۔ شادی کے بعد سے وہاں کی کوئی خبر بھی نہیں معلوم ہوئی۔ تم وہاں جانا تو نہیں چاہتیں۔ کسوم مسکرا کر بولی۔ میرا وہاں کون ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب میں بہت کمسن تھی تو گاؤں میں ایک نہایت خوفناک طاعون پھیلا۔ اور اسی میں مبتلا ہو کر میرے ماں باپ دونوں مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت جی مہاراج نے جو میرے پڑوس میں رہتے تھے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر اب تک جیسی گذری اس کے خیال سے جی کانپنے لگتا ہے۔ گھر میں ہر شخص ذلیل نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پنڈت جی کی بیوی اور لڑکیاں مجھ سے بہت بُری طرح پیش آتی تھیں۔ مہراج میرا خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ باہر کے آدمی ان کو کیا معلوم کہ گھر کے اندر کیا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا تھا کہ شادی کس بے ترتیبی سے ہوئی۔

کسوم کی زبان سے یہ باتیں سُن کر راج کشور کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس لڑکی سے اُس کی شادی ہوئی تھی اُس کے ماموں جل گاؤں کے کاشتکار تھے اور وہی اُس کے سرپرست تھے۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا تمہارے گاؤں کا نام کیا تھا؟" اب کیا تم کو اتنا بھی یاد نہیں۔" کسوم راج کشور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔" شادی سے

پہلے آخر تم بھی تو ایک ہفتہ اپنے دوست کے یہاں ٹھہرے تھے۔ کیا کرن پور نہیں یاد نہیں رہا۔" راج کشور سخت پریشان ہو گیا۔ کچھ اور گفتگو کے بعد اسے قطعی طور پر یہ معلوم ہو گیا۔ کہ کسوم وہ لڑکی نہیں۔ جس کے ساتھ جل گاؤں میں اس کا بیاہ ہوا تھا۔ لیکن اس نے اس کا اظہار کسی طرح کسوم پر نہ ہونے دیا۔ وہ پریشان تھا کہ کیا کرے۔ یہ بات نہایت نازک تھی۔ کسوم کے اصلی شوہر نہ ہونے کی حیثیت سے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا راج کشور ہرگز گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ یہ کسی طرح ممکن تھا کہ کسوم کو جس کا کوئی پرساں حال نہ تھا بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

راج کشور جب سے کلکتہ آیا تھا۔ اپنے پیشہ میں بہت منہمک تھا۔ لیکن فرصت کے وقت وہ کبھی کبھی منشی برج نرائن کے یہاں بھی ہو آتا تھا۔ اور جب سے کسوم کا اصلی حال معلوم ہوا تھا۔ برج نرائن کے یہاں اسے ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

کنول برج نرائن کی تنہا اولاد تھی۔ اور جب سے ان کا جوان لڑکا مر چکا تھا۔ اُن کی تمام امیدیں صرف کنول کی خوشی سے وابستہ تھیں۔ کنول نے سال گزشتہ ایف۔اے درجہ اول میں پاس کیا تھا۔ اور اس تعلیم نے کنول میں ایک مغربی رنگ پیدا کر کے اس کے اچھوتے حسن کو اپنی جگہ پر مکمل کر دیا تھا۔ کنول جب اپنے بالوں میں متعدد جگہ نشیب و فراز پیدا کر کے ان کو سنوارتی۔ اپنی باریک ساری جس میں سے اُس کے کندن جیسے بدن کی روشنی چھنتی تھی زیب تن کرتی۔ اپنے خوشنما انگریزی وضع کے جوتے پہنتی۔ اور اس طرح جب وہ اپنی بغل میں کتاب دبائے۔ اسکول کی گاڑی کی طرف جو روز صبح کو وقت سڑک پر اس کا انتظار کرتی تھی۔ چلتی تو صدہا نگاہیں بے اختیار کھچ جاتیں اور وہ ایک فاتحانہ استغنا سے جلدی جلدی چل کر گاڑی میں ہو لیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک مخلوق اپنی حسرتیں اس کے پاؤں کے نیچے ڈال دے۔ اور وہ انھیں ہنس کر لاپرواہی سے ٹھکرا دے۔ اگر وہ کسی ایسے مرد کو دیکھتی جس کی نظروں میں اس کو دیکھ کر التجا کا رنگ نہ آ جاتا۔ تو اس کے حسن کو ایک ناقابل برداشت ٹھیس لگتی۔ راج کشور کا روز روز کا آنا جانا رنگ لا کر رہا۔ اس کی سنجیدہ طبیعت، اس کی شائستہ گفتگو اور پھر اس کی رعنائی۔ یہ سب باتیں ایسی نہ تھیں کہ کنول اس سے متاثر نہ ہوتی۔ راج کشور بھی کنول کے اس احساس کو سمجھ گیا تھا اور سمجھ کر خوش تھا، کنول کی نکتہ سنجی، اس کی ذہانت، اس کی اعلیٰ تعلیم اور اس تعلیم کے اثر سے اس کی اداؤں کی دلفریبی ایسی باتیں نہ تھیں کہ راج کشور داد نہ دیتا۔ اس کو اس کا قلق تھا کہ کسوم اس کے عمیق حیات کے مطالعہ سے قطعی نابلد ہے۔ اور اسکی فراست و ذہانت کو نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ داد دے سکتی ہے۔ یہ تھی وہ رُکاوٹ جو کسوم کا حال معلوم ہونے کے بعد اس میں اور راج کشور میں پیدا ہو گئی تھی۔ برج نرائن صاحب کے کہنے سے کنول اپنے درس فلسفہ کا کوئی مسئلہ جس میں اُس کو کچھ شبہ ہوتا۔ راج کشور کے سامنے لاتی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ راج کشور کی ذرا سی تنقید سے اس کی پوری تشفی نہ ہو گئی ہو۔ راج کشور کا یہ معمول ہو گیا کہ بلا ناغہ شام کی چائے برج نرائن صاحب کے یہاں پیا کرتا، اتفاق سے اگر راج کشور کو دیر ہو جاتی

تو کنول کو الجھن ہونے لگتی۔ اور وہ اگر اسی درمیان میں آ جاتا تو کنول خوشی سے اُچھل پڑتی۔ اس کا چہرہ چمکنے لگتا۔ اور راجکشور کو اس انتظار کرانے کے جرمانہ میں ایک پیالی چائے زیادہ پینی پڑتی۔ اور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس کو اس پیالی میں سرور محسوس نہ ہوتا تھا۔

راج کشور جب گھر آتا تو پریشان رہتا۔ اس کی جان عجیب کشمکش میں تھی۔ کسوم اس تغیر کی وجہ بالکل نہ سمجھی۔ راج کشور کے اگلے التفات کے لئے وہ ترسا کرتی۔ پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔ ایک روز راج کشور نے کہا:-

"کسوم میں دن بھر کچہری میں رہتا ہوں۔ تمہاری طبیعت نہیں گھبراتی۔ تمہیں پڑھنے کا شوق نہیں"

"اچھا مجھے پڑھائیے" کسوم نے لجاتے ہوئے کہا۔

"تم خود دیکھتی ہو کہ مجھے کہاں فرصت رہتی ہے؟ دن بھر موکلوں میں پھنسا رہتا ہوں۔ میں تمہارا داخلہ کسی سکول میں کرا دوں"

"میں اسکول میں پڑھوں گی۔ مجھ سے اتنی لڑکیوں کے بیچ میں کیسے جایا جائے گا؟"

راج کشور کا لہجہ اب زیادہ سنجیدہ تھا۔ اور کیوں اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ دیکھو بڑے بڑے شریفوں کی لڑکیاں اسکول پڑھنے جاتی ہیں۔ چار لڑکیوں کے ساتھ رہو گی، تو بہت سی اچھی باتیں آپ سے آپ آ جائیں گی۔ کسوم! علم بڑی دولت ہے۔ بغیر علم کے آدمی نہ تو اپنا برا بھلا سمجھتا ہے اور نہ اپنے پرائے کو پہچان سکتا ہے۔ میں تمہارا داخلہ اسکول میں کرا دوں اور تم وہیں بورڈنگ میں رہا کرنا۔ بغیر بورڈنگ میں رہے آدمی کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ کیوں؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟

"جیسی آپ کی مرضی" کسوم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن جب راج کشور باہر چلا گیا تو اس خیال سے کہ اسے بورڈنگ میں راج کشور سے بالکل علحدہ رہنا پڑے گا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

چھ مہینے کسوم کو اسکول میں پڑھتے ہوئے ہو گئے۔ اس درمیان میں راج کشور اس کے پاس صرف دو مرتبہ گیا۔ وہ بھی اس کی فیس وغیرہ جمع کرنے کے لئے اور۔ ان میں جو گفتگو ہوئی وہ صرف کسوم کی تعلیم کے متعلق۔ کسوم آخر کب تک سینہ پر سل رکھ کر اپنے دل کو بہلاتی۔ اس کا ننھا سا دل اس سخت امتحان کے لئے تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ آخر وہ کمرہ بند کر کے اپنی موجودہ حالت پر بیٹھی غور کیا کرتی۔ اکثر اس کا اضطراب غالب آتا اور وہ یہ سوچکر اپنا دل بہلا لیتی کہ راج کشور مجھ سے میری جہالت کی وجہ سے برگشتہ رہتا ہے۔ اب گرمیوں کی تعطیل میں۔ میں خوب پڑھ کر اس کے پاس جاؤں گی۔ تو وہ پہلے کی طرح مجھ سے پھر خوش رہا کرے گا۔ اس خیال سے وہ خوب جی لگا کر پڑھنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سالانہ امتحان میں اسکو دو درجوں کی ترقی دی گئی۔ وہ چار روز کی تعطیل جب ہوتی تو اس کی ہمجولیاں اس کو چھیڑتیں۔ کہ تم اپنے گھر کیوں نہیں جاتیں؟

وکیل صاحب تم کو بلاتے کیوں نہیں۔ کسوم یہ کہکر ان کو ٹالدیتی:۔
"میں خود نہیں جاتی۔ کتابوں میں جو مجھے لطف آتا ہے وہ کہیں نہیں آتا" اس پر لڑکیاں اسے بہت دق کرتیں۔ ان کے سامنے تو وہ بہ ظاہر بہت خوش رہتی۔ لیکن اس کے دل میں نہایت ہی تکلیف دہ خلش پیدا ہوتی۔ اور جب وہ تنہا رہجاتی تو خدا معلوم کیسے کیسے وہم اس کے دل میں گزرتے۔

گرمیوں کی تعطیل کو صرف دو ہفتہ رہ گئے ہیں۔ ساری لڑکیاں گھر جانے کی خوشی میں پھولی نہیں سماتیں۔ کسوم نے بیٹھے بیٹھے ایک خط راج کشور کے نام لکھ ڈالا۔

پران ناتھ!

ڈرتی ہوں کہ آپ میری اس ہمت پر ناراض نہ ہو جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ آپ میرے ہاتھ کا خط دیکھکر خوش بھی ہوں گے۔ لڑکیوں نے اپنے بھائی بہنوں کے لئے کروشیا کے بہت سے تحفے تیار کئے ہیں، میں نے بھی آپ کے لئے بہت سی اچھی اچھی چیزیں بنائی ہیں۔ جب آؤں گی تو آپ کے قدموں پر رکھوں گی۔ آپ میرے لئے خرچ بہت زیادہ بھیجتے تھے۔ میں نے اس میں سے بہت سا روپیہ جمع کر لیا ہے۔ لیکن اس کو میں آپکو واپس نہ دوں گی۔ میں نے انکے لئے ایک بہت اچھا استعمال سوچا ہے۔ جب آپ ملیں گے تو بتاؤں گی۔

آپ کی داسی

راج کشور برج نرائن کے یہاں سے واپس ہی ہوا تھا کہ ڈاکیہ نے اس کو کسوم کا خط لاکر دیا۔ پڑھکر اسے واقعی خوشی ہوئی۔ لیکن رنج بھی کم نہ ہوا۔ اس کو اپنے اندر ایک کھٹک محسوس ہوئی جس میں لطف کا ایک پہلو ضرور تھا لیکن کلفتیں زیادہ تھیں۔ جس قدر اس نے سوچا گتھیاں زیادہ پڑتی گئیں۔ پریشان ہو کر وہ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ آخرکار وہ گھر سے نکلا اور اسکول کی طرف چلدیا۔ راستہ میں کئی دفعہ اس کے پاؤں نے اس کو جواب دیدیا۔ اس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہونے لگی۔ اور وہ ٹھٹکا کہ گھر واپس جائے۔ لیکن وہ طاقت جو اسکول اسکو لیجانا چاہتی تھی۔ غالب آئی اور وہ اسکول کے احاطہ میں داخل ہو کر سیدھا ہیڈ مسٹرس کے دفتر میں پہونچا۔ اور ملاقاتی کارڈ بھیجکر باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو دور سے چند لڑکیاں اسکول سے بورڈنگ کی طرف جاتی دکھائی دیں۔ اس نے دیکھا کہ ان میں ایک کسوم ہے۔

راج کشور کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخرکار راج کشور نے اس خیال سے کہ کسوم اس کو پہچان نہ لے اپنے منھ پر رومال ڈال لیا۔ اتنے میں آدمی نے آکر کہا کہ ہیڈ مسٹرس آپ کو سلام کہتی ہیں۔

راج کشور ہیڈ ماسٹرس کے دفتر میں اپنی حالت سنبھال کر پہنچا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" ہیڈ مسٹرس نے کہا۔
"کسوم کو میں گرمیوں کی تعطیل بھر آپ کی زیر نگرانی بورڈنگ ہی میں رکھنا چاہتا ہوں"۔ راج کشور نے رُک رُک کر کہا۔
"تعطیل میں سب لڑکیاں اپنے گھر چلی جائیں گی۔ پڑھائی بھی بند ہو جائے گی۔ کسوم یہاں بیکار۔ تنہا کیسے رہے گی۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ کیونکر گوارا ہو گا کہ سال بھر کے بعد تعطیل میں بھی وہ آپ سے علحدہ رہے"۔
"کیا کروں؟ کچھ مجبوریاں اسوقت ایسی ہیں کہ اور کوئی چارہ نہیں"۔
"اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ میں کسوم کے متعلق ضروری انتظام کر دوں گی"۔
اس کے بعد راج کشور گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ برج نرائن صاحب کا آدمی آیا تھا۔
راج کشور کو اول تو ان الجھنوں نے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ دوسرے وہ تھک بھی بہت گیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اس وقت وہاں نہ جائے۔ لیکن یک بہ یک اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اور بغیر کسی ارادہ کے گھر سے نکل پڑا۔ اس نے غور کرنا چاہا کہ وہ آخر کیوں اس درجہ بدحواس ہے۔ لیکن دماغ اس کو جواب دے رہا تھا۔
برج نرائن صاحب باہر بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "راج کشور آج تم نے بڑی راہ دکھائی۔ ہم لوگ کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں، کنول کو آج حرارت ہے"۔ راج کشور خاموش دیوار کی آڑ لئے کھڑا رہا۔ برج نرائن کی سمجھ میں نہ آیا کہ خلاف معمول یہ حالت راج کشور کی کیوں ہے؟ پوچھا "کیوں تم آج ایسے متوحش کیوں نظر آتے ہو۔ اندر چلو۔ تم ایسے کھڑے ہو جیسے کچھ سنا ہی نہیں"۔ راج کشور چونک پڑا اور بولا "کوئی خاص بات نہیں۔ طبیعت ذرا آج بھاری ہے۔ چلئے اندر تشریف لے چلئے"۔ کنول۔ ایک مسہری پر پڑی تھی۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ برج نرائن نے پوچھا "کیسی طبیعت ہے۔ ٹمپریچر کیا ہے؟" کنول کا چہرہ بخار کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ گالوں کی گلابی رنگت تپ کی گرمی سے ایک دل آویز سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی اور بالوں سے چھپی ہوئی فراخ پیشانی پر کہیں کہیں پسینہ کے قطرے چمک رہے تھے۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد راجکشور ایک کرسی لے کر بیٹھ گیا۔ کنول کو تعجب تھا کہ وہ کیوں اس قدر خاموش اور کھویا ہوا سا ہے۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو رہی۔ رات چونکہ کافی گذر چکی تھی۔ راج کشور عذر کر کے گھر واپس آیا۔ کھانا نہیں کھایا۔ اور کپڑے اُتار کر لیٹ گیا۔ اُسوقت دو تصویریں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ ایک کسوم کی تھی۔ دوسری کنول کی۔ اور اس خیال سے کہ وہ کسے چھوڑدے اسے اختلاج ہونے لگا تھا۔ ایک طرف کنول کی ادائیں۔ اس کے خوبصورت خد و خال۔ اسکی آنکھوں کی مقناطیسی شراب دوسری طرف کسوم کی خیالی تصویر۔ نظریں جھکائے ملتجی تھی کہ "مجھے اپنے اوپر سے نثار ہو جانے کی اجازت دو"۔ اس کی نگاہ میں سرور نہ تھا۔ لیکن ان سے ایک پاکیزہ شفاف روشنی چھن رہی تھی۔ اس کی فراخ پیشانی آرائشوں سے بری تھی۔ لیکن

اس کے خوبصورت بالوں کا فطری تموج احساسات میں ایک جذبۂ شوق پیدا کر رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ لیکن اسکے گلابی ہونٹ ایک دوسرے سے کچھ ایسی نرمی سے متصل تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ اب کھل کھلا کر ہنسنے ہی والی ہے۔
راج کشور کو کسی فیصلہ پر پہونچنا سخت دشوار تھا۔ ایک سخت اضطراب کی حالت میں لبنہ کروٹیں لیتا رہا اور دیر تک اسے نیند نہ آئی۔

راج کشور کی جب آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانیوں کے بجائے ایک خود فراموشی کا رنگ تھا۔ شاید شب کی کاوشوں کے بعد راج کشور کسی فیصلہ پر پہونچ گیا تھا۔ چائے پی کر برج نرائن صاحب کے یہاں پہونچا۔ کنول کی حالت بدستور تھی۔ بلکہ تپ اور شدید ہو گئی تھی۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے وہ کچہری بھی نہیں گیا، اور دن بھر نہایت انہماک سے کنول کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ ڈاکٹر نے ہر دو گھنٹے کے بعد دوا پلانے کے لئے کہا تھا۔ راج کشور ہمہ تن اضطراب بنا ہوا گھڑی کی ٹک ٹک پر کان لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ جب بڑی سوئی بارہ کے قریب ہوتی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے اُٹھتا۔ غلبۂ شوق سے اُس پر ایک سخت ارتعاش طاری ہوتا۔ اور وہ اسی طرح کانپتا ہوا کہہ اُٹھتا: "کنول دوا پی لو۔" کنول دو روز کے بخار سے بہت نحیف ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کو اُٹھانے میں راج کشور کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ جس کے بعد دوا کا چمچہ راج کشور اُس کے منہ کے سامنے کر دیتا اور وہ اسے آنکھ بند کر کے پی جاتی۔ آیا کنول واقعی اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ بغیر راج کشور کی مدد کے نہ اُٹھ سکتی۔ اور اپنی نیم باز آنکھوں سے گھڑی کی طرف صرف اس لئے دیکھتی تھی کہ اسکو وقت پر دوا پینے کا بہت خیال تھا۔ اس پر تنقید کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دوا پی لینے کے بعد اپنی مدھ بھری آنکھیں راج کشور کی طرف متشکرانہ انداز سے پھیر دیتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ راج کشور اس مقابلہ کی تاب لاسکتا تھا۔ وہ ایک غیر محسوس سوز سے پھُکنے لگتا اور یہ محسوس کرتا کہ اس کی روح کو کنول کی آنکھوں کے گلابی ڈورے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جذبات کی ان کشاکش میں دو بیتاب ہستیاں پھر گھڑی کی طرف متوجہ ہو کر دوسرے گھنٹہ کے انتظار میں کھو جاتیں۔
راج کشور کے رات دن کا حصہ کنول کی تیمارداری میں صرف ہونے لگا۔ کام پر بھی وہ برائے نام ہی جاتا لیکن ایک ماہ گذر گیا اور کنول کی طبیعت روبہ اصلاح نہ ہوئی۔ جوں جوں کنول کی علالت پیچیدہ ہوتی جاتی تھی۔ راج کشور کا دل اس خیال سے بیٹھا جاتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ایک روز کچہری سے واپس آکر وہ کمرہ کے اندر اسی ادھیڑبن میں بیٹھا تھا کہ دروازہ کے سامنے زنانہ اسکول کی گاڑی آئی اور ہیڈ مسٹرس معہ کسوم کے اُس میں سے اُتری۔ راج کشور نے جو نظر اُٹھائی تو اسے سکتہ سا ہو گیا۔ اُس نے اپنی گھبراہٹ کو حتیٰ الوسع چھپاتے ہوئے نہایت تپاک سے ہیڈ مسٹرس کو سلام کیا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد ہیڈ مسٹرس نے ایک سنجیدگی سے جس میں ذرا ترشی ضرور ملی تھی۔ راج کشور سے بولیں: "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ تعطیل میں تمام لڑکیاں اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ اور اس حالت میں کسوم کو اکیلے رہنے میں بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔

چنانچہ اسکول میں تعطیل ہو گئی ہے۔ اور جسوقت سے کسوم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ تعطیل میں بھی وہیں رہے گی برابر رو رہی ہے۔ اس لئے کوئی چارہ نہ تھا بجز اسکے کہ آپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔" راج کشور نے بہ ہزار وقت اپنے حواس اکٹھا کر کے کچھ منتشر الفاظ میں ہیڈ مسٹرس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اسکول واپس گئیں۔

روتے روتے کسوم کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا لیکن بایں ہمہ کسوم اب وہ کسوم نہ تھی جو ایک سال پہلے اسکول میں داخل ہونے کے وقت تھی۔ اسکول کی لڑکیوں کی صحبت اور تعلیم کے اثر سے اسکی نشست و برخاست میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ اس کی وضع اس کی گفتگو، اس کی سفاک سنجیدگی جس میں اس کے فطری البیلے پن کی جھلک اب بھی موجود تھی۔ ان باتوں نے اگر راج کشور کو کچھ دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسوم نے کس قدر جلد اسکول اور تعلیم کا اچھا اثر قبول کر لیا۔ لیکن کسوم کی فطری سادگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور اب بھی وہ حجاب و عصمت کی پتلی تھی۔

راج کشور ہمت کر کے بولا: "کسوم میں نے تم کو بورڈنگ میں چھوڑ دینے کا اس لئے ارادہ کیا تھا کہ ایک تو میرا ارادہ کچھ دنوں کے لئے نینی تال جانے کا ہے۔ دوسرے مجھے یہ خیال ہوا کہ تعطیل میں تم ہیڈ مسٹرس کے ساتھ رہ کر اپنی تعلیم میں خوب ترقی کر سکو گی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئیں"؟

کسوم کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے بولی: "گنہگار ہوں"۔ یہ کہنے کے بعد بڑے بڑے موتی آہستہ آہستہ اُسکی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ راج کشور نے اسے بہت سمجھایا، تسلی دی، اسکول کے حالات پوچھے، کچھ سبق وغیرہ سنا اور شام کو ٹہلنے کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔ کسوم کا دل شک کرنے کے لئے تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ راج کشور کے تسلی دینے سے اسے اطمینان ہو گیا اور وہ خوش ہو گئی۔ راج کشور جب رات کو برج نرائن کے یہاں سے واپس آیا تو کسوم نے خوشی خوشی اپنی دستکاری کے نمونے راج کشور کو دکھلائے۔ اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ لیکن راج کشور صبح کا گیا ہوا سہ پہر کو آتا۔ اور شام کو جاتا تو بہت رات گئے واپس ہوتا۔ کسوم کب تک دل کو مغالطہ دے کر خاموش رکھتی۔ آخر انسان تھی۔ اور اس سے قبل معلوم نہیں کتنے صدمے اُٹھا چکی تھی۔ راج کشور کسوم کی معصوم باتوں کی طرف مائل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن کنول کا خیال اس کو ایک لمحہ کے لئے نہ چھوڑتا تھا۔ اب پھر وہ کسوم کی طرف سے لاپرواہ رہنے لگا۔ اور وہ اس کی باتوں کے لطف سے محروم رہنے لگی۔ وہ بھی کبتک اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھتی۔ آخر کار اُس کو ایک جانسوز خلش، ایک جلا دینے والی سوزش بیتاب کرنے لگی۔ وہ پہروں اُداس بیٹھی رہتی۔

کنول کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ راج کشور پر کنول کے عشق کا جنون پوری قوت کے ساتھ مسلط تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کسوم سے فی الحال پیچھا چھڑا لینا چاہیئے۔ کیونکہ اُس کے بغیر کنول کی تیمارداری یکسوئی کے

ساتھ نہیں ہو سکتی۔ بکسر میں اس کے ایک ملاقاتی تھے۔ اس نے ان کو ایک بار گی لکھ دیا کہ میں فلاں روز آرہا ہوں اور کسوم کو کچھ دنوں کے لئے تمہارے یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ کسوم سے اس نے ایک مقدمہ کے سلسلے میں باہر جانے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا یہاں اتنے بڑے شہر میں تنہا رہنا مناسب نہیں۔ میں تم کو بکسر میں اپنے ایک دوست کے مکان پر پہونچا آؤنگا۔ ان کی بی بی بہت خوش اخلاق ہیں۔ تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔ اور پھر ایک ماہ کے اندر آکر میں تمہیں واپس لے آؤں گا۔

کسوم کا دل تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ اس نے کہا "جیسی آپ کی خوشی" چنانچہ اُسکے تیسرے روز راج کشور مع کسوم کے بکسر بابو نولکشور کے یہاں پہنچ گیا۔ نولکشور نہایت سادہ مزاج شریف انسان تھے۔ راج کشور کے ساتھ وکالت پاس کی تھی۔ اسی پیشہ سے وال روٹی پیدا کر کے عزت و آبرو سے زندگی گذار رہے تھے۔ راج کشور کے آنے سے بہت خوش ہوئے راج کشور نے جب واپس جانے کا ارادہ کیا تو نول کشور صاحب نے قسم کھا کر کہدیا کہ ایک ہفتہ تک وہ کوئی ایسی بات نہیں سنیں گے۔ راج کشور نہایت گھبرایا۔ کیونکہ نول کی خدمت سے ایک ہفتہ کی غیر حاضری ایک ایسی بات تھی کہ راج کشور گھبرا گیا۔ اور اس کی پریشانی اس حد تک پہونچ گئی کہ نولکشور بھی بغیر کہے ہوئے نہ رہ سکے کہ: "راج کشور یہ آخر تمہاری کیا حالت ہے؟" راج کشور نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر نول کشور نے ایک نہ سُنی۔ راج کشور نے یہ ہفتہ کسی طرح گذارا۔ یہ اسی کا دل جانتا تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ تمام جھگڑا ہی نہ پاک کر دیا جائے۔ یہ طے کر کے وہ خط لکھنے بیٹھ گیا:

"پیاری کسوم!

مجھے نہیں معلوم کہ مجھ کو تمہیں اس طرح خطاب کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟ تم کو میری کشیدگی سے تکلیف ہوتی ہوگی۔ اور جس غلط فہمی میں تم قدرت کی ستم ظریفی سے مبتلا ہو۔ اس لحاظ سے تم کو جو شکایت بھی میری جانب سے ہو بجا ہے۔ مجھے خود تعجب ہے کہ آخر میں نے تم کو کیوں اب تک حقیقت سے نا آشنا رکھا۔ تم کو شاید یاد ہو گا کہ ہماری باہمی علیحدگی کی وہ تاریخ ہے۔ جب میں نے تم سے تمہارے میکے کے متعلق کچھ سوالات کئے تھے۔ مگر اس انکشاف سے صدمہ ضرور ہو گا اور ایسا شدید جس کا برداشت کرنا تمہارے لئے سخت دشوار ہو گا۔ لیکن اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم کو واقعات سے آگاہ کر دیا جائے۔ لو کسوم میں وہ کہے دیتا ہوں جس کے کہنے کی اب تک نہ تاب تھی نہ ہمت، سنو! اُس روز کی باتوں سے مجھے یہ معلوم کر کے ایک خفقان سا ہونے لگا کہ تم میری بیوی نہیں ہو۔ میری اور تمہاری دونوں کی کشتی غالباً طوفان سے اُلٹ گئی تھی۔ اور چونکہ نہ میں نے اپنی بیوی کی شکل دیکھی تھی اور نہ تم نے اپنے شوہر کی۔ ہلوگوں کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق زندگی ہیں۔ لیکن تم نے جو واقعات بتلائے اُنھوں نے مجھے سراسیمہ کر دیا غالباً میری کشتی سے میری بیاہی ہوئی بیوی اور تمہاری کشتی سے تمہارے شوہر دونوں مع تمام لوگوں کے غرق ہو گئے۔ ان واقعات کو معلوم کر کے تم کو مجھ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ مجھے اپنا ہر حال میں ہمدرد سمجھو۔ میں تم کو دنیا میں بے یار و مددگار

نہیں چھوڑ سکتا۔ میں خود تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب کیا ہو؟

تمہارا مخلص
راج کشور

خط لکھنے کو تو لکھ گیا لیکن راج کشور کسوم کی طبیعت سے خوب واقف تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اس خط کو پڑھتے ہی سر پر خاک ڈال کر کہیں نکل جائے گی۔ اور دوبارہ صورت دکھانا اسکی غیرت ہرگز گوارا نہ کرے گی۔ راج کشور کنول کی رعنائیوں میں کچھ اس طرح پھنسا ہوا تھا۔ کہ اس کو شاید اس کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن کنول کی علالت اگر خوفناک نہیں تو کم از کم اندیشہ کی حالت تک تو پہنچ ہی گئی تھی۔ یہ سوچ کر وہ کانپ اُٹھتا تھا کہ اگر کنول جانبر نہ ہو سکی تو پھر کیا ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ وہ وہ اپنے تمام جسم میں ایک ہلاک کن کپکپی محسوس کرنے لگتا۔ اور تمام دنیا اس کو تاریک نظر آتی۔ ہاں اس حالت میں کسوم کے خیال سے اُسے تسکین نہیں تو کم از کم ایک خفیف سی گرمی تو آہی جاتی تھی۔

کسوم پھر بھی وہی کسوم تھی۔ جسکی ایک ایک ادا پر راج کشور قربان ہوا کرتا تھا۔ جب وہ پھولوں کا ہار بنا کر اسے پہناتی اور محبت سے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیتی تو اسے یہ معلوم ہوا کرتا تھا کہ مقصد حیات کی انتہا یہی ہے۔ اس کی معصوم نگاہیں۔ اسکی جان بخش ادائیں۔ اس کی معصوم مسکراہٹ۔ یہ ایسی باتیں نہ تھیں کہ ایک انسان کی حسیات کو متاثر نہ کر دیتیں اور واقعہ یہ ہے کہ کسوم اور کنول میں وہی فرق تھا جو چاند کی روح افزا خنکی اور آفتاب کی گرم کرنوں میں ہوتا ہے۔

ان خیالات میں کھویا ہوا راج کشور معلوم نہیں کبتک سر مارا کرتا کہ ملازم نے آکر کہا کہ کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ راج کشور گھبرا کر اُٹھا۔ اُس نے یہ طے کر لیا کہ فی الحال کسوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور واقعہ سے وہ بدستور بے خبر رہے۔ اس خیال سے اُس نے اس خط کو مروڑ کر دیوار کی ایک دراز میں ڈالدیا۔ اور ایک ہفتہ بھر رہ کر کلکتہ واپس چلا گیا۔

لکبسر جاتے وقت راج کشور نے برج نرائن سے یہ کہلا دیا تھا کہ ایک سخت ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، دو روز کی معذرت چاہتا ہوں اور کنول یہ سُن کر سرد پڑ گئی تھی۔ راج کشور کی وجہ سے اس کو اپنی علالت کا بہت کم احساس ہوتا تھا۔ اور اب یہ معلوم کر کے کہ دو روز تک راج کشور نہیں آئے گا۔ اس کو خفقان سا ہونے لگا۔ وہ رات بھر شدید ... میں پڑی رہی۔ برج نرائن کی یہ حالت تھی کہ رات میں کئی بار رو رو پڑے۔ صبح کچھ حالت سنبھلی۔ کنول کی بیماری کی خبر سُن کر اسکی پُرانی ہیڈ مسٹرس اسکو دیکھنے آئیں۔ کچھ دیر تک تاسف کرتی رہیں۔ پھر باتوں باتوں میں بولیں: "کنول مجھے تو تمہاری علالت کی خبر صرف کل شام کو معلوم ہوئی۔ ابھی چند روز ہوئے کہ میں بابو راج کشور کے یہاں جا رہی تھی۔ تمہارے ہی مکان کے سامنے سے گذری۔ لیکن کیا معلوم تھا۔ خیال ہوا کہ رک کر ملاقات ہی کر لوں لیکن کام جلدی کا تھا۔ علاوہ اسکے راج کشور کی بی بی بھی میرے ساتھ تھیں۔ کنول چونک گئی۔ گھبرا کر پوچھا: "آپ کس راج کشور کا ذکر کر رہی ہیں" انہوں

نے کہا:۔ "وہی راج کشور بابو وکیل جو یہاں سے تھوڑی دور رہتے ہیں۔ یہیں ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کی بی بی ہیرے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ تعطیل میں اس کو بورڈنگ ہی میں رکھیں۔ لیکن لڑکی اس بُری طرح پریشان ہوئی کہ مجبوراً اسکو راج کشور بابو کے پاس پہنچا آئی"۔ کنول کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے اُس کے سینہ پر زور سے گھونسہ مار دیا ہو۔ اُس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک تو کمزور تھی۔ پھر اُس پر اتنی سخت چوٹ۔ وہ بیہوش ہوگئی۔ ہیڈ مسٹرس گھبرا گئیں۔ برج نرائن کو پکارا وہ بیچارے یوں ہی بدحواس تھے۔ کنول کی یہ حالت دیکھکر اور بھی ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ہیڈ مسٹرس نے کہا:۔ "میرے ایک ملاقاتی ڈاکٹر شیام نرائن ہیں، جنھوں نے یہیں سے ڈاکٹری پاس کی ہے۔ اور کچھ دنوں سے بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ آج کل یہاں بغرض تفریح آئے ہوئے ہیں۔ نہایت ہوشیار آدمی ہیں اور اخلاق نہایت اچھا ہے۔ میں ان کو بلا لاؤں۔ کنول کا علاج وہی کریں گے۔ آپ کو بہت جلد فائدہ محسوس ہوگا"۔ برج نرائن بابو نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "میرے تو حواس بجا نہیں ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیے کیجیے"۔

ہیڈ مسٹرس گھنٹہ بھر کے بعد ڈاکٹر شیام نرائن کو لیکے آئیں۔ شیام نرائن صاحب ابھی نوجوان آدمی تھے۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور چوڑی پیشانی سے انکی فطری سنجیدگی اور شرافت کا پتہ چلتا تھا۔

کنول ابتک بیہوش تھی۔ شیام نرائن کی گھنٹہ بھر کی کوششوں کے بعد کنول نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اس کی وحشت کی وہی حالت رہی۔ بار ہا اس کو یہ خیال آیا کہ اس نے ایک پریشان خواب دیکھا ہے۔ لیکن واقعات کو دیکھکر وہ پھر مایوس ہو جاتی۔ اس کے جذبات میں سخت تلاطم تھا۔ راج کشور کا اس کو اتنے دنوں مغالطہ میں رکھنا ایسا امر تھا کہ اُس کی غیور طبیعت اس کو برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔ رہ رہکر وہ غصہ اور رنج سے کانپ اُٹھتی۔ اسی اُدھیڑ بن میں اُس پر پھر ایک ہیجانی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

شیام نرائن نے کہا مرض سخت ہے۔ اور شدید گرمی کی وجہ سے کلکتہ میں رہکر علاج مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ دو روز کے بعد جب کنول کی حالت کچھ سنبھلی تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ دنوں کے لئے سب لوگ نینی تال چلے جائیں۔ راج کشور کا خیال کنول کو بار بار ستا رہا تھا۔ اس خیال سے کہ راج کشور نے اس کی امیدوں کو اسطرح برباد کیا وہ غصہ و انتقام کی آگ سے بھڑکنے لگتی۔ برج نرائن کو بھی ہیڈ مسٹرس کی زبانی یہ واقعہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ راج کشور نے اس کا حال کیوں اُن سے اتنے دنوں پوشیدہ رکھا۔ شیام نرائن کی ہمدردی۔ اس کی دلکش جوانی اور قابلیت نے بہت جلد کنول کی آنکھوں میں اسکو ایک امتیازی حیثیت دیدی۔ کنول کی بیمار لیکن فاتحانہ آنکھوں سے متاثر نہ ہوتا کیا معنی۔ چنانچہ برج نرائن بابو کے اصرار سے وہ بھی نینی تال چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔

راج کشور نے معلوم نہیں کسطرح ایک ہفتہ بکسر میں گذارا۔ خدا خدا کرکے کلکتہ واپس آیا۔ اور اس خوف کیساتھ

جو ضمیر کی ملامت کی وجہ سے آدمی میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ ڈرتا ڈرتا برج نرائن کے یہاں پہنچا۔ لیکن مکان کو مقفل پا کے اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سو سو وسوسے دل میں آئے اور گذر گئے۔ پڑوس میں برج نرائن بابو کے ایک ملاقاتی رہتے تھے۔ راج کشور انکے پاس انتہائی سراسیمگی کی حالت میں پہنچا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک نوجوان ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع ہوا تھا۔ ان کی رائے سے وہ لوگ نینی تال گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کے ساتھ گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی۔ نوجوان ڈاکٹر کا علاج شروع ہوتے ہی نینی تال جانا اور پھر ان کا بھی ساتھ جانا۔ راج کشور کو سینکڑوں وسوسے ہوئے پوچھا آپ ان ڈاکٹر صاحب کو جانتے ہیں؟ کیسے آدمی ہیں۔ شادی شدہ ہیں یا نہیں۔

”جی ہاں میں ڈاکٹر شیام نرائن صاحب کو ایک زمانہ سے جانتا ہوں۔ اُنھوں نے ڈاکٹری کلکتہ ہی سے پاس کی ہے بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ عمر قریب چھبیس سال کی ہوگی۔ ان کی شادی کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ ازدواجی زندگی کے قائل ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی مرضی سے ایک غریب لڑکی سے شادی کی تھی۔ مگر شادی کے بعد ہی لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد وہ شادی کے نام سے گھبراتے ہیں،،

ان جوابات سے راج کشور کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی۔ پریشان و مایوس گھر آیا۔ ملازم نے کہا۔ برج نرائن بابو کا ملازم روز آتا تھا۔ آخری روز یہ خط دے گیا ہے۔ اور کہا کہ اس کو صرف راج کشور بابو ہی کو دینا۔ راج کشور نے خط اسطرح لیا کہ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ پہ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ لفافہ پہ کنول کی نازک اُنگلیوں سے لکھا تھا۔ بابو راج کشور۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کانپتے ہوئے اُس نے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا۔

ڈیر راج کشور بابو۔ تسلیم۔

اپنی پرانی ہیڈ مسٹرس سے ملکر کچھ دلچسپ و عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔ اسکی کیا شکایت کہ آپ نے نہیں معلوم کن ارادوں سے میرے سچے جذبات کو آلۂ تفریح بنانا پسند کیا۔ ہاں اس کی شکایت ضرور ہے کہ آپ ایسے وقت ہم لوگوں سے یک بیک علیحدہ ہو گئے جب پتا جی کو میری بیماری کی وجہ سے آپ کی سخت ضرورت تھی۔ ہم لوگ تبدیل آب و ہوا اور علاج کی غرض سے نینی تال جا رہے ہیں۔ اگر میں سخت جان زندہ رہی تو دو ماہ کے بعد واپسی ہوگی۔ اسوقت امید ہے کہ نیاز حاصل ہو۔

آپ کی مخلص

کنول

خط کو پڑھ کر جو کیفیت راج کشور کی ہوئی وہ قابل عبرت تھی۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ کسم کے دل دکھانے کا بدلا اس کو ملنا شروع ہو گیا ہے، اس کا دل پھنکا جا رہا تھا، جیسے کسی بہت پیاسے آدمی کے منھ تک پانی لا کر علیحدہ کر لیا جائے اور وہ پیاس کی تکلیف سے لوٹنے لگے۔ راج کشور کو اپنے آپ سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ دُنیا اس کے لئے تاریک ہوگئی اور اُس کو ایک ایک لمحہ کٹنا دشوار ہو گیا۔ دنیا کی تمام نظر فریبیاں اسے بے معنی نظر آنے لگیں، اور وہ ایک نیم غشی کی حالت

میں پلنگ پر پڑ گیا۔

کسوم بکسر میں زندگی سے بیزار ایک جانکاہ استقلال کے ساتھ زندگی کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ نول کشور کی بی بی نے اس کے دل بہلانے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اس کا کلیجہ اندر ہی اندر پھنکا جا رہا ہے۔ کسوم دن بھر اکیلے کمرہ میں پڑی رہتی۔ اصرار کرنے سے دو چار نوالے کھا لیتی۔ وہ دن بدن زرد ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے گلاب سے رخسار زعفرانی ہو گئے تھے۔ آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتیں۔ رات بھر اس کو نیند نہ آتی۔ اکثر پلنگ سے اُٹھ کر وہ گھنٹوں ٹہلا کرتی۔ اور جب ضبط نہ ہو سکتا تو رو پڑتی۔ اسکو اپنا کوئی ہمدرد دنیا بھر میں نہ نظر آتا تھا۔ اکثر تاروں بھری راتوں میں آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی:۔ "اے پرماتما کیا میں یوں ہی ہمیشہ کے کڑھنے کیلئے پیدا کی گئی ہوں۔ جب سے دنیا میں آئی۔ مصیبت جھیلا کی۔ ان کا ساتھ ہوا۔ چار دن چین سے گزرے۔ خیال ہوا اب دن بھلے آئے ہیں۔ لیکن وہ تو میں پیدا کی گئی ہوں مصیبت جھیلنے کے لئے۔ پھر جب حالت یہی ہے۔ تو آخر مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ ہزاروں شخص جو جینے کے آرزومند ہیں۔ جنکی ذات سے سینکڑوں امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ تو اس آسانی سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میری دن رات کی یہ دعا کیوں قبول نہیں ہوتی۔ میں دنیا کے لئے ایک بار ہوں فضول۔ میری موت پر کوئی رونے پیٹنے والا نہیں۔ میری ذات سے کسی کو ذرہ بھر کا فائدہ نہیں۔ پھر آخر میرے زندہ رکھنے میں قدرت کو کیا دلچسپی ہے۔ قدرت کو بھی میری کلفتوں میں مزہ آتا ہے۔ کیا اس سفاک کھیل کے لئے ایک میری ہی نامراد جان تھی۔ پرماتما کسی طرح اس جانکنی سے نجات دے۔ آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ لیکن تو نے کبھی میری آہوں کی شنوائی نہ کی۔ میری تلخ کامیاں آزمائش کی حد سے کب کی گزر چکی ہیں مجھے اس بے رحم دنیا سے رہائی عطا کر۔"

ایک روز شام کے وقت وہ حسب معمول اداس بیٹھی تھی کہ دیوار کی درز میں ایک کاغذ لپٹا ہوا ملا۔ یہ وہی خط تھا جو راج کشور نے کسوم کو دینے کے لئے لکھا تھا اور پھر کچھ سوچ کر ڈال دیا تھا۔ کسوم نے جب اسے کھولا تو سخت تعجب ہوا کہ خط اسی کے نام کا ہے اور تحریر راج کشور کی۔ پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے اس طرح لرز اٹھی جیسے جلتا ہوا لوہا کسی کے بدن میں چھوا دیا جائے اور وہ تڑپ اٹھے۔ خط پڑھکر کچھ دیر کے لئے تو وہ دیوانی سی ہو گئی۔ کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی اُٹھکر بھاگتی۔ خیر سے اسوقت کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ خط کو پھر پڑھا۔ ایک ایک جملہ اسکے دل پر زہر کے بجھے ہوئے نشتر چبھو رہا تھا۔ اس کو اپنی ذات سے شرم آنے لگی۔ رہ رہ کر اسکے کلیجہ میں ایک ٹیس اُٹھتی اور وہ تلملا اٹھتی۔ آخرکار اپنی بے کسی اور مجبوری پر منھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ معلوم نہیں کبتک وہ اپنی تیرہ بختی پر آنسو بہاتی اگر ملازمہ اس کا کھانا رکھنے نہ آتی۔ کسوم نے گھبرا کر آنسو پونچھے۔ اور اخفائے راز کے لئے کسی طرح کچھ نوالے حلق سے نیچے اُتارے۔ اُسے یہ خوف تھا کہ اگر کھانا نہ کھائے گی تو نول کشور کی بی بی آکر اصرار کریگی۔ اور ممکن ہے اُن کے سامنے وہ ضبط نہ کر سکے۔ ماما کے برتن لیجانے کے بعد وہ کچھ دیر تک غور کرتی رہی

اور پھر آہستہ آہستہ یوں بولی کہ "پرماتما میں اگر اب بھی زندہ رہوں تو بے حیائی اور ہٹ دھرمی ہے۔ ابتک میں اپنے کو صرف بدقسمت ہی سمجھتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں ناپاک بھی ہوں۔ میری بے شرم اور بدنصیب ذات سے دنیا جتنی جلد خالی ہو اچھا ہے۔" اتنے میں گھڑیال نے بارہ بجائے۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ اور اسطرح جیسے سب کچھ پہلے سے سوچ چکی تھی۔ کاغذ کے دو ٹکڑوں پر چند سطریں لکھیں اور دبے پاؤں جاکر اسکو نول کشور صاحب کی بی بی کے سرہانے رکھ آئی۔ اس کے بعد اُس نے ایک حسرت بھری نگاہ چاروں طرف ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر چپکے سے دروازہ کھولا۔ اور بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف چلدی۔ کسوم کے طرز عمل میں بجائے بے چینی یا کلفت کے اب سکون اور استقلال کے آثار تھے۔ وہ کوئی مستقل ارادہ کر چکی تھی۔ جس کے اثر سے وہ اب ان عارضی تکالیف سے بے خبر ہو چلی تھی۔ اسے دور سے ریل کا رنگین سگنل نظر آیا۔ اور وہ رات کے سناٹے میں اس عمیق قرمزی رنگ کو دیر تک دیکھتی رہی۔ وہ ایک طرف بے اختیار بڑھی۔ وہاں پہونچ کر معلوم نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اسٹیشن کی طرف بڑھی۔ پلیٹ فارم پر کچھ آدمی گاڑی کے انتظار میں اونگھ رہے تھے۔ وہ ایک کنارے بیٹھ کر اپنے تاریک ماحول پر غور کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی سنسناتی ہوئی چلی آئی۔ مسافر چڑھنے اُترنے لگے کسوم بھی ایک غیر ارادی طور سے اُٹھی اور ایک خالی ڈبہ میں بیٹھ گئی۔ سیٹی ہوئی اور گاڑی نکبسر اسٹیشن سے آہستہ آہستہ چلدی۔ چاندنی رات تھی۔ چھٹکے ہوئے تارے جھلملا جھلملا کر ایک مبہم اشارے سے کسوم کو اپنی طرف بلا رہے تھے۔ رات کی فطری تاریکی میں بھی ہمدردی اور آشنائی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ کسوم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے اور قدرت کے درمیان کے تمام حجابات ایکبارگی اُٹھ گئے ہیں۔ اور اس نہ طے ہونیوالی راہ کی منزلیں اُس نے سر کرلی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اُسکو یہ معلوم ہونے لگا کہ اسکی روح اس وقت کے مناظر قدرت میں تحلیل ہوتی جارہی ہے۔ اور وہ خود اوپر سے تاروں کے ساتھ دنیا والوں پر ایک حقارت کی نگاہ ڈال رہی ہے۔ تخیلات کی اس مسرور کن جولانگاہ میں وہ معلوم نہیں کبتک محو رہتی۔ کہ گاڑی مغل سرائے اسٹیشن پر رُکی۔ اور قلیوں نے پکارنا شروع کیا۔ کاشی کے جانے والے۔ کاشی کے جانیوالے۔ یہاں اتر پڑیں۔ کاشی کے متبرک نام پر کسوم چونک پڑی۔ اسے خیال ہوا کہ زندگی کا آخری دور ختم کرنیکے لئے کاشی گھاٹ سے بہتر کون مقام ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے وہ گاڑی سے اُتری اور ایک قلی سے کاشی جانیوالی گاڑی کو پوچھکر اسمیں جا بیٹھی۔ اس کے ہر انداز میں ایک اطمینان اور استغنا تھا۔ شاید وہ ایک تہورانہ جذبہ میں رنج و غم کے حدود سے گزر چکی تھی۔

کاشی پہونچکر کسوم سیدھے اُس متبرک دریا کے کنارے پہنچی جس نے بنارس کو ہندوستان کے شہروں میں ایک امتیازی حیثیت دیدی ہے۔

(باقی)

عبدالسلام فاروقی۔ بی۔ اے

خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

یادش بخیر، خواجہ آتش کی عظمت میرے دل میں ایک عرصہ سے ہے اور ساتھ ہی اسکی خواہش بھی کہ اگر علاوہ ان متداول تذکروں کے کہیں سے انکے صحیح و مفصل حالات مل سکیں تو ان کو ترتیب دیکر پیش کروں۔ کیونکہ ایک تو آتش اور ناسخ کے زمانہ کے حالات زیادہ تر پردۂ خفا میں ہیں۔ چنانچہ ناسخ کے والد اور خاندان کا حال، ناسخ اور آتش کی پیدائش کا زمانہ، یہ اور ایسی ہی اکثر باتیں آج تک صحیح صحیح لوگوں کو نہ معلوم ہوسکیں۔ دوسرے عام تذکروں میں جو حالات خواجہ صاحب کے ملتے ہیں چونکہ ان کا ماخذ بیشتر بلکہ تمامتر۔ محمد حسین آزاد کا تذکرہ "آب حیات" ہے، اس لئے بجائے تسکین بخشنے کے اور زیادہ بے اطمینانی دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور خواجہ موصوف کے حالات کا ایک ایسا متضاد مجموعہ سامنے آتا ہے جس پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گل رعنا اور آب بقا ضرور ظلمات ادبیات میں خضر راہ بنتے ہیں مگر پھر افسوس ہے کہ اُن کے مصنفوں کو ذرا پہلے کا زمانہ نہیں مل سکا اور مؤخر الذکر مبسوط نہیں!

میں نے اس تلاش میں مختلف تذکرے[1] پڑھے بہت سی کتابیں دیکھیں اور بہت کچھ سرگردانی کے بعد ایک گونہ تسلی حاصل کر چکا تھا کہ مرزا جعفر علی خاں اثر کا مضمون بہ عنوان "خواجہ آتش" رسالہ زمانہ کی اکتوبر اور نومبر ۲۹ء کی اشاعتوں میں نکلا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ چلو مجھ سے زیادہ اہل شخص نے جو روشن خیال، سخن سنج اور تنقید کا علمبردار بھی ہے۔ جب اس مبحث پر قلم اُٹھایا ہے تو یقیناً تنگ نظری، جنبہ داری، تعارضِ حالات اور نادرستی روایات کو دور کرکے ایک عمدہ اور قابل اضافہ چیز منظر عام پر لائے گا۔ میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میں نے نہایت پُرشوق ہاتھوں سے اُسے لیا اور بیتاب نگاہوں سے پڑھا۔ لیکن پڑھنے کے بعد توقعات غلط ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ اُن کی حیثیت صرف ایک جامع ناقل کی ہے۔ ناقد بلند

---

[1] جن میں ایک تذکرہ "خازن الشعرا" قلمی قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے اور زبان فارسی میں اچھلی خاندان کے اردو اور فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اسکے مصنف مولانا شاہ سید علی کبیر عرف میرجان تھے۔ میں نے اسکا اصل نسخہ بخط مصنف حکیم سید شاہ نذیر احمد صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ یہ ایک فاضل شخص ہیں۔ جو مصنف تذکرہ کے نواسے ہیں۔ اور موجودہ سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کے والد ہیں۔ اگرچہ اس کتاب سے مجھے زیادہ مدد نہ ملسکی کہ مصنف تذکرہ کے چھوٹے بھائی سید محمد کبیر حسن رضا اچھلی قدسی تخلص بھی خواجہ آتش کے شاگرد تھے لیکن اُنکی بابت بھی خواجہ صاحب سے تعلق اور حسن تعلق سے کم نہیں افسوس اوراق منتشر ہیں۔ و شاہ صاحب اسکی نشر و اشاعت کیطرف بے نیاز۔ اسکا ذکر صاحب گل رعنا نے بھی ایک جگہ کیا ہے

اور صاحب بصیرت مورخ کی حیثیت وہ نہیں رکھتے۔ وہ آزاد کی ذہنیت اور مشن کی تائید اور تقلید تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی تنقید کا حوصلہ اور تردید کی ہمت نہیں کر سکتے۔

بنا در ستی بیان صاحب آب حیات "یا مہٖ دانست یا دانستہ اخفا کردہ است"

چونکہ میرے نتیجۂ تلاش و تحقیق سے مرزا صاحب کا مضمون یا نظریہ جدا گانہ ہی نہیں بلکہ مخالف تھا۔ اس لئے اس مضمون میں کہیں کہیں اسکا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ عنوان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ میں بھی ان کی سوانح عمری لکھ دیتا۔ لیکن یہ تطویل محض ہو گی۔ اور اسلئے تحصیل حاصل۔ قدر مشترک اور عام مسلّم حالات کو چھوڑ کر کہ وہ آبحیات۔ گل رعنا۔ آب بقا میں درج ہیں۔ چند نئے حالات و نتائج جو میری تلاش و تحقیق میں آئے اُن کے حوالہ قلم کرتا ہوں

سنہ ولادت

گلشن بیخار۔ گل رعنا۔ آبحیات۔ خمخانۂ جاوید اور سخن شعرا اس باب میں ساکت ہیں۔ آب بقا (مصنفہ خواجہ عشرت لکھنوی) میں صفحہ (۹) پر درج ہے "اسی اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند آصف الدولہ کی شادی کی۔ ...... یہ واقعہ ۱۷۶۸ء کا ہے۔ یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔

اگرچہ اثر صاحب نے خواجہ صاحب کے حالات میں اور خصوصًا زمانۂ ولادت خواجہ کا تعین و اندازہ کرنے میں "آب بقا" ہی سے استفادہ کیا ہے مگر خدا جانے کیسے بلا دلیل سنہ ولادت "تقریبًا ۱۷۶۴ء" لکھا ہے۔ لیکن آب بقا کی روایت بعض حالات کے ملانے سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

(۱) آب بقا میں صفحہ ۳۱ پر ہے: "جب میر تقی میر کا انتقال ہوا (سنہ ۱۲۲۵ھ میں) تو آتش اکتالیس برس کے تھے" گویا سنہ ولادت سنہ ۱۱۸۴ھ ہے۔

(۲) آب بقا صفحہ (۹) پر ہے: "آتش اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی نامکمل تھی کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شوریدہ پشت ہو گئے۔ ...... اس جوہر کے قدردان، فیض آباد میں نواب میر محمد تقی ترقی تھے۔ جو آتش کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے۔ انھیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے"۔ (صفحہ ۲۵۹ پر گل رعنا میں بھی تقریبًا یہی ہے سوا ناسخ کی ہمراہی کے)

(۳) آب بقا صفحہ ۴۱ پر ہے: "آتش نے ناسخ کے مرنکی خبر سنی تو چیخ مار کر رونے لگے"۔ ... کہنے لگے: "میاں ..... ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم نوالہ ہم پیالہ رہے"۔

(۴) ناسخ کا لکھنؤ آنا سنہ ۱۱۹۱ھ میں ثابت ہوتا ہے نواب میر محمد تقی ترقی کے ہمراہ۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ یہ پہلے پہل کا آنا تھا، کیونکہ لکھنؤ سے ناسخ کا واپس فیض آباد جانا اور دوبارہ لکھنؤ آنا کہیں سے معلوم نہیں ہوتا۔ اچھا اور ناسخ لکھنؤ آئے اُسوقت جب بقول آزاد "لکھنؤ دارالخلافہ" ہوا یا بقول خواجہ عشرت، جب آصف الدولہ نے سنہ ۱۱۸۸ھ لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا

۵۱ قاموس المشاہیر میں خواجہ آتش کے والد کا نام خواجہ علی محسن چھپا ہے۔ سراج

اس کے دو چار سال کے بعد، (آب بقا صفحہ ۱۲)

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش بھی ناسخ کے ساتھ پہلے فیض آباد میں مدتوں ایک نواب کے نوکر رہے پھر ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ اب یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ آتش ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوں اور ۱۱۹۱ھ میں سات ہی برس کے سن میں بانکوں میں نوکر بھی ہو گئے ہوں اور لکھنؤ آئے ہوں۔ حالانکہ آتش کے حالات میں تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ "باپ کے مرنے کے وقت اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم نامکمل تھی"۔ ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی موت کے وقت انکی عمر (کم سے کم) گیارہ بارہ برس کی رہی ہوگی اور میر تقی کی نوکری اور لکھنؤ آنیکے وقت انکی عمر (کم سے کم) پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ پھر اگر ۱۱۹۱ھ ان کا آنا ناسخ کے ہمراہ صحیح مانا جائے تو سوا اسکے چارہ ہی کیا ہے کہ ان کی عمر کو "اسی یا اسّی" برس سے (جیسا آب بقا میں ہے) کچھ زیادہ مانا جائے اور سنہ ولادت کو ۱۱۸۴ھ سے کچھ پہلے کیونکہ غالباً سنہ وفات متفق علیہ ہے یعنی ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء۔

یہیں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آتش کی عمر، میر تقی میر کی وفات کے وقت اکتالیس برس کی (یا کچھ زیادہ) تھی تو میر صاحب نے اپنے نکات الشعرا میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر صاحب نے یہ کتاب اپنے شباب کے زمانہ میں دلی میں لکھی تھی اور خواجہ صاحب کی شہرت بعد میں ہوئی۔

آتش اور دلی

آزاد نے خواجہ کے نام کے ساتھ فیض آباد تک کا نام تو لکھا ہیں، دلی تو پھر بھی دور تھی۔ لکھتے ہیں:۔ "باپ دلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی"۔ اب اس مجمل جملہ سے خواہ یہ سمجھ لیجئے کہ باپ ہی نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی (اور یہ صریحاً غلط ہے) خواہ یہ نتیجہ نکال لیجئے کہ خواجہ آتش لکھنؤ میں جا کر رہ پڑے (فیض آباد کا ذکر ندارد) آب بقا اور گل رعنا میں ہے کہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور مرزا ترقی کے ساتھ لکھنؤ گئے"۔ لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آتش بھی کبھی دلی گئے تھے یا نہیں۔

ہم کو کلیات آتش۔ ردیف نون میں ایک غزل ملتی ہے۔ "الجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پرشکن میں" الخ ان اشعار کو پڑھئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچپن کی مشق اور ابتدائی کلام ہے۔ ذیل کے اشعار کسی کہنہ مشق اور ذی رتبہ شاعر کے منہ پہ نہیں کھلتے۔

سنبل سے بال اُس نے جب ذرہ سو منڈائے — کنگھی دوا کی خاطر ملنے لگی چمن میں
عطر گلاب مل کر حلقہ میں یار بیٹھا — بلبل پکڑنے آیا صیاد انجمن میں
تُرکِ فلک ہی نہاں۔ ظاہر ہے تُرک اپنا — عاقل جو ہو وہ کر لے تمیز مرد و زن میں
اُسکو دکھا کے تو نے اُس پر جو تیر جوڑا — بہروں رہی لڑائی شیر اور گرگدن میں۔ وغیرہ

اسی غزل میں ایک شعر ہے:۔

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہمارے — نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

غور کیجئے دہلی کی تخصیص "ہمارے" کے لفظ کے ساتھ کیا بتاتی ہے اور "اپنے اکبر" کا لہجہ کس امر پر روشنی ڈالتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آتش اکبر شاہ ثانی[ف۱] بادشاہ دہلی اور خود شہر دہلی کی تعریف میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر دہلی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم ہیچ ہے۔ اور ہمارے بادشاہ اکبر ثانی کے دربار میں نو آسمان مصاحب ہیں جو "نورتن اکبری" کا جواب ہیں۔ صاف طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آتش دلّی میں پیدا ہوئے اور وہاں کچھ مدت تک رہے۔ کیونکہ یہ میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ اُن کے حالات کچھ صاف صاف نہیں ملتے۔ لیکن اتنا تو اس شعر سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ آتش چاہے فیض آباد میں پیدا ہوئے ہوں مگر وہ دلّی بھی گئے اور رہے ہیں۔ اور آبائی وطن کو خود بھی دیکھ کر یہ غزل وہاں کہی ہے اور گو وہ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے مگر ایک شاعر تلمذ سے قبل بھی کچھ کہہ لیتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے فیض آباد یا لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ غزل کہی ہو۔ لیکن میرے خیال میں اگر آتش دلّی نہ گئے ہوتے تو "اپنے اکبر" اور "ہماری دلّی" جیسے تحتی لہجہ میں تعریف نہ کرتے آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ مجھے اعتراف ہے کہ یہ میرا ایک احتمال و قیاس ہے۔ جسکی تائید شاید آئندہ کسی انکشاف و تحقیق میں ہو سکے۔ اسوقت اپنی تائید میں دو باتیں کہہ سکتا ہوں:۔

(۱) گل رعنا صفحہ ۳۶۲ و ۳۶۴ پر ہے: "آتش کی غزلوں میں دلّی کے ٹھیٹ الفاظ مثلاً انکھڑیاں۔ نزور۔ بل بے۔ میرے شامل۔ بھاریاں وغیرہ زیادہ ملتے ہیں۔ عجب نہیں یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو"۔

(۲) آزاد نے لکھا ہے کہ اُن کے اکثر اشعار ضائع ہو گئے۔ ممکن ہے ضائع شدہ غزلوں میں اور باتیں بھی دلّی کی بابت رہی ہوں۔

اُستادسی نزاع

آزاد نے اس بحث کو بہت آب و رنگ دیکر لکھا ہے۔ اس سے بظاہر اُسکی دو غرضیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) آتش کو چونکہ آزاد شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُسلئے اُسے ایک سُنّی اُستاد مصحفی سے لڑا دینا چاہا اور باور کیجئے کہ اگر ان کو اس قسم کی کوئی اور بات بھی مل جاتی تو وہ انشا اور مصحفی کا سا معرکہ آتش اور مصحفی کے درمیان پیدا کر دیتے۔

(۲) آزاد، جو وطناً دہلوی اور مذہباً لکھنوی تھے۔ جہاں لکھنؤ پرستی میں لکھنؤ کو "دار الخلافہ" جیسے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ وہ اس فکر میں بھی ہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دلّی کی زبان کی تقلید سے آزاد کر دکھائیں۔ اور اس خیال میں جان اُسوقت تک نہیں پڑ سکتی تھی۔ جبتک آتش و ناسخ کو (جن سے لکھنوی زبان کی عمارت قائم سمجھی جاتی ہے) کس طرح مصحفی سے الگ نہ کر لیا جائے۔ ناسخ کو تو اُس نے صاف الگ کر دکھایا بچے آتش تو اُن کے لئے اُس نے ذیل کا قصہ تصنیف کیا۔

آزاد کے الفاظ یہ ہیں:۔ (آبحیات تذکرہ آتش صفحہ ۳۸۰)

"کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا جو شاگردانِ الٰہی ہیں۔ مجازی اُستادوں کے ساتھ انکی بگڑتی ہی چلی آئی۔

ف۱ ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی شعاع تخلص ابن شاہ عالم۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۰۶ء میں بادشاہ بنے اور ۳۱ سال سلطنت کر کے سنہ ۱۸۳۷ء میں انتقال کر گئے (قاموس المشاہیر)

چنانچہ اُن کا بھی اُستاد سے بگاڑ ہوا۔ خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہو گی۔ اور اُن میں حق کس کیطرف تھا۔ آج اصل حقیقت دُور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے۔ مگر جہاں سے کھلم کھلا بگڑی اُسکی حکایت یہ سُنی گئی کہ ......''

اس کے بعد دہن بگڑا، کفن بگڑا کے مشاعرہ کا قصہ لکھا ہے کہ آتش نے اپنے اشعار اُستادوں کو سُنا کر کچھ تعلّی کی مصحفی نے انکے شعروں کے جواب میں دو شعر کہہ کر ایک لڑکے سے پڑھوا دئے۔ جب مشاعرہ میں ان اشعار کی داد ملی تو آتش کو شبہ ہوا اور اُستاد سے بگڑ کر کہا کہ ''یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منھ تھا جو ان قافیوں میں شعر نکالتا۔ مگر مصحفی کے یہ اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے (یہنے آزاد کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ طول ہو جاتا اسکا خلاصہ لکھدیا)

خواجہ آتش کی سپاہیانہ وضع اور اُس پر آزاد کی رنگیں اور فریب کار تحریر۔ نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہرگز قابل حیرت نہیں کہ یہ روایت شہرت پا گئی اور بعد میں مقلدین تذکرہ نویسوں نے (الا ما شاء اللہ) اسکو اپنے یہاں نقل و درج بھی کر دیا۔ لیکن عقل دُور رس اس پر حسب ذیل تنقیحیں قائم کرتی ہے:۔

(۱) ہمارے سامنے گل رعنا موجود ہے وہ اس خصوص میں ساکت ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو صاحب گل رعنا جنھوں نے آتش کی موت کا حال بالکل آزاد ہی کے الفاظ میں لکھدیا ہے۔ ضرور اسکو اپنی کتاب میں لکھتے۔

(۲) شعرالہند میں بھی یہ روایت نہیں ہے۔

(۳) تذکرہ آب بقا میں آتش کے حالات، آب حیات سے بہت زائد لکھے ہیں۔ وہ اس مشاعرہ کا ذکر ان الفاظ کرتے ہیں (صفحہ ۱۶) ''تحسین گنج میں میاں تحسین علی خاں ....

خواجہ سرا کے ہاں مشاعرہ ہوا، چلن بگڑا، کفن بگڑا، اس میں بھی پالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور رہی''۔

خواجہ عشرت، لکھنوی ہیں اور شاد پیر و میر کے شاگرد۔ اُردو زبان کی خدمت، تاریخ نویسی، لغت نویسی، قواعد نویسی سے ایک مدت سے کرتے چلے آتے ہیں۔ اور اگرچہ اُنھوں نے ناسخ و آتش کا زمانہ نہیں پایا مگر پرانوں کی آنکھیں دیکھیں اور قصّے سُنے ہیں ––– خود تلاش، تحقیق اور تفتیش و جستجو کا مادّہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ان کو لکھنؤ کے حالات کا (گو وہ ماضی ہی کیوں نہ ہوں) بمقابلہ آزاد کے (جو غالباً لاہور میں آب حیات لکھنے بیٹھے تھے۔) زیادہ اور صحیح تر معلوم ہونیکے موقعے حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بہ لحاظ مقدار مواد اور کیا بلحاظ اعتبار و استناد اُنکے ہاں خواجہ آتش کے زیادہ حالات ہیں۔ وہ اس خاص مشاعرہ کا موقعہ اور محل تک بتا رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو لکھنؤ جیسے مقام پر خواجہ عشرت جیسے جوئندہ کو اس روایت کا ملنا ناممکن نہ ہونا چاہئے۔ اچھا روایت نہ ملنے کو بھی جانے دیجئے۔ خواجہ عشرت نے آبحیات کے بعد اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ وہ بھی مثل دیگر تذکرہ نویسوں کے اس کو اپنے یہاں نقل کر سکتے تھے مگر نہیں نقل کرتے۔ آخر کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے اس روایت میں اصلیت کا شائبہ نہیں پایا۔ اس لئے اسے اعتبار و استناد کے پایہ سے ساقط سمجھا۔ پھر ذرا غور تو کیجئے (نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا) بھری محفل مشاعرہ میں

جب یہ گفتگو پیش آئی تھی تو ناممکن ہی ہے کہ لوگوں میں مشہور نہ ہوتی اور خواجہ عشرت کو یہ روایت کسی طریق سے نہ پہونچ سکتی اور آزاد کو لاہور میں پہونچ جاتی!

(۳) آتش ایک صلح کل اور بقول آزاد "سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے، ان اوصاف کے آدمی پر تو یہ بات کچھ کھلتی نہیں کہ ذرا سی بات پر اُستاد سے سر مجلس بگڑ بیٹھے۔ شاگرد کی تعلیوں پہ اُستادوں نے اکثر اسطرح کی دریردہ تنبیہیں کی ہیں۔ اور سعادتمند شاگرد ہمیشہ اُس سے متنبہ اور شرمندہ ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے جو رویہ آتش کا پیش کیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آتش کو سعادت مندی چھو نہیں گئی تھی اور نیک نفسی اور حیا کا اس میں نام و نشان نہ تھا۔ وہ اس استاد کی مطلق قدر نہ کر سکا۔ جو میر تقی کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔

(۴) جو آزاد کہتے ہیں کہ مصحفی کے اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے۔ اس صورت میں آتش کا رویہ کتنا مذموم نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اشعار سے کمزور اشعار کو اپنے ایک اُستاد بھائی کے منھ سے سُنکر تاب نہ لا سکے اور سیدھے استاد سے جا کر لڑ مرے۔

(۵) ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آزاد کو آتش کا ایک مسلم الثبوت اُستاد سے بگاڑ دکھانا تھا تو اُصولاً کوئی مستند روایت بیان کرتے یا راوی کا ذکر کرتے۔ لیکن اس طرز تاریخ نویسی اور اس عقل و فہم کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایسی مبہم روایت کو یوں تحریر فرماتے ہیں "مگر جہاں سے کھُلم کھُلا بگڑی اسکی حکایت یہ سُنی گئی ہے"۔ اے سبحان اللہ یہ تو حال تھا نفس روایت کا۔ اب آزاد ہیں کہ اسکو تائید و تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ان مرعوب کُن اور احتمال انگیز الفاظ سے کہ "خدا جانے بِنا کن کن جزئیات پہ قائم ہوئی ہوگی اور حق کس کی طرف جا رہا ہوگا، آج اصل حقیقت دُور کے بیٹھنے والوں پہ کھُلنی مشکل ہے"۔ اللہ اکبر! جب یہ شبہات روایت بیان کرتے وقت خود ہی پیدا کر دئے جائیں تو کیوں نہ یقین کر لینے کو جی چاہے۔ اور کیوں نہ کسی آئندہ زمانہ میں کوئی صاحب تنگی گنجائش پا کر اُٹھ کھڑے ہوں کہ "جی ہاں اب معلوم ہوا۔ وہ جزئیات یہ ہیں۔ اور حق آتش کی طرف تھا"، پھر یہ کہ "اصل حقیقت کھُلنی مشکل ہے مگر صاحب بصیرت اور صاحب فراست ناقد کے نزدیک آسان ہے۔

مذہب | مذہب کی بحث دیکھکر جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونگے۔ ہمیں اُن کا پورا علم و احساس ہے۔ پھر بھی ہم اس بحث کو چھیڑتے ہیں۔ محض اس مقصد سے کہ ایک شخص کے کلام کو پڑھکر اور تذکروں میں اُسکے حالات دیکھکر جو صحیح نتیجہ نکلتا ہو اُسکو ظاہر کیا جائے۔ بنا بریں اگر مجھے آتش کے تشیّع مفروضہ سے انکار ہو تو اسکی وجہ تنگ نظری یا "کسی مشہور شاعر کو شیعہ نہ دیکھ سکنا" نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ دراںحالیکہ ہم عُرفی و قاآنی۔ انیس و دبیر۔ سودا و ناسخ کو مشہور اور پھر شیعہ جانتے اور مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ آتش جیسے بنگ نوش، رند و آزاد اس قابل بھی نہ تھے کہ اُن کو خلاف واقع طور پر محض زبردستی کھینچ تانی سے سُنّی ثابت کیا جائے نہ تسنن کو اس سے چار چاند لگ جائیں گے نہ تشیع میں کوئی ٹبہ لگ جائیگا نہ ہم اس بارہ میں اوروں کی طرح تاویلات بارِدہ اور تحریفات رکیکہ کام میں لائیں گے۔ بلکہ جو کچھ از روئے تحقیق ثابت ہوگا اُسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

آزاد نے اس بیان کو بڑی ترکیب سے لکھا تھا۔ مرزا اثر صاحب نے نہ صرف اسکی تائید کر دی بلکہ اسکے مشن سے دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی اُس نے تو گول لفظوں میں لکھا اثر صاحب نے اس سے نتیجہ نکال کر صاف صاف لکھدیا کہ وہ شیعہ تھا حالانکہ کوئی تذکرہ حتی کہ خود آزاد بھی مرزا صاحب کا ساتھ نہیں دیسکتے۔

آزاد و اثر صاحبان کی طرز تحریر اور افتادِ طبع کو دیکھکر حیران ہوں کہ تذکرہ نویسیوں اور خاصکر اپنے یہاں کے تذکرہ نویسوں کی اس روش کی داد دوں یا فریاد کروں کہ یکے بعد دیگرے صدہا شعرا کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں، مگر مذہب کا حال تفصیلی تو در کنار، کوئی اشارہ تک اُسکی جانب نہیں کرتے اور نہیں کرنا چاہتے۔ معلوم نہیں یہ اُنکی فراخدلی اور رواداری تھی، یا بے خبری اور لاعلمی، بہرحال شریعت سیرت نگاری اور مذہب ادبیات کا یہ ایک بہت بڑا گناہ تھا جو اُن سے سرزد ہوا اور میں سچ کہتا ہوں کہ انقلاب زمانہ کا دیوتا اُنکو اس گناہ پر بغیر سزا دیئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسکی سزا وہ ہے جو دوسرے لوگ موقع پاکر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اب صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے آکر بنیادی اینٹ رکھدی دوسرے نے بنیاد بھردی تیسرے نے پوری عمارت اُس پر بنا کھڑی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس بارہ میں "اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے"۔ اور اگر آج بعض رسالے اور مضامین نہ شائع ہوئے ہوتے تو یقیناً ہمکو روز روشن میں رات کی تاریکی، چاند۔ ستارے سب کچھ دکھائے اور منوائے جا سکتے تھے اور اسوقت سوا ماننے کے اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ بہرحال آتش کی شیعیت کے ذیل میں اتنی باتیں بیان کیجاتی ہیں:-

(۱) آزاد نے آبحیات صفحہ ۳۷۴ تذکرہ آتش میں ایک بات بہت پردہ پردہ میں لکھی ہے کہ "۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خورد سال تھی اُنکی بھی سرپرستی وہی کرتے رہے"۔

میر دوست علی خلیل آتش کے شاگرد تھے۔ اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ آزاد کا مطلب غالباً یہ ہے کہ چونکہ ایک شیعہ نے تجہیز و تکفین کی لہذا آتش کی موت اور دفن و کفن وغیرہ امور شیعوں کی طرح ہوئے اور آتش شیعہ تھا۔

(۲) آبحیات میں صفحہ ۳۸۲ پر ایک روایت سے آتش کو شیعہ گردانا جاتا ہے "خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقۂ سنت و جماعت سے تھا اُس نے ویسی ہی نماز سکھا دی اور یہ کہدیا کہ اُستاد! عبادتِ الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کرکے اُسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل انکے شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن اُنھوں نے بھی دیکھ لیا، بہت حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا کہ "اُستاد آپ کا مذہب کیا ہے؟" فرمایا "شیعہ۔ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟" اُنھوں نے کہا "کہ نماز سنیوں کی" فرمایا کہ "بھئی میں کیا جانوں فلاں شخص سے میں نے کہا تھا اُس نے جو سکھا دی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی

ایک مضبوط ٹلسکوپ سے دیکھنے پر حلزونی شکل میں کواکب منتظمہ کا ایک مجموعہ دکھائی دیتی ہے، موصوف کے اس انکشاف کے بعد سدیم کی تحقیقات کا درس منقطع ہوگیا اور جدید سدیم کے انکشاف کی بحث چھڑ گئی، اسوقت سدیم جدیدہ کا انکشاف، علماء فلکیات کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جاتا ہے، چنانچہ اسوقت تک ماہرین فن کی پیہم کوششوں سے سینکڑوں سدیم منکشف ہو چکے ہیں۔

ابھی علماء فن، سدیم کی اس کافی مقدار کا انکشاف نہ کر چکے تھے کہ خود ان میں سدیم کی حقیقت کے اندر اختلاف شروع ہوگیا، کہ کیا یہ تاروں کا کوئی مجموعہ ہے، جو اپنی غیر معمولی بُعد کے باعث بادل کی شکل میں نظر آتا ہے؟ اور پھر جب کسی قوی ٹلسکوپ سے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے تو اسکے واقعی اجزاء دکھائی دیتے ہیں؟ یا وہ ایسے غیوم (ابر) ہیں جو آس پاس کے ستاروں کی روشنی سے روشن ہیں؟ یا وہ ملتہب گیسیں ہیں جو فضا کے اندر بکھری ہوئی ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں سر ولیم ھگنز نے یہ ثابت کیا کہ:۔ "بعض سدیم دراصل بہت سے تاروں کا مجموعہ ہیں، لیکن غیر معمولی بعد کی وجہ سے وہ صرف چند تارے دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض فی الحقیقت ملتہب گیسوں کی ایک سحابی چادر ہیں، اور اُنکے خطوط نور، ان گیسوں کے خطوط کے مماثل ہیں، جو اپنی غیر معمولی حرارت کے باعث دوسری گیسوں سے ممتاز ہیں۔

وہ گیسیں، جن سے سدیم بنتے ہیں، جب حرارت اور حدت کی انتہائی درجہ پر پہونچ جاتی ہیں تو ان سے شعاعیں نکلتی ہیں ماہرین طبقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ:۔ "سدیم میں ہیڈروجن اور ہلیوم کے عناصر بہت کافی اور کاربون اور نائٹروجن کے بہت کم ہیں، اسکے علاوہ ایک ایسا عنصر بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کا مثل عناصر ارض میں کہیں نہیں ملتا، اس جدید عنصر کا نام ماہرین فن نے نبولیسیم رکھا ہے۔

لیکن ہر سدیم یکساں نہیں ہے، بعض سدیم اس نور سے منور ہوتے ہیں، جو فضا کے اندر دوسرے ستاروں سے پیدا ہو کر اس پر منعکس ہوتا ہے، اور بعض سدیم چند اپنی طرف آنیوالے کواکب سے نور کا اقتباس کرتے ہیں۔ علامہ برنار امریکی نے محض تحقیقات سدیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، موصوف آج کی گھڑی تک ۱۰۰ انئی سدیموں کا سراغ لگانے میں بالکل کامیاب ہو چکے ہیں۔

جو اجرام ساویہ سدیم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک ملتہب گیسوں کے غیوم، دوسرے سدیم لولبیہ وغیرہ، اور یہ سدیمیں زیادہ تر نجوم کے چھوٹے بڑے مجموعے ہیں، جو غیر معمولی دوری کے سبب پر کالہ ابر کی شکل میں نظر آتے ہیں،

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سدیم لولبیہ نجوم کے مجموعے ہیں اور چاروں طرف سے ہمارے آفتاب کو محیط ہیں، لیکن جب رصد و تصویر اور حل طیفی کے آلات زیادہ مکمل ہو گئے تو علماء فن کو یہ معلوم ہوا کہ سدیم اپنے غیر معمولی وسعت کے سبب ہمارے نظام شمسی کے ساتھ قیاس نہیں کی جا سکتیں، بلکہ سدیم کا ہر تارہ ہمارے مجرّہ (کہکشاں) کے مانند خود ایک مستقل عالم ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ فضا کے اندر ہزار ہا سدیم لولبیہ ہیں۔ اور ہر ایک کی وسعت ہمارے مجرّہ کی وسعت کے برابر ہے۔ اور ہر سدیم الگ الگ واقع ہے، کوئی کسی کے ضمن میں نہیں ہے امریکہ کے مشہور علماء فلک ان کو عوالم جزری کے نام سے موسوم کرتے ہیں،

اس حیثیت سے بھی سدیم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو ہمارے مجرہ کے اندر داخل ہیں، دوسرے وہ جو اس سے خارج ہیں، حقیقت میں ہمارا مجرّہ سدیم غازیہ اور نجوم متفرقہ کا ایک مجموعۂ عظیمہ ہے، یہ مجرّہ ان سینکڑوں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو آنکھوں سے

نظر آتے ہیں، اور ان ہزاروں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو ٹلسکوپ (دوربین) سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان لاکھوں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو محض فوٹوگرافی آلہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

مرصدِ مجرّہ کے تمام معروف وسائل رصد کی وساطت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مجرّہ عدسی شکل کا ایک قرص ہے جس کے قطر کا طول تقریباً ہزار برس نوری اور جس کا سمک (عرض) بیس ہزار برس نوری ہے، اور ہمارا نظام شمسی تقریباً اسی کے وسط میں واقع ہے، اور اس قرص کی فضا میں تقریباً ۳۰ ہزار ملین تارے مختلف مسافتوں پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن غیر معمولی دوری کی وجہ سے وہ لطخۂ سحابیہ کے مانند نظر آتے ہیں، کوکبۂ رامی اور کوکبۂ ہرقل میں اس قسم کے بادل اکثر دیکھے جاتے ہیں۔

جو سدمین، مجرہ کے باہر ہیں، وہ اصل میں، کنار غیوم غازیہ ہیں جو مجرہ کے باہر فضا میں اسی طرح بکھری ہوئی ہیں جس طرح ناپیدا سمندروں میں جزائر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، جن سرگرم علماء نے ان سدیم کے درس و تحقیق پر توجہ کی، ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ ہبل امریکی جبل ولسن کی رصدگاہ کا نامور عالم ہے، موصوف نے مجلۂ الاسٹرو فزکس (علم الفلک الطبیعی) میں ایک مضمون شائع کیا ہے، جس میں آپ نے چار سو سدیم کے متعلق بحث کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ:۔

"ان سدیموں میں بعض غیر منتظم شکل کی سدیم ہیں، یعنی ان کی کوئی خاص قیاسی شکل نہیں ہے، اور ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ سدیم ہے جو غیوم مجلان کے نام سے پہچانی جاتی ہے، اور کرۂ جنوبی کے وسط میں (اتنی قریب) نظر آتی ہے۔ کہ اس کا دیکھنے والا بادی النظر میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ گویا "درب لبان" کا ایک جزو ہے، حالانکہ واقع میں وہ اس سے بہت زیادہ دور ہے۔ باقی وہ سدیم جنکی ایک مخصوص شکل ہے، ان غیر منتظم الشکل سدیم بہت تعداد میں زیادہ ہیں۔ اور ان سدیموں کا بیشتر حصہ یا تو اہلیلجی شکل کا ہے یا لولبی شکل کا! اسپکٹرسکوپ کے ذریعہ اہلیلجی سدیم کے نور کی جو تحلیل کی گئی تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ ایک حد بعید تک ہمارے مجرہ کے مماثل ہے۔ اور مجرہ ہی کے مانند نجوم کا ایک مجموعہ بھی ہے۔ نجوم کی فرداً فرداً تقویم لینی غیر معمولی بُعد یا کثرت وسعت اور تعداد کی وجہ سے محال ہے۔ مزید تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بعض سدیم اہلیلجی شکل سے لولبی شکل کی طرف منتقل ہو رہی ہیں۔ اور بعض سدیم لولبیہ میں وہ مخصوص نشانات ظاہر ہو رہے ہیں، ماوہ ان سدیموں میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ماہرین فن نے ان سدم کے ابعاد کا قیاس کیا تو ثابت ہوا کہ کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کی سدیم کبیر کا بُعد تقریباً ۹۰۰ ہزار برس نوری ہے۔ اور وہ سدیم لولبی جو کوکبۂ مثلث میں ہے وہ بھی تقریباً اتنی ہی دور ہے۔ علاوہ ازیں ہزاروں سدم لولبیہ ہیں جو بیسوں ہزار برس کی دوری پر واقع ہیں۔ استاذ ہبل اور استاذ ہملی کو تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ کوکبۂ شعر برنیکی اور کوکبۂ سنبلہ کی سمت میں ایک ایسی سدیم ہے جس کا بُعد ۱۰۰ ملین نوری برس سے کم نہیں ہے۔

ان فضائی سدم کی حرکت کی معرفت کے لئے اسپکٹرسکوپ کا استعمال کیا گیا تو ظاہر ہوا کہ مراۃ المسلسلہ کی سدیم ۲۰۰ کیلومیٹر فی منٹ کی رفتار سے ہمارے مجرہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور اکثر سدم لولبیہ ۶۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اور دور ہوتے جاتے ہیں۔

ان سدموں کی جرم کی واقعی معرفت کیلئے باحثین فن نے جو طریقے ایجاد کئے ہیں، وہ اسقدر مشکل ہیں کہ اس مقام پر انکو بسط سے بیان کرنا از بس دشوار ہے اسلئے ہم انکی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں، لیکن ان طریقوں کے تطبیق سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کی سدیم کا جرم ہمارے آفتاب کے جرم سے دو ہزار ملین گنے کے برابر ہے۔ اور یہ سدیم ۱۷ ملین برس کے بعد ایک مرتبہ گردش کرتی ہے۔ حالانکہ ہماری زمین ہر چوبیس گھنٹہ کے بعد ایک مرتبہ گردش کرتی رہتی ہے۔

بدر اصلاحی

مطبُوعات موصولہ

تلاشِ حق

"مہاتما گاندھی کی آپ بیتی" جو اُنکے گجراتی اخبار اور ینگ انڈیا میں مسلسل شائع ہوچکی ہے، اسقدر مشہور چیز ہے کہ اس کا تعارف کرانا بے معنی سی بات ہے۔ انگریزی میں اس کی اشاعت کتابی صورت میں میکملن کمپنی نے کی ہے۔ اور اب تلاشِ حق کے نام سے اس کا اُردو ترجمہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی نے کیا ہے۔

جس طرح اصلی کتاب تعارف کی محتاج نہیں، اسی طرح ترجمہ کے متعلق اظہار خیال کی ضرورت نہیں کیونکہ جس پایہ کی کتاب ہے اُسی مرتبہ کا مترجم اُسے ملا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتی ہے۔ وہ لوگ جو مہاتما گاندھی کی سیرت، موجودہ سیاسیات کی تاریخ، اور حقگوئی کی بہترین مثال دیکھنا چاہتے ہیں، ان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ عہد حاضر کے سب سے بڑے انسان کے خیالات ہیں۔ قابل غور و مطالعہ ہیں۔

مضامین فرحت

مرزا فرحت اللہ بیگ ملک کے اُن انشاپردازوں میں سے ہیں، جن کے متعلق دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ ان کے مضامین میں زبان و انشاء کا لُطف ہلکے ہلکے مزاح کے ساتھ ملا ہوا اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ ہر طبقہ میں اُس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیئے۔

کتاب زیر تنقید ان کے مضامین کا دوسرا حصہ ہے۔ جس میں پہلا مضمون وہی ہے جو نگار کے ظرف نمبر میں پھول والوں کی سیر پر اُنھوں نے لکھا تھا۔ اس کے بعد بارہ مضمون اور ہیں جو مختلف عنوانوں پر لکھے گئے ہیں، لیکن حکیم آغا جان عیش پر جو مقالہ تحریر ہوا ہے وہ کاوش و تحقیق اور تنقید صحیح کا بہت پاکیزہ نمونہ ہے۔ الغرض وہ لوگ جو دہلی کی زبان اور اُس کے چٹخاروں کے ساتھ ساتھ کچھ کام کی باتیں بھی سننا چاہتے ہیں۔ اُن کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہیئے، جو نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے اور دو روپیہ میں خود مصنف سے ہوم ڈپارٹمنٹ حیدر آباد دکن کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

قدیم افسانے

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا ہے جس کا پہلا حصہ "قدیم افسانے" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اس میں قدیم مصری، یونانی، رومی، ہندی، ایرانی اور عربی مختصر افسانوں کا اقتباس ہے، جسے مولوی عبدالقادر سروری ایم۔ اے نے کیا ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ کے ۱۳ حصے اور ہوں گے۔ جو مختلف حضرات کے مرتب کئے ہونگے۔ چودہواں حصہ اُردو افسانوں کا ہوگا اور

یہ بھی جناب سروری کے اقتباس کا نتیجہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کے مفید و کار آمد ہونے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ کی اس خدمت زبان سے انکار کی گنجائش کہاں، والبتہ بحیث اسمیں ضرور آ پڑے گی کہ جن افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ حقیقتاً اس کے مستحق تھے یا نہیں اور جن کو چھوڑ دیا گیا ہے، ان میں سے کون کون انتخاب کے قابل تھے۔ لیکن اس نزاع سے اصل تجویز کی افادیت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا اور اگر اختلاف رائے کی وجہ سے کسی کو پس و پیش ہو، تو کبھی کوئی کام اس قسم کا انجام نہیں پا سکتا یہ کتاب ایک روپیہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

حافظ شیراز

اس کتاب میں مولوی سید یوشع بی۔ اے نے جو متوسلین دکن میں سے ہیں، حافظ کی شاعری پر خود اس کے شعروں سے مدد لیکر تنقید کی ہے۔ یعنی انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حافظ خود اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا۔ یہ مقالہ اسلوب بیان و ندرت گفتگو کے لحاظ سے اچھا ہے، لیکن استقصاء کے لحاظ سے ناقص۔ امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں اسکی تکمیل کی طرف زیادہ توجہ کیجائیگی۔ اسکو بھی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد نے شائع کیا ہے اور قیمت ۸/ ہے۔

بغاوت عرب اور لارنس

مشرق ادنیٰ کی موجودہ سیاسیات کی اہمیت سے کرنل لارنس کی مشہور ہستی کو جتنا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کرنل لارنس نے کس کس طریق پر اور کن کن تدابیر سے وہاں کی سیاسیات کا رُخ بدلا اور اُس کی ایک ہستی نے سرزمین عرب میں کیسے کیسے انقلاب برپا کئے۔ مولوی چراغ حسن صاحب حسرت نے اس کتاب شریف حسین کی بغاوت کے اسباب اور کرنل لارنس کے کارناموں سے ایسی دلچسپ اور محققانہ گفتگو کی ہے کہ مشکل ہی سے کسی ایک جگہ یہ تمام معلومات نظر آسکتی ہیں۔ اسمیں تمام وہ جاسوسیاں لارنس کی ظاہر کی ہیں جو عراق میں اسنے کیں جو سقوط عقبہ کا باعث ہوئیں اور آخرکار جنھوں نے ترک و عرب کے درمیان اختلاف و عناد کی آہنی دیوار قائم کر دی۔ کتاب مجلد معہ چند تصاویر کے شائع کی گئی ہے اور ایک روپیہ میں اُردو کتب خانہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

انجیل و قرآن کا مطالعہ

تکور علاقۂ نیگھ میں ایک صاحب محمد عبد اللہ ہیں جو اپنے نام کے ساتھ شُشل (انبیاء بنی اسرائیل) بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب بشارت خداوندی کی بناء پر تحریر فرمائی ہے۔

اس کتاب کا موضوع اُسکے نام سے ظاہر ہے۔ اور ۱۰ میں غالباً مصنف سے مل سکتی ہے۔

روزنامچہ مقدس

اخبار نیر اعظم مراد آباد کے ایڈیٹر و پرنٹر نے حال ہی میں بسلسلۂ حج زیارت و عتبات عالیات کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ اس سیر سیاحت کے تمام حالات اُنھوں نے روزنامچہ مقدس کے نام سے شائع کئے ہیں۔ میں نے اس روزنامچہ کو پڑھا اور دلچسپ و مفید پایا۔ بہت لوگوں نے اس قسم کے سفرنامے لکھے ہیں جنمیں سے بعض کو امتیازی درجہ حاصل ہے اور یقیناً حق تلفی ہوگی اگر روزنامچہ مقدس کو انھیں امتیازی سفرناموں میں جگہ نہ دیجائے۔

یہ مقدس کتاب عہ میں دفتر نیر اعظم مراد آباد سے مل سکتی ہے۔

دنیا کی حور

جناب کوثر چاند پوری کا ایک فسانہ ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۹۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اسکا موضوع معاشرتی اصلاح ہے اور مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ جناب کوثر اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، زبان صاف و سلیس، پلاٹ دلکش اور اسلوب بیان اچھا ہے۔ قیمت دس آنے۔ ملنے کا پتہ جناب حکیم کوثر چاند پوری۔ بیگم گنج۔ ریاست بھوپال۔

پیمانۂ محبت

جناب ہمدم کے مجموعۂ غزلیات پر شاید اس سے پہلے نگار میں ذکر آچکا ہے۔ یہ تصنیف بھی آپ ہی کی ہے جسمیں غالب کی چند غزلوں کی تضمین کی ہے اور کچھ غزلیں اور رباعیاں اپنی بھی اخیر میں شامل کر دی ہیں۔ جناب ہمدم کا ذوق تغزل پاکیزہ ہے اور اُن کی شاعری کا عنصر غالب جذبات نگاری ہے۔ یہ پیمانہ ایک روپیہ میں دفتر اخبار ملت کے کراچی سے ملسکتا ہے جسکی ادارت آجکل جناب ہمدم ہی کے ہاتھ میں ہے۔

باب الانعام

مولوی انعام الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے ایک رسالہ اس نام سے لکھا ہے جسمیں بعض اخلاقی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اسمیں سفید بال اُکھاڑنے اور ازار کا پائنچہ دراز رکھنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ رسالہ اسی قدیم مولوی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو اخلاق کو صرف نظریہ کی حد تک رائج کرنا چاہتی ہے اور کام کی باتوں سے زیادہ بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند کرتی ہے۔ اس رسالہ کی قیمت ۱۰ ار رکھی ہے۔ جو بہت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ۔ پیرجی انعام الرحمٰن کٹرہ دینا بیگ خاں بازار لال کنواں دہلی ہے۔

تعلیم الرحمان

یہ بھی جناب انعام الرحمٰن صاحب تالیف ہے۔ جسے باب الانعام کا دوسرا حصہ کہنا چاہئے۔ اسمیں بھی معمولی مسائل درج ہیں اور وہی انداز بیان ہے جو کسی وقت کیمیائے سعادت سے شروع ہوا تھا اور بعد کو جس نے نورنامہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس کی قیمت اور زیادہ۔ یعنی ۱۲ ار رکھی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ وہی ہے۔

الجہاد فی الاسلام

مولوی ابوالاعلےٰ صاحب مودودی۔ اعزازی رکن دارالمصنفین اس کتاب کے مصنف ہیں۔ متفقہ طور پر سب نے اس کتاب کو اسکے موضوع کے لحاظ سے بہت جامع و مکمل تصنیف قرار دیا ہے۔

جہاد تاریخ اسلام کا نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے اور مخالفین نے جس جس رنگ سے اسکو پیش کیا ہے۔ وہ بھی اہل نظر سے مخفی نہیں۔ لیکن مولوی ابوالاعلےٰ صاحب نے اس کتاب میں تاریخ و مذہب، اقتصاد و معاشرت، نفسیات و سیاسیات ہر لحاظ سے نہایت مکمل بحث اس موضوع پر کی ہے اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ پر ایسی جامع تصنیف اُردو کیا معنے کسی اور زبان میں بھی نہ تھی۔ یہ کتاب شاید دو روپیہ میں مولوی ابوالخیر صاحب مودودی رکن دارالترجمہ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

ڈراما ضحاک

پنجاب اُردو اکاڈیمی کی پہلی کتاب ہے، جسے ملک کے مشہور ادیب اختر شیرانی نے اُردو منتقل کیا ہے۔ میں نے جا بجا سے اسکو دیکھا اور ترجمہ کو بہت شگفتہ و دلچسپ پایا۔ یہ اکاڈیمی میاں محمد اسلم خاں صاحب ایم۔ اے (کنٹب)، بیرسٹرایٹ لا کی نگرانی میں قائم کی گئی ہے، جو رائل سوسائٹی آف آرٹس کے فیلو بھی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایسے فاضل شخص کی نگرانی میں جو یورپ کی کئی زبانوں کا ماہر ہے اکاڈیمی قابل قدر خدمات انجام دے گی۔

اس کتاب کا حجم ۱۰۲ صفحات کا ہے۔ طباعت کتابت معمولی ہے۔ اور قیمت عمر مقرر کی گئی ہے۔

حسیات

(اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی)

کر گئی مست ہوائے سحر و شام مجھے
ہو گیا رنگ شفق بادۂ گلفام مجھے

خواہشِ حور نے زاہد کو کہیں کا نہ رکھا
لے گئی تا لبِ کوثر طلبِ جام مجھے

ہے قیامت میں یہ خورشید قیامت کا ظہور
یا کوئی دیکھنے آیا ہے لبِ بام مجھے،

مثلِ سیماب سکوں ہی مری فطرت میں نہیں
تم بھی چاہو تو میسر نہ ہو آرام مجھے،

ہو گیا باغ کا ہر ذرہ شناسائے رموز
ہر کلی دینے لگی ہے ترا پیغام مجھے

ان کے الطاف نے تو اور بھی بیتاب کیا
ہو گئے وصل کے دن ہجر کے ایام مجھے،

صورتِ نخلِ ارم قاتل سرکش ہے نظیر
موجِ تسنیم ہے آبِ دمِ صمصام مجھے،

بیانِ حسن

(کوکب شاہجہاں پوری)

دل نے اگر کیا کبھی حوصلۂ بیانِ حسن
شعلۂ آہ بن گیا سرخیٔ داستانِ حسن

سجدۂ شیخ خود نما موجبِ داغِ ناصیہ
نقشِ سجودِ عشق ہے زینتِ آستانِ حسن

جرأتِ دل کا راز ہے ہمتِ عشق میں نہاں
ورنہ کہاں میں خستہ جاں لائقِ امتحانِ حسن

دیر و حرم کے شوق میں محو ہیں شیخ و برہمن
میری جبینِ عشق ہے اور ہے آستانِ حسن

عشق کے سارے حوصلے ختم ہوئے اک آہ پہ
تیرِ قضا سے کم نہ تھا غمزۂ جاں ستانِ حسن

بہرِ نظارہ چاہیئے چشم حقیقت آشنا
خاک کے ذرہ ذرہ سے جلوہ نما ہے شانِ حسن

پوچھیئے مستِ عشق سے کیفیتِ مئے الست
عالمِ عقل و ہوش میں کون ہے رازدانِ حسن

سوز و گدازِ عشق بھی کتنا کرشمہ ساز ہے
ذرۂ خاک بن گیا کوکبِ آسمانِ حسن،

رباعیات آسی

گو دورِ سرور و خرمی ہے ساقی
فانی ہے خوشی تو کیا خوشی ہو ساقی
جس جام سے تو پلا رہا ہے مجھ کو
جانے کتنوں نے اس سے پی ہے ساقی

رونے پہ کہیں نہ چشم حیرت آ جائے
سامان قرار پہ نہ آفت آ جائے
فردا پہ نہ رکھئے اپنے دیدار کی شرط
ممکن ہے کہ آج ہی قیامت آ جائے

چھوڑی ہوئی خو کو چھوڑتا ہوں میں ابھی
ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑتا ہوں میں ابھی
پیمانہ مری طرف بڑھا دے ساقی
پیمانہ صبر توڑتا ہوں میں ابھی

اے واعظِ خوش بیان مجھے تنگ نہ کر
باتوں کا ترے نہیں مرے دل پہ اثر
آنیوالا نہ کوئی جانے والا
پھر کس سے سُنی بہشت و دوزخ کی خبر

اس سمت ہے کعبہ اسطرف ہے مندر
تسبیح اِدھر ہے اور زنار اُدھر
اے بیخبرِ مآل سیر ہستی
جانا ہے کسی طرف تو جا دیر نہ کر

بیکار ہیں واعظوں کی یہ سب باتیں
ہیں مکر و فریب کی یہ ساری گھاتیں
روز محشر کا خوف کیا ہے آسی
ایسی تو گزار دیں ہیں لاکھوں راتیں

وہ دولت و مرتبت کہاں سے آئے
وہ ثروت و مقدرت کہاں سے آئے
دریائے شراب ؟ بہتا ہے مگر
پیمانۂ معرفت کہاں سے آئے

آسی

غزلیات

(احمد علی خاں شاد عارفی رامپوری)

حسن جتنا تجھے ذوقِ ستم آرائی دے
عشق اُتنا ہی مجھے درسِ شکیبائی دے

مطمئن ہو کے میں انجامِ محبت سوچوں
ہاں اگر دردِ جگر رخصتِ تنہائی دے

نہ یہ مطلب ہے کہ ہو قدرِ نیازِ الفت
نہ یہ منشا ہے کوئی اجرِ جبیں سائی دے

دل کو عنوانِ محبت پہ تصدق کر کے
اور کیا نذر تجھے تیرا تمنائی دے

یہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کعبہ ہے یہ دیر
ان میں تو مجھکو نظر آئے وہ بینائی دے

قتل میرا تجھے آسان ہے لیکن قاتل
تیری شہرت نہ تجھے مژدۂ رسوائی دے

لطف یہ ہے نہ کسی کا وہ شناسا نکلے
ذرّہ ذرّہ جسے پیغامِ شناسائی دے

شاد بے شبہ میں اُس آنکھ کا دیوانہ ہوں
جان جس آنکھ پہ ہر آہوئے صحرائی دے

طور پر جلوہ دکھایا بُت کدہ میں دل؟ مجھے
مدعا یہ ہے کہیں تسکین ہو حاصل مجھے

آبلہ پائی نہ دے ایسے میں تکلیفِ قیام
وقت کم ہے اور جانا ہے کئی منزل مجھے

چاہتا ہوں اور نہیں پاتا سکونِ اضطراب
ڈھونڈھتا ہوں اور نہیں ملتا نشاطِ دل مجھے

اے نگاہِ یاس تو ہی ترجمانِ درد بن
کہہ رہے ہیں وہ سُناؤ داستانِ دل مجھے

میں تمہارے سنگِ در کو چھوڑنے والا نہ تھا
تم نے کب سمجھا کسی لائق کسی قابل مجھے

اور بڑھتی جا رہی ہے ہمت مشکل پسند
ہاں سُناؤ داستانِ دوریٔ منزل مجھے

دیکھتا ہوں جب کہیں بھی گرمیٔ بزمِ نشاط
یاد آجاتا ہے وہ ہنگامۂ محفل مجھے

شاد یہ مشقِ تصور نے صفائی قلب کی
صاف آتا ہے نظر اُس بُت کا اک اک تل مجھے

غزلیات

عشق رامپوری

وہ تو اپنی برشِ تیغِ نظر دیکھا کئے — کون کہتا ہے مرا زخمِ جگر دیکھا کئے
سامنے اونکے نہ آیا کچھ ہمیں بنکر جواب — اُن کا منہ حیرت سے ہر ہر بات پر دیکھا کئے
اونکو نخوت تھی ادھر لب بند رعبِ حسن سے — وہ ہماری اور ہم اونکی نظر دیکھا کئے
اب سرِ محفل نہیں معلوم کس امید پر — چُپکے چُپکے ہم نگاہِ فتنہ گر دیکھا کئے
جھوٹ ہی سے کچھ قرارِ دل ہوا اس امید پر — ہم فریبِ گفتگوئے نامہ بر دیکھا کئے
وقتِ آخر یاس کی تصویر تھا بیمارِ غم — دم بخود بیٹھے ہوئے سب چارہ گر دیکھا کئے

عشق کیا امید وعدہ تھی کہ جسپر رات بھر
ٹکٹکی باندھے ہوئے ہم سوئے در دیکھا کئے

شاد صابری

سعی لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں — وائے بدبختی کہ علم دورئ منزل نہیں
ذوقِ بیتابی کے قابل کوئی اہلِ دل نہیں — دل بہت لیکن کسی میں جذبۂ کامل نہیں
جلوۂ تاباں کا اک موہوم سا خاکہ ہوں میں — جلوہ گر مجھ میں نقوشِ ہستئ باطل نہیں
پوچھتی ہیں عشق سے اکثر مری مایوسیاں — اے متوجِ خیزِ دریا، کیا ترا ساحل نہیں
جستجوئے منزلِ مقصود میں ہوں گامزن — ہمسفر تو جسکو سمجھا وہ مری منزل نہیں
حسن میں موجود ہے پیرایۂ دلبستگی — قابلِ عنواں مگر ارمانِ اہلِ دل نہیں
ہر متوج دامنِ ساحل نظر آیا مجھے — جب ہوا ظاہر کہ بحرِ عشق کا ساحل نہیں
منزلِ مقصود ہے ہر منزلِ راہِ طلب — دامنِ رہرو پہ داغِ حسرتِ منزل نہیں

ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق
واقف معنی نہیں جو آپ سے غافل نہیں

شاؔد تھک کر بیٹھنے کا قصد جب میں نے کیا
شوق نے بڑھ کر ندا دی یہ مری منزل نہیں

خلیقؔ فیض آبادی

دلِ بیتاب مدت سے رہینِ یاس و حرماں تھا
خبر کیا تھی انھیں پردوں میں تو بھی آکے پنہاں تھا

غلط سمجھا تھا میں تیر نگاہِ ناز کو قاتل
مجھے بسمل کیا جس نے وہ خود میرا ہی ارماں تھا

نگاہیں جھک گئیں اُنکی جو میری عرضِ حسرت پر
مجھے محسوس ہوتا تھا کہ گویا میں پشیماں تھا

خلیقؔ غمزدہ کو چھیڑ کر کیا پا گیا ظالم!
کہ وہ ہر رنگ میں خود ہی مثالِ شمعِ سوزاں تھا

جگرؔ بسوانی

جب میں کہتا ہوں نہیں مجھ پہ عنایت تیری
یہ صدا کان میں آتی ہے کہ قسمت تیری

ہم کو دھوکا یہی ہوتا ہے کہ بیدار ہیں ہم
دیکھتے ہیں جو کبھی خواب میں صورت تیری

دوست کا دوست ہے کیوں ہم اُسے دشمن سمجھیں
آج کل جب یہ زیادہ ہے عنایت تیری

دیکھنے تجھکو تو جینا ہو خوشی سے دشوار
جبکی آنکھوں میں پھرا کرتی ہو صورت تیری

دل پہ بڑھتے گئے جتنے ستم و جور و جفا
دل میں بڑھتی گئی اتنی ہی محبت تیری

سامنا ہو گیا جب ہوش ہوئے گم اپنے
ہم نے جی بھر کے نہ دیکھی کبھی صورت تیری

دل خم زلف میں ہے یا تری مٹھی میں ہے
کچھ بتاتی نہیں چتون کی شرارت تیری

ہم کو ہر نقش میں تیرا ہی نشاں ملتا ہے
شکل کوئی ہو نظر آتی ہے صورت تیری

آخری آہ نے افشا کیا رازِ اُلفت
عمر بھر ہم نے چھپائی تھی محبت تیری

اپنے بیمار سے وہ پوچھ رہے ہیں ہنس کر
آج کیا حال ہے کیسی ہے طبیعت تیری

دلِ بیتاب شبِ غم ہو تیری عمر دراز
اب رفاقت مری تو کر میں رفاقت تیری

دہیاں توبہ کا جگرؔ میکدے والو میں کہاں
ایک چلو میں بدلجاتی ہے نیت تیری

باسط بسوانی

دمِ آخر تجھے اے رشکِ مسیحا دیکھا
دیکھا بیمارِ محبت نے مگر کیا دیکھا

جان پر کھیل کے پھر آنکھ لڑائی تم سے
تم نے آئے ہوئے دل کا یہ تقاضا دیکھا

کنجِ زنداں میں خبر موسمِ گل کی پا کر
ہم نے حسرت سے بہت جانبِ صحرا دیکھا

کام آتا نہیں ہنگامِ مصیبت کوئی
اُس نے منھ پھیر لیا جسکو شناسا دیکھا

جانبِ در تھی نظر۔ جانِ حزیں ہونٹوں پر
مرنیوالے نے بہت آپ کا رستہ دیکھا

آپ سے کیا کہیں۔ کچھ یاد ہے کچھ بھول گئے
خواب تھا عہدِ جوانی بھی۔ اُسے کیا دیکھا

قیس و فرہاد ہوں یا وامق و باسط کوئی
کوچۂ عشق میں دیکھا جسے رسوا دیکھا

بسم اللہ

اعلانات صفحہ ۷۰ نگار و صفحہ ۱ ملاحظہ ہوں

جلد ۱۸ فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء شمارہ (۶)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ دسمبر ۱۹۳۰ء شمار (۶)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ہم ہندوستانی اکاڈمی کے "تماہی رسالہ" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ اردو مفہوم کیا ہے اور وہ زبان

سادگی پر جسکے مٹ جانیکی حسرت دلیں ہے

بعض ناحق کوش اور رمز ناشناس حضرات کی دوستی سے کس قدر خطرہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو اکاڈمی کے وجود اور اُس کے برکات سے بھی بحث کیجائے گی۔ ہرچند ہم اس وعدہ کی تکمیل کے لئے ابھی تیار نہیں، لیکن چونکہ اکاڈمی کی گزشتہ سہ [illegible] الی التسالہ رپورٹ (انگریزی میں) شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہونچ گئی ہے، اس لئے ضمناً و ایجازاً ایک سرسری نگاہ [illegible] ڈالنا ضروری ہے۔

یہ رپورٹ [illegible] کے [illegible] صفحات پر شائع ہوئی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ ایک ناواقف الحال شخص اسکو دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے [illegible] جو اکاڈمی کے ارباب نظم ونسق دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں، لیکن ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنیوالے کو زیادہ [illegible] بتے، اگر وہ اس کی ترتیب کو "خلوتیان راز" کے لئے بھی محل تنقید ونظر ہونے سے محفوظ رکھ سکتا۔

اس رپورٹ کا تقریباً نصف حصہ تو اس بیان پر مشتمل ہے کہ اکاڈمی کا وجود کیونکر عمل میں آیا، صوبہ کی حکومت نے کس قدر دلچسپی کا اظہار کیا، کون کون ممبر نامزد ہوئے، لائحہ عمل کیا مرتب کیا گیا، کتنے جلسے ہوئے ان میں کیسی کیسی شاندار اور وزنی تجویزیں پیش ہوئیں، وغیرہ وغیرہ اور ظاہر ہے کہ جہاں تک ترتیب الفاظ کا تعلق ہے یا جس حد تک اغراض مقاصد کا بیان ہو سکتا ہے، اس حصہ میں ایک جگہ بھی حذف واضافہ یا ترمیم واصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے بعد کا حصہ جس میں واقعات عمل، اعداد و شمار کا بیان ہے، ہمکو بعض بعض مقامات میں کچھ ایسے خلا ضرور نظر آتے ہیں جہاں نگاہ پہونچکر خود بخود رکجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تفصیل سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔

میں اسوقت رپورٹ کے اُس حصہ سے بحث نہیں کرنا چاہتا جسکا تعلق تجربۂ ماضی سے ہے اور نہ اُن بعض کمیٹیوں کے اندرونی تار و پود کا ذکر کروں گا جنھوں نے بعض بالکل غیر مستحق کتابوں کو انعام دینے کے لئے حد درجہ چابکدستی سے کام لیا، بلکہ صرف یہ دیکھوں گا کہ آئندہ جو کچھ وہاں ہونیوالا ہے، اُس سے اُردو زبان یا اُردو کے اہل قلم حضرات کو کسقدر فائدہ پہونچنے کی توقع کیجاتی ہے

اکاڈمی کے ممبر ہونیکی حیثیت سے میرا تین سال کا گزشتہ تجربہ بتاتا ہے کہ محض پانسو روپیہ انعام کی توقع پر کوئی اچھی کتاب جو اکاڈمی کے شایان شان ہو، نہ کبھی مرتب کیجا سکتی ہے اور نہ حصول انعام کے لئے پیش ہو سکتی ہے۔ اس کا سبب خواہ زرانعام کی کمی ہو یا کچھ اور بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جس سے غالباً اکاڈمی کے دیگر ممبران اور صدر و سکریٹری کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ہندی کے شعبہ میں یہ شکایت محسوس نہ کیجاتی ہو لیکن شعبۂ اُردو کا تو یہ ایک تجربہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کامیابی کی صورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ اکاڈمی خود ایک شعبۂ تصنیف و تراجم قائم کرے یا ایسے لوگوں سے جو حقیقی معنے میں اس کے اہل ہیں معقول معاوضہ دیکر منتخب کتابیں ترجمہ کرائے یا خاص خاص موضوع کی تصانیف حاصل کرے۔

رپورٹ زیر بحث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے اور ترجمہ و تالیف کے لئے بعض حضرات کا انتخاب بھی عمل میں آیا ہے، لیکن کس حسن تدبیر کے ساتھ، کس اصول تقسیم کی بناء پر اور کس لطف و مصلحت کوشی کو لئے ہوئے؟ اس کا ذکر غالب عرصہ ہوا اس طرح کر گیا ہے کہ

دہر بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبت من
ہمی نماید دور انجمن فرو ریزد

سب سے پہلے مجھے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ ترجمہ کے لئے صرف انگریزی زبان کی کتابوں، اور اُن میں بھی گالسوردی کے ڈراموں کو کیوں پسند کیا گیا۔ کیا اُردو یا ہندی زبان کی ترقی کی بنیاد صرف ڈراموں ہی سے استوار ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف انگریزی کے عہد حاضر کے ڈراموں سے۔

اگر غیر زبانوں کی ادبیات ہی سے اُردو یا ہندی کی نجات ممکن ہے اور وہ ادبیات سنسکرت و عربی میں نہیں پائے جاتے یا جو کچھ اُن سے لینا تھا وہ لیا جا چکا ہے، تو میں دریافت کروں گا کہ فرانسیسی زبان کے تمثیل نگاروں میں سے کیورے (Curel) برنسٹائن (Bernstein) اور ٹرسٹا برنارڈ (Trista Bernard) کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اطالوی ڈرامہ نویسوں میں سے ڈانسزیو (D'Annunzio) کی طرف کیوں توجہ مائل نہ ہوئی، کیا لطافت خیال اور نزاکت بیان کے لحاظ سے کوئی دوسری نظیر ایسی پیش کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر آپ دور حاضر کے کچھ زمانہ قبل چلے جائیں تو کیا روسی لٹریچر میں سے پوشکن (Pushkin) کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا جو فن ڈرامہ نگاری میں اپنا ہمسر نہ رکھتا تھا یا اس کے بعد دستفسکی (Dostoievsky) ترگنیف (Turgeniev) طالسطائی (Tolstoy) چیکف (Chekov) اور گورکی (Gorky) کو نظر انداز کر سکتے ہیں، جنھوں نے واقعہ نگاری کی دنیا میں ایک الہامی انقلاب پیدا کر دیا اور جن کے مقابل مغربی ممالک میں کوئی ملک لٹریچر میں واقعیت (Realism) پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بہرحال میں اصولاً اس کا مخالف ہوں کہ اُردو یا ہندی میں سب سے پہلے غیر زبانوں کے ادبیات منتقل ہونے چاہئیے۔ کیونکہ کم از کم اُردو کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبیات میں وہ اس قدر فروتر نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے اور اگر کوئی کمی بھی ہے تو چنداں قابل لحاظ نہیں۔ کیونکہ اسوقت ضرورت اس کو علمی زبان بنانے کی ہے۔ اور جو روپیہ ڈراموں، ناولوں اور افسانوں کے ترجمہ میں بیکار صرف کیا جاتا ہے اسے زیادہ کام کی باتوں میں صرف ہونا چاہئیے۔

اس رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسورذی کے چار منتخب ڈراموں میں سے تین ڈرامے اُردو ترجمہ کے لئے منشی دیانرائن نگم کے سپرد کئے گئے ہیں اور ایک جگت موہن لال صاحب رواں کو مرحمت ہوا ہے اگر مترجموں کا یہ انتخاب صرف اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہیں، تو ہم حیران ہیں کہ ان دونوں حضرات میں وہ کونسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستان کی آٹھ کروڑ مسلمان آبادی میں سے کسی میں نظر نہیں آئیں۔ اگر کسی اُردو رسالہ کا اتنی مدت تک نکالتے رہنا کہ اُس کا جوبلی نمبر شائع ہو جائے کوئی اہمیت گالسورذی کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کی پیدا کر سکتا ہے یا نظموں کا ایک دیوان شائع کر دینا بڑا استحقاق گالسورذی کے ساتھ اردو میں انصاف کرنے کا قرار دیا جا سکتا ہے تو منشی دیانرائن نگم اور جگت موہن لال رواں سے باندازہ دو جوبلی دو بہ مقیاس چار دواوین زیادہ مستحق حضرات مسلمانوں میں بھی نکل سکتے تھے، اگر ان کی سعی و کاوش سے کاوش سے کام لیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور سارے اردو کی خدمت کے لئے کوئی ایک شخص بھی اکاڈیمی کے ارباب نظم و نسق کو مسلمانوں میں ایسا نظر نہ آیا جو گالسورذی کے ترجمہ کرنے کا اہل ہوتا۔ معلوم نہیں اس مسئلہ میں ہم کو اپنے یہاں افراد قابل کے فقدان پر ماتم کرنا چاہئیے، یا اُس ذہنیت کی داد دینا چاہئیے جو آنکھوں میں خاک جھونکنے کی حد تک بھی اپنی عصبیت کی سکون بخشی کی تدابیر سے کبھی شرم نہیں کرتی۔

یقیناً مسٹر دیا نرائن نگم ایک اُردو رسالہ کے اڈیٹر ہیں اور اگر زمانہ کے گزشتہ چند سال کے لٹریچر کو نظر انداز کردیا جائے جو فی المعنی ہندو معاشرت و تاریخ، ہندو تہذیب و سیاست ہی کی تبلیغ و خدمت میں شمار کیا جائے گا تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک حد تک اُردو کی کچھ خدمت بھی انجام دی ہے، اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ منشی جگت موہن لال رواں کا مجموعۂ نظم بہت پاکیزہ چیز ہے، لیکن ان حضرات کی ان خدمات کا اعتراف اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اکاڈمی رسالۂ زمانہ کی مستقل امداد کر دیتی یا رواں صاحب کو اُنکے دیوان پر اسی طرح انعام دیدیتی، جس طرح صفی کی مثنوی اور عروج کے مرثیہ کو دیا گیا ہے، لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ ڈراموں کا ترجمہ اُن کے سپرد کر کے غریب گالسورذی اور اُردو دونوں کو کشمکش میں مبتلا کیا جاتا۔

جیسا کہ میں گزشتہ ماہ کے رسالہ میں عرض کر چکا ہوں، اُردو زبان میں مہارت تامہ یا بصیرت کاملہ ہندوؤں میں کسی طرح پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جس طرح ایک مسلمان ہندی زبان میں کبھی اس کے ماہر ہونے کا دعوے نہیں کر سکتا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُردو زبان پر اُسی شخص کو پورا عبور حاصل ہو سکتا ہے جو عربی فارسی کا "قدر ضرورت" سے زیادہ مطالعہ کر چکا ہو، جس طرح ہندی کے صاحب نظر ہونیکے لئے سنسکرت یا ہندی بھاشا کا علم ضروری ہے۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم رہی ہندوؤں کو یا تو مجبوراً یا اس ذوق کے لحاظ سے جو عام طور پر اسوقت پیدا ہو گیا تھا، فارسی حاصل کرنا پڑتی تھی، کیونکہ دربار و دفتر کی وہی زبان تھی لیکن جس زمانہ میں اُردو کا رواج ہوا وہ دور حکومت برطانیہ کے آغاز کا تھا۔ جب اُردو سے زیادہ انگریزی جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو جنھوں نے فارسی و عربی کا مطالعہ بقدر ضرورت محض مجبوری کی بنا پر کیا تھا۔ اب انگریزی کی طرف متوجہ ہو گئے اور کچھ عرصہ میں فارسی عربی کا تھوڑا بہت ذوق جو ان میں چلا آرہا تھا رفتہ رفتہ فنا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مجبوری میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا پڑا۔ اور اُن کو بھی انگریزی کی طرف مائل ہونا ضروری ہو گیا، لیکن وہ عربی فارسی سے نابلد نہ رہ سکتے تھے کیونکہ ان کا مذہبی، تاریخی، قومی، معاشری۔ اخلاقی و ادبی لٹریچر سب انھیں زبانوں میں تھا اور سب سے پہلے حروف شناسی کے بعد ہی جو کتابیں اُنکے سامنے رکھی جاتی تھیں وہ عربی فارسی کی ہوتی تھیں۔ بلکہ اس وقت تک اکثر خاندانوں میں یہی رواج چلا آتا ہے۔

اس لئے وہ شخص جس نے اُردو زبان کا کچھ بھی غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے جاننے کا مدعی وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف عربی فارسی کا جاننے والا ہو۔ بلکہ اُس کے اندر ایک صحیح ذوق ان زبانوں کا پایا جاتا ہو اور وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں حیثیت سے اس فرق کو سمجھ سکتا ہو جو یہ ادنےٰ تغیر اعراب و لہجہ ایک لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اسی لفظ تماہی کو لے لیجئے۔ جو اصطلاح اُردو کے سلسلہ میں اکاڈمی کی سب سے پہلی اُپج ہے۔ ان لوگوں نے سہ ماہی میں سے لفظ سہ کا ترجمہ بالاختصار تِ پاتے تو کر دیا لیکن غریب یہ نہ سمجھ سکے کہ اردو زبان میں سہ ماہی اور تماہی دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیئے۔ اُردو میں چھ ماہی کا استعمال ہوتا ہے، لیکن صرف اُن مراسم کے لئے جو ایک

شخص کے مرنے کے بعد چھٹے مہینے ادا کئے جاتے ہیں۔ کبھی یہ لفظ اس مفہوم سے ہٹکر استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ غالب کا شعر ہے ؎

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی گی

میری چھ ماہی سال میں دو بار

اس لئے اگر تماہی کا استعمال ہو سکتا ہے (حالانکہ اسوقت تک کہیں نہیں دیکھا گیا) تو اسی قسم کے مفہوم میں جو چھ ماہی کا ہے۔ اور قیاس کی بناء پر وہی مفہوم اس کا متعین ہو سکتا ہے۔ پس اسی سے انداز دیکھئے کہ محض ذراسی ناواقفیت زبان کی وجہ سے اکاڈمی کے "تماہی رسالہ" کا مفہوم کس قدر مضحک، مہمل اور شاید "شگون بد" بھی) ہوکر رہ گیا۔

یہی سبب ہے کہ آج ہندوؤں میں بہتر سے بہتر اردو نظم و نثر لکھنے والا ایسا نہیں ہے جس کی تحریروں میں زبان، محاورہ و لغت کی غلطیاں نہ پائی جائیں، چہ جائیکہ منشی دیا نرائن نگم یا جگت موہن لال صاحب کہ ان بیچاروں نے تو کبھی اپنی زباندانی یا قدرت انشاء کا دعوے بھی نہیں کیا، اور نہ حقیقتاً اُن کی زندگی کا کوئی ایسا ادبی کارنامہ موجود ہے، جو انھیں کسی تاویل بعید ہی کے بعد کسی اردو ترجمہ یا تالیف کا مستحق قرار دے سکے۔ مجھے انتخاب کرنیوالی کمیٹی کی جسارت پر اتنی حیرت نہیں ہے، جس قدر خود ان حضرات کے "تسلیم و رضا" پر۔ اگر ان کا نام بغیر ان کی خواہش و تمنا کے اس خدمت کے لئے تجویز کیا گیا تھا تو خود اُن کو اپنی اہلیت دیکھکر اس سے انکار کر دینا چاہئے تھا۔ کیونکہ اردو سے عدم واقفیت کسی ناقابلیت کا اظہار تو ہے نہیں کہ اس کو گوارا نہ کیا جا سکے۔ اور اگر ہو تو بھی کیا ایسی ناقابلیت باعث فخر نہیں جس میں لارڈ اردن، وزیر ہند، بلکہ خود ملک معظم برابر کے شریک ہیں۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسورد ی کے ڈراما (Skin game) کا اردو ترجمہ جو منشی جگت موہن لال صاحب نے کیا ہے، شائع ہو گیا ہے۔ لیکن اسوقت تک غالباً ریویو کے لئے کہیں نہیں بھیجا گیا اگر کسی وقت مجھے مل گیا تو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکوں گا۔

رپورٹ زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکاڈمی نے حسب ذیل علوم و فنون کی تصانیف کا بھی اہتمام کیا ہے:۔

(۱) فلکیات Astronomy (۲) جغرافیہ طبعی Physical Geography
(۳) ارتقاء Evolution (۴) برقیات Electricity
(۵) اجتماعیات Sociology (۶) انکشافات علمیہ عصریہ Modern Scientific discoveries
(۷) حیات اجتماعیہ حیوانیہ Social life in animals
(۸) ماکولات Food.
(۹) فلاحت البساتین Horticulture (۱۰) اجمالیات حکمیہ Outlines of Science
(۱۱) فلاحت Agriculture

ان گیارہ علوم میں سے صرف چار (۲، ۵، ۶، ۱۱) پر چار کتابیں اردو کے لئے تجویز ہوئی ہیں

اور سات ہندی کے لئے ۔ اس تقسیم و عدم توازن کے لئے اگر کوئی سبب موجود تھا تو اس کو ظاہر کرنا چاہیئے تھا۔ کیا جن علوم پر اُردو کتابیں تصنیف نہیں کرائی جارہی ہیں، وہ اُردو میں پہلے سے موجود ہیں۔ اور کیا جن علوم پر ہندی کی تصانیف پیش نظر ہیں، وہ ہندی میں پہلے نہیں پائے جاتے تھے؟

اسی کے ساتھ مصنفین کے نام کو چھپایا گیا ہے، حالانکہ ضرورت اظہار کی تھی تاکہ ان کی اہلیت کے لحاظ سے ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا۔ اگر یہ اخفا اتفاقی فروگذاشت نہیں ہے، تو اردو کے ارباب علم وفضل کو مطمئن رہنا چاہیئے، کہ ان میں سے کسی کو ان علوم پر کسی تصنیف مرتب کرنیکی زحمت نہیں دیجائیگی۔

علاوہ متذکرہ بالا علوم وفنون کے اور مباحث پر بھی اکاڈیمی کے ممبران نے تصانیف مہیا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور ان کے لئے جو فہرست مصنفین و مؤلفین کی مرتب ہوئی ہے وہ بھی اکاڈیمی کا راز ہے جس کا اظہار رپورٹ میں نہیں کیا گیا۔

حالانکہ اس کا اظہار کم از کم اس خیال سے ضروری تھا کہ لوگ اس کو ضمیر کی عدم جرأت یا اخلاقی کمزوری پر محمول نہ کریں۔

ان مباحث میں سے افراد تاریخ ہند کے سلسلہ میں (تین ہندوؤں کے مقابلہ میں) صرف ایک محمد تغلق مسلمانوں میں قابل ذکر سمجھا گیا ہے، اسی طرح لٹریچر میں چار ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف دو (غالب وانیس) کو لیا گیا ہے۔ اور ابطال اقوام عالم میں سے صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کو۔ اس کے علاوہ تاریخ وفلسفہ وغیرہ میں کسی جگہ مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔

میں حیران ہوں کہ وہ کون سے (Members of the Academy) تھے، اور وہ (Other Scholars) کس گوش وہوش کے تھے، جنھوں نے نہ صرف انتخاب علوم بلکہ اُن کے ماتحت انتخاب مباحث میں اس قدر بے اصولی، پریشاں خیالی، غیر موزونی اور محاورہ عوام میں "بے تکے پن" سے کام لیا۔

سنہ ۲۹-۳۰ میں اکاڈیمی نے صرف ایک مسودہ "ویلی کرسان رکمنی ری" اشاعت کے لئے پسند کیا۔ معلوم نہیں اور مخطوطات موصول ہوئے یا نہیں، اگر ہوئے تو کتنے اور کس کس موضوع پر اور ان میں سے صرف رکمنی والے مسودہ کو پسند کرنے کے کیا اسباب تھے؟ ان تمام اُمور کی طرف سے رپورٹ کے مرتب کرنے والے نے بہت بامعنی سکوت اختیار کیا ہے۔

ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کی سالانہ رپورٹ اکاڈیمی کے اسکالروں نے کانفرنس میں پڑھی تھی، اسی طرح اور مضامین اس موقعہ پر پڑھے گئے تھے، لیکن وہ ابتک شائع نہیں کئے گئے، رپورٹ میں ان کی اشاعت کا سرسری وعدہ کرکے ٹالدیا گیا ہے۔

شائع شدہ کتابوں کی تعداد چودہ بتائی گئی ہے، سات کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے کہ پریس میں ہیں، چھ طباعت

کے لئے تیار ظاہر کی گئی ہیں۔ اور آٹھ نظر ثانی کی منزل سے گزری ہوئی ہیں۔ لیکن رپورٹ کے مرتب نے نہ انڈکس کی صورت میں نہ اصل رپورٹ میں کہیں ان کتابوں کی فہرست دی۔ اور نہ بعید ترین اشارہ اس امر کی طرف کیا گیا ہے۔ کہ وہ کس زبان و موضوع کی ہیں۔

اسی طرح رپورٹ میں تکمیل کے ساتھ کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ لکچر دینے والوں کو کیا رقم دی گئی، انعام پانیوالے اور مترجمین کون کون تھے اور کس کو کیا دیا گیا۔ اگر رپورٹ کے تسلسل میں اس کے بیان سے خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا تو انڈکس کی صورت میں اس تفصیل کو ظاہر کرنا چاہیئے تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قابل افسوس ہے کہ گزشتہ تین سال کے اندر جو جو لکچر دئے گئے ان میں سے سوائے بعض کے ابھی تک شائع بھی نہیں ہوئے۔ یا اگر شائع ہوئے تو ان پر ارباب صحافت کو رائے زنی کا موقع نہیں دیا گیا۔ لائبریری کے متعلق جو روپیہ صرف کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہونا چاہیئے کہ اردو کتابوں پر کس قدر رقم خرچ کی گئی۔ اور ہندی کتابوں پر کتنی؟ اور ۲۸۶۷ ہندی کتابوں کے مقابلہ اُردو کی کتابیں کیوں صرف ۱۹۲۶ فراہم ہو سکیں۔

الغرض یہ رپورٹ اپنی ترتیب و تفصیل کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے اور باوجود کوشش اخفا کے بعض اُمور میں جو کہیں کہیں "ترشح" ہو گیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ "ظرف" کس چیز سے لبریز تھا؟

میں اخیر میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور جس کی اہمیت سے کوئی تعلیم یافتہ ہندو بے خبر نہیں، صرف رواداری چاہتا ہے، لیکن خیر رواداری تو بڑی چیز ہے، مسلمانوں کو اُن کی زندگی کے ان حقوق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے؟ جو ان کے عمران و تمدن کے اجزا ترکیبی ہیں۔

ایک طرف ہندو حضرات سیاسیات و قومیات میں مسلمانوں اپنے ساتھ ملے رہنے کی بھی دعوت دے رہے ہیں۔ "بھارت ماتا" کے حقوق بھی دونوں جماعتوں پر یکساں ثابت کئے جاتے ہیں، لیکن جب ان جذبات وطنیت کا تجزیہ کیا جاتا ہے، جب اس دعوائے بلند بانگ کے بعد اعمال و افعال پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مکر و فریب ہے خدع و ریا ہے، اور ہندو جماعت ابتک مسلمانوں کے وجود، مسلمانوں کی معاشرت، مسلمانوں کی تہذیب، یہانتک کہ مسلمانوں کی زبان و انشاء کو بھی "آریہ ورت" کی "پوتر" فضا میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

دنیا کو معلوم ہے کہ میں کانگریس کے مقاصد و اغراض کا بہت بڑا حامی ہوں اور میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہی بتایا کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ابنائے وطن کے ساتھ وطنیت کے رشتہ کو مستحکم کرو اور مذہبیت کو بالکل علیحدہ رکھو۔ کیونکہ ایک ایسے ملک کی ترقی جس میں مذاہب کے لحاظ سے مختلف جماعتیں پائی جائیں، اغراض مشترکہ مرکزیت صرف وطنیت کے جذبہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ (بقیہ ملاحظات کیلئے صفحہ ۹۲ ملاحظہ ہو)

مشرقی ادبیات و فنون پر ایک اجمالی نظر

تمہید مغربی تمدنی و ادبی ترقی کے مطالعہ کے بعد اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم مشرقی ادبیات و تمدن کا بغور مطالعہ کریں، اور تقابل کے بعد یہ دیکھیں کہ ہم میں کیا خامیاں ہیں اور وہ کون سے موانع ہیں جنھوں نے ہمیں ترقی سے روک رکھا ہے اور یہ کہ وہ موانع فطری ہیں یا عارضی۔

مشرقی ذہنیت پر ہمیشہ سے قدامت پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام نادرست نہیں ہے۔ اور نیا مذہب ہو یا نیا تمدن، اسکو سب الحاد و کفر ہی نظر آئے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ ذہنیت مذہبی غلو کا نتیجہ ہے۔ اور سر ڈینی سن راس قدامت پرستی کو مشرق کی آب و ہوا پر محمول کرتے ہیں، لیکن میں اس کا بھی قائل نہیں، جب میں دیکھتا ہوں کہ اس وسیع براعظم میں ہر قسم کی آب و ہوا کی "نیابت کاملہ" موجود ہے۔

ہم نے اپنی نکبت و بدبختی کا راز صرف یہ سمجھا ہے کہ ہمیں ابتدا سے مستبد سلاطین کا تسلط رہا، اسلام نے اپنی مختصر تیس سال کی زندگی میں اس استبداد کو مٹانے کی کوشش بلیغ کی، وقتی مذہبی جوش کچھ دنوں کے لئے ذہنیت پر غالب ہوتا دکھائی دیا، لیکن جب عجم سے ربط و ضبط پیدا ہوا تو وہ ساری پرانی کیفیتیں پھر عود کر آئیں۔

ممکن ہے کہ آپ میرے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں، اس لئے کہ استبداد حکومت کو ملکی ادبیات و فنون سے بظاہر کوئی تعلق محسوس نہیں ہوتا، لیکن جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ابتدائی زندگی کے تمام شعبے اور اُن کی ترقی، تنزل کی ذمہ داریاں سب حکومت پر منحصر ہیں۔

قدامت پرستی، غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، آزاد خیالی، حریت و مساوات ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، آپ شاعری ہی کو لے لیجئے۔ جب تک اُمرا و سلاطین کی جابرانہ حکومت قائم رہی، شاعری و ہرزہ گوئی میں، کوئی فرق نہ تھا۔ ثنا و صفت میں جو قصائد لکھے جاتے تھے وہ شاعرانہ ذہنیت کا بدترین نمونہ تھے، بادشاہوں کی عیاشیوں نے غزل کا طرز بھی بالکل بدل دیا اور شاعری جذبات عالیہ سے معرا ہو کر رکیک جذبات کے برانگیختہ کرنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔

ابتدائی دور اسلامی میں سلطنت و مذہب کا حقیقی افتراق ممکن نہ ہوا۔ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے بعد سیاسی اغراض اس امر کے مقتضی تھے کہ مذہب و حکومت متحد رکھے جائیں، کیونکہ مذہبیت کا اثر سب پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس لئے

امتداد زمانہ نے بادشاہ کو ایک مذہبی حیثیت دیدی۔ لیکن چونکہ فرمانروا خود مذہب سے اکثر ناواقف ہوتے تھے، اس لئے "علماء کرام" کو اپنا بنایا گیا تاکہ وہ اثر قائم رہے، اُن "مولویوں" کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا، ایک طرف شاہانہ قدر و منزلت اور دوسری طرف عوام پر اقتدار، دونوں باتیں حاصل تھیں۔ اس "امتزاج" نے ایک ایسی مذہبی فضا قائم کر دی کہ ہر فعل کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا، اور ہر وہ عمل ناجائز سمجھا گیا، جس میں ذرہ برابر بھی اسکی اہلیت تھی کہ وہ خیالات میں وسعت پیدا کرکے مذہبی غلامی سے دماغ کو آزاد کر دے گا۔ قرآن کا ترجمہ ناجائز قرار پایا صرف اس لئے کہ عوام حصول علم کے بعد ان مطالب کی طرف کبھی بھی توجہ نہ کریں گے۔ جو صرف اس لئے اختراع کئے گئے تھے کہ توہم پرستی و جہالت میں مبتلا ہو کر وہ ہر مسئلہ کے سامنے سر اطاعت خم کریں۔

عربی و ایرانی ادبیات سے قطع نظر کرکے آپ صرف ہندوستان کو لے لیجئے۔ آٹھ سو برس کے وسیع دوران حکومت میں مسلمانوں نے جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے نصف مذہب کے فروعی مسائل پر ہیں (جینے کم سے کم سو کتابیں۔ صرف اس بحث پر دیکھی ہیں کہ سورہ فاتحہ میں "ضالین" کا ض، ذ، کے مخرج سے ادا کیا جائے یا محض ض کی صورت میں ادا ہو) باقی نصف میں چالیس فیصدی شاعری پر ہیں، اور دس قصص و حکایات پر ہزار دو ہزار میں کہیں دو ایک کتاب واقعی خالص ادب و فن پر ہوتی ہے۔ اس ماحول میں ادبی ترقی جو ہو سکتی تھی، ظاہر ہے جو حال ہندوستان کا تھا وہی کم و بیش ایران و عرب کا بھی تھا۔

ہندی مسلمانوں کی اس بدقسمتی میں ہندو بھی شریک رہے۔ مولویوں کی طرح پنڈتوں نے بھی "وسعت نظر" کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا۔ پیشہ کی تقسیم نے پنڈتوں کی اعانت کی اور اُنکا اقتدار و اثر مولویوں سے بھی زیادہ قائم رہا۔

یہ تو ادبیات کا حشر ہوا۔ اب فنون عام تمدن کو لیجئے۔ فنون لطیفہ، (مصوری، موسیقی وغیرہ) کے متعلق تو خیر ناجائز ہونیکا فتویٰ صادر ہو ہی چکا تھا، رہ گئی صنعت و حرفت سو اُس کو معاشرتی اُصول نے مذموم قرار دیدیا۔ حالانکہ اسلام نے کبھی بھی وہ غلامی جائز نہیں قرار دی تھی۔ جسے لوگوں نے رواج دے رکھا تھا۔ بہر نوع اس مذموم رواج نے غلاموں کو مزدور پیشہ جماعت بنا دیا، غلام مزدوریاں کرتے، تجارت کرتے، پارچہ بافی کرتے، غرض تمام صنعت و حرفت جس میں محنت شاقہ کو دخل ہوتا وہ غلاموں سے لی جاتیں۔ غلامی اور مزدوری میں رفتہ رفتہ ایک ایسی مناسبت پیدا ہوئی کہ عام مسلم ذہنیت نے خود مزدوری محنت کو مذموم سمجھنا شروع کر دیا۔ یہی وہ کج ذہنیت ہے جو مسلمانوں کی (خواہ وہ ایرانی ہو یا ہندوستانی یا عربی) موجودہ تخریب کی ذمہ دار ہے۔

اس معاملہ میں بھی ہندوؤں نے ہماری کسی حد تک "شرکت غم" کی۔ مسلمانوں کی اس غفلت سے اونھوں نے فائدہ ضرور اُٹھایا، لیکن پھر بھی اوس حد تک نہیں، جس حد تک اونکو مواقع حاصل تھے۔ پیشہ کی تقسیم نے قومیت کا پہلو اختیار کر لیا اور صدیوں تک قوم کے ہونہار نوجوان اون پیشوں کے حصول سے محترز رہے، جنکا اونکو شوق تھا، یا جس میں اون کا فطری میلان اونکو کامیاب بنا سکتا تھا۔

موجودہ دور انقلاب نے البتہ مشرق میں ایک بیداری پیدا کر دی ہے۔ اب ہمیں اپنی خامیاں محسوس ہو رہی ہیں اور اس لئے ممکن ہے کہ ہم اونکا ازالہ بھی بآسانی کرسکیں گے۔

مذکورہ ذیل مضمون میں نے عربی، ایرانی، ہندوستانی اور چینی ادبی وفنی حالات کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے، یوں تو ایشیا کا ہر ملک ایک خاص تمدن وتہذیب رکھتا ہے، لیکن یہ چار ممالک اپنی تاریخی روایات کی بنا پر ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اسی لئے میں نے انکا تذکرہ مناسب وضروری سمجھا۔

عرب

یہ مسئلہ اب مسلمات کی حد تک پہونچ گیا ہے کہ آب وہوا اور ملکی فضا سے ایک ملک کے ذوق ادب وشوق تمدن کا پتہ چلایا جاسکتا ہے، اور وہی تمدن ملک میں قائم رہ سکتا ہے جو اوس کی فضا کے مطابق ہو، اگر بیرونی اثرات نے اپنی قوت سے ایک اجنبی تمدن کو ملک پر مسلط کرنا چاہا بھی تو اوسکو نقش بر آب سے زیادہ وقعت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ عرب کی قدیم وموجودہ تاریخ اس دعوے کے لئے کافی ثبوت بہم پہونچا رہی ہے۔

واقعات کے اعتبار سے آپ عرب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں۔

(۱) قبل از اسلام۔　　　(۲) بعد از اسلام

لیکن اصول تاریخ کے لحاظ سے عرب کی تاریخ کسی تقسیم کی متحمل نہیں۔ تاریخ سنوات اور واقعات پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو آپ قوم کی ذہنیت کا پتہ چلاتے ہیں۔ اگر عرب ذہنیت میں کوئی تغیر بعد از اسلام پیدا ہوا ہو تب البتہ آپ عرب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ آپ اپنے پیش نظر ملک کا حسب ذیل نقشہ رکھیں۔

"ایک وسیع صحرا۔ جابجا اونچے اونچے ٹیلے۔ کوسوں پانی کا نام نہیں، شجر کے عوض حجر، نسیم وشمیم کی جگہ سموم وتند ہوا، آبادی کا کوسوں پتہ نہیں۔ دہوپ کی وہ شدت کہ میدان قیامت کو شرم آئے اوس پر طرہ یہ کہ ہر چہار طرف بلند پہاڑیاں، کہیں کہیں نخلستان اور چشمۂ آب"۔

جس ملک کی فضا کا یہ عالم ہو وہاں کے باشندوں کی ذہنیت وشوق تمدن کا آپ خود اندازہ کرلیں۔ ایسی آب وہوا صرف مذہبی ذہنیت کی ترتیب میں معین ہوسکتی تھی، چنانچہ یہی سبب ہے کہ عرب ہی تمام ادیان عالم کا منبع اور مخزن رہا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ چین نے ترقی کی اور اوس کی تمدنی ترقی کے اثرات دنیا میں پھیلے، وہ بھی دن آئے جب ہندوستان کو عروج نصیب ہوا، اور اوس کے تمدن وتہذیب کی لہریں ایران ومصر ویونان تک پہونچیں، وہ بھی ایک دور تھا، جب مصری تمدن سے دنیا مستفیض ہو رہی تھی، لیکن عرب نے اگر کوئی شے دنیا کو دی تو وہ صرف مذہب تھا ممکن ہے کہ ایک مذہب کا دلدادہ مذہب کو حاصل حیات سمجھکر اوسی پر قناعت کرلے، لیکن مذہب ذریعہ ہے، مقصود نہیں مسلمانوں کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری صرف اس خیال پر منحصر رہی کہ اُنھوں نے مذہبی اعتقادات وعملیات کو مقصود بالذات سمجھا،

بقول انڈری سرویر (فرانسیسی مصنف "اسلام اور مسلمانوں کی ذہنیت") "عرب تمدن، کوئی شے نہیں اسلامی تمدن بے شک ایک چیز ہے"۔ اس کا خیال صرف اس امر پر مبنی ہے کہ عرب نے قبل از اسلام یا بعد از اسلام کوئی تمدن دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ ہاں جب مسلمانوں نے ایران و مصر و ہندوستان فتح کئے، محکوم اقوام کے تمدن اختیار کئے اور اُس پر اضافے کئے، اسوقت اونھوں نے ایک ثانوی تمدن کی بناء ڈالی جو اسلامی تمدن کے نام سے موسوم ہے۔

قبل از اسلام

تمدن اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہے، قبل از اسلام عرب بیرونی اثرات کا آماجگاہ رہا، اور بعد از اسلام خود عربوں نے اپنے ملک سے نکل کر دنیا میں قدم رکھا، چونکہ اسلام تخیل وطنیت کا شروع سے مخالف تھا، اس لئے فاتح عربوں نے مفتوحہ ممالک کے تمدن کو خود عرب میں لیجا کر رائج نہیں کیا۔

ابتدائی دور میں بھی جبکہ خود عرب دوسرے ممالک و اقوام کا رہگذار تھا، اوس نے کوئی تمدن دوسروں سے اخذ نہیں کیا، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ عرب کی غیر زرخیز حالت نے کسی فاتح قوم کو اُس کی جانب توجہ کا موقع نہیں یا اگر سیاسی اغراض سے جنگ ہوئی بھی تو وہ صرف جدال و قتال تک محدود رہی، نہ ملک میں کوئی مستقل تسلط رہا اور نہ کوئی تمدنی ترویج ہوئی۔ دوسرا سبب خود عربوں کی آزادانہ ذہنیت تھی، جس نے کسی حکومت کو گوارا نہ کیا، یا تو ملک تاجروں کا رہگذر رہا یا خود عربوں نے باربردارانہ تجارت اختیار کی۔ دونوں صورتوں میں کوئی بھی مستقل صورت حصول تمدن کی پیدا نہ ہوسکی۔ مکہ والوں میں تاجرانہ ذہنیت ضرور تھی۔ لیکن بوجہ کم مائیگی صرف وہ باربرداری ہی تک محدود رہی۔

قدیم تاریخ میں سوائے عرب کے کوئی ملک ایسا نہیں تھا، جسکو تجارتی رہگذر کہا جا سکے، چین، ہندوستان اور ایران ایک طرف، دوسری طرف مصر، ایشیائی کوچک، یونان و اطالیہ ان ممالک کو زمانۂ قدیم میں جو تجارتی اہمیت حاصل تھی وہ ظاہر ہے۔ تمام تجارتی مال کی درآمد برآمد کا راستہ عرب تھا، مگر لطف یہ ہے کہ پھر بھی عربوں نے ان ممالک کے تمدنی اثرات سے خود کو محفوظ رکھا۔ عرب میں بیرونی اثرات کے ذرائع حسب ذیل تھے:۔

(۱) مصریوں نے سرحدی حصوں پر قبضہ کر لیا تھا اور معدنیات کی دریافت کے لئے ملک کے اکثر حصوں میں پھیل گئے تھے۔

(۲) ۲۸۰۰ سال قبل مسیح سارگن نے شمالی مصر میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، جس میں شام کا کل حصہ شامل تھا، سارگن کے لڑکے رموش نے کل جزیرۃ العرب پر اپنا اقتدار جما لیا۔

(۳) ۷۱۵ سال قبل از مسیح اسیریا کے بادشاہ سارگون نے عرب پر حملہ کیا اس لئے کہ بدوی قبائل تجارت میں حائل ہوتے تھے۔

(۴) ۵۵۲ سال قبل مسیح بنونیدس سلطان بابل نے بھی ملک عرب فتح کیا۔

(۵) بدوی قبائل اپنی لوٹ مار کی عادت سے باز نہیں آتے تھے اور تجارت کا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اسلئے مجبوراً مصر و بابل و ایران وغیرہ کے سلاطین نے عربوں سے عہدنامے کئے اور وقتاً فوقتاً نذریں پیش کیں۔

(۶) بار بردار بدوی عرب کے سرحدی حصہ میں جاکر آباد ہوئے، جس سے اونکو دوسری قوموں کے ساتھ ربط وضبط کا موقع ملا۔

(۷) یہود، عیسائی اور گبر کثیر تعداد میں ملک کے مختلف حصوں میں آباد تھے، اور عیسائی مبلغین نے ملک کے تمام گوشوں میں بھیجکر اپنے مذہب کی ترویج شروع کر دی تھی۔

بعد از اسلام

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تخیل وطنیت کا سرے سے مخالف تھا، اس لئے فاتحین نے ہر مملوکہ ملک میں سکونت اختیار کرلی اور اپنے وطن کو بھول بیٹھے، دوسرا سبب خود مذہب اسلام کی تشاؤم پسندی تھی۔ خود قرآن نے کبھی بھی تشاؤم کی تعلیم نہیں دی، لیکن عربی ذہنیت نے اُسے اپنا کر لیا تصویری وعکاسی معصیت قرار پائی۔ جاہ وحشم معاصی میں شامل ہوگئے۔ خوش پوشی۔ خلاف شریعت ثابت کر دی گئی۔ غرض اسلام بانئ اسلام کے مقاصد سے مختلف ایک بدوی خزاں رسیدہ ذہنیت کا جولان گاہ بن گیا۔

چونکہ ہمارا مبحث صرف عرب ہے، اس لئے ہم مسلمانوں کے عجمی ذوق ادب سے بحث نہیں کرنا چاہتے، مگر شاید اس قدر ذکر غیر مفید بھی نہ ہو کہ خلافت فاروقیہ کے بعد شیرازۂ اسلام میں جو انتشار پیدا ہوا اوس نے عربی سطوت وجبروت کا خاتمہ کر دیا۔ بنو امیہ نے سرزمین مکہ و مدینہ سے علیحدگی اختیار کی۔ بنی عباس نے بھی خاص گہوارۂ اسلام سے بے اعتنائی برتی۔ ترکوں نے اپنے دور حکومت میں اوسے محض سیادت اسلامیہ کا ذریعہ سمجھا، اور سلطان سلاطین نے سرزمین عرب کو کبھی متمدن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بس جو کچھ اوس سے تعلق تھا وہ مذہبی عقیدت تھی۔ سال کے دس دن دنیائے اسلام کا کثیر گروہ زیارت و حج کے لئے جمع ہوجاتا۔ یہاں بھی وہی غلطی قائم رہی۔ ارکان حج مقصود سمجھے گئے، جنکا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد چندے اوسکی حالت مراسم ورواج سے زیادہ نہیں رہ گئی۔

بعد جنگ عظیم انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے قومی تحریک کا احیاء کر دیا۔ لیکن پھر بھی عرب ذہنیت پر اسدرجہ مذہب غالب ہے کہ ابن سعود نے اس دور میں بھی کافی قدامت پرستی کا ثبوت دیا۔

ادبیات

فنون کا یہ حال رہا، اب ادبیات کو لیجئے، عربی زبان دنیا کی بہترین زبانوں میں سمجھی جاتی ہے۔ میرا یہ خیال کسی عصبیت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ سر ڈینی سن راس ایسے مستشرقین کا خیال بھی یہی ہے۔

قبل از اسلام کسی عربی کتاب کا پتہ نہیں ملتا۔ ادبیات محض شاعری و گفتگو تک محدود تھے۔ سبع معلقات ہی ایک ایسا مجموعہ تھا۔ جس سے ہم قبل از اسلام عربی ذوق ادب کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ عربوں کو اپنی زبان دانی وتقریریہ

ناز تھا، چنانچہ وہ ماوراے عرب کو عجم (گونگا) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بعثت اسلام کے بعد سب سے پہلی کتاب جس کے تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ کلام اللہ تھا، خلفائے راشدین کا یہ احسان ہے کہ اونھوں نے اسکو جمع کر کے محفوظ کر لیا۔

عربی ادبیات عجمی دماغ کی ممنون منت رہیں۔ الا ماشاء اللہ خود عربوں نے کبھی کوئی ادبی ذوق کا ثبوت نہیں دیا۔ آپ تمام تر مشہور عربی تصانیف کو عجمی دماغ کا نتیجہ پائیں گے۔ میرے خیال میں اس کا بھی وہی سبب ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یعنی سلاطین اسلام کی خاص سرزمین عرب سے بے اعتنائی۔

اگر اس ریگستان میں کوئی نخلستان ہے تو وہ صرف عربی شاعری۔ عربی شاعری دنیا کی بہترین شاعریوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک طرف تو عربی شاعری میں عجمی نسائیت مفقود ہے، بدوی طرز معاشرت نے عورتوں سے بھی نسائیت غائب کر دی تھی چہ جائیکہ مرد۔ تمدن کی سادگی نے خیالات میں سادگی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ ہر شے کو فطری نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے نہ فکر معیشت تھی۔ اور نہ خیالات میں غامضانہ بلندی۔

دنیا محبت کو انسانی کمزوری سمجھتی ہے، لیکن عرب ذہنیت نے اس کو دیگر اعلےٰ جذبات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی آب و ہوا۔ قد و قامت نے کبھی بھی محبوبیت کو نزاکت کا مرادف نہیں سمجھا۔ عرب ذہنیت نے عقد و مناکحت کو معاہدہ و پیمان سے زیادہ کبھی وقعت نہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے عورتوں کو کبھی منجملہ "اسباب لطافت" نہیں جانا اونکے نزدیک "اسباب ضرورت" میں شامل تھی۔ اور اس تخیل نے شاعری میں ایک گونہ خشونت ضرور پیدا کر دی۔

ایران

ایران کی ادبی و تمدنی تاریخ تین بڑے حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۱) قبل از اسلام (۲) بعد از اسلام ——— ۱۹۱۴ء تک (۳) موجودہ انقلاب

قبل از اسلام

تاریخ قدیم میں ایرانی تمدن کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ برخلاف عرب کے ایرانی ذہنیت تمدنی اثرات قبول کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے۔ خوشگوار موسم، زرخیز زمین، قدرتی چشموں کی فراوانی، غرض فطرت نے ایران کو وہ قدرتی فوقیت دی ہے، جو ایشیا کے کسی ملک کو حاصل نہیں ہے۔ اہل یونان و اہالیان روم کے تعلقات و روابط نے مغربی حکمت و فلسفہ کو ملک میں رائج کر رکھا تھا۔ زردشت نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ عقل کے خواہ کتنا ہی منافی کیوں نہ ہو لیکن تہذیب و تمدن کا مانع نہ تھا اسلام کی طرح زردشتی اصول مذہب نے کبھی "ہمہ گیری" کا ارادہ نہیں کیا۔ اوس نے تو صرف تزکیہ نفس کے ذرائع بتائے اور دنیاوی معاملات کو انسانی ضروریات پر منحصر رکھا۔ اس مذہبی آزادی نے ایرانیوں کو کبھی مذہب کا غلام نہیں بننے دیا۔

عرب سرحدی ملک تھا، لیکن وہاں کیا تھا جسکو وہ حاصل کرتے، یونان و بابل کی سلطنتیں گو فاصلہ پر تھیں، لیکن جنگی و تجارتی تعلقات نے ایران کو کسب تمدن کے کافی مواقع بہم کر دئیے۔ اشوک کے زمانہ میں ہندوستان سے بھی سیاسی و اقتصادی تعلقات کے قیام کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ جنگی اسلحہ بیشتر ہندوستان ہی سے بنکر جاتے۔ دارا اور بہرام کے دور سلطنت میں شاہانہ جاہ و حشم کو بیحد عروج نصیب ہوا۔ سامان تعیش کی بہم رسانی نے فنون لطیفہ کی جانب توجہ دلائی، فن موسیقی نے ترقی کی اور آلات ترنم ایجاد ہوئے۔ دارا کے دربار میں متعدد ماہران موسیقی کا مجمع رہتا۔ بہرام گور کے زمانہ میں مصوری نے خاص ترقی کی۔ ظروف پر نقش و نگار بنائے جاتے۔ تجارتی و جنگی تعلقات نے یونانی اثرات کو عمارتوں میں قبول کیا، مگر ایرانی کبھی بھی اچھے معمار ثابت نہیں ہوئے۔ شراب سازی ایرانیوں کی مخصوص تجارت تھی۔ ہندوستان اور مصر کے وسط میں ہونے کی باعث یہ تجارتی رہگذر بھی تھا۔ ایرانی سلاطین نے اکثر عرب پر تسلط و اقتدار کی خواہش کی لیکن فتوحات کے بعد بھی کبھی پُر امن تسلط قائم نہ رہ سکا۔

بعد از اسلام

جس وقت رسول عربی نے دنیا میں قدم رکھا اوسوقت ایران میں نوشیروان عادل کی حکومت تھی۔ نوشیرواں نے اپنی تمامتر توجہ عدالتی نظم و نسق پر مبذول رکھی۔ پُر امن زندگی نے عوام میں متمدن اثرات پیدا کر دئیے تھے۔ لیکن اوس نے کوئی خاص صورت اختیار نہیں کی تھی۔

خلیفہ دوم کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ اسلام کی ترویج و تبلیغ نے سارا قدیم تمدن فنا کر دیا، مذہبی غلو نے تمام فنون لطیفہ کو خاک میں ملا دیا۔ تصویریں ضائع کر دی گئیں، منقش قالین جلا دئیے گئے، زردشتی قدیم ادبیات بہ سبب اس کے کہ وہ اسلام کے منافی تھیں، نذر آتش کر دی گئیں۔ مگر یہ صورت صرف سو ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی۔ ایرانیوں سے زیادہ دنیا میں کوئی قوم تمدن کے حصول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایرانی ذہنیت کا اندازہ آپ صرف ان اشلہ سے کر سکتے ہیں۔

(۱) زمانہ تو با تو نسازد تو با زمانہ بساز،

(۲) باہمیں مردماں بہ باید ساخت،

ایرانی اپنے کو ہر نئے ماحول کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ ضرور ہوا۔ لیکن جب مسلمانوں کو اقتدار نصیب ہوا تو ایرانیوں نے بہ ظاہر اپنے کو عربوں سے زیادہ مذہب کا وفادار ثابت کیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں وہ وسیع سلطنت اسلامیہ کا ایک جزو تھا۔ مامون نے سنہ ۲۰۴ھ میں صوبہ خراسان کی حکومت طاہر کو تفویض کی۔ طاہر آزاد خیال تھا، اوس نے رعایا کو پوری مذہبی آزادی عطا کی، ایرانیوں نے اپنے سابقہ تمدنی و ادبی روایات کے احیاء میں کوششیں شروع کر دیں۔ مدارس کا اجراء ہوا۔ مختلف ممالک سے حکماء و اہل علم طلب کئے گئے۔ نکو بار دپائے تخت) میں ایک عظیم رصد گاہ بنائی گئی۔

فتح اسلامی کے بعد ایرانیوں نے سب سے پہلی کوشش ۸۷۰ء میں اس امر کی کی کہ وہ عربی اقتدار کو ملک سے ختم کردیں۔ دو سو برس کے اندر قدیم ایرانی مذہب تو ضرور فنا ہوگیا۔ لیکن ایرانی ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوسکی۔ یعقوب نے ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالی۔ جلال الدین ملک شاہ (۱۰۷۰-۱۰۹۲) کے زمانہ سلطنت میں تمامی فنون لطیفہ کے احیاء کی کوششیں کی گئیں۔ اور ایرانی تمدن ایک بار اور زندہ کردیا گیا۔

نقاشی و مصوری نے ایک نئی صورت اختیار کی جو گو مذہب کے تابع تو نہ تھی۔ لیکن مذہب کے خلاف بھی نہیں سمجھی گئی۔ قرآن و دیگر کتب مذہبی کے اوراق پر مطلا نقش و نگار بنائے جانے لگے۔ رزمی و بزمی قصص کے واقعات کی تصویریں بھی بننی شروع ہوگئیں۔ بہرام اور اُس کی محبوبہ فتنہ کی تصویر ایک قومی حیثیت رکھتی ہے۔ قالین اور جائے نماز پر نقش و نگار بھی بنتے تھے۔ موخر الذکر پر خانۂ کعبہ یا مسجد نبوی کی تصویر ہوتی تھی۔ اور اول الذکر پر ساقی و محبوبہ و جام" کا پُر لطف امتزاج۔ ایرانیوں کو موسیقی سے شغف تھا۔ ابتدائی اسلامی فتوحات نے اس کو بھی معصیت قرار دیدیا تھا لیکن گیارھویں و بارھویں صدی میں ایرانی دربار ماہرین موسیقی کا آماجگاہ تھا۔ میرے خیال میں اسلامی تاریخ میں یہ پہلا دور ہے جب کنیزوں کو گانا اور ناچنا سکھایا گیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ رواج عام ہوگیا اور شرفاء کی عورتیں بھی موسیقی سیکھتیں اور اپنے شوہروں کو اس سے مسرور کرتیں۔

بغداد و خراسان و شیراز کا یہ عام رواج تھا کہ چار بجے شام کو جب مرد اپنے اپنے کاموں سے گھر کو واپس آتے تو ان کی عورتیں نہا دھوکر اچھے اچھے کپڑے زیب تن کئے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتیں۔ بعد غسل و طعام ملکۂ خانہ سامان سرود لیکر بیٹھ جاتی اور اپنے شوہر کے دل کو خوش کرتی۔ گیارھویں صدی میں اس طرز معاشرت نے اسقدر عام رواج حاصل کیا کہ ایک سیاح نے لکھا ہے کہ جب وہ بغداد کی گلیوں میں گذر رہا تھا۔ تو اس نے صدہا مکانوں سے رقص و سرود کی روح افزا آوازیں سنیں۔ اس رواج نے زنان بازاری کو بالکل مفقود کردیا تھا۔ مرد خواہ کتنا ہی بدطینت کیوں نہ ہو۔ کبھی بھی وہ بیرونی دلچسپیوں کو پسند نہیں کرتا، جبتک کہ وہ دلچسپیاں اوسکے گھر میں خود مفقود نہ ہوں۔

زبان

شیرینی میں کوئی زبان فارسی کا مقابلہ نہیں کرسکتی، خود زبان میں ایک شاعرانہ موسیقی ہے، ترکیب اضافت نے اختصار کی وہ لطافت پیدا کردی ہے جس کی مثال کسی زبان میں بھی نہیں ملسکتی۔

اسلامی فتوحات سے قبل ایرانی زبان ایک گونہ خالص تھی، غیر زبان کے صرف وہی الفاظ مستعمل تھے۔ جس کا مرادف ملکی زبان میں موجود نہ تھا۔ زبان میں گو سادگی تھی لیکن لطافت سے معرا نہ تھی۔ زردشتی لٹریچر ملک میں رائج تھا اور قرآن کی طرح وہی زبان کے اعتبار سے مستند بھی سمجھا جاتا تھا۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ ایرانی ذہنیت میں قبول اثر کا مادہ بعید ہے۔ عربی فتوحات کے بعد زبان میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ قدیم ایرانی زبان تقریباً مفقود ہوگئی، کسی زبان میں بھی آپ کو غیر زبان کے اس قدر الفاظ نہ ملیں گے۔

س قدر آپ فارسی میں عربی کے الفاظ پائیں گے۔

مغربی اقوام کے تعلقات نے ایک دوسری کروٹ بدلی، اسوقت آپ فارسی زبان میں دس فی صدی الفاظ گریزی، روسی اور فرانسیسی پائیں گے۔

شاعری و ادبیات

ایرانیوں نے شاعری عربوں سے سیکھی، چنانچہ فارسی عروض عربی عروض ہے، قواعد کی سہولت، زبان کی شیرینی، علم عروض کی آسانی، ایرانیوں کی لیف ذہنیت، ملک کی خوشگوار فضا، اتنے اسباب فارسی شاعری کو پُرلطف بنانے کے لئے کم نہ تھے، حکمت و فلسفہ و تاریخ میں فارسی صانیف کم نہیں ہیں، لیکن شاید یہ میرا بیان غلط نہ ہو کہ فارسی ادبیات میں شاعرانہ کلام کا جزو نسبتاً زائد ہے۔

قرآنی تعلیم سے بے اعتنائی نے مسلمانوں میں تصوف کا عام مذاق پیدا کر دیا، لیکن عربی "واقعہ پسند" ذہنیت نے اسکو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ایرانی فضا تصوف کی پرورش کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی، چنانچہ آپ کو فارسی سے یادہ کسی اسلامی زبان میں اسقدر صوفیانہ لٹریچر دستیاب نہ ہوگا۔ جلال الدین رومی کی مثنوی نے دنیا میں جو وقعت اصل کی ہے وہ محتاج ثبوت نہیں، صوفی شعراء میں حافظ کا نام اگر نہ لیا جائے تو ظلم ہوگا۔ حافظ نے نئے اصول شاعری ی بنیاد ڈالی۔ جس کا اتباع آجتک قائم ہے۔

دورِ جدید

ایران کا دورِ جدید نہایت امید افزا ہے، صنعت و فنون کی جانب ملک کو خاص توجہ ہے اس دور کی خصوصیت مغربی اتباع ہے، لیکن تقلید نہیں، رضا شاہ کی ذی ہوش نکھیں ایشیائی ذہنیت کا اچھی طرح مطالعہ کر چکی ہیں۔ امان اللہ کے تلخ تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ایشیا ابھی مذہبی روایات دیمہ کا جوا اپنی گردنوں سے علیحدہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

ادبیات نے بھی طبائع کے ساتھ رنگ بدلا۔ اب نہ وہ حافظ کا رنگ ہے اور نہ قاآنی و خاقانی کا طرز، مغربی رات نے شاعری سے مصنوعی لطافت کو فنا کر دیا۔ قصیدوں کی جگہ قومی نظمیں ہیں۔ غزلیات کی جگہ اخلاقی وجدانات افزا لعات ہیں۔

ہندوستان

ہندوستانی ادبیات و فنون کی تشریح مشکل امر ہے، اس لئے کہ انکی ترتیب تدوین میں صرف ہندو مذہب اور ہندو قوم ہی کی کارفرمائی نہ تھی۔ بلکہ بودھ اور اسلام نے بھی اپنا کافی اثر ڈالا، بودھ ہب کا ماخذ چونکہ ہندو مذہب ہے، اس لئے اُن کی ذہنیت میں بھی کوئی امتیاز و تفاوت پیدا نہ ہو سکا۔ باقی رہا اسلام اور مسلمان اسکا دخل ہندوستانی تاریخ میں اس قدر تاخیر کے ساتھ ہوا کہ اصل ہندو ذوق ادب بالکل غیر متاثر رہا۔ یہاں تک کہ آپ ندوؤں کی ادبیات و فنون کی تاریخ اس طرح بھی ترتیب دے سکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کا نام بھی اوس سلسلہ میں نہ آئے۔ ہب کی متضاد و مخالفت نے ذہنیت کو اسدرجہ علیحدہ رکھا ہے کہ دونوں میں ایک بین فرق نظر آتا ہے، گو موجودہ مضمون

کو میں صرف ہندوؤں کی ادبی و فنی تاریخ پر محدود کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اسلامی اثرات کو نظر انداز کرنا کسی قدر نامناسب و ناموزوں ہے۔

سندھ و شمالی و مشرقی حصۂ ہند میں جو کھنڈر دستیاب ہوئے ہیں، اون سے ہندوستان کی تین ہزار برس قبل مسیح کی تاریخ و تمدن کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ سکندر اعظم کی فتوحات سے قبل بھی ہندوستان اور مصر و بابل کے درمیان تمدنی و معاشرتی تعلقات قائم تھے۔ سکندر کی فتوحات سے قبل کی عمارتیں، مندر اور عبادت گاہ یونانی و مصری اُصول تعمیر کا پتہ دیتی ہیں۔ پہاڑیوں پر ایسے مندر بھی موجود ہیں، جو ایک مسلم پتھر کے بنائے ہیں۔ اور تمامی نقوش، در و دیوار اوسی سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ خود اون پہاڑیوں پر وہ پتھر نایاب ہے اتنے بڑے اور جسیم پتھر کا وہاں پہونچانا عجیب حیرتناک واقعہ ہے۔

ہندوستان کی موسمی تبدیلیاں۔ آب و ہوا۔ برسات کا پُرلطف موسم، غرض ان مجموعی اثرات نے ہندوستانی ذہنیت کو فلسفیانہ بنا دیا۔ دنیا کی کسی قوم میں اسدرجہ غامض فلسفہ ملنا مشکل ہے، اس لئے کہ دوسرے ملکوں میں یہ ذہنیت کسبی ہوتی ہے۔ لیکن فطرت نے یہاں وہبی بنادی ہے، مگر یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس فلسفہ میں تشاؤم کا عنصر غالب ہے۔ رامائن و وید تفاؤل سے مالامال ہیں۔ لیکن ہندو فلسفہ میں تشاؤم ہے، ماہرین فن نے اس ذہنیت کے جو وجوہ بیان کئے ہیں، میں اون سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں تناسخ کا اعتقاد اس تشاؤم کا ذمہ دار ہے، مرنا اور جینا، پھر مرنا اور پھر جینا اس خیال و اعتقاد نے زندگی کے مطمح نظر کو گو غامض بنادیا لیکن علویت غائب ہوگی۔ اور یہ علویت ہی ہے جو تفاؤل پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کی کم مائیگی کو ہمیشہ مجبور کرتی ہے کہ ہم دنیا اور اوسکے تمام شعبہ جات کو حقیر سمجھیں۔

ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی، جب ہم خالص ادبیات کو مسرت انگیز پاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم اس طرح کا نسائی فلسفہ پیش نہیں کرسکتی۔ ایک ہندو عورت عجیب غریب شئے ہے۔ مرد کے نقطۂ نظر سے وہ محبت کا مجسمہ ہے۔ فرمانبرداری اور اطاعت کا ہیولے ہے۔ وحدت مناکحت نے گو محبت کو معین بنادیا ہے، لیکن یہ جبر ایک پُرلطف چیز ہے، رام جی اور سیتاجی کا واقعہ جو بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہو لیکن رامائن نے اس کو جس طرح پیش کیا ہے، اوس سے عجیب و غریب پُرلطف نکات حل ہوتے ہیں۔ میری رائے میں یہ کتاب ہندو فلسفۂ نسائیت کی بہترین تشریح پیش کرتی ہے، رام جی جرات و ایثار کا مجسمہ ہیں سیتا جی عفت و راستی کا ایک پیکر ہیں، راون ظلم و بدی کا ایک نمونہ ہے۔ ہرچند والمیک نے رام جی اور راون کو اخلاقی تقابل سے ایک ممتاز حیثیت دی ہے، اور سیتاجی کے مقابلہ میں کوئی کیرکٹر پیش نہیں کیا ہے، مگر میری نظروں میں یہ قصہ سیتاجی کو ممتاز ترین جگہ دیتا ہے۔

رامائن سے کوئی موزوں اقتباس پیش کرنا مشکل ہے۔ اس لئے میں بھگوت گیتا سے چند سطریں ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ ہندو فلسفہ کا بہترین اندازہ کرسکتے ہیں۔

"انسان کے تسلسل خیالات سے اُلفت پیدا ہوتی ہے، اُلفت سے محبت اور محبت سے غصہ۔ غصہ کا نتیجہ پریشانی اور پریشانی کا انجام انتشار خیال۔ جہاں خیالات منتشر ہوئے۔ عقل میں فتور آیا اور جب عقل جاتی رہی تو انسان ایک گم کردہ راہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

لیکن جس نے اپنے خیالات سلیم کا سلسلہ قائم رکھا اور جو غصہ و نفرت سے محترز رہا اور نفس پر قابو رکھا وہ بہت جلد روشن دماغ ہو جائے گا۔ جس شخص نے اپنی نفسانیت کو پس پشت ڈال کر زندگی بسر کی اوس کو اطمینان میسر ہوا۔"

قصص و حکایات ہندوستانی ادب کی دوسری نمایاں خصوصیت ہے، کلیلہ و دمنہ دنیائے قصص میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کتاب کا فارسی و عربی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے، گو حیوانات اس قصہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان سے نہایت نتیجہ خیز سبق ملتا ہے، اُصول جہانبانی معاشری قواعد، تمدنی ضوابط غرض یہ کتاب ہندو اصول سیاست کی بہترین توضیح ہے۔

طب میں ہندوؤں نے کافی دسترس حاصل کی۔ کشتہ ہندو حکماء کی ایجاد ہے، چونکہ تمدن و تہذیب کے ابتدائی مدارج تھے، اس لئے طریقہ علاج بھی معمولی تھا۔ علاوہ کشتہ جات کے جڑی بوٹیوں سے علاج ہوتا تھا۔ ہندو حکماء نے ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کی تھیں۔ جن کو آج یورپ بھی اپنی کیمیاوی ترکیب سے دریافت نہ کر سکا۔ میرے علم میں یہ واقعہ ہے کہ ایک ہندو فقیر صرف ایک دن کوئی جنگلی بوٹی کھا لیا کرتا تھا اور ایک ماہ تک نہ اوسکو بھوک لگتی تھی اور نہ پیاس۔

مسلمان بہ حیثیت فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے، بجز مذہب کے اون کے ساتھ نہ کوئی تمدن تھا اور نہ کوئی فلسفہ۔ آٹھویں صدی میں جب اونھوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تو اوسوقت تک خود اُنکی قوت عمل میں اضمحلال آچلا تھا عجمی آب و ہوا نے ایران ہی میں ان کا سارا خلوص و جوش ضبط کر لیا تھا۔ اب تو صرف ملک گیری کی ہوس تھی۔ نہ مذہب کی ترویج کا خیال تھا اور نہ اصول زندگی کی تبلیغ کا دہیان۔

ہندوؤں نے مسلمانوں سے ترک موالات اختیار کی جسکے باعث وہ بالکل محفوظ رہے، شمالی ہندوستان میں فارسی علم ادب نے ہندوؤں کو ضرور متوجہ کر لیا، مگر سوائے اس کے اور کوئی اثر مسلمانوں کا ہندوؤں پر نہ پڑ سکا۔ ممکن ہے کہ یہ میرا خیال ایک مناظرہ کی صورت پیدا کر دے۔ لیکن میں بے خوف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں نے اپنی آٹھ سو سال کی حکومت میں کوئی تہذیب و تمدن ہندوستان کو عطا نہیں کیا، بجز چند پرانی عمارتوں کے اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ یہاں کبھی ہم حکمراں تھے بھی۔ تاج محل اور اکبر شاہ کے مقبرے، کسی گذری ہوئی حکومت کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ پھر نہ صرف یہ ہوا بلکہ ہم نے وہ بھی کھو دیا جو ہم لے کر آئے تھے۔ ہندوؤں کی جاذب قومیت نے مسلمانوں کو فنا کر دیا، حکومت محض طاقت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اوس کے پس پشت تمدنی اخلاقی قوت ہونا چاہیئے، یہی سبب ہے کہ

جبتک مسلمانوں میں عسکریت قائم رہی وہ حکومت کر سکے۔ اور جب وہ فنا ہوئی تو یہ بھی فنا ہو گئے۔

انگریزوں کی حکومت نے ہندوؤں کی طرح کروٹ بدلی۔ ہند و تہذیب و تمدن کا یہ تیسرا دور، دور اول سے زیادہ شاندار ہے اور رہوگا۔ ابتدائی مراحل پر بربریت تو موجودہ تمدن نے دور کر دے اب جو لکھا رہے وہ غضب کا ہے "ہندوؤں کی اخلاقی تاریخ" میں میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ہونہار قوم قابل رشک و تقلید ہے۔

ہندی عام ملک کی زبان ہو رہی ہے، ہندی میں گزشتہ سال بجز بنگالی کے سب سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں چونکہ بنگال میں انگریزی تمدن کے آثار سب سے پہلے نمایاں ہوئے اور بنگالیوں نے سب سے پہلے انگریزی تمدن اختیار کیا اس لئے قدرتاً اوس نے ہندو قوم کی ادبی و فنی رہنمائی میں کافی حصہ لیا۔ بنگالی زبان اسوقت ملک کی مایۂ ناز زبان ہے۔ شعر و شاعری حکمت و سائنس غرض تمامی اصناف علوم کا کافی سرمایہ اس زبان میں موجود ہے۔ اخبارات و جرائد بالکل مغربی اُصول پر مدون ہوتے ہیں۔ رسائل میں عالمانہ و ناقدانہ مضامین تحریر ہوتے ہیں، ندرت و جدت، تحقیق و تنقید اون کا طرۂ امتیاز ہے۔

اول تو ہندی و سنسکرت شاعری ابتداء ہی سے فطرتی مناظر سے مملو تھی، لیکن مغربی مذاق نے اوس میں اور لطافت پیدا کر دی۔ قومی و فلسفیانہ نظمیں، اخلاقی و معاشرتی ڈرامے صدہا کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اور قوم میں رائج ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے تو ایک خاص مدرسۂ شاعری کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس نے مغرب کو بھی متحیر کر رکھا ہے۔

چینی

دنیا کی متعدد اہم ایجادات چین سے منسوب ہیں۔ تاریخ سے مصری تمدن کا پتہ چار ہزار برس قبل مسیح تک چلتا ہے۔ اس خیال و اعتبار سے چینی تمدن نسبتاً جدید ضرور ہے، مگر مصری تاریخ معتبر نہیں کہی جا سکتی۔ برخلاف اوس کے ہمارے سامنے صحیح چینی حالات ۲۸۰۰ سال قبل مسیح تک کے موجود ہیں۔ چین کے تمام بادشاہ و حکمران اپنی حکومت کے صحیح حالات کا قلمی ذخیرہ رکھتے تھے، شاید اسکی مثال آپ کو کسی اور ملک میں نہیں ملے گی۔ یہی سبب ہے کہ گو دوسرے ملکوں کے حالات ہزارہا سال قبل مسیح کے دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اون کو وہ صداقت نصیب نہیں۔

دنیا میں چینی زبان سے زیادہ کوئی زبان تعجب خیز نہیں۔ اوسکی پہلی خصوصیت اوس کا طرز تحریر ہے۔ ابتدائی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ چینیوں کے یہاں کوئی حروف کتابت نہ تھے۔ اشارات سے آواز و معنی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ اشارات تصویری شکلوں میں ہوتے۔ وہ جس چیز کا نام لکھنا چاہتے اوسی کی تصویر بناتے۔ تصویر کی مماثلت سے مفہوم کا اندازہ ہوتا تھا۔ اشیا کا مفہوم تو آسان تھا، مگر لطف یہ ہے کہ صنعت کا بھی وہ اسی طرح اظہار کرتے۔ اعداد کا اظہار لکیروں سے کیا جاتا۔ ایسے مفہوم جو تصویروں سے ادا نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً "روشنی" وغیرہ ان کا مفہوم دو نشانات کو ملا کر ادا کیا جاتا تھا۔ چاند و سورج کی تصویروں کا امتزاج "روشنی" کا مفہوم ادا کرتا۔

"خوشی" زچہ و بچہ کی نشانیوں سے ظاہر ہوتی۔ "امن و صلح" ظاہر کرنا ہوتا تو عورت کی نشانی کو چھت کے نیچے

دکھاتے۔ "حق و صداقت کا اظہار انسان اور "ایک" سے کرتے۔

میں ان نشانات سے چینیوں کی اخلاقی زندگی کے متعلق ایک نہایت لطیف نتیجہ اخذ کرسکا ہوں، چینیوں کی متاہلانہ زندگی نہایت خوشگوار رہی ہوگی۔ اس لئے کہ زچہ و بچہ کی یکجائی اونکے لئے خوشی کی مرادف تھی۔ اسی طرح اون کے نزدیک عورت کا تخیل فساد آمیز نہ رہا ہوگا، آج کل ہندوستان میں ایک ضرب المثل رائج ہے، جو گو رکیک ہے، لیکن اس سے ہندوستانی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "زن، زمین، زر، یہ جھگڑے کا گھر" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہندوستانی ذہنیت عورت کو کن نظروں سے دیکھتی ہے، اس خیال کا اثر عورت و مرد دونوں کی اخلاقی زندگی پر پڑتا ہے۔ چینیوں کی صداقت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کا "واحد القول" ہونا ضروری سمجھتے تھے۔

چینی زبان کی دوسری خصوصیت اس کا لب ولہجہ ہے ایک ہی لفظ مختلف لہجہ و تلفظ میں مختلف معنی رکھتا ہے اس سے گو اونکی زبان کی کم مائیگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن دوسری طرف اون کی زبان سے "حسن اجمال" بھی مترشح ہوتا ہے ایک لفظ "فینگ" کو لے لیجئے۔ یائے معروف کے ساتھ اوس کے معنی "مکان" کے ہیں۔ یائے مجہول کے ساتھ "کاتنے" کے ہیں، اور "ی" کو اگر کھینچکر پڑھیے تو اوسکے معنی "آزاد کرنا" ہے۔

چینیوں کی تیسری خصوصیت اون کا "ذوق حسن" ہے، آپ اونکی ہر صنعت و حرفت میں تناسب حسن اور استقلال پائیں گے۔ ہزار ہا سال قبل از مسیح کے مٹی کے برتنوں پر بھی جو نقش و نگار پائے جاتے ہیں، اون سے بھی ذوق حسن کا پتہ چلتا ہے، ڈنی سن راس مشہور مستشرق کا خیال ہے کہ چینی مذموم و بدنما صنعت کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، آپ چینی تعمیرات میں کبھی بھی ناموزونیت اور خشونت نہ پائیں گے۔ اور اوس پر لطف یہ ہے کہ وہ پائیداری میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں، دیوار چین، چینیوں کی مستحکم و مستقل طبیعت کا ایک نمونہ ہے، اون کی عبادتگاہیں اکثر چوبی ہوتی ہیں، لیکن جب کبھی وہ سنگ مرمر کا استعمال کرتے ہیں تو نہایت قابل تعریف ہوتا ہے۔

سکندر اعظم نے جب ہندوستان فتح کیا، تو یونانی اصول نقاشی کا ملک میں رواج ہوا اور یہاں سے بدھ مذہب کے مبلغین و معتقدین نے چین میں جاکر اوسکو رواج دیا۔ اس طرح چین کے اصول نقاشی میں یونان کی مغربیت اور ہندوستان کی مشرقیت کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔

چین کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں بھی نقش و نگار کا مذاق پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ سیاہ و آبی رنگ آمیزی کا سعلاج عام تھا، وہ کبھی کبھی ریشمی کپڑوں پر بھی نقش و نگار بناتے تھے۔ چینی اصول نقاشی کی کلید "صوری اثرات" ہیں، نا شرانہ حقیقت کے بجائے اون سے شاعرانہ تجویز مترشح ہوتی ہے تصویروں میں عکس و سایہ کا نام نہیں۔ متقدمین میں جن سے زیادہ خوشنما تصویر چراگاہ کی آج تک کسی نے نہیں بنائی۔ پہاڑ اور ابر کی تصویروں میں مصنوعی اثرات کو زیادہ دخل ہوتا تھا۔

وہ چراگاہ کی تصویروں کو مسلسل کئی قطعات میں دکھاتے۔ ایسی تصویروں کو لکڑی میں لپیٹ کر کھلے ہوئے صندوق میں رکھتے، اور لکڑی کے ایک کنارہ کو گھماتے، اس طرح تصویر کا ہر قطعہ رفتہ رفتہ نظروں کے سامنے آتا جاتا۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ سینما کی ایجاد کا پہلا زینہ ہے۔

چینی اپنے مورث و آباؤ اجداد کی روحوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اون کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد بھی مُردوں کی روحیں خاندان کی عملی زندگی میں دخیل رہتی ہیں۔ ہر گھر میں ایک صندوق ہوتا ہے، جس میں روحوں کا قیام خیال کیا جاتا ہے۔ ہر اہم موقعہ پر عمدہ عمدہ کھانے اوس صندوق کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

ہندؤں کے اصول حیات چینیوں کے فلسفۂ زلیست سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندو فلسفہ کے دلدادہ ہیں لیکن چینیوں کو علم اخلاق میں بے حد شغف ہے، کنفوشیس کے اُصول مذہب سے غیر متعلق ہیں۔ چینیوں کی سیاسی و اخلاقی زندگی دونوں علم اخلاق پر مبنی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف چینی ذہنیت بیحد قدامت پسند ہے۔ وہ کبھی بھی بیرونی اگردوپیش سے خود کو مطابق نہیں بنا سکتے۔

انیسویں صدی کی ابتدا تک چینی ذخیرہ ادبیات کا کوئی ملک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نجوم، جغرافیہ، علم الابدان وغیرہ وغیرہ تمام علوم پر اونکی نہایت عالمانہ تصنیفات موجود ہیں۔

پندرہویں صدی میں حکومت کی ایما سے گیارہ ہزار جلدوں میں ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہوئی۔ ہر جلد دو نسخوں میں مرتب کی گئی۔ ہر جلد کا ایک نسخہ سولھویں صدی میں نظر آتش کر دیا گیا۔ دوسرے نسخہ جات باکسر کے غدر تک پیکنگ میں موجود تھے۔ اسوقت صرف سو جلدیں موجود ہیں بقیہ سب ضائع ہو گئیں۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں، آپ چینیوں کے ہر شعبۂ زندگی میں علم الاخلاق کی تبلیغ کا اثر پائیں گے۔ اونکا ہر ادیب ناصح ہے، اور اونکا ہر شاعر واعظ۔ اس میں شبہ نہیں کہ چینی ادبیات موجودہ اُصول تنقید کا بار نہیں اُٹھا سکتے۔ بااینہمہ چین میں چند ایسے شاعر گزرے ہیں جنکا کلام کسی طرح غیر موثر نہیں سمجھا جا سکتا۔

زمانۂ قدیم سے چینیوں کو شاعری سے شغف ہے، علم عروض کے اُصول گو دقیق ہیں، لیکن چینی شاعری اونکی سکون طلب زندگی اور مطمئن ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔

دور جدید زمانہ کے انقلاب نے چینیوں کی بھی آنکھیں کھول دی ہیں۔ تین چوتھائی ملک افیون کا عادی تھا مگر چینی حکومت نے افیون کی درآمد قطعی بند کر دی۔ بیرونی حریت سوز اثرات کلیتًا نابود ہو گئے، لیکن ابھی تک ملک کو وہ اطمینان حاصل نہیں ہے، جس کی عافیت پرور آغوش ادبیات و فنون کی ترقی کے لئے ضروری ہے قومی ترقی کی ابتدا و انتہا دونوں شاعری سے ہوتی ہے، چونکہ صحیح جذبات ترقی کے پیش خیمہ ہیں اور شاعری جذبات کا آئینہ ہے۔ اس لئے قومی ترقی کے ابتدائے مراحل میں شاعرانہ تخیل بیحد معین ہوتی ہے۔ لیسا اوقات تو

یہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ چینیوں نے خواب غفلت سے جو کروٹ لی تو اونھیں اپنی کمزوریاں محسوس ہوئیں۔ اور اُنھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اون کی بدبختیوں کی تمام تر ذمہ داری استبدادی حکومت پر ہے، چنانچہ اونھوں نے سب سے پہلے اس کو فنا کیا، اور جب جمہوریت قائم ہو گئی تو ذہنیت بھی بدلنے لگی۔ چنانچہ موجودہ ذہنیت کا اندازہ مذکورہ ذیل کلام سے ہوگا:۔

(۱) غلامی کا دوسرا نام موت ہے۔ زندگی و آزادی مرادف الفاظ ہیں۔ اے موت تو آ۔ اور مجھے غلامی سے نجات دے۔ اس لئے کہ تیری نیش زنیاں حکومت کے بیہم مظالم سے کم نہیں۔ آ۔ اور جلد آ۔

(۲) اے قوم پرستو! اگر تم حصول ذرائع میں متحد نہیں ہو سکتے تو نہ ہو، لیکن خدا کے لئے مقاصد کا اختلاف نہ اختیار کرو، اس لئے کہ اختلاف مقصد موت کا پیش خیمہ ہے۔

(۳) زندگی صرف شجاعانہ زندگی کا نام ہے، فطری طرز موت سے اگر تم ہلاک ہوئے تو وہ طرز موت عامیانہ ہے اگر تم نے اسوقت معین کو اپنی شجاعت سے پہلے بلا لیا تو تم خاصان خدا میں ہو۔

سید یامین ہاشمی ایم۔ اے

ایک چتا میں دو شعلے

(بہ سلسلۂ ماسبق)

صبح صادق کا وقت تھا۔ اسوقت گھاٹ کے کنارے کچھ عجیب منظر ہوتا ہے، صبح بنارس سے کون ناواقف ہے۔ شہر کی معزز عورتیں اسی وقت اشنان کرنے آتی ہیں۔ اور فارغ ہو کر اندھیرے سے گھروں کو واپس جاتی ہیں۔ کسوم نے اُن موجوں کو جو گھاٹ کی سیڑھیوں سے ٹکرا رہی تھیں پیار کے انداز سے دیکھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر بولی: "اے میرے پیدا کرنیوالے تو خوب جانتا ہے کہ میری کلفتیں برداشت کی حد سے بڑھ گئی ہیں ..... کبھی نہ ختم ہونیوالی تلخیوں نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے۔ اور پھر اس آخری چوٹ نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں رکھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ جان بوجھکر میں نے آج تک کوئی کام تیرے حکم کے خلاف نہیں کیا۔ لیکن اگر بھولے سے کوئی لغزش ہوئی ہو تو اے پرماتما اُسے معاف کر دے۔ میں تیرے حضور میں خود آ رہی ہوں، اپنے کرم کے صدقے میں مجھے وہاں آرام دینا۔"

کسوم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی آخری سیڑھی تک پہونچی۔ اور قریب تھا کہ وہ پانی میں کود کر دنیا سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے کہ ایک بوڑھی عورت نے جو اس کی تمام باتیں کھڑی سُن رہی تھی اس کی کمر کو پوری طاقت سے پکڑ لیا۔ کسوم نے چھڑانے کی کوشش کی، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو لجاجت سے کہا کہ "پرماتما کے لئے مجھے مرنے سے نہ روکو۔"

بوڑھی عورت نے شفقت سے کہا: "بیٹی تیری عمر اس قابل نہیں کہ تو ایسے ارادہ پر تل جائے۔ ابھی دنیا کو تیری ضرورت ہے اور تجھ کو دنیا کی۔ جس پرماتما نے تجھے دکھ دیا ہے وہی آرام بھی دے گا۔"

بوڑھی عورت کی گفتگو میں اس قدر صداقت و متانت تھی کہ ناچار کسوم کو اپنے ارادوں سے باز آنا پڑا۔ اس نے گھاٹ سے کسوم کو الگ لیجا کر تسلی تشفی دی اور پوچھا "بیٹی تیرا گھر کہاں ہے؟" کسوم نے سسکتے ہوئے کہا کہ "اس دنیا میں کوئی نہیں۔" بوڑھی عورت جو بشرے سے شریف و معزز معلوم ہوتی تھی۔ بہت خوش ہوئی۔ بولی "بیٹی تو میرے ساتھ چل مجھے خدا نے کوئی لڑکی نہیں دی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تجھے اپنی لڑکی کی طرح جانوں گی۔" عورت کی چتون سے اسقدر شرافت ظاہر ہو رہی تھی کہ کسوم نے ساتھ ہونے میں کوئی تامل نہ کیا۔ اگرچہ اسکو کوئی خوشی اس سے نہیں ہوئی۔ بوڑھی

عورت جسکو لوگ ماتاجی کہتے تھے۔ کسوم سے بہت محبت اور پیار سے پیش آتی۔ یہاں تک کہ کسوم کا غم ایک حد تک غلط ہوگیا۔ ماتاجی ایک روز غیر معمولی طور پر خوش نظر آرہی تھیں۔ کسوم نے پوچھا تو کہا کہ "تیرے بھائی جو کچھ دنوں کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہیں سے ینی تال چلے گئے تھے۔ ان کا خط آیا ہے اسی ہفتہ میں آنیوالے ہیں"۔

ینی تال پہنچتے ہی کنول کو افاقہ ہونے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اس قابل ہوگئی کہ شیام نرائن کے ساتھ پہاڑوں اور چشموں کی سیر کرنے جایا کرتی۔ شیام نرائن کنول کی بلا کی ذہانت اُس کی طباعی اُس کے اندازِ گفتگو کو قدر کی نگاہ سے ضرور دیکھنے لگا تھا۔ لیکن کنول کی خلش کی کوئی انتہا نہ رہتی جب وہ دیکھتی کہ شیام نرائن پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں ہے۔ جب وہ دونوں چہل قدمی کے لئے جاتے ہوئے کسی آبشار کے قریب یا گھاٹی میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتے اور کنول ایک سنجیدہ سکون کے ساتھ اپنی تمام دلآویزیوں کو صرف کرتی۔ تو شیام نرائن اپنی معمولی بے نیازی سے کنول کی طرف دیکھتا اور کنول کی کرشمہ سازیوں کو ایک ناقابل برداشت ٹھیس لگتی۔

شکست کا خیال کبھی کنول کے دماغ میں آیا ہی نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اپنے نہایت معمولی حربہ سے وہ ہر طاقت کو نیچا دکھا سکتی ہے۔ لیکن شیام نرائن کی مستقل خودداری نے اس کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کر رکھا تھا اور ان کی اس مستقل مزاجی سے جہاں اسکی فطرت کو چوٹ پہنچتی تھی وہیں اس کو ایک مسرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ وہ اکثر نفسیات کی نازک بحثیں چھیڑ کر شیام نرائن کے حسیات کا امتحان لیا کرتی۔ جہاں تک ہوتا ان مباحثوں میں شیام نرائن ایک سنجیدہ اختصار سے کام لیتا جس سے کنول کی گرمیاں اور بڑھ جاتیں۔

ایک روز شیام نرائن برج نرائن بابو کے پاس تنہا بیٹھا تھا باتوں باتوں میں ایک مختصر سی تمہید کے بعد اس نے اسکی درخواست کی کہ برج نرائن بابو کنول کا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیدیں۔ برج نرائن بابو راج کشور سے مایوس ہو چکے تھے۔ پھر شیام نرائن کی شرافت اور لیاقت بھی بخوبی دیکھ اور سُن چکے تھے۔ بولے کنول اگر راضی ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں۔

شام کو شیام نرائن اور کنول حسب معمول ٹہلنے کے لئے گئے۔ ایک گھاٹی پر جو ایک غیر معمولی بلندی پر واقع تھی دونوں نے چڑھنا شروع کیا۔ کنول ہنوز کمزور تھی۔ چنانچہ شیام نرائن نے اس کو اپنا ہاتھ دیدیا۔ جس کی مدد سے کنول گھاٹی تک چڑھ گئی۔

گھاٹی خود ہی بہت دلکش تھی اور اسکے چاروں طرف کے مناظر بھی حد درجہ فرحت بخش تھے۔ آبشار اپنی سیمیں چادر سے دامن کوہ کو مالامال کر رہی تھی، پانی کے کنارے سبزہ بہاؤ کے زور سے ہر لحظہ جنبش میں آجاتا تھا۔ کنول نے تیز بہتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے دنیا میں کسی شئے کو قرار نہیں۔ آبشار کا شفاف پانی جو حد درجہ دلکش ہے ایک نامعلوم جستجو میں ہمیشہ سرگرداں ہے۔" شیام نرائن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں کنول زندگی کے لطف کا راز جستجو اور کاوش ہے دنیا پر اگر جمود کا غلبہ ہو جائے۔ تو ہماری تمام امنگیں سرد پڑ جائیں۔ ہماری بلند آرزوئیں پست ہو جائیں۔ ہماری سرگرمیاں سرد ہو جائیں اور دلجمعی ایک فضول شے ہو جائے" کہتے کہتے شیام نرائن یک بیک خاموش ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد بولا "کنول کچھ واقعات کی بنا پر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس چند روزہ زندگی کو تنہا رہ کر گزار دوں گا۔ لیکن کچھ دنوں سے یہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنا قدرت کے خلاف ایک بغاوت ہے، جس کے لئے میں کسی طرح تیار نہیں۔ ایسی حالت میں کیا تم میری رفیق زندگی بننا پسند کرو گی" کنول سکتہ میں آ گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ شیام نرائن کی ذات کو تمام ہستی سے بالاتر سمجھنے لگی تھی" اس کے سامنے وہ اپنی تمام فاتحانہ ادائیں بھول جاتی۔ کنول کا چہرہ ایک فوری جذبہ سے سُرخ ہو گیا۔ اور وہ عرق عرق ہو گئی۔ شیام نرائن نے یہ دیکھکر کہا "کنول اگر میں نے یہ لکر تمکو تکلیف پہونچائی ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو۔ کنول نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کی زبان خشک ہو گئی۔ اس نے بے اختیار شیام نرائن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیام نرائن کنول کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا:" میں نے تمہارے پتاجی سے اس کے لئے کہا تھا۔ ان کو کوئی انکار نہیں۔ ہاں بشرطیکہ تم راضی ہو۔ شیام نرائن نے کنول کو زیادہ دیر تک اس ہیجان میں مبتلا رکھنا مناسب نہ سمجھکر اسکا ہاتھ پکڑا اور کہا "چلو واپس چلیں"۔

بنارس میں سالانہ اشنان کا میلہ ہونیوالا تھا۔ کنول اب بالکل تندرست ہو گئی تھی۔ شیام نرائن کے اطرار سے میلہ میں شریک ہونے کے لئے وہ دونوں بھی تیار ہو گئے، اور سب لوگ اسطرح بنارس آ گئے۔

باوجود شیام نرائن کے اصرار کے برج نرائن بابو دریا کے کنارے ایک مکان کرایہ پر لیکر میلہ کا انتظار کرنے لگے۔ طے یہ پایا کہ میلہ کے بعد کنول اور شیام نرائن کی شادی کر دیجائے۔

نول کشور کی بی بی جو صبح کو اُٹھیں تو اپنے سرہانے دو خط پڑے پائے۔ ایک تو بند تھا اور دوسرا کھلا ہوا تھا۔ اسپر یہ عبارت لکھی تھی:-

"پیاری بہن۔ یہ حد درجہ کی بداخلاقی ہے کہ آپ کی بے انتہا عنایات اور اخلاص کا شکریہ ادا کئے بغیر یوں یک بیک آپ سے جدا ہو جاؤں۔ لیکن قدرت کے کرشمے انوکھے ہیں۔ بس آپ یہ یقین کر لیں کہ میری مجبوری اسکی ذمہ دار ہے۔ جب وکیل صاحب کلکتہ سے آئیں تو دوسرا خط ان کو (صرف اُنھیں کو) دیدیجیگا۔" "کسوم"

نول کشور کی بی بی گھبرائی ہوئی کسوم کے کمرہ میں گئیں۔ سب چیزیں بدستور پائیں۔ کسوم البتہ نہیں تھی وکیل صاحب

کو بلا کر سب حال سُنایا۔ وکیل صاحب بیچارے پریشان ہو گئے دو پہر تک بیکار تلاش کرنیکے بعد راج کشور کو ذیل کا تار دیا:۔

"جس قدر جلد ممکن ہو بکسر آؤ"

کنول کا خط ملنے کے بعد جو کیفیت راج کشور کی ہوئی وہ عجیب تھی۔ معلوم نہیں وہ خیالات کے کن دشوار گذار مراحل کو طے کر رہا تھا کہ ہر وقت اس کا چہرہ تمتمایا رہتا، اور اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے، کنول کے لئے اس نے کس کس طرح اپنے ضمیر کا خون کیا تھا۔ حقیقت سے کسوم کو نا آشنا رکھنا یا انکشاف حقیقت کرکے دوبارہ اس سے جائز طور پر رشتہ نہ قائم کرنا اس کا جوابدہ وہ کنول کو تصور کرتا تھا۔ اس کے اسطرح کھو جانے سے راج کشور کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عنصر جس سے اس کے جذبات میں گرمی اور حرارت پیدا ہوتی تھی اس سے یکبارگی چھین لیا گیا ہے۔

ان خیالات کا سلسلہ جب ختم ہوتا تو اُس کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوتی۔ اور اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح کسوم کی ذات سے ہوتا۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ اس کی بے پرواہی نے کسوم کے دل کا بُری طرح خون کیا ہے اس کا ضمیر کسوم کی پاک زندگی کے تباہ کرنے پر اسکو بے انتہا نفرین کرتا۔ اس کو بعض وقت یہ بھی خیال ہوتا کہ اب اگر تمام یکسوئی کے ساتھ بھی کسوم کی دلدہی کیجائے جب بھی اس کی کلفتوں کی تلافی ممکن نہیں۔ بہرحال وہ قریب قریب طے کر چکا تھا کہ جو کچھ بھی ہو کسوم سے صرف کنول کا واقعہ محفوظ رکھتے ہوئے تمام حقیقت بیان کر دیجائے، اور پھر اگر کسوم راضی ہو جائے جسکی اُسے امید تھی تو وہ کنول کا خیال دل سے نکال کر کسی طرح یہ چند روزہ زندگی گذار دے۔ اب جو اسکو یہ تار ملا تو اس کے دل سے یہ آواز آنے لگی کہ ہو نہ ہو کسوم بھی اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی۔ وہ حد درجہ سراسیمہ بکسر پہنچا۔ بابو نول کشور نے جو کسوم کے یکبیک غائب ہو جانے کا حال اس سے بتلایا تو وہ سر دھڑ گیا۔ اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ دنیا کی تمام ہستیاں اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ احساس اُس کے لئے سوہانِ روح تھا کہ اس دنیا کی ایک انتہائی پاک اور معصوم ہستی کا خون اُس کی گردن پر ہے۔ مواخذہ کے خیال سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے شمار خوفناک اور کریہہ المنظر شکلیں دکھلائی دے رہی تھیں، جو ایک طنزیہ ہنسی سے اس کو اپنی طرف آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور کچھ دیر کے لئے اس کی ایسی کیفیت ہو گئی کہ نول کشور بابو سہم گئے۔ لوگوں نے سر پر برف رکھا شربت کے قطرے حلق سے اُتارے۔ بارے کچھ دیر کے بعد راج کشور کی طبیعت قدرے سنبھلی تو نول کشور نے کسوم کا خط جو راج کشور کے نام کا تھا لا کر دیا۔ راج کشور نے ایک سرد ہیجان کے ساتھ لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"راج کشور بابو۔

آپ نے جو خط میرے لئے لکھا تھا وہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آج میرے ہاتھ پڑ گیا۔ ایسی حالت میں مجھے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ممکن ہے کہ میں آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہوں۔ اس لئے اُن تمام کلفتوں کی جو میری وجہ سے آپکو خواہ مخواہ برداشت کرنا پڑیں۔ معافی چاہتی ہوں۔ چونکہ اپنے تاریک مستقبل سے قطعی نا آشنا ہوں میں نہیں

کہہ سکتی کہ کہاں جارہی ہوں ؟ آپ میری جستجو کی کوشش نہ کیجئے گا۔ "کسوم"

راج کشور پر متواتر کچھ اسطرح صدمے گذرے کہ وہ متوحش ہو کے رہگیا، وہ جسقدر اپنی حالت پر غور کرتا اُسکو اپنے آپ سے نفرت ہوتی جاتی۔ اس کے جانگداز احساسات عمیق تر ہوتے جاتے۔ اسکو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی روح ایک عمیق ترین غار میں جا پڑی ہے۔ جہاں سے وہ واپس نہیں آسکتی۔ رہ رہ کر اُس کے کلیجہ سے دھواں سا اُٹھتا، اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ اُسے بکسر میں حد درجہ کی وحشت ہونے لگی۔ گھبرا کر وہ کلکتہ واپس گیا۔ لیکن چونکہ سکون وہ کھو چکا تھا۔ اس لئے اس کی کلفتیں بڑہتی گیئں اور اس کی صحت بھی بُری طرح برباد ہونے لگی۔

شیام نرائن اور کنول کو بنارس آئے ہوئے دو ہفتے ہوگئے۔ کسوم کے متعلق ماتا جی نے ایک مجمل سا حال شیام نرائن کو بتلا دیا۔ جستجو کرنا شیام نرائن کی عادت کے خلاف تھا۔ اس لئے اُس نے اور کچھ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن باوجود ارادی غفلت کے شیام نرائن یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کسوم کی معصوم نگاہوں میں کسی بالاتر عالم کا راز پنہاں ہے۔

کنول بھی کسوم کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی لینے لگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسکو کسوم سے کوئی اخلاص تھا یا کیا، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ شیام نرائن کی غیر حاضری میں دیر تک کسوم کے ساتھ بیٹھی رہتی۔ کنول کلکتہ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی۔ لیکن سیدھی سادھی کسوم کے سامنے وہ اپنی تمام قابلیت بھول جاتی۔ کسوم کو وہ قدرت کی تکمیلات کا ایک بیش بہا نمونہ سمجھنے لگی تھی۔ اور اُس کو اس کا اعتراف تھا کہ کسوم کے پاک جذبات کا جواب دینے سے اس کا تمام علم قاصر تھا اُس کو کسوم کو دیکھ کر یہ حقیقت اُس پر واضح ہوگئی تھی کہ وسعت دماغی یا کمال تمدن نسائیت کا اصل مدعا نہیں۔ بلکہ عورت کی کبھی نہ فتح ہونے والی قوت جس کے ایک معمولی کرشمہ سے وہ دنیا کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے۔ ان تمام تحصیلات سے بالاتر ہے۔ کسوم کنول کی فطرت سے گھبراتی ضرور تھی، مگر اس کا خمیر محبت اور اخلاص سے تھا۔ کنول کے انہماک کو وہ ٹھکرا نہ سکی۔ اور ان دو متضاد ہستیوں میں ایک بہناپا قائم ہوگیا۔ کنول اکثر کسوم کا حال پوچھتی، مگر وہ یہ کہکر ٹالدیتی کہ "سُن کر کیا کرو گی ؟"

ایک روز کنول اس پر تُل گئی کہ جو کچھ بھی ہو وہ سُن کے رہیگی۔ کسوم نے حیلہ حوالہ کیا تو کنول نے رنجیدہ ہو کر کہا "بہن تمہارا کچھ قصور نہیں یہ میری فطرت کا قصور ہے کہ میں اعتبار کے قابل نہیں۔" یہ کہکر کنول کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کسوم سے کنول کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور بولی۔ "یہ تو میں تمکو چھیڑنے کے لئے کہتی تھی۔ کنول سنو۔ مگر تمہارا اکثر دل ملول ہو جائے گا۔" یہ کہکر کسوم نے آنکھیں زمین سے گڑالیں۔ اور اجمالاً اپنی بیتی۔ عہد طفولیت، شادی، طوفان۔ راج کشور سے سابقہ۔ پھر راج کشور کا حقیقت سے آشنا ہو کر اس سے کچھ دنوں کنارہ کش رہنا، لیکن اس کو

لاعلم رکھنا، پھر اس کا اسکول میں داخل ہونا۔ کلبسر آنا۔ وہاں اتفاقیہ راج کشور کی تحریر کے ملنے کے بعد کاشی آنا اور ماتا جی کا اس کو مرنے سے روک کر گھر لانا ——— سب بتلا دیا۔ یادِ ماضی نے کسوم کا غم تازہ کر دیا۔ اور کچھ دیر تک وہ سسک سسک کر زار و قطار روتی رہی۔ کنول بہت متاثر ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسوم کو تسلی تشفی دلائے۔ لیکن اس کے منھ سے ایک حرف نہ نکل سکا، اور وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اُٹھی اور خدا حافظ کہکر اپنے گھر چلدی۔

کنول نے کسوم کے بیان سے اتنا گہرا اثر لیا تھا کہ شام کو جب شیام نرائن کے ساتھ وہ ٹہلنے گئی تو بالکل خاموش تھی۔ شیام نرائن نے کہا "تم بہت مضمحل معلوم ہوتی ہو۔ گھر چلو تم کو کچھ دوا دوں؟ کنول کو دوا تو پینی تھی نہیں، لیکن جب شیام نرائن گھر چلنے کے لئے واپس ہوا تو وہ اُس کے ساتھ غیر ارادی طور پر ہو گئی۔ گھر پہنچکر کنول نے کہا "کہ میں اچھی ہوں، دوا کی ضرورت نہیں"۔

کنول نے کہا "یہاں گرمی ہے آؤ کوٹھے پر چلیں"۔ اپنی درد بھری داستان دوہرانے کے بعد کسوم کچھ ایسی مضمحل ہو گئی کہ وہ ماتا جی سے یہ کہکر کہ طبیعت بھاری ہے۔ کوٹھے پر برآمدہ میں ایک چارپائی ڈال کر پڑ رہی وہ اسیطرح ایک نیم غنودگی کی کیفیت میں پڑی تھی۔ کہ کنول اور شیام نرائن آئے اور کسوم سے بے خبر کمرہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد کنول نے پوچھا آپ نے شادی کے متعلق میری رضامندی دریافت فرماتے ہوئے یہ کہا تھا کہ آپ نے بعض اسباب کی بنا پر شادی کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کیا بات تھی؟ جس نے آپ کو میری صنف سے اس قدر مایوس کر دیا تھا"۔ شیام نرائن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا:۔

"کنول مایوس ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اب تم نے پوچھا ہے تو سُن لو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنیکے بعد میرا ارادہ ہوا کہ کلکتہ ہی میں کچھ دنوں کسی پرانے ڈاکٹر کے ساتھ مشق کروں۔ جب ڈاکٹر کے ساتھ میں نے اپنی مشق شروع کی اُنکے پاس میرے ہی ساتھ کے ایک اور ڈاکٹر شیو کمار مشق کے لئے آیا کرتے تھے۔ انکا مکان پٹنہ کے قریب ایک موضع کرن پور میں تھا"۔ "کرن پور" کنول چونکی۔ صبح کو وہ کسوم سے سُن چکی تھی کہ اس کا وطن کرن پور تھا۔ شیام نرائن نے کہا "ہاں کرن پور میں تھا۔ ایک مرتبہ شیو کمار بہت اصرار سے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ازدواج کے مسئلہ پر مجھسے اور شیو کمار سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ اس کے لئے شادی کے پیغامات آتے تھے، لیکن اُس نے کسی کا صاف جواب دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ شادی ایسی جگہ کرے۔ جہاں سے معقول رقم ہاتھ لگے۔ میں ہمیشہ اُس کے اس خیال سے جھگڑتا رہا۔ چنانچہ کرن پور جانے پر چونکہ بیکاری تھی۔ اس مسئلہ پر اکثر گفتگو رہا کرتی۔ میں یہ کہا کرتا تھا کہ شادی سوسائٹی کا ایک اصول ہے، اور ہر اصول سلئے وضع ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہو۔ اور اس طرح ازدواج کا نصب العین سوسائٹی کے بگڑتے ہوئے افراد کی زندگی کو سنبھالنا ہے۔ ایک ہونہار اور لائق جوان ہونے کی حیثیت سے تمہارا یہ فرض ہے کہ تم اپنی شریک زندگی کے لئے

اُس فرد کو انتخاب کرو جس کی حالت اسکی محتاج ہو کہ تمہاری مدد سے اس کی زندگی ٹھکانے لگ جائے۔ اس طرح تم سوسائٹی کے ایک فرد کو ظاہری بربادی اور باطنی ہلاکت سے بچا کر ازدواج کا مقصد پورا کرو گے۔ اگر تم نے برخلاف اسکے اپنے لئے ایک ایسا انتخاب کیا جس سے تم کو ہر قسم کے دنیاوی فائدے کی امید ہے تو تم اُس فرد کی حق تلفی کرو گے جسکی حالت تمہاری امداد کی محتاج تھی۔ اور اس طرح تم سوسائٹی کے دو افراد کی زندگی برباد کرنیکے ذمہ دار ہو گے۔ شیو کمار اگر ازدواج میں یہ مقصد جو میں کہہ رہا ہوں نہ پنہاں ہوتا تو میں اس کو ہرگز ایک پاک رشتہ نہ تصور کرتا بلکہ یا تو اسے ایک جذبۂ شہوانی کہتا۔ یا خود غرضی اور دنائت۔"

ایک روز دوران گفتگو میں شیو کمار نے کہا کہ آپ بڑے ریفارمر بنتے ہیں۔ دوسرے کی زندگی درست کرنیکا بڑا خیال ہے۔ پڑوس میں ایک نہایت شریف خاندان کی لڑکی پنڈت جی کے یہاں رہتی ہے۔ اُس کے والدین بچپن ہی میں مرچکے ہیں۔ اس کے بعد وہ پنڈت جی کے یہاں رہتی ہے۔ لڑکی بیچاری میں نے سنا نہایت خوبصورت اور نیک ہے۔ لیکن پنڈتائن اور اُن کی لڑکیوں نے اس کی جان مصیبت میں کر رکھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اکثر کہتی ہے کہ میں اپنی جان دیدوں گی۔ لوگ اُس کی پیاری پیاری صورت اور سیدھے پن پر بہت ترس کھاتے ہیں۔ لیکن کوئی اُسکی مدد کو نہیں پہنچتا۔

آپ اگر سوسائٹی کے ایک فرد کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں، تو اس سے شادی کر لیجئے۔ پھر میں سمجھوں کہ جو تم کہتے ہو اس میں کچھ خلوص بھی ہے۔

میں نے کہا: "شیو کمار میں جو کچھ کہتا ہوں اُس کو اپنے دل کے ہر ہر گوشہ میں صداقت اور اخلاص کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ اگر واقعی میری وجہ سے ایک غریب لڑکی کی زندگی ٹھکانے لگ جائے تو میں سمجھونگا کہ مقصد حیات پورا ہو گیا۔" مختصر یہ کہ شیو کمار کے ذریعہ سے بات طے ہو گئی اور اُسی ہفتہ کے اندر سیدھے سادھے طریقہ سے میری اس لڑکی کے ساتھ شادی ہو گئی۔ شادی کے دوسرے ہی روز باوجود شیو کمار کے اصرار کے میں معہ اپنی بیوی کے کلکتہ آنے کے لئے تیار ہو گیا۔ پنڈت جی نے بھی مان لیا۔ راستہ میں کچھ دور کے لئے کشتی کا سفر تھا۔ ہم لوگ جب کشتی سے جا رہے تھے۔ ایک نہایت سخت طوفان اُٹھا اور ملاحوں کی باوجود سخت احتیاط کے کشتی اُلٹ گئی۔

مجھے جو ہوش آیا تو میں پانی کے کنارے پڑا تھا۔ لیکن کسی اور کا پتہ نہ تھا۔ میں نے بہت سر مارا۔ لیکن اُس لڑکی کا جسکی میں نے صورت تک نہیں دیکھی تھی نشان تک نہ ملا۔ تھک کر کلکتہ چلا آیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ حتی الامکان اب شادی نہیں کروں گا۔ میرے دل پر بہت دنوں ایک بوجھ سا رہا۔ مگر تمہاری ملاقات میری زندگی ایک نئے ولولے سے معمور ہو گئی اور بالآخر مجھے اپنے ارادہ سے واپس ہونا پڑا۔" شیام نرائن نے کنول کی صورت دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا وہ زار وقطار رو رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "خیر تو ہے تم اسقدر پریشان کیوں ہو گئیں۔" کنول نے اس خیال سے

کہ شیام نرائن کو کوئی شبہ نہ ہو جائے کہکر ٹالدیا۔ کہ طبیعت آج مضمحل تھی ہی۔ تمہارے افسانہ نے بڑا اثر کیا" حقیقت یہ تھی کہ کنول یہ معلوم کرکے سراسیمہ ہو گئی کہ شیام نرائن کی کھوئی ہوئی بیوی جسے وہ مردہ تصور کر چکا ہے کسوم ہے۔ اور کسوم جو پڑی ہوئی شیام نرائن کی باتیں سُن رہی تھی یہ معلوم کرکے ایک سکتہ میں آگئی کہ اس کا اصل شوہر شیام نرائن ہے۔

نیرنگ کدۂ ہستی کا یہ دوسرا کھیل تھا اور کسوم میں اتنا دم باقی نہ رہگیا تھا کہ وہ اس کے کھیلنے کی تاب لاتی۔ اِس زہر آلود بھول بھلیاں سے وہ گھبرا اُٹھی تھی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اس کشمکش سے آزاد ہونے کے لئے اسکی روح سخت بیتاب ہے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ زمانہ نے اس کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ شیام نرائن کی ہمدم بننے کی وہ جرات کرتی۔ اس کو اس کا قلق تھا کہ اس نے اپنے واقعات کیوں کنول کے گوشگزار کر دئے۔ وہ ایک غیر معلوم حالت میں جان دینا چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ اگر کنول سے اس نے یہ حال نہ کہا ہوتا تو ماتا جی کی زندگی تک کم از کم وہ وہاں سے علیحدہ ہونے کی کوشش نہ کرتی۔ اور یہ سوچکر کلیجہ پر صبر کی سل رکھ لیتی۔ کہ گرچہ اُس کا شوہر اُس کی دسترس سے باہر ہے لیکن قسمت نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے لیکن اب صورت حال دگرگوں تھی۔ وہ کنول کی فطرت سے واقف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کنول اس سے کنول ہو کر نہ ملے گی۔ بلکہ شیام نرائن کی بی بی اور اُس کی رقیب ہو کر اور پھر معلوم نہیں وہ کیا کرے؟ اور اس کا اثر کسوم کی زندگی پر کیا ہو؟ اس جانسوز کشمکش میں کسوم نے تارے گن گن کر رات گذار دی۔ صبح ہوئی تو اسکے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔

کنول کی حالت نازک تھی۔ وہ شیام نرائن سے بخوشی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ کسوم کے ہوتے ہوئے اُسے شیام نرائن پر کوئی حق حاصل نہیں ہے لرز جاتی۔

تین روز ہو گئے اور کنول شیام نرائن کے مکان پر نہ آئی۔ شیام نرائن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ تیسرے روز وہ کنول کے پاس خود گیا۔ کنول کے برتاؤ میں کوئی خاص فرق نہ تھا ہاں وہ ایک حد تک مضمحل ضرور تھی۔ دو لوگ ٹہلنے گئے۔ تو شیام نرائن نے جو ایک خاص بات محسوس کی وہ کنول کی نگاہوں کا سنجیدہ استفسار تھا۔

صبح سے کاشی کا سالانہ اشنان شروع ہونیوالا تھا۔ ماتا جی بہت خوش تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد شیام نرائن دولھا بننے والا تھا۔ وہ نہایت سرگرمی سے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ کسوم بھی کلیجہ پر پتھر رکھکر ان کے ساتھ کاموں میں مشغول تھی۔ اس کا مستقبل صرف خوفناک طور پر تاریک ہی نہیں بلکہ حد درجہ متوحش کن تھا۔ برداشت کی تمام طاقتیں اس کی سلب ہو چکی تھیں۔ اسکی وہی کیفیت تھی۔ جیسے کوئی انتہائے رنج میں بالکل بے حس ہو جائے۔ فطری طور پر ایسی حالت میں اس کا طرز عمل قطعی غیر ارادی تھا۔ ماتا جی کسوم کی اس کیفیت سے متاثر ضرور تھیں لیکن ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

ماتا جی نے کسوم اور شیام نرائن سے کہدیا تھا کہ سویرے سو رہیں۔ کیونکہ اشنان کے لئے رات رہے

اُٹھنا پڑے گا۔ کسوم پلنگ پر پڑی اپنی مصیبت کی گھڑیاں گن رہی تھی کہ ماتا جی نے اس سے پکار کر کہا کہ گھاٹ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

گاڑی میں اتفاق سے ایک طرف ماتا جی اور خادمہ بیٹھ گئی۔ دوسری طرف شیام نرائن اور مجبوراً کسوم کو ساتھ بیٹھنا پڑا۔ اسوقت کسوم کا اضطرار اُس کے لئے ہلاک کُن ثابت ہو رہا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ گاڑی کسی چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور وہ اس مجبوری سے نجات پائے۔ گاڑی چلتے چلتے ہچکولے لیتی اور شیام نرائن کا بدن کسوم سے مس ہوتا جس سے کسوم کے تمام بدن میں ایک جانسوز سنسنی پیدا ہونے لگتی۔ گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔ شیام نرائن ایک بار اُٹھا تا کہ سر نکال کر دیکھے کہ گھاٹ کتنی دور رہ گیا ہے۔ اُٹھتے وقت اتفاق سے اس نے اپنا ہاتھ کسوم کے شانوں پر رکھدیا۔ کسوم کے حسیات کی ہلچل آخری درجہ تک پہونچ گئی۔

گاڑی گھاٹ پر پہنچ گئی۔ برج نرائن اور کنول پہلے سے منتظر تھے۔ کسوم کنول سے آنکھ چار کرتے ہی اس طرح زرد پڑ گئی کہ اسکو چھپانے کے لئے تمام طاقت صرف کرنی پڑی۔ کنول بھی کسوم کو دیکھکر بے اختیار جھجک سی گئی۔

گھاٹ پر بہت ہجوم تھا۔ ملک کے ہر حصہ سے لوگ اس مقدس دریا کے کنارے اور خاص کر اس موقعہ پر جب اسکی برکت دونی ہو جاتی ہے اپنے گناہ دھونے آتے ہیں۔ آفتاب نکلنے سے پہلے یہ لوگ اشنان سے فارغ ہو کر گھر واپس ہو گئے اشنان کے بعد باوجود انکار کے کسوم کو وہی ساری پہننی پڑی جو ماتا جی نے اُس کے لئے اُسی روز کے واسطے تیار کی تھی۔ کسوم مضمحل ضرور تھی۔ لیکن اس کے اس اضمحلال میں بھی ایک غیر معلوم لطافت ایک غیر محسوس کیف تھا۔ اس کا ارغوانی رنگ ایک حد تک زعفران کی رنگت لئے ہوئے تھا۔ اس کی عنابی ساری کا عکس اس کے چہرے کی سپیدی سے مل مل کر خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اس کی پلکیں قدرتی طور پر بہت لانبی تھیں۔ لیکن آج انتہائے رنج سے وہ ان کو اس طرح جھکائے تھی۔ کہ بات کرتے وقت بھی اس کی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتیں۔

اشنان سے واپسی میں کئی مرتبہ شیام نرائن کی آنکھیں کسوم سے چار ہو گئیں۔ کسوم تو عرق عرق ہو جاتی۔ لیکن شیام نرائن ہکا بکا ہو کر رہجاتا۔

گھاٹ سے واپس ہوتے ہی ماتا جی کو خفیف سی حرارت ہو گئی اور شام تک ان کو کافی تیز بخار ہو گیا۔ صبح تک بخار اسقدر بڑھ گیا کہ شیام نرائن گھبرا گیا۔ اور یہ معلوم کر کے بہت پریشان ہوا کہ انکو مہلک قسم کا بخار آ گیا ہے۔

ماتا جی کی حالت نازک ہوتی گئی۔ کسوم کا کلیجہ اس درد سے پھٹا جا رہا تھا کہ زندگی بھر میں اس کو ایک ہمدرد ملا تھا۔ اُسے بھی قدرت اُس سے چھینا چاہتی ہے۔ وہ انتہائے خلوص انہاک سے ماتا جی کی تیمارداری میں مشغول تھی۔ رات رات بھر پلنگ سے سر لگائے یہ دیکھتی رہتی کہ خدانخواستہ ماتا جی کا دم تو نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ لیکن اسکے

باوجود اسکے گھر کا کام جو تمام اُسکی ذمہ داری پر تھا اس قرینہ اور جانفشانی سے کرتی رہی کہ ماتاجی کی علالت سے گھر کے کام کاج میں رتی بھر کا فرق نہ آیا۔ دن رات میں شاید وہ کسی وقت آرام نہ کرتی تھی۔ کسوم واقعہ یہ ہے کہ ایک ہندوستانی بیوی کی صحیح مثال پیش کر رہی تھی۔ شیام نرائن سے نہ رہا گیا وہ ایک دن اُس نے کہا: "کسوم تم کسی وقت آرام نہیں کرتیں اگر خدا نخواستہ تمھاری بھی طبیعت ناساز ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟" کسوم خاموش رہی۔ کنول کسوم کی جانفشانیوں کی داد دل سے دے رہی تھی۔ اسکو یہ معلوم ہو گیا کہ صرف تعلیم و معاشری تہذیب انسان کا کمال نہیں۔ بلکہ وہ چیز جو انسان کو تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا دردِ دل اور بے غرضی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کسوم سے بہت پیچھے پاتی وہ کسوم کو ایک معصوم اور رودبھر فرشتہ خیال کرنے لگی اور اس کی حق تلفی کے خیال سے اس کو جانکنی سی ہونے لگی۔

ایک شام کنول ماتاجی کو دیکھنے آئی۔ ماتاجی پر ایک نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ کسوم پلنگ کے پاس بیٹھی تھی۔ کنول کو آتا دیکھکر نہایت خندہ پیشانی سے بلاکر اپنے قریب بٹھلایا۔ کسوم واقعی ماتاجی کی بیماری میں اسقدر منہمک تھی کہ وہ اپنی رسوائیاں ایک حد تک بھول گئی تھی۔ لیکن کنول کو دیکھکر وہ پھر تازہ ہو جاتیں۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ کنول کی جانب سے رقابت کا خیال اس کے دل میں بغض کا خیال پیدا کرتا ہو۔ وہ ان منزلوں سے اپنے خیال میں گذر چکی تھی۔ اس نے کنول کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا: "کنول اب تم نے یہاں آنا کیوں اسقدر کم کر دیا۔ اسوقت جب ماتاجی کی حالت نازک ہے سخت نگہبانی کی ضرورت ہے۔ اور میں اپنی جہالت سے بجائے کام بنانے کے بگاڑ دیتی ہوں۔ کیا رسوم کی پابندی میں تم ابھی اس گھر سے اجنبیت قائم رکھنا چاہتی ہو۔"

وہ کسوم کی اس قربانی پر جسے وہ ہنس ہنس کر کر رہی تھی تصویرِ حیرت ہو کر رہ گئی۔ کسوم کے منھ سے وہ اسپنسر اور گوئٹے کا فلسفہ سُن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کے فطری جذبات کسقدر پاکیزہ ہیں۔ کسوم کی یہ خوبیاں کنول کی زندگی کے نئے اوراق اُلٹ رہی تھیں۔ اور اُسے یقین ہو گیا کہ کسوم کے جائز حق پر قابو پا کر وہ کبھی خوشی کا ایک سانس نہیں لے سکتی۔ اور جب کسوم نے پھر چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ کاش ماتاجی اُسوقت بیمار پڑتیں جب تم اس گھر میں مستقل طور پر آجاتیں۔ تو کنول اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی جوش سے سُرخ ہو رہا تھا "کسوم! میں غاصب ہو کر اس گھر میں نہیں رہوں گی تمکو خدا تمہارا گھر مبارک کرے۔ تمکو معلوم ہے کہ تم شیام نرائن کی کھوئی ہوئی بیوی کسوم ہو۔" یہ تھے وہ الفاظ جو کنول کانپتی ہوئی آواز سے ادا کر کے کسوم کو ایک ساکت بت کی طرح چھوڑ کر چلی گئی۔

شیام نرائن کے مکان سے نکلکر کنول نے سواری کا انتظار نہ کیا اور پیدل ساحل کی سڑک سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ اُس نے ایک بوجھ اپنے ضمیر سے اُتار دیا۔ یکایک اُس کے قریب ایک گاڑی آکر رُکی۔ اُس نے جو سر اُٹھا کر دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ راج کشور اس گاڑی پر تنہا بیٹھا تھا۔ اُس نے بلاکسی تصنع کے کنول سے کہا: "اگر کوئی حرج نہ ہو تو گاڑی پر آجائیے۔ میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔" کنول ایسی کھوئی تھی کہ وہ بغیر کسی ارادے

کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور کچھ دیر تک اس کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ کہاں؟ اور کس ماحول میں ہے؟ آخر راج کشور بولا:۔
"کنول تم اسقدر مجھ سے اجنبی کیوں ہو گئیں۔ اگر تم کو میرے قصور کا علم ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں کسقدر مجبور اور بے بس تھا۔ خیر اگذری ہوئی باتوں کو جانے دو۔ میں نے تم کو کسوم اور ڈاکٹر شیام نرائن صاحب کے ساتھ گھاٹ پر اشنان کے پہلے روز دیکھا تھا۔ میں نے اپنی موجودگی کا علم تم کو اس لئے نہیں ہونے دیا کہ میں تمہارے پُر سرور لمحات کو تلخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ تاریخ تو مقرر ہو چکی تھی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی" کنول اب اپنے ہوش میں آ گئی تھی۔ وہ راج کشور کی اس بے تعلقی اور استقلال پر متعجب تھی۔ جس بات سے اُسکے دل کو ایک حرکت ہوئی وہ یہ تھی کہ راج کشور زرد اور نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی حالت دیکھکر کسوم نے آسانی سے سمجھ لیا کہ اس کو دق ہو گئی ہے۔ وہ اپنی تمام طاقتوں کو جمع کر کے بولی:۔ "ڈاکٹر صاحب سے اس لئے شادی نہیں ہو سکتی کہ ان کی بیوی موجود ہے۔ گرچہ ابھی اس کا علم ان کو نہیں۔ لیکن میں اس حق تلفی کو گوارا نہیں کرونگی"۔

راج کشور کچھ دیر کے لئے ساکت ہو گیا۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرہ کنول کے ہاتھ پر گرے، وہ چونک پڑی اور حسرت سے راج کشور کی صورت دیکھنے لگی۔ راج کشور نے کہا "اور ڈاکٹر کی اصلی بیوی کسوم ہے"؟ کنول نے سر ہلایا۔ اتنے میں راج کشور کا مکان آ گیا وہ اُتر پڑا اور گاڑی والے سے یہ ہدایت کر کے کہ کنول کو اُس کے مکان پہنچا دے۔ کنول سے خدا حافظ کہتا ہوا چھڑی کا سہارا لیتا ہوا مکان کے اندر چلا گیا۔

اس واقعہ کو دو ہفتہ گذر گئے ہیں۔ ماتاجی اچھی ہو گئی ہیں۔ ضعف باقی رہ گیا ہے۔ ان کو کسوم سے پہلے جو انس تھا وہ ایک مستقل محبت مادرانہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور جس خلوص سے اب بھی کسوم اُن کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی اُس پر بعض وقت ماتاجی کو شرم آنے لگتی۔

شیام نرائن کو کنول کی ان دنوں کی بے تعلقی بہت گراں گذر رہی تھی۔ وہ دو ہفتہ سے ماتاجی کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ شام کے وقت شیام نرائن کمرہ میں بیٹھا اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کہ ایک ایسی لڑکی جو دوروں سے اس قدر بیگانہ ہو کیونکر اُس کو خوش رکھ سکتی ہے۔ یکایک دروازہ کھلا اور کنول خاموش آکر بیٹھ گئی۔ شیام نرائن نے رسمی مزاج پرسی کی۔ کنول نے کہا زندہ ہوں۔ اور پھر نہایت سنجیدگی سے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کیا:۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کو میری ان دنوں کی کج خلقی بہت ناگوار گذر رہی ہوگی۔ لیکن واقعات کی بنا پر مجبور تھی۔ بات یہ ہے کہ آپ کی جائز بیوی کی موجودگی میں جس کا آپ کو علم نہیں مجھے آپ سے کسی ایسے قسم کی امید وابستہ کرنا میری ایک دنائت ہوتی۔ اور اُس نے کسوم کی پوری سرگذشت شروع سے اخیر تک حرف بحرف سُنادی۔ اس سلسلہ میں اُس نے نہایت صفائی سے اپنا اور راج کشور کا تعلق بھی بیان کر دیا۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اپنی کج خلقی سے جو واقعی فطرت سے مجھ میں ودلیعت ہوئی ہے آپ میں اپنی طرف سے اسلئے بر ہمی پیدا کر رہی تھی کہ آپ اس واقعہ کے سننے کے لئے تیار ہو جائیں۔ آپ کی چونکہ میں دل سے عزت

کرتی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو میرے چھٹنے کا زیادہ غم ہو اور اپنی قابل پرستش فرشتہ خصلت بیوی کے واپس ملنے کی آپ کو خوشی نہ ہو۔ میں نے کسوم کو بھی حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔"

شیام نرائن انتہائی سنجیدگی سے شروع سے لیکر آخر تک بیٹھا رہا۔ اپنے اوپر اُس نے اسقدر قابو رکھا کہ کنول کو دیکھکر تعجب ہوا۔ کنول کے چلے جانیکے بعد شیام نرائن نے اپنا سر میز پر ڈالدیا اور دو گھنٹہ اسی طرح معلوم نہیں کن استغراق میں پڑا رہا۔ وہ اُٹھا تو اُس کا تمام جسم اسطرح پسینہ سے بھیگا تھا۔ جیسے کسی نے گھڑوں پانی ڈالدیا ہو۔ وہ نہا کر سیدھا اندر گیا۔ اور کھانا نیکے لئے کمرہ میں چلا گیا۔ اتفاق سے کام کرنیوالی اُس روز سویرے چلی گئی تھی۔ ناچار کھانا کسوم ہی کو لانا پڑا۔ کھانا لیکر وہ شیام نرائن کے سامنے آئی۔ لیکن اس طرح کہ مجسم ارتعاش تھی۔

شیام نرائن نے اُسکی اس کیفیت کو دیکھا اور جب وہ کھانا رکھکر واپس ہو رہی تھی تو شیام نرائن اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا:"کسوم مجھ سے کیسی شرم؟" کسوم پر جیسی بجلی گر گئی ہو۔ وہ سمجھ گئی کہ کنول نے تمام حال شیام نرائن سے کہدیا۔ اور کانپ کر فرش پر گر گئی۔

کسوم کو جب ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا سر شیام نرائن کی آغوش میں ہے۔ کسوم نے یہ کہکر اُٹھنے کی کوشش کی کہ "مجھے چھوڑ دو میرا ماضی بہت سیاہ ہے۔" لیکن اُسے اُٹھنے نہیں دیا گیا۔ "تاریک ماضی کو بھول جاؤ۔ تم بالکل بے قصور ہو۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تم مجسمہ ہو معصومیت کی۔" کسوم نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی اور کہنا چاہا لیکن نہ تو وہ اُٹھ پائی اور نہ کچھ کہہ پائی۔ اُسکے منہ پر شیام نرائن نے مہر لگادی اور کسوم عرق عرق ہو گئی۔

راج کشور کی حالت کلکتہ میں روز بروز خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کسی دریا کے قریب کچھ دنوں کے لئے چلے جاؤ۔ راج کشور نے بنارس کو منتخب کیا۔ وہ اپنے ضمیر کی شب و روز کی نفرین سے عاجز ہو کر مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اوس نے سمجھا کہ شاید اس مقدس مقام کی برکت سے اس کا جی ہلکا ہو جائے گا۔ اور موت جس کو وہ سمجھ رہا تھا کہ دور نہیں ہے ایسے وقت آئے گی۔ جب اُس کی اندرونی کلفتیں محو ہو چکی ہوں گی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ معصوم اور شریف کسوم کے دل دکھانے سے یہ سب آفتیں اس پر آئی ہیں۔ اب وہ کسوم کے خیال کی دل سے عزت کرتا۔ اس کا وہ اسطرح احترام کرتا جیسے کسی دیوی کا۔ جہانتک ممکن ہو وہ کسوم کے خیال کو دل میں نہ آنے دیتا۔ ہاں اتنی تمنا ضرور تھی کہ اگر کسوم مل جائے تو اُس کے قدم چوم کر اُس سے معافی کی آرزو کرے۔ لیکن کنول کا خیال۔ اس کو وہ اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ روز بروز اور مستحکم ہوتا گیا۔ لیکن اب اس سوز و گداز کو وہ مادیات کی تنگ اور کثیف حدود سے بالاتر لیجانا چاہتا تھا۔ اس حدتک کہ کنول کے خیال کو کنول کی شخصیت سے کوئی تعلق نہ رہے۔ اور اسکی پرستش وہ اس پاک مندر میں کرے جہاں کائنات کی کسی شے اور کسی دوسرے خیال کا گذر نہ ہو۔

اُس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کنول اسکو اب کس حیثیت میں ملیگی۔ لیکن اب اس کو اس سے ملنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کنول کی وہ پرستش صرف اسلئے کرتا تھا کہ وہ کنول تھی۔

وہ صدرجہ لاغر ہو گیا تھا۔ اسے تپ بھی رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے اسکے خیال کے مطابق اسکو دق بتلادیا۔ اور یہ کہا کہ کسی اندرونی صدمہ کیوجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حقیقت کو خوش رکھنے کی کوشش بہت ضروری ہے۔ لیکن راج کشور کا یہ ایمان تھا کہ کوئی طاقت اسکو کنول کے خیال سے جدا نہیں کر سکتی۔ بنارس آکر اُس نے شیام نرائن کا علاج یونہی لوگوں کے کہنے سے شروع کر دیا۔ وہاں کنول کے متعلق اسکو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لیکن وہ ہمیشہ محتاط رہا کہ اسکا قدم نہ پھسلے۔ اور اس خیال سے کہ شاید کنول سے ملاقات ہو جائے اور پھر معلوم نہیں کیا ہو۔ اُس نے ڈاکٹر شیام نرائن کے مطب میں آنا چھوڑ دیا جب ضرورت ہوتی تو خود انکو اپنے یہاں بلا لیتا۔ اُس نے اشنان کے روز کنول کو دیکھا۔ لیکن کسوم کو دیکھکر کنول کے دیکھنے کی تمام مسرتیں پامال ہو گئیں۔ اپنی تمام روحانیت کو وہ سیاہ تصور کرنے لگا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ ایک معصوم زندگی کے برباد کرنیکا وہ ذمہ دار ہے۔ اور یہ ایسا داغ ہے جو مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ اس کے بعد سے اسکی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اتفاق سے جو کنول سے ملاقات ہو گئی تو گرچہ اُسکے سامنے اُس نے بلا کا استقلال دکھلایا۔ لیکن اس کے بعد اسکے باقی ماندہ خون کے قطرے بھی نہایت تیزی سے جل کر سوکھنے لگے۔ اس خیال سے ایک قسم کا اطمینان ہو گیا تھا کہ کنول کا دامن ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ دیا جانیوالا ہے۔ جس کے بعد وہ اُس سے قریب تر ہونے کی کوشش کرے گا بھی تو بیکار۔ لیکن اب جو اُس نے سنا کہ صورت حال یوں ہے تو اُسکی بے تابیاں پھر بڑھ گئیں۔ ہاں اس خیال سے اُسے ضرور سکون ہوتا تھا کہ کسوم کی زندگی اب شاید ٹھکانے لگ جائے۔

دوسرے روز شام کو شیام نرائن جو راج کشور کو دیکھنے آیا تو اُس کے انداز میں کچھ ایسا تغیر تھا کہ راج کشور سمجھ گیا کہ کنول نے تمام واقعات اس سے کہدئے ہیں۔ شیام نرائن جب واپس جانے لگا تو راج کشور نے اپنے قریب بٹھلاکر اُس سے کہا:" ڈاکٹر صاحب یہ تو جناب کو معلوم ہے کہ میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کسی وقت اپنے ساتھ کسوم کو لیتے آویں۔ شیام نرائن کچھ دیر خاموش رہا اور پھر یہ کہکر چلا گیا کہ آپ اطمینان رکھئے میں کل اپنے ساتھ کسوم کو ضرور لیتا آؤں گا۔

دوسرے روز شیام نرائن کسوم کو لیکر راج کشور کے مکان گیا۔ کسوم سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ راستہ میں اُس نے پوچھا تو کہدیا کہ تم کو ایک ایسی جگہ لے چل رہا ہوں جہاں تم کو تعجب اور خوشی دونوں ہوگی۔ راج کشور پلنگ پر پڑا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیام نرائن کسوم کو اپنے بازو میں لئے کمرہ میں داخل ہوا اور کسوم کو راج کشور نے سامنے چھوڑ کر خود آہستہ سے باہر چلا گیا۔ کسوم نے جو سامنے راج کشور کو دیکھا تو یہ محسوس کیا کہ اُس کا تمام جسم پتھر کا ہوا

جا رہا ہے۔ راج کشور بہت نحیف ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اسکو تیز تپ چڑھی ہوئی تھی۔ تمام قوت یکجا کرکے وہ اُٹھا اور کسوم کے سامنے دو زانو ہو کر سر اُس کے پاؤں پر ڈال دیا۔ کسوم نے اب محسوس کیا کہ وہ ہنوز پتھر کی نہیں ہوئی۔ راج کشور کی ہچکی بندھی تھی آواز پر قابو پا کر بولا:۔ "کسوم! کیا تم مجھے کبھی نہیں معاف کر سکتیں۔ دیکھو اپنے کئے کی سزا بہت اچھی طرح پا رہا ہوں۔ میرا وقت آ چکا ہے۔ میں چند دنوں یا چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ کسوم! کیا تمہارا معصوم دل یہ گوارا کرے گا کہ میں اسی طرح پھنکتا سسکتا جان دوں۔ کیا مجھے معاف کرکے تم اس سکون کو جسے میں کھو چکا ہوں واپس نہ بخشو گی۔ کسوم میں موت کا بہت خوشی سے خیر مقدم کرونگا۔ اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ تمہارے دل کو خون کرنے کا مواخذہ مجھ سے نہ ہوگا۔ للہ کسوم بولو۔"

کسوم کا دل درد آشنا تھا۔ وہ بے التفاتی جانتی ہی نہ تھی۔ راج کشور کی یہ بے بسی اور اُس کی قابل رحم حالت دیکھ کر بلبلا کر رونے لگی۔ اور بولی:۔

"راج کشور بابو آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ قطعی بے خطا ہیں۔ اگر آپ کی کوئی غلطی تھی بھی تو اسکا اب کوئی ذکر نہیں کیونکہ خدا نے وہ دن گذار دئے۔ آپ اس قدر مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کی تشفی اتنے سے نہیں ہوتی تو میں اپنے پیدا کرنیوالے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ سے کوئی غلطی ہوئی بھی تو میں نہایت صاف دل سے معاف کرتی ہوں۔ اور وہ بھی معاف کرے۔"

راج کشور کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ "کسوم! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی" یہ کہکر اُس نے پہلے کسوم کے پاؤں پھر ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ اور شیام نرائن کو اندر آنیکی آواز دی۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کو کسوم جیسی بیوی پر فخر کرنا چاہئیے۔ یہ زمانہ کی بہت ستائی ہیں۔ آپ انکی قدر خود پہچان گئے ہوں گے۔ اس لحاظ سے آپ ان کی جتنی بھی دلداری کیجئے کم ہے۔" راج کشور اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ دروازہ کھلا اور کنول اور برج نرائن بابو داخل ہوئے۔ برج نرائن بابو اندر آتے ہی بول اُٹھے "کیوں راج کشور تم اتنے دنوں سے بنارس میں ہو لیکن تم نے ہملوگوں کو بیخبر رکھا۔"

راج کشور نے پہلے ان کا مزاج پوچھا اور کہا "کہ غلطی تو ضرور ہوئی لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ میں ان منزلوں سے گذر چکا ہوں۔ جہاں کسی قسم کی تیمار داری مفید ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں کو پریشان کرنا فضول تھا۔" "نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو" برج نرائن بابو نے کرسی قریب کرتے ہوئے کہا اور شام تک راج کشور کو سب لوگ تسلی تشفی دیتے رہے۔ راج کشور بالکل خاموش بیٹھا اُن لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ مغرب کے بعد سب لوگ واپس گئے۔

راج کشور کی حالت رات کے پچھلے پہر سے بہت بگڑنے لگی۔ صبح ہوتے ہوتے اُس کے نوکر نے کنول کے مکان پر پہونچکر آواز دی۔ کنول سو رہی تھی۔ دروازہ کھولا۔ آدمی نے کہا کہ راج کشور صاحب کا آخری وقت ہے۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کنول بالکل اسی حالت میں اس کے ساتھ ہو گئی۔ پہونچی تو واقعی راج کشور دم توڑ رہا تھا۔ کنول کو دیکھتے ہی ایک برقی طاقت نے

آخری مرتبہ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔ بولا:" پیاری..... کنول...... تم آگئیں"۔ کنول کی ہچکی بندھ گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ راج کشور آخری سانس لیتا۔ آپس میں کچھ آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ کنول پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور راج کشور کی جان اس حالت میں نکلی کہ کنول کا سر اُس کے سینہ پر تھا۔

عجیب حسرتناک موت تھی۔ دوپہر تک لاش گھاٹ پر لائی گئی۔ کسوم شیام نرائن و برج نرائن بھی ساتھ تھے مذہبی رسمیں ادا ہوئیں۔ اب آخری منزل یعنی لاش کو جلانا باقی رہ گیا۔ اور اس سوال پر کہ آگ پہلے کون دے۔ کنول آگے بڑھی اس طرح کہ اُسکے لمبے لمبے بال کھلے تھے۔ خوبصورت پاؤں میں برہنہ تھے پیاری پیاری آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو نہایت فراوانی سے بہہ بہہ کر اُس کے خشک رخساروں کو دھو رہے تھے۔ شیام نرائن نے کہا:" کسوم تم کو بھی آگ دینا چاہیئے" کسوم بھی آہستہ سے آگے آئی۔ اور ان دونوں لڑکیوں نے ایک ساتھ آگ دی۔ اس طرح کہ کسوم اضمحلال مجسم تھی اور کنول یکسر پیکر اضطراب۔

(ماخوذ از ٹیگور)

عبد السّلام فاروقی بی۔ اے

خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

بسلسلۂ ماسبق

اب وجوہ تشیع کے جوابات سنیئے۔

۱۔ آزاد کی پہلی روایت کا حال یہ ہے کہ (الف) آتش کے ایک ہی لڑکا تھا۔ خواجہ محمد علی جوش نامی، کوئی لڑکی نہ تھی۔ (آب بقا صفحہ ۱۰ اور گل رعنا صفحہ ۳۶۰)

۲۔ آتش کی بیوی آتش کی زندگی ہی میں مرگئی تھی۔ آب بقا صفحہ ۱۳ پر ہے کہ جب آتش نابینا ہوگئے تو محمد علی جوش کی شادی ایک باہمت ہندو شاگرد کے اصرار اور خرچ سے آتش نے کی۔ جوش سہرا پہن کر آتش کے پاس گئے تو آتش رو دیئے۔ لوگوں نے کہا: "اس وقت آپ روتے کیوں ہیں؟" کہنے لگے "اس کی ماں مرگئی ورنہ وہ اس کو سہرا پہنے دیکھ کر خوش ہوتی۔ میں نابینا ہوں دیکھ نہیں سکتا"۔

۳۔ آتش کی وفات کے وقت اُن کا بیٹا جوش شادی شدہ جوان تھا نہ کہ خرد سال۔ (گل رعنا صفحہ ۳۶۰ = بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔)

دیکھیئے آزاد نے ایک سانس میں کتنے جھوٹ بولے۔ بیوی اور بیٹی کا بعد وفات آتش کا زندہ رہنا غلط۔ لڑکے کا خرد سال ہونا غلط۔ جس فقرہ میں اتنی باتیں خلاف واقعہ ہوں تو کیونکر اُس کے اس حصہ کو صحیح مانا جا سکتا ہے کہ ایک شیعہ نے آتش کی تجہیز و تکفین کی اور اس سے ان کی موت پر شیعی موت کا اطلاق ہو سکے۔ کیونکہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ایک جوان بیٹے نے تجہیز و تکفین نہ کی ہو بلکہ ایک غیر نے کی ہو۔

۴۔ آب بقا میں صفحہ ۱۳ پر خلیل کی سعادتمندی کا ذکر ضرور ان الفاظ میں ہے کہ "آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کرتے تھے"۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس نے شیعی تجہیز و تکفین بھی کی ہو۔ بات فقط اتنی ہی تھی کہ خلیل نے آتش کی زندگی اور بڑھاپے میں خدمت کی۔ آزاد نے اس پر آتنا حاشیہ چڑھا کر یہ افسانہ بنا دیا۔

۵۔ آب بقا میں ناسخ کا مذہب۔ اُنکی قبر کی شکل (کہ وہ حسب دستور اہل تشیع زمین سے ملی ہوئی ہے) تو درج ہے مگر آتش کے بارہ میں کچھ درج نہیں۔ سوا اس کے کہ گھر ہی میں دفن ہوئے۔

۲- میر انیس کی روایت = راوی کا نام پڑھ کر ناظرین شاید مرعوب ہو جائیں اور آزاد کی چال بھی یہی تھی بقول غالب۔

غازیاں ہمراہ خویش آوردہ از بہر جہاد تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ ہست

لیکن میر انیس کی شہرت و عظمت صرف مرثیہ گوئی کی بنا پر ہے روایت۔ ثقاہت۔ تاریخ میں تو ان کا کوئی پایہ نہیں۔ ان حیثیتوں سے وہ ایک عام شخص تھے۔ اب روایت پر تھوڑی ہی سی درایت کی نظر ڈالنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میر انیس کی اس روایت کا وجود آب حیات سے باہر بھی کہیں ہے؟ جواب نفی میں ہوگا۔

آتش کے خاندان میں تسنن اور تصوف متوارث تھا اور ابا عن جد پیری مریدی کا طریقہ چلا آتا تھا۔ خود آتش اس باپ کی گود میں پلا تھا جس کی بابت سب تذکرہ ویس متفق اللفظ ہیں کہ فقیر سالک تھا۔ پھر باپ کے انتقال کے وقت تک آتش اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اور باپ اسوقت مرا ہے جب "آتش ابھی اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم نا مکمل تھی"۔

کیوں صاحب! وہ کونسا مسلمانوں کا اور خاصکر درویشوں کا گھرانہ ہوگا جس کا بچہ بچپن سے اپنے بزرگوں کو نمازیں پڑھتے نہ دیکھے گا؟ اور اس کو نماز نہ سکھائی جائے گی؟ اور اچھی طرح جوان ہونے کی عمر تک بھی وہ جاننے گا کہ ہم شیعہ ہیں یا سنی۔ اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور سنیوں کے ہاں ہاتھ باندھ کر؟ خود ہمارے گھر میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی جاتی ہے یا ہاتھ کھول کر؟ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لڑکا آوارہ ہو تو خود نماز کا پابند نہ ہو۔ لیکن ہر مسلم کا بچہ نماز کی ہیئت اور دونوں نمازوں کا فرق جانتا ہے

۳- کیا آپ ایسے شیعہ کا تصور کر سکتے ہیں کہ عقائد سے تو اتنا باخبر ہو کہ بقول اثر صاحب یہ مصرعہ کہہ جائے کہ:۔

شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف ایدل

لیکن اعمال سے اتنا ناواقف ہو کہ دونوں نمازوں کا فرق جانے نہ شیعہ نماز اسکو آئے؟

(۴) لکھنؤ میں آتش و ناسخ کا زمانہ، شیعیت اور مذہبیت کے سخت جوش کا زمانہ تھا۔ ناسخ صاحب آخر شیعہ ہو ہی گئے آتش ایسے جوش کے زمانہ میں ہرگز شیعہ نماز اور دونوں نمازوں کے فرق سے بیخبر نہیں رہ سکتے تھے؟

(۵) بقول آزاد "میر دوست علی خلیل شاگرد خاص تھے اور خلوت و جلوت کے حاضر باش۔ آتش کو جب اپنا مذہب شیعہ معلوم تھا تو کیوں نہ اپنے شیعہ شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش ہی سے نماز سیکھ لی۔

(۶) میر دوست علی خلیل شیعہ تھا۔ پھر ان کے استاد آتش کی اتنی بیخبری کے کیا معنے؟

(۷) آتش جو بقول اثر صاحب ایسی غزل کہے اور خلیل ہر وقت اسکی مصاحبت میں بھی رہیں۔ اس کو اپنا شیعہ ہونا معلوم بھی ہو پھر بھی آتش نماز پڑھتا ہے تو سنیوں ہی کی؟ کسقدر حیرتناک امر ہے؟

(۸) آزاد نے کیا خوب فقرہ سوچکر لکھا ہے کہ "شاگرد نے کہہ دیا کہ استاد عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی"۔ شاید آزاد نے اس لئے لکھا کہ اہل سنت کے یہاں کھلم کھلا جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ انکے یہاں کوئی مخفی عبادت نہیں نہ وہ کسی کو کسی مخفی عبادت کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ فرضی نماز سکھانے میں اس شاگرد کی کون سی مصلحت تھی؟

کہ اس نے عبادت چھپانے کو کہا۔ غرض یہ ثابت ہے کہ بچپن میں نہیں عمر کی پختگی میں آتش نے سینوں کی نماز پڑھی۔ اس امر کو اس سے ملائیے کہ آتش سنی اور صوفی باپ کے یہاں پلے تھے۔ انھوں نے سینوں کی نمازیں دیکھی تھیں۔ تصوف کے اُن مدارج اور نکات سے آگاہ تھے جنکی تفصیل اثر صاحب نے کی ہے۔ نیز آتش اس کے قائل تھے کہ درندمشرب ہوں مجھکو کیا ہووے + مذہبوں میں جو اختلاف ہوا) نتیجہ صاف یہ نکلتا ہے کہ آزاد ہوں یا امینس سب نے اس معاملہ میں غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اگر فی الحقیقت میر امینس نے یہ روایت بیان نہیں کی تھی بلکہ یہ بھی آزاد کی صنعت تھی تو اس کے ذمہ وار بھی آزاد اور اس کا وبال بھی آزاد ہی کے سر۔

۳۔ آتش کے بعض اشعار۔ مرزا صاحب کی پیش کردہ غزل اوپر لکھ آیا ہوں اور اگر مجھے بھی اُس کے ایسے ہی شعرا کی جمع و تلاش مقصود ہو تو چند اور اشعار اُسکی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں:۔

قسم اول۔ (الف) لاتحف ایدل والی غزل۔

(ب) دیوان دوم کی پہلی غزل = دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہوگیا۔

(ج) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو + یہ مشت خاک ہووے کربلا کی خاک سے پیدا۔ (صفحہ ۹)

(د) آتش کی التجا ہے یہی تم سے یا علی + صدمہ ہو نہ فشار لحد کے عذاب کا۔ (صفحہ ۲۴)

(ہ) آتش غم حسین میں رو رہنا ہی کیا + سطریں کی سطر نامۂ عصیاں سے دور ہوں۔ (صفحہ ۱۰۹)

(و) ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر + مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا (صفحہ ۲۱۲)

(ز) پیروی پیشوا کی لازم ہے + روسیہ منکر امامت کا (صفحہ ۲۲۱)

(ہ) دست علی کی ضرب کا جنبش میں ہے اثر + ان ابروؤں میں معجزہ ہے ذوالفقار کا (صفحہ ۴۷)

قسم دوم:۔ (الف) سر سے حاضر منقبت میں لئے تامل ہوگیا + مدح حیدر میں کمیت خامہ دلدل ہوگیا۔

(ب) خوں ریز جس قدر کہ ہو اس سے عجب نہیں + آتش فراق یار بدتر ہے یزید کا (صفحہ ۲۱۴)

(ج) اک سال میں دس دن بھی جسے غم نہیں ہوتا + وہ شہر ہے جس میں کہ محرم نہیں ہوتا (صفحہ ۲۲۱)

(د) یا علی لشکر بت پندار توڑا چاہیئے + نفس امارہ کی گردن کو مروڑا چاہیئے (صفحہ ۲۵۰)

ظاہر ہے کہ مجھے قسم دوم کے اشعار کا تو جواب دینا نہیں ہے۔ ان میں محض کوئی نام آگیا ہے اور اُن سے کوئی شیعی عقیدہ کھلا ہوا نہیں ظاہر ہوتا۔ الف اور ج کے اشعار اگر ایک سنی لکھنؤ میں بیٹھ کر کہے تو تعجب کا مقام نہیں (ب)۔ فراق کو یزید سے بڑھ کر سمجھنا اور ابروؤں کو ذوالفقار کا اثر ماننا محض تشبیہی انداز بیان ہے اور نکتہ آفرینی۔ "باعلم" اس میں صریح اشارا ہے اس حدیث کی طرف جس میں ذکر ہے کہ رسول اکرم صلعم نے حضرت علیؑ کو۔

کیا تھا۔ اس قسم کے بیانات تو سنیوں کے ہاں بھی ہیں۔ اور عام ہیں مثلاً
(الف) ذوق کی پہلی غزل کے یہ مصرعے :۔ ۱۔ محبت اہلِ بیتِ مصطفےٰ کی نورِ برحق ہے ۔ ۲۔ کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا ۔ ۳۔ غمِ آلِ نبی سے واللہ ہر اشکِ نم میرا ۔ حالانکہ ذوق مسلّم طور پر سنی تھے۔
(ب) سید محمد مبین الدین صاحب مبین مچھلی شہری نے (جو سنی حنفی اور داغ مرحوم کے ارشدِ تلامذہ میں ہیں) ۱۳ رجب کو شیعوں کی ایک مجلس میں تعریفِ جناب امیرؑ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا ایک مصرعہ مجھے اس وقت یاد ہے۔ ع
وہی علیؑ کہ جو تھے خاتمِ خلافتِ خاص
(ج) اور کسی دوسرے کی مثال کیوں دوں۔ خود مجھ پر ایک زمانہ حبِ علیؑ کے جوش کا ایسا گزرا ہے کہ جب میں نے مقبول احمد دہلوی کی تفسیر کے رد میں اپنی تفسیر "فبہت الذی کفر" لکھی جو پبلک میں شائع ہو چکی ہے۔ اُس کے دیباچہ میں میں نے لکھا تھا کہ محبت علی میں مجھکو وہ شغف اور غلو حاصل ہے کہ میں فضیلتِ شیخین کو بدعت اور ایک امرِ خارج از امورِ دین سمجھتا ہوں" لیکن ان سب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اور یہ سب لوگ بھی شیعہ ہو گئے۔ رہے دوسرے قسم کے اشعار تو
(۱) مجھے سرے سے اسی میں شک ہے کہ یہ اشعار آتش کے ہیں کیونکہ حسب تمہید نمبر ۲ سعدی و رومؒ پر تشیع کا اتہام حافظ کے نام سے الحاقی غزل اور قصائد۔ فردوسی کے نام سے ہجو محمود میں الحاقی اشعار۔ کتابوں اور تصنیفوں میں تحریفِ حسب ہمارے سامنے ہے، تو آتش کے کلام میں الحاقی اشعار کا ہونا کون سی بڑی بات تھی۔ آتش کا دوسرا دیوان تتمہ ہے جو انکی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوا ہے۔ اس لئے اس میں کافی موقع الحاق کا تھا۔ چنانچہ ہمکو پہلی ہی غزل بلا مقطع کے پانچ شعر کی ملتی ہے غالباً پنجتن کی رعایت سے اور اس میں شروع سے آخر تک ہر شعر میں شیعیت بھری ہے۔ پہلا دیوان اگرچہ اُن کی زندگی ہی میں طبع اور شائع ہو چکا ہے لیکن اُس میں بھی الحاقی اشعار بیچ بیچ میں داخل کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش جو صاحب تھے وہ شیعہ ہی تھے اور آتش جیسے بنگ نوش رند اور لااُبالی شاعر سے غالباً اس بیدار مغزی اور باخبری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اُس نے اپنے نام سے شائع شدہ دیوان کی ہر جگہ سے تنقیح اور جانچ کر لی ہو۔
(۲) آتش کے حالات و صفات، اطوار و اشعار آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے ایک حد تک آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان اوصاف کے آدمی سے ہم کو کس کس قسم کی باتوں کی توقع ہو سکتی ہے۔ وہ زیادہ تر تو وراثت کے تصوف کہنے پر زیادہ مائل نظر آتا ہے یا لکھنؤ کی فضا سے متاثر ہوتا ہے تو اس حد تک کہ کنگھی چوٹی۔ محرم، تی کے اشعار بھی کہہ جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ غزل کے مطالبات اور خصوصیات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ غزل، غزل ہے نہ کہ مرثیہ و سلام۔ تغزل میں فرقہ وارانہ عقائد اور سخت لہجے کی گنجائش کہاں؟ چونکہ اس سے سخت تنگ نظری ٹپکتی ہے۔ اس لئے عموماً اساتذہ اور ثقہ لوگ اس سے اجتناب کرتے کے بارہ میں اہلِ نظر کا خیال ہے کہ غالب سے کسی طرح تغزل کی بلند پروازیوں میں کم نہ تھا، ہرگز اس کلیہ سے بیجز منحرف نہیں ہو سکتا۔ تنگ نظر اور فرومایہ شعرا ایسا کر سکتے ہیں۔

(۳) مسلمان صاحب دیوان شعرا کا طریقہ ... دیوان کے شروع میں حمد و نعت ... منقبت
...نت ضرور کہتے ہیں۔ آتش کے پہلے دیوان میں ... کے شروع کے سات آٹھ صفحات تک کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ آتش
...اشیعہ تھا اپنی زندگی میں شائع ہوئے ... دیوان میں نہ نعت کہی نہ منقبت۔ اور منقبت کہی تو وہ ردیف "لام" میں جا چھپی۔
(۴) کسی شیعہ ... یہ رد یہ دیکھا نہیں گیا کہ شروع کی منقبت کے علاوہ غزل کے ہر شعر میں ایک ہی عقیدے
...اظہار ہو۔ ایک مذہب ... آتش ہی نے اپنے دیوان صفحہ ۲۴۴ پر ایک مطلع لکھا ہے۔ ور د زباں جناب محمدؐ کا نام ہو۔
... درود پڑھ ... نام ہے) بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غزل نعتیہ ہے۔ مگر سوا اس شعر کے اور ایک شعر بھی نعت میں نہیں۔
... بہ بات ... صول کے ماتحت ہے کہ ہر شعر میں کسی عقیدے کا اظہار معیوب ہے۔
(۵) اسی نعتیہ مطلع کے بعد ایک موقع منقبت کے ذکر کا تھا مگر آتش کی توجہ اسطرف نہیں ہوتی۔
(۶) پھر کیا ایک واقعی شیعہ شاعر کے ہاں شیعیت کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ پوری پوری غزلوں میں اور ہر
... (جو منقبت کی جگہ شروع میں نہ لکھی گئی ہوں) اپنے عقیدے کا اظہار کرے اور "شیطان کے نطفہ الخ" جیسے سخت اور گندہ
... اپنا مذہب دکھائے؟ اور خاصکر آتش جیسے بھولے بھالے۔ صوفی کے یہاں؟
کیا اب بھی ان اشعار کے الحاقی ہونے میں کسی کو کچھ شبہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کسی اور نے
کی غزل کو ردیف "لام" میں اس لئے لکھا کہ اس پر آتش کی یا دوسروں کی نظر جلد نہ پڑے؟ پھر اگر یہ اشعار آتش کے ہوتے تو
...ن آزاد (جو مذہب کو مشتبہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور نہایت والی پوچ روایت تک اسی مقصد سے گڑھتے ہیں) کیوں
...ہ آتش میں کوئی غزل یا کوئی شعر ایسا نقل کر دیتے؟ حالانکہ اس نے آبحیات میں تصریح کر دی ہے کہ آتش کے دواوین اس
... سے گزرے ہیں۔ اگر اس کو یہ اشعار مل جاتے تو کیوں نہ وہ آتش کا مذہب صاف صاف شیعہ لکھ جاتا۔ حالانکہ آزاد وہی ہیں
... نے غالب کو "منصور فرقہ اسد اللہیان منم" سے فائدہ اٹھا کر ان کو نصیری کہا ہے اور خوب خوب مزے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ
... سمجھ سکتا کہ آتش جیسے استاد کے ہاں زبان کی یہ غلطیاں بھی مل سکیں گی؟
(الف) پیروی پیشوا کی لازم ہے۔ روسیہ منکر امامت کا۔ دوسرے مصرعہ میں اس نے کہا ہے "منکر امامت کا
... (ہو)" لیکن اس میں یا تو "کا" زائد ہے اسکی جگہ "ہے یا ہو" ہونا چاہئیے۔ اور با محاورہ میں ناجائز تصرف کیا ہے اس لئے
... محاورہ یوں ہے۔ "اس کا منہ کالا" یا "اس کا رو سیاہ" لیکن "اس کا روسیہ" درست نہیں۔
(ب) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو = اس میں "کو" حشو محض ہے۔
(ج) دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا = اس میں تعقید لفظی ہے اور مکروہ۔
بہرحال روز روشن کی طرح یہ بات نظر آ رہی ہے کہ یہ سب "آزاد کے کسی اہل ساز..."
... اس شدت و غلو، اس جوش و کثرت، اس لہجہ و طریقہ سے اور شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔[۱۴۷]

سادہ مزاج شخص کے منھ پر یہ اشعار نہ کھلیں گے تو پڑھنے والے صاف معلوم کرلیں گے کہ یہ جعلی الحاق ہے۔

یہاں تک تو جوابات تھے اُن شکوک کے جو پیدا کئے گئے یا پیدا کئے جا سکتے تھے۔ آتش کے تسنن کے بارہ میں اب مختصراً اسکے وجوہ تسنن بیان کرتا ہوں:۔

(۱) آتش صوفی اور سنی باپ کا بیٹا تھا۔ خود تصوف گو تھا۔ سیدھا اور بھولا تھا اور مذہبوں کے جھگڑوں سے دور رہتا تھا۔ یہ اوصاف بجائے خود اُس کے شیعہ ہونے سے ابا کرتے ہیں۔

(۲) اُس زمانہ میں بادشاہ کے تشیع کا اثر رعایا پر بہت تھا۔ اور اکثر لوگ تبدیل مذہب کر کے شیعہ ہو جاتے تھے مگر وہی جن کو دربار میں رسائی کا شوق اور مال و جاہ کا لالچ تھا۔

چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ کو یہ شرف نصیب ہوا کہ بقول آزاد پہلے مذہب سنت و جماعت رکھتے تھے پھر شیعہ ہو گئے ان کی زندگی تمام تر سیاسی چالوں میں گذری اور دنیا طلبی کے ذرائع ان کو اچھے حاصل تھے۔ لیکن آتش کو دربار سے تعلق اور امرا بادشاہ کے ہاں رسائی کا شوق نہ تھا۔ اس نے بادشاہ کا خلعت واپس کر دیا۔ اور ایک رئیس شاگرد سے ملتے ہوئے روپے لوٹا دیئے۔ وہ متوکل قانع و عزلت گزیں تھا۔ ایسے شخص پر اس وقت کی آب و ہوا کا اثر نہ پڑ سکتا تھا نہ پڑا۔

(۳) کسی تذکرہ نویس نے آتش کو شیعہ نہیں لکھا یہاں تک کہ آزاد نے بھی نہ آتش کے تبدیل مذہب کا ذکر کیا نہ صاف طور سے اُس کو شیعہ لکھا۔ رہا اثر صاحب کا لکھنا تو اُنھوں نے یہ روش اختیار کی ہے کہ دوسرے لوگ جعلی روایات اور الحاق سے جو اینٹ رکھ گئے تھے۔ اس پر پوری عمارت کھڑی کر دی ہے۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ بنیاد ہی پانی پر تھی۔

(۴) آتش نے ایک دفعہ مرزا دبیر کے مرثیہ پر صاف کہدیا کہ "یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان"۔ اور ایک شیعہ مرثیہ جیسی مذہبی چیز پر ایسی سخت طنز نہیں کر سکتا۔

ہر چند کہ اس مضمون میں ابتک مرزا اثر صاحب کے مضمون پر استطراداً کچھ نقد و بحث آ چکی ہے لیکن بعض اور باتیں بھی اُنکے مضمون میں ایسی ہیں جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیجا سکتیں۔

۱۔ مرزا صاحب غالباً بے خیالی میں ایک ایسی بات لکھ گئے ہیں۔ جس پر اطلاع ہونے کے بعد یقیناً اُن کو اس سے اختلاف ہوگا۔ اور وہ یہ کہ عام شعرائے لکھنؤ کا کلام تصوف سے خالی ہے۔ لیکن کیا اثر صاحب براہ کرم بتائیں گے کہ تصوف ... ان تغزل۔ خمیر تغزل۔ بلکہ تمام تغزل ہوتا ہے اُس ... کے لکھنؤ میں نہ ہونے کی کیا وجہ تھی یا ہو سکتی ہے؟ کیا اس کا جو ... بھی کچھ ہو سکتا ہے کہ وہاں شیعیت کا زور تھا اس لئے تصوف کا چرچا نہ تھا یعنی سرزمین لکھنؤ۔ مفتی محمد عب... سکتی تھی جو یہ کہہ سکے کہ (این کلام صوفیان شوم مینت الخ) لیکن خواجہ میر درد، میر سوز، مرزا مظہر، ... آخر میں آتش جیسے مقدس وجود نہ پیدا کر سکی۔

... کے مضمون میں آب بقا سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ابتدا مضمون ہی میں حوالہ ...

لیکن خاص موقعوں پر وہ آزاد کی تقلید کر گئے ہیں۔ "دسناؤ" ... والے مشاعرے کے ذکر میں آب حیات نے لکھا تھا کہ نواب نے دوسرا خلعت آتش کو دے کر رخصت کیا۔ یہی مرزا صاحب بھی نقل کر گئے۔ حالانکہ آب بقا میں ہے کہ آتش نے خلعت لینے سے انکار کیا بلکہ اُسے بھی ناسخ ہی کو دلوادیا اور ... پگڑی پر قناعت کی۔ آتش جیسا متوکل شخص اور وہ معرکۂ خاص کہ ناسخ نے دشمنی ہم چشمگی برتی اور طرح کی اطلاع ... ایک روز قبل آتش کو دی۔ اس صورت میں آتش کا خلعت قبول کر لینا۔ آتش کو کچھ اعلیٰ ثابت نہیں کرتا ... ب بقا ... روایت سے اس کی عالی ہمتی۔ سیر چشمی۔ اور صبر و توکل کا نہایت اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے۔ اگر اثر صاحب کو ... اور مختتم مضمون لکھ رہے تھے تو یا تو اپنے ممدوح کی بابت عالی ہمتی کی روایت لکھتے۔ جس سے اس کی شخصیت ... یا پھر اُصولاً دونوں روایتیں جمع کر دیتے۔ لیکن آخر یہ راز کیا ہے کہ کوئی مضمون تلاش و جستجو سے بھی ... مشہور و مسلم کذاب و افسانہ گو مورخ کی تقلید تو کی جائے اور دوسرے مورخ کو یوں نذر تغافل کیا جائے گویا ... ہی نہ تھا۔ اگر آب بقا بروئے کار نہ آیا ہوتا یا اثر صاحب نے اس سے استفادہ نہ کیا ہوتا تو کچھ حرج نہ تھا۔ لیکن وضعداری ... آزاد پرستی کم سے کم اتنی تو ہو کہ آنکھ بند کر کے اس کو امام بنایا جاتا ہے۔

سلسلۂ سخن میں لکھنا پڑتا ہے کہ آب حیات ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اس کی دروغ نویسی ... حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ مرزا عسکری صاحب (مترجم تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ) کو دیباچہ ترجمہ تاریخ ادب اردو میں لکھنا پڑا کہ اُس نے افسانہ نویسی کی ہے۔ تاریخ نہیں لکھی۔ اس نے کہیں کہیں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور یہ تنقیدیں جو برابر نکلتی آرہی ہیں لازمہ اور خمیازہ ہیں۔ ان غلطیوں کا جو آزاد نے آبحیات میں کی ہیں۔

۳۔ مرزا صاحب نے اُستاد سے نزاع والی روایت بھی جس کی حقیقت آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ آبحیات سے نقل کر دی۔ تنقیدی نظر نہ ہونے کے علاوہ مرزا صاحب یہ بھی تو نہیں درج کرتے کہ اور تذکرہ نویسوں کے ہاں اس کا ذکر تک نہیں تاکہ پڑھنے والوں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ آزاد اس روایت میں منفرد ہیں۔ پھر جو درجہ اُس کا قائم ہو سکتا وہ اپنے دل میں اس روایت کا قائم کرتے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مرزا صاحب کو آتش کے حالات میں تلاش و تحقیق یعنی ریسرچ کرنا نہیں تھا اور درایت و تنقید کی بجائے تقلید منظور تھی تو پھر مضمون کی ضرورت ہی کیا تھی؟

۴۔ مرزا صاحب نے بھی وہی آزاد کا سا یقین و اطمینان پیدا کر کے مذہب کی بابت لکھدیا کہ "شیعہ تھا" گویا یہ مسلم اور اگر پوچھا جائے کہ حضور یہ دوٹوک فیصلہ کسی اور نے بھی کیا ہے جو آپ نے جلدی سے لکھ دیا؟ تو شاید جواب آسان نہ ہو۔ آزاد ہی کو دیکھئے، دیوان دیکھ چکا ہے مگر تشیع پر اشعار نہیں لکھتا۔ اس کا دل خود چاہتا ہے کہ لکھنؤ کے دور تشیع کے ایک نامی شاعر کو شیعہ کر دکھائے مگر کوئی بات نہیں ملتی ناچار ایک پوچ روایت گڑھتا ہے اور زور پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے شخص کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے کہ جو کچھ راست و دروغ ہو برگردن راوی" مگر وہ بھی کو ... ثابت ... پھر ... نہیں ...

[illegible] کسی عدالت پر [illegible] لگایا جاتا۔ اس سے بھی بڑھ کر دلچسپی اور مرزا صاحب کی دلی پریشانی [illegible] ظاہر ہوتی ہے جہاں یہ یوسف پر لکھا ہے "وہ ایک آزاد شاعر تھا اور باستثناء اُن حالتوں کے جب وہ کسی مذہبی عقیدے کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھول جاتا تھا کہ اُس کا مذہب کیا ہے"۔ واہ کیا خوب استثناء کیا ہے۔ آٹے سے بال نکالنا اسے کہتے ہیں لیکن اب بھی نتیجہ صاف یہی نظر آرہا ہے کہ مرزا صاحب پیش بندی کرنا اور ایک گنجائش نکالنا چاہتے ہیں اور جس طرح "آزاد" اور "اہلِ راز" کے پیدا کردہ شبہوں اور موقعوں سے مرزا صاحب نے فائدہ اُٹھایا ویسے ہی مرزا صاحب کی تحریر سے کسی دوسرے کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ ملے۔

۵۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں جہاں آتش کے اشعار کی تقسیم کی ہے۔ وہاں "مسئلہ رویت" کا عنوان قائم کر کے یہ تین شعر لکھے ہیں۔

(الف) بوئے گل آتش کہیں ہوتی ہے محبوس نظر ٭ افترا ہے روز روشن یار کے دیدار کا۔

مرزا صاحب نے اس پر نوٹ لکھا ہے "دیدار اسکی معرفت دل سے ہے۔ آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں"۔ لیکن سخت تعجب ہے [illegible] نے اس کو مسئلہ رویت کے عقیدے پر شاعر کی رائے سمجھا۔ حالانکہ صاف نظر آرہا ہے وہ مضمون آفرینی کے طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ [illegible] معرفت دل سے ہیں حاصل ہے۔ پھر دیدار کا انحصار صرف روز محشر پر ہم کیوں مانیں۔ روز محشر پر دیدار کا انحصار نہیں [illegible] رہتا ہے۔

(ب) گرے گی برقِ جمال اس کی بند آنکھوں کو ٭ وہ خلوتی اگر اے انجمن نظر آیا۔

مرزا صاحب کا نوٹ اس پر یہ ہے کہ دیدار اس لئے بھی محال ہے کہ اس نے یہ شعر کہا۔ افسوس ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو تو عقیدہ رویت پر اظہار خیال سمجھا (حالانکہ اس میں محشر کا ذکر ہے نہ اس کا اشارہ حتی کہ انجمن سے بھی محشر مراد نہیں) لیکن آگے خود ہی (مقام حیرت) کے عنوان سے ایک شعر لکھا ہے۔ جو ٹھیک اسی مضمون و مفہوم کا ہے۔ اس سے عقیدہ رویت پر اظہار خیال نہیں سمجھتے۔ وہ شعر یہ ہے: "اُلٹا اودھر نقاب تو پردے پڑے اُدھر ٭ آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا"۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ آنکھیں جلوہ دیکھنے کے بعد بند ہوں گی نہ کہ دیکھنے سے قبل۔ پس دیدار اور لقائے یار تو ہو گیا۔ رہا آنکھوں کا بند ہو جانا تو یہ اُس کے حسن کا کمال ہے اور اپنے ظرف کی کمی۔

(ج) اُٹھ چکا روزِ قیامت روئے قاتل سے نقاب ٭ روزِ محشر نگہ کے تیر کی منزل نہ ہو۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ رویت کا محال ہونا اس میں بھی دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس شعر کے بارے میں ہمکو مرزا صاحب کے خیالات نہ معلوم ہو سکے کہ دوسرے مصرعہ کا مطلب اُنھوں نے کیا سمجھا ہے۔ اس لئے کچھ لکھنا ذرا بے موقعہ ہے۔

ان اشعار کے مطلب و معنی کی طرح مختصرًا اشارہ کیا جا چکا۔ لیکن مرزا صاحب کے اس جملہ نے "تصوف میں مسئلہ رویت مختلف فیہ ہے" ہمکو بہت دیر تک غرقِ حیرت رکھا۔

مرزا صاحب نے "تصوف میں رویت کا انکار" کہیں سے سُن لیا ہوگا۔ اس لئے اس استدلال سے کام لیا بندہ نواز، صوفیوں کے ہاں نفس رویت خداوندی سے انکار نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ صوفی جو خدا کا طالب ہوتا ہے۔ کس منھ سے دیدار محبوب کا انکار کرے گا؟ بلکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ یہاں اس دنیا میں اس جسم خاکی کے ساتھ اُن آنکھوں سے بھی دیدار ہو سکے گا یا نہیں؟ اس میں بعض قائل ہیں۔ ہو سکتا ہے اور بعض منکر۔ یہی اختلاف اسلام کے بعض فرق ظاہرہ میں بھی ہے اور معتزلہ نے اس سے صاف انکار کیا ہے (عقائد نسفی میں اسکی پوری بحث موجود ہے)

ایک صوفی کا یہ شعر بہت مشہور ہے "ے بقرآں ہم نیاوردہ است ایماں زاہد اعمیٰ ؏ اگر دیدار اینجا نیست آخر جلوہ گاہے کو" لیکن اس میں رویت کا جو پہلو بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے۔ لیجئے یہ تھا مطلب رویت سے اختلاف کا جسے جناب اثر صاحب جیسے اہل قلم نے واقف کارانہ انداز میں اس شد و مد سے لکھا ہے۔

———— سراج الحق مچھلی شہری

جبریہ شادی

(ڈرامہ)

فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کا ایک شاہکار

افرادِ ڈرامہ

(۱) سنارل :- ڈورمین کا ہونیوالا خاوند
(۲) ڈورمین :- ایلکانسٹر کی بیٹی
(۳) ایلکانسٹر :- ڈورمین کا باپ
(۴) ایلیڈاس :- ڈورمین کا مشہور شمشیرزن بھائی
(۵) جیرونیمو :- سنارل کا دوست
(۶) پنکریس :- ایک فلسفی
(۷) مارفوریس :- ایک اور فلسفی
(۸) لائیکاٹ :- ڈورمین کا عاشق
(۹) ملازم وغیرہ جیسی عورتیں

سنارل (پس پردہ ملازم سے)

س - میں ابھی واپس آتا ہوں - گھر کا خیال رکھنا - اور اگر کوئی روپے دینے آئے تو مجھے فوراً مسٹر جیرونیمو کے مکان پر اطلاع دینا - اور اگر کوئی روپیہ لینے آئے تو اس سے کہدینا کہ میں یہاں نہیں ہوں - اور نہ آج واپس آؤں گا -

جیرونیمو - (سنارل کے آخری الفاظ سنکر) اچھی پیش بینی ہے

س - آہ جیرونیمو خوب پہونچے - میں تو تمہارے ہی گھر جا رہا تھا -

ج - کیوں خیر تو ہے ؟

س - تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا -

ج - بڑی خوشی سے - میرا خیال ہے :- ہم یہاں اچھی طرح سے گفتگو کر سکتے ہیں -

س - تو پھر بیٹھ جاؤ - معاملہ بہت اہم ہے - اور میں کوئی کام دوستوں کے مشورہ بغیر نہیں کرنا چاہتا -

ج - میں ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اس کام کے لئے منتخب کیا - اچھا بتاؤ کیا بات ہے ؟

س - مگر سب سے پہلے میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خوشامد درامد کی ضرورت نہیں تم مجھے صحیح صحیح رائے دینا -

ج - ایسا ہی ہوگا -

س - قسم کھاؤ -

ج۔ تمہاری قسم۔ اچھا تو اب معاملہ بتاؤ۔
س۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ میں شادی کروں یا نہ کروں؟
ج۔ کون؟ تم
س۔ ہاں میں۔ تمہارا اس کی نسبت کیا خیال ہے؟
ج۔ مگر پہلے مجھے ایک بات بتاؤ۔
س۔ کیا؟
ج۔ تمہارے خیال میں تمہاری عمر کتنی ہے؟
س۔ میری۔
ج۔ ہاں۔
س۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔
ج۔ سنا ہے تم باون یا ترپن سال کے ہوگے۔
س۔ کون؟ میں! یہ نہیں ہو سکتا۔
ج۔ بہر حال میں تمہیں حسب وعدہ یہ رائے دیتا ہوں کہ تم شادی کرنے کے ناقابل ہو۔ میں تمہیں یہ مشورہ دونگا۔ کہ اس جنون کو سر سے نکال دو۔ اگر تم اتنے عرصہ تک آزاد رہنے کے بعد اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لوگے تم جیسا بدقسمت انسان دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔
س۔ اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں شادی کرنیکا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔ اور میں اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں کسی تعویق و تو خیر سے کام نہیں لوں گا۔
ج۔ خیر یہ معاملہ اور ہے۔ مجھے تو تم نے یہ نہیں بتایا تھا۔
س۔ میں اُس لڑکی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اور دل سے چاہتا ہوں۔
ج۔ تم اُسے دل سے چاہتے ہو؟

س۔ بے شک اور میں نے اُس کے باپ سے بھی پوچھ لیا ہے۔
ج۔ باپ سے بھی؟
س۔ ہاں۔ آج شام کو شادی ہونیوالی ہے۔ اس کا تصفیہ ہو چکا ہے۔
ج۔ تو پھر شادی کرو۔ میں اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔
س۔ مگر جیر دیکھو تمہارا خیال ہے کہ میں ارادہ فسخ کر دوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں شادی کرنیکے ناقابل ہوں؟ میری عمر کو چھوڑ دو۔ واقعات کو صحیح روشنی میں دیکھو کہ وہ کیا ہیں؟ کیا کوئی سی سالہ آدمی مجھ سے زیادہ توانا و تندرست ہے؟ کیا میرے اعضا و حواس باقاعدہ کام نہیں کرتے؟
ج۔ تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں غلطی پر تھا۔ ضرور شادی کرو اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔
س۔ پہلے میں شادی کرنے کے خلاف تھا۔ مگر اب میری رائے بدل چکی ہے۔ اور میرے پاس اس کے لئے متعدد دلائل ہیں۔ بیوی کی معیت سے حصول مسرت کے علاوہ جو بڑا فائدہ پہونچنے کی توقع ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری نسل باقی رہیگی۔ جو بہ صورت دیگر معدوم ہو جائے گی۔
ج۔ بے شک یہ خیال بہت اچھا ہے۔ اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ جلد از جلد شادی کر لو۔
س۔ سچ مچ؟ کیا تم یہ مشورہ دیتے ہو؟
ج۔ یقیناً اس سے بہتر اور کیا کام ہو سکتا ہے؟
س۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم ایک مخلص دوست کی طرح مجھے مشورہ دے رہے ہو۔
ج۔ مگر تم شادی کس عورت سے کرنا چاہتے ہو؟
س۔ ڈوریں سے۔

ج۔ وہ خوش پوش اور خوش باش نوجوان سی لڑکی۔

س۔ ہاں وہی۔

ج۔ ایلکانسٹر کی بیٹی؟

س۔ ہاں، وہی۔

ج۔ مشہور شمشیر زن ایلیسیڈا اس کی بہن؟

س۔ ہاں، وہی۔

ج۔ خوب!

س۔ کیوں تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج۔ اچھا رشتہ ہے۔ ضرور شادی کر لو۔

س۔ کیا میں نے اچھا انتخاب نہیں کیا؟

ج۔ بے شک۔ مگر جلدی کرو۔

س۔ میں تم سے یہ سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔ اور تمہیں آج شام کو برات میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔

ج۔ شکریہ میں ضرور آؤں گا۔

س۔ روز بخیر۔

ج۔ (ایک طرف) نوجوان ڈورمین! ایلکانسٹر کی بیٹی۔ اور سنارل سے شادی۔ جو ابھی صرف اکاون سال کا ہے۔ اچھا رشتہ ہے! کیا ہی اچھا رشتہ ہے! (دہراتے ہوئے چلا جاتا ہے)

سنارل (تنہا)

یہ شادی یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ کیونکہ جو بھی مجھ سے اس کے متعلق سنتا ہے۔ ہنستا ہے۔ آہا! میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں۔

ڈورمین

ڈورمین (ملازم سے) دیکھو گاڑی کا خیال رکھنا۔

سنارل (ایک طرف ڈورمین کو دیکھ کر) وہ میری مالکہ آپہونچی۔ کتنی دلربا ہے؟ کیا شان ہے؟ کس رعنائی سے چل رہی ہے اسے دیکھکر کس کا جی شادی کرنے کو نہ چاہے گا۔ (استقبال کرتے ہوئے) تم کہاں جا رہی ہو؟

ڈ۔ میں کچھ خریدنے جا رہی ہوں۔

س۔ کیا تم اس شادی پر خوش ہو؟ .... میرا تو خیال ہے ہم بہت لطف سے زندگی بسر کرینگے۔ مجھے تم پر ہر ایک طرح کا حق حاصل ہوگا اور تم میری ہر ایک خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھوگی۔

ڈ۔ میں بہت خوش ہوں، کیونکہ میرا باپ مجھے بہت بری حالت میں رکھتا ہے۔ میں اپنی آزادی کے لئے آج تک اپنے باپ سے لڑتی رہی ہوں۔ میری بہت خواہش تھی کہ مجھے جلد از جلد کوئی خاوند ملجائے۔ تاکہ آزاد ہوکر اس کے پاس جو چاہوں کروں سو خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں آج سے ہمہ تن مسرت و انبساط ہوں۔ اور وقت کا بہترین مصرف دنیادی آسائشوں کا حصول سمجھوں۔ چونکہ تم عالی نسب اور نئی روشنی کے آدمی ہو۔ اس لئے تم یہ کبھی نہیں چاہوگے کہ میں جھگڑالو بنوں۔ اور الوؤں کی طرح مکان کی چار دیواری میں محصور رہوں۔ تنہائی مجھے کاٹے دوڑتی ہے۔ میرا دل۔ کلب تھیٹر اور رقص گاہوں میں خوب لگتا ہے۔ تم میری جیسی بیوی پاکر بہت خوش ہوگے۔ ہم میں کسی طرح کے جھگڑے نہیں ہونگے نہ تم میری نقل و حرکت پر معترض ہوگے۔ نہ مجھے تم سے کسی طرح کا تعرض ہوگا۔ الغرض ہم اس طرح رہیں گے گویا موجودہ زمانہ کی روش سے پوری طرح واقف ہیں۔ مگر کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان سے نظر آتے ہو۔

س۔ میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔

ڈ۔ آج کل یہ مرض عام ہے۔ مگر ہماری شادی یہ درد سر رفع کردیگی۔ اچھا روز بخیر۔ میں ایک اچھا سا سایہ خریدنا چاہتی ہوں۔ اور ان چیتھڑوں کو پھینک دوں گی۔ میں آج تمام ضروری چیزیں خرید لوں گی۔ اور بل تمہیں بھجوادوں گی۔

جیرونیمو اور سنارل

جیرونیمو۔ آہ سنارل۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں آج ایک جوہری سے ملا تھا۔ اور اُس کے پاس ایک نہایت قیمتی ہیرا ہے جو تم اپنی ہونیوالی بیوی کو شادی کے موقعہ پر تحفہ کے طور پر دے سکتے ہو۔

س۔ ابھی رہنے دو کوئی جلدی نہیں۔

ج۔ کیوں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ وہ کل والا شوق کہاں گیا؟

س۔ اصل بات یہ ہے کہ میں چند گذشتہ لحوں سے بہت پریشان ہوں۔ آگے بڑھنے سے پیشتر میں اس معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور تمہیں معلوم ہے۔ کہ بعض دفعہ خواب ہمارے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک جہاز میں ہوں۔ اور جہاز بھنور میں.............

ج۔ سنارل مجھے ایک کام ہے۔ اس لئے میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا۔ تمہارے پڑوسی حکیم اور فلسفی ہیں۔ اُن سے اس کی تعبیر دریافت کرلو۔

س (تنہا) یہ درست ہے۔ مجھے ان لوگوں سے مشورہ لینا چاہیئے۔ پینکریس (ایک فلسفی) کسی سے پس پردہ بول رہا ہے اور سنارل کو نہیں دیکھتا۔

پ۔ جاؤ تم بہت گستاخ ہو اور علوم و فنون سے قطعاً بے بہرہ ہو۔

س۔ خوب! میں بروقت پہونچا۔

پ۔ (سنارل کو نہ دیکھتے ہوئے) میرے پاس اس دعوے کی تائید میں زبردست شواہد ہیں۔ میں ارسطو کی کتابوں سے ثابت کروں گا کہ تم جاہل مطلق ہو۔

س۔ کسی سے لڑ رہا ہے (پینکریس سے) جناب!

پ۔ (مثل سابق) تم بحث کرنا چاہتے ہو۔ اور منطق کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔

س۔ اُسے غصے میں دکھائی بھی نہیں دیتا (پینکریس سے) جناب!

پ۔ (مثل سابق) یہ مسئلہ تمام فلسفہ میں ناقص تسلیم کیا گیا ہے۔

س۔ کسی نے بہت برافروختہ کردیا ہے (پینکریس سے) میں کہتا ہوں۔

پ۔ (مثل سابق) غلط ہے اور بالکل غلط ہے۔

س۔ قبلہ ذرا ادھر تو آیئے۔

پ۔ فرمایئے۔

س۔ کیا میں..........؟

پ۔ (دوبارہ لڑتے ہوئے) تم جانتے ہو یہ کونسا مسئلہ ہے یہ مسئلہ قیاس ہے۔

س۔ میں..........؟

پ۔ (مثل سابق) کبریٰ غلط ہے۔ اور صغرا معمولی۔ اور نتیجہ مضحکہ خیز۔

س۔ میں........

پ ۔ (مثلِ سابق) میں موت کو تمہاری بات کے قبول کرنے پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور میں اپنی رائے پر آخری دم تک قائم رہوں گا۔

س ۔ کیا میں ....

پ ۔ ہاں۔ میں اس مسئلہ کی تا دمِ آخر تردید کروں گا۔

س ۔ ارسطو صاحب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس قدر آتش زیر پا کیوں ہیں؟

پ ۔ نہایت معقول وجہ ہے۔

س ۔ مگر کیا ہے؟

پ ۔ ایک جاہل ایک غلط مسئلہ پر مصر ہے۔

س ۔ مگر وہ ہے کیا؟

پ ۔ آہ مسٹر سنارل۔ آج کل ہر ایک چیز کی قلب ماہیت ہو چکی ہے۔ دنیا نقائص سے مملو ہو رہی ہے۔ حکومت کے منصفوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے غلط مسئلہ کو سن کر ڈوب مریں۔ جو کہ میں تم سے بیان کرتا ہوں۔

س ۔ صاحب بتایئے تو وہ کیا ہے؟

پ ۔ کیا یہ قابلِ نفرین نہیں کہ عوام الناس کے روبرو ”ٹوپی کی صورت“ کہا جاتا ہے۔

س ۔ کیسے؟

پ ۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہمیں ٹوپی کی وضع کہنی چاہیئے۔ نہ کہ ٹوپی کی صورت۔ کیونکہ صورت، اور وضع میں فرق ہے کہ صورت ہمیشہ جاندار چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور وضع، بیجان چیزوں کیلئے۔ چنانچہ حکیم ارسطو نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

س ۔ (ایک طرف) گھاس کھا گیا ہے (پینکریس سے) قبلہ اس قدر زیادہ غور نہ کیجئے۔ میں........

پ ۔ مجھے اس قدر رنج ہے کہ میں یہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں۔؟

س ۔ صورت، وضع اور ٹوپی کو ایک طرف رہنے دیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

پ ۔ گستاخ آدمی!

س ۔ صاحب خاموش رہیئے اور..........

پ ۔ جاہلِ مطلق۔

س ۔ توبہ خدایا! میں ....

پ ۔ کتنا احمق ہے۔ کہ اس پر اصرار کرتا ہے۔

س ۔ وہ جھک مارتا ہے۔ میں ....

پ ۔ ارسطو نے اسے واضح طور پر لکھا ہے۔

س ۔ یہ صحیح ہے۔ میں ....

پ ۔ ایک طویل بیان لکھا ہے۔

س ۔ آپ کا خیال درست ہے (اُس طرف جا کر جہاں سے پینکریس داخل ہوا تھا)

تم بیوقوف ہو گدھے ہو کہ ایک حکیم سے بحث کرتے ہو۔

اچھا تو یہ کام ختم ہو گیا۔ اب ذرا میری طرف توجہ کیجئے۔ میں آپ سے ایک مسئلہ میں مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکی خوبصورت اور با سلیقہ ہے۔ اور مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ اُس کے باپ نے بھی اجازت دیدی ہے مگر میں کچھ ایسا ہی سا خائف ہوں۔ آپ چونکہ حکیم ہیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیئے؟

پ ۔ ٹوپی کی صورت کہنے کے بجائے گدھا بن جانا اچھا ہے۔

س ۔ (ایک طرف، خدا تمہیں غارت کرے (پینکریس سے) قبلہ میں دو گھنٹے سے آپ سے مخاطب ہوں۔ اور آپ توجہ نہیں

کرتے۔ ذرا ایک لمحہ میری بات تو سنیئے۔

پ۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے غصہ نے مغلوب کرلیا تھا۔

س۔ اچھا تو اب غصہ کو تھوک دیجیئے۔ اور ذرا میری عرض سنیئے۔

پ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

س۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں ....

پ۔ اور تم کون سی زبان استعمال کروگے؟

س۔ کون سی زبان؟

پ۔ ہاں۔

س۔ زبان تو میں وہی استعمال کروں گا۔ جو میرے منھ میں ہے۔ کسی پڑوسی کی تو نہیں مانگ لاؤں گا۔

پ۔ میں کہتا ہوں۔ کس زبان کے محاورے اور اصطلاحات استعمال کروگے۔

س۔ اوہ! تو یہ علحدہ بات ہے۔

پ۔ کیا تم مجھ سے اطالوی زبان میں گفتگو کروگے؟

س۔ نہیں۔

پ۔ اسپینی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ انگریزی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ جرمنی؟

س۔ نہیں۔

پ یونانی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ لاطینی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ سریانی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ ترکی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ عربی؟

س۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی

پ۔ اچھا فرانسیسی

س۔ جی ہاں۔

پ۔ تو میرے دوسرے کان کی طرف چلے جاؤ۔ کیونکہ یہ کان صرف السنۂ علمیہ کے لئے وقف ہے۔ اور دوسرا کان گنوار زبانوں کے لئے ....

س۔ معاملہ یہ ہے۔ کہ میں ایک خوبصورت اور باسلیقہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں اُسکے باپ نے اجازت دیدی مگر ....

پ۔ (سنارل کی نہ سنتے ہوئے) انسان کو گویائی خیالات کا اظہار کرنے کیلئے دی گئی ہے۔ اور جس طرح خیالات چیزوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔ اسی طرح الفاظ خیالات کے نمایندے ہوتے ہیں (سنارل بیتابی سے فلسفی کے منھ پر ہاتھ رکھدیتا ہے) مگر وہ بدستور بولنے لگتا ہے۔ جبکہ ہاتھ ہٹادیا جاتا ہے۔ (اور یہ عمل کئی بار دھرایا جاتا ہے) اس لئے تم مجھ سے اُن الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرو۔ جو تمہارے خیالات کے بہترین نمایندے ہوں۔

س۔ (فلسفی کو مکان کے اندر ڈھکیل کر دروازہ بند کردیتا ہے) خدا اس مجنون سے سمجھے۔

پ (مکان کے اندر) گفتگو جذبات کا آئینہ ہے۔ یعنی دل کی ترجمان اور ضمیر کا عکس (کھڑکی کھول کر بولنا شروع کردیتا ہے) یہ

وہ آئینہ ہے۔ جو عیاں طور پر ہمارے اندرونی۔ ذاتی اور صحیح جذبات کا صادق عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ تم کو عقل ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے تم کیوں صحیح الفاظ کی وساطت سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے؟

س۔ میں تو یہی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔

پ۔ میں سنتا ہوں۔ کہو۔

س۔ تو میں کہتا ہوں کہ ....

پ۔ مگر ذرا مختصر کہنا۔

س۔ ایسا ہی ہوگا۔

پ۔ اور واضح طور پر۔

س۔ اوہ! جناب!

پ۔ تمام گفتگو کو ایک مجمل بیان کی صورت میں بیان کرو۔

س۔ میں ....

پ۔ کسی طرح کا ابہام وغیرہ نہیں ہونا چاہیئے (سنارل غصے میں پنکریس کے سر پر پتھر مارنے کیلئے اُٹھاتا ہے) ہیں یہ کیا؟ تم اپنا مطلب بیان کرنے کی بجائے غصہ سے مغلوب ہو رہے ہو۔ تم تو اُس گدھے سے بھی بڑھے ہوئے ہو، جو ٹوپی کی صورت، کہتا تھا۔ میں یہ ثابت کروں گا۔ اور معتبر کتابوں سے ثابت کرسکتا ہوں کہ تم حیوان مطلق ہو۔ اور میں حکیم پنکریس۔

س۔ کسقدر بک بک کرتا ہے؟

پ۔ (نیچے اُتر کر) عالم اور فاضل!

س۔ اور کیا؟

پ۔ ایک لائق اور قابل ہستی (جاتے ہوئے) تمام اخلاقی سیاسی اور طبیعی علوم کا ماہر (مڑتے ہوئے) ایک فاضل اور فاضل ترین شخصیت (جاتے ہوئے) وہ شخصیت جسے تاریخ۔ قواعد۔ شاعری۔ ریاضی۔ اور علم ہیئت پر کامل عبور ہے۔

سنارل (تنہا)

خدا غارت کرے ان عالموں کو۔ جو کسی کی بات نہیں سنتے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ان کا پیشوا ارسطو صرف باتیں بنانی جانتا تھا۔ مجھے اب کسی اور سے ملنا چاہیئے جو اس سے زیادہ عقل رکھتا ہو۔

مارفوریس (ایک اور فلسفی)

مسٹر سنارل تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟

س۔ مجھے آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے۔ اور میں اسی لیئے آیا ہوں (ایک طرف) یہ اچھا آدمی ہے۔ کسی کی بات تو سنتا ہے۔

م۔ مسٹر سنارل مہربانی فرما کر اپنی طرزِ گفتگو کو بدلیئے۔ ہمارا فلسفہ ہم کو کسی امر کے متعلق فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ فیصلہ کو ہمیشہ معلق رکھا جاتا ہے۔ اس لئے تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیئے۔ کہ میں آیا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں آیا ہوں۔

س۔ معلوم ہوتا ہے؟

م۔ ہاں۔

س۔ بے شک معلوم تو ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا ہی ہوا ہے۔

م۔ یہ ضروری نہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ جو کام ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہ دراصل ہوتے نہیں۔

س۔ یہ کیسے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ میں آیا ہوں۔

م۔ یہ مشکوک ہے۔ ہمیں ہر ایک بات پر گمان نہ کرنا چاہیئے۔

س۔ کیا میں یہاں نہیں ہوں؟ اور کیا آپ مجھ سے نہیں

بول رہے ہیں؟

م - مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں ہو۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

س - یہ کیا مذاق ہے۔ یہ میں ہوں اور وہ آپ اور معلوم ہوتا ہے، کہاں سے آگیا۔ اس بحث کو چھوڑیئے۔ اور اصل معاملہ سنیئے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

م - مجھے اس کا علم نہیں۔

س - میں آپ کو بتا رہا ہوں۔

م - ایسا ہی ہوگا۔

س - جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نوجوان اور خوبصورت ہے۔

م - ہو سکتا ہے۔

س - مجھے شادی کرنی چاہیئے یا نہیں؟

م - تمہاری مرضی۔

س - (ایک طرف) یہ ایک اور گدھے سے پالا پڑا ہے۔ (مخاطب ہو کر) قبلہ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں۔ کہ میں اس لڑکی سے شادی کروں یا نہ کروں؟

م - جیسا موقعہ ہو۔

س - کیا یہ برا فعل ہوگا؟

م - خدا جانے۔

س - ٹھیک طرح جواب دیجیئے۔

م - میرا ارادہ یہی ہے۔

س - مجھے لڑکی سے بعید محبت ہے۔

م - ہو گی۔

س - اس کے باپ نے اجازت دیدی ہے۔

م - اس نے ایسا کیا ہوگا؟

س - مگر میں شادی کرنے سے خائف ہوں۔

م - ہو گے۔

س - آپ کا کیا خیال ہے؟

م - یہ ناممکن نہیں۔

س - مگر آپ اگر میری جگہ پہ ہوتے۔ تو کیا کرتے؟

م - میں نہیں کہہ سکتا

س - مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

م - جو تمہارا جی چاہے۔

س - میں پاگل ہو جاؤں گا۔

م - میں اس سے بری ہوں۔

س - خدا تم سے سمجھے۔

م - ایسا تو ہوگا ہی۔

س - (ایک طرف) کمبخت میں تجھے ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ (اُسے مارتا ہے)

م - اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔

س - یہ تمہاری خرافات کا نتیجہ ہے۔ اور ا ہو گئی ہے۔

م - تم بڑے پاجی ہو۔ جو مجھ

س - ذرا طرز تکلم در چاہیئے۔ یہ نہ کہ معلوم۔

س۔ میں اس سے بری ہوں۔
م۔ میرے بدن پر ضربات کے نشانات ہیں۔
س۔ ایسا ہی ہوگا۔
م۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ تمہاری حرکت ہے۔
س۔ یہ ناممکن نہیں۔
م۔ میں تمہارے خلاف سمن جاری کرواؤں گا۔
س۔ مجھے اس کا علم نہیں۔
م۔ اور تم ماخوذ ہو جاؤ گے۔
س۔ ایسا تو ہوگا ہی۔
م۔ اچھا دیکھو تو (چلا جاتا ہے)

سنارل (تنہا)

اب کیا ہوگا؟ ان بیوانوں سے تو کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ مجھ جیسا بدبخت انسان بھی کوئی نہ ہوگا۔ میں اب تک بدستور پریشان ہوں۔ آہ یہ گنوار عورتیں آ رہی ہیں۔ شاید ان سے کچھ پتہ چلے۔

(دو جپسی عورتیں ناچتی اور گاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

س۔ یہ کتنی خوش ہیں۔ کیوں۔ تم مجھے کچھ میری قسمت کے بتا سکتی ہو۔

ت۔ جناب ہم دونوں بتائیں گے۔

ت۔ ہمیں اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ اور چاندی کا کچھ بتائیں گے؟

اور چاندی۔

نمبر۲۔ تمہیں ایک خوبصورت بیوی ملے گی۔
نمبر۱۔ ایسی بیوی جسے ہر ایک چاہے گا۔
نمبر۲۔ وہ بیوی جو تمہارے بہت سے دوست بنائیگی۔
نمبر۱۔ وہ بیوی جو تمہارے گھر بہت کچھ لائیگی۔
نمبر۲۔ وہ بیوی جو بہت نامور ہوگی۔
نمبر۱۔ وہ بیوی جو تمہاری ہر جگہ عزت کرائے گی۔
س۔ یہ ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ۔ کسی طرح کا خطرہ تو نہیں۔
نمبر۱۔ خطرہ!
س۔ ہاں۔
نمبر۲۔ خطرہ!
س۔ ہاں۔ کسی طرح کے فریب کا تو احتمال نہیں (وہ ناچتی اور گاتی ہیں) یہ کیا لغویت ہے۔ یہ کوئی جواب نہیں۔ جلدی کرو۔ مجھے بتاؤ۔ کہ میری بیوی مجھے کوئی فریب تو نہیں دیگی۔
نمبر۲۔ تمہیں؟
س۔ ہاں۔ مجھے۔

(گاتی ہوئی چلی جاتی ہیں)

سنارل (تنہا)

پس اب کوئی طریقہ اس کے سوا نہیں رہا کہ میں منجم سے جا کر پوچھوں۔ اب اُس کے پاس جاؤں گا۔

ڈورمین (الائرکا سٹ)

سنارل (پس پردہ)

ل۔ کیوں پیاری ڈورمین تمہاری سچ مچ یہی مرضی ہے۔
ڈ۔ بالکل۔
ل۔ تم ضرور شادی کرو گی۔
ڈ۔ ضرور۔

ل۔ اور تمہاری برات شام کو آنیوالی ہے۔
ڈ۔ آج شام کو۔
ل۔ مگر ظالم عورت کیا تم میری محبت اور اپنے وعدوں کو بھول چکی ہو؟
ڈ۔ نہیں تو مجھے اب بھی تم سے وہی اُلفت ہے۔ اور یہ شادی اس میں حارج نہیں ہوسکتی۔ میں اس آدمی سے محبت کی وجہ سے شادی نہیں کر رہی۔ میں غریب ہوں۔ تم بھی غریب ہو۔ اور دولت کسی نہ کسی طرح سے پیدا کرنی چاہئیے۔ جب موقعہ مل رہا ہے۔ تو اس سے کیوں فائدہ نہ اُٹھایا جاوے اس بوڑھے کھوسٹ سے عنقریب نجات مل جائے گی۔ کیونکہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے (سنارل کو دیکھ کر) اخاہ پیارے ہم تمہارے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اور تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔
ل۔ کیا یہی صاحب ہیں؟
ڈ۔ ہاں یہی صاحب ہیں۔ جو مجھ سے شادی کرنیوالے ہیں۔
ل۔ صاحب میری مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسی عورت سے شادی کرنیوالے ہیں۔

سنارل (تنہا)

تو اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مجھے اس رشتہ سے گلو خلاصی کرانی ہوگی۔ گو میرا کافی روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کوشش کرنی ہوگی کہ رشتہ منقطع ہو جائے۔

(ایلکانسٹر کے دروازہ پہ جا کر کھٹکھٹاتا ہے)

ا۔ آؤ۔ خوش آمدید۔
س۔ جناب میں۔
ا۔ کیا تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو
س۔ ہاں۔ جناب۔
ا۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟
س۔ مسٹر ایلکانسٹر یہ صحیح ہے کہ میں نے آپ سے آپ کی لڑکی کے لئے درخواست کی تھی۔ جو آپ نے منظور بھی کرلی تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری عمر زیادہ ہے۔ اس لئے رشتہ غیر موزوں ہوگا۔
ا۔ میری لڑکی تمہیں بہت پسند کرتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔
س۔ میرا مزاج بہت غیر مستقل ہے۔ جو آپ کی لڑکی کیلئے تکلیف دہ ہوگا۔
ا۔ میری لڑکی مرنجان مرنج ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اچھی طرح بسر کرے گی۔
س۔ میں جسمانی لحاظ سے بھی کمزور ہوں۔
ا۔ کوئی حرج نہیں۔ شریف بیوی خاوند کا ہر حالت میں ساتھ دیتی ہے۔
س۔ تو پھر مجھے صاف طور پر کہنا پڑے گا۔ کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔
ا۔ یقیناً تم مذاق کر رہے ہو۔ میں اپنا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا۔
س۔ آپ تو وعدہ کو نہیں توڑ رہے ....
ا۔ کبھی نہیں۔ چونکہ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لئے تمہارا حق سب سے افضل سمجھتا ہوں۔
س۔ (ایک طرف) ارے کمبخت۔
ا۔ دیکھو میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے۔ اور اب اگر مجھ سے شہزادہ بھی درخواست کرے۔ تو میں تمہیں ترجیح دوں گا۔
س۔ میں آپ کی عزت افزائی کا ممنون ہوں۔ مگر میں

یہ شادی نہیں کرسکتا۔
ا۔ شادی نہیں کرسکتے؟
س۔ نہیں۔
ا۔ مگر کیوں نہیں؟
س۔ کیوں؟ کیونکہ میں اپنے آپ کو شادی کا اہل نہیں سمجھتا اور دوسرے میں اپنے باپ اور دوسرے بزرگوں کی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ جنھوں نے شادی نہیں کی تھی۔
ا۔ خیر یہ ہر ایک کا اپنا مذاق ہے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ چونکہ تم اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کررہے ہو۔ اس لئے میں دیکھتا ہوں کہ اس کے متعلق کیا کیا جاسکتا ہے؛ میں ابھی آتا ہوں۔

سنارل (تنہا)

اب راہ راست پر آرہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بہت تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔ میں وہ قدم اُٹھانے والا تھا۔ جو بہت مضر ثابت ہوتا۔ اب اُس کا بیٹا آرہا ہے۔ شاید کوئی جواب لایا ہے۔ ایلیڈاس! (نہایت نرمی سے) جناب آپ کا خادم۔
س۔ جناب میں خود آپ کا خادم ہوں۔
ایل۔ میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ رشتہ واپس لینا چاہتے ہیں۔
س۔ ہاں جناب مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر......
ایل۔ اوہ! اس میں کوئی حرج نہیں۔
س۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میری خواہش......
ایل۔ خیر اسے جانے دیجئے۔ یہ لیجئے (سنارل کو دو تلواریں دیتا ہے) ان میں سے ایک لے لیجئے۔
س۔ ان میں سے ایک تلوار؟
ایل۔ ہاں۔ بشرطیکہ آپ پسند کریں۔
س۔ کس لئے؟
ایل۔ جناب چونکہ آپ میری بہن سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے یہ کرنا ہوگا۔
س۔ یہ کیا؟
ایل۔ دوسرے لوگ آپ سے بے طرح لڑتے۔ مگر ہم سب کام باقاعدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آیئے ایک دوسرے کا گلا کاٹیں۔
س۔ یہ بہت بُرا ہے۔
ایل۔ مگر آپ کو کرنا ہوگا۔
س۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ مگر میرا گلا کٹنے کے قابل نہیں (ایک طرف) دیکھئے۔ یہ ایک اور گدھے سے پالا پڑا ہے۔
ایل۔ مگر جناب یہ ہو کر رہے گا۔
س۔ نہیں صاحب مجھے یہ منظور نہیں۔
ایل۔ جلدی کیجئے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔
س۔ مگر میں یہ کام نہیں کرسکتا۔
ایل۔ تو آپ لڑینگے نہیں؟
س۔ نہیں بالکل نہیں۔
ایل۔ (بید سے سنارل کو پیٹتا ہے) آپ شکایت نہیں کرسکتے یہاں ہر ایک کام باقاعدہ ہوتا ہے۔ اگر آپ تلوار نہیں اُٹھاتے تو آپ کو پٹنا ہوگا۔
س۔ (ایک طرف) عجیب احمق سے پالا پڑا ہے۔
ایل۔ (دوبارہ تلوار دیتے ہوئے) آیئے مردانگی کا ثبوت دیجئے پیشتر اس کے کہ میں آپ کے کان کھینچوں۔

س۔ کیا؟ تم نے واقعی تہیہ کر لیا ہے؟

ایل۔ جناب میں کسی کو مجبور نہیں کرتا یا آپ کو شادی کرنی ہوگی اور یا تلوار چلانی پڑے گی۔

س۔ جناب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا غلام دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

ایل۔ واقعی؟

س۔ واقعی!

ایل۔ معاف فرمائیں ..... (دوبارہ پیٹتے ہوئے)

س۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔

ایل۔ جناب میں آپ سے یہ سلوک کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو یونہی پیٹتا چلا جاؤں گا۔ حتیٰ کہ آپ شادی کرنے پر رضامند ہو جائیں۔

س۔ تو میں شادی کرنے کیلئے تیار ہوں۔ میں ضرور شادی کروں گا۔

ایل۔ میں یہ دیکھکر بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ کے حواس کا اختلال درست ہوگیا ہے۔ یقین جانیئے میرے دلمیں آپکی بہت عزت ہے۔ آپ ذرا انتظار کریں۔ میں باپ کو بلاتا ہوں۔

(باہر جاکر باپ کو بلاتا ہے)

ایل۔ اباجان۔ یہ صاحب اب شادی کرنے پر رضامند ہیں وہ یہ تہیہ کر چکے ہیں۔

ایلکانسٹر۔ جناب یہ لیجئے۔ اس کا ہاتھ۔ اب یہ آپ کی ملکیت ہے۔ اور میں کس بلا سے نجات پا چکا ہوں۔ آیئے نغمۂ شادی گائیں۔

(گانا)

نسیم رضوانی

چند دن پشاور میں

عبرت و بصیرت کے چند لمحات

سنتے ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتۂ رحمت ہوتا ہے جو اُس کے لئے اسباب خیر فراہم کرتا رہتا ہے۔ اور ایک فرشتۂ شر (شیطان) ہوتا ہے جو انسان کو تباہیوں کی طرف دعوت دیتا رہتا ہے۔ مجھے خیر، اپنے اس دوسرے محترم رفیق کا تو علم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ اور کہاں نہیں؟ لیکن اپنے ایک اول الذکر فرشتہ کا حال ضرور معلوم ہے جو ڈیرہ اسماعیل خاں میں رہتا ہے اور جس کا نام اخوند فیض محمد ہے۔ یوں تو میری اور اخوند صاحب کی قابل ذکر شناسائی اول اول اس وقت ہوئی تھی جب میں زمیندار کے اڈیٹوریل اسٹاف میں (غالباً سنہ) شامل تھا۔ لیکن حقیقی تعلق کی تاریخ اب سے نو سال قبل اجراء نگار کے وقت سے شروع ہوتی ہے، جب میں بھوپال میں تھا اور وہ اپنے وطن ڈیرہ اسماعیل خاں میں — پھر اس کو میری کشش صادق کہیے یا انکا شوق فراواں کہ یہ بُعد مکانی بھی ایک بار مسٹ کر رہا۔ اور اُنھوں نے ازراہِ کرم بھوپال تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور آخر کار یہ فرشتہ بالکل اسی طرح میرے سامنے مجسم آگیا جس طرح بلا تشبیہ دحیۂ کلبی کی صورت میں رسول کو نظر آیا تھا۔

شروع سے اس وقت تک جناب اخوند صاحب نگار اور اُس کے مقاصد کے ساتھ جسقدر دلچسپی لے رہے ہیں اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن مختصراً اس قدر بیان ضروری ہے کہ صوبۂ سرحد میں نگار کی مقبولیت انھیں کی ممنون کرم ہے اور انھیں کے لطف و خلوص نے اس کا ایک وسیع حلقہ وہاں کے ارباب علم و ادب اور اصحاب جاہ و ثروت میں پیدا کیا۔ رہا یہ امر کہ وہ اسقدر

؎ اخوند صاحب کے اسلاف کا وطن صوبۂ قندھار ہے اور آپ کے جد اعظم اخوند فضل علی فاروقی وہاں قاضی القضاۃ اور شاہزادگان کے معلم و اتالیق تھے۔ لیکن بعد کو سیاسی حالات کے بناء پر قندھار چھوڑنا پڑا اور نواب شیر محمد خاں فرمانروائے ڈیرہ اسماعیل خاں نے انکو وزارت کا عہدہ تفویض کیا۔ بعد کو جب ڈیرہ اسماعیل خاں پر برطانیہ کا تسلط ہوا تو یہ خاندان ریاست بھاولپور سے متوسل ہوگیا لیکن وطنی تعلقات وہیں رہے، چنانچہ ہمارے اخوند صاحب بھی ڈیرہ اسماعیل خاں میں رہتے ہیں اور خاندانی عظمت و وقار کو قائم رکھتے ہوئے۔ حد درجہ ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رافت و شفقت سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ اس کا سبب (اگر واقعی نگار اس قابل نہیں ہے کہ وہ کسی صاحب ذوق کو اپنا بنالے) سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خصوصیت کے ساتھ ویسے ہی بد ذوق واقع ہوئے ہیں جیسا میں اور میرا نگار۔

گزشتہ اگست میں غالباً اسی قسم کی کوئی علمی یا ادبی صحبت پشاور میں برپا تھی کہ اخوند صاحب نے پھر اپنی ''ملکوتیت'' سے کام لے کر میرا اور نگار کا ذکر شروع کر دیا اور مذہب کے باب میں میرے مقالات و خیالات پیش کرکے ایسی گرمی محفل پیدا کر دی کہ آغاز اکتوبر میں مجھ کو وہاں دعوت دئے جانے کی تجویز آخر کار طے کرنا پڑی۔ اکتوبر کی تعیین ایک تو اس لحاظ سے تھی کہ موسم خوشگوار ہوگا، دوسرے اس سبب سے کہ اگست میں وہاں کی سیاسی فضا بھی اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنیکی اجازت نہ دے سکتی تھی۔

مجھ کو اطلاع اُس وقت ملی جب میں ستمبر میں کشمیر جانے کے لئے اپنا پروگرام مرتب کر چکا تھا، اور یہ ممکن نہ تھا کہ میں ستمبر میں کشمیر رہوں اور اکتوبر میں پشاور۔ کیونکہ اتنا طویل زمانہ اپنے مستقر سے باہر رہ کر بسر کرنا کاروبار کے انتظامی حالات کے لحاظ سے محال تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ آیا ''سیہ چشمان کشمیری'' زیادہ قابل ترجیح چیز ہیں یا کلہ بوشان افغانی''۔ لیکن چونکہ کشمیر کی سیاحت اس سے قبل کر چکا تھا، اس لئے مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ اور میں نے اطلاع دیدی کہ

کیست آں جانے تا بد سر ز فرمان شما

لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں کے سیاسی کوائف درست نہ تھے۔ اور اس لئے معناً میرا یہ سفر منحصر تھا۔ اس توقع پر کہ اکتوبر تک وہاں کے حالات اعتدال پذیر ہو جائیں گے۔ گو کسی قدر میں اس فلسفۂ اعتدال کے خلاف تھا۔ تاہم قضیۂ بر سر زمین ''طے کرنیوالوں کے مصالح کے خلاف میں کیا کہہ سکتا تھا۔

آخر کار شروع اکتوبر تک میرے امن پسند دوستوں کے نقطۂ نظر سے وہاں امن ہو گیا اور تار کے ذریعہ سے اِدھر اُدھر دعوت کے توثیق و قبول کا مرحلہ طے ہو کر میں ۱۶ اکتوبر کو یہاں سے روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ بھی قدرت کی عجیب کارفرمائی تھی کہ ایک ہفتہ قبل جب مجھے تار بھیجا گیا تو وہاں کامل امن و سکون تھا۔ لیکن میرے پہونچتے پہونچتے دفعتاً صورت حالات بالکل بدل گئی اور پہلے سے بہت زیادہ خطرات کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ پہلا شگون نیک تھا جس کا کچھ علم تو پہلے ہی اخبارات کے ذریعہ سے ہو گیا تھا اور پوری طرح اُس وقت جب میں ۱۷ کی رات کو دس بجے پشاور چھاؤنی اسٹیشن پر پہونچا اور سب سے پہلے پلیٹ فارم پر رسم خیر مقدم ادا کرنیکے بعد یہی خبر مجھکو سنائی گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر سے جو مسرت مجھے حاصل ہوئی اُس کے چھپانے میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ میں احباب کے اُس اظہار تاسف کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ نہ ہو سکا، اور اس لئے ممکن ہے کہ اُنھوں نے میری بے حسی کا کچھ اندازہ کر لیا ہو۔

ہر چند گاڑی رات کو کچھ نا وقت پہونچی، لیکن جناب سردار احمد خاں صاحب سول جج پشاور جناب خان بہادر رسالدار مغل باز خاں صاحب (جو پہلے چیف کمشنر صوبۂ سرحد کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور اب قبائلی سیاسیات کے مدیر و مہتمم ہیں) جناب رائے بہادر لالہ دینا ناتھ صاحب گیریزن انجینئر، جناب دیوان شیو چرن لال صاحب افسر خزانہ اور جناب اخوند فیض صاحب نے (جو محض میری وجہ سے تقریباً ایک ہفتہ قبل یہاں تشریف لے آئے تھے) اسٹیشن پر میری پذیرائی کی زحمت گوارا فرمائی اور اس طرح میں اس نئی سرزمین کے نئے انسانوں کی پرخلوص معیت میں جناب سردار احمد خاں صاحب کے بنگلہ پر پہونچا، جہاں میرا قیام تجویز کیا گیا تھا۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی نئی جگہ پہونچنے سے قبل وہاں کی جغرافی، تمدنی و عمرانی حالت کا نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیتا ہے، اور پھر وہاں پہونچنے کے بعد اپنے قیاسات کو حقیقتوں سے موازنہ کرکے دیکھتا ہے کہ اس کے تصور نے کتنی غلطیاں کی تھیں، پھر اکثر و بیشتر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قائم کئے ہوئے نقوش ایک ایک کرکے سب محو کر دینے پڑتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے نقوش کو دینی پڑتی ہے جو کہ توقع کے لحاظ سے کبھی کم اور کبھی زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ کو ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس حیثیت سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا قصہ مختصر یہ کہ پشاور کو میں نے ویسا ہی پایا جیسا سمجھ چکا تھا اور بہت کم اپنی پیش بینیوں میں مجھے اصلاح کرنا پڑی۔

پشاور اور صوبۂ پشاور کے ساتھ میری دلچسپی نہ وہاں کی آبادی سے متعلق تھی جو حکومت برطانیہ کے زیر اثر اپنی تمام آزادانہ خصوصیات کو عرصہ ہوا محو کر چکی ہے، اور نہ وہاں کی خوش گوار آب و ہوا سے کہ اس لحاظ سے بہتر مقامات میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بلکہ وہ متعلق تھی صرف اس خیال سے کہ اس کے جوار میں کچھ قومیں اب بھی ایسی آباد ہیں جو صحیح معنے میں آزادی کی لذت سے آشنا ہیں۔ اور جو باوصف حد درجہ بے سروسامانی کے، علم و حکمت کی تمام ہلاکت باریوں اور خارا شگافیوں کا مقابلہ کرنے میں کبھی اپنے آپ کو درماندہ و عاجز نہیں پاتیں۔ پھر اسی کے ساتھ یہ خیال کہ پشاور آخری حد ہے حکومت برطانیہ کے فیوض و برکات کی اور اس کے بعد ہی دنیا کا وہ مشہور ترین درۂ خیبر شروع ہو جاتا ہے جو تاریخ نوع انسانی سے لیکر اس وقت تک بے شمار واقعات انقلاب و حوادث اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، بہت زیادہ معاون تھا میرے شوق کی فراوانی میں جو اس وقت تک بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا تھا۔

پشاور و حدود پشاور فی الحقیقت نام ہے اس وسیع وادی کا جو ہمالیہ کے دامن میں کسی وقت بحر آسا جھیل کی صورت رکھتی تھی۔ لیکن اب بقول غالب "بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا" اُس نے خشک ہو کر اپنے بیابان میں ایک وقت غیر معلوم سے اس انسانی آبادی کو جگہ دے رکھی ہے۔ جسے اگر صوبۂ سرحد کا قلب و دماغ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہیں صوبہ کے فرمانروا کا نشیمن ہے۔ اور اسی مقام سے صوبہ کے اکثر وہ افراد متعلق ہیں جو دولت و امارت، جاہ و ثروت یا تعلیم و سیاست کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر چند میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اگر کسی وقت ہندوستان کے دوسرے

صوبوں کی طرح اس صوبہ کو بھی نظم و نسق کے خود مختارانہ اختیارات تفویض کئے گئے، تو اس کا امتیاز اس صوبہ کی آبادی کے کس جذبہ کو دیا جائے گا۔ آیا وہ جو موجودہ حالات سیاست کے ماتحت وہاں کے علمبرداران حریت اور اپنی جانوں کی قربانیاں کرنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوا ہے۔ یا وہ جو حد درجہ امن و سکون کے ساتھ سر عبدالقیوم خاں کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے "دیار محبوب" کی طرف لے گیا ہے۔

صوبۂ سرحد کے تقریباً تمام اضلاع کو ہمالیہ اپنے نیم قوسی دائرہ کی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اور اس لئے اس صوبہ کی سیاسیات اُن آزاد قبائل کی وجہ سے جو ہندوستان اور کابل کے درمیان ان پہاڑوں کے غاروں اور دروں میں آباد ہیں۔ زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ اور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اندرون ملک میں حکومت کا واسطہ ایکطرف ان تعلیم یافتہ، متمدن و مہذب لوگوں سے ہے جو اپنے جذبات کے اظہار میں صرف زبان و قلم کو جنبش میں لاسکتے ہیں۔ اور دوسری طرف تعلق اُن جاہلوں اور وحشیوں سے ہے۔ جنھوں نے تمام آئینِ انسانیت میں سے صرف ایک یہ اُصول اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے کہ شاید آزادی کے لئے جان دینا اولین نذر ہے جو انسان کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے۔ یعنی اگر ایک طرف وہ جماعت ہے جو اپنے عرض حال کے لئے

ما ئیم و سرشکے کہ چکیدن نہ تواند،

سے زیادہ کوئی اور تعبیر و تفسیر نہیں رکھتی تو دوسری طرف وہ گروہ ہے جس کے جنون کو

دستے کہ بجز جامہ دریدن نہ شناسد

کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر اگر ان دونوں کے فرق و امتیاز کو دیکھنا ہے تو سرحد جائے اور اس حزم و احتیاط، اس نظم و اہتمام کو دیکھئے جو برطانیہ الیسی عظیم المرتبت حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ میدانوں میں، دروں میں، پہاڑوں پہ، سڑکیں ہیں، ریلیں ہیں، فوجیں ہیں، توپ خانے ہیں، ہوائی جہاز ہیں، پھٹنے والے بم ہیں، خاردار تاروں کے حصار ہیں، نعائم و لذائذ کے انبار ہیں، اور ہر وہ چیز ہے، جو اس دور علم و حکمت میں قدرت کے سامنے چیلنج کے طور پر پیش کیجا سکتی ہے؟ اور کس کے مقابلہ میں؟ ان چند ہزار وحشی و خانمان برباد نفوس کے مقابلہ میں، جن کی زندگیاں ناہموار غاروں میں، پتھروں کی چٹانوں پر بسر ہو گئی ہیں، جو برفباری کی صعوبتوں، گرمی کے شدائد کا مقابلہ صرف اپنے جسم کی عریانی سے کرتے ہیں، جو علم و حکمت کی ترقیوں سے بالکل بیخبر ہیں۔ اور جن کا آزوقۂ جنگ سوائے اُن دو خشک روٹیوں یا چند مٹھی آٹے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جسے اُن کی مائیں، بہنیں اور بیویاں آخری ہدیۂ محبت کی صورت میں اُن کی جھولی میں ڈال کر خدا کے سپرد کر دیتی ہیں۔

جس وقت میں وہاں پہونچا تو حکومت اور آفریدی جماعت کے درمیان کشیدگی پیدا ہو چکی تھی، جرگوں کی طلبیاں ہو رہی تھیں اور جمرود میں دونوں فریق کے نمایندوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ نزاع یہ تھی کہ برطانیہ کی فوجیں کھجوری میدان

تک بڑھ گئی تھیں۔ جو قبائلی علاقہ میں شامل ہے اور آفریدی جماعت اس مداخلت کے خلاف برہم تھی۔ اِس طرف سے اس اقدام و مداخلت کا سبب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ چونکہ انھوں نے گزشتہ اگست میں پشاور تک اپنی تاخت کو بڑھا دیا تھا۔ اس لئے آئندہ کے لئے پشاور کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے فوجوں کو آگے بڑھا دینا اور کھجوری میدان پر قبضہ کر لینا ضروری ہے۔ اس کا جواب آفریدیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ حکومت نے سیاسی مظاہرات پر جو سلوک اہل پشاور کے ساتھ کیا تھا اُس کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم ان کے ساتھ ہمدردی کرتے، اُن کا حال دریافت کرتے اور اگر اس سلسلہ میں بعض غیر ذمہ دار نوجوانوں کی طرف سے حملہ یا تاخت کی صورت پیدا ہو گئی تو اس کا ذمہ دار تمام قبیلہ یا جماعت کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رہا یہ امر کہ آئندہ کیلئے امن و سکون کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے تو اس کے لئے ہمارا وہ مطالبہ موجود ہے جو لاکھوں کی تعداد میں حکومت کی طرف سے سڑکوں کے معاوضہ میں دیا جاتا ہے اور جس کو عہد شکنی کی صورت میں ہر وقت ضبط کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب سی وقت ممکن ہے اور گفتگوئے مصالحت اس شرط سے ہو سکتی ہے کہ پہلے اُن فوجوں کو ہٹا لیا جائے جو کھجوری میدان میں آکر ہمارے حصۂ زمین پر قابض ہو گئی ہیں۔

آفریدیوں کے نمایندوں سے حکومت کا پولیٹکل اسٹاف جس میں ہمارے محترم دوست خان بہادر رسالدار مغل باز خاں درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے تھے، مصروفِ گفتگو تھا، اور ہمارے رسالدار صاحب[۵۱] جو قدرت کی طرف سے نہایت سوچنے والا، فلسفیانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر رہے تھے کہ آفریدی جماعت اپنا سر اُس قوت سے نہ ٹکرائے جو اُن کے مقابلہ میں ایک کوہِ گراں کی حیثیت رکھتی ہے، چیف کمشنر، وائسرائے اور وزیر ہند کے درمیان لاسلکی رابطۂ گفتگو ہر وقت جاری تھا، فوجیں اپنی طیاریوں میں مصروف تھیں۔ شہر کی آبادی نتیجہ کی منتظر تھی، اور ہر زبان روز ایک نئی پیشین گوئی بیان کر رہی تھی کہ صورتیں بن بن کر بگڑیں، فضا صاف ہو ہو کر ابر آلود ہوئی اور آخر کار آفریدیوں کی جاہل و وحشی قوم نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا کہ:-

> "اگر اتنی زبردست سلطنت کا ہم ایسے خستہ جانوروں کے مقابلہ میں آنا باعث ننگ نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس چیلنج کو اپنے لئے باعثِ فخر نہ سمجھیں۔ کیونکہ قوت کی طرف سے ترکِ رواداری گویا ضعیف کو دعوت قربانی دیدینا ہے۔ پھر جب خانماں بربادی یقینی ہے اور جان دینا اٹل، تو پس و پیش کیسا؟ اسلئے آپ کھجوری میدان پر شوق سے قبضہ کر لیجئے لیکن کم از کم یہ حق ہمیں ضرور حاصل ہونا چاہیئے کہ سپرد کرنے سے قبل ایک بار ہمکو اسکو اپنے سیلابِ خون سے رنگین بنا کر ہمیشہ کے لئے خیر باد کہیں۔"

پشاور سے تقریباً ۶ میل جانب مغرب و جنوب حکومتِ ہند کے حدود ختم ہو کر قبائل کی سرزمین شروع ہو جاتی ہے

---

[۵۱] رسالدار صاحب موصوف خود بھی آفریدی ہیں۔ اور بڑا زبردست اثر اس جماعت پر رکھتے ہیں۔

جسے دس میل سے لیکر بیس میل تک کا وسیع و ہموار حصہ وادی سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور وہ پیچ در پیچ بلندیاں نظر آتی ہیں، جن کے اندر ایبٹ آباد سے لے کر ڈیرہ اسماعیل خاں تک ایک نیم دائرہ کی صورت میں اقوام سوات و بنیر، مہمند، آفریدی، اورک زئی، وزیری اور محسود آباد ہیں اور جن میں کسی نہ کسی ایک قوم کا صوبہ سرحد کی حکومت سے برسر پرخاش رہنا ضروری ہے۔ کھجوری میدان اس سے قبل حقیقتاً آفریدیوں کے قبضہ میں تھا، اور اس کو زیادہ تر چراگاہ کی صورت سے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ آفریدی قوم ایک ہجرت کرنوالی قوم ہے جو برفباری کے زمانہ میں پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان میں آجاتی ہے اور پشاور و حدود پشاور میں مزدوری کرکے زندگی بسر کرتی ہے، اس لئے وہ کھجوری میدان کو اپنی سرمائی قیام گاہ بھی سمجھتے ہیں۔ اور کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ کہ اس کو برطانیہ کے فوجی قبضہ میں دیدیں۔ الغرض میرے سامنے ہی جرگے ختم ہو گئے۔ اور حکومت برطانیہ کی طرف سے اُن کو چند گھنٹوں کا نوٹس دیدیا گیا کہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو محفوظ مقامات میں لیجائیں ورنہ ہوائی جہازوں کی تاخت سے اُن کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ اس کے بعد وہ تیراہ چلے گئے جو خاص انکا مرکز ہے اور ہر چند اس کے بعد کبھی کبھی رات کو توپوں اور بندوقوں کی آوازیں دونوں فریق کے درمیان گفتگوئے مصالحت کے انقطاع سے مجھے خبردار کرتی رہیں لیکن کوئی قابل ذکر مقابلہ یا تصادم نہیں ہوا، گو پشاور میں روزانہ عجیب غریب مبالغہ آمیز خبریں مشہور ہوتی تھیں، جو فوجوں کی نقل و حرکت اور حفاظت پشاور کے انتظامات کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کے نزدیک قابل یقین بھی ہوتی تھیں۔

آفریدی قوم اس وقت تقریباً ۶۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں کم از کم ۴۰ ہزار ایسے افراد ہیں جو پوری عسکری قوت کے ساتھ میدان میں آسکتے ہیں۔ رائفلوں اور کارتوسوں کی ان کے پاس کمی نہیں۔ قدر اندازی انکا فطری جوہر ہے جسے ہر آفریدی بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے، جان لینا اور دیدینا اُن کے نزدیک ایسا ہی فطری تقاضہ ہے جیسے مطالعۂ کتاب کے وقت اس کے اوراق اُلٹتے رہنا۔ قوت جسمانی کے لحاظ سے وہ صحیح معنے میں ہرقلس کی اولاد ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور چٹانوں پر وہ اس طرح آسانی کے ساتھ دوڑتے پھرتے ہیں گویا نشیب فراز کا کوئی مفہوم ہی انکے یہاں نہیں ہے، جنگ کے دوران میں وہ اکثر شبخونوں سے کام لیتے ہیں، اور جس وقت دست بدست لڑائی ہوتی ہے تو خود اپنے سینہ کے اندر فریق ثانی کی سنگینوں کو تیرا کر خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور اُس کو بھی ہلاک کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم ان صفات و خصوصیات کی چاروں طرف دروں، پہاڑوں، خندقوں اور غاروں میں پھیلی ہوگی تو اس کی مخالفت کس درجہ امن شکن ثابت ہوگی، اور ایک ایسی سلطنت کو جو صلح و جنگ دونوں حالتوں میں ایک خاص اسلوب و آئین کی پابند ہے کس قدر گھبرانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ شخص جو پشاور سے لنڈی خانہ تک گیا ہو دیکھ سکتا ہے کہ درۂ خیبر کے استحکامات کتنے زبردست ہیں اور صرف ۲۷ میل تک ریل لیجانے میں جو ۳۲ سرنگوں میں سے گزر کر گئی ہے چودہ کروڑ روپیہ صرف کردینا کوئی بے معنی بات نہیں ہو سکتی۔ جگہ جگہ پہاڑوں پر قلعوں کے استحکامات ریل کے ساتھ ساتھ سڑک کی تعمیر جو

ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی ہمالیہ کی بلندی پر چلی گئی ہے، بلند چوٹیوں تک فوجوں کے لئے بجلی کی روشنی اور آبرسانی کا وافر انتظام، درۂ خیبر کے دونوں طرف مسلح خاصہ داروں کا قیام[۱]، جگہ جگہ بلندیوں پر اوٹ پوسٹ اور تمام استحکامات کا باہمدگر لاسلکی سے مربوط ہونا، یہ وہ تمام مناظر ہیں جس سے اگر ایک طرف برطانیہ قوم کی حزم واحتیاط، خوبی نظم واہتمام پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف درۂ خیبر کی اہمیت وعظمت بھی سامنے آجاتی ہے کہ باوجود ان تمام احتیاطوں اور پیش بینیوں کے اب بھی قبائل کے لئے سینکڑوں ہزاروں مواقع اس کے اندر ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر وہ تمام ترقی یافتہ آلات حرب سے آراستہ ہوں تو حکومت کے یہ تمام استحکامات نسیج عنکبوت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان درۂ خیبر دیکھنے کے بعد ہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ جس قوم کے پاس یہ قدرتی ذریعۂ دفاع موجود ہو اور جو حکومت اس پر اقتدار کامل حاصل کرلے وہ نصف ایشیا کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

یہی وہ درہ ہے جس سے عہد قبل تاریخ میں قدیم آریہ قوم وسط ایشیا سے ہندوستان آئی، یہی وہ مقام مرور ہے جس سے اسکندر کی فوجیں گزر کر ٹکسیلا تک آئیں، یہی وہ تاریخ عالم کا اہم ترین راستہ ہے جس نے تیمور، بابر، محمود، اور تمام سلاطین غزنانہ وافاغنہ کی فوجوں کو اپنی آغوش میں جگہ دی۔ تاریخ ماضی کے اوراق ایک ایک کرکے میری نگاہوں کے سامنے آرہے تھے، درۂ خیبر کی ایک ایک چٹان زبان حال سے افسانۂ ماضی دہرا رہی تھی، اور جمرود کے وسیع میدان کا ایک ایک ذرہ بتا رہا تھا کہ یہی وہ وادی ہے جہاں اس سے قبل ملک ملک قدیم کی فوجیں درہ کی صعوبتوں سے گزرنے کے بعد راحت کو اپنی خستگی دور کیا کرتی تھیں۔

میں اسی خیال میں مستغرق تھا کہ سامنے کابل کا ایک قافلہ نظر آیا، جو وہاں کی مختلف قسم کی پیداوار اونٹوں اور خچروں پر لادے ہوئے اسی وادی جمرود سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ اس سنگلاخ درہ کو پیادہ پا طے کرکے آرہے تھے، لیکن نہ چہروں پر اضمحلال تھا، نہ اعضاء پر خستگی کا نشان۔ حسین وجمیل عورتیں جن میں بعض بہت نازک تھیں، اسی استواری قدم کے ساتھ چل رہی تھیں جو ہمارے یہاں مردوں کا بھی حصہ نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے جو گرد آلود پھولوں کی طرح نظر آرہے تھے اس طرح گزر رہے تھے گویا وہ ابھی ابھی کھیلنے کو باہر نکلے ہیں۔ میں نے ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھا جو بہت ہی نازک تھی اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہ زیادہ خستہ ہوچکی ہے، لیکن اس کے چہرہ کی شگفتگی نہ رہی تھی کہ اگر وہ خستہ ہے تو بھی اس خستگی سے مسرور ہے۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو ایک آزاد قوم کے فلاکت زدہ افراد میں بھی پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد آب وہوا میں خشک نان جویں سے پیدا ہونے والا ایک قطرۂ خون کہیں زیادہ قیمتی واہم ہے تولید دم کی اس زیادتی سے

---

[۱] خاصہ دار اس بے ضابطہ آفریدی فوج کا نام ہے جو حکومت کی مشاہرہ یاب ہے اور جس کے سپرد درہ کی حفاظت ہے خاصہ داروں کے علاوہ آفریدی جماعت کے متعدد سردار وخوانین بھی حکومت کی طرف سے معقول مشاہرہ پاتے ہیں جنکو ملک کہتے ہیں اور یہی لوگ انکی نمائندوں کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہیں۔

جس کے لئے غلاموں کے فربہ جسم میں ہر سال نشتر فصاد چبھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قافلہ جمرود کی کاروانسرائے پر رات کو قیام کرے گا، اور صبح کو پشاور میں اپنا مال فروخت کرکے پھر واپس آجائے گا۔ خدا جانے کتنی قومیں اس سنگستان کی ایسی ہیں جو وقت نامعلوم سے اسی طرح مرتحل زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور جن کی حیات عبارت ہے اُس رات سے جس میں وہ تھک کر چٹائیوں پر یا فرش زمین پر بیہوش ہو جاتے ہیں۔ یا اُس دن سے جس کا مفہوم اُن کے یہاں "بر بندید محملہا" سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، علم و حکمت، دولت و امارت کتنا ہی سامان آسائش و تن پروری کا کیوں نہ فراہم کرلے لیکن روح جس کے لئے تڑپ سکتی ہے وہ یہی وحشت ہے، جو فطرت کی سادہ لیکن پُر از آب و رنگ آغوش میں حقیقی درس حریتِ آزادی کا دیتی ہے۔

چونکہ گفتگوئے صلح کے انقطاع کے بعد ہر وقت آفریدیوں کے تاخت کا امکان تھا اور وہ سڑکیں جوان کے علاقوں سے ہو کر گزرتی ہیں خطرناک ہوگئی تھیں، اس لئے پشاور سے کوہاٹ جانیوالی سڑک زیادہ مخدوش ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہ سڑک خاص اُس درہ سے ہو کر گزرتی ہے جو تیراہ سے قریب تر ہے اور جس پر امن شکنی کے زیادہ امکانات تھے اس لئے میزبانِ عزیز جناب سردار احمد خاں صاحب متامّل تھے کہ میں اُس سڑک سے گزروں، لیکن جب اُنھوں نے مجھے زیادہ بیتاب پایا تو درہ کے ایک آفریدی ملک کو طلب کرکے مجھے ان کے سپرد کیا اور اُنھوں نے ایک غیر یقینی وعدہ (کیونکہ جو وعدہ انشاءاللہ کے ساتھ شروع ہو وہ ہمیشہ غیر یقینی ہوتا ہے) مجھے صحیح و سلامت واپس لانے کا کرکے مجھے اپنے ساتھ موٹر پر لے لیا، جناب اخوند فیض محمد صاحب فاروقی بھی میرے ساتھ تھے۔ ہر چند ملک صاحب کی معیت جو اپنے علاقہ تک سڑک اور درہ کی حفاظت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں اور جن کے پاس ہر وقت ایک پستول معہ درجنوں کارتوسوں کے آتش فشانی کے لئے تیار رہتا ہے، کافی اطمینان بخش بات تھی، لیکن میرا اطمینان ان میں سے کسی چیز سے متعلق نہ تھا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت اطمینان یا امن و سکون کا سوال ہی میرے سامنے نہ تھا تو زیادہ موزوں ہوگا۔

پشاور سے چل کر ۵-۶ میل کے بعد حدود برطانیہ ختم ہوگئے اور اسی کے ساتھ وہ مناظر عسکری بھی اوجھل ہوگئے جو فوجی چوکیوں اور خیمہ زن فوجوں کی صورت میں سڑک پر اور میدانوں میں نظر آرہے تھے۔ اب میں ایک آزاد علاقہ میں تھا۔ اُس فضا میں تھا جو اس وقت تک غلامی کی سانس سے زہر آلود نہیں ہوئی تھی۔ میدان میں سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے، چراگاہیں تھیں، جابجا آفریدیوں کے گاؤں تھے، اُن کی حسین عورتیں تھیں، ان کے معصوم بچے تھے اور وہ خود تھے جن کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی ایک منٹ کے لئے کبھی ان سے جدا نہیں ہوتی۔ ان کی نگاہیں غور سے ہمیں دیکھتی تھیں لیکن ملک صاحب کو دیکھکر جو آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے مطمئن ہو جاتی تھیں۔ میدان ختم ہونیکے بعد وہ درہ شروع ہوا جس میں اس وقت تک خدا جانے کتنے واقعات قتل و خونریزی کے جذبہ انتقام فرو کرنے کے لئے ہو چکے ہیں اور ایک گھنٹہ کے

اندر ہم ملک صاحب کے گاؤں میں پہونچ گئے، جہاں صرف ایک انھیں کا مکان عمران و تمدن کا پتہ دینے والا تھا۔ ملک صاحب نے مجھے دکھایا کہ کس طرح یہاں ہر ہر گھر رائفل بنانے کا مستقل کارخانہ ہے، اور یہ کہ اُن کی تیار کی ہوئی رائفلیں کس قدر نفیس ہوتی ہیں۔ ایک تیار رائفل میرے سامنے لائی گئی تو میں دیکھکر حیران رہگیا اور کسی طرح باور کرنے کو جی نہ چاہتا تھا کہ یہ ولایتی نہیں ہے۔ درہ کوہاٹ کے سڑک پر جتنے گاؤں ہیں سب آفریدی علاقہ کے ہیں، اور ان سب میں رات دن سوائے رائفل سازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، کہیں نالیں بن رہی ہیں، کسی جگہ ان پر پالش ہو رہی ہے، کہیں اجکٹر (EJECTOR) تیار ہو رہا ہے، اور کسی جگہ کندے بن رہے ہیں، الغرض جس مکان کو جا کر دیکھئے، وہاں سوائے اس مشغلہ کے اور کچھ نہ پائیے گا اور ہر ہاتھ مظاہرہ شجاعت کی امداد میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصروف کار نظر آئے گا۔

اس گاؤں میں ایک مدرسہ بھی ہے جہاں اُردو کی تعلیم ہوتی ہے، ملک صاحب کے عزیزوں میں سے کسی کا ایک چھوٹا بچہ موجود تھا۔ میں نے کتاب منگوا کر اُس کا سبق سُنا اور اُسکی پشتو بولنے والی زبان سے اردو کے ٹوٹے ٹوٹے لفظ سُن کر عجیب لطف آیا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح پشاور سے لنڈی خانہ تک جوار کے گاؤں والوں کو اخلاقی طور پر ممنون کرنے کے لئے کسی سے ریل کا کرایہ آج کل نہیں لیا جاتا، اسی طرح یہاں کا مدرس بھی حکومت سے تنخواہ پاتا ہے، جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ حکومت ہند صلح و آشتی کا ہر ممکن طریقہ اس قوم کے ساتھ استعمال کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس قوم کی وحشت کا وہی عالم ہے اور اس کی آزادی کا کسی قیمت پر بھی خریدا جانا ممکن نہیں۔

ان کی عورتوں میں پردہ برائے نام ہے اور وہ نہایت آزادی سے باہر نکل کر اپنے کاموں میں مصروف دیکھی جاتی ہیں۔ ان کا لباس سیاہ دوپٹہ اور سیاہ شلوار ہے جو ان کی دیہقانی خاک آلود زندگی کے لحاظ سے غالباً زیادہ موزوں ہے، اور ممکن ہے اس انتخاب میں کوئی جمالیاتی پہلو بھی اُن کے رُخ و سفید رنگ کے لحاظ سے نہاں ہو۔

میرے پروگرام میں کوہاٹ، بنوں، اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا جانا بھی شامل تھا، لیکن کچھ تو سیاسی اضطراب کی وجہ سے احباب نے مخالفت کی اور کچھ اس وجہ سے کہ سردار محمد نواز خاں صاحب بھی یہیں خیبر ایجنسی میں رسالدار مغل باز خاں صاحب کی عیادت کے لئے طلب کر لئے گئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ کوہاٹ اور بنوں کی سیاحت بغیر ان کی موجودگی کے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ ہر چند مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ پروگرام کی اس تبدیلی سے میں نہ ملک خدا بخش صاحب گورنمنٹ پلیڈر ڈیرہ جات سے مل سکا اور نہ خاں صاحب نوابزادہ سردار اسد اللہ خاں صاحب رئیس کلاچی سے، اسی طرح نہ مولوی نور بخش صاحب بی اے وکیل ڈیرہ اسماعیل خاں کی زیارت ہو سکی اور نہ کوہاٹ کے دیگر احباب کی جن سے بہت قدیم غائبانہ تعارف مجھے حاصل ہے، لیکن شکر ہے کہ اس فروگذاشت یا نامساعدت بخت کی تلافی ایک حد تک یوں ہو گئی کہ سردار محمد نواز خاں صاحب اتفاق سے پشاور آ گئے اور اس طرح مجھے اُس ہستی کا شرف دید و ملازمت حاصل ہو گیا، جو تمام صوبہ سرحد میں اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے گلِ سرسبد

کی حیثیت رکھتی ہے۔

چودہ دن کے قیام پشاور میں جن حضرات نے غایت لطف و کرم سے کام لے کر میرے مطالعہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان وجود جناب نواب سردوست محمد خانصاحب رئیس تاکال کا ہے، جنھوں نے مجھے یہ دیکھنے کا موقعہ دیا کہ رؤسا پشاور کس فراخدلی کس علوئے حوصلہ سے دعوت کرتے ہیں۔ نواب صاحب ممدوح یہاں کی وہ مخصوص ہستی ہیں جن پر حکومت و پبلک دونوں کا کامل اعتماد ہے اور جن کے علوئے اخلاق سے ہر شخص متاثر ہے۔ افسوس ہے کہ نواب صاحب کی علالت مزاج کی وجہ سے زیادہ موقع تبادلۂ خیالات کا نہیں ملا۔ ایک دن رئیس موضع چمکنی کے یہاں بھی تقریب شادی کے موقعہ پر شرکت ضیافت کی فرصت نصیب ہوئی اور اس طرح مجھے یہاں کے گاؤں اور وہاں کی معاشرت غیر عمرانی دیکھنے کا بھی موقعہ ملا۔ پشاور بڑا شہر ہے، تجارت کی وجہ سے دولتمند بھی ہے، مسلمانوں کی حالت اچھی ہے، لیکن حفظان صحت کی طرف سے محکمۂ بلدہ کو مطلق توجہ نہیں۔ کیسا اچھا شہر، کسقدر عمدہ آب ہوا کتنی دلکش آبادی، لیکن گندگی اس قدر! یہ ہے نتیجہ اس نظم و آئین کا جس نے اتنے عرصہ تک اس صوبہ کو خود مختارانہ حقوق سے علیحدہ رکھا، اور یہاں کے دماغوں میں اصلاح و تنظیم کی اہلیت پیدا نہ ہونے دی۔

اسلامیہ کالج میں بھی دوبار جانے کا اتفاق ہوا اور قریشی صاحب (اسسٹنٹ سکرٹری) کے ساتھ بھی چند لمحے یہاں کی خوش گوار و صحت بخش ہوا میں صرف کرنے کی توفیق میسر آئی۔ کالج آبادی سے تقریباً ۵ میل دور واقع ہے اور اپنے نظم و اہتمام تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اچھی شہرت رکھتا ہے۔

میں جسوقت لکھنؤ سے روانہ ہوا تو موسم گرم تھا، لیکن پشاور پہونچتے پہونچتے کافی سرد ہو گیا اور اخیر اکتوبر تک اتنی سردی ہو گئی کہ آج ۲۰ر نومبر تک بھی یہاں اس کا پتہ نہیں۔ موسم کی دلکشی کے لحاظ سے میں لنڈی خانہ کا وہ ایک دن مشکل سے فراموش کر سکوں گا، جب ٹھیک دوپہر کو بلند چوٹیوں سے آنیوالی خنک ہوا ہلکے سے ترشح کے ساتھ جسم کے اندر پیوست ہوئی جا رہی تھی اور میں اُس کا مقابلہ کرنے کی خواہش بھی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔ میں دیر تک پہاڑ کے ایک غار میں جو غالباً کسی وقت کسی الشان کا مسکن رہا ہوگا اور بہت بلندی پر واقع تھا بیٹھا رہا اور چاروں طرف سنسان منظر کا خاموش مطالعہ کرتا رہا۔

جن حضرات نے میری پذیرائی کی تھی، انھیں نے ۳۰ر کی رات کو مجھے رخصت کیا اور ۳۱ر کو بہت صبح میں پشاور سے روانہ ہو کر یکم نومبر کو لکھنؤ پہونچ گیا۔ میں اپنے جذبات منت پذیر کا تفصیلی بیان

مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ نہ وہ حضرات اس کو پسند کرتے ہیں جن سے وہ متعلق ہیں، اور نہ میں زیادہ چنیں و چناں کا عادی ہوں، لیکن اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان احباب کے لطف و کرم نے میرے اندر یہ خواہش ابھی سے پیدا کر دی ہے کہ آیندہ موسم بہار میں اسی وحشی سرزمین میں چند راتیں اپنی زندگی کی پھر بسر کروں، جس کی وحشت پر علم و تہذیب کے ہزاروں دن قربان ہیں۔

نگار کا نیا سال
اور
ناظرین نگار

(۱) یہ پرچہ اٹھارویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور آیندہ پرچہ جنوری ۳۱ء کا تقریباً دو چند ضخامت کا ہوگا جس کی خوبی کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ اسمیں آپ کو ایک مستقل کتاب **فراست التحریر** پر ملیگی جس میں ایک شخص کے صرف سواد خط کو دیکھکر **اسکی سیرت اور اسکے مستقبل پر آپ سانی سے حکم لگا سکینگے** اردو میں اس **موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے**۔ علاوہ اسکے **حضرت نیاز** کا ایک نہایت معرکۃ الآرا افسانہ "**داستان حسن و عشق کا ورق خونیں**" اور **مجنوں گورکھپوری کا** ایک بالکل نیا افسانہ "**خواب و خیال**" شائع ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک درحد درجہ دلچسپ بحث علماء ہند کے اُن فتادی پر ہوگی جو **مولانا نیاز** کے استفسار و استفتاء پر انکی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

اس لئے ظاہر ہے کہ آپ ایسے مفید و دلکش مجموعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیوں نہ آپ نگار کا چندہ نئے سال کا پہلے ہی سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیں اور وی پی کے فضول مصارف سے بچیں۔

مینجر نگار

سید سلیمان ندوی کی طرف سے جواب

کسی صاحب نے ماہ اکتوبر کے رسالہ نگار میں بعنوان "مولانا سید سلیمان ندوی اس کا جواب دیں کہ کیا واقعی احادیث کی کوئی دینی قیمت ہے؟"

ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں اپنے آپ کو عامل بالقرآن ظاہر کرتے ہوئے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ دعوےٰ کیا ہے کہ:۔

احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں اور حدیثوں کو ہم دینی حجت نہیں مانتے

احادیث شریفہ کو دینی حجت تسلیم نہ کرنیکی جسقدر وجوہ بیان کئے ہیں ان سب کا لب لباب یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"بخاری یا مسلم سے روایت کرنے میں لازم تھا کہ اس روایت کے دو شاہد عادل ہوتے پھر وہ راوی جس سے روایت کرتا ہے اُسکے بھی دو گواہ معتبر درکار تھے اس اصول کے مطابق آپ کے پاس ایک حدیث بھی ہے راوی ایک حدیث بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی پھر وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس سے اسکو فلاں نے بیان کیا"

اس گمراہ کن مضمون کی حقیقت سے مسلمانوں کو متنبہ کر دینا چونکہ ہر ایک سچے عامل بالقرآن کا فرض ہے اس لئے اسی اصول مخترعہ کو کہ جسے حق اور ناحق کے امتیاز کا معیار مقرر کیا ہے پیش نظر رکھتے ہوئے اوسکے ادعائے ناروا کی حقیقت سے مسلمانوں کو مطلع کرتا ہوں کہ حفظ ایمان کا ذریعہ ہو۔ اس منکر حدیث کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا قرآن کو خالص دین قرار دینا اور اپنے متعلق عامل بالقرآن ہونے کا دعوےٰ کرنا بچند وجوہ بالکل غلط اور مغالطہ سے خالی نہیں ہے۔ پہلے یہ کہ احادیث شریفہ کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر قرآن پر عمل دشوار اور غیر ممکن ہے۔

دوسرے یہ کہ جب اُس کے اُصول مخترعہ کے اعتبار سے احادیث دینی حجت نہیں بن سکتیں تو بعینہ یہی سوال قرآن پاک کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اسکو دعویٰ ہے اگر وہی قرآن ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا تو اس قرآن پر عمل کرنے والوں کو احادیث کو دینی حجت تسلیم کرنا لازمی اور فرض ہے۔ اس لئے کہ اس قرآن کا رسول اللہ پر نازل ہونے کا علم اور یقین اسکو

قرآن ہونیکے اعتقاد رکھنے کا الزام عائد ہوگا جس کا قرآن ہونا ظنی اور غیر یقینی ہے۔ اور اگر وہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اُسکو دعوی ہے منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہے تو اس کا احادیث کے دینی حجت ہونے کو نہ تسلیم کرنیکا دعوی بالکل صحیح اور درست ہے۔

تیسری یہ کہ کل قرآن پاک کا نزول بیک وقت نہیں ہوا ہے بلکہ حالات اور واقعات کے بموجب اس کا نزول تدریجاً ہوا ہے اور اسکے اندر جسقدر احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مجمل۔ بعض محکم۔ بعض متشابہات بعض ناسخ بعض منسوخ۔ بعض ماؤل۔ بعض مفسر ہیں اگر یہ مدعی عمل بالقرآن احکامات کو دینی بات سمجھتا ہے اور اپنے اصول مخترعہ کے بموجب احادیث مدونہ فی الکتب کو واقعی دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے تو ان احکامات قرآنیہ کے سمجھنے کا اس کے پاس کونسا ذریعہ ہے اگر کوئی ایسا مدعی عمل بالقرآن جو احادیث کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے حسب ارشاد قرآنی اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھنے کے لئے جائے۔ تو اس کو کیسے معلوم ہوگا کہ محظورات اور دن کے اندر کون کون وقت نماز پڑھنی چاہیئے اور کون وقت کتنی رکعتیں نماز فرض ہیں اور کتنی واجب۔ صحت نماز کے لئے کیا کیا شرائط ہیں۔ ارکان نماز میں سے کون کون ارکان فرض ہیں اور کون کون واجب۔ پس ان تمام دینی باتوں کا معلوم کرنا احادیث کو بغیر دینی حجت تسلیم کئے غیر ممکن اور محال ہے اس لئے کہ قرآن پاک نے مسائل جزئیہ کو نہیں بیان کیا ہے ممکن ہے کہ کسی منکر حدیث کے ذہن میں یہ آئے کہ جب قرآن نے نماز کا حکم دیا ہے تو نماز کے متعلق جسقدر مسائل جزئیہ ہیں قرآن کے اسی کلیہ اقیموا الصلوات کے اندر داخل ہیں اور رسول نے قولاً اور فعلاً اسی کلیہ کی تفصیل کردی ہے تو اندریں صورت بھی اولاً اس کو حدیث کے دینی حجت ہونیکو تسلیم کرنا پڑے گا اور ثانیاً قول رسول کو۔ جو غیر قرآنی ہے قرآن ہونا تسلیم کرنا پڑے گا۔

احادیث کے دینی حجت ہونے کو منکرین ہی کی شان میں آیت شریفہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی نازل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ دین کی جس قدر باتیں خدا نے اپنے رسول کو بتلائیں اور رسول نے ان دینی باتوں کی اشاعت فرمائی دو قسم ہیں ایک تو۔ وہ باتیں ہیں کہ خدا نے بمعرفت جبرئیل وحی بھیجکر بتلائیں اور متلو فی القرآن ہیں۔ دوسری قسم کی وہ باتیں ہیں کہ خدا نے دوسرے فرشتہ کی معرفت سے وحی بھیجکر یا بلاواسطہ کسی فرشتہ کے خود خدا نے رسول پر وحی بھیجکر یا جبرئیل کی معرفت وحی بھیجکر بتلائیں مگر متلو فی القرآن نہیں ہے۔ وہ دینی باتیں جو وحی کی پہلے قسم سے متعلق ہیں قرآن کہلاتا ہے اور جن باتوں کو وحی کے دوسرے قسم سے تعلق ہے قول رسول اور حدیث کہلاتی ہیں۔ اگر منکرین حدیث اسی آیت شریفہ پر نظر غور ڈالکر سوچیں تو خود انکو باحسن وجوہ معلوم ہو جائیگا کہ درحقیقت احادیث کی واقعی دینی حجت ہے اور حدیثیں دینی حجت ہیں۔ اور مدعی عمل بالقرآن کے لئے حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کرنا اور سمجھنا لازمی ہے۔ اور اس منکر حدیث نے۔ حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے انکار میں جو یہ بیان کیا ہے کہ :۔

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کے لئے یہ ہے کہ قرآن میں حکم ہے۔ اطیعوا اللہ و

قرآن ہونیکے اعتقاد رکھنے کا الزام عائد ہوگا جس کا قرآن ہونا ظنی اور غیر یقینی ہے۔ اور اگر وہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اُسکو دعویٰ ہے منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہے تو اس کا احادیث کے دینی حجت ہونے کو نہ تسلیم کرنیکا دعویٰ بالکل صحیح اور درست ہے۔

تیسری یہ کہ کل قرآن پاک کا نزول بہ یک وقت نہیں ہوا ہے بلکہ حالات اور واقعات کے بموجب اس کا نزول تدریجاً ہوا ہے اور اسکے اندر جسقدر احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مجمل۔ بعض محکم۔ بعض متشابہات بعض ناسخ بعض منسوخ۔ بعض ماؤل۔ بعض مفسر ہیں اگر یہ مدعی عمل بالقرآن احکامات کو دینی بات سمجھتا ہے اور اپنے اصول مخترعہ کے بموجب احادیث مدونہ فی الکتب کو واقعی دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے تو ان احکامات قرآنیہ کے سمجھنے کا اس کے پاس کونسا ذریعہ ہے اگر کوئی ایسا مدعی عمل بالقرآن جو احادیث کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے حسب ارشاد قرآنی اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھنے کے لئے جائے۔ تو اس کو کیسے معلوم ہوگا کہ مکروہات اور دن کے اندر کون کون وقت نماز پڑھنی چاہئیے اور کون وقت کتنی رکعتیں نماز فرض ہیں اور کتنی واجب۔ صحت نماز کے لئے کیا کیا شرائط ہیں۔ ارکان نماز میں سے کون کون ارکان فرض ہیں اور کون کون واجب۔ پس ان تمام دینی باتوں کا معلوم کرنا احادیث کو بغیر دینی حجت تسلیم کئے غیر ممکن اور محال ہے اس لئے کہ قرآن پاک نے مسائل جزئیہ کو نہیں بیان کیا ہے ممکن ہے کہ کسی منکر حدیث کے ذہن میں یہ آئے کہ جب قرآن نے نماز کا حکم دیا ہے تو نماز کے متعلق جسقدر مسائل جزئیہ ہیں قرآن کے اسی کلیہ اقیموا الصلوات کے اندر داخل ہیں اور رسول نے قولاً اور فعلاً اسی کلیہ کی تفصیل کردی ہے تو اندریں صورت بھی اولاً اس کو حدیث کے دینی حجت ہونیکو تسلیم کرنا پڑے گا اور ثانیاً قول رسول کو۔ جو غیر قرآنی ہے قرآن ہونا تسلیم کرنا پڑے گا۔

احادیث کے دینی حجت ہونے کو منکرین ہی کی شان میں آیت شریفہ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ نازل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ دین کی جس قدر باتیں خدا نے اپنے رسول کو تبلائیں اور رسول نے ان دینی باتوں کی اشاعت فرمائی دو قسم ہیں ایک تو۔ وہ باتیں ہیں کہ خدا نے بمعرفت جبرئیل وحی بھیجکر تبلائیں اور متلو فی القرآن ہیں۔ دوسری قسم کی وہ باتیں ہیں کہ خدا نے دوسرے فرشتہ کی معرفت سے وحی بھیجکر یا بلا واسطہ کسی فرشتہ کے خود خدا نے رسول پر وحی بھیجکر یا جبرئیل کی معرفت وحی بھیجکر تبلائیں مگر متلو فی القرآن نہیں ہے۔ وہ دینی باتیں جو وحی کی پہلے قسم سے متعلق ہیں قرآن کہلاتا ہے اور جن باتوں کو وحی کے دوسرے قسم سے تعلق ہے قول رسول اور حدیث کہلاتی ہیں۔ اگر منکرین حدیث اسی آیت شریفہ پر نظر غور ڈالکر سوچیں تو خود انکو باحسن وجوہ معلوم ہوجائے گا کہ درحقیقت احادیث کی واقعی دینی حجت ہے اور حدیثیں دینی حجت ہیں۔ اور مدعی عمل بالقرآن کے لئے حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کرنا اور سمجھنا لازمی ہے۔ اور اس منکر حدیث نے۔ حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے انکار میں جو یہ بیان کیا ہے کہ :۔

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کے لئے یہ ہے کہ قرآن میں حکم ہے۔ اطیعوا اللہ و

اطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ کہتے ہیں کہ جبتک حدیثیں تسلیم نہ کیجائیں رسول کی اطاعت کیونکر ہوسکتی ہے اسکے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کے ساتھ ساتھ امرائے اسلام کی بھی اطاعت کا بھی حکم ہے آپ نے احادیث رسول کے دفاتر تو تیار کرلئے۔ لیکن امرائے اسلام کی احادیث کے مجموعے کیوں نہ بنائے کہ دین کا جزو ہوتے۔ کیونکہ بلا اون کی احادیث کے ان کی اتباع کیونکر ہوسکتی ہے؟

درحقیقت ان پر حجت ہے۔ اس لئے کہ اطاعت رسول حسب ارشاد قرآنی۔ جب فرض ہے تو رسول کے افعال اور اقوال کے مطابق اپنے افعال اور اقوال کو درست کرنا ضروری ہے اور قرآن نے کل افعال اور اقوال رسول کو۔ بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ اگر معمولی غور و فکر سے یہ منکر حدیث کام لے تو۔ خود ان کو حدیثوں کے دینی حجت ہونے کا اقرار کرنا پڑے اس لئے کہ جس طرح اطاعت رسول حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر غیر ممکن اور محال ہے۔ اسی طرح اطاعت الہی بھی حدیثو کو دینی حجت سمجھے بغیر غیر ممکن ہے اور ان تمام لوگوں کا جو صحیح معنی کے ساتھ مدعی عمل بالقرآن ہیں یہی مذہب ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امرائے اسلام کی اطاعت کے لئے انکی احادیث کے مجموعے بنائے جائیں عقل سلیم کا کام نہیں ہے امرائے اسلام کی اطاعت کے لئے ان کی حدیثوں کے مجموعے بنانے کی ضرورت درحقیقت انہی عامل بالقرآن کو ہے جو حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے منکر ہیں۔ اور جو عامل بالقرآن احادیث رسول کے دینی حجت ہونیکے معتقد ہیں اونکو امرائے اسلام کی احادیث کی کیا ضرورت ہے رسول نے خود تمام باتوں کو بالتفصیل بیان فرمادیا ہے۔ مگر منکر احادیث کے پاس قرآن کے اس حکم پر عمل کرنیکا کونسا ذریعہ ہے۔ اولی الامر سے کون امرائے اسلام مراد ہیں۔ اور ان کی اطاعت کا کیا مطلب ہے اگر یہ منکر حدیث احادیث کے دینی حجت ہونے کا انکار نہیں کرتا تو آیات قرآنیہ کے معنی اور مطالب میں تحریف کی جرات نہیں کرسکتا فافھم وتدبر ولا تکن من الذین ضلوا فاضلوا۔

اب اس منکر حدیث کے تحقیقی جواب کو بھی ملاحظہ فرمادیں لکھتا ہے:-

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کو ہم بھی فرض سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت بھی کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جسکی اتباع وہ خود کرتا ہے اس کی پیروی کی جائے۔

اگر درحقیقت یہ منکر حدیث اطاعت رسول کو فرض سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا تو حدیثوں کے دینی حجت ہونیکا انکار ہرگز نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جب یہ خود کہہ رہا ہے کہ رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جس کی اتباع وہ خود کرتا ہے اسکی پیروی کی جائے اس کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کی اتباع جس طرح سے رسول نے کی ہے کرنیکا نام اتباع رسول ہے۔ اگر کسی نے۔ قرآن کی اتباع بعینہ جسطرح کہ رسول نے کی ہے نہیں کی تو وہ شخص متبع قرآن نہیں کہلاسکتا ہے پس اتباع قرآن کے لئے حدیثوں کے دینی حجت ہونے میں بھی اب کلام کی گنجائش نہیں ہے اس لئے

یہ معلوم کرنا کہ رسول نے قرآن پاک کی کس آیت کا کیا مطلب سمجھا اور اس پر کس طرح عمل کیا ہے متبعین قرآن کے لئے ضروری ہے بغیر اسکے قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنا ضلالت اور خارج عن الاسلام ہونے کا پیش خیمہ اور اپنے کو خدا کا دشمن بنانا ہے۔

علاوہ بریں اس منکر حدیث کے علمی معلومات کا جب یہ حال ہے کہ قرآن پاک کے آسان سے آسان لفظوں کے بھی صحیح معنی سمجھنا اس کے لئے محال ہے تو۔ اپنی علمی لیاقت سے قرآن پاک کی ان آیتوں کو کہ جس کے متعلق خود خدا کا ارشاد ہے ھو الذی انزل علیک الکتب منہ ایات محکمات ھن ام الکتب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولی الالباب حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر کیا سمجھ سکتا ہے۔ بالخصوص اس منکر حدیث کی جیسی علمی حالت ہے خود آیت شریفہ ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم کے ترجمہ میں اپنے سے ظاہر کر دی ہے اس آیت کے ترجمہ میں لکھتا ہے۔

بعض لوگ حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں۔

جب اس منکر حدیث کو لھو الحدیث اور مطلق حدیث۔ اور حدیث رسول کے معنی اور اُسکے درمیان فرق و امتیاز کی طاقت نہیں تو۔ ایسے شخص کا حدیثوں کے دینی حجت ہونے کو تسلیم نہیں کرنا اپنے سے اپنے کو چاہ ضلالت میں ڈھکیلنا نہیں ہے تو اور کیا اور مشیر دیانت اور تقویٰ کا یہ حال کہ محض اپنے ادعائے باطل کو ثابت کرنے کیلئے قرآن کے لفظ اور معنی میں تحریف کرنے میں۔ نہ خداوند قہار کی قہاریت اور نہ قرآن پاک کی عظمت اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کا خیال ہے۔
احادیث رسول کے دینی حجت ہونیکو نہیں تسلیم کرنیکی اثبات میں اس آیت شریفہ کو پیش کرنا اور لھو الحدیث کا معنی۔ حدیث رسول مراد لینا۔ اور اوس پر عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرنا۔ اس منکر حدیث کی ایمانی حالت کا بے مثل خاکہ ہے۔ خدا اور اوسکے رسول اور خدا کے کلام کی عظمت اور اہمیت کو پیش نظر رکھکر ایمان سے کام لے کر اس آیت شریفہ کے ترجمہ لکھتے وقت کم از کم قرآن پاک کے کسی آسان سے آسان اردو ترجمہ کو دیکھ لیتا تاکہ من فسر القرآن برائہ فلیتبوأ مقعدہ فی النار کے وعید سے تو محفوظ رہتا۔ رسول کی احادیث کے مشغلہ کا خریدار ہونا ایمان اور سعادت مندی کا وسیلہ ہے۔ ہاں یہی منکر حدیث اور انھیں کے جیسے لوگوں کے جھوٹ موٹ اور مزخرفات سے ایمانداروں کو دور رہنے کی ہدایت اور تاکید اس آیت شریفہ میں کی گئی ہے۔ اور بتلا دیا ہے کہ یہ منکر حدیث عامل بالقرآن ہونیکے جھوٹ دعویٰ کرنے والا جھوٹ اور من گڑھت باتوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو گمراہ کرنیکی کوشش کر رہا ہے۔ گمراہ اور جاہل ہے۔ **محمد یوسف رشیدی**

(نگار) یہ نمونہ ہے مولویوں کی مربوط و مدلل تحریروں کا جو کبھی کبھی ہمیں موصول ہو جاتی ہیں اگر سارا مضمون پڑھنے کے بعد آپ کسی نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو بھی الہامی نہ کہیں کیونکہ جس طرح کلام مجید بغیر احادیث کی مدد کے نہیں سمجھ سکتے اسیطرح مضمون بھی عام فہم انسانی سے اسقدر بلند ہے کہ جب تک خود اسکا لکھنے والا آکر نہ سمجھائے کوئی مفہوم پیدا کرنا مشکل ہے

باب الاستفسار

نفس و روح

(جناب سید علی متقی صاحب۔ حیدرآباد)

کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ نفس انسانی و روح میں کوئی فرق ہے اور اگر کوئی فرق نہیں ہے تو کلام مجید میں روح اور نفس کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیوں آیا ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں علیحدہ ہیں تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ یعنی مرنیکے بعد نفس باقی رہتا ہے یا روح

موت کے بعد بقاء روح کی صورت کیا ہے اور کلام مجید میں جو روح انسانی کی حقیقت "قل الروح من امر ربی" کہکر بتائی گئی ہے وہ نفس انسانی سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ الغرض میں نفس و روح کا فرق اور بقاء روح کی بابت آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) آپ کا استفسار بہت دلچسپ لیکن بہت تفصیل کا محتاج ہے اگر میں اس مسئلہ میں تمام اکابر کے خیالات پیش کروں۔ لیکن چونکہ میں کسی اور کی رائے سے استناد نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ خود اپنی رائے اس باب میں ظاہر کروں گا، اس لئے غالباً زیادہ شرح و بسط کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ آپ کے سوالات کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھوں گا اور عمومی طور سے اس مسئلہ پر اس طرح اظہار خیال کرونگا کہ آپ کے سوالات کا جواب کسی نہ کسی طرح آجائے خواہ ترتیب کچھ ہو۔

قرآن میں نفس و روح دونوں لفظ آئے ہیں، لیکن قبل اس کے کہ قرآنی مفہوم سے بحث کیجائے ان دونوں الفاظ کے لغوی معنی معلوم ہوجانا چاہئیے۔

لفظ نفس عربی زبان میں مونث و مذکر دونوں مستعمل ہوتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جب وہ مونث استعمال ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے معنے روح یا جان کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ خرجت نفسہ روح یا جان نکلنے کے محل پہ بولتے ہیں اور جب وہ مذکر استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ذات یا شخص ہوتی ہے۔ نفس کے معنے مقصد و ارادہ کے بھی

آتے ہیں، خون کے معنے میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے اور جسم کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح عظمت، ہمت، اور رائے کا مفہوم بھی اسی لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے،

روح کے معنے عربی میں اس چیز یا کیفیت کے ہیں جس سے حیات قائم رہتی ہے اور وحی والہام کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

یعنی لغوی لحاظ سے نفس کا لفظ زیادہ وسیع المعنی ہے جس میں روح کے معنے بھی شامل ہیں اور لفظ روح سے وہ تمام معنے ظاہر نہیں کئے جاتے جو نفس کے ماتحت ہم نے ابھی ظاہر کئے۔

اب قرآن کو دیکھئے کہ اس میں یہ دونوں الفاظ کہاں اور کن معنے میں استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے کلام مجید میں لفظ نفس (باوجود اس کے کہ وہ مونث استعمال ہوا ہے) ہر جگہ ذات، ضمیر، حیثیت اصلی، جوہر اور نوع کے معنے میں آیا ہے اور لفظ روح الہام ووحی، فراست وذکاوت، قوت استعداد یا استعداد ترقی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن میں کسی جگہ نہ لفظ نفس بول کر اور نہ لفظ روح کہ کر وہ روح مراد لی گئی ہے، جس کے متعلق بقاء یا عدم بقاء کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ گویا قرآن اس باب میں بالکل ساکت ہے اور اس نے اس روح سے مطلق بحث نہیں کی جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے۔

سورہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا (پیدا کیا تم کو ایک نفس یعنی ایک نوع سے اور پھر اس سے جوڑے پیدا کئے) میرے نزدیک اس جگہ نفس واحدۃ سے مراد کوئی مخصوص ذات یا ہستی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہاں نفس سے مراد کوئی خاص ذات یا مشخص ہستی ہوتی تو اس کا استعمال مذکر صورت میں ہوتا اور اس کی صفت واحدۃ کی بجائے واحد آتی۔ وہ مفسرین جو اس سے مراد آدم وحوا لیتے ہیں، میرے نزدیک غلطی پر ہیں، کیونکہ کلام مجید نے آدم وحوا کی انجیلی روایت کی بہ حیثیت واقعہ ہونے کے کہیں تصدیق نہیں کی، بلکہ اس کو صرف استعارہ و تشبیہ کے مفہوم میں ظاہر کیا ہے۔

سورہ الفجر میں ارشاد ہوتا ہے "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ (اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف مائل ہو اس حال میں کہ تو اس سے اور وہ تجھ سے خوش ہے) اس جگہ نفس کے معنی ضمیر (CONSCIENCE) کے لئے گئے ہیں۔ نہ کہ روح کے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جو میں نے بیان کیا۔ کیونکہ اس سورۃ میں بدکاروں اور نیکوکاروں کے انجام سے بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ نیکی کے انجام کی مکمل ترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان کا ضمیر مطمئن ہو کر حقیقی مسرت سے وابستہ ہو جس کو ارجعی الی ربك سے ظاہر کیا گیا ہے۔

لفظ نفس کا ضمیر کے معنے میں مستعمل ہونا سورہ القیامہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جہاں ولا اقسم بالنفس

اللوامہ کہکر نفس لوامہ سے ملامت ضمیر مراد لی گئی ہے۔ سورۂ والشمس میں بھی ونفس وما سوٰہا سے ضمیر انسانی مراد ہے جس کی تصدیق بعد کی آیت فالھمہا فجورہا وتقواہا سے ہوتی ہے۔

اب لفظ روح کے متعلق غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں کسی جگہ اس سے مراد وہ روح نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ وانہ لتنزیل رب العالمین۔ نزل بہ الروح الامین۔ یہاں روح الامین سے وحی والہام مراد ہے۔

سورۃ السجدہ میں خلقت انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ یہاں لفظ روح سے استعداد ترقی و ملکۂ ارتقاء مراد ہے۔ عیسیٰ کے بیان میں جہاں جہاں نفخ روح کا ذکر ہے، اس سے مقصود وہی استعداد مراد ہے جو انسان میں اخلاق بلند وتزکیۂ نفس کا باعث ہوتی ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ کلام مجید میں لفظ روح، عام متعارف روح کے معنے میں نہیں آیا ہے سورۃ النحل اور سورۃ المومن کی ان آیات سے ہوتا ہے:۔

(۱) ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی ملکۂ قبول وحی والہام ہر شخص میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ جس کو اللہ چاہتا ہے عنایت کرتا ہے)

(۲) یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے اس میں یہ روح یا استعداد پیدا کر دیتا ہے)

اگر روح سے مراد وہی انسانی روح ہوتی تو یہ نہ کہا جاتا کہ "جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے"۔ کیونکہ وہ روح تو ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ایک آیت ہے:۔ یسئلونک عن الروح۔ قل الروح من امر ربی (یعنی تجھ سے لوگ روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ سو کہدو کہ روح میرے خدا کے حکم سے ہے) عام طور پر سب نے یہی سمجھا ہے کہ اس آیت میں روح انسانی سے بحث کی گئی ہے اور روح کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک روح انسانی کا ذکر اس جگہ بھی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہاں بھی روح سے مراد وحی والہام ہے۔ اس کا ثبوت خود اس آیت کے سباق وسیاق سے ہوتا ہے۔

اس آیت کے بعد ہی یہ آیتیں نظر آتی ہیں۔ ولئن شئنا لنذہبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا .... قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیرا۔

ان آیتوں سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ رسول سے لوگوں نے روح انسانی کے متعلق نہیں دریافت کیا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ "تم جو قرآن کی بابت کہا کرتے ہو ک ... مین اس کو لاتا ہے، اس کو خدا نازل کرتا ہے، الہام ربانی ہے، القائے خداوندی ہے، سو اس کی حقیقت کیا ہے یعنی ... کا نام روح رکھا ہے سو اس کی اصلیت کیا ہے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے، ا ... سے ہوتا ہے، جسکو تم نہیں سمجھ سکتے۔

ظاہر ہے کہ اگر اس آیت سے ... انسانی ہوتی تو فوراً ہی اسکے بعد قرآن اور وحی کے ذکر کا کوئی موقعہ نہ تھا قرآن اور وحی کے ذکر ہی سے یہ امر ثابت ... یہاں روح سے مراد روح انسانی نہیں ہے۔ بلکہ قبول وحی والہام کا ملکہ مقصود ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر ... کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو من امر ربی کہکر کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا گیا ... دنیا کے اور تمام مظاہر و آثار کو حکم ربانی کا نتیجہ بتایا گیا ہے اسیطرح روح کے متعلق بھی کہدیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ر ... ملہ جس قدر اول دن دقیق تھا، اسی قدر آج بھی ہے، اور ہمیشہ رہیگا، کیونکہ اسکی بنیاد اگر مفروضات پر نہیں تو قیاسا ... ہے اور چونکہ یہ قیاسات ہماری اسی دنیاوی زندگی کے مراحل ومنازل، تاثرات وکیفیات کو دیکھکر قائم کئے گئے ہ ... ، وہ ہمیشہ معرض بحث میں رہیں گے اور کسی پہ درجۂ یقین کے حد تک اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر یقین کی کوئی ص ... تو صرف یہ کہ ہم مرنے کے بعد تمام کارگاہ کو اسی دنیا کی طرح تصور کریں لیکن ایسا تصور کرنیکے کیا وجوہ ہو سکتے ہیں؟ ... ے قیاسات کے اور کچھ نہیں ہیں۔

متقدمین ... نے سینکڑوں کتابیں اس ایک مسئلہ روح پر تصنیف کر ڈالی ہیں، اور اگر ہم پہلے ہی سے یہ یقین کرلیں کہ اُن کے ... بلکسر حقیقت نگار ہیں، تو بیشک اس اعتقاد کی بناء پر ہم انھیں صحیح سمجھ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ اس اعتقاد سے خالی ال ... یہ معلوم کرنا چاہیں کہ انھوں نے اپنے نظریات اس مسئلہ میں کیونکر قائم کئے، اُن کی علمی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے، اور ہم کیو ... ان کو باور کریں، تو اس کا جواب اُن کی کتابیں کیا معنے اگر وہ خود زندہ ہو کر سامنے آجائیں، تو کوئی نہیں دے سکتے

بقاء ... کا خیال جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون "مذہب کی ضرورت" میں بیان کیا ہے، بہت قدیم چیز ہے اور ابتداء آفرینش ... وہم وخیال کی صورت میں اسکا وجود چلا آتا ہے، کیونکہ انسان کے جذبۂ محبت کا بھی اقتضا یہی تھا کہ جو محبوب ہستیاں ... سے جدا ہو چکی ہیں ان کی یاد قائم کرنے کے لئے کسی حقیقی تصور کو پیدا کرے اور جذبۂ خوف کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جو متسلط یا حکمران ہستیاں گزر چکی ہیں، ان سے ڈرتے رہنے کے لئے اُن کے اثرات کو قائم ومحفوظ سمجھے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھکر انسان نے بقاء روح کا عقیدہ پیدا کیا اور جب مذاہب اخلاقی کی بنیاد پڑی تو مصلحین وقائدین مذہب نے انسان کے اس قدیم خیال سے فائدہ اُٹھا کر معاد کی صورت پیدا کی جس میں نہ صرف روح انسانی بلکہ اُس کے جسم کا بھی

بتلائے عذاب و مستحق ثواب ہونا ظاہر کیا اور چونکہ انسان صرف انھیں باتوں سے متاثر ہو سکتا ہے جنکا اسکو تجربہ ہوتا رہتا ہے اس لئے عذاب و ثواب کی صورتیں بھی وہی بیان کی گئیں جن سے ہم اس دنیائے آب و گل میں متاذی یا مسرور ہوتے ہیں۔

الغرض بقاء روح کا مسئلہ علمی دنیا کا کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ دور جہل و تاریکی کا عقیدہ ہے جس سے اہل مذہب نے فائدہ اُٹھانے کے لئے مسلمات عالم اور حقائق ثابتہ میں داخل کر دیا، درآنحالیکہ اس کی بنیاد صرف وہم و خیال پر قائم ہوئی اور آج بھی کوئی علمی یا اخلاقی سبب اسکو حقیقت ثابت کرنے کیلئے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سلسلہ میں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ چونکہ انبیائے کرام علم لدنی رکھتے تھے اور ان کو براہ راست اس مصدر فیض علم سے معلومات حاصل ہوتی تھیں، جسے خدا کہتے ہیں، اس لئے ان کی تعلیمات کو صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں وہی اعتقاد کی روح کام کر رہی ہے۔ علم لدنی یا علم وحی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ جب وہ کسی امر کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے تو فوراً آنکھ بند کرتے ہی ان پر تمام حالات منکشف ہو جاتے تھے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ فطرت کی طرف سے وہ اچھا سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے اور جس حد تک درستی اخلاق یا نظام تمدن کا تعلق ہے وہ اپنے وقت و زمانہ کے لحاظ سے اچھا قانون بنانے والے، اور بہتر تعلیمات پیش کرنے والے تھے، علوم دنیا، یا حقائق اشیاء سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ان امور سے بحث کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اگر انھوں نے بقاء روح کے خیال کو شائع کر کے معاد کا یقین لوگوں کو دلایا تو اس لحاظ سے بالکل صحیح و درست سمجھا جائے گا کہ اس سے درستی اخلاق پر اثر پڑا، لیکن جس وقت محض حقیقت کے لحاظ سے اس پر گفتگو کیجائے گی۔ تو ہم اس کے ماننے پر صرف اس لئے مجبور نہ ہونگے کہ فلاں پیغمبر یا فلاں ولی نے ایسا بیان کیا ہے بلکہ ہم یہ معلوم کرنیکے مستحق ہوں گے کہ ہم اسے کیوں ایسا سمجھیں اور اس کے صحیح سمجھنے کے لئے کیا دلائل ہو سکتے ہیں؟

جو لوگ بقاء روح کے قائل ہیں ان کی سب سے زیادہ زبردست دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اس کے قائل نہ ہونگے تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ خدا نے یہ سب کچھ عبث پیدا کیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ کمزور دلیل کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اسکو عبث کہنا بھی اپنے ہی اصول حیات و معاشرت کے لحاظ سے ہے کہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ کے منتظر ہوتے ہیں۔ ورنہ جس وقت آپ خلاق و آفریدگار کی بے نیازیوں پر نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ جس کا مشغلہ ہی ہر وقت بنانا بگاڑنا ہو جو ہر لمحہ ہمیشہ دنیائیں پیدا کر کے فنا کرتا رہتا ہے، وہ نتیجہ، عبث، وجہ، سبب اور علت کی دنیا سے بالکل بے نیاز ہے اور اگر وہ انسان کو فنا کرنیکے بعد بالکل کالعدم کر دے اور کوئی چیز از قسم روح یا نفس اس کی یادگار باقی نہ رکھے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی پایا جاتا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

وہ شخص جو بقاء روح یا قیام معاد کا قائل ہے وہ ایسے مفروضات و مباحث کا سلسلہ قائم کر دیتا ہے۔ جو کبھی ختم ہونیوالے نہیں اور ذہن انسانی کو مشوش کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر روح قائم ہے تو اس کے قیام کی کیا صورت ہو، زمان و مکان سے اس کا تعلق ہوگا یا نہیں، جسم سے علیحدہ رہنے کی حالت میں اس کے تاثرات کی کیا کیفیت ہو گی؟ پھر بقاء اگر [illegible] ہے

تو اس کے یہ معنے ہیں کہ اسکو خدا کا ہمسر بنا دیا گیا۔ اگر غلود نہ ہوگا تو پھر اس بقاء کے بعد فنا کیوں اور کیسی؟ عذاب و ثواب سے کیا فائدہ ہے جبکہ دوبارہ اس روح کو دنیائے عمل میں لوٹ کر آنا نہیں ہو، کیوں ہم بادیہ، فردوس، پل صراط، میزان، حور و قصور، کوثر و سلسبیل، حساب کتاب وغیرہ کو صحیح باور کریں، کون سے عقلی دلائل انکے وجود میں پیش کئے جاسکتے ہیں، اگر ان سے انکار کیا جائے تو خدا کا کیا نقصان ہوتا ہے، اُس پر کیا الزام آتا ہے۔ الغرض اسیطرح کے ہزاروں مسائل و مباحث ایسے پیدا ہوجاتے ہیں، نہ جنکو آجتک حل کیا گیا اور نہ آیندہ ممکن ہے۔ لیکن دوسرا شخص جو بقاء روح کا قائل نہیں اور مرنیکے بعد نسیاً منسیاً کا ماننے والا ہے، وہ ان تمام مباحث کے دروازے کو بند کردیتا ہے اور کوئی اعتراض اسکے اس عقیدہ پر عقل کی طرف سے وارد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جہانتک قدرت خداوندی کا تعلق ہے، اس صورت میں اسکا ظہور زیادہ روشن ہوجاتا ہے اور کائنات کی وسعت، عالم تخلیق کی بے پایانی کو دیکھتے ہوئے یہی عقیدہ زیادہ قرین عقل و انصاف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ خلق و فنا کا سلسلہ اسیطرح ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جن مخلوقات کو وہ فنا کردے، انکے کسی اثر یا کسی جزو یا کسی کیفیت و تاثر کو باقی رکھے۔ اس کا کام یہی ہے کہ جسکو مٹا دیتا ہے، بالکل محو کردیتا ہے، اور اسے کوئی غرض نہیں کہ اس کا سلسلہ پھر کسی صورت سے قائم رکھے۔

یہ ہیں دونوں صورتیں بقاء روح اور عدم بقاء روح کے ماننے کی۔ اسلئے آپ مجھ سے کیا دریافت کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اگر آپ بقاء روح کے خیال کو ضروری سمجھتے ہیں اور آپ کا اطمینان نفس اسی طرح ہوتا ہے تو مانئے اور اگر نہیں ہوتا تو بیشک انکار کردیجئے کیونکہ عذاب و ثواب جس چیز کا نام ہے اسکو ہم بغیر بقاء روح تسلیم کئے ہوئے بھی اس دنیا میں متعین کرسکتے ہیں جو زیادہ قریب الفہم اور کارآمد بات ہے۔

اس سلسلہ میں یوروپ کے موجودہ روحانیین اور انکی تحقیقات کا ذکر فضول ہے، کیونکہ اس وقت تک کوئی ثبوت ان کی طرف سے بقاء روح کا پیش نہیں [illegible] اور جو واقعات و حالات بیان کئے جاتے ہیں اول تو ان میں اکثر مکر و فریب [illegible] اور بعض ایسے ہیں جو نتیجہ ہیں خود اپنے [illegible] کا، اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

اس کو بھی پڑھ لیجئے

[illegible] حضرات کا چندہ ختم ہو رہا ہے انکو ایک مطبوعہ تحریر سرخ کاغذ پر اس رسالہ کے اندر ملیگی اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ ۳۰ دسمبر [illegible] سالانہ چندہ روانہ کردیں ورنہ ۴ جنوری سے وی پی کی روانگی شروع ہوجائے گی۔ ایک مطبوعہ کارڈ بھی اس کے ساتھ بھی ملیگا۔ جس [illegible] ہے کہ آپ اپنے حلقۂ احباب سے کم از کم دو جدید خریدار پیدا کرکے نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں۔

(۲) نگار کے ہر خریدار کو اس کا چندہ نئے سال کا وصول ہونے پر حسب ذیل کتابیں نصف قیمت پر ملیں گی۔

تذکرۂ خندۂ گل بجائے للعہ کے دو روپیہ میں۔ شاعر کا انجام بجائے ۱۰ کے ۵ ر میں۔ نگارستان جدید اڈیشن بجائے عا کے عہ میں۔ شہاب کی سرگذشت جدید اڈیشن بجائے (عصہ) کے ۱۲ میں۔ جن کے گذشتہ پرچے بجائے ہر فی پرچہ کے ۲ میں۔ اور رسائل کے عجائب مفت [illegible] یہ تمام کتابیں طلب کرینگے ان سے محصولڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

مینجر نگار

"شاعر"

خاک پر کھینچا گیا نقش طلسم رنگ و بو، [illegible] کی خلوت میں جمال آرزو
کیف کے نغموں سے تھا محروم ساز گفتگو، بزم [illegible] دل رمز آشنا کی جستجو،
حسن نے اسرار کے پردوں کو جنبش دی نہ تھی
جلوۂ خوابیدۂ ہستی نے کروٹ لی نہ تھی

پھول کے اوراق تھے ناآشنائے آب رنگ، خندۂ اصنا[illegible] سنگ
رہین ترکش تھے جگر میں ڈوبنے والے خدنگ، گم دلوں کی وسعت خاموش [illegible] امنگ
انگلیاں مطرب کی پیہم دوڑتی تھیں ساز پر
کچھ مگر خود رفتگی سی تھی نوائے راز پر

دہر میں انوار کی ایسی گھٹا چھائی نہ تھی، محفل ہنگامۂ اسرار تنہائی نہ [illegible]
مسکراتی صبح میں یہ "بادہ پیمائی" نہ تھی، شام کی اس درجہ کیف انگیز انگڑائی نہ تھی
روح کی خلوت میں دخل بیخودی ہوتا نہ تھا
سینۂ بربط میں نغموں کا لہو دوڑا نہ تھا

ناگہاں امواج ناپیدا میں اک جنبش ہوئی، کان میں فطرت کے نغموں کی صدا آنے لگی
مسکرا کر رازِ دل کہنے لگی نورس کلی، پھول نے چھیڑی نشاط انگیز میٹھی راگنی
برق گزری خرمن غفلت سے لہراتی ہوئی
روح کو بیداریوں کا راز سمجھاتی ہوئی

خود بخود اٹھنے لگا، روئے حقیقت سے نقاب، ہو گئے خلوت سرائے حسن کے باطل حجاب
چھڑ گئے، ہر سمت اٹھلاتی ہواؤں کے رباب، دل میں گھر کر نیگا، سلمائے گیتی کا شباب
جلوہ نوست ہوئی، ترتیب رنگ صبح و شام
کر دیا آخر ادا، شاعر نے فطرت کا پیام